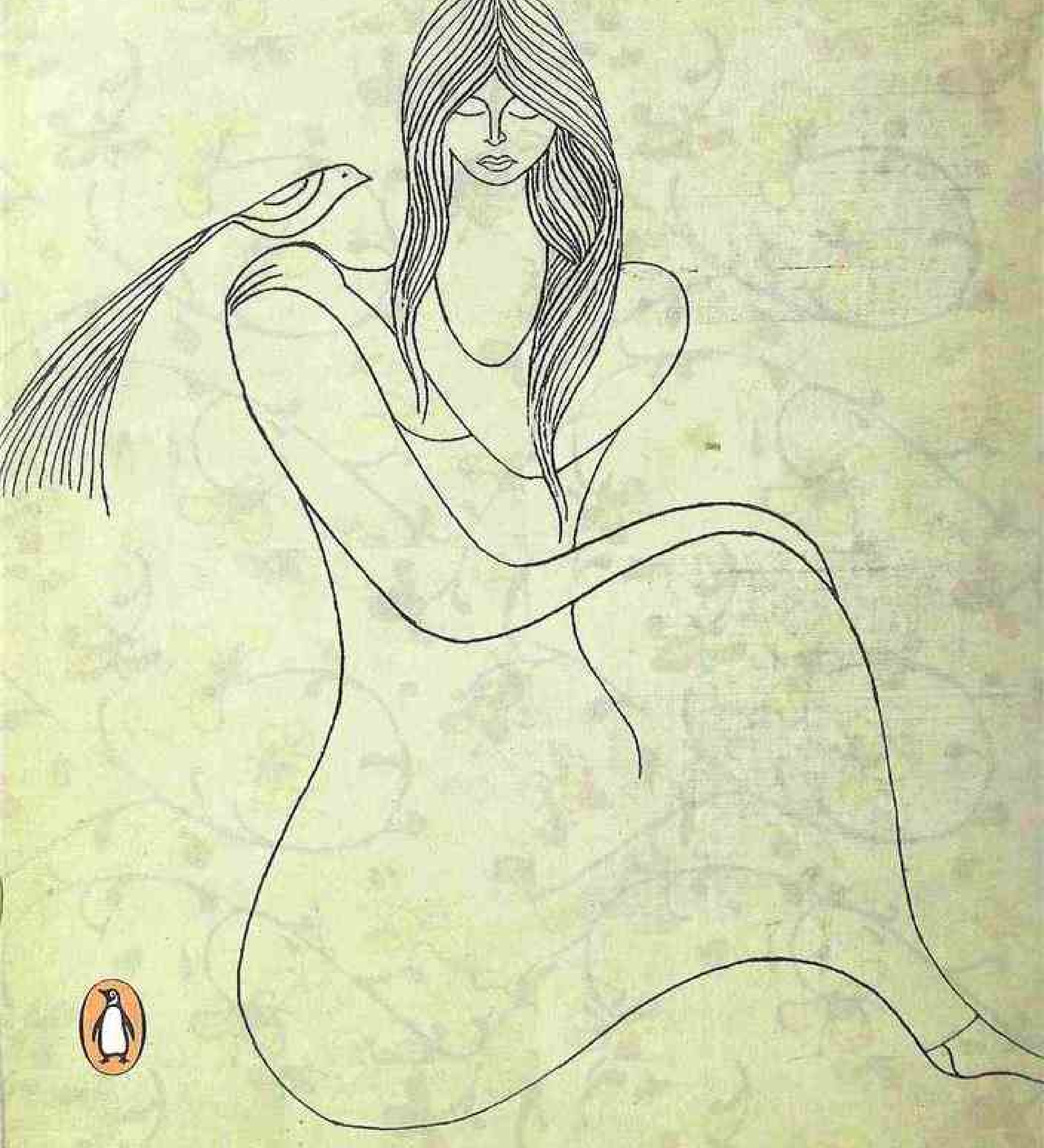
کئی چاند تھے سرآسماں

شمس الرحمٰن فاروقی



Penguin Books

Ka'i Chaand The Sar-e Aasman

برصغیر کے ادبی حلقوں میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے کوئی چالیس سال تک اردو کے مشہور و معروف ادبی ماہنامہ ''شب خون'' کی ادارت کی اور اس کے ذریعہ اردو میں ادب کے بارے میں نئے خیالات، اور برصغیر اور دوسرے ممالک کے اعلیٰ تخلیقی ادب کی ترویج کی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو اور انگریزی میں کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ خدائے سخن میر تقی میر کے بارے میں ان کی کتاب ''شعر شور انگیز'' جو چار جلدوں میں ہے، کئی بار چھپ چکی ہے اور اس کو ۱۹۹۶ میں سرسوتی سمان ملا جو برصغیر کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ کہا جاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تنقید، شاعری، فکشن، لغت نگاری، داستان، عروض، ترجمہ، یعنی ادب کے ہر میدان میں تاریخی اہمیت کے کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھیں متعدد اعزاز و اکرام مل چکے ہیں جن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اعزازی ڈی۔لٹ کی ڈگری بھی شامل ہے۔

کچھ سال پہلے شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوں کا مجموعہ ''سوار'' شائع ہوا تھا جس نے اردو کی تمام ادبی دنیا میں دھوم مچادی۔ ان افسانوں میں اٹھارویں انیسویں صدی کی اردو ادبی تہذیب اور ہند مسلم تہذیبی ماحول کو نہ صرف زندہ کردیا گیا ہے بلکہ انھیں ایک نئے اور مثبت نقطۂ نظر سے بھی دیکھا گیا ہے۔ ان افسانوں کے بارے میں عام طور سے کہا گیا ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ سارے برصغیر میں اس طرح کے افسانوں کی مثال نہیں ملتی جن میں تاریخ، ادب، سیاست، تہذیب اور شاعرانہ کردار کو بیک وقت، اور اس درجہ خوبی سے پیش کیا گیا ہو۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں

شمس الرحمٰن فاروقی

یاترا بکس
YATRA BOOKS

پینگوئن بکس
PENGUIN BOOKS

پینگوئن بکس

پبلیشر۔ پینگوئن گروپ

YATRA BOOKS
203, Ashadeep, 9 Hailey Road,
New Delhi-110001

PENGUIN BOOKS
Published by the Penguin Group

Penguin Books India Pvt. Ltd, 11, Community Centre, Panchsheel Park, New Delhi 110017, India

Penguin Group (USA) Inc., 375 Hudson Street, New York, NY 10014, USA

Penguin Group (Canada), 90 Eglinton Avenue East, Suite 700, Toronto, Ontario, M4P 2Y3, Canada (a division of Pearson Penguin Canada Inc.)

Penguin Books Ltd, 80 Strand, London WC2R 0RL, England

Penguin Ireland, 25 St Stephen's Green, Dublin 2, Ireland (a division of Penguin Books Ltd)

Penguin Group (Australia), 250 Camberwell Road, Camberwell, Victoria 3124, Australia (a division of Pearson Australia Group Pty Ltd)

Penguin Group (NZ), cnr Airborne and Rosedale Roads, Albany, Auckland 1310, New Zealand (a division of Pearson New Zealand Ltd)

Penguin Group (South Africa) (Pty) Ltd, 24 Sturdee Avenue, Rosebank, Johannesburg 2196, South Africa

Penguin Books Ltd, Registered Offices: 80, Strand London WC2R 0RL, England

First published in Urdu by Penguin Books India, Yatra Books 2006

10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

Typeset by Riaz Ahmad Katib, Allahabad
Printed at Chaman Offset Printers, New Delhi

کئی چاند تھے سر آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے

احمد مشتاق

بہرزمیں کہ خبر گیری از سواد عدم
فتادہ نامۂ ما سر بہ مہر نقش قدم

میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی

۲۹ سی، ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد،

اس کی خاتون خانہ،

اور ان دو بچیوں کے نام جو اس چمن زار کی گل تر ہیں،

اور شاید اس کی باغبان بھی ہوں۔

فہرست عنوانات

وزیر خانم

[ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم، کی یادداشتوں سے]

وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم (پیدائش غالباً ۱۸۱۱) محمد یوسف سادہ کار کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ لیکن محمد یوسف سادہ کار دہلوی الاصل نہ تھے، کشمیری تھے۔ یہ لوگ دہلی کب اور کیونکر پہنچے، اور دہلی میں ان پر کیا گذری، یہ داستان لمبی ہے۔ اس کی تفصیلات پہلے بھی کچھ بہت واضح نہ تھیں، اور اب تو تمادی ایام کے باعث، اور کچھ دوسری مصلحتوں کے باعث شاید بالکل بھلا دی گئی ہیں۔ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ حسب ذیل ہے، لیکن ضروری نہیں کہ یہ سب تاریخی طور پر بالکل درست ہو۔

وزیر خانم ۱۲۴۵ / ۱۲۴۶ مطابق ۱۸۲۹ / ۱۸۳۰ میں نواب شمس الدین احمد خان، والی فیروز پور جھرکہ و لوہارو سے منسلک تھیں۔ لیکن اس سے پہلے وہ مسٹر ایڈورڈ مارسٹن بلیک صاحب انگریز Edward Marston Blake, Gent. کے ساتھ بھی رہ چکی تھیں۔ اس زمانے میں وہ مارسٹن بلیک کے دو بچوں، یعنی ایک بیٹے مارٹن بلیک (Martin Blake) عرف امیر مرزا، اور ایک لڑکی سوفیہ (Sophia)، عرف مسیح جان، عرف بادشاہ بیگم کی ماں بنیں۔

گمان غالب یہ ہے کہ مارسٹن بلیک (Marston Blake) ان کی زندگی میں پہلا مرد تھا اور اس سے وزیر خانم کی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ تقریب ملاقات کا کچھ مصدقہ حال نہیں ملتا۔ پردہ نشین مسلمان لڑکی جو بظاہر کسبن یا پیشہ ور نچنی نہ تھی، کس طرح اور کیوں ایک انگریز کے تصرف تک پہنچی، اس کے بارے میں کوئی تحریری روایت یا کسی چشم دید گواہ کے بیان کی بنیاد پر مرتب کی ہوئی روداد موجود نہیں

ہے۔ خاندان میں جو روایت ایک زمانے میں متداول تھی وہ حسب ذیل ہے۔

بڑی بوڑھیوں کا کہنا تھا کہ ایک بار عرس مبارک کے ایام میں وزیر خانم اپنے والد کے ساتھ مہرولی شریف خواجہ قطب صاحب کی درگاہ فلک بارگاہ سے واپس آرہی تھیں۔ شام پھوٹ چلی تھی، سب مسافروں کو مراجعت کی جلدی تھی، کہ حوض شمسی کے کھنڈر ان دنوں بعض پنڈاروں نے چپکے چپکے اپنی آماجگاہ بنالئے تھے، اور موقع مناسب دیکھ کر وہ رات کے مسافروں کا شکار کھیل لیا کرتے تھے۔ لہٰذا سب ہی اس تگ و دو میں تھے کہ سورج افق مغرب سے نیچے نہ اترنے پائے اور وہ حوض شمسی اور حوض خاص کے مضافات کو پار کرلیں۔ وزیر خانم کی بہلی کا ایک دھرا گھستے گھستے ذرا مخدوش ہو گیا تھا اور خوف تھا کہ بیلوں کو اگر تیز دوڑایا گیا تو دھرا ٹوٹ سکتا ہے۔ ان کی بہلی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، یہاں تک کہ ساتھ کے تمام مسافر، خواہ وہ بہلیوں پر تھے یا تام جھام یا پالکیوں پر، آگے نکل گئے۔ فیل نشین، شہسوار، سانڈنی سوار اور بگھی سوار تو پہلے ہی یہ جادہ جانظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

وسط بیساکھ کے دن تھے۔ ریواڑی اور لوہارو کی طرف سے آنے والی گرم ہوا میں جتنی گرمی تھی اس سے زیادہ گرد و غبار تھا۔ لیکن یہی گرد و غبار ہفتے میں چار یا پانچ دن سورج ڈھلنے کے کچھ پہلے الور اور رتھمبور کے جنگلوں کی تھوڑی بہت رطوبت پی کر اور راستے کی گھنی جھاڑی جھنڈیوں سے ملاطفت کرتا جب گوڑگاؤں پہنچتا تو طوفان ابر و باد کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی دلی پر بہت ساری مٹی اور اس سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، بلکہ جھکڑ، سارے میں غبار کی ہلکی سی چادر اور خنکی کا محبت اور مروت بھرا ماحول بچھا کر، دہلی اور مضافات کی ارض وغبرا کو خوش کرتے، دو ڈھائی گھڑی کے کھیل کود کے بعد متھرا کی راہوں میں خود کو گم کرنے نکل جاتے اور دلی کے امیر و غریب، وضیع و شریف، جوان و پیر، سب کے کلیجے اور آنگن ٹھنڈے ہو جاتے۔

لیکن ایسے میں ان مسافروں کی جان پر بن آتی جو منزل سے دور ہوتے یا جن کی سواریاں ان سے بے وفائی پر آمادہ ہوتیں۔ اچانک وزیر خانم کی بہلی ریت اور لال مٹی کے بڑے بڑے ذروں سے بھر گئی۔ بیلوں کی بڑی بڑی آنکھیں دہشت اور چبھن کے باعث بند ہو گئیں۔ بہلی کے تین پردے جھرانا مار کر یوں اڑے گویا لومڑی کے خوف سے بوکھلائے ہوئے تیتر ہوں۔ گاڑھی ہوتی ہوئی روشنی میں ماشی اور قرمزی رنگ کے پردے کچھ دور تک تو ہوا میں معلق دکھائی دیئے، پھر خدا جانے کہیں دور اڑ گئے یا گھنے درختوں کی شاخوں نے ان کو اچک لیا۔ پردوں کے یوں اڑ جانے، بیلوں کے بھڑکنے اور سواریوں کے

جگہ سے بے جگہ ہونے کے باعث گاڑی کا توازن جو بگڑا تو بہلی چار کے بجائے دو پہیوں پر معلق ہوگئی اور پھر ہوا کے دوسرے تھپیڑے نے اسے سیدھا کیا تو چاروں پہیے ایک دھاکے کے ساتھ زمین سے ٹکرائے اور اسی کے ساتھ ساتھ دھرے کے ٹوٹ جانے کی کریہہ آواز سنائی دی۔ فوری طور پر تو سمجھ میں نہ آیا کہ بہلی میں کوئی چیز ٹوٹی ہے یا آس پاس کے درختوں کی کوئی موٹی شاخ ہوا کے دباؤ سے مجبور ہوکر زمیں بوس ہوگئی ہے۔ لیکن بہلی کا ایک پہیہ بھی چشم زدن میں الگ ہوگیا اور بہلی دوبارہ الٹتے الٹتے بچی تو بچارے مسافروں کو معلوم ہوا کہ ان پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔

وزیر خانم کے باپ نے تو تقدیر ٹھونک لی تھی کہ آج کی رات اس کے اور اس کی بیٹی کے لئے آخری رات ہوگی۔ اب کوئی اکا دکا بچھڑا ہوا مسافر تو کیا، کوئی قافلہ بھی گذرنے والا نہ تھا، نہ کہیں سے کوئی دستگیر پیدا ہو سکتا تھا کہ سب اپنی اپنی پناہ گاہوں میں بند تھے۔ شکستہ بہلی کے سواروں کی رات اسی بیابان میں گذرنی تھی اور صبح کا منھ دیکھنا انھیں شاید ہی نصیب ہونا تھا۔ لڑکی کو تو لونڈی یا قحبہ بننا تھا اور باپ کی قبر وہیں بننی تھی۔ گاڑی بان شاید بچ نکلتا تو بچ نکلتا۔

لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ دہلی کی طرف سے ایک نیم روشن ابر نما بڑا دھبہ سڑک پر متحرک نظر آیا۔ پھر سانڈنی کے پاؤں کی جھانجھن سنائی دی، پھر ایک گھڑ سوار، جس کے پس اور جلو میں دو برچھیت ہواؤں اور غبار کے آگے منھ کو ڈھانکے ہوئے، لیکن پا مرد اور ثابت قدم، ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پاؤں رکھتے ہوئے، گھوڑ سوار کے دونوں طرف دو احدی، ایک کے ہاتھ میں مشعلہ، ایک کے ہاتھ میں بادبان (۱) گھوڑا بھی خوب سدھا ہوا تھا کہ ہوا کے تھپیڑے اور درختوں کی سائیں سائیں اس کی دلجمعی میں قطعاً حارج نہ تھی۔ سانڈنی سوار نے دھندلاتی فضا میں اپنی فراست کو کام لاتے ہوئے تھوڑی دور پر ہی سے سمجھ لیا تھا کہ مصیبت زدہ مسافر ہیں۔ ٹھگ بھی ہو سکتے تھے، لیکن یہ موسم ٹھگی کا نہ تھا، اور نہ وہ علاقہ ٹھگوں کا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ٹھگوں کے جرگے میں عورتیں نہ ہو سکتی تھیں۔ سانڈنی سوار اور برچھیت نفر تو آگے بڑھتے آئے لیکن گھڑ سوار اپنے روشنی بردار احدیوں کے ساتھ ذرا فاصلے پر رک گیا۔ ابھی کچھ

(۱) مشعل کی لکڑی سے ذرا چھوٹی لکڑی کے ایک سرے پر پیتل کا گہرا پیالہ نصب کر دیتے تھے، پھر مشعل میں جلانے کا سامان، مثلاً سرسوں کے تیل کی گاڑھی تلچھٹ یا روغن نفت میں تر کیا ہوا موٹا چیتھڑا، اس میں یوں رکھتے تھے کہ پیالے کی کور اس کے لئے اوٹ کا کام کرتی تھی۔ لہٰذا اس کا شعلہ ہوا سے بجھتا نہ تھا۔ ایسی مشعل کو مشعلہ کہتے تھے۔ دتی اس سے بھی چھوٹی مشعل ہوتی تھی۔ ایسا فانوس، جو چاروں طرف سے بند ہو لیکن جس میں ہوا کے لئے ننھے ننھے سوراخ ہوں، اور جسے ہاتھ میں لیا جا سکے، بادبان کہلاتا تھا۔ انگریزی لفظ Lantern سے بنایا ہوا لفظ لالٹین، اور روشنی کے آلے کے طور پر خود لالٹین بھی رائج ہو رہے تھے، لیکن احدی اور مشعل بردار اسے کم استعمال کرتے تھے۔

واضح نہ تھا کہ شہسوار کی ذات برادری کیا ہے۔ بادشاہ ظل الٰہی کے اہل کاران بھی ان اطراف میں شاموں کو گشت لگاتے دکھائی دے جایا کرتے تھے اور کمپنی بہادر کے بھی سپاہی کسی کسی دن نکل پڑتے تھے۔ ادھر گاڑی بان نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ ڈاکو لٹیرے نہیں ہیں، ان سے امداد کی درخواست ممکن ہے۔

گاڑی بان آگے بڑھا تو سانڈنی سوار نے اپنی سواری کو ڈپٹا کر اس کا راستہ روک دیا اور پوچھا:

''کون ہو تم لوگ؟ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ جانتے نہیں ہو غروب آفتاب کے بعد کسی قافلے یا سپاہیوں کی نفری کے بغیر یوں پھرنا ممنوع ہے؟''

''جانتے ہیں مائی باپ۔ ہم لوگ خواجہ صاحب بختیار بابا کے دربار سے آرہے ہیں۔ اچانک آندھی نے آلیا۔ پھر پہیہ ٹوٹ گیا۔ اب یہاں کھڑے اپنی جان کو رورہے تھے۔ پردے کی بیبیاں ساتھ ہیں، اللہ ہی جانتا ہے کیا ہو جاتا اگر آپ اور اوغلان صاحب...''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تمھارے مالک کہاں ہیں؟ کمپنی صاحب کے سامنے حاضر ہوں۔''

''حاضر ہیں سرکار، بس زنانہ ایک تل اوٹ ہو جائے، بے پردگی ہوتی ہے۔'' اس فروتنی کے عالم میں بھی گاڑی بان کا اشارہ تھا کہ فرنگی مرد ذرا دور ہی رہے تو بہتر ہے۔

وزیر خانم کا باپ خود کو ٹوٹی ہوئی بہلی سے الگ کر کے آگے آرہا تھا کہ گھڑ سوار نے اپنی سواری کو حرکت دی، اور ایک لمحے میں وہ اور بہلی کی سواریاں آمنے سامنے تھیں۔ اتنی دیر میں ایک برچھیت نے انگریزی وضع کی ایک لالٹین بھی روشن کر لی تھی۔ لیکن اسی اثنا میں ہوا بھی تیز تر ہو گئی تھی۔ لالٹین کا شعلہ دھواں سا ہوا جا رہا تھا۔ اچانک ایک زور کا جھونکا آیا اور وزیر خانم کے بدن کی چادر اڑتی چلی گئی، اور دفعۃً اس کا چہرہ کھل گیا۔ بڑی بڑی جامنی آنکھوں کے نیچے اس کا منھ خوف، گھبراہٹ اور شرم کے باعث کالے ہرن کی پیشانی جیسا تمتما اٹھا تھا اور لالٹین کی کپکپاتی ہوئی لو نے اس کے آپے کو ذرا اور روشن کر دیا تھا۔ انگریز اسے تکتا رہ گیا اور ادھر ایک دلکش غیر مرد کو اپنے میں اس قدر مستغرق دیکھ کر جوانی کی بڑھتی ہوئی موجوں نے کچھ شوخ ہونے کی ٹھانی۔ دونوں کی آنکھیں ایک نگاہ بھر تک ملیں، پھر گاڑی بان نے جلدی سے ایک چادر کھینچ کر اس کے بدن پر ڈال دی۔

یہ انگریز مارسٹن بلیک تھا جو اپنی معشوقہ کے گھر رات گذارنے عرب سرائے جا رہا تھا۔ تھوڑی

ہی گفتگو اور کچھ تامل کے بعد یہ طے ہوا کہ مارسٹن بلیک صاحب بنفس نفیس ان مسافروں کو حوض شمسی کے آگے منیر کے باغ تک پہنچادیں گے۔ وہاں سے کسی معتبر سواری کا انتظام ممکن تھا۔ منیر کے باغ تک کا سفر زنانہ سواریاں تو کسی نہ کسی طرح ٹھنس ٹھنسا کر سانڈنی پر کرلیں گی۔ باقی لوگوں کو گھوڑے کی دلکی چال کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔ مسافروں کا سامان بہت نہ تھا، کچھ کو تو سانڈنی ہی پر ڈال لیا گیا۔ جو تھوڑا بہت بچا اسے بھی کسی صورت برچھیتوں اور گاڑی بان نے اٹھالیا۔

اس واقعے کے بعد مارسٹن بلیک کسی نہ کسی تقریب سے ہر دو تین دن پر وزیر خانم کے گھر پہنچ کر سیر و تفریح کی باتیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ اسے چاندنی چوک اور نہر کی سیر کے لئے لوا لے جاتا۔ ماں تو تھی نہیں، باپ ان کے ساتھ ہوتا، لیکن طوعاً و کرہاً، اور بیٹی کو پوری چادر لپیٹ کر باہر جانے پر ہمیشہ اصرار کرتا۔ پھر بھی، اس اثنا میں وزیر خانم سے اس کے چپکے چپکے کیا مراسم بنے یا کیا عہد و پیمان ہوئے، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ خیر، چند مہینے بعد مارسٹن بلیک نے آکر خبر دی کہ میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی اسامی پر متعین ہو کر ریاست جے پور جارہا ہوں۔ اس وقت تو کچھ خاص بات چیت نہ ہوئی، صرف رسمی افسوس اور راہ و رسم قائم رکھنے کے وعدوں کے بعد مارسٹن بلیک ان سے رخصت ہوا۔ لیکن وہ پھر ایک سوا مہینے بعد دہلی واپس آیا تو محمد یوسف کے یہاں بھی گیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے مناسب مکان لے لیا ہے اور گرہستی کے سب ساز و سامان مہیا کرلئے ہیں۔ تنخواہ بھی معقول ہے، نوکر چاکر قدم قدم پر موجود ہیں، ہل کر پانی بھی نہیں پینا پڑتا۔ جے پور میں میری بڑی آؤ بھگت ہے۔ بس صاحب پولیٹیکل ایجنٹ صاحب میرے حاکم بالا ہیں، ورنہ اور مجھ سے نکلتا ہوا وہاں کوئی نہیں۔

مارسٹن بلیک کی باتیں سن کر سب لوگ کچھ دیر کے لئے خاموش سے ہوگئے۔ پھر مارسٹن بلیک ہی نے پہل کی، لیکن کچھ کہنے کے بجائے اس نے چھوٹی بیگم کو ذرا معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ کچھ ادھر کا بھی اشارہ دیکھ کر بلیک اور محمد یوسف خاموشی سے ایک طرف کو ہولئے، سرگوشیوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔

اس کے کوئی ہفتہ بھر بعد مارسٹن بلیک کے قافلے میں، جو عازم جے پور تھا، آرائش اور گوٹے ٹھپے سے جگمگاتا ہوا اور تازہ پھولوں کے گجروں سے گمکتا ہوا اور تازہ ہری ترہات سے ہریالا بنا ہوا ایک رتھ بھی تھا۔ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم زرق برق حلۂ عروسی میں ملبوس اس میں سوار تھیں۔

سوفیہ

[ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم، کی یادداشتوں سے]

مارسٹن بلیک کی موت ریاست جے پور میں بزمانہ ملازمت ایک مقامی بلوے میں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اوائل ۱۸۳۰ کا ہے۔ انگریزوں نے غالباً از راہ ناانصافی یا از روے قانون انگریزی، چھوٹی بیگم اور مارسٹن بلیک کے رشتۂ زناشوئی کو تسلیم نہ کیا تھا۔ لہٰذا بلیک کے املاک غیر منقولہ اور نقد و جنس سے چھوٹی بیگم کو کچھ بھی نہ ملا۔ نہ انھیں کچھ گذارے کی رقم یا پنشن ملی۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، چھوٹی بیگم کے بطن سے مارسٹن بلیک کے دو اولادیں ہوئی تھیں، ایک بیٹا مارٹن بلیک عرف امیر مرزا، اور بیٹی سوفیہ عرف مسیح جان عرف بادشاہ بیگم۔ سوفیہ اپنے وقت کے حسینوں میں تھیں۔ ان کی پہلی شادی مشہور اینگلو انڈین فوجی افسر ایلکزنڈر اسکنر (Alexander Skinner) المعروف بہ ایلک صاحب سے ہوئی تھی جس کے باپ جیمس اسکنر (James Skinner) عرف ''سکندر صاحب'' کے فوجی رسالے Skinner's Horse کی بڑی شہرت تھی۔ بیگم اسکنر، یعنی سوفیہ عرف بادشاہ بیگم عرف مسیح جان کو اردو کے ادبی حلقوں میں مس بلیک خفی کے نام سے جانا گیا۔ وہ اپنے زمانے کے خوش فکر شعرا میں شمار ہوتی تھیں۔ یہ دونوں بھی اپنے باپ کے ترکے سے محروم رہے۔ لیکن اس کی ایک رشتے کے چچا چچی اور خود چھوٹی بیگم نے ان کی کفالت کی۔

سوفیہ مارسٹن بلیک اور ایلکزنڈر اسکنر (Alexander Skinner) کے ایک بیٹا بہادر مرزا نام کا، اور ایک بیٹی احمدی بیگم نامی ہوئیں۔ احمدی بیگم کا عیسائی نام شارلٹ (Charlotte) تھا لیکن وہ کہلائیں احمدی بیگم۔ سنہ ۱۹۴۶ میں ان کی اولادیں جے پور میں خوش حال زندگی بسر کر رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس شادی سے ایک اور بیٹا محمد امیر یا امیر مرزا، یا امیر اللہ، بھی پیدا ہوا تھا۔ لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ جیسا

کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، امیر مرزا تو مارسٹن بلیک (Marston Blake) کے بیٹے مارٹن بلیک (Martin Blake) کی عرفیت تھی۔

یہ ضرور ہے کہ صوفیہ عرف بادشاہ بیگم کے دوسرے شوہر کا نام محمد امیر، یا امیر اللہ تھا۔ ان کے ایک بیٹا تھا، لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، بجز اس کے کہ اس بیٹے کے ایک بیٹا ہوا جس کا نام حبیب اللہ قریشی تھا۔ حبیب اللہ کی پیدائش شاید ۱۸۹۰ کے آس پاس ہوئی۔ (ممکن ہے کہ امیر اللہ پہلے شوہر رہے ہوں، اور ان کے انتقال کے بعد صوفیہ بیگم نے ایلک صاحب سے نکاح کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امیر اللہ دوسرے شوہر رہے ہوں، یا انھوں نے صوفیہ بلیک سے نکاح نہ کیا ہو، انھیں صرف داخل حرم کر لیا ہو۔) حبیب اللہ قریشی نے اپنے باپ کا اصل نام ونسب کیوں چھپایا اور خود کو قریشی کیوں قرار دیا، یہ بات کبھی نہ کھلی۔ ممکن ہے کہ امیر اللہ نسباً قریشی رہے ہوں، لیکن حبیب اللہ کے عمل اخفا سے یہ گمان پیدا ہونا فطری ہے کہ امیر اللہ اور صوفیہ عرف بادشاہ بیگم رشتۂ نکاح میں منعقد نہ ہوئے تھے۔ بہر حال، یہی حبیب اللہ قریشی بعد میں سلیم جعفر کے نام سے اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور عروضی مشہور ہوئے۔ سلیم جعفر نے نظیر اکبر آبادی کا ایک مبسوط انتخاب ''گلزار نظیر'' کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد کے لئے کیا تھا(۱)۔ یہ اب بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا پر بھی لکھا ہے۔ فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی بھی وہ خوب جانتے تھے اور انگریزی تو گویا اردو کے ساتھ ساتھ ان کی پہلی زبان تھی۔

سلیم جعفر کا انتقال کراچی میں ہوا۔ غیر منقسم ہندوستان میں وہ اچھی سرکاری ملازمت پر متمکن تھے۔ پاکستان میں انھیں اپنی لیاقت کے موافق، بلکہ اس سے کچھ نزدیک مرتبے کا بھی کام نہ ملا۔ ایسا شاید اس لئے بھی ہوا ہو کہ وہ وظیفہ یابی کی عمر (اس زمانے میں پچپن سال) کو پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے میر پور خاص (تب مغربی پاکستان) میں سکونت اختیار کی اور ایک مقامی وکیل محمد لطیف گاندھی کے یہاں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ انھوں نے تصنیف و تحقیق کا کام جاری رکھا اور ایک مبسوط لغت اشتقاق بھی مرتب کیا۔ ''تحقیق اللغات'' نام کے اس لغت میں اردو کے ایسے الفاظ کے اشتقاقات بتائے گئے ہیں جو سنسکرت یا فارسی سے اردو میں آئے ہیں۔ افسوس کہ یہ لغت ابھی تک تشنۂ انطباع ہے۔ میر پور خاص میں ادب گلشن آبادی اور پھر پروفیسر کرار حسین کے ساتھ ان کی ادبی صحبتوں نے ان کی زندگی کو کچھ دلچسپ

---

(۱) مطبوعہ ۱۹۵۱۔

بنا دیا تھا۔ کرار صاحب کی فرمائش پر شاہ عبد اللطیف بھٹائی کالج میں تقابلی لسانیات اور دیگر علمی موضوعات پر سلیم جعفر نے کئی لیکچر بھی دیے جو بہت کامیاب رہے۔ سلیم جعفر کا رویہ طالب علموں کے ساتھ نہایت مشفقانہ تھا اور وہ بلا معاوضہ ان کی علمی امداد کرتے تھے اگر چہ خود ان کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔

سلیم جعفر کی واحد اولاد ان کے بیٹے اعجاز احمد قریشی تھے۔ باپ کی طرح وہ بھی اردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انھیں تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا، لہٰذا انھوں نے شمیم جعفر قلمی نام اختیار کیا لیکن انھوں نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ باپ کے برعکس انھیں نواب مرزا داغ سے اپنی قرابت داری، وہ دور کی سہی، بڑی قابل ذکر بات معلوم ہوتی تھی۔ شمیم جعفر نے داغ کی والدہ یعنی اپنی پردادی وزیر خانم کے بہت سے حالات کتابوں، بزرگوں کی یادداشتوں اور بڑے بوڑھوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کیے تھے۔

شمیم جعفر (اعجاز احمد قریشی) کی شادی سلیم جعفر کی ایک اینگلو انڈین قرابت دار خاتون ہرمائنہ مارٹیمر (Hermione Mortimer) کی اکلوتی بیٹی پرڈیٹا مارٹیمر (Perdita Mortimer) سے ہوئی تھی۔ اس وقت وہ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں کسی چائے کے باغ میں منیجر تھے۔ ایک بار باغ کے مزدوروں نے اپنے میٹ کے کسی برے برتاؤ کی بنا پر ہڑتال کر دی اور ان میں سے تھوڑے بہت کچھ تشدد پر بھی مائل ہو گئے۔ پولیس یا انتظامیہ کے آتے آتے شمیم جعفر کے گھر پر ایک بھیڑ مجتمع ہو گئی۔ شمیم جعفر کو چونکہ اپنی ہر دلعزیزی پر اعتماد تھا، اس لیے وہ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر مجمعے کے سامنے چلے آئے اور مزدوروں کے رہنماؤں سے انھوں نے اتنی خوش اسلوبی اور خوش خوئی سے گفتگو کی کہ ہڑتال وہیں کی وہیں واپس لے لی گئی۔ اپنے مقصود میں کامیابی اور ہڑتال کے ختم ہو جانے کی مسرت میں سرشار مجمعے نے شمیم جعفر کو کاندھوں پر اٹھا لیا اور ''منیجر صاحب زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے انھیں باغ کی طرف لے چلے۔ تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ شمیم جعفر کی سرکاری زندگی کا سب سے منور لمحہ چشم زدن میں حادثے کا شکار ہو کر ان کی اور ان کے گھر والوں کی دنیا اندھیری کر گیا۔

وہ دن بارشوں کے تھے اور چائے کے علاقوں میں بارش عام ملک سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پھر یہ باغات زیادہ تر ڈھلواں زمین پر لگائے جاتے ہیں کہ بارش سے پودے سیراب تو ہوں لیکن پانی کہیں ٹھہرنے نہ پائے۔ فتح مندی اور تشکر کے احساس سے چور مزدوروں نے شمیم جعفر کو کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے ایک معمول سے زیادہ تیز ڈھال پر چڑھنا چاہا۔ ایک مزدور کا پاؤں جو رپٹا تو سب کے سب دور تک لڑھکتے ہوئے بالآخر بائیں طرف کی ایک نچلی کھائی میں جا رہے۔ جان تو بفضل خدا کسی کی نہ

گئی لیکن زخم ار بھی ہوئے۔ شمیم جعفر کے سر میں گہری چوٹ آئی جس کی بنا پر وہ اپنا حافظہ کھو بیٹھے۔ کلکتہ میں طویل علاج کے بعد ان کی یادداشت تو بڑی حد تک واپس آ گئی لیکن ان کی ذہنی کیفیت بچوں یا از کار رفتہ بوڑھوں جیسی ہو گئی۔ مجبوراً انھیں نوکری چھوڑ کر باپ کے پاس میر پور خاص (تب مغربی پاکستان) چلا جانا پڑا۔ اپنے خیالوں میں ابھی تک وہ ٹی اسٹیٹ کے بڑے صاحب تھے اور ان کی دوستی بڑے بڑے انگریزوں اور سرکاری افسروں سے تھی۔ وہ ہر شام کو پورے سوٹ بوٹ میں ملبوس، ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگار لئے ''ٹی اسٹیٹ'' کے ''کلب گھر'' کو جاتے۔ ظاہر ہے کہ کلب گھر تو کوئی تھا نہیں، وہاں دور دور تک چائے کی پتی کی مہک بھی نہ تھی۔ لیکن شمیم جعفر اپنے خیالوں میں مگن، مسکرا مسکرا کر خود سے انگریزی بولتے ہوئے ساری بستی کا چکر لگا کر رات ڈھلے واپس آ جاتے۔ ان کی صاحبی وضع قطع پر اتنی سخت پابندی کی بنا پر بعض لوگ، خاص کر بچے، ان کا مذاق اڑانے کے لئے ان سے پوچھتے، ''بابو جی ٹیم کیا ہوا ہے؟'' حتیٰ کہ ان کا نام ہی ''ٹائم بابو'' پڑ گیا۔

حادثے کے وقت شمیم جعفر کے بیٹے وسیم جعفر کی عمر کوئی دس بارہ سال کی تھی۔ وسیم کی ایک بہن بھی تھی جو بھائی سے کوئی دو سال بڑی تھی، لیکن وہ ذہنی طور پر کمزور اور جسمانی طور پر بڑی حد تک معذور تھی۔ شمیم جعفر کی دیکھ بھال ان کی بیوی نے اور باپ نے حتی المقدور کی، لیکن اب ان کے دن بگڑنے ہی پر آمادہ تھے۔ سلیم جعفر ایک حادثے میں دائیں کولھے کی ہڈی تڑا بیٹھے۔ اس عمر میں، اور ان حالات میں اصلاح بھی محال تھی، صحت مندی کا کیا ذکر۔ اب ان کی بہو انھیں بھی دیکھتی، معذور بچی کو بھی، اور ذہنی طور پر ماؤف شوہر کی بھی نگہداشت کرتی۔ مسلسل پلنگ پر پڑے رہنے کی وجہ سے سلیم جعفر کے سارے بدن پر آبلے اور زخم ہو گئے جن میں پیپ کے ساتھ ساتھ بدبو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ سلیم جعفر جیسے نستعلیق اور نفاست پسند شخص کی یہ گت دیکھنے والوں کو رنجیدہ اور ہراساں کرتی تھی، خود ان پر کیا جانے کیا بیتتی ہوگی۔ آخر کار حد درجہ معذوری کے عالم میں وہ اپنے ایک رشتے کے ماموں کے یہاں کراچی لے جائے گئے، لیکن اب ان کی حالت معالجے سے زیادہ دعا کی متقاضی تھی کہ انھیں اس دار المحن سے نجات ملے۔ کئی مہینے تک مصیبت جھیلتے رہنے کے بعد انھوں جان جان آفریں کے سپرد کی۔ بقول بعض یہ سال ۱۹۵۹ تھا۔

سلیم جعفر نے ایک وصیت نامہ لکھ کر شمیم جعفر کے لئے بہت کچھ انتظام کر دیا تھا اور ضروری کاغذات محمد لطیف گاندھی کے سپرد کر دیئے تھے۔ پرڈیٹا اپنے مخبوط الحواس شوہر اور بیٹی بیٹے کو لے کر انگلستان منتقل ہونا چاہتی تھیں، لیکن باپ کے چند ہی دن بعد شمیم جعفر کا بھی بلاوا آ گیا۔ ان کی تکفین و

تدفین کے کچھ عرصہ بعد پرڈیٹا دونوں بچوں کے ساتھ ایک ننہالی عزیز کے توسط سے انگلستان آ گئیں۔

ماں کی توقع اور امید کے خلاف ویم جعفر نے خود کو اپنے دادا کی تہذیبی اور ادبی روایات سے پوری طرح سیراب رکھنا پسند کیا اور ان کے علوم و آداب کو شعوری طور پر، اور بیش از بیش اختیار کیا۔ ویم جعفر نے لندن یونیورسٹی کے مشہور ادارے School of Oriental and African Studies میں کئی سال تک تعلیم حاصل کر کے اردو اور فارسی میں اچھی دستگاہ بہم پہنچائی۔ بولنے کی حد تک تو وہ بہت صفائی اور روانی سے نہایت با محاورہ اردو بولتے ہی تھے۔ باپ سے ان کی ساری گفتگو اردو میں ہوتی تھی۔ ماں کے ساتھ بھی وہ انگریزی اردو ملا کر ہی بولتے تھے۔ اب کالج میں جم کر تعلیم لینے کے باعث وہ بہت اچھی ادبی اردو لکھنے اور سمجھنے بھی لگے تھے۔ وزیر خانم اور ان کے خاندانی حالات کے بارے میں انھوں نے اپنے دادا سے کچھ کہانیوں کے روپ میں تو کچھ باپ دادا کی گفتگوؤں کے ذریعہ بہت کچھ سنا تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ انھیں مصوری سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے لندن کے مشہور زمانہ Slade School of Art میں کئی برس شام کے درجات میں تعلیم حاصل کی۔ پھر انھیں محسوس ہوا کہ ان کا اصل میدان مغل طرز کی مصوری ہے۔ یہاں بھی انھوں نے بہت تگ و دو کے بعد اچھی دستگاہ حاصل کر لی اور بالآخر وکٹوریہ اینڈ البرٹ (Victoria and Albert) میوزیم میں وہ انیسویں صدی کی ہندوستانی (اور کمپنی) مصوری کے شعبوں میں نائب نگراں (Assistant Keeper) مقرر ہو گئے۔ فرصت کے زیادہ تر اوقات وہ انڈیا آفس لائبریری میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے کاغذات کو الٹنے پلٹنے میں گذارتے۔ (اب وہ برٹش لائبریری کا حصہ بنا دی گئی ہے لیکن پرانے لوگ اسے اب بھی ''انڈیا آفس لائبریری'' کے نام سے پکارتے ہیں۔)

ویم جعفر کئی سال سے شمالی ہندوستان میں اٹھارویں انیسویں صدی کے بعض ایسے خاندانوں اور گھرانوں کے حالات ڈھونڈنے میں مصروف تھے جو اپنے زمانے میں تو بہت نمایاں تھے لیکن اب وقت نے انھیں اوراق کے ملبے میں داب دیا تھا اور ان کے نام اب اگر کسی کو معلوم تھے تو وہ محض چند اختصاصی مورخین ہی تھے۔ ان میں سے بعض تو انگریزوں کی سرپرستی میں خوب پھلے پھولے لیکن اپنے ہی نا اہل اخلاف کی بنا پر تباہ یا گمنام ہوئے، اور بعض ایسے تھے جو ۱۸۵۷ کے پہلے یا بعد حاکمان فرنگ کی تیغ جور اور ستم عدل نما کی ترازو پر تلے اور کم وزن پائے گئے۔ انھیں امید تھی کہ ان کی داستان وہ کبھی قلم بند بھی کر سکیں گے۔

آج ایسے گھرانوں کے نام صرف اختصاصی مورخین ہی کو معلوم سہی، لیکن اپنے وقت میں یہ خانوادے علم اور فن، خاص کر شاعری، مصوری، اور موسیقی کا گہوارہ تھے۔ ان کے کاغذات اور کتابیں اگر دیکھی جاتیں تو ہند اسلامی تہذیب کے نہ جانے کتنے گوہرِ بے بہا ان میں خفتہ اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے نظر آتے۔ وسیم جعفر کے سامنے چند نام تھے جن پر وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے یا ڈھونڈتے رہتے تھے: بریلی کے راجا رتن سنگھ زخمی، کڑا مانک پور کے رائے بالمکند شہود، بنارس کے صاحب رام خاموش، باندہ کے علی بہادر خان، فرخ آباد کے تجمل حسین خان، فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے شمس الدین احمد خان اور وزیر خانم، خاص گنج (کاس گنج) کے کرنیل گارڈنر، ان کی بیگم، جو نواب کھمبائت کی بیٹی تھیں، اور ان کی بہو، جو فردوس منزل شاہ عالم بہادر شاہ ثانی کی بیٹی تھیں اور شاہ اودھ کی مہربانیوں اور اپنے پہلے شوہر کی زیادتیوں سے متنفر ہو کر کرنیل کے بیٹے کے ساتھ چلی آئی تھیں، دہلی کے حسام الدین حیدر اور ان کی اولاد، دیوان فضل اللہ خان۔ وسیم جعفر خود سے پوچھتے تھے کہ کیا سیاسی وجوہ سے قطع نظر بھی نئے ہندوستان کے عروج میں ان لوگوں کا زوال لازمی تھا اور اب ہم لوگ ان سے جتنی دوری پر ہیں وہاں سے یہ لوگ کیسے نظر آتے ہیں؟ آج ان کی شبیہوں پر ماضی کی سیاہ دھند ہے، یا تمنا کی گلابی دھند ہے؟ یہ لوگ اپنے بارے میں کیا سوچتے تھے؟ وہ خود کو کیا سمجھتے تھے اور اپنے عہد کو کس روشنی میں دیکھتے تھے؟ کیا انھیں کچھ اندیشہ یا تصور تھا کہ ان کی تہذیب کی ردا اس طرح پارہ پارہ ہونے والی ہے کہ ان کا نظام اقدار جلتے ہوئے ملک کا گاڑھا دھواں بن کر سمندر میں تحلیل ہو جائے گا اور اس سے جو انقطاع پیدا ہوگا اس کی خلیج میں حافظے زائل ہو جائیں گے اور یادیں گم ہو جائیں گی؟

وسیم جعفر کو یقین نہ تھا کہ انھیں اپنے سوالوں کے جواب مل سکیں گے لیکن وہ اس بات کے بھی قائل نہ تھے کہ ماضی ایک اجنبی ملک ہے اور باہر سے آنے والے اس کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کہتے تھے کہ پرانے لفظوں کو نئے لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے، بس ہم آہنگی اور ہم آغوشی چاہئے۔

وسیم جعفر

[ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم، کی یادداشتوں سے]

جیسا کہ بیان ہوا، وسیم جعفر کا گھر لندن میں تھا۔ میری ان سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی، بلکہ پہلے سے کوئی ملاقات بھی نہ تھی۔ اور نہ میں لندن میں رہتا ہوں۔ میں نے گذشتہ سال مولانا حامد حسن قادری کے مکتوبات (مرتبہ خالد حسن قادری) میں وسیم جعفر کے دادا سلیم جعفر کے خاندانی حالات کے بارے میں بڑی دلچسپی سے پڑھا ضرور تھا اور قادری صاحب کے یہاں سلیم جعفر کا ذکر پڑھنے سے پہلے میں نے ان کی کئی تحریریں بھی دیکھی تھیں۔ میں انھیں دہلی یا لکھنو یا حیدرآباد کا کوئی باذوق مصنف خیال کرتا تھا، لیکن سلیم جعفر، یا ان کے اخلاف اب کہاں ہیں اور کہیں ہیں بھی یا نہیں، اس معاملے میں مجھے کوئی معلومات نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ سلیم جعفر بزرگ آدمی تھے، کہیں مرکھپ گئے ہوں گے۔ عام حالات میں تو یہ ہوتا کہ نواب مرزا خان داغ، اور ان کے حوالے سے ان کی والدہ وزیر بیگم، اور سلیم جعفر کے باہمی تعلق اور وزیر بیگم کی غیر معمولی زندگی کی بنا پر مجھے ان کے بارے میں کرید ہوتی اور میں سلیم جعفر کے اعقاب کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا۔ لیکن ان دنوں مجھے کچھ اور ہی دھن تھی۔

گذشتہ سال ایک شادی کے سلسلے میں مجھے لندن جانے کا موقع ملا۔ اپنے بارے میں کچھ زیادہ کہنے میں مجھے تکلف ہے، اور جو داستان اگلے صفحات پر مرتسم ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ لہٰذا اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میں پیشے کے لحاظ سے ماہر امراض چشم ہوں۔ شعر و شاعری کا کچھ شوق میں بھی رکھتا ہوں، لیکن اگر میں زمانۂ قدیم میں ہوتا تو مجھے نساب کہا جاتا، اس معنی میں کہ مجھے خاندانوں کے حالات معلوم کرنے، ان کے شجرے بنانے اور دور دور کے گھرانوں کی کڑیوں سے کڑیاں ملانے کا بے حد شوق

ہے اور اب اگر چہ میری عمر بہت زیادہ نہیں ہے، میں نے طب کا مشغلہ ترک کر دیا ہے، میرا زیادہ تر وقت شجرے بنانے اور بنائے ہوئے شجروں کو مزید وسیع اور پیچیدہ بنانے میں گذرتا ہے۔

میں نے اوپر اپنی ایک دھن کا ذکر کیا ہے۔ اسے دو دھنیں کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ جن دنوں مولانا حامد حسن قادری صاحب کے مکتوبات میری نظر سے گذرے تھے اسی زمانے میں مجھے گورکھ پور میں مقیم ایک پارسی خاندان بومن جی خدائی جی کا شجرہ دریافت اور تحریر کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے جد امجد جمشید آرین پور کو شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے زمانے میں انگریز سیاح ٹام کوری ایٹ (Tom Coryat) اپنی رہبری کے لئے علاقۂ سورت سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ کوری ایٹ نے یورپ اور ایشیا میں ہزاروں کوس پیدل سفر کیا تھا اور بالآخر جہانگیر کے دربار کے ساتھ آگرہ سے اجمیر ہوتا ہوا براہ سندھ ترکستان و چین کی طرف نکل گیا تھا۔ کوری ایٹ کو تو دربار جہانگیری سے کچھ نہ ملا، لیکن جمشید آرین پور کی کسی بات پر خوش ہو کر اسے وسادۂ خاقانی سے اودھ کے علاقۂ گورکھپور میں شراب اور جنگلاتی پیداوار، خصوصاً شہد اور بنسلوچن کی تجارت کرنے کا اجازت نامہ عطا کر دیا گیا تھا۔ مشہور تھا کہ زمانۂ حال کے تمباکو و شراب فروش بومن جی خدائی جی کا خاندان اسی جمشید آرین پور کے اخلاف میں تھا۔

ایک دوسری چیز جس کی مجھے اس وقت کرید تھی، اس کا تعلق خود میرے لوگوں سے تھا۔

یہ بات اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے صوفیا اور اہل اللہ میں سیدوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، لیکن کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ آل عبدالمطلب کے بعد صوفیاے ہند کی سب سے زیادہ تعداد آل خطاب سے ہے۔ اور یہ بات بھی صرف مورخوں کو معلوم ہے کہ سید، ترک، اور پٹھان حکمراں تو یہاں کثرت سے ہوئے ہیں، لیکن فاروقیوں کے صرف ایک خاندان نے ہندوستان کے کسی خطے میں فرماں روائی کی ہے۔ برہان پور کی فاروقی مملکت کی بنیاد ملک راجا فاروقی نے ۱۳۹۷ میں رکھی تھی اور اس کی اولاد نے دو صدیوں سے کچھ اوپر برہان پور اور خاندیس پر حکومت کی۔ بالآخر جلال الدین محمد اکبر کی ہوائے شمس اقبال اور جیش و اجلال نے ۱۶۰۱ میں اس گھرانے کا چراغ گل کر دیا۔

انتزاع سلطنت کے بعد برہان پور کے فاروقیوں کا ذکر تاریخ سے کچھ یوں فراموش ہو گیا گویا میدان جنگ کی گرد کے چھٹنے کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی آسمانی گہرائیوں میں تحلیل ہو گیا ہو۔ برہان پور کے فاروقیوں کی بات مجھے بالکل اتفاقی طور پر معلوم ہوئی اور تب سے مجھے یہ دھن (خیال خام کہیے) لگ گئی کہ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ زوال حکومت کے بعد برہانپور کے فاروقیوں پر کیا گذری۔ ہر چند کہ ہم

اعظم گڈھ کے فاروقیوں کا خاندان تو عام عقیدے کے مطابق ملک راجا کے بھی پہلے سے، یعنی فیروز تغلق کے آخری زمانے (۱۳۸۸) سے ان اطراف میں آباد تھا، لیکن کیا پتہ ہمارے اسلاف کا کچھ رشتہ برہان پوری فاروقیوں سے بھی رہا ہو، یا اکبر کے زمانے کے بعد بن گیا ہو۔

مجھے دونوں ہی منصوبوں میں کچھ کامیابی نہ ہوئی تھی، اور نہ ہی مجھے اس کا امکان ہی نظر آتا تھا، لیکن شادی میں شرکت کے لئے لندن جانے کو میں نے دراصل اپنی تلاش کو وسعت دینے کا بہانہ بنالیا اور شادی کی تقریبات کے دوسرے ہی دن سے میں نے انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈس (India Office Library and Records) میں ضروری کارروائی کے بعد اس کے دارالمطالعہ میں بیٹھنے، فہرستوں اور کتابیات، اور ان کے علاوہ اہم انگریز افسروں کے خاندانی کاغذات اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے کی سہولت کا انتظام کرلیا۔ نچلی منزل کے بڑے ہال میں ایک کونا، ایک کمپیوٹر، اور چھوٹا سا ڈیسک اور کتابوں کاغذوں کے لئے ایک چھوٹا سا کھلا ہوا شیلف بھی مجھے دے دیا گیا کہ وہاں اپنے دوران کار میں مجھے ضروری سہولتیں مہیا رہیں۔ انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈ اب برٹش میوزیم کا حصہ قرار دے دیئے گئے ہیں اور برٹش میوزیم سے لائبریری کو الگ کر کے اس جدید اکائی کو ''برٹش لائبریری'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

ایک زمانے میں برٹش میوزیم میں مالی تنگی بہت تھی۔ اب یہ تنگی ایک حد تک رفع ہو رہی ہے کیونکہ برنارڈ شا نے اپنی دولت خطیر کا بڑا حصہ برٹش میوزیم کو وقف کر دیا تھا۔ اس وقت برٹش میوزیم اور لائبریری ایک ہی شے تھے، لہٰذا برنارڈ شا کے وقف کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ لائبریری کے مصارف میں کام آتا تھا۔ لیکن جب انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈس کو برٹش لائبریری میں ضم کیا گیا تو برٹش میوزیم نے ایک نکتہ اٹھایا کہ برنارڈ شا کا ترکہ انڈیا آفس کے لئے تو تھا نہیں، لہٰذا اب یہ نوتشکیل برٹش لائبریری اس بات کا حق نہیں رکھتی کہ برنارڈ شا کی وراثت سے اسے کچھ ملے۔ آپسی جھگڑوں نے قانونی شکل اختیار کرلی اور برٹش لائبریری کا کٹھن سماں طویل تر ہوتا گیا۔ اب کچھ دن ہوئے معاملہ بحسن وخوبی طے ہوا ہے تو لائبریری کے دلدر کچھ دور ہوئے ہیں۔ پنسل، کاغذ، ٹیلیفون، کام کرنے کے لئے آرام دہ کرسیاں، آسانی سے سمجھ میں آجانے والے کمپیوٹر کیٹیلاگ، سب مہیا ہیں۔ پہلے یہ سب کچھ نہ تھا۔ دام بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ہاں اب بھی ہر چیز کے لئے انتظار بہت کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات پرانی دستاویزات اور خاندانی کاغذات، جن میں سے بعض کی حالت خاصی سقیم ہوتی ہے، انھیں ڈھونڈنے اور اندر سے نکلوانے میں دیر

اب بھی لگتی ہے۔

میں نے گریٹ ویسٹ رسل اسٹریٹ(Great West Russell Street) کی ایک میوز(Mews) میں ایک کمرہ لے لیا تھا جو میری ضرورتوں کے لئے کافی تھا۔ اطلاعاً عرض کردوں کہ Mews کسی محلے کا نام نہیں۔ اچھے مکانات یہاں شارع عام پر بالکل لب سڑک ہوتے ہیں۔ ایسے مکانوں کے پیچھے ایک تنگ سی گلی ہوتی ہے جن میں ان مکانوں کے گیرج (پہلے زمانے میں Carriage House) بنے ہوتے ہیں۔ انھیں Mews کہا جاتا ہے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے گاڑی خانے کو شاگرد پیشہ بنالیا تو جن گھروں میں شاگرد پیشہ کا انتظام گھر کے اندر ہی تھا، انھوں نے اپنے Mews کو گیرج بنالیا اور بعض نے انھیں نسبتاً کم قیمت پر نوجوانوں کے لئے ایک کمرے کا فلیٹ بنادیا۔ سنٹرل لندن کے علاقے میں یہ میوز بے انتہا مقبول اور قابل قدر اقامت گاہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ یہ میری بس خوش نصیبی تھی کہ مجھے ایک بہت اچھا میوز فلیٹ واجبی کرائے پر مل گیا تھا۔ برٹش لائبریری یہاں سے پیدل بمشکل بیس منٹ کا فاصلہ تھی۔ چاروں طرف کھانے اور چائے وغیرہ کی دوکانیں بھی افراط تھیں۔ ہندوستانی دکانیں تو کم تھیں لیکن گوا کا چکن بنڈآلو(Chicken Vindaloo)، پنجاب کا دم آلو، اور ''مغلئی گرلڈ چکن تکا'' وہاں بعض ریستورانوں میں مل جاتے تھے۔ میں نے انھیں دنوں مشہور معاصر انگریز نقاد اور ناول نگار پیٹر ایکرائڈ (Peter Ackroyd) کا ایک بیان پڑھا تھا کہ چکن بنڈآلو نے تو اب مچھلی اور آلو کے قتلے (Fish and chips) کو انگریزوں کے قومی کھانے کے درجے سے ہٹا کر ان کی جگہ خود لے لی ہے۔

برٹش لائبریری جاتے ہوئے مجھے دو ہی چار دن ہوئے تھے کہ مجھے وہ صاحب دکھائی دے گئے جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وی۔ اینڈ اے۔ کے شعبۂ مغل مصوری برائے انیسویں صدی، اور شعبۂ کمپنی مصوری کے بھی اسسٹنٹ کیپر ہیں۔ میں نے تو انھیں کچھ گھبرایا ہوا سا، جلدی میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا، اپنے خیالوں میں گم، دبلا پتلا کشیدہ قامت، نہایت گورے لیکن کجلائے ہوئے رنگ، بڑے بڑے سفید بالوں اور ہلکی سفید مونچھوں والا شخص دیکھا جو ہر موسم میں اونی ٹوپی اوڑھتا تھا۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں بریف کیس ہوتے۔ ایک میں تو کاغذات، قلم پنسل، ڈائری، یادداشتیں، ایک آدھ کتاب، ان کی چیک بک، پلاسٹک (یعنی کریڈٹ کارڈ وغیرہ)، وغیرہ ہوتے، لیکن دوسرے بریف کیس کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ شاید کچھ کھانے کا سامان رکھتے ہوں۔ لیکن کھانا تو وہ ہمیشہ ٹرافیلگر اسکویر (Trafalgar Square) کے پاس ایک یونانی ریستوراں میں کھاتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں دوائیں ہوں گی

کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ کچھ بیمار سے لگتے تھے۔

جب میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تو گمان کیا کہ یہ انگریزوں کے وقت کے کوئی پرانے مخطوطہ شناس، یا پرانی تحریروں کے پڑھنے میں ماہر کوئی منشی قسم کے ہندوستانی ہوں گے جو ملک کی آزادی کے بعد بھی برٹش میوزیم چھوڑ کر اس لئے واپس نہ گئے ہوں گے کہ گھر پر ان کا کوئی نہ تھا۔ وہ شیروانی پہنتے یا سوٹ، دونوں ہی ڈھیلے ڈھالے اور کچھ ملگجے رنگوں کے ہوتے تھے۔ کپڑا ہمیشہ قیمتی لیکن ذرا لاپروائی سے پہنا ہوا لگتا تھا۔ جوتے، ہیٹ، چھڑی، چھاتا، سب نہایت قیمتی اور فیشن کے مطابق، لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ پہننے والے کو اس باب میں کچھ اہتمام نہیں ہے کہ کپڑے شکن آلود نہ ہوں، صفائی اور محنت سے برش کئے گئے ہوں، ان پر کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ وہ گریٹ ویسٹ رسل اسٹریٹ (Great West Russell Street) پر برٹش لائبریری کے ایک بس اسٹاپ پہلے بس سے اترتے، نکڑ والے اخباری لڑکے (وہاں اخبار فروش کو Newsboy کہتے ہیں، چاہے وہ بوڑھا کیوں نہ ہو) سے انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون (International Herald Tribune) بین الاقوامی اخبار خریدتے اور اسے بغل میں داب کر برٹش میوزیم کی طرف پیدل چل دیتے۔

ایک دن بالکل اتفاق سے لفٹ میں میرا ان کا ساتھ ہو گیا تو میں نے انھیں ''سلام علیکم'' کہا۔ انھوں نے نہایت گرم جوشی سے جواب دیا، اگر چہ مجھے ان کی ضعیف العمری اور عام چال ڈھال کو دیکھتے ہوئے ان سے کسی گرم جوشی کی امید نہ تھی۔ آج میں نے انھیں غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان کا ڈھیلا ڈھالا سوٹ محض درزی کی، یا پہننے والے کی لاپروائی، یا بہت زیادہ عمر رسیدگی کے باعث نہ تھا۔ بلکہ اصل میں وہ خود بہت ہی دبلے تھے اور ان کے بدن کی جلد ان کی گردن، ہاتھوں، اور چہرے پر بے حد خشک اور سختی سے کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گویا اندر کا گوشت گل گیا ہو اور جلد کو ہڈیوں پر کسی نہ کسی طور مڑھ دیا گیا ہو اور اگر اسے ہاتھ سے چھوئیں گے تو کاغذ کی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے گی۔ چھڑی لئے ہوئے ان کے ہاتھ کی کلائی کسی بچے کی کلائی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے میر کا شعر یاد آیا۔

ترا ہے وہم کہ یہ ناتواں ہے جامے میں
وگرنہ میں نہیں اب اک خیال اپنا ہوں

میں ابھی انھیں خیالوں میں تھا کہ لفٹ رکی اور ہم دونوں ساتھ ہی باہر نکلے۔ سامنے سے گذرتی ہوئی سکریٹری لڑکیوں نے انتہائی خوش مزاجی سے ''گڈ مارننگ ڈاکٹر''، یا ''گڈ مارننگ وسیم''

وغیرہ کہا جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ صاحب یہاں بہت جانے پہچانے ہیں اور ان کا نام وسیم ہے، پورا نام وسیم احمد، وسیم اختر وغیرہ ہوگا۔ لفٹ سے نکل کر وہ کچھ مسکرا کر ''اچھا، سلام علیکم، انشاء اللہ پھر ملیں گے'' کہتے ہوئے دائیں طرف کی راہداری میں مڑ گئے۔ میں سامنے کے ہال میں اپنی مقررہ جگہ پر پہنچا تو مجھے دیکھ کر یک گونہ استعجاب اور بڑی مسرت ہوئی کہ کل شام جن کاغذات اور کتابوں کا طلب نامہ میں جمع کر گیا تھا، وہ سب کچھ میرے آنے کی پیش آمد میں میری شیلف پر رکھ دیئے گئے تھے۔ دستاویزیں زیادہ تر ۱۶۶۱ کے بعد کی تھیں جب ممبئی کے جزیرے کو پرتگالی حکومت نے انگریز کمپنی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ یہودی اور پارسی وہاں مدتوں سے آباد تھے اور ان کے بارے میں کچھ معلومات ممبئی کے بدھ بھکشوؤں اور تعلیمی اداروں کی یادداشتوں میں دستیاب تھے، لیکن ان میں تسلسل نہ تھا۔ سترہویں صدی کے اواخر میں انگریزوں نے ممبئی میں میونسپلٹی قائم کی اور اس کے بعد کی دستاویزیں اور کاغذات کم و بیش مسلسل بستوں یا بکسوں میں محفوظ تھے اور اچھی حالت میں تھے۔

میں اپنے کاغذوں کی چھان بین میں لگ گیا۔ لنچ میں کھاتا نہ تھا، اس لئے وقت کے گذرنے کا کچھ اندازہ اسی وقت ہوا جب میرے پاس کے مطالعہ کنندگان آہستہ اٹھ کر جگہ خالی کرنے لگے۔ میں بھی اٹھا تو مجھے خیال آیا کہ وسیم صاحب شاید ابھی موجود ہوں، ان سے ملنا ممکن ہوتا تو خوب تھا۔ اس لق و دق لائبریری میں ایک دو ہم صورت مل جائیں تو بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ شاید ابھی اندر ہی تھے، یا پہلے ہی اٹھ گئے تھے۔ خیر، کبھی اور سہی، میں نے اپنے دل میں خیال کیا۔ اگلے دن اتوار تھا، دریائے ٹیمز کے کنارے تھیٹروں کے سامنے پرانی کتابوں کا بازار لگے گا، وہاں اول وقت جاؤں گا تو کتابوں میں دن اچھا گذر جائے گا۔ شاید کوئی چیز میرے مطلب کی بھی مل جائے۔

اس اتوار کو پرانی کتابوں کے علاوہ پرانی مصوری کے نمونوں اور پرانے نقشوں کی بھی کچھ دکانیں وہاں نظر آئیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی نادر چیز یا کوئی اعلیٰ درجے کی تصویر بہم پہنچنا غیر ممکن تھا۔ بیش از بیش سامان پرانی تصویروں کی مطبوعہ نقلوں پر مشتمل تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے انگریزی رسالوں کے پھٹے پرانے مصور اوراق ضرور مل رہے تھے، اور بہت کم داموں پر مل رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے جنوری ۱۷۷۲ کی The Gentleman's Magazine کا ایک ورق صرف دس پونڈ میں مل گیا۔ ورق پر تاریخ اور رسالے کا نام صاف نظر آتا تھا۔ ورق پر دو جانوروں کی سفید سیاہ تصویریں تھیں۔ ایک کو

Giraffe بتایا گیا تھا اور دوسرے کو Chinese Antelope لکھا تھا۔ ہر چند کہ تصویریں بہت درست نہ تھیں لیکن ان کی طباعت اب بھی بہت روشن تھی اور کاغذ صرف ہلکا سا آب زدہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کہیں کسی کیلنڈر کی خالی ٹیوب مل جائے تو اس میں اس ورق کو لپیٹ لوں۔ پاس ہی میں ایک بڑے میاں پرانے نقشوں کا انبار لگائے بیٹھے تھے۔ میں ادھر مڑا تو ایک جانی پہچانی صورت دکھائی دی۔ یہ وسیم صاحب تھے اور ایک چھوٹے سے نقشے کو طرح طرح سے الٹ پلٹ کر گھما گھما کر روشنی کو پیچھے رکھ کر دیکھ رہے تھے۔

''سلام علیکم۔ جناب عالی،'' میں نے ان کے پاس جا کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''اچھی ملاقات ہوئی!''

انھوں نے عینک کے پیچھے سے مجھے گھورا۔ ان کے ماتھے پر شکنیں تھیں، شاید اس لئے کہ وہ اس نقشے کو غور سے دیکھ رہے تھے، یا شاید اس لئے کہ انھیں میرا مخل ہونا برا لگا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اصل بات یہ تھی کہ وہ مجھے بیک نظر پہچان نہ سکے تھے۔

''اخاہ، آپ ہیں! یہاں کیسے آنکلے؟... لیکن معاف کیجئے گا ابھی آپ سے تعارف تو ہوا ہی نہیں، کل آپ کو وہاں دیکھا ضرور تھا۔'' ان کی آواز گلو گرفتہ تھی، گویا حلق پر بہت سا بلغم جمع ہو۔ ان کی سانس بھی بہت چھچھلی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ سانس ان کے پیٹ میں سما نہ رہی تھی۔

''جی، معافی چاہتا ہوں یہ کوتاہی میری ہے۔ آپ کا اسم گرامی وسیم ہے اور آپ وی۔ اینڈ اے۔ میں...''

''جی ہاں، مجھے وسیم جعفر کہتے ہیں۔ وی۔ اینڈ اے۔ کی بات چھوڑیئے، اپنے بارے میں فرمایئے۔''

''جناب میرا نام خلیل اصغر فاروقی ہے، ماہر امراض چشم تھا، اب پریکٹس چھوڑ کر اپنے شوق کا کام کرتا ہوں۔''

''بہت خوب،'' وہ کھانستے ہوئے بولے۔ ''انسان اپنا شوق پورا کرے تو اس سے بڑھ کر کیا چاہیئے۔ فراغت ہو، اپنا شوق ہو، اور خوشگوار گھر کا خاموش گوشہ ہو، سبحان اللہ۔''

مجھے دفعتاً خیال آیا، وسیم جعفر...؟ لیکن مرزا داغ صاحب کی والدہ کے پرپوتے کا نام تو سلیم جعفر تھا۔ میں نے سوچا، پوچھ لوں، لیکن ہمت نہ پڑی۔ سلیم جعفر صاحب نے تو شاید اس پہلو کو مخفی ہی رکھنا

چاہا تھا، ورنہ اپنا نام کیوں بدلتے؟ لیکن نام کا بدلنا شاعرانہ مصلحت یعنی تخلص کے باعث بھی تو ہو سکتا ہے۔

مجھے خیال میں گم دیکھ کر وہ ہنس کر بولے: ''کیا بات ہے جو چپ ہو گئے، عمر خیام یاد آ گیا کیا؟ اچھا یہ بات تو رہی جاتی ہے کہ آپ کا شوق کیا ہے، یہ شوق رقیب سروساماں تو نہیں جو بے وطن ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں، یا کیا لندن ہی میں مستقل قیام ہے؟''

''میرا شوق... میرے شوق کو آپ نسابی کہہ سکتے ہیں اور...''

میری بات پوری ہونے کا انتظار کیے بغیر وہ بول اٹھے:

''بھئی واہ، نساب اور اس زمانے میں! کیا عمدہ بات ہے۔ آپ کو کیوں نہ مغتنم جانیں۔ آپ نے کچھ لکھا وکھا بھی ہے؟''

''لکھا تو ضرور ہے، لیکن میں مغتنم وغیرہ خاک نہیں، بس طالب علم ہوں۔ اور... (اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ صاحب سلیم جعفر کے بیٹے بھتیجے وغیرہ ہیں، ورنہ یہ بات بات میں اشعار کے اشارے، یہ نستعلیق گفتگو اور کہاں ممکن)... اور مغتنم روزگار تو آپ لوگ ہیں، سلیم جعفر صاحب کے نام سے میں خوب واقف ہوں۔''

''سبحان اللہ، آپ دادا جان کی تحریروں سے آشنا ہیں تب تو آپ اپنی گوں کے یار نکلے۔ میں تو ان کا پاسنگ بھی نہیں۔ لیکن باپ دادا کی تربیت نے کچھ حرف شناس کچھ نقش شناس کر دیا۔ خوب لوگ تھے وہ...'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ''رہے نام اللہ کا۔''

''اور وزیر خانم صاحبہ...؟'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ کس شان اور کس آن بان کی خاتون تھیں۔ بلکہ اس وقت تو میں بھی انھیں کے بارے میں کچھ چیزیں تلاش کر رہا ہوں۔''

''خوب، اور اس وقت جناب کے ہاتھ میں یہ نقشہ کیسا ہے؟''

''نقشہ،'' وہ خوش ہو کر ہنسے، لیکن پھر کھانسنے لگے۔ کھانسی نے ان کا چہرہ سرخ کر دیا، سانس بالکل تلپٹ ہو گئی۔ میں بے چارگی سے انھیں دیکھتا رہا۔ انھوں نے جیب سے دوا کی ٹیوب نکال کر گہری سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے دوا کی پھوار حلق میں ڈال کر ایک لمحے کو توقف کیا۔ پھر جب حال ذرا بہتر ہوا تو بولے۔ ''جناب یہ ممبئی کا نقشہ ہے، ۱۶۹۴ کا۔ ظاہر ہے کہ آج کا شہر کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے...''

''لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نقشے کی تاریخی اور دستاویزی اہمیت بہت ہے۔ اور حسن اتفاق

یہ کہ میری بھی دلچسپی اس وقت ایک ایسے معاملے سے ہے جس میں ممبئی کا بھی سلسلہ ہے۔''

''بھئی بہت خوب۔ تب تو یہ نقشہ خریدے لیتے ہیں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر انھوں نے بے تامل وہ چھوٹا سا نقشہ ایک سو ساٹھ پونڈ میں خرید لیا۔

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے پملکو (Pimlico) کی طرف چلے جہاں انھیں کسی سے ملنا تھا۔ راستے میں ہم دونوں نے اپنا مزید تعارف کرایا۔ نسابی کے باعث پرانی دستاویزوں اور کتابوں سے مجھے دلچسپی تھی اور مخطوطہ شناس، نقش شناس اور قدیمیات کے ماہر کی حیثیت سے پرانی کتابیں، دستاویزیں، تصویریں، ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ شعر بھی انھیں خوب یاد تھے، لیکن اقبال کے بعد کے کسی شاعر کو انھوں نے نہیں پڑھا تھا۔ ناول اور افسانے سے انھیں کوئی ذوق نہ تھا، ہاں قرۃ العین حیدر کے کئی بیانیے خاص کر ''کار جہاں دراز ہے'' انھوں نے پڑھے تھے اور انھیں اپنے کام میں ایک حد تک مفید مطلب جانتے تھے۔

پملکو پہنچ کر انھوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ ''اب میں بائیں گلی سے ہو کر اپنے دوست کے یہاں پہنچ جاؤں گا، آپ مزید زحمت نہ کریں۔ کل ملاقات ہوگی۔''

مجھے خوف تھا کہ کہیں کھانسی انھیں پھر نہ پریشان کرے لیکن انھوں نے مجھے ہی ہنسی میں اڑا دیا کہ آپ بھی خوب شے ہیں، ذرا سی کھانسی سے ڈرتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر مڑے ہی تھے کہ رکے اور بولے، ''آپ کو معلوم ہے عربی میں ''کھانسی'' کو کیا کہتے ہیں؟''

''جی، جی نہیں۔ میری عربی بس واجبی سی ہے۔''

'قحبہ''، وہ مسکرا کر بولے۔ میں ایک لمحے کو گڑبڑا گیا۔ کیا یہ کسی آنے جانے والی خاتون کی طرف اشارہ تو نہیں کر رہے ہیں؟

''جی؟ قحبہ، میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں۔''

انھوں نے ہنسنے کی کوشش کی، لیکن انھیں پھر کھانسی آگئی۔ وہ کچھ دیر کھانستے رہے، اس بار انھوں نے سینے کو دونوں ہاتھوں سے داب لیا تھا لیکن کھانسی تھی کہ آئے چلی جا رہی تھی۔ جب ان کی حالت میں ذرا اعتدال آیا تو بولے۔

''مجھے اس کھانسی پر ہی یاد آیا۔ قدیم عرب میں قحبائیں چونکہ اپنے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے ہلکے سے کھانستی اور کھنکھارتی تھیں، اس لئے انھیں بھی ''قحبہ'' کہا جانے لگا۔''

میں ہنسا، ''بڑی عجیب بات بتائی آپ نے۔ زبان بھی کیا شے ہے خدا کی قسم۔ امریکی انگریزی میں طوائف کو Hooker بھی کہتے ہیں۔ اس کی بھی شاید کچھ ایسی ہی تاریخی وجہ تسمیہ ہے۔ لیکن صاحب آپ اپنی کھانسی کا علاج کرڈالئے، اس عمر میں کوتاہی ٹھیک نہیں۔''

ان کے چہرے پر کچھ عجیب سا رنگ آیا۔ ''ہا آں، علاج تو کرتا ہوں۔'' پھر وہ کچھ مسکرا کر بولے۔ ''قحبہ تو قحبہ، جائے گی کہاں۔ اچھا خدا حافظ۔'' وہ گلی میں مڑ گئے۔

اگلے دن لائبریری میں مجھے انھوں نے خاص طور پر ڈھونڈا اور دن کا کھانا کھلانے کے لئے اپنے معمولہ یونانی ریستوراں میں لے گئے۔

''جانتے ہیں آپ، ورجینیا وولف (Virginia Woolf) بھی اسی ریستوراں میں دن کا کھانا کھاتی تھی۔ جب وہ برٹش میوزیم میں دیر تک کام کرتی تو ذرا سا کھانا یہیں آکر کھا لیتی تھی۔ اس نے اپنی کتاب A Room of One's Own میں اس کا ذکر کیا ہے۔''

وسیم جعفر کا دماغ اور بہت سی چیزوں کے علاوہ کسی بڑے عجائب گھر کے ان کمروں سے مشابہ تھا جن میں وہ اشیا رکھی جاتی ہیں جنھیں نمائش پر رکھنا کسی باعث ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کمروں میں ایک سے ایک عجیب، دور از کار، غیر متوقع اور نادر سامان بھرا ہوتا ہے۔ وسیم جعفر صاحب بھی ایسی ہی انوکھی معلومات کا خزانہ تھے۔ مجھے وہ اپنے خیال میں کچھ شرمیلا اور منھ چھپاؤ سمجھتے تھے۔ ایک دن رائل سوسائٹی کے سامنے سے گذرتے ہوئے انھوں نے مجھے بتایا کہ شرم اور گھر گھسنا پن اعلیٰ سائنسی یا ادبی کارناموں کا ضامن ہوسکتا ہے۔ مشہور سائنسداں ہنری کیونڈش (Henry Cavendish) اس قدر شرمیلا تھا کہ وہ کسی سے، حتیٰ کہ اپنے نوکروں سے بھی بات نہ کرسکتا تھا۔ اس کے گھر کی مغلانی ذرا ذرا سے معاملات میں احکام حاصل کرنے کے لئے اس سے دن رات رقعوں کے تبادلے کرتی تھی۔ مغلانی کے سوالوں کا جواب عموماً وہ ''ہاں''، ''نہیں''، ''جانے دو''، وغیرہ فقروں میں دیتا تھا۔ اس کے باوجود کیونڈش نے کئی سائنسی دریافتیں ایسی کیں جو اس کے عہد سے کئی دہائی، بلکہ ایک دو صدیاں آگے تھیں۔ کیونڈش نے گھر بیٹھے صرف ایک بھونڈی سی مشین، کاغذ قلم، اور ایک دو معمولی پیمانوں کی مدد سے زمین کا وزن دریافت کیا۔ اس کا نکالا ہوا نتیجہ آج کے نہایت باریک اور لطیف اوزاروں کی مدد سے متعین کئے ہوئے وزن سے بس ایک فی صدی سے کچھ کم ہے۔

''تو میاں خلیل، جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم کچھ عقلمندی کا مقولہ نہیں۔ ضرورت تو

دراصل خود سے شرم کرتے رہنے کی ہے۔ کل میں لارڈ لیک اور مہا راول بختاور سنگھ کے کاغذات اور مراسلت دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے بعض اچھے مصور بھی نوکر رکھے تھے۔ مجھے ان کی بنائی ہوئی تصویروں کی تلاش ہے۔'' انھیں بے طرح کھانسی آ گئی، یہاں تک کہ وہ سڑک کے کنارے ایک دوکان کی سیڑھی پر ذرا سمٹ کر بیٹھ گئے کہ کھانسی فرو ہو تو بات کو آگے بڑھائیں۔

ایسی بری کھانسی اور پھنسی ہوئی آواز اور تنفس کی تنگی تو کوئی اچھی علامتیں نہ تھیں۔ بات کو بدلنے کی غرض سے میں نے کہا:

''لیکن آپ نواب احمد بخش خاں اور وزیر خانم کے بارے میں بھی کچھ تلاش کر رہے تھے؟ جناب عالی، خود سے شرم کرنا تو ایک ادائے ناز ہے۔ وہ ہم لوگوں کو نصیب کہاں۔ یہ آپ وزیر خانم سے کہتے تو ایک بابت بھی تھی۔'' میں نے انھیں چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

انھیں دوبارہ ذرا سی کھانسی آئی، انھوں نے فوراً رومال سے منھ صاف کیا اور بولے: ''ہاں میاں، ہم ٹیوب ٹرین اور انٹرنیٹ کے زمانے کے لوگ ادائے ناز جیسی نازک شے کیا سمجھیں۔ لیکن جناب میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اپنے کو کرم کا احساس ہو...''

''واللہ یہ لفظ کو کرم آپ نے کہاں سے نکالا، اچھا خاصا انسان کتا معلوم ہونے لگے!''

''یہی تو اس لفظ کی خوبی ہے۔ وہ کس کی نظم تھی، آڈن کی نظم تھی نہ، The Dog Beneath the Skin...؟ تو پھر میں نے کیا جھوٹ کہا۔''

''جی ہاں عمیق حنفی صاحب مرحوم نے بھی ایک نظم میں لکھا ہے، ع میرے اندر بھونکتا کتا بند ھے۔''

''یہ عمیق حنفی صاحب کون تھے، ان کو تو میں جانتا نہیں، لیکن بات پتے کی کہی ہے انھوں نے۔ تو لیجیے کتنا کارآمد لفظ ہے۔ لیکن صاحب میں سچ کہتا ہوں اگر ہمیں اپنی برائیوں کا شعور ہو جائے...''

''تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہے۔'' میں نے بادشاہ بہادر شاہ کے شعر کا ایک ٹکڑا کچھ بدل کر پڑھ دیا۔

''نہ، نہ، نہ... ہرگز نہیں، یہ بات نہیں۔ برے تو ہم سب ہیں، لیکن ہم اپنی برائیوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ولیم فریزر کو لیجیے، بڑا ہندوستانی بنا پھرتا تھا لیکن شمس الدین احمد خان سے وزیر خانم کا عشق برداشت نہ کر سکا۔ شمس الدین احمد خان کی والدہ کے ساتھ ان کی سوتوں نے اچھا سلوک نہ کیا تو شمس الدین احمد

خان کے دل میں ان کے لئے اور ان کی اولادوں کے لئے نفرت امڈ آئی۔"

"اور وزیر خانم، آپ کی دادی جان؟"

"بڑی پیچیدہ مزاج خاتون تھیں، باہمت بھی تھیں۔ میں ان کی تصویر کی دھن میں ہوں کہ کہیں سے مل جائے تو شاید ان کا کردار کچھ اور سمجھ میں آئے۔ اس زمانے کے بعض ہندوستانی مصوروں نے شبیہ سازی میں کردار نگاری کے بھی ڈھنگ آزمانے شروع کر دیئے تھے۔"

پھر میری ان کی ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں۔ انھیں وزیر خانم، مارسٹن بلیک، نواب احمد بخش خان، میرزا فتح الملک بہادر وغیرہ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ مارسٹن بلیک کی موت کا حال انھوں نے مجھے بہت مفصل بتایا تھا۔ میں دیر تک تعجب کرتا رہا کہ انگریزوں کے خلاف اس زمانے میں بھی ایسے اقدامات اور "غدارانہ" واقعات ہو سکتے تھے۔ وسیم جعفر صاحب نے میری غلط فہمی رفع کی۔ انھوں نے بتایا کہ سنہ ۱۸۰۰ اور ۱۸۵۷ کے درمیان اہل ہند نے تین یا چار بار فرنگی حاکم کے خلاف خروج کیا تھا اور ہر بار انگریز کو خاصا جانی و مالی نقصان پہنچایا تھا۔ انھوں نے بریلی اور بنارس کے واقعات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بنارس میں تو شاہ عالم ثانی کے سب سے ہونہار بیٹے میرزا جہاندار شاہ نے انگریز پر گولی ہی چلا دی تھی اور انگریزوں کے خلاف خروج کی سربراہی کی تھی۔ ایک اور مغل شاہزادے میرزا جہانگیر بخت نے بھی کسی بدتمیزی کی بنا پر ایک انگریز افسر کو گولی مار دی تھی اور الہ آباد جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔

"سر سید کی بات میں کچھ صداقت تھی۔" وسیم جعفر نے کہا، "اپنے بجنور والے رسالے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں اس بات کا بہت غصہ تھا کہ فرنگی لوگ ہمارے ساتھ برابری کا سلوک تو دور رہا، انسانی سلوک بھی نہیں کرتے۔ اسی بات کو بڑے عجیب و غریب انداز میں سید محمود نے بنارس میں ۱۸۹۱ کی ایک تقریر میں کہا کہ انگریزوں کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ حاکم ہیں اور ہم رعایا۔ رعایا ہم دونوں ہیں۔ ملکۂ عالیہ ہماری حاکم ہیں، اور ان کی رعایا کی حیثیت سے ہم دونوں برابر ہیں، برابر کے حقوق و فرائض و مراعات رکھتے ہیں۔"

"اس زمانے کو دیکھتے ہوئے بڑی عجیب اور بڑی جرأت مندانہ بات تھی، بلکہ سید محمود کا یہ خیال ہی بالکل نیا تھا۔ مگر انگریزوں کا جواب کیا رہا؟"

"اجی انگریز ایک کائیاں قوم ہیں۔ وہ موقع یہ تھا کہ سر سید نے اپنے پرانے کلکٹر بجنور اور موجودہ کمشنر بنارس مسٹر شیکسپیئر کی دعوت کی تھی، شہر کے سارے رؤسا و عمائد جمع تھے۔ سید محمود کی تقریر کو اس

زمانے کے مذاق کے مطابق ایک خوش طبع After dinner speech کہہ کر ٹال دیا گیا۔ ویسے بھی کمشنر صاحب کرتے کیا؟ سید محمود کی تجویز کو حکومت کے سامنے پیش کر سکتے نہ تھے۔ اور اگر پیش کرتے بھی تو نوکری سے برخاست ہو جاتے۔"

وہ ہنسے، لیکن ان کی ہنسی پھر کھانسی میں تبدیل ہو گئی۔

ایک بار وسیم جعفر صاحب نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ پورٹو بیلو روڈ (Portobello Road) خود ہی ذرا خستہ حال علاقہ ہے، اس کی ایک سالخوردہ عمارت کی تیسری منزل پر ان کا گھر تھا۔ پرانی وضع کی تنگ سیڑھیاں تھیں، لفٹ تھی نہیں، خدا معلوم کس طرح چڑھتے اترتے ہوں گے۔ جب میں اندر داخل ہوا تو فوراً محسوس ہوا کہ ایسی غیر فیشن ایبل اور کم آرام دہ بستی کے ایسے معمولی گھر میں ان کے قیام کی وجہ یہ تھی کہ وہ زیادہ کرایہ نہ دے سکتے تھے، اور زیادہ کرائے کی عدم استطاعت کا باعث جز رسی نہیں، بلکہ نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا۔ دو کمروں کے گھر میں تصویریں، کتابیں، شیشہ آلات، مخطوطے، ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی تھا کہ پورٹو بیلو روڈ میں پرانی اشیا اور چھوٹے موٹے عجائبات کی کئی دکانیں ہیں۔ لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کا سامان انھیں وہاں وافر مقدار میں مہیا تھا۔ میں جس چیز کو اٹھاتا اسے اپنی طرز کی انوکھی ہی پاتا۔ میری حیرت اور شغف کو دیکھ کر وہ مسکرائے۔

"میں نے آپ کو ایک خاص مطلب سے زحمت دی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا کھانا نہ کھلوائیں گے آپ؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"کھانا... تو کھائیں گے، ضرور ہی کھائیں گے صاحب۔ لیکن یہ بتائیں آپ نے مولانا محمد حسین آزاد کا مدون کردہ دیوان ذوق پڑھا ہے؟"

"کہہ تو نہیں سکتا،" میں نے جواب دیا۔ "ذوق کا کلام تھوڑا بہت دیکھا ضرور ہے لیکن مولانا محمد حسین آزاد کا مرتب کیا ہوا دیوان ذوق تو... میں نے شاید اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اب تو بہت نادر ہو گیا ہوگا۔ مگر آپ اسے ہی کیوں پوچھتے ہیں...؟ تنویر احمد علوی والا نسخہ تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔"

"آپ نے اس کی شکل نہیں دیکھی تو اچھا ہی کیا۔" اچانک ان کا منہ تمتما گیا، جیسے بخار میں ہوں۔ میں نے انھیں ہمیشہ نہایت ٹھنڈے مزاج کا اور کسی بات کا زیادہ اثر نہ لینے والا پایا تھا۔ لیکن آج ان کا رنگ بظاہر بے سبب اور دفعتہً اس قدر برہم دیکھ کر میں کچھ گھبرا گیا۔ میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"چلئے پھر تو کوئی بات نہیں۔ میں تو ڈرا تھا کہ اگر میں نے وہ کتاب دیکھی ہوتی تو اس کی سزا میں آپ مجھے کھانا ہی نہ کھلاتے۔"

انھوں نے کچھ ضبط کرتے ہوئے کہا۔"نہیں یہ بات نہیں کہ اس کی وجہ سے کوئی بھوکا سوئے۔لیکن جس نے لکھی ہے اس نے ایمان وانصاف کا کچھ خیال نہ رکھا۔"

میں ذرا پریشانی میں پڑ گیا۔کتاب سے اگر ان کی مراد دیوان ذوق سے تھی تو اس کے مصنف کے بارے میں یہ خیال مولانا حالی یا سرسید کا تو ہوسکتا تھا کہ اس نے ایمان وانصاف کا کچھ خیال نہ رکھا، لیکن وہ تو ایک تاریخی اور تہذیبی شکست کی بات تھی۔سنہ ۵۷ کی جنگ آزادی میں لٹ پٹ کر ہمارے بزرگ اپنے بزرگوں کی ہر بات کو جو دُک ذنبٍ کہہ رہے تھے۔اب وہ بات تو تھی نہیں۔کیا مولوی نذیر احمد کی روح نے دوبارہ جنم لے لیا تھا؟ لیکن آج تک تو وسیم صاحب نے ایسی کسی رائے یا رویئے کا اظہار نہ کیا تھا... پھر آج کیا بات ہوگئی تھی؟

مجھے چپ دیکھ کر وسیم صاحب کا بھی مزاج ذرا ٹھنڈا ہوا۔"دیکھئے نہ، اس میں ایک جگہ مولانا نے کیسی غیر منصفانہ اور دل آزار بات لکھ دی۔"

"جی، میں نے اس کتاب کو پڑھا تو نہیں ہے... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا تو شیخ ابراہیم ذوق کے بے حد پرستار تھے۔ذوق کے خلاف انھوں نے بھلا غیر منصفانہ بات کیا لکھ دی ہوگی؟"

"تھے۔وہ ذوق کے پرستار تھے۔" وہ تیزی سے بولے۔"لیکن بہادر شاہ ظفر کے نہیں، نہ مرزا فتح الملک کے... اور نہ شوکت محل کے۔"

ان کا چہرہ پھر سرخ ہونے اور سانس پھر پھولنے لگی تھی۔میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کہوں کیا کروں۔شوکت محل کے نام سے میں واقف نہ تھا۔مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وسیم جعفر صاحب پر اس طرح کے دورے اکثر پڑتے تھے یا آج ہی یہ معاملہ تھا، اور یہ کہ ان کا ڈاکٹر یا نیشنل ہیلتھ سروس (National Health Service) کا اسپتال کہاں تھا، اس وقت ڈاکٹر کو بلانا ٹھیک ہے بھی کہ نہیں، میں کچھ سراسیمہ سا ہونے لگا۔میں وسیم جعفر صاحب کی صحت کے بارے میں کچھ جانتا نہ تھا، بیمار وہ ضرور لگتے تھے۔گھبراہٹ میں مجھے اور کچھ نہ سوجھی تو میں نے ریفریجریٹر سے بوتل نکال کر انھیں پانی پیش کیا اور کہا،"لیجئے پہلے پانی پی لیجئے، ذرا سانس تو برابر آئے۔پھر بات کریں گے۔"

انھوں نے پھنسی پھنسی آواز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ ایک دو گھونٹ پانی پی کر انھیں شاید کچھ سکون ہوا۔ وہ چپ بیٹھ گئے اگرچہ ان کے منھ پر اب بھی تھوڑی سی وحشت کے آثار تھے۔

پانچ سات منٹ یوں ہی گذرے۔ پھر انھوں نے گہری سانس لی، دونوں ہاتھوں سے منھ کو رگڑا، آنکھیں ملیں، گویا ابھی سو کر اٹھے ہوں۔ پھر وہ گلاس کا باقی پانی ایک سانس میں پی کر اپنی عام آواز میں بولے:

''خلیل اصغر، چوری کرنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں گڑبڑا کر کچھ الٹی سی کہنے ہی والا تھا کہ انھوں نے بات پوری کی، ''میرا مطلب یہ ہے کہ چوری کرنا آپ کی نظر میں کیسا ہے؟''

مجھے الجھن سی ہوئی، یہ کیا فضول گفتگو ہو رہی ہے۔ کھانے پر بلا کر عجب عجب طرح کی بے تکی اڑائی جا رہی ہے۔ پھر بھی میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا۔ ''جناب چوری کرنا تو پانچوں عیب شرعی میں شامل ہے، مگر کیا آپ کوئی اجتہاد کرنے والے ہیں؟ یا آپ کی کوئی چیز کھوئی گئی ہے؟''

ان کے چہرے پر بیزاری اور کبیدگی کے سے تاثرات ابھرے۔ شاید میری بات انھیں پسند نہ آئی تھی، یا شاید وہ بات ہی ناپسندیدہ تھی اور اسے میرے سامنے افشا کرنا انھیں بہت ناگوار تھا، لیکن افشا کیے بغیر بنتی بھی شاید نہ تھی۔

''دیکھیے،'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولے، جس طرح بچوں یا کم عقل لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ ''فرض کیجیے آپ کی کوئی چیز ہو، اور اسے اگلا چرا لایا ہو، تو آپ اس چیز کو واپس چرا لینے میں حق بجانب ہوں گے کہ نہیں؟''

''د... دیکھیے یہ معاملہ تو ف... ف... فرضی ہے،'' اچانک میری زبان میں ہکلاہٹ آ گئی۔ ''جسے انگریزی میں hypothetical کہتے ہیں۔ ایسی ای ای ب... بات پر میں کیا رائے دوں؟'' میں ڈر رہا تھا کہ میرے انکار پر انھیں پھر سے غصے، یا کھانسی، کا دورہ نہ پڑ جائے۔ لیکن ان کی بات ہی عجب بے ڈھب اور مگھم سی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کون سی بات کہوں جو انھیں ناگوار نہ ہو اور یہ بھی محسوس نہ ہو کہ میں ان کے ساتھ مربیانہ برتاؤ کر رہا ہوں یا انھیں بہلا رہا ہوں۔

وہ دوبارہ کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ پھر کچھ اس لہجے میں بولے گویا کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہیں:

''بتائیے برٹش لائبریری اور وی۔ اینڈ اے۔ میوزیم میں بہت سارا مال ہندوستانیوں کا ہے،

کہ نہیں؟''

''بے شک، ہندوستانیوں یا کسی انفرادی ہندوستانی کا بھلے ہی نہ ہو، لیکن اہل ہند کی ملکیت تو وہ بے شک ہے۔''

''خوب، اور یہی کیفیت اس مال کی بھی ہے جو دوسرے عجائب گھروں اور ذاتی حویلیوں، کوٹھیوں، بلنگھم پیلیس وغیرہ میں ہے؟''

''جی بے شک۔ لیکن اس سب میں سے کچھ تو مال کے اصل مالک نے موجودہ مالک کو تحفۃً بھی دیا ہوگا۔''

''بے شک،'' انھوں نے میری بات دہرائی لیکن اس میں کوئی طنز نہ تھا۔ ''میں اس سب مال کو چھوڑنے کو تیار ہوں جو برضا و رغبت اور تحفۃً دیا گیا ہوگا۔ لیکن خوشامد اور رشوت میں دیئے ہوئے مال، لوٹ کے مال، اور از روے جبر و استحصال قرق کیئے ہوئے مال کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟''

یہ بحث کہاں لئے جارہی تھی، اس کا دھندلا سا احساس مجھے تھا۔ لیکن اس طرف جانے کا مقصد میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے بہت سوچ کر کہا، ''اگر کسی ایسے مال کا حقیقی اور جائز وارث پیدا ہو جائے تو وہ اس کی واگذاشت کے لئے دعویٰ کرسکتا ہے۔''

''اور اگر دعویٰ منظور ہونے کی کوئی امید نہ ہو...؟''

''مگر عدالت ہی تو ایک راستہ ہے۔''

''کیوں؟ اور کوئی راستہ کیوں نہیں؟''

''بھلا کیا راستہ ہے، کیا وہ اسے زبردستی چھین لے؟ اور زبردستی چھیننا... یہ اس کے بس میں بھی ہے کہ نہیں؟''

''نہیں، چھیننے کی بات نہیں ہے۔''

''بھئی وسیم جعفر صاحب پہیلیاں نہ بجھایئے۔ میرا تو دم الٹا آرہا ہے۔''

مجھے ڈر تھا کہ جعفر صاحب پھر بگڑ جائیں گے۔ لیکن اس بار وہ ایک لمحہ چپ رہ کر بولے:

''آپ کو معلوم ہے وزیر خانم میری پردادی تھیں اور میں ان کے حالات تلاش کر رہا ہوں۔''

''جی ہاں۔ اور آپ کو تلاش ہے کہ ان کی کوئی تصویر آپ کو مل جائے۔''

''محمد حسین آزاد نے ایک تصویر کا ذکر کیا بھی ہے، اسی دیوان ذوق میں جس کا میں نے ابھی آپ سے تذکرہ کیا تھا۔''

''اچھا، بہت خوب۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔''

''مجھے وہ تصویر مل گئی ہے۔'' انھوں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

''ارے واللہ! میں اپنی جگہ سے تقریباً اچھل کر بولا۔'' تو یہ تو بڑی قیمتی تصویر ہوگی، تاریخی اعتبار سے بھی اور ادبی اعتبار سے بھی۔ واہ صاحب واہ۔ آپ نے تو بڑا گہرا ہاتھ مارا!''

''وزیر خانم کے واحد مرد وارث کی حیثیت سے میں اس تصویر کا قانونی مالک ہوں۔'' انھوں نے اپنی بھاری، کھانسی زدہ آواز میں کہا۔

''لیکن وہ تصویر ہے کہاں؟ کیا اس کا مالک آپ کے ہاتھ اسے بیچ دے گا؟''

''وہ بھلا کیوں بیچے گا؟ کیا عبد الحمید لاہوری کا ''پادشاہ نامہ'' انگریزوں نے واپس کیا؟ کیا کوہ نور ان لوگوں نے واپس کیا؟''

''لیکن وہ تو کروڑوں کی چیزیں ہیں، اور وہ بھی پونڈ میں، نہ کہ ہندوستانی روپیوں میں۔ یہ تو ایک تصویر ہے، وہ بھی کسی شہزادی یا ملکہ کی نہیں۔ بھلا ''پادشاہ نامہ'' اور کوہ نور کہاں اور یہ تصویر کہاں؟ یہ تصویر تو اس کا موجودہ مالک دے ہی دے گا، نہیں تو بھاری داموں میں آپ کے ہاتھ بیچنے پر ضرور راضی ہو جائے گا۔ ہے کہ نہیں؟''

''مانتا ہوں کہ یہ تصویر کوئی بڑا خزانہ نہیں، لیکن پھر بھی یہ قوم ایسی نہیں کہ ہاتھ آئی چیز کو جانے دے۔''

''یعنی وہ تصویر بھی انگریزی حکومت کے قبضے میں ہے اور آپ اس سے واپسی کی درخواست نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے؟''

''دونوں ہی باتیں ہیں۔''

''بھئی معاف کیجیے گا آپ چبا چبا کر کیوں بات کر رہے ہیں؟ صاف کہیے تو کچھ میں عرض بھی کر سکوں۔'' میں نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔

''آپ کے کیے کچھ نہ ہوگا۔'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔ ''بہر حال سنیے۔ آپ جانتے ہیں میں برٹش لائبریری میں چیزیں ڈھونڈا کرتا ہوں۔ ایک بار بالکل اتفاقاً مجھے لارڈ رابرٹس، وہی

Forty-one Years In Indiaوالا لارڈ رابرٹس(Lord Roberts) جس نے ایک موقعے پر زینت محل کے بارے میں گستاخانہ باتیں کہی ہیں، اس کی ڈائری کی خبر لگی کہ جس کے اندراجات سے اس نے اپنی کتاب میں بہت کام لیا تھا۔ میں نے سنا کہ وہ ڈائری ایبرڈین یونیورسٹی (Aberdeen University) کے کتب خانے میں ہے لیکن عام مطالعے کے لئے نہیں ہے۔ خیر میں نے اپنے تعلقات کو کام میں لا کر وہاں تک رسائی حاصل کر لی۔ میں نے ڈائری میں جگہ جگہ ایسی چیزیں پائیں جن کا ذکر رابرٹس نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے۔"

"یعنی لوٹ مار کے واقعات، یا انگریزوں کے مظالم؟" میں نے کہا۔

"وہ تو یقیناً، لیکن اس میں بادشاہ کے اور میرزا فتح الملک بہادر کے ذاتی کاغذات کا بھی ذکر تھا کہ قلعے کے کتب خانے اور دفاتر کی لوٹ میں سے کچھ چیزیں اس کے ہاتھ لگیں، جیسے میرزا فتح الملک بہادر کا ذاتی روزنامچہ۔ میں نے اس سے پہلے اس زمانے کے کسی معمولی شہزادے، کجا کہ ولی عہد سلطنت کے روزنامچے کا ذکر نہ سنا تھا۔ رابرٹس نے لکھا ہے کہ میں نے وہ سب کاغذات انڈیا آفس میں جمع کرا دیئے تھے۔"

"تعجب اور سخت تعجب ہے کہ آج تک کسی کو اس کا خیال نہ آیا۔ آپ کی دریافت تو بڑی اہم ثابت ہو سکتی ہے۔"

"جی۔ پھر میں نے برٹش لائبریری میں ہر جگہ ڈھونڈا، تمام ممکن فہرستیں، کیٹلاگ، اور سالانہ رپورٹیں دیکھیں، کچھ پتہ نہ لگا۔ میں امید کھو چکا تھا لیکن بس اتفاق ہی کہیئے کہ ایک دن ایک بڑے میاں مجھے مل گئے جنھیں انڈیا آفس کی نوکری سے سبک دوش ہوئے کوئی پچیس تیس برس گذر گئے ہیں۔ ان سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ ۱۸۵۷ کے بہت سے کاغذات جنھیں غیر اہم قرار دیا گیا تھا، وہ کتب خانے کی فہرست میں درج ہی نہ ہوئے تھے۔ انھیں بکسوں میں بند کر کے تہ خانے میں رکھوا دیا گیا تھا کہ کبھی فرصت اور وسائل ہوں گے تو انھیں کیٹلاگ کیا جائے گا لیکن وہ نوبت ہی نہ آئی۔"

"بھئی واہ۔ یہ تو بڑی عجب بات ہوئی۔"

"جی ہاں، خیر مزید تفصیل کو چھوڑتے ہوئے بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بہت تلاش کے بعد وہ سب بکس مجھے مل گئے۔ چمڑے کے سات بکس تھے، جیسے کہ اکثر جہازی استعمال کرتے ہیں اور ہر بکس کے مشمولات کی تفصیل بھی کاغذوں کے ساتھ بستے میں بندھی ہوئی تھی۔ ایک بکس میں بہت سی دستاویزوں

کے ساتھ میرزا فخرو مرحوم کا روزنامچہ بھی تھا...لیکن اس میں کچھ اور بھی تھا۔''

وسیم جعفر خاموش ہو گئے، جیسے آگے بتانا چاہتے نہ ہوں۔ اب مجھے بھی کرید ہوئی کہ وہ کیا چیز ہو سکتی تھی، بادشاہ کی وصیت، یا مرزا الٰہی بخش کی غداری کے بارے میں کوئی نئی بات، یا...وہ جو بات مشہور ہے کہ دہلی کے قلعے سے لے کر آگرے کے قلعے تک سرنگ تھی، اس کا کچھ ثبوت، یا...یا گڑا ہوا خزانہ، بھلا کیا شے ہو سکتی تھی؟

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی؟'' میں نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

''جاننا کیا معنی، میں وہ چیز آپ کو دکھائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اپنا بریف کیس کھول کر انھوں نے ایک مضبوط، بڑا سا لفافہ میری طرف بڑھایا۔ ان کے ہاتھ میں خفیف سی لرزش تھی۔ لفافہ مہر بند نہ تھا، لہٰذا میں نے اس کا فلیپ کھول کر اس کے اندر رکھا ہوا کوئی چھ انچ اونچا اور پانچ انچ چوڑا موٹا کاغذ نکال لیا۔

کسی انتہائی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کی عمر یہی چوبیس چھبیس سال کی رہی ہوگی۔ سانولا رنگ، لیکن اس قدر تر و تازہ چہرہ گویا کسی نے سوسن کے پھول کا جوہر نچوڑ کر رکھ دیا ہو۔ سیدھی، نازک سی ناک، لیکن دونوں نتھنے ذرا پھڑکتے ہوئے سے، جیسے اس نے کوئی اچھی بات سنی ہو یا کوئی اچھی بات کہنے والی ہو۔ کوئی ڈیڑھ دو سو برس پرانی تصویر دو چشمی تھی لیکن اس زمانے کی عام تصویروں سے برخلاف صاحب تصویر کو یوں دکھایا گیا تھا گویا وہ مصور، اور تماشائی، دونوں کے وجود کا پورا احساس رکھتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں جنس اور شباب کا ایسا بھرپور شعور تھا کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا یہ تصویر اپنی آنکھ یا ابرو سے مجھے کوئی اشارہ کرنے والی ہے۔ لیکن اس اشارے میں کوئی رکاکت یا سوقیانہ پن نہ تھا، بلکہ ایک طرح کی چنوتی تھی، کہ کیا تم اس فتنہ سامانی سے عہدہ برآ ہونے کا دل رکھتے ہو؟ سڈول چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، ان پر لمبی لمبی پلکیں، لیکن سایہ فگن نہیں، چلمن کی طرح کچھ اٹھی ہوئی۔ آنکھوں کا رنگ شربتی، گہرا اور ہلکی سی سنہری دمک لئے ہوئے، اور سفیدی ایسی سفید اور اس میں ہلکی سی ٹھنڈک کی ایسی کیفیت جیسے تازہ کھلا ہوا گل مشکی۔ آہو کی سی لمبی سڈول گردن میں مالائے زمرد، نولڑوں کا، لیکن سب دانے برابر کے اور ہم رنگ و ہم شکل تھے۔ گلے کے نیچے تک وادی شانہ میں چنے کی دال کے برابر زمرد ہی زمرد تھے جن کی سبزی آنکھوں میں ہری دوب کی طرح کھبی جاتی تھی۔ آنچل سر پر نہ تھا، اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ صاحب تصویر کو آنچل کے ڈھلک جانے کا علم ہے۔ سنہرے بادلے سے پٹا ہوا آسمانی دوپٹہ

شانے اور سینے کو بے پروائی سے کچھ ڈھک رہا تھا کچھ نمایاں کر رہا تھا۔ بہت گھنی چوٹی، تھوڑی سی کھلتی ہوئی، ہر لٹ میں ایک دو موتی ٹکے ہوئے، گویا بے خیالی میں وہاں الجھ گئے ہوں۔

لیکن افسوس کہ تصویر ادھوری تھی، لیکن اس لئے نہیں کہ مصور نے اسے نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ کسی بے درد نے اسے اس طرح پھاڑ ڈالا تھا کہ تہائی سے کچھ زیادہ تصویر ضائع ہو گئی تھی۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا:

''یہ... یہ تصویر... وزیر خانم کی تو نہیں؟ اسے پھاڑ کس نے ڈالا؟'' میں نے وفورِ وحشت میں یہ بھی نہ محسوس کیا کہ میرا دوسرا سوال کس قدر احمقانہ ہے۔

وسیم جعفر نے کہا، ''اس کی پشت پر ایک تحریر ہے۔ پڑھئے۔'' ان کے چہرے پر کچھ سیاہی مائل تپش تھی، بیماروں جیسی۔ ان کی آواز میں اب اور زیادہ لرزش تھی۔

میں نے کاغذ پلٹا تو دیکھا کہ اس پر خط شکستہ میں تحریر تھی، مٹی مٹی سی۔ شاید کبھی کسی نے اسے پانی سے دھونے کی کوشش بھی کی تھی۔ سیاہ روشنائی آنسو بھرے کاجل کی طرح پھیل گئی تھی، حرف بہت جلی نہ تھے، لیکن مجھے پرانے شجرے اور دستاویزیں پڑھنے کی جو مشق تھی وہ کام آئی۔ ذرا سی کوشش کر کے میں نے پڑھ لیا: ''شبیہ حقیقی وزیر خانم صاحب عرف چھوٹی بیگم، سلمہا اللہ تعالیٰ''۔ اس کے آگے کچھ تاریخ تھی لیکن وہ کوشش کے باوجود مجھ سے پڑھی نہ جا سکی۔

''مبارک ہو، وسیم جعفر صاحب، آپ کی تلاش کامیاب ہوئی،'' میں نے بڑے جوش سے کہا۔

''لیکن... لیکن یہ تصویر... یہ تصویر کیا انھیں بکسوں میں ملی جن کا ذکر آپ فرما رہے تھے؟ اگر ایسا ہے تو... تو آپ اسے لائبریری سے نکال کیونکر لائے؟''

''جی ہاں۔'' انھوں نے ''جی'' پر زور دے کر کہا۔ ''میں اسے نکال لایا۔ اور اب یہ میری ہے۔'' ان کے لہجے میں مبارز طلبی تھی، گویا مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ ہمت ہو تو میری شکایت کر دو، یہ تصویر مجھ سے چھنوا لو۔

''مگر... مگر بھلا کیسے یہ ممکن ہو سکا، یہ تو بتائیں۔'' میں نے حلیمی سے کہا۔ میں انھیں خفا نہ کرنا چاہتا تھا، اور یوں بھی مجھے اس معاملے میں کوئی داروغۂ اخلاق بننے کا شوق تو تھا نہیں۔ تصویر پر اصل حق تو وسیم جعفر ہی کا تھا، قانون کچھ کہے۔

''بات یہ ہے خلیل اصغر صاحب،'' انھوں نے کچھ رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''اس تصویر کا کہیں

اندراج نہیں ہے۔ آپ کو میں بتا ہی چکا ہوں کہ ان بکسوں کا کیٹلاگ اب تک نہیں بنا ہے، صرف کچی فہرست ہر بکس کے اندر رکھی ہوئی ہے، لیکن یہ تصویر اس فہرست میں بھی درج نہیں۔ ہر فہرست کی نقل لائبریری کے ڈائرکٹر کے قبضے میں مہر بند بھی رکھی ہوئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ فہرست بھی اس تصویر کے ذکر سے خالی ہوگی۔''

وہ کچھ دیر کو چپ ہو گئے، میں ڈر کے مارے کچھ نہ بولا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں۔ پھر وسیم صاحب نے کچھ اور بھی آہستہ لہجے میں کہنا شروع کیا:

''دراصل یہ تصویر میرزا فخرو صاحب کے روزنامچے میں دو ورقوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی، اسی حالت میں جیسی آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ میں شاید پہلا شخص ہوں جس نے اس روزنامچے کے سارے ورق کھول کر دیکھے ہیں۔ جب یہ تصویر مجھے ملی تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ وزیر خانم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ لیکن میں اور وزیر خانم کی تصویر! ایسا میرا نصیبہ کہاں؟''

وہ پھر چپ ہو گئے۔ میں بھی اسی طرح خاموش رہا۔ اس وقت ان کا عالم ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے بیچ میں بولنے کی کچھ بات سوجھتی نہ تھی۔

''بڑی دیر تک تو میں نے کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی ہمت ہی نہ کی۔ خدا معلوم یہ تصویر ان کی نہ ہو، کسی اور کی ہو۔'' بالآخر انھوں نے سلسلۂ کلام پھر جاری کیا۔ ''پھر میں نے آنکھیں بند کر کے اس کاغذ کو کئی بار الٹا پلٹا، اور پھر آنکھیں کھول دیں... وہ عبارت آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ اب آگے کیا کہوں۔ تصویر کو میں نے بے سوچے سمجھے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ آپ جانتے ہی ہیں لائبریری میں بریف کیس، بیگ، پیکٹ، کچھ بھی لے جانا ممنوع ہے۔ سردیوں کے اوورکوٹ تو رواج اور قاعدے کے مطابق اتار کر کلوک روم میں جمع کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصویر چھوٹی سی ہے، اور مجھ پر کوئی شک بھی نہ کر سکتا تھا۔ بس میں نے اتنا کیا کہ اس دن اور کچھ کام نہ کیا، سب کاغذات سمیٹ کر لائبریری کے عملے کو واپس کیے اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے چلتا ہوا لائبریری کے باہر ہو گیا۔''

''حق بہ حقدار رسید۔'' میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

انھوں نے مجھے غور سے دیکھا، گویا انھیں شک ہو کہ میں ان کا تمسخر کر رہا ہوں۔

''کیا واقعی؟ کیا واقعی آپ کا یہی خیال ہے؟'' وہ ذرا تیز لہجے میں بولے۔

چونکہ مجھے اپنے دل میں پوری طرح اطمینان تھا کہ اخلاقی طور پر اس تصویر کے مالک وہی

تھے، میں نے ذرا جوش سے جواب دیا:

''جی بالکل۔ مجھے اس میں کوئی شک ہی نہیں۔ خدا مبارک کرے۔''

انھوں نے دوبارہ مجھے غور سے دیکھا، لیکن اس بار انداز یہ تھا کہ مجھے متنبہ کر رہے ہوں کہ انھیں میری رائے کی چنداں پروا نہیں۔ تصویر تو انھیں کی تھی اور انھیں کی رہے گی۔

''اچھا اب لیجیے، دیوان ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد ملاحظہ کیجیے۔'' انھوں نے ایک پرانی سی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے اب بھوک لگ رہی تھی اور تصویر کی دریافت اور صاحب تصویر کی کرشمہ جاتی شخصیت نے میرے حواس بھی کچھ زائل کر رکھے تھے۔ ایک لمحے کے لئے میں نے احمقوں کی طرح منھ پھاڑ کر انھیں دیکھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ انھوں نے ابھی کچھ پہلے بھی دیوان ذوق اور وزیر خانم کی تصویر کا ذکر کیا تھا۔ میں ہاتھ بڑھا کر کتاب ان سے لے لینے کے لئے اٹھا تو انھوں نے کہا:

''صفحہ ۱۴ ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے وہاں ورق نشان رکھ دیا ہے۔''

میں نے وہ صفحہ کھولا اور بڑھتی ہوئی نفرت، کراہیت اور استعجاب کے ساتھ یہ عبارت پڑھی:

> شہر میں چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحب جمال اپنے ہنر میں باکمال تھیں۔ عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی اور کتنے ہی امیروں کو مار کر ہضم کر چکی تھیں۔ اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چنتی تھیں۔ مرزا فخرو کی ۲۴۔۲۵ برس کی عمر تھی۔ رنڈی کو نوکر رکھ کر غلام ہو گئے۔ مرزا نے ایک تصویر صندوقچے سے نکالی، اسے دیکھا اور کہا کہ استاد اسے ذرا دیکھئے۔ استاد سمجھ گئے کہ اسی کی تصویر ہے۔ دیکھ کر کہا، بہت خوب۔ مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی۔ پھر کہا دیکھئے تو سہی۔ اگر واقعی معشوق ہو تو کیسا ہو۔ استاد سمجھے کہ دل آیا ہوا ہے۔ چاہتا ہے میں بھی بڑھیا کی تعریف کروں۔ پھر بھی اتنا کہا کہ خوب! بہت خوب! ان سے پھر بھی رہا نہ گیا۔ تیسری دفعہ تصویر ہاتھ میں دی اور کہا بھلا استاد اس حسن میں کچھ نقص تو بتایئے۔ استاد نے دیکھا اور کہا ذرا چھاتیاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ استاد خود فرماتے تھے کہ میں نہ کہتا۔ مگر دل نے کہا لڑکا ہے اور ایک بیسوا کے دام میں پھنس گیا ہے۔ کہہ تو دو۔ شاید سمجھ جائے۔

میرے جی میں آئی، ورق کو کتاب سے چیر کر مٹھی میں مسل ڈالوں اور اسے غسل خانے کے فلش میں بہا دوں۔ لیکن ظاہر ہے یہ بے وقوفی اور بدمذاقی ہوتی۔

''میں ماننے کو تیار نہیں۔ مغل شاہزادہ، وہ بھی ولی عہد، ہزار گئی گذری حالت پر بھی اس قدر بے حیا نہیں ہو سکتا۔'' میں نے گرم لہجے میں کہا۔ ''بادشاہوں کی غیرت یہ بات گوارا ہی نہ کر سکتی تھی کہ ان کی عورتوں کو کوئی نامحرم شہزادہ بھی دیکھ لے، کجا کہ ایک معمولی ملازم، چاہے وہ شاعری میں ان کا استاد ہی کیوں نہ ہو۔ اور پھر متانت اور تمکین بھی کوئی شے ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مولانا نے داغ یا مرزا فخرو سے کوئی دشمنی نکالی ہے۔''

''میں اس کو خارج از امکان نہیں قرار دیتا، خاص کر جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ واقعہ یا لطیفہ بالکل بے محل اور بے موقع درج کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر ولی عہد نے دلالوں کی طرح وہ تصویر دکھا کر صاحب تصویر کے حسن کی داد چاہی بھی تو شیخ ذوق کی یہ ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسا رکیک اور سوقیانہ جواب دیں۔''

''لیکن مولانا کو پرخاش کیوں ہوگی، بھلا کوئی بات بھی تو ہو۔''

''پتہ نہیں۔'' وسیم جعفر نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ نے شاید غور کیا ہو مولانا نے بادشاہ اور اصحاب حویلی کے خلاف اور بھی کئی باتیں کئی جگہ لکھی ہیں۔ شاید اس زمانے کی تاریخ نگاری کا فیشن یہی رہا ہو۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ حویلی والے سب تھے ہی ایسے زوال آمادہ اور بے غیرت کہ ان کی تاراجی ہی بہتر تھی۔''

''ہاں پھر تو فیشن ہی بن گیا۔ نیاز صاحب نے داغ صاحب کے بارے میں جو لکھا سو لکھا لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی ارباب قلعہ کے ساتھ پوری طرح انصاف نہ کیا۔''

''خیر، پھر بھی ان کا انداز غنیمت تھا۔ یہاں مولانا کو دیکھئے، میرزا فخرو بہادر کو ''لڑکا'' بنا رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ان کی عمر ۲۴ یا ۲۵ کی ہوگی اور وزیر خانم ''بڑھیا'' تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرزا فتح الملک بہادر اور وزیر خانم کی عمریں برابر ہی برابر رہی ہوں گی۔ شاہزادہ ۱۸۱۱ میں پیدا ہوا تھا اور وزیر خانم کی بھی پیدائش کچھ اسی زمانے کی ہے، ممکن ہے وہ شاہزادے سے چار چھ مہینے چھوٹی ہی رہی ہوں۔''

''بہر حال۔ چلئے اب یہ تصویر تو آپ کے قبضے میں آگئی۔ یہ بڑی کامیابی ہے لیکن افسوس کہ آپ اس کے بارے میں کچھ لکھ نہیں سکتے۔''

''کیوں نہیں لکھ سکتا؟ میں کبھی نہ کبھی اس موضوع پر کچھ لکھوں گا ضرور۔ آپ دیکھئے گا۔''

اس گفتگو کے کچھ دن بعد میں ہندوستان واپس آ گیا۔ وسیم جعفر کے علی الرغم مجھے اپنے مقصد میں کچھ بھی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ برہان پور کے فاروقی اور گورکھ پور کے خدائی جی دونوں ہی اپنی کہانی مجھ

پر منکشف کرنے سے گریزاں رہے۔ اس ناکامی اور مایوسی کو تو میں نے کم و بیش بھلا ہی دیا لیکن وزیر خانم کی تصویر کو میں نہ بھول سکا۔ مجھے افسوس رہا کہ میں مورخ یا ناول نگار ہوتا تو محبت، فن، اور زندگی کی تلاش کی داستان میں ضرور لکھتا۔

کوئی تین چار مہینے اور گذرے تھے جب مجھے مارٹن اینڈ مارٹن (Martin and Martin) نام کی ایک قانونی فرم کے پارٹنر مسٹر ڈگلس ایبر نتھی (Douglas Abernethy) کے خط کے ساتھ ایک لفافہ، اور کوئی پچاس اوراق پر مشتمل ایک پیکٹ ملا۔ خط کا مضمون یہ تھا :

ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے رنج ہے کہ ہمارے ایک قدیمی موکل ڈاکٹر وسیم جعفر، پی۔ ایچ۔ ڈی۔، ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس۔، وغیرہ، ساکن ۱۴ / ۴۲، پورٹو بیلو روڈ، لندن، کا گذشتہ ۱۹ ستمبر کو لندن میں انتقال ہو گیا۔ انھیں پھیپھڑوں کا سرطان تھا۔ مرض کا مقابلہ انھوں نے آخری وقت تک نہایت پامردی سے کیا، لیکن سرطان آہستہ آہستہ ان کے سارے بدن میں سرایت کر گیا تھا۔ موصوف نے اپنے وصیت نامے میں ہدایت کی تھی کہ منسلک کاغذات اور سربہ مہر لفافہ ان کی وفات کے بعد آپ کی خدمت میں ارسال کر دیے جائیں۔ موتی کی ہدایت یہ بھی تھی کہ اگر آپ منسلک کاغذات پر مبنی کوئی تاریخ مرتب کرنا چاہیں تو تحقیق اور دیگر اخراجات کے لئے ان کے ترکے سے ایک ہزار پونڈ کی رقم آپ کو پیش کر دی جائے۔ علاوہ ازیں، ڈاکٹر جعفر کی تمام کتابیں اور کاغذات برٹش لائبریری میں محفوظ ہیں اور ان کی وصیت کے مطابق ان میں سے کسی بھی کاغذ یا کتاب کی نقل آپ کو موصوف کی جائداد کے خرچ پر مہیا کی جا سکے گی اگر آپ کو ان میں کسی کی ضرورت اپنی تصنیف کے لئے محسوس ہو۔ براہ کرم اس خط اور منسلک کاغذات کی رسید سے مطلع فرمائیں، شکریہ۔

ہم ہیں آپ کے صادق،

برائے مارٹن اینڈ مارٹن

ڈگلس ایبر نتھی، جونیئر پارٹنر

پیکٹ کو میں نے الگ رکھ کر لفافے کو کھولا۔ اس میں وزیر خانم کی تصویر تھی، ایک کونے میں وسیم جعفر نے باریک لیکن روشن حروف میں اپنے دستخط ثبت کر کے تاریخ بھی درج کر دی تھی۔

کتاب

[ڈاکٹر وسیم جعفر کی تحریرات پر مبنی]

چھوٹی سی کتاب تھی، بالکل جیسے صفیر بلگرامی کی ''رشحات صفیر''۔ نام کے اعتبار سے تو ''رشحات صفیر'' مجموعۂ اشعار لگتی ہے، لیکن ہے یہ دراصل تذکیر و تانیث کا لغت۔ اردو میں تذکیر و تانیث کے انتشار کے باوجود صفیر نے اس کتاب میں اردو مذکر مونث کے قاعدے بھی بیان کرنے یا وضع کرنے کا جوکھم اٹھایا تھا۔ کتاب اس اعتبار سے ناکام رہی تو کیا ہوا، اور ہر طرح سے تو کارآمد تھی۔ ''رشحات صفیر'' مطبع نورالانوار، آرہ سے ۱۸۷۶ میں چھپی تھی، پھر کبھی نہ چھپی اور اس کے نسخے اب اس قدر کمیاب تھے کہ النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے تھے۔ میں اس سے بہت کام نہیں لیتا لیکن اسے عزیز بہت رکھتا ہوں۔ دو ڈھائی سو صفحے، گدلا کاغذ، گندی چھپائی لیکن جلی اور روشن کتابت۔ بہت موٹی دفتی کی جلد جس پر چمڑا مڑھا ہوا۔ پچھلے مالک نے کتاب کو شاید احتیاط سے نہ رکھا تھا۔ دفتی دونوں طرف ٹیڑھی ہو گئی تھی، جلد کی سنہری جدول اتنی دھندلی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ چمڑا جہاں جہاں سے سوکھ کر ترخ گیا تھا، بادامی گتہ اس کے نیچے صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں جب بھی کوئی لفظ دیکھنے کے لئے ''رشحات صفیر'' کھولتا تو چمڑے پر ہلکی سی کریم یا زیتون کا تیل ضرور پھیر دیتا، کہ چمڑا کچھ نرم ہو جائے اور اس میں مزید دراریں نہ پڑیں۔ یورپ اور امریکہ والے ایسے کاموں کے لئے برفانی لومڑی (Mink) کے تیل کی بنی گاڑھی پالش استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بے گناہ جانوروں کی جان لے کر اپنا الو سیدھا کرنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہاں اگر کوئی دوسرا چارہ ہی نہ ہو تو اور بات ہے۔

گتے کی خاکی اور چمڑے کی کتھئی بھوری رنگت اب تطاول ایام اور میری ہلکی روغن آمیزیوں

کے باعث کچھ سیاہ پڑ گئی تھی۔ اس سبب سے وہ کتاب، میرا مطلب ہے "رشحاتِ صفیر"، کچھ اور بھی پرانی لگنے لگی تھی۔

مگر یہ کتاب تھی کیا، اور کس کی تھی، کون اسے لا کر میرے پلنگ پر رکھ گیا تھا، یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں نے اسے چھوا تو گرم گرم سی لگی، جیسے ابھی ابھی کسی نے دھوپ یا آگ کے پاس سے اٹھا لی ہو۔ میں نے اسے کھولنا چاہا تو کچھ رکاوٹ کا سا دھوکا ہوا، گویا دفتی کی جلد نیچے کے کاغذوں کے ساتھ چپک کر رہ گئی ہو۔ جلد پر کوئی نام تھا نہیں، اور پشتہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن نہ بھی ٹوٹا ہوتا تو یہ صاف ظاہر تھا کہ اس پر مصنف، یا مالک، یا تصنیف کے بارے میں کچھ نہ لکھا تھا۔ یہ کتاب مخطوطہ ہے کہ مطبوعہ؟ عمر کے لحاظ سے تو بہت قدیم نہ معلوم ہوتی تھی، رہی ہوگی یہی کوئی سوا ڈیڑھ سو برس کی۔ لیکن اتنی عمر کی بھی کتاب قیمتی، بلکہ بے حد قیمتی ہو سکتی تھی۔ کہیں کوئی بالکل نایاب شے نہ ہو۔ مثلاً میر کے مکاتیب، یا بہادر شاہ ظفر کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان؟ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ لیکن زور لگا کر کتاب کو کھولوں اور ورق واقعی باہم چپکے ہوئے ہیں تو سب ضائع ہو جائے گا۔ تو پھر کیا؟ میں نے کچھ جھنجھلاہٹ اور کچھ بے صبری سے اپنے دل میں کہا۔ ضائع ہو جائے کم بخت ضائع ہو جائے۔ اب بھی یہ میرے یا کسی کے کون کام کی ہے۔ نہ کھلے گی تو بند ہی تو رہے گی۔

میں نے اس بار ذرا زور سے کتاب پر ہاتھ مارا... ہلکی سی حرارت ویسی ہی تھی۔ حرارت؟ یہ کیا فضول اوہام ہیں؟ حرارت کا لفظ تو عام طور پر ہلکے جسمانی بخار کے لئے انسانوں کی ضمن میں برتتے ہیں۔ یہ کتاب اگر کہیں سے گرم گرم آئی بھی ہوگی... (کیا مطلب؟ گرم گرم آئی ہوگی کا کیا مطلب؟ کیا یہ کتاب نہیں کباب ہے؟) تو بھی اب تک تو ٹھنڈی ہو چکی ہوگی۔ آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر کیا خبر اس مقام تک آتے آتے کس کس نے اس کتاب کو پڑھا اور برتا ہے۔ اور کیا ضرور ہے کہ اردو ہی کی کتاب ہو؟ فارسی عربی عبرانی کچھ ہو سکتی ہے۔ ہاں انگریزی سنسکرت تو ہے نہیں کہ وہ بائیں طرف سے کھلتی... لیکن جب تک کھلے نہ مجھے کیسے معلوم ہو یہ کتاب بائیں سے کھلتی ہے کہ دائیں سے کھلتی ہے۔

میں نے ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے کتاب کو کہیں بیچ سے کھولنا چاہا۔ ورق کچھ بھاری بھاری لگے، لیکن سب کے سب باہم چپکے ہوئے نہ تھے۔ بھاری یوں جیسے بہت دیر تک پانی میں تر رکھے گئے ہوں اور پھر سائے میں خشک کئے گئے ہوں۔ عبدالرحمٰن چغتائی جن کاغذوں پر تصویر بناتے تھے ان کے ساتھ پہلے یہی سلوک وہ کرتے تھے۔ لیکن وہ تو کاغذ ہی خاص طرح کا ہوتا تھا اور اس پر وہ کچھ مسالے اور انڈے

کی سفیدی، کچھ ہلکا السی کا تیل بھی لگا کر اسے پانی بلکہ بارش میں ڈلوا دیتے تھے۔ تو ایسے کاغذ پر یہ کتاب لکھی گئی تھی؟ پھر تو شاید بہت پرانی نہ ہوگی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ کاغذ کچھ پھولے پھولے سے تھے گویا پانی میں ارادتاً ڈبائے اور خشک نہ کئے گئے ہوں، بلکہ کسی حادثے کی بنا پر دیر تک آب زدہ رہے ہوں۔ شاید کسی بگڑے دل رئیس نے پڑھتے پڑھتے کسی بات پر الجھ کر یا اکتا کر اسے گہرے حوض میں پھینک دیا ہو۔ پھر بعد میں افسوس کر کے انھوں نے شاید اسے نکلوا لیا ہو، یا کوئی اور ہی لے بھاگا ہو۔ (سنا ہے ولی دکنی کے کسی حریف نے ان کا بھی دیوان اچانک اٹھا کر ندی میں جھونک دیا تھا...)

میر سوز کے بھی تو اوراق اشعار میر نے شاید ان کے ہاتھ سے لے کر آصف الدولہ کی عین موجودگی میں حوض میں ڈبو دیے تھے؟ میرا دل ایک بانس اچھلا۔ ولی نہ سہی میر سوز سہی۔ میر سوز نے بعد میں چپکے سے میر کی آنکھ بچا کر وہ اوراق نکال کر سکھا صاف کر کے مجلد کرا لئے ہوں گے۔ کیا عمدہ دریافت ہوگی! مگر یہ کہانی بھی سراسر فرضی ہے۔ اچھا فرضی سہی لیکن اس کتاب کے اوراق بہر حال ایک دو غسل کر چکے تھے اور دیر دیر تک بھیگے رہے تھے۔

میں نے اس بار دفتی کو اٹھا کر اور قریب سے دیکھنا چاہا کہ شاید اب سوکھ گئی ہو اور پوستین الگ دکھائی دے جائے... دفتی بڑی آہستگی سے کھل گئی۔ مجھے خیال بھی نہ رہا کہ اب تک میں اس وہم یا کشاکش یا اضطراب میں تھا کہ دفتی اور پوستین اور ورق سب آپس میں چپک کر ٹھوس چوکھٹی لوح نہ بن گئے ہوں۔

جلد کھلی تو ایک مری ہوئی ننھی منی روپا مچھلی جلد کے موڑ اور پوستین کے درمیان پڑی نظر آئی۔ لو، اس چمن کی بچاری نگہبان اور گلچیں جو بھی تھی اس کو بھی موت آ گئی! لیکن ہوا لگتے ہی اس میں تھوڑی بہت حرکت ہوئی... (ہوا لگتے ہی؟ سنا تو گیا ہے کہ کتاب کو ہوا لگتی رہے تو روپا مچھلی مر جاتی ہے، پنپ نہیں سکتی؟) اور وہ دھیرے دھیرے سرک کر (پھسل کر؟) پوستین کے پیچھے چلی گئی۔

پوستین کتھئی پیلی سانپ کی کھال جیسے رنگ اور قماش کے موٹے کاغذ کی تھی جو اب سے کوئی سوا ڈیڑھ سو برس پہلے مقبول تھا۔ اسے کلکتے میں انگریزی کتابوں کے جلد سازوں نے ولایت سے منگا کر عام کیا تھا۔ گہرے رنگوں کے باعث اس پر کچھ لکھا بھی ہوتا تو پڑھا نہ جاتا اور کاغذ جگہ جگہ سے شکستہ الگ تھا۔ (اس کاغذ میں خرابی یہ تھی کہ یہ ٹوٹتا بہت جلد تھا۔ اس میں لچک نہ تھی۔) جلد کی داب کے ساتھ کئی جگہ تو ٹوٹ ہی چکا تھا، اور خود پوستینی ورق پر بھی دراریں پڑ رہی تھیں۔ (روپا مچھلی انھیں میں سے ایک درار کے پیچھے جا چھپی تھی۔ نہیں، شاید سرک کر یا پھسل کر جا رہی تھی... بھلا مرا ہوا کیڑا اچل کہاں سکتا ہے۔) سلائی

اگرچہ فی الحال محفوظ معلوم ہوتی تھی لیکن اندرونی پشتہ بھی اب سلائی سے الگ ہو رہا تھا۔ جزائی لئی یا گوند کی نہیں، سریش کی تھی۔ اس کی بدبو مدت ہوئی اڑ چکی تھی لیکن خود سریش کی تہ گدلے شیشے کی طرح جگہ جگہ سلائی اور پشتے سے چپکی ہوئی تھی۔ چلو خیر سلائی ٹوٹی نہیں ہے اور جز سب الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر سامنے سے نہ کھل سکی تو کوئی ماہر جلد ساز اسے پشتے کی طرف سے کھول ہی لے گا۔

میں نے پوستین کا ورق پلٹا۔ جس طرح کے کاغذ کی یہ پوستین تھی اس کی دوسری طرف کا غذ عموماً بالکل سادہ ہوتا تھا، یعنی اس میں رنگ تو ہوتا تھا، لیکن ایک ہی رنگ، لہٰذا اس پر کچھ لکھنا چاہیں تو لکھ سکتے تھے، بس بھاری قلم یا بہت روشن سیاہی درکار ہوتی تھی۔ لیکن یہاں بھی کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔ اگلا ورق کتاب کا پہلا صفحہ تھا لیکن خالی۔ لاحول ولا قوۃ، کوئی کچھ اپنا نام، دستخط، مہر، تاریخ، کچھ تو چھوڑ گیا ہوتا۔ سو رنگ ہے خرابی پر کچھ تو رہ گیا ہے کے مصداق کچھ تو مجھ تک پہنچ جاتا۔ میں تو حتی الامکان اپنی ہر کتاب پر اپنا نام ضرور لکھتا ہوں، اور اگر پرانی کتاب ہو تو اس پر کچھ کتاب کی تفصیلات کا حاشیہ بھی چڑھاتا ہوں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کہیں پوری کتاب ہی اسی طرح سادہ ورق نہ ہو۔ میں نے دل میں کہا، چلو چھوڑو، کتاب کو (اگر یہ واقعی کتاب ہے) اٹھا کر پرے کرو۔ صبح دیکھیں گے۔

میں کتاب کو سرہانے کی طرف تکیے کے نیچے کھسکانے جا ہی رہا تھا دفعتہً مجھے اپنی گردن کی پشت پر روئیں کھڑے ہوتے ہوئے لگے۔ جیسے کوئی میرے پیچھے ہے اور جھک کر کتاب کو پڑھنے یا پہچاننے کی کوشش میں ہے اور اس کی سانس میری گردن کے اطراف میں ہے۔ اس اکیلے گھر میں کون... پیچھے گردن گھمانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، اور یوں بھی میری گردن ذرا اکڑی ہوئی سی ہے (ہو سکے تو شمع ساں دیجیے رگ گردن جلا پر عمل کرنے کی ہمت نہیں)، میں التہاب و وجع مہرات (spondylitis) کا پرانا مریض ہوں، سرکسو سے فرو نہیں آتا کا رتبہ خود بخود حاصل ہو گیا ہے۔ قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں۔ خیر گردن کو کسی نہ کسی طرح دھیرے دھیرے کر کے ایک حد تک موڑ لیتا لیکن اصل معاملہ تو بکھری ہوئی ہمت کو مجتمع کرنے کا تھا۔ سانس کی تو آواز بھی اب صاف سنائی دے رہی تھی، کتاب یوں ہی کھلی ہوئی تھی۔

اچانک اپنے ہی آپ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کتاب بند ہو گئی۔ میں ابھی ٹھیک سے چونک بھی نہ پایا تھا کہ کتاب پھر کھلی اور کسی نے سرگوشی کے لہجے میں، لیکن بالکل صاف صاف ہر حرف کو ادا کرتے ہوئے کچھ کہا۔ مگر کیا کہا، یہ میں نہ سمجھ سکا۔ خدا معلوم اردو تھی یا پشتو یا ترکی، میرے لئے سب برابر تھیں۔ میں نے ہمت پھر مجتمع کرنی چاہی کہ دیکھوں تو سہی کیا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن اچانک کتاب

کے کھلے ورق پر ایک نارنجی شخبرفی لہر لرزاں لرزاں گذر گئی۔ نہیں میں شاید بھولتا ہوں لرزاں تو وہ بالکل نہ تھی۔ وہ تو اس طرح گذری تھی جیسے جاندار ہو، بل کھاتی ہوئی، قمقمے کی چوڑی کی طرح لیکن ورق اب بھی خالی تھا... پھر کچھ ایسا لگا کہ خالی تو نہیں تھا۔ کبھی اس پر کچھ لکھا ہوا ہوگا جسے کسی بے درد نے بہت آہستہ آہستہ رگڑ کر مٹا دیا تھا۔ آتشی شیشہ اٹھاؤں، کم بخت کو اسی دراز میں تو رکھتا ہوں لیکن دراز کہاں، میں تو پلنگ پر دراز ہوں۔ میں نے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ذرا سا سوراخ بنایا اور ایک طرف سے مٹھی کو کچھ زیادہ کھلا چھوڑے رکھا جس طرح بچپن میں دوربین خوردبین کا کھیل کھیلتا تھا۔ یعنی کبھی کبھی پڑھتے پڑھتے میں مٹھی کو خوردبین فرض کرتا، مٹھی بند کر کے ایک آنکھ میچ کر نیم وا مٹھی کو ایک آنکھ سے لگاتا، اس طرح کہ باریک سوراخ والا سرا دوسری طرف ہوتا۔ پھر باریک سوراخ سے گذر کر تارِ نگاہ شاید زیادہ روشن اور شوخ ہو جایا کرتا تھا اور مہین لکھی ہوئی عبارت کا ایک دو لفظ مجھے پہلے سے زیادہ صاف دکھائی دینے لگ جاتا تھا۔

لیکن اب تو مجھے آنکھ کی حقیقت سب معلوم ہے۔ یہ تارِ نگاہ وار نگاہ فضول تو ہماتی تشکیلات ہیں۔ روشنی آنکھ سے نہیں نکلتی، آنکھ کے اندر آتی ہے تو دکھائی دیتا ہے۔ ابن الہیثم نے یہ بات ہزار برس پہلے بتا دی تھی۔ لوگوں کو یقین تب آیا جب اسے انگریزی کتابوں میں ثابت کیا گیا۔ لیکن مٹھی کی لمبائی ایک طرح کی طوالت عدسہ (Focal length) بھی تو بناتی ہے، میرے ضدی ذہن نے کہا۔ اور اس سے آنکھ کی بصارت پذیری بڑھ جاتی ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ڈاکٹر سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرایا تھا تو اس نے ایک سیاہ ٹکیہ میری آنکھ پر رکھی تھی۔ ٹکیے میں صرف ایک مہین سا سوراخ تھا۔ میری کمزور آنکھ پر بھی اس نے وہ ٹکیہ رکھی تو اس باریک جوف سے مجھے بہت سے حرف صاف صاف نظر آ گئے جو عام طور پر میرے لئے ناخوانا تھے۔ میں بہت خوش ہوا کہ میری نیم کور آنکھ ٹھیک ہو رہی ہے، لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ یہ کچھ خاص امید افزا بات نہیں، دلچسپ ضرور ہے۔ اسے Pinhole effect کہتے ہیں۔ تو میں اسی Pinhole effect کو کیوں نہ کام میں لاؤں، محدب شیشہ نہیں ہے نہ سہی۔

ہوگا، Pinhole effect ہی ہوگا، لیکن میرا تو ہاتھ کانپ رہا تھا، مٹھی بندھ ہی نہ رہی تھی۔ اب تو بدن میں بھی ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی... پیچھے کوئی تھا، زیر لب مسکرا رہا تھا... چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے مجھ سے کسی نے کہا۔ خوشی سے وہ چہرہ کھلا جا رہا ہے! خوف کے مارے میرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا پیچھے مڑ کر دیکھا نہیں نہ دیکھ سکتا ہوں نہ واقعی کوئی چہرہ یا کوئی ہستی میرے شانے کی اوٹ سے کتاب کو یا کتاب کو دیکھنے کی میری کوشش کو دیکھنے میں محو ہے۔ اور کوئی ہے بھی نہیں اور کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا اور کوئی

گل گل شگفتہ بھی ہو رہا ہے اور میں... میرے سر و گردن کی پشت پر کسی سانس کا لمس اور سرگوشی، اکیلا گھر۔

کسے آواز دوں کہ **برائے خدا مجھے اس عذاب سے...**

یہ کتاب ہے کہ کوئی لوح طلسم؟ لوح طلسم پر تو کچھ لکھا ہوتا ہے جسے طلسم کشا ہی پڑھ سکتا ہے۔ پسینے کی ایک بوند میرے ماتھے سے پھسل کر داہنی آنکھ میں آرہی۔ بائیں تو بہت کمزور ہے، دائیں آنکھ سے ہی سارے باریک کام کرتا ہوں۔ اضطراراً میرا ہاتھ اٹھا کہ پسینہ خشک کروں۔ ''کھل جائے گی۔'' کسی نے کہا۔ گھبراہٹ میں میرا ہاتھ مٹھی کی طرح آپ ہی آپ بھنچ گیا اور زور سے میری آنکھ پر اس طرح لگا جیسے کسی نے جبراً اسے ہلکے ہتھوڑے کی طرح میری چشم و ابرو پر کھٹاک سے ٹھونک دیا ہو۔

مٹھی کے سرے پر باریک سوراخ ننھی سی سوئی کی طرح، سنہرے پکھراج کی کنی سا جگمگا رہا تھا اور کتاب کے پہلے ورق پر، جہاں حاشیہ ہوتا ہے، اگر اس صفحے پر حاشیہ ہوتا، اسی سنہری پکھراجی روشنائی میں کچھ لکھا ہوا تھا لیکن مٹا مٹا سا۔ میں نے آنکھ کو خوب میچ کر اسے مٹھی کے باریک سوراخ سے پیوست کرنا چاہا۔ ''کھل جائے گی تو سن سکو گے۔'' کسی نے کچھ اس طرح کہا گویا آواز میرے کان میں نہیں ریڑھ کی ہڈی میں سموگئی ہو۔ پسینے کی نئی بوندیں ماتھے اور آنکھ سے ہو کر مٹھی کو تر کر رہی تھیں جیسے آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے ہوں، دکھائی کیا دیتا۔

میں نے کچھ سراسیمگی کچھ برہمی کے عالم میں کتاب کو پھر پرے ہٹانا چاہا.. تو وہ ہٹی ہی نہیں۔ پتھر بن گئی۔ میں نے کچھ زیادہ زور لگانے کی ہمت کی ہی تھی، ہاتھ ابھی بڑھایا بھی نہ تھا کہ لو وہ کتاب تو آپ ہی آپ کسی ورق پر کھل گئی، جیسے ہوا کے کسی غیر محسوس جھونکے نے اپنا کام دکھایا ہو۔ کچھ لکھا ہوا تھا۔ فارسی تھی کہ اردو، پتہ نہ چل رہا تھا۔ سارا ورق دونوں طرف سے کرم خوردہ، شاید ہی کوئی سطر سوراخ سے خالی ہو۔ مجھے غصے اور خوف اور مایوسی سے رونا آنے لگا ہے لیکن آنکھ میں تو آنسو نہیں پانی کی دھند ہے۔ یہ پانی کہاں سے آیا؟ وہی، جو کتاب کے اوراق میں تھا اور کہاں سے۔ وہ پہلا ورق آہستہ آہستہ اپنے زور پر اٹھا، اپنی قوت سے پلٹا، کتاب ٹھیک سے کھلنے والی ہے شاید۔ دوسرے ورق پر پیشانی کے بائیں جانب کچھ پڑھنے میں آنے لگا تھا۔

کوئی شعر معلوم ہوتا تھا، لیکن اکثر حرف طعمۂ دیداں ہو چکے تھے۔ میں نے مٹھی کے سوراخ سے اور پھر مٹھی کھول کر ورق کو ممکن حد تک آنکھوں کے نزدیک لا کر پڑھنے کی کوشش کی۔ بے

...ہجر...در مرگ...آں نیست...شبے...افسانہ بگذرد۔ کس کا شعر ہے؟ یہ شعر تو پڑھا ہوا ہے، سینکڑوں بار کا دل ہی دل میں دہرایا ہوا۔ بارہا اس کی کیفیت اور اسرار پر وجد کر چکا ہوں۔ بابا...بابا؟ طاہر عریاں؟ نہیں یہ ان کی زبان نہیں۔ بابا...بابا...بابا فغانی گیلانی؟ نہیں اس نام کا کوئی شاعر نہیں گذرا۔ نصیری گیلانی، ہاں بابا نصیری گیلانی۔ اور پھر پورا شعر میں نے پڑھ لیا، یا یاد آ گیا اور میں نے سمجھا کہ ورق پر پڑھ لیا ہے۔

بے خوابیم ز ہجر در مرگ می زند

ایں نیست آں شبے کہ بہ افسانہ بگذرد

وہی بکھراجی سنہری روشنائی بہت مٹی مٹی سی لیکن ایک زرد بہار تھی کہ ان حرفوں سے پھٹی پڑتی تھی۔ کیسی کششیں ہیں اور کیسے جوڑ۔ صرف ایک دو دائرے اور نہ جانے کتنی کششیں۔ مرگ، نیست، شبے، اور بے خوابیم کو بھی یوں لکھا تھا کہ "بے" اور "خوابیم" میں بھی کشش ڈال دی تھی۔ اور علم کی طرح دل میں کھچتے ہوئے "ایں" اور "آں"، اور "افسانہ" کے الف۔ ایں نیست آں شبے کہ بہ افسانہ بگذرد کیا پر اسرار بات ہے اور اس موقعے پر تو اور بھی رمزناک معلوم ہوتی ہے۔ یہ رات ایسی رات نہیں کہ کہانی کی طرح گذر جائے یا کہانی کہانی اسے گذار دے ختم کر دے۔ "سنو گے تو کہوں۔" کوئی پھر بولا ہے۔ خدا معلوم کوئی جنات ہے کیا ہے۔ میرے جسم و جان کا جنگل اس آواز کو سن کر تھرا اٹھا ہے۔ ساکت گمبھیر فرش شب کے اوپر لمبے قدموں سے کون گذرا ہے ابھی؟ لیکن کون مجھے سنائے گا، اور کیا سنائے گا؟ کون ہے جو مجھ سے کہہ رہا ہے "سنو گے تو کہوں۔" کیا سنوں؟ کیوں سنوں؟ ہجوم سادہ لوحی نے گوش ہوش میں خروش بے معنی کا کف بھر دیا ہے کتاب بند ہو گئی۔

مجھے اپنے ہاتھ پر اور ہاتھ پر ہی نہیں، بدن پر قابو نہیں رہ گیا۔ ہزار چاہتا ہوں کہ جی کو مضبوط کروں، آنکھیں بھینچ لوں۔ انھیں دیر تک بند رکھوں۔ پھر گوشہ ءچشم سے بہت دھیرے دھیرے دیکھوں کہ کتاب اب بھی وہیں ہے کہ نہیں۔ میرے پیچھے والے [والی؟] کی سانسیں اب بھی میری گردن کے باریک روئیں مرتعش کر رہی ہیں کہ نہیں۔ جاتے ہیں کیسے کیسے ہمیں چشم وا کرو۔ میر محمد تقی صاحب نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، یا شاید نہیں دیکھا، تو وہاں کھڑکی نہیں باریک شیشے کی دیوار تھی جس پر مخطوطہ لکھا ہوا تھا۔ آر پار کا منظر سب اس مخطوطے میں منقش تھا اور جہاں جہاں جگہ خالی تھی وہاں سے نسیم بھی کبھی تیر سی، کبھی معشوق سی، کبھی مصرع طرح سی چھن کر آ جاتی تھی۔ کتاب ہے کہ بہت سی غیر متعلق اشیا سے

ترتیب دیا ہوا کوئی منظر؟

لیکن میری آنکھیں تو ابھی بند ہی ہیں، میں نے دل میں کہا۔ میری آنکھیں خوف سے بند ہیں شاید؟ لیکن خوف مجھے اس کتاب سے نہیں، اپنے آپ سے تھا... شعر کے نیچے بھی کچھ لکھا ہوا تھا، حسب معمول مٹا مٹا سا۔ روشنائی وہی افشانی شنگرفی سی، یا شاید لاجوردی سی۔ مگر بھلا لاجوردی پر شنگرفی کا شک کیوں کر گذر سکتا تھا؟ میں نے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں پرانی کتابیں دیکھی اٹھائی اور برتی ہیں۔ خود میرے پاس ایسی کتابوں کی کثرت نہیں تو کمی بھی نہیں۔ ایسا کبھی نہ دیکھا کہ زرد نیلگونی اور سرخی مائل زعفرانی ایک سا معلوم ہو۔ لیکن یہ بھی ہے کہ دہلی کے پرانے مصوروں اور خطاطوں کے خاص رنگ چار تھے: سفید، سنہرا، لاجوردی، اور شنجرفی۔ یہ رنگ ہمیشہ گھر کی چہار دیواری میں بڑے رازدارانہ انداز میں تیا رہوتے تھے، کیا مجال کسی کو کسی کے نسخے اور پرچہ، ترکیب استعمال کی بھنک پہنچ جائے۔ تو یہ شاید ایسے ہی کسی گھرانے کی خفیہ روشنائی ہوگی جس کے رنگ میں اور بھی رنگوں کی چھوٹ تھی۔

کچھ ''میرزا...'' کے بعد کوئی لفظ تھا، ایک لفظ یا شاید دو لفظ اس کے پہلے۔ میرزا؟ میرزا غالب، میرزا سودا؟ کچھ ''نو...'' سا بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو کیا اسے ''میرزا نوشہ'' پڑھوں؟ کیا یہ غالب کے دستخط تھے؟ میرا دل زور سے دھڑکا۔ لیکن غالب نے خود کو ''میرزا نوشہ'' تو کبھی لکھا نہ تھا، دوسرے لوگ کہتے تھے۔ اور نوشہ... نواب... تو کیا ''میرزا نوشہ'' لکھا ہوا تو ہے لیکن کسی اور کے قلم سے ہے؟

اچانک مجھے بالکل صاف سمجھ میں آ گیا کہ ''نوشہ'' نہیں، ''نواب'' ہے، اور ''میرزا'' کے پہلے ہے۔ ''میرزا'' کے بعد جس لفظ کو میں ''نو...'' گمان کر رہا تھا وہ ''خان'' کے ''خ'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دفعتہً سب آئینہ ہو گیا۔ ''نواب مرزا خان'' لکھا ہوا تھا، اور دستخط کی طرح نہیں، بلکہ گویا کسی نے پہلے بابا نصیری کا شعر لکھا پھر یہ نام لکھا، پھر نیچے کچھ اور لکھا۔ مثلاً ''ملاحظہ نمایند''، یا ''مطالعہ فرمایند''، یا ''عرض دیدہ شد''، یا ''داخل کتاب خانہ شد''، وغیرہ۔ لیکن داغ کو کسی کتاب خانے سے تعلق نہ تھا۔ رام پور میں وہ داروغۂ اصطبل مقرر ہوئے تھے جس پر کہتے ہیں بعض لوگوں کو ناگواری ہوئی تھی شہر دہلی سے آیا اک مشکی آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا۔

(کسی نے فرمایا ہے کہ یہ شعر رسا رام پوری کا نہیں ہو سکتا۔ وہ ''پرانے'' آدمی تھے۔ ''اصطبل'' میں موحدہ ساکن ہے، بروزن مفعول۔ وہ موحدہ کو متحرک کر کے ''اصطبل'' کو بروزن فاعلن بھلا کیوں کر لکھ سکتے تھے؟ میں کہتا ہوں کیوں نہ لکھتے؟ ''اصطبل'' کا اردو میں ایک تلفظ بتحریک موحدہ بھی ہے۔ اور

اگر نہ بھی ہو تو کیا آفت آگئی۔ عربی میں موحدہ ساکن ہوگی، اردو والے متحرک بولتے ہیں اور ان کے لئے وہی صحیح ہے۔ خیر مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ... یہ پرانے آدمی کی بھی خوب کہی۔ پرانے آدمی اردو کے اپنے لوگ تھے عربی فارسی کے غلام نہ تھے جو ''اصطبل'' کو بروزن فاعلن باندھنے کو گدھے کی دولتیاں کھانے کے برابر جانتے۔)

کتاب پھر آپ سے آپ بند ہوگئی۔ معاً ہلکی سی ''چٹ'' کی آواز ہوئی، پھر ایک ورق کہیں اور سے کھلا۔ انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ پتہ نہیں ہاتھ کا لکھا تھا یا کانٹے کے حروف کا چربہ تھا۔ کوئی ماہر خطاط ہی ہوگا جس نے اطالوی کاپر پلیٹ (Italic Copperplate) سے کچھ مشابہ طرز میں سیاہ روشنائی سے آڑے لمبے حروف میں لکھا تھا۔ لارڈ رابرٹس کا نام صاف پڑھا گیا۔ پھر صفحے کی آخری سطروں میں اور جلی حروف میں یہ عبارت بھی صاف دکھائی دی:

Meerza Futhoolmoolk Bahadoor Ghoolam Fukhrooddeen Rumz 1849

اب ہاتھ لگا کر اگلا ورق پلٹا تو بالکل خالی۔ دوسرے ورق پر کچھ لکھا نظر آیا لیکن کھلتا نہ تھا کہ اردو ہے یا فارسی۔ میرا جی الجھنے لگا۔ بھلا یہ کس طرح کی کتاب ہے؟ مطبوعہ ہے کہ مخطوطہ؟ مطبوعہ ہوتی تو صفحے کے صفحے اس عجب ڈھنگ کے نہ ہوتے کہ کوئی خالی ہے، کوئی گھنا لکھا ہوا ہے اتنا کہ پڑھا نہ جائے اور کوئی بہت ہی پاشاں۔ کہیں انگریزی ہے کہیں کچھ اور۔ عجب جناتی چیز ہے، میں نے دل میں کہا۔ اب اسے تکیے کے نیچے محفوظ رکھ دوں سو جاؤں۔ صبح دیکھوں گا۔ لیکن ابھی تو سر شام ہی کا سماں تھا۔ رات بہت دور تھی اور میرے سونے کا وقت ابھی بالکل نہ تھا۔

یہ کتاب نہیں کوئی جناتی کارخانہ ہے۔ بولتی ہے، چپ رہتی ہے، آپھی آپ کھلتی ہے، آپھی آپ بند ہوتی ہے، کبھی ڈراتی ہے، کبھی رجھاتی ہے۔ آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) کی کتاب کا نام The Ghost in the Machine تھا تو اس کتاب کو The Ghost in the Book کا نام دے دوں؟ لیکن کوسلر نے تو اس عنوان کے ذریعہ دیکارت (Descartes) کے نظریے کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انسانی جسم ایک ظرف ہے اور روح، یا دماغ، یا قوت تفکر اس کا مظروف۔ یعنی روح اور مادہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ کوسلر کو خوف تھا کہ اگر سائنس یوں ہی زور دکھاتی رہی تو ایک دن وہ مشینوں میں قوت نامیہ کا اصول ڈال دے گی یا دریافت کر لے گی اور میں... میں تو ان تمام گم شدہ چیزوں کو تلاش کر رہا ہوں... (کہ

ہم پرندے مقامات گم شدہ کے ہیں) جنھیں ہم کتابوں میں بند کر کے، اور کتابوں کو کالے نیلے بستوں میں باندھ لپیٹ کر ندی کے اس پار جھاڑی جھنڈیوں میں پھینک آئے تھے کہ ہماری بندشیں ڈھیلی تھیں اور وزن زیادہ اور کمریں خمیدہ۔ اور جب ہم ندی کی سیاہی مائل ریت کے کگاروں پر افتاں و خیزاں نیم تاریکی میں کشتیاں ٹٹول رہے تھے تو وہ بستے ایک ایک کر کے ہماری کمروں سے پھسلتے گئے مگر ہم نے کچھ خیال نہ کیا۔

اے پری خواں یہ پری زادوں کی تسخیر نہیں کتاب میں سے کچھ آواز سی آئی جیسے کوئی گنگنا رہا ہو جیسے شیشے کی صراحی میں پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہو رہا ہو جیسے نہایت ہی نازک چھوٹے سے تانپورے پر کوئی پری سروں کو سدھ کر رہی ہو۔ بڑی دلفریب گونج تھی۔ نغمہ گرا ہے بوند بوند پھر بھی اٹھی ہے کتنی گونج اڑتی پھری ہے ذہن میں گرد خیال ہر طرف۔ پھر اچانک کتاب کا صفحہ روشن ہو گیا، جیسے سنیما کا چھوٹا سا پردہ ہو، میرے گھر میں تو ٹی وی بھی نہیں۔ اور یہ تصویریں تو رنگین ہیں۔ لیکن سنا ہے خواب تو ہمیشہ سفید و سیاہ ہی ہوتے ہیں۔ ہندی والے شویت شیام کہتے ہیں، لفظ خوبصورت ہے لیکن عجب طرح کا تصنع ہے اس پیکر میں جو اس لفظ یا فقرے کے ذریعہ ذہن میں روشن ہوتا ہے۔ لال قلعے کا لاہوری دروازہ... لیکن یہاں تو چہل پہل کچھ اور طرح کی ہے؟ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے کچھ بے ہنگم سے لوگ، نمک مرچ لگا کر کیلے کھاتے ہوئے، گہری گاڑھی لپ اسٹک اور نمایاں ہونٹوں، کچھ اکتائے ہوئے کچھ برہم چہروں والی عورتیں، اسکوٹروں، کاروں اور بسوں کا دھواں اور شور، سڑک کے دونوں طرف دکانیں اور ٹھیلے، پلاسٹک کی تھیلیاں، گول گپے اور چاٹ کے دونے، بدصورت بیمار رنگوں کے پلاسٹک کے گلاس اور آئس کریم کی پیالیاں، یہ سب کچھ نہیں۔ میرے پیچھے جامع مسجد صاف دکھائی دیتی ہے۔ کوئی کہتا ہے، آج تو چوک سعد اللہ خاں کی چھب ہی نرالی ہے، حضرت مرشد برحق قدر قدرت ظل سبحانی مینا بازار تشریف لے جائیں گے... پھر کہیں سے ستار پر کھرج میں کسی راگ کی آروہی کے سر گونجتے ہیں...

پا... نی... سا... رے... رے

یہ تو تلک کا مود ہے، آروہی میں رکھب کے سر لگ رہے ہیں، گندھار و ذرا سا، لیکن کھرج پورے زور میں۔ کیسی گونجتی ہوئی سی آواز ہے، ستار لگتا ہی نہیں ہے، سرود لگتا ہے۔ خدا جانے مضراب اور صاحب مضراب میں کتنی جان ہو گی، سروں میں پھیلاؤ اور گہرائی اور وزن ہے۔

رے... ما... پا... نی... سا...

اور اب اوروہی...

سا... نی... دھی... پا... ما... گا... رے... گی... سا...

پھر پورا راگ بجنے لگتا ہے:

سا... نی... سا... پا... نی... سا... رے... رے... پا... ما... گی...

نہ بجانے والا نظر آتا ہے نہ اس کی سنگت والے۔ لاہوری دروازے پر رونقیں اور بھی بڑھ گئی ہیں، لیکن کچھ کچھ لوگوں کی چال ذرا مدھم ہے... تلک کامود رات کے دوسرے پہر کا راگ ہے۔ یہ سورٹھ اور دیس سے بہت مشابہ ہے۔ مشاق سازندے یا گویئے ہی انھیں الگ الگ کر سکتے ہیں۔ اس راگ میں گذرتی ہوئی رات کا درد اور بھولے ہوئے لمحات کی کسک اور آنے والی صبح کا خوف ہے جب شمعیں بجھا دی جائیں گی، جب چراغوں کی لوؤں کے سر قلم ہوں گے۔

تصویر

میرا نام محمد یوسف سادہ کار ہے۔ میں کشمیری الاصل ہوں۔ لیکن اصل معاملہ میرا اتنا سادہ نہیں، اور شروع سے بیان کروں تو بہت لمبا اور پیچ در پیچ ہے۔ لیکن شروع سے بیان نہ کروں تو اس کی باریکیاں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔ اب میں عمر کی اس منزل میں ہوں (سنہ عیسوی ۱۸۴۰، عمر ۴۷ سال) جہاں انسان پیچھے مڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو ہوا اسے یوں ہی ہونا تھا یا کچھ اور صورت یا صورتیں ممکن تھیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ وہ خود بنا، اور جیسے اس کے اخلاف بنے، تو کن منازل و مراحل کو طے کر کے یہ صورتیں اور مورتیں صانع وقت کو بہم پہنچ سکیں۔ قبلہ میر صاحب فرما گئے ہیں کہ بگڑیں ہزار شکلیں تو روپ یہ بنائے۔ یہ بات شاید ایک سے زیادہ مفہوم میں ہم پر صادق آتی ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اس عمر میں جب عورتیں اپنوں میں سکھ اور بہناپا ڈھونڈتی ہیں اور مرد اپنی گھر والی میں ساتھی سنگاتی دیکھتا ہے، میں اکیلا ہر طرف سے ہوں۔ میری نیک بخت بیوی کو اللہ نے اچانک یوں اٹھا لیا جیسے مہر عالم تاب نوک خار سے شبنم کو چپ چاپ اٹھا لیتا ہے۔ اور میری بیٹیاں تینوں مجھ سے جدا ہو چکی ہیں۔ اب مجھے یہاں کچھ کرنا نہیں ہے، اے خوش آں روز کزیں منزل ویراں بروم۔ لیکن اس تنہائی اور اس امید و تمنائے مرگ میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جو بھی کہوں گا سچ کہوں گا اور کچھ پوشیدہ نہ رکھوں گا کہ مجھے کسی سے کوئی توقع نہیں، کسی کا کچھ خوف نہیں۔

سادہ کاری ہمارا آبائی پیشہ نہیں۔ میرے باپ دو بھائی تھے، محمد داؤد بڈ گامی اور محمد یعقوب بڈ گامی۔ یہ لوگ کشمیر میں مدت سے رہ رہے تھے، لیکن درحقیقت داؤد بڈ گامی اور یعقوب بڈ گامی اصلاً

یہاں کے نہ تھے اور ان کے دادا کا نام مخصوص اللہ میاں مرقع نگار تھا۔ یہ میاں صاحب فردوس قرار، اعلیٰ حضرت شہنشاہ عالم و عالمیان، اقبال نشان، سعادت گیہان، محمد روشن اختر شاہ بہادر غازی فردوس آرام گاہ کے عہد مبارک و باسعادت و جنت سند کے زمانے (۱) میں کشن گڈھ راج کے ایک چھوٹے سے گاؤں ہند الولی کا پروا میں آباد تھے۔ یہ امر شاید ضروری الاظہار نہ ہو کہ راجپوتانے میں بالعموم، اور ہند میں بالخصوص حضرت مہر سپہر ولایت، سپہر مہر سخاوت و جودت، خواجۂ بزرگ، غریب نواز و شاہ ساز، پیران پیر، شاہوں کے تاج بخش اور بے کسوں کے دست گیر، پیارے پیا بابو معین الدین صاحب چشتی محبوب خدا کو ''ہند الولی'' کہا جاتا ہے۔ کیا مسلمان کیا غیر مسلم، سب ''ہند الولی'' کا نعرہ لگاتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ خواجہ مجیب ہو کر کرم گستر بھی ہوتے ہیں۔ ''ہند الولی'' میں حرف سوم مفتوح ہے۔ پہلے تو ایک ہی گاؤں تھا جو اجمیر شریف سے کچھ دور خواجہ صاحب کا چلہ نامی بستی کے قریب ''ہند الولی کا پروا'' کے نام نامی سے ملقب ہوا۔ وقت کے ساتھ کئی گاؤں کے ناموں میں اس مبارک نام کا بھی حصہ وابستہ ہو گیا۔

ہمارے گاؤں کا نام کثرت استعمال سے اب صرف ''ہندل پروا'' رہ گیا تھا۔ خاص گاؤں میں تین گھر کو چھوڑ کر آبادی سراسر غیر مسلم تھی، ایک دو پنڈتانے، پانچ سات گھر راجپوتوں کے، باقی مختلف اہل حرفہ کے۔ مصوری ان کا وسیلۂ حصول آذوقہ تھی۔ کشن گڈھ قلم کی زینتیں انھیں جیسے عسرت کے مارے لیکن خلق اور خوش خوئی کی صفت سے متصف صناعوں کی مہارت، رنگ سازی میں ان کے ابداع، اور کاغذ سازی میں ان کے مختارات کی مرہون منت تھیں۔ خاص شہر کشن گڈھ میں تو محض اناڑی اور دلال رہتے تھے، کام تو ہم گاؤں والے کرتے اور نام کشن گڈھ قلم کا ہوتا۔

میاں مخصوص اللہ کا اصل نام مجھے نہیں معلوم۔ نہ اس وقت ان کی عمر کا ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب ہندل پروا کا بھی نشان صفحۂ ہستی پر نہیں کہ وہاں کسی سے پوچھ لیا جائے۔ بس اتنا ہی ہے جو میں گوش گذار پیارے ناظرین اپنے کے کر ہی چکا کہ اغلب ہے غیر مسلم تھے اور ان کا آبائی نام کچھ اور تھا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی تیس پینتیس رہی ہوگی لیکن دنیا سے بہت الگ تھلگ رہنے اور اپنے کھانے لباس کی کچھ فکر نہ کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے زیادہ لگتے تھے اور سارا گاؤں انھیں ''میاں'' یا ''بابا'' کہتا تھا۔ گاؤں کی کل آبادی کوئی دو پونے دو سو نفر تھی۔ ان میں بیش تر ہی کسی نہ کسی طرح مصوری کی روزی کھاتے تھے۔ سرحد سے ذرا باہر کچھ مسلمان اور ہندو چرواہوں اور ساربانوں کے گھر ضرور تھے۔ ایک دو

(۱) ۱۷۱۹ تا ۱۷۴۸۔

موروثی لیکن مختصر کاشت کار بھی تھے۔ ان سب کے بارے میں مدتوں سے شک تھا کہ ٹھگ ہیں اور خون بہائے بغیر قتل کرنا، لاش کو لوٹنا اور گہرا داب کر اس طرح غائب کر دینا کہ کبھی پتہ نہ لگے، ان کا دھرم ہے۔ لیکن یہ بات کسی پر ثابت نہ تھی اور گاؤں کے قرب و جوار میں ایسی کوئی واردات ان پر ثابت نہ ہوئی تھی۔ ثابت کیا معنی، کسی کو احتمال خفیف بھی ایسے جرم کا نہ گذرا تھا۔ ان میں کچھ لوگ مسلمان تھے، کچھ دوسری ذاتوں کے، حتیٰ کہ ایک کے بارے میں کہتے تھے کہ پنڈت ہے۔ مسلمان تو پابند صوم و صلوٰۃ تھے اور ہندو اپنی اپنی ذات کے اعتبار سے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے۔ مشہور تھا کہ ہندو یا مسلمان، ان ٹھگوں کی اصل دیوی تو درگا یا کالی ہے جسے یہ لوگ بھوانی کے نام سے پکارتے ہیں۔

گاؤں کی خوش حالی کا بڑا حصہ یہاں کے شبیہ سازوں (اور شاید تھوڑا بہت ٹھگوں) کی بدولت تھا۔ لوگ منھ مانگی قیمتیں دے کر شبیہیں لے جاتے تھے۔ یہ زیادہ تر خیالی ہوتی تھیں۔ شبیہ حقیقی بنانا عام طور پر معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے شبیہ سازوں نے جڑی بوٹیوں اور پتیوں اور درختوں کی چھالوں، پھولوں اور پھلوں اور بعض کیڑے مکوڑوں سے رنگ نکالنے کے طریقے اپنے اجداد سے سینہ بہ سینہ پائے تھے۔ ان کے رنگوں میں خارجی تیل کا عنصر بالکل نہ ہوتا تھا، الا ماشاء اللہ وہ تیل جو خود اس کیڑے یا پھل میں ہو جس کا رنگ اتارا جا رہا تھا۔ رنگ کو پہلے خشک بھربھرے ڈھیلوں کی شکل میں بناتے تھے۔ پھر اوپر نیچے بہت باریک ململ رکھ کر نرم سنگ جراحت کے چکنے ٹکڑوں سے انھیں آہستہ آہستہ کوٹا اور پیسا جاتا۔ یہ عمل اتنی ہلکی قوت سے کیا جاتا تھا کہ آواز تک نہ آتی تھی۔ اس دوران ململ کے کپڑے پھٹ جاتے تو فوراً بدل دیئے جاتے۔

جب مہینوں کی کٹائی پسائی کے بعد رنگ ایسا ہو جاتا کہ ہوا میں آپ سے آپ غبار بن کر اڑنے لگتا تو اسے ایک بار اور چھان کر ہلکے پانی سے گوندھ کر لئی سی بنا لیتے تھے۔ یہ پانی بھی ہر جگہ سے نہیں آتا تھا۔ کشن گڈھ کی قدیمی جھیل کے صرف مغربی کنارے کے ایک کنڈ کا پانی اس کام میں لگتا تھا۔ یہاں کچھ نئی طرح کی گھاس پانی کے اندر اگتی تھی۔ (کہتے تھے کہ مگرمچھ اسے اپنے پیشاب سے سینچتا ہے اور یہ مگرمچھ پشکر جھیل کے دیوتا مگرمچھوں کے خاندان کے ہیں۔) یہ گھاس نہ تو سوار کی طرح سخت اور گھنی اور دھاردار لمبی پتیوں والی تھی اور نہ مچھلی گھاس کی طرح لمبی لسلسی اور باہم الجھی ہوئی۔ موٹی موٹی ڈنٹھلیں تھیں، پتیوں اور ریشوں سے بالکل معرا، اور وہ اس طرح آڑی ترچھی شکلوں میں اگی تھیں کہ کبھی کبھی لگتا تھا کسی نے ہاتھ سے بنا کر کاٹ جوڑ کر ڈال دی ہیں۔ اور کبھی ایسا لگتا کہ کوئی تیز دانتوں والا جانور انھیں مہینوں سے

کترتا آیا ہے اور اب جو لکڑی اور پتیاں جگہ جگہ سے کھل اور چھل اور کٹ گئی ہیں تو آمیر اور لال قلعے کی دیواروں پر بنے ہوئے نقش و نگار جیسے متنوع اور ایک کے اندر ایک کے گتھے ہوئے نمونوں اور نقشوں کا التباس ہوتا ہے۔

یہ ساری جھنڈیاں اور ڈالیاں ہمیشہ پانی میں غرق رہتیں۔ پانی کبھی کم ہو جاتا اور اس کا خدشہ ہونے لگتا کہ لکڑیاں سطح آب سے اوپر آ جائیں گی اور دھوپ انھیں چھو لے گی، تو خود ان ڈالیوں سے اتنا پانی بوند بوند پھوٹ بہتا کہ ڈالیاں پھر سے تہ آب ہو جاتیں۔ کشن گڈھ کے رنگ حسب ضرورت گوندھے جاتے تھے، ورنہ انھیں جست کی کلھیوں میں سر بہ مہر رکھا جاتا تھا۔ یہاں کے مصور اونٹ کے بچے کی دم کے نچلے اندرونی روئیں اور گجراتی کچھار کی گدھیوں کے نوزائیدہ بچوں کے کانوں سے آہستہ نوچے گئے باریک بالوں سے اپنے موقلم تیار کرتے تھے۔ اور کشن گڈھ کی جھیل کے متذکرہ گوشے کے پانی کو مٹی کی ٹھلیوں میں سرد کر کے اس پانی سے ان کے رنگ گوندھے جاتے تھے۔ کبھی کبھی زبرجد یا لاجورد کے ٹکڑوں کو اسی پانی میں رکھ کر کلھیوں کو مہینوں بند رکھتے۔ پھر پنچانگ اور آسمان اور پروہت سے مشورہ کر کے وہ کھولی جاتیں اور ان ٹکڑوں کو پیس کر رنگ بنایا جاتا۔

مخصوص اللہ (یا جو بھی نام ان کا اس زمانے میں رہا ہو، سب سے اچھا یہی ہے کہ ان کو ''میاں'' کہا جائے) کے یہاں جانور، اور شکار، اور مناظر کارزار کی تصویریں نہیں بنتی تھیں۔ لیکن ان کی کئی تصویروں میں کسی پرانے، بلند، یا شکستہ اور ویران لگنے والے مینار کے پس منظر کے ساتھ کسی نوجوان لڑکی کو ایک ٹوٹے ہوئے، بھورے یا کچھ کائی زدہ پتھر، یا ہری بھری لیکن پست چٹان پر اس طرح بیٹھا ہوا دکھایا جاتا گویا کوئی شخص ابھی ابھی اس کے سامنے تھا اور وہ اس سامنے والے شخص (۱) کو دیکھ رہی تھی، لیکن اچانک اس کی توجہ بائیں طرف کو منعطف ہو گئی ہے اور اب اس کی نیم رخ ہی صورت تصویر کو دیکھنے والے کے سامنے ہے۔ گردن کے خم اور شانوں کے ہلکے سے کھنچاؤ کے باعث جو بن کچھ نمایاں ہو گئے ہیں، بیاض گردن میں لطیف سا دلکش تناؤ ہے، ٹھوڑی سے آنکھوں تک جلد بہت ذرا سی کسی ہوئی، بہت خفیف سی کشیدہ ہے، گویا ایک لحظہ پہلے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑی تھی اور اب وہ تبسم زائل ہو چکا ہے، لیکن اس کے آثار ابھی باقی ہیں۔ ماتھا آدھے سے زیادہ ڈھکا ہوا، لیکن اوڑھنی کے باریک پلو کے نیچے بالوں کی بناوٹ اور گل دوپہریا سے ان کی تزئین صاف نظر آتی تھی۔ تصویر کے نیم

(۱) یعنی مصوری کی اصطلاح میں gazer۔

رخ ہونے کے باعث چوٹی اور گردن اور شانوں کا بھی جلوہ الگ بہار رکھتا تھا۔

یہ لڑکی میاں کی کون تھی، یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ ان سے پوچھنے کی ہمت کسی میں تھی بھی نہیں۔ وہ دن بھر میں شاید دس یا بیس کلمے ادا کرتے ہوں، ورنہ بالکل چپ ہی رہتے۔ کئی کئی رات جنگل جا کر چاندنی راتوں میں ریت کے ٹیلوں کی چھاؤں میں پڑے رہتے۔ پڑے رہتے یا دعا پوجا کرتے۔ کبھی کبھی وہ ایک پوٹلی میں باجرے کی روٹی، چٹنی، ایک چھاگل میں پانی، اور ایک دو پڑیوں میں کچھ رنگ اور کاغذ کے دو چار تختے لے کر دو دو تین تین دن تک غائب رہتے۔ ہمارا گاؤں کشن گڈھ ریاست کے صدر مقام سے کوئی دس کوس شمال مغرب میں بارمیڑ اور جیسلمیر کی طرف پڑتا تھا۔ سڑک کوئی تھی نہیں، اونٹوں، گھوڑوں، پیدلوں اور کبھی کبھی رتھوں کی آمد و رفت نے صدیوں میں ریگستان میں جو نقش بنائے تھے وہ ایک باریک سی پگڈنڈی کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ بارش دو چار برس میں ایک آدھ بار ہوتی تھی، اس لئے راستے میں گھوڑے یا گاڑی کے پھنس جانے کا امکان صرف اسی صورت میں تھا کہ بھربھری ریت کے نیچے کوئی گڈھا ہو اور سواری یا جانور انجانے میں اس میں جا رہے اور ہاتھ پاؤں تڑا بیٹھے۔ اس خطرے کے سوا ہماری راہیں محفوظ تھیں۔

ان دنوں ہمارے گاؤں کے اطراف میں تغدر(1) بہت ہوتے تھے۔ سانپ اور چھوٹے جانور، اور ٹڈیاں، کیڑے، اس کا من بھاتا کھاجا تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے علاقے کا سب سے خطرناک سانپ پھرسا اس کا محبوب شکار تھا۔ بمشکل ڈیڑھ دو ہاتھ کا پتلا سا سیاہی مائل یہ سانپ اس قدر زہریلا تھا کہ اس کا کاٹا ہوا، جانور ہو یا انسان، کبھی بچتا دیکھا نہ گیا تھا۔ اور حملے میں وہ اس قدر تیز تھا کہ اس کے سامنے آنے والے کا بچ نکلنا غیر ممکنات سے تھا۔ اونٹ اور گائے بیل جیسے بھاری جانوروں کے سم، یا بیل گاڑی، بہلی، رتھ کے پہیوں کے بنائے ہوئے گڑھوں میں پھرسا یوں تو پہروں مزے کی نیند سوتا، لیکن اگر کسی بدنصیب کا پاؤں اس گڑھے میں پڑ گیا جہاں پھرسا محو استراحت تھا تو پھر اس کی خیر نہ تھی۔ ایک لمبی فوں سی پھنکار کے ساتھ وہ اپنے تقریباً پورے قد سے اچھلتا اور مقابل کی ران یا پیٹ پر کاٹ لیتا۔ اس کے بعد چند گھنٹوں کی لاعلاج غشی اور پھر موت۔ ہم لوگ تغدروں کی بہت قدر کرتے تھے کہ صرف وہی ایسی بے جگر اور سریع السیر تھیں کہ پھرسوں کو بے تکلف مار کر کھا لیتی تھیں۔ لوگ مخصوص اللہ میاں سے یہی کہتے کہ بابا ادھر ہی جایئے گا جدھر تغدر کثرت سے ہوں۔

---

(1) Great Indian Bustard.

ہمارے گاؤں کے زمیندار مہاراول گجند رپتی سنگھ کا تعلق بوندی راج سے تھا لیکن ایک زمانے میں کشن گڈھ راج سے کچھ خانہ دامادی کے رشتے پیدا ہو گئے تھے، اور تب سے وہ لوگ کشن گڈھ ہی میں رہتے تھے۔ تیوہار کے دنوں کے سوا مہاراول ہمارے گاؤں میں شاذ ہی تشریف لاتے۔ عید، ہولی وغیرہ میں وہ ذرا دیر کو آئے، سر سواری نذریں لیں، سونے چاندی، بادلے، مقیش کے پھول لٹائے، کسی کسی کو زیور یا کپڑے سے نوازا اور چل دیئے۔ گاؤں کی آمدنی جوان تک پہنچتی تھی کاشت کاری پر مرتہن نہ تھی، لہٰذا انھیں آب پاشی، کھیتی، فصل، بیج، وغیرہ معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک دن خبر اڑی کہ مہاراول گاؤں کی سیر کو آنے والے ہیں۔ یہ عجیب واقعہ تھا، کہ گاؤں کی سیر کے لئے مہاراول کیا، ان کا گماشتہ بھی کبھی نہ آتا تھا۔ سب لوگوں نے اپنے دروازے دہلیزیں صاف کیں، گھروں کے سامنے چھڑکیاؤ کیا۔ دیواروں پر تصویریں اور چوکھٹ کے آگے رنگولیاں بنائی گئیں۔ موروں کی تو بستی میں بہتات تھی، جگہ جگہ مور پنکھیاں لٹکائی گئیں۔ ذرا دیر میں بازار سا سماں ہو گیا۔ مخصوص اللہ میاں حسب معمول اپنی سیروں پر نکلے ہوئے تھے، لیکن ایک تصویر انھوں نے کچھ دن پہلے مکمل کی تھی۔ ہلکی لیکن مضبوط سفید ریشمی چادر کا ٹکڑا لے کر اسے ہلکے رنگ میں رنگا تھا اور پھر نقش بنائے تھے۔

تصویر کیا تھی، آئینے میں پری تھی۔ بالکل میاں کے خاص قلم کا اعلیٰ نمونہ۔ چودہ پندرہ برس کی لڑکی سنگ سیاہ کی ایک شکستہ سی چوکی پر یوں بیٹھی ہوئی گویا اب اٹھے گی تو پوری جوان ہی اٹھے گی۔ بھرپور جوانی اس کے جسم کے عضو عضو پر دستک دے رہی تھی۔ لہنگا ذرا ڈھیلا اور لمبا، لیکن گلاب کی کلی سے نازک تر ٹخنے اور گلاب کی پنکھڑی سے بھی لطیف، گلابی لیکن زندہ پھڑکتے ہوئے رنگ کے پاؤں تھوڑے تھوڑے جھلک رہے تھے۔ ایک تلوے پر ہلکا سا داغ، خدا معلوم تل تھا یا باغ کی کوئی پتی پاؤں کے صدقے ہو کر رہ گئی تھی۔ گردن اسی طرح ایک طرف کو خم، صورت ویسی ہی نیم رخ، لباس شوخ اور بھڑکیلا نہیں بلکہ سفید اور گلابی اور زعفرانی، لیکن تینوں رنگ اس طرح بول رہے تھے کہ تصویر تھرتھراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چندری پر بہت باریک لچکا پٹھا اور چنگی، لیکن پھر بھی لگتا تھا سر سے چندری اب ڈھلکی اب ڈھلکی۔ اور ڈھلکی تو ہاتھ بڑھا کر چھوؤ گے تو واقعی ململ کی چندری کا پلو ہاتھ میں آ جائے گا اور تم اسے چٹکی سے اٹھا کر پھر اس کے سر پر رکھ دو گے۔ ستواں ناک، گردن، سب بالکل کشن گڈھ والی، آنکھیں کمرک کی پھانکیں اور پتلیاں اتنی سیاہ اور سفیدی میں سرخی کی ہلکی سی ایسی جھلک کہ آنکھوں میں گلابی لہریے انگڑائی لیتے محسوس ہوتے

تھے۔ گردن میں صرف ایک سادہ سونے کا ہار، جس میں گوریا کے انڈے کے برابر ایک انتہائی صفائی سے بیضوی کاٹے ہوئے یاقوت انجم (Star ruby) کا آویز، کلائیوں میں صرف ایک ایک گھڑیالی کڑا۔ باکمال مصور نے اندھیاروں اجیاروں کا انتظام ایسا رکھا تھا کہ اجیارے کی ایک کرن یاقوت ستارہ پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھی کہ تارے کی چھیوں لکیریں جھلک اٹھی تھیں۔ ٹھنڈی پہاڑی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں خوش مزاجی اور الھڑ پن اور نخوت کا امتزاج۔ چہرے پر واضح مسکراہٹ نہیں تو کوئی تشویش بھی نہیں، ایک خاموش تمکنت، خود پر کامل اعتماد، اور دنیا کے ہر خوف سے بیگانہ، مطمئن انداز نشست۔

میاں کی بنائی ہوئی یہ تصویر ان کے حجرے کے بڑے طاق پر اٹکا دی گئی تھی۔ لوگ دیکھنے آتے اور عش عش کرتے۔ لیکن ایک ہی دو دن میں یہ بھی سنا جانے لگا کہ تصویر میں کچھ گڑ بڑ ہے۔ گڑ بڑ؟ کیسی گڑ بڑ؟ لڑکیوں کی شبیہیں تو سب خیالی ہوتی ہیں۔

''نہیں۔'' مہاراول کا ایک سپاہی پاس کھڑا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے اور سرگوشی کے لہجے میں کہا، ''یہ اصلی ہے۔'' اور پھر اس نے جلدی سے کان اور منھ کو سختی سے بند کر لیا۔

سانجھ پھول رہی تھی، لیکن روز کی طرح اس میں ریت کے ذروں کی ہلکی چمک نہ تھی۔ کچھ سیاہ ڈورے افق پر لہرا رہے تھے۔ شام یوں بھی ہمارے اطراف میں بہت تیز پھیل جاتی تھی، جیسے گلدار بستی کا شکار کرنے کے لئے دوڑا آ رہا ہو۔ چٹ روشنی اور پٹ اندھیرا۔ اور اس دن تو گرد اور پانی کی بھاپ سے بھرے ہوئے بادل آسمان پر اژدہے کی مانند بل کھا رہے تھے۔

''کیا مطلب؟ 'اصلی ہے' کا کیا مطلب؟'' کسی نے اونچی آواز اور تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ لڑکیاں استریاں تھوڑی ہیں، اپسرائیں ہیں۔ بنی ٹھنی (۱) کو کسی نے آج تک دیکھا ہے؟ رادھا ماں کو کسی نے آج تک دیکھا ہے؟ کیا کسی کو وہ آج تک سپنے میں بھی نظر آئیں؟ ہم لوگ استری کی شبیہ نہیں بناتے، ہم لوگ چتیرے ہیں، چاند صورت کا روپ بناتے ہیں۔''

''شش، چپ رہو، آہستہ بولو۔'' ایک شخص، جو منھ کو آدھا لپیٹے اب تک الگ کھڑا تھا، پاس آ کر بولا۔ ''بحث کا وقت نہیں۔ اس تصویر کو کہیں ہٹا دو، داب دو، پھینک دو۔'' اس کا اضطراب اور جوش دفعتہً کئی درجے اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس نے گانجے کی کلی کا بڑا سا کش کھینچا۔ گاڑھا زردی مائل دھواں اس کی

(۱) سترہویں صدی کے ایک والی کشن گڈھ کی محبوب ملکہ کی تصویر ''بنی ٹھنی'' کی تصویر کہلاتی ہے۔ بعض لوگ اسے ''کشن گڈھ کی رادھا'' بھی کہتے ہیں۔ اصل تصویر کی نقلیں آج بھی سارے کشن گڈھ میں عام ہیں۔

کھچڑی داڑھی کے چاروں طرف بل کھاتا ہوا پھیل گیا اور فضا اس کی بھاری، میٹھی لیکن امتلا انگیز مہک سے گونج اٹھی۔

''کیوں؟ اس تصویر کو کیوں پھینک دیں؟'' ایک شخص ناک سکوڑ کر بولا۔ ''میاں بھی تو نہیں ہے کہ اس سے پوچھ لیں۔ شاید کوئی مول لے چکا ہو تو...''

''ابے چڑیا کے، یہ کیا چانڈو خانے کی اڑائی ہے تو نے؟'' ایک شخص بات کاٹ کر بولا۔ ''اصلی کیا اور نقلی کیا؟ یہ تو بنی ٹھنی ہے۔''

''چپ... چپ...'' گانجا پینے والا سانپ کی طرح پھپھکارا۔ ''یہ گاؤں لٹے گا۔ یہ گاؤں تباہ ہوگا، اجڑے گا۔ کیا تم دھمک اونچی سانڈنی سواروں اور پہاڑیوں جیسے بھاری صبا رفتاروں کے قدموں کی نہیں سن رہے ہو؟ چلو۔ سب ختم ہو گیا۔ میاں نے اس گاؤں کو سولی پر چڑھوا دیا۔ تقدیریں تمھاری اپنے تھان پر سے بچل گئیں۔'' اس کی آنکھوں میں دہشت کے آنسو تھے اور اس کے گھٹنے لرز لرز کر آپس میں یوں کھٹ کھٹ کی آواز نکال رہے تھے گویا کھڑتال بج رہی ہو۔

''ابے واہی ہوا ہے، گنجیڑی چرسی بدشراب کہیں کا۔ چل اپنا راستہ ناپ نہیں تو تیری گردن ہی نپ جائے گی۔''

کسی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ گانجا پینے والا گرتے گرتے سنبھل کر چلایا:

''یہ بنی ٹھنی نہیں... یہ بنی ٹھنی نہیں!'' اس نے اب ایک ایک حرف پر زور دیتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر پکارنے کی آواز میں کہا۔ مدت مدید سے گانجا پینے والے کی زبان اور ادائیگی پر اس وقت گانجے کی پیدا کردہ ٹیڑھ کی پرچھائیں بھی نہ تھی۔ ''یہ...... من...... موہنی...... ہے۔''

مہاراول

سب پر سناٹا چھا گیا۔ من موہنی؟... من موہنی...؟ وہ تو مہاراول کی چھوٹی بیٹی تھی، یہی کوئی پندرہ برس کا سن، اس کی خوبصورتی سارے اطراف میں ضرب المثل تھی لیکن خود اسے کسی نے دیکھا نہ تھا۔ وہ ستر پردوں میں رکھی جاتی تھی اور کیا مجال کہ مشاطۂ خاص کے سوا کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں بھی دیکھے ہوں۔ منھ یا بدن دیکھنا تو ایسا ہی تھا جیسا چاند کے اندر اتر جانا۔ تو پھر یہ اس کی تصویر کیسے ہو سکتی ہے؟ فرض کیا کسی نے اس کے نام سے شبیہ خیالی بنائی تو بنائے، اصل سے اسے مطابقت کہاں ہوگی؟ جب ناک نقشہ ہی صحیح نہ ہوگا تو صورت کیسے کھنچے گی؟

''نہیں، یہ سب جھوٹ بکواس ہے۔'' کسی نے پکار کر کہا۔ ''کوئی ہماری شہزادی کو بدنام کرے گا تو زبان کھینچ لی جائے گی۔''

''مگر کوئی کیوں کرے گا بدنام؟'' ایک بڑھیا بولی۔ ''ملائی پر گوبر پوتنے والے کو کیا ملے گا؟ اس کے بھید تک پہنچو، چیخنے اور غصہ کرنے کا یہ موقع نہیں۔ گلوگیری سے ایک دوسرے کی کیا حاصل؟''

''مہاراول کو بدنام کرنے کا چکر ہو سکتا ہے،'' کوئی شخص سر کھجاتا ہوا بولا۔ ''لیکن...''

ابھی اس کا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ ہندل پروا کی سرحد پر گھوڑوں کی ٹاپیں غرانے لگیں۔ گرد کا ریلا اٹھا اور چشم زدن میں پورے گاؤں میں پھیل گیا۔

''میاں کہاں ہے؟ میاں کہاں ہے؟ میاں کہاں ہے؟'' کی آوازیں گرد کی دھند کو چیرتی ہوئیں، اور راہ کے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے گھوڑوں کے سموں سے اڑتی ہوئی چنگاریاں اور برستے ہوئے پتھروں کی دھمک سارے پر چھائی ہوئی۔ اور رہواروں کی پوئیاں قدمی کی تکان سے کسی ننھے بچے کی طرح لرزتی ہوئی

زمین۔

"میاں یہاں نہیں ہے، میاں یہاں نہیں ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"ہم سب نہتے ہیں۔ حکم سرکار ہم بالکل بے خطا ہیں۔" گاؤں والوں میں سے کوئی پکارا۔ پھر اسی طرح کی اور بھی آوازیں بلند ہوئیں۔ لیکن شور اس قدر تھا کہ کسی کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔

میاں کی جھونپڑی کے طاق میں رکھی ہوئی تصویر پھڑ پھڑا رہی تھی، گویا زلزلہ آیا چاہتا ہے اور سب کچھ ابھی زمیں بوس ہو جائے گا۔ پورا گاؤں گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ اس گاؤں کی بساط ہی کیا تھی، بازار نام تک کی تو کوئی چیز نہ تھی۔ آوازوں کا زور ذرا تھما۔ بچے اور بوڑھیاں اپنے منھ آنکھ کان پر کپڑے ڈالے ہوئے زمین پر گھٹنے نہوڑائے سر جھکائے پڑے تھے کہ جان تو اس طرح شاید پھر بھی نہ بچے مگر قتل عام کا منظر تو آنکھ میں خنجر نہ چبھوئے گا۔ کبھی بالکل خاموشی ہو جاتی، کبھی زور کی بھن بھناہٹ گھٹتی بڑھتی پھیلتی سنائی دیتی۔ زیادہ تر لوگوں کی آنکھ زمین پر تھی، یا اپنے دروازے کی دہلیز پر۔ بہت ہی کم آنکھ ایسی تھی جو پیشانی کی سطح سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ جو بہت بلند ہمت تھے وہ سانڈنی سواروں کے نیزوں کو تک رہے تھے۔ اور ہر نیزہ بردار کے نیزے کا رخ کسی گھر، کسی سینے، کسی بچے، کسی عورت پر تھا۔ لمبے نیزے ہتھوانسے ہوئے وہ بالا قد تنومند جوان جن کے چہرے پر کوئی رنگ نہ تھا، نہ خشونت، نہ برہمی، نہ جوش خوں ریزی۔ قد آدم سے ڈیڑھ سوا دو ہاتھ لمبے نیزے جن کے پھل نیزے کی لمبائی کے نصف سے کچھ کم تھے۔ لمبی باریک نوک لیکن باریکی میں پشت خار کی نزاکت نہیں تھی۔ لگتا تھا جنگلی سور کے اگلے دانت کو کھرچ کر اور سیدھا کر کے نوک کو اور تیکھا کر کے انی کی طرح نیزے کے اوپر جڑ دیا گیا تھا اور اوپر سے چاندی کا خول چڑھا دیا گیا تھا۔ سواروں کی نشست اپنے جانور پر اور نیزوں کی نشست اپنے مالک کے دست و بازو و شانہ پر ایسی تھی کہ دونوں مل کر یک جان ہو گئے تھے، پورا پیکر ایک نیزہ بن گیا تھا۔

گاؤں کی سرحد پر تھوڑا بہت شور۔ سپاہیوں کی قطار گویا آپ سے آپ ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوئی۔ آگے آگے مہاراول گجندر پتی سنگھ اپنے عربی گھوڑے پر سوار، لیکن ننگے سر۔ ننگے سر...؟ گاؤں والوں نے تو کیا، شاید کھلے آسمان نے بھی یہ لرزہ خیز منظر پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ بالوں سے خوشبودار پسینہ بہ کر ماتھے اور رخساروں پر ہلکا چمکتا ہوا۔ کان کے پاس سے دونوں طرف کی گھنی کاکلیں مونچھوں سے پیوستہ نہ رہ گئی تھیں۔ اور مہاراول کی سواری کے پیچھے ایک محافہ، بے پردہ۔ بے پردہ محافہ۔ ہمت والوں نے

نکھیوں سے دیکھا، آنکھیں میچ کر کھولیں، پھر دیکھا۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں، پھر دیکھا۔ محافہ بے پردہ تھا، اور من موہنی اس میں بے چادر اور جوتی۔ ناک ہاتھ پاؤں زیوروں سے عاری۔ منھ پر سرخی کا نشان نہیں، لیکن سر اٹھائے ہوئے۔ رگ گردن میں وہی خفیف سا تناؤ کہ جیسے کچھ مہینے ہوئے رانی بنی ہو اور بیاہ کر شہزادے کے شہر میں آئی ہو اور آکر اس نے شہر کے باغوں میں لعل اور پکھراج اگا دیئے ہوں اور اب گربھ کے بھاری غرور کی سربلندی سے ہم کنار ہو۔ چودہ برس کی شہزادی نے محل کی دہلیز بھی نہ دیکھی تھی لیکن میاں مخصوص اللہ کی جھونپڑی کے طاق میں اس کی تصویر، یا ہو بہو اس جیسی ماہ پارہ کی تصویر ضرور تھی۔ پھر وہ کسی نے بنائی تو ہوگی۔ من موہنی کا محافہ ٹھیک جھونپڑی کے آگے آکر رکا۔ کسی کے اشارے یا حکم کے بغیر، جیسے اسے خود معلوم تھا کہ یہی میری منزل ہے، من موہنی نے پاؤں پھیلائے اور محافے سے اترنا چاہا۔ لوگوں نے دیکھا، اس کے پاؤں میں بیڑی تھی اور سوسن جیسے نازک پاؤں میں کیا، انگلیوں تک میں کوئی زیور نہ تھا۔ فالج زدہ کی طرح پاؤں کو شانوں اور کہنیوں کے سہارے گھسیٹ کر وہ نیچے آئی اور سروقد کھڑی ہوگئی۔

''من موہنی...'' عجب دل شگاف لہجہ تھا جس میں التجا، خوف، اور دندانہ دار پیش قبض کے پھل کی طرح بے تحاشا کاٹنے اور اندر اندر قیمہ کرنے والے غصے کا درد ہلکی سی آہ میں بدل گیا تھا۔

''من موہنی ای ای...! میری طرف دیکھ۔''

لڑکی نے آنکھیں اٹھائیں۔ لیکن باپ کی آنکھ تک اس کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس کی آنکھیں اپنے گلے کے آویز، خون کبوتر کی طرح سرخ یاقوت ستارہ کو دیکھ رہی تھیں۔ دور نزدیک کی مشعلوں کے نور میں یاقوت کی کرنیں یوں پھوٹ رہی تھیں گویا من موہنی کے دل کو چیر دیں گی۔

''تو میری بیٹی، میں والا جاہ گجندر پتی مرزا تیرا باپ، میں نے تجھے اس لئے تو نہ پیدا کیا تھا کہ تو مجھے اور خود کو رسوا کرے۔ یہ تیری تصویر یہاں کہاں سے آئی؟ کس نے تجھے دیکھا اور کس نے اسے اتنی جرأت بخشی کہ وہ تیری شبیہ کو میرے پہلو میں زخم دامن دار بنادے اور پھر تیرے نام کو لوگ یوں اچھالیں کہ وہ زمین آسمان میں شہاب ثاقب کی طرح سب کے لئے مفت نظر بن جائے؟''

من موہنی کچھ نہ بولی، اس کا سر جھکا کا جھکا رہا۔ کھردری ریتلی زمین کے سنگریزے اس کے پاؤں میں چبھے ہوں گے، مگر اس کے بدن میں کوئی لرزش، بے چینی کے کوئی آثار نہ تھے۔

''موہنی...'' اس کے باپ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''ذرا مڑ کر دیکھ، وہ کس کی تصویر ہے؟

یہاں کیسے آگئی؟ تو یہاں کیسے آگئی؟ کون ہے وہ؟ اس تصویر کو چترنے والا کون ہے؟ بول تیرے منھ پر یہ کالک کے رنگ کس نے لکھے؟''

لڑکی نے آہستہ گردن موڑ کر اپنے شانوں کے پیچھے دیکھا۔ وہاں جو تصویر اپنی جوت جگا رہی تھی، اس میں بالکل وہی انداز تھا۔ وہ گہری ماشی سیاہی مائل زمین اور ننھے ننھے سفید پاشاں پھولوں کی بوٹیوں والی اوڑھنی ذرا ڈھلکتی ہوئی، پیچھے سے اجیارے کی ہلکی سی چھوٹ میں چمک دار گیسو، جن کا رنگ کہیں کہیں اوڑھنی سے اس طرح مل گیا تھا کہ اوڑھنی اور گیسو میں فرق مشکل سے ہو سکتا تھا، اور کہیں وہ بالوں سے زیادہ پرداز معلوم ہوتے تھے، اور بڑی بڑی جامنوں جیسی آنکھوں کے گوشے ایک طرف کو مائل، گویا کوئی آنے والا ہو، اور وہ اس کی آہٹ سن کر متوجہ ہوگئی ہو۔

''گردن سیدھی کر۔ میری طرف دیکھ۔'' اس بار باپ کے لہجے میں التجا، درد، خوف، کچھ نہ تھا، صرف تحکم تھا۔ من موہنی نے دھیرے دھیرے منھ موڑا۔ اب اس کا پورا چہرہ دوبارہ سب کے سامنے تھا۔ جگندر پتی مرزا عربی مشکی پر سوار پیچھے ہٹتا گیا، یہاں تک کہ وہ من موہنی سے کوئی دو سو قدم کی دوری پر جا کر ٹھہرا۔ اس نے نیزے کو گھوڑے کی پشت و شکم کے متوازی کر کے دوسرے ہاتھ میں ڈالا، اس طرح کہ نیزے کی انی کا سرا گھوڑے کی کنوتیوں کے بیچوں بیچ آگیا۔ پھر اس نے میان سے تلوار نکالی، تلوار ہتھوانس کر اس نے بازو پھیلایا۔ دیکھنے والوں کو لگا جیسے کسی آسمانی عقاب کا شہپر اس کے پنجے میں اگ آیا ہو۔ گھوڑے کو ہلکی مہمیز لگی، تلوار اور بازو ساکت اور سخت تھے۔ صبا رفتار کو رانوں سے ہلکا سا دبا کر شہزور نے خدا جانے کیا اشارہ دیا کہ گھوڑے نے ایک قدم جست کی۔ پھر کچھ دکھائی نہ دیا کہ کب وہ دو سو قدم کا فاصلہ طے کر کے من موہنی کے سر پر آپہنچا، کب تلوار کی بال سے بھی زیادہ باریک دھار من موہنی کی گردن پر اس پار سے اس پار تک خط کھینچتی چلی گئی۔ شہسوار و راہوار آگے بڑھتے چلے گئے۔ دل کی چند دھڑکنوں تک من موہنی کا سر اس کی گردن ہی پر رہا۔ پھر جیسے ٹاپ کی وہ پیکر دھمک کی تکان مردہ جسم تک پہنچی، من موہنی کا سر لڑھکتا ہوا دو چار گز کی دوری پر بے حس کھردری بھوری زمین پر تھا۔ لیکن من موہنی کے نہال قد کو زمین چومنے کے لئے کچھ لمحے اور درکار تھے۔ خون کی چادر نے اس کے سینہ و پہلو کو ڈھانک لیا، قد بالا یوں لہرایا جیسے رقص میں ہو۔ پھر بستر نرم پر پالے پوسے اس تن کو خاکستر گرم نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شہسوار دریا کی موج کی طرح لہرا کر بے تکلف یوں مڑا گویا وہ آگے جا ہی نہ رہا تھا، صرف ران باگ کی لڑگت دکھا رہا تھا۔ تلوار بھی اسی رفیق، لہراتی سی شان سے میان کے اندر تھی اور اب اس کے

ہاتھ میں نیزہ تھا۔ میاں کی جھونپڑی کے دروازے پر کشتہ پڑی ہوئی حور کی طرف اس نے نگاہ بھی نہ کی، بس نیزے کو لمبا کیا۔ سدھا ہوا ہاتھ طاق تک پہنچا۔ تصویر کے سینے کو نیزے کی انی سے چھید کر وہ اسے اس طرح باہر نکال لایا جیسے زیرآب خنجر مار کر مچھلی کے پیٹ میں لوہا اتار دیا ہو۔ ایک جھٹکا، اور تصویر زمین پر تھی، پھر ایک اشارہ، اور تصویر گھوڑے کے سموں تلے پائمال تھی۔

''یہ لوگ صبح کے پہلے پہلے گاؤں خالی کر دیں، ورنہ میں ان کی جان مال کا ذمہ دار نہ ہوں گا۔'' اس نے گردن موڑ کر کسی سے کہا۔ پھر اس نے نیزے کو اسی طرح شبارنگ گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان رکھ لیا اور مجمعے سے نکلتا چلا گیا۔

مخصوص اللہ

ایک لمبی آہ اٹھی اور عقاب کی طرح آسمان میں گم ہوگئی۔ کسی کے گلے سے، کسی کے سینے سے، کسی کے پورے وجود سے اٹھی، لیکن ہوا کی تاریکی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوا۔ ماؤں کو پکارتے بچے، بیٹیوں کو گہارتی مائیں، بوڑھے بوڑھیوں، بیویوں اور معشوقوں کو دوڑ دوڑ کر چادریں اڑھاتے نوجوان، یہ سب تھے ہی کتنے لوگ۔ جب میاں مخصوص اللہ تغدر اور طاؤس اور پیلک کے پروں سے بھری ہوئی اپنی جھولی سنبھالے ہندل پروا سے تین کوس کی دوری پر تھا تو اسے اپنے گاؤں کے جلاوطن ملے۔ اس نے کچھ پوچھا، کچھ پوچھے بغیر سمجھا، اور چپ چاپ قافلے کے آخری مسافروں میں شامل ہوگیا۔

صبح جب خوب چمک چکی تو وہ اس شاہراہ کے قریب پہنچے جو دہلی سے میرٹھ، بیانہ، ریواڑی، کوٹا کو چھوتی ہوئی دائیں مڑ کر سیدھی شمال کو لاہور اور پھر اس سے آگے شمال مغرب کی جانب گھوم کر گجرانوالہ، وزیرآباد، جہلم اور راولپنڈی، اور پھر شمال مشرق میں سری نگر ہوتی ہوئی بارہ مولہ تک چلی جاتی تھی۔ ہندل پروا کے بزرگوں نے حساب لگا کر فیصلہ کیا کہ شمال مغرب کی سمت جنوب مشرق سے بہتر ہے، حالانکہ آب و ہوا، زبان، رسم ریت، سب ہی ادھر اجنبی تھے۔ اب وہ سر شاہراہ اس انتظار میں رک گئے کہ کوئی بڑا اور معتبر قافلہ شمال مغرب کی طرف جاتا ہو تو وہ اس میں شامل ہولیں۔

تین دن اس انتظار میں لگے۔ پھر جگہ جگہ رکتے رکاتے، ٹھہرتے، رخت سفر کھولتے باندھتے، ہندل پروا کے لوگ مختلف مقام و مستقر کو اختیار کرتے اپنی ایک اصل سے دور اور ایک نئی اصل سے نزدیک ہوتے گئے۔ تھک تھک کے ہر قیام پر دو چار رہ بھی گئے۔ پانچ مہینے کی مسافت کے ہرج مرج کھینچتا یہ قافلہ جب بارہ مولہ پہنچا تو ہندل پروا کے بہت کم لوگ اس کے ساتھ تھے۔ میاں چتیرا ان کا سب سے نمایاں فرد

تھا۔ جاننے والے جانتے تھے کہ اس کے ہاتھوں میں قوس قزح اور انگلیوں میں صبح اور چاندنی کی روشنیاں اور بادلوں اور دھندلکوں کی سیاہیاں ہیں۔ چنار کا ایک خشک پتہ، ایک پیالی پانی اور ایک دومٹ میلے رنگ میاں کو مل جائیں تو وہ پورے پیڑ کو نہ سہی، اس خشک پتے کو پھر سے زندہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا قافلے کے ہر فرد نے اپنی حیثیت کے مطابق اس کی تقدیم کی اور دشمنوں سے، جانوروں سے، صعوبات سفر سے، راہوں کے ہوش ربا پیچ و خم سے اسے حتیٰ الامکان محفوظ رکھا۔

جب قافلہ بارہ مولہ پہنچا تو میاں چیترا بہت ساری راجپوتانی بولی بھول چکا تھا۔ اور چند ہی مہینے اور گذرے تھے کہ وہ کشن گڈھ قلم کی مصوری کے لئے رنگ بنانا بھی بھول گیا۔ اور کیسے نہ بھولتا، ان اطراف میں نہ تو وہ جڑی بوٹیاں تھیں، نہ وہ پتھر اور پانی، نہ وہ کیڑے مکوڑے، اور سب سے بڑھ کر نہ وہ دیویوں جیسی قد آور اور سنہرے تامڑے رنگ کے ہاتھ پاؤں والی حسین لڑکیاں جن کے ہتھوڑے کی ایک ضرب سے لاجوریا زبرجد کا بظاہر مٹ میلا ڈلا تین ٹکڑے ہو جاتا۔ پھر بڑے پتھر کو وہ آہستہ آہستہ ہلکے پانی میں دیر تک اس طرح گھستی رہتیں کہ ان کا سقیم و عقیم حصہ گھس کر زائل ہو جاتا اور نیلے نافرمان والے رنگوں جیسی تتلی یا مصری اسکیر ب جیسے فیروزی کیڑے کا رنگ نمایاں ہو جاتا۔ کشمیر کی نازک انگلیوں اور لچک دار کلائیوں میں وہ صلابت نہ تھی اور نہ ان کے ہاتھ لکڑی کے ان ہتھوڑوں کے لئے بنے تھے جو دیکھنے میں نازک اور سبک لیکن درحقیقت اتنے سخت ہوتے تھے کہ مناسب زاویے سے پتھر پر چوٹ ڈالتے ہی اپنا کام کر ڈالتے تھے۔

میاں نے کچھ دن لکڑی پر نقش و نگار بنانے کا کام کیا۔ اور حق یہ ہے کہ خوب کیا۔ کشمیری مصوری میں خط کشی کی نزاکت نہ تھی۔ یعنی وہ لوگ موٹے کوئلے یا جلی ہوئی لکڑی کی نوک سے تختے پر خاکہ اٹھاتے تھے۔ پہلے وہ لکڑی کو چیر کے تیل میں غرق رکھتے تھے تا آنکہ لکڑی خوب تیل پی کر اور بھی دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بن جاتی۔ اب وہ نرم اور تقریباً کاغذ کی طرح گول لپیٹنے کے لائق تو ہو جاتی، لیکن وہ بہت جلد ٹوٹ بھی جاتی تھی۔ اس لئے اب لاکھ کی ہلکی ہلکی تہیں وقفے وقفے سے پھیری جاتی تھیں کہ لکڑی کے منھ پر چمک اور اندر مضبوطی آئے۔ ہر تہ کے بعد لکڑی کو سائے میں رکھ کر سکھایا جاتا حتیٰ کہ وہ گتے کی طرح محسوس ہونے لگتی۔ اب اسے تصویر کشی کے قابل قرار دیا جاتا اور مصوروں کے ہاتھ اچھی قیمت پر فروخت کر دیا جاتا۔

یہ سب تو تھا، لیکن وہاں بنی ٹھنی کہاں تھی، اور وہ ریشمی جھالر جیسی جلد والے ناقے کہاں تھے، وہ بڑی بڑی ہرنیوں جیسی اور گھوڑوں سے بھی گہری آنکھوں والی سانڈنیاں کہاں تھیں کہ جن میں کسی ایک کی اونچائی دس بارہ ہاتھ سے کم نہ تھی اور جن کے پاؤں ریت پر اتنے ہلکے پڑتے تھے کہ بیاہی اور کنواری سانڈنی کی دوڑ میں کچھ فرق ہی نہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ آٹھ آٹھ ہاتھ لمبائی کے آدم خور تیندوے اور گلدار کہاں تھے جو راتوں کو گھروں کے تنگ روشن دانوں کے ذریعہ اژدہوں کی سی آہستگی سے بند کمروں میں سرک آتے تھے۔ اور وہ اپنے انسانی شکار کو ایک ہی تھپڑ میں اس طرح نیم مردہ کر دیتے کہ اس کے منھ سے سسکی بھی نہ نکلتی اور پھر اسے وہ اس صفائی سے اٹھا لے جاتے کہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے شخص کو تیندوے کے آنے اور جانے کی خبر اس وقت لگتی جب شکار کے ہاتھ سے چلم چھوٹ کر گرتی اور جلتے ہوئے تمبا کو اور کوئلے کی چنگاریاں کچے فرش پر گل چاندنی کی طرح بکھر جاتیں۔

یہاں تو سر بفلک سرو کے پیڑ تھے، مغرور، سرافراز، پر اسرار کالے دیودار تھے۔ بھاری بھر کم، بہی قد، اتنے گھنے، اتنے بخود پیچیدہ کہ لگتا تھا کوئی پرندہ انھیں اپنا مسکن نہ بناتا ہوگا، ان کی شاخوں پر گرم نوا بھی نہ ہوتا ہوگا۔ اور یہ خود بھی کسی چرند پرند سے بات نہ کرتے ہوں گے، سر بھی نہ ہلاتے ہوں گے۔ برف کی قلمیں جب ان کی ڈالی ڈالی اور پھر پتی پتی پر پھوٹ نکلتی ہوں گی تو بھی یہ کہتے کچھ نہ ہوں گے، بس شاید ذرا زمین کی طرف مائل ہو جاتے ہوں اور زبان حال سے کہتے ہوں کہ ہم ہیں تو یہیں کے، اب ہم کو حق نے سرفراز کیا ہے تو کبھی کبھی موت کی ٹھنڈک کا مزا چکھنے کے لئے یہ سنگین سوئیاں بھی ہمارے ریشے ریشے میں پیوست کر دیں۔ اچھا ہی تو کیا۔

میاں کو وہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے سیاہ مرطوب دیودار کبھی اچھے نہ لگے۔ اور رہے وہ پھول جو بارہ مولہ میں جہلم کے کنارے برف کے مہینوں کے سوا سارے برس کسی نہ کسی رنگ میں کھلتے رہتے، تو ان کی پتیاں اتنی ہلکی اور پنکھڑیوں کی رگیں اس قدر باریک ہوتی تھیں کہ مخصوص اللہ کو چنار اور کرم کے بڑے پتوں کا ڈھانچا بنانے میں زیادہ لطف آتا تھا کہ ہر طرف ہر رگ بالکل واضح، ایک تنزیبی جال سا بنا ہوا، ہر رگ خشک لیکن ریشم کے دھاگے کی طرح نرم اور لچک دار ہوتی تھی۔

بالآخر میاں نے کاغذ اور لکڑی پر نقش و نگار بنانے اور مینا کاری کا فن سیکھ لیا۔ اور دو ہی ایک برس میں وہ ان ہنرمندیوں کا مرد میدان مانا جانے لگا۔ اس کی فن کاری کے آگے لوگ اس کے لہجے، اس کی صورت شکل، اس کی چال ڈھال، سب کچھ بھول کر اسے کشمیر ہی کا فرزند سمجھ لیتے۔

دو چار برس اور گذرے۔ میاں چتیرا اب مخصوص اللہ نقاش بن گیا تھا۔ اس نے بڈگام کی رہنے والی ایک کشمیری لڑکی سلیمہ سے شادی کر لی اور وہیں منتقل ہو گیا۔ کام اس کا خوب چل نکلا تھا، لیکن پھر بھی وہ اختراعی باتیں سوچتا اور نئی اختراعوں کے لئے کوشاں رہتا۔ ہاتھی دانت کا رواج کشن گڈھ میں تھا نہیں، اور کشمیر میں جو تھوڑا بہت کانگڑا قلم رائج تھا، وہ نہ ہاتھی دانت کے خطوط کی باریکیوں کا متحمل ہو سکتا تھا، اور نہ کشن گڈھ کی بڑی تقطیع اس کو راس آسکتی تھی۔ پھر بھی، مخصوص اللہ نقاش نے خدا جانے کس طرح ہاتھی دانت پر کانگڑا اور کشن گڈھ کے امتزاج سے ایک تصویر بنی ٹھنی کی بنا ڈالی اور اسے اپنی کارگاہ کے طاق میں آویزاں کر دیا۔ کسی نے کبھی اس سے کشن گڈھ کے حالات معلوم کرنے چاہے، یا ہاتھی دانت پر بنی ہوئی اس انوکھی شبیہ کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا تو وہ بات کو صاف اڑا جاتا، اور بعض اوقات یہ بھی لگتا کہ ان موضوعات پر لب کشائی، اپنی یا کسی کی بھی، اسے گوارا نہیں۔

بنی ٹھنی کے طاق پر ہر شام چراغ جلتا تھا۔ کسی کو اس کے بارے میں پوچھنے کا یارا تو تھا نہیں، لیکن شاید روز روز، یا شاید رات رات بھر جاگ کر، اسے دیکھتے رہنے کے باعث مخصوص اللہ نقاش کے مزاج میں کچھ وارفتگی پیدا ہو چلی تھی۔ اب وہ کئی کئی دن کام نہ کرتا، کئی کئی دن چپ رہتا، کئی کئی دن کھانا نہ کھاتا، یا برائے نام کھاتا۔ کبھی کبھی وہ گھر کے آنگن میں کھلے ہوئے بادام یا خوبانی کے شگوفوں کو گنتا اور گھر کے بچوں سے شرط لگاتا کہ کون سا شگوفہ کب ثمر کی صورت اختیار کرے گا۔

پھر ایک دن مخصوص اللہ نے اعلان کر دیا کہ یہ تیل پانی والی نقاشی مجھے بالکل نہیں بھاتی۔ آج سے یہ کام بند۔ بنی ٹھنی کی تصویر بھی اٹھا کر اس نے جیب میں رکھ لی اور سر پر پگڑی کس کر بیٹھ گیا کہ اب جاتا ہی جاتا ہوں۔ اس کی بیوی نے سر پر دو ہتڑ مار کر کہا، ''اور کھاؤ گے کیا، اور ہمیں کھلاؤ گے کیا؟ اس عمر میں کوئی نیا کام تو سیکھنے سے رہے۔ لکھے پڑھے تو ہو نہیں کہ کچہری دربار میں متصدی ہی لگ جاتے۔ دھان پان ہو، احدی نفری کا کام کر نہیں سکتے۔ ہاتو بنانا یا کشتی بانی تمھارا خاندانی کام نہیں...''

''تو چپ کر، جس نے منہ دیا ہے وہ بھرے گا بھی۔ ہم کیوں فکر کریں۔'' سلیمہ کچھ اور کہنے والی تھی کہ دفعۃً مخصوص اللہ جوش میں آ گیا۔ حقے کی نے منہ سے کھینچ کر دور پھینکتا ہوا وہ بولا:

''میں کوئی تیرا کشمیری مربھکا نہیں ہوں۔ کشن گڈھ کا چتیرا ہوں۔ بس ہاتھ اٹھانے کی دیر ہے۔ اور تیرا یہ گورا رنگ، یہ نازک نازک ہاتھ پاؤں میرے کس کام آئیں گے؟ میرے گھر کی ہوتی تو تیرے ہاتھ میں ایک کلہاڑی پکڑا دیتا، سر پر پلاس کی بڑی سی جھابی اور دس گز کا رسا رکھ دیتا۔ دن بھر میں

ایک دو سانپ بچھو تجھے کاٹتے لیکن تو ہفتے بھر کا سوختہ تو بٹور لاتی۔ اب یہاں کی بھیگی ٹھنڈی پھسلواں پہاڑیوں پر تو اونچے اونچے پیڑ کیا کاٹے گی کہ گھر میں چولھا جلے۔ یہاں تو جھڑ بیری نہ جنگل جلیبی نہ مہندی نہ مولسری۔"

اسے کھانسی آنے لگی اور وہ چپ ہو گیا۔ یا شاید اسے خیال ہوا کہ بات کو دور تک اور دیر تک لے جانا ٹھیک نہیں اور اب اسے بات کو خوش اسلوبی سے ختم کرنے کا بہانہ مطلوب تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اسے پھر جوش آ گیا:

"میرا کالا رنگ تیرے برفیلے موسموں نے پیلا کر دیا۔ پالے اور بارش بھری ہواؤں نے میرا خون پتلا کر دیا، ہڈیاں کھوکھلی کر دیں... کچھ نہیں تو ایک اولاد ہی مجھے پیدا کر دے، میں اسے اپنے ڈھب کا بناؤں گا۔"

یہ کہتے کہتے میاں نے سر پر رومال رکھ کر دھوپ میں بچھی ہوئی چارپائی پر لمبی تان لی۔ پھر وہ تین دن یوں ہی پڑے رہے، کسی سے نہ بولے۔ لوگوں میں گھبراہٹ ہو گئی کہ کہیں مر تو نہیں گئے۔ لیکن بدن ان کا خاصا گرم تھا، دل کی دھڑکن بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن نہ ہلانے سے ہلتے نہ بلانے سے بولتے۔ سلیمہ نے دعائیں پڑھی ہوئی اگر بتیاں سارے میں روشن کیں۔ پاس کے مولانا سے پھونکا ہوا پانی صراحی میں لائیں اور کونے کونے میں چھڑکاؤ کیا۔ دو چار قطرے زبردستی مخصوص اللہ کے بھی حلق میں اتارے۔ دور سے ایک حکیم جی بھی بلائے گئے۔ لیکن سب بے سود۔ مخصوص اللہ پورے تین دن بے کھائے پئے ہنسے بولے پڑا رہا۔ حکیم صاحب کی تشخیص تھی کہ مرگی ہو سکتی ہے، لیکن فصد سے مریض کو کچھ فائدہ نہ ہوا۔

چوتھی صبح کو مخصوص اللہ خود سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فجر کی اذانیں ابھی ہوئی نہ تھیں۔ لیکن میاں نماز کا کچھ خاص پابند بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ چرار شریف کے شیخ العالم حضرت نور الدین ولی کی منقبت میں ایک قصیدہ نما گیت ضرور گاتا۔ کبھی کبھی گیت کا رخ ہند الولی کی طرف بھی ہو جاتا۔ کیفیت کے بعض لمحوں میں اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور اپنے کچھ بچکانے، ملے جلے کشمیری راجستھانی لہجے میں شیخ العالم کو یوں پکارتا، یوں ان سے باتیں کرتا گویا ان کے حضور میں حاضر ہو اور شیخ العالم بھی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اس صبح کو رات بھر کی جاگی سلیمہ کی آنکھ لگی ہی تھی کہ جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ وہ سن سے ہو کر رہ گئی۔ گھر میں ہر طرف عجب طرح کی ہلکی نیلی سبز روشنی تھی اور میاں مخصوص اللہ مصلے پر بیٹھے شیخ العالم پر

جاں نثار کررہے تھے۔ وہ ابھی اس نئی بات کا مطلب نہ سمجھ پائی تھی کہ اچھا سمجھوں یا برا، کہ میاں نے اس کی آہٹ پاکر نظریں اٹھائیں۔ ایک لمحے کے لئے بالکل سکوت رہا۔ پھر میاں نے مصلے پر اٹھ کر آنسو پونچھے، اشارے سے دودھ کا پیالہ مانگا جو مدت مدید سے اس کا ناشتہ تھا۔

دودھ پی کر اس نے اپنی کمر میں بندھے ہوئے ڈوپٹے کے بل کھولے، تین اشرفیاں فرخ سیری نکال کر بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

''میں تو نیا کام سیکھنے نئی روزی کمانے جاتا ہوں۔ تو نے سن ہی لیا ہے یہ تیل پانی والی تصویر گری میرے گوں کی نہیں۔''

''اللہ اب اس عمر میں کیا کام سیکھو گے اور کس قابل بنو گے؟ تمھاری تو مت ماری گئی ہے۔''

''تو چپ رہ۔ مردوں کے آگے عورتیں بولتی نہیں ہیں۔ بس تو چپ رہ۔'' اس کے لہجے میں اوپر اوپر محبت لیکن اندر کہیں کچھ مایوسی اور ناکامی کی چبھن تھی۔ ''میں گرم ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ ریت کے باریک ذرے سینہ وجگر میں اتارنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ لیکن یہ برف جیسی سفید اور بچھو جیسی نوکیلی ہوائیں اور ان کے کاندھوں پر سوار یخ کے ذرے میرا مقدر بن گئے تو میں ان سے بھی نبا ہوں گا۔''

''تو جا کہاں رہے ہو، مجھے بھی ساتھ کیوں نہیں لے چلتے؟''

''جاؤں گا کہاں؟ چرار شریف جاؤں گا، وہاں چلہ کھینچوں گا۔ پھر جو ہوگا، ہوگا۔''

''تو وہاں کون سا ہنر سیکھو گے؟ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو؟''

''بس یہی تو مجھ میں تجھ میں فرق ہے سلیمہ۔ مجھے چرار شریف کے دربار سے وہی گرمی ابلتی محسوس ہوتی ہے جو ویرناک کے چشمے پر ٹھنڈی ہو کر جہلم بن جاتی ہے اور سارے کشمیر کو سیراب کرتی ہے۔ چرار شریف کا بادشاہ میری بھی کھیتی کو اگائے گا، پکائے گا، گرم کرے گا۔ تیرا اور میرا پیٹ بھرے گا۔''

''یا شیخ العالم!'' پکارتا ہوا مخصوص اللہ نقاش چشم زدن میں گھر سے باہر تھا اور ایک ہی دو لمحے میں اس طرح غائب ہو گیا جیسے وہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی نہیں بلکہ غبار تھا اور وہ گلیاں نہ تھیں، غار تھے۔ سلیمہ چلاتی رہ گئی کہ کہاں رہو گے کب تک لوٹو گے؟ لیکن میاں نے ایک نہ سنی۔ اس کو تو کوئی غیبی طاقت لئے جاتی تھی۔ اسے راستہ معلوم تھا نہ جگہ کی خبر تھی۔ اسے معلوم تھا تو بس اتنا کہ اگر مانس بل کی جھیل پر غروب آفتاب کے صد ہا رنگ ہیں اور اتنے باریک فرق والے متنوع رنگ کہ میرا قلم ان کو بیان نہیں کر سکتا، اگر یوس مرگ کی اونچی، مرطوب ہواؤں کی گود میں پلی ہوئی چوٹی پر بسے ہوئے گاؤں کے گرداگرد سیاہ دیودار سر بفلک یوں

کھڑے ہیں کہ سورج کی کرن وہاں سبزی مائل معلوم ہوتی ہے، گویا سارا گاؤں ہلکے پانی کی تہ میں غرق ہو، اگر بارہ مولہ کے آگے دریاے جہلم کو چڑھائی سے اترتا دیکھیں اور اس کی پھواروں میں سبز اور نیلا اور سرخ رنگ آنکھ مچولی کھیلتے دکھائی دیں اور اگر اچھی بل کے فواروں کا پانی بالکل شیشے کی قلم جیسا سفید ہو تو میری دنیا میرا کشمیر (ہاں اب یہ میرا کشمیر ہے)... یہاں کا سورج وہ سورج نہیں جو کشن گڈھ کی جھلا بور دھوپ میں بھورے کو سیاہ اور سیاہ کو نیلا اور سبز کو سرخ کر دیتا ہے، جہاں کی سیاہی چشمۂ آب حیواں کی تاریکی کو مات کرتی ہے اور جہاں کی گلابی ٹھنڈے موسموں کی دوپہر لڑکیوں کے چہرے پر جنت کا غازہ مل دیتی ہے۔ تو میں ان رنگوں کو دیکھوں گا جو میرے کشمیر کے رنگ ہیں اور میں ان رنگوں کو اپنے دل میں اتاروں گا اور ان رنگوں کے دل میں خود اتر جاؤں گا۔

تعلیم

خدا جانے کے دن کی مسافت کے بعد بھی میاں مخصوص اللہ اپنی منزل مقصود سے بہت دور تھا، لیکن بڈ گام کی بڑی مسجد سامنے تھی۔ اس نے مسجد کے وضو خانے میں پیشاب کیا، وضو کیا اور بسم اللہ کہہ کر مسجد کے صحن کی ٹھنڈک میں جا بیٹھا۔ نماز ہوئی، لوگ آئے گئے۔ بعض لوگ آئے تو دیر تک ٹھہرے رہے۔ کوئی قرآن پڑھتا رہا، کوئی نعت گنگناتا رہا، بہت سے لوگ تو مسجد کی بخاری کے پاس منڈکری مار کر پڑ رہے کہ اگلی اذان ہی پر اٹھیں گے۔ عشا کی اذان و نماز کے بعد بھی مخصوص اللہ اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ اب وہ سردی سے کانپ رہا تھا، بھوک بھی آسمان کے تاروں کی طرح اس کے بدن کے چپے چپے میں چمک رہی تھی۔

''مسافر ہو؟'' کسی نے بڑی میٹھی آواز میں پوچھا۔

''جی... جی نہیں... ہاں مسافر ہی کہہ لیجیے، یہاں غریب الدیار ہوں۔''

''کہاں جاؤ گے؟'' پوچھنے والے کے لہجے میں وادی لولاب کے گوجروں کے آہنگ کی شیرینی تھی۔ مشہور تھا کہ وہ گیت بھی گاتے ہیں تو قرآن کی قرأت کے رنگ جھلکنے لگتے ہیں۔ اور میاں کی بولی پر اب بھی راجپوتانے کی کرخت اینٹ کی سرخی والے رنگ بے تکلف بکھرے ہوئے تھے۔

''جانا کہاں تھا، پتہ نہیں۔ بس ایک اضطراب تھا جس نے گاؤں اور دہلیز چھڑا دی۔ شاید شیخ العالم...''

''شیخ العالم نے بلایا ہے تو پہنچ ہی جاؤ گے۔ لیکن زادِ راہ کیا رکھتے ہو، اور کہاں ہے تمہارا زادِ سفر؟'' اجنبی کا بدن پھرن میں پوشیدہ تھا، اور سر پر عمامہ کچھ اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ منہ صاف نظر نہ آتا

تھا۔اس کی کیفیت ٹھیک سے کھلتی نہ تھی، صرف دائیں ہاتھ کی تسبیح دھیرے دھیرے گردش کر کے اسے عام لوگوں کے قریب کر رہی تھی۔متوسط ڈیل، اکہرا بدن، ناک آنکھ میں کوئی غیر معمولی بات بظاہر نہ تھی، ہاں ہاتھوں کی انگلیاں بادام کے شگوفوں کی طرح نازک تھیں۔

''زادسفر؟'' مخصوص اللہ نے زیرلب دہرایا۔''عمل میرے پاس کوئی نہیں۔علم سے بھی بے بہرہ ہوں۔صرف ایک بے قراری ہے۔ایک جبر ہے جو کشاں کشاں آپ کے قدموں میں لے آیا ہے۔لیکن آپ ....؟''

میاں نے ہمت کر کے کہنے کو تو یہ فقرہ کہہ دیا، مگر پھر پچھتایا کہ تجھے یہ سوال کرنے کا حق کس نے دیا؟ ابھی تو تیری ہی زندگی معرض سوال میں ہے۔

''کھانا کب کھایا تم نے؟'' بڑی میٹھی آواز میں، لیکن اس کے سوال کو سنی ان سنی کر کے پوچھا گیا۔

''گھر سے کھا کر نہیں چلا تھا۔چلا تھا تو گاندربل کے آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔جہلم کے کنارے بید مجنوں کی آنکھیں تر تھیں، آج خدا جانے کتنے دن ہو گئے۔''

''تو آؤ، پہلے کھانا کھاتے ہیں۔''

کچھ اور کہے سنے بغیر میاں مخصوص اللہ ان بزرگ کے ساتھ ہولیا۔مسجد کی گلی سے نکلیں تو ایک بڑی سی حویلی ملتی تھی۔حویلی تھی، کہ خانقاہ تھی، کہ کارخانہ تھی، سب کچھ یک جا لگ رہا تھا۔دونوں ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئے جس کے چوبی فرش کا زیادہ تر حصہ قیمتی قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔فضا میں عطر زعفران کی خفیف سی مہک تھی۔اوپر شمعوں کے بجائے چیر اور سفیدے کی شاخوں کو کہیں مشعل، کہیں شمع کی صورت دے کر روشن کر دیا گیا تھا۔چیر اور سفیدے کی خوشبو عطر زعفران سے مل کر نئی بہار دے رہی تھی۔چوبی شمعوں اور مشعلوں کی مہک، ان کا ہلکا سا دھواں، ان کے چٹک کر جلنے کی آوازیں، موسیقی سے لبریز، مگر دھیمی، دس دس بارہ بارہ کے جتھوں میں فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی آہستہ گفتگو کی ریشمی لہراہٹ، ان سب نے ماحول پر ایک ناقابل بیان لیکن شدت سے محسوس کیفیت کی چادر ڈال دی تھی۔

ہر جتھے میں لوگوں کے سامنے کوئی پون ہاتھ بھر کی اونچائی اور سات آٹھ ہاتھ لمبی چوکیاں شاہ بلوط کی، جن پر کوئی دسترخوان نہ تھا، لیکن ہر چوکی پر ایک بھنا ہوا مسلم گوسفند اور اس کے چاروں جانب

روٹیوں کے ڈھیر۔ کچھ لوگ چپ چاپ کھا رہے تھے، کچھ لوگ دونوالوں کے بیچ میں بہت دھیمے لہجے میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔ مخصوص اللہ اور وہ بزرگ جب اندر آئے تو ایک لمحے کے لئے سب لوگ ان کی طرف مودب انداز میں متوجہ ہوئے لیکن کوئی بولا کچھ نہیں۔ دونوں ایک کونے میں خالی چوکی کے آگے بیٹھ گئے۔ اس ذرا سی خاموش توقیر کے سوا کوئی اشارہ اس بات کا نہ تھا کہ وہ بزرگ وہاں کسی خاص حیثیت کے مالک ہیں۔

جب کان اور زبان وہاں کی گفتگو کے آہنگ اور کھانے کے ذائقے سے آشنا ہوئے تو مخصوص اللہ نے کمرے میں موجود لوگوں کی طرف پوری توجہ کی۔ اسے حیرت ہوئی کہ بولنے کو تو وہ لوگ کشمیری ہی بول رہے تھے، لیکن ان کے اکثر الفاظ اس کے لئے بالکل معنی بیگانہ تھے، اور ان لوگوں کا لہجہ عجب طرح کا تھا، کہ وہ اپنے الفاظ کو عام لوگوں سے زیادہ تیز رفتار سے ادا کرتے تھے۔ اس نے کان لگا کر سنا تو ایک گروہ میں بات چیت کا یہ انداز تھا:

''یہاں ایک سوت کا چالیسواں اور اس جگہ تین سوت کا چوتھائی لگتا ہے۔ پھر یہ شکل بنے گی۔''
اس نے دو کاغذ دکھائے۔ ایک تو بادامی رنگ کا تھا، جس پر ہلکی شنجرفی روشنائی سے عجیب سی عبارت لکھی ہوئی تھی۔ دوسرے میں قالین کے نقشے کا ایک ٹکڑا تھا جس میں پورے رنگ دکھائے گئے تھے۔

''اس قرمزی کو اس صنوبری سے نہ ملاؤ۔ یہاں سفیدے والی سبزی آئے گی۔ اور جب یہ سبزی بید مجنوں کے ہلکے سنہرے سے ملے گی تو یہ رنگ دکھائے گی۔'' لیکن بجائے رنگ کے اس نے اسی بادامی کاغذ کا ایک کونا دکھایا جس پر شنجرفی نقش بنے ہوئے تھے۔ بولنے والے کی آواز میں بادشاہوں جیسا اعتماد اور اولیاء اللہ جیسی گیرائی تھی۔ اسی اثنا میں اٹھارہ انیس سال کے ایک لڑکے نے آکر ان بزرگ کو سلام کیا اور کچھ جھنجھلاہٹ، کچھ لاڈ بھرے لہجے میں کہا:

''استاد یہ نقشہ مجھ سے تو نہیں بننے کا۔'' اس نے ایک لمبا سا کاغذ پیش کیا، وہی بادامی رنگ، وہی شنجرفی بے معنی سے نقوش۔ ''میرے بس میں نہیں ہے اتنے دھاگوں اور اتنے رنگوں کو پڑھنا۔ کوئی پڑھ کر بولتا جائے تو...''

''وہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن تم تو تعلیم نویسی سیکھنے کے خواہاں ہو۔ پہلے تعلیم پوری طرح پڑھنا تو سیکھنی ہی ہوگی۔''

پھر ان بزرگ نے وہ لمبا، ذرا بوسیدہ بادامی کاغذ اس نوجوان کے ہاتھ سے لے کر مخصوص اللہ کو

دکھایا:

"یہ تعلیم کہلاتا ہے۔ اٹھارہ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے قالین کا پورا نقشہ یہاں درج ہے۔ ایک ایک رنگ، ایک ایک دھاگا ان علامتوں کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان کو پڑھنا ہی بہت مشکل ہے، چہ جائے کہ ایسے نقشے، یعنی ایک نئی تعلیم، خود ایجاد کرنا۔ ان کو پڑھنے والے مکتب میں کریما اور مامقیما نہیں پڑھتے، نہ ریاضی اور مساحت جانتے ہیں۔ یہ علم اور طرح کا ہے۔ اس کے جاننے والے تخیل، قوت ایجاد، اور ابداع کی بدولت کاغذ پر یہ ننھے منے بظاہر بے معنی نقش بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ یوں تو وہ اکثر اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔"

مخصوص اللہ منھ پھاڑے ان بزرگ کو تک رہا تھا۔ یہ تو گویا کوئی خفیہ زبان تھی جس کو جاننے کے لئے ریاضی، نقاشی، مصوری، رنگریزی، اور خدا جانے اور کیا کیا قوتیں درکار تھیں۔ اور غیر معمولی حافظہ، اور ایک چیز، جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا، مگر جس کا عمل یہ تھا کہ رنگوں اور لکیروں کے مجموعے کو چشم تخیل سے اسی طرح دیکھ لیا جائے جس طرح کوئی مرئی، مادی قالین دیکھا جا سکتا ہے۔

بزرگ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک اور کمرے میں لے گئے۔ یہاں کئی قالین باف اپنی اپنی کار گاہ پر کام کر رہے تھے۔ ایک سن رسیدہ شخص ذرا الگ تھوڑی سی اونچی جگہ پر بیٹھا کچھ بول رہا تھا، گویا املا کرا رہا ہو۔

"تعلیم کے ہر ٹکڑے کو "اچ" کہتے ہیں، اور اس کی ایک سطر کو "وار" کہتے ہیں۔ دھیان دے کر سنو، یہ استاد کیا کہہ رہے ہیں۔" ان بزرگ نے کہا۔

استاد نے اونچی آواز میں کہا:

"ایک چینی۔

"ایک زرد۔

"نو چینی۔

"تین ملائی۔

"ایک بادامی۔

"ایک اناری۔

"ایک چینی۔

''نو گلابی۔

''کیا؟''

اب سب قالین باف، جواب تک استاد کے بولے ہوئے لفظ کے مطابق قالین بن رہے تھے، یک زبان ہو کر بولے:

''ہاں جی، کیا۔ چلیے بھائی چلیے۔''

مخصوص اللہ نے آگے بڑھ کر استاد کے تعلیمی کاغذ کو غور سے دیکھا۔ صرف علامتیں ہی علامتیں تھیں، کچھ اس طرح کی:

\ 0

0 M 9 M 8

C

_

مخصوص اللہ نے حیرت اور الجھن کی نگاہ سے بزرگ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولے (۱)۔

''پریشان نہ ہو، سیکھنے پر سب آسان ہو جاتا ہے۔ پہلی علامت ہے، ''ایک چینی''، یعنی شکری رنگ ایک بار۔ دوسری علامت کہتی ہے، ''ایک زرد''، یعنی ایک بار زرد رنگ۔ تیسری علامت کے معنی ہیں، ''نو چینی''، یعنی نو بار شکری رنگ۔ چوتھی علامت دلالت کرتی ہے، ''تین ملائی''، یعنی تین بار ملائی کا رنگ۔ پانچویں علامت کہتی ہے، ''ایک بادام''، یعنی ایک بار بادامی رنگ۔ یوں ہی یہ علامتیں مختلف رنگوں اور دھاگوں کی تعداد کو بیان کرتی ہیں۔ تعلیم کی ایک سطر ختم کر کے استاد پوچھتا ہے، 'کیا؟'، یعنی 'کیا تم سب لوگوں نے اسی طرح کام کر لیا جس طرح میں نے آواز دی تھی؟' قالین باف جواب دیتے ہیں، 'ہاں جی، کیا۔' پھر کہتے ہیں 'چلیے بھائی، چلیے'، یا وہ کہتے ہیں، 'چلیے استاد، چلیے۔' یعنی اب اگلی وار بولیے۔''

''سبحان اللہ، تعلیم کو سمجھنا اسے ایجاد کرنے سے کچھ ہی کم باریکی کا طلب گار ہے۔''

ان بزرگ نے بات جاری رکھی، لیکن اب ان کے لہجے میں کچھ خطابت، کچھ ترغیب کا انداز تھا۔ ''تم رنگوں کے رسیا ہو، لیکن چمکنے والوں رنگوں کی طرح شوخ رنگ، اور چیر کے تیل کی طرح چکنے اور

(۱) ملحوظ رہے کہ اوپر جو علامتیں بنی ہوئی ہیں ان کا رومن حروف یا انگریزی گنتیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں انھیں آسانی سے سمجھ میں آجانے کی غرض سے اس طرح بنا دیا گیا ہے۔ اصل علامتیں ان سے ملتی جلتی ہیں لیکن وہ صحیح معنی میں علامتیں ہیں، حرف یا عدد نہیں ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ان پر حرف یا عدد کا دھوکا ہوتا ہے۔

صابن کے جھاگ جیسی جھلملاتی شفافیت رکھنے والے اور ہاتھوں سے بار بار پھسل جانے والے روشن رنگ ، جلتے ہوئے، آپس میں متصادم لیکن کسی نہ کسی سطح پر بہم آمیز حقیقت وجودی کی طرح اپنی اپنی خصوصیت کو بر قرار رکھنے والے رنگ، تمھاری تلاش کا مقصود ہیں۔تم صفحۂ قرطاس پر باغ لگانا چاہتے ہو جس میں فوارے ہوں، پرند ہوں، ہنگولوں کے جھنڈ ہوں۔تم پہاڑوں کی تصویر بنانا چاہتے ہو جن میں درختوں کے سائے کی سیاہ وسفید دھاریاں ہوں اور ابر آسا تیندوؤں کا بے پرواخرام ہو، تیندوے جن کے بدن ولر کے کنارے اگتی ہوئی گھاس جیسے لچک دار ہیں۔ان کے رنگ برف کے اور دیودار کے رنگ میں مل جاتے ہیں تو تیندوا غائب ہو جاتا ہے اور اس کے رنگ جب سفید دودھیا برف کے پس منظر میں ہوں تو اس کے سمور سے اتنی تیز روشنی پھوٹتی ہے کہ برف اسے لپیٹ لیتی ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ برف تیندوے کو کلید پیچ نامہ بنا دیتی ہے کہ اسے کوئی پڑھ نہیں سکتا۔"

انھوں نے ایک لحظہ توقف کیا، ان کی نگاہیں کہیں دور دیکھنے لگی تھیں، جیسے وہ برف زار، وہ تیندوا، وہ سیاہ دیودار جن کے اطراف میں برف ہی جیسے سفید قلیچ چکور دن بھر اپنا کھانا ڈھونڈتے ہیں، وہ سب ان کی آنکھ کے سامنے ہوں اور مخصوص اللہ کہیں بہت دور او جھل ہو چکا ہو۔ مخصوص اللہ کو بہر حال قطع کلام کرنے یا لقمہ دینے کا یارا نہ تھا۔

"تم ڈیڑھ دو گز کے ریچھ کو بیس گز اور اس سے بھی زیادہ اونچے دیودار اور بلوط کے سائے میں یوں سوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہو کہ ایک طرف سے سایہ اور بدن متحد دکھائی دیں اور ایک طرف سے الگ دکھائی دیں۔تم حرم الٰہی کے لطیف سبز اور حرم نبوی کے گہرے سبز کو یکجا کرنا چاہتے ہو اور تم یہ بھی چاہتے ہو کہ کسی طرح ان سرخ نارنجی اور آسمانی طاؤسی رنگوں کے راز جان لو جنھیں لداخی اور تبتی عورتیں اپنے قالینوں میں استعمال کرتی ہیں۔تو یہ ساری دنیا، یہ ساری کائنات، رنگوں کے پیچ در پیچ لہریوں کے سوا کچھ نہیں، ہاں ان سے اوپر وہ رنگ ہے جس کا کوئی رنگ نہیں..."

میاں مخصوص اللہ ہونقوں کی طرح ان بزرگ کا منہ تک رہا تھا۔اس کی سمجھ میں کوئی بات ٹھیک سے نہ آ رہی تھی۔ یہ بزرگ میرا مذاق اڑا رہے ہیں یا سچ مچ میرے دل کا حال جانتے ہیں اور انھیں واقعی معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے ،اور یہ بھی کہ مجھے جو کرنا ہے وہ کس طرح عمل میں آ سکتا ہے؟

ان بزرگ نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر اچانک انھوں نے آنکھ کھول کر مخصوص اللہ کا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا اور بولے:

''آؤ، میں تمھیں تعلیم نویسی سکھاؤں گا۔ قالین بافی بھی ایک طرح کی مصوری ہے، اور تعلیم وہ حروف راز جن میں قالین کا نقش خیالی پنہاں ہے۔ تعلیم نویس اپنے زور تخیل سے قالین کو ہوا پر پھیلاتا ہے، اسے خیالوں ہی خیالوں میں ہر طرف سے، ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ دائیں سے دیکھیں تو کیسا معلوم ہو گا؟ اوپر سے کیسا دکھائی دے گا؟ قالین دیوار پر ٹنگا ہو اور مقابل کی دیوار پر آئینہ ہو تو کیسا لگے گا؟ قالین اگر پورے فرش پر بچھے تو کیا تاثر حاصل ہوگا، اور اگر اس طرح بچھے کہ اس پر روشنی باہر سے بھی پڑ رہی ہو تو کیا صورت ہوگی؟ اس طرح کے کتنے ہی نکات ہیں جنھیں تعلیم نویس قالین کو اپنے ذہن میں متشکل کر کے ہی فیصل کر سکتا ہے۔''

اس نے ایک لمحے کو سکوت کیا تو مخصوص اللہ نے ہمت کر کے کہا:

''م... مگر میں تو ت... تصویر ہی بنانا جانتا ہوں، اور تصویر کو کاغذ پر بناتے ہوئے تمام باتوں کا لحاظ رکھ سکتا ہوں۔''

''ہمارے بزرگوں نے ایران اور کاشان اور اقصائے چین سے جو نمونے اور طرز اور طریق عمل صدیاں گذریں سیکھے تھے، تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ ہمارے پاس اسی طرح موجود ہیں؟ ایک طرح سے دیکھو تو وہ بالکل ویسے ہی ہیں اور ایک طرح سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر دور کے تعلیم نویسوں نے پرانی شاخوں میں نئی قلمیں لگا کر تازہ کاری کے نئے پھول کھلائے ہیں۔ ہر نئے کا دامن نئی بیلوں، حاشیوں اور طرازوں سے از سر نو بہار ایجاد ہوتا ہے... تعلیم نویس کو شاعر، مصور، رقاص، مغنی، سب کچھ ہونا چاہیئے۔''

میاں مخصوص اللہ نے کچھ کہنے کے لئے منھ کھولا ہی تھا کہ ان بزرگ نے ذرا گونج دار، تحکم آمیز لہجے میں کہا:

''تم تعلیم سیکھو گے۔'' اس جملے میں سوال نہ تھا، اور نہ پیشین گوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ مخصوص اللہ کو اس کام کے لئے ازل ہی سے مخصوص کر لیا گیا ہو۔

''جی... جی میں؟ میں اس لائق گردانا جاؤں تو میرے لئے بڑے افتخار کی بات ہوگی۔'' مخصوص اللہ نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اچانک اس کی کمر سیدھی ہوگئی اور گردن میں خود بخود اکڑ آ گئی۔ ''حضور شاید نہیں جانتے کہ میں نے کشن گڈھ میں شبیہ سازی میں کتنا نام پیدا کیا تھا۔ شبیہ خیالی...''

''میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا،'' اچانک بزرگ کے بھی لہجے میں قطعیت سی آ گئی۔ ''میں جانتا ہوں۔ مصور یا نقاش اپنی ذات کا اصیل ہے تو اس کے لئے ہر شبیہ حقیقی ہے۔ مگر میں تم سے تعلیم

نویسی کے بارے میں پوچھتا ہوں۔‘‘

’’بسروچشم حاضر ہوں۔‘‘ مخصوص اللہ کے منھ سے نکلا۔ اس نے کسی کیفیت سے مغلوب ہو کر سر جھکا لیا، پھر اس کا سرا تنا جھکا کہ ان بزرگ کے پاؤں سے تقریباً چھو گیا۔

مخصوص اللہ نے پورے آٹھ برس جان توڑ محنت کی۔ تعلیم نویسی اس کی تاریخ میں نہ تھی لیکن اس کی روح میں تھی۔ جس بوڑھے استاد سے اس نے فن سیکھا تھا وہ اٹھتے بیٹھتے انھیں ایک قصہ سناتا:

’’سن بے اوراچھوتانے کے اجڈ، سنتا ہے؟‘‘

’’جی، سنتا ہوں۔‘‘

’’پرانے زمانے میں ایک راجا تھا، سنا؟‘‘

’’ہاں استاد، سنا۔‘‘

’’راجا تو تھا تیری طرح کا گاؤدی، لیکن اس کا وزیر بے حد عقل مند تھا، سنتا ہے؟‘‘

’’جی ہاں استاد، وزیر بہت عقیل وفہیم تھا۔‘‘

’’عقیل وفہیم تو میں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا بے حد عقل مند تھا۔‘‘

’’معافی چاہتا ہوں استاد، وزیر بے حد عقل مند تھا۔‘‘

’’میں کہتا کچھ ہوں تو سنتا کچھ ہے۔ پھر تعلیم نویسی کیا سیکھے گا؟ ناگ پھنی کا دودھ پینے اور سوسمار کا گوشت کھانے سے یہ فن نہیں آتا، سمجھے میرے راجپوتی گنوار؟‘‘ پھر استاد تمام حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا، ’’سنو اے احمق ہنگولوں کی اولادو، ایک راجا تھا پرانے وقتوں میں۔ بڑا احمق لیکن فن کا دلدادہ، اور اس کا وزیر تھا بے حد عقل مند۔ سنتے ہو تبتی بدھ پنتی عورتوں کی یادگارو؟‘‘

سب لوگ یہ قصہ ایک سے زیادہ بار سن چکے تھے، لیکن یک زبان ہو کر کہتے، ’’جی استاد، سن رہے ہیں۔‘‘

’’راجا نے وزیر سے کہا: مجھے خطاطی سکھا دے۔ وزیر نے کہا، جہاں پناہ خطاطی سیکھنے کے لئے رقاص بننا ضروری ہے۔ تو پھر چل، پہلے نرت سکھا دے، راجا نے کہا۔ وزیر نے جواب دیا... معلوم ہے کیا جواب دیا؟‘‘

سب کو معلوم تھا، مگر کوئی بولا نہیں۔ ’’وزیر نے کہا،‘‘ استاد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بیان

کیا، ’’مگر عالم پناہ، رقص جاننے کے لئے مصور ہونا ضروری ہے۔ تو کوئی بات نہیں، مصوری ہی سیکھتے ہیں، راجا بولا۔ مگر وزیر نے کہا، لیکن ظل الٰہی، مصور وہی ہو سکتا ہے جو اچھا معمار ہو۔ راجا کو بڑا غصہ آیا، یہ کیا بکواس ہے۔ اچھا یوں ہی سہی، آج سے معماری سیکھنا شروع کرتا ہوں۔ وزیر تھوڑی دیر چپ رہا، پھر بولا... معلوم ہے وزیر اب کیا کہے گا؟‘‘

ظاہر ہے کہ سب جانتے تھے، لیکن سب حسب سابق چپ رہے۔ استاد نے فتح مندانہ انداز میں بتایا: ’’وزیر نے کہا ملجا و ماوائے ما، عالی جاہ، معمار وہی ہو سکتا ہے جو مہندس ہو۔ ٹھیک ہے، کہیں تو بات شروع ہو گی، راجا نے ہنس کر کہا۔ میں مہندس بننے کو تیار ہوں۔‘‘

استاد نے تجسس پیدا کرنے والی خاموشی اختیار کی، پھر رک رک کر بولے، ’’لیکن وزیر نے جواب دیا... وزیر نے جواب دیا، ظل سبحانی، منہدس بننے کے لئے نرتک ہونا ضروری ہے!‘‘

’’اور نرتک وہی بن سکتا ہے جو خطاط ہو۔‘‘ استاد نے زیر لب سے لہجے میں کہا۔ پھر جیسے ایک دو دم تک وہ سانس روکے رہے تھے، لمبی سانس لے کر بولے:

’’انسان کا وجود غیر منقسم ہے۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ جسم کہاں ختم ہوتا ہے اور روح کہاں شروع ہوتی ہے؟ کیا تم جانتے ہو کہ جو سن نہیں سکتا وہ زیادہ اچھا دیکھ سکتا ہے؟ لیکن جو سن نہیں سکتا وہ بول نہیں سکتا۔ اور جو بول نہیں سکتا وہ گا نہیں سکتا، لیکن وہ ناچ سکتا ہے۔ سات سروں کے درمیان کوئی دیوار نہیں ساتوں سر آپس میں حل ہو کر ایک بھی ہو سکتے ہیں اور الگ الگ بھی سنائی دے سکتے ہیں۔ یہ سب فن شریف انسانی وجود ہیں اور انسانی وجود کی تمثیل سات سر، ست رنگ اور سات سوز اویے ہیں۔‘‘

مخصوص اللہ کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ سب سمجھ سکوں تو کائنات کو ایک ہی تعلیم میں سمو دوں، اس نے خود سے کہا۔

استاد نے کہنا شروع کیا: ’’دیکھنا سیکھو، اور دیکھنا تب سیکھو گے جب رنگوں کا ترانہ سن سکو گے۔ مخصوص اللہ، سبز رنگ کتنی طرح کے ہوتے ہیں؟‘‘ اس کی آنکھ مخصوص اللہ پر یوں تھی جیسے کسی کے سینے پر خنجر کی انی رکھ دی جاتی ہے۔

’’س... سبز رنگ؟ استاد، سبز رنگ ہوں گے یہی... یہی ک... کوئی پندرہ سولہ طرح کے...‘‘

استاد نے گھور کر اسے دیکھا، خنجر کی انی ایک ذرا سی سینے میں اتر گئی۔

’’کیا فضول شخص ہے۔ ارے میاں، سبز کے کوئی ساٹھ باسٹھ روپ تو میں تجھے ابھی دکھا دیتا۔

بس دیدۂ بینا درکار ہے۔ ذرا موسم کے لحاظ سے سوچ، وقت کے لحاظ سے سوچ۔''

''جی ہاں، استاد۔'' مخصوص اللہ نے کچھ سمجھے بغیر جواب دیا۔

''نہیں، ابھی تو نے سوچا نہیں، میرا میاں،'' استاد نے اچانک چمکارنے کا لہجہ اختیار کر لیا۔ ''میرا میاں، ذرا گرمیوں کے موسم میں، جب مانس بل پر سورج ڈوبتا ہے تو اس وقت چنار کے سبز پتوں کی سبزی اور سیب کے کچے پھلوں کی سبزی کو سوچ۔ بارشوں کے فوراً بعد سیاہ دیودار سے پھوٹتی کونپلوں کی سبزی کو دیکھ۔ زمرد کی اس ڈال کی سبزی کو سوچ جو ابھی ابھی معدن سے نکلی ہے، جس کے بیچ میں کھرا نگینہ ہے اور جس کے چاروں طرف کچے زمرد کی ملگجی ہریالی ہے۔ دونوں کے رنگ میں کیا فرق ہے، یہ سوچ۔ اور گرمیاں ختم ہوتے ہوتے ولر کی وادی میں دھان کی اگتی ہوئی بالیوں کی زرد سنہری سبزی کو دیکھ۔ پھر کیاریوں میں ٹھہرے ہوئے پانی میں دھان کی بالیوں کے عکس کا رنگ دیکھ جب اس پانی میں آسمان کی نیلاہٹ بھی منعکس ہو رہی ہو۔ اور اسی پانی میں لہراتے سانپ کی ہری لمبائی کو سوچ... اور بالآخر یہ سب کیا ہیں؟ وہی ایک سبز رنگ۔ ان کے سرگم کو سن، تب تجھے پتہ لگے گا بچے کہ تعلیم کا جال مایا جال ہے کہ اندر جال ہے۔''

مخصوص اللہ کا سر چکرا گیا۔ اتنی باریکی سے تو چیونٹی بھی نہ دیکھتی ہوگی، اس نے دل میں کہا۔

استاد چپ ہو جاتے، سب شاگرد کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ جن سے کچھ نہ بن پڑتا وہ اون اور ریشم کے لچھوں یا بادامی کاغذوں کو الٹتے پلٹتے۔ اس طرح آٹھ سال گذر گئے، مخصوص اللہ اس مدت میں کشمیر کا سب سے بڑا تعلیم نگار بن گیا۔ اس کے دماغ کی اپج، آنکھ کی تیزی، خاکے کی باریکی، سب ایسی تھیں کہ اس سے پہلے دیکھی یا سنی نہ گئی تھیں۔ آٹھ سال کے بعد وہ بارہ مولہ واپس آیا۔ اس وقت تک اس کی فن کاری کے نمونے ہندوستان اور دکن اور ایران و کاشان تک پھیل چکے تھے۔

احمد شاہ بادشاہ غازی کو وسادۂ مملکت پر پانچواں سال تھا جب مخصوص اللہ کو اللہ نے ایک بیٹا عطا کیا، گویا اس کی کامگاری اور خوش نصیبی پر قسام ازل کی مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔ بچے کا نام اس نے یحیٰ رکھا، کہ اس بچے کے وجود میں اسے اپنی صناعی اور تخلیقی وجود کے لئے حیات نو کی تمنا اور امید تھی۔

یحیٰ کی پیدائش اور مخصوص اللہ کی موت کم و بیش ایک ساتھ ہوئی، لیکن کوئی یہ نہ جان سکا نہ سمجھ سکا کہ وہ کس طرح مرا۔ جب اس کی بیوی کو درد لگے تو مخصوص اللہ اپنی ذاتی کارگاہ پر کام کر رہا تھا۔ یہ کارگاہ

الگ کمرے میں مکان کے مردانہ حصے میں تھی اور وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ مخصوص اللہ نے ایک نئی تعلیم ایجاد کی تھی اور اسے خدشہ تھا کہ میرے سوا کوئی اور اسے سمجھ بھی نہ سکے گا، اس کو پڑھ کر کامیابی سے قالین میں منتقل کرنا تو دور رہا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس میں روایتی رنگوں کے ساتھ بعض بالکل نئے رنگ، جیسے نارنجی سنہرا اور سیاہ، بھی استعمال ہوئے تھے۔ اور میاں مخصوص اللہ کو شک تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور ان رنگوں کی معنویت تک پہنچ سکے گا۔

بیوی کے دردِ زہ کی اطلاع پا کر مخصوص اللہ سب کام چھوڑ گھر کے اندر آ کر مصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے کسی سے کچھ کہا نہیں، نہ اس سے کسی نے کچھ کہا۔ بس جس طرح وہ کسی نوجوان نوآموز قالین باف کو پوری توجہ اور تندہی کے ساتھ کسی پیچیدہ تعلیم کے نکتے سمجھاتا، اسے ایک ایک دھاگے، ایک ایک گرہ سے واقف کراتا، گویا کسی بچے کا ہاتھ پکڑ کر کسی دشوار گذار وادی کے اتار چڑھاؤ پر چلواتا گھر تک لا رہا ہوتا، اسی طرح وہ مصلے پر بیٹھا اپنے اجداد، اپنے روحانی پیشواؤں، خاص کر شیخ العالم، اور خواجہ خضر، پھر اپنے نبی کا نام لے لے کر انھیں تصور میں لاتا اور ان سے ملتجی ہوتا کہ میری بیوی کی مشکل آسان کر دیجیے، میرے بچے کی راہ نئی نئی ہے، ذرا اس کا ہاتھ پکڑ لیجیے۔ ذرا توجہ دے دیجیے، وہ ناک نقشے ہاتھ پاؤں کا درست ہو۔ لڑکا پیدا ہو کہ لڑکی، اس باب میں اس کا ذہن صاف نہ تھا۔ وہ نازائیدہ کو ''بچہ'' کہہ کر اسے خیال میں لاتا اور اس کے لئے وہی الفاظ لاتا جو صیغۂ مذکر کے ہیں، لیکن عملاً اور عقلاً اس نے کوئی فیصلہ نہ کیا تھا کہ اس کی اولاد لڑکی ہوگی یا لڑکا۔

کالا گلاب

سخت سردی کی رات تھی۔ دن میں اتنی برف گری تھی کہ مخصوص اللہ کے مصلے والے برآمدے اور پہلی منزل پر واقع زچہ خانے کے درمیان لکڑی کی پرانی سیڑھی برف کا بوجھ نہ برداشت کر سکی اور صبح ہوتے ہوتے پٹاخے کی سی آواز کے ساتھ نیچے آ رہی۔ مخصوص اللہ یوں ہی مصلے پر بیٹھا رہا۔ ادھر وہ آنگن، جہاں سے سیڑھی شروع ہوتی تھی، سیڑھی کے ملبے اور برف کے تودوں سے اس طرح اٹ گیا تھا کہ اس کی صفائی کیے بغیر کسی عارضی سیڑھی کا بھی انتظام مشکل نظر آتا تھا۔ لوگ ابھی اس کوشش میں تھے کہ کہیں سے ہلکی سی لکڑی کی سیڑھی لے آئیں کہ اسی لمحے بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ اوپر سے دائی جنائی کی آواز آئی:

''واہ بھئی سلیمہ بی بی، اتنے اچھے ہاتھ پاؤں کا بچہ اور اتنا کالا رنگ، گویا نشاط باغ کا کالا گلاب، واہ جی واہ سبحان اللہ!''

پھر مبارک بادیاں گانے بجانے کا شور، اور بہت بعد میں ایک بوڑھی عورت نے زچہ خانے کی دہلیز پر آ کر پکارا، ''بچے کو لے لو'' کس طرح لے لوں، مخصوص اللہ نے دل میں کہا، راستہ تو ہے کوئی نہیں۔

آواز پھر آئی، ''بچے کو لے لو۔ اس کے کان میں اذان دینی ہے۔''

مخصوص اللہ نے اوپر دیکھا تو دائی جنائی سفید موٹے گبھے میں لپیٹی ہوئی ایک گٹھری لیے کھڑی تھی۔

''آؤ، نیچے آ جاؤ، بالکل میرے برابر۔ پھر ہاتھ پھیلا لو۔ ذرا سی تو اونچائی ہے اور ذرا سا بچہ۔ دو انچلی شال ہو تو اس میں بس لپک لو، اذان دینے میں دیر نہ ہو تو اچھا ہے۔''

ایسے کس طرح اسے نیچے لانے دوں؟ کہیں ہوا میں اس طرح پھینکے جانے کی تکان اس کو کچھ گزند نہ پہنچائے، مخصوص اللہ نے دل میں کہا۔

''نہیں، یوں نہیں۔ اسے ٹوکری میں رکھ کر رسی کے سہارے اتارو۔ میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔''

رسی سے بندھی ہوئی ایک ٹوکری نیچے لٹکائی گئی، رسی نہیں بلکہ پرانی کسی چادر کی پٹیاں پھاڑ کر انھیں بٹ لیا گیا تھا۔ ٹوکری بھی یوں ہی سی تھی، بھلا برفانی رات میں کوئی اچھی ٹوکری کہاں ملتی۔

''لاؤ، لاؤ۔ دیکھنا میں کس خوش اسلوبی سے اسے اپنے ہاتھوں پر لیتا ہوں، تکان کیا، جھٹکا بھی نہ محسوس ہوگا۔'' ٹوکری اور اس کا قیمتی سامان دھیرے دھیرے نیچے اترے، مخصوص اللہ نے پنڈلی پنڈلی برف کے گالوں میں پاؤں رکھ کر ٹوکری کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالا۔ بچے کی پیشانی چوم کر وہ بولا:

''میں نے اس کا نام محمد یحییٰ رکھ دیا ہے۔ انشاء اللہ یہ ننھی سی جان بہت دن جئے گا۔ میرا بیٹا تعلیم نویسی میں نئی جان ڈالے گا۔ ہم دونوں مل کر ملک ہند فتح کر لیں گے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے چپکے سے پھرن کے گریبان میں آنسو پونچھے، بچے کے دائیں کان میں اذان دی، بائیں میں کلمہ شہادت پڑھ کر پھونکا، پھر اس کو اپنی انگلی چساتے ہوئے اس نے دائی جنائی سے پوچھا:

''اس کی ماں تو ٹھیک ٹھاک ہے نہ؟ اس کے دودھ اترا کہ نہیں؟''

''سب کچھ ہے، سب ٹھیک ہے میاں۔ بی بی کے دودھ ابھی ذرا درد کرتے ہیں لیکن میرا منا چسر چسر پی رہا ہے۔ تم دونوں بڑے خوش نصیب ہو، اللہ کی راہ میں خیرات کرو، ہم لوگوں کو بھی الگ سے انعام دو۔''

''ہو گا، وہ سب ہو گا۔ ذرا سورج نکلے، بچے کی ماں کے ہاتھ پاؤں میں جان آجائے، پھر دیکھنا۔''

یہ کہہ کر اس نے بچے کو اس کے ماموں کی گود میں دیا جو پاس ہی کھڑا تھا۔ پھر وہ گھر سے باہر نکل گیا اور کبھی واپس نہ لوٹا۔

شروع میں تو گانے بجانے کے غل اور لوگوں کے آنے جانے کی رونقوں میں کسی نے کچھ خیال نہ کیا، لیکن جب دن خاصا چڑھ آیا تو مخصوص اللہ کی تلاش شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر میں یہ تلاش

سراسیمگی اور حواس باختگی میں بدل گئی۔ پھر دوسرے دن کی صبح ہوتے ہوتے اس امید کا سہارا لیا جانے لگا کہ میاں جلد یا بدیر لوٹ آئیں گے۔ آخر پہلے بھی تو یوں ہی اچانک غائب ہوئے تھے۔ لہٰذا بڈگام خبر بھجوائی گئی، لیکن وہاں سے کچھ پتہ نہ لگا۔

چھٹی نہانے کے بعد سلیمہ نے بزرگوں کے مزاروں پر منتیں مانیں، روزے رکھے، تعویذ لکھوا کر گھر میں پتھر کے نیچے دبائے، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ پھر ایک دن خبر ملی کہ ڈاچی گام کے جنگل میں کسی اجنبی کی لاش ملی ہے۔

برف اب بھی یوں ہی شدت سے گر رہی تھی جب سلیمہ کا چھوٹا بھائی ڈاچی گام کے لئے روانہ ہوا۔ جنگل کے رکھوالے نے اسے خبر دی کہ چند ہی کوس کے فاصلے پر اجنبی کی لاش ملی ہے اور ابھی تک کوئی اسے پہچان نہیں سکا ہے۔ برف میں کسی نہ کسی طرح پاؤں جماتے، اپنے سر وگردن کو اچھی طرح لپیٹے، پھرن کے نیچے کانگڑی روشن کئے، وہ تیز ہواؤں سے الجھتے سلجھتے کئی گھڑی میں وہاں پہنچے۔

وہ مخصوص اللہ ہی تھا۔ ایک تنومند شاہ بلوط کے تنے سے ٹیک لگائے، بدن پوری طرح ڈھانپے، گویا سو رہا ہو۔ دھڑ تک برف میں ڈھکا ہوا، چہرے پر طمانیت، شاید سوتے سوتے ہی میں اس کی جان ملک الموت نے قبض کر لی تھی۔ سخت برف باری کی شدید سردی میں جسم کی حرارت تیزی سے گرتی ہے، توانائی گھٹتی ہے۔ خون کی روانی سست پڑنے لگتی ہے، دل ایک طرف تو کوشش کرتا ہے کہ شریانوں میں خون کی رفتار بڑھائے، اور دوسری طرف سردی کے باعث گاڑھا ہوتا ہوا خون اور سکڑتی ہوئی رگیں دوران خون کے فطری آہنگ میں مداخل ہوتی ہیں۔ اس طرح دل پر غیر معمولی بوجھ پڑنے لگتا ہے، لیکن تھوڑی سی مزاحمت اور مقاومت کے بعد قلب تھکنے لگتا ہے، پھر ہاتھ پاؤں، خاص کر جسم کے وہ تمام حصے جو دل سے دور ہیں، سن ہونے لگتے ہیں۔ اگر سن نہ ہو جائیں تو غیر معمولی درد ہو اور انسان درد کے مارے جان دے دے۔ آنکھوں کی بال جیسی باریک رگوں میں خون کی کمی کے باعث نظر دھندلا جاتی ہے۔

پہلے تو دماغ بدن کے تمام عضلات کو رعشہ اور کپکپی لانے کا حکم دیتا ہے، کہ حرکت سے گرمی پیدا ہوتی ہے اور گرمی ہی توانائی ہے۔ لیکن جلد ہی کپکپی میں صرف ہونے والی توانائی (حرارت) کا تناسب اس توانائی کے مقابلے میں زیادہ ہونے لگتا ہے جو کپکپی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔ جتنی ہی سردی بڑھتی ہے، کپکپی بھی اتنی بڑھتی ہے، اور بالآخر کپکپی کے بڑھتے جانے سے توانائی اور حرارت اتنی کم ہو جاتی ہے کہ کپکپی کی بھی قوت نہیں رہ جاتی۔ پھر غنودگی سی چھانے لگتی ہے، چپ چاپ بے حس پڑے رہ جانے

میں عجب فردوسی لطف آتا ہے، روحانی تسکین سی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر مریض کی جان بچانے کے لئے کوئی اسے جھنجھوڑے اور گرم قہوہ بھی منھ سے لگا دے تو اسے قتل کر دینے کا جی چاہتا ہے۔

ایک لمبی نیند کے بعد جسم ٹھنڈا بے اضطراب و بے حس ہو جاتا ہے۔ بہت دیر بعد دماغ کی بھی روشنیاں ایک ایک کر کے بجھنے لگتی ہیں۔

مخصوص اللہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ جب اسے برف کے بستر سے اٹھا کر شال کو اس کے بدن سے الگ کیا گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے داہنے ہاتھ میں ہاتھی دانت جیسا ایک پتلا تڑا مڑا کاغذ تھا۔ اس کو بدقت بھنچی ہوئی مٹھی سے نکال کر اس کی شکنیں کچھ درست کی گئیں (زیادہ درست کرنے میں ڈر تھا کہ وہ پرانی خستہ لکڑی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔) جب ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا گیا تو پتہ لگا کہ وہ کاغذ نہ تھا۔ لیکن وہاں کے لوگ ہاتھی دانت سے واقف نہ تھے اس لئے سمجھ نہ پائے کہ کیا چیز ہے اور انھوں نے اس پر کسی جانور کی ہڈی کا گمان کیا۔ ہڈی پر ایک بے حد اجنبی، بے حد خوبصورت لڑکی کی شبیہ تھی۔ وہ بنی ٹھنی تھی، لیکن کشمیر کے رہنے والے اسے کیسے پہچانتے۔ انھوں نے تصویر کو مصور کی قبر کے پاس ہی برف میں دبا دیا۔

سلیمہ

سلیمہ نے پورے چالیس دن مخصوص اللہ کا سوگ کیا۔ میاں کے مرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے شوہر کو شاید پوری طرح سمجھ نہ سکی تھی، اور سمجھنے کی شاید کوئی سنجیدہ کوشش بھی اس نے نہ کی تھی۔ لیکن یہ بات بھی اس کے لئے معمے سے کم نہ تھی کہ اس کے ذہن میں یہ بات کہاں سے آئی کہ اس کا شوہر اس بات کا مستحق تھا کہ اس کی بیوی اسے سمجھے، اسے مجازی خدا کے علاوہ انسان بھی گردانے، اس کی ذات اور صفات کے مختلف نہاں اور بے پردہ گوشوں سے مانوس ہو۔ شوہر کو سمجھنے کا تصور بہت اجنبی اور دنیا اوپر تصور تھا، اور اس کے گھریا ماحول کی ہر روایت، ہر تربیت، اس باب میں خاموش تھی۔ عورت کے لئے شوہر در حقیقت تعویذ یا دعا کی طرح تھا، کہ جسے سمجھنے کی ضرورت نہ تھی، (بلکہ تعویذ کو تو کھول کر دیکھنا عموماً ممنوع ہی رہتا ہے، اور بسا اوقات دعا کے لفظ عربی میں ہوتے ہیں، جنھیں مسجد کے مولانا بھی شاید ٹھیک سے پڑھ یا سمجھ نہ پائیں)۔ تعویذ کو گلے میں ڈال لینا، اور دعا کا ورد کر لینا ہی مناسب اور احسن ہیں۔ ان کا تو کام بس مصیبت سے بچاؤ کرنا، بیماری کو مبدل بہ صحت کرنا، اور زندگی کے آہنگ کو ہموار رکھنا ہے۔ شوہر کے بھی یہی تفاعل ہیں۔ وہ انھیں ٹھیک سے انجام دے تو خوب ہے، اور نہیں، تو پھر خاموشی سے سہنا اور صبر سے دعا کرنا ہی عورت کا اصل وظیفۂ حیات بن جاتا ہے۔

ممکن ہے سلیمہ کے دل میں شروع سے ہی خلش رہی ہو کہ میرا شوہر ہم لوگوں میں سے نہیں ہے۔ اس کے خیالات اور ذہنی ردعمل ہم جیسے نہیں ہیں۔ وہ جس آنکھ سے دنیا کو دیکھتا ہے وہ ہم لوگوں جیسی آنکھ نہیں ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ مصور ہے، اور اس کی مصوری بھی ہمارے قلم سے کچھ مشابہت نہیں رکھتی۔ اسے خوش رکھنے کے لئے وہ طریقے کام نہ آئیں گے جو کشمیری مردوں کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

لیکن وہ کرتی بھی تو کیا کرتی؟ ازدواجی مسائل تو اوڑھنی کی گرہ، اور کرتے کے دامن میں بندھے ہی بندھے رہتے اور زندگی تمام ہو جاتی۔ کوئی مشورہ دینے والا تو تھا نہیں، اور اگر ہوتا بھی تو وہ بھی کشمیری ہی ہوتا، اسے راجپوتانے کے مرد کا گیان کہاں سے ہوتا۔ پوری زندگی سلیمہ نے اس بے نام بے چینی میں گذاری تھی کہ میرے شوہر کے باطنی وجود میں کچھ ایسی کمی ہے، جو اس کی بیوی ہونے کی حیثیت سے میں ہی پوری کر سکتی ہوں۔ مگر وہ کبھی سمجھ نہ پائی کہ مخصوص اللہ کو بھی اس کمی کا ادراک تھا کہ نہیں۔ عام طور پر میاں بیوی میں تنہائی کی بات چیت بہت کم ہوتی تھی۔ اور میاں بیوی میں کیا، چھوٹے بچوں سے کبھی کبھی بے تکلف ہونے کے سوا مخصوص اللہ کسی کے سامنے کھلتا نہ تھا۔ اور اب، جب کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو چکا تھا، اس کا جی تڑپتا تھا کہ کسی طرح اب میں وہ کچھ کر سکوں جو میاں کی زندگی میں مجھ سے نہ ہو سکا تھا۔ اور اسی تڑپ نے اس کے اوپر یہ حقیقت آشکار کی تھی کہ شوہر قلعۂ حیات کے لئے صرف فصیل نہیں ہوتا، وہ اس قلعے کا باسی بھی ہوتا ہے۔

چالیس دن کے شدید ظاہری سوگ، اور دل کے سکوت منجمد کے دوران دھیرے دھیرے اس پر یہ حقیقت بالآخر منکشف ہوئی کہ جانے والا یہاں کبھی ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ اور جب وہ یہاں ٹھہرا ہی نہیں تو ہزار برس میرے پاس رہ کر بھی کہیں اور کا اجنبی راہگیر ہی رہتا۔

پھر بھی، سلیمہ نے تہیہ کیا کہ جو شوہر زندگی میں اس کے قریب نہ آسکا تھا اسے وہ موت کے بعد قریب تر لانے کے لئے ہر جتن کرے گی۔ چنانچہ عدت پوری کر کے سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ بارہ مولہ کو خیر باد کہی اور بڈگام کو اپنی مستقل قیام گاہ قرار دیا۔ خود تو وہ نقاشی سیکھنے کی عمر میں نہ تھی، اور نہ ہی عورتیں اس فن کے لئے مناسب سمجھی جاتی تھیں، لیکن اس نے نقاشوں کے گھروں میں آنا جانا اور ان کے یہاں کی عورتوں میں کثرت سے اٹھنا بیٹھنا شروع کیا، کہ وہ نقاشوں کی افتاد مزاج اور ان کے من کی موجوں کو تھوڑا بہت جان سکے۔

چار برس چار مہینے کی عمر میں محمد یحییٰ کی بسم اللہ ہوئی۔ جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اس کی ماں نے کئی راتوں میں کہانی کہنے کے انداز میں اپنے بیٹے کو اس کے باپ کے احوال سنائے اور پھر ایک دن باتوں باتوں میں اس سے پوچھا:

”بیٹا، تیرا جی تو نہیں چاہتا اپنے اباجی کی سرزمین کو دیکھنے کا؟“

”میرے ابا کی سرزمین یہی تو ہے اماں، اور یہاں سے میں کہاں جاؤں گا؟“

"میرا مطلب یہ تھا بیٹا کہ تیرے باپ یہاں کے تو تھے نہیں، وہ دور سے آئے تھے، ملک ہند سے..."

"لیکن اماں تم تو یہاں کی ہو۔ اور میرے باپ نے بھی تو تمھیں اور اس ملک کو اپنا لیا تھا۔ میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں گا۔"

سلیمہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کئی آنسو گر کر اس کی اوڑھنی کو بھگو گئے۔ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے بیٹے کے چہرے پر باپ کے نقوش پڑھنے کی ناکام کوشش کی۔ پکے سانولے رنگ کے سوا وہاں مخصوص اللہ کا کچھ ظاہر نہ تھا۔

"اچھا میں تجھے کبھی اپنے گھر والوں کے پاس لے چلوں گی۔"

رات کے سناٹے میں مصلے پر بیٹھی ہوئی سلیمہ نے بار بار اپنے اللہ سے دعا کی۔ اللہ یہ بچہ مجھے چھوڑ کر نہ جائے، یہاں اس کے بیٹیاں ہوں، نرگس کی پہلی کلیوں کی طرح برف میں پلنے والی اور برف پگھلنے پر سب سے پہلے کھلنے والی۔ نازک اور خوبصورت، لیکن سخت جان اور سخت کوش۔ ان کے خط و خال پر دور دراز کے رنگوں کی پرچھائیں نہ ہو، انھیں کوئی باہر والا نہ لے جائے۔ اس کے بیٹوں کی زندگیاں دھان کی بالیوں کی طرح کشمیر کی وادیوں میں لہلہائیں اور اسی وادی کی ہوا میں وہ پروان چڑھیں، پھلیں پھولیں۔

محمد یحییٰ نے بہت جلد تعلیم نویسی میں نام پیدا کر لیا۔ فارسی بھی خوب پڑھی، کچھ شد بد عربی اور ریاضی میں بھی حاصل کر لی۔ اپنے ہم چشموں میں وہ مولوی بھی مشہور ہوا اور ماہر تعلیمی استاد بھی۔ چودہ پندرہ سال کا ہوتے ہوتے اس نے اچھے ہاتھ پاؤں بھی نکالے۔ صورت ایسی کہ بالکل ہو بہو باپ کی تصویر، لیکن مخصوص اللہ کے چہرے پر ایک وحشت آمیز استغراق رہا کرتا تھا، اور محمد یحییٰ کے منہ پر قلبی سکون کی ہلکی ہلکی ارتعاش آمیز روشنی کی چھوٹ تھی، جیسے صبح کاذب کے وقت لولاب کا پانی۔

محمد یحییٰ اٹھارہ برس کا ہوا تو جگہ جگہ اس کی شادی کی بات چلنے لگی۔ سلیمہ نے خوب دیکھ بھال کر اپنے مائکے کی ایک خوبصورت اور سگھڑ لڑکی سے یحییٰ کی شادی کی اور شادی کا دوسرا برس ختم ہونے کو تھا کہ اس کے یہاں جڑواں بیٹے پیدا ہوئے۔ دونوں میں ایک گھنٹے کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ ان کی شکلیں ماں سے بہت ملتی تھیں لیکن رنگ باپ ہی جیسا پختہ سانولا تھا۔ بڑے کا نام محمد داؤد اور چھوٹے کا نام محمد یعقوب رکھا

گیا۔ بڑے ہوکر دونوں نے ریشم اور زعفران اور شہد کی تجارت کا کام شروع کیا۔ بڈگام کی نسبت سے دونوں محمد داؤد بڈگامی اور محمد یعقوب بڈگامی کہلائے، لیکن اس کے سوا باپ کی کوئی خصوصیت انھوں نے نہ حاصل کی۔ تعلیم نویسی، نقاشی، چوب تراشی، قالین بافی، انھیں کسی فن سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں گلے دونوں نے بہت اچھے پائے تھے اور وہ لل دید کا کشمیری عارفانہ کلام اور ملا طاہر کی فارسی غزلیں یکساں مہارت اور ذوق وشوق سے گاتے تھے۔ رفتہ رفتہ بھائیوں کی جوڑی سارے کشمیر میں مشہور ہوگئی۔ کبھی تجارت اور کبھی موسیقی انھیں اکثر بڈگام کیا، وادی کشمیر کے بھی بہت آگے دور افتادہ علاقوں میں لے جاتی اور کبھی کبھی تو باپ بیٹوں میں مہینوں ملاقات نہ ہوتی تھی۔ مغرب میں بلخ سے لے کر مشرق میں لاہور تک وہ بےتکلف آتے جاتے تھے۔

سلیمہ کو پوتیوں کی تمنا رہ گئی۔ وہ اچھی عمر پا کر مری اور اپنی وصیت کے بموجب ڈاچی گام کے جنگل میں میاں مخصوص اللہ کی پائنتی دفن کی گئی۔ محمد یحییٰ کو اپنے بیٹوں سے مایوس ہونا بہت شاق گذرا تھا۔ اسے امید تھی کہ داؤد اور یعقوب اپنے باپ دادا کی روایت کو قائم رکھیں گے نہ کہ معمولی بنیوں کی طرح شہد کے شیشے، زعفران کی پوٹلیاں اور ریشم کے تھان لادے ہوئے وادی وادی جنگل جنگل گھومتے پھریں گے۔ اس پر مستزاد تھا ڈوم ڈھاڑیوں کی طرح ان کا گانا بجانا۔ سلیمہ لاکھ سمجھاتی لیکن یحییٰ کے دل کا رنج نہ جاتا اور خود سلیمہ کے بھی دل میں اس بات کا خار خار تو تھا ہی کہ بیٹیاں پیدا نہ ہوئیں اور بیٹے کسی کام کے نہ نکلے۔ میاں کی روح شاید جنت میں بھی بے قرار ہوگی۔

مہادا جی سندھیا

داؤد اور یعقوب کے برخلاف، کہ پکے سیلانی جیوڑے تھے، محمد یحییٰ صرف ایک بار وطن سے باہر گیا تھا۔ یہ سفر کیوں پیش آیا، اس کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ اچھا ہے کہ میں اسے مختصراً یہاں بیان کردوں، ورنہ آج کے لوگ بہت کچھ بھولتے جا رہے ہیں۔ گھرانوں کے ماضی کی بھول بھلیاں اور قوموں کی تاریخ کے طلسمی پیچ وخم میں پوشیدہ راہداریوں میں ایسے کتنے ہی واقعات کے نقوش زمانۂ حال کے دھوئیں اور گرد میں محو ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ واقعہ تو کہانی ہی جیسا لگتا ہے۔

یہ ۱۲۰۷ ہجری، مطابق ۱۷۹۲ / ۱۷۹۳ کا زمانہ تھا۔ دہلی میں غلام قادر روہیلہ کے قتل اور بہادر پٹھانوں کی تاراجی کے بعد ظل سبحانی عالی گوہر محمد عبداللہ شاہ عالم بہادر شاہ ثانی بادشاہ غازی کو دوبارہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے پانچ سال ہونے کو آرہے تھے۔ ان پانچ برسوں میں شاہ عالم بہادر شاہ ثانی کی ظاہری طاقت کو مرہٹوں کی پشت پناہی حاصل ہونے کی وجہ سے سلطنت دہلی کے سنہرے فانوسوں کے اندر دھندلاتی ہوئی شمعوں کی روشنی قریب کے لوگوں کی آنکھیں اب بھی چکا چوندھ کر رہی تھی۔ مادھو راؤ سندھیا کو مہابلی نے فرزند دلبند، وکیل مطلق، مدار المہام، عالی جاہ، مادھو راؤ جی سندھیا بہادر کے القاب وخطابات سے نوازا تھا۔ کم وبیش سارا ملک ہند اور نظام الملک اور ٹیپو سلطان کے علاقوں کو چھوڑ کر نصف سے زیادہ ملک دکن اس کے زیر نگیں تھا، کچھ تو شاہ عالم کے نام پر، کچھ پیشوا کے نام پر، اور کچھ مرہٹہ راجاؤں مہاراجوں کی طرف سے۔ کمپنی کے تحت بہت کچھ خطۂ زمین تھا تو سہی، لیکن ابھی اہل ہند کی نظر میں وہ حکم چلانے اور خراج وباج وصول کرنے کی مستحق نہ ہوئی تھی۔ حکم اس کا رہا ہو، لیکن حکومت اس کی نہ تھی۔

وہ ۲۱ ذی قعدہ، ۱۲۰۷ مطابق گیارہ جون، ۱۷۹۲ کی گرم دوپہر تھی جب بارشوں کی ہلکی سی جھلک بھری ہوائیں اپنے جلو میں لئے ہوئے مادھوراؤ سندھیا نے ایک مختصر لیکن عالیشان قافلے کے ساتھ پونا میں قدم رکھا۔ اس کا ہمنام پیشوا انیس سالہ مادھوراؤ ثانی اس کا منتظر تھا۔ لیکن سندھیا نے فرنگی ریزیڈنسی کے سامنے والے بڑے میدان میں خیمہ و خرگاہ قائم کیا اور دوسرے دن نائب چھتر پتی اشٹ پرتیندھی (۱) کے پیشوا عالی جاہ و آسماں بنگاہ کیواں مرتبت و مریخ منزلت مادھوراؤ بہادر ثانی کے دربار میں حاضر ہوا۔

مادھوراؤ سندھیا قلعۂ مبارک سے نصف کوس پر ہاتھی سے اتر گیا اور ٹانگ کی تکلیف کے باوجود باقی مسافت اس نے پاپیادہ طے کی۔ چتر زرتار جو ہمیشہ آسمان تلے اس کے سر پر سایہ فگن رہتا تھا، وہ بھی موقوف کر کے چمچماتی دھوپ میں، جب سورج کی تشدد انگیز شعاعیں ست پڑا کی ٹھگنی، سیاہ، کروڑوں برس پرانی، بے گیاہ پہاڑیوں سے ٹکرا کر آنے جانے والوں کو عدم کا پتہ بتا رہی تھیں، سندھیا نے پسینہ خشک کئے بغیر اور ایک لحظہ ٹھہرے بغیر ساری راہ ایک ساعت سے کم میں پوری کی۔ قلعۂ مبارک کے دروازے پر سندھیا نے ہتھیار الگ کئے، برہنہ پا ہوا اور دیوان عام کی آخری صف میں، صف نعال کے ذرا اوپر اپنا ڈوپٹہ زمین پر بچھا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کارچوبی بستہ تھا۔ اوپری ہتھیار تو وہ اپنے نوبت دار، یا پگاہ (۲) کے حوالے کر ہی چکا تھا، اب کسی کو یہ پوچھنے کی ہمت نہ تھی کہ اس بستے میں وہ کیا لئے جا رہا ہے۔

معاً بارگاہ کے پرلی طرف کا سیاہ مخملی پردہ کھنچا، نقارے پر ہلکی چوب پڑی اور جب پردہ پورا کھنچ چکا تو کوئی دو ہاتھ اونچا، بیس ہاتھ لمبا اور چودہ ہاتھ چوڑا چبوترا سامنے تھا۔ اس پر یمنی زرد ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے اور جگہ جگہ گلدار کی کھال یوں پڑی تھی گویا بے خیالی میں ڈال دی گئی ہو، لیکن دراصل ان کے بچھے ہونے میں بڑا انتظام مضمر تھا۔

سیاہ ٹھوس آبنوس کی اونچی چوڑی کرسی پر پیشوا مادھوراؤ ثانی متمکن تھا۔ اگر وہ خود کامل اعتماد، سیدھی کمر اور فراز گردن کے ساتھ نہ بیٹھا ہوا ہوتا تو اس کا نوجوان چھریرا بدن اور کچھ ذرا ستا ہوا سا چہرہ

---

(۱) مراٹھا طریق حکومت میں آٹھ افراد کی ایک مجلس نظم و نسق حکومت کی سربراہ ہوتی تھی۔ اسے اشٹ پرتیندھی Eight یا Council of Eight Representatives کہتے تھے، اصل طاقت کا مالک بہرحال پیشوا ہی تھا۔

(۲) باڈی گارڈ۔

جس پر شراب نوشی کی علامتیں ابھی سے نمایاں تھیں، اس بڑی سی کرسی کے لئے چھوٹا محسوس ہوتا۔ اس وقت تو وہ بھاری بھر کم کرسی ہی اس کے لئے چھوٹی لگ رہی تھی۔

مادھوراؤ سندھیا کو دیکھ کر پیشوا اپنی جگہ سے اٹھا اور ابھی وہ چبوترے کی دوسری سیڑھی ہی طے کر رہا تھا کہ سندھیا نے آگے بڑھ کر تین تسلیمات ادا کیں، اپنا زرنگار بستہ کھول کر کولہا پوری جوتیوں کی ایک مرصع جوڑی نکالی اور فارسی میں کہا:

"میرے اجداد نے اسی کام کو اپنا سرمایۂ افتخار و مباہات جانا ہے، اجازت مرحمت ہو کہ میں ان متبرک قدموں کو جوتیاں پہنانے کی سعادت حاصل کروں۔"

مادھوراؤ ثانی نے وہیں رک کر مسکراتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور سندھیا نے ذرا آگے بڑھ کر نئی جوتیاں پیشوا کو پہنا دیں، پرانی جوڑی اس نے اسی کارچوبی بستے میں لپیٹ کر بغل میں داب لی۔ چبوترۂ صدر کے عین نیچے ایک بلند زرنگار صندلی تھی جس پر سرخ و کبود ریشمی غاشیہ پڑا تھا۔ ایک گرز بردار زنگی نے قدم آگے بڑھا کر غاشیہ کھینچ لیا اور پیشوا نے گردن اور آنکھ کے خفیف اشارے سے سندھیا کو بیٹھنے کا عندیہ فرمایا۔

سندھیا کے بیٹھنے پر راگ بہار میں ایک مختصر خیر مقدمی دھرپد گایا گیا۔ پھر اور کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ دربار برخاست ہوا، گویا آج دربار صرف مادھوراؤ سندھیا کے خیر مقدم کی خاطر منعقد کیا گیا تھا۔

دوسرے دن کا دربار قلعۂ میمونہ میں نہیں، بلکہ کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ راوٹیوں، اسکوں، شامیانوں، بارگاہوں اور قناتوں کا جنگل راتوں رات اگ آیا تھا۔ ہر خیمہ باہر سے سرخ اور لاجوردی کمخواب و زربفت سے مڑھا ہوا تھا۔ امرا کے خیام میں اندر بھی یہی سماں تھا، اور ان کے بلند سنہری شمسے دور تک چمکتے تھے۔ گرمی کو معتدل بنانے کے لئے ہر جگہ گلاب کی ہلکی پھواریں تھیں اور بڑے بڑے پنکھے، اتنے بڑے بڑے کہ ایک پنکھے کو چار اور چھ پنکھا بردار اٹھاتے تھے۔ مرصع جھولیں پہنے ہوئے ہاتھی، چمڑے کی رنگین زینوں سے لدے ہوئے گھوڑے، اور ایک نئی بات جو مغل درباروں میں نہ تھی، یعنی کوئی دو ہزار جنگی گھڑسوار ساز و اسلحہ سے لیس اس پورے جنگل کو گھیرے ہوئے تھے۔ قلب اردو میں شاہی بارگاہ تھی جس میں ایک خالی تخت شاہی حضور ظل سبحانی شاہ عالم و عالمیان شاہ عالم ثانی کے وجود اور یمن قدوم کی علامت کے طور پر بچھا ہوا تھا۔ مادھوراؤ ثانی عام درباری کے لباس میں برہنہ پا، بارگاہ کے دروازے پر ٹھہرا۔ درگہ سالار نے فارسی میں پکارا کہ ستارہ کے مرہٹہ دربار کا پیشوا مادھوراؤ ثانی اعلیٰ حضرت ظل الٰہی

جہاں پناہ فلک بارگاہ شہنشاہ ہندوستان و دکن کی خدمت میں نذر پیش کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔ سب اہل دربار اٹھ کھڑے ہوئے اور مادھوراؤ سات تسلیمات بجالاتا ہوا اندر داخل ہوا، سندھیا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ تخت کے سامنے پہنچ کر مادھوراؤ ثانی نے گھٹنوں کے بل ہو کر سر جھکائے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور کمخواب کے خریطے میں بندھی ہوئی ایک سو ایک اشرفیاں تخت پر رکھ دیں۔ مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔

الٹے قدم چلتے ہوئے پیشوا اور سندھیا تخت کی بائیں جانب کا پردہ ہٹا کر ایک اور کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں پیشوا نے سندھیا کو بادشاہ کی طرف سے پانچ بے بہار قوم جواہر اور نو پارچوں پر مشتمل خلعت پہنایا، پھر اس کے ایک ہاتھ میں مرصع تلوار دی، دوسرے میں آبنوسی قلمدان مع مہر شاہی رکھا۔ سندھیا نے باہر آ کر تخت کے پائے کو بوسہ دیا، پھر مادھوراؤ کا ہاتھ چوما۔ نقیب نے اعلان کیا کہ قلمدان و شمشیر و مہر کے علاوہ بادزن طاؤسی، ایک صندلی زریں، چھ ہاتھی مع عماری و نشان، اور ایک فرس جنگی بھی اعلیٰ حضرت خلافت پناہی ظل الٰہی، فخر دودمان بابری، اخلف من اخلاف نیاگان تیموری، خاقان ابن خاقان، سلطان ابن سلطان، حضرت عالی گہر شاہ عالم بہادر شاہ ثانی خلد اللہ ملکہٗ وادام اللہ سلطانہٗ نے اپنے فرزند دلبند وکیل السلطنت عالی جاہ مادھوراؤ سندھیا کو مرحمت فرمائے ہیں۔ مبارک سلامت کا غلغلہ پھر بلند ہوا، نقاروں پر چوب پڑی، حاضرین پر گلاب، عطر و عبیر کی ہلکی بوچھار ہوئی۔ پھر سندھیا نے سامنے کھڑے ہوئے کاتب کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سر سے تانبے کا ایک بھاری خوان اتارا جس میں مخملی زرکار خوان پوش کے اوپر دو فرمان شاہی رکھے ہوئے تھے۔ سندھیا نے جھک کر فرمانوں کو تین سلام کئے، پھر بڑھ کر انھیں لیا، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھا۔ کاتب نے بڑھ کر وہ فرامین سندھیا کے سر سے اتارے، انھیں ایک ایک کر کے کھولا اور سندھیا کے سامنے پیش کیا۔

سندھیا نے ٹھہر ٹھہر کر، کھلی ہوئی متین آواز میں وہ فرامین اہل دربار کو سنائے۔ ایک کا مفہوم یہ تھا کہ نواب فلک مستطاب پیشوائے دربار مرہٹہ مادھوراؤ ثانی کو نائب السلطنت مقرر کیا جاتا ہے۔ انھیں ماہی مراتب رکھنے اور سر پیچ پر مالائے مروارید باندھنے کی خصوصی اجازت عطا کی جاتی ہے۔ مبارک باد کے شور سے تمام دربار گونج اٹھا۔ دربار میدان میں توپیں سر ہوئیں، آسمان میں چرخ اڑائے گئے، شہنائی اور نفیری بجی۔ شور تھمنے کے بعد اور اس کے پہلے کہ دوسرا فرمان پڑھا جاتا، پیشوا نے آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ میں دربار ستارہ کے پٹیل اور اپنے بھائی مادھوراؤ سندھیا کو نائب نائب السلطنت مقرر کرتا

ہوں۔ سندھیا نے جھک کر پیشوا کے قدم لئے اور دوسرا فرمان پڑھا جس کی رو سے وکیل مطلق، مدار المہام، عالی جاہ، مادھوراؤ سندھیا کو اس بات کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنا جانشین وکیل مطلق نامزد کر سکتا ہے۔

یہ ایسا اعزاز تھا جو مغل بادشاہی میں کسی کو کبھی نہ ملا تھا۔ ایک لمحے کے لئے حضار مجلس کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، لیکن جب خود پیشوا نے بڑھ کر سندھیا سے معانقہ کیا اور ''مبارکباد'' کہا تو سب کی سمجھ میں آیا کہ یہ کتنی بڑی بات ہوگئی ہے۔ سندھیا نے آگے آکر سب کو جھک کر سلام کیا۔ پھر اس نے بلند گونجتی ہوئی آواز میں دربار کا آخری اعلان سنایا:

> آج کی تاریخ سے سلطنت مغلیہ کے طول و عرض میں سینگ والے جانوروں کا ذبیحہ ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔

یہ علامتی مراعات سہی، لیکن مراٹھوں کی اندرونی سیاست کے اعتبار سے یہ مذہبی سے زیادہ سیاسی فتح تھی، کہ برہمن پیشواؤں اور چھترپتی کے برہمن وزیر نانا فرنویس سے وہ نہ ہو سکا جو کفش بردار پٹیل کے بیٹے نے کر دکھایا تھا۔ یہ لمحہ مادھوراؤ کی زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ تھا۔

دربار سے واپس آنے پر سندھیا نے ملک کے طول و عرض میں جشن منانے، مینا بازار سجانے اور خرید و فروخت کی عارضی منڈیاں قائم کرنے کا حکم دیا۔ ہدایت جاری ہوئی کہ سلطنت کے ہر بڑے شہر میں اہل ہنر اور اہل حرفہ دور دور سے جمع ہوں اور اپنی صنائع کے جوہر دکھائیں۔ اس سے اس کی منشا یہ بھی تھی کہ اس کے اعزاز و اکرام، اور سینگ والے جانوروں کے ذبیحے پر امتناع کی خبر ملک کے کونے کونے میں جلد از جلد پھیل جائے۔ اسی سلسلے میں لاہور میں ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۷ (مطابق ۳۰ جون، ۱۷۹۲) سے دو ہفتے کے لئے مینا بازار لگا اور کشمیری صنعتوں کی ایک منڈی قائم ہوئی۔ محمد یحییٰ بڈگامی اسی منڈی میں اپنی مصنوعات لے کر بطور خاص بلایا گیا تھا۔

لاہور

گرمیاں اختتام پر آتی ہی نہ تھیں، برسات کسی مشاق لولی بازار کی طرح تھی کہ منہ دکھانے کے وعدے کرتی اور جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی۔ لاہور کے چلچلاتے دن، کہ جن کی تمازت سے گھبرا کر چیل انڈا چھوڑتی تھی اور گرگٹ کا جگر کباب ہوتا تھا، اور وہ سائیں سائیں کرتی راتیں جب بیکانیر سے دن میں اٹھ کر جودھپور اور ملتان کو روندتی ہوئی، شجر حجر، ہر فرد بشر کی صورتوں کو گرد آلود کرتی ہوئی ہوائیں لاہور کے سنسان کوچہ و بازار میں ہلچل مچاتیں۔ بھلا بارش کے ایک دو چھینٹے تنور میں جلی ہوئی نان کی طرح خشک سیاہ کڑکڑاتی لاہوری زمین کا گلا کیا سیراب کرتے۔ بوند پڑتی تو چھن سے یوں سوکھ جاتی جیسے سرخ توے پر دودھ کی چھینٹ۔ گرم ٹھہری ہوئی سناٹی راتوں میں لگتا تھا شہر میں اندر باہر کوئی نہیں چاہے کوئی پکارے۔

یحیٰ بڈ گامی کو بھلا ایسی گرمی کب دیکھنے کو ملی تھی۔ ایک ایک دن بلکہ ایک ایک گھڑی اسے جہنم لگتی تھی۔ اس کے ہنر کے چرچے سارے شہر میں تھے اور اس کی دکان پر دیر رات تک شائقین کا ہجوم رہتا۔ قیمت بھی اسے منہ مانگی مل رہی تھی اور اپنے فن کی یہ توقیر اسے کشمیر میں کہاں ملتی، کہ بدخشان، ماوراء النہر، اور سیستان سے لے کر آذربائیجان، ایران، حتیٰ کہ روم کے بھی قالین باف اس کی صناعیوں پر عش عش کرتے تھے اور بوڑھے نوجوان ہنروران لاہور، جن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں، اس کے نکات فن کو سمجھنے اور سیکھنے اور اس کی ایجاد کردہ تعلیموں کی تقلید و تتبع کے لئے ساعی و کوشاں رہتے تھے۔ لیکن یحیٰ کو کشمیر کی جدائی شاق تھی اور اسے اس وقت کا انتظار تھا جب محرم شروع ہونے کے پہلے مینا بازار کا دفتر تہ ہو اور اسے وطن جانے کی اجازت ملے۔ ملا طاہر غنی کاشمیری کی رباعی دن رات اس کے ورد زبان رہتی۔

کردست ہوائے ہند دلگیر مرا

اے باد رساں بہ باغ کشمیر مرا

گشتم زحرارت غریبی بیتاب
از صبح وطن بدہ طباشیر مرا

ادھر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ محرم کا چاند دکھائی دینے میں کچھ دن باقی تھے لیکن لاہور میں حضرت خلد منزل شاہ عالم بہادر شاہ اول (زمانہ حکومت، ۱۷۰۷ تا ۱۷۱۲) کی ڈالی ہوئی رسم کے اتباع میں محرم کا اہتمام زیادہ ہونے لگا تھا، اور غرۂ محرم کی پیش آمد کے طور پر ۲۷ ذی قعدہ ہی سے شہر میں ماتمی سی ہوا چلنے لگتی تھی۔ اگلے دن مینا بازار کا اختتام وقوع پذیر ہوا اور محرم کی تیاریاں مزید زور پکڑنے لگیں۔ سیاہ کپڑوں، پٹکوں، ڈوپٹوں اور سیاہ مخمل کی جوتیوں کے ساتھ ساتھ پیش قبضوں اور خنجروں کے لئے سیاہ ڈابوں کی تلاش ہونے لگی۔ عزاخانوں کی صفائی پتائی ہونے لگی۔ بچے بوڑھے جوان عورت مرد بلا لحاظ مذہب وملت مرثیوں اور نوحوں کی بیاضوں کو جھاڑ پونچھ کر تیار، اور پہلے سے یاد کئے ہوئے رثائی کلام کو اپنے اپنے حافظوں میں تازہ کرنے لگے۔ ہیرا منڈی کے ارباب نشاط کے بالاخانوں سے بھی اب ماتمی دھنیں بلند ہونے لگیں۔

یحیٰ بڈگامی کو ماتم اور عزاداری سے کوئی خاص طوع نہ تھا، لیکن خوش عقیدگی اور احترام واکرام شہر محرم الاحرام میں وہ کسی سے کم نہ تھا۔ اس نے خود سے تجویز کیا کہ سواری اور بار برداری کے جانوروں، محافظوں اور رہنما کا انتظام ہو جائے، اور ممکن ہو تو چند دیگر مسافروں کی معیت بھی نصیب ہو جائے تو محرم کی تیسری صبح کو لاہور سے نکل کر وہ یوم عاشورہ کی شام کو سری نگر پہنچ جائے گا اور زینہ کدل کے پاس جہلم کے بائیں کنارے پر واقع شاہ ہمدان کی مسجد اور خانقاہ میں خطیبوں اور واعظوں سے فضائل ومصائب اہل بیت اطہار کا بیان بھی سن لے گا۔

یکم محرم کی شام کو اپنے سب حساب بے باق کر کے محمد یحیٰ بڈگامی اپنی سرائے سے نکل کر پالکی میں سوار ہوا اور انتظام سفر کے معاملات طے کرنے کے لئے نواں کوٹ ہوتا ہوا گاڑی بان ٹولے کی طرف چلا۔ ماتمیوں سے عزاخانے جگہ جگہ آباد تھے، لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ گاڑی بان ٹولے میں قافلہ سالاروں اور راہ دانوں کے جس گھرانے سے وہ بات کرنے جا رہا تھا، ان کے گھر کے بالکل متصل ایک سراخانہ تھا جس میں اجمیر کے زردوز وکفش دوز، کشن گڈھ کے مصور، اور جے پور کے زرگران میناکار مقیم تھے۔ یہ لوگ بھی یحیٰ کی طرح مینا بازار میں شرکت کے لئے آئے تھے، لیکن انھیں گھر لوٹنے کی جلدی نہ تھی۔ وہ کچھ تو اس وجہ سے یہیں رک گئے تھے کہ ان کے وطن اور راہ مراجعت، دونوں کا موسم اس وقت تو لاہور کے موسم سے بھی برا تھا، لیکن راستے میں برسات ہو جاتی تو سفر بمنزلہ سقر ہو جاتا۔ دوسری وجہ ان کے رک جانے کی

یہ تھی کہ وہ عشرۂ محرم میں سفر کرنے کو منحوس اور غلط جانتے تھے۔

محمد یحیٰی بڈگامی کی پالکی راجپوتانی مہمانوں کی سراگاہ کے پاس آئی تو اس نے دیکھا کہ صدر دروازے کے پیچھے جو بڑا سا صحن ہے اس میں عورتیں جمع ہو رہی ہیں۔ ان کے بال اور منھ کھلے ہوئے ہیں، باقی بدن سیاہ پوش ہے۔ عورتوں کے پیچھے کچھ مرد بھی تھے اور ان کا بھی لباس ماتمی تھا۔ مردوں کی کمروں کے ڈوپٹے یا پٹکے کھلے ہوئے تھے اور بدن پر صرف کرتا پائجامہ تھا، یا اگر کوئی قبا پوش بھی تھے تو اس کی قبا تکموں سے آزاد تھی اور کھلے ہوئے گریبان صاف نظر آتے تھے۔ ان لوگوں کے مذہب وملت کو محمد یحیٰی ٹھیک سے نہ سمجھ سکا، کہ بعض تو بے شک وشبہ مسلمان نہ تھے۔ بعضوں کے چہرے داڑھی سے عاری تھے اور وہ نہ مسلمان لگتے تھے نہ غیر مسلم۔ اتنا تو یحیٰی نے بہر حال سمجھا کہ وہ سب ماتمیان امام مظلوم تھے۔ ان کے احترام میں بڈگامی نے پالکی چھوڑ دی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سرائے کے عالی شان صدر دروازے کے محافظ خانے پر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس نے آنکھیں نیچی کر لی تھیں کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ وہ عورتوں کے ساتھ دیدہ درائی کرنا چاہتا ہے۔

چند لمحوں کے اندر اندر لیکن تقریباً غیر محسوس طریقے پر احاطۂ صحن میں موجود مردوں اور عورتوں نے خود کو اس طرح منظم کر لیا کہ عورتوں کا جھنڈ بیچ میں تھا اور مرد ان کے گرد حلقہ کیے ہوئے تھے۔ عورتوں کے سانولے چہروں پر رنج واضمحلال کی سیاہی تھی اور ان کی نگاہیں زمین کو تک رہی تھیں۔ مردوں کے چہرے کسی تاثر سے بظاہر عاری تھے۔ اچانک کہیں اندر سے ''واحسیناہ'' کی پکار اٹھی اور یحیٰی کو ایسا لگا جیسے کوئی جلوس اندر سے باہر آ رہا ہو، لیکن کوئی باہر نہ آیا۔ شاید کوئی بپتا کا مارا بیماری یا کسی مجبوری کے باعث باہر کے مجمعے میں شرکت سے معذور تھا۔ ہاں ایک لحظہ بعد کہیں باہر سے ایک ایسے بزرگ سرنگوں اور آہستہ قدم آئے جن کی چال ڈھال، چہرہ بشرہ، قماش ولباس، سب ان لوگوں سے بالکل مختلف تھے جو صحن میں مجتمع تھے۔ ان بزرگ کا عمامہ سیاہ اور ان کے شانے پر نیاں جیسے کسی سیاہ کپڑے کی چادر سے ڈھکے ہوئے تھے۔ انھوں نے آس پاس کسی طرف نگاہ نہ کی، بس مجمع کی طرف رخ کیا اور ایک عجیب سی سنسناتی ہوئی آواز میں رباعی پڑھی۔ لگتا تھا درد بھری پکار پر سسکی غالب آ رہی ہے، یا حلق وسینہ میں سسکی کو دبا کر وہ درد بھری پکار زمین کی حدوں کو چھوڑ کر آسمان سے سر ٹکرانا چاہتی ہو۔

ریحانۂ مصطفےٰ حسین ابن علی

نو بادۂ گلزار نبی بود و ولی

از تیشۂ ظلم پیشہ و خنجر بغض
دردا کہ برید ند گروہ دغلی

انھوں نے رباعی ختم کر کے چوتھا مصرع دوبارہ پڑھا، پھر تیسری بار صرف لفظ ''دردا'' کو اس طرح ادا کیا کہ راگ دیس کے پہلے سر کی الاپ صاف سنائی دی، پھر عورتوں نے اسی راگ میں، مگر موسیقی کے پیشہ ورانہ لوازم کے بغیر یوں نوحہ پڑھنا شروع کیا کہ ان بزرگ کا الاپ ختم ہو کر نوحے کے پہلے لفظ میں ضم ہو گیا۔

کسی نے کوفے کے...
کسی نے کوفے کے رستے میں دی یہ شہ کو خبر
کہ قتل ہو گئے...
کہ قتل ہو گئے مسلم اور ان کے دونوں پسر
نہ جائیں آپ جو کوفے کو...
نہ جائیں آپ جو کوفے کو اس میں ہے بہتر
یہ سن کے کہنے لگے...
یہ سن کے کہنے لگے وہ امام جن و بشر...

نوحہ پڑھنے والیوں پر خاموشی چھا گئی، جیسے امام دو جہاں کے الفاظ کو دہرانے کی قوت کسی میں نہ ہو، اور ان الفاظ کو سننے کی بھی قوت کسی میں نہ ہو۔ درختوں پر شام کے بسیرے کی خاطر آنے والے پیلی چونچوں اور گلابی گردنوں والے ہیرامن، اور گردن میں کالے کنٹھے، سرخ چونچوں والے گاڑھے ہرے طوطے اور لکھوری اینٹوں کی طرح سرخا سرخ، سفید چتیوں والے لاہوری لال، مٹ میلے لیکن سفید چتیوں والے ذرا بڑی جسامت کے سینہ باز، دورنگی نرگسیں، بازوؤں کے نیچے سفید دھبے ڈالے نازک ممولے، اور پھر وہ ہزاروں گوریاں جن کی چہکار سے سارا ماحول گرم رہتا تھا، سارے طائر اچانک ساکت و صامت لگنے لگے۔ بازار کی صدائیں مدھم پڑنے لگیں۔ پھر ایک لمحے کو سارا بازار گویا قرق ہو گیا۔ آئندو روند ٹھہر گئے، بیوپاریوں نے بیع و شریٰ موقوف کی، گھوڑ سوار، اونٹ سوار، تام جھام، رتھیں، سب ساکت و سرنگوں جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔

عورتوں کے جھنڈ کے وسط میں ایک عورت نے نہایت بلند اور تیور سر اور لمبی تان میں کہنا

شروع کیا، اس طرح کہ دونوں مصرعے قریب قریب ایک ساتھ ادا ہوئے لیکن دوسرے مصرعے کے ختم ہوتے ہوتے سر میں تھکن کے آثار نمایاں ہو گئے۔

قضا کشیدہ ٔ من می روم بہ کرب و بلا
گذشتہ نوبت مسلم رسیدہ نوبت ما

بزرگ نے ''ما'' کی آواز کے رکتے رکتے ''دردا'' کی تکرار اسی طرز سابق میں کی اور وہ اسی طرح عورتوں کے نوحے میں ضم ہو گئی۔

کسی نے کوفے کے...
کسی نے کوفے کے رستے میں...

جب پورا نوحہ اسی طرح دوبارہ پڑھا جا چکا تو ننگے سروں والے ننھے بچے، امام حسین کے پائک(۱) گریباں چاک سرا خانے سے ''حسن حسین، حسن، حسین، حسین حسین'' کہتے ہوئے اور اپنے سرو سینہ پر ہاتھوں سے ضرب لگاتے ہوئے برآمد ہوئے۔ عورتوں نے بچوں کو گھیرے میں لے لیا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی رو رو کر کہنے لگیں، ''کشتہ شد حسین، ہائے... کشتہ شد حسین۔''

بچوں کے ماتم کے ساتھ ساتھ سارے مرد بھی اپنے سینوں پر ضرب لگانے لگے، پھر آہستہ آہستہ سارا ہجوم سرا کے اندر داخل ہونے لگا۔ یحییٰ نے ایسی عزاداری، ایسی درد بھری لیکن صناعانہ کیفیت بھلا کاہے کو دیکھی تھی۔ ان آوازوں کے درد کی کھنک اس کے خون میں دھڑک رہی تھی۔ اپنے وہاں ہونے کی غایت کو بھول کر وہ جلوس کے پیچھے پیچھے سرا میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے اچانک خیال آیا کہ وہاں کسی سے معرفی تو ہے نہیں، کس کے پاس جاؤں، کیا پوچھوں؟ اور میں عزاداری میں کوئی بہت مستعد تو ہوں نہیں، مجھے تو باربرداروں اور سواریوں کا انتظام کر کے وطن کو مراجع ہونا ہے۔ ان لوگوں میں میرا کچھ خاص کام نہیں، نہ مجھے ان کے آداب و رسوم کا علم ہے۔ کہیں کوئی غلط یا الٹی بات کہہ یا کر بیٹھوں تو یہ لوگ ہنسیں گے، اور امام کی ناراضگی الگ مول لوں گا۔ اللہ اللہ مگر کیا آواز تھی، کیا معصوم سلیقہ تھا، کیا دلدوز رنجیدگی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں بے اختیار صل علیٰ کہی۔

ان خیالوں میں سے کچھ باہر نکل کر یحییٰ نے چاہا تھا کہ گاڑیبان ٹولے کا رخ کرے کہ ایک نوجوان، سبزہ رنگ و سبزہ آغاز، کشیدہ قامت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لیکن اس وقت ذرا تھکی تھکی سی،

(۱) پیک، قاصد۔

بدن پر ماشی رنگ کی شلوار قمیص، سر پر ہرا سرخ سیاہ تخفیفہ، پاؤں میں نکے دار جوتی (بعد میں یحییٰ کو معلوم ہوا کہ وہ جودھپوری گرگابی تھی)، مودب قدموں سے چلتا سرا سے باہر آیا۔ اس نے دور ہی سے یحییٰ کو اشارہ کیا کہ کہیں جایئے گا نہیں، وہیں ٹھہرے رہیئے۔ یحییٰ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا لیکن رک گیا۔ نوجوان نے قریب آ کر یحییٰ کو جھک کر سلام کیا اور کہا:

''آپ کا حصہ منتظر ہے۔ جناب نے فرمایا ہے کہ حصہ لئے بغیر نہ جائیں۔''

''حصہ؟ کیسا حصہ؟ میں سمجھا نہیں۔'' یحییٰ نے پوچھا۔

''ہمارے گاؤں میں آج کے دن اماموں کی نیاز ہوتی ہے۔ آپ نوحہ خوانی کے وقت موجود تھے، آپ کا بھی حصہ تبرک میں ہے، تشریف لائیں۔''

''مگر... مگر یہ تم لوگوں کا تو گاؤں نہیں ہے صاحبزادے، یہ تو...''

''بیشک یہ لاہور ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن ہم لوگ راجپوتانے کے ہیں، اطراف کشن گڈھ کے۔ ہمارے یہاں محرم، بیساکھی، سب منائی جاتی ہیں۔ محرم کے دنوں کے لئے ہم اپنے جناب کو بطور خاص اجمیر سے بلواتے ہیں۔ ہمارے نوحے اور تعزیئے سب اجمیر والوں کے ہیں۔''

دونوں سرائے کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ ''تو تم لوگ مسلمان نہیں ہو؟'' محمد یحییٰ نے پوچھا۔

''جی نہیں، ہم میں کچھ چتیرے ہیں اور کچھ میراثی ہیں۔ ہم لوگ عورتوں مردوں کی تصویریں بناتے یا بنگالے کے راجا گوپی چند اور اجین کے راجا بھرتھری کی گاتھائیں سناتے ہیں۔''

''اچھا؟ تو کون سے راجے مہاراجے ہیں یہ؟ اور کیا تم لوگوں کے گیت ہندی زبان میں ہیں، یا راجپوتانی زبان میں؟''

''راجا گوپی چند اور راجا بھرتھری ہزاروں لاکھوں برس پہلے کے راجا ہیں۔ وہ امر دیوتاؤں کی طرح ہیں۔ ہم ان کی گاتھائیں گانے والے گھٹیالی گاؤں کے ناتھ لوگ ہیں۔ یہ گاؤں اجمیر شریف کے پاس ہے۔ اجمیر شریف جانتے ہیں آپ؟''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں، خواجہ غریب نواز کے ماننے والے ہمارے دیار میں بہت ہیں۔''

اب وہ سرا کے لمبے چوڑے اندرونی آنگن اور اس میں بہتی ہوئی نہر کو پار کر کے سامنے کی بارہ دری میں قدم رکھ رہے تھے۔

''یہیں ٹھہرتے ہیں۔ اندر شاید پردہ ہوگا۔ ہمارے جناب ابھی تشریف لاتے ہیں۔'' نوجوان نے کہا۔

''تم اپنی زبان کے بارے میں بتا رہے تھے...''

''جی، ہم لوگ مارواڑی بولتے ہیں۔ ہندی ہم آپس میں نہیں بولتے۔ راجپوتانی کوئی زبان نہیں۔ مگر ہمارے راجپوتانے میں کئی زبانیں ہیں، بھیلی، میواڑی، بیکانیری، ڈھونڈھاری، اور بھی بہت سی ہیں۔ گھٹیالی اور ہمارے اطراف کی زبان ایک ہے، مارواڑی۔''

اتنے میں ذرا سا شور بلند ہوا، بارہ دری کا بغلی پردہ ہٹا اور وہی بزرگ کئی سن رسیدہ اور ادھیڑ مردوں کے ساتھ باہر آئے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر یحییٰ سے مصافحہ کیا اور بولے:

''بندگی عرض کرتا ہوں۔ میرا نام تقی الدین حیدر رکنا بادی ہے۔ آپ جس عقیدت اور حضوری کے ساتھ نوحہ سن رہے تھے اس نے مجھے مجبور کیا کہ آپ کو اندر تشریف آوری کی زحمت دوں۔''

محمد یحییٰ بڈگامی نے جھک کر سلام کیا اور سر اٹھاتے اٹھاتے انکھیوں سے ان بزرگ کی ایک جھلک دیکھی۔ ہلکی ایرانی طرز کی داڑھی، بہت گورا رنگ، پتلا سوتواں چہرہ، قد کشیدہ اور تھوڑا سا جھکا ہوا، گویا علم کے بوجھ یا ذکر و گریہ کی کثرت نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہو۔

''تسلیمات بجا لاتا ہوں سرکار۔ بندہ محمد یحییٰ کے نام سے موسوم ہے۔ زحمت نہیں، میرے لئے عین سعادت ہے کہ آپ جیسے مقدس بزرگ کا دیدار و مصافحہ نصیب ہوا۔''

''میں اجمیر میں قیام پذیر ہوں۔ وہاں میرے گھرانے کے کچھ افراد خواجہ بزرگ کے آستانۂ عالیہ پر خادمی کرتے ہیں۔ کچھ مصروف ذکر فضائل و مصائب اہل بیت علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ یہ ناکارہ بھی انھیں میں سے ہے۔ یہ میرے ساتھی مدت مدید سے اپنے دیہات و قریات میں عشرۂ محرم الاحرام کے دوران بھر مجالس عزا منعقد کرتے ہیں، اگرچہ اکثر ہم غیر مسلم ہیں۔ ان کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ اس محرم میں چونکہ انھیں مجبوراً یہاں ہونا تھا اس لئے بطور خاص بندے کو یہاں بلوا لیا، ورنہ کہاں یہ دور دراز خطۂ لاہور اور کہاں جلوہ گاہ خواجۂ بزرگ۔''

مولانا نے یہ سب باتیں بہت ٹھہر ٹھہر کر اور بڑی شائستہ آواز اور شستہ لہجے میں کہیں۔ ان کی بولی میں اہل لاہور یا اہل کشمیر جیسی صلابت اور ٹھوس ٹھنک نہ تھی بلکہ ایک شیریں نرمی تھی۔ محمد یحییٰ بڈگامی نے گمان کیا کہ یہ شاید دہلوی یا ایرانی لہجہ ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اجمیر سے چند ہی کوس پورب جائیں تو

ڈھونڈھاری زبان کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا، اور اس کی سرحد برج کے علاقے سے ملتی تھی۔ اس زمانے کے اہل علم کی طرح مولانا ہندی تو جانتے ہی تھے، لیکن ان کے لہجے پر دہلی کی ہندی کا نہیں بلکہ آگرے کی برج کا اثر تھا۔ محمد یحییٰ کو یہ باریکیاں نہ معلوم تھیں، لیکن اس کو مولانا کی بولی اتنی اچھی لگی کہ اس کا جی چاہا وہ یوں ہی بیٹھا انھیں سنتا رہے۔

''مولا کا کرم ہے،'' اس نے سر جھکا کر جواب دیا، ''کہ مجھے اس بہانے آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔''

''جناب کا تعلق غالباً کشمیر جنت نظیر سے ہے۔ کیا شغل فرماتے ہیں؟''

''حضور، میں قالینوں کے نقشے بناتا ہوں۔ میرے والد بھی یہی کام کرتے تھے، لیکن وہ نقاش بھی تھے۔''

لفظ ''نقاش'' کو سنتے ہی مولانا کے ہمراہیوں میں دلچسپی کی لہر سی دوڑی۔ سب معاً محمد یحییٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''میں نے سنا ہے کہ میرے والد مرحوم و مغفور آپ ہی کے اطراف سے آکر کشمیر میں بس گئے تھے۔'' محمد یحییٰ نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا۔

''اچھا! واہ واہ، کیا خوب۔'' ایک عمر رسیدہ شخص نے کہا۔ ''پرمیشور کی کرپا ہے، مولا کی مہربانی ہے کہ گھر سے ہزاروں کوس ہمیں ایک ہم وطن سے ملوا دیا۔''

''جی ہاں، مجھے بھی یہاں بڑی یگانگت محسوس ہو رہی ہے۔''

''آپ تو وہاں کے ہیں جہاں خزاں آتی ہی نہیں۔ ہمارے ملک کو تو مردھر کہتے ہیں، یعنی موت کی سرزمین۔ لیکن جینے والے وہاں بھی ہیں اور زندگی کی حرکت اور برکت وہاں بھی ہے۔'' مولانا نے فرمایا۔

''جی بیشک۔ بحر حیات کی امواج ہر جگہ گہر بار ہوتی ہیں اور ان لآلی آبدار کو مٹھیوں میں ضبط کر لینے والے ہنر مند نقاش بھی ہر جگہ ہیں۔''

''خوب فرمایا جناب نے۔ کیوں نہ ہو، آخر صناع اور اہل ہنر ہیں۔'' مولانا نے کہا۔ ''میرے ساتھیوں کے خاندان کی ایک شاخ حضرت شہاب الدین شاہجہاں علیین مکان کے وقت میں مشرف بہ اسلام ہو گئی تھی۔ وہ لوگ آج بھی اہل اسلام ہیں لیکن مصور بھی ہیں اور رادھا رانی کی تصویریں بناتے

ہیں۔"

اس بات سے گویا کچھ اشارہ پا کر اسی عمر رسیدہ شخص نے کہا:

"جناب کو بھی تصویر بنانے کا کچھ شوق ضرور ہو گا۔ میں آپ کو اپنی کچھ تصویریں دکھاؤں؟"

"جی ضرور، مجھے بڑی مسرت ہو گی۔ میرے لئے تو اعزاز کی بات ہے۔"

اتنی دیر میں باپ کا اشارہ پا کر وہی سبزہ رنگ نوجوان لپک کر اندر گیا اور چند لمحہ بعد موٹے کپڑے کا ایک بستہ لے آیا۔ سامنے ایک تخت بچھا ہوا تھا، اس کی چاندنی کو جھاڑ کر دوبارہ بچھایا گیا، پھر عمر رسیدہ شخص نے بستے کو جھاڑا پونچھا اور بڑی احتیاط سے اس کے بند کھولے۔ پہلی شبیہ کسی عورت کی تھی...

بنی ٹھنی

کاسنی رنگ کی کامدار ساری، پلو سے سر ڈھکا ہوا، لیکن ساری اس قدر باریک تھی کہ سر کا ایک ایک بال، مانگ میں چنی ہوئی افشاں کے ذرے، ماتھے کے جھومر میں جڑے ہوئے یاقوت، ہیرے، گومید اور تامڑے صاف جھلکتے تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، منھ پر بہت ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق، اور مصور اس قدر مشاق تھا کہ مسکراہٹ کی وجہ سے کانوں کی لوؤں کی سرخی اور خفیف سا کھنچاؤ تک دکھائی دیتا تھا، بلکہ محسوس ہوتا تھا۔ بڑی بڑی جامنی آنکھیں، پتلیوں کی سیاہی میں نیلگونی جھلکتی ہوئی، سیدھی ناک، بظاہر ذرا لمبی، لیکن دوبارہ دیکھیں تو بالکل مناسب معلوم ہو، ناک میں بڑا سا بلاق جس میں ایک سرمئی موتی۔ گردن اونچی اور نازک، نخوت اور اعتماد کی بلندی اس میں نمایاں تھی۔ گردن میں گول ترشے ہوئے جامنیا کے دانوں کا ہار، جس میں جگہ جگہ کسی زردی مائل گلابی پتھر کے بڑے بڑے دانے کشمیری ناشپاتیوں کی شکل میں تراشے گئے تھے۔ (یحییٰ کو بعد میں معلوم ہوا کہ اس پتھر کو ''کٹھیلا'' کہتے ہیں۔ خاص جے پور کے اس پتھر کی قیمت تو بہت نہ تھی، لیکن ان کے ''ڈھنگ'' یعنی تراش نے ان کو بہت قیمتی بنا دیا تھا۔) نازک سی ٹھوڑی پر ایک تل، گویا آنکھوں کی روشنی سے چشمک کر رہا ہو۔ ساری کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ ریشمی تھی یا کتاں کی، لیکن مصور نے عجب صناعی دکھائی تھی کہ شفافیت کے باوجود اس میں بدن کی نمائش کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ لڑکی نے ساری کے پلو کو ایک ہاتھ سے سنبھال رکھا تھا، اس طرح کہ ہتھیلی کی حنا جھلک رہی تھی، اور مخروطی لطیف انگلیوں کی پوروں میں بھی مہندی کی ہلکی سی لکیر تھی۔ انگوٹھی صرف ایک، لیکن بہت بڑے یاقوت کی جس کے چاروں طرف ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ سڈول کلائی میں جڑاؤ آرسی تھی اور دودھ جیسی نرم اور شیریں انگلیوں میں نیلگونی مائل سرمئی کنول کی بڑی سی شاداب کلی، دوسرے شانے کے ساتھ صرف بازو دکھائی دیتا تھا، لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ گود میں رکھا ہوا ہے۔

اس سب سے بڑھ کر لڑکی کے چہرے پر جمالِ ملکوتی کا وقار تھا جسے باکمال مصور نے صرف رنگ سے نہیں، بلکہ گردن کی نرم مگر ثابت قدم افرازی، نگاہ کے زاویے، اور ٹھوڑی کی ہلکی سی بلندی کے ذریعہ بھی ظاہر کیا تھا۔ اگر وہ ہلکی سی مسکراہٹ نہ ہوتی تو اس منھ پر تمکنت حسن کے بجائے جلال حسن کی تمازت ہوتی۔ اس وقت تو یہ لگتا تھا کہ کوئی پری شہزادی دل کے سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی دنیا کی تمام حسینوں پر راج کر رہی ہے۔ پوری شبیہ پر ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت تھی، گویا پری اپنی مرضی سے آئینے میں اتر آئی ہو اور آئینہ اسے آغوش میں لے کر سو گیا ہو ؎

چوں نسخۂ دقیق بہ نزدیک کم خرد

از دیدنِ تو آئینہ را خواب می برد

محمد یحییٰ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کوئی حقیقی لڑکی نہ تھی، بلکہ راجپوتانے، یا یوں کہیں کہ کشن گڈھ کی شری رادھا تھیں۔ نیلگوں سرمئی کنول کی کلی میں یہی رمز تھا۔ کلی علامت ہے دل کی، اور سری کرشن جی کا رنگ نیلگوں یا سانولا فرض کیا جاتا ہے۔ اور یہ تصویر کوئی حقیقی شبیہ نہ تھی، بلکہ ماضی بعید سے کشن گڈھ کے مصور ''بنی ٹھنی'' کے نام سے شری رادھا کی تصویریں ہی بناتے آئے تھے۔ یحییٰ کو تو ایسا لگا جیسے کسی نے مچھلی پکڑنے کے کانٹے میں الجھا کر اس کا دل باہر کھینچ لیا ہو۔ اس کا سانولا چہرہ سیاہی مائل زرد ہو گیا، ہاتھ پاؤں پر ہلکی سی لرزش طاری ہو گئی۔ لیکن اس اہتزاز میں ہوس کا شائبہ نہ تھا۔ اسے آج معلوم ہوا کہ پرستش سے شعرا کیا مطلب لیتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی انسانی وجود کو اس طرح چاہے جس طرح لوگ ساحل دریا پر چھٹکی ہوئی نارنجی روشنی میں نہاتے ہوئے آشیانوں کو واپس جاتے طیور کو چاہتے ہیں، جس طرح لوگ آدھی رات کے بعد سنتور پر بجتی ہوئی بھیروی کو چاہتے ہیں، جس طرح لوگ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر گریبان سحر کی چاکی کے پس منظر میں آبشار کی آواز کو چاہتے ہیں، جس طرح لوگ لمبے سفر کے بعد گھر کی چوکھٹ کو چاہتے ہیں، جس طرح لوگ خوبصورت قالینوں، دلفریب تصویروں کو چاہتے ہیں کہ بس دیکھتے رہیئے، سنتے رہیئے۔ نہ کچھ غرض ہو نہ کسی نتیجے کی توقع، نہ وقت کا احساس، نہ کسی کارنامے کا التباس۔

یحییٰ بڈگامی کا جی چاہا کہ تصویر کو کلیجے میں بھر لے اور ہمیشہ کے لئے سو جائے۔ اس کی محویت کو دیکھ کر مولانا تقی الدین نے کہا:

''یہ شبیہ خیالی ہے جناب من، ویسے آپ کو پسند آئے تو مصور کی طرف سے ہدیہ قبول...

فرمائیں۔''

''...جی...جی؟ کیا فرمایا جناب نے؟'' محمد یحییٰ گڑبڑا کر بولا۔'' آپ کا تحفہ سر آنکھوں پر، میرے واسطے شرف ہے۔لیکن شبیہ خیالی ہی سہی، میں اتنی قیمتی تصویر کس طرح ہدیے کے طور پر قبول کرلوں؟ ن...نہیں، گستاخی معاف، یہ نہ ہوگا۔'' محمد یحییٰ دل میں خود کو نفرین کر رہا تھا کہ ایسی بھی کیا رنگی کہ سب پر حال کھل جائے۔اسے باقر ماوراء النہری کا شعر یاد آیا اور اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ بھلا آنکھوں کا کلام چہرے سے کیوں نمایاں ہو۔

عشق می گفت بہ منصور کہ اے تشنۂ شوق

درحق خویش کسے ہم چو تو غماز نہ باد

''قیمت کا خیال کچھ نہ فرمائیں مشفق من۔'' مولانا نے مصور کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں کہا۔'' قیمت تو دیکھنے والے کی نظر میں ہے۔نقش اگر قدرداں آنکھوں میں کھب جائے تو اس کی قیمت ادا ہوگئی، ورنہ وہ ایک صفحۂ قرطاس یا پرچۂ کرپاس سے زیادہ نہیں۔''

محمد یحییٰ کو اب بھی حیص بیص میں دیکھ کر نقاش، جن کا نام گردھرناتھ تھا، بول پڑے:

''خان جی، استاد جی...آپ ناحق کو ہلکان ہوتے ہیں۔ہمارے لئے تو یہ گھریلو چیز ہے، کوئی امولا ابکاؤ مال تو ہے نہیں۔ہمارے یہاں تو بچپن ہی سے بنی ٹھنی کے روپ میں شری رادھا جی کا چتر بنانے کی مشق کی جاتی ہے۔رادھا جی کا نام تو آپ نے سنا ہوگا مولوی جی۔سچ جانئے اگر آپ بات ہمارے مولانا کی ٹالیں گے تو ہمیں بڑا دکھ ہوگا۔''

''ٹالنے کی بات نہیں جناب عالی،'' محمد یحییٰ نے اس فروتنی سے مسکرا کر کہا کہ ان کے انکار میں ذرا بھی رعونت یا خودنگری کا شائبہ نہ رہا۔'' لیکن میں اس ہنر کے پیچ و خم کیا جانوں، اتنا سمجھتا ہوں کہ ایسی شبیہیں عجائب روزگار ہیں، ناقدرشناس کے ہاتھ میں یہ بھلی نہ معلوم ہوں گی۔اور میرا یہ مرتبہ کہاں کہ میں رادھا رانی جی کے شایان کوئی حجرہ بنا سکوں۔''

''محمد یحییٰ، جناب من،'' مولانا نے کہا،'' آپ کا استغراق تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔جناب بہر حال ایک عالی مرتبت نقاش اور قالین ساز کے چمن کے ثمردار نہال ہیں۔اور یہ محض تصویر ہے، آپ یقین فرمائیں، اس سے کچھ علاقہ بت پرستی کو نہیں۔''

''بے شک حضرت والا درست فرماتے ہیں، لیکن میرا استحسان دراصل ایک نااہل کی حیرت

مذموم سے زیادہ نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ بدو شعور سے انتہائے ریعان تک اور اس وقت سے تا ایں دم بندے نے صناعوں، ہنروروں، اور کاملین فن کی آنکھیں دیکھی ہیں، ان کی باتیں سنی ہیں، لیکن...''

اتنی دیر میں گردھر داس نے بستے کے مشمولات کو الٹ پلٹ کر ایک اور شبیہ نکالی اور بولے، ''لیجئے جناب، یہ وہی چتر ہے لیکن ناپ میں پہلے والے سے آدھا ہے۔ اور ریشم پر نہیں، موٹے کاغذ پر ہے۔ اس کے تو دام کچھ نہیں ہیں۔ اسے ہی قبول کرلیں۔''

اب محمد یحییٰ کو وہ تصویر قبول کرنی ہی پڑی۔ لیکن جب وہ اسے کپڑے میں طومار کی شکل میں باحتیاط لپیٹ کر واپس جا رہا تھا تو اس کا دل عجب طرح کے اندیشوں سے بھرا ہوا تھا۔ بنی ٹھنی کی شبیہ کا راجپوتانے سے آنا اور محمد یحییٰ کے متین، نشیب و فراز وقت و حیات سے باخبر، دانشمندانہ وجود کی اوپری تہوں کو چیر کر اس کے اعماق ہستی میں یوں ہلچل مچا دینا اسے اپنی پرسکون اور پرطمانیت زندگی میں کسی بڑے تغیر کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔ ہر چند کہ اب اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ شبیہ خیالی تھی لیکن... لیکن (لوگ خیالی شبیہوں پر بھی تو مر مٹتے تھے؟) ایسا حسن، جو بیک وقت تمکنت اور سپردگی، نفس مطمئن اور خانہ برانداز، ولرا اور ڈل اور نگین کے بظاہر بے پایاں سکوت اور پہلگام پر دریائے لیدر کی تنبیہ و تادیب ناپذیر سرشوری کو اپنی چھنگلیا کی حنائی نوک پر متوازن رکھتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا، اس کی اصل کہیں تو، کچھ تو، ہوگی؟ مانا کہ اپنا گھر، اپنی بیوی، اپنے بچے، اپنا ہنر، ان میں سے کوئی بھی شے ایسی نہ تھی جسے ایک لمحے کے لئے بھی دل سے الگ کر دینا اسے منظور ہوتا، تج دینے کا تو سوال ہی نہ تھا...

...لیکن میں اس کو کیا کروں کہ وہ صورت میرے دل میں اس طرح پیوست ہوئی جا رہی ہے جیسے کسی نے برف توڑنے کی سوئی کلیجے میں اتار کر وہیں پھنسا دی ہو۔ میرا تو جی چاہتا ہے وطن واپس نہ جاؤں، یہیں خود کو رسوا کرلوں، کچھ شہرت تو ہوگی۔

نیست گر ہیچ دگر حاصل رسوائی عشق
گرمی معرکہ و مجمع بازارے ہست

...لیکن ایسی رسوائی سے مجھے کیا لینا؟ اور میری شہرت یوں ہی کیا کم ہے؟ پورے کشمیر میں میرا نام ہے، اور اب تو کشمیر کے باہر ہندوستان میں بھی لوگ مجھے جاننے لگے ہیں۔ کیا بھلا یہ میری عمر ہے کہ اس طرح کے نئے نئے اشتلے اٹھاؤں، چونچلے کروں؟ مگر اسے چونچلا کون کہتا ہے؟ یہ تو روحانی زلزلے کا معاملہ ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ بھونچال میں سب کچھ تلپٹ ہو جاتا ہے؟ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے

ہیں۔ تو کیا اس وقت میری بھی عقل اپنے گھر سے بھاگ نکلی ہے اور میں راہ باٹ کے خطرات اور جوکھم مول لینے کے لئے تنہا رہ گیا ہوں؟ کیا اب میں ساری دنیا سے برکندہ دل ہوں؟ کیا اب میرا کسی سے کوئی ناتا نہیں؟ یہ میں کون سی بڑ مار رہا ہوں، کیا میرے ہوش ٹھکانے نہیں رہ گئے ہیں؟

محمد یحیٰ کو خوب معلوم تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ زندگی طرح طرح سے ہمیں فریب دیتی ہے، عمر نئے نئے ڈھنگ سے ہمارا شکار کرتی ہے۔ کبھی بوڑھے کو جوانی اور تسخیر گیتی کا بھرم ہو جاتا ہے، کبھی جوان کو ساری دنیا بوڑھی معلوم ہوتی ہے اور سارا بڑھاپا جوانی کا محکوم نظر آتا ہے۔ کبھی غیر کی آگ کو ہم روشنی سمجھ لیتے ہیں، کبھی اپنی بے تہی کو بحر شور انگیز قرار دینے لگتے ہیں۔ مجھے کہیں جانا نہیں ہے، میں نے اپنی سطح کو پالیا ہے، اپنی روشنی حاصل کر لی ہے... لیکن اس تصویر کا اس موقعے پر یوں ہاتھ آنا کسی بڑی بات کا اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر کیوں؟ خود تصویر تو اس سے کچھ کہتی نہ تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں راستے میں سواری روک کر کسی باغ میں جا بیٹھوں اور کھلی روشنی میں تصویر کو پھر دیکھوں کہ وہ مجھ سے کیا کہتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بے معنی بات ہوتی۔ بھلا تصویریں بھی کسی سے کچھ کہتی ہیں؟ اور اگر چند کچھ کہتی بھی ہوں تو میں ایک نپٹ اجنبی، دور سے بھی میرا کچھ رشتہ ان لوگوں سے نہیں، ان چیزوں سے نہیں۔ کوئی بولے تو مجھ سے کیوں بولے؟ اور اگر بولے تو کیا کہے؟

یہ سب تاملات ایک طرف، لیکن محمد یحیٰ بار بار سوچنے لگتا کہ یوں اچانک اس طرح اس تصویر کا میرے ہاتھ آنا کیا معنی رکھتا ہے؟ مانا کہ میں سچا اور پکا تعلیم نویس، قالین کا مانا ہوا ہنرمند استاد ہوں، غنی کاشمیری کے کلام کا عاشق ہوں، بادام کے شگوفوں کی معصوم خوشبو اور سیاہ دیوداروں کی سر بفلک خوابیدہ پرچھائیاں، قاضی گنڈ کی وادیوں میں متبسم زعفران کے کھیتوں کی زردی اور ولر کے چاروں طرف اونچائیوں میں چڑھتے اترتے ہلکے دھانی ہلکے شفقی رنگ میں نہائے ہوئے چاول کے کھیت میری زندگی کی بہاروں کا شیرازہ ہیں۔ میں انھیں کیوں چھوڑوں، کہاں کے لئے چھوڑوں؟ میرا گھر، میری وفادار بیوی، میرے دکھ سکھ کی ساتھی... لیکن میں تو کشمیری نہیں ہوں، میں تو دور دھندلے کسی خشک، بھورے علاقے کا ہوں جہاں گرمیوں میں بچھو کے رنگ کی مائل خاک اڑتی ہے، جہاں ہوا کے تھپیڑوں میں سیاہ اور سرمئی موت صبح و مسا رقص کرتی ہے۔ جہاں دو دو تین تین برس تک بارش نہیں ہوتی...

باغ کشمیر

نہ جانے کب کی بات ہے، میں اپنی ماں کے ساتھ خچر پر سوار ہوں، یا یوں کہیں کہ میری ماں ڈانڈی پر سوار ہے اور میں اس کے ساتھ ساتھ، خچر کی پیٹھ سے چپکا ہوا اور ڈوپٹے سے بندھا ہوا تقریباً لٹکا ہوا ہوں۔ میری ماں کی چادر کبھی کبھی ہلکی ہوا میں لہرا کر میری طرف آنے لگتی ہے اور میں اسے تھامنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ڈانڈی والے پکارتے ہیں، ''ہوش، ہوش!'' میں سمجھتا ہوں وہ مجھے تنبیہ کر رہے ہیں اور میں ڈر کر اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی تنگ اور تیز ڈھال یا چڑھائی والی پگڈنڈیوں پر احتیاط اور سست رفتاری اختیار کرنے کے لئے ڈانڈی والے اور خچر والے آپس میں اس طرح کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔

ابھی بارشیں ٹھیک سے شروع نہیں ہوئی ہیں، لیکن جہلم کے دونوں کناروں پر آسمان بادلوں سے بھرنے لگا ہے۔ کل تک ہوا میں لطیف ٹھنڈک تھی، اب اس میں ڈل پر تیرنے والے گھاس اور بنفشہ اور سوسن کے پھولوں سے لدے ہوئے بجروں سے ہمکتے ہوئے رنگوں، سبز، کاسنی، سوسنی سرمئی، کا بول بالا ہے۔ اور لب دریا خوبانی کے پکتے ہوئے پھلوں جیسی سنہری زرد خوشبو مدھ ماتیاں کرتی ہے، سارا ماحول سرد ہو رہا ہے۔ ہمارا ننھا سا قافلہ سونہ مرگ جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے، مجھے کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں۔ وہاں شاید کوئی میلہ ہے یا کسی عزیز کی شادی ہے، کچھ خوشی کا موقع ہے۔ اور میں تو یوں بھی خوش ہوں کہ اتنی مدت تک نئی نئی چیزیں دیکھوں گا، نئے نئے پھول، نئی نئی پتیاں، چڑیاں ملیں گی۔ نئے نئے گیت سنوں گا اور سیکھوں گا۔ ایک صبح کو ہم نے کہیں راستے میں سفر کا آغاز کیا تو ہمارے سامنے حد نظر تک پھیلا ہوا ایک قطعۂ آب تھا۔ ہم ابھی ذرا اونچائی پر تھے اور پانی کا رنگ دور سے کچھ ہلکا زبرجدی تھا اور کبھی کبھی جب سورج کی کرنیں پانی میں پیوست ہو کر اوپر ابھرنا چاہتیں تو اس میں نیلمیں ہیرے جیسے نیزے نمایاں ہو

جاتے۔ گہرے نیلے رنگ میں ہلکی ہلکی لہروں کے زنجیرے چمک رہے تھے۔ ہم اترے تو ساحل اب بھی بہت دور معلوم ہوا۔ پانی کے چاروں طرف کھیت تھے لیکن ابھی ان میں پودوں نے ٹھیک سے آنکھیں نہ کھولی تھیں۔ کھیتوں میں پانی تھا اور پودوں کی اوپری پتیاں ذرا ذرا سی دکھائی دیتی تھیں۔

"یہ ولر جھیل ہے۔" کوئی بولا۔ "اور چاروں طرف چاول کے کھیت ہیں۔"

بہت جلد ہم وادی کا نشیب چھوڑ کر پیچ دار راستوں کی بلندی پر آ گئے۔ چاول کے کھیت بھی تھوڑی دور ساتھ چلے، پہاڑ کو جہاں کہیں ہوا یا پانی نے کاٹ کر جگہ بنا دی تھی وہاں ہری پٹیوں کی طرح چاول کی کیاریاں موجزن تھیں۔ جب تک ممکن ہو سکا میں چاول کے کھیتوں کو مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ جلد ہی ہم اتنی دور آ گئے جہاں ولر اور اس کے چاروں طرف کھیتوں کا حلقہ کسی آسمانی ہستی کی انگشتری معلوم ہونے لگے تھے۔ پھر جھیل کا پانی کبھی کبھی جھلک جاتا لیکن کھیت نظر نہ آتے، صرف سبزے کی خفیف سی تحریر، اور پھر وہ بھی نہیں۔ چیل اور چنار کے پیڑ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر شاہ بلوط بھی مرطوب گھاٹیوں سے غائب ہو گئے۔ دیوداروں نے ان کی جگہ لے لی اور بہت دور تک میرے ساتھ رہے۔ ان کی سر بفلک سیاہی سے مجھے ڈر لگتا تھا۔

پانی کے چشمے جا بجا ہمارے ساتھ، کوئی وقت ایسا نہ تھا جب پانی کی چمک یا قلقاری یا گنگناہٹ ہمارے ساتھ نہ ہو۔ یہاں تک کہ تیسرے دن وہ جگہیں بھی آ گئیں جہاں دیودار بھی تھک کر پیچھے رہ گئے تھے۔ پانی پھر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ پہاڑ پانی پر بنے ہیں، اس نے سوچا۔ کچھ پانی اوپر آ گیا اور بہت سارا پہاڑ کے پیچھے نیچے بہ کر وٹلب کے چشموں اور ولر کی جھیل میں اتر گیا۔ کچھ عجب بات تھی کہ سونہ مرگ میں برف تو بہت تھی، ایک ندی بھی تھی، لیکن ہریالی بہت کم تھی۔ میں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے؟

"ٹھنڈک بہت ہے یہاں۔ ٹھنڈ نے ہریالی کو جلا دیا ہے۔" ماں نے بتایا۔

تو سردی سے بھی چیزیں جل جاتی ہیں؟ میں نے متعجب ہو کر خود سے کہا۔

ایک ڈیڑھ مہینہ برف زاروں میں اچھل کود مچا کر ہم واپس چلے۔ میلہ؟ نہیں، کوئی میلہ تو نہ تھا لیکن میری ماں کی ایک بہن وہاں رہتی تھیں۔ انھوں نے خوب میرے لاڈ کئے اور میں مزید موٹا اور تندرست ہو کر وہاں سے لوٹا۔

اب کے ولر پر اور ہی نقشے کھلے ہوئے تھے، یا یوں کہیں کہ نئے نقشے، پھولوں کی طرح کھلے

ہوئے تھے۔ چاول کے پودے اونچے ہو گئے تھے، لگتا تھا دفعۃً کسی نے انھیں بلندی پر بٹھا دیا ہو۔ وہ سر نکال کر ہر طرف دیکھ رہے تھے، لہلہا رہے تھے۔ کھیتوں میں پانی اب نہ تھا، سیاہی مائل کتھئی رنگ کی نم آلود مٹی میں پودوں کی جڑیں چھپی ہوئی تھیں اور پودوں کا رنگ بھی سیاہی مائل سبز تھا، جیسے ان کی رگوں میں خون دوڑ گیا ہو۔

محمد یحییٰ نے یہ کایا پلٹ پہلے کبھی کاہے کو دیکھی تھی۔ ایک ہی ڈیڑھ مہینے میں پانی مٹی اور ہوا نے پرانے فرش کو بدل کر اونچے روئیں والے نئے قالین بچھا دیئے تھے۔

...مرودھر...لوگ وہاں مرنے کے لئے جاتے ہیں... کشمیر میں خزاں نہیں آتی
گر مرغ کباب است کہ بابال و پر آید
لیکن زندگی کی بہار تو بحر ظلمات اور مجلس آفاق سے بھی آواز دیتی ہے
چہرے پر وہ سہانی ملکوتی طمانیت
وہ اعتماد اور تمکنت سے چھلکتا ہوا گردن کا خفیف سا زاویہ
وہ آنکھیں کس کو دیکھ رہی ہیں؟ ان کے سامنے تو کوئی ٹھہر
نہیں سکتا۔ لیکن آنکھیں جھکی ہوئی بھی نہیں ہیں
میں چلا بھی جاؤں گا تو کشمیر کی دولت کم نہ ہوگی مگر میں کیوں
دھوپ کی شدت سے چمکتے ہوئے پتھر، پتھروں کے نیچے دبکے ہوئے
پیاسے بھورے سیاہ عقرب
کشت زعفران، برفانی تیندوا کہ شیر برفی، ہانگلوں کے جھنڈ، سیب اور بادام کے باغ
قالینوں پر چشمۂ شاہی اور شالیمار
مجھے گھر جانا ہے
اے بخت رساں بہ باغ کشمیر

دوسرے دن محمد یحییٰ نے ایک سوار اور چوبدار کے ساتھ بادام، خشک خوبانیاں اور شہد مولانا تقی الدین حیدر کے لئے، اور اپنے ہنر کے بہترین نمونوں میں سے دو اور دو تہائی گز لمبا، ایک اور ایک تہائی گز چوڑا قالین راجپوتانے کے بزرگ مصور گردھر ناتھ کی خدمت میں سلام اور بندگی اور اس پیغام کے ساتھ

بھجوایا کہ افسوس اب وطن کو مراجعت درپیش ہے، آنحضرت کی ملازمت کا شرف فی الحال حاصل نہ ہو سکے گا۔ قالین کا سب سے نادر پہلو یہ بات تھی کہ اس میں چینی انداز کے لاجوردی اور نارنجی رنگ استعمال ہوئے تھے، ورنہ کشمیری اور ایرانی قالینوں میں یہ رنگ کم وبیش عنقا ہوتے تھے۔

اس دن یحییٰ نے شام ہی کو شہر چھوڑ دیا اور نور جہاں کے مقبرے کے پاس ایک سرائے میں شب باش ہوا۔ کشمیر کے لئے روانگی دوسرے دن ہوئی۔ اس کی سمجھ میں دیر تک نہ آیا تھا کہ جب اصل سفر کو دوسرے دن شروع ہونا ہے تو شام کو وہاں سے نکل چلنے کے کیا معنی تھے۔ جب اس کا قافلہ جہلم کے بہت آگے وادی کشمیر کے پہلے اہم پڑاؤ کوٹلی پہنچا اور اس نے دو راتیں وہاں کچھ جاگ کر اور کچھ سو کر، کچھ ابتہاج ومسرت کے جذبے سے سرشار، اور کچھ ایک بے نام محزونی کی ہم آغوشی میں گذاریں تو اسے معلوم ہوا کہ لاہور میں وہ آخری شام اس پر کیوں بھاری تھی۔ وہ لاہور سے نہیں بلکہ بنی ٹھنی سے بھاگ رہا تھا۔ اب جب کہ اس کے چاروں طرف چیل کے درختوں پر کانگڑا بلبلیں چہچہا رہی تھیں اور اکا دکا سفیدے کے پیڑ بھی دکھائی دینے لگے تھے اور چیل کی پتیوں کی خوشبو سے فضا معطر تھی تو اسے یقین آیا کہ وہ اس سحر سے نکل آیا ہے۔ ابھی کئی دن کا سفر باقی تھا۔

پیر پنجال کے درے سے اتر کر فی الواقع اس کی طبیعت میں مکمل ٹھہراؤ آ گیا۔ دل وجان کے نواح میں ہر طرف سکون کی چادر چھا گئی۔ آج اسے داؤد اور یعقوب اور بشیر النسا کی صورتیں صاف صاف نظر آئیں۔ اس کی چشم تصور نے انھیں اپنے گھر میں دیکھا، گھر جو اس کا اپنا گھر بھی تھا۔ ایک نیا ذہنی ارتکاز اور نئی حضوری اسے سیدھے اسی گھر میں لے آئی جہاں کے درودیوار بچپن کی یادوں کی طرح مانوس تھے۔ لیکن ان یادوں میں کہیں سے کوئی ملگجی ملگجی دھندلی کیفیت اجنبیت کی بھی تھی۔ اس نے لڑکپن میں ایک بار اپنی ماں سے کہا ضرور تھا کہ میں وہیں ہوں جہاں آپ ہیں، میرے باپ باہر کے تھے تو کیا ہوا، انھوں نے آپ کو اور آپ نے ان کو اپنا لیا تھا، اب میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں گا۔ اور حق یہ ہے کہ کشمیر نے بھی اسے اپنا لیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی نیند میں اسے ایسے مناظر دکھائی دیتے جنھیں وہ بالکل پہچانتا نہ تھا۔ بہت دور، بالکل حد نگاہ کے پاس، بلند ہیکل جانوروں کی قطاریں چپ چاپ گذرتی ہوئی، پاس میں کہیں پانی چمک رہا ہے لیکن جب میں قریب جاتا ہوں تو پانی غائب ہو جاتا ہے۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو سری نگر سے شالیمار کو جانے والی شاہراہ ہے اور ایک طرف نگین کا فیروزی مائل پانی جھمک رہا ہے۔ اس کی آنکھ کھل جاتی اور

وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہتا کہ اس خواب کا مطلب و منشا کیا ہے، کیا اس میں میرے لئے کوئی اشارہ ہے؟

...اشارہ اگر تھا بھی تو اس کی سمجھ میں کبھی آیا نہیں، لیکن ایسے خواب کے بعد صبح کو ہر بار اسے ایسا لگتا جیسے اسے کسی سفر پر جانا تھا لیکن اب وہ بھول گیا ہے کہ کہاں جانا تھا اور کیوں، اور اس بھول کا نتیجہ اس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ آج جب وہ واقعی ایک سفر سے واپس آرہا تھا تو اس کے دل میں گھر کی محبت پوری طرح موجزن تھی۔ اس کے دل میں وہ خفیف سا شکوہ بھی نہ تھا جو اسے تقدیر سے تھا، اس بات پر کہ اس کے بیٹوں کو تجارت کا پیشہ اور گانے کا شوق ملا، ہنرمندی اور علم کے وہ جوہر نہ ملے جو قسام ازل نے اسے ودیعت کئے تھے۔ کچھ حرج نہیں، ان کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ میری عمر کو پہنچیں گے تو سنبھل جائیں گے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے اور بفضل الٰہی وہ دونوں بھی روپیہ پیدا کرنے اور خرچ کرنے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

کہنے کو تو سری نگر سے بڈگام بہت دور نہیں، یہی کوئی دس کوس جنوب کا سفر تھا، لیکن راستہ اس قدر بیہڑ اور اس زمانے میں برساتی کیچڑ سے بھرا ہوا تھا کہ یہ ذرا سی مسافت تین بلکہ چار دن میں پوری ہوتی تھی۔ شام ہو رہی تھی، محمد یحییٰ انتظار میں تھا کہ مناسب ساتھی مل جائیں تو اگلے دن سفر کا ڈول ڈالوں۔ اتنے میں اسے خبر ملی کہ شہر کے ایک مشہور اور صاحب ثروت تاجر حبیب اللہ بٹ کے یہاں محفل موسیقی اور اس کے بعد واز وان ہے۔ داؤد اور یعقوب بھی وہیں مدعو تھے۔ محمد یحییٰ کو ایک لمحے کے لئے افسوس تو ہوا کہ میرے بیٹے اور ڈوم میراثیوں کے ساتھ شمار ہوں، لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ بچے ہیں، اپنا شوق پورا کرنے میں برائی کیا ہے۔ اور یہ شوق بھی کوئی مذموم شوق تو نہیں، بڑے بڑے بزرگان دین بھی سماع کے شائق رہے ہیں۔

وہ انھیں خیالات میں تھا کہ کسی نے آکر خبر دی کہ حبیب اللہ بٹ آپ سے ملنے آرہے ہیں۔ اسے کچھ تعجب سا ہوا لیکن اگلے ہی پل میں حبیب اللہ بٹ ’’سلام علیکم حضور‘‘ کہتا ہوا اس کے سامنے تھا۔ دونوں بغل گیر ہوئے، حبیب اللہ بٹ نے اخروٹ کی لکڑی کے منقش ڈبے میں زعفران کی پڑیاں اور دو اشرفیاں پیش کیں اور کہا، ’’استاد مکرم، ہر چند کہ آپ سے معرفی نہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ لحن داؤدی سنوا کر آپ کا خیر مقدم کروں۔ میں نے سن لیا ہے کہ آپ بلاد ہند سے بہت سی توقیر اور تکریم لوٹ کر لائے ہیں۔ آپ نے کشمیر کا نام روشن کیا... ماشاء اللہ ایں کار از تو آید۔‘‘

محمد یحییٰ کے کلیجے پر اچانک ہلکی سی چوٹ لگی، روح کے سات پردوں میں چھپائی ہوئی تصویر

کو اچانک تبسم اور گویائی کا ہنر آ گیا۔ بلاد ہند میں تم کچھ چھوڑ آئے ہو اور کچھ لوٹ کر نہیں، شاید کچھ لٹا کر آئے ہو۔ نہیں نہیں، میں نے جو کچھ پایا اور جو کچھ گنوایا سب وہیں نور جہاں کے مقبرے میں چھوڑ آیا ہوں۔

اس کی خاموشی کو دیکھ کر حبیب اللہ بٹ کو اندیشہ ہوا کہ میں نے کوئی بات خلاف مزاج کہہ دی۔ وہ عاجزی سے بولا:

''حضرت میں نے گستاخی ضرور کی جو کسی وسیلے کے بغیر باریابی کی ہمت کر بیٹھا۔ لیکن حاش للہ میں آپ کو آشفتہ کرنا نہیں چاہتا۔ سارے شہر میں جناب کے شہرے ہیں، اور مجھے بھی اشتیاق قدم بوسی تھا، اس پر مستزاد یہ کہ مخدوم زادگان بھی کفش خانے میں رونق افزائے بزم ہوں گے۔ اس سے اچھا موقع متصور نہ ہو سکتا تھا۔''

''نہیں جناب من، آشفتگی کی کوئی بات نہیں۔ لیکن مجھے ذرا وطن پہنچنے کی عجلت تھی۔ خیر آپ کا اصرار ہے، اور داؤد و یعقوب بھی وہیں ہیں، تو بسم اللہ۔''

دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں طاؤس، ایک ایک سنتور نواز اور دف نواز دائیں اور بائیں، تین نوجوان سمرقندی سہ تار لئے ہوئے پیچھے کچھ الگ کھڑے تھے۔ سنتور نواز کے پیچھے ایک سنتور، اور ایک بزرگ نے نواز کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نے، لیکن بید کی نہیں بلکہ پیتل کی۔ طاؤس اور سہ تار کو ہم آہنگ کرنے کی مشقیں جاری تھیں۔ دف نواز اور سنتور نواز ابھی خاموش تھے۔ نے کی ہلکی ہلکی آواز کبھی کبھی بلند ہو جاتی۔ بڑے سے کمرے میں قالینوں پر کوئی بیس پچیس کا مجمع، سہ تار نوازوں کے سوا سارے موسیقار کمرے کے وسط تھے لیکن ان کی نشست دوسرے مہمانوں سے ذرا الگ تھی۔ سہ تار نواز، جیسا کہ مذکور ہوا، کمرے کے ایک سرے پر ذرا الگ کھڑے کئے گئے تھے۔ کمرے میں روشنی کچھ دھندلی تھی، اگر اور صندل کے عطر کی گاڑھی مگر لطیف خوشبو آتی جاتی پھواروں کی طرح ہوا میں تھی۔ چار بخوردان کمرے کے چاروں کونوں میں طاق پر رکھے تھے لیکن بہت آہستہ جل رہے تھے، سوزگی کو شاید کسی ترکیب سے ایسا بنایا گیا تھا کہ وہ دیر تک اور آہستہ جلے۔ بہت باریک دھوئیں کی لکیروں کے ساتھ عود اور عنبر کی خوشبو کی لپٹیں کبھی کبھی مہمانوں کو چھو جاتیں۔

محمد یحییٰ کے داخل ہوتے ہی دونوں بیٹوں نے دوڑ کر باپ کے قدم لئے اور اس کا دامن اور ہاتھ چوم کر بولے:

''بابا، بابا آپ نے کیوں زحمت کی؟ ہم خود ہی حاضر ہو جاتے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ آپ

ہندوستان سے واپس آگئے۔ یہ تو بڑی خوش نصیبی ہے کہ یہیں آپ کی زیارت ہوگئی!''

نہ جانے کیوں محمد یحییٰ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے منھ پر رومال کچھ اس طرح پھیرا گویا پسینہ خشک کر رہا ہو اور اس بہانے آنکھیں پونچھ کر بولا:

''واہ بھئی واہ۔ لحن داؤدی اور نغمۂ یعقوبی سننے کا موقع ہو اور ہم اسے ہاتھ سے جانے دیں؟''

یحییٰ نے باری باری سے بیٹوں کو سینے سے لپٹایا، پیشانی چومی، پیٹھ ٹھونکی، پھر پوچھا، ''یہ تو معلوم ہو کہ شہزادگان موسیقی کب کے گھر سے نکلے ہیں، اماں تو اچھی ہیں؟''

''جی ماشاء اللہ، بہت اچھی طرح ہیں۔ ہم لوگ کل ہی بڈگام سے یہاں حاضر ہوئے ہیں۔''

''بہت خوب، بہت خوب،'' کہتا ہوا محمد یحییٰ دونوں بیٹوں اور اپنے میزبان کو صدر محفل میں لے آیا اور ''السلام علیکم حضرات'' کہہ کر بیٹھ گیا۔ حبیب اللہ بٹ نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا، ''حکم ہو تو محفل کا آغاز کیا جائے؟''

''بسم اللہ، بے شک۔''

اس اثنا میں تینوں سنتور آہستہ آہستہ بجنے لگے تھے۔ بیٹوں نے پھر سے طاؤسوں کو چھیڑا۔ جب سب سر مل گئے تو دونوں نے سروقد کھڑے ہو کر حضار محفل کو سلام کیا، باپ کے قدم دوبارہ لئے اور کہا:

''عالی جاہا، ہمارے نصیب کی بلندی ہے کہ ایسی والاشان و صفات مجلس میں اپنے والد گرامی کی موجودگی میں کچھ ٹوٹا پھوٹا کہنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ درخواست ہے کہ ہمارے عیوب پر آشفتہ نہ ہوں، بنظر اصلاح ملاحظہ فرمائیں۔''

''اللہ، اللہ، عزیزان گرامی۔ ارشاد فرمائیں۔ سب ہمہ تن گوش ہیں۔'' کسی بزرگ نے جواب دیا۔

''بے شک، اب تاب انتظار نہیں۔ بسم اللہ۔'' ایک اور آواز آئی۔

دریں اثنا سہ تاروں کی صدا میں سنتور کی گنگناہٹ شامل ہو کر بلند ہوئی۔ محمد داؤد نے راگ چاندنی کدارا میں الاپ شروع کیا۔ پھر یعقوب نے کہا، ''حضرات، سلطان ابوسعید ابی الخیر کی رباعی ہے، گوش ہوش کا متمنی ہوں۔''

سب ذرا اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ یعقوب نے گانا شروع کیا۔

جز در رہ عشق تو نہ پوید ہرگز
دل راز ترا بہ کس نہ گوید ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تا مہر کسے دگر نہ روید ہرگز

پہلا مصرع کہہ کر محمد یعقوب نے توقف کیا، محمد داؤد نے الاپ کو اور اونچا کیا، پھر دوسرا مصرع ہلکے سروں میں ادا کیا۔ اب دونوں کی جگل بندی شروع ہوئی۔ عام طور پر جوڑے میں گانے والوں میں ایک کی آواز ہلکی، یا پست، اور دوسرے کی آواز بھاری، یا اونچی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی عجب تھا۔ دونوں کی آوازیں متوسط تھیں، اور آپس میں اس قدر مشابہ تھیں اور دونوں کا ریاض اتنا پختہ تھا کہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کس نے الاپ لی اور کس نے انترے سے استھائی میں قدم رکھا۔ آواز ایسی منجھی ہوئی اور اس قدر تیار کہ جھالے گٹکری وغیرہ سے بالکل بے نیاز تھی۔ کبھی کبھی گمان ہوتا کہ لداخ کے برفانی صحرا کے گوجر تنہا ٹھنڈی رات میں ایک دوسرے کو راگ کے ذریعہ مخاطب کر رہے ہیں، کبھی محسوس ہوتا دور کہیں بدھ بھکشوؤں کے مندر میں تانبے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ آواز کیا تھی کسی ماہر مشاطہ کے بنائے سنوارے ہوئے گیسو تھے، کہ ایک بال بھی اپنی جگہ منحرف نہ تھا، اپنی حد سے نیچے یا آگے نہ تھا۔ اور آخری مصرعے کی ادائیگی میں وہ جوش تھا جو وادی لولاب کے چشموں میں بھی نہ ہوگا۔

محمد یحیٰی کو موسیقی سے شغف نہ تھا، وہ اسے ماہرین فن کے دون مرتبہ جانتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ راگوں کے اثر سے بیگانہ تھا۔ بارہا ایسا ہوا تھا کہ دور سے کسی مشاق مغنی کی نشید سن کر اس کا دل اس طرح بے چین ہو جاتا گویا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہوں اور وہ آزاد ہونے کے لئے تڑپ رہا ہو۔ کبھی کبھی تو اس کے جی میں آتی کہ سب کام چھوڑ چھاڑ، جبہ و دستار پھینک کسی جنگل میں آوارہ ہو جائے۔ خاص کر جن راتوں کو اس کی نیند جلد کھل جاتی اور وہ صبح کاذب کے پہلے اپنے گھر کے پیچھے وادی میں کارگل اور گلگت سے آئے ہوئے خانہ بدوشوں کے خیموں میں کبھی اہیر بھیرو، کبھی پہاڑی، کبھی جوگیا، اور کبھی میاں کی ٹوڑی پر مبنی بنسی کی پکار سنتا تو اس کا جی کرتا کہ وہ ابھی، اسی حال میں اٹھ کر ان کے پاس چلا جائے۔ اس وقت یہ رباعی سن کر شری رادھا، یا بنی ٹھنی، یا کچھ بھی کہیں، (اس کے دل یا ذہن میں یہ بات اب تک واضح نہ ہو سکی تھی کہ وہ کسی حقیقی وجود کے طلسم میں اسیر ہے یا محض کسی خیال پر مرمٹا ہے) کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے میں بہت سارا دھواں بھر گیا ہے، اور اس کا

دل دھوئیں کے پیچ میں اس طرح گرفتار ہے کہ دھڑکنا بھول گیا ہے۔

''سبحان اللہ، درست، بہت درست،'' کی آوازوں نے محمد یحییٰ کو کچھ ہوشیار کیا۔ اس نے کنکھیوں سے دیکھا، سارے سامعین جھوم رہے تھے۔ یحییٰ نے آگے بڑھ کر بیٹوں کو شاباشی دینی چاہی، لیکن اسے شرم محسوس ہوئی کہ اپنے ہی چمن کی گلفروشی کیسے کروں۔ وہ کچھ کہنے کے لئے ہمت باندھ رہا تھا کہ داؤد نے اور یعقوب نے نیم قد ہو کر اہل محفل کو سلام کیا، شکریے کے الفاظ کہے اور پھر ذرا ٹھہر کر مودب لہجے میں اعلان کیا:

''بزرگان محترم کی خدمت میں کشمیر کے یگانۂ روزگار استاد، کلیم ہمدانی اور صائبائے تبریزی کے ممدوح، اعلیٰ حضرت ملا محمد طاہر غنی نور اللہ مرقدہ وقدس اللہ سرہ کا کلام معجز نظام پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔''

محفل میں آہ اور واہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک سازوں کے سر ملائے گئے، پھر سنتوروں پر ضرب پڑنے لگی۔ دونوں موسیقاروں نے بیک وقت راگ پیلو میں الاپ اٹھایا اور گانا شروع کیا۔

آں سرِ رواں جائے در آغوش کہ دارد
دستے بہ نوازش بہ سر دوش کہ دارد

محمد یحییٰ کو لگا کہ یہ شعر اس کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ اس کے ریشے ریشے میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ بیٹوں کو باپ کے حال کی خبر کیا تھی، انھوں نے اگلا شعر کہا۔

تارنگہم رشتۂ گوہر شدہ از اشک
ایں دیدہ تمنائے بنا گوش کہ دارد

محمد یحییٰ کے سینے میں پھر اسی طرح دھوئیں کی پیچیدہ لہریں اٹھیں، اس کے سینے کے بالائی حصے میں شانوں کی جانب ہلکا درد ہونے لگا، گلے میں سانس رکنے سی لگی۔ اور جب مغنیوں نے تیسرا شعر گایا تو درد کی لہر یحییٰ کے بائیں شانے اور بازو کی طرف بھی دوڑ گئی۔

شد رشتۂ گلدستہ زیادش تن زارم
آں دستۂ گل جائے در آغوش کہ دارد

ساری محفل ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اپنے ہی حال میں مست تھی۔ ایسے عالم میں

خود بینی کا یہ شعر صاحبان فہم کے لئے اور بھی لطف کا سامان دے گیا۔

شعرم نہ بود منتظر گوش حریفاں
خوان سخنم حاجت سرپوش کہ دارد

ایسے میں محمد یحییٰ کی حالت کو بھلا کون سمجھتا۔ اس کے سینے کا درد بڑھا، پھر گھٹا، پھر اسے پست و مضمحل چھوڑ گیا۔ جب داد کا شور ذرا تھما تو اس نے اٹھنے اور اجازت لینے کا ارادہ کیا، لیکن دل میں طاقت اور جگر میں حال نہ تھا۔ اس نے فرش پر ہاتھ ٹیکے کہ اٹھوں، پھر وہیں بیٹھا رہ گیا۔ بیٹوں نے اب تک تو اس کے متغیر رنگ کو شعر یا موسیقی کے اثر پر محمول کیا تھا، لیکن اب جو انھوں نے اس کے چہرے کو غیر معمولی طور پر اترا ہوا اور اس کی پیشانی پر کچھ شکن آلودگی اور کچھ عرق آلودگی دیکھی تو فوراً اٹھے اور میزبان محفل کو بھی اشارہ کیا۔ یک بارگی سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تو محمد یحییٰ کو اور بھی گھبراہٹ ہوئی، لیکن تکلفاً وہ ''نہیں، نہیں، کوئی بات نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں'' کے سوا کچھ کہہ نہ سکا۔ حضار مجلس میں ایک طبیب بھی تھے۔ انھوں نے نبض دیکھی لیکن بات کو صحیح سمجھ نہ پائے۔ ان کا خیال تھا کہ گرمی اور ابتہاج کے باعث معدے میں بخارات پیدا ہوئے اور ان کی پیچش نے دوران سر اور گرانی قلب پیدا کر دی۔ عرق بید مشک کے ساتھ خمیرۂ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک ابھی اور دوسری ایک ساعت کے وقفے سے دے دی جائے اور مریض پوری طرح آرام کرے، انشاءاللہ یہی بہت کافی وشافی ہوگا۔ اگر رات کو نیند نہ آئے تو تلوؤں میں تھوڑے سے روغن بادام کی مالش کر دی جائے۔

محمد یحییٰ کے دونوں بیٹے اس کے ساتھ قیام گاہ تک گئے، دواؤں کا انتظام کیا اور ساری رات اس کے پاس ہی رہے۔ صبح تک یحییٰ کی حالت بہت بہتر تھی اور اس نے بڈگام کے لئے روانہ ہونے کے لئے اہتمام شروع کر دیئے۔ اگرچہ یعقوب اور داؤد چاہتے تھے کہ ابھی چندے آرام کر لیا جائے لیکن باپ کے سامنے کچھ زیادہ نہ کہہ سکے، انھوں نے سری نگر میں ٹھہرنا یا آگے جانا منسوخ کیا اور واپسی کے سفر میں باپ کے ساتھ ہی رہے۔

بشیر النسا

سفر بخیر و خوبی تمام ہوا۔ بشیر النسا کی آنکھیں شوہر اور نور ین العینین کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوئیں۔ یحیٰی نے پہلی بار اتنا لمبا سفر کیا تھا، اور وہ بھی اس قدر کامیاب، اس لئے بشیر النسا کو توقع تھی کہ سفر کے حالات اور کامیابیوں کی تفصیلات سننے کو ملیں گی۔ لیکن یحیٰی کچھ خاموش خاموش تھا۔ شاید سفر کی تھکن ہے، اس کی بیوی نے تصور کیا۔ بیماری شدید یا جان لیوا ہوگی، اس طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا۔ محمد یحیٰی کے چہرے کا رنگ کچھ زردی مائل سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی سے کچھ کہنا نہ پڑے اور کسی کی کوئی بات میرے کانوں میں نہ پڑے۔ بستر سے اٹھتا تو اپنے آپ سے وحشت لگتی، جی چاہتا گھر سے دور کہیں چلا جاؤں جہاں یہ صبح شام کی جھنجھٹیں نہ ہوں۔ لیکن جب وہ اپنے کمرے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے کا ارادہ کرتا تو اس کی ہمت جواب دینے لگتی۔ اور اگر کسی صورت سے وہ لباس بدل کر دنیا کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو کر نیچے آ بھی جاتا تو واپس سیڑھیاں چڑھنا اس کے لئے ننگا پربت کی چڑھائی جیسا ہو جاتا۔ سینے میں اسی طرح کا درد، لیکن کچھ ہلکا، حلق میں خشکی، اور بائیں بازو اور شانے میں بھاری پن محسوس ہوتا۔

یہ سب تھا، لیکن طبیب سے رجوع کرنے کا خیال اسے نہ آیا۔ اسے اس بات سے کچھ دلچسپی ہی نہ رہ گئی تھی کہ وہ بیمار ہے، یا بیمار ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کی یکسوئی بھی نصیب ہوتی تو اس کی چشم تصور ایسی اشیا کو دیکھتی جن پر ہلکے زردی مائل سرمئی رنگ کی نہایت باریک گرد کی تہیں چڑھی ہوئی ہوتیں، اونٹوں کے کجاوے، گھوڑوں کی زین و یراق، پانی کے بڑے بڑے مٹکے، سخت پختہ مٹی کے بنے ہوئے، یا پھر پتھر کے بنے ہوئے، لیکن پانی شاید ان میں نہ تھا۔ دور تک پھیلا ہوا دھندلا سا میدان، جس پر برف کی ہلکی سی تہ، لیکن برف اتنی بھربھری کہ ریت معلوم ہوتی تھی۔ اونٹوں کے قلادے میں پڑی ہوئی بھاری بھاری گھنٹیاں، کشمیری گوجر قبیلے کی دوشیزاؤں کے گیت، رتھوں کے ٹوٹے ہوئے پہیے، ہوا میں گلابی

نارنجی اوڑھنیوں کے لہراتے ہوئے پلو، باریک شبنم کے بہت ہلکے نیلے پردوں کے پیچھے کوئی بڑی بڑی آنکھوں، روشن پیشانی، سیاہ لمبے گیسوؤں والا چہرہ، تمکنت اور اعتماد سے دمکتا ہوا، نیلی آسمانی کرنوں سا بے پروا، جس کا رخ میری طرف ہے بھی اور نہیں بھی ہے...

ایک رات محمد یحییٰ نے خواب دیکھا کہ اس کے سینے میں وہی پرانا درد ہے، لیکن درد اس بار نہ گھٹ رہا ہے نہ بڑھ رہا ہے، بس ایک گونج سی ہے، جیسے چشمہ شاہی میں آبشاروں کے گرنے کی آواز، کہ ایک ہی رفتار سے کانوں میں آئے چلی جارہی ہے۔ لیکن یہ درد صرف سینے یا شانے تک نہیں ہے، کوئی چیز اس کے حلق میں بھی گھر بنائے بیٹھی ہے اور وہاں سے اس کے دماغ کو خبریں مل رہی ہیں کہ یہاں رکاوٹ ہے، یہاں درد ہے، یہاں سانس کو راستہ نہیں مل رہا ہے۔ نیند ہی کے عالم میں اس نے کمبل کو اپنے بدن سے اتار پھینکا اور پلنگ سے اٹھنا چاہا۔ لیکن اس کے پاؤں کچھ جکڑے ہوئے سے تھے۔ اس نے ادھر ادھر ایک دو بار کروٹ لی اور پھر سو گیا، یا یوں کہیں کہ اسی خواب میں مبتلا ہو گیا۔ درد کی لہر اب بھی آبشار کی آواز کی طرح تھی، لیکن اب محسوس ہو رہا تھا کہ آبشار کچھ زیادہ بلندی سے گر رہا ہے اور جہاں گر رہا ہے وہاں پانی کے ذرے دھوئیں کی شکل بن کر چکر کھا رہے ہیں۔ اس کو اپنے سینہ و گردن پر نمی سی محسوس ہوئی لیکن وہ پسینہ پونچھنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھا سکا۔ کسی نے اس سے کہا کہ یہ پسینہ نہیں آبشار کی پھواریں ہیں۔ لیکن دھوئیں کے مرغولے اس کے سینے میں کہاں سے آگئے؟ اب تو سینہ بھی کچھ مرطوب لگ رہا تھا۔

اچانک درد نے اسے یوں کچوکا دیا جیسے جراح کے ہاتھ سے نشتر پھسل جائے اور مریض کے پہلو میں پیوست ہو جائے۔ شدت درد سے اس کی سسکی نکل گئی اور آنکھ کھل گئی۔ نہیں، یہ خواب نہ تھا۔ اس کے سینے میں، شانوں میں، جبڑوں میں، دونوں بازوؤں میں درد ہی درد ہی تھا۔ سانس لینا اب اور دشوار ہو گیا تھا۔ اس نے بشیر النسا کو پوری قوت سے آواز دی لیکن اسے اپنی آواز سنائی نہ دی۔ اس نے ہاتھ سے ٹٹول کر صراحی ڈھونڈی کہ پانی سے کچھ حلق تر کروں۔ پھر اس نے دیکھا کہ میری آنکھیں کھلی بھی ہوئی ہیں اور بند بھی ہیں۔ یعنی میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن کسی نے میری آنکھیں سختی سے بند کر رکھی ہیں۔ اسے یاد آیا بچپن میں بھی جب اسے کبھی چوٹ لگتی اور بہت زور سے درد ہوتا تو وہ آنکھیں بڑے زور سے میچ لیتا تھا، جیسے اسے یقین ہو کہ آنکھیں زور سے بند کر لوں گا تو درد اندر نہ آئے گا۔ اسے یہ خیال نہ آتا کہ آنکھیں بند کرنے سے درد شاید اندر تو نہ آسکے گا لیکن جو درد اندر ہے وہ باہر بھی تو نہ بھگایا جا سکے گا...

اس نے دوبارہ پوری قوت سے بشیر النسا کو پکارا۔ لیکن آواز پھر بھی نہ سنائی دی۔ اچھا تو شاید

میں مر چکا ہوں؟ اسے اچانک بڑا اطمانیت بھرا خیال آیا۔ لیکن نہیں، ابھی درد کی گھر گھراہٹ سینے میں باقی تھی اور کانوں میں بھی کچھ سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے قالین کا ایک بالکل نیا نقشہ جھمک گیا۔ اچنبھے والے ایسے رنگ جیسے تبت اور کاشان کے صناعوں نے بھی نہ تصور کیے ہوں گے۔ نیلا روشن، جیسے بارش کے بعد یوس مرگ کا آسمان، اس کے چاروں طرف بادامی زرد اور کچی خوبانیوں کا ہرا، پھر گہرا نیلا، بہت گہرا رنگ، بھلا مانس بل بھی کیا اتنی گہری ہوگی... اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ تو کیا یہ قالین میں نے بنایا ہے؟ نہیں یہ تو میرے لئے بچھایا گیا ہے۔ مگر کہاں؟ یہاں تو برف گر رہی ہے، ہاں سامنے کوئی عمارت ہے جس کے صدر دروازے کی محراب بادلوں کو چھو رہی ہے اور یہ قالین میرے پاؤں کے پاس سے لے کر عمارت کے صدر تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے وہیں جانا ہے۔ تو چلتا ہوں... لیکن صدر دروازے پر کچھ لکھا ہوا ہے، اسے پڑھ تو لوں، شاید کوئی ضروری بات ہو۔

لیکن مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کسی نے اچانک ڈھیر ساری کالک ہر طرف دیواروں اور دروازے اور چھت پر پوت دی ہے۔ کیا میں کسی سرنگ میں مقید ہو گیا ہوں؟ اللہ اللہ میرے اپنے گھر میں مجھے اجنبیت کا احساس! یہ خیال آتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ میں اب اس گھر ہی کے لئے، اس دنیا کے لئے اجنبی ہو جاؤں گا، میرے گھر کا یہ دروازہ اب مجھ پر کبھی نہ کھلے گا۔ اسے بڑی کامیابی کا احساس ہوا۔ سبحان اللہ، مجھے شکر گذار ہونا چاہیئے۔ پھر کہیں سے اسے اپنے آقا کے متبرک الفاظ یاد آئے افلا اکون عبداً شکورا اور اس نے انگشت شہادت بلند کر کے الحمد للہ کہا، پھر کلمہ طیبہ پڑھا، بشیر النسا کو پیار بھری لیکن بند آنکھوں سے دیکھا، دونوں بیٹوں کا تصور کیا، بلند آواز میں یا شیخ العالم! کہا اور گنبد خضرا کو کلیجے سے لگا کر سو گیا۔

محمد یحییٰ کے چہلم کے بعد بشیر النسا پلنگ سے لگ گئی۔ چہلم کے دن تک تو وہ بھلی چنگی تھی، اور ایک دن تو اس نے بیٹوں سے ان کی شادی کے بارے میں بڑی خوش طبعی اور خندہ جبینی سے بات بھی کی۔ لیکن آخری مہمان کے رخصت ہوتے ہی بشیر النسا کی طاقت و استقلال بھی رخصت ہو گئے۔ اس کو چپ سی لگ گئی، کھانا پینا تقریباً موقوف ہو گیا۔ وہ پڑھی لکھی نہ تھی لیکن اسے نماز ادا کرنے بھر قرآنی سورتیں اور درود اور دعائیں ازبر تھیں۔ نماز وہ لیٹے لیٹے ہی پڑھتی اور باقی وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ تلاوت قرآن اور درود پڑھ کر شوہر کو بخشنے میں گذارتی۔

محمد یحییٰ کی موت کو تیسرا مہینہ تھا کہ اچانک ایک دن بشیر النسا نے فجر کی نماز کے بعد بیٹوں کو بلوایا، انھیں کچھ حسرت اور کچھ امید بھری نگاہوں سے دیکھا اور نحیف آواز میں بولی۔

"میرا منھ قبلہ رخ کر دو۔"

بیٹوں کو استفسار حال یا بحث کا یارا کہاں تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر انھوں نے پلنگ کو قبلہ رخ کیا، ماں سے تقصیریں معاف کرائیں، دودھ بخشوایا اور اس کے سرہانے سورۂ یٰسین پڑھنے بیٹھ گئے۔ اچانک بشیر النسا نے معمول سے بہت زیادہ بلند آواز میں کہا:

"اللہ میرے کلیجے میں درد ہے..."

بیٹے قرآن خوانی چھوڑ کر ماں کی طرف جھکے۔ اپنے سفید کمزور ہاتھوں میں ان کے بھاری مضبوط دائیں ہاتھوں کو بمشکل لے کر وہ مسکرائی اور بولی:

"تم لوگ گواہ رہو گے نہ؟"

بیٹوں کے رندھے ہوئے گلے سے آواز نہ نکلی لیکن انھوں نے بار بار سر ہلا کر اقرار کیا، کلمۂ طیبہ پڑھ کر ہاتھوں پر دم کیا اور ہاتھوں کو ماں کے چہرے پر پھیرا۔ ماں نے رک رک کر کہا، "مجھے انھیں کے پاس رکھ دینا۔" اور آہستہ آہستہ کلمہ پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

از موت و حیات چند پرسی آخر
خورشید بہ روزنے در افتاد و برفت

کتنا ہی بڑا گھر ہو، راجاؤں نوابوں کی حویلی ہو یا بادشاہوں کا آسماں بوس آہنی و سنگی قلعہ، اس کی جان ایک ہی شخص میں ہوتی ہے۔ وہ شخص نہیں تو گھر میں جان نہیں۔ کاغذات اور عام اعتقاد کے مطابق بشیر النسا کے گھر کا مالک تو محمد یحییٰ تھا، لیکن اس گھر کی روح بشیر النسا تھی، صرف اس معنی میں نہیں کہ اس کی سلیقہ مندی، حسن انتظام، سگھڑاپا، اور مزاج کی عذوبت گھر کی ہر چیز میں جھلکتی تھی، لگتا تھا گھر نہیں ہے عنبری سیبوں کا کھلیان ہے جہاں ہر طرف سے بنفشہ و بادام کے شگوفے برس رہے ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس کے وجود میں کچھ ایسی ٹھنڈک اور اس کے سبھاؤ میں کچھ ایسی وسعت، کچھ ایسی صحت ناکی، اور کچھ ایسی شیریں گہرائی تھی جو ویرناگ کے چشمے (۱) کی یاد دلاتی تھی۔

(۱) جہانگیر کے مہندسوں نے ویرناگ کی گہرائی چودہ گز ناپی تھی۔ اس کی چوڑائی کسی کنویں سے کم نہ تھی لیکن فرق یہ تھا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بشیر النسا کے مزاج میں بھی کچھ ایسی ہی معجز نما مٹھاس اور روانی اور سنہرا پن اور شوکت تھی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی سارا گھر بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ داؤد اور یعقوب کا جی چاہا کہ ابھی ابھی گھر چھوڑ کر کہیں بھاگ جائیں، لیکن رسومات مذہبی و دنیاوی تو پوری ہی کرنی تھیں۔ اور گھر میں خدا جانے کتنا ساز و برگ و سامان جمع تھا، اس کو بھی ٹھکانے لگانے کی کچھ سبیل کرنی تھی۔ یہاں قیمتی اور نادر قالین تھے اور ان سے زیادہ نادر چیزیں نئے قالینوں کے وہ نقشے تھے جن پر محمد یحییٰ کام کر رہا تھا۔ اخروٹ اور شاہ بلوط کی لکڑی کے برتن، کرسیاں، چوکیاں، جن میں سے بعض بہت پرانی تھیں۔ چاندی کے پرانے ظروف، ختن اور خلخ کے منقش چوبی اور چینی پیالے، تبت اور لداخ کے عقیق اور فیروزے کی تسبیحیں، کاشان و کاشغر کے ریشمی پردے، سمرقند و بخارا کے ظروف گلی وسیمی، کرغیزستان کے اونی لباس، قزاقستان کی چرمی چھاگلیں اور طنبورے، برفانی تیندوؤں کے پشمینے، ہانگلوں کے سر اور سینگ، مشک کی کپیاں، زعفران کی پوٹلیاں، یعنی وہ سب کچھ، بلکہ اس سے بھی زیادہ موجود تھا جو کسی قدیمی خوش حال کشمیری صناع کی حویلی میں متوقع ہو سکتا تھا۔

یہ سب دیکھ کر داؤد اور یعقوب کا دم الٹتا تھا، لیکن اتنا سامان، اور وہ بھی قیمتی سامان یوں ہی تو نہیں پھکوا سکتے تھے۔ اور یہ بھی تھا کہ قریب کے نہ سہی، لیکن دور کے اعزا ایسے کئی تھے جو اس ترکے کا استحقاق بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے چہلم کی رسم گیارہویں دن ادا کی۔ سب رسوم کے ختم ہو جانے کے بعد اکیلے گھر میں انھوں نے ساز اٹھائے، ماں کے کمرے میں گئے، اور حمد و معرفت و نعت کے شعر گا کر وجود مطلق کی بارگاہ میں اپنی ہستی کا نذرانہ پیش کر کے دل کو کچھ تسلی بخشی اور ماں کی روح پاک پر فاتحہ پڑھی۔ سب سے پہلے انھوں نے خسرو کی قصیدہ نما مناجات کے شعر راگ درباری میں پڑھے۔

اے ز خیال ما بروں در تو خیال کے رسد
در صفت تو عقل را لاف کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت
دامن عزت ترا گرد زوال کے رسد

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کہ ویرناگ کا نیلگوں پانی کنویں میں لبالب بھرا ہوا تھا، اور اب بھی بھرا ہوا ہے۔ جہانگیر اور نور جہاں نے چشمے میں آزاد تیرتی پھرتی سیاہ مہاشیروں اور سرخ نارنجی قزل آلا ماہیوں کی ناکوں میں سونے کے چھلے ڈلوا دیے تھے۔ انھیں مچھلیوں کی اولاد محمد یحییٰ کے زمانے میں چشمے کی سطح پر تیرتی پھرتی تھی اور اب بھی موجود ہے، چھلے البتہ کب کے غائب ہو چکے۔

در رہ بے نیازیت صد چو حسین کربلا
تشنہ بہ ماند بر گذر تا بہ زلال کے رسد
زاں چمنے کہ بلبلش روح قدس نمی سزد
گلخنیان خاک را بوے وصال کے رسد

اب تک تو ایسا تھا کہ فراق و یاس و نارسائی کی کیفیت اور اشعار کے حزن و ملال کا رنگ اور ان کے دل کا درد، سب کچھ ان کے پست، کھرج میں ادا کیے ہوئے سروں میں چھلکا پڑتا تھا، لگتا تھا کہ دونوں بس اب لحظہ بھر میں گانا بند کر کے سسکی لینا شروع کر دیں گے، کہ اچانک محمد داؤد نے بہت اونچے سر میں جا کر دوبارہ الاپ اٹھایا اور محمد یعقوب کے لہجے میں مسرت کی سرشاری پیدا ہو گئی، گویا انھیں اپنی پیاری ماں کے بارے میں کچھ بشارت مل گئی ہو کہ راہ اندیشہ کی اس نوسفری کو بخیر و خوبی منزل پر پہنچا دیا گیا ہے ۔

جلوۂ روے عاشقاں بر سر چوں منے سزد
راہروان پاک را لوث و بال کے رسد

انھیں خود نہیں معلوم تھا کہ اس موقعے پر امیر خسرو کے نسبتاً نامانوس اشعار انھوں نے کیوں گائے، سوا اس کے ان کو پورا یقین تھا کہ ماں کی روح ملاے اعلیٰ میں روح اعظم سے جا ملی ہے اور ذات مطلق موجود و موثر کے لمعات برکت اور توجہ کی نیلگوں سنہری شعاعیں اس کی روح پر امطار بہاراں کی نوید دے رہی ہیں۔ وہ دیر تک آخری شعر کو طرح طرح سے کہتے رہے، پھر داؤد خاموش ہو گیا۔ یعقوب نے نندکوس سے ذرا ہٹ کے مالکوس میں ترانہ شروع کیا، پھر داؤد کی آواز اس میں ملتی، اس سے الگ ہوتی، بلند تر ہوتی ہوئی ابھری ۔

آں کو سر حقیقتش باور شد
خود بیں ترا ز سپہر پہناور شد
ملا گوید کہ بر فلک شد احمد
سرمد گوید فلک بہ احمد در شد

وہ بہت دیر تک مکمل محویت کے عالم میں درت لے میں گاتے رہے۔ اچانک دونوں کی ہچکی پھوٹ پڑی، موسیقی جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ داؤد نے موسیقار کو آہستہ سے دھکیل کر پرے کیا اور ماں کے پلنگ کی پٹی پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔ یعقوب نے بھائی کا سر اپنے کاندھے پر رکھا اور اس کی پیٹھ کو ہلکے

ہلکے تھپتھپاتے ہوئے کہا :

"رہروانِ پاک کو کچھ وبال نہیں۔ بلا شبہ وہ جنت میں ہوں گی اور ہمارے لئے دعا کر رہی ہوں گی، تم دل چھوٹا نہ کرو۔ وہ بہت اچھی جگہ پر ہیں۔" پھر اس نے سحابی استرآبادی کی رباعی کچھ سرگوشی کے لہجے میں، کچھ گفتگو کے لہجے میں پڑھی۔

باذات بہ ہر صفت گرایند خوش است
نغمہ بہ ہر آہنگ سرایند خوش است
از بہر خدا ہیچ عمل ضائع نیست
در خلد ز ہر در کہ در آیند خوش است

داؤد کے آنسو تھمے تو یعقوب کو رونا آنے لگا۔ اس نے بھی اپنا دف پرے کیا اور ماں کے پلنگ سے لگ کر بیٹھ کر اس نے کہا :

"اماں بی، اب آپ نہیں ہیں تو ہم کس کو سنائیں گے۔ بابا ہمارے گانے پر خفا ہوتے تھے تو آپ کس کس طرح انھیں مناتی تھیں۔ ہمیں اللہ نے وہ موقع بھی عطا کر دیا کہ انھوں نے بھری بزم میں ہمیں گاتے ہوئے سنا اور شاید کچھ خوش بھی ہوئے۔ اب نہ وہ ہیں نہ آپ، تو پھر ہمارا گانا بھی نہ رہے گا۔"

اب تک ان کے ذہن میں بات صاف نہ تھی کہ بر فیلے صحرا سی لمبی زندگی جو انھیں بے مروت آنکھوں سے گھور رہی تھی اب کیسے اور کہاں گذرے گی۔ انھیں بس اتنا معلوم تھا کہ اب بڈگام میں نہیں رہنا ہے، گانے کا شغل نہیں کرنا ہے، نہ شوق کے طور پر نہ وسیلۂ رزق کے طور پر۔ کرنے کے لئے فی الحال پہلا کام یہ تھا کہ گھر اور گھر کے سامان کا مناسب انتظام کیا جائے۔ سفیدۂ سحر پھوٹ رہا تھا جب بھائیوں نے اثاث البیت کو اٹھانا، رکھنا اور الگ کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے باپ کے سفری صندوق اور صندوقچے کھولے گئے جو باپ کی مراجعت کے وقت سے یوں ہی بند پڑے تھے۔

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے ایک ایک چیز یوں اٹھائی اور رکھی گویا مقدس بزرگانِ دین کے تبرکات ہوں۔ آخری صندوقچے میں پہلی چیز ریشمی پارچے میں لپیٹا ہوا ایک موٹا کاغذ تھا۔ جب انھوں نے بڑے تجسس سے بستے کے بند کھولے کہ شاید کسی جائداد کے قبالے یا لاہور میں کسی تجارت کے معاہدے ہوں تو دونوں کے دل پر دھکا سا لگا کہ یہ کیا اور کیوں؟ یہ تصویر کیسی؟ ان کے باپ کو غیر عورتوں،

لذات اور شہوات سے کوئی رغبت نہ تھی۔ کم از کم وہ تو یہی جانتے تھے۔ وہ اپنے باپ سے ڈرتے ضرور تھے لیکن ان کا گمان تھا کہ وہ اس کے مزاج کو بھی سمجھتے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ ان کا باپ کسی بھی رکیک یا بازاری عادت کا آزاری نہ تھا۔ تو پھر یہ طرح دار جوان عورت، یہ کس کی تصویر تھی؟ کیا ہمارے بابا نکاح ثانی کا خیال رکھتے تھے؟ یا یہ عورت ان کی کوئی خفیہ معشوقہ تھی، یا لاہور کی کوئی زن بازاری جسے وہ اپنی اڑہری بنانا چاہتے تھے؟ اس عمر میں بعض مردوں کی طبیعتیں بدل جاتی ہیں، ایسا انھوں نے سنا تھا۔ ان کے دل پر کچھ گھن اور تنفر اور بہت سی اداسی چھانے لگی۔ ان کا جی چاہا کہ اس کمبخت کاغذ کو چیر پھاڑ کر چشمے میں بہا دیں کہ اس تاریک راز کا پتہ نشان ہی نہ رہے۔

یعقوب نے چاہا کہ تصویر کو بھائی کے ہاتھ سے لے کر پھاڑ ڈالوں، لیکن ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر اس نے سوچا، اسے پھاڑ کر پھینک دینے سے کچھ فرق تو پڑے گا نہیں، کہ جو شے ہماری آنکھوں کے آگے سے گذر چکی اسے ہم واپس نہیں لا سکتے اور حقیقت کا بوجھ اٹھائے ہی بنتا ہے، یہ کبھی سر سے اترتا نہیں۔ اور کسے معلوم حقیقت کیا ہے؟ یہ تو بہر حال ثابت ہے کہ اس لڑکی کی تصویر بابا کے پاس اس مقصد سے محفوظ نہیں تھی کہ وہ اسے ہمارے لئے پسند کرنا چاہتے تھے۔ اس نے کہا:

"برادر، اک ذرا ٹھہرو، ذرا اس معاملے پر غور کر لیں۔ اس میں کچھ پیچ نہ ہو۔"

"پیچ کیا ہوگا برادر،" داؤد نے کچھ جھلا کر جواب دیا۔ "افسوس ضرور ہے، پیچ بھلا کیا ہوگا؟" اس نے دوبارہ ذرا اونچے لہجے میں کہا۔

"نہیں، ذرا غور کرو۔ یہ عورت مسلمان تو ہے نہیں، لیکن کوئی کسبن بھی نہیں لگتی۔ یہ شان، یہ تمکنت، یہ اعتماد، پیشانی پر اقتدار کا یہ نور..."

"تم بھی کیا بات کہتے ہو برادر، مجھے تو..."

"جلد بازی نہ کرو۔ ایسا خوش کمر بنڈا، ایسا بہشتی رو چہرہ... اس میں کچھ بھید ہے۔ ہمارے بابا ایسے نہ تھے۔ یہ تو کسی دور دیس کی رانی ہے، کسی بات پر خوش ہو کر اس نے ہمارے بابا کو اپنی تصویر تحفے میں عطا کر دی ہوگی۔ ہمارے اطراف کی یا ملک پنجاب کی بی بی تو یہ ہے نہیں۔"

اب داؤد نے ذرا سنبھل کر تصویر کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل پر لرزہ سا طاری ہو گیا اور پھر یہ لرزہ اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔ عجب تیکھی سی مسکراہٹ تھی، ایسا لگتا تھا صاحب تصویر اس کے خیالات سے واقف ہو کر دل ہی دل میں اس پر ہنس رہی ہے۔ تم نے سمجھا بھی تو کیا سمجھا۔ فکر ہر

کس بقدر ہمت اوست۔ میں تمھارے عام انسانی محدود تاملات سے بہت دور ہوں۔ داؤد نے پھر غور سے دیکھا، صاحب تصویر کے ہونٹوں پر ہلکی سی متبسم سرخی تھی اور چہرے کے صباحت آمیز رنگ میں کچھ گرمی سی جھلک اٹھی تھی۔ ابھی ابھی تو یہ تصویر صرف تصویر تھی، اب اچانک اس میں زندوں کی صفات کیسے پیدا ہوگئیں؟ بیوقوف بیٹے یہ بلاول یا یمن کلیان میں کوئی معمولی سی بندش نہیں جس کے بول تم چٹکی بجاتے میں سیکھ لو۔ اس چہرے پر نہ جانے کس طرح کے اعتماد کا پرتو ہے... کیا تیج ہے، کیا جوت ہے...

دفعتہً اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہ لفظ تو میں نے پہلے کبھی بولے نہیں، نہ سنے۔ تیج... جوت... یہ لفظ مجھے کس نے سکھائے؟ لیکن دونوں لفظ صاحب شبیہ کے لئے کتنے مناسب ہیں۔ یہ کوئی ہندوؤں کی دیوی ہے جو میرے منھ سے بول رہی ہے۔ دیوی ہی ہوگی، انسان کے چہرے پر یہ جوت کہاں...

یعقوب کی آواز نے اسے حواس باختہ ہونے سے بچالیا۔

"ذرا اس کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھو، شاید کچھ پتہ ملے۔ یہ کوئی آبرو باختہ خیلا نہیں، بڑی آن بان کی مخدرہ لگتی ہے۔"

داؤد نے تصویر کے کاغذ کو پلٹا تو اسے محسوس ہوا کہ شبیہ کی پشت پر بھی موٹے اور گتے کی طرح بھاری کاغذ کی ایک تہ لگی ہوئی ہے، گویا تصویر کو محفوظ کرنے اور اس کی پشت کو نمی اور تیل وغیرہ سے بچانے کی یہ سبیل کی گئی ہے۔ بہت آہستہ آہستہ پتلے چاقو کی نوک دونوں کاغذوں کے بیچ میں ڈال کر انھوں نے پشتہ الگ کیا تو تصویر کے دوسری طرف بالکل بیچ میں نہایت عمدہ شکستہ آمیز نستعلیق میں لکھی ہوئی عبارت صاف نظر آنے لگی:

شبیہ خیالی شری رادھا جی المشتہر بہ بنی ٹھنی

ہدیۂ محبت ومودت بخدمت حضرت استاد اجل وصناع بے بدل محمد یحیٰی بڈگامی کشمیری

طال اللہ عمرہ وذہب اللہ صناعتہ

منجانب احقر گردھر ناتھ نقاش سکنہ گھٹیالی

کمترین رعیت رائے رایان مہاراجہ کشن گڈھ

صوبہ اجمیر راجپوتانہ

تصویر کا اسرار تو واضح ہوگیا۔ کرشن جی اور رادھا کی لیلاؤں سے وہ نا آشنا نہ تھے۔ "بنی ٹھنی" کی بات سمجھ میں نہ آئی، لیکن اس میں تو کوئی شک نہ تھا کہ یہ طلسم سب خیالی ہے اور انھیں اپنے باپ کے

بارے میں متوحش یا شرمندہ رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ انھیں یہ خبر نہ لگ سکتی تھی کہ اس تصویر نے ان کے باپ کے سرمایۂ تمکین و ہوش پر کیسی رہزنی کی تھی۔ لیکن ان دونوں بھائیوں کے بھی رگ و ریشے میں اس کا التہاب اس طرح دوڑنے لگا تھا جس طرح برگ بنفشہ میں باد سحر گاہ کا نم سرایت کر جاتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر شری رادھا کی تصویر کو دیر تک تکتے رہے۔ جڑواں ہونے کی وجہ سے ایک پر دوسرے کے داخلی حالات و کوائف خود بخود بڑی حد تک آشکار ہو جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک بھائی جو بات کہنا چاہتا وہی بات دوسرے کی زبان پر معاً آجاتی، یا ایک بھائی کہیں جانے کا ارادہ کرتا تو دوسرا اسی جگہ کی تعریفیں شروع کر دیتا۔ ایک کو کسی شخص یا شے سے وحشت یا بے دماغی ہوتی تو دوسرا ابھی اس شخص یا شے کے بارے میں لازماً یہی محسوس کرتا۔ گانے میں ان کی جگل بندی اسی لئے اکثر دو کے بجائے ایک مغنی کا تاثر پیش کرنے لگتی تھی اور ظاہر ہے کہ اس صفت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

دونوں کی نگاہیں تصویر کے چہرے پر ایک ساتھ اٹھیں۔ داؤد نے کہا:

''کشن گڈھ...''

''ہمارے دادا وہیں کے تھے۔'' یعقوب نے جواب دیا۔

''کہتے ہیں دادی نے ایک بار بابا سے کہا تھا کہ بیٹا تمھارا دل کشن گڈھ جانے کو تو نہیں چاہتا؟''

''بابا اس وقت بہت چھوٹے تھے لیکن انھوں نے جواب دیا تھا کہ وہاں میرا کون ہے، اور یہاں میرا سب کچھ ہے۔ میرے باپ نے بھی تو تمھیں اور اس ملک کو اپنا لیا تھا۔ میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں گا۔''

داؤد کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''لیکن اب ہمارا یہاں کون ہے...''

''بابا نے یہ تصویر اس قدر احتیاط سے کیوں رکھ لی تھی، میں سوچتا ہوں اس میں ان کی کچھ مصلحت رہی ہوگی۔''

''مصلحت کا ہے کی، دور دراز کے صناع تھے، غیر ملک سے آئے تھے، ان کا تحفہ تھا۔''

''لیکن مجھے تو اس میں کچھ فال دید نظر آتی ہے... اور برادر ہم نے تو یہاں نہ رہنے کا تہیہ بھی کر لیا ہے...''

''غیر ملک، غیر لوگ، ہم نہ وہاں کی زبان سے واقف نہ مذہب و ملت کے عارف۔ ذرا سوچ

لو، کیا کہہ رہے ہو۔"

"گانے بجانے اور تجارت کے لئے ہم نے کہاں کہاں کے شہر و قریہ کی خاک نہیں چھانی ہے۔ دلی اور اجمیر نہ سہی لاہور تو ہم کتنی ہی بار گئے ہیں۔"

"مگر یہ تصویر تو بالکل خیالی ہے برادر۔"

"صاحب ہنر کے لئے کوئی در بند نہیں۔ ہم خیال کو عمل میں بدل دیں گے۔" یعقوب نے ہنس کر کہا۔

اس کے بعد دونوں میں اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی لیکن دونوں کو معلوم تھا کہ اب ہمیں کشن گڈھ جانا ہے۔ وہاں کیا کریں گے کہاں رہیں گے، یہ باتیں غیر اہم معلوم ہوتی تھیں۔

انھوں نے فوراً ہی گھر خالی کرنا شروع کر دیا۔ گھریلو استعمال کی تقریباً ساری چیزیں انھوں نے خیرات کر دیں۔ قرض کسی کا کچھ تھا نہیں، نہ ہی کوئی ایسا قریبی عزیز تھا جسے شرعی ورثہ ملتا، اس لئے بیشتر قیمتی اشیا انھوں نے دور کے اعزا، لواحقین، اور مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ چند چیزیں اور نقدی کا بڑا حصہ انھوں نے اپنے لئے رکھا، باقی سب کچھ مدرسے کو بھجوا دیا۔ مکان انھوں نے فروخت نہ کیا، لیکن تالا ڈال کر اس پر ایک نگہبان ضرور مقرر کر دیا اور اس کی تنخواہ کے لئے مستقل بندوبست بھی کر دیا۔ صدر دروازے کے سامنے سخت زمین تھی، اسے بدقت کھود کر جگہ بنائی گئی اور آلات مزمور و غنا وہاں دفن کرا دیئے گئے۔ والدہ کو انھوں نے باپ کے پہلو میں سپرد زمین کیا اور لوح مزار پر صرف یہ لکھوایا:

بشیر النسا بیگم جنت آرامگاہ

خوں کہ از مہر تو شد شیر و بہ طفلی خوردیم

باز آں خوں شدہ از دیدہ بروں می آید

پسران سوگواران داؤد و یعقوب

سنہ ۱۲۰۷ ہجرت النبوی صلی اللہ علیہ وسلم

لاہور سے وہ قصور، فیروز پور، مالیر کوٹلہ، اور حصار ہوتے ہوئے ریواڑی پہنچے جہاں شیر شاہ کی شاہراہ دہلی کی طرف مڑتی تھی۔ دہلی یہاں سے بہت دور نہ تھی لیکن ان کے دلوں کے پردے پر ریگ زار راجپوتانہ کی دھن بج رہی تھی، حضرت دہلی سے انھیں کیا کام تھا۔ امیر خسرو کا شعر پڑھ کر وہ لوہارو کی راہ لے کر عازم الور ہوئے۔

حضرت دہلی کنف دین وداد
جنت عدل است کہ آباد باد

الور کے آگے کئی راہیں ملتی اور الگ ہوتی تھیں۔ ان میں اکبر کے زمانے کی سڑک بھی تھی جو آگرے سے باندی کوئی ہوتی ہوئی اجمیر شریف کو نکل جاتی تھی۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر پیادہ پا چل کر اکبر نے آگرہ تا اجمیر کی مسافت قطع کی تھی۔ شاہزادہ خرم نے اپنی مہم میواڑ کے دوران الور اور جے پور کو باندی کوئی اور اجمیر سے براہ راست ایک چوڑی سڑک کے ذریعہ منسلک کر دیا تھا۔ کشن گڈھ کا محل وقوع اسی جے پور اور اجمیر شریف کی شاہراہ پر کم وبیش آدھے راستے پر تھا۔ انھیں کشن گڈھ پہنچنے کی اس قدر عجلت تھی کہ انھوں نے جے پور میں سوائی راجہ جے سنگھ کی رصد گاہ بھی دیکھنے کا اہتمام نہ کیا جو چالیس سال کی مدت کے بعد بھی سیاحوں اور ہیئت دانوں کا مرجوعہ تھی۔ جے پور تک تو ان کے کئی ہم سفر تھے، بلکہ ایک چھوٹا سا قافلہ تھا۔ لیکن یہ سب ہیروں اور قیمتی کپڑوں کے تاجر تھے، انھیں جے پور میں لین دین کے بڑے بڑے معاملات طے کرنے تھے۔ لہٰذا قافلہ وہاں پہنچ کر مسافرت سے اقامت میں بدل گیا۔ داؤد اور یعقوب نے ساتھیوں کو وہیں چھوڑا، چار گھوڑے خریدے، ایک سائیس کو بطور رہبر ساتھ لیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑے۔

دفترِ امکاں

وہ جے پور سے ذرا آگے نکلے تھے کہ دنیا ہی بدلی ہوئی دکھائی دی۔ یوں تو نباتات اور جمادات میں تبدیلیاں لاہور پہنچتے ہی پہنچتے نمایاں ہوگئیں تھیں، لیکن قصور کے آگے سے اراولی کا سلسلہ کوہ بھی تھوڑا بہت شروع ہو جاتا تھا لہٰذا بھورے سیاہ پتھروں کے بڑے بڑے اونچے چٹان نما ڈھیر جگہ جگہ بکھرے ملنے لگے تھے، اس لئے جے پور سے آگے سفر کا منظر ان کے لئے پوری طرح اجنبی نہ تھا۔ گرمی اگرچہ بہت تھی، لیکن یہ مہینہ کشمیر میں بھی گرمی کا تھا، لہٰذا موسم کی بھی تعدی ابھی برداشت کے اندر تھی۔ جنگلوں سے وہ متعارف تھے، مگر ملک ہند کے ان علاقوں میں پانی کی کمی انھیں ہمیشہ متحیر رکھتی تھی۔ ملتان تک ایک بار وہ ضرور گئے تھے، لیکن وہاں کی بھی خشکی اور خاردار درخت یہاں کے مقابلے میں کچھ نہ تھے۔ شاہراہ کے دونوں طرف دور تک بھدے بھورے سبز رنگ کی تنومند جھاڑیاں خوف اور افسردگی پیدا کرتی تھیں۔ ان کے نام بھی ان کی طرح غیر دلچسپ اور چڑچڑے مزاج کے تھے۔ بھٹ کٹیا، جھڑ بیری، گوکھرو، کو ببول، کریل، تھوہر، ناگ پھنی۔ ناگ پھنی تو عجب شے تھی۔ اکثر پودے تو دو ڈھائی گز اونچے، ان کے پتے نہایت موٹے (اگر انھیں پتے کہا جا سکے) گھنے سیاہی مائل، اکثروں میں تو صرف تنا ہی تنا تھا، اور بعض میں پتوں کے نام پر موٹے موٹے کانٹوں سے ڈھکی ہوئی، ہاتھیوں کے کھانے کے روٹ سے مشابہ شاخیں، لیکن شاخیں بھی کہاں، کسی خونخوار خرگوش یا جنگلی گدھے کے کان کہیں تو غلط نہ ہوگا، زمین سے سیدھے اگے ہوئے، جڑ کا نام نہیں۔ آپس میں گتھم گتھا اس قدر کہ ان کے اندر انسان کیا، رینگنے والے جانور کا گذر محال، اور ان کے گھنے سراپا سے سرطان یا راج پھوڑے جیسی مہلک خباثت برستی تھی۔

جے پور سے کشن گڈھ کوئی ڈھائی تین دن کی مسافت تھی۔ پہلے دو دن تو ٹھیک گذرے، لیکن تیسری صبح کوچ کرتے ہی انھیں آندھی نے آلیا۔ ان کا سائیس کہنے کو تو راہبر بھی تھا، لیکن وہ سیدھی راہ کا

عادی تھا، جہاں مینار میل، ہر پانچ سات کوس پر سرائیں، اور کہیں کہیں چھوٹے موٹے گاؤوں کے باشندے نشان راہ دینے کے لئے کافی تھے۔ یہاں تیز آندھی جیسی ہواؤں نے ان کے ہوش اڑا دیئے۔ کوئی سایہ دار درخت، کوئی چھت، کسی جوگی کی کٹی، دور دور تک کچھ نظر نہ آتا تھا، اور نظر آتا بھی تو کیسے، گرد و غبار اس قدر رہتا کہ دو گز کے فاصلے پر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ گھوڑے ٹھوکر کھاتے تو بمشکل سنبھلتے، ڈر تھا کہیں پاؤں نہ تڑا بیٹھیں۔ تھوڑی دیر رکنا، پھر چلنا، یہ عمل کچھ دیر جاری رہا۔ انھیں پتہ ہی نہ چلا کہ وہ سیدھے جا رہے ہیں یا کولھو کے بیل کی طرح آنکھیں بند کئے دائرے میں چکر لگا رہے ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ہر قدم کے ساتھ دائرے کا مرکز کچھ بدل جاتا ہے اور سمتیں ریت کی غلامی میں گم ہوتی جاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں خبر ہی نہ ہوئی کہ کب وہ سڑک سے ہٹ کر صحرا میں آگئے...

وہ صحرا ایسا تھا کہ جہاں کوسوں سائے کا نام و نشان نہ تھا۔ پانی نایاب کوسوں قحط آب، نہ کوئی چشمہ نہ چاہ نہ جھیل نہ دریا، صاف میدان کہ جہاں بقول شخصے کف دست میدان، ہیہات خدا کی ذات۔ جوں جوں آفتاب بلند ہوتا ہے وہ گرمی اور طپش اور زیادہ ہوتی جاتی ہے اور دھوپ کی حدت بڑھتی جاتی ہے۔ اور تیزی دھوپ سے ان کی یہ حالت ہوئی کہ نہایت غلبہ تشنگی کا ہوا، اور بسبب اس جنگل کے کوئی برگ درخت یا جنگلی ثمر یا بناس پتی بھی نہیں ملی۔ گرسنگی نے غلبہ کیا۔ یہ وہ جنگل ہے کہ جہاں خضر والیاس ایسے پیغمبر بھی سرگرداں پھرے۔ بڑے بڑے ایسی راہروی میدان سے ڈرتے ہیں، بسبب نایابی آب کے سر پٹک کر مر جاتے ہیں۔ ابھی کوئی کوس دو کوس راستہ کٹا تھا کہ آفتاب بالکل بلند ہو گیا اور اب وہ تیزی دھوپ میں ہوئی کہ مارے شدت کے غش آگیا۔ اور پھر ہوشیار ہوئے اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ اور گرسنگی اور تشنگی نے اس قدر پریشان کیا کہ اب گھوڑے پر بیٹھا نہیں جاتا ہے۔ ادھر گھوڑے کی یہ حالت ہے کہ مارے پیاس کے زبان نکالے ہوئے ہے اور راستہ نہیں چلا جاتا ہے۔ اور اس پر غضب یہ کہ سواری بھی پیٹھ پر موجود ہے۔ عجیب صحرا ہے کہ جہاں سوائے دریائے ریگ کے اور کوئی شے نظر نہیں آتی ہے۔ اگر کوئی درخت دور سے دکھائی دیا تو یہ اس امید میں جلد جلد قدم بڑھائے ہوئے اس کی طرف چلے کہ اس کے

سائے میں کوئی دم دم لیں گے اور قرار پکڑیں گے۔ جب قریب اس کے پہنچے تو دیکھا کہ وہ بھی بسبب پانی نہ ہونے کے جل گیا ہے اور برگ و بار کچھ نہیں ہیں۔ خالی تنا کھڑا ہے وہ بھی خشک، کہیں تری کا نام نہیں۔ اگر کوئی چشمہ نظر پڑا تو یہ خیال کیا کہ شاید اس میں پانی ہوگا۔ جب اس کے قریب گئے، اول تو پانی نہ پایا، اور اگر پایا بھی تو ایسا خراب کہ جس کو دیکھ کر تے آنے لگی۔ اور اس میں، دیکھا کہ سانپ اژدہے لوٹ رہے ہیں اور بسبب شدت گرمی کے اپنا زہر اس میں اگل رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہاں سے بھی آگے بڑھے۔ اور ہوا جو چلتی ہے تو اس کے چلنے سے جو ذرے وغیرہ اڑ کر جسم پر پڑتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آگ کی چنگاری ڈال دی۔ اور گھوڑا تو مارے پیاس کے مرا جاتا ہے۔ یہ رنگ و حالت گھوڑے کی دیکھ کر اوپر سے اتر پڑے اور اس کی باگ ڈور پکڑ کر آگے چلے۔ مگر زمین اس قدر تپ رہی ہے، اور یہ معلوم ہو رہا ہے کسی نے تاوۂ آہنی کو گرم کر کے رکھ دیا ہے۔ جہاں پر قدم رکھ دیا وہاں پر تلوے میں چھالا پڑ گیا۔ وہ جنگل نمونۂ محشر تھا۔ گرمی کی یہ حالت ہے کہ راستہ نہیں چلا جاتا ہے۔ زمین سے شعلے نکلتے ہیں، آسمان سے آگ برستی ہے۔ ہوائے گرم چل رہی ہے، اگر کوئی جھونکا آگیا تو یہ معلوم ہوا کہ استخواں تک جل گئے۔ اسی طرح دوپہر ڈھلی، اور وہ حدت و تیزی دھوپ کی کم ہونے لگی اور ہوا بھی چلنا موقوف ہوگئی۔ مگر مارے بھوک اور پیاس کے یہ حالت ہے کہ ایک قدم راہ چلنا دشوار ہے، اور گھوڑے کی ایسی ابتر حالت ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے وہ تو کوئی دم کا مہمان ہے۔ مگر اس جنگل میں دانہ گھاس کہاں، کہ جہاں انسان کا کیا ذکر ہے چرند و پرند تک نظر نہیں آتے ہیں۔ اور اگر کوئی جانور مثل چیل یا گدھ وغیرہ کے آفت کا مارا بھولے سے آ بھی گیا تو اس کے پر جل گئے اور وہ خود بھی جل کر کباب ہوگیا۔ اور اگر کوئی بچا بھی تو اس کے استخواں سوکھے ہوئے پڑے ہیں اور پرواز سے عاجز ہو کر کہیں گر پڑا ہے۔ کہیں آدمی کی ہڈیاں پڑی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں آ کر مارے بھوک پیاس اور گرمی کے مر گیا ہے۔ کہیں درندوں کی ہڈیاں ہیں، کہیں اژدہے کے رہنے کے غار ہیں، کسی مقام پر غولوں کے قیام کی جگہ ہے۔ بڑے بڑے غار ہیں، سوائے ان چیزوں کے اور

وہاں کوئی رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب برنگ زرد لرزاں و ترساں آشیانۂ مغرب میں پنہاں ہونے لگا۔

(''آفتاب شجاعت''، جلد اول، از شیخ تصدق حسین، ص ص ۱۵۳ تا ۱۵۴)

...لیکن داؤد اور یعقوب کو یقین تھا کہ اب آگے جانا یا پیچھے جانا مزید گمراہی کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انھوں نے اپنے بدن پر چادریں اور بھی مضبوط لپیٹ لیں، آنکھ منھ سب ڈھک لئے اور گھوڑوں سے اتر کر انھیں کے موہوم سائے میں پڑ رہے۔ زوال کے وقت ہوا تھمی، غبار آہستہ آہستہ گرد و پیش کی جھاڑیوں پر جم گیا۔ اب سب کچھ دکھائی دینے لگا، لیکن دیکھنے کو کچھ نہ تھا، اس معنی میں کہ اس دشت کربت و غربت میں راستہ تنگ دیدۂ تصویر سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن انھیں اتنا معلوم تھا کہ ہمیں جنوب مغرب کی سمت جانا ہے، جنوب زیادہ اور مغرب کم۔ شمس غارب ان کے سامنے تھا، لہٰذا وہ بآسانی اپنی سمت کم و بیش متعین کر کے روانہ ہوئے۔ سڑک تک پہنچنا ضروری تھا، لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ کہیں بھی، سڑک سے دور یا نزدیک کوئی آبادی یا کوئی سرائے مل جائے تا کہ کھلے آسمان تلے شب گذاری کے خوف و خطر سے نجات ملے۔

داؤد اور یعقوب کی تقدیر اچھی تھی، شاید جو ہستی انھیں کشاں کشاں یہاں لائی تھی وہ ان پر کسی نہ کسی روپ میں رقیب و نگہبان تھی۔ جو بھی ہو، محض اتفاق ہی سہی، لیکن کوئی ایک ساعت چلتے رہنے کے بعد انھیں ایک مختصر سی آبادانی کا سواد نظر آیا، پھر چھوٹے جانوروں کے ایک آدھ ریوڑ، سر ہلاتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف قدم زن، گردن میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کا شیریں نغمہ دھیرے دھیرے فضا کو سیراب کرتا ہوا، اور بھی دور سے کچھ اونٹوں کے کوہ جثہ ڈیلوں کا سایہ، ان کی طرف آتا ہوا۔ یہ مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے یوں گذرے گویا وہ خواب میں ہوں اور ابھی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہی لق و دق دشت و ریگزار ہوں گے اور ان کی بیچارگیاں ہوں گی۔ ان کا رہبر تو ہنس بھی رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔ راستے کے جوکھم سے واقفیت اسے اپنے نو آمدہ مسافروں سے بہت زیادہ تھی۔

کنواں

تھوڑی دیر میں وہ گاؤں میں پہنچ گئے۔ گاؤں کیا تھا، اسے نگلہ یا پروا کہیں تو بہتر ہوگا۔ کوئی پچاس ساٹھ گھر، دو چار دس پیڑ، جانوروں کے کچھ دبلے پتلے ریوڑ، ایک مندر اور ایک کنواں۔ شام پھولنے ہی کو تھی جب وہ کنویں پر پہنچے۔ کنویں سے پانی لینے کے لئے مجتمع عورتیں ہر عمر اور ہر انداز کی تھیں، نوجوان دوشیزائیں، ادھیڑیں، بیوائیں، کئی بچوں کی مائیں تھیں۔ کئی کے ساتھ شیر خوار یا ذرا زیادہ عمر کے بچے بھی تھے۔ ان کے لباس معمولی تھے اور تقریباً سب کے چہروں پر تھکن اور ایک طرح کی اداسی کی سرمئی روشنی تھی۔ ان کی آنکھوں میں مطمئن بیاہتا عورتوں یا امید بھری زندگی جینے والی ماؤں کے دلوں کی ماہتابی کی جگہ گذرے ہوئے اور آنے والے بے رنگ اور رائیگاں ماہ و سال کی مٹیالی گرد تھی۔ وہ آپس میں باتیں تو کر رہی تھیں، لیکن اس طرح نہیں جس طرح شام کو طوطے اپنے مسکن کو جاتے ہوئے آپس میں چہلیں کرتے ہیں اور ان کی آوازیں جھجھاتی اور بلند سے بلند تر ہوتی رہتی ہیں، گویا ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی دوستانہ کوشش میں ہوں۔ انھوں نے ذرا غور سے دیکھا تو انھیں محسوس ہوا کہ ادھیڑ عورتیں دراصل سب ادھیڑ نہ تھیں، ان کی عمریں تیس پینتیس سے متجاوز نہ رہی ہوں گی، لیکن ان کے چہروں سے جوانی نہ جانے کب کی رخصت ہو چکی تھی۔ بچے پیدا کرنے اور انھیں پالنے پوسنے کا بوجھ، گھر کے سارے کام کاج کا بوجھ، مائکے کے پیار کی جگہ جھڑکی گالی اور مار سے دن رات کی تواضع، شوہر کی بے رخی، اور سب سے بڑھ کر اس غیر ہمدرد، اپنی اولادوں کی خاطر مدارات کے تصور سے بے نیاز زمین، اور اس کی درشت آب و ہوا کے رنج و صعب کو شباں روز جھیلتے رہنے کے باعث ان کی روح اور بدن دونوں میں شکستگی سی آ گئی تھی۔ ان کی کمریں اب بھی پتلی تھیں لیکن ان کے سینے اور کولھے بد و شباب کے کساؤ اور کھنچاؤ سے عاری تھے۔ سب کے سرو کمر کے اوپر پیتل کے بھاری گھڑے تھے۔ کسی کسی عورت نے تو دو دو گھڑے سر پر ٹکا لئے تھے۔

کنویں سے پانی نکالنے کے لئے کوئی مرد یا مزدور نہ تھا۔ بھاری، ذرا پرانا ڈول تھا جس میں کئی سوراخ تھے، دو عورتیں مل کر اسے کھینچتیں۔ بڑا ڈول، یوں ہی وہ پوری طرح نہ بھرتا تھا اور اس کے سوراخوں سے پانی چھوٹے چھوٹے فواروں کی شکل میں چھوٹتا بھی رہتا۔ لہٰذا ایک ڈول سے ایک گھڑا ہی بھر سکتا تھا، اور ڈول کھینچنے والی عورتیں آدھی گھڑی یا اس سے کچھ کم مدت میں تھک جاتیں تو نئی عورتیں ان کی جگہ لے لیتیں۔ اس طرح کنویں کے گرد ہجوم بہت آہستہ آہستہ گھٹ رہا تھا۔

چند گھڑیاں اور گذریں۔ مسافروں کا جی تو بہت للچا رہا تھا کہ کنویں پر جائیں اور تازہ پانی کا لطف اٹھائیں اور پھر شب باشی کے امکانات اور سرائے کے بارے میں معلوم کریں، لیکن اجنبی عورتوں کے ہجوم میں دھنسنا ہمت طلب کام تھا۔ وہ یوں ہی کچھ دور پر گھوڑوں کو لگام دیئے کھڑے رہے۔ جب بھیڑ کچھ اور چھٹی تو انھوں نے آگے بڑھنے کی جرأت کی۔ ان کے گھوڑے بھی تازہ ٹھنڈے پانی کی مہک پا کر ہنہنا رہے تھے اور ٹاپیں زمین پر مار رہے تھے۔ گھوڑوں کو آگے لا کر یعقوب اور داؤد نے پنگھٹ والیوں کو کچھ غور سے دیکھا۔ سب سے آخر میں دو لڑکیاں تھیں، کوئی پندرہ سولہ کے ان کے سن تھے، دونوں کے سروں پر بھاری بھاری دو گھڑے، ہر چند کہ ابھی وہ خالی تھے لیکن پھر بھی ان کا بوجھ ان کی کمروں کو ذرا سا جھکا دینے کے لئے کافی تھا۔ بندھی ہوئی گاتیوں اور کمر کے خفیف سے جھکاؤ کے باعث ان کی چھاتیاں اور بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ بظاہر ان میں وہ چلبلا پن اور چونچال پن نہ تھا جو اس عمر کی لڑکیوں میں خود بخود آ جاتا ہے، لیکن ہرنیوں کی طرح ان کی اٹھی ہوئی گردن کا زاویہ اور نگاہوں کا چوکنا پن وعدوں سے بھرپور نظر آتا تھا۔ ان کے منھ پر تھوڑی سی شرماہٹ کی غیر قطعیت تھی، لیکن صاف لگتا تھا کہ شرم کی یہ لہر محض عارضی ہے، ان کے منھ کا اصل روپ گلابی شوخ ہونا چاہیئے۔ تنہا ہونے کے سبب وہ اوروں سے الگ تھلگ سی تھیں۔ شاید اس مجمعے میں ان کی کوئی خالہ یا بھابی یا پھوپھی وغیرہ نہ تھی، وہ آپس ہی میں نیم بلند لہجے میں باتیں کر رہی تھیں۔ دونوں بھائیوں نے محسوس کیا کہ کوشش کے باوجود محبوبیت اور معشوقیت کے لہریئے ان لڑکیوں کی آنکھوں میں افسردہ نہ ہو سکے تھے۔

دونوں لڑکیوں نے نارنجی پیلے رنگ کی دھاریوں اور پھولوں والی سوسی کے لہنگے پہن رکھے تھے، بدن پر زرد اور مونگیا رادھانگری کی چولیاں، لیکن اس قدر اودنچی کہ شلوکا معلوم ہوتی تھیں۔ چوڑو کی بندھنی کی سرخ و زرد چنری کو اس وقت گاتی بنا کر باندھ لیا گیا تھا۔ اوسط سے نکلتا ہوا قد، چھریرے بدن، کھلتا ہوا گیہواں رنگ، کتابی چہرے، شربتی آنکھیں، گھنے بال، لیکن بہت لمبے نہیں، سیاہ چمکیلی زلفوں کی

اک دو لٹیں کاکل بن کر چہرے کے دونوں طرف ہلکی ہوا میں موجزن تھیں۔ دونوں کے گلوں میں سیاہ سیلیاں، گول سڈول کلائیوں میں ہاتھی دانت کے کڑے پھنسے ہوئے، ناک میں سونے کی کیلیں، لیکن جڑاؤ نہیں۔ کانوں میں بہت پتلی سونے کی بالیاں۔ اونچے لہنگے کی بنا پر پنڈلیاں بڑی حد تک بے پردہ تھیں۔ پاؤں میں چاندی کی ہلکی پازیب کے سوا کوئی زیور نہ تھا۔ جوتی سے بے نیازی کے باوجود پاؤں کے پنجے اور انگلیاں پھیلی ہوئی نہ تھیں جیسا کہ ننگے پاؤں پھرنے والوں کے یہاں عام طور پر دیکھا گیا ہے۔

دونوں لڑکیوں کی نگاہیں کبھی کبھی نوجوان مسافروں کی طرف اٹھتیں، بظاہر بالکل بے ارادہ اور اتفاقیہ، لیکن پھر وہ فوراً جھکتی نہ تھیں، جیسے بھری محفل میں کسی کی انگلیاں اچانک کسی اور کی انگلیوں سے اتفاقاً چھو جائیں لیکن فوراً الگ نہ ہوں۔ اندھیرا آسمان کے زینوں سے چھلانگیں مارتا ہوا اتر رہا تھا۔ یعقوب اور داؤد نے دل میں سوچا کہ اب اور تھوڑی بھی دیر کی گئی تو اندھیرا ہر طرف چھا جائے گا اور یہ دونوں جل پریاں نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ وہ اپنے گھوڑوں کو اور قریب لائے۔ وہ لڑکیاں کنویں میں ڈول ڈال کر پانی بھرنے کی کوشش میں تھیں۔

''لائیے، ہم بھر دیتے ہیں۔ آپ ادھر آجائیے۔'' یعقوب نے کہا۔

لڑکیوں نے ہرنی کی طرح آنکھیں اٹھائیں، آنے والوں کو دیکھا، پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پنگھٹ والیوں کی قطار ابھی دور نہ گئی تھی۔ ان کی نزدیکی ان کی حفاظت اور سلامتی کی ضمانت تھی۔ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پیچھے ہٹ گئیں۔ ان کی مسکراہٹ کسی خاص فرد کے لئے نہ تھی، اس کے باوجود مسافروں کو لگا کہ یہ مسکراہٹ ہمارے ہی لئے تھی۔

''بڑی پیاس لگ رہی ہے، اجازت ہو تو ہم بھی پانی لیں اور جانوروں کو بھی پلا دیں۔'' داؤد نے ڈول کو کنویں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر وہی خفیف سا تبسم، لیکن اس بار اس کے ساتھ سر کی ہلکی سی جنبش بھی تھی۔ اب ان کی حرکات وسکنات، بدن کی جنبش، اور چال کے سرگم میں اعصابی تناؤ بالکل نہ تھا، لگتا تھا ایک ہی لمحے کی بات نے انھیں مطمئن کر دیا تھا۔ دونوں وہیں کنویں کی جگت پر بیٹھ گئیں۔ مسافر نوجوانوں نے آناً فاناً اپنی میزبانوں کی گاگریں بھر دیں۔ اس کے پہلے کہ لڑکیاں اپنے اپنے گھڑے اٹھانے کے لئے جھکتیں، مسافروں نے اپنے سامان سے تانبے کے بھاری نقشین کٹورے نکالے اور چار کٹوروں میں پانی بھرا۔ پھر خرجین سے مٹھیاں بھر بھر بادام، اخروٹ، خشک خوبانیاں، اور چلغوزے لے کر انھوں نے ایک اور کٹورا بھر کر پانی اور

میووں کا کٹورا اپنی میز بانوں کو پیش کیا۔

''آیئے، آپ بھی ہمارا ساتھ دیجئے نہ۔'' ایک بھائی نے کہا۔

''جی ہاں اور کیا؟ بھلا آپ کو بھی تو پیاس لگی ہوگی۔'' دوسرا ذرا مسکرا کر بولا۔

وہ ایک لحظہ تو مسافروں کا منھ تکتی رہیں، پھر انھوں نے ان کے رہبر کی طرف دیکھا جو ذرا فاصلے پر کھڑا گھوڑوں کو پانی پلانے کا انتظام کر رہا تھا۔

''یہ کون لوگ ہیں اور ہمیں کیا کھانے کو دے رہے ہیں؟'' بڑی لڑکی نے مارواڑی میں کہا۔ اس کی آواز میں الھڑ پن اور پختہ مزاجی کا عجب دلکش امتزاج تھا۔ اس کی آواز میں ایک طرف تو جوانی اور طفلی گلے مل رہی تھیں اور دوسری طرف یہ اشارہ بھی تھا کہ ہم کو نادان نہ سمجھنا، دنیا اور اہل دنیا کے بارے میں ہم نے تھوڑی ہی عمر میں بہت کچھ سمجھ لیا ہے۔

رہبر ایک لمحے کو گڑ بڑایا کہ کیا جواب دے۔ اس نے اپنے مسافروں اور ان لڑکیوں کے درمیان کچھ کیمیائی عمل واقع ہوتے محسوس کیا تھا لیکن ہنوز وہ اس کے معنی اور مضمرات تک نہ پہنچ سکا تھا۔ اس کو سب بات سچ سچ تو کہنی ہی تھی لیکن اسے پوری طرح اطمینان نہ تھا کہ اس کے مسافروں کی بھی توقع یہی تھی کہ وہ سچ بولے گا۔

''یہ لوگ کشمیر سے آئے ہیں، ان کی ذات پات مجھے نہیں معلوم، ترک ہیں اور نیک لوگ ہیں۔ ان کے کٹورے میں کشمیر کے پھل ہیں، یہ یوں ہی خشک کھائے جاتے ہیں۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر اور آنکھیں جھکا کر کہا۔

داؤد اور یعقوب نے ''ترک'' اور ''کشمیر'' کے الفاظ بخوبی سمجھے۔ وہ مارواڑی تو نہ جانتے تھے لیکن ہندی سے ان کا کام اب تک بخوبی چلتا رہا تھا۔ یعقوب نے ذرا آگے بڑھ کر کہا:

''ان میووں میں کوئی چیز آپ کے دھرم کے خلاف نہیں۔ ہم کلمہ گو ہیں اور صاف پاک کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔''

بڑی لڑکی نے ''دھرم'' اور ''کلمہ'' کے الفاظ کو سن کر خفیف سا تبسم کیا اور عجب دلربائی کی ادا سے ہاتھ گلے کے پاس لے جا کر سیلی کو گریبان سے نکالا۔ پتہ چلا کہ وہ سیلی نہیں تھی، چاندی کی ہیکل تھی جس پر لفظ ''اللہ'' لکھا ہوا صاف نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ اٹھانے، گلے تک لے جانے اور تعویذ باہر نکالنے، ہر ادا میں پانی کی سی لطافت اور روانی تھی۔ ہیکل، اور اس سے زیادہ صاحب ہیکل کے چہرے کی چمک دیکھ کر داؤد

نے ذرا اور ہمت کی:

''ہم لوگوں کو بھی اپنا خیر خواہ اور دوست جانئے۔ میں داؤد کشمیری ہوں، یہ میرا جڑواں بھائی یعقوب ہے۔ ہم لوگ بیوپاری ہیں اور گانے بجانے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ ہمارے دادا چتیرے تھے، یہیں کشن گڈھ کے...''

''...ہمارے باپ ماں نہیں ہیں۔ ہم لوگ اپنا وطن تج کر اب آپ کے ملک کی کٹھور سرزمین میں سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈنے آئے ہیں۔'' یعقوب نے بھائی کی بات پوری کی، لیکن اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اسے ایسا لگا جیسے کہ فرشتے اس کے سر پر سایہ کرتے ہوئے شفق مغرب میں جا کر گم ہو گئے ہوں۔

ان ناخواندہ اور غیر متوقع مسافروں کی نستعلیق گفتگو اور خوبروئی کا ان لڑکیوں پر وہ اثر نہ پڑ سکا تھا جو یعقوب کی آب دیدگی نے ان کے دلوں میں پیدا کیا۔ چھوٹی لڑکی اضطراراً اٹھنا چاہتی تھی کہ آگے بڑھ کر رونے والے سے ہمدردی کرے، لیکن بڑی نے اشارے سے اسے روک دیا۔ مگر پھر وہ بھی یہ دیکھ کر ذرا گھبرا گئی کہ دوسرے بھائی کی بھی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلی روشنی تھی۔ عشق کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اپنی گرمی سے زمین والوں کے سخت دلوں کو نرم، خشک مٹی کو گرم اور ہیزم حیات کو جلنے کے لئے آمادہ کر دیتا ہے۔ عشق آتشے ست پیر و جواں راخبر کنید۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں، سوا اس کے بات کا جواب بات سے دیں کہ مسافروں کے دلوں کا تناؤ کچھ کم ہو۔

''جی، ہم... ے... میرا نام حبیبہ ہے،'' بڑی نے نیچی آنکھوں سے کہا۔ ''یہ میری بہن جمیلہ ہے، مجھ سے دو برس چھوٹی...''

''...ہمارے بھی باپ ماں نہیں ہیں۔'' جمیلہ بول پڑی۔ ''ہم بھی دنیا میں بالکل اکیلے ہیں۔'' دونوں کی ہندی میں برج کی مٹھاس کے ساتھ مارواڑی کا تھوڑا اکھڑ پن بھی تھا، لیکن مسافروں کو ان باریکیوں کی کیا خبر ہوتی۔ وہ تو بس آواز کی آئینہ آسائی پر غش اور ہونٹوں کی شکر شکنی پر زہر کھائے ہوئے تھے۔

''چپ،'' حبیبہ نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا، ''ہمارے بابو تو ہیں۔ چل اب گھر کو چل۔ نہیں تو لوگ کیا جانے کیا سمجھ لیں گے۔''

''نہیں نہیں، کچھ دیر تو بیٹھئے۔'' داؤد نے کہا۔ ''آپ لوگوں کو پانی لانے لے جانے کی بڑی

مشکل ہے۔ کوئی ملازم نہیں ہے آپ کے یہاں؟''

''ملازم؟'' جمیلہ نے زیر لب دہرایا۔ ''ملازم کیا مطلب، نوکر؟ ہمارے یہاں کوئی نوکر نہیں ہے، عورتیں ہی سارے کام کرتی ہیں۔'' اس نے سادگی سے اپنی ہتھیلیاں کھول کر ان کے سامنے کر دیں۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے کے باوجود ہتھیلیوں کے بھورے گٹھے صاف نظر آ رہے تھے۔

''افسوس... اچھا ہمیں نوکر رکھ لیجئے۔ ہمیں بھی سر چھپانے کو جگہ مل جائے گی۔''

''بل بے کشمیری جی آپ کی یہ دھج!'' جمیلہ چمک کر بولی۔ صحرا نوردوں کی ملائمت اور باتوں کی مٹھاس دیکھ کر ان کی ہمتیں اب کھل رہی تھیں۔

''چپ چڑیل کہیں کی، تیرا سر تو نہیں پھرا۔'' حبیبہ نے کہا۔

''کشمیری جی،'' جمیلہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا، ''جایئے چنی میں منھ دھو آیئے، ہماری نوکری خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔''

اس جملے کی تہ میں معنی ہی معنی تھے اور انھیں سمجھنے میں یعقوب کو تامل تھا نہ داؤد کو۔ لیکن منازل تعلق کو اتنی جلد جلد طے کرنے سے دونوں جھجکتے تھے۔ یعقوب نے میووں کا پیالہ ہاتھ میں لیا اور دو پہلو بیٹھ کر بولا، گویا کوئی اور بات ہی نہ ہوئی تھی۔ ''لیجئے کچھ تو نوش کر لیجئے، کچھ دیر کیے تو سہی۔''

حبیبہ نے بتکلف ایک گھونٹ پانی پیا۔ مسلمان ہونے کے باوجود اسے چھوا چھوت کا بہت خوف تھا، لیکن ان مسافروں کے چہرے بشرے چال ڈھال بات چیت میں موہنی سی تھی کہ ان کی بات ٹالنے کا اسے یارا ہی نہ تھا۔ حبیبہ کی دیکھا دیکھی جمیلہ نے بھی ہاتھ بڑھا کر دو بادام اٹھائے اور منھ میں ڈال لئے۔

''آپ لوگوں کا کھانا کون پکاتا ہے؟'' یعقوب نے سلسلۂ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا۔ اسے اور کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔

''جی ہمارے یہاں شاہ عالم بادشاہ غازی کے بکاول ملازم ہیں۔'' جمیلہ نے سیدھے منھ جواب دیا، گویا حقیقت حال یہی ہو۔ لیکن حبیبہ نے پھر اسے سرزنش کی۔

''جمیلہ چپے چاپ بیٹھ جا، مجھے یہ چہٹر کھانیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔'' پھر وہ نوواردوں سے متوجہ ہو کر بولی:

''میاں جی آپ کیا جانے کہاں کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم لوگ کھانا پکانے کے لئے بہت

ہیں۔ اور ہم لوگوں کا کھانا ہی کتنا اور کیا۔ کبھی روکھی سوکھی ملتی ہے تو سائیں کا شکر بجاتے ہیں۔ کبھی وہ بھی نہیں ملتی...''

''آپ کو ہم اپنا کھانا کھلائیں؟ کھایئے گا؟''

''جی نہیں،'' حبیبہ ذرا تنک کر بولی۔ ''ہم نے تو سنا تھا کہ پردیس کے لوگ مان نہ مان میں تیرا مہمان جیسے کام کرتے ہیں۔ یہاں تو الٹی ہی گنگا بہادی آپ نے۔''

''ہم کو پردیسی مہمان نہ گردانیئے،'' داؤد نے مسکرا کر کہا۔ ''ہمیں گھر والا سمجھئے۔''

اس جملے کی معنویتیں بولنے والے پر عیاں تھیں تو اس سے کچھ زیادہ ہی سننے والیوں پر آشکارا تھیں۔ دونوں کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔

''اچھا اب ہم چلتے ہیں،'' حبیبہ نے کہا۔ ''بہت دیر ہو گئی ہے۔ بابو کیا سوچتے ہوں گے۔ آپ لوگوں نے پانی پی لیا کہ نہیں؟''

''پی تو لیا... لیکن ابھی پیاس کہاں بجھی۔''

''پانی تو پی لیا لیکن ذات تو نہیں پوچھی...'' دوسرے بھائی نے جملہ پورا کیا۔

''اچھا، میاں جی ہم لوگوں کو کھلواڑ تو بنائیں نہیں۔ آپ لوگ آپھی پیاسے ہیں کہ ہم لوگوں سے پانی بھروا رہے ہیں۔'' جمیلہ نے کہا۔

''نہیں سچ آپ کی جان کی قسم بڑی پیاس لگی ہوئی ہے۔ لیجئے اوک سے پلا دیجئے۔'' یہ کہہ کر داؤد نے پانی سے بھرا کٹورا جمیلہ کے ہاتھ میں دے دیا اور خود دوزانو بیٹھ گیا۔ دونوں بہنیں ابھی تک نو وارد اجنبیوں سے کچھ کٹی کٹی سی بیٹھی تھیں، اب جمیلہ کسی کبوتری کی طرح جو دھوکے سے نئے آنگن میں اتر آئی ہو، سنبھل سنبھل کر چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتی داؤد کے پاس آئی اور کٹورے سے اس کے چلو میں پانی ڈالنے لگی۔ لیکن اس کی آنکھیں داؤد کے ہاتھوں پر نہیں، اس کے جھکے ہوئے سر پر تھیں، اور داؤد ٹکٹکی لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔ پانی چلو سے ہو ہو کر نیچے بہتا رہا یہاں تک کہ کٹورا خالی ہو گیا۔ جمیلہ نے یہ رنگ دیکھا تو کچھ شرمندہ ہو کر اور کچھ جھنجھلا کر کٹورا الگ پھینکتی ہوئی بولی :

''دھنیہ ہو مہاراج، بڑے پیاسے بنتے تھے۔ سارا پانی گرا دیا۔ شرم نہیں آتی آپ کو۔'' لیکن حبیبہ کی آنکھیں یعقوب پر تھیں اور دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے کچھ مبہم سا پیغام تھا۔

شام اچھی طرح پھول چکی تھی۔ اب ان لعبتان صحرا زاد کو یارائے قیام نہ تھا۔ انھوں نے

ایک گاگر تھی لیکن ان کے قدم کچھ سست پڑ رہے تھے، گویا پنگھٹ پر جانے کے بارے میں وہ گومگو میں گرفتار ہوں۔ لیکن بہر حال پانی تو بھرنا ہی تھا، اور ایک بار کنویں پر آجانے کے بعد انھیں واپسی کی بظاہر کوئی عجلت نہ تھی۔ دونوں کی نگاہیں گرد و پیش میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ اگر چہ کنویں پر سے کچھ نظر نہ آتا تھا لیکن شاید ان کے دل نے گواہی دے دی تھی کہ مسافر پاس آگئے ہیں۔ بھیڑ کم ہوئی لیکن حبیبہ اور جمیلہ نے آگے بڑھنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

پنگھٹ پر نگاہیں جمائے ہوئے بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ اب پیش قدمی کے لئے وقت مناسب ہے۔ تھوڑی دور واپس جا کر گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہ اس انداز میں کنویں کی طرف مڑے گویا ابھی ابھی پہنچے ہوں۔ ان کو آتے دیکھتے ہی ایک عورت نے حبیبہ کی کمر میں ٹھوکا دیا اور کہا، ''لو وہ آگئے تمھارے پیاسے مسافر!''

''توبہ ہے دیدی، آپ بھی کیسی باتیں کرنے لگیں۔ ہمارے پیاسے کیوں، وہ اپنے ہوتے سوتوں کے پیاسے ہوں گے۔ میں تو ان سے لوٹا بھی نہ اٹھواؤں۔''

''جی بندگی عرض ہے۔'' یعقوب نے پاس پہنچ کر کہا۔ ''شکار سے آرہے ہیں، بڑی پیاس لگی ہے ذرا پانی پلوا دیجئے۔''

گاؤں کی عورتیں اپنے اپنے گھڑے اور گڑویاں اٹھا کر واپس جاتے جاتے معنی خیز انداز میں مسکرائیں، لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں، اور نہ ہی کسی نے جانے کی جلدی کی، یا ٹھہرے رہنے کا کچھ اشارہ ہی دیا۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے گلابی ہونے لگے، لیکن جواب انھوں نے بھی کچھ نہ دیا۔

''کیوں صاحب، پانی نہ ملے گا؟ کنویں پر کربلا نہیں مچتی، سبیلیں لگتی ہیں۔'' دوسرے بھائی نے مسکرا کر کہا۔

اب جمیلہ نے ذرا تنک کر جواب دیا، ''کوئی برتن ہو تو نکالئے، اوک سے پینا تو آپ کو آتا نہیں۔''

''پینے پلانے کے لئے اور بھی طریقے ہیں، اور بھی برتن ہیں۔''

''باتیں نہ بنایئے، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' جمیلہ نے منھ پھیر کر کہا۔

اس اثنا میں بھیڑ چھٹ چکی تھی، لیکن گاؤں کی عورتیں ابھی بہت دور نہ گئی تھیں۔ حبیبہ نے واپس جاتی ہوئی عورتوں کو پیچھے ایک نظر دیکھا اور آہستہ سے بولی، ''اس طرح یہاں آجانا آپ لوگوں کو

سوہتا نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"ہم کوئی لچے بدمعاش نہیں۔ آپ ہمیں اوروں کی طرح نہ سمجھئے۔ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔"

جمیلہ نے انھیں تیکھی لیکن متبسم نگاہ سے دیکھا اور پوچھا:

"آپ دونوں میں ہیرا کون ہے؟"

داؤد نے کہا۔ "جو آپ کے قدموں تلے پامال ہو جائے وہ ہیرا اور جسے آپ ٹھوکر مار کر ہٹا دیں وہ کنکر۔"

"میاں صاحب شاعری تو جانتے ہیں، پر شاید یہ نہیں جان سکے کہ شاعری جتنی میٹھی اور سجل ہے زندگی اتنی ہی کڑوی اور کٹھن ہے۔" حبیبہ کے لہجے میں تحقیر کی ہلکی سی سردی اور تیزی تھی۔

"زندگی تنہا گذرے تو بے شک کڑوی اور کٹھن ہے۔ یار موافق مل جاوے تو چاہ کا لطف اور جینے کا مزہ بھی ہے۔"

"تو آپ وہاں سے یہی کچھ ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں؟ کہیں دھوکا نہ کھا جائیں۔"

"وہاں ہمارا کوئی نہ تھا اور ہماری نال یہاں گڑی ہے۔ اپنوں سے دھوکا کھائیں تو اس میں بھی ایک عالم ہے۔"

"ہم تو بنی ٹھنی کے دیوانے تھے، اسی کے فراق میں سر کو بکھیرے پھرتے ہوئے جگر سوختہ یہاں تک آئے تھے، لیکن یہاں دو حوروں نے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔"

یعقوب سے صبر نہ ہوا، اس نے دل میں کہا کہ شگفتہ جملوں اور گرم فقروں کے رد و بدل میں کچھ صرفہ نہیں۔ کام کی باتیں معلوم کی جائیں۔

"وہ... وہ بابو صاحب آپ کے کون ہیں، کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

دونوں لڑکیوں کے چہرے پر کلونس سی دوڑ گئی۔ جمیلہ کی ساری زندہ دلی ایک دم میں غائب ہو گئی۔ "وہ ہمارے دوسرے باپ ہیں۔" حبیبہ نے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کو کریدتے ہوئے کہا۔

جمیلہ کی روشن اور شفاف آواز اچانک دھندلا گئی۔ "آپ کو تو بتایا تھا کہ ہم بے ماں باپ کی ہیں۔"

دونوں بھائی ایک لمحے کے لئے سکتے میں آگئے۔ "تو آپ کے بڑے بوڑھے کوئی ہوں

گے؟'' یعقوب نے ہمت کر کے پوچھا۔

''ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ہمارے باپ کو ایک دن جنگل میں پھرسے نے کاٹ لیا۔ ہمارا ایک بھائی دودھ پیتا بچہ گود میں تھا۔ اور کوئی آگے نہ پیچھے۔ ہماری ماں اس گاؤں کی نہ تھی۔ اس کے مائکے والے پوچھنے بھی نہ آئے۔ اماں نے کچھ دن تنگی برداشت کی...''

''...لیکن سہارا بھی تو کوئی نہ تھا۔'' حبیبہ بولی۔ اکیلی عورت، اجنبی گاؤں۔ پھر اس نے ایک مرد کر لیا۔ پر تھوڑے ہی دن گئے ہوں گے کہ ہمارے بھائی کو سیتلا ماں لے گئی...''

''سیتلا ماں؟'' داؤد کے منھ سے نکلا۔

''شش، چیچک۔ یہاں کے لوگ نام نہیں لیتے۔'' یعقوب نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''تپ سے اس کا پنڈا بھلستا تھا اور چھالے یہ بڑے بڑے ...لیکن اماں اسے اپنی گود میں کھلاتی اور سلاتی تھیں۔ اس کو گاڑ کے آئے تو اماں کو تپ چڑھی...''

''اماں چار دن میں چٹ پٹ ہو گئیں۔''

اب دونوں لڑکیاں زار و قطار رونے لگی تھیں۔ ''بابو ہمیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ کبھی کبھی غصے میں یہ بھی کہہ بیٹھتے ہیں کہ تم دونوں کو لے جا کر جے پور میں بیچ دوں گا۔''

داؤد اور یعقوب کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں اور کیا کریں۔ ایک بھائی نے جھٹ کنویں میں ڈول ڈال کر پانی نکالا اور چلو بھر پانی لے کر ہلکے ہلکے دونوں بہنوں کے منھ دھلائے۔ جس کی آواز اور جس کی دید کے لئے وہ تمام رات ترسے تھے اب اس کے لب و رخسار پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ لیکن اس وقت تو ان کے آنسو خشک کرنا سب سے اہم کام تھا، اختلاط اور لمس کا لطف اٹھانے کا محل یہ نہ تھا۔

بڑی مشکل سے انھوں نے دونوں لڑکیوں کو ایک ایک گھونٹ پانی پینے پر راضی کیا۔ انھوں نے اوڑھنی کے دامن میں آنسو پونچھے۔ پھر مسکرانے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے حبیبہ بولی:

''آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ یہ دکھاریاں اپنی ہی جان کو کلپتی بیٹھی ہیں۔ لیکن یہ تیرہ صدی ہے، کسی کا کچھ ٹھیک نہیں۔ ہم تو بڑے خواجہ جی کی چوکھٹ پر پڑے یہی دعا کرتے ہیں کہ ہمارا کوار پتا سلامت رہ جائے۔'' اس کی آنکھیں پھر چھلکنے لگیں۔

''آپ دل چھوٹا نہ کریں، وہ بڑا کارساز ہے... سنئے، آپ لوگوں نے اپنے آگم کے بارے

میں کبھی کچھ خیال کیا؟''

''کیا خیال کرتے اور کس کے بھروسے پر؟'' جمیلہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''علیا حضرت، آسمان کی چالوں سے ہر کوئی ناچار ہے، لیکن جو آسمان کو چلاتا ہے وہ تو ناچار نہیں۔'' یعقوب نے جواب دیا۔

''اسی امید کے سہارے تو اب تک کٹی ہے لیکن اب تو زندگی کا ہر دن ہم لوگوں کو موت سے بد تر لگتا ہے۔ زہر بھی تو نہیں ملتا کہ کھا کر سو رہیں۔ کاش اسی مردودھر میں کہیں منھ چھپا لیتے کہ چیل کوؤں کو بھی پتہ نہ لگتا۔'' حبیبہ نے کہا۔

''چھی، ایسی بات زبان پر نہیں لاتے۔ اللہ کے لئے کیا مشکل ہے، ابھی پہاڑ میں راستہ بنا دے۔''

''جی ہاں آپ کا تو راستہ بنا ہوا ہے، کل کہیں اور ہوں گے۔''

''ہماری ساری راہیں تو آپ نے مسدود کر دی ہیں۔'' یعقوب نے سر جھکا کر کہا۔

حبیبہ چپ چاپ اس کا منھ تکنے لگی۔ پھر ایک لمحہ چپ رہ کر یعقوب نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''اب ہم کہیں نہ جائیں گے۔''

''آپ کے در پر گدائی ہمارے لئے بادشاہی سے بڑھ کر ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ لوگ اسے بھی کوئی بیوپار کی بات سمجھے ہیں کیا؟ اور پھر ہمارا دروازہ کیا اور ہماری گلی کیسی، ہم نے تو یہی سنا ہے کہ سانپ اور عورت زمین کے اندر ہی ٹھیک ہیں۔''

''لعنت ہے۔ اور ہیہات اس دنیا پر کہ اس نے آپ جیسی رونق گلزار خوبی اور بلبل شاخسار محبوبی کو اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیا...''

''مولوی جی ہمیں یہ ٹیڑھی میڑھی فارسی نہ پڑھاؤ ہم تو ہندی بھی ٹھیک سے نہ جانیں۔'' جمیلہ نے ہنس کر، لیکن زہرخند کے لہجے میں کہا۔

''دن چڑھتا چلا آ رہا ہے،'' داؤد نے کہا۔ ''ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کے سامنے کوئی راہ روشن ہے۔ ورنہ یہ دن بھی رات میں بدل جائے گا۔''

یعقوب نے منت کے لہجے میں کہا، ''ذرا دیر میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو جائے گی، اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ آپ کہیں تو ہم شام کو پھر آئیں، نہیں تو...''

''نہیں، آپ کو ہم شام میں یہیں ملیں گے۔'' حبیبہ نے جواب دیا۔

لیکن اس جملے کے معنی کیا تھے، ان لفظوں میں کیا کچھ اشارے پنہاں تھے یا صرف رسمی بات تھی، ان معاملات کا کوئی کنایہ اس کے لب ولہجہ، یا اس کی چشم سخن ساز میں تھا۔ نہ ہی اس کے چہرہ و پیشانی پر کوئی تناؤ یا انقباض تھا، بس جیسے ایک عام سی بات بر سبیل گفتگو کہہ دی گئی ہو۔ مطلب نکالنا تو ان کا کام تھا، بشرطیکہ کہنے والے نے کچھ مطلب رکھا بھی ہو۔ سب ہی اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی توفیق کے اعتبار سے دولت معنی سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے حصے کی ملتی ہے۔ لیکن کیا خبر ہمارے حصے کی اسی میخانے میں ہے یا کہیں اور۔

زاہد از مسجد من از مے خانہ رسوا گشتہ ام
ہر یکے را طشت از بام دگر افتادہ است

تیقن کی کمی اپنی جگہ، لیکن داؤد اور یعقوب نے قسمت ٹھونک لی تھی۔ اگر آج کامیابی نہ ہوئی تو بھی وہ میدان چھوڑ کر جانے والے نہ تھے۔ اور اگر کامیابی انشاء اللہ ہوئی تو انھوں نے آئندہ کا انتظام بھی سوچ لیا تھا۔ سرائے واپس پہنچ کر انھوں نے اپنے رہبر کو معقول معاوضہ اور قرار واقعی انعام دے کر رخصت کیا کہ آگے کا راستہ ہمارا دیکھا ہوا ہے، ہم یہاں سے باندی کوئی ہوتے ہوئے اکبر آباد نکل جائیں گے۔ پھر انھوں نے دوپہر کو باندی کوئی کی راہ پر ایک منزل جا کر ایک سرائے بھی ڈھونڈ لی۔ شام پڑنے کے پہلے ہی انھوں نے رخت سفر باندھ لیا اور بھٹیاری کو انعام و اکرام دے کر چاروں گھوڑوں کے ساتھ باندی کوئی کی راہ تھام لی۔ ایک دو کوس جا کر انھوں نے گھوڑوں کو ستایا، پانی پلایا، تازہ دم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور پنگھٹ والے گاؤں کو واپس چل پڑے۔ لیکن اس بار ان کی کمر میں پیش قبض کے بجائے تلوار تھی۔

عورتوں کا ہجوم آج شاید کچھ جلد رخصت ہو گیا تھا، اس وقت وہاں صرف حبیبہ اور جمیلہ تھیں۔ دونوں بھائی گھوڑے اٹھائے ہوئے درانہ کنویں تک آ گئے۔ انھیں یہ دیکھ کر حیرت اور اس سے زیادہ دلی ابتہاج اور سنسنی کا احساس ہوا کہ دونوں بہنوں کے ہاتھ میں ایک ایک بقچہ تھا جس میں بظاہر پہننے کے کپڑے تھے۔

''بندگی عرض ہے علیا حضرت، ہم حسب وعدہ حاضر ہیں۔''

''ہم بھی موجود ہیں، قسمت جہاں لے جائے۔'' حبیبہ نے اپنے بقچے کی طرف اشارہ کیا اور کچھ محجوب سے تبسم کے ساتھ بولی۔ ''اور ہمارا گھر بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔''

''اے سبحان اللہ! زہے نصیب اور خہے تقدیر، تشریف لائیں، رہوار حاضر ہے۔'' داؤد نے کہا، لیکن اس کی آواز میں کچھ تھرتھری تھی۔ داؤد اور یعقوب ہاتھ پھیلا کر بڑھے ہی تھے کہ دونوں لڑکیاں سہم کر اپنی جگہ پر تھم گئیں۔ ایک دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دی:

''ٹھہرتو جاؤ مالزادیو ابھی تمھاری ایسی گت بناتا ہوں کہ چیل کوؤں کو تم پر رحم آئے۔ حرامزادی چھتیسی تم لوگوں کی یہ ہستی کہ اپنے دھگڑوں کے ساتھ گاؤں میں سب کے آگے مستی کردہو...''

''بابو آگیا۔'' حبیبہ نے سسکی لے کر کہا۔ ''ہائے اللہ اب کیا ہوگا۔''

ایک ادھیڑ سے کچھ زیادہ عمر کا شخص، دھوتی اور سوتی بنڈی میں ملبوس، گلے میں سیاہ سیلی اور تعویذ، ہاتھ میں لمبا را چپوتی بلم لئے بڑھا آرہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں لکڑ بگھے کی یاد دلاتی تھیں۔

نزدیک پہنچ کر اس شخص نے مسافروں سے تو کچھ تعرض نہ کیا، لیکن لڑکیوں پر جھپٹنا چاہتا تھا کہ داؤد نے اپنی لمبی ٹانگ آگے کردی، وہ لڑکھڑا کر گرا اور ابھی سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ یعقوب نے تلوار نکال لی اور بولا:

''ان لڑکیوں پر تمھارا کوئی حق نہیں۔ اور یہ بالغ ہیں اور اپنی مرضی کی مالک۔ تم انھیں اپنی ہوس کا شکار بنا کر کوٹھے پر بیچنا چاہتے ہو تو یہ ہم نہ ہونے دیں گے۔''

بابو نے ماں کی گالی دے کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''تم ہو کون مجھ سے کہنے والے کہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟''

یعقوب نے تلوار کی نوک اس کے تلوے میں چبھوئی اور کہا، ''اٹھ۔ سیدھا اپنے گھر جا۔ یہ لڑکیاں ہمارے نکاح میں آئیں گی۔ تیرا ان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اور لے، تیرا ان پر کچھ نکلتا تھا تو یہ لے۔'' یہ کہہ کر اس نے روپے کے دو بدرے ہمیانی سے کھول کر بابو کے منھ پر پھینک دیئے، اور پھینکے اس ہوشیاری سے کہ ایک توڑا گرتے گرتے کھل گیا۔ بابو کے سر اور منھ پر روپیوں کی بوچھار سی گری۔ وہ ادھر متوجہ ہوا اور ادھر یعقوب اور داؤد نے دونوں لڑکیوں کو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار کر کے ایڑ لگائی اور چشم زدن میں کنویں پر سے اوجھل ہو گئے۔ دونوں گھوڑے کوتل ان کے پیچھے پیچھے اسی جوش کے ساتھ دوڑتے ہوئے نکل گئے۔

فرخ آباد

پہلی منزل پر پہنچ کر وہ ٹھہرے نہیں، لیکن چار گھڑ سوار وہاں ان کے منتظر تھے۔ یہ انتظام وہ دوپہر کے وقت ہی کر آئے تھے۔ دو سواروں کے پاس فرانسیسی طرز کی رفل (Rifle) تھیں اور دو کے پاس ہندوستانی دگاڑے۔ دور تک مار کرنے کے لئے رفلیں بہتر تھیں اور نزدیک نشانہ لگانے، خاص کر ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے ہندی دگاڑے سے بہتر کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس میں ہندوستانی چھرے (انگریزی میں انھیں bird shot کہتے تھے۔) اور انگریزی گراب (انھیں انگریزی میں grapeshot کہتے تھے) دونوں چل جاتے تھے۔ چاروں محافظوں کے پاس سیل بھی تھے۔ یہ نیزے سے چھوٹے اور بلم سے ہلکے ہونے کے سبب سے پھینک کر مارے جاسکتے تھے اور دو بدو جنگ کے لئے بھی مناسب تھے۔ چاروں سواروں کے پاس ایک ایک بادبان بھی تھا جسے وہ دوران سفر ہمہ وقت روشن رکھتے تھے لیکن مسافروں کے رہوار بالکل تاریک رکھے جاتے۔ دو محافظ کوئی پچاس قدم آگے رہتے اور دو مسافروں کے ذرا پیچھے۔ مسلح سواروں کی محافظت میں وہ ساری رات چلتے رہے۔ کوتل گھوڑوں کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکا تھا کہ ہر گھنٹے کے بعد وہ ذرا دیر رکتے، گھوڑے بدلتے اور آگے چل دیتے۔ باندی کوئی پہنچتے پہنچتے صبح ہونے لگی تھی۔ انھوں نے سرا میں قیام کیا اور صبح کو قاضی کے دربار میں پیش ہوئے کہ یہ کنیزیں ہم نے مول لی ہیں، اب ہم ان سے نکاح کے متمنی ہیں اور اسی غرض سے دار القضا میں حاضر ہیں۔ قاضی نے حکم دیا کہ دکھیاریوں کو پہلے آزادی کا پروانہ دیا جائے۔ یہ کارروائی فوراً مکمل ہوگئی تو قاضی نے مناسب لیکن معمولی پوچھ گچھ کی اور اپنی وکالت اور مسلح سواروں کی گواہی پر نکاح بطریق اہل سنت پڑھا دیا۔

اس واقعے کے گیارہ مہینے بعد میرے اعلیٰ حضرت، میرے بابو جناب یعقوب بڈگامی علیہ

الرحمہ والغفران اور میری پیاری اماں بی بی جمیلہ علیہا الرحمہ کے یہاں میری پیدائش ہوئی (اکتوبر ۱۷۹۳ء) پیغمبران کرام کے پاک ناموں پر نام رکھنے کی سنت پاستان کو جاری رکھتے ہوئے میرے والد مرحوم نے میرا نام محمد یوسف رکھا۔ میرے چچا صاحب کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دونوں بھائیوں میں حسب سابق محبت وملاطفت قائم رہی جو پیدائش پر بنی مواخات سے بڑھ کر سچی مواسات کے درجے کو پہنچ گئی تھی۔ ایک کی کمی ایک پوری کرتا تھا، ایک کی مشکل ایک حل کرتا تھا، ایک کا غم ایک اٹھاتا تھا۔

باندی کوئی میں نکاح و ولیمہ کے دو ہی دن بعد وہاں سے کوچ ہوا۔ دونوں بھائیوں نے بر بنائے احتیاط متفقہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ جے پور اور میواڑ کے اضلاع کو بہت دور چھوڑ کر فرخ آباد میں سکونت اختیار کی جائے۔ باندی کوئی سے نکل کر گنگا پور، بیانہ، فتحپور سیکری ہوتے ہوئے وہ بڑے آرام سے آٹھ دن میں اکبر آباد پہنچ گئے تھے۔ وہاں چندے قیام کے بعد فیروز آباد، مین پوری، اور بیاور ہوتے ہوئے فتح گڈھ میں صاحبان فرنگیان کی چھاؤنی سے کترا کر نکلتے ہوئے انھوں نے فرخ آباد پہنچ کر دم لیا۔

فرخ آباد میں قیام کی سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ اب وہاں مرہٹہ کا زور بہت کم ہو گیا تھا۔ چار دہائی پہلے صفدر جنگ اور راجہ نول رائے کی حملہ آوری کا جواب ترکی بہ ترکی دینے کے بعد (۱۷۵۰) سے نواب احمد خاں بنگش اور پھر ان کے بیٹے اور حالیہ نواب، دلیر ہمت خاں مظفر حسین بنگش مظفر جنگ کے زمانے (مسند نشینی، ۱۷۷۱) میں چین ہی چین تھا۔ اعلیٰ حضرت دہلی بھی نواب دلیر ہمت مظفر جنگ پر مہربان تھے۔ اصحاب فرنگ اپنا رسوخ بڑھا رہے تھے اور انھوں نے فتح گڈھ میں اپنی چھاؤنی بنا کر وہاں بنگالی پیدل برقندازوں (Bengal Native Infantry) کی ایک پلٹن بھی کھڑی کر دی تھی، لیکن وہ کسی سے تعرض نہ کرتے تھے۔ ایک طرح سے یہ ملک سلطنت دہلی میں تو تھا ہی، لیکن اسے نواب کے علاوہ فرنگیوں کی بھی پشت پناہی حاصل تھی۔ دولت ہر طرف برس رہی تھی۔ کشمیری قالین یا میوہ جات کی تجارت کا یہاں کوئی امکان نہ تھا، لیکن ہنر اور صناعی کی طرف فطری رجحان کے باعث، اور اس وجہ سے بھی، کہ وہاں زیورات طلائی کا بہت چلن تھا، بھائیوں نے سادہ کاری اختیار کی اور فرخ آباد کی قدیم صنعت، یعنی کپڑے پر نقاشی اور قلمکاری کی طرف بھی توجہ کی اور بہت جلد اعلیٰ درجے کے سادہ کار اور نئے نئے نقشوں اور نمونوں کے خالق کے طور پر انھیں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ کپڑے پر قلم کاری کا کام مسلمانوں کی ایک قوم کے ہاتھ میں تھا جسے پیشے کے لحاظ سے چھیپا اور قومیت کے لحاظ سے سادھ کہتے تھے اور اب بھی ان کے یہی نام ہیں۔ عموماً وہ کسی غیر کو اپنے ہنر کے راز نہ بتاتے تھے، چہ جائے کہ کسی

اورکواس پیشے میں دھنسنے دیں۔ لیکن میرے باپ چچانے کچھ ایسے کرشمے کئے کہ وہ لوگ ان کے گویا مرید ہو گئے۔ سادہ کاری میں بھی دونوں بھائیوں نے بہت نام اور روپیہ کمایا۔ فرنگیوں کی بعض عورتیں تو ان کی سادہ کاری کی اس قدر دیوانی تھیں کہ بات بات پر کندنی کلدار اشرفیاں یا شاہ عالمی اشرفیاں ان کے سامنے ڈال دیتیں کہ بیعانے کے طور پر رکھ لیجئے اور ہمارا کام جلد کر دیجئے۔ فرخ آبادی روپے تو ہر کوئی لئے آتا تھا۔

فرخ آباد کے چھپیروں سے ربط ضبط کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اپنی رسوم و عادات میں ہندوؤں سے بہت قریب تھے۔ مارواڑی جاٹ نسل کی ہونے کے باعث میری اماں خالہ میں بھی ہندوپن بہت تھا۔ اس بنا پر ان کی عورتوں اور میری ماں اور خالہ میں بہت خلا ملا ہو گیا تھا اور وطن کا داغ ان کے دلوں سے بہت جلد دھندلا ہونے لگا۔

کوئی دس سال آرام سے گذرے۔ کمپنی بہادر کا داب واستیلا سال بسال بڑھتا گیا اور اب تو اتنا بڑھ گیا کہ ہمارے حضور نواب کم و بیش عضو معطل ہو کر رہ گئے۔ ادھر پایگاہ تخت دہلی فرخندہ بخت پر مراٹھوں کا رسوخ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ کیا گنگا و رام گنگا کی باڑھ ہوگی جو مرہٹہ کی باڑھ جمنا کنارے کے اس شہر نیک بنیاد پر تھی۔ فرخ آباد اور اس کے نیچے تمام فرنگی، اور دہلی اور اس کے اطراف میں تمام مرہٹے۔ ایک کا عروج دوسرے کے رقیبانہ عروج کے لئے بھی راہ اور بہانے بناتا تھا۔ بائیس تیئیس برس پہلے شاہ جمجاہ حضرت عالی گوہر رعایا پرور آفاق محور نے انگریز کا ساتھ چھوڑ کر الہ آباد سے عزم دہلی کیا تھا اور مراٹھوں کی دوستی پر مہر توثیق ثبت فرمائی تھی۔ بھلا انگریز جیسی کینہ توز قوم یہ توہین کہاں بھول سکتی تھی۔ تب سے ان کی ریشہ دوانیاں مسلسل جاری رہیں۔ شجاع الدولہ بہادر کے ہاتھ انھوں نے حافظ الملک کو کٹوا کر رحمت خانی بڑیچ روہیلوں کا شیرازہ منتشر کیا۔ شکست یاب شہید حافظ الملک کے بعد اب صرف محمد خانی بنگش روہیلے رہ گئے تھے جن سے اندیشہ تھا۔ کمپو کی چھاؤنی کی ایک ٹکڑی کو فرنگیوں نے فتح گڈھ میں ڈال ہی رکھا تھا، اب نواب لاٹ لیک صاحب بہادر کی سربراہی میں ''بڑی فوج''(۱) مرتب کی جانے لگی اور فتح گڈھ میں ان کا دباؤ اس قدر بڑھا کہ نواب مظفر جنگ نے ۱۲۱۷[= ۱۸۰۲] میں اپنے علاقے کا انتظام سوالاکھ روپے سالانہ خراج کے عوض کمپنی بہادر کو دے دیا۔ اب فرنگی پورے خطۂ محکوم بنگش کے سیاہ وسفید کے مالک بن گئے۔

---

(1) Grand Army.

معرکہ

فرخ آباد کی مملکت کو اپنی پشت پر رکھ کر یہ آسان ہو گیا کہ دہلی پر چڑھائی کی جائے اور شاہ فلک جناب مطاف ماہ و آفتاب حضرت شاہ عالم ثانی کو مراٹھوں کی "قید فرنگ" سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ فرنگیوں کی فوج دریا موج کا ایک بازو ۱۹ ربیع الآخر ۱۲۱۸ (= ۸ اگست، ۱۸۰۳) کو کمپو سے ٹھاٹھیں مارتا ہو نکلا۔ فتح گڈھ چھاونی کا لشکر بیاور کے مقام پر بتاریخ ۲ جمادی الاولی ۱۲۱۸ (= ۲۰ اگست، ۱۸۰۳) کمپو کی فوج سے مل گیا۔ فتح گڈھ کی فوج کے ساتھ ہمارا سارا گھرانہ بھی تھا۔ یہ مصیبت میرے باپ اور چچا کے کچھ سادہ کار مہربانوں کی وجہ سے ہم پر پڑی تھی۔ انھوں نے میرے والد اور عم محترم کو سبز باغ دکھائے تھے کہ فوج انگریز میں دولت بہت ہے۔ کیا سپاہی کیا کمیدان سب کی عورتیں زیور بہت بنواتی ہیں اور لوٹ مار میں بھی طلائے کثیر ان کے ہاتھ لگتا ہے۔ پھر دلی پہنچ کر فتح لاٹ لیک صاحب کی ہوئی تو سب کی چاندی ہی چاندی ہے، لیکن اگر انھیں شکست بھی ہوئی تو ہمارا کچھ نہ بگڑے گا، بلکہ کاروبار اور بھی چمکے گا۔

اللہ تعالیٰ میرے بزرگوں کی گور ٹھنڈی کرے (مگر مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی قبریں کہاں بنیں) لیکن انھوں نے زندگی میں یہ پہلی غلطی کی، جو ان کی آخری غلطی ثابت ہوئی۔

لاٹ صاحب کی بڑی فوج نے ۲۰ جمادی الاولی ۱۲۱۸ (= ۱۰ ستمبر، ۱۸۰۳) کو دہلی پہنچ کر جمنا سے کچھ دور ہنڈن ندی کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ مجھ کج مج زبان میں اہلیت کہاں کہ لاٹ صاحب کی فوج فلک اوج کی رونق اور گہما گہمی کا بیان لکھ سکوں۔ یوں سمجھیے کہ ایک بہت بڑا مستطیل آنگن ہے، کئی کوس کے گھیرے کا، اور وہ رواں ہے۔ دائیں طرف پیادہ برقندازوں کی قطاروں کا میمنہ اور بائیں طرف گھوڑ سواروں کی پلٹنوں کا میسرہ بھی اس کے ساتھ رواں ہیں۔ سامنے مقدمۃ الجیش، پھر ہراول دستے، پیچھے چنڈاول دستے، جنھیں پرانے لوگ ساقہ بھی کہتے تھے۔ پیچھے والوں کے ساتھ توپیں اور بارود خانہ،

پھر سامنے والوں کے ساتھ آتشی اسلحہ خانہ اور ہلکی باتری (Battery)۔ کیا گھڑ سوار اور کیا پیادہ، سب کے ہتھیار کئی کئی ہوتے تھے، تلوار، نیزہ یا برچھا، قرابین یا رفل، کمر میں پیش قبض، فرنگی کمیدانوں کی کمر میں طمنچہ۔ گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں، بیل گاڑیوں، بیلوں، خچروں، گدھوں وغیرہ کا شمار ممکن نہ تھا۔ ہر گھوڑے پر دو ملازم تھے، ایک سئیس اور ایک چرکٹا۔ ہر ہاتھی پر ایک فیل بان یا مہاوت، اور ہر تین اونٹوں یا بیلوں پر ایک شتربان یا گاڑی بان۔ ہر فرنگی کمیدان کے پاس اپنا ڈیرہ خیمہ تھا جس کو لگانے اکھاڑنے کے لئے متعدد خیمہ بردار (جنھیں فرنگی زبان میں لاسکر (Lascar) کہتے تھے) ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ہر افسر کی رسد خوراک کے لئے بھیڑیں، بکریاں، مرغے وغیرہ اس کے ساتھ تھیں کہ خدا معلوم گوشت انڈا ہر جگہ ملے نہ ملے۔ ہر صاحب انڈا ابَل (boil) کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے چولھے اپنے ساتھ ضرور رکھتا تھا۔ ان چولھوں میں ایک طرح کا شراب جیسا ایندھن جلتا تھا۔ فرنگی کمیدانوں کے ساتھ خدام کا جم غفیر بھی تھا۔ ہر لیپٹنین (Lieutenant) کے ساتھ کم از کم دس ملازم، ہر کپتان کے ساتھ کم از کم بیس، اور اس کے اوپر بٹالین کمیدان کے ملازم تیس سے کم نہ تھے۔ جرنیل صاحبان اور لاٹ صاحب کے شاگرد پیشہ کی گنتی تو ناممکنات میں تھی۔ پھر بہت سے افسران (سب کے سب فرنگی) اپنی میموں کے ساتھ تھے۔ ان کی خادمائیں اور آیائیں مشاطائیں الگ۔ چنڈاول دستے کے ساتھ ہی ساتھ غلہ فروشان چلتے تھے۔ یہ بنجارے کہلاتے تھے، دس بارہ ہزار لڑھیوں پر اپنا مال لادے ہوئے یہ چیونٹی کی چال چلتے تھے اور ساری فوج کو بھی ان کی چال چلنی پڑتی۔ سب ملا کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی رہا ہوگا۔

فوج جب قیام کرتی تو گھڑی بھر میں بازار سج جاتا۔ چشم زدن میں خیمے کھڑے ہو جاتے، قناتیں، راوٹیاں، اسپک، بے چوبے، ان پر جھنڈیاں لہراتی ہوئی۔ افسران اعلیٰ کے خیموں پر شمسے چمکتے ہوئے، خیموں کے آگے بارگاہیں قائم ہوتی تھیں اور اگر میمیں ساتھ ہوں تو کوچۂ سلامت بھی لگتا تھا۔ شہر کی طرح یہاں بھی بازار الگ الگ تھے۔ غلہ فروش، گوشت فروش، طعام فروش، خاص کر پراٹھے کلچے اور کباب فروش تو تھے ہی، لیکن کئی پورے پورے بھٹیار خانے مع بکاول اور نان پز بھی مہیا تھے۔ انگریز دوکاندار ''سوداگر'' کہلاتے تھے۔ وہ صرف شراب اور بسکٹ وغیرہ کا دھندا کرتے تھے۔ دیسی بیوپاریوں میں مہاجن، جوہری، صراف، مرصع کار، سادہ کار، بزاز، کشمیری شال فروش، ڈھاکے والے ململ فروش، اور پھر ارباب نشاط، ڈیرے دارنیاں اور کنچنیاں، غرض کہ پوری پوری آبادانی تھی۔ سب کے الگ الگ بستر، ٹھیے اور کوچے تھے۔ ایک بار بازار میں نکل جائیں تو ہندی، بھاشا، مارواڑی، تلنگی، بنگلہ، کشمیری، پشتو،

فارسی، عربی، انگریزی، ہر طرح کی زبان سن لیجئے اور ہر طرح کے روپ دیکھ لیجئے۔ اس پر طرہ گھوڑوں اور اونٹوں کے مرصع ساز، ہاتھیوں کی زرتار جھولیں، رنگی ہوئی مسکیں، بیلوں اور ہاتھیوں کے گلوں سے لٹکتی ہوئی سریلی گھنٹیاں، لیکن دونوں کی بولیاں بالکل مختلف، کہ ہاتھیوں کی گھنٹیاں اور بیلوں کی گھنٹیاں دور ہی سے الگ الگ پہچان لو، سپاہیوں کی رنگ برنگی وردیاں، ڈیرے دارنیوں اور کنچنیوں کے محافظوں اور سازندوں کے زرق برق لباس، میموں کی ترک پھڑک، جرنیل صاحبان کا تزک و احتشام، سارے لشکر بازار کو الف لیلہ سا منظر نہ کہیے تو اور کیا کہیے۔

لیکن افسوس کہ میرے لئے یہ سب تھوڑی ہی دیر میں جہنم کا نمونہ بننے والا تھا۔ اگلی رات ابھی صبح کاذب بھی ٹھیک سے نہ ہوئی تھی، کوئی تین بجے کا عمل تھا جب لاٹ لیک صاحب نے افواج مرہٹہ پر دھاوا بولنے کا حکم دیا۔ صبح صادق ہوتے ہوتے ہم لوگ مراٹھوں کے مورچے کے قریب پہنچے۔ ابھی کچھ ٹھیک سے نظر نہ آتا تھا۔ دریا کے کنارے کنارے دور تک گھنی اور اونچی خاردار جھاڑیوں کے دشوار گذار جنگل تھے۔ دریا کبھی کبھی چمک جاتا تو لگتا بجلی تڑپی ہے۔ مرہٹہ فوج کا پہلا مورچہ ایک محفوظ پہاڑی پر تھا اور جنوب مشرق کے افق کا سورج ان کے پیچھے تھا۔ شاہی رسالے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ شروع شروع میں تو روشنی ٹمٹماتی ہوئی سی تھی اور اس کی اوٹ میں مرہٹہ فوجوں کا پڑاؤ نظر آجاتا تھا، لیکن آفتاب جوں جوں بلند ہوا، لاٹ صاحبی فوج کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ لاٹ صاحب کا توپ خانہ ابھی خاموش تھا لیکن آگے آگے پیدل برقندازوں اور ان کے فوراً بعد گھڑ سواروں نے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ جھاڑیوں کے درمیان سے گذرنا مشکل تھا، کجا کہ دوڑنا، لیکن بنگالی پیدل برقندازوں کا ایک دستہ سنگینوں اور برچھوں سے کاٹ کاٹ کر راہ نکالتا تو دوسرا گولیاں برساتا ہوا اس راہ پر آگے نکلتا۔ ان کے بعد پھر سوار فوج اپنی رفلوں سے قہر برساتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔

لشکر کے سارے اہالی موالی پیچھے کر دیے گئے تھے، صرف چنڈاول دستہ ان کا محافظ تھا۔ توپ خانہ آگے آگیا تھا اور جب وہ سوار فوج کے برابر آیا تو ساری توپوں نے بیک وقت مار شروع کر دی۔ لیکن اب افواج انگلشیہ کے رسالے بھی مرہٹہ توپ خانے کی زد میں آچکے تھے اور مراٹھوں کی گولندازی نے ایک ہی دو گھڑی میں نظم لشکر فرنگ کو تہ و بالا کر دیا۔ سوار اور پیدل فوجی کثیر تعداد میں ہلاک یا زخمی ہوئے۔ زخمداروں نے پیچھے بھاگنا شروع کیا تو ہراول اور چنڈاول تقریباً ایک ہو گئے۔ ہنڈن ندی پار کرتے کرتے بھگدڑ کا سماں ہو جاتا لیکن لاٹ صاحب اور ان کے فرنگی جرنیلوں کا اقبال کہیئے کہ اکثر برقنداز

بخوبی پار اتر گئے۔ کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا۔ مگر مرہٹہ سردار فوج نے یہ دیکھ کر کہ دریا اب سپاہ انگلشیہ کے پیچھے ہے اور انھیں جائے فرار نہیں، اپنے بھاری توپ خانے کی سوڈیڑھ سو کے قریب توپیں پہاڑی پر سے آگے بڑھائیں اور شدید گولہ باری کر کے انگریزی فوج کو ایک بار پھر کم و بیش تتر بتر کر دیا۔ پیچھے جانے کی جگہ نہ تھی، لیک لاٹ صاحب نے کمال دانش مندی سے کام لے کر اپنے رسالوں کو یوں پھیلا دیا گویا فوج نے جھرمٹ کھایا ہو۔ ادھر لاٹ صاحب نے پیک بچوں کے ذریعہ اپنی سوار فوج کو پیغام بھیجا کہ چپکے چپکے، لیکن ہر ممکن سرعت سے آگے بڑھ آؤ۔

افواج اہل فرنگ کی ظاہری مراجعت اور انتشار سے مراٹھوں نے دھوکے میں آکر تعاقب شروع کیا۔ اس وقت دونوں فوجوں میں کوس بھر کا فصل تھا۔ مرہٹے بڑھتے آئے اور توپیں ان کی مار کرتی ہوئی چلیں، حتیٰ کہ دونوں فوجوں میں فاصلہ بہت کم رہ گیا۔ اب مراٹھی گولندازوں نے اور بھی بے جھجک اور بے تحاشا گولہ باری شروع کر دی۔

دو پہر ہو رہی تھی، سوار لیک لاٹ صاحب کے چپکے چپکے آگے آرہے تھے، لیکن میمنہ اور ہراول تیزی سے منتشر ہو کر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ اس طرح افواج فرنگ کا اردو، اس کے سارے بازاری، سئیس، گاڑی بان، ارباب نشاط، بیوپاری، سب مراٹھوں کی بالکل زد میں آگئے۔ مہندی اور جنگل جلیبی کی گھنی جھاڑیوں میں سے ہم لوگوں کو کچھ صاف نظر نہ آتا تھا کہ کون سا رسالہ کہاں ہے۔ ہر طرف ڈرانی آوازیں گونجتی تھیں۔ توپ کے دھماکے، جانوروں کے شور وغل اور فوجیوں کے قدموں کی دھمک کے باعث کان پڑی نہ سنائی دیتی تھی۔ ہم غیر فوجی لوگ اس فکر میں تھے کہ کوئی محفوظ جگہ کہیں ملے تو رک کر کھانے پینے کا بندوبست کریں۔ ہمارے ہم سفروں میں فرخ آباد کی مشہور ڈیرے دارنی اکبری بائی فرخ آبادی کا ٹبر، سازندے، گائنیں، محافظ، سبھی کچھ تھا۔ فتح گڈھ سے یہاں تک آتے آتے ہماری ان کی خوب چھننے لگی تھی۔ ان کے گورکھا بندوقچی نے ایک مناسب جگہ تلاش کی اور ہمارے خیمے وہاں فوراً برپا کئے جانے لگے۔ لیکن اچانک لگا کہ سورج ٹوٹ کر ہم پر آگرا ہے۔ مرہٹہ ہم سے اتنی دور نہ تھے جتنا ہم سمجھ رہے تھے، پھر ان کی پیش قدمی سنائی بھی نہ دیتی تھی۔ ابھی ہم اپنی بیل گاڑیوں کی حفاظت سے باہر نکل کر خیموں میں جانے کا بندوبست کر ہی رہے تھے کہ درجنوں گولے آکر سیدھے ہم پر پڑے۔ رال گندھک اور شورہ سے بھرے ہوئے پھٹنے والے غبارہ گولے، گراب، زنجیری گولے اور پتھر کے گولے، سب نے مژہ برہم زدن میں ہمارے خیام وانعام کو تہس نہس کر دیا۔ میرے پیارے والدین، چچا، خالہ، شاگرد پیشہ،

جانور، سب ہلاک ہو گئے۔

ایک میں بدنصیب بچ رہا۔ اکبری بائی کا اپنا خیمہ بچ گیا کیونکہ وہ ابھی برپا نہ ہوا تھا۔ اکبری بائی، ان کی ننھی بیٹی اصغری، اور ایک دو اصیلیں، ماما چھوچھو، جو ابھی کچھ دور بیل گاڑی میں تھیں، ان کو تھوڑا تھوڑا لوکا شعلوں کا لگا، لیکن اور کوئی نقصان نہ ہوا۔ میں اس وقت دس برس کا تھا، بھلے برے کو خوب سمجھتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر چندے اور جیا تو آج کی موت سے بدتر انجام ہوگا۔ میں نے آنکھ بند کر کے ندی کی طرف دوڑنا شروع کیا کہ خود کو پانی میں گرا دوں، یا شاید کوئی گولہ مجھے بھی لگ جائے۔ لیکن اکبری بائی کی اصیل نے دوڑ کر مجھے پکڑ لیا، بلکہ جکڑ لیا اور میرے ہزار چیخنے پیٹنے اور نوچنے کھسوٹنے کے باوجود وہ مجھے اس وقت تک اپنے سینے سے لپٹائے رہی جب تک میں تھک کر اور نیم بے ہوش ہو کر سو نہ گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی، میں اکبری بائی صاحبہ کے ساتھ بیل گاڑی میں تھا۔ فوج کا شور غل تھم گیا تھا، نہ بھاگنے والے نظر آتے تھے نہ ان کا تعاقب کرنے والے۔ بڑی دیر بعد میں سمجھا کہ یہ جنگ کے بعد کا دن ہے، معرکہ انجام کو پہنچ چکا ہے۔ لیک لاٹ صاحب کے سواروں نے دفعۃً نمودار ہو کر، جیسا کہ اصل نقشۂ جنگ تھا، مرہٹوں کے منھ پھیر دیئے تھے۔ کتنے تو ہنڈن میں ڈوب کر مرے، لیکن کثیر تعداد میں مرہٹہ بہادروں نے اپنی جان بہت مہنگی بیچی۔ فرنگی فوج کے بھی کئی سو نفر کھیت رہے، دو تین انگریز کمیدان بھی لقمۂ اجل بنے۔ کوئی پان سات سو دیسی سپاہی زخم دار تھے اور کوئی اتنوں ہی کا پتہ نہ تھا۔ غیر اہل جنگ کے نقصان جانی و مالی کا حساب کسی نے نہ رکھا تھا۔

بیٹیاں

جب مجھے ہوش آیا تھا اس وقت لاٹ لیک صاحب کی فوجیں فتح کے جھنڈے لہراتی ہوئی دہلی میں داخل ہو رہی تھیں۔ جو اہالی موالی محفوظ بچے تھے وہ ان کے ساتھ تھے اور ہم بچے کھچے غیر جنگی شکستہ جسم و شکستہ دل اب دلی پہنچنے والے تھے۔ جمنا کے پار پہنچے تو دیکھا کہ شہر میں کچھ چہل پہل نہیں۔ سارے دلی والے شاید اس خوف سے گھروں میں بیٹھ رہے تھے کہ فرنگی فوجیں خدا معلوم کس طرح کا سلوک کریں۔ لیکن خدا نے خیر کی، سب امی جمی سے گذر گئی۔ حضرت ولی عہد بہادر کے بارے میں سنا گیا کہ لاٹ لیک صاحب کو حضور ظل سبحانی کے دربار میں لوالے جانے کے لئے تشریف لانے والے ہیں۔ ان کے برآمد ہونے میں بہت دیر لگی۔ لاٹ صاحب ان کے انتظار میں رہے اور ان کی فوجوں کی تعیناتی فصیل شہر کے بہت باہر کشمیری دروازے کے بھی آگے پہاڑیوں اور جنگلوں میں کر دی گئی کہ کمر کھولیں، کھائیں پکائیں اور آرام کریں۔

اکبری بائی نے چاوڑی بازار میں اپنی ایک رشتے کی بہن کے یہاں قیام کیا۔ پہلے تو ان کا ارادہ تھا کہ دارو دستہ کی تباہی کا رنج اور سفر کی تکان ذرا ہلکے پڑیں تو فرخ آباد لوٹ جائیں گی، لیکن ان کی بہن نے کہا:

''دوگانہ جان، اب ہمیں چھوڑ کے کہاں جاؤ گی۔ مولا سارا بندوبست یہیں کر دیں گے۔ اور اب موا فرخ آباد میں اپنا بیٹھا بھی کون ہے۔''

ان کے بار بار کہنے پر اکبری بیگم کا دل بھی پسیجا اور انھوں نے دلی ہی میں رہنے کی ٹھان لی۔ چاوڑی ہی میں کوچہ پنڈت کے نکڑ پر اچھا سا کوٹھا بھی مل گیا اور تماشبین و شائقین بھی متوجہ ہونے لگے۔ اکبری بائی کے احسان میں کبھی نہ بھول سکوں گا، انھوں نے مجھے بچوں کی طرح پالا۔ اجمیری دروازے پر

مدرسۂ غازی الدین خاں میں اچھی عربی فارسی پڑھوانے کے علاوہ انھوں نے مجھے ساز اور سنگیت کی بھی کچھ تعلیم گھر پر دلوائی۔ ہندی کے لئے مجھے کسی مدرسے میں جانے کی ضرورت تھی نہیں۔ میں بہت جلد میاں نور العین واقف، میاں ناصر علی، رائے آنند رام مخلص، اور حضرت بیدل کے ساتھ ساتھ جگت استاد شاہ حاتم، میرزا محمد رفیع صاحب سودا، میر محمد تقی صاحب المتخلص بہ میر، جناب خواجہ محمد میر صاحب درد اور ان کے بھائی میر اثر صاحب، اور بہت سے صاحبان کمال کے نام اور کلام سے شناسا، بلکہ بخوبی متعارف ہو گیا۔

یہ سب تو الگ رہا، اکبری بائی صاحبہ کی مہربانی اور محبت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ جب میں پندرہ برس کا اور اصغری تیرہ برس کی ہوئی تو انھوں نے ہم کو نکاح کے رشتے میں باندھ دیا۔ وہ چاہتی تو یہی تھیں کہ ہم انھیں کے پاس رہیں، لیکن میں نے الگ رہنا اور اپنے والد مرحوم کی طرح سادہ کار بننا پسند کیا تو انھوں نے طیب نفسی سے منظور کیا۔ منظور ہی نہیں کیا بلکہ کوچہ رائے مان میں ہمیں ایک مکان بھی مول لے دیا جو ہماری ضرورت کے لئے کافی تھا۔

میرا کام اچھا چل نکلا، دن فراغت سے گذرنے لگے۔ اصغری کبھی کبھی اپنی ماں سے ملنے چلی جاتی، کبھی میں بھی ہو آتا۔ شادی کے دوسرے برس ہمارے یہاں بیٹی تولد ہوئی، نانی کی طرح سرخ وسفید، نازک نازک ہاتھ پاؤں، پیٹ کے ہی بال اتنے گھنے اور گھونگر والے کہ لگتا تھا اللہ کے یہاں سے مشاطہ نے بنا کر بھیجے ہیں۔ ہم نے اس کا نام انوری خانم عرف بڑی بیگم رکھا۔ اس کے بعد تابڑ توڑ دو بیٹیاں سال بسال اور ہوئیں۔ دونوں بے حد خوش شکل لیکن گندمی رنگ بلکہ سانولی، گویا باپ دادا پر گئیں۔ بڑی کا ناک نقشہ ہندوستانیوں جیسا تھا تو عمدہ خانم عرف منجھلی بیگم اور وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم رنگ کے سوا ہر بات میں ہو بہو کشمیرن لگتی تھیں، حتیٰ کہ ان کا انداز خرام بھی اکبری بیگم کے بقول کشمیریوں جیسا تھا۔ مثل مشہور ہی ہے ماں کا پیٹ کمہار کا آوا کوئی گورا کوئی کالا۔

بڑی بیگم کو ایام صبا ہی سے اللہ رسول سے بے حد لگاؤ تھا۔ سات برس کے سن سے اس کی نماز قضا نہ ہوئی، نو سال کی ہوئی تو پابندی سے روزے رکھنے لگی۔ کلام مجید کی کئی سورتیں، بہت سی حدیث پاک، قصص الانبیا کے کتنے ہی اجزا، سب اسے ازبر تھا۔ پردے کی سخت پابند، کھیل تماشوں سے اسے کچھ لگاؤ نہ تھا، یہاں تک کہ بسنت کی بہار بھی نہ دیکھتی۔ محرم کے تعزیے دیکھنے کے لئے ایک عالم کی عورات جوان و

ضعیف کوچۂ چیلاں سے لے کر چاوڑی اور خانم کے بازار میں کوٹھوں، ڈیوڑھیوں، بالا خانوں پر جمع ہوتیں لیکن نہ جاتی تو یہ نیک بخت۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز کے وعظ سننے فتح پوری کی جامع مسجد کبھی کبھی ضرور چلی جاتی تھی۔ سیرت ایسی نیک اور صورت ویسی پاکیزہ، دس ہی گیارہ کی ہوئی تھی کہ اس کے لئے پیغامات آنے لگے۔ میں نے بھی اچھا گھر دیکھ کر بارہ برس کی عمر میں اس کے ہاتھ پیلے کردیئے۔ کھاتے پیتے لوگ تھے، ذات کے شیخ اور اطوار سارے مرزائی بھی اور اہل طریقت جیسے بھی۔ دین اور دنیا دونوں کا وفور تھا۔ بڑی بیگم کی سسرال پھاٹک حبش خاں میں حسام الدین حیدر کی حویلی [اس حویلی موسوم بہ حویلی حسام الدین حیدر میں اب پرانی دلی کا ایک پورا محلہ آباد ہے] کے پاس پنجابی پھاٹک کے بالکل متصل ہے۔ اس کے میاں مولوی شیخ محمد نظیر صاحب سلسلہ اور صاحب حیثیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے خوش وخرم وہاں رکھا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔

منجھلی بیگم بھی طبیعت کی متین تھی، لیکن اسے ننہال بہت پسند تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہیں کی ہو کر رہ جاتی۔ اکبری بائی صاحبہ کی صحبت میں رہ کر اسے نستعلیق گفتگو، بذلہ سنجی، بات بات پر شعر خوانی، بیگماتی رکھ رکھاؤ خوب آ گئے تھے۔ موزوں طبع تھی، خود شعر کہتی تھی اور زمانے کے نئے سنگیت کی طرزوں، خیال اور دادرا سے بھی خوب واقف تھی۔ پیشے کے طور پر نہیں، لیکن شوق پورا کرنے کے لئے اس نے فن کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ نواب سید یوسف علی خان بہادر، ابن نواب سید محمد سعید خاں بہادر اس زمانے میں (دولت دار السرور رام پور کی ولی عہدی کے قبل) دہلی میں رونق افروز تھے۔ علوم عربیہ وحکمیہ میں وہ صدر الصدور، ثانی جلال الدین دوانی وعلامہ تفتازانی مولانا صدرالدین خاں صاحب آزردہ، اور ارسطوے دوراں، بوعلی زماں، رشک رازی وفخر طوسی حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ فرصت کے اوقات میں خوش وقتی کی خاطر وہ اکبری بائی صاحبہ کے یہاں بھی قدم رنجہ فرماتے تھے۔ یہاں انھوں نے منجھلی بیگم کو پسند کرلیا۔ اکبری بائی صاحبہ نے مقدم سایۂ دولت واقبال اس تعلق کو جان کر دل وجان سے اس کی موافقت کی۔ اس طرح میری اور والدۂ منجھلی کی شدید مخالفت کے باوجود منجھلی بیگم نواب مستطاب کے متوسلین میں شامل ہوگئی۔

میں منجھلی کو کیا روؤں، چھوٹی نے اور پر پرزے جھاڑے۔ بچپن ہی سے اس کے مزاج میں، سجاؤ میں، بولی میں، ایسا ڈومنی پن نکلتا تھا کہ میں اسے دیکھ دیکھ ڈرے تھا کہ بڑی ہو کر کیا غضب ڈھائے

گی۔ ماں کی تنبیہیں، بڑی بہن کی مثال اور محبت سب ایک طرف، اور نانی کی لاڈو کے لچھن ایک طرف۔ دس برس کے سن پیچھے اس کا زیادہ وقت نانی کے عشرت کدے میں گذرتا۔ وہاں اس نے تھوڑا بہت گانا بجانا ضرور حاصل کیا، ورنہ وہاں اس کی اصل تعلیم ان امور میں ہوئی جن کو سیکھ سمجھ کر عورت ذات مردوں پر راج کرتی ہے۔ سات ہی آٹھ برس کی تھی جب اسے اپنے حسن، اور اس سے بڑھ کر اس حسن کی قوت، اور اس قوت کو برتنے کے لئے اپنی بے نظیر اہلیت کا احساس ہو گیا تھا۔ نوکر چاکر، بازاری پھیری والے، بہشتی سقے، پھول والے، گاڑی بان، بیوپاری، حتیٰ کہ ماں باپ تک کو وہ انگلیوں پر نچاتی تھی۔ جس سے جو چاہا لے لیا، جس سے جو کہا منوا لیا۔ روٹھتی تھی تو اس طرح کہ دیکھنے والوں کے کلیجے ٹکڑے ہوتے تھے کہ ہائے اس پھول سی نازک جان پر کس نے ستم کیے۔ منتی تھی تو یوں کھلکھلاتی تھی گویا بلبل شاخسار شیراز میں برگ گل در منقار زمزمہ کناں ہے۔ کپڑے جو بھی پہنا دیجیے، اس پر یوں پھبتے تھے گویا خیاط ازل نے ساری قبائیں اس کے لئے قطع کی تھیں۔

انوری زیادہ تر سسرال رہتی تھی۔ مہینہ پیچھے وہ ملنے ضرور آتی اور وقت وقت پر چھوٹے موٹے تحفے بھی بھجواتی۔ منجھلی سے اس کی بول چال گویا بند تھی۔ اب رہی وزیر، تو اسے اپنی ہی باتوں سے فرصت نہ تھی۔ گیارہ برس کی ہوتے ہوتے وہ سارے کوچہ رائے مان کیا، آس پڑوس کے بھی کوچوں گلیوں اور دروازوں میں مشہور ہو گئی کہ لوگ بہانے کر کے اسے دیکھنے آتے۔ کوئی کپڑوں کے سوداگر کے روپ میں، کوئی نمش فروش کے بہروپ میں، کوئی خستہ کچوریاں بیچنے کے بہانے، کوئی گل فروش بن کر، اور کچھ نہیں تو رستہ بھولے ہوئے مسافر کے روپ میں لوگ پہنچ جاتے۔ چھوٹی کبھی باہر نہ آتی، صرف دروازے کی اوٹ سے، یا اوپری منزل کی کھڑکی سے ایک دو بات پوچھ کر رخصت کر دیتی۔ کبھی کبھی نوعمر مرزایان رند مشرب بھی کسی جوہر فروش یا مرصع کار کو اپنے ساتھ لئے چلے آتے کہ سنا ہے آپ کو معتبر کاری گر کی تلاش ہے تو لیجیے ہم انھیں حاضر لائے ہیں، کچھ پسند آئے تو بنوا لیجیے گا یا مول لے لیجیے گا، دام پہنچا دیے جائیں گے۔ نئی نئی وضع کے زیور، نئی تراش کے جوڑے، دور ملکوں کے نامانوس اقمشہ کے لباس، تازہ نمونوں اور طرزوں کی جوتیاں، ان چیزوں کی وہ دیوانی تھی۔ زیوروں کے نام اسے سب معلوم، کپڑوں کی قسموں اور قیمتوں کا اسے پورا پورا اندازہ، اور لکھنو، کلکتہ، حیدر آباد میں لوگ کیا پہن اوڑھ رہے ہیں، اس کا اسے بخوبی علم ہوتا۔ خدا معلوم کہاں کہاں سے کس کس سے پوچھ کر باتیں وہ سب جان لیتی تھی۔ لوگ کبھی کبھی کسی بہانے سے، اور کچھ تو باقاعدہ مشاطاؤں کے ہاتھ تحفہ تحفہ اشیا دور و نزدیک کی جگہوں سے منگوا کر

اکبری بائی کے یہاں اس کے لئے بھجواتے۔ میں اور اصغری ہزار منع کرتیں کہ ہم یہ سب کچھ بھی نہ لیں گے، لیکن چند دن کے وقفے کے بعد وہی بے ڈھنگی چال پھر شروع ہو جاتی۔

وزیر جب بارہ پورے کر کے تیرہویں کو لگی تو اس کے لئے باقاعدہ پیغامات آنے لگے۔ اور بعض اچھی جگہوں سے پیغام کے علاوہ یہ اشارے بھی تھے کہ چھوٹی بیگم ہماری پابند ہو جائے خواہ اپنے ہی گھر پر رہے۔ لیکن نکاح یا گھر آباد کرنے کے نام پر تو اسے گویا دوں لگ جاتی۔ منھ لال بھبوکا ہو جاتا۔ ماتھے پر شکن لا کر وہ بادشاہزادیوں کی سی تمکنت سے کہتی کہ ہمیں یہ روگ نہیں پالنے ہیں۔ اس وقت تک اس کی بعض اور خوبیاں بھی ظاہر ہو چکی تھیں، یا چمک اٹھیں تھیں۔ گلا اس کا شروع ہی سے اچھا تھا اور اگرچہ موسیقی جیسی مشکل چیز کا ریاض اس کے مزاج کے موافق نہ تھا لیکن نانی کے ہاں اٹھتے بیٹھتے اسے بعض معمولی راگ راگنیاں بھی بخوبی یاد ہو گئی تھیں۔ یمن، بسنت، بہار، باگیسری، پھر بہت کچھ دادرا، کھتریوں اور چرواہوں کی دھنیں جیسے چیتی، بنارسی ٹھمری، ان میں بھی اسے خوب دخل ہو گیا تھا۔ محمد افضل کا بارہ ماسا وہ کھترائنوں کی دھن میں ایسا پڑھتی کہ کلیجے سننے والوں کے پانی ہو جاتے۔ طبیعت کی موزونی اس پر مستزاد تھی۔ میاں شاہ نصیر کی شاگردی اس نے حسام الدین حیدر خاں بہادر کے فرزند ثانی مظفر الدولہ ناصر الملک مرزا سیف الدین حیدر خاں سیف جنگ کے توسط سے حاصل کی تھی۔ بڑی بیگم کی سسرال حویلی حسام الدین حیدر کے بہت پاس تھی، اس لئے بڑی بیگم کے وارثوں سے نواب مظفر الدولہ تھوڑی بہت شناسائی رکھتے ہی تھے، اور شاید وزیر کا بھی نام ان کے لئے اجنبی نہ رہا ہو، لیکن نواب موصوف کبھی کبھی اکبری بیگم کے یہاں بھی رونق افروز ہوتے تھے اور وہیں چھوٹی بیگم نے ان سے بالمشافہ اکرام و اعزاز سلام و تعارف کا حاصل کیا تھا۔ میاں نصیر نے اسے زہرہ تخلص عطا کیا تھا۔ ایسا کم ہی ہوتا کہ کم از کم ایک شعر پر صاد کے بغیر استاد اس کی غزل واپس لوٹائیں۔ وہ کبھی کبھی نذرانے کے ساتھ اپنی غزل بھیج دیتی، نذرانہ قبول تو ہو جاتا لیکن غزل پر کچھ اس طرح کا فقرہ بھی استاد لکھ ضرور بھیجتے تھے۔ ''آں عزیزی مصرعہا ے تر و تر اکیب تازہ دارند۔ اللھم زد فزد۔ حاجت دیگر نذرانہ نیست۔ سلمہا اللہ تعالیٰ۔ فقیر شاہ نصیر۔''

کہنے کو تو منجھلی بھی موزوں طبع تھی۔ حافظ عبد الرحمٰن صاحب احسان کی شاگردی اس نے نواب یوسف علی خان کے توسط سے حاصل کی تھی اور نواب صاحب ہی نے اس کے لئے ماہ تخلص تجویز کیا تھا، لیکن شعر گوئی اس کا اصل مذاق نہ تھا۔ وہ کشیدہ کاری اور خطاطی کا عمدہ ذوق رکھتی تھی۔ رام پور جانا آنا زیادہ ہونے کے وقت سے اس کی شعر گوئی بالکل چھوٹ چکی ہے۔ اس کا شعر مجھے یاد رہ گیا ہے، استاد کا رنگ صاف

جھلکتا ہے۔

ماہ بھی کاہیدہ ہو جاتا ہے ابرو دیکھ کر
دیکھ لو نکلا ہے بن کے آج وہ شکلِ ہلال

اس زمین میں مرزا نوشہ کی غزل بہت مشہور ہوئی تھی۔ مطلع اور ایک شعر مجھے بھی یاد ہیں۔

ہوں بہ وحشت انتظار آوارۂ دشتِ خیال
اک سفیدی مارتی ہے دور سے چشمِ غزال
اس جفا پیشہ پہ عاشق ہوں جو سمجھے ہے اسد
خونِ صوفی کو مباح اور مالِ سنی کو حلال

وزیر اگر محنت کرتی اور دل لگا کر کہتی تو شعر گوئی میں ماہ لقا بائی چندا سے کم فرد نہ ہوتی۔ لیکن شعر گوئی اس کے لئے مردوں کی برابری کرنے کا مشغلہ اور دلبری و دلستانی کا ایک ڈھنگ تھی۔ اور اس حد تک وہ فنِ شعر میں طاق تھی ہی، باقی غیر ضروری تھا۔ اس کے جے پور جانے کے قبل کی ایک غزل کا پرچہ مع اصلاحِ استاد میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے۔ طرحی غزل کا مصرع تھا ع منھ لگاتا ہے کون سائل کو۔ اس پر وزیر نے پیش مصرع لگا کر شعر پورا کیا تھا۔

بوسہ دیں گے نہ وہ تجھے زہرہ
منھ لگاتا ہے کون سائل کو

اس پر استاد نے صاد کیا تھا۔ پوری غزل مع اصلاح مرقوم الذیل کرتا ہوں۔

پھینک آئیں کنویں میں اس دل کو
کریں آسان اپنی مشکل کو
دل میں اٹھتی ہیں درد کی موجیں
کاٹتی ہیں یہ لہریں ساحل کو
خوں میں غلطیدہ اس کی راہ میں ہے
~~زخم دے کر چلا گیا صیاد~~
کاش کوئی اٹھا لے بسمل کو

(شاہ صاحب اصلاح کی توجیہ شاذ ہی بیان کرتے تھے۔ لیکن اس شعر کا مصرع اولی انھوں

نے کاٹ کر اپنا مصرع لکھا اور حاشیے میں تحریر فرمایا، "سبحان اللہ، راہ چہ کس، و چرا غلطیدہ بہ خوں؟ ایں بیت دو لخت شد۔"

~~اف رے واعظ کی لن ترانی ہا~~
سن لیں ناصح کی چپ رہیں بہتر
ہم نہ دیں گے جواب جاہل کو

(یہاں بھی پورا مصرع بدل دیا۔ توجیہ نہیں بتائی، لیکن بات بالکل سامنے کی ہے کہ اصلاح نے مصرعے کو با محاورہ اور برجستہ کر دیا اور جواب کا محل ناصح کے لئے ہے نہ کہ واعظ کے لئے۔)

~~آگیا ہے چمن میں کیا صیاد~~
پھر رہا ہے چمن میں کیا صیاد
~~لگ گئی چپ ہے کیوں عنادل کو~~
چپ ہے کیوں لگ گئی عنادل کو

(مصرع اولیٰ میں بہتر محاورہ آ گیا اور مصرع ثانی کی تعقید کم ہو گئی، برجستگی بڑھ گئی۔)

دشت و در میں ہے خوشبوے لیلیٰ
ساربان تاکتا ہے محمل کو

(اس شعر پر بھی صاد ہے۔)

بوسہ دیں گے نہ وہ تجھے زہرہ
منھ لگاتا ہے کون سائل کو

میرا کہنا شاید اچھا نہ لگے، لیکن حق یہ ہے کہ تمام اشعار میں عالی دماغی اور مضمون یابی کے جوہر نمایاں ہیں۔ یہ چاردہ سالہ ناکتخدا بچی سے زیادہ کسی مشاق اور استادوں کی محفلیں دیکھے ہوئے مرد کا کلام لگتا ہے۔

وزیر پندرہویں میں تھی کہ ہمارے اوپر آسمان پھٹ پڑا۔ اصغری اچانک بیمار پڑیں اور چار دن میں ختم ہو گئیں۔ حیلے روزی بہانے موت سنتے آئے ہیں لیکن اس زمانے میں دلی میں نہ کوئی بلا تھی نہ وبا۔ نہ باڑھ نہ بھونچال۔ نہ نادر نوردی تھی نہ مرا ٹھا گردی۔ کوئی وجہ نہ تھی، قضا و قدر کے لئے کوئی بہانہ نہ تھا

کہ میرے گھر کی روشن ترین محراب کو یوں سیاہ کر ڈالے۔

گذرتے جاڑوں کے دن تھے۔ اس نیک بی بی کو کئی روز سے زکام نزلہ کھانسی کی شکایت تھی۔ سب کو یہی خیال تھا کہ تداخل فصلین ہے، دو چار دن میں نزلہ آپ سے آپ تحلیل ہو کر بہ جائے گا۔ کوئی دوا نہ ہوئی، صرف حکیم محمود خاں صاحب کے یہاں سے جوشاندہ آ جایا کرتا تھا۔ پانچویں دن اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو سوچی کہ کئی دن سے نہائی نہیں ہوں نہ کپڑے بدلے ہیں، سارا بدن کیٹ ہو رہا ہے۔ لاؤ ٹھنڈے پانی سے نہالوں۔ وہ نہانا کیا تھا موت کو دعوت تھی۔ ایک مرتبہ ہلہلا کر اسے تپ چڑھی اور وہ بے سدھ، چادر لپیٹ، لوتھ ہو کر پلنگ پر پڑ رہی۔ میں ایک دو حویلیوں میں سادہ کاری پہنچانے گیا ہوا تھا۔ لوٹا تو دیکھا کہ بستر پر پڑی ہیں۔ میں سمجھا شکر خوابی میں ہیں لیکن ہاتھ لگایا تو بخار میں بت اور بے ہوش پایا۔ چھوٹی حسب معمول اوپری منزل پر اپنے چاؤ چونچلے میں مگن تھی۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ نیچے اماں پر کیا افتاد پڑی ہے۔ میں بھاگا بھاگا حکیم محمود خاں صاحب کی ڈیوڑھی پر گیا۔ لیکن ہائے بدنصیبی کہ وہ نہ موجود تھے۔ ان کے ایک طالب علم کو حال بتا، نسخہ بندھوا، میں الٹے پاؤں گھر لوٹا۔ یہاں اصغری کے وہی عالم تھے۔ شام ہوتے ہوتے حکیم محمود صاحب خود تو نہ آئے لیکن ان کے نسخہ نویس حکیم بھورے خاں صاحب جن کا ان دنوں بہت نام ہو رہا تھا، ہوادار پر سوار ہو کر آئے۔ مریضہ کی نبض دیکھتے ہی ان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ دھیمی آواز میں انھوں نے فرمایا:

"پھیپھڑوں پر ورم اور اندر بلغم بہت آ گیا ہے۔ بلغم بڑھ کر حنجرہ تک پہنچا تو..."

"حکیم صاحب، اخراج بلغم کے لئے کچھ کریں... آپ جو دوا بتائیں میں ابھی جیسے بھی ہو لے آؤں گا... حکیم محمود صاحب سے مشورہ ہو جاتا تو اور بھی اچھا تھا۔"

"حکیم صاحب سے مشورہ تو ہو گا ہی۔ لیکن بلغم بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ بفور میں یہ ضماد لکھے دیتا ہوں۔ ابھی لال کنویں جا کر عبدالمجید عطار سے بنوا لائیے۔ ہلکا گرم کر کے پٹی پر رکھ کر لگائیں اور ہر تین گھڑی پر پٹی بدلیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

"اور حکیم صاحب یہ تپ...؟" میں نے پوچھا۔

"تپ کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔ ابھی تو ورم اور بلغم اس قدر ہے کہ کوئی دوا حلق سے بہت نیچے اترے گی ہی نہیں۔"

میں حکیم بھورے خاں صاحب کے ساتھ ہی گھر سے نکلا، دوڑتا ہوا لال کنویں پر پہنچ کر عطار

سے نسخہ باندھنے کو کہتا ہوا میں کوچہ پنڈت کے نکڑ پر اکبری بائی صاحب کو خبر کرتا ہوا الٹے پاؤں عطار کے یہاں پھرا۔ ضماد لے کر جب تک میں گھر پہنچوں اکبری بائی صاحبہ اور ان کے پیچھے پیچھے منجھلی اور بڑی بیگم بھی آگئیں۔ میں نے سب عورتوں کے ساتھ ساری رات اصغری کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر گذاردی۔ اگر بیمارداروں کا تضرع اور لگن اور الحاح کچھ کارآمد ہوتا تو ایک کیا سو ملک الموت بھی میری بیوی کو نہ لے جاسکتے تھے۔ لیکن نیم شب گذر کر اصغری بیگم کی سانس الٹی سیدھی چلنے لگی۔ کھانسنے کی طاقت ان میں رہ نہ گئی تھی کہ اخراج بلغم کچھ ذرا بھی ممکن ہوتا۔ ان کا گلا بالکل رندھ گیا، گھر گھراہٹ اس قدر تھی گویا سینے میں آرے چل رہے ہوں۔ کبھی کبھی بھرائی ہوئی آواز میں اللہ! اللہ! کے سوا کچھ نہ کہتیں۔

صبح کاذب ہوتے ہوتے عورتیں سورۂ یٰسین پڑھنے لگیں اور فجر کی اذان کے ذرا پہلے اصغری کا منکا ڈھل گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ دنیا میں صبح ہوئی ہو تو ہوئی ہو میرے گھر پہ تو رات چھا گئی۔

بڑی بیگم اور منجھلی بیگم دونوں چہلم تک میرے گھر رہیں۔ جانے سے پہلے بڑی نے بہت جھجکتے ہوئے مجھ سے کہا:

''باواجان ایک بات کہوں؟''

''بھلا پوچھتی کیوں ہو؟ کہو، شوق سے کہو۔''

''اب آپ بالکل تنہا ہو گئے ہیں۔ عمدہ خانم کا کچھ ٹھکانا نہیں، ان کے طور ہی نرالے ہیں۔ لیکن مجھے سچ میں ڈر ہے تو ان چھوٹی بنو سے ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ابھی وہ آپ کے پاس رہتی آپ کی خدمت کرتی۔ لیکن ان کے لچھن دیکھ دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں کچھ اور اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ پہلے تو اماں کا کچھ لحاظ بھی تھا... آپ دیر نہ کریں۔ چھوٹی کے ہاتھ...''

''بیٹا میں تو دل سے چاہتا ہوں اور اللہ بخشے تمھاری اماں کا بھی یہی خیال تھا لیکن وزیر تو کسی کی سنتی نہیں۔ اب تمھاری ماں کے بعد میں اسے قابو میں رکھوں کہ خود کو سنبھالوں۔ میری تو جان عذاب میں ہے۔ نانی کے یہاں رکھ دوں تو اور بھی خرابی ہے۔''

''نہیں آپ اسے وہاں نہ بھیجیں۔ میں اس سے بات کروں گی، شاید کچھ راہ نکلے۔''

دونوں بہنوں کی گفتگو کا نتیجہ لیکن وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔ راہ تو اسے ہی ملے جسے راہ مطلوب ہو۔ میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے والی بات یہاں بھی تھی۔

''چھوٹی میں تیرے بھلے ہی کو کہتی ہوں، سخن شنیدن بیخ دولت۔ ذرا اپنے بارے میں کچھ تو سوچ تیرا کیا ہوگا۔''

''ہوگا کیا؟ کون سی بیماری ہے مجھ میں جو سوچوں کہ کیا ہوگا؟ اماں کا کفن میلا بھی نہ ہوا اور آپ اپنے تان تشنے لے کر بیٹھ گئیں۔''

''تان تشنہ میں کون سا دے رہی ہوں، میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں...''

''...کہ تمھاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم شادی کرلو۔ بھلا میں کیوں کرتی شادی؟ کون سا عیب ہے مجھ میں کہ شادی اسے سدھار دے گی؟''

''بی بی، اماں کے بعد گھر اکیلا ہے۔ باوا جان سے چاہنا کہ وہ تجھے تاکتے رہیں، گرہستی بھی چلائیں اور اپنا اور تیرا پیٹ بھی بھریں...تو یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟''

''مجھے تاکیں کیوں؟ کیا میں کوئی چھوٹی ہوں کہ مجھے کوئی ہر لے گا؟ سن رکھئے میں کسی سے دبنے ڈرنے والی نہیں ہوں۔''

''تو کیا ساری عمر کنواری رہے گی؟ اور یہ ہر طرف سے جو اشارے اور پیغام تیرے بارے میں ہیں...''

''باجی، جس گھر میں بیری ہوتی ہے اسی میں پتھر آتے ہیں۔'' اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا، گویا وہ بڑی ہو اور بڑی چھوٹی ہو۔ ''آپ کاہے کو فکر کریں۔ سب کچھ اپنے وقت پر ہوگا۔''

''سچ؟ تو میں باوا جان سے کہہ دوں کہ تو...''

وزیر خانم ہنس کر بولی: ''باوا جان سے کیا کہیئے گا۔ میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ لوگ دیکھتے جائیں۔ ہر کام اپنے وقت پر...''

''کیا مطلب، یہ وقت پر وقت پر کی رٹ پھر کیوں لگا رکھی ہے تو نے؟ کیا تیرے لئے کوئی گھر ور ڈھونڈا جائے، کہ نہیں؟ تو کہنا کیا چاہتی ہے؟'' بڑی نے زچ ہو کر کہا۔

''سنئے، میں شادی وادی نہیں کروں گی۔'' وزیر نے مربیانہ لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں کرے گی شادی؟ اور نہ کرے گی تو کیا کرے گی؟ لڑکیاں اسی لئے تو ہوتی ہیں کہ شادی بیاہ ہو، گھر بسے...''

''...بچے پیدا کریں، شوہر اور ساس کی جوتیاں کھائیں، چولھے چکی میں جل پس کر وقت کے

پہلے بوڑھی ہو جائیں۔" وزیر نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا۔

"اور نہیں تو کیا کوٹھے آباد کریں لڑکیاں؟ دین دنیا دونوں خراب کریں؟ اماں باوا کے نام پر کلنک لگائیں؟"

"باجی،" اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "کیا لڑکیوں کے لئے بس یہی دو راستے ہیں؟ کیا اللہ میاں کا یہی انصاف ہے؟"

"انصاف مہربانی تو میں جانتی نہیں۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ لیکن جب سے دنیا بنی ہے عورتیں انھیں کاموں میں لگائی گئی ہیں۔ ایک شریفانہ راہ ہے ایک رزالوں کی راہ ہے۔"

"بس بھی کرو یہ شریفوں رزالوں کی باتیں۔ مرد کچھ بھی کرتے پھریں انھیں کوئی کچھ نہ کہے اور ہم عورتیں ذرا اونچے بھی سر میں بول دیں تو خیلا چھتیسی کہلائیں۔ اللہ یہ کہاں کا انصاف ہے۔"

"بس یہی دستور ہے، یہی انصاف ہے۔ عورت ذات کو اللہ نے شرم حیا ممتا اور رحم دلی اور قربانی کا پتلا بنایا ہے۔"

"میں نہیں بنتی کسی کی پتلا پتلی۔ میری صورت اچھی ہے، میرا ذہن تیز ہے، میرے ہاتھ پاؤں صحیح ہیں۔ میں کس مرد سے کم ہوں؟ جس اللہ نے مجھ میں یہ سب باتیں جمع کیں اس کو کب گوارا ہوگا کہ میں اپنی اہلیت سے کچھ کام نہ لوں، بس چپ چاپ مردوں کی ہوس پر بھینٹ چڑھا دی جاؤں؟"

"اے لو بی بی تجھے بھینٹ کون چڑھاوے ہے؟ تیرا تو میاں تجھے گھوڑے پر بٹھا کر لے جاوے گا۔ لاڈ پیار سے رکھے گا۔"

"ہاں اور جب جی چاہے گا دو جوتی مار کر الگ کر دے گا۔ یا مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دے گا اور خود چار شانہ ہو کر جہاں چاہے گا چہار چشمیاں بلکہ اس سے بھی بدتر کرتا پھرے گا۔"

"تو تو ہوا سے لڑ رہی ہے تجھ سے کوئی کیا بات کرے۔"

"دیکھو باجی جان۔ شادی کر کے میں خواہی نخواہی خود کو زندگانی بھر کے لئے کیوں پھنساؤں۔ تعلق وہی اچھا جس کو توڑ سکوں۔"

"ہائے اللہ یہ تو کیا بک رہی ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے!"

"کفر ہی، لیکن اللہ میاں سے میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ عورت پیدا ہو کر میں نے کون سا کفر کیا تھا کہ اس کی سزا میں جیتے جی دوزخ میں ڈال دی جاؤں... آخر تو ہی نے تو مجھے عورت بنایا، میں آپ

آپ تو نہیں بنی۔"

"عورت کے لئے مرد ضروری ہے۔ مرد کے لئے عورت ناموس ہے اور عورت کے لئے مرد وارث۔"

"چلئے، وارث ہی سہی۔ لیکن نکاح تو ضروری نہیں۔"

"تو کیا حرام کاری کرے گی؟ لڑکی خدا سے ڈر۔"

"بس دو بول پڑھ دینے سے جو حرام تھا وہ حلال ہو گیا؟ اور آپ کی بیٹی ان قصائیوں کی چھری سے حلال ہو گئی تو وہ کچھ نہ ہوا؟ باجی جان سن رکھو۔ میں شادی نہ کروں گی، لیکن کرتی بھی تو ان موئے چپڑ قناتی خوبچے والوں، ٹکڑ گدے قلاعوذی مولویوں، بھک منگے وظیفہ خوار نمائشی شریف زادوں سے تو ہرگز نہ کرتی۔"

"اور نہیں تو کیا تیرے لئے کوئی نواب کوئی شاہزادہ آئے گا؟ بیٹی اتنا غرور نہیں کرتے، اللہ کو غرور پسند نہیں۔"

"شاہزادہ تقدیر میں لکھا ہوگا تو آئے گا ہی۔ نہیں تو نہ سہی۔ مجھے جو مرد چاہے گا اسے چکھوں گی، پسند آئے گا تو رکھوں گی۔ نہیں تو نکال باہر کروں گی۔"

"اے اللہ اس لونڈیا کو نیک ہدایت دے۔ اس کی عقل ٹھکانے کر دے۔" بڑی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اس کا دماغ چل گیا ہے۔"

مارسٹن بلیک

مارسٹن بلیک چھریرے لیکن کسرتی بدن کا کشیدہ قامت جوان تھا۔ عمر کوئی اٹھائیس سال، ناک نقشہ معمولی، رنگ بہت گورا، بالوں کا رنگ سرخی مائل بھورا، آنکھیں چھوٹی اور کرنجی تھیں۔ انگریزی کا حال نہیں معلوم، لیکن وہ تو اس کی مادری زبان ہی تھی۔ ہندی اچھی خاصی بول لیتا تھا، منشیانہ فارسی کی معمولی استعداد تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی تھی۔ وزیر خانم کا وہ دلدادہ تھا، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اسے اپنی بیوی بنا کر انگریزی میم کا بھی درجہ دینے کو تیار تھا۔ ذات پات تو ان لوگوں کی ہوتی نہیں تھی، یہ ضرور ہے کہ اپنے ملک کے پرانے خاندانی صاحبان کی آؤ بھگت یہ لوگ بدرجہ اتم کرتے تھے۔ متمول لوگوں کے بھی دبدبے بہت تھے، اور اگر خاندان کے ساتھ دولت بھی کسی کے پاس ہوتی تو پھر اس سے بڑھ کر ان کی نظروں میں کوئی نہ تھا۔ سفید کھال ان کے یہاں سب سے بڑی چیز تھی۔ کچھ صاحبان ایسے بھی تھے جن کے خون میں کئی پشت پہلے، یا ایک دو پشت پہلے کچھ ''دیسی'' ملاوٹ آ گئی تھی۔ ایسے لوگوں کو صاحبان انگریز اپنے سے ذرا کم ہی سمجھتے، لیکن اگر ان کی لیاقت اور کارکردگی اچھی ہوتی تو انھیں ترقیاں بھی ملتی تھیں۔ کچہری دربار کے باہر اونچے گھرانوں کے صاحبان البتہ ان سے میل جول رابط ضبط بہت کم روا رکھتے تھے۔ سفید کھال والی قوم کی عورتیں عموماً پھیکی، مغرور، اور کم عقل ہوتی تھیں۔ ان کے بناؤ سنگھار، ناز نخرے بھی ٹھنڈے اور بے لطف لگتے تھے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہر انگریز ایک نہیں بلکہ دو، چار، چھ ہندوستانی ''بیبیاں'' رکھتا تھا۔ طوائفوں اور ارباب نشاط سے عارضی تعلق یا کبھی کبھی کا آنا جانا اس پر مستزاد تھا۔

وزیر خانم جہاں تک بالا بالا پوچھ گچھ کر کے اور اپنی فراست کے ذریعہ سمجھ سکی تھی، مارسٹن بلیک

انگریزوں کے درمیان کسی نمایاں یا ثروت مند خاندان کا فرد نہ تھا، لیکن اس کے خون میں کچھ ملاوٹ بھی نہ تھی۔ ایسوں کے لئے بشرط محنت ولیاقت ترقی کی راہیں وسیع اور دوررس تھیں۔ اس زمانے میں صاحبان عالی شان کے یہاں قوم انگریز کے فرد کے لئے سب سے اعلیٰ نوکریاں حسب ذیل تھیں: ریزیڈنٹی/ پولیٹیکل ایجنٹی، پھر افواج مسلح میں افسری، پھر محاصل جن میں مالگذاریاں، کروڑ گیری، پرمٹ (Customاور Excise) وغیرہ شامل تھے۔ باقی سب ان کے بعد اور ان سے فروتر تھے۔ ریزیڈنٹی اور پولیٹیکل ایجنٹی میں زیادہ تر (یعنی عموماً دس میں نو) عہدے، بہت چنیدہ فوجی افسروں سے، اور باقی غیر فوجی محاصلات کے محکموں سے پر کئے جاتے تھے۔ اپنے اپنے ضلعوں میں افسر محاصل و دیوانی و فوجداری، یعنی کلکٹر/ ڈپٹی کمشنر کی شان سب سے اعلیٰ تھی۔ محنت کرنے اور ذمہ داری اٹھانے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہنا، اختیارات کا روزانہ استعمال، مشکل معاملات سے بروقت نپٹنا اور کمپنی کی شان اور دبدبہ قائم رکھنا، یہ سب کام کٹھن بھی تھے اور اکثر تنہا ہی انجام دیئے جاتے تھے۔ یعنی اکادکا کے سوا کوئی اور انگریز افسر حاکم ضلع (اس زمانے کی زبان میں District Officer) کا ہاتھ بٹانے والا نہ ہوتا تھا۔ لیکن سیاسی اہمیت، بڑے علاقے میں نام ونمود، اور مرتبے کے اعتبار سے ریاست یا ملک کے بادشاہ کے تقریباً برابر ہونے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ''دیسی'' (Native) راجاؤں مہاراجوں کے مزاج ومعاملات میں دخیل ہونے کی وجہ سے کمپنی کے دربار میں ریزیڈنٹ/ پولیٹیکل ایجنٹ کا پلہ باقی تمام نوکران کمپنی پر گراں رہتا تھا۔

وزیر خانم کی نظر میں مارسٹن بلیک کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اٹھائیس سال کی ہی عمر میں کپتان اور اس پر طرہ یہ کہ اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ بن گیا تھا۔ وہ ان دنوں کے خواب دیکھ سکتی تھی جب جرنیل اختر لونی (General David Ochterlony) کی طرح مارسٹن بلیک بھی دہلی میں جرنیل کے عہدے پر اور حویلی کے دربار میں ریزیڈنٹ مقرر ہوگا۔ اور مارسٹن بلیک کی دوسری خوبی (یہ خوبی انگریز کمیدانوں وغیرہ میں شاذ تھی) یہ تھی کہ وزیر خانم سے تعلق پیدا کرنے کے بعد اس نے کسی بھی ہندوستانی یا فرنگی عورت کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی چشم تصور میں جرنیل اختر لونی کی جگہ پر مارسٹن بلیک کو متمکن تو دیکھ سکتی تھی، لیکن صاحب ریزیڈنٹ بہادر کے ہاتھی کے پیچھے ہاتھیوں کا جلوس نہ تھا جن پر اختر لونی صاحب کی گیارہ (اور بقول بعض تیرہ) بی بی لوگ سوار ہوکر ان کے ساتھ شام کی ہواخوری کو نکلتی تھیں۔

جے پور پہنچ کر وزیر خانم کی دنیا بدل گئی۔ اب تک وہ متوسط درجے کے گھر، پردے کی بندش، اور اپنا زیادہ تر کام خود کرنے کی عادی تھی۔ گھر کے اندر ایک دائی یا مغلانی، اور باہر کے کاموں کے لئے ایک نفر، جو عموماً شاہی فوج کو چھوڑ کر شہر میں آ رہا ہوتا تھا، بس شاگرد پیشہ کی یہی بساط تھی۔ دہلی میں متوسط درجے کے شرفا کے ایک آدھ گھروں میں ان کا آنا جانا تھا، اور بڑی کے سسرال والے تو تھے ہی۔ جب منجھلی نے نواب یوسف علی خان سے تعلق پیدا کیا تو شرفا میں سے اکثر دامن کشاں ہو گئے، لیکن پھر بھی اس کے باپ ماں کی کچھ حیثیت برقرار رہی۔ اور پھر یہ بھی ہوا کہ نواب یوسف علی خان کے متوسل گھرانوں کے لوگوں میں سے کچھ گھرانوں سے بھی اس کے والدین کا ملنا ملانا شروع ہوا۔ لہٰذا ایک کمی آئی تھی تو اس کی جگہ کو بھرنے کے لئے ایک وسیلہ بھی پیدا ہو گیا۔ دہلی کے سیر تماشوں، تیوہاروں، میلوں، بازاروں کی سیر کرنے اور گھر بیٹھے، یا بھرے بازار میں اپنی پسند کی چیزیں دیکھنے، آنکنے، اور مالی بساط کی حد تک خریدنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اور وزیر خانم پر تو یوں ہی تحفے تحائف نثار کرنے والوں، اسے بازار یا میلے کی سیر کرنے لے جانے، اس کی ثنا میں قطعے اور رباعیاں موزوں کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ لہٰذا گھر میں رہ کر بھی وزیر خانم خود کو محبوس یا دہلی کے جہان سے باہر نہ سمجھتی تھی۔

جے پور کی دنیا کئی معنی میں نرالی تھی۔ نوکروں کی ریل پیل، گرہستی کے ہزاروں کام جنھیں اب تک اس کے باپ ماں انجام دیتے رہے تھے، اور پھر یہ کہ گرہستی بھی مختلف طرح کی، ملنے والوں کی کثرت، اجلے خرچ، یہ سب باتیں تو تھیں ہی، لیکن ایک بہت بڑی بات، یا شاید سب سے بڑی بات، جس کے لئے وہ پہلے سے بالکل تیار نہ تھی، یہ تھی کہ اب وہ نہ دہلی کے ہندو مسلمان شرفا کی دنیا میں تھی اور نہ انگریز صاحبان عالیشان کی دنیا میں تھی۔ ملنا ملانا تو پہلے سے زیادہ تھا، لیکن ملنے والوں، حتیٰ کہ تیوہار کے دن ملنے آنے والوں میں ہندو مسلمان شریف گھرانوں کا کوئی فرد نہ تھا، نہ عورت نہ مرد۔ دلی میں تو جھوٹوں ہی سہی، لیکن وزیر خانم کے حلقۂ شناسائی میں کچھ اعلیٰ خاندان کی عورتیں، کچھ متوسط لیکن شریف گھرانوں کی لڑکیاں، میاں نصیر کی برکت اور ہمت افزائی کی دولت سے کچھ مرد عورت شعرا، یہ سب علیٰ حسب مراتب شامل تھے۔ اسے دھندلی سی توقع تھی کہ آمیر کے راج محل میں نہ سہی، لیکن درباریوں کی حویلیوں میں اس کی آمد و رفت ممکن ہو سکے گی۔ جے پور پہنچ کر چند ہی ہفتوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ نوکر چاکر کے سوا کوئی ہندوستانی اس کے حیطۂ ملاقات میں نہ آ سکتا تھا۔ انگریز عورت مرد سے ملنے جلنے کا تو سوال ہی نہ

اٹھتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی انگریز سرکاری کام سے، یا اپنے یہاں کی تنہائی سے اکتا کر اس کے صاحب سے ملنے آجاتا تو اس کے استقبال اور ضیافت کا اہتمام وہ ضرور کر دیتی، لیکن باہر دیوان خانے میں نہ وہ بلائی جاتی (جیسا کہ اس نے سنا تھا انگریزوں کا دستور تھا)، اور نہ ہی ملاقات کو آنے والا انگریز کچھ اشارہ دیتا، یا وضاحت سے کہتا کہ آپ کی بی بی ہمارے یہاں تشریف لائیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔

ضیافت کے انتظام میں شراب اکثر شامل ہوتی، اور یہ بھی اس کے لئے بالکل نامانوس اور کراہت انگیز شے تھی۔ بہت سے انگریز صاحبان شراب کم کر کے نیبو کا عرق اور پانی (یا کوئی جھاگ اور بلبلوں والی چیز ''سوڈا واٹر'' نام کی ہوتی تھی) اس میں برف ڈال کر پیتے تھے، خاص کر گرمیوں میں۔ اس کا نام آہستہ آہستہ ''نمبو پانی'' ہو چلا تھا اور ہر انگریز گھر میں لیموں (اور گرمیوں میں برف) کی وافر مقدار اور ''سوڈا واٹر'' کی بوتلیں موجود رہتی تھیں۔ ایک مدت تک تو اس نے ''سوڈا واٹر'' ہاتھ سے بھی نہ چھوا، اس شک میں کہ حرام نہ ہو۔ بڑی مشکل سے اس نے مارسٹن بلیک کی قسموں پر یقین کیا کہ یہ صرف پانی ہے جس میں ہوا بھر دی گئی ہے۔ اسی طرح، اسے شبہ تھا کہ اس کی آمد کے قبل گھر میں لحم خوک بھی آتا ہوگا، لہٰذا مارسٹن بلیک سے پوچھے بغیر اس نے پہلے ہی دن سارے برتن منجھوا اور دھلوا کر ان پر آب زمزم کا چھڑکاؤ کیا جس کی ایک کپی وہ اپنے ساتھ بطور خاص لیتی گئی تھی، اور مارسٹن بلیک سے کہہ دیا کہ اب اس گھر میں موئے ناپاک بنڈیلے کا نام بھی لیا گیا تو میں زہر کھالوں گی۔ مارسٹن بلیک نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں تقریباً بھینچتے ہوئے کہا کہ ''وزیر خانم، تم وزیر نہیں، اس گھر کی ملکہ ہو۔ تم جو کہو گی وہی ہوگا۔'' یہ کہتے کہتے اس نے وزیر خانم کا منھ کئی بار چوم لیا اور وہ بمشکل خود کو چھڑا کر یہ کہتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی کہ ''چھوڑیئے، ہر بات کا موقع اور محل ہوتا ہے۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' مارسٹن بلیک بولا۔ ''اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ 'بات' کے معنی کیا ہوتے ہیں۔''

اس کا لہجہ انگریزوں جیسا، یعنی ذرا جھجکتا ہوا سا تھا، بہت رواں نہ تھا بلکہ بھاری تھا۔ 'ت' اور 'ڈ'، اور مخلوط آوازیں وہ صاف ادا کر لیتا تھا۔ آواز اس کی مردانی اور بھاری تھی، لیکن لہجے میں جھجک کے باعث اس کو ہندی بولتے سن کر عجب لطف اور استعجاب کا احساس ہوتا تھا، جیسے کوئی بچہ بڑوں کی نقل کر رہا ہو۔ اس کی آواز میں لیکن کوئی لے نہ تھی، کوئی لوچ نہ تھا۔ اسے شاہ نصیر صاحب یاد آئے کہ ان کی آواز میں عجب ترنم تھا، عجب لحن تھا۔ اور ہر حرف کو وہ کس قدر خوبی سے ادا کرتے تھے، مولویوں کی طرح اکڑا اکڑا کر نہیں، جیسے گلا

صاف کر رہے ہوں، بلکہ اس طرح گویا انگور کی دار بست پر نرم چھینٹے پڑ رہے ہوں۔ ایک لمحے کو اس کا دل گھبرایا کہ اب مارسٹن بلیک کی آواز کے ساتھ عمر گذارنی ہے۔ لیکن اس خیال کو دل سے الگ کر کے وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی:

''چلیے، ہمیں خوب معلوم ہے بات کسے کہتے ہیں، بات چیت تو انسان کا جوہر ہے۔ تھکے ہارے آئے ہیں منھ ہاتھ دھوئیے، غسل کیجیے...''

''غسل تو بعد میں ہوگا۔ تم تو بڑی پکی مسلمان تھیں، اب الٹی بات...''

وزیر خانم کا منھ لال ہو گیا۔ اس نے دوپٹے کا کونا منھ میں ٹھونس کر آنچل سے منھ ڈھانپ لیا اور بولی:

''ہٹیے ہم آپ سے نہیں بولتے۔ کچھ شرم ہی نہیں ہے... یہ سارے نوکر چاکر منھ پھاڑے کھڑے ہیں...''

''یہ انگریز کا گھر ہے وزیر بیگم۔ نوکروں سے یہاں مرنے پر بھی چھٹکارا نہ ملے گا۔ یہ سب تمھاری رعایا ہیں، تم ان پر حاکم۔ ان سے کیا پردہ۔''

اور بات سچ بھی تھی۔ اتنے نوکر اس نے نواب یوسف علی خان کے یہاں بھی نہ دیکھے تھے۔ نواب موصوف ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے، لیکن ان کے زیادہ تر نوکر چاکر احدی، سپاہی، برقنداز، چوبدار، عصا بردار، برچھیت، وغیرہ قسم کے تھے۔ منجھلی کی خدمت کو چار پانچ خادمائیں تھیں، بس۔ لیکن یہاں تو فوج کی فوج تھی، اور بہتوں کے تو فرائض منصبی بھی عجیب تھے۔ نوکروں کی کثرت نے اسے ایک طرح کا احساس اقتدار و سرشاری دیا تو یہ بھی بتایا کہ اس کی نئی دنیا میں دہلی جیسی گپ چپ، دھیمی آواز میں گفتگوئیں، ہلکے لیکن جلترنگ جیسے بجتے ہوئے لحن میں کھڑکیوں میں منھ ڈال کر باتیں، چھوٹے گھر میں مل جل کر رہنے کے باوجود ہر ایک کے دل کی اپنی اپنی خاموش کٹیا جیسی چیزیں نہ ہوں گی۔ مارسٹن بلیک کا ہاتھ تھامتے وقت اسے موہوم سا خیال تھا کہ رتبہ اور طاقت کے ساتھ اسے ہندوستانی شرفا، یا ہندوستانی نہیں تو انگریز گھروں کی میم صاحبوں کی ہم نشینی اور ہم جلیسی بھی حاصل ہوگی۔ لیکن حقیقت کچھ اور نکلی۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک دنیا تو ہندوستانی شرفا کی تھی جو دھیرے دھیرے فرنگی طاقت کے سامنے کمزور اور بے خون ہوتی جا رہی تھی لیکن اسے حفظ نفس اور پاس وضع کا خیال پہلے ہی جیسا تھا۔ اور ایک انگریزوں کی دنیا تھی جس میں ہندوستانی کا دخل بالکل نہ تھا۔ اور ایک دنیا ''بیبیوں'' کی اور ان کے خدام ولواحقین کی تھی۔

''بیبیوں'' کی دنیا کے باسیوں میں سے صرف نوکروں کا گذر دوسری دو دنیاؤں میں ممکن تھا، اور وہ بھی شاذ۔ ورنہ یہ انگریز دنیا بالکل مہر بند اور اپنی جگہ پر تنہا اور پر اسرار تھی۔

اسے معلوم ہوا کہ بیبیاں سب بیبیاں ہیں۔ ہندو یا مسلمان، کم ذات یا اعلیٰ ذات، تعلیم یافتہ یا اہل حرفہ، ایسی کوئی قید نہیں، نہ تعداد کی کوئی شرط ہے۔ پھر یہ کہ سب کا مرتبہ آپس میں برابر ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جس بی بی کا صاحب جتنا بڑا آدمی ہوگا اتنی ہی بلند حیثیت اس بی بی کی بھی ہوگی۔ اس طرح جے پور میں سب سے بلند مرتبہ بیبیاں صاحب ریزیڈنٹ کی تھیں، ان کے بعد وزیر خانم، پھر فوج کے افسران باعتبار عہدہ، وقس علیٰ ہٰذا۔ وزیر خانم کے لئے اطمینان کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے صاحب کے حرم میں اکیلی تھی، اور آپس کی بات چیت میں مارسٹن بلیک اسے اپنی منکوحہ بیوی کہتا تھا۔ ورنہ عام طور پر نکاح یا شادی کی کوئی اسلامی یا عیسائی رسم کسی بی بی کے ساتھ ادا نہ ہوتی تھی۔ بہت سے بہت یہ تھا کہ کسی عورت کو بی بی بنانے کے پہلے یا فوراً بعد اپنے افسر بالا کو تحریری (اور اکثر زبانی) اطلاع دے دی جاتی تھی کہ میں فلانی کو اپنی بی بی بنا رہا ہوں۔ لیکن یہ پابندی صرف متوسط درجے کے صاحبان تک تھی۔ بڑے صاحبان، مثلاً رکن مجلس، گورنر، بڑی ریاستوں کے ریزیڈنٹ، بڑے فوجی افسران، یہ لوگ اپنی بیبیوں کے بارے میں کسی کو اطلاع دینے کے لئے خود کو مکلّف نہ قرار دیتے تھے، اور بعض تو انھیں بالکل خفیہ رکھتے تھے۔ اسی طرح، ہندوستان چھوڑتے وقت، یا اپنے وصیت نامے میں، بہت سے صاحبان اپنی بی بی یا بیبیوں کے نام بھی کچھ رقم یا جائداد لکھ جاتے تھے تو بعض ان کا بالکل ہی تذکرہ نہ کرتے اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔

اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ کم ذات بیبیوں کو چھوڑ کر بہتر بی بی کر لی جاتی اور پرانی بی بی، اپنے نطفے اور اس کے بطن کی اولاد کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا۔ اگر کوئی انگریز اپنی بی بی کے حق میں اعلان بھی کر دیتا، یا بیان کرتا کہ یہ میری منکوحہ، یا ''بیوی'' ہے، تو بھی انگریزی قانون اور کمپنی کے ضوابط میں ایسی شادی کے کچھ معنی نہ تھے۔ ان کے خیال میں شادی وہی درست تھی جو عیسائی رسوم کے مطابق ہو یا جسے کمپنی کی منظور شدہ انگریزی عدالت کے سامنے انجام دیا گیا ہو اور افسر عدالت کے دستخط اور گواہیاں نکاح نامے پر ثبت ہوں۔

لیکن انگریزوں کی نکاحی بیویوں کا بھی اپنی اولاد پر کوئی خاص دعویٰ یا حق نہ ہوتا تھا۔ حد سے حد یہ تھا کہ ان کے دو نام رکھے جاتے، ایک عیسائی اور ایک ہندوستانی، ہندو یا مسلمان۔ بچوں کی تربیت کا

بیشتر حصہ فرنگی اصولوں پر مرتب کیا جاتا اور اکثر تو سات آٹھ برس کا ہونے پر بچے (لڑکا ہو یا لڑکی) کو ماں سے بجبر یا اس کی مرضی سے لے کر ولایت روانہ کر دیا جاتا۔ ایسی صورت میں اگر اولاد ہندوستان واپس آتی اور ماں کا تعلق ابھی اپنے صاحب سے قائم رہتا، یا اگر صاحب بھی ملک یا دنیا چھوڑ چکا ہوتا، لیکن اولاد کو اپنی ماں کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو وہ شاید ماں کو ڈھونڈ نکالتے۔ ورنہ دونوں دنیائیں الگ تو ہو ہی چکی تھیں، بیچ میں کالا پانی حائل ہو یا نہ ہو۔

وزیر خانم کو ان باتوں کا دھندلا سا احساس تھا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسے ان معاملات کی کوئی خاص پروا بھی نہ تھی۔ اسے یہ ضرور گمان تھا کہ ہندوستانیوں کے لئے صاحب لوگوں کا رویہ کتنا ہی بے ایمانی اور بد دیانتی کا ہو، اپنے لوگوں کے ساتھ ان کا سلوک درست ہوتا ہے اور ان کے یہاں اپنی عزت اور اپنے وعدے کا پاس ضرور ہوتا ہے، لہٰذا مارسٹن بلیک کو اس سے سچی محبت ہو یا نہ ہو، لیکن وہ اس کے ساتھ دغا بازی نہ کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مارسٹن بلیک اسے نوکروں کے سامنے ''بیگم'' کہہ کر پکارتا اور سب کو یہ باور کراتا کہ ان کا نکاح یا ''سرکاری شادی'' ہو چکی ہے، تو اسے یک گونہ فخر کا احساس ہوتا۔ اسے لگتا کہ زبان سے کہہ دینے کے بعد کاغذی لکھا پڑھی یا نکاح نامے یا گواہی کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ایک دو بار اس نے اشارۃً مارسٹن بلیک سے نکاح نامے وغیرہ کے بارے میں پوچھا بھی تو مارسٹن بلیک نے جواب دیا کہ میں نے ریزیڈنٹی میں ہم دونوں کا نام صاحب اور بی بی کے طور پر درج کرا دیا ہے، اسے نکاح کے برابر ہی سمجھو۔ رہا معاملہ اولاد اور اولاد کے حقوق اور اس کی تربیت کا، تو وزیر خانم سوچتی کہ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اسے اولاد کا چنداں شوق بھی نہ تھا اور وہ خیال کرتی تھی کہ اگلی بار دلی جاؤں گی تو منجھلی سے مانع حمل تدابیر کے بارے میں معلوم کروں گی۔ ایک منجھلی ہی کو وزیر خانم کے دل کے حال کا کچھ اندازہ تھا کہ اس کا تشخص، اس کا ظاہری و باطنی بدن، مردوں کے لئے کس قدر کشش انگیز ہے اور وزیر اس کشش ہی کو اپنا سارا سرمایہ جانتی ہے اور اسی کے بل بوتے پر اپنی زندگی کا نیا نقشہ مرتب کرنا چاہتی ہے۔

دو ہی چار مہینوں میں وزیر خانم اس بات پر مطلع ہو گئی کہ وہ مارسٹن بلیک کے بھرے پرے، خوش حال اور باعزت گھرانے کی مالکہ تو ہے، لیکن اس کی اصل حیثیت مارسٹن بلیک کی گرمیٔ بستر کی ہے۔ اسے یہ توقع فضول معلوم ہونے لگی کہ مارسٹن بلیک اسے اپنی بیاہی بیوی بنا کر اسے کم از کم وہ حقوق دے سکے گا جو ہندوستانی بیگموں کے لئے انگریز صاحبان عموماً روا رکھتے تھے۔ جے پور پہنچنے کے دوسرے مہینے

تک اس نے اودھ کے کرنیل ولیم گارڈنر اور دکن کے جرنیل پامر کے مشہور زمانہ حالات سنے تو اسے بھی دھندلی سی امید بندھنے لگی تھی کہ ایک دن وہ اور مارسٹن بلیک بھی انھیں لوگوں کی طرح ہندی شرفا جیسی زندگی گذاریں گے، وہ اپنے مذہب اور طور طریقوں پر کار بند اور مارسٹن بلیک اپنے مسلک پر، لیکن زنانے میں عملداری وزیر خانم کی ہوگی، اولادیں ہندوستان میں رہیں گی اور مسلمان شرفا میں شمار ہوں گی۔ امیدوں کے ایسے محل بناتے وقت وہ یہ بھول جاتی کہ گارڈنر کرنیل صاحب کی بیگم اعلیٰ خاندان اور اعلیٰ ذات تھی۔ وہ نواب کھمبائت کی بیٹی اور خود صاحب جائداد و مال تھی۔ اور جرنیل پامر کی بیگم تو شہنشاہ شاہ عالم ثانی فردوس منزل کی منھ بولی بیٹی تھی۔ حضرت شاہ عالم اور نوابوں کی بیٹیوں سے اس کا مقابلہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک والی بات تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کرنیل اور جرنیل دونوں نے ہی ولایت ترک کر کے ہندوستان کو اپنا لیا تھا اور مارسٹن بلیک کا ایسا کوئی ارادہ فی الحال نہ تھا اور نہ آئندہ کے لئے اس نے کبھی ایسا کوئی عندیہ ظاہر کیا تھا۔

وزیر خانم کو یہ تو بہر حال معلوم تھا کہ صاحبان کے عقیدے میں ذات پات نہ سہی، لیکن مراتب اور خاندان کا لحاظ ان کے یہاں اہل ہند سے کم نہ تھا۔ اور اہل ہند کا حال یہ تھا کہ ان کا اپنا صاحب چاہے جس کو بیاہ لاتا یا گھر میں ڈال لیتا، اس عورت کو تو ملکۂ تخت و تاج تسلیم کرنے میں کچھ عار نہ رکھتے، لیکن صاحبان فرنگ کی عورتوں کے معاملے میں وہ سخت متعصب تھے۔ جرنیل اختر لونی نے ایک مرہٹی خادمہ کو مسلمان کر کے اس سے شادی کی اور اسے اپنے وصیت نامے میں ''بی بی محترم مبارک النسا بیگم، عرف بیگم اختر لونی'' کے نام سے یاد کیا اور بہت مال و املاک بھی اس کے لئے چھوڑا۔ لیکن اہل ہند نے اس کی نوابی تو کیا، اس کے ایمان کی بھی کوئی عزت نہ کی۔ مبارک النسا بیگم کی حویلی، جس میں بقول مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی کریم الدین کا مطبع بعد میں قائم ہوا، اور مسجد حوض قاضی پر آج بھی موجود ہیں، لیکن مسجد غیر آباد ہے اور ''رنڈی کی مسجد'' کہلاتی ہے۔ ایسی صورت میں وزیر خانم کو اپنے اہل وطن کے ہاتھوں بھلا کسی بہتر سلوک کی توقع کب ہو سکتی تھی۔

تو کیا وہ محض کسی انگریز، جو غیر کفو ہی نہیں غیر مذہب اور غیر ملکی نامانوس طور طریقوں والا تھا، اس کی دلبستگی کے لئے لعبت چین بن کر رہنا گوارا کر سکتی تھی؟ مانا کہ یہاں اسے ہر طرح کی آسائش تھی، نیچ ذات کے لوگ اس کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے۔ وہ کبھی باہر جاتی تو پالکی کے بجائے نالکی میں جاتی جس کا استعمال صرف اعلیٰ طبقوں ہی کے لوگ کر سکتے تھے۔ مگر یہ سب کب تک؟

وزیر کو عشق کے بارے میں کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ معلوم تھا۔ کیا اسے مارسٹن بلیک صاحب سے عشق تھا؟ خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا اور اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی، یہ سب اسے معلوم تھا، لیکن اس کا اصل مطلب، اس کا صحیح اور دل کو لگنے والا سچا مفہوم کیا تھا؟ کیا اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے صاحب کو ہر وقت دیکھتی رہے؟ وہ اس سے سرد ہو یا گرم، کینہ رکھے یا مہر و محبت، لیکن اس کے اپنے دل میں مارسٹن بلیک کے لئے بے اندازہ لگاؤ اور بے پایاں خواہش کے سوا کچھ بھی نہ ہو، کیا ایسا اس کے دل کا حال تھا؟ اسے ملا جامی کی ''یوسف و زلیخا'' کے شعر یاد آئے۔ حضرت یوسف کے عشق میں دیوانی ہو کر زلیخا نے فقیری لے لی تھی۔ مدتوں بعد کہیں حضرت یوسف نے زلیخا کو دیکھا تو اس کا حال ہی کچھ اور تھا۔ یہ زلیخا وہ زلیخا نہ تھی جس کی ہم نشینوں اور خادماؤں تک کے حسن کا ثانی نہ تھا، جس کی نخوت کے آگے عزیز مصر بھی تھرا جاتا تھا۔ اب زلیخا کا چہرہ اترا ہوا اور اس کا خرمن حسن اجڑا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کا قد خمیدہ تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ ہیروں جیسی چمک نہ تھی۔ جگمگاتے ہوئے زیوروں اور لباس فاخرہ کی جگہ اس کے بدن پر فقیرانہ چیتھڑے تھے۔ مولانا جامی نے اس موقعے پر حضرت یوسف اور زلیخا کے سوال جواب کو یوں نظم کیا تھا۔

بگفتا کو جوانی و جمالت
بگفت از دست شد دور از وصالت
بگفتا چشم تو بے نور چونست
بگفت از بس کہ بے تو غرق خونست
بگفتا خم چرا شد سرو نازت
بگفت از بار ہجر جاں گدازت
گفتا کو زر و سیمے کہ بودت
بہ فرق آں تاج و دیہیمے کہ بودت
بگفت از حسن تو ہر کس سخن راند
ز وصفت بر سر من گوہر افشاند
سر و زر را نثار پاش کردم
بہ گوہر پاشیش پاداش کردم

چھوٹی بیگم کو خوب یاد تھا کہ ان اشعار کو پڑھ کر اس کی سسکیاں چھوٹ گئی تھیں۔اس رات وہ بالکل نہ سو سکی تھی اور نیند کے انتظار میں بے چین کروٹیں بدلتے اس کے جی میں آئی تھی کہ کاش کوئی ایسا اسے بھی ملتا جس کی خاطر اس کا بھی وہ حال ہو جاتا جو زلیخا کا حضرت یوسف کی خاطر ہوا تھا۔تو کیا مارسٹن بلیک کے تئیں اس کے دل میں ایسے ہی کچھ مر مٹنے کے ارادے تھے؟ توبہ ہے شاعری تو شاعری ہی ہے چھوٹی بیگم۔لیکن اس دن اسی شاعری کو پڑھ کر تم اس قدر روئی کیوں تھیں اور تم نے دل میں کیا ارمان کیے تھے؟ شاعری تو کبھی کبھی ایمان کی طرح سچی بھی بن جاتی ہے۔ہوگا، لیکن اس انگریز مسٹنڈے کو کیا کروں جو پان کھا کر مجھے لگاوٹ سے دیکھتا ہے تو میرا جی ضرور چاہتا ہے کہ وہ مجھے گود میں بٹھا لے...

اور کچھ نہیں تو طورِ عشق و عاشقی میں مارسٹن بلیک بہت تجربہ کار، بہت منجھا ہوا، سدھا ہوا اور چھوٹی بیگم کی ہر خواہش، ہر ضرورت کو بخوبی سمجھنے والا اور بوجوہ احسن پورا کرنے والا مرد ضرور تھا۔وہ اسے اتنا پریشان کبھی بھی نہ کرتا کہ وہ گھبرا جائے یا منھ پھیر لے یا بیزار ہو۔اور نہ ہی وہ اس سے ایسا فاصلہ برتتا کہ اس کے دل میں الجھن ہونے لگتی کہ اب وہ کب میری طرف دیکھے گا، خواہش کی گاڑھی خوشبو کب اس کے بدن سے اڑتی اڑتی مجھ تک آئے گی۔مارسٹن بلیک کو کچھ ایسا گر معلوم تھا وہ از خود سمجھ لیتا کہ آدابِ بستر کے اعتبار سے چھوٹی بیگم کے ساتھ کب کس طرح کا برتاؤ کیا جائے۔وہ کچھ جبلی طور پر سمجھ لیتا تھا کہ کب میرا خیر مقدم گرم جوشی سے ہوگا۔اور جب دونوں کی طبیعتیں حاضر ہوتیں تو کم و بیش ساری ساری رات نہ وہ تھکتا اور نہ یہ گھبراتی۔

ظاہر ہے کہ ہم آغوشی کے آداب و مدارج سے چھوٹی بیگم شروع شروع میں بالکل بیگانہ تھی، لیکن کچھ تصور اور تخیل کے زور پر، کچھ ہمجولیوں میں بیٹھ سن کر اور کچھ اپنے بدن کے بدلتے ہوئے باطنی ماحول اور ظاہری موسموں کے بل بوتے اس نے بہت کچھ جان لیا تھا۔لیکن مارسٹن بلیک اسے جن دنیاؤں میں اڑاتا ہوا لے جاتا ان کی خبر اسے اپنے گرم ترین خوابوں اور تخیلات کی بلند ترین سطحوں پر بھی نہ ہوئی تھی۔ایک معمولی سی بات یہ تھی کہ اس نے سن رکھا تھا کہ مرد اپنی خواہش کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔اکثر کو تو یہ خبر بھی نہ تھی کہ عورت کے بھی تقاضے ہو سکتے ہیں۔اور اگر کسی کسی کو خبر تھی بھی تو وہ اس کی پرواخاک نہ کرتا تھا۔اس نے اپنی ہمجولیوں سے سنا تھا کہ مثلاً فلانی کو تو بچہ بس یوں ہی ٹھہر گیا، اس میں میاں جی کی کارستانیاں شامل ہوں تو ہوں، خود بیوی کا کچھ دخل نہ تھا۔مرد لوگ بس اپنی سی چاہتے ہیں، اپنی سی کرتے ہیں۔عورت کی تھکن، یا بیزاری، یا بے لطفی، یا بیکاری تک کا کچھ خیال نہیں کرتے، عورت کے من پورن یا

آسودگی کا تو شاید کوئی اندیشہ بھی ان کی خاطروں سے ہو کر نہ گذرتا تھا۔

اور کیا مارسٹن بلیک کو اس سے محبت تھی؟ عشق تھا؟ انس تھا؟ پتہ نہیں ان لفظوں کے کچھ معنی بھی ہیں کہ نہیں۔ لیکن عشق کی جو علامتیں کتابوں میں لکھی تھیں ان کا تو یہاں کوئی محل نہ تھا۔ اس باب میں میر صاحب قبلہ ایک شعر کہہ گئے تھے۔ ہائے اسے یہ شعر کتنا اچھا لگتا تھا کہ وہ اکیلا پا کر اکثر اسے گنگناتی اور کبھی کبھی تو ہمت کر کے بعض زیادہ ضد کر کے تحفے پیش کرنے والوں کے سامنے پڑھ بھی دیتی تھی۔

چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں مانئے کیوں کر بے آثار
اشک کی سرخی زردی منھ کی عشق کی کچھ تو علامت ہو

یہ ضرور تھا کہ اسے دیکھتے ہی مارسٹن بلیک کا چہرہ کھل اٹھتا تھا اور اس کی ہر بات، ہر قرینے سے لگتا تھا کہ وزیر خانم کے آس پاس ہی رہنے میں اس کے دل کی مسرت ہے۔ لیکن پھر...؟ نکاح اور شادی تو دور کی بات تھی، کوئی معمولی کاغذ بھی ان دونوں کے درمیان نہ تھا۔ ہاں اسے یہ اطمینان تھا کہ مارسٹن بلیک صاحب میرے ساتھ دغا نہ کریں گے۔ اور ابھی تو زندگی بہت ساری دونوں کے سامنے پڑی تھی، ابھی سے لکھا پڑھی کی بات کرنا اسے منحوس معلوم ہوتا تھا۔ مگر کیا انھیں مجھ سے عشق ہے؟ اور اگر ہے تو کیا میں...؟ کیونکہ چھوٹی بیگم کے دل میں یہ چور ضرور تھا کہ مانا میں ان کے آنے کی راہ دیکھتی ہوں، مانا اگر انھیں دیر ہو جائے تو میں گھبراتی ہوں، مانا کہ راتوں کو... لیکن کیا اسے عشق بھی کہتے ہیں؟ نہیں تو میں گھر بار، باپ کی دہلیز، بہن کی محبت، اپنا مذہب، ذات پات سب تج کر یہاں کیوں آئی؟ رکھ پت رکھا پت بزرگوں نے کہا ہے لیکن میں تو اپنی پت شاہجہاں آباد ہی میں مٹا کر آگئی۔ انھوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تو میرا کون ہوگا؟ اور میں انھیں چھوڑ دوں تو بالکل ہی نگھری ہو جاؤں گی۔

آئندہ کچھ بھی ہو، ابھی تو میں چین سے ہوں۔ دولت کی بہت فراوانی نہیں تو کمی بھی نہیں، اپنی ہم چشموں میں عزت نہیں تو غیروں اور کم اصلوں میں تو رعب داب ہے۔ چالیس پچاس نوکر ہیں، کیسا پھرکی بنے ہوئے میرے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ میں فرنگی کی بی بی ہی نہیں، جے پور شہر کی نمودار ہستیوں میں ہوں۔ اور سب بیبیوں میں حسن اور سلیقے کے سبب ممتاز بھی ہوں۔ میرا صاحب بھی مجھے چاہتا ہے، نوکر چاکر خوش، بیوپاری مہاجن ادب کرتے ہیں، دہلی والی بیگم کے لقب سے ملقب ہوں۔ اور کسی کو کیا چاہئے؟ میں عمدہ باجی سے تو اچھی ہوں۔ ان نواب لوگوں کا کیا بھروسا، یہ سب رنجھ پچاؤ ہیں۔ ان کی اصل لاگ اور اصل مطلب کس سے ہے یا کس سے ہو جائے گی، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور پھر اس نوابی کا

کیا ہے ابھی تو مسند پر براجے نہیں ہیں۔ اللہ جانے کل کلاں کیا ہو کیسا پڑے کیسا نہ پڑے۔ اور ان کے پاس اپنی دولت تو کچھ بھی نہیں، نواب گذارے کے لئے معقول رقم ضرور دیتے ہیں لیکن محل کے شیشہ آلات، ساز سامان پر ان کا تصرف مالکانہ نہیں۔ نوکر جوان کے اپنے ہیں وہ تو ہیں لیکن بقیہ پر ان کا حکم نہیں چلتا۔ مجھے دیکھیں، یہ ساری پلٹن کی پلٹن میری مطیع ہے۔ جسے چاہوں رکھوں جسے چاہوں نکالوں۔ ایک آیا تھی پورب دیس کی، ذرا بنی سنوری رہتی تھی، صاحب کی چمپی پر نوکر تھی، شاید کچھ اور بھی... میں نے آتے ہی کھڑے کھڑے باہر کیا۔ میں نے کہا صاحب کی چمپی میں خود کروں گی۔ کیا مجال جو صاحب نے ایک حرف بھی منہ سے نکالا ہو۔

اور بڑی...؟ بھلا ان جیسا کون ہو سکتا ہے۔ پاک صاف جنت کی حور۔ لیکن ان کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ بچوں کی خدمت، میاں کی ناز برداری، ساس سسر کے دباؤ میں جینا، یہ بھی کوئی جینا ہے؟ ابھی کم سے کم مجھے تو صاحب کے ناز نہیں اٹھانے پڑتے، وہی میرے ناز اٹھاتے ہیں۔ نہ بابا۔ ایک پاؤں پر کھڑی ہو کر سارے گھر کی خدمتیں، ساس سسر کے چونچلے، بچوں کی چیخم دھاڑ، میاں کے تن بدن پر اپنی جان نچھاور کر کے دو وقت کی روٹی کھانا، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ میں کسی مرد سے دبنے والی نہیں۔ کیسی اچھی گڑیا سی صورت تھی ان کی۔ اب منھ سوکھ کر ذری سا نکل آیا ہے۔ آخر دنیا میں عورتیں ہی سارے دکھ کیوں بٹوریں، سارے بوجھ کیوں اٹھائیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ لونڈی کو لونڈی کہا رو دیا بی بی کو لونڈی کہا ہنس دیا اسی لئے تو کہتے ہیں کہ بس دو بول پڑھوا لو اور جو خدمت چاہو لے لو۔ ذلیل بھی کرو تو وہ ہنسی میں ٹالے گی۔ ایسی بیگم صاحبی کس کام کی۔ اس سے تو میں اچھی ہوں۔ موئے شیر سے بلی بھلی۔ بلا سے بیگم نہیں ہوں لیکن ماما چھوچھو بھی نہیں ہوں۔

دھیرے دھیرے وزیر خانم نے خود کو مارسٹن بلیک کی بی بی بن کر جینا اور پھر خوش بھی رہنا سکھا لیا۔ لیکن عشق اور عاشقی کے رموز پر ذہنی کشمکش کے سوا ابھی اس کو بہت کچھ چھوڑنا اور مارسٹن بلیک کو بھی بہت کچھ بدلنا پڑا۔ یہاں یہ ماننا ہوگا کہ مارسٹن بلیک نے وزیر خانم کی باتیں ماننے اور گھر کا نظم و نسق وزیر ہی کے حسب دلخواہ بنانے میں اپنی حد تک کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ وزیر جس طرح کے گھروں کی عادی تھی ان میں ہر کمرے کے ساتھ آبدار خانہ ضرور ہوتا تھا۔ آبدار خانے میں ایک طرف گھڑونچیوں پر گھڑے اور کٹورے رکھے ہوتے، مستطیع گھرانوں میں شربت کیوڑہ، شربت انبہ، شربت انار کے شیشے بھی ہوتے اور گرمی کے موسم میں لکڑی کی ایک ناند میں برف کی سل رکھی ہوتی جس کو پگھلنے سے بچانے کے لئے اس پر لکڑی کا

برادہ اور بنگالی ٹاٹ کا ٹکڑا پڑا رہتا۔ آبدار خانے کے دوسرے سرے پر چھوٹا سا چبوترا جس پر بڑے مٹکے یا ناند میں نہانے کے لئے پانی، خوشبو کے لئے کیوڑے کی بوتل، اور سر دھونے، بدن ملنے کے لئے حنا، بیسن، وغیرہ کی پڑیاں رکھی ہوتیں۔ سردیوں میں عموماً اور اگر آبدار خانہ بڑا ہوتو دوسرے موسموں میں بھی اس کے ایک کونے کو بول گاہ بنا لیا جاتا۔ اس کی بدررو کو ہر استعمال کے بعد پانی لنڈھا کر بالکل صاف کر دیا جاتا تھا۔ جائے ضرور عام طور پر گھر کے ایک علیحدہ سے کونے میں ہوتی تھی۔

وزیر کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور جھنجھلاہٹ ہوئی کہ مارسٹن بلیک نے آبدار خانے کو گھر کا فالتو سامان رکھنے کا گودام بنا دیا تھا۔ مارسٹن بلیک نے اسے بتایا کہ پانی ہم لوگ بہت کم پیتے ہیں اور پیشاب کرنے کے لئے چینی یا تام چینی کی چپنی ہر کمرے میں پلنگ کے نیچے رکھی رہتی ہے۔ (اس نے اشارہ کر کے دکھائی کہ چپنی کیا چیز ہوتی ہے۔) عورت مرد دونوں اپنے اپنے برتن استعمال کرتے تھے، نہ طہارت کا کوئی تصور تھا اور نہ بدبو کا لحاظ۔ صبح و شام حلال خورنی آکر برتن کو اٹھا لے جاتی اور اسے خالی کر کے دھو کر واپس رکھ دیتی۔ اور نہانا؟ کبھی مہینے سوا مہینے پر ایک بار دل کھول کر نہا لیا، بس چھٹی ہوئی۔ عام طور پر منھ دھو لینا، موٹے کپڑے سے بدن پونچھ لینا اور سارے بدن پر ڈھیر سارا میدے سے بھی زیادہ چکنا سنگ جراحت کے برادے سے بھی باریک اور صابون کی مانند ہاتھوں میں چپکنے والا خوشبو کرتا ہوا خشک بٹنا یا غازہ (اسے یہ لوگ ''پوڈر'' کہتے تھے) مل لینا بہت تھا۔ (یہ موا پوڈر دن میں کئی کئی بار لگتا لیکن بدن کی بو پھر بھی نہ جاتی۔) مرد لوگ کوئی عطر نہ لگاتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ تمباکو کی مہک ہی مرد کے لئے بہترین خوشبو ہے، عورتیں البتہ خوشبو لگائیں تو روا ہے۔

بی بی

وزیر نے آبدار خانے دوبارہ قائم کیے، پیشاب کی چپنیاں حلال خورنی کو بخش دیں، اور روز صبح کو نہانے کا اہتمام کیا۔ مارسٹن بلیک پر بھی روز کا غسل لازم قرار دیا گیا۔ اس پہلی تبدیلی کے بعد وزیر نے چمپی والی آیا کو نوکری سے برخاست کیا۔ (اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔) دوسری بڑی تبدیلی اس نے کھانے کے باب میں نافذ کی۔ مسیحیوں کے مذہب میں حلال حرام کا تصور نہ تھا، یہ بات اسے معلوم تھی۔ لحم خوک پر وہ پہلے ہی پابندی لگا چکی تھی، شراب کے بارے میں اس نے اتنی مروت روا رکھی کہ باہر دیوان خانے میں ممنوع نہ ہوگی۔ لیکن سب سے بڑی بات اس نے یہ دیکھی کہ مسیحیوں کے یہاں تازہ گوشت اور باسی گوشت کی تمیز نہ تھی۔ ذبیحہ تو خیر وہ کھانے پر مجبور ہی تھے کہ شہر بھر میں غیر ذبیحہ ملتا ہی نہ تھا، لیکن باسی، بسا ہوا، حتیٰ کہ تقریباً سڑا گلا گوشت بھی وہ کھالیا کرتے تھے، بس شرط یہ تھی کہ مسالے اور خوشبوئیں ڈال کر اس کی بدبو ماردی گئی ہو۔ دودھ کے معاملے میں انھیں یہ بھی لحاظ نہ تھا۔ بکری کا دودھ ان کا مرغوب تھا، اس کی ہیک انھیں محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ وزیر نے باسی گوشت کا پکنا اور بکری کا دودھ یک قلم موقوف کردیا۔ تازہ گوشت اور انڈے ہمہ وقت مہیا رہیں، اس غرض سے اس نے مرغی، تیتر، بٹیر، بطخ، مور، کبوتر، کثیر تعداد میں پال لئے۔ مارسٹن بلیک تو خرگوش بھی پالنا چاہتا تھا لیکن خرگوش کے گوشت سے وزیر خانم کو کراہیت ہوتی تھی، اس نے سنا تھا کہ خرگوش حرام نہیں تو مکروہ ضرور ہے۔ دو گائیں اور ایک بھینس دودھ کے لئے خریدی گئیں۔ سب کی دیکھ بھال کے لئے نوکر الگ سے رکھے گئے۔ علاوہ ازیں شکار کے گوشت اور شکاری کتوں کا بھی اہتمام کیا گیا، لیکن شکار کا گوشت اگر ایک دن میں صرف نہ ہوتا تو تقسیم کردیا جاتا۔

لیکن ایک معاملے میں مارسٹن بلیک نے وزیر کی ایک نہ مانی۔ عام ہندوستانی شرفا کے گھرانوں میں عورتوں کا کھانا مردوں کے کھالینے کے بعد، سب سے الگ، اور سخت پردے میں ہوتا تھا۔

شوہر اور باپ بھائی تک کو بھی کھانے کے وقت زنان خانے میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مارسٹن بلیک کہتا تھا کہ ناشتہ نہ سہی، دن اور رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا ہوگا، اور وہ بھی میز کرسی پر، چھری کانٹے کے ساتھ کھانا ہوگا۔ چھوٹی بیگم کہتی کہ میں زہر کھا سکتی ہوں لیکن تمھارے ساتھ کھانا کھانے کی بے حیائی نہیں کر سکتی۔ بہت ضدم ضدا کے بعد طے ہوا کہ رات کا کھانا صاحب اور بی بی اکٹھے کھائیں گے، کوئی بے پردے والا مہمان آیا تو اس کے ساتھ بہت خاص حالات میں وزیر بھی کھانے کی میز پر بیٹھے گی، لیکن اس سے زیادہ کی خدمت پر وہ مکلّف نہ تھی۔ صاحب کے ساتھ میز پر (یا دسترخوان پر بھی) کھانے کو وہ تکلیف دہ خدمت ہی قرار دیتی تھی۔ مارسٹن بلیک نے اسے چھری کانٹے سے کھانا کھانے کی مشق کرانی شروع کی تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وزیر نے ہر قسم کے چھری کانٹے کی پہچان اور ان کے استعمال کا طریقہ ایک ہی بار میں سیکھ لیا۔

مارسٹن بلیک سے اس کی بات چیت صرف گھر کے معاملات، یا عام حالات پر ہوتی۔ اس کے صاحب کے نام ولایت سے خط پابندی سے آتے جاتے تھے، لیکن وزیر کو کبھی خبر نہ ہوتی تھی کہ ان کا مافیہ کیا ہے۔ مارسٹن بلیک کے بھائی بہن ہیں، باپ ماں ہیں کہ نہیں، اگر ہیں تو کہاں اور کس حال میں ہیں، مارسٹن بلیک نے ان باتوں میں وزیر کو کبھی شریک نہ کیا۔ وزیر نے سن رکھا تھا کہ بہت سے صاحبان فرنگی یہاں آکر بی بی کر لیتے ہیں لیکن ان کی منکوحہ بیویاں یا منگیتریں بھی دور ولایت میں ہوتی ہیں جن کے پاس وہ واپس جائیں ہی جائیں، کوئی ہندی بی بی مزاحم نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن جب اسے مارسٹن بلیک کی اماں باوا کا کچھ حال نہ معلوم ہو سکا تھا تو فرنگی بیوی یا منگیتر کی کیا خبر لگ سکتی تھی۔

اہل ہند کے بارے میں فرنگیوں، اور خاص کر مارسٹن بلیک، کے رویے میں کئی باتیں اسے بہت بری معلوم ہوتی تھیں اور کئی بار تو وہ اس سے جھگڑ بھی پڑی، لیکن لاحاصل۔ مارسٹن بلیک کے خیال میں ہندوستان کے لوگ عموماً غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب تھے۔ وہ یہاں ریت رسم کی کثرت پر ہنستا تھا اور کہتا تھا کہ دولت اور عزت دونوں گنوانے کا اچھا طریقہ تم لوگوں نے نکالا ہے۔ یہاں تک تو شاید کچھ ٹھیک بھی تھا لیکن مارسٹن بلیک کے ہم قوموں کے دل میں ہند اور اہل ہند کی باتوں، ان کی معیشت و معاشرت، ان کے خیالات و عقائد، ان کے مذہب، کسی چیز کی کچھ قدر نہ تھی۔ اور سب سے بدتر یہ کہ مارسٹن بلیک کے لفظوں سے نہیں، اشاروں سے بھی نہیں، لیکن ہندوستان میں اس کے رہن سہن کے انداز، اور یہاں کی دولت سے متمتع ہونے کے طور طریقوں سے دو باتیں بالکل صاف نظر آتی تھیں۔ ایک تو یہ صاحبان

فرنگیان یہاں کی دولت بٹورنے آئے تھے اور دوسری بات یہ کہ اگر دولت بٹورنے کے لئے یہاں حکمرانی بھی کرنی پڑے تو وہ اس کے لئے بھی سارے جوڑ توڑ، ساری جنگ اور ساری سازش، ہر طرح کی راہیں اختیار کرنے پر آمادہ اور مستعد تھے۔ میاں مصحفی کا شعر اسے یاد تھا۔

جوڑ توڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کے تئیں
فوج دشمن سے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ

وزیر تو یہ دیکھتی تھی کہ مارسٹن بلیک کے گھر میں چوریاں بہت ہوتی تھیں۔ شاید ہی کوئی نوکر یا شاگرد پیشہ سے متعلق عورت مرد ایسا ہو جو عادتاً، یا موقع پا کر، گھر کی چیزیں چرا نہ لے، یا گھر کے روپیوں میں خیانت نہ کرے۔ مارسٹن بلیک ان چھوٹی موٹی چوریوں سے کسی بڑے مالی نقصان میں تو نہ آتا، لیکن الجھتا اور جھنجھلاتا بہت تھا، اور سچ یہ ہے کہ حق اسی کی طرف تھا۔ لیکن وہ کبھی کبھی چڑ چڑا کر وزیر سے یہ بھی کہہ گذرتا کہ تم ہندوستانی ہوتے بڑے چور اور بے ایمان ہو۔ اس پر وزیر چراغ پا ہو جاتی اور کہتی کہ خدا جانے موئے مونڈی کاٹے انگریز صاحبان کے گھر میں یا ان کی صحبت ہی میں کوئی خرابی ہے کہ ہمارے گھریلو نوکر تو کبھی ایک دمڑی ایک چھدام کی چوری نہیں کرتے، خواہ نقد خواہ جنس۔

''تو تمھارا مطلب ہے ہم لوگوں نے انھیں چوری سکھائی ہے؟'' مارسٹن بلیک برہم ہو کر کہتا۔

''سکھائی تو نہیں ہو گی۔ لیکن اللہ جانتا ہے ہمارے نوکر چور نہیں ہوتے۔ تم نے بھی نہیں سکھائی، لیکن پھر یہ لت ان میں لگی کہاں سے، کبھی سوچ کر تو دیکھا ہوتا؟''

''سوچنا کیا ہے؟ یہ سب حرام کے جنے ہندوستانی ہوتے ہی ایسے ہوں گے۔''

''نکاح بیاہ کے تو تم لوگ قائل نہیں ہو اور میرے لوگوں کو حرام کا جنا کہتے ہو۔ آئندہ ایسی بات منھ سے نکالنا مت، نہیں تو...''

غصہ اور جذبات کے وفور سے وہ کچھ ہانپنے سی لگی تھی۔ مارسٹن بلیک کو بھی محسوس ہوا کہ بات بلا وجہ بڑھ گئی۔ وہ دوڑ کر آبدار خانے سے شربت انار لایا اور اس کی خوشامدیں کرنے لگا کہ ''لو دو چمچے پی لو، جی ٹھہر جائے گا۔ چلو بات کو ختم کرو، I am sorry۔''

اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھے، ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی۔ اسے صاحب کی یہ بات بہت اچھی لیکن بہت عجیب لگتی تھی کہ وہ ''ام سوررے'' (I am sorry) کہنے میں کچھ تکلف نہ کرتا تھا۔ ورنہ عام طور پر تو مرد کبھی معذرت طلبی کرتے ہی نہ تھے۔ صاحب کی زبان سے ''ام سوررے''

اسے بہت بھلا لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات چھیڑتی جس کا اختتام صاحب کی ''ام سوررر ے'' پر ہو۔ ادھر صاحب کو بی بی کی زبان سے انگریزی لفظوں کی ٹوٹی پھوٹی ادائیگی بھی بڑی پیاری لگتی تھی۔ وہ ''کرمس'' کو ''کسمس'' کہتی، ''شیمپین'' کو ''سمپن'' بولتی اور ''پارسلی'' کو ''پیتر سیلی'' کہتی۔ دوسری طرف، صاحب بھی ہندی الفاظ کا تلفظ کرنے میں کچھ کم توڑ موڑ نہ کرتے تھے۔ وزیر سے تو مارسٹن بلیک اچھی خاصی ہندی میں گفتگو کرتا، لیکن نوکروں سے، اور دوسرے انگریزوں سے بات کرتے وقت وہ اچھے بھلے ہندی الفاظ کی مت بگاڑ کر رکھ دیتا تھا۔ ''پیکدان'' کو ''پگڈین''، ''پیکدانی'' کو ''پگڈنی''، ''چھینٹ'' کو ''چنٹز''، ''چٹھی'' کو ''چٹ''، ''چمپی'' کو ''شیمپو''، ''سپاہی'' کو ''سیپائے''، ''کھچڑی'' کو ''کجری'' بنا دینا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

خوش طبعی اور ہنسی کھیل کے موقع ان کے یہاں کم نہ تھے، اور ہندی کو بگاڑ کر بولنا بھی ایسا ہی ایک موقع تھا۔ لیکن گھر کی چوریوں کے باب میں وزیر کے دل کی خلش نہ جاتی تھی۔ وہ کہنا یہ چاہتی تھی کہ ہم اہل ہند تم فرنگیوں کو غاصب اور خائن اور غیر تصور کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے لوگوں کو تمھارے یہاں چوری کرنے میں عار نہیں آتی۔ دوسری بات یہ کہ تم لوگ ہمارے لوگوں کا احترام نہیں کرتے۔ تم لوگ یہاں بیوپار کرنے آئے تھے پر تم لوگ تو اڑھائی دن کے سقے سے بھی بڑھے جاتے ہو۔ تم نے ہر طرف بادشاہی کے چونچلے اور حکومت کے بکھیڑے پھیلا دیے ہیں۔ ہمارے بادشاہ کے اکبر آبادی قلعے کے دیوان خاص کو باورچی خانہ بنا ڈالا، سارے قلعے کو افغانوں اور جاٹوں اور مراٹھوں نے غارت کر ہی ڈالا تھا، اب تم لوگ جو آئے تو اس کی بچی کھچی یادگاروں ہی کو بیچ کھانے پر تلے ہو۔ ٹھیک ہے مجھ سے تم بھلے سجاؤ رہتے ہو لیکن خدا کی بستی تو مجھ سے بہت بڑی ہے۔

وزیر کا سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ اسے مارسٹن بلیک اچھا بھی لگتا تھا اور اس کی قوم سے اسے اگر نفرت نہیں تو کراہیت ضرور تھی۔ طہارت اور ذاتی صفائی کے معاملوں میں تو اس نے صاحب کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ کلموہے ناپاک جانور کے بارے میں تو وہ پہلے ہی دن فیصلہ سنا چکی تھی۔ آبدار اس نے اپنا الگ مقرر کیا تھا کہ شراب کی خدمت بھی آبدار ہی انجام دیتا تھا اور وہ شراب چھونے کو تیار نہ تھی۔ لہٰذا صاحب کا آبدار الگ تھا اور چھوٹی بیگم کا آبدار الگ تھا۔ یہ سب تو تھا، لیکن ملکی معاملات میں فرنگیوں کے منصوبے یہی لگتے تھے کہ وہ ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کریں گے۔ رواج اور قانون اپنے نافذ کریں گے اور ہم لوگوں کو اسی طرح محکوم بنا کر رکھیں گے جس طرح میں اپنے صاحب کی محکوم ہوں۔ صاحب کے

بارے میں اسے یہ بھی یقین تھا کہ عام فرنگیوں کی طرح انھیں بھی ہند اور اہل ہند کی کوئی بھی بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور ایسوں سے تا حیات نباہ جس قدر مشکل تھا، اس کا اندازہ اسے اب جا کر ہوا۔ چاہت کے سانحے ایسے بھی ہوتے ہیں، اس نے پہلے تو کچھ تصور بھی نہ کیا تھا۔

لیکن یہ باتیں وہ کہتی تو کس سے کہتی اور کس طرح کہتی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ میرا اور میرے صاحب کا اولین رشتہ بستر کا ہے اور بستر میں معاملات ملکی دخیل نہیں ہوتے۔ اگر صاحب اسے آج چھوڑ دیں تو پھر وہ کس کا منھ دیکھے گی۔ اسے دوبارہ اپنے حالات بہتر بنانے، اپنے حسن کو اپنے سرمائے کے طور پر استعمال کرنے کے لئے جد و جہد کرنی پڑے گی۔ اور دلی کیا اور ہندوستان کیا، اس زمانے میں سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ چھوٹی خانم بھی اگر اپنی نبیڑنے میں پڑی تھی تو کسی کا کیا اجارہ تھا۔ دلی میں حویلی اجڑی پجڑی جیسی بھی تھی اس کے دیس کے حاکموں کا گھر اور ان کے اجداد کی یادگار تھی۔ لیکن اب فرنگیوں کے لچھن ایسے لگتے تھے گویا انھوں نے ٹھان لی ہو کہ اگر ان کی توپوں نے اسے پہلے ہی مسمار نہ کر دیا تو ایک دن حویلی پر بھی انھیں کا جھنڈا لہرائے گا۔ شاہی و شہنشاہی سب ان نصرانیوں کی ہوگی۔ اس آپا دھاپی میں وزیر بیگم جیسی ہزاروں ہی کٹ پس کر چٹنی ہو جاتیں تو کچھ عجب نہ تھا۔ اس وقت اس کے پاس ایک عافیت کا گھر تو تھا۔ لیکن یہ کیا؟ اسے تو راج دربار چلانا اور شبستان شاہی کی زینت بننا تھا نہ کہ مچھندر کسی فرنگی کی بی بی بن کر شاہی میں غلامی کرنی تھی۔ مگر میرا صاحب ہے بڑا چاہنے والا اور مجھے بھی اس کے ساتھ...

بادشاہ بیگم نام اس نے مارسٹن بلیک سے لڑ لڑ کے رکھا تھا، ورنہ وہ نصرانی نام ''سوفیہ'' کے سوا کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔ بہت کہنے سننے کے بعد اس نے ہندوستانی نام ''مسیح جان'' تجویز کیا لیکن بپتسمہ صرف ''سوفیہ'' کے نام پر ہونا تھا۔ جب چھوٹی بیگم نے زچہ خانے میں سب سے منھ پھیر کر قسم کھالی کہ ٹھیک ہے بچی کو آپ لے جائیں میں اب اس کا منھ نہ دیکھوں گی تو مارسٹن بلیک ذرا پسیجا اور مزید دانتا کل کل کے بعد طے ہوا کہ ''بادشاہ بیگم'' نام بھی ہوگا، بپتسمہ تینوں ناموں پر ہوگا لیکن ملاں جی صرف ''بادشاہ بیگم'' کے نام پر بچی کے کان میں اذان دیں گے۔ یہ سب ہوا، لیکن انھیں دنوں میں مارسٹن بلیک کے کچھ رشتہ داروں سے وزیر خانم کا تعارف ہوا۔ یہ مارسٹن بلیک کا پھوپی زاد بھائی ولیم کاٹرل ٹنڈل (William Cotterill Tyndale) اور اس کی بہن ابیگیل ٹنڈل (Abigail Tyndale) تھے۔ اب تک یہ لوگ میسور میں تھے جہاں ٹنڈل فرنگی فوجیوں کو رسد مہیا کرنے کا کام کرتا تھا۔ جس فوج کے ساتھ وہ منسلک تھے وہ اب جے پور

اور بیکانیر کے علاقوں میں تعینات ہو گئی تھی اس لئے ٹنڈل بھی جے پور آ گیا تھا۔

ولیم ابھی غیر شادہ شدہ تھا، ایبیگیل دونوں سے بڑی، بلکہ سن رسیدہ تھی، لیکن اس نے شادی نہ کی تھی۔ کئی سال ہوئے وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہندوستان آ گئی تھی اور تب سے وہ اس کے گھر کی مالکہ اور داروغہ کی حیثیت سے زندگی گذار رہی تھی۔ پستہ قد، چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھیں، بھورے کھچڑی بال، اونچی لیکن مہین آواز، خوش مزاج، لیکن پکی عیسائی، ایبیگیل کو جلد ہی سب لوگ بشمول چھوٹی بیگم ''ابے بی میم صاحب'' (Abby Mem Sahib) کہنے لگے۔ گھر تو ان لوگوں کا اپنا تھا، لیکن ایبیگیل کا خالی وقت بیش از بیش چھوٹی بیگم کے گھر میں سوفیہ کی دیکھ بھال میں گذرتا تھا۔ اس طرح سوفیہ پر نصرانی رنگ چڑھتا گیا، لیکن یہ ضرور تھا کہ ماں اور آیاؤں کے ساتھ سوفیہ کی بات صرف ہندی میں ہوتی تھی اس لئے دو ہی ڈیڑھ سال کی عمر تک وہ انگریزی اور ہندی بخوبی بولنے اور سمجھنے لگی تھی۔ یہ اور بات کہ اس کی انگریزی پر ہندوستانی ہی لہجہ غالب رہا۔ مدتوں بعد جب ریزیڈنٹ وایجنٹ گورنر جنرل بہادر سرٹامس مٹکاف کی بیٹی لیڈی ایملی بیلی (Lady Emily Bayley) کی ملاقات سوفیہ سے ہوئی تو اس ملاقات کا حال اپنی ڈائری میں ایملی نے بڑے حقارت آمیز لہجے میں لکھا کہ سوفیہ نے ہمیں ایک انگریزی گانا سنایا، لیکن اس کا لہجہ اس قدر گنوار و ہندوستانی تھا کہ میرے پلے ایک بھی لفظ نہ پڑا کہ وہ کیا گا رہی ہے۔

ٹنڈل بھائی بہن کٹر نصرانی تھے اور وہ بھی کیلوین (Calvin) کے ماننے والے پروٹسٹنٹ۔ لہٰذا وہ ''خدمت''، ''وطن پرستی''، ''محنت''، ''کفایت شعاری'' وغیرہ کے بے حد قائل ہونے کے ساتھ تنگ نظر، غیر مذاہب سے ایک گونہ نفرت رکھنے والے، غریبوں اور غریبی کو بری نظر سے دیکھنے والے (ان کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ خدا نے کسی کو غریب بنایا تو اس کی کوئی معقول وجہ ہوگی)، اور مجموعی حیثیت سے شئے لطیف سے عاری تھے۔ ولیم ٹنڈل تو کم سخن تھا لیکن ایبیگیل ٹنڈل کی زبان کترنی کی طرح چلتی تھی اور وہ یہ بات جتانے کا کوئی موقع فروگذاشت نہ کرتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ نہ صرف اوپر سے کالے ہوتے ہیں، بلکہ چونکہ کالا رنگ اور سیاہی ایک ہی شے ہیں، اور سیاہی کے معنی ہیں گمراہی اور بدعقلی، اس لئے ان کی نجات نہیں ہو سکتی۔ وزیر خانم کا کھلتا ہوا سانولا رنگ (جسے وہ ''کتھئی'' (brown) کہتی تھی)، اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں منصوبے بناتی کہ کسی طرح اپنے بھائی کو اس دیسی بی بی کے پنجے سے چھڑا کر کسی سچی نیک سفید رنگ مسیحی لڑکی سے اس کا بیاہ کرا دے۔ فی الحال یہ ممکن نہ دیکھ کر اس نے سوفیہ کی نگہداشت، پرورش اور دیکھ ریکھ اپنے ذمہ کر لی تھی کہ ایک گمراہ کی تو نجات کا سبب بن سکے۔

چھوٹی بیگم نے مارسٹن بلیک کے بھائی بہن کو کئی معنی میں مارسٹن بلیک سے مختلف پایا۔ اسے محسوس ہوا کہ سب فرنگی ایک طرح کے اور ایک سبھاؤ کے نہیں ہوتے۔ لیکن سب میں ایک طرح کی رعونت، ایک انداز تبختر، حاکمی کا احساس، مشترک ہوتا ہے۔ لیکن بہت سی باتیں بالکل الگ بھی تھیں۔ اے بی (Abby) کو صفائی ستھرائی کا خیال مارسٹن بلیک سے بھی کم تھا۔ وہ کئی کئی دن اپنے ناخن نہ ترشواتی اور وہی میلے ناخنوں والی انگلیاں وزیر خانم کے بچوں کے منھ میں پیار سے چساتی رہتی۔ وزیر کو گھن تو بہت آتی، لیکن اسے چارہ کچھ نہ تھا۔ خود مارسٹن بلیک ان باتوں کے بارے میں عدم احتیاط کرتا تھا، لہٰذا اس سے شکایت بے فائدہ ہوتی۔ لیکن ولیم ٹنڈل کو صفائی کا خیال اشد سے بھی بڑھ کر تھا۔ اے بی خاصی کنجوس اور باتونی ہونے کے باوجود تنک مزاج بھی تھی، ولیم کم سخن اور خوش لہجہ، لیکن پیسے کوڑی کے معاملے میں ذرا ممسک تھا۔ مارسٹن بلیک کو اچھے کھانوں کا بہت شوق تھا لیکن ان بھائی بہن کو اس باب میں کچھ اختصاص نہ تھا۔ سینے کاڑھنے بننے میں اے بی میم صاحب البتہ ید طولیٰ رکھتی تھی۔ چھوٹی بیگم کو یہ بھی محسوس ہوتا کہ اس کے حسن اور عمومی دل کشی کی بنا پر اے بی اسے حسد کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور مارسٹن بلیک کے بچوں پر اتنی توجہ اور محنت صرف کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اے بی کو امید تھی کہ اس طرح وہ انھیں اپنی ماں سے بر گشتہ کر سکے گی۔ چھوٹی بیگم کو یہ بات ناگوار تو بہت تھی لیکن اسے بچے پالنے اور ان کی تربیت کے ڈھنگ کچھ بہت ٹھیک سے آتے نہ تھے اور نہ اسے یہ کسالے کھینچنے پسند ہی تھے۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ بچوں کی خبر گیری اور انھیں دیر تک دودھ پلانے سے اس کے جسم کا کھنچاؤ کساؤ اور سڈول پن اور منھ کی رونق جاتی رہے گی۔ بچے اسے اچھے تو بہت لگتے تھے لیکن ان کو پالنے کی کھکھیڑ اٹھانا... اللہ میری توبہ، بڑی باجی کا سا جگرا سب کا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مارٹن اور بادشاہ بیگم دونوں ہی بچوں کی دیکھ بھال کا سارا نہیں تو بیشتر کام دائیوں اور اے بی میم صاحب ہی پر چھوڑ کر ایک طرح سے مطمئن بھی ہو گئی تھی۔

بادشاہ بیگم کی پیدائش کے وقت مارٹن عرف امیر مرزا (پیدائش ۱۸۲۷) کا سن ڈیڑھ دو سال کا تھا اور وہ بھی دو سال کی عمر تک انگریزی ہندی دونوں ہی زبانیں فرفر بولنے لگا تھا۔ دونوں بچوں کے لئے گھر کے اندر کے لئے ایک آیا اور باہر کے لئے دائی کھلائی تعینات تھی۔ سوفیہ کے لئے دائی پلائی اس پر مزید تھی۔ وزیر خانم نے بہت ڈھونڈ کر دونوں بچوں کے لئے اچھی ذات کی مسلمان دائی پلائیاں نوکر رکھی تھیں۔ مارسٹن بلیک ان انتظامات سے خوش تھا، کہ اس طرح اس کی دلبستگی اور بستر کی زینت بننے کے لئے وزیر کی خدمات زیادہ آسانی سے مہیا ہو سکتی تھیں۔ اور یوں بھی اسے بچوں سے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا،

ہاں تحفے تحائف اور مٹھائی ریوڑی کی حد تک وہ فیاض ضرور تھا۔

ان دنوں سردی خوب چمکی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۲۹ کے بڑے دن میں ابھی کچھ مدت باقی تھی، لیکن تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ ضیافتوں کے جانور تیار کئے جارہے تھے، کلکتے سے شمپن کی نئی بوتلوں اور دوسری شرابوں کا انتظام کیا جارہا تھا۔ سب بچوں، رشتہ داروں، متعلقین، ملازمین کے لئے تحفوں کا اہتمام ہورہا تھا۔ نوکر بھی اپنی طرف سے ڈالیوں کے اہتمام میں تھے۔ ڈالی کا قاعدہ یہ تھا کہ جو شخص جتنی مالیت کا سامان لاتا اسے بھی اتنی ہی، یا اس سے کچھ زیادہ مالیت کا تحفہ دیا جاتا۔ یہ بات بھی اسے یہاں آکر معلوم ہوئی کہ ڈالی کا تعلق پھولوں یا پھلوں سے نہ تھا، بلکہ ڈالی ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں یا ٹوکریوں کو کہتے تھے جن میں پھل رکھ کر لائے جاتے تھے۔ عموماً دو کشتیوں یا ٹوکریوں کو ایک ساتھ باندھتے تھے اور ایک ڈالی میں ایک ہی طرح کا پھل ڈالتے تھے۔ انگریزوں کے یہاں تحفے میں پھل بھیجنے کا اتنا رواج تھا کہ آہستہ آہستہ ''ڈالی'' کے معنی ہی ''پھلوں کا تحفہ'' اور پھر ''تیوہاروں پر حکام کے یہاں بھیجنے کا تحفہ'' ہوگئے۔ یہاں کے نوکر مٹھائی اور پھل سے زیادہ دستکاری اور صناعی کی چیزیں لاتے تھے جو کبھی کبھی بے مصرف بھی ہوتی تھیں، لیکن ان کی قیمت کا اندازہ کر کے انھیں واپسی تحفہ دیا جاتا تھا۔ دہلی اور آگرہ سے گوٹا کناری اور ریشمی کپڑے، اجمیر سے نئی جوتیاں، اودے پور سے مینا کاری کے زیور، کشمیر سے پیشواز اور جامے کے لئے پارچہ جات، ہر چیز تلاش کر کے منگوائی جارہی تھی۔ ٹنڈل بھائی بہن کی وجہ سے ایک بڑا فائدہ وزیر کو یہ تھا کہ اب وہ بھی کہہ سکتی تھی کہ انگریزوں کے یہاں ہمارا برابر کا آنا جانا ہے۔ اب وہ دل میں خود کو واماندہ اور سبک نہ محسوس کرتی تھی، جیسا کہ شروع میں تھا، کہ یہاں اس کی رسائی اچھے خاندانوں تک نہ تھی، اور انگریز تو اس کی طرف نگاہ غلط انداز کے بھی روادار نہ تھے۔

اس وقت سوفیہ ڈیڑھ سال کی تھی اور مارٹن تین سال کا ہوچکا تھا۔ دونوں بچوں کے لئے دائی کھلائیاں اور آیائیں حسب سابق موجود تھیں، مگر سوفیہ کا دودھ اے بی میم صاحب نے بجبر چھڑوا دیا تھا۔ دونوں بچے دائی کھلائیوں کی نگرانی میں باہر کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ نوکروں کی فراوانی کے باعث گھر میں پردے کی بات بمشکل ہی ہوسکتی تھی۔ مارسٹن بلیک اس دن کچھ ماندہ تھا، ریزیڈنٹی نہ گیا تھا۔ وہ اپنے لمبے چوڑے پلنگ پر پیٹ کے بل پڑا سونے کی کوشش کر رہا تھا اور وزیر اس کی پیٹھ اور کمر دھیرے دھیرے دبا رہی تھی۔

''یہ سب چھوڑو نہیں تو مجھے دروازہ بند کرنا پڑے گا۔'' مارسٹن بلیک نے ہنس کر کہا۔

"توبہ ہے، آپ کو اور کوئی اچھی بات نہیں سجھائی دیتی۔ اور یہ نوکر جو ہر وقت چوروں کی طرح سن گن لیتے رہتے ہیں، کیا کہتے ہوں گے؟"

"کہتے کیا ہوں گے؟ ان کے یہاں یہ سب نہیں ہوتا کیا؟"

"اللہ میری توبہ، میں چلی جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وزیر اٹھنے ہی والی تھی کہ مارسٹن بلیک نے اس کا بازو پکڑ کر اسے بٹھالیا اور خود اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم یہاں میرے پاس خوش ہو کہ نہیں؟" اس نے وزیر خانم کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بے دھڑک کہو، میرا کچھ خیال نہ کرنا۔"

وزیر نے بڑی بڑی شربتی آنکھیں جھکائیں، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ اور سوچ میں وہ یقیناً پڑ گئی تھی۔ صاحب یہ سوال اس وقت کیوں پوچھ رہے ہیں؟ ادھر کوئی ایسی بات بھی نہیں ہوئی تھی، نہ بچوں کے بارے میں، نہ اس نے اپنے گھر جانے اور باپ بہنوں سے ملنے کا کوئی خیال ظاہر کیا تھا۔ اس کو مارسٹن بلیک کی یہ ادا پسند بھی تھی، اور وہ اس سے گھبراتی بھی تھی، کہ ہندوستانی لوگوں کے برخلاف وہ ہر بات بہت صاف صاف اور بے کھٹکے کہہ دیتا تھا۔ ہم لوگ تو دیر تک ادھر ادھر کی بات کرتے ہیں، پھر اشاروں کنایوں میں کچھ تمہید باندھتے ہیں، پھر حرف مطلب ادا کرتے ہیں اور وہ بھی حتی الوسع مُبہم رکھتے ہیں۔ میاں بیوی، باپ بیٹے، بھائی بھائی، سب میں یہی دستور ہے۔ اور صاحب تھے کہ ہر بات پھٹ سے کہہ دیتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی وزیر نے بھی بڑی حد تک صاف صاف اور بے تکلف بات کہنے کی عادت ڈال لی تھی، لیکن پوری طرح بے محابا کہنے میں اسے بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ منھ سے بات ہی نہ نکلتی، اور ادھر صاحب کچھ اس قدر رغبی (غبی ہی کہا جائے گا ایسے لوگوں کو) کہ اشارہ بالکل نہ سمجھتے تھے، یا سمجھنے کو تیار نہ تھے۔

اس کے جی میں آئی، کہے: "اور سب تو ٹھیک ہے، لیکن نہ کوئی کاغذ ہے، نہ عہد نامہ... میرا آگم آپ نے کچھ سوچا ہے کہ نہیں؟" لیکن ظاہر ہے وہ ایسی کوئی بات برملا کہہ نہیں سکتی تھی، چاہے جان ہی پر بنی ہو۔ ایک دو لمحہ چپ رہ کر اس نے آنکھیں اٹھائیں اور ذرا سا مسکرا کر بولی:

"ہاں، خوش تو ہوں۔ بہت خوش ہوں۔ لیکن..." اس نے دوبارہ سر جھکا لیا۔

"لیکن کیا؟ بتاؤ، بتاؤ، تمھیں کس چیز کی کمی ہے۔ میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں۔ ڈرو نہیں۔ صاف صاف بولو۔"

''ن...نہیں،نہیں، کسی چیز کی کمی نہیں۔'' اس نے ''چیز'' پر کچھ زور دے کر کہا۔ ''سب کچھ تو ہے میرے پاس۔مگر آپ آج یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ طبیعت نصیب دشمناں ٹھیک نہیں ہے اس وجہ سے میرے ساتھ چہلیں کرنے کی سوجھی ہے؟''

''نہیں، اس میں چہل کی کیا بات ہے۔بس یوں ہی خیال آ گیا کہ تم میری خاطر گھر سے دور پڑی ہو...''

''آپ ہی کی خاطر تو پڑی ہوں۔بس یہی میرا جواب ہے۔آپ تو جانتے ہی ہیں۔''

''شاباش میری پیاری۔'' مارسٹن بلیک نے کہا۔ایسے موقعوں پر اس کے لہجے اور اس کے الفاظ دونوں میں انگریزیت آجاتی تھی جو وزیر خانم کو بہت بری لگتی، لیکن وہ اپنی ناگواری کو بحسن وخوبی چھپا جایا کرتی تھی۔ ''میں تم سے بہوت بہوت خوش ہوں۔مجھے تم پر گھمنڈ ہے۔''

وزیر کو یہ مربیانہ لہجہ بھی کچھ خاص نہ بھایا، لیکن اس نے ظاہر یہی کیا کہ وہ بھی بہوت بہوت خوش ہے۔ ''بھلا اس میں گھمنڈ کی کیا بات ہے صاحب،'' اس نے جواب دیا۔ ''کون ہے جو آپ کے سائے میں بسنا پسند نہ کرے گا۔''

''نہیں، تمھاری بات اور ہے۔وہ کیا شعر تھا تمھارے دلی والے شاعر خسرو کا، بڑے لطف کا شعر تھا، ارے بھئی ذرا یاد تو دلاؤ، ایک دو لفظ تو پڑھ دو۔''

''اب خدا جانے کس شعر کو آپ کہہ رہے ہیں...''

''وہی جو کچھ اس طرح سے ہے، چیزے دگر وغیرہ، اور کس شعر کو میں کہوں گا۔''

اب وزیر خانم کو شعر پڑھتے ہی بنی۔ ''ٹھیک ہے،ٹھیک ہے۔مجھے یاد آ گیا۔

آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن...''

مصرع پورا ہونے کے پہلے ہی مارسٹن بلیک بول اٹھا۔ ''اہہا! لیکن تو چیزے دیگری! واہ واہ ...کتنی اچھی بات کہی۔''

''ہوگا، وہ لوگ اور تھے...'' وزیر نے کہنا شروع کیا۔لیکن مارسٹن بلیک نے اس کی بات پھر کاٹ دی اور بولا:

''وہ سب تو ہوا۔لیکن چھوٹی بیگم یہ بات تو رہی جاتی ہے کہ تم میرے پاس خوش ہو کہ نہیں۔''

''اے لو، ساری رامائن سن گئے پھر پوچھتے ہیں سیتا کون تھی۔ کہا تو کہ میں یہاں آپ ہی کی خاطر پڑی ہوں۔ آپ کی چوکھٹ میرے دل کی خوشیوں کا دروازہ ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''اب تو چین پڑا، میرے دل کا حال سن لیا آپ نے۔''

اس بار مارسٹن بلیک نے کچھ جواب نہ دیا۔ شاید وہ چھوٹی بیگم سے کچھ اور کا طلب گار تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کی بی بی کچھ والہانہ انداز دکھائے، کچھ احسان مندی اور کچھ عشق اور جسم کی لذتوں کی بات کرے۔ چھوٹی بیگم ایک لمحہ چپ رہ کر بولی:

''یہ سارا بھرا پرا عالی شان گھر، یہ حکومت، یہ عزت، اور...اور...آپ...''

وہ کہنا چاہتی تھی ''آپ کی محبت''، اور ''دل لبھانے، بات کرنے کے آپ کے طریقے''، لیکن کوئی چیز، شاید شرم، اس کی زبان پر آ کر ٹھہر گئی اور الفاظ کہیں دل کی گہرائی میں دور دبے رہ گئے۔ مارسٹن بلیک کے چہرے پر کچھ معمائی سی مسکراہٹ آئی۔

''اور یہ چاند ستارہ جیسے بچے،'' وہ بولا۔ ''اور میں، تمھارے حسن پر جان نچھاور کرنے والا...''

''اور کیا، یہ سب مجھے کہاں سے ملتے؟ اور مجھے ہی کیا، کسی کو بھی کہاں سے ملتے؟ یہ تو مجھ پر اللہ کی خاص مہربانی ہے۔''

وہ یہ سب کہہ تو رہی تھی، لیکن اس کے جی میں تھی کہ کسی طرح یہ بھی پوچھ دوں کہ ایسے ہی جان چھڑکنے والے ہو تو مجھے نکاحی بیوی نہ سہی لکھا پڑھی کی بی بی ہی بنا دیتے۔ مگر مارسٹن بلیک اب اسے اپنے خاص انداز سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ سے لگاؤ، غرور، اور اپنائیت ٹپک رہی تھی۔ وزیر کو اپنا دل موم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''ایک بات کہوں؟'' مارسٹن بلیک بولا۔

''کیوں نہیں، ضرور کہیے۔ مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

''تو سنو... یہ ۱۸۳۰ کا نیا سال شروع ہونے پر میں تم سے شادی کی درخواست کروں گا۔ نئے سال میں میری تنخواہ بھی بڑھ جائے گی، پھر کچھ دن بعد شاید ترقی بھی ہو جائے۔ شاید ہم دہلی واپس جا سکیں گے۔''

وزیر خانم کا جیسے جی سنسنا گیا۔ دہلی، اور بلیک صاحب جیسے فرنگی صاحب کی نکاحی بی بی بن کر، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس کے تن بدن پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ اس نے بڑھ کر مارسٹن بلیک کا

ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا، جیسے ابھی سے شادی کا بندھن باندھ رہی ہو۔

''قبول ہے؟ اب تو خوش ہو؟''

''بہت خوش۔ پہلے بھی خوش تھی، لیکن اب تو آپ نے مجھے جیتے ہی جی جنت کی بشارت دے دی۔ اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔''

مارسٹن بلیک نے بڑھ کر اس کے ہاتھوں اور بالوں اور منھ اور گردن اور ماتھے پر بوسے دیئے۔ وہ ''ہٹئے، یہ کیا کر رہے ہیں۔ نوکر دیکھ لیں گے'' کہتی ہی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد مارسٹن بلیک دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی کروٹ لے کر سو گیا۔ شاید اس کا بھی دل شادی کی تجویز ظاہر کر دینے کے بعد ہلکا ہو گیا تھا۔ وزیر کے دل کی سنسنی اب کم ہو گئی تھی، لیکن اب ایک ہلکی سی الجھن اس کی جگہ آ گئی تھی۔ اب تک تو وہ بخیال خود آزاد تھی، اور صاحب سے کسی بات پر ناچاقی ہو جاتی یا صاحب کے طور بدل جاتے یا خود اسی کا جی صاحب سے اکتا جاتا تو گذشتہ پر خاک ڈالنے اور از سر نو زندگی شروع کرنے کا امکان تھا۔ لیکن نکاح...؟ پھر تو وہ بندھوا اور باندی ہی بن جائے گی، صاحب تو جب چاہیں گے طلاق دے دیں گے لیکن وہ تو اپنے ہاتھ پاؤں تڑا چکی ہوگی۔ باندی تو تم اب بھی ہو بنو، کسی اور بھرم میں نہ رہنا۔ کیا تم بچوں کو چھوڑ کر رہ سکو گی؟ لیکن یہ بچے میرے ہیں کہاں؟ ہندی ضرور بول لیتے ہیں، جئیں گے تو بڑے ہو کر انھیں غزل مثنوی بھی سکھاؤں گی اور فارسی عربی بھی پڑھواؤں گی۔ خوش نویسی، شہسواری سکھاؤں گی، میرزا بناؤں گی۔ لیکن وہ میرے پاس رہیں اور پلیں بڑھیں تب تو صحیح۔ صاحب نے کچھ کہا نہیں ہے لیکن اے بی میم صاحب کی نیت تو صاف معلوم ہوتی ہے کہ وہ میرے بچوں کو کرسٹان ہی نہیں، انگریز بھی بنائیں گی، مجھ سے چھڑا کر رہیں گی۔ کہتے ہیں انگریز لوگ خون اپنا نہیں چھوڑتے، اگر اس میں مسلمان کا خون مل گیا ہو۔ اختر لونی جرنیل صاحب نے اسی لئے تو مراٹھن آیا کو مسلمان کر کے اس سے نکاح کیا، مبارک النسا بیگم نام و خطاب دیا۔ بلاک صاحب بھی میرے بچوں کو مجھ سے لے ہی لیں گے... میں تو اکیلی ہی رہنے کے لئے بنی ہوں۔ یہ زمانہ کیا ہے آشوب محشر ہے، ہر ایک کو اپنی پڑی ہے کوئی کسی کا ہونے والا نہیں۔ میں اور بلاک صاحب... نوکر کہتے ہیں جوڑی اچھی ہے، لیکن وہ نصرانی انگریز، میں ہندی مسلمان۔ ان کی قوم ہم پر حکومت کے خواب دیکھ رہی ہے، یہ میرے کب ہو کر رہنے والے ہیں۔ اور مجھے اتنی جگہ تو ملے کہ کھل کر سانس لے سکوں۔ میں کسی کی محکوم بن کر کیوں رہوں چاہے وہ فرنگی بڑا صاحب ہی کیوں نہ ہو... تو کیا نکاح سے انکار کر دوں؟ بلاک صاحب تو سمجھتے ہیں کہ مجھ

پر بڑا احسان کر رہے ہیں۔ اور میں تو اپنی ناموس پہلے ہی سے انھیں دیئے بیٹھی ہوں، مجھ پر احسان کریں یا پیٹھ پر میری لات ماردیں، میں نے تو اپنی زندگی کا خاکہ بنا ہی لیا ہے۔ اس میں ابھی بلاک صاحب کا علاقہ بہت کچھ ہے، لیکن پھر...؟ اگر نکاح سے انکار کردوں تو بلاک صاحب مجھے رکھیں گے یا جانے کو کہیں گے؟ سچی پوچھو تو جانا اتنا برا بھی نہیں لیکن کہاں جانا ہے؟ کیا لے کے جانا ہے کیا چھوڑ کے جانا ہے؟ جان رہتی ہے کہ جاتی ہے، بلاک صاحب کی محبت بھی تو اس میں گھر بنا چکی ہے... مجھے نکاح کر لینا چاہیئے، لیکن انگریزی عدالت میں کاغذ بھی دستخط کرا لینا چاہیئے۔ مگر اس طرح تو میں اور بندھ جاؤں گی۔ پر یہ بھی تو سوچو کہ یہ دن کتنے پر ہیبت و مصیبت ہیں۔ کسی کا کچھ ٹھیک نہیں، نہ زندگی کا نہ عہد و پیمان کا، نہ وعدہ وعید کا۔ بلاک صاحب فوجی افسر ہیں آج نہیں تو کل لڑائی پر بھیجے جاویں گے، پھر شیطان کے کان بہرے نہ جانے وہاں کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ چلو کچھ نہیں تو زخمی ہی ہو جاویں، ہاتھ پاؤں کچھ گنوا بیٹھیں۔ پھر انھیں کون دیکھے گا، کون کھلائے پہنائے گا۔ اور مان لو دور پار وہ کسی جنگ میں کام آگئے تو مجھ دکھیاری کا ہاتھ کون پکڑے گا؟ یا نہ بھی یہ سب نہ ہوا، لیکن بلاک صاحب ولایت واپس چلے گئے تو؟ کہتے تو ہیں کہ میرا جینا مرنا اب یہیں ہوگا۔ لیکن مرد ذات کا اعتبار کیا اور وہ بھی فرنگی کرسٹان مرد کا کہ ان سے تو دہری ہی بھلے۔ کیا خبر کب ان کے گھر والے یا اور کوئی نہیں تو یہی ٹنڈل صاحب اور اے بی میم انھیں مجھ سے چھڑا دیں یا انھیں کا دل کل کلاں کسی گوری کھال والی پر آجائے۔ میں تو اپنی بھلائی کی پہلے سوچتی ہوں... لیکن بلاک صاحب میں کچھ موہنی سی ضرور ہے کیسا ان کو دیکھ کر میرا کلیجا بلیوں اچھلا تھا اس رات جب مہرولی شریف سے واپسی میں ہمیں آندھی نے آلیا تھا۔ وہ اگر ہماری دستگیری نہ کرتے تو اپنا تو بیڑا ہی پار تھا، ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئی ہوتی یا پھر جنات اٹھالے جاتے۔ کیا انھیں عورتوں کا معشوقوں کا خدمت گذاروں کا کوئی کال تھا؟ لیکن میں بھی تو ہزاروں میں ایک ہوں اور مجھ سی گنوں والی بی بی انھیں کہاں نصیب ہو سکتی تھی۔ کیا پتہ ان کے دوستوں عزیز اقربا نے مجھے پسند نہ کیا ہو پھر بھی انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اب تو نکاح کی بھی کہتے ہیں۔ مگر میں یہ سب کیوں سوچوں، کیا ساری دنیا کا درد میرے ہی جگر کے لئے ہے؟ بلاک صاحب اگر مجھے چاہتے ہیں تو میں نے بھی ان کی خاطر سب کچھ چھوڑا ہے۔ میں نے بھی بہت کچھ کھو کر ان کو لیا ہے۔ کیا ان کی طرف بڑی قربانیاں ہیں اور میری طرف صرف گلچھرے ہیں؟ حقیقت تو کچھ اور ہی ہے، پر منصفی سے دیکھنے والے کہاں ہیں۔

خدا جانے کب اسے جھپکی آگئی۔ جب بچے کھیل سے واپس آئے تو ان کے شور سے چونک کر

اس کی آنکھ کھلی۔ وہ پلنگ کی پٹی پر ٹکی ہوئی عجب بے آرامی سے سوئی تھی کہ اس کا سارا بدن درد کر رہا تھا۔ لیکن اسے تعجب اس بات پر ہوا کہ اس کا دوپٹہ بالکل تر تھا۔ یہ پسینہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔

اکتوبر کا مہینہ ختم ہو کر نومبر (۱۸۲۹) شروع ہونے والا تھا۔ مارسٹن بلیک نے نوکروں کی تنخواہ کے لئے روپیوں کے تین توڑے لا کر اسے دو تین دن پہلے ہی دے دیے تھے۔ وہ ہر مہینے کی چار تاریخ کو تنخواہ بانٹتی تھی، شاید اس لئے کہ جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو اس دن چار تاریخ تھی۔ پہلی بار جب سب نوکر اسے سلام کرنے کو حاضر ہوئے تو وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔ اس نے کسی گھر میں اتنے نوکر بھلا کب دیکھے تھے۔ چالیس سے کیا کم رہے ہوں گے۔ پھر جب گرمیاں آئیں تو پانی بھرنے اور ٹٹیاں چھڑکنے کے لئے نوکر اور بڑھے، لیکن وہ عارضی تھے۔ اس کے یہاں ہر بچے کی پیدائش کے ساتھ دو تین نوکروں کا اضافہ ہو جاتا، وہ الگ۔

نوکروں کی اس کثرت پر وزیر کی جان الجھتی تو تھی، لیکن اس کے فائدے بھی بہت تھے۔ صاحب جب تک گھر میں ہوتے وہ ان کے ساتھ باتوں میں، کھانے کی میز پر، یا اور طرح مشغول رہتی تھی۔ لیکن صاحب کے باہر جانے کے بعد اسے فرصت ہی فرصت ہوتی۔ نوکر خوب سدھے ہوئے تھے، خانساماں اور سردار بیرا بھی ان کی نگرانی میں کمی نہ کرتے، اس لئے صبح کے احکامات صادر کر کے وہ گھر کے کاموں سے تقریباً بالکل فارغ ہو جاتی۔ ملنے ملانے کے سلسلے زیادہ تھے نہیں، صرف ٹنڈل بہن بھائی اور بچوں کی آمد نے اس کی مصروفیتیں کچھ بڑھا دی تھیں، لیکن پھر بھی بہت نہیں۔ اے بی میم صاحب نے بچوں کی تربیت کا ذمہ بڑی حد تک لے ہی لیا تھا۔ اس طرح وزیر خانم کو پڑھنے اور شعر گوئی کے پرانے شوق پورے کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ گلستاں، بوستاں، غزلیات سعدی، کلام حافظ شیرازی، غزلیات خسرو، فیضی کی مثنویاں، محمد افضل سرخوش اور شاہ نور العین واقف کے دیوان، مثنوی رومی، حضرت میرزا مظہر جانجاناں شہید کا دیوان اور بیاض موسوم بہ ''خریطۂ جواہر'' اس کے مطالعے میں رہتیں۔ شعرائے ریختہ میں شاہ نصیر صاحب تو اس کے استاد ہی تھے، دہلی کے اکثر اساتذہ، خصوصاً میاں محمد تقی میر، میرزا سودا، شیخ جرأت، اور میاں مصحفی کا بہت سا کلام اس کا خوب دیکھا ہوا تھا۔ نئے شعرا میں وہ میرزا نوشہ، میاں ذوق اور شیخ ناسخ کی مداح تھی۔

نومبر ۱۸۲۹ کی چار تاریخ کو وزیر خانم نے جو چٹھا بانٹا اس کی تفصیل حسب ذیل تھی:

نوکر	ماہانہ تنخواہ
چاند خاں، خانساماں	بارہ روپے
نور میاں، بکاول	گیارہ روپے
شہامت علی، آبدار برائے صاحب	آٹھ روپے
لال خاں، آبدار برائے بی بی صاحب	چھ روپے
گھسیٹے خاں، باورچی	پانچ روپے
امر سنگھ، خدمت گار اول	سات روپے
کیول رام، خدمت گار دوم	چھ روپے
عیدو میاں، مشالچی	چار روپے
نتھو لال، دھوبی	آٹھ روپے
ننھے میاں، استری والا	پانچ روپے
مَن خاں، درزی	آٹھ روپے
رام دئی، بڑی آیا	دس روپے
لاڈو بیگم، دائی کھلائی	سات روپے
نازو بیگم، دائی کھلائی	سات روپے
رمجی، چھوٹی آیا	پانچ روپے
انوری بی بی، ماما اصیل	دس روپے
چتر سنگھ، ڈوریا اول	پانچ روپے
ناہر سنگھ، ڈوریا دوم	چار روپے
تمیزن، حلال خورنی	دو روپے
نرگس، خاکروب	ڈیڑھ روپے
چندن سنگھ، سردار بیرا	آٹھ روپے
عالم سنگھ، بیرا	چھ روپے

رام کرپال، گوالا	چار روپے
کرتار سنگھ، بھیڑی والا	پانچ روپے
سدو میاں، مرغی بٹیر والا	پانچ روپے
نا تھو رام، مالی اول	پانچ روپے
للو، مالی دوم	تین روپے
شام لال، مزدور	دو روپے
شیرا، مزدور	دو روپے
چنی دیوی، راتب والی برائے اسپاں	ڈھائی روپے
نبی کریم، بہل بان (۱)	دس روپے
غلام خاں، سئیس	چار روپے
نتھو خاں، سئیس	چار روپے
کیلاش، سئیس	چار روپے
دھنی رام، سئیس	چار روپے
لکھن لال، سئیس	چار روپے
قائم خاں، سئیس	چار روپے
نوازش علی، سئیس	چار روپے
ابھے سنگھ، سئیس	چار روپے
کلوا، چر کٹا	دو روپے
رامو، چر کٹا	دو روپے
پیرو، چر کٹا	دو روپے
سلامت، بہشتی اول	آٹھ روپے
للن خاں، بہشتی دوم	پانچ روپے
کلن خان، بہشتی سوم	چار روپے

(۱) بہل دو پہیے کی گاڑی ہوتی تھی، لیکن عام گاڑی بان کو بھی بہل بان کہہ دیا جاتا تھا۔

دینا ناتھ، بڑھئی اول	آٹھ روپے
کھلاون، بڑھئی دوم	چار روپے
رام بہادر، قلی مشال بردار	دو روپے
بندہ گنیش، قلی مشال بردار	دو روپے
نین سنگھ، چوکیدار	پانچ روپے
نول سنگھ، چوکیدار	پانچ روپے
بختاور خاں، دربان	چار روپے
قادر بخش، چپراسی	پانچ روپے
غوث خاں، چپراسی	پانچ روپے
پھول وتی، نائن برائے مالش	تین روپے
سہیلی دیوی، چپی والی	چار روپے
زور آور خاں، عصابردار	سات روپے
دھننجے، عصابردار	سات روپے
کل تعداد نوکروں کی	اٹھاون
کل چٹھا برائے نومبر ۱۸۲۹	مبلغ تین سو روپے

گرمیوں کے مہینوں میں ٹٹیاں بھگونے اور عمومی جھاڑ پونچھ کرنے والوں کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ تعداد میں آٹھ ہوتے اور ان کی تنخواہیں ڈیڑھ سے دو روپے ماہوار ہوتیں۔ بیرون حویلی کچھ نوکروں کی تنخواہ بلاک صاحب خود بانٹتے تھے، یا شاید کمپنی برداشت کرتی ہو، ان کا صحیح علم وزیر کو نہ تھا۔ یہ لوگ ہرکارے، سپاہی، اور شاید ایک دو جاسوسی اور مخبری کا کام کرتے تھے۔ گھر میں ان کی آمد و رفت منع تھی۔ دیوان خانے یا بڑے کمرے کے سامنے، صاحب جس کمرے میں ہوتے، وہاں ایک چپراسی ہمہ وقت موجود رہتا۔ اسی طرح، بڑی آپا اور چھوٹی آپا میں سے ایک خادمہ ہمہ وقت وزیر خانم کی پیشی میں، یا کمرے کے سامنے رہتی۔ بڑھئی، درزی، دھوبی، استری والے، چر کٹے، بہشتی، نائن، عصابردار، کے علاوہ

باقی سب نوکروں کا کھانا صاحب ہی کے باورچی خانے سے جاتا تھا۔ کچھ اپنا کھانا آپ پکاتے تھے، انھیں سیدھا صاحب کے گودام سے ملتا تھا۔ نوکروں میں خانساماں کا درجہ سب سے اونچا تھا، اس کے بعد بکاول، پھر سردار بیرا اور صاحب کا خدمت گار اول اور آبدار۔ زنانہ نوکروں میں ماما اصیل سب سے اوپر تھی، اس کے بعد دائی پلائی یا کھلائی اور بڑی آیا۔ باہر کے نوکروں میں بہل بان کا درجہ سب سے اعلیٰ تھا۔

مندر

بڑا دن آیا، ہر طرف خوشیاں منیں۔ گرجا گھر میں گھنٹے بجے، نماز ہوئی، ملنا ملانا ہوا۔ گھر میں تحفوں اور مٹھائیوں کا انبار لگ گیا۔ خود مہاراجہ کے یہاں سے عمدہ عمدہ اشیا آئیں جن میں ہاتھی دانت کا بنا ہوا ڈیڑھ ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ اونچا ایک رتھ بھی تھا جس میں دو بیل جتے ہوئے تھے، رتھ بان اپنے آسن پر، اور رتھ کے اندر نوجوان میاں بیوی پورے درباری لباس میں ملبوس و مخلع بیٹھے ہوئے تھے۔ بیلوں کے ماتھے پر نقش و نگار سے لے کر نوجوان بیوی کے زیوروں تک ہر چیز کی تفصیل اس قدر واضح اور ان کے رنگ اتنے سچے تھے گویا سب بالکل اصلی ہیں اور کسی ایسے ملک کے ہیں جہاں کی ہر چیز اسی چھوٹی تقطیع کی ہوتی ہے۔ وزیر خانم اتنے خوبصورت اور قیمتی تحفے کو دیکھ کر پھولوں نہ سمائی۔ اس نے ایک پورا دن اس انتظام اور تفتیش میں لگا دیا کہ یہ رتھ کہاں رکھا جائے اور کس طرح اور کس جگہ رکھا جائے کہ اس کی خوبصورتی اور اس کے کام کی صفائی اور باریکی پوری طرح نمایاں ہو سکیں۔

بڑے دن کے جشن کے تسلسل میں نیا سال آیا اور حسب معمول جوش و خروش سے منایا گیا۔ اس کے فوراً بعد کرنل ایلویس (Alves) صاحب پولیٹیکل ایجنٹ برائے راجپوتانہ چھ ہفتے کی رخصت پر کلکتہ چلے گئے اور مارسٹن بلیک کو جے پور کی ریزیڈنٹی کا مختار بنا گئے۔ اس دن وزیر نے اور بھی خوشیاں منائیں کیونکہ اس کے حسابوں یہ اس کے صاحب کی افزائش عہدہ کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس کا یہ خیال اس وقت اور بھی مستحکم ہو گیا جب نوکروں کے علاوہ ٹنڈل بھائی بہن نے بھی مارسٹن بلیک کو اور اسے مبارک باد دی۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔ مارسٹن بلیک کا عہدہ بڑھا تو ذمہ داریاں بھی

بڑھیں اور کام بھی بڑھا۔ کمپنی کے ملازموں کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ کے فرائض میں پولیس اور جج کی بھی خدمات انجام دینا شامل تھا۔ آئے دن مقدموں کی پیشیاں ہوتیں، چھوٹے بڑے جھگڑے پیدا ہوتے۔ اکثر مہاراجہ کے دربار سے شکایتیں یا معاملات برائے انفصال و تکمیل بھیجے جاتے اور ان پر فوراً کارروائی ضروری ہوتی۔ سیاسی مسائل، کلکتے کی ڈاک، پاس پڑوس کے ریزیڈنٹوں کی ڈاک، ان سب سے الگ الجھنا پڑتا۔ اگر مارسٹن بلیک کچھ چڑچڑا ہو گیا تھا یا گھر پر بھی دفتر کے کام دیکھتا رہتا تو کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ ''دیسی ریاستوں''(۱) میں دربار کی مقامی سیاست، رانیوں کی آپسی رقابتیں، فوج کے اخراجات، نا اہل راجاؤں یا شہزادوں کی تربیت و تدریب، رعایا کی اندرونی بدامنی یا مرفہ الحالی کے حالات، ان سب پر روز نظر رکھنی پڑتی تھی۔ بہت سے صاحبان ریزیڈنٹ تو دن رات راج محلوں کے مخبروں ہی سے پوچھ گچھ اور خفیہ بات چیت میں لگے رہتے تھے۔

کرنل ایلویس کے عازم کلکتہ ہونے کے کوئی دو ہفتے بعد کی بات ہے کہ چاند خاں خانساماں جب بازار سے اشیائے ضروری کی خرید کے بعد واپس آیا تو خلاف معمول مارسٹن بلیک کے دفتری کمرے کے دروازے پر آ کر ٹھہر گیا۔ مارسٹن بلیک کلکتے کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ جب وہ متوجہ نہ ہوا تو چاند خاں نے کھنکھار کر اپنی موجودگی کی خبر دی، لیکن بے اثر۔ دفتر کے کمرے میں جانے کی اجازت کے بغیر داخلہ ممنوع تھا، لیکن صاحب کا متوجہ نہ ہونا اس بات کا اشارہ تھا کہ اس وقت وہ کسی کو مخل ہونے دینا پسند نہ کریں گے۔ چاند خاں نے ہمت کر کے دوبارہ بآواز بلند کھنکھارا تو مارسٹن بلیک نے سر اٹھایا اور ناگواری کے لہجے میں پوچھا:

''کیا معاملہ ہے؟ اس وقت مجھے فرصت نہیں ہے۔''

''سرکار کا حکم ہو تو ایک بات کہنا چاہتا ہوں... اندر آ جاؤں؟''

چاند خاں کے چہرے پر تناؤ اور تشویش کے آثار نمایاں دیکھ کر مارسٹن بلیک نے اسے اندر بلا ہی لیا۔

''اچھا کہو، جلدی کہو، کیا بات ہے، کیا مصیبت آ گئی ہے؟''

''جی، سرکار، وہ ہمارے مہاراجہ سوائی جے سنگھ صاحب بہادر... آپ کو معلوم ہی ہے طبیعت ان کی بہت دن سے خراب ہے...''

---

(۱) Native States، یہ انگریزوں کا اصطلاحی لفظ تھا، اور جذبۂ حقارت سے خالی نہ تھا۔

''ہمارے مہاراجہ'' کا فقرہ مارسٹن بلیک کو شاق تو بہت گذرا، لیکن وہ طرح دے گیا۔ صرف ذرا چیں بجبیں ہو کر بولا:

''ہاں، تو پھر؟ تمھیں اس بات سے کیا؟ تم تو ہمارے نوکر ہو۔''

''جی، لیکن... لیکن... وہ بات یہ ہے کہ...''

''کچھ بکو بھی، کیا لیکن، لیکن کی رٹ لگا رہے ہو۔''

''جی... حکم، بات یہ ہے کہ بازار میں خبر اڑی ہوئی ہے کہ مہاراجہ صاحب بہادر کو زہر دینے کے منصوبے ہیں۔''

اب تو مارسٹن بلیک سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ڈاک کے کاغذات اس نے بستے میں واپس رکھے، اپنی فوجی ٹیونک کی شکنیں برابر کیں، میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو دوبارہ درستی سے لگایا اور اس بہانے سے اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کا وقت حاصل کیا۔ مہاراجہ کے دشمنوں کی کمی نہ تھی، اور دیسی ریاستوں میں یہ سب تو روز کا معمول تھا، لیکن یہاں، اس وقت، اس خبر میں کچھ اور معنی تھے۔ مارسٹن بلیک نے بظاہر لاپروائی سے پوچھا:

''یہ کسی چانڈو خانے کی گپ ہوگی۔ تم نے کہاں سنی؟''

''حکم، میں اپنے بھائی سے ملنے ہوامحل گیا تھا۔ مہاراجہ کی فوج وہاں تعینات ہے، آپ کو تو معلوم ہی ہے جناب کہ میرا بھائی بھی اسی فوج میں ہے۔''

مارسٹن بلیک کو یہ بات خوب معلوم تھی۔ ایسی تمام باتیں جاننا اس کے فرائض منصبی میں تھا۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

''وہاں سارے فوجیوں میں چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں کہ مہاراجہ بہادر کے مختار عام لالہ جھونتا رام چاہتے ہیں کہ مہاراجا کو راستے سے ہٹا دیں اور ننھے مہاراجہ رام سنگھ کا اتالیق بن کر خود راج کرتے رہیں۔ لیکن رعایا کو سیٹھ جھونتا رام ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''

''یعنی اگر ایسا ہوا تو رعایا بلوہ کر دے گی؟''

''حضور اس کا امکان قوی ہے۔''

مارسٹن بلیک کے لئے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ سیٹھ جھونتا رام کے مراسم اجمیر، مارواڑ، الور، تمام رجواڑوں سے تھے۔ مہاجنی اس کے اجداد کا پشتینی کاروبار تھا اور راجپوتانہ کے تمام رجواڑے، اور

خاص کر متذکرہ بالا ریاستوں کے مہاراجاؤں سے اس کا لین دین تھا، یارہا تھا۔ اگر جھونتا رام کو جے پور کی رجنٹی مل جاتی ہے تو وہ ایک متحدہ محاذ قائم کر سکتا ہے جس کے اثرات کمپنی کے مفاد کے لئے نامناسب ہو سکتے تھے۔ سوائی راجہ جے سنگھ اپنی موت مرتا ہے یا کسی قاتلانہ سازش کا شکار ہوتا ہے، یہ بات فی الوقت چنداں اہم نہ تھی۔ ضروری امر یہ تھا کہ ننھے مہاراجہ رام سنگھ کا اتالیق جو بھی ہو وہ کمپنی کی گوں کا آدمی ہو۔ کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے مارسٹن بلیک کو اب ایسی کوئی راہ جلد از جلد نکالنی تھی کہ لالہ جھونتا رام کا اقتدار نہ قائم ہو سکے۔

''سوائی راجہ صاحب کچھ اتنے بیمار تو نہیں ہیں، میرے پاس ابھی پرچہ لگا ہے۔''

''جی حکم۔ پر سچی بات صرف حکیم صاحب ان کے کو معلوم ہے۔ سنا گیا ہے وہ محل میں ہدایت دے رہے تھے کہ روگ ان کا ٹھیک نہ ہوگا، ان کی پوری نگہداشت کی جائے کہ وہ آرام سے رہیں۔''

''تو اسی لئے لالہ جھونتا رام کو جلدی ہے۔ اور بڑے خزانچی سیٹھ راول رام کو کسی نے سب حال سے باخبر کیا؟''

''حضور وہ پل پل کی خبر رکھ رہے ہیں لیکن ان کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ مہاراجہ سوائی جے سنگھ صاحب بہادر تک ان کی پہنچ پر روک لگا دی گئی ہے۔''

راول سیٹھ کے تعلقات انگریزوں، اور خاص کر پولیٹیکل ایجنٹ کے ساتھ بہت خوش گوار تھے۔ اگر مہاراجہ سوائی جے سنگھ کو مرنا ہی تھا اور ریاست اور ننھے مہاراجہ کی اتالیقی کی ذمہ داری کسی کو ملنی تھی تو سیٹھ راول رام اس کے لئے صحیح آدمی تھا۔

مارسٹن بلیک نے چاند خاں کو اشارے سے رخصت کیا اور خود گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس وقت کرنل ایلویس یہاں ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ جھونتا رام کی طاقت کو توڑنا اور راول رام کو اس کی جگہ پر لانا اکیلے میرے بس کا نہیں۔ تو کیا سوائی راجہ کو جھونتا رام کی سازش کا لقمہ بننے سے روکنا میرے بس کی بات ہے؟ جھونتا رام کو ریزیڈنٹی میں بلا کر قید کر لوں؟ مگر کس الزام میں؟ اور اس کا بھی محافظ دستہ بڑا جابر اور وفادار تھا۔ سب کے سب پکے راجپوت یا فارملی پٹھان تھے جو خود بھی اصلاً راجپوت تھے اور شیر شاہ کے وقت میں مسلمان ہو کر جرگۂ پٹھاناں میں بحکم بادشاہ شامل کئے گئے تھے۔ ان سے بار پانا مشکل تھا اور سیٹھ جھونتا رام ان کے بغیر کہیں جاتا نہ تھا۔ اول تو وہ محل سے نکلتا ہی نہ تھا کہ اسے کہیں تنہا کیا جا سکے۔

تو کیا صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کی طرف سے سوائی راجہ جے سنگھ کی معزولی، سوائی راجہ رام سنگھ

کی مسند نشینی اور لالہ راول رام کی اتالیقی کا اعلان کر دوں؟ لیکن اگر اس پر عمل نہ ہوا تو زبردست کرکری ہو گی۔ مجھے تو جے پور چھوڑنا ہی پڑے گا لیکن کمپنی کا وقار اور دبدبہ سب خاک میں مل جائے گا۔ کاش کرنل ایلویس اس وقت یہاں ہوتے۔ کلکتے کی ڈاک سے معلوم ہوا تھا کہ وہ دلی کے لئے نکل چکے ہیں لیکن کچھ راستہ براہ کشتی بھی طے کریں گے۔ اس میں دیر لگ سکتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ بہترین سانڈنی سواروں کو دلی بھیجوں کہ وہ پتہ لگائیں اس وقت کرنل ایلویس کہاں ہوں گے۔ ان کے ساتھ ہی کلکتہ میں لارڈ ولیم بینٹنک کے سکریٹری کے نام پوری رپورٹ بھیج دوں۔ ادھر میں کمپنی کے انگریز ڈاکٹر کو مہاراجہ سوائی جے سنگھ کے محل میں، بلکہ ان کے پلنگ پر تعینات کر دوں۔ اگر ادھر سے کوئی مخالفت اس تجویز کی ہو تو سختی سے اسے کچل دینا ہوگا۔ اس کے بعد دیکھیں گے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

دل میں یہ فیصلے کرتے ہی مارسٹن بلیک نے ان پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے کمپنی کے ڈاکٹر میجر میک ڈانلڈ (Theobald MacDonald) کو بلوا کر صورت حال سے مختصراً آگاہ کیا اور دو انگریز سارجنٹوں کے ساتھ چھ دیسی (لیکن غیر مقامی) سپاہیوں کی ٹکڑی کے ساتھ محل میں داخل ہونے کا پروانۂ راہداری لکھ کر اسی وقت آمیر روانہ کر دیا۔ یوں تو فوجی منصب کے اعتبار سے میجر ڈاکٹر میک ڈانلڈ کا عہدہ مارسٹن بلیک سے اونچا تھا، کہ بلیک ابھی صرف کپتان ہی تھا، لیکن ریزیڈنٹی کے انتظامی امور میں فوجی ڈاکٹر کو ریزیڈنٹ کا تابع رہنا پڑتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے ریزیڈنٹی کے مخبروں نے یہ اطلاع پہنچائی کہ سوائی مہاراجہ جے سنگھ اب چند دن کے مہمان معلوم ہوتے ہیں اور سیٹھ جھوٹا رام نے سارے محل کی ناکہ بندی کرا دی ہے۔ مہاراجہ کو زہر دینے، یا کسی اور ڈھنگ سے ان کا رشتۂ حیات منقطع ہونے کی کوئی بات انھوں نے نہیں کہی۔ مارسٹن بلیک نے انھیں بلا کر خود پوچھ گچھ اور جرح کی، لیکن انھوں نے کسی ایسی سازش کے علم، بلکہ وجود ہی سے صاف انکار کیا۔ پھر بھی مارسٹن بلیک کے دل میں خلش رہ گئی۔ مخبروں کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ جھوٹا رام نے محل کی ناکہ بندی کن وجوہ کی بنا پر کرائی ہے۔ مخبروں کو ہدایت کی گئی کہ ابھی الٹے پاؤں واپس جاویں اور اس امر کی پوری تحقیق کر کے ہی واپس آویں۔

اگلے دن دوپہر کو جاسوسوں نے خبر دی کہ بازار میں ضروری اشیا بہت کم ہو گئی ہیں اور ہر چیز کے دام بڑھنے لگے ہیں۔ سچ پوچھیں تو اس اطلاع کے لئے جاسوسوں کی حاجت نہ تھی، مارسٹن بلیک اور ٹنڈل بھائی بہن کے گھریلو نوکروں کے ذریعہ یہ بات اندرون حویلی صبح ہی کے وقت پہنچ گئی تھی اور وہاں

سے مارسٹن بلیک کے بھی کان میں پڑی تھی، لیکن اس نے اسے بازار کی گپ یا نوکروں کی چالاکی سمجھا تھا کہ اس بہانے وہ دو چار دمڑی دھیلے اور کمالیں گے۔ لیکن جاسوسوں کی اطلاع نے معاملے کو اور ہی رنگ دے دیا۔ مارسٹن بلیک یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گیا کہ راج محل کے معاملات اور مسند کے متزلزل حالات نے بازار بھاؤ پر برا اثر ڈالا ہے۔ شام کی چائے کے وقت ریزیڈنٹی کے مخبروں نے آکر بتایا کہ محل کی ناکہ بندی غالباً اس وجہ سے ہے کہ مہاراجہ سورگباش ہو چکے ہیں لیکن لالہ جھوتا رام ابھی اس خبر کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ انھیں کسی کا انتظار ہے۔ مارسٹن بلیک نے دل میں خیال کیا کہ یہ انتظار صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کا تو ہو نہیں سکتا، ضرور کسی سازش کے تانے بانے پھیلائے جا رہے ہیں۔ اس نے کمپنی کے ڈاکٹر صاحب اور دیگر عملے کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ لوگ خیریت سے ہیں لیکن قید ہیں۔

مارسٹن بلیک اسی شام کو اپنا گھر چھوڑ کر ریزیڈنسی میں منتقل ہو گیا۔ وزیر خانم اور بچوں کو اس نے ٹنڈل بھائی بہن کی نگرانی میں ان ہی کے گھر میں چھوڑ دیا۔ ریزیڈنسی کو مسلح کر دینے کے سوا اس نے کوئی کارروائی فی الحال مناسب نہ سمجھی۔ مہاراجہ کے بارے میں راج محل سے ابھی کوئی اعلان نہ ہوا تھا اور اپنے ڈاکٹر اور عملے کا حال معلوم کرنے اور ممکن ہو تو انھیں واپس بلانے کے لئے جو شقہ اس نے دربار میں بھیجا تھا وہ ہنوز تشنۂ جواب تھا۔ دوسری صبح کو شہر میں خبر اڑی کہ اجمیر سے ایک دیسی فوج کئی دن ہوئے جے پور کے لئے چلی تھی، کل رات اس نے کشن گڈھ چھوڑ دیا اور پرسوں شام تک جے پور شہر میں اس کا ورود متوقع تھا۔ یہ فوج کس کی تھی، یہ تو نہ ظاہر ہوا، لیکن کیوں یہاں آرہی تھی، اس کا جواب کیا اہل بازار اور کیا جاسوس، سب یہی دیتے تھے کہ یہ فوج سیٹھ جھوتا رام کی اعانت کے لئے آرہی ہے۔ مارسٹن بلیک نے کمپنی کے ڈاکٹر اور عملے کے بارے میں پھر تفتیش کی تو اس بار جواب ملا کہ وہ لوگ بیمار مہاراجہ کی دیکھ بھال کر رہے ہیں اور ابھی ان کی واپسی ممکن نہ ہوگی۔ جواب معقول تھا، مارسٹن بلیک دانت پیس کر رہ گیا۔ اسے بہر حال اتنا اطمینان تھا کہ وہ لوگ اگر قید میں بھی ہوں گے تو کمپنی کے اقبال سے ان کا بال بیکا نہ ہوگا۔

سانڈنی سوار ہرکاروں کے عازم دہلی ہونے کے پانچویں دن جاسوسوں نے خبر دی کہ شہر میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے کہ سانڈنی سوار بخیریت دہلی پہنچ گئے ہیں، اور یہی نہیں، کرنل ایلویس صاحب بھی دہلی پہنچ کر وہاں سے بسبیل ڈاک جے پور کے لئے کوچ کر چکے ہیں اور اغلب ہے کہ آج سے چوتھے دن وہ وارد جے پور ہوں گے۔ ادھر اجمیر والی فوج بھی اب شہر سے بہت دور نہیں رہ گئی ہے۔ ہر چند کہ سرکاری اطلاع کوئی نہ تھی، لیکن مارسٹن بلیک کا تجربہ تھا کہ ہندوستانی لوگوں میں دور دور کی خبریں بہت جلد پہنچ جاتی

ہیں اور خبریں عموماً صحیح ہوتی ہیں۔ نہ کوئی ڈاک نہ ہرکارہ نہ جاسوس، لیکن خبریں خدا جانے کس ذریعے سے پھیل جاتیں اور سرکاری طور پر ان کی تصدیق ہوتے ہوتے کئی کئی دن لگ جاتے۔

مارسٹن بلیک نے یہ خیال کیا کہ اس وقت صاحب پولیٹیکل ایجنٹ کی آمد آمد کی خبر سے شہر میں ان عناصر کے حوصلے بڑھے ہیں جو لالہ جھوتنا رام کے خلاف ہیں۔ اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر جھوتنا رام کو کیوں نہ معزول کر دیا جائے۔ یہ فیصلہ ناتجربہ کاری پر مبنی تھا اور مارسٹن بلیک کو اس کی قیمت اپنی جان سے ادا کرنی پڑی۔ پہلی خرابی تو اس فیصلے میں یہ تھی کہ ریزیڈنٹی کے ایک انگریز افسر لفٹننٹ مارکس انچ بولڈ (Lieutenant Marcus Inchbold) اور بارہ دیسی تلنگے سپاہیوں کی گارد کو ریزیڈنٹی کی محافظت سے ہٹا کر راج محل آمیر بھیجنا پڑا۔ لیکن اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ شہر میں افواہ پھیل گئی یا پھیلا دی گئی کہ کمپنی چاہتی ہے ننھے مہاراجہ رام سنگھ کو اپنے قبضے میں کر لے بلکہ مار ہی ڈالے، اور اپنی مرضی کے مہاراجہ کو مسند نشین کرے۔ افواہ یہ بھی تھی کہ فرنگی افسر اور بارہ مسلح سپاہی اسی غرض سے روانہ کئے گئے ہیں کہ مہاراجہ سوائی صاحب بہادر کے گذرنے کا انتظار بھی نہ کیا جائے اور ہو سکے تو انھیں بھی ختم ہی کرا دیا جائے۔

چنانچہ جب سیٹھ جھوتنا رام کی معزولی کا پروانہ لے کر لفٹننٹ انچ بولڈ قلعۂ آمیر پر پہنچا ہے تو اس بات سے قطع نظر کہ اس پروانے کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہ تھی، مہاراجہ کے محافظ دستے اور سیٹھ جھوتنا رام کے سپاہی متحد ہو کر قلعے کے دفاع کی پوری تیاری کر چکے تھے۔ لفٹننٹ صاحب ابھی اپنے ہاتھی سے اترنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار کر کے راج محل کے ایک تہ خانے میں قید کر دیئے گئے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ رعایا مارسٹن بلیک کے اقدامات کی ستائش کرتی اور ہر طرح اس کا ساتھ دیتی، لیکن ہوا یہ کہ سارے شہر میں اس پر گالیاں پڑنے لگیں کہ وہ ننھے مہاراجہ کی جان کے درپے ہے۔ مخبروں اور جاسوسوں نے اسے ان معاملات کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ میں جو کر رہا ہوں رعایا بھی اس کے حق میں ہے۔ لفٹننٹ انچ بولڈ اور اس کے سپاہیوں کے قید ہو جانے پر بھی وہ بہت ہراساں نہ ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ کوئی دن جاتا ہے کرنل ایلویس خود یہاں موجود ہوں گے اور سب کام بحسن و خوبی انجام پا جائیں گے۔ ایک دو دن کے لئے گھبرانا کیا ہے۔

خیر، یہاں تک تو بات صحیح نکلی، کہ اس واقعے کے دوسرے ہی دن گئی رات کرنل ایلویس جے پور پہنچ گیا۔ خلاف توقع اس کے ساتھ سکندر صاحب کے گھڑسواروں (Skinner's Horse) کا ایک مسلح

کا مکمل دستہ بھی تھا۔ اسی دن صبح ہوتے ہوتے یہ اطلاع بھی مصدقہ طور پر مل گئی کہ رات میں کسی وقت سوائی مہاراجہ جے سنگھ سوئم اللہ کو پیارے ہوئے۔ اجمیر کی فوج ابھی کچھ دور تھی۔ کرنل ایلویس نے اسی وقت سکندر صاحب کے گھڑ سواروں اور ریزیڈنٹی کی فوج کی پلٹنیں اپنے ساتھ لیں، مہاراجہ سوائی رام سنگھ کو مہاراجہ جے پور تسلیم کرنے کی سند کمپنی تیار کرائی، لالہ راول رام کی اتالیقی اور سیٹھ جھوٹا رام کے حبس دوام کی تجویز برائے منظوری مہاراجہ نو اپنے ہاتھ سے لکھی۔ رام سنگھ اگرچہ اس وقت ڈیڑھ سال کا بھی نہ تھا اور کسی قسم کی منظوری یا نامنظوری دینے کا اہل نہ تھا، لیکن کرنل ایلویس کا منصوبہ یہ تھا کہ تجویز پر وہ رام سنگھ کی والدہ سے دستخط کرالے گا اور بعد میں صاحب گورنر جنرل سے مناسب پروانہ منگوالے گا۔ لفٹنٹ اچ بولڈ کے حال سے باخبر ہونے کی وجہ سے کرنل ایلویس نے اپنی روانگی کے پہلے انگریزی اور دیسی فوج کی دو ٹکڑیاں تحفے تحائف لے کر مبارک بادی گاتے ہوئے طائفے کے ساتھ روانہ کر دیں کہ قلعے میں اس کی آمد اور ارادوں کی خبر ہو جائے اور جھوٹا رام کو بھی تنبیہ ہو جائے۔ یوں بھی، اجمیر کی فوج کے نہ پہنچ سکنے کے باعث جھوٹا رام میں پہلے سا حال نہ رہا تھا۔

سورج نکلتے نکلتے قلعۂ آمیر کے سامنے ماتمی رعایا کا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ قلعے کے اونچے دروازے پر مسلح ہاتھی جھوم رہے تھے، ان پر جھوٹا رام کے حامی فوجی سوار تھے۔ لیکن ریزیڈنٹی کے ہراول دستے کو اندر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ ان میں سے کچھ سپاہی اور ایک افسر دیوان عام کے سامنے کرنل ایلویس کے منتظر تھے۔ کچھ نے دیوان خاص کے دروازے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ننھا مہاراجہ رام سنگھ دو راجپوت سپاہیوں کی گود میں اور کئی خادماؤں سے گھرا ہوا لیکن شاہی لباس میں دیوان خاص کے اندر تھا۔ جھوٹا رام اس کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا، اس نے کرنل ایلویس کے داخلے پر بھی کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ یہی اس کی بھول تھی۔ اگر وہ اپنے محافظوں کو اشارہ کر دیتا تو اغلب تھا کہ خون کی ندیاں بہ جاتیں اور میدان شاید کسی کے ہاتھ نہ رہتا لیکن عارضی طور پر انگریز کی پسپائی ہو جاتی۔ جھوٹا رام کو شاید اب بھی یہ امید تھی کہ مناسب موقعے پر وہ انگریزوں کو اپنے حق میں ہموار کر لے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک خطیر رقم چھپا کر رکھی تھی کہ انگریز افسران کی خدمت کے لئے کام آئے گی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ کمپنی کے دو افسروں کو قید کرنے کے بعد اسے انگریزوں سے کسی ہمدردی یا نرمی کی توقع نہ ہونی چاہیے تھی۔ اس کی یہ امید اب خیال خام تھی کہ حسب معمول روپئے سے سب کام نکل سکیں گے۔

کرنل ایلویس کے افسر باڈی گارڈ میجر کریڈک (Craddock) نے اپنا ہاتھ اپنے پستول پر

رکھا اور بایاں ہاتھ جھونتا رام کے شانے پر مضبوطی سے رکھ کر کہا:

''میرے ساتھ آیئے۔ آپ حراست میں ہیں۔''

دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر جھونتا رام کی مشکیں کس لیں اور فوراً اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اپنے مالک کی یہ ذلت دیکھ کر جھونتا رام کے محافظوں نے تلوار نکال لی۔ ایک وار کرنل ایلویس کے شانے پر لگا، کرنل کا دایاں شانہ نشانہ ہوا اور اس کا ہاتھ مونڈھے پر سے جھول کر بیکار ہو گیا۔ کپتان مارسٹن بلیک اس وقت کرنل ایلویس کے برابر میں تھا۔ اس نے چمک کر تلوار کا ہاتھ مارا تو کرنل کا حملہ آور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن کپتان بلیک کی سفید درباری وردی جگہ جگہ خون سے رنگین ہو گئی۔ کمپنی کے سپاہیوں نے تلوار کے علاوہ طمنچوں اور پیش قبضوں سے بھی کام لیا۔ جگہ تنگ، ہر طرف عورتوں کا ہجوم، محل کے سپاہیوں کو یہ خوف کہ مہاراجہ کو کچھ گزند نہ پہنچے، کمپنی کے طمنچوں اور سکندر صاحب کے گھڑسواروں کے پیش قبضوں نے اپنا کام کر دکھایا، لڑائی نصف گھنٹہ بھی نہ چلی۔ جھونتا رام کو قلعے کے ایک تہ خانے میں ڈال دیا گیا۔ قلعے کے سپاہیوں سے کچھ باز پرس نہ ہوئی، ہاں ان سب کو بے درنگ گولی مار دی گئی جو عملی طور پر جنگ میں شریک تھے اور جنھوں نے کمپنی کے کسی سپاہی کو زخمی کیا تھا۔

کرنل ایلویس نے کمپنی کی طرف سے مہاراجہ سوائی رام سنگھ کو جیغہ اور طرہ پہنایا، جڑاؤ پیش قبض اس کی کمر سے باندھا اور لالہ راول رام کی اتالیقی کا باقاعدہ اعلان کیا۔ پوجا پاٹ کی رسمیں ادا ہوئیں۔ دن چڑھے تک مبارک بادیاں گائی جاتی رہیں، رسمی دعوت بھی ہوئی۔ یہ طے پایا کہ مہورت دیکھ کر مسند نشینی کے لئے دن اور وقت طے کیا جائے گا۔

کرنل ایلویس کی حالت اچھی نہ تھی، اسے پالکی میں ڈال کر کمپنی کے ڈاکٹر کے ساتھ آگے روانہ کیا گیا۔ پیچھے پیچھے کمپنی کے افسران اور سپاہی، جن میں مارسٹن بلیک بھی تھا۔ شہر پہنچ کر دو چوبداروں اور ایک سرکاری برچھیت کے ساتھ اس نے اپنی راہ الگ کر لی کہ وزیر اور بچوں سے ملتا ہوا اور انھیں خوش خبری سناتا ہوا ریزیڈنٹی کو واپس جائے۔ کمپنی کے لوگ ایک طرف کو مڑ گئے اور کپتان مارسٹن بلیک اپنے تین آدمیوں کے ساتھ ایک تنگ سے راستے میں تنہا رہ گیا۔ نئے مہاراجہ کی مسند نشینی کی خوشی میں دونوں طرف جھنڈے لہرا رہے تھے، پھول اور پھل، مٹھائیاں اور چنریاں، دھوتیاں اور پگڑیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ چوپڑوں پر ناچ گانا ہو رہا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر کچھ اور طوفان بھی پرورش پا رہا تھا جس کی مارسٹن بلیک کو اصلا خبر نہ تھی۔

شہر میں یہ جھوٹی افواہ تو پھیل ہی چکی تھی کہ مارسٹن بلیک نے بیمار مہاراجہ اور ننھے مہاراجہ دونوں کو ٹھکانے لگانے اور جھوٹا رام کو اتالیق مقرر کرنے کا انتظام کرنا چاہا تھا۔ اب جب وہ خون آلود کپڑوں میں قلعے سے باہر نکلا تو اس کے آگے آگے یہ افواہ بھی چلی کہ کپتان صاحب نے ننھے مہاراجہ کا خون کر دیا ہے اور جھوٹا رام کو عارضی اتالیق مقرر کرا دیا ہے۔ اجمیر کی فوج جب آجائے گی تو جے پور راج کے کسی اور شہزادے کو مسند پر بٹھایا جائے گا۔ مارسٹن بلیک کے شہر میں داخل ہوتے ہوتے یہ بات پھیل چکی تھی اور بعض علاقوں میں تو نئے مہاراجہ کی مسند نشینی کا جشن ملتوی یا منسوخ بھی کر دیا گیا تھا۔ مارسٹن بلیک جب تک افواج کمپنی کے ساتھ رہا کسی کو کچھ کرنے کی ہمت نہ پڑ سکی۔ لیکن جب اس نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ کر گھر کا رخ کیا تو اس کے ساتھ صرف چند آدمی دیکھ کر بعض لوگوں نے از روے بلوہ جمع ہو کر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ ایک دو نعرے بھی لگے جنھیں مارسٹن بلیک ٹھیک سے سمجھ نہ پایا لیکن اس کا برچھیت یہ کہتا ہوا ایک دوکان کے تختے کے نیچے چھپنے لگا کہ سرکار کی جان کو خطرہ ہے، یہ لوگ آپ کو مہاراجہ جی کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔

یہ لوگ کون تھے، یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ کہا تو یہی جاتا ہے کہ جھوٹا رام کے حمایتی یا کرائے کے ٹٹو تھے جو اپنے مالک و مربی کے قید ہو جانے کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ لیکن جھوٹا رام کے پاس اب کوئی طاقت تو رہ نہیں گئی تھی، اس کے حمایتی جاڑوں کی دھوپ کی طرح ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ ہندوستانیوں، خاص کر ریاست جے پور کے ملازموں کے تئیں مارسٹن بلیک کا رویہ چونکہ بہت تفاخرانہ اور توہین آمیز رہا تھا، اس لئے بہت سے مقامی لوگوں کو، جن میں بعض عادی مجرم بھی شامل تھے، مارسٹن بلیک سے دلی پرخاش تھی اور اس وقت انھوں نے اس کی تنہائی اور اس کے خلاف عمومی افواہوں کا فائدہ اٹھا کر اس کا قصہ پاک کرنا چاہا۔ برچھیت کو جب کچھ بلوائیوں نے تاکا تو وہ دوکان سے نکل کر یہ پکارتا ہوا ایک تنگ گلی میں غائب ہو گیا کہ ''صاحب اپنی جان بچائیے، میں اتنے سپاہیوں کو لے کر آتا ہوں۔'' اب مارسٹن بلیک کے پاس صرف چوبدار تھے اور دونوں غیر مسلح۔ اس نے انھیں اپنے دائیں بائیں لے کر طمنچہ نکالا اور جلد جلد ہوا میں دو چار فیر کئے کہ مجمع شاید کچھ خوف زدہ ہو جائے۔ لیکن اس کے فیروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ آناً فاناً میں ایک شخص ''ہائے مار ڈالا، ہائے مجھے بچاؤ'' چیختا ہوا زمین پر لوٹنے لگا۔ خدا ہی جانے وہ زخمی تھا بھی کہ نہیں، لیکن اس نے ایسے فیل مچائے کہ مجمع اور بھی برہم ہو گیا۔

''مارو فرنگی کو!''

''مارلو مہاراجہ کے قاتل کو!''

''جانے نہ پائے، یہیں ڈھیر کردو!''

''چھوڑنا مت سور کی اولاد کو!''

''آؤ آؤ بڑھو، گرادو حرام کے جنے کو... مادر بخطا حرامی!''

''دیکھتے ہیں سالا کتا... اب کہاں جاتا ہے۔''

جلد ہی ان گالیوں میں ماں بہن کی بھی گالیاں شامل ہوگئیں اور مجمعے کی آواز غراہٹ میں بدلنے لگی۔ چند لمحوں میں وہ بھیڑ جو بمشکل بیس پچیس بے فکروں اور لاخیروں پر مشتمل تھی، تین چار سو کے بلوے میں تبدیل ہوگئی۔ مارسٹن بلیک نے دیکھا کہ اس تنگ سڑک پر نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن، یہاں سے نکل کر اگلی چوپڑ پر پہنچ جاؤں تو وہیں پر شاید کوتوالی کے سپاہیوں کا ایک تھانہ ہے، وہاں شاید عافیت مل سکے۔ اس نے دوسرا طمنچہ نکال کر ایک چوبدار کو دیا اور خود فیر کرتا ہوا چیخا، ''دیکھتے کیا ہو، فیر کرو۔ یہاں سے نکلو گے تو جان بچے گی۔''

دونوں طمنچوں سے فیر ہونے لگے تو مجمعے کے پاؤں ذرا اکھڑے۔ تھوڑی سی راہ پا کر مارسٹن بلیک نے اپنا گھوڑا ہجوم کے اندر ڈال دیا۔ جس چوبدار کے ہاتھ میں طمنچہ تھا وہ گھوڑے کی آڑ لے کر فیر کررہا تھا، لیکن اس کا طمنچہ پرانی وضع کا تھا، نئے انداز کا پستول نہ تھا، اور نہ ہی اس کو قدر اندازی میں کچھ مہارت تھی، اس لئے فیروں کی رفتار دھیمی تھی۔ دوسرا چوبدار وہیں مجمعے کی روندن میں آگیا، اس کی ہڈیاں پسلیاں سرمہ ہوگئیں۔ مارسٹن بلیک کے پستول میں بیک وقت پانچ گولیاں بھری جاسکتی تھیں اس لئے وہ نسبۃً زیادہ تیزی سے گولی چلا رہا تھا۔ گھوڑا اس کا عربی النسل اور نہایت سدھا ہوا، نہایت بے جگر تھا، وہ اپنے سوار کے ہر اشارے کی مکمل فرماں برداری کرتا بے جھجک آگے بڑھتا رہا۔

جب وہ تنگ سڑک ختم ہوئی تو مارسٹن بلیک نے دیکھا کہ اس کا اندازہ غلط تھا۔ آگے نہ کوئی چوپڑ تھی اور نہ کوتوالی کے داروغہ کا تھانہ۔ سامنے ایک چھوٹے سے میدان میں ایک پرانا سا مندر تھا مگر اس وقت کوئی عقیدتمند پجاری وہاں نظر نہ آتا تھا۔ میدان کے دورویہ سڑکیں تھیں لیکن مارسٹن بلیک کو بالکل یاد نہ آتا تھا کہ وہ دوراستے کہاں نکلتے ہیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر چوبدار کو مستفسرانہ آنکھوں سے دیکھا تو چوبدار نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا اور اشارہ کیا کہ اس مندر میں پناہ لینا بہتر ہوگا۔ بھولے ہوئے راستے کو خیال میں

نہ لا سکنے کی وجہ سے مارسٹن بلیک کی عقل کچھ کام نہ کر رہی تھی۔ اس نے اس فیصلے کے عواقب پر غور نہ کیا اور گھوڑے کو میدان میں اڑاتا ہوا وہ مندر کے دروازے پر اتر گیا۔ اس وقت پیچھے کا مجمع کچھ چھٹ گیا تھا لیکن دوسری طرف سے کچھ اور بلوائی بھی آگئے تھے اس لئے مجموعی اعتبار سے ہجوم کم نہ ہوا تھا۔ مندر کی طرف مڑ جانے کی وجہ سے ہجوم کو اور بھی آزادی سے دوڑنے اور پیچھا کرنے کا موقع مل گیا۔ مسلح چوبدار کے پاس گولیاں ختم ہو چکی تھیں لہٰذا بلوائیوں نے اسے بآسانی گرا کر وہیں اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ مارسٹن بلیک درانہ مندر میں گھس گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مسیحی گرجا گھروں کی طرح مندر بھی محفوظ جگہ یعنی Sanctuary کا کام کرے گا۔

لیکن مارسٹن بلیک کو دو باتوں کی خبر نہ تھی۔ ایک تو یہی کہ وہ کالی جی کا مندر تھا، وہاں سفک دم کی روایت سینکڑوں برس سے چلی آ رہی تھی۔ اور دوسری بات یہ کہ وہاں کا پروہت مہاراجہ الور کے خاندان کا پنڈا تھا لہٰذا سیٹھ جھونتا رام سے اس کے مراسم اچھے تھے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مارسٹن بلیک کون ہے تو اس نے مجمعے کی بالکل مزاحمت نہ کی، بلکہ مشتعل ہجوم کو مندر کا محاصرہ کر لینے اور مسلح بلوائیوں کو مندر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے بارے میں کسی بھی عینی شاہد کو کوئی تفصیل یاد نہ رہی۔ بعد میں جب کمپنی نے ایک فوجی عدالت اس معاملے کی جانچ کے لئے قائم کی تو پروہت نے، اور دوسرے سب لوگوں نے یہی کہا کہ صاحب ہم نے کچھ دیکھا نہیں کہ بلاک صاحب پر پہلا ہاتھ کس نے اٹھایا۔ اور ایک ہاتھ جب اٹھ گیا تو دوسروں کو روکنے والا کون تھا۔

ایک گھڑی سے کم مدت میں مارسٹن بلیک کا بدن تلواروں سے چھلنی ہو گیا۔ اس کا جسد خاکی اس کے قاتلوں نے اس کے رہوار پر ڈال کر گھوڑے کو میدان سے باہر نکال دیا۔ جب انگریزی افواج اور حکام گھوڑے کڑکڑاتے، بھونپو بجاتے، ہٹو بچو کے شور میں گھرے ہوئے ہر طرح مسلح اور مکلل ہو کر موقع واردات پر پہنچے تو انھیں کپتان ایڈورڈ مارسٹن بلیک کا گھوڑا سر جھکائے ہوئے اپنے مالک کو اپنی پشت پر لادے کمر شکستہ اور سرنگوں مندر کے سامنے ترمہانی پر کھڑا ملا، گویا سمجھ نہ پا رہا ہو کہ کیا کروں اور کس طرف جاؤں۔ گھوڑے کے ساز و یراق کا سارا قیمتی سامان غائب تھا اور مارسٹن بلیک کے بدن پر سے ہر قابل استعمال شے اتار لی گئی تھی۔ قاتلوں نے اتنی مہربانی کی تھی کہ اس کی وردی اس کے جسم پر چھوڑ دی تھی اور لاش کو بے حرمت نہ کیا تھا۔ مندر کے پروہت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اور بلوائی تو گویا وہاں کبھی تھے ہی نہیں۔ مندر کے دروازے پر زمین بھی جھاڑو پھیر کر برابر کر دی گئی تھی کہ انسان یا گھوڑے کے قدموں کے نشان نہ مل سکیں۔

بھائی بہن

وزیر خانم کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا پہلو چیر کر زہرہ اور جگر کھینچ لیا ہو اور سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اور اب اس کے بدن کی کوئی چیز اس کی اپنی نہ رہ گئی تھی۔ اس نے مارسٹن بلیک کو آخری بار اس وقت دیکھا تھا جب وہ اسے ٹنڈل بھائی بہن کے یہاں چھوڑ کر یہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ میں ریزیڈنٹی میں بالکل محفوظ رہوں گا، تم بالکل فکر نہ کرو، بہت جلد واپس آؤں گا اور ہم اپنا گھر پھر آباد کریں گے۔ حافظ کے شعر بار بار اسے یاد آتے، وہ انھیں دل میں دہراتی اور روتی جاتی۔

با او بگو کہ اے مہ نامہربان من
باز آ کہ عاشقاں تو مردند ز انتظار
دل دادہ ایم و مہر تو از جاں خریدہ ایم
بر ما جفا و جور فراقت روا مدار

اس نے اکیس دن تک اپنے صاحب کا سوگ منایا۔ مسیحی طرز سے جنازہ اٹھا اور گرجا گھر کی رسمیں بھی سب ادا ہوئیں، لیکن وزیر نے اپنی طرف سے مسجدوں میں قرآن خوانی کرائی، مکتبوں میں طالب علم کھلوائے اور خود پنج وقتہ نماز ادا کر کے صاحب کے لئے دعا کی۔ جب اس کا غم کچھ تھما تو اس نے اپنے گرد و پیش میں نظر کی۔ اب زندگی کیا اور کیسے گذرے گی؟ لسان الغیب خواجۂ شیراز کی اسی غزل کا ایک شعر اسے بطور تفاؤل یاد آیا۔

اے دل بساز با غم ہجران و صبر کن
اے دیدہ در فراقش ازیں بیش خوں مبار

لیکن زندگی کرنے کے لئے تو صبر کے سوا اور بھی بہت کچھ درکار تھا۔ دو بچوں کو کس طرح

پالوں، یہاں پردیس میں کس کے سہارے رہوں۔ جہاں راج رجی ہوں وہاں ماماؤں کی طرح کیونکر بسر کرسکتی ہوں؟ مارسٹن بلیک نے کوئی وصیت نامہ نہ چھوڑا تھا، اور بی بی کی حیثیت سے وزیر خانم کا کوئی اندراج تو کمپنی کے کاغذات میں تھا نہیں۔ اے بی میم صاحب نے بھائی کی تدفین کے دوسرے ہی دن چھوٹی بیگم سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس گھر میں تمھارے کپڑوں کے سوا تمھارا کچھ نہیں۔ وزیر اس وقت تو خاموش رہی تھی لیکن اب ماتم اور سوگ سے دل کچھ ٹھہرا تو اس نے ٹنڈل بھائی بہن سے کھل کر بات کی۔ مانا کہ وہ گھر سے بہت ساز و برگ نہ لائی تھی، لیکن مارسٹن بلیک نے جو تحفے تحائف اسے دیے تھے وہ تو اس کے تھے۔ جو رقم اس نے کمپنی کے جرنیل پامر صاحب کے بنک گھر میں اپنے نام سے جمع کی تھی وہ تو اصل مع سود اس کی اپنی تھی۔ اور جو روز کی استعمالی چیزیں اس کے قبضے میں ساری مدت رہی تھیں وہ بھی اس کی ملکیت تھیں۔

گفتگو کچھ تلخ ہونے لگی تھی کہ ولیم ٹنڈل نے اپنی بہن سے انگریزی میں کچھ کہا۔ اے بی ایک لمحے کے لئے چپ سی ہوگئی، گویا اس کا بھائی جو بات کہہ رہا ہے اسے اپنی زبان پر لانے میں اسے کچھ تردد ہے۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ بولی:

''اور یہ بچے، مارٹن اور سوفیہ...؟ ان کا کیا سوچا ہے تم نے؟''

''سوچتی کیا؟'' وزیر نے فوراً جواب دیا۔ ''میرے بچے ہیں، میں انھیں پالوں گی۔''

''تمھارے پاس ہے ہی کیا جو بچے پالوگی اور تس پر یہ کہ اکیلی بھی رہوگی۔ اور اگر دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا...''

''اے بی میم صاحب، آپ ان معاملوں میں دخل نہ دیں۔ کہہ جو دیا کہ بچے میرے ہیں، میں اپنا پیٹ کاٹ کر انھیں پالوں گی۔ آپ کو کیا؟''

''بچے ہمارے بھی ہیں،'' دفعۃً ولیم ٹنڈل بول پڑا۔ ''ایڈورڈ نے ان کی پیدائش کا اندراج بھی اپنے بچوں کی حیثیت سے کرالیا تھا۔''

یہ اطلاع چھوٹی بیگم کے لئے نئی تھی، اور نہ وہ یہ سمجھ سکتی تھی کہ مارسٹن بلیک نے اگر بچوں کی ولدیت تسلیم کرلی تھی تو اس کے قانونی مضمرات کیا ہیں، یا ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوگئی۔

''سنو۔ ایک تجویز میں تمھارے سامنے رکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے اسے قبول کرنے میں تمھاری بھلائی ہے۔'' یہ کہہ کر اے بی نے ذرا سکوت کیا، گویا اپنی تجویز کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی ہو۔

''فرمائیے، میں سن رہی ہوں۔'' وزیر نے خفیف سے طنز کے ساتھ کہا۔

''اچھا تو سنو۔'' اے بی نے ذرا تنک کر کہا، ''بچوں کو ہمیں دے دو...''

''کیا مطلب، آپ انھیں مجھ سے چھڑائیں گی، کرسٹان بنائیں گی، مجھ سے دور کر دیں گی؟ یہ نہ بھولئے بچے میرے بھی ہیں۔''

''ہاں، لیکن تم تو اب کچھ نہیں ہو۔ ٹھاٹ باٹ سے پلے ہوئے یہ بچے، نوکروں کی ریل پیل، ہر چیز کی افراط، رعب داب الگ، یہ سب تم انھیں کہاں دے سکتی ہو؟''

''لیکن ان کا ایمان دھرم...''

''ایمان دھرم کی نہ کہو۔ ان کا بپتسمہ مسیحیوں کی طرح ہو چکا ہے، میں خوب جانتی ہوں۔ اس خیال میں نہ رہنا کہ تم انھیں مسلمان بناؤ گی۔''

''میں کیوں بناتی، وہ خود جو چاہیں گے بنیں گے لیکن ان پر اپنا فرنگی مذہب ٹھونسنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔''

''اے لوبی بی کیا بات کہہ رہی ہو،'' اے بی نے ہنس کر کہا۔ ''ہم کسی پر کچھ کیوں ٹھونسا چاہیں ہیں۔ وہ مسیحی پیدا ہوئے، مسیحی رہیں گے۔''

''رہیں گے کیوں؟ ان کو اسلام کے بارے میں بتا کر تو دیکھیں گے پھر جو ان کا جی چاہے گا کریں گے۔''

''ایسا تو ہم نے کہیں دیکھا نہیں...''

''نہ دیکھا ہو گا۔ لیکن میرے صاحب کا بھی یہی خیال تھا نہیں تو وہ ان کے دو نام کیوں رکھتے؟''

''اچھا تو تم کیا چاہتی ہو؟ بچے تو ہمارے پاس رہیں گے، تمھاری حیثیت تو کچھ ہے نہیں، نہ عزت ہے...''

''عزت ناپنے والی آپ کون ہیں اے بی میم صاحب۔ معاف کیجئے اپنی حدوں کو نہ پھلانگئے۔ میرے بھی لوگ ہیں، ٹھیک ہے میرے صاحب کی شہادت نے مجھے بے گھر کر دیا لیکن میں بے عزت تو نہیں ہوئی۔ آپ کو جو کہنا ہو صاف صاف کہیئے لیکن میرے خاندان کو نہ بکھانیئے۔''

''کہنا بس یہی ہے کہ بچے ہمارے، گھر کا ضروری سامان تمھارا، جو کچھ تمھیں ہمارے بھائی

سے ملاوہ سب تمھارا۔ تم چاہو یہاں رہو یا کہیں اور، گاہے ماہے بچوں کو دیکھنے آسکتی ہو، لیکن وہ تمھارے گھر نہ جاویں گے۔''

لفظ ''گھر'' کچھ طنزیہ انداز میں ادا کیا گیا تھا، یہ بات وزیر سے مخفی نہ رہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اے بی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور اپنی بات جاری رکھی:

''بچوں کی نگہداشت پر تمھارا کچھ خرچ نہ ہوگا۔''

''اور ان کی شادی بیاہ، تعلیم تربیت...؟''

''ظاہر ہے کہ وہ ہماری طرح پلیں بڑھیں گے۔ اپنی مرضی سے لیکن ہم لوگوں کی منظوری سے شادی کریں گے۔ تعلیم تربیت ان کی ویسی ہی ہوگی جیسی انگریز بچوں کی ہوتی ہے۔''

وزیر خانم کھڑی ہوگئی اور تیز لہجے میں بولی:

''مجھے آپ کی باتیں ہرگز منظور نہیں...''

لیکن اس کا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ ولیم نے اپنی بہن سے پھر کچھ انگریزی میں کہا۔ اے بی نے زور زور سے سر ہلایا اور بولی:

''بی بی۔ بیٹھ جاؤ۔ بچوں پر تم کوئی حق ثابت نہیں کر سکتیں۔ ہم کمپنی کی عدالت سے اور ضرورت پڑی تو مہاراجہ کی عدالت سے تمھارے خلاف ڈگری پلک جھپکتے میں لا سکتے ہیں۔''

چھوٹی بیگم کہاں تو ناک اٹھائے اپنے کپڑے سنبھالتی کمرے سے باہر جانے والی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''جو تجویز ہم نے رکھی ہے وہ مہربانی سے اور تمھارا خیال کرتے ہوئے رکھی ہے۔ اس کے بارے میں ہم مزید گفتگو کر سکتے ہیں لیکن بچوں کے باب میں کسی وہم میں نہ رہنا۔ وہ ہمارے ہیں اور ہمارے رہیں گے۔''

وزیر خانم خوب سمجھتی تھی کہ ٹنڈل بھائی بہن بھی اسی کی طرح غرض مند ہیں، اس لئے وہ سمجھوتے پر راضی ہیں۔ طاقت انھیں کے ہاتھ میں ہے لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ بات بڑھے اور جھگڑے کا روپ لے لے۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ اس وقت اس کے لئے بچوں کی نگہداشت واقعی محال نہیں تو بہت مشکل ضرور تھی۔ بہت سوچ کر وہ بولی:

''پہلی بات تو یہ کہ آپ یہاں کی عدالت سے ڈگری لے بھی آئیں گے تو صاحب لاٹ گورنر

ہیں۔ کلکتے میں ان کی عدالت ہے۔ میں وہاں تک چارہ جوئی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن شریفوں کو اس طرح جھگڑنا زیب نہیں دیتا۔ لہٰذا میں بھی کچھ تجویزیں پیش کرنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا، یہی سہی۔ بتاؤ کیا شرطیں رکھتی ہو۔'' اے بی نے جواب دیا، لیکن اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چھوٹی کی شرائط کو یک قلم مسترد بھی کر سکتی ہے۔

''بچوں کا خرچ میں اٹھاؤں گی۔''

یہ الفاظ سنتے ہی ٹنڈل بھائی بہن بڑے زور سے چونکے۔ ''اچھا...!''

''آپ متعجب نہ ہوں۔ میں اس وقت بیس بیس روپیہ مہینہ دونوں بچوں کے لئے دوں گی۔ جب بڑے ہو جائیں گے تو بڑھا دوں گی۔ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا، اس سے آپ کو غرض نہ ہونی چاہئے۔ وہ میرا معاملہ ہے۔''

''اور آگے کہو۔''

''ان کی تعلیم میں ہندی اور فارسی بھی ہو گی۔ انگریزی چاہے جتنی پڑھیں مجھے کچھ عذر نہیں۔ اسی طرح، لباس بھی وہ دونوں طرح کا پہنیں گے۔ صرف انگریزی لباس پہنانا مجھے منظور نہیں۔''

''ٹھیک ہے، اس پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ اور کچھ؟'' اے بی کا لہجہ اب بھی طنزیہ تھا۔

''میں جب چاہوں گی ان سے مل سکوں گی۔ ان کی شادی بیاہ کے معاملات میں مجھے شریک رکھا جائے گا۔''

''دیکھیں گے۔ اور تو کوئی بات نہیں؟''

وزیر نے گہرا سانس لیا اور ٹھہر ٹھہر کر صاف لہجے میں بولی:

''ان قربانیوں کے بدلے اس گھر کا سارا سامان، فرش فروش، شیشہ آلات، برتن باسن، سب میرا ہو گا۔''

ٹنڈل بھائی بہن سناٹے میں آ گئے۔ مارسٹن بلیک کے بچوں کو اپنے قبضے میں کر لینے کے منصوبے میں دین اور دنیا دونوں کی منفعت متصور تھی، لیکن انھیں امید تھی کہ گھر کا اثاثہ بھی بیش از بیش تر وہ ہتھیا سکیں گے۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد دونوں نے کچھ دیر تک انگریزی میں متفکرانہ انداز میں بات کی۔ پھر دونوں نے یک زبان ہو کر کہا، ''ہمیں منظور ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کی مشکور ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے دفعتہً اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے،

لیکن اس نے معاہدے کی توثیق کے لئے ہاتھ بڑھا کر دونوں سے مصافحہ کیا۔ ہندوستانی عورت سے انھیں توقع نہ تھی کہ وہ اس لیاقت کے ساتھ گفت وشنید کرے گی اور پھر مردوں کی طرح ہاتھ بھی ملائے گی۔ بہر حال، دونوں نے وزیر سے ہاتھ ملائے اور یہ کہہ کر رخصت ہوئے کہ کاغذی کارروائی دو چار دن میں مکمل ہو جائے گی۔ تب تک وزیر اپنے سامان واثاثے کو عرض دیدہ کر لے۔ یہ بات تو طے ہی تھی کہ وہ دلی واپس چلی جائے گی، جے پور میں نہ رہے گی۔

اس گفتگو کے آٹھویں دن وزیر نے سارا مال واسباب اونٹوں پر بار کرایا، ایک معتبر قافلہ سالار مقرر کیا اور خود اپنی واپسی کے لئے ڈاک کی سبیل کی۔ دونوں بچوں کے سامنے اس نے پانچ توڑے روپیوں کے اے بی میم صاحب کے سپرد کئے کہ یہ ان معصوموں کا سال بھر کا خرچ ہے۔ بچوں کو اس نے رو رو کر پیار کیا اور وعدہ کیا کہ جلد ہی تم سے ملوں گی یا اپنے پاس بلا لوں گی۔ اب کے بعد انھیں ملنا نصیب نہ ہو گا، اس کا وہم بھی ان کے دل میں نہ تھا، لیکن اتنی بات تو سب دیکھتے تھے کہ ایک دور زندگی کا ختم ہو گیا، اور بہت جلد ختم ہو گیا۔ اگلا دور شاید اتنی جلد ختم نہ ہو۔

گفتم از گوے فلک صورت حالے پرسم
گفت آں می کشم اندر خم چوگاں کہ مپرس

چھوٹی بیگم

پانچویں دن کی شام وہ دہلی پہنچ گئی لیکن اپنے باپ کے یہاں نہ اتری۔ منجھلی سے کہہ کر اس نے ایک مکان سرکی والان میں ٹھیک کرالیا تھا۔ اس کے دہلی پہنچنے کے چھٹے دن اس کا سامان بھی پہنچ گیا جو سات اونٹوں پر بار تھا۔ زیور اور زرنقد وہ اپنے ساتھ لیتی آئی تھی۔ اس وقت وزیر خانم کی عمر انیس سال اور چند دن تھی۔ دو دو بچے پیدا کرنے، پھر صاحب کا غم اٹھانے اور پھر بچوں کی جدائی کے صدمے کے باوجود اس وقت اس کا حسن ایسا تھا کہ قسم کھائیے اور دیکھتے رہیئے۔ یہ مارچ کا مہینہ اور ۱۸۳۰ کا سال تھا۔

اس وقت چھوٹی بیگم کے سامنے دو مسائل تھے۔ ایک تو تنہائی، اور دوسرا آذوقۂ حیات۔ ہر چند کہ صاحب کا چھوڑا ہوا مال اور خود اس کی جمع پونجی جو اس نے پانچ برس میں مہیا کی تھی، بہت وافر تھی، لیکن جب مال میں اضافہ نہ ہو اور وہ صرف ہوتا چلا جائے تو گنج قارون بھی وفا نہ کرے گا۔ جے پور سا بڑا حویلی نما گھر، نوکروں کی وہ فوج، وہ پالکی، نالکی، بگھی، گھوڑے، گائے بھینس، کتے، اور دوسرے جانور، متوسلین کا وہ جمگھٹ، یہ سب تو اب خواب میں بھی ممکن نہ تھا اور چھوٹی بیگم اپنے احوال کی اس تخفیف پر خود کو بڑی حد تک قانع و صابر کر چکی تھی۔ لیکن تخفیف بھی کتنی؟ اسے کھانے پہننے، روزمرہ کا خرچ چلانے کے لئے کچھ وجہ مقرری، اور گھر کی حفاظت کرنے، بازار جانے آنے کے لئے شاگرد پیشہ تو درکار ہی تھا۔ بلا سے اللے تللے خرچ نہ کرتی لیکن اجلے طور پر تو بہر حال رہنا تھا۔ اور پھر اپنی صورت بھی بنائے رکھنی تھی۔

گانے ناچنے کے فن سے وہ بے بہرہ نہ تھی لیکن ان چیزوں کا اسے ذوق نہ تھا۔ ہم جولیوں اور شادی بیاہ کی گھریلو محفلوں کی اور بات ہے لیکن اسے ذریعۂ معاش بنانا اسے پسند نہ تھا۔ یہ بات اس کے تصور حیات میں شامل بھی نہ تھی کہ وہ ہنر، یا جسم کا سودا کر کے روزی کے ڈھب اور جینے کے ڈھنگ حاصل کرے گی۔ مردوں کے ساتھ وہ اپنی شرطوں پر معاملہ ضرور کر سکتی تھی۔ یا اگر اپنی شرطوں کو سراسر نہیں تو کم

سے کم کچھ اہم شرائط کو منظور کرائے بغیر وہ کسی کی پابند ہونا تو کیا، کسی سے متوسل ہونے پر بھی تیار نہ تھی۔

انگریز اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر کا قتل کچھ ایسی خبر نہ تھا جس کی گونج دہلی تک نہ پہنچتی۔ اور معاملات نشاط و لذت حیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو وزیر خانم کے بارے میں بھی پوری اطلاع تھی کہ اب وہ دلی میں ہے، بچے ساتھ نہیں ہیں، اور ابھی کسی کی پابند ہو کے رہنا کیا، کسی سے متعارف بھی نہیں ہے۔ ہاں اس باب میں لوگوں کو شک تھا کہ وہ اپنے صاحب کا سوگ کب تک منائے گی اور اس کے بعد خود اس کی تجویزیں اور منصوبے کیا ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس جیسی دولت حسن اور دولت دنیا رکھنے والی ڈومنی کے خواہاں لوگوں کی کمی نہ تھی، لیکن وہ خود کس بات کی خواہاں تھی، یہ کھلتا نہ تھا۔ اور یہ بھی ہے کہ یہ تو دلی والے تھے جو اسے (خاص کر منجھلی کے طرز پر) ڈومنی کہتے یا سمجھتے تھے۔ ورنہ اپنی نگاہ میں وزیر خانم کسی بیگم سے کم نہ تھی۔ یہ اور بات کہ وہ ایسی بیگم تھی کہ اس میں ڈومنی پن ایسا چوکھا تھا کہ ہر رنگ میں اور ہر امر سے نکلتا تھا۔ اور علاوہ ہمت اور ارادے کی صلابت میں شہزادیاں اور رانیاں اس سے بڑھ کر نہ تھیں۔ اور پھر یہ دلی شہر تھا، ہاتھی لاکھ لٹے گا تو بھی سوا لاکھ کا رہے گا۔ گلی گلی دروازے دروازے ہر طرف علما، صلحا، زہاد، صوفیا، شعرا، حسن پرست، چھیلے، بانکے، کلانوت، شطرنج باز، قادر انداز، تیغ زن، منجم، پڑے چمک رہے تھے۔ تو بھلا کیوں کر ممکن تھا کہ کسی کو خبر نہ ہوتی کہ وزیر خانم جیسی حسینہ نے دلی کو آباد کیا ہے۔ وہ غنچۂ نیم شگفتہ اب ہزاروں پھولوں کی بہار اور ہزاروں بہاروں کا پھول بن کر خارستان راجستھان سے چل کر دلی کے چمنستان عیش کو دوبارہ معطر اور آتشستان ہجر کو دوبارہ روشن کرنے چلا آیا ہے۔

وزیر کے ورود دہلی کے آٹھ ہی دس دن میں اشارے اس تک آنے لگے، مشاطائیں دروازے سے جھانکنے اور اندر آنے کے اذن مانگنے لگیں۔ منجھلی کا بہانہ سب سے آسان تھا۔ جو منجھلی سے ملتا، کسی نہ کسی عنوان سے چھوٹی کے بارے میں پوچھتا۔ اس نے بھی دل میں خیال کیا کہ رنڈاپے کے چیتھڑے کے دن اوڑھے رہوں گی، آخر مجھے بھی جینا ہے اور دو جانوں کا مزید خرچ بھی اٹھانا ہے۔ اپنی اوقات کو ذلیل بھی نہیں کرنا ہے اور اس کی بہتری کی کوششوں پر قائم بھی رہنا ہے۔ عمدہ خانم کے توسط سے اس نے نواب یوسف علی خان کی خدمت میں دوبارہ بار حاصل کیا، لیکن گھریلو انداز میں۔ کہیں آنے جانے کی کوئی بات نہ اس نے اٹھائی، نہ ان کی طرف سے کوئی اشارہ ہوا۔ بس یہ ہوا کہ جب وہ منجھلی سے ملنے جاتی اور اگر نواب صاحب حویلی میں ہی تشریف فرما ہوتے تو انھیں بھی سلام کر لیتی۔ زیادہ بات چیت نہ ہوتی لیکن چھوٹی بہن کی حیثیت میں اسے دعائیں اور کچھ نقد یا میوے، شربت، پان کے لوازم،

انعام میں مل جاتے۔ اسی طرح کئی ہفتے گذر گئے۔ لیکن ایک دن جب وہ سلام کر کے الٹے پاؤں پلٹنے لگی تو نواب صاحب نے زبان معجز کلام سے ارشاد فرمایا:

''چھوٹی بیگم، ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ذری ایک دم ٹھہرو۔''

''جی۔ بندی دل و جان سے حاضر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ان کے سامنے قالین پر دوزانو بیٹھ گئی۔

آج یوسف علی خان نے پہلی بار اسے ذرا توجہ سے دیکھا، ورنہ اب تک تو نگاہیں نیچی کیے اس سے ایک دو رسمی بول بول لیتے تھے۔ اس وقت وہ دوبر کا بناری گلبدن کا چٹاپٹی ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھی، اوپر سے تنگ لیکن نیچے آتے آتے اس کا گھیر بڑھتا گیا تھا۔ چٹاپٹی کے رنگوں میں زرد کے ساتھ طاؤسی سبز، سنہرا اور لاجوردی، موسم کے اعتبار سے بہار دے رہے تھے۔ دوبر کا پاجامہ عموماً بدن کے خطوط کو ڈھانکنے کے لئے پہنتے ہیں، لیکن وزیر اپنے بدن کو کچھ اس طرح چرا کر دو پہلو بیٹھی تھی کہ رانوں کے زاویے کچھ نمایاں ہونے لگے تھے۔ نہایت باریک ریشمی جالی دار ہلکے دودھیا رنگ کے تاش کی انگیا خوب ٹھیک کسی ہوئی تھی۔ انگیا کی آستینیں بس ذرا ذرا سی، شانوں کے آگے بازوؤں کے اوپری حصے کو بمشکل ڈھک رہی تھیں۔ آستینوں پر بھاری سچے کام کے پٹھے تھے۔ انگیا کا گھاٹ نیچا تھا، لیکن اتنا نہیں کہ بے حیائی معلوم ہو۔ کٹوریاں سادہ لیکن ان پر بہت باریک بادلے سے مناسب جگہوں پر تارے ٹکے ہوئے تھے۔ پچھوے اور بازو چوڑے تھے، مگر پھر بھی پشت اور پیٹ کی جھلک رہ رہ کر نمایاں ہو جاتی تھی۔ انگیا کے اوپر اس نے بے آستینوں کی ذرا نیچی اور کچھ ڈھیلی کرتی پہن رکھی تھی، سفید باریک ترین شبنم کی کرتی، اس پر جگہ جگہ سچا کام بنا ہوا تھا۔ کرتی کا دامن آگے اور پیچھے خاص کر بہت نازک سنہرے کام سے پٹا ہوا تھا۔ کرتی اور انگیا نے مل کر بدن کے اوپری حصے کو کچھ ڈھانکنے، کچھ نمایاں کرنے کا عجب تجسس انگیز پرلطف کام انجام دیا تھا۔ کرتی کا کپڑا اس قدر لطیف تھا کہ انگیا کا رنگ اس کے نیچے صاف جھلکتا تھا، لیکن اس میں پھر بھی پردے کا کچھ ایسا اہتمام تھا کہ گریبان کے نیچے صرف اشارے ہی اشارے تھے، صراحت کہیں نہ تھی۔ وہ سر پر دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی، لیکن اس دوپٹے میں بھی وہی اشارے اور وعدے کارفرما تھے۔ ہلکے آسمانی رنگ کا چھ گزا بہت ہی باریک جالیوں والی شربتی کا دوپٹہ، جو کہنے کو سوتی کپڑا تھا لیکن اس کے پلوؤں پر سچا کام تھا، اور ننھے ننھے بادلے کے ستاروں کے ساتھ مقیش کی جھالروں نے اسے اور بھی بھاری بنا دیا تھا۔ وزیر خانم کے بدن پر دوپٹہ نہ تھا، ایک نیلگوں سنہرا بادل تھا جس کے پیچھے سے اس کے ماتھے اور رخسار اور ٹھوڑی کی ملیح جگمگاہٹ، کھنچے ہوئے بدن کے نشیب و فراز، اس کے گلے کا نو لکھا زبرجدی ہار اور گردن

کی نیلمی دھکدھکی، کانوں میں یاقوت کی انتیاں، کلائیوں میں جڑاؤ شیر دہاں چوڑوں کے بیچ میں کریلیاں، کلمے کی انگلی اور چھنگلیا میں ہیرے اور لہسنیا کی جڑاؤ انگوٹھیاں، ناک میں زمرد کی نتھ، فرش پر رکھے ہوئے تیز فانوسوں کی روشنی میں یہ سب بجلیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

سونے کے کام سے دمکتا ہوا آسمانی دوپٹہ، انگیا کا دودھیا رنگ اور کرتی کا سفید رنگ، اور اس پر وزیر کا کھلتا ہوا سلونا سانولا چہرہ، کمر کی سیاہ آنکھیں جن میں کاجل کی بہت ہلکی تحریر، انگیا اور کرتی کے گول گریبان سے اٹھتی ہوئی سڈول گردن، رنگوں کا ایسا دل کو بھلا لگتا اور آنکھوں میں کھبتا ہوا امتزاج یوسف علی خان جیسے تجربہ کار حسن شناس کو بھی سناٹے میں ڈال گیا۔ وہ ایک لمحے کو اسے دیکھتے رہے، لیکن حسن کی گرمی اس قدر تھی گویا وزیر کا بدن بخار سے تپ رہا ہو اور اس کی لپٹیں ان کے بدن تک پہنچ رہی ہوں۔ انھوں نے محجوب ہو کر نظریں جھکا لیں، کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولے:

''چھوٹی بیگم، تم ٹھیک ٹھاک تو ہو نہ؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''سرکار نواب صاحب کا کرم ہے اور اللہ کی مہربانی، ابھی تک تو سب ٹھیک ہی ہے۔''

''کیوں، ابھی تک ہی کیوں، آئندہ کیوں نہیں؟'' نواب نے مسکرا کر کہا۔

''حضور خلد آشیانی ظل سبحانی کی وہ معجز نما بیت تو سرکار کے حافظۂ مبارک میں ہوگی۔'' وزیر نے بھی نیم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''خوب،'' نواب نے فوراً شعر پڑھا ؎

عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

''سرکار پر سب کچھ آئینہ ہے۔ ظل سبحانی کے بھی قلب مبارک میں ہاتف غیب سے کچھ القا ہوا ہوگا۔ انھیں خبر تو نہ ہوئی ہوگی، لیکن اشارہ یہاں موجود تھا کہ عاقبت سے مراد اسی دنیا کا زمانۂ آئندہ ہے، کہ نقد جاں نہ سہی، لیکن نقد بصارت لٹ جائے گا۔ میرا بھی...''

''اللہ اللہ کرو بی بی۔ خدا نہ خواستہ تم پر ایسی افتاد کیوں پڑتی۔''

''سرکار کا سایہ سر پر ہے تو اللہ بھی مہربان رہے گا۔''

''خیر، اللہ سب کا پالن ہار ہے۔ لیکن کچھ تو کہو، سب کام تمھارے درست ہیں؟''

اب وزیر کی سمجھ میں آیا کہ اس سوال کی علت غائی کیا تھی۔ اس کے چہرے پر شرم کی ہلکی سی

لالی دوڑ گئی۔ سر جھکا کر اس نے جواب دیا:

"سرکار جانتے ہیں میں بالکل تنہا ہوں۔ منجھلی بیگم اور آپ کے دیدار کر کے دل کو ٹھنڈا کر لیتی ہوں۔ اور میرا کوئی نہیں ہے۔"

یہ بات پوری طرح درست نہ تھی، لیکن مبنی بر حقیقت ضرور تھی۔ مارسٹن بلیک کے قتل کی خبر سن کر اس کے باپ نے معمولی تعزیت ضرور کی تھی، لیکن اسے گھر واپس آنے کو نہ کہا تھا۔ بڑی بہن نے سچی غمخواری کی تھی اور کئی بار چھوٹی کے پاس آئی گئی تھی۔ لیکن اصل مسئلے کا حل اس کے پاس یہی تھا کہ وزیر باپ کے پاس چلی جائے۔ بڑی نے کہا:

"سال چھ مہینے میں تمھارے لئے کوئی دوہاجو لیکن مناسب دولہا ڈھونڈ ڈھانڈ کر تمھارا نکاح پڑھوا دوں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔"

لیکن وزیر کو یہ تجویز قطعاً منظور نہ تھی۔ وہ اب بھی اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق چاہتی تھی۔ مجبور ہو کر بڑی نے بھی آہستہ آہستہ کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اب صرف منجھلی ہی سے اس کا آنا جانا رہ گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ نواب کو یہ حالات معلوم تھے، لیکن وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آئندہ زندگی کے لئے وزیر خانم کے پاس کوئی نقشہ ہے کہ نہیں، اور اگر ہے تو کیا نقشہ ہے۔

"تو تم نے ملنا ملانا چھوڑ رکھا ہے؟"

"اللہ نواب صاحب، عصمت بی بی از بے چادری۔ مجھے کوئی ملنے کے قابل دکھائی تو دے۔"

"میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ کچھ لوگ تم سے تمنائے ملاقات رکھتے ہیں..."

وزیر کچھ چکرا گئی۔ نواب صاحب دونوں بہنوں کو مجتمع...؟

یوسف علی خان نے بھی فوراً تاڑ لیا کہ میری بات کا مطلب کچھ اور بھی نکل سکتا ہے۔ وہ فوراً بولے:

"میرے ملاقاتی کچھ عمائد و شرفا تک تمھاری شہرت پہنچی ہے۔ وہ لوگ مشتاق ہیں۔"

وزیر خانم کی سانس میں سانس آئی۔ ایک لحظہ ٹھٹک کر وہ بولیں:

"آپ کی کنیز ہوں، آپ کے حکم سے باہر نہیں ہو سکتی۔"

"خوب، بہت خوب۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔" یہ کہہ کر نواب نے اپنے ہاتھ کو خفیف سی

حرکت دی جسے وزیر نے نہ دیکھا لیکن ان کی پشت پر کھڑے ہوئے چوبدار نے آنکھ کے اشارے سے اس کو بتایا کہ اب ملاقات ختم ہوتی ہے۔ وزیر نے اٹھ کر تین سلام کیے اور الٹے پاؤں دیوان خانے سے چلتی ہوئی اندرون حویلی داخل ہوگئی۔

ولیم فریزر

اس گفتگو کے آٹھویں یا دسویں دن ایک چوبدار اور سونٹا بردار نواب یوسف علی خان کا رقعہ اور روپیوں کے دس توڑے لے کر وزیر خانم کے دروازے پر حاضر ہوئے۔ نواب مستطاب نے رقعہ فارسی میں اور اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ بعد دعاے افزونی دولت حسن و دوام اقبال وزیر خانم سلمہا ملاحظہ فرمائیں کہ اگلے پنج شنبہ کی شام کو بعد مغرب نواب ولیم فریزر صاحب ریزیڈنٹ دولت کمپنی بہادر دام ظلہم و مدت فیوضہم کی ڈیوڑھی عالیہ واقع پہاڑی (۱) شہر دہلی پر ایک محفل شعر و سخن قرار دی گئی ہے۔ نواب مرزا اسد اللہ خان صاحب المتخلص بہ غالب والملقب بہ میرزا نوشہ تازہ کلام سے سرفراز فرمائیں گے۔ حضرت دہلی کے چنیدہ عمائد و اساطین بھی رونق افروز بزم ہوں گے۔ آں عزیزہ اگر اپنے قدوم نزہت لزوم کو زحمت نہضت عطا کریں تو عین باعث لطف ہوگا۔

وزیر نے نوکروں کو انعام دے کر اور انھیں کی زبانی اپنے سلام اور منظوری کہلا کر فوراً رخصت تو کیا لیکن ولیم فریزر کا نام سن کر اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ دلی میں کون تھا جو ولیم فریزر کے نام سے آشنا نہ رہا ہو۔ کچھ ہی دن گئے تھے کہ مارسٹن بلیک کی زبانی اس نے سنا تھا کہ جرنیل اختر لونی صاحب کی موت [۱۸۲۵] کے بعد جو کول بروک (Edward Colebrooke) صاحب ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تھے وہ بد عنوانیوں میں ماخوذ ہو کر معطل ہیں اور ولیم فریزر صاحب ان کی جگہ ریزیڈنٹ مقرر ہوئے ہیں۔ بلکہ مائٹن بلاک صاحب کی امید گاہ بھی اسی بات میں تھی کہ فریزر صاحب کی ترقی کے بعد ان کی خالی اسامی پر مارسٹن بلیک کو بلایا جا سکتا تھا۔ لیکن آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند، اب بھی وہ جگہ خالی ہی تھی۔

---

(۱) شمالی مغربی دہلی میں کشمیری دروازے اور پہاڑ گنج کے آگے کا پہاڑی نیم جنگلی علاقہ جو آج کل Ridge کہلاتا ہے، اس زمانے میں "پہاڑی" کہلاتا تھا۔ رائے سینا کی پہاڑی، اور جنوبی مغربی دہلی کا نیم جنگلی پہاڑی علاقہ جسے اب شہر کے تقریباً وسط میں گمان کیا جاتا ہے، اس زمانے میں شہر سے بہت باہر تھا اور شہر دہلی کے مکینوں کے لئے وہ گویا بے وجود تھا۔

فریزر صاحب البتہ دلی میں راج کر رہے تھے۔

فریزر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ ایک افواہ یہ تھی کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ لیکن اتنا تو یقینی تھا کہ اپنے سابق حاکم اعلیٰ اختر لونی صاحب کی طرح اس نے بھی ہندوستانی طور طریقے اپنا لئے تھے۔ وہ سور اور گائے نہ کھاتا تھا، حقہ، پان اور عطریات کا شوق اسے کثرت سے تھا، لیکن ہندوستانی شراب کا ذوق اسے کم تھا، فرانسیسی شراب البتہ اس کا من بھاتا کھاجا تھی۔ فارسی بے تکان بولتا تھا اور شعر ریختہ سے بھی شغف رکھتا تھا۔

ان سب کے باوجود فریزر صاحب نہایت جابر و ظالم بھی مشہور تھا۔ کاشتکاروں اور زمینداروں سے لگان کی شرح اور اس کی وصولی میں وہ اس قدر سختی کرتا تھا کہ دہلی اور مضافات دہلی میں گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے تھے۔ سنا گیا تھا کہ اس کے نشست و برخاست کے آداب بالکل امرائے اہل ہند جیسے تھے۔ اس کے دیوان خانے میں فرنگی طرز کے سوفے اور کوچ نہ تھے، قالین، گاؤ تکیوں اور گدوں کا انتظام تھا۔ زنان خانے میں وہ ننگے پاؤں داخل ہوتا تھا۔ لیکن اس کے چال چلن کے اور پہلو اتنے دلکش نہ تھے۔ اس کی چھ سات بیبیاں تھیں اور متعدد امرد بھی اس کے معشوق تھے۔ ہر چند کہ دہلی میں امرد پرستی کچھ بہت انہونی چیز نہ تھی لیکن سنا گیا تھا کہ وہ بہت دراز دست بھی تھا اور اپنے ملاقاتیوں کے بھی متوسلین پر آنکھ ڈالنے میں اسے تکلف نہ تھا۔

وزیر خانم کے دل میں ایک سنسنی سی اٹھی۔ اگر فریزر صاحب مجھے... مگر مجھے... کیا ان کی نوکر بن کر رہنا منظور ہوگا؟ مارٹن بلاک صاحب کی بات اور تھی، ان کے گھر میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ اور یہاں... توبہ... اسے امردوں اور خواجہ سراؤں سے ہمیشہ گھن سی آتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ پہلے سے کئی کئی بیبیاں بھی ہیں۔ مجھے کسی کے دباؤ تلے رہنا منظور نہیں اور میں ایک ہی گھر میں چاہے وہ بڑی سی حویلی کیوں نہ ہو دیگر عورتوں کے ساتھ رہنا ہرگز گوارا نہ کروں گی...

تو کیا مجھے وہاں نہ جانا چاہیئے؟ مگر کیا ضرور کہ فریزر صاحب کا مجھ سے کچھ مطلب ہی ہو، بس یوں ہی بلا لیا ہوگا۔ نواب صاحب تو کہہ رہے تھے کہ کئی لوگ مجھ سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ فریزر صاحب کو کیا پڑی ہے جو مجھ پر جھوٹوں ہی نگاہ کریں، ان پر جان چھڑکنے والیاں ہزار ہیں اور صورت شکل میں مجھ سے بہتر ہوں تو کچھ عجب نہیں۔ میں آپ ہی میاں شیخ چلی بنی جاتی ہوں۔ اور نواب صاحب کو کیا منھ دکھاؤں گی؟ ان کو تو کہلا دیا ہے کہ کنیز ضرور حاضر ہوگی اور یہ ایک ہزار روپے جو انھوں نے بھجوائے

ہیں۔اس قدر فراخ دلی کا جواب کیا میں ابلہانہ پہلو تہی سے دوں گی؟

لیکن فریزر صاحب...اگر کچھ اشارہ کر ہی بیٹھے تو جواب کیا دوں گی؟ جواب...جواب کچھ بھی نہیں۔ہم لوگ جواب نہ دیں یہی جواب ہے۔اور اگر وہ خفا ہو گئے تو؟ ہو جائیں خفا میری بلا سے۔ایسوں کو تو میں اپنی پیزار پر رکھوں ہوں، وہ میرا کیا کر لیں گے۔نواب صاحب خفا ہوں گے تو انھیں منا لوں گی۔نہیں تو منجھلی باجی کے ہاتھ میں تو وہ بالکل موم ہیں، ان سے کہہ دوں گی۔ مجھے کسی موئے مشٹنڈے انگریز کے حرم میں پڑے سڑتے رہنا منظور نہیں بلا سے وہ فارسی ہی بولتا ہو۔ مجھے اپنی زندگی کا نقشہ یوں مرتب کرنا ہے کہ بلاک صاحب کے بے وقت اور بے موت گذرنے کے بعد میری زندگی کی بازی جو زچ ہو کر رہ گئی ہے اس کے رواں ہونے کی راہیں پیدا ہوں اور عزت بھی بنی رہے۔ ورنہ کیا میں کوئی مونڈھے والی ہوں کہ بات کی بات میں ٹکسال چڑھ جاؤں۔وہ انکھ مندی اور ہوں گی جو دو وقت کی روٹی پر آبرو بیچ دیتی ہیں۔

اس نے منجھلی بیگم کے یہاں سے رتھ منگوائی، دو سونٹا بردار کرائے پر لئے اور گھڑی دن رہے عازم پہاڑی ہوئی۔اسے رات کی فکر تھی کہ واپسی کس طرح ہو گی، پھر خیال آیا کہ اور بھی لوگ ہوں گے، خود نواب یوسف علی خان صاحب بہادر ہوں گے، وہ مجھے بحفاظت پہنچوا دیں گے۔نہایت خوبصورت اونچے قد کے چکنے بیل تھے، ایک بالکل سفید ایک بالکل سیاہ۔ان کی سنگوٹیوں پر چاندی سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے، بدن پر موتی پروئی ہوئی بھاری ریشمی جھولیں، پاؤں میں گھونگھرو۔رتھ بہت اونچی سواری ہوتی تھی، زمین سے کوئی تین یا چار بالشت اونچی، اور اندر اتنی فراخ اور کشادہ کہ بچے اور عورتیں اس میں کم و بیش سرو قد کھڑی بھی ہو سکتی تھیں۔نہایت عمدہ پرانی پختہ کی ہوئی شیشم یا ساگون کی لکڑی کی صندوق نما یہ سواری تین طرف سے بالکل بند اور چھت پر سے کھلی ہوتی تھی، لیکن اس کی چھت ساگون یا سال کی مضبوط پچیوں پر قائم کی جاتی اور چھت کو حسب ضرورت نمدے یا موٹے چھپر اور نمگیر سے ڈھانک کر موسم کے لئے مناسب بنا دیا جاتا تھا۔

نواب یوسف علی خان کی رتھ کے پہیوں پر پیتل کے پھول لگے ہوئے تھے اور آدھے پہیے پر موٹا گرمزیا گرنچ کا پردہ کیچڑ اور سڑک کے پانی وغیرہ کی چھینٹ کو اوپر آنے سے روکنے کے لئے تھا۔چاروں طرف مخمل کے پردے کھنچے ہوئے، مقیش کی جھالریں، دونوں طرف ہوا آنے جانے کے لئے

چھوٹی کھڑکیاں جن پر کمخواب کے پردے مزید تھے۔ اندر قیمتی نرم قالین کا فرش، اس پر دو گدے دار نیچی اور چوڑی کرسیاں تھیں، سامنے خواص کے بیٹھنے کے لئے لکڑی کا صندوق، جس کے اندر کھانے کا خشک سامان حسب ضرورت بھی رکھ لیا جاتا تھا، ورنہ اسے عام طور پر مزید گدوں، چادروں، اور قیمتی سامان ظرف ظروف رکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پانی کے جھجر اور دیگر مشروبات باہر رتھ بان کے پاس رکھے جاتے تھے۔

بناوٹ کے لحاظ سے رتھ اور نالکی بہت مشابہ تھے، لیکن رتھ میں جگہ زیادہ ہوتی تھی اور وہ چار پہیوں کی سواری تھی جسے دو یا چار بیل کھینچتے تھے۔ اس کے برخلاف نالکی میں پہیے نہ تھے، پالکی کی طرح اسے بھی کہار اٹھاتے تھے جو عام طور پر آٹھ ہوتے تھے۔ نالکی کے ساتھ سونٹا بردار اور کبھی کبھی چوبدار بھی ہوتے۔ پالکی اٹھانے کے لئے چار کہار ہوتے تھے اور اس کے دروازے پر بھاری پردہ ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف نالکی رتھ کی طرح ایک چھوٹا سا حجرہ ہوتی تھی اور اس کا دروازہ لکڑی کا ہوتا تھا۔ نالکی ہی میں تھوڑی بہت ضروری ترمیم کر کے اسے بیگمات کے ہاتھیوں پر ہودے کی طرح استعمال کرتے تھے۔ نالکی اور رتھ دونوں میں آگے کی طرف مرصع چھجا سا نکلا ہوتا تھا جس کا اصل مقصد تو شان میں اضافہ کرنا تھا، لیکن رتھ بان بارش یا دھوپ کے موسم میں اس کے نیچے بیٹھ کر خود موسم سے محفوظ رکھتا تھا۔

پہاڑ گنج کی عیدگاہ اور پھر خواجہ باقی باللہ صاحب کی درگاہ سے ہو کر وزیر خانم کی رتھ پہاڑی کی ہلکی چڑھائی کو بآسانی پار کرتی ہوئی سرائے کے پیچھے نکلی جہاں سے اراولی کی اصل پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور چڑھائی سخت ہونے کے علاوہ دونوں طرف دور تک مالتی، چھیول، ببول اور جھڑ بیری کے گھنے جنگل بھی تھے۔ برسات کے نمو افروز موسم نے پرانی جھاڑیوں اور درختوں کو ہریالی سے لاد کر متمول بنا دیا تھا اور جھاڑیاں جو عام حالات میں پژمردہ یا ناپید ہوتیں، ہر طرف ہاتھ پاؤں پھیلا رہی تھیں۔ سرائے کی روشنیاں دور ہو کر دھندلی یا غائب ہو گئی تھیں لیکن صاحب ریزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی کے آس پاس دور تک چراغاں تھا۔ بڑے پھاٹک پر کنول، مردنگ، اور انگریزی لالٹینیں روشن تھیں۔ ہر طرف سپاہیوں کی سنگینیں اور کلغیاں چمک رہی تھیں۔ وزیر خانم کے رتھ بان کو معمولی پوچھ گچھ کے بعد اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ اندر کا لمبا راستہ خم کھا کر دائیں طرف کچھ مزید چڑھائی لئے ہوئے تھا۔ بلند کرسی پر کھڑی اونچی سفید کوٹھی کے بیرونی برآمدے کے سنگین گول موٹے کھمبے جو فرنگی وضع کی محرابوں کو ٹیکے ہوئے تھے، دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ محرابوں پر فرنگی طور کی جالیاں اور کنگنیاں تھیں اور ہر محراب میں ایک فانوس تعبیہ کیا ہوا

تھا۔ چاروں طرف جنگل سے ڈھکی ہوئی وسیع و عریض سفید اور روشن کوٹھی ملائی مکھن کا بنا ہوا کوئی انگریزی کیک لگ رہی تھی۔ لیکن اس کے سفید اور بظاہر سبک ہیئت کے باوجود اندر سے بہت مضبوط اور قلعہ نما تھی۔ دن کی روشنی میں دیکھا جاتا تو کوٹھی کی قلعہ نما بناوٹ کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ خود فریزر نے ۱۲۳۵ مطابق ۱۸۱۹ / ۱۸۲۰ میں کوٹھی کی تعمیر کے بعد اپنے باپ کو ولایت لکھا تھا کہ میں نے ایک مرتفع پہاڑی پر ایک لمبا چوڑا سفید مکان بنایا ہے جہاں سے مجھے شہر دہلی کا بہت سارا حصہ نظر آتا ہے(۱)۔ کہا جاتا تھا کہ یہ کوٹھی اسی جگہ بنی ہے جہاں آج سے پانچ سو برس پہلے تیمور لنگ نے دہلی پر اپنا پہلا پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس کوٹھی کے بارے میں کسی کے حسب ذیل شعر اس زمانے میں بہت مشہور تھے ؎

گذر گر کسی کا جو ہووے ادھر
سہانی سی کوٹھی وہ آوے نظر
سفید اک عمارت وہ دیکھے بلند
کہ ہے نور میں چاندنی سے دوچند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا
وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

کوئی بارہ چودہ ہاتھ چوڑے صاف ستھرے برآمدے کے سامنے کھلی ڈیوڑھی میں رتھ آ کر رکی، سامنے کئی سَیس گھوڑوں کو لئے ہوئے کھڑے تھے۔ دوسری طرف دو ایک رتھیں اور پالکیاں، ایک انگریزی وضع کی گاڑی جسے چرٹ (Charet) کہتے تھے، اور ایک بند بگھی اپنے اپنے کہاروں اور گاڑی بانوں کی نگرانی میں تھیں۔ ان کے ساتھ کے ملازم ناریل پی رہے تھے لیکن ایک دو کے ہاتھ میں بوتلیں بھی تھیں۔ برآمدہ ایک بڑے اور اونچے کمرے پر کھلتا تھا جس کے تینوں دوہرے دروازوں پر بھاری پردے تھے لیکن پھر بھی قہقہوں اور دوستانہ بات چیت کی بلند آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ کھلی ڈیوڑھی پر متعین دربان نے بڑھ کر وزیر خانم کی رتھ کا پردہ اٹھایا، جھک کر انھیں سلام کیا اور بولا:

''تشریف لائیں، بسم اللہ۔''

وزیر خانم ڈوپٹہ سنبھالتی ہوئی اتریں، دوسرے دربان نے بیچ کے دروازے کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر بآواز بلند پکارا:

(۱) "A large white house on top of a hill, from the top of which I am getting a large view of Dehlee."

''سرکار وزیر خانم صاحب تشریف لاتی ہیں۔''

آواز کے ساتھ ہی ادھر وزیر خانم نے ڈیوڑھی کی سیڑھی پر قدم رکھا، ادھر پردہ ہٹا اور ولیم فریزر نواب ریزیڈنٹ بہادر خود باہر تشریف لائے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر مسکراتے ہوئے بولے:

''اہلاً وسہلاً۔ اے آمدنت باعث دل شادی ما۔''

فریزر صاحب کا لہجہ بہت صاف تھا، لیکن اہل زبان جیسا نہ تھا، اور آواز میں بھاری پن اور ہلکی سی غراہٹ تھی، جیسی کہ تمام فرنگیوں کی آواز میں ہوتی ہے۔ وزیر خانم نے جھک کر تسلیم ادا کی اور چہرے پر مسرت یا عاجزی کا کوئی تاثر، یا مسکراہٹ لائے بغیر بولی:

''حضور نواب صاحب کلاں بہادر، کنیزک ثنا و دعا گوے شما۔''

''دیدہ و دل فرش راہ، اندر تشریف لے چلیں۔'' ولیم فریزر نے متانت سے کہا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے اندر کی طرف گھوم گیا۔ وزیر خانم کی طرف اب اس کی پشت تھی۔ وزیر خانم نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگ میں ہلکا سا لنگ تھا۔ وزیر نے سنا تھا کہ فریزر صاحب کئی جنگوں میں بھی شریک رہے ہیں لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ کسی جنگ میں وہ زخمدار بھی ہو چکا ہے۔ وزیر نے آج اسے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر رہی ہوگی لیکن کاٹھی اور صحت اچھی ہونے کے سبب وہ پینتالیس کا لگتا تھا۔ وزیر کو پھر بھی وہ بہت معمر دکھائی دیا۔ البتہ اس بات پر اسے کچھ حیرت ہوئی کہ وہ بالا قامت نہ تھا۔ انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانی عموماً پستہ قد ہوتے تھے لیکن فریزر صاحب کا قد عام ہندوستانیوں سے بھی کچھ دبتا ہوا تھا۔ اس کی مونچھیں سرخی مائل بھوری، بہت گھنی، کچھ راجپوتی کچھ مسلمانی طرز کی تھیں۔ موٹے گل مچھے نیچے ٹھوڑی پر بھوری داڑھی میں بدل گئے تھے جنھیں راجپوتی انداز میں بیچ سے پھاڑ کر اس طرح پھیلا لیا گیا تھا کہ ٹھوڑی پر مانگ بن گئی تھی، لیکن ٹھوڑی میں وہ مضبوطی نہ تھی جو صلابت کردار کی علامت کہی جاتی ہے۔ گھنی داڑھی کے باوجود ٹھوڑی کی کمزوری کچھ کچھ جھلک رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، سیدھی ستواں ناک، ہونٹ کچھ موٹے اور پان کی سرخی سے رنگین، چہرے پر خوش طبعی، لیکن آنکھوں میں کچھ عجب طرح کی ہلکی سی وحشت کی چمک تھی۔ کثرت مے نوشی کی وجہ سے اس کا منھ کچھ ورم کر آیا تھا جس پر مریضانہ سی سرخی گویا مجموعۂ اضداد کا رنگ پیش کر رہی تھی۔

ولیم فریزر کا لباس ہندوستانی تھا۔ اورنگ آبادی ہمرو کا ایک بر کا تنگ پاجامہ، بدن پر باریک تنزیب کا کرتا، اس پر سیاہ مخملی نیمہ، یعنی انگرکھا جس کی آستینیں نیچے سے کٹی ہوئی تھیں، اس کے اوپر کچھ

انگریزی سی وضع کی عبا جس کے تکمے کھلے ہوئے اور آستینیں بہت چھوٹی تھیں۔ آٹھوں انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں، گلے میں سچے موتیوں کا ہار، پاؤں میں زری کے کام کی نکے دار جودھپوری جوتی، سر پر سرخ سیاہ بوٹیوں کا ریشمی چیرۂ بلدار، غرض ولیم فریزر بالکل دلی کا امیر زادہ لگتا تھا۔

فینی پارکس

وہ کمرے میں اس طرح داخل ہوئے کہ ولیم فریزر کچھ تیز قدم رکھتا ہوا آگے آگے تھا اور وزیر خانم اس کے پیچھے، گویا وہ کوئی شہزادی ہو اور فریزر اس کا نقیب۔ اندر کمرہ بہت بڑا تھا، اتنا بڑا کہ تیز روشنی کے باوجود چھوٹی بیگم ایک نگاہ میں اس کے دوسرے سرے کو صاف نہ دیکھ سکیں۔ چھوٹی بیگم کے دل میں تھوڑی سی گھبراہٹ تھی، سردی کے باوجود اسے محسوس ہوا کہ اسے پسینہ آنے والا ہے۔ اس کے قدم ایک لمحے کو لڑکھڑائے، لیکن پھر مستحکم ہو کر اپنے معمولہ آہنگ میں آ گئے۔ وہ ولیم فریزر کے پیچھے آہستہ قدم رکھتی ہوئی کمرے کے پرلی سرے کی طرف چلی۔

مہمانوں میں ہندوستانی اور انگریز قریب قریب برابر کی تعداد میں تھے۔ عورتیں خال خال ہی نظر آ رہی تھیں اور ایک آدھ کے سوا سب انگریز تھیں۔ برسات کی نم آلود سردی کے باوجود کمرے میں آرام دہ گرمی اور شراب اور خمیرہ تمباکو کی آمیختہ بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ قہقہوں اور دوستانہ گرم جوش گفتگو سے چھلکتے ہوئے کمرے میں جب وزیر خانم داخل ہوئی تو ہر چیز کی رفتار کچھ مدھم پڑ گئی۔ کیا مرد کیا عورت، سب حاضرین اس کی طرف متوجہ ہو گئے، لیکن وزیر ان کی توجہ سے بے نیاز سی اپنی عام رفتار سے باوقار قدم رکھتی گئی۔ وہ ہلکے زرد رنگ کے بلبل چشم کا پاجامہ پہنے ہوئے تھی جس پر طاؤسی سبز سنہرے رنگ کی بلبل چشم بوٹیاں تھیں۔ عام رواج کے برخلاف اس کا پاجامہ ایک برے بھی کچھ کم کا تھا، پنڈلیوں اور رانوں پر تنگ، کہ نچلے دھڑ کا سڈول پن نمایاں تھا، لیکن پھوہڑ پن سے نہیں۔ اصطلاح میں اسے آڑا پاجامہ کہتے تھے اور اس کا پہناوا وزیر نے راجستھان کی کتھک رقاصاؤں سے سیکھا تھا۔ پاجامے کے اوپر نہایت باریک نہایت ہلکے کاسنی رنگ کے ریشمی کپڑے کا جامہ تھا (اس کپڑے کو بھی "آڑا" کہتے تھے) جس کے نیچے سے پاجامے کی بوٹیاں اور ساق و ران کا کھنچاؤ جھلک رہے تھے۔ بدن پر ڈھاکے کی ململ کی بے آستینوں کی

نچی کرتی جس پر زری کے نازک پھول کڑھے ہوئے تھے، کرتی کے نیچے سیاہ ململ کی انگیا (یہ انداز بھی راجستھانی تھا) جس کے گھاٹ اور پٹھے زری کے کام سے بھرے ہوئے تھے۔ بھاری آسمانی جالی دار زربفت کا دوپٹہ اس کے بدن پر کس طرح ٹھہرا ہوا تھا، یہ شاید وہ بھی نہ بتا سکتی، لیکن دوپٹہ اس کے سر و سینہ کے گرد ہالے کی طرح تھا جو چاند کی روشنی کو اور بھی روشن کر دیتا ہے۔ دوپٹہ اس کے سر پر ایک عجب انداز بے پروائی سے پڑا ہوا تھا کہ اس کے نیچے سے اس کی زلفوں، چوٹی اور موباف میں پروئے ہوئے موتی صاف نمایاں تھے۔ ماتھے پر جڑاؤ چاند جس میں لہسنیا، گلابی یاقوت، موتی اور نیلم جڑے ہوئے تھے۔ بہت بڑی بڑی، متبسم سخن گو آنکھوں میں کاجل کی بہت ہلکی لکیر، کانوں میں لمبے لمبے آویزے جن میں ہیرے اور نیلم جگمگا رہے تھے۔ ناک میں موتی اور زمرد جڑی ہوئی بھاری کیل، گلے میں سرخ یاقوت کا جگنو، اس کے نیچے سچے موتیوں کا ست لڑا ہار، کلائیوں میں بھرواں گھڑیالی کڑے اور ان کے دونوں طرف کانچ کی مہین چوڑیاں جن پر سنہرا کام تھا۔ پاؤں میں پازیب اور زری کی جوتیاں جن میں دیوار نہ تھی اور اوپری حصہ اتنا مختصر تھا کہ پاؤں کی نگار صاف جھلکتی تھی۔ لمبی مخروطی انگلیاں، کلمے کی انگلی اور بائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں زرد الماس اور سنہرے پکھراج کی انگوٹھیاں۔ دست و پا کی نزاکت اور بدن کی نرم بناوٹ اس کی رفتار سے نمایاں تھی۔

اس روشن خوش گوار کمرے کی نرم کرنیں وزیر خانم کے بدن کے چاروں طرف رقص کناں لگتی تھیں اور رات کا متبسم آسمانی رنگ اس طرح اس کے سارے وجود سے جھلک رہا تھا گویا وہ لڑکی کے بجائے کوئی غیر زمینی وجود ہے۔ اس کا قد متوسط سے کچھ نکلتا ہوا تھا لیکن نہایت متناسب، اور ہر قدم آہستہ تھا لیکن اس سے جھجک یا غیر تیقن کی جگہ اعتماد و استقلال ٹپکا پڑتا تھا۔ اس کی چال میں لطیف روانی تھی، جیسے جمنا میں رات کی ہلکی لہروں پر بجرا آپ سے آپ چلا جا رہا ہو۔ اچانک کمرے کے دوسرے سرے سے کسی انگریز عورت نے بآواز بلند کچھ کہنا شروع کیا۔ ہر طرف خاموشی سی چھا گئی، بیرا لوگ اور آبدار جو شراب کی صراحیاں، نقل کی رکابیاں، اور حقوں کی چلم تازہ کرنے کے سامان لئے مودب پھر رہے تھے، ٹھٹک کر رک گئے۔ وزیر نے ذرا توجہ سے سنا تو وہ عورت کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، سریلی اور صاف آواز تھی لیکن اس میں کوئی کھنک نہ تھی۔ بلاک صاحب کے ساتھ رہ کر وزیر انگریزی سمجھنے لگی تھی، لیکن اس کے شعر کی خوبیوں سے نا آشنا تھی۔ مسکراتی ہوئی انگریز عورت اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف آتی ہوئی پڑھ رہی تھی:

She walks in beauty, like the night

Of cloudless climes and starry skies;

And all that is best of dark and bright,

Meets in her aspect and her eyes.

وزیر کو یہ نہ معلوم تھا کہ یہ اس زمانے کے مشہورترین انگریزی شاعر لارڈ بائرن کے اشعار ہیں، لیکن اتنا وہ ضرور سمجھ گئی کہ یہ اسی کی تعریف میں پڑھے گئے ہیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے شرما گئی، لیکن اشعار کے ختم ہوتے ہی انگریزوں نے تالیاں بجائیں اور ہندیوں نے واہ واہ، سبحان اللہ کی آواز بلند کی تو اس نے سوچا کہ میری شرماہٹ اس شور میں چھپ گئی ہوگی۔ وہ ذرا تیز قدم بڑھاتی ہوئی چلی تو وہی انگریز عورت جس نے اشعار پڑھے تھے، بڑے صاف لہجے میں ہندی بولتی ہوئی آگے آئی:

''آیئے آیئے وزیر خانم، آپ کا بڑا انتظار تھا۔ میں فینی پارکس (Fanny Parkes) ہوں، الہ آباد میں رہتی ہوں۔ میرا شعر پڑھنا آپ کو برا تو نہیں لگا؟''

''جی... جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں... تسلیمات عرض کرتی ہوں۔''

فینی پارکس نے وزیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنی کوچ کی طرف لے چلی:

''آیئے میرے پاس بیٹھئے۔ بھئی اصل بات یہ ہے کہ آپ کی چال اس قدر پیاری تھی کہ مجھے بے ساختہ بائرن صاحب کی نظم یاد آگئی... اف کس قدر نازک اور خوبصورت ہیں آپ کے ہاتھ اور انگلیاں، اور یہ... یہ مہندی سے پھول پتیاں جو آپ نے ہاتھوں پر بنائی ہیں... کیا کہتے ہیں انھیں، بھلا سا لفظ ہے۔''

''جی، انھیں نگار کہتے ہیں۔''

''ہاں، ہاں، نگار۔ کیسا پیارا لفظ ہے۔ اور بھئی آپ لوگوں کے کپڑے بدن پر کس قدر سجتے ہیں! ہمارے لباس تو جیسے کابک میں کبوتر بند کر دیئے گئے ہوں۔ میں کمبخت مجبوراً یہ انگریزی سایہ اور ٹوپی پہنے ہوئے ہوں۔''

فینی پارکس چھوٹے قد کی ذرا دوہرے بدن کی گہری بھوری آنکھوں والی گول مٹول سی عورت تھی۔ آنکھوں سے ذہانت اور خوش مزاجی اور طبیعت کی آزادگی جھلک رہی تھی، لباس انگریزوں کے طرز و وضع کو دیکھتے ہوئے غنیمت تھا۔ اس کے بے تکلف اور سہج انداز نے چھوٹی بیگم کی بھی جھجک ذرا کم کر دی۔ جس کوچ پر فینی اور چھوٹی بیگم بیٹھیں اس پر ایک نسبۃً معمر فرنگن پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تو زیادہ نہ

بولی، لیکن چھوٹی بیگم اور فینی پارکس میں خوب باتیں ہوئیں۔ معلوم ہوا ان کے میاں الہ آباد میں برف خانے کے مہتمم تھے۔ فینی بی گھومنے پھرنے کی شائق اور ہندوستانی طور طریقوں کی شیدا تھیں۔ میاں کو چھوڑ کر براہ کشتی الہ آباد سے آگرہ آئیں، وہاں کی سیریں کرنے کے بعد اب وہ دہلی پہنچی تھیں اور فریزر صاحب کی مہمان تھیں۔

فینی پارکس نے وزیر خانم کے بارے میں کچھ نہ پوچھا، اپنے ہی حال بتاتی گئی۔ مثلاً اس نے آپ سے آپ دہلی اور الہ آباد کے قلعوں کا، اور گنگا اور جمنا کے پانی کا موازنہ کر کے دونوں کی خوبیاں بتائیں اور شہر الہ آباد کی خوب تعریف کی، کہ وہاں کے لوگوں کی بولی بہت میٹھی ہے، وہاں کے نوکر چور نہیں ہیں، وہاں کے آم اور خربوزے نہایت شیریں ہیں۔ جمنا کنارے اس کی کوٹھی ذرا اونچائی پر نہایت پر فضا مقام پر تھی۔ وہاں سے جمنا کا گہرا سبز پانی دور تک موجیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ ندی میں گھڑیال، مگر مچھ، سونس، بڑے بڑے کچھوے، بے شمار تھے۔ پھر اس پر سردیوں کے موسم میں لا تعداد چڑیوں کا آنا اور سنگم کے اطراف میں رین بسیرے کی جگہ بنا کر مہینوں وہیں رہنا، طرفہ دل لبھانے والا سماں ہوتا تھا۔ مور اور گڑ پنکھ اور مہوک تو بارہوں مہینے نظر آتے تھے۔ شام کو شاہجہانی جامع مسجد میں روشنیاں جگمگاتیں اور اذان کی سریلی آواز بلند ہوتی۔ [یہ مسجد انگریزوں نے ۱۸۵۷ کی بغاوت کے بعد مسمار کر دی۔] کڈ گنج (۱) اور مٹھی گنج کے گاؤں اس کی کوٹھی کے علاقے اور شہر کے بیچ میں پڑتے تھے، اس لئے اگر شہر جانا ہوتا تو پہلے سے تیاری کر کے دن ہی دن میں ہو آنا پڑتا تھا۔ ہاں الوپی باغ کے میلے اور پوجا کے زمانے میں دن رات ایک ہی طرح کے بارونق ہو جاتے تھے۔ سال میں ایک آدھ بار الوپی باغ کے مندر کے سامنے میدان میں ستیاں جلنے کو لائی جاتیں۔ عام طور پر کمپنی بہادر کے فوجی انھیں جلنے سے روک دیتے، لیکن کبھی کبھی عوام کا ہجوم اور خود ستی ماتا کا اصرار انھیں ناکام بنا دیتا۔

وہ اپنی دھن میں یہ سب بتاتی گئی، وزیر خانم بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اور کنکھیوں سے مہمانوں پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ فریزر صاحب اسے فینی بی کے پاس چھوڑ کر دوسرے مہمانوں سے باتوں میں مصروف تھے۔ فینی باتیں کرتے کرتے کبھی وزیر خانم کے کسی زیور یا لباس کی تعریف کر دیتی، کبھی اس کا منھ چھو کر اس کے آویزوں یا نتھ کے نگوں کی چمک کا لطف اٹھاتی اور پھر اپنی باتوں میں لگ جاتی۔ اس نے یہ ایک عجیب بات بتائی کہ اگر چہ الہ آباد میں کمپنی کی عملداری اور امن و امان ہے، لیکن گنگا پار کے لوگ، جو

(۱) Kydganj، اب کیڈ گنج یا کیٹ گنج۔

شاہ اودھ کے محکوم ہیں، نہ الٰہ آباد آنا پسند کرتے ہیں اور نہ کمپنی کے راج کو شاہ اودھ کے راج پر ترجیح دیتے ہیں۔

"کیوں، ایسا کیوں ہے فینی میم صاحب؟" وزیر نے بیچ میں موقع پا کر پوچھا۔

فینی پارکس ایک لمحے کو کسی خیال میں کھو گئی۔ پھر وہ ذرا آہستہ لہجے میں بولی:

"بات یہ ہے کہ... کمپنی راج میں شہر والے تو آرام سے ہیں، لیکن گاؤں کے لوگوں کو بہت پریشانیاں ہیں۔ کمپنی نے لگان بڑھا دیئے ہیں، کسان اور زمیندار آپس میں خوش نہیں ہیں... مقامی صناعوں کو کام نہیں مل رہا ہے... لیکن چھوڑو ان باتوں کو، یہ تو دنیا ہے۔"

وزیر کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ فینی میم صاحب کے کتنے بچے ہیں اور ان کے صاحب کہاں ہیں، یہاں مہمانوں میں موجود ہیں کہ نہیں، وغیرہ۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ انگریز لوگ ایسی باتیں پوچھنا معیوب سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فینی میم صاحب نے میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا، یا شاید جانتی ہوں... بلاک صاحب کے بارے میں تو جانتی ہی ہوں گی۔

میرزا غالب

وہ انھیں خیالوں میں تھی کہ صدر دروازے پر آواز ہوئی:

''حضور دلاورالملک نواب شمس الدین احمد خان بہادر تشریف لاتے ہیں۔''

ولیم فریزر فوراً باہر گیا اور ایک بے حد خوبرو، لمبے تڑنگے، زرق برق لباس پہنے ہوئے جوان کے شانے پر ہاتھ رکھے اندر آیا۔ کمرے میں موجود اکثر لوگ کھڑے ہو گئے۔ جو کھڑے نہیں ہوئے انھوں نے بھی انگریزی یا ہندی میں شمس الدین احمد کا خیر مقدم کیا۔ شمس الدین احمد کی عمر اس وقت اکیس بائیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن ان کے چہرے پر امارت کی رعونت اور تجربے کی پختگی کے آثار نمایاں تھے۔ ان کے سر پر مغل امرا کی طرح پگڑی اور سرپیچ دونوں تھے، سرپیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر اور بیضاوی ہی طرز میں کٹا ہوا بدخشانی لعل کمرے کی تمام روشنیوں سے چشمکیں کر رہا تھا۔ موسم کی سردی سے بے نیاز بدن میں باریک تنزیب کا کرتا، اس پر جامہ وار کا نیمہ، کرتے کی کاٹ اور نیمے کی بناوٹ جدید طرز کے مطابق ایسی تھی کہ کرتے کے نیچے سے داہنا سینہ جھلکتا تھا۔ گلے میں ست لڑا موتیوں کا ہار، کمر میں مرصع کمر بند، جڑاؤ خنجر اس سے تعبیہ کیا ہوا، کمخواب کا ایک بر کا پاجامہ، لیکن اس پر جامہ نہ تھا لہٰذا رانوں کا کھنچاؤ اور پنڈلیوں کا کساؤ خوب نمایاں تھے۔ رنگ نہایت گورا، بڑی بڑی آنکھیں، مغل طرز کی نوکدار داڑھی، نمایاں لیکن ہلکی مونچھیں۔ ان کی چال ڈھال اور چہرے بشرے کا مجموعی تاثر اس قدر وجیہ اور دلپذیر، طرز رفتار اس قدر امیرانہ اور پروقار، اور مجموعی رنگ ڈھنگ اس قدر قوت اور اندرونی توانائی کا تھا کہ اس بھرے پرے بارونق کمرے میں، جس میں کچھ نہیں تو بیس بائیس لاکھ کی مالیت کے زیور اور لباس ہی لوگوں کے تن پر تھے، ایک لمحے کے لئے تمام لوگ غیر اہم اور غیر شاندار نظر آنے لگے۔ خود فریزر بھی، جسے دن رات نواب سے علاقہ رہتا تھا، کچھ دنگ اور کچھ مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ نواب کے پیچھے دو سونٹا بردار بے

دھڑک اندر چلے آئے تھے، حالانکہ مہمانوں کے نوکروں کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ نواب شمس الدین احمد نے خفیف سا اشارہ کیا تو سونٹا بردار تین سلام کر کے الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ ولیم فریزر نے نواب شمس الدین احمد کو نمایاں مقام پر بٹھا کر اپنے ہاتھ سے پیچوان کی نے ان کے سامنے پیش ہی کی تھی کہ دروازے پر آواز ہوئی:

''نواب مرزا اسد اللہ خان صاحب۔''

ولیم فریزر فوراً مڑ کر کمرے کے باہر گیا اور معاً نواب مرزا اسد اللہ خان غالب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واپس آیا۔ ہر طرف سے ''تسلیمات!''، ''جناب نواب صاحب بندگی!''، ''ادھر تشریف لائیں، بڑا انتظار دکھایا'' کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وزیر نے محسوس کیا کہ نواب شمس الدین کی آمد پر تہنیت اور خیر مقدم کی آوازیں اس طرح بلند نہ ہوئی تھیں۔ مرزا صاحب کا قد نہایت بلند و بالا، پیشانی اونچی، آنکھیں روشن اور متبسم، سینہ فراخ، کلائیاں چوڑی، اور گردن بلند تھی۔ ان کی رفتار تمکنت و اعتماد سے بھری ہوئی لیکن عجب یا نخوت سے بیگانہ تھی۔ نہایت گورا سنہرا رنگ، جسے میدہ شہاب کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ چہرہ داڑھی سے بے نیاز، لیکن بڑی بڑی خوبصورت نوکدار مونچھیں تورانی وضع کی، گھنی بھوئیں، لمبی پلکیں، نازک نازک ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم، ان چیزوں نے مل کر ان کے چہرے کو اس قدر دیدہ زیب بنا دیا تھا کہ دیکھتے رہیئے۔ ایک لمحے کے لئے وزیر کی نگاہیں بھی نواب شمس الدین احمد کے چہرے سے ہٹ کر میرزا صاحب کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

''میرزا نوشہ، ہم نے آپ کے لئے فرنچ لیکیور کا انتظام کر رکھا ہے، لیکن شرط نئی غزل کی ہے۔'' فریزر نے مرزا غالب کو مظفر الدولہ ناصر الملک مرزا سیف الدین حیدر خان بہادر کی بغل میں بٹھاتے ہوئے کہا۔ مبارز الدولہ ممتاز الملک نواب حسام الدین حیدر خان بہادر کے بڑے بیٹے مظفر الدولہ ناصر الملک سیف الدین حیدر خان بہادر اور مرزا غالب کی دوستی اور باہم مواخات کے شہرے ساری دلی میں تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ میرزا غالب کو تشیع کی طرف مائل کرنے میں لڑکپن کی اس دوستی کو بہت دخل تھا۔ ان دنوں نواب حسام الدین حیدر کی اولادوں کو شاہی حویلی میں بہت رسوخ تھا۔ بادشاہ سے وفاداری کی بنا پر میرزا سیف الدین حیدر خان بہادر کو ۱۸۵۷ کی رستاخیز میں انگریز کی گولی کا شکار ہونا تھا، لیکن فی الوقت انگریزوں میں بھی ان کی آؤ بھگت تھی۔ فارسی کا ذوق ان میں اور ولیم فریزر میں مشترک تھا۔

''زہے نصیب کہ مجھ غریب کے لئے یہ اہتمام ہو،'' مرزا صاحب نے مسکرا کہا۔ ''ہمارے

لئے تو ساقی فرنگ کے مے خانے سے یہی بہت ہے کہ درد تہ جام ہو اور آتش افشانی کا اذن عام ہو۔ زیادہ ازیں مارا پارنج درکار نیست۔" ان کی آواز میں عجب لوچ اور دلکشی تھی۔ نہایت صاف اور کھلی ہوئی آواز، نہ بہت بلند نہ پست، لہجے میں شیرینی ایسی گویا جس سے ہم کلام ہیں اسے اپنا مطلوب خاص سمجھتے ہیں۔

نواب شمس الدین احمد نے پیچوان کا ایک کش لے کر بہت ٹھہر ٹھہر کر کہا، لیکن الفاظ کی تہ میں کہیں دور تھوڑا سا طنز بھی پنہاں تھا:

"سبحان اللہ مرزا نوشہ بھائی صاحب۔ آپ تو نثر میں لآلی نظم رولتے ہیں۔ لیکن ہم بھی آپ کی نظم انیق کے مشتاق ہیں۔"

نواب کا اشارہ یہ تھا کہ غیر ملکی، وہ بھی فرنگی، ہزار ما مقیماں اور گلستاں بوستاں پڑھ جائے، قتیل و وارستہ کے رسائل چاٹ ڈالے، لیکن سخن فہمی، وہ بھی شعر پارسی کی، اس کے بس کا روگ نہیں۔ یہ فن تو ہم ترکوں اور ایرانیوں ہی پر ختم ہے۔ نیزۂ تعریض کا یہ طعن مرزا صاحب ہی نہیں، ولیم فریزر پر بھی عیاں تھا۔ لیکن اس نے خاموشی بہتر سمجھی، کچھ اس لئے بھی کہ مرزا غالب صاحب جواب میں کوئی گرم لیکن شگفتہ فقرہ کہیں گے ہی کہیں گے۔ اور بات ٹھیک ہی تھی۔ مرزا غالب بے حد دلکش انداز میں مسکرائے، اور نواب شمس الدین احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے:

"بجا ارشاد ہوا میاں نواب شمس الدین احمد صاحب۔ لیکن سخن گوئی اور سخن فہمی دونوں ہی قید فرنگ ہیں، اور ان کی مشقت میں کچھ حاصل نہیں۔ عرض ہنر میں فائدہ خاک نہیں۔ میں تو اکثر سوچتا ہوں کہ سو پشت کا پاستانی پیشۂ آبا چھوڑ کر کچھ دانش مندی نہ کی۔"

"یہ قید فرنگ کی بھی خوب کہی آپ نے مرزا نوشہ بھائی صاحب۔ بظاہر تو آپ کی زمین سخن قابل زراعت لگتی ہے۔ اور یہ زمین بھی اللہ کی زمین کی طرح بے حد و بے نہایت ہے۔ یہاں قید کہاں؟ زمینیں تو ہم لوگوں پر تنگ ہیں۔"

نواب شمس الدین کے سخن میں دو رمز تھے۔ ایک اشارہ تو اپنی ریاست لوہارو کے چھن جانے کے خدشے کی طرف تھا، اور دوسرا اشارہ تھا کہ فرنگیوں کے سایۂ شفقت میں آپ کی کشت سخن تو خوب ہری بھری لگتی ہے۔ لیکن مرزا غالب نے ہنس کر جواب دیا:

"لیکن میاں صاحب، وہ جو کسی نے کہا ہے نہ۔

گردانہ اشکے بہ زمیں نفشانی

اے خواجہ تمام کشت کار تو عبث

بس وہی اپنا حال ہے۔ اور شاید آپ کا بھی۔" بات کا رنگ کچھ زیادہ تیز ہوتا دیکھ کر مرزا اسیف الدین حیدر نے دونوں ہاتھوں سے ایک عام سا اشارہ کیا، لیکن اس طرح، کہ کچھ لوگوں کو محسوس ہوا ان کا روئے سخن وزیر خانم کی طرف ہے، اور بولے۔

"بجا ارشاد ہوا۔ لیکن ہم تو باغ محبت کے مالی ہیں، خواجۂ لسان الغیب کی زبان سے کہتے ہیں۔

تا نہال دوستی کے بر دہد

حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم"

اس پر نواب یوسف علی خان نے ہاتھ اٹھا کر شعر کی داد دینے کے انداز میں کہا۔ "سبحان اللہ۔ کیا خوب ارشاد ہوا سیف الدین خان بہادر۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس"

دونوں صاحبان انتہائی معاملہ فہم اور نکتہ ور تھے۔ ولیم فریزر اور نواب شمس الدین احمد کے تعلقات میں جو بال آچکا تھا، اور دوسری طرف مرزا غالب اور ولیم فریزر میں جو گاڑھی چھن رہی تھی اس کی بنا پر اور نواب احمد بخش خان مرحوم کے مقرر کردہ وظیفے کے بارے میں میرزا غالب کی شکایت کی بنا پر بھی، نواب شمس الدین احمد کے دل میں جو غبار تھا، عام لوگ ان باریک رازوں سے واقف نہ تھے۔ لیکن دہلی کے عمائد و اساطین تو جانتے ہی تھے کہ اندر اندر کیا تلخیاں جمع ہو رہی ہیں۔ یہ بات ان پر صاف نہ تھی کہ ولیم فریزر نے ان دو صاحبان کو کسی مصلحت سے یکجا کیا ہے کہ آپس میں ان کی صلح صفائی ہو جائے، یا اس کی تہ میں کوئی باریک کنایہ ہے کہ نواب شمس الدین احمد بزعم خود والی ریاست اور خود مختار ہوں، لیکن نواب ریزیڈنٹ بہادر کی نظر میں وہ محض Native Chieftain [دیسی رئیس، یہ فقرہ حقارت آمیز تھا] ہیں اور نواب ریزیڈنٹ بہادر جس سے چاہیں ملیں، جس کو چاہیں اپنے در دولت پر بلائیں۔ نواب شمس الدین احمد کو برا لگے تو لگے، لیکن مرزا غالب کا آنا جانا نواب ریزیڈنٹ بہادر کے یہاں رہے گا، اور نواب شمس الدین احمد کو سو بار غرض ہوگی تو وہ ولیم فریزر کی کوٹھی پر مرزا غالب کے ساتھ ہم طعام ہوں گے۔ یا پھر ممکن ہے ولیم فریزر نے صرف و محض نواب شمس الدین احمد کو سبک کرنے کے لئے اپنے وہاں دعوت میں بلایا ہو۔

اصل حقیقت کسی کو نہ معلوم تھی، جو صرف اتنی تھی کہ نواب یوسف علی خان کی زبانی وزیر خانم کا تذکرہ سن کر ولیم فریزر کی رنگین مزاجی جاگ اٹھی تھی۔ یہ دعوت طعام اور مرزا غالب سے شعر سننا وزیر خانم کو اپنے یہاں بلانے کا اچھا بہانہ اور مناسب موقع تھا۔ اور نواب شمس الدین احمد کی شاید تالیف قلب بھی اس کو منظور رہی ہو۔ بہر حال، نواب شمس الدین احمد کی خودداری، طبیعت کی اشتعال انگیزی، اور مزاج کی تیزی کی بنا پر یہ امر بالکل فطری تھا کہ ولیم فریزر کے یہاں دعوت کو قبول کرنا ان پر شاق گذرے اور قبول کرنے کی مجبوری ہو، اور اس پر طرہ یہ کہ مرزا غالب بھی وہاں مدعو ہوں۔ ادھر مرزا غالب کی بھی خود بینی اور خودداری بڑے بڑوں سے بڑھ کر تھی۔ پھر نواب شمس الدین کی عم زاد بڑی بہن غالب کو بیاہی تھیں، اس اعتبار سے وہ ان کے بڑے بہنوئی بھی تھے۔ نسل اور قوم کے اعتبار سے نواب احمد بخش خاں بے شک سید تھے اور غالب سے ہزار درجہ بلند تر، لیکن شمس الدین احمد خان کی والدہ تو کم ذات اور غیر کفو تھیں، لہٰذا مرزا غالب انھیں نسباً اپنا ہم پلہ نہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف یہ بھی تھا کہ مال و مرتبۂ دنیا کے لحاظ سے نواب شمس الدین احمد کو غالب پر، اور غالب ہی نہیں، کئیوں پر فوقیت تھی، لہٰذا غالب کے دل میں شمس الدین احمد کے تئیں کشاکش کا احساس لازمی تھا۔

انھیں نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دونوں امرا نے بات کے رخ کو معاندانہ سمت میں مڑنے سے روکنے کی غرض سے محبت اور حسن اور شعر و سخن کے اشاروں کنایوں کی گلفروشیاں شروع کر دیں۔ ان کے سخنان مرموز کو کسی نے سمجھا، کسی نے نہ سمجھا، لیکن نواب شمس الدین احمد اور مرزا غالب بخوبی ان کی کنہ کو پہنچ گئے۔ مرزا غالب کے چہرے پر لطیف سا تبسم آیا جس نے ان کے چہرے کو اور بھی روشن کر دیا۔ سیف الدین حیدر خان بہادر کے اشارے نے ان کی توجہ بھی وزیر کی طرف منعطف کر دی۔ ولیم فریزر تو یوں بھی بار بار وزیر کو چپکے چپکے دیکھتا اور دل ہی دل میں وجد کرتا تھا کہ رونق محفل کے لئے شمع انجمن ہو تو ایسی ہو۔ نواب شمس الدین احمد نے نگاہیں غالب کی طرف سے پھیر کر وزیر خانم کو دیکھا۔ اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

وزیر کی نگاہیں اس وقت شمس الدین احمد اور مرزا غالب کے درمیان کسی خالی جگہ پر یوں تھیں کہ لگتا تھا وہ ان دونوں کو دیکھ رہی ہے لیکن اس طرح کہ اس کے لئے وہ محفل ہی کا حصہ ہیں، کسی مخصوص وقعت کے مالک نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی آنکھیں مرزا غالب کی چوڑی کلائیوں اور نہایت لمبی لمبی مخروطی انگلیوں پر تھیں، کان سب کی گفتگو پر تھے، اور باطنی دھیان کا میلان نواب شمس الدین احمد کی

وجیہ اور راہ چلتوں کے قدم روک لینے والی صورت وشخصیت پر تھا۔اس نے ان کی روح کی گہرائی میں کہیں چھپی ہوئی تلخی اور ناگواری اور بے چینی بھی محسوس کر لی تھی۔ادھر شمس الدین احمد نے جو ذرا توجہ سے وزیر خانم کی طرف دیکھا تو انھوں نے بھی کسی نہ کسی قرینے سے یہ بات سمجھ لی کہ وزیر خانم اور ان کے درمیان کہیں کوئی شعلہ روشن ہونے لگا ہے۔یا شاید اصل بات یہ تھی کہ انھیں وزیر کے بدن سے نسائی کشش کی لہریں اس طرح اٹھتی اور بل کھاتی ہوئی اپنی طرف آتی ہوئی لگ رہی تھیں جیسے وہ جمنا کی بیچ دھار میں کسی ہلکی سی ناؤ میں کھڑے ہوں اور جمنا کی لہریں ان کی ناؤ کو چھونے کے لئے دور دور کے کناروں اور گہرائیوں سے آ رہی ہوں...ان کے بدن پر ٹھنڈے پانی اور ہوا کی لائی ہوئی لرزش ہے،یا شاید پوری ناؤ ہی کے ہچکولوں نے یہ لرزش پیدا کر دی ہے۔انھیں ڈوبنے کا بھی ڈر ہے اور اسی طرح بھیگتے رہنے کی حسرت بھی ہے۔انھیں لگا کہ اس محفل میں صرف میں اور چھوٹی بیگم دو ہی وجود ایسے تھے جن کے اعماق میں کئی طرح کے تلاطم اور شاید کئی طرح کے خوف بھی زلزلے ڈال رہے تھے۔

شراب کا دور دوبارہ شروع ہوا تھا،یا یوں کہیں کہ شراب کا دور گھڑی بھر سے کم عرصے کے لئے ٹھہر کر نئے مہمانوں کی شخصیت اور چہرے مہرے اور آواز کے دلکش اور گہرے لیکن ذرا تاریک پیچ وخم میں محو ہو گیا تھا اور اب اس نے جھرجھری لے کر آنکھ کھولی۔مرزا اسد اللہ بیگ خاں صاحب کی خدمت میں ولیم فریزر کے خاص آبدار نے چاندی کی کشتی پر بلور کی بطے میں لگا کر تھالی جوڑ گلاس کے ساتھ سر بمہر بوتل پیش کی جس پر انگریزی حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا اور کچھ نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔

''نواب صاحب،بسم اللہ۔''ولیم فریزر نے مسکرا کر مرزا غالب سے کہا۔مرزا صاحب بھی مسکرائے،اپنے ہاتھ سے بوتل کھولی اور کہا:

''منھ میں پانی تو بھرا آ رہا ہے،لیکن اسے چندے کھلا چھوڑتا ہوں کہ ہوا خوردہ ہو جائے۔ہر چند کہ ہوا خوردہ اس شراب کو کہتے ہیں جسے رطوبت ہوا نے خراب کر دیا ہو،لیکن یہ شرابیں ایسی ہیں کہ سانس لینے کا تقاضا کرتی ہیں۔''

''واللہ مرزا نوشہ آپ کی انھیں باتوں پر تو ہم فدا ہیں۔''ولیم فریزر ہنس کر بولا۔آداب مے نوشی کوئی آپ سے سیکھے۔مگر بھلا آپ کو یہ ''سانس لینا'' محاورہ کہاں سے معلوم ہوا حضرت سلامت۔یہ تو انگریزی لغت ہے،ہمارے یہاں بعض شرابوں کو پینے سے پہلے ذرا دیر تک کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کے بخارات نکل جائیں،اس کے لئے ہم to breathe یعنی ''سانس لینا'' کا محاورہ بکار لاتے ہیں۔''

"مشفق من، آتی ہیں غیب سے یہی باتیں خیال میں۔ آپ نے سنا نہیں کہ الشعرا..."

"جی ہاں، تلامیذ الرحمٰن... پر صاحب اس خاص مصطلح تک آپ کس طور پہنچ سکے، اس راز پر سے تو پردہ اٹھے۔"

"ہمارے مہرباں اور بھی ہیں۔ ایلک صاحب المتخلص بہ آزاد (۱) کا نام آپ نے سنا ہو گا... لیکن چھوڑیئے ان قضیوں کو۔" مرزا غالب نے وزیر خانم کی طرف ہلکا سا اشارہ کر کے کہا، "آپ نے یہاں اس میخانۂ باقی کی ہمسائگی مجھے عطا کر کر اور میرے دست نااہل میں یہ شیشہ دے کر میرا ایک شعر جھوٹا ثابت کر دیا۔"

"مرزا نوشہ، بھلا آپ کا شعر اور جھوٹا نکلے، لیکن ارشاد ہو تو بارے ہم بھی سن لیں۔" سیف الدین حیدر خان بہادر نے مرزا غالب کا شانہ ہلکے سے تھپک کر کہا۔

"جی میرزا صاحب، اور ہم بھی مشتاقان سخن میں شامل ہیں۔" نواب یوسف علی خان نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ وہ خود بھی شاعر تھے لیکن ابھی کسی کے شاگرد نہ ہوئے تھے۔

"حاضر کرتا ہوں، بلکہ اس کے ساتھ کا بھی ایک شعر عرض کروں گا۔" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے بطور خاص ولیم فریزر کو مخاطب کیا، "ملاحظہ ہو پیر و مرشد۔"

نواب شمس الدین خاں کو یہ بات بری لگی کہ کسی انگریز نصرانی کو "پیر و مرشد" کہا جائے۔ محمد روشن اختر محمد شاہ بادشاہ غازی فردوس آرام گاہ کے زمانے تک تو صرف بادشاہ کو "پیر و مرشد" کہتے تھے۔ بعد میں الگ الگ ریاستوں کے نواب، صوبہ دار، اور راجہ کو بھی ان کے خاص مصاحبوں نے "پیر و مرشد" کہنا شروع کر دیا۔ لیکن انگریز بیدین کو "پیر و مرشد" کہیں، یہ نئی بات تھی۔

"اب نوبت بایں جا رسید کہ کافر کرستان بھی یوں ملقب کئے جانے لگے۔" انھوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے دھیمے لہجے میں کہا، لیکن لہجہ اتنا پست بھی نہ تھا کہ سرگوشی معلوم ہو۔ "اور یہ شراب کو کھلا چھوڑ دینے کی بھی ایک رہی۔ ان لوگوں کا باوا آدم ہی اوندھا ہے۔ بائیں سے دائیں لکھتے ہیں، سلام کرنا ہو تو ٹوپی اتارتے ہیں، بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں... اور سارے ملک ہند میں مرغ زریں بنے گھومتے ہیں۔"

ان کے مخاطب ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک لکھنوی صاحب تھے۔ باریک چکن کی لکھنوی

---

(۱) Alexander Heatherly, "Azad" جنھیں ان کے انگریز دوستوں کی طرح غالب بھی "ایلک" کہتے تھے۔

انداز کی نہایت ہلکی دو پلی ٹوپی ذرا ترچھی اوڑھے ہوئے، جس کے نیچے پٹیاں جمائے ہوئے بال چمکیلے جھلکتے تھے، دوہرا بدن، بہت باریک چکن کا کرتا پہنے ہوئے، اس کے اوپر پھولدار مالینے کا انگرکھا، اسی مالینے کا جامہ، پرانے دہلوی طرز کا اورنگ آبادی مشروع کا بڑے پائینچوں کا پاجامہ دوبرکا، لیکن اس جدت کے ساتھ کہ کپڑے میں نہ نقش ونگار تھے نہ پٹریاں، ان کی جگہ چکن کی ریشمی بوٹیاں نہایت نزاکت سے کڑھی ہوئی تھیں، گلے میں مالاے مروارید، پانچوں انگلیوں میں جڑاؤ انگشتری۔ دہلوی طرز میں لکھنوی رنگ خوب بہار دکھلا رہا تھا۔ یہ اودھ کے معزول وزیراعظم منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خان بہادر کے بیٹے اشرف الدولہ نواب احمد علی خان بہادر تھے۔ انھیں کسی بنا پر ''جرنیل صاحب'' کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے معزول باپ کے ساتھ فتح گڈھ میں رہتے تھے اور اس وقت ولیم فریزر سے ملنے دہلی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے سر ہلا کر نواب شمس الدین احمد کی بات سے اتفاق کیا۔ وزیر تک یہ الفاظ بہت صاف نہ پہنچے، لیکن چونکہ اس کا دھیان بیش از بیش نواب ہی کی طرف تھا اس لئے وہ کچھ سامعہ اور کچھ قیاس سے سمجھ گئی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ شمس الدین احمد کی طرف دیکھ کر کچھ اپنائیت کے انداز میں مسکرائی گویا نواب کی بات سے اتفاق کر رہی ہو۔ مارسٹن بلیک کے ساتھ اس کی زندگی کے پس منظر میں یہ مسکراہٹ بہت کچھ معنی اور شاید معنی سے بھی کچھ زیادہ کی حامل تھی۔

مرزا غالب نے، جو اس اثنا میں پیچوان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، سر اٹھا کر سامعین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور فرمایا، ''مطلع حاضر کرتا ہوں، پھر وہ شعر پیش کروں گا جس کا وعدہ تھا۔''

''ارشاد ہو''، ''عطا ہو''، کئی آوازیں آئیں۔

''ملاحظہ ہو،'' کہہ کر مرزا صاحب نے مطلع پڑھا۔ ان کی شعر خوانی کی آواز بھی ان کی عام آواز کی طرح لوچ دار اور نفاست آمیز تھی۔ لگتا تھا اس شخص کو باآواز بلند گفتگو کرنے کی ضرورت کبھی نہ پڑتی ہوگی کہ اس کی عام آواز کے ہی سر نہایت صاف تھے اور اس میں دور تک پہنچ جانے کی صفت تھی۔

به گونه ‌می نه پذیرد ز هم دگر تفریق
تجلی تو به دل هم چو مے به جام عقیق

''مرزا صاحب درست گفتید، سبحان اللہ، تجلی معشوق در دل و موج مے در جام یک رتبہ و یک مقام دارند، خوب، خوب گفتید'' نواب یوسف علی خان نے بے ساختہ داد دی۔ مرزا غالب نے متانت سے سلام کر کے داد قبول کی اور اپنی نشست پر کچھ اور سنبھل کر بیٹھے۔ دوسروں کی طرف سے واہ واہ کا شور

ذرا تھما تو اشرف الدولہ نے کہا، ان کی آواز ذرا باریک سی، لیکن بہت صاف تھی:

''قبلہ میرزا صاحب، یہ ''گونہ'' کی لفظ اس مقام پر آپ نے کیا ہی خوب صرف کی! واللہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اور کوئی ہوتا تو ''طرز'' یا ''وضع'' کہتا۔''

فریزر کچھ کہنے والا تھا کہ فینی پارکس، جو ہندی خوب سمجھتی تھی لیکن فارسی سے بے بہرہ تھی، اور شعر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، اشرف الدولہ کی زبان سے ''لفظ'' کی تانیث سن کر چونکی۔ اشرف الدولہ سے اس کی جان پہچان اچھی تھی، اس لئے اسے پوچھنے میں تکلف نہ ہوا:

''جرنیل صاحب، آپ 'لفظ' کو... وہ کیا ہوتا ہے...feminine gender...''

''جنس مونث،'' فریزر نے لقمہ دیا۔

''جی، مونث،'' وہ خوش ہو کر بولی، ''شکریہ، کرنل فریزر... تو اشرف الدولہ آپ نے 'لفظ' کو مونث فرمایا، یا میں غلط سنی؟''

''جی نہیں، فینی میم صاحب، آپ نے ٹھیک سنا۔ آپ الہ آباد میں رہتی ہیں، وہاں اسے مذکر ہی بولتے ہیں، مگر ہم اہل لکھنو کا مسلک اور ہے۔ ہم تو ''لفظ'' کو مونث ہی کہتے ہیں۔ دہلی کا طرز اور ہوگا، کیوں جناب میرزا صاحب؟''

''بجا فرمایا،'' مرزا غالب نے کہا۔ ''ہمارے حساب تو ''لفظ'' کی تذکیر ہی مرجح وانسب ہے۔''

''لغات اردو کی تذکیر و تانیث بڑی پریشان کن ہے۔ اب اسی لفظ ''رتھ'' کو دیکھئے، کوئی اسے مذکر بولتا ہے کوئی مونث۔'' فریزر نے کہا۔ ''مرزا صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟''

''بھئی اس کا تو معاملہ آسان ہے۔ رتھ پر عورتیں سوار ہوں تو مونث، ورنہ مذکر۔'' مرزا غالب نے ہنس کر کہا۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ وزیر چونکہ رتھ پر بیٹھ کر آئی تھی اس لئے دل ہی دل میں تھوڑی جھینپی، لیکن ہنسی میں وہ بھی شریک ہوئی۔ مرزا غالب کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی، گویا اپنے فقرے کی داد پا کر خوش ہوں۔ ان کا طریقہ تھا کہ اپنی ظریفانہ بات پر خود نہ ہنستے تھے بلکہ یوں بیٹھے رہتے تھے جیسے انھوں نے کچھ کیا کہا ہی نہیں۔ قہقہہ ابھی فرو نہ ہوا تھا کہ ولیم فریزر نے مرزا غالب کو یاد دلایا، ''دیکھئے ہمیں ہنسی میں نہ ٹالئے گا۔ ابھی آپ کو دوسرا شعر سنانا باقی ہے۔''

''جی، بے شک۔ بے شک، ابھی عرض کیا، ملاحظہ ہو،'' کہہ کر غالب نے وزیر کی طرف دیکھا

اور شعر پڑھا۔

ترا بہ پہلوے میخانہ جا دہم غالب
بہ شرط آں کہ قناعت کنی بہ بوے رحیق

ہر طرف سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ مرزا غالب نے وزیر خانم کی طرف اشارہ کر کے فریزر سے کہا، ''ولیم فریزر بہادر، جب آپ نے ایک سدا بہار میخانہ مشائی کو میرا ہم بغل کر دیا اور تس پر یہ کہ مینا خانہ فرنگ کی یہ پری میرے ناتواں لبوں سے لگا دی تو یہ میرا شعر جھوٹا کیوں نہ ثابت ہوتا۔ لیکن یہ شیشہ اپنے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اپنا ایک ہندی شعر بھی یاد آیا۔

ہے دور قدح وجہ پریشانی صہبا
یک بار لگا دو خم مے میرے لبوں سے

چلئے، خم مے نہ سہی، مینائے مے سہی۔ اثر تو ایک ہی ہے۔''

وزیر خانم کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں، اس نے شرما کر سر جھکا لیا، لیکن کنکھیوں سے نواب شمس الدین احمد کی طرف دیکھا تو وہ کچھ آشفتہ سے نظر آئے۔ شاید وزیر خانم کے بارے میں ان کے دل میں کچھ خیالات پیدا ہو رہے تھے؟ جہاں تک وزیر سمجھ سکی تھی، ولیم فریزر اس کا خواہاں تھا لیکن اس سے بات کرنے کے لئے مناسب موقعے کی تلاش میں تھا، یا شاید شمس الدین احمد کا رنگ دیکھ کر وہ کچھ لیت و لعل میں پڑ گیا تھا۔ ولیم فریزر کو تو اسے ہر حال میں ٹکا سا جواب ہی دینا تھا، نتیجہ خواہ کچھ ہوتا، لیکن یہ نواب شمس الدین اسے ان نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے اور خود اس کے دل میں کچھ سرگوشیاں سی کیسی تھیں؟

ادھر وہ ان باتوں کو اپنے ذہن میں سلجھانے کی سعی میں تھی، ادھر نواب شمس الدین احمد کچھ بےچین سے نظر آ رہے تھے، جیسے انھیں اٹھنے کی جلدی ہو، لیکن وہ آداب مجلس کا، اور اس سے زیادہ، وزیر کا لحاظ کر رہے ہوں۔ ولیم فریزر کو وہ نجی ملاقاتوں میں 'فریزر چچا جان' کہتے تھے، لیکن جب سے دونوں کے تعلقات میں بگاڑ آنا شروع ہوا تھا، ایسی ملاقاتیں ہی شاذ ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی تھیں۔ سرکاری ملاقاتوں میں ولیم فریزر کو وہ 'نواب ریزیڈنٹ بہادر' کہتے تھے اور فریزر انھیں 'نواب شمس الدین احمد بہادر' کہتا تھا۔ اگر بہت مہربانی جتلانی مقصود ہوتی تو 'دلاور الملک' کہہ کر مخاطب کرتا۔ نواب احمد بخش خان کے خطابات 'فخر الدولہ دلاور الملک' ضرور تھے، لیکن انگریزوں نے شمس الدین احمد خان پر ان خطابات کی توثیق نہ کی تھی۔ شمس الدین احمد نے آپ ہی آپ خود کو 'دلاور الملک' لکھنا اور کہنا شروع کر دیا تھا۔ لہٰذا ولیم

فریزر جب انھیں 'دلاورالملک' کہتا تو گویا لطف خاص کا اظہار کرتا۔

فریزر نے نواب شمس الدین احمد کی طرف نگاہ کی۔ نواب اور مرزا غالب کو یکجا کرنے کا جو بھی اس کا مقصد تھا وہ شاید پورا ہو چکا تھا۔ پھر اس نے نواب کی بےچینی بھی محسوس کر لی اور دل میں خیال کیا کہ اب ذرا ان کی تالیف قلب کی جائے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نواب کے پاس آیا اور وزیر خانم پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر بولا:

''دلاورالملک بہادر ادھر تشریف لائیں، میرے پاس رونق افروز ہوں۔'' نواب شمس الدین احمد کو خیال گذرا کہ شاید یہ مجھے وزیر خانم سے دور کرنے کی ترکیب ہے، وہ انکار کرنے والے تھے کہ فریزر نے مزید کہا۔ ''اور یہ بھی فرمائیں کہ پہلے ماحضر نوش کرنا پسند کریں گے یا میرزا نوشہ صاحب کو سخن سرائی کی زحمت پہلے دے لی جائے؟''

اس التفات خاص پر شمس الدین احمد کے دل کی کھولن کچھ سرد ہوئی۔ پھر انھوں نے یہ بھی خیال کیا کہ وزیر خانم کی طرف راہ سخن وا کرنے کی ایک اور صورت نکل رہی ہے۔ انھوں نے ولیم فریزر کا ہاتھ ظاہر گرم جوشی سے تھام کر کہا:

''بندے کو اس باب میں کچھ ترجیح نہیں نواب ریزیڈنٹ بہادر، جو مزاج عالی ہو۔ لیکن... بی وزیر خانم صاحب کو کہیں دیر نہ ہو جائے...''

نواب کے منھ سے اپنا نام سن کر، اور وہ بھی اس انداز میں گویا نواب کی نظر میں اس کی مرضی کی کچھ اہمیت ہو، وزیر بے اختیار اور نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ جگہ سے اٹھ کر اس نے سلام کئے اور بولی:

''بندی بسر وچشم حاضر رہے گی، سرکار والا تبار کے خدام کا مزاج جو بھی چاہے۔ رہا دیر ہونے کا خدشہ، تو وہ بھی کوئی بات نہیں۔'' اس نے نواب یوسف علی خان کی طرف نظر کی اور کہا، ''بندگان اعلیٰ حضرت کے سائے سائے چلی جاؤں گی۔''

اس کی میٹھی آواز کانوں میں یوں اترتی چلی گئی جیسے بہترین شراب کا مخملی ذائقہ کام و دہن کو شگفتہ کرتا ہوا سینے میں اتر جائے۔ اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی نسوانی کشش کی گرم شعاعوں میں اس کا چہرہ گویا دمک رہا تھا۔ نواب یوسف علی خان کچھ کہنے ہی والے تھے کہ نواب شمس الدین احمد نے وزیر کی طرف پہلو بدل کر کہا:

''اس خدمت کے لئے ہم حاضر ہیں۔ برادر عالی گہر نواب صاحب کی اجازت ضروری ہو تو

امید ہے کہ وہ بھی حاصل ہو سکے گی۔''

نواب یوسف علی خان صاحب نے جواب دیا:

''بے شک، بے شک۔ اور یوں بھی ہماری اور دلاور الملک کی راہیں ایک ہیں، کچھ مشکل نہ ہوگی۔'' یہ جملہ انھوں نے بات بنانے کی خاطر کہا تھا، ورنہ راہیں ان کی جدا جدا تھیں۔ نواب شمس الدین احمد کی ایک کوٹھی دریا گنج میں تھی اور ایک کوٹھی بلی ماراں میں، اور نواب یوسف علی خان کی کوٹھی پل بنگش کی بڑی مسجد سے متصل دوسری سمت میں تراہا بیرم خاں کے پاس تھی۔ بہرحال، بات خوش اسلوبی سے طے ہو گئی۔ فریزر کو البتہ یہ بات پسند نہ آئی کہ شمس الدین احمد خان نے وزیر خانم کو اپنی طرف براہ راست متوجہ کر لیا اور آئندہ ملاقاتوں کے لئے کچھ طرح کشی بھی ہو گئی۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوتا تھا۔ فریزر کو یہ اعتماد بہرحال تھا کہ جاہ و حشمت، اقتدار و ریاست، تجربہ و طاقت ہر چیز میں اسے نواب شمس الدین پر ترجیح تھی۔ اور ابھی تو روز اول کی صبح ہو رہی تھی، ابھی بہت وقت باقی تھا۔ اس نے مرزا غالب کی طرف رخ کر کے کہا:

''مرزا صاحب، کیا میں آپ کو سخن گستری کی زحمت دے سکتا ہوں؟ ہم سب مشتاق ہیں۔''

''جی، حاضر ہوں۔ ابھی پیش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر مرزا صاحب نے اپنا جام سامنے کی چھوٹی تپائی پر رکھ دیا، منھ پر ہاتھ پھیرا، ہاتھ اٹھا کر حضار مجلس کی طرف اشارہ کیا اور بولے۔ ''سخن سنجوں کی محفل ہے، یہاں شعر سنانا موجب لطف کامل ہے۔ نواب ولیم فریزر بہادر کے امتثال امر میں نئی غزل ملاحظہ ہو۔''

ابھی ''بسم اللہ''، ''ارشاد فرمائیے''، ''ہم مشتاق ہیں'' کی صدائیں تھمی نہ تھیں کہ مرزا صاحب نے ''مطلع عرض ہے'' کہہ کر غزل شروع کی۔ ہر طرف سناٹا ہو گیا۔ نوکر بھی اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔ پیچوان کی گڑگڑ خاموش ہو گئی۔ غالب کی آواز میں اب ایک سوز، ایک نئی گہرائی آ گئی تھی۔ لگتا تھا کسی پر اسرار غیر مرئی وجود سے مخاطب ہوں۔

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

''واہ، واہ''، ''خوب، خوب''، کی آوازوں کے اوپر سیف الدین حیدر کی آواز آئی، ''اللہ اللہ، کیا مطلع فرمایا ہے۔ چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر۔ دوبارہ عطا ہو۔''

"میرزا نوشہ، بار دگر زحمت کنید، واللہ درست گفتید۔" فریزر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ غالب نے سلام کر کے مطلع دوبارہ پڑھا اور داد کی طرف دھیان دیے بغیر "حسن مطلع" کہتے ہوئے دوسرا شعر بھی پڑھا۔

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی

پاس بیٹھے ہوئے سامعین نے مصرع اٹھایا، "سبحان اللہ، زمن بہ جرم تپیدن..."

"خوب، 'کنارہ می کردی'، بہت خوب۔ 'جرم تپیدن' داد سے مستغنی ہے۔" اب مرزا غالب نے دوسرا مصرع پڑھا،

بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

اب تو ایسا معلوم ہوا کہ چھت اور ظرف ظروف، شیشہ آلات، سب متزلزل ہو گئے ہیں، کسی کو خبر نہ تھی کہ کون کن لفظوں میں داد دے رہا ہے۔ مرزا صاحب شور سے بے نیاز، سر جھکائے ہوئے، زانو پر ہاتھ مار مار کر مصرع ثانی کو دہرائے جا رہے تھے۔ بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر، بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر، بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر۔ کبھی کبھی وہ صرف گنگنانے لگتے، الفاظ کو پوری طرح ادا بھی نہ کرتے۔ پھر اچانک سر اٹھا کر انھوں نے سارے مجمعے کو دیکھا اور پورا شعر ذرا پست آواز میں پڑھا۔

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

مجمع ایک لمحے کو ساکت ہوا تو انھوں نے اگلا شعر پڑھا۔

گذشتہ کار من از رشک غیر شرمت باد
بہ بزم وصل تو خود را نہ دیدنم بنگر

داد کا شور پھر بلند ہوا تو مرزا صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے التماس کی کہ کلام سن لیجیے، اس قدر داد دی جائے گی تو غزل کیونکر تمام ہووے گی۔ پھر بھی، تھوڑی بہت "احسنت!"؛ "ماشاء اللہ کیا زور بیان ہے، کیا مضمون ہے!"؛ "کیا قافیے ہیں!" اور مصرعے بار بار اٹھائے جانے کی آوازوں کے درمیان انھوں نے شعر پڑھے۔

شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم
نہ دیدن تو شنیدم شنیدنم بنگر

دمید دانہ و بالید و آشیاں گم شد
در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

اس شعر پر بھی مجلس کی بری حالت ہوئی۔ مرزا صاحب نے اہل لکھنؤ کی طرح ہاتھ جوڑ جوڑ کر سلام کئے اور کہا ''طالب عفوم، حلق بندۂ ضعیف خشک می شدہ باشد، مزید تکرار اشعار را طاقت ندارم۔'' لیکن سامعین ہی بے خود ہو ہو کر درانتظار ہما دام چیدنم بنگر، ہائے دمید دانہ و بالید و آشیاں گم شد، ہائے کیا بات کہی مرزا صاحب، درانتظار ہما دام چیدنم بنگر، کی تکرار کرتے جا رہے تھے۔ فینی پارکس بھونچکا ہو کر دیکھ رہی تھی کہ شعر یوں بھی سنتے ہیں اور داد کے ڈونگرے یوں بھی برساتے ہیں۔ میرے ملک میں تو شیکسپیئر کے ڈرامے پر بھی لوگوں کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ سچ ہے اہل ہند کی تہذیبی بنا ہی شاعری پر قائم ہے۔ لوگ کچھ خاموش ہوئے تو مرزا غالب نے غزل پھر شروع کی ۔

نیاز مندی حسرت کشاں نمی دانی
نگاہ من شو و دزدیدہ دیدنم بنگر
اگر ہوائے تماشائے گلستاں داری
بیا و عالم در خوں تپیدنم بنگر

''تپیدنم'' کا قافیہ جس طرح بندھ چکا تھا اس کے اس شعر کا چراغ کیا جلتا، خاص کر جب ''دزدیدہ دیدنم بنگر'' جیسا شعر پہلے گذر چکا تھا۔ لیکن یہاں ایک ذرا سا مکر شاعرانہ تھا، کہ اپنے پاس بلانے کے لئے فقرہ دے رہے ہیں کہ سیر گلشن کرنی ہو تو ہمیں خون میں تڑپتا دیکھ جاؤ۔ اس نکتے کو وزیر خانم نے سمجھا لیکن داد دینے کی ہمت نہ تھی، زیر لب صرف ''بہت خوب'' کہہ کر رہ گئی۔ نواب شمس الدین احمد نے بھی بات کو پا لیا تھا، لیکن وہ خود کھل کر تنہا داد دینا نہ چاہتے تھے، وزیر کی طرف اشارہ کر کے مسکرائے اور بولے:

''اپنے پاس بلانے کے یہ طور آپ پر تو خوب آشکارا ہوں گے۔''

وزیر خانم نے شرما کر سر جھکا لیا لیکن نواب شمس الدین کے فقرے نے اوروں پر بھی شعر کا مضمون روشن کیا تو دوبارہ واہ واہ ہوئی۔ مرزا صاحب نے اگلا شعر پڑھا ۔

جفائے شانہ کتارے گسستہ زاں سر زلف
ز پشت دست بہ دنداں گزیدنم بنگر

اس پر بھی واہ واہ ہوئی۔ جاننے والے جانتے تھے کہ مرزا صاحب اس مضمون کو کئی بار بہت

بہتر باندھ چکے ہیں۔ مرزا صاحب نے اگلا شعر سنایا۔

بہار من شو و گل گل شگفتنم دریاب
بہ خلوتم بر و ساغر کشیدنم بنگر

''بہار من شو'' کا فقرہ بار بار دہرایا گیا اور کسی نے پکار کر کہا، ''سبحان اللہ مرزا صاحب، میر صاحب نے تو معشوق کو'گل گل شگفتہ' کہا تھا، پر آپ نے تو یہ مضمون اپنے ہی اوپر جاری کر لیا، خوب۔ بہت ہی خوب۔''

مرزا صاحب اس نکتہ رسی پر خوش ہو کر مسکرائے۔

''بہت صحیح پہنچے آپ رائے پران کشن صاحب۔ اس شعر میں لفظ'بہار' بھی وہیں سے آیا ہے۔ ہم سب اس خوان یغما سے اپنے اپنے نصیب کا پاتے ہیں۔''

رائے پران کشن کا شمار دہلی کے معززین اور بڑے روسا میں تھا۔ ان کی شعر فہمی کے سب قائل تھے اور فن موسیقی، خاص کر دھرپد سے ان کے شغف کی بنا پر شہر کے تمام بڑے لوگ ان کے دوست تھے۔ سید خواجہ فرید کے بڑے صاحب زادے نواب زین العابدین خان [سید احمد خان کے ماموں] سے ان کی دوستی ضرب المثل تھی۔ ''جی، بہت خوب، ملاحظہ ہو'' کہہ کر رائے پران کشن صاحب نے میر کا شعر پڑھا۔

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ
یک جرعہ ہمدم اور پلا پھر بہار دیکھ

پھر انھوں نے پر جوش لہجے میں کہا: ''کیا خوب مضمون آفرینی ہے میرزا نوشہ صاحب، سبحان اللہ۔'' یہ داد دونوں طرف تھی اور اس کا بھی لطف حاضرین نے اٹھایا۔ اس کے بعد اگلا شعر گویا داد اور صاحب داد دونوں کو خراج تحسین تھا۔

بہ داد من نہ رسیدی ز درد جاں دادم
بہ داد طرز تغافل رسیدنم بنگر

''واللہ کیا تلاش ہے، ایک کی نارسی اور ایک کی دادرسی دونوں آپ ہی اپنا جواب ہیں۔ داد طرز تغافل تو بہت درست، مگر میرزا صاحب ہم تو آپ کی داد کو پہنچے، ہم سے تو آپ کو شکوہ نہ ہونا چاہیئے۔'' فریزر نے کہا۔

''جی بے شک۔ اسی لئے تو اس آستانۂ عالی پر جبہہ سائی کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر غالب نے مقطع

پڑھا جو ایک طرح آج کی محفل اور بانی محفل پر ان کا استدراک بھی تھا کہ اگر آپ قدرداں نہ ہوں تو ہم بھی آپ کی طرف پھٹکنے والے بھی نہیں۔

تواضع نہ کنم بے تواضع غالب
بہ سایۂ خم تیغش خمیدنم بنگر

فریزر ایک معاملہ یاب تھا، فوراً بولا: ''حسب حال شعر کہا مرزا صاحب، کیا خودداریاں ہیں، کیا پاس وضع اور حفظ نفس ہے۔''

اس پر داد کا شور پھر اٹھا، لیکن اس بار کچھ داد فریزر کے لئے بھی تھی۔ یہ بات بھی مگر بعض ہندیوں نے محسوس کی کہ نواب ریزیڈنٹ بہادر نے نکتہ تو پالیا، لیکن مرزا صاحب کی خودداریاں کبھی شکست نہ ہوں گی، اس کی ضامنی نہیں کی۔ یہ لوگ ابھی سے بادشاہ ہوئے جارہے ہیں، وزیر نے دل میں سوچا۔

ولیم فریزر کے خاص آبدار نے مرزا صاحب کے لئے گلاس میں شراب حاضر کی، دوسری طرف سے بھنڈے بردار نے بھنڈا پیش کیا۔ مرزا صاحب نے پورا پیمانہ ایک سانس میں خالی کردیا۔ گیارہ شعر کی غزل، پھر اس قدر تحسین اور ہر شعر کو بار بار پڑھنا، ایک گھڑی سے زیادہ وقت گذر گیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ لوگ تو متمنی تھے کہ ابھی اور سنیں، لیکن دیر کے علاوہ مرزا صاحب میں اب زیادہ حال بھی نہ رہا تھا۔ ان گیارہ شعروں کے کہنے میں اتنی توانائی نہ صرف ہوئی ہوگی جتنی ان کے سنانے میں صرف ہوئی۔ انھوں نے ایک رباعی پڑھ کر اجازت رخصت چاہی۔ رباعی پڑھتے وقت انھوں نے سامنے رکھے ہوئے جام و مینا کی طرف اشارہ کیا۔

چوں درد تہ پیالہ باقیست ہنوز
نازم کہ بہار لالہ باقیست ہنوز
در کیش توکل غم فردا کفر است
یک روزہ مئے دو سالہ باقیست ہنوز

اس حسب حال رباعی پر سب نے دوبارہ غلغلۂ داد بلند کیا۔ ولیم فریزر کا اشارہ پا کر خانساماں نے اطلاع دی کہ ڈنر تیار ہے۔ فریزر نے یک بہ یک ہر مہمان سے کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلنے کی درخواست کی۔ کھانے کا کمرہ بھی کمرۂ ملاقات کی طرح بلند سقف اور وسیع تھا۔ وزیر خانم کو یہ دیکھ کر کچھ تعجب ہوا کہ کھانا میز کرسی پر چھری کانٹے سے کھایا گیا، لیکن کھانا سب ہندوستانی تھا اور خوش ذائقہ تھا۔ ولیم فریزر غیر شادی شدہ تھا اگرچہ چار یا چھ بیبیاں رکھتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی کھانے کی میز پر مدعو نہ تھی۔

دلاور الملک

رات بہت جا چکی تھی جب سواریاں ولیم فریزر کی کوٹھی سے نکلیں۔ نواب شمس الدین احمد خان کے چار مسلح سوار، پھر دو سونٹا بردار، ان کے بعد سروں پر مشعلیں لئے ہوئے دو مشعل بردار، ان کے بعد نواب شمس الدین احمد کی بند بگھی، بگھی پر بھی دو رویہ ایک ایک مہتابی روشن تھی۔ اس کے بعد وزیر خانم کے سونٹا بردار، پھر ان کی رتھ۔ یہ قافلہ آہستہ آہستہ باڑہ ہندو راؤ کی ڈھال سے اتر کر پہاڑ گنج کی طرف چلا۔ نواب شمس الدین احمد خان کے جی میں تھا کہ وزیر کو اپنے ساتھ بگھی کے اندر بٹھائے لے چلیں، لیکن یا رعب حسن، یا ولیم فریزر کے سامنے کچھ تکلف مانع رہا۔ ادھر ولیم فریزر بھی وزیر خانم کو یوں جاتا دیکھ کر کف افسوس مل رہا تھا۔

بادلوں سے ٹپکتی ہوئی دھند ہر طرف پھیل رہی تھی۔ راستے سب سنسان ہو چکے تھے۔ خواجہ باقی باللہ صاحب کی درگاہ پر البتہ ابھی چہل پہل تھی۔ شہر کے جن علاقوں پر بادشاہ کا براہ راست تسلط تھا وہاں، اور خاص کر فتحپوری کی جامع مسجد سے لے کر حویلی تک چاندنی چوک میں، اور علی مردان خاں کی نہر کے کنارے کنارے دونوں طرف روشنی کا انتظام تھا۔ وہ پہاڑ گنج سے نکل کر ترکمان دروازے کی طرف جانے کے بجائے ذرا لمبے راستے سے ہو کر اور کچھ چکر کھا کر فتحپوری کی جامع مسجد کے پیچھے نکلے۔ وہاں سے راستہ آسان تھا لیکن شمس الدین احمد کی سواری کا جلوس سرکی والاں میں وزیر کے دروازے تک ساتھ گیا۔ وزیر جب رتھ سے اتر کر اپنے دروازے کی طرف چلی تو نواب کا ایک سوار بھی گھوڑے سے اتر کر اس کے ساتھ بڑھا۔ اتنے کہ دروازے پر دستک ہو اور دروازہ کھلے، سوار نے جھک کر وزیر کو سلام کیا اور بولا:

"نواب صاحب حضور کا ایک پیغام ہے، گستاخی نہ ہو تو عرض کروں؟"

وزیر کا دل ایک لمحے کو زور سے دھڑکا۔ "فرمایئے۔"

''سرکار نواب دلاور الملک فرماتے ہیں کہ امروز و فردا میں باز دید کی کوئی سبیل نکلے گی؟''

اس استفسار کا مفہوم وزیر پر بالکل عیاں تھا۔ نواب شمس الدین احمد جاننا چاہتے تھے کہ وزیر ان دنوں کسی کی پابند تو نہیں ہے۔

''زہے نصیب۔ سرکار کب تشریف آوری کا خیال رکھتے ہیں؟''

''کل ہی کسی وقت اگر ممکن ہو۔''

''کوئی چار گھڑی دن رہے، اگر سرکار کو فرصت ہو۔''

''بہت بہتر۔ آپ کو صبح اطلاع ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر سوار واپس ہوا۔ ادھر دروازہ بھی کھل چکا تھا، وزیر اندر جا کر سیدھی اپنی خوابگاہ میں چلی گئی۔ اس کا دل امکانات کے تصور سے لبریز تھا۔

صبح کو پہلا کام وزیر نے یہ کیا کہ گھر کی صفائی اور تھوڑی بہت آئین بندی کا اہتمام کیا اور نواب شمس الدین خاں اور ان کے گھرانے کے بارے میں معلومات مختلف ذرائع سے مہیا کیں۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ نواب شمس الدین احمد اور ولیم فریزر کے تعلقات میں تلخی پوری طرح سرایت کر چکی تھی۔ اپنے چھوٹے سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد سے انھوں نے بہت پہلے ہی بگاڑ کر لیا تھا۔ گھر میں دو بیویاں پہلے سے تھیں لیکن ان سے بھی وہ خوش نہ تھے۔ بادشاہ کے یہاں ان کا کچھ رسوخ نہ تھا کہ ان کی دونوں ریاستیں انگریزوں اور پھر الور کے مرحوم راجہ بختاور سنگھ کی مرہون منت تھیں۔ بدیں وجہ سیاسی دنیا اور گھریلو دنیا، دونوں ہی میں وہ تنہا تھے۔ ان کے مزاج میں رعونت، گرمی اور جلد بازی الگ تھی، لہٰذا اپنے ہم چشموں میں بھی کسی کی گہری دوستی نہ حاصل کر سکے تھے۔ ہاں فیاضی اور سیر چشمی اور شجاعت ذاتی کے باعث رعایا اور عوام الناس میں وہ بے حد مقبول تھے۔

لارڈ لیک نے جلدوے حسن خدمت، قدر افزائی، اور اظہار تشکر کے طور پر نواب احمد بخش خان کو وسیع املاک عطا کی تھیں جن میں فیروز پور جھرکہ ایک پوری ریاست کے برابر تھا۔ الور کے مہاراجہ بختاور سنگھ نے بھی اکرام و قدر افزائی کی غرض سے احمد بخش خان کو لوہارو کی ریاست ہی نہیں، اپنی معشوق و محبوب عورت موسی کی بہن مدی بھی انھیں بخش دی۔ انگریزوں نے انھیں فخر الدولہ رستم جنگ کا خطاب دیا تھا، بختاور سنگھ نے انھیں دلاور الملک کا خطاب دیا۔ اس طرح نواب احمد بخش خان اپنے زمانے کے بڑے لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ انگریزوں سے ان کے مراسم دوستانہ اور کم و بیش برابری کے تھے۔

موسی اور مدی کم اصل عورتیں تھیں، ان کے مذہب کے بارے میں بھی ٹھیک سے معلوم نہیں۔ شاید ہندو ہوں گی، کیونکہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ مہاراؤ راجہ بختاور سنگھ کی وفات [۱۸۱۵] پر موسی ان کے ساتھ ستی ہوگئی تھی۔ لیکن حسن صورت، خوش سلیقگی اور اپنے اپنے مرد کو پوری طرح اپنا حلقہ بگوش بنا لینے میں دونوں ہی عدیم المثال تھیں۔ جلد ہی مدی کے بطن سے احمد بخش کے یہاں ایک بیٹا شمس الدین خان، پھر ایک بیٹا ابراہیم علی خان، اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ابراہیم علی خان کی موت طفولیت ہی میں واقع ہوئی۔ اسی اثنا میں احمد بخش خان نے برلاس مغل خاندان کی ایک حسینہ بیگم جان سے شادی کر لی۔ ان کے بطن سے احمد بخش خان کے گھر میں دو بیٹے امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد، اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ شمس الدین احمد سب میں بڑے تو تھے ہی، باپ کی طرح وجیہ اور خوش رو، تحصیل علمی میں بہت ذکی، ذاتی لیاقت اور انتظامی امور کی اہلیت اور استعداد میں طاق، امیرانہ مزاج، اللہ نے انھیں سب کچھ دے رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس بات کا کچھ بھی امکان نہ تھا کہ وہ باپ کی مسند پر متمکن ہو سکیں گے۔ ان کی ماں نہ صرف غیر کفو تھیں، بلکہ نواب کی منکوحہ بھی نہ تھیں۔ سارا گھرانہ ان کے خلاف تھا۔ لیکن مدی نے اپنی حکمت عملی اور احمد بخش خان کو خوش رکھنے میں اپنی جانفشانیوں کے باعث ساری مخالفت کا سد باب کر ڈالا۔ نواب احمد بخش خان نے مدی سے باقاعدہ نکاح کر لیا اور انھیں بہو خانم کا خطاب دے کر اپنی محل ہونے کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ نواب شمس الدین احمد کو فیروز پور جھرکہ کی نوابی کا جانشین بھی مقرر کر دیا۔

اس طرح شمس الدین احمد اور ان کی والدہ کی حیثیت چشم زدن میں سمک سے اٹھ کر ثریا بوس ہوگئی، لیکن بیگم جان اور ان کی اولاد کی ناخوشی اور بھی بڑھ گئی۔ ان کی مخالفتوں کے باوجود احمد بخش خان نے فروری ۱۸۲۵ میں ایک وصیت نامہ ترتیب دے کر اس پر جنرل اختر لونی اور سر چارلس منکاف کی گواہی کرائی۔ اس وصیت نامے کی رو سے احمد بخش خان نے فیروز پور جھرکہ کی مسند پر شمس الدین احمد خان کو اور لوہارو کی مسند پر بیگم جان کے فرزند کلاں امین الدین احمد خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لیکن اس وصیت نے شمس الدین احمد کو مطمئن کیا اور نہ امین الدین احمد خان کی والدہ کو۔ بڑی اولاد صلبی ہونے کی حیثیت سے شمس الدین احمد خان بخیال خود دونوں ریاستوں پر استحقاق رکھتے تھے۔ دوسری طرف، امین الدین احمد خاں اور ان کی والدہ کو زعم تھا کہ شمس الدین احمد خان کی ماں سے ان کے باپ نے شمس الدین احمد خان کی پیدائش کے بعد نکاح کیا تھا۔ لہٰذا شمس الدین احمد خان نہ صرف کم اصل ماں کے بطن سے تھے، بلکہ اس

حدیث کے مصداق بھی تھے جس کی رو سے اولاد اسی کی ہے جس کے بستر پر پیدا ہو۔ لیکن انگریز قانون وراثت کی رو سے غیر منکوحہ عورت کے بطن سے متولد صلبی فرزند نرینہ کا استحقاق باپ کی املاک وترکہ پر اسی قدر اور اسی طرح تھا جس طرح منکوحہ عورت کے بیٹے کا ہوتا ہے، اور انگریزوں میں رائج دوسرے قانون کی رو سے، جسے Primogeniture یعنی جیٹھوانس، یا وراثت خلف اکبر کہتے تھے، بڑا بیٹا باپ کے تمام ترکے کا بلا شرکت غیرے مالک ہوتا تھا۔

احمد بخش خان کے بھی دل کو یہ خلش بار بار سالتی تھی کہ میرا گردن افراز اور خودسر بڑا بیٹا میرے بعد اپنے سوتیلے بھائیوں کو چین سے نہ رہنے دے گا اور نہ ہی اس کے سوتیلے بھائی اس کے ساتھ وہ مواخات اور تعظیم برتیں گے اولاد اکبر ہونے کی وجہ سے جس کا استحقاق وہ رکھتا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ معاملے کو کس طرح سر بر کیا جائے کہ میرے بعد میرے بیٹوں کی دولت، لیاقت، اور عزت آپسی مناقشوں میں ضائع نہ ہو کہ جنرل اختر لونی کا انتقال ہو گیا (جون ۱۸۲۵ء) تمام انگریز زعما و حکام میں وہی ایک ایسا تھا جس پر احمد بخش خاں کو پورا اعتماد تھا کہ وہ میرے خانوادے کا بے لوث بہی خواہ اور میری اولاد کا سچا مربی ثابت ہوگا۔ چارلس منکاف سے بھی ان کے مراسم شگفتہ تھے لیکن اختر لونی والی بات نہ تھی، کہ اختر لونی نے خود کو پوری طرح ہندی رنگ میں رنگ لیا تھا اور یہاں کے امرا و فضلا کے مزاج و منہاج سے ہمدردانہ واقفیت رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف چارلس منکاف ''نئی نسل'' کا انگریز تھا، یعنی اس نسل کا جسے یقین تھا کہ ہمیں اہل ہند کی بہبودی کی خاطر ان پر راج کرنا ہے۔ طبائع اور لائحۂ حیات کے اس اختلاف کے باعث اہل ہند میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے یہ گمان ہو کہ ہندی فرنگی بھائی بھائی بن کر رہ سکتے ہیں۔

فرنگی حاکموں کی ''نئی نسل'' کا ہونے کے باوجود اختر لونی کی تربیت اور سکندر صاحب (۱) کے گھرانے سے اس کے ربط ضبط کی وجہ سے ولیم فریزر کا طرز معاشرت البتہ پرانے انگریزوں سے، لہٰذا ہندوستانیوں سے، قریب تر تھا۔ احمد بخش خان کے بچے اسے ''چچا جان'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اختر لونی کے گذرنے پر احمد بخش خان کے دل میں پرانے اندیشے اور بھی قوی ہو گئے۔ انھیں زیادہ توقع اس

---

(۱) ''سکندر صاحب'' کا اصل نام جیمس اسکنر (James Skinner) تھا۔ اس کے ایک بیٹے الکزنڈر (Alexander) عرف ایلک صاحب (Alec Sahib) کو وزیر کی بیٹی سوفیہ کا شوہر بننا تھا، لیکن وہ بات ابھی بہت دور مستقبل میں تھی۔ جیمس اسکنر کو آج کی زبان میں اینگلو انڈین کہا جائے گا۔ شروع شروع میں ایسے لوگ East-Indian کہلاتے تھے، لیکن جلدی Eurasian کہے جانے لگے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں Anglo-Indian کی اصطلاح مقبول ہوئی، لیکن تحقیر، یا بےزاری کے لہجے میں انھیں انگریز حلقوں میں Coloured یا Half Caste بھی کہا جاتا تھا۔ وزیر خانم کے زمانے میں Eurasian کی اصطلاح عام تھی۔

بات کی نہ تھی کہ شمس الدین احمد کی جاہ طلب طبیعت اسے میرے بعد اپنے علاتی بھائی بہنوں کے ساتھ پورا انصاف کرنے دے گی۔ نہ انھیں اس بات کا پورا بھروسا تھا کہ اختر لونی کی طرح چارلس مٹکاف بھی میرے تمام فیصلوں اور ارادوں کو قوت سے فعل میں منتقل کرنے کے لئے پوری طرح ساعی اور موثر ہو گا۔ لہٰذا ایک رات (اکتوبر ۱۸۲۶) انھوں نے سر چارلس مٹکاف کی اپنے یہاں دعوت کی اور ریاست و ریزیڈنٹی کے دیگر عمائد کے سامنے کاروبار حکومت سے دست بردار ہو کر فیروز پور جھرکہ کی کلید حکومت شمس الدین احمد کے حوالے کی اور لوہارو مع پرگنہ پہاسو کا نظم و نسق امین الدین احمد کے سپرد کر دیا اور چارلس مٹکاف سے وعدہ لے لیا کہ میرے بعد بھی یہی انتظام رہے گا۔

اس عہد بندی کے ٹھیک ایک سال بعد فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان رستم جنگ نے دار المنافات سے دار المکافات کی راہ لی۔ کچھ عرصے تک باپ کا غم منانے کے بعد شمس الدین احمد نے سرکار کمپنی بہادر میں درخواست گذاری کہ میرے باپ نے ریاست کی تقسیم درست نہیں کی ہے۔ خلف اکبر کی حیثیت سے دونوں ریاستیں مجھے ملنی چاہئیں۔ اس دعوے کی دلیل میں انھوں نے انگریزوں کے قانون وراثت سے نظیر پیش کی کہ جب حاکم قوم کے یہاں خلف اکبر کی جانشینی کا رواج ہے تو محکوم قوم میں بھی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ دلیل مسموع نہ ہوئی اور احمد بخش خان کا قائم کردہ انتظام باقی رہا۔

شمس الدین احمد خان نے پھر بھی اپنی کوششیں اور پیروی جاری رکھی، حتیٰ کہ چارلس مٹکاف کے بعد تیسرے ریزیڈنٹ فرانسس ہاکنس (Francis Hawkins) نے نواب گورنر جنرل کے دفتر میں شمس الدین احمد خان کے موافق رپورٹ دے کر حالات کو پلٹ دیا۔ امین الدین احمد اور ان کی والدہ بے دخل کر دیئے گئے اور لوہارو کا علاقہ بھی شمس الدین احمد کو مل گیا۔ لیکن امین الدین احمد اور ان کی والدہ نے اپنے علاقہ جات کی واپسی کے لئے تگ و دو برقرار رکھی، حتیٰ کہ ان کی خوش نصیبی سے ولیم فریزر کا بعہدۂ ریزیڈنٹی تقرر ہو گیا۔ فریزر کو پرانے حالات سب معلوم تھے لہٰذا اس نے امین الدین احمد اور ان کی والدہ کے معاملے پر ہمدردی کی نگاہ ڈالی اور کلکتہ کے دفتر کو جدید رپورٹ بھیجی کہ پچھلا فیصلہ مبنی بر حقائق نہ تھا، لوہارو کی عملداری امین الدین احمد کو واپس دلائی جائے۔ ادھر شمس الدین احمد کو گمان تھا کہ جس شخص کو میں ''چچا جان'' کہتا ہوں اسے چاہیئے تھا کہ میری جنبہ داری کرتا نہ کہ میرے حریف بھائیوں کی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ دونوں کے تعلقات کشیدہ ہوتے چلے گئے۔

مرزا غالب کو بھی احمد بخش خان سے شکایت تھی۔ اس کی کہانی لمبی ہے اور لب لباب اس کا یہ

ہے کہ مرزا غالب کے گھر والوں کے لئے انگریزوں کی ہدایت پر احمد بخش خان نے اپنی ریاست سے جو پانچ ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا وہ بقول مرزا غالب بہت کم تھا۔ مرزا صاحب کا کہنا یہ بھی تھا کہ اس قلیل رقم میں نواب احمد بخش خان نے خواجہ حاجی نامی ایک مرد مجہول کو دو ہزار سالانہ کا حصہ بنا دیا تھا۔ بقول میرزا اسد اللہ خان یہ غیر منصفانہ بات تھی کیونکہ خواجہ حاجی کا کوئی نسبی تعلق غالب کے باپ یا چچا سے نہ تھا، اور سببی تعلق بھی جو تھا تو وہ بہت ضعیف تھا۔ خواجہ حاجی کچھ نہ تھا، میرزا قوقان بیگ خان یعنی غالب کے دادا کی بیوی کی ایک بیوہ ہمشیرہ کی بیٹی (یعنی مرزا قوقان بیگ خان کی بیوی کی بھانجی) کا بیٹا تھا۔ ایک مجہول الاحوال شخص خواجہ مرزا پانچ روپے مہینے پر بصیغۂ بارگیری وسیسی میرزا قوقان بیگ کے اصطبل میں ملازم تھا۔ غالب کے دادا نے از راہ پرورش اس کا نکاح اپنی بیوی کی اسی یتیم بھانجی سے کر دیا تھا۔ خواجہ حاجی اسی عقد کا ثمرہ تھا۔

مرزا غالب کا بیان یہ تھا کہ دادا کے بعد میرے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خان ہم سب کے کفیل تھے۔ حادثۂ ناگہانی میں میرزا نصر اللہ بیگ خان کی موت کے بعد ہماری تنہائی اور بے کسی سے فائدہ اٹھا کر خواجہ حاجی نے ہمارے خیام لوٹ لئے اور میرزائے مرحوم کے کیمپ کا سارا سامان، حتیٰ کہ خیمے اور چھولداریاں، پالکیاں، فرش فروش سب لوٹ لیا اور اونٹوں پر بار کر کے نواب احمد بخش خان کی خدمت میں بطریق نذر پیش کر دیا۔ احمد بخش خان نے اس غداری کا انعام خواجہ حاجی کو یہ دیا کہ اسے نصر اللہ بیگ خان کے پسماندگان میں شمار کرایا اور وظیفۂ انگریزی کی ایک تہائی سے بھی زیادہ رقم اسے اور اس کے بعد اس کے بیٹوں کو دلوا دی۔

میرزا غالب نے اس معاملے میں کلکتہ جا کر مرافعہ کیا اور اپنے عرضی دعویٰ میں نواب شمس الدین احمد خان کے خلاف بھی بہت کچھ کوائف درج کئے۔ صد ہزار کوشش کے باوجود ان کا مرافعہ خارج ہو گیا۔ انگریز کی شکایت تو وہ کیا کرتے، دودمان احمد بخش خان کی شاخ شمس الدینی سے ان کی شکایت برقرار رہی۔ نواب شمس الدین احمد خان کے بھی دل میں میرزا غالب کی طرف سے گرہ پڑ گئی جو کبھی کھل نہ سکی اور نہ طرفین میں اصلاح ذات البین کے لئے کسی نے کوئی کوشش ہی کی۔ یہ سب اس بات کے باوجود کہ مرزا غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خان کو نواب احمد بخش خان کی ایک سگی بہن بیاہی تھیں اور نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی میرزا الٰہی بخش معروف (۱) کی بیٹی امراؤ بیگم کا عقد مرزا غالب سے ہوا تھا۔

(۱) مولانا محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں انھیں احمد بخش خان کا بڑا بھائی لکھا ہے۔ یہ درست نہیں۔

ظاہر ہے نواب شمس الدین احمد خان کے لئے یہ وقت ایسا نہ تھا کہ معاملات دل کا ایک روگ لگا لیں۔ لیکن عشق ازیں بسیار کردہ ست وکند۔ ادھر وزیر بھی اپنے خیالوں میں گم تھی کہ میری بساط عمر پر ایک نیا شہزادہ آفتاب صفت طلوع ہونے والا ہے۔ مارسٹن بلیک اسے پیادہ صفت تنہا چھوڑ گیا تھا اور اسے نہ جائے رفتن نظر آتی تھی نہ پائے ماندن ہی کہیں دور دور تک ممکن تھا۔ بچوں کا خیال اسے اور بھی سوہان روح تھا۔ کس طرح انھیں پالوں جلاؤں تربیت کروں راہ سے بے راہ نہ ہونے دوں۔ انگریز تو وہ ہو ہی جائیں گے لیکن اپنی ماں کو ماں سمجھیں، اپنے دیس اپنی مٹی کی بو باس پہچانیں۔ ایسا ہو کہ انھیں سمندر پار ولایت بھی جا کر رہنا پڑے تو اپنے گھر کو بھول نہ جائیں۔ اور یہ بھی کیا پتہ کہ نواب صاحب استمراری طور پر مجھے مستحکم قبول ہی کر لیں۔ کیا معلوم صرف چند دنوں کا دل بہلاوا چاہتے ہوں۔ لیکن میں تو ان شرائط پر راضی ہونے والی نہیں۔

نواب شمس الدین احمد کا انجام کیا ہونا تھا، اس کا خفیف ترین بھی گمان کسی کو نہ تھا۔ اس وقت تو وہ فیروز پور جھرکہ اور لوہارو پر بلا شرکت غیرے متصرف تھے۔ بجا کہ انگریز ریزیڈنٹ سے ان کی بنتی نہ تھی اور اس نے ان کے خلاف رپٹ سرکار کلکتہ کو بھیجی تھی، لیکن یہ تو راج کاج کے معاملے تھے۔ یہاں ایسی اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ آخر کول بروک صاحب ریزیڈنٹ نے بھی تو نواب صاحب کے برخلاف کیفیت لکھی تھی۔ تو کیا ہوا، ہاکنس صاحب نے آکر سب ٹھیک کر دیا۔ فرض کردم فریزر صاحب نے کچھ ناموافق لکھا بھی تو فریزر صاحب سدا کو تھوڑا ہی رہیں گے۔ اگلا کوئی آئے گا معاملات کو پھر ٹھیک کر دے گا۔ پھر دلی کی بادشاہی بھی تو ہے۔ کیا پتہ کل کلاں مراٹھوں یا کسی اور کے بل پر اعلیٰ حضرت کا اقتدار ملک میں دوبارہ ہر طرف ہو جائے، اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ کیا پتہ اللہ میاں کو رحم آ ہی جائے۔ اسے حکیم مومن خاں صاحب کے نعتیہ قصیدے کے شعر یاد آئے۔

اے جسم تو جان آفرینش
جان تو جہان آفرینش
ایں عیسویاں بہ لب رسانند
جان من و جان آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی
فارغ ز فغان آفرینش

برخیز کہ شور کفر برخاست

اے فتنہ نشان آفرینش

حکیم مومن خان صاحب بڑے بڑے مولاناؤں کے یہاں نشست و برخاست رکھتے تھے۔ ان کی دعا میں کچھ تو اثر ہوگا۔

نواب شمس الدین خان کا خوشرو اور وجیہ تشخص، ان کا رئیسانہ رکھ رکھاؤ، ان کے اخلاق، یہ سب چھوٹی بیگم کے دل میں گھر تو کر گئے تھے، لیکن کیا اس کا دل بھی ان کے وہاں اٹک گیا تھا؟ پتہ نہیں۔ پتہ نہیں اسے بلاک صاحب سے کتنی گہری محبت تھی۔ ان کی موت پر وہ روئی تو بہت تھی لیکن شاید وہ صرف مارسٹن بلیک پر نہیں رو رہی تھی۔ اس کی تقدیر، اس کے بچے، دہلی میں اس کا گھر جسے اب وہ گھر نہ کہہ سکتی تھی، وہ ان سب کی نوحہ گر تھی۔ لیکن بلاک صاحب پھر بھی اسے پیارے لگتے تھے۔ اور نواب شمس الدین احمد؟ ان سے وہ کچھ ڈرتی بھی تھی، حالانکہ بلاک صاحب سے اسے کبھی ڈر نہ لگا تھا۔ نواب صاحب ہزار اس کے ہم قوم تھے لیکن خدا معلوم ان کا رعب اس پر بہت تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر نواب صاحب سے کوئی رشتہ رکھنا ہے تو اپنے دل سے ان کا رعب نکال ڈالنا ہوگا۔

صبح کو نواب شمس الدین احمد کے چوبدار نے آکر اطلاع دی کہ نواب صاحب بعد نماز عصر جلوہ افروز ہوں گے، امید کہ خانم صاحب کو اس وقت فرصت ہوگی۔ وزیر نے جواباً کہلا دیا کہ ضرور تشریف لائیں بندی کے دیدہ و دل ابھی سے فرش راہ ہیں۔ چوب دار نے سلام کیا اور انعام لے کر رخصت ہوا۔ اس ارادے کے باوجود کہ میں نواب صاحب کے رعب میں نہ آؤں گی، اس کا دل پھر دھڑکنے لگا کہ خدا جانے کس طرح انھیں برتوں کہ اپنی بات ہیٹی نہ ہو اور انھیں بھی آزردگی نہ ہو۔ نواب کی آمد کی تیاریوں اور اپنے کو درست و آراستہ کرنے میں وقت کس طرح نکل گیا، اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ عمدہ خانم سے کچھ گر گیان پوچھ لیتی تو اچھا ہوتا۔

وقت مقررہ پر کچھ ہی پل گذرے ہوں گے کہ سرکی والاں میں ''ہٹو! بچو!'' کا شور بلند ہوا۔ نواب صاحب کی انگریزی وضع کی گھوڑا گاڑی میں چار عربی گھوڑے جتے ہوئے تھے، باہری اونچے بکس پر گاڑی بان سرخ بانات کے بانہ ہائے سیسی میں ملبوس، گھوڑوں کے سر پر طاؤسی طرے، منھ پر ریشمی پوزی، سنہری دمچیاں، گاڑی بان کے ایک ہاتھ میں مرصع لگام، دوسرے میں چابک۔ گاڑی کے آگے چار

مسلح سوار، پیچھے چار مسلح سوار، دونوں طرف دو سونٹا بردار تیز قدم چل رہے تھے۔ نواب صاحب پوری شان سے اترے۔ صدر دروازے پر وزیر نے خود تعظیم کی، جھک کر مبارک سلامت کہا، چاندی کے گلاب پاش سے ان کے کپڑوں پر ہلکے عطر کی پھوار ڈالی، گلے میں ہار ڈالا اور کہا:

''اے آمدنت باعث دلشادی ما۔ زہے نصیب کہ آپ کے قدم اس حقیر کفش خانے تک پہنچے، ہم تنہا نشینوں کا نصیبہ جاگا۔ بسم اللہ تشریف لائیے۔''

نواب نے اپنے گلے سے موتیوں کی ایک لڑ اتار کر وزیر کے سر پر آہستگی سے لپیٹ دی اور مسکرا کر بولے:

''علیٰ ہٰذا القیاس مجھے بھی یہاں آکر دلی مسرت ہوئی۔''

نواب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے وزیر انھیں اپنے چھوٹے سے دیوان خانے میں لائی۔ نواب ہر چیز کو بغور دیکھتے تھے گویا گھر والی کا سگھڑاپا اور سامان کی قیمت آنک رہے ہوں۔ وزیر کے پاس مارسٹن بلیک کی حویلی کا بہت سارا سامان تو تھا ہی، اسے گھر ٹھیک سے رکھنے کا طور بھی خوب آتا تھا، اور اس نے مارسٹن بلیک اور اے بی میم صاحب سے اس باب میں بہت کچھ سیکھا بھی تھا، کہ گھر کی آرائش کا صاحب ثروت انگریزوں کو بھی اچھا ذوق تھا۔

وزیر کے گھر کی ہر چیز میں نفاست اور صفائی ستھرائی تھی، ایک خاموش خاموش سی آرائش جو دکھاوے یا پھوہڑ پن سے کوسوں دور تھی، اور ان سے بھی بڑھ کر یہ ہنر تھا کہ جو چیز جہاں رکھ دی گئی تھی، چاہے آئینہ ہو یا تصویر یا کوئی گلدستہ، ایسا لگتا تھا کہ بس وہیں کے لئے بنی ہے۔ انگریزوں میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ گھر کو عجائبات وغرائبات کا مجموعہ بنا دیتے تھے۔ لگتا تھا کہ جو چیز جہاں پائی اٹھالی اور لا کر گھر میں کہیں ڈال دیا، وہاں اس کے لئے ضرورت یا جگہ ہو یا نہ ہو۔ ان کی دیکھا دیکھی بعض ہندوستانیوں، خاص کر لکھنؤ کے امرا کو بھی یہ شوق لگ گیا تھا۔ اور لطف یہ تھا کہ انگریز صاحب لوگ ہندوستانیوں کی اس خصلت پر ریش خندی کرتے تھے اور یہ نہ خیال کرتے تھے کہ یہ تو انھیں کی دیکھا دیکھی ہے۔ فینی پارکس نے اشرف الدولہ اور ان کے باپ منتظم الدولہ حکیم مہدی کے بارے میں وزیر کو باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ فتح گڈھ کی ان کی محل سرا میں اتنا اور اس تنوع کا سامان ٹھسا ہوا تھا کہ کھڑے ہونے کی جگہ مشکل سے ملتی تھی۔ خیر، وزیر کے گھر میں حسن انتظام، اور خوش سلیقگی کے شواہد جگہ جگہ موجود تھے۔

دیوان خانے کی کیفیت یہ تھی کہ ڈیوڑھی سے نکل کر دائیں طرف دالان تھا، اس کے سامنے

آنگن اور دالان کے دوسرے سرے پر مستطیل کمرہ تھا جو لمبائی میں چوڑائی سے کچھ ہی زیادہ تھا۔ سارے کمرے میں قالین کا فرش تھا جس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں چاندنی کے اوپر پھر قالین پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں چار دروازے اور دو کھڑکیاں تھیں۔ دو دروازے اور دونوں کھڑکیاں شرق رویہ تھیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر نہایت باریک کام کی چلونیں پڑی ہوئی تھیں جن سے روشنی تو چھن کر آجاتی تھیں لیکن باہر والے کو کچھ دکھائی نہ دے سکتا تھا۔ ایک بڑا ابلوری جھاڑ چھت سے آویزاں تھا، فرش پر رات کو کنول بھی لگتے ہوں گے لیکن اس وقت روشنی کا مزید انتظام نہ تھا کیونکہ کمرے میں قدرتی روشنی اچھی خاصی تھی، اگرچہ زوال آفتاب کو خاصا وقت گذر چکا تھا۔ کمرے کے مغربی سرے پر، یعنی صدر دروازے کے ٹھیک سامنے صدر گاہ تھی۔ کمرے کی پوری چوڑائی میں دو موٹے گدے بچھے ہوئے تھے، ان پر کشمیری قالین تھے۔ اس طرح کمرے کا یہ حصہ کمرے کی عام سطح سے کچھ اونچا اور نمایاں ہو گیا تھا۔ دیوار سے لگے ہوئے دو زربفتی گاو تکیے، سامنے چاندی کا اگال دان، بغل میں چاندی کا خاصدان پانوں سے بھرا ہوا، ایک چھوٹی کشتی میں عطر کی ننھی ننھی شیشیاں، ایک بڑی کشتی میں چھوٹی چھوٹی پیالیاں جن میں کشمش، چلغوزے، بادام، پستے، اور چاندی کا ورق لپیٹی ہوئی الائچیاں تھیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ تازہ گلاب کے ہار اور طاقوں میں گلدستے تھے۔

نواب کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وزیر انھیں صدر تک لائی۔ انھیں بٹھا کر وہ خود ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دن کی روشنی میں نواب کل رات سے بھی زیادہ خوش رو لگ رہے تھے۔ آج ان کے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی، اس کھنچاؤ اور تناؤ کا پتہ نہ تھا جو کل ان کی حرکات وسکنات سے تقریباً سارے ہی وقت عیاں تھا۔ ان کا لباس کل ہی کی طرح کا تھا لیکن پستئی رنگ کے جامہ وار کا چغہ انھوں نے آج اس کے اوپر ڈال لیا تھا۔ اس وقت تو ان کے منہ پر کچھ ایسی بہار تھی جیسی دور تک پھیلے ہوئے اور پھولوں بھرے سرسوں کے کھیت پر غروب آفتاب کے ذرا پہلے ہوتی ہے۔ گورے دمکتے ہوئے تبسم کناں منہ پر پستئی چغہ بھی اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔

''بھئی واللہ وزیر خانم یہ کیسا امتحان جذب دل تھا جو ہمیں کشاں کشاں تمھارے در تک لے آیا۔'' نواب دوزانو بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کے انداز نشست و گفتگو میں عاجزی اور فروتنی نہ تھی، ایک طرح کی بے تکلفی اور یگانگت تھی۔ وزیر کے جسم کی گرمیاں ان پر ہلکے سرور کا سا اثر پیدا کر رہی تھیں۔ جب وزیر نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا تو ان کے جی میں آئی تھی کہ بس یہیں اسی وقت اسے آغوش میں بھر

لیں اور اٹھا کر اپنی بگھی میں بٹھالیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان کے آداب کے منافی تھا۔ اس وقت بھی ان کا جی چاہتا تھا کہ وزیر کو بغل میں بٹھالیں لیکن شرط اول قدم وزیر کی طرف سے تھی۔

''نواب صاحب، وہ جو کہا گیا تھا کہ کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید تو میں اسی پر متعجب ہوتی تھی لیکن آج میں کس طرح اپنی آنکھوں پر یقین کروں کہ نصف النہار کا شمس میری دہلیز کو منور کر رہا ہے۔''

''لیکن تمھارا چہرہ تو خود شمس بازغہ ہے۔ بھئی واللہ یہ سنہرا باریک دوپٹہ تو تمھارے روے زیبا کے چاروں طرف ابر زرتار کی طرح ہے۔ کاش یہ بادل چھٹے اور مطلع رخ و بیاض گردن کا نور ہماری آنکھیں روشن کرے۔ بھئی واللہ۔''

وزیر نے مارسٹن بلیک تو کیا، نواب یوسف علی خان سے بھی ایسے شگفتہ جملے اور برجستہ فقرے نہ سنے تھے۔ اور نواب کے لہجہ و آواز میں میوات کا کھڑتل پنا قطعاً نہ تھا۔ اس کے برعکس ان کے گلے میں برج بھاشا کا لوچ اور نزاکت تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کی ماں راجپوتانے کے اس علاقے کی تھیں جو برج نگری کے بالکل متصل ہے اور وہاں کی راجستھانی میں برج کا سنہری رنگ یوں جھلکتا تھا جیسے پانی کے گھریلو چشمے میں پلتی ہوئی سنہری مچھلیاں جھمکتی ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ نواب کی دائی پلائی اور دائی کھلائی دونوں سہارن پور اور مظفر نگر کے شریف لیکن غریب مسلمان گھرانوں کی بیٹیاں تھیں۔ وہ چھوٹی عمر کی تھیں کہ ڈاکو انھیں کہیں کسی میلے سے اٹھا لائے اور نواب احمد بخش خان کے یہاں اونے پونے بیچ گئے تھے۔

''سرکار کی نگاہ باریک بیں وہاں بھی خوبیاں دیکھ لیتی ہے جہاں کچھ نہیں ہوتا، اسے نواب کی رعایا پروری نہ کہوں تو کیا کہوں۔'' وزیر نے جواب دیا۔

''تم نے تو پورے مہتاب کی طرح اس گھر کو روشن کر رکھا ہے۔ اس میں باریک بینی کی کیا بات ہے۔ اندھا ہی ہو جو تمھاری خوبیاں نہ دیکھ پائے۔ ہمارا بس چلے تو تمھیں چادر مہتاب کی طرح اوڑھ کر سو جائیں۔''

''سرکار نے مجھے چاند کہا، میری توقیر کی۔ لیکن عالی جاہ تو شمس ریاست اور مہر امارت ہیں، سورج کے آگے چاند کی کچھ حیثیت نہیں۔ عالی جاہ نے ضرور سنا ہوگا، نور القمر مستفید من الشمس۔ سورج اپنی منزل میں چلا جائے گا اور چادر مہتاب لپٹی لپٹائی دھری رہ جائے گی۔''

''بھئی واللہ۔ آپ کے فقرے کیا ہیں، فقرہ بازیاں ہیں۔ کہیں ان فقروں میں آپ ہمیں اڑا

ہی نہ دیں۔'' نواب نے ہنس کر کہا۔

''سرکار ہم تو خود پرکاہ ہیں، حضور کی نسیم شفقت کے منتظر ہیں کہ ہمیں اڑا لے جائے اور آسودۂ منزل کردے۔''

''اور منزل کہاں ہے آپ کی، یہ تو بتایا نہیں آپ نے۔''

''پرکاہ کی منزل کیا، ترو تازہ ہو تو گلدستہ، خشک اور خزاں رسیدہ ہو تو گلخن۔''

''لیکن آپ نہ پرکاہ ہیں نہ خزاں رسیدہ۔ ابھی تو آپ پر ٹھیک سے بہار آئی ہی نہیں۔''

وزیر نے مسکرا کر سر جھکا لیا اور طالب آملی کا شعر پڑھا۔

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

نواب شعر سن کر پھڑک گئے۔ یہ بھی تھا کہ اس سے زیادہ کھلی ہوئی دعوت نہ وزیر کی طرف سے ممکن تھی اور نہ نواب کو قبول ہوتی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا مدعا ٹھیک پڑھ لیا تھا۔ نواب نے اپنے گلے سے مالائے مروارید اتار کر وزیر کی طرف بڑھائی۔

''چھوٹی بیگم، سبحان اللہ کیا پاکیزہ بات تم نے کہی بھئی واللہ۔ یہ لو، ہماری طرف سے قبول کرو۔''

نواب منتظر تھے کہ اب وزیر کیا کہتی یا کرتی ہے۔ ''چھوٹی بیگم'' کہہ کر پکارنے کی معنویت شاید اس پر عیاں ہو، شاید نہ ہو۔ اگر وزیر انتظار کرتی ہے کہ نواب نیم قد ہو کر ایک قدم بڑھیں، تو ظاہر ہے کہ نواب کے لئے یہ ناممکن تھا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ گذشتہ تمام گفتگو کی منسوخی کے مترادف ہوتا۔ یعنی اس کا مطلب یہ نکلتا کہ وزیر اب تک صرف چہلیں کر رہی تھی، کوئی پائدار تعلق اس کے مطمح نظر نہ تھا۔ اگر وزیر اشارہ کرتی ہے کہ ہار کو اس کی طرف اچھال دیا جائے تو اس کے معنی یہ تھے کہ اسے نوکری منظور تھی، لیکن اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ اور اگر وزیر خود ہی نواب کی طرف بڑھتی ہے اور ہار قبول کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ....

نواب ابھی سوچ ہی میں تھے کہ اگر وزیر میری طرف بڑھتی ہے تو اس کے کیا معنی نکالے جائیں کہ وزیر نے اپنی جگہ پر دوزانو ہو کر جھک کر ہاتھ بڑھایا اور نواب کے ہاتھ سے ہار لے لیا، اسے آنکھوں سے لگایا اور گلے میں ڈال لیا۔ اب وہ نواب کے نزدیک تھی، لیکن یہ بات صاف تھی کہ وہ خود سے اس سے زیادہ آگے بڑھنے والی نہ تھی۔ نواب نے اسے غور سے دیکھا اور اس کے عندیے کو سمجھنے کی کوشش

کی۔ گویا ایک شطرنج کا کھیل تھا جو وہ کھیل رہے تھے اور دونوں کی ہر ہر بات بہت سوچی اور تولی ہوئی تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ دونوں چاہتے تھے کہ کھیل کا انجام حسب دلخواہ ہو، لیکن کوئی بھی غلط اشارہ، یا بات کو غیر ضروری طول دینے کا انداز کھیل کو خراب بھی کر سکتا تھا۔ نواب نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے وزیر کا شانہ چھوا اور سنجیدہ لہجے میں کہا:

''آؤ، ادھر آ جاؤ۔ ذرا دیکھوں وہ ہار تمھارے گلے میں کیسا لگتا ہے۔''

''میں زیادہ قریب کیونکے آسکوں ہوں سرکار۔ ادب آب حیات آشنائی ست۔'' وزیر نے اپنی جگہ سے ذرا کھسک کر نواب کے قریب آتے ہوئے کہا۔ اب بھی دونوں کے درمیان ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کا فاصلہ تھا، لیکن دونوں کے چہروں پر اشتیاق کی لالی بھی لہریں مار رہی تھی۔ لفظ ''آشنائی'' نے ایک اور دروازہ کھول دیا تھا۔ نواب نے ہاتھ بڑھا کر ہلکے سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا، پھر اس کے منھ کو ذرا اوپر اٹھایا اور کہا:

''آشنائی میں تو بحر حسن میں پیرنے کی بھی دعوتیں ہیں، پھر ادب کہاں؟ شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی۔ ہم تو بے خطر گرداب میں کود پڑنے کے قائل ہیں۔ ذرا سنیے کوئی کیا کہتا ہے۔

گر حسن تو ایں چنیں فزوں خواہد شد
کار ہمہ کس مشق جنوں خواہد شد
در بحر غمت کشتی عقل صد نوح
مانند حباب سرنگوں خواہد شد

بھئی واللہ۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے کہ ہم ڈوبیں یا تریں۔''

''کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش!'' وزیر نے ہنس کر کہا۔

''جو کچھ ہے آپ ہی کا ہے۔'' نواب نے اس کے لب و رخسار کو ہلکے سے چھوتے ہوئے کہا۔ ''راز بھی آپ کے، راز داں بھی آپ کا۔ ہمارے لئے تو آپ رازوں کا ایک پراسرار دریا ہیں وزیر خانم۔ ہم بے سہارا آپ کے دریائے حسن اور اپنے دریائے شوق میں بہے جاتے ہیں۔

ایسے دریا میں بہ چلے ہیں آہ
جس میں تاپو نہیں ہے ناؤ نہیں

''عالی جاہ، آپ ہی دریا ہیں آپ ہی تاپو۔''

’’بھئی واللہ ہمارے لئے سر ٹکنے کی جگہ تو آپ ہی کے پاس ہے۔‘‘

شمس الدین احمد نے وزیر کی طرف اس طرح دیکھا کہ ان کی آنکھ وزیر کی گردن اور وادی شانہ پر تھی جہاں سے بھاری انگیا کے نیچے کنٹھے اور باریک کرتی کی آڑ میں سے نرم گلابی سرسبز پر بہار پہاڑیوں کا ارتفاع صاف جھلک رہا تھا۔ دو بچوں کی پیدائش کے باوجود وزیر کا بدن ڈھیلا نہ ہوا تھا، کولھے اور سینہ البتہ اور بھاری ہو گئے تھے۔ وزیر نے اس وقت اپنے بدن کو کچھ اس طرح چرالیا تھا کہ اپنی عمر سے بھی کم لگنے لگی تھی اور اسی وجہ سے سینہ اور وادی شانہ کے خطوط کی ذرا سی بھی جھلک جان لیوا معلوم ہوتی تھی۔

اس نگاہ کے معنی وزیر کی نگاہ سے مخفی نہ تھے اور نواب شمس الدین احمد کے جسم اور تشخص کے لئے وہ اپنے دل میں کشش بھی محسوس کرتی تھی۔ لیکن ابھی اسے بہت کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ جذبات کی رو میں بے اختیار بہ جانے کے دن اب نہ تھے۔ مارسٹن بلیک کے ساتھ زندگی گذارنے اور پھر اس کی اچانک، ناوقت اور اذیت ناک موت سے وزیر نے یہ سبق تو سیکھا ہی تھا کہ زندگی محض فیصلے لینے اور ان پر عمل کر ڈالنے سے عبارت نہیں۔ نہ فیصلہ لینا اس قدر آسان ہے جس قدر اسے مارسٹن بلیک کے ساتھ اپنا رشتۂ حیات منعقد کرتے وقت معلوم ہو رہا تھا اور نہ ان فیصلوں کا قوت سے فعل میں لانا قسام ازل کی کسی حکمت کی طرح پر تھا، جس طرح رات کے بعد صبح ہوتی ہے۔ اور نہ ہی ایسا تھا کہ قوت سے فعل میں آکر ارادے اور فیصلے پھر ایک سیدھی راہ چلتے ہیں جس کے نشیب وفراز اور پیچ وخم کے بارے میں پہلے سے اطلاع نہ بھی ہو تو ان کے بارے میں قیاس اور اس قیاس کی روشنی میں پیش بندی ہی ممکن تھی۔ گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے نیم فاقہ زدہ کتوں اور گھروں کی منڈیروں، نیم اور پیپل کے درختوں پر گھنٹوں ساکت بیٹھے قوت لایموت کے منتظر پرندوں اور دانے کے لالچ میں زمین پر اترنے اور پھر کسی حقیقی یا خیالی خوف سے مرتعش ہو کر فوراً ہی اڑ جانے والی گوریوں، کبوتروں، فاختاؤں اور میناؤں کو شاید اپنی زندگی پر زیادہ اختیار اور اپنے حالات پر زیادہ قابو تھا۔

وزیر خود کو اس گمان میں مبتلا دیکھتی تھی کہ فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے، لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ یہ محض گمان ہی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ کسی بھی فیصلے کے بارے میں تمام اطراف وعواقب پر پوری طرح غور کرنا اگر ممکن بھی ہوتا تو اس سے کچھ منفعت یقینی طور پر متصور نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں تو تمام اطراف و عواقب پر غور کرنے کی مہلت بھی نہ تھی۔ نواب شمس الدین کی آنکھوں میں ہوس تھی لیکن دل میں شاید کچھ

خلوص بھی تھا۔ اگر وہ نواب کو قبول نہ کرے تو پھر اس کے آگے راستہ ہی کیا تھا اور کون سا تھا؟ کیا ولیم فریزر؟ اللہ میری توبہ۔ کیا میری راہیں اتنی مسدود ہیں؟ کیا میرے لئے زمین اتنی تنگ ہے؟ مگر مجھے دو بچوں کی پرورش بھی کرنی، خود بھی زندگی کرنی ہے۔ آخر بھیک مانگ کر تو جی نہیں سکتی...

''کہاں کھو گئیں وزیر خانم؟''

نواب کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔ اس وقت نواب کی نگاہوں میں اس کے لئے اختلاط جسمانی کے اشتیاق سے زیادہ کچھ اور ہی طرح کی روشنی تھی جسے وہ اگر چاہتی تو لگاؤ سے تعبیر کر سکتی تھی۔

''جی، کچھ نہیں... کچھ نہیں، بس آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔''

''اے لوبی بی کی باتیں، ہم تو یہاں موجود ہیں، بھئی واللہ۔''

''جی میں آپ کو سفر حیات کی کئی منزلیں آگے جا کر ڈھونڈ رہی تھی کہ وہاں اس بے نشاں کا کچھ نشان ہے کہ نہیں۔''

نواب ایک دم کو چپ ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں جو اشتیاق جھلک رہا تھا وہ کچھ مدھم پڑ گیا، گویا کسی گہری سوچ میں چلے گئے ہوں۔ پھر انھوں نے سر جھکا کر کہا:

وزیر خانم، عمر رواں کسی کے بس میں نہیں۔ کیا جانے میری منزلیں تمھاری منزلوں کے پہلے ہی اختتام کو پہنچ جائیں۔''

''لونڈی کے ماں باپ آپ پر قربان، سرکار ایسی بات منھ سے نہ نکالیں۔''

''ہمارے تمھارے چپ رہنے سے ہونی انہونی میں نہیں متبدل ہو سکتی۔'' نواب نے مسکرا کر کہا۔'' اسی لئے میں آگے کے سفر اور آئندہ کی منزلوں کا بس دھندلا ہی سا نشان آج کے قیام میں دیکھتا ہوں۔ آج پر کل کو قیاس نہیں کرتا لیکن آج کی مسرتوں کو بیضۂ طاؤس جانتا ہوں کہ ان میں جگمگاتے ہوئے رنگوں اور دور دور تک اپنی جھنکار پہنچانے والے طیور بوقلموں کے امکانات خفتہ ہیں۔ ہوگا وہی جو ہونا ہے، لیکن کہیں، کسی وقت، کسی جگہ، کسی شے پر کچھ اعتبار بھی چاہیئے ورنہ کشتی حیات دم کے دم میں طوفانی ہو جائے گی۔''

''سرکار کا ارشاد ہے کہ انسان روز کے روز جیئے، ہر رات کو زندگی کی آخری رات اور ہر صبح کو زندگی کی پہلی صبح قیاس کرے؟''

''نہیں۔ بھئی واللہ۔ ایسا نہیں۔ لیکن سینے کو آرزو سے آباد رکھو اور ہر آج کو کچھ اور بھی خوب تر

کل کی تمہید جانو۔''

''سرکار والا تبار کے پاس ریاست ہے، حکومت ہے، دولت ہے، اس سب سے بڑھ کر خاندانی نجابت ہے اور ذاتی وجاہت ہے۔ بندگان عالی اپنی بساط زیست پر جو بھی مہرہ رکھ دیں وہ بڑھ کر فرزی بن سکتا ہے۔ لیکن میں اس پاشکستہ واماندۂ حال پیادے سے زیادہ کچھ نہیں جسے وقت کا راہوار اپنے قدموں تلے روندنے کو بے قرار ہے۔''

''ہر پیادہ فرزی بن سکتا ہے اور ہر فرزی کے پاؤں قلم کر کے اس کے سینے میں خنجر خاک بھونکنے کے لئے ایک پیادہ کافی ہے۔ کارکنان قضا وقدر اپنی قوت کے اظہار کے لئے کسی کے محتاج نہیں۔''

وزیر نے سر اٹھایا تو نواب نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں جنھیں پھوٹ بہنے سے روکنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔

''ارے یہ کیا؟ بھئی واللہ ہم نے کیا ایسی بات کہہ دی جو خاطر نازک پر گراں گذری؟'' نواب نے اپنی جگہ سے ذرا آگے بڑھ کر اپنے رومال سے وزیر کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

''سرکار کی ہمت افزائیاں اپنی جگہ، لیکن مجھ میں قوت بازو بہت کم ہے اور اس مٹی کی ٹوکری کا بوجھ دم بدم بھاری ہوا جاتا ہے۔ حضور کی غریب نوازیوں سے طالب عفو ہوں...'' اب اس کی سسکیاں پھوٹ پڑیں جنھیں ضبط کر کے وہ اٹک اٹک کر بولی:

''سرکار کے ابر کرم کی گہر پاشیوں نے مجھے سید خواجہ میر صاحب کی باتیں یاد دلا دیں۔''

پھر اس نے نہایت دلنشیں گلوگرفتہ لہجے میں درد کے شعر پڑھے۔

معلوم نہیں آنکھیں یہ کیوں پھوٹ بہی ہیں
رونے کی طرف کس لئے یوں ٹوٹ بہی ہیں
کشتی کی طرح آنکھیں مری اشک میں یارو
جس تار نگہ سے بندھی تھیں چھوٹ بہی ہیں

پھر یہ شعر پڑھتے وقت اس کے منھ پر، اور منھ ہی نہیں آنکھوں پر بھی آنسوؤں کے ساتھ شمع تبسم کی ہلکی سی تجلی دوڑ گئی۔

سرسبز یہ کس جلوے سے ہوئیں آنکھیں جو اتنا
دریا کی طرح کھیت مرا لوٹ بہی ہیں

نواب، جو ہر شعر پر کچھ سر جھکائے اور کچھ نگاہیں اٹھائے ''واللہ سبحان اللہ، واہ وا'' کہہ رہے تھے، اس آخری شعر پر کچھ بے اختیار ہو کر انھوں نے وزیر کو اپنی طرف کھینچ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں تمھاری قوت بازو بن سکتا ہوں، جن آنسوؤں نے تمھارا خرمن صبر لوٹا ہے اور سیل بے اماں کی طرح تمھاری ہستی پر چھا گئے ہیں میں ان کے سامنے بند کی طرح سینہ سپر ہو جاؤں گا۔ آج کی رات کے بعد یہ آنسو تمھاری آنکھوں میں نہیں تمھارے دشمنوں کے خان و مان کو برباد کریں گے۔''

''آپ کی پرورش ہے، آپ کا سینہ اللہ نے حویلی کی فصیل جیسا فراخ اور فلک بوس بنایا ہے۔'' وزیر نے سر اٹھا کر آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔۔نواب چاہتے تھے کہ اس کا منھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک بوسہ لے لیں لیکن وزیر ان کی گرفت سے نکل کر کھڑی ہو گئی اور اپنے دل کے تلاطم پر قابو پا کر بولی:

''حضور، سانجھ پھولے مدت ہو گئی۔ آپ خاصہ کس وقت تناول فرمائیں گے؟ امر ہو تو انتظام کیا جائے۔ یا وقت کی مناسبت سے کچھ غزل یا خیال سنوایا جائے اگر مزاج عالی اس طرف ملتفت ہو...'' اس کا ڈوپٹہ لہرا کر سر و سینہ سے ڈھلک آیا تھا لیکن بظاہر اسے اس کی پروا نہ تھی۔

''بھئی واللہ۔ یہ اچھی بات ہوئی۔ غزل کا دل چاہ رہا ہے، لیکن آپ تو گائیں گی نہیں۔''

اس جملے میں یہ رمز بھی پوشیدہ تھی کہ نواب نے وزیر کے بارے میں معلومات کر لی ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ وہ رقص و سرود کا کام نہیں کرتی۔

''جی نہیں، لیکن میں نے انتظام کر لیا تھا، اس خیال سے کہ شاید بندگان عالی کا دل چاہ جائے۔ نئی گانے والی ہیں، ابھی ابھی جالندھر سے دہلی میں وارد ہوئی ہیں۔''

''خوب، بہت خوب۔ تو پھر دیر کا ہے کی، بھئی واللہ۔''

''جی ابھی حاضر ہوتی ہیں،'' وزیر نے یہ کہہ کر مورچھل ہلانے والی خواص کو اشارہ کیا۔ آن کی آن میں ساز اور سازندے آموجود ہوئے اور تین سلام کر کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ سب سے آخر میں نسیم جالندھری آئیں، دوہرا بدن، شباب ڈھل چکا تھا لیکن چال ڈھال، نشست و برخاست میں سج سبھاؤ تھا، گویا اسم بامسمیٰ تھیں۔ انھوں نے سات سلام کیے پھر آگے بڑھ کر نواب کے داہنے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا:

''کیا سناؤں، جناب عالی کی مرضی کیا ہے، فارسی کا کچھ عارفانہ کلام، یا ریختہ کی کوئی غزل؟''

''دہلی کے ریختہ گویوں نے ایران ودکن تک اپنا نام روشن کیا ہے۔ ہمیں تو کچھ ریختہ ہی سننا منظور ہے۔''

''جی بہت خوب، جو مزاج عالی میں آئے۔ حضرت میر حسن دہلوی اعلی اللہ مقامہ' کی غزل پیش کرتی ہوں۔''

وزیر کا دل دھڑک رہا تھا کہ نسیم جالندھری کہیں مرزا نوشہ کی غزل نہ چھیڑ دیں، حالانکہ وہ انھیں پہلے ہی متنبہ کر چکی تھی، لیکن ان گانے والیوں کا کیا بھروسا۔ اب اس کی جان میں جان آئی۔ نسیم جان جالندھری نے طاؤس پر سر ملائے، مردنگ نواز کی طرف دیکھا اور راگ چارو کیشی میں غزل شروع کی۔

نظروں میں اس نے مجھ سے اشارات آج کی
کیا تھا یہ خواب کچھ نہ کھلی بات آج کی
میں نے تو بھر نظر تجھے دیکھا نہیں ابھی
رکھیو حساب میں نہ ملاقات آج کی
جی میں یہی تھا میرے کہ دور شراب ہو
میں سچ کہوں کہ تو نے کرامات آج کی
یہ گفتگو کبھی بھی نہ آئی تھی درمیاں
جو کچھ کہ تو نے حرف و حکایات آج کی
لیکن مجھے تو پھر وہیں کل دیکھیو حسن
گر خیر و عافیت سے کٹی رات آج کی

نسیم جالندھری نے خوب بتا بتا کر بڑے شوق کے انداز سے غزل گائی، گویا غزل خود انھیں کی ہو۔ یہ حسن اتفاق تھا یا حسن انتخاب کہ ہر شعر میں معنی کا کوئی نہ کوئی ڈھب آج کی صحبت کا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر اس قدر بے خود ہوئی کہ خود بھی زانو پر دھیرے دھیرے تال دینے اور مغنیہ کی آواز میں آواز ملانے لگی۔ اس کی آواز میں اب بھی الھڑ لڑکیوں جیسی کھنک اور لچک تھی۔ اس شام کی کیفیت میں وزیر کی سریلی آواز میں ایک نئے سرور کا رنگ پیدا کر دیا۔ غزل ختم ہوئی تو نواب نے کمرے کے دروازے پر مودب کھڑے ہوئے اپنے چوبدار کو خفیف سا اشارہ کیا۔ چوبدار نے فوراً روپیوں کے دو توڑے کمرے کھول کر وزیر کی خدمت میں پیش کیے۔ وزیر نے انھیں نسیم جالندھری کے سامنے رکھ دیا۔ نسیم جالندھری

نے سروقد کھڑی ہو کر نواب کو سات سلام کئے اور ان کے دولت و اقبال کو دعا دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔

وزیر نے دوبارہ کھانے کو پوچھا اور اس بار نواب کا عندیہ پا کر اس نے دوسرے کمرے میں کھانا لگوایا۔ مارسٹن بلیک کے ساتھ رہ کر اس نے کئی باتیں سیکھی تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ کھانے کی جگہ کو دیوان خانے سے الگ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا کھانے کا انتظام اس نے الگ کمرے میں کیا لیکن انگریزی وضع کے برخلاف وہ نواب کے ساتھ کھانے پر بیٹھی نہیں۔ اگرچہ نواب کی طرف سے کچھ ایسے قرائن تھے کہ وہ بھی کھانے میں وزیر کی شرکت چاہتے تھے، لیکن انھوں نے صراحت سے نہ کہا کہ شاید وزیر اسے پسند نہ کرے۔ ہندو مسلمان شرفا کی عورتیں ہمیشہ مردوں کے بعد اور ان سے الگ، بلکہ چھپ کر کھانا کھاتی تھیں۔ کھانا سارا ہندوستانی تھا اور باہر سے پکوایا گیا تھا۔ صرف انگریزی کیک نئی غیر ملکی چیز تھی جو وزیر نے اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی۔ کھانے کے دوران وزیر ان کے سامنے نہیں بلکہ دائیں طرف، اور کچھ پیچھے کھڑی ہر چیز کا اہتمام کر رہی تھی اور نواب کو باصرار کھلا رہی تھی۔ خلاف توقع نواب نے بہت کم کھایا، لیکن یہ ظاہر تھا کہ کھانا ان کی پسند کا ہے اور اگر وہ کم کھا رہے ہیں تو اس کی وجہ کچھ اور نہیں صرف ان کی کم خوراکی ہے۔ کھانے کے دوران گفتگو یا کھانے کی تعریف یا وزیر کی طرف سے کسی چیز کے کھانے پر اصرار کے سوا کوئی بات چیت نہیں ہوئی، کہ مشرقی آداب کے منافی تھی۔

کھانے کے بعد بھنڈے اور پان کا دور چلا۔ وزیر نے جے پوری قوام کی سونے کے ورق میں لپیٹی ہوئی اور چاندی کی تیلیوں میں چھدی ہوئی گلوریاں بطور خاص تیار کرائی تھیں۔ نواب بات بات پر خوش ہوتے، خواصوں سے کوئی شگفتہ جملہ کہتے اور انھیں انعام دیتے۔ ایک اصیل جو ذرا شوخ تھی، بولی:

"سرکار نے خاصہ بہت کم نوش جان فرمایا لیکن باتیں کرتے نہیں تھکتے۔"

"یہ بات نہیں بھئی واللہ۔ ہم نے کھانے میں تعجیل کی۔ ہم آئے ترکستان سے ہوں لیکن اصلاً تو عرب ہیں۔ عرب بہت جلد جلد کھانا کھاتا ہے۔ بھئی واللہ وزیر خانم آپ نے وہ شوربے والا واقعہ نہیں سنا ہے کیا۔"

"سرکار ہم ایران توران عرب مصر کیا جانیں۔" وزیر نے بھی نواب کے انداز سے شہ پا کر ذرا بے تکلف ہو کر کہا۔ "ہم جہان آباد کی گھر در والیاں، ہم تو بس یہیں کی بولیاں بولیاں ہیں۔"

"جی بہت خوب، اسی لئے تو آپ کا طوطی ہر طرف بولتا ہے۔"

اس پر اصیلیں ماما ئیں کھلکھلا کر، لیکن ہلکی آواز میں ہنسیں۔ "سرکار وہ شوربے والا واقعہ..."

''جی، تو ایسا ہوا کہ کسی عرب سے کسی ایرانی نے پوچھا، بھئی واللہ تمھارے یہاں ٹھنڈے شوربے کو کیا کہتے ہیں؟ عرب نے جواب دیا...'' نواب ایک پل کو ٹھہرے، ان کے چہرے پر خفیف سی شرارت بھری مسکراہٹ آئی۔ ''...عرب نے جواب دیا، ہم لوگ شوربے کو ٹھنڈا ہی نہیں ہونے دیتے، فوراً پی جاتے ہیں۔''

وزیر دوپٹے میں منھ چھپا کر ہنسی۔ اس بار اصیلوں کی ہنسی زیادہ کھلی ہوئی تھی۔ سارا گھر ہنستا ہوا سا لگ رہا تھا۔

ان کے عملہ فعلہ کے لوگ بھی کھانا کھا چکے تھے، لیکن نواب ابھی محفل کو تہ کرنے کے بجائے کچھ اور دیر تک قائم رکھنا چاہتے تھے۔ وزیر اب ان کے سامنے ہی ذرا دائیں جانب کو گھٹنے موڑ کر بیٹھی تھی، لیکن دونوں میں اب بھی وہی ایک ڈیڑھ ہاتھ کا فصل تھا۔ نواب بار بار وزیر کے منھ کی طرف دیکھتے، جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن کچھ سوچ کر رک جاتے ہوں۔ تمام تر انکسار کے باوجود وزیر کے چہرے پر عجب طرح کی گرمی تھی، جسے تیج ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور نواب کو وزیر کی قربت میں یہ تیج بھی اتنا ہی صاف محسوس ہو رہا تھا جتنی روشن ہو کر اس کے جسم کی آنچ ان تک پہنچ رہی تھی۔ وزیر کے بدن کی گرمی اور اس کے منھ کی جوت دونوں نے مل کر نواب شمس الدین احمد کو کچھ ایسے خلفشار میں ڈال دیا تھا جس سے آج تک وہ کبھی دوچار نہ ہوئے تھے۔

عام حالات میں تو یہ ہوتا کہ وہ وزیر سے کہہ دیتے، یا اگر عمومی دستور پر مکمل طور پر عمل کیا جاتا تو اپنے داروغہ یا مشاطہ کی زبانی کہلا دیتے کہ کھانے کے بعد شب باشی بھی یہیں ہوگی۔ لیکن نواب کو یہ بات کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر غلط اور نامناسب لگی تھی۔ انھوں نے سوچا تھا کہ وہاں پہنچ کر کسی لطیف قرینے سے اپنے عندیے کا اظہار کر دیں گے۔ لیکن جیسے جیسے شام بھیگتی گئی وزیر کے چہرے پر تیج کی سی کیفیت بڑھتی گئی۔ اب یہ عالم تھا کہ شب گذاری کی نیت کا اعلان تو دور رہا، اب نواب کے جی میں آ رہی تھی کہ شب باشی کی اجازت مانگیں، لیکن یہ لفظ بھی ان کی زبان پر نہ آ رہے تھے۔ اور دیر تھی کہ ہوئی جا رہی تھی۔ بات کا فیصلہ کر لینا، یا پھر رخصت کے پان لے کر محفل سے اٹھ جانا ضروری ہوتا جا رہا تھا۔

وزیر نے شاید نواب کی کشمکش کو بھانپ لیا تھا، لیکن وہ ایسا کوئی بھی اشارہ نہ دینا چاہتی تھی جس سے اس کی طرف سے ذرا بھی ابرام یا غرض مندی یا دلچسپی ہی ظاہر ہو۔ اول تو اسے اپنے دل کا حال پوری طرح سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ خود سے کیا چاہتی ہے اور نواب سے کیا امید رکھتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی تھی

کہ اسے خوف تھا کہ اگر میں نے نواب کے سامنے خود کو کسی بھی طرح بے طاقت دکھایا تو وہ اسے بے حیائی یا اتاولے پن پر محمول کریں گے پھر بات بگڑ بھی سکتی ہے۔ لیکن یہ سکوت بھی تو بے محل بلکہ اور بھی تصدیع اور الجھیڑے کا باعث تھا۔ آخر دونوں ایک دوسرے کا منھ تکنے کے لئے تو نہیں وہاں بیٹھے تھے۔

''سرکار کا جی چاہے تو خیال کی کوئی بندش سنواؤں؟ یا قہوہ حاضر کروں؟'' آخر کار وزیر نے مسکرا کر کہا، گویا ان دونوں کے بیچ میں کوئی پیچ یا باطنی رکن نہ تھی، عام سی شام تھی اور رسمی گفتگو کا ماحول تھا۔

''ن... نہیں وزیر خانم۔ مجھے اب رخصت لینا چاہیئے۔'' نواب نے وزیر کی طرف پھر ذرا غور سے دیکھا، ایک پل کے لئے دونوں کی آنکھیں ملیں۔ وزیر کی آنکھ پہلے جھکی، لیکن اس نے شدت سے محسوس کیا کہ نواب اس کی طرف سے کچھ پیش قدمی کے منتظر ہیں، چھوٹی ہی سی سہی۔ اور اگر اس نے نواب کی توقع نہ پوری کی تو آج کی شام انھوں نے جتنا فاصلہ طے کیا تھا اسے از سر طے کرنا ہوگا۔

''اللہ اب وہ مبارک و مسعود گھڑی کب آئے گی جب حضور کے قدموں کی خاک سے یہ کلبۂ تاریک دوبارہ روشن ہوگا۔'' وزیر کی مسکراہٹ میں اس وقت الھڑ دوشیزاؤں کے پہلے پہلے لگاؤ کی سی سادگی تھی، گویا وہ آئندہ کے نشیب و فراز پر ابھی کچھ مطلع نہ ہو۔ اس کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ طلوع ہو کر اس کے منھ تک چلی آئی تھی۔ اس کا سارا چہرہ کندن کی طرح دمک اٹھا تھا۔

نواب شمس الدین احمد کے جی میں آئی، کہہ دیں، ہم یہاں سے جا ہی کہاں رہے ہیں جو دوبارہ آنے کا مذکور ہو۔ لیکن ظاہر تھا کہ اب اس کا وقت نکل چکا تھا، اگر کبھی تھا۔ نواب اپنی جگہ سے اٹھے، بڑھ کر انھوں نے وزیر کے رخساروں کو ہلکے سے چھوا اور دروازے کی طرف چلے۔ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی اصیل جوتیاں پہنانا چاہتی تھی کہ وزیر نے جھپٹ کر جوتیاں خود لے لیں اور نواب کے قدموں کی طرف جھک گئی۔ نواب نے فوراً پاؤں پیچھے کر لئے اور بولے:

''نہیں وزیر خانم، یہ ہرگز نہ ہوگا بھئی واللہ۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' اتنی دیر میں اصیل نے دوڑ کر جوتیاں وزیر کے ہاتھ سے لے لیں اور اسی لمحے نواب کا سونٹا بردار بھی ایک کشتی میں جامہ وار کا دوشالہ اور بنارسی کمخواب کا تھان اور کئی بدرے لے کر حاضر ہوا۔ نواب نے دوشالہ اپنے ہاتھ سے وزیر کو اڑھایا، ریشمی تھان اور روپے کی تھیلیوں کے بارے میں وزیر کی طرف نیم مستفسرانہ نگاہ سے دیکھا۔ وزیر کی کنکھیوں کا اشارہ پا کر ایک ماما نے سونٹا بردار کے ہاتھ سے کشتی لے کر سر پر رکھ لی اور اندر چلی گئی۔ وزیر نے شال کو سر و شانہ پر لپیٹ کر بکل سا نکال لیا، گویا نماز پڑھنے جا رہی ہو۔ قدردانی اور شکریے کے اس انداز کی نزاکت

نواب سے مخفی نہ تھی۔ وہ مسکرا کر کچھ کہنے والے تھے کہ وزیر نے جھک جھک کر سلام کیے اور بولی:

''بندگان عالی کی پرورش کے شہرے سارے ملک ہند میں ہیں۔ ہم تو جب تک جئیں گے سرکار کے گن گائیں گے... لیکن ہم تو کچھ اور پوچھ رہے تھے...'' آخری فقرے میں اس نے لگاؤ کے رنگ میں کچھ ناز کا بھی انداز شامل کر دیا تھا۔

نواب کی کمر میں ہیجان سا اٹھا، ان کے پاؤں میں خفیف سی لرزش بھی آئی۔ ان کے جی میں آئی، وہیں فرش پر لیٹ جائیں، کہیں کہ بہت تھک گیا ہوں۔ چھوٹی بیگم ذرا کمر دبا دو۔ لیکن دونوں کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ سب محالات میں تھا۔ انھوں نے کہا:

''جلد ہی۔ انشاء اللہ جلد ہی ملنا ہوگا۔ کبھی آپ بھی ہماری ہجراں نصیب دہلیز کو وصل بہاراں سے گلنار کریں تو کیا خوب ہو بھئی واللہ۔''

''بندی آپ سے باہر کب ہے۔ آپ اصل بہار ہیں، میں تو وہ برگ خزاں فرسودہ ہوں جسے آپ نے اپنے مقدم سے دوبارہ زندہ کر دیا۔ ایسے مسیحا صفت مربی کا مطیع فرمان ہو جانا میرے بخت خفتہ کا بیدار ہو جانا ہے۔''

شمس الدین احمد نے دیکھا کہ بکل کی آڑ میں وزیر کے منھ پر وہ صفائی اور پھبن تھی جو نئی دلہنوں کے بھی چہرے پر نہ ہوگی۔ اور اس کی آواز اس قدر شائستہ تھی، اس کے الفاظ اس قدر صفائی اور شستگی سے ادا ہو رہے تھے گویا کوئی اعلیٰ مرتبت شاعر کلام سنا رہا ہو۔

''بہت خوب، انشاء اللہ جلد ملنا ہوگا۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ رخصت ہونے کے پہلے آپ کو مولانا عرفی کا ایک شعر سنایئے۔''

''ارشاد ہو، کنیز ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی ہے۔''

نواب ذرا رکے، گلا صاف کیا، گویا شعر سنانے میں کچھ تکلف ہو۔ پھر بولے، ''لیکن یہ شعر ایک خاص غرض سے سنا رہا ہوں۔''

''دور پار۔ بھلا آپ کو کوئی غرض کیوں ہو۔ لیکن شعر عطا فرمائیں۔''

نواب نے شعر پڑھا۔

نازم بہ حسن و عشق کہ از جام اتحاد
مستند و از میانہ حیا کم نہ می شود

وزیر ابھی داد کا کوئی لفظ ادا نہ کر پائی تھی کہ نواب بول اٹھے:

''چھوٹی بیگم۔ جام اتحاد اور پئیں۔ خوب پئیں اور خوب پلائیں مگر... پردہ تو پردہ ہے، حیا ہی کا سہی۔ یہ بھی ایک ادائے ناز ہے... ناز اٹھانے میں لطف ہے لیکن...''

''خدا نہ کرے جو میں آپ سے ناز کروں۔ مجھ سی کتنی ہی آپ کی جوتیوں پر قربان ہوں۔ سرکار کے مہر کرم کی تابانی نے میری آنکھیں خیرہ کر دی ہیں، اور کوئی بات نہیں۔ حیا اگر پردہ ہے تو کوئی اس کا پردہ کشا بھی ہے۔''

نواب شمس الدین احمد نے سمجھ لیا کہ میری بات کو جہاں پہنچنا تھا وہاں پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے خندہ روئی سے کہا: ''بہت خوب، اب اجازت مرحمت ہو۔ آپ سے مل کر ہمارا جی خوش ہوا۔''

نواب کو جوتیاں پہنائی گئیں، ایک عمر رسیدہ خادمہ نے آکر ان کی بلائیں لیں، دعا پڑھ کر دم کی۔ وزیر نے لمبی ڈنٹھل کے سرخ گلاب کی ایک بڑی سی کلی ہاتھوں کا گلدان بنا کر نواب کو پیش کی۔ نواب نے وزیر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے، انگلیوں کو الگ الگ بوسہ دیا اور کہا:

''جاے بوسہ است سر انگشت حنابستۂ تو
غنچۂ گل شد کہ گل از دست تو چیدن دارد

''اس تحفے نے اور اس کے حسن نے ہم سے کچھ کہا ہے۔ ہمارا دل ہمارا سینہ خالی کر کے کہیں چلا گیا ہے۔ یہ تحفہ کہتا ہے کہ دل اگر واپس بھی آ جائے تو دروازہ نہ کھولنا، کہہ دینا گھر میں کوئی نہیں۔''

وزیر کی آنکھ میں اچانک آنسو چھلک آئے۔ اس نے سسکی ضبط کر کے کہا، ''سرکار کا دل جہاں بھی ہے سرکار ہی کا ہے اور جس دیس میں ہے وہ بھی سرکار کی قلمرو میں ہے۔ اب سدھاریئے۔ جس طرح پیٹھ دکھاتے ہیں منھ بھی دکھایئے گا۔''

نواب نے آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے وزیر کی آنکھیں پونچھیں، دل پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکے، سلام کیا، وزیر کے سر پر ہلکے سے ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں بولے، ''ٹھیک ہے، کُلُّ امرٍ مرھونٌ باَوقاتِھا''، اور ڈیوڑھی سے تیز تیز نکل گئے۔

نواب یوسف علی خان

وزیر نے باہر سے بلوائے ہوئے نوکر چاکروں کو انعام دے کر رخصت کیا، اپنی ماما سے کہا کہ مجھے بھوک نہیں ہے، تم لوگ کھانا کھا لو۔ پھر وہ سر جھکائے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر کچھ اوڑھے بغیر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کے بدن پر لرزہ تھا، لیکن سردی کی وجہ سے نہیں۔ وہ چپ چاپ پڑی رہی، پھر اس کے آنسو بہ نکلے۔ وہ دیر تک روتی رہی، پھر سسکیاں بھرتی سو گئی۔

بہت رات جا چکی تھی جب کپکپی لگ کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا بدن برف ہو رہا تھا۔ اس نے یوں ہی لحاف کھینچ کر اپنے بدن پر ڈال لیا اور خالی آنکھوں سے چھت کو تکنے لگی۔ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ گذشتہ شام کی باتیں، نواب شمس الدین احمد کا خوبصورت وجیہ تشخص، ان کا نستعلیق لب و لہجہ، ان کا مہذب انداز، یہ سب اس کے دل میں بار بار تمنا کی کسک پیدا کرتے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے وہ شب و روز تھے جو اس نے مارسٹن بلیک کے ساتھ گذارے تھے۔ بلاک صاحب کا خیال آتے ہی اس کے دل میں ان کی ناوقت اور بے کسی کی موت پر رنج تو امڈ ہی آتا تھا، لیکن اس رنج سے بڑھ کر آرزو اور کامرانی کی گرمیاں اور اس کی فرنگی ہندی محبت کے لہریئے اس کے بدن میں سنسنی کی طرح دوڑنے لگتے تھے جیسے کوئی تالاب میں کنکر پھینک دے اور اس کے لہری دائرے دور دور تک پھیلتے جائیں، جیسے کوئی ان دیکھی قوت انھیں آگے بڑھائے لئے جا رہی ہو۔ بلاک صاحب جیسا چاہنے والا، اس کے جوش و خروش، وزیر کے لئے اس کی امنگیں، وزیر کے جسم کے اسرار سے اس کی آگاہی، جیسے اس کی عقل حیوانی، اس کی اصلی سدھ، کسی پر اسرار طریقے سے وزیر کے جسم و جاں میں، اس کے ریشے ریشے میں سما گئی ہو... ویسا اب کہاں سے مل سکے گا، کس کو مل سکے گا؟

مہرولی شریف سے واپسی کی وہ رات، رات کی وہ آندھیاں، راستے کے جوکھم، تیز ہوا سے

اڑتا ہوا بہلی کا پردہ... کسی کی آنکھیں میرے بدن پر نہیں، میرے جی جان کی بھول بھلیوں میں کہیں پیوست... کسے معلوم تھا کہ میں ان کے ساتھ اپنا گھر آباد کر سکوں گی ولیکن جے پور میں میرا گھر ان کی قبر بن جائے گا... میں ریزیڈنٹی میں بالکل محفوظ رہوں گا، تم بالکل فکر نہ کرو، بہت جلد واپس آؤں گا اور ہم اپنا گھر پھر آباد کریں گے... مجھے جو مرد چاہے گا کوئی ضروری نہیں کہ میں بھی اسے چاہوں۔ لیکن نواب صاحب...

ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھ جھپک گئی۔ لیکن جب اس کی نیند ٹوٹی تو دن اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ باہر آنگن میں نیبو اور ہار سنگھار کے پیڑوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ بڑے پنجرے میں لال جو جے پور سے اس کے ساتھ آئے تھے اور خوب چُہچہے ہو رہے تھے، اپنی سیٹیوں سے گھر کو سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ وزیر آستینیں چڑھا، دوپٹہ الگ رکھ، آبدار خانے میں دانت مانجھ کر منھ دھو رہی تھی کہ معلوم ہوا فیروز پور کا چوبدار دروازے پر حاضر ہے۔ اسے ڈیوڑھی کے اندر بلایا گیا، وزیر جلد جلد منھ پونچھ کر دوپٹہ سنبھالتی باہر نکلی۔ چوبدار کے ساتھ ایک مزدور تھا، اس کے سر پر ایک بڑی پٹاری تھی۔ پردے کے پیچھے سے وزیر کی ذرا سی جھلک پا کر چوبدار نے جھک کر سلام کیا اور ذرا بلند آواز میں کہا:

''بی بی صاحب۔ بندگی عرض کرتا ہوں، حضور نواب صاحب نے ڈالی ارسال فرمائی ہے۔ مزدور یہیں منتظر ہے۔ اور ایک رقعہ بھی ہے۔''

''میں پردہ کرائے دیتی ہوں، مزدور کو اندر بھیج دو۔ رقعہ ماما کے ہاتھ میں دے دو'' وزیر نے کہا۔ چوبدار، جو وزیر کا سامنا کرنے کی امید میں تھا، تھوڑا مایوس ہوا، لیکن ''جی بہت اچھا'' کہہ کر اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹا ہوا مہر بند رقعہ ماما کے حوالے کر دیا اور مزدور سے کہا، ''چل بے، ڈالی کو اندر پہنچا دے۔ جلدی کر، واپسی میں دیر ہو جائے گی تو سرکار بد دماغ ہوں گے۔''

''ابھی لو جمادار صاحب، جھپاک سے اندر پہنچائے دیتا ہوں''، کہہ کر مزدور نے ماما کے ساتھ گھر کے اندر آ کر پٹاری آنگن میں تخت پر رکھ دی اور سلام کر کے فوراً واپس ہو گیا۔ وزیر نے چوبدار کو پانچ روپئے اور مزدور کو ایک روپیہ انعام اور نواب صاحب کی خدمت میں بندگی اور آداب بھجوا کر انھیں رخصت کیا اور صبح کے تحفوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ پٹاری میں سرخ گلابی عنبری سیب بھرے ہوئے تھے۔ وزیر نے خریطہ کھولا، اس میں عطر زعفران کی شیشی، اور معطر افشانی کاغذ پر نہایت پاکیزہ خط شکستہ میں شعر لکھا ہوا تھا۔

نخل پر غنچہ شد و غنچہ گل و گل نو بر

تو بیا تا نہ شود محنت گلزار عبث

وزیر پھڑک گئی، بھلا مارسٹن بلیک سے یہ نزاکتیں کہاں ممکن تھیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی، یہ کیا ہو رہا ہے... میں کہاں جا رہی ہوں؟ جا رہی ہوں کہ لے جائی جا رہی ہوں؟

اسی شام کو وزیر نے نواب یوسف علی خان کے یہاں ماما بھیج کر ملاقات کا وقت مقرر کرایا اور اگلے دن دھوپ چڑھتے ہی وقت مقررہ پر تراہا بیرم خان پر نواب یوسف علی خان کی حویلی میں حاضر ہوئی۔ منجھلی بیگم کو اس نے سلام کے بعد مختصراً حالات بتائے اور کہا کہ باجی تم اگر مناسب سمجھو تو میں نواب بھائی صاحب سے مشورہ کر لوں۔

''بچی جان، بھلا اس میں مجھ سے مناسب نامناسب پوچھنے کی کیا بات ہے۔ ضرور پوچھو، چلو میں بھی تمھارے پاس بیٹھوں گی اور ضروری ہوا تو میں بھی اپنی بات کہوں گی۔ آؤ، بسم اللہ۔ میں نواب کو اندر بلواتی ہوں۔ تم اتنے گلوریاں چکھو۔''

تھوڑی ہی دیر میں نواب یوسف علی خان صاحب زنان خانے میں تشریف لے آئے۔ ولیم فریزر کی دعوت میں ملاقات کے بعد آج ان کا ملنا پہلی بار ہوا تھا۔ نواب شمس الدین احمد خان کی چھوٹی بیگم کے یہاں آمد کے بارے میں انھیں پر چہ لگ چکا تھا، لیکن انھوں نے یہ بات منجھلی پر بھی ظاہر نہ کی تھی۔

''سرکار پر سب حال روشن ہے۔ لیکن مجھے ایک فکر یہ بھی ہے کہ بڑی باجی یا باوا جان کو کچھ بتاؤں یا ان سے پوچھوں یا نہ۔''

''چھوٹی بیگم، یہ تو آپ کا معاملہ ہے، میں نہ ہی بولوں تو خوب ہے۔ جب آپ جے پور سے واپس آئی تھیں اس وقت بھی تو آپ اور انوری خانم کی بات چیت ہوئی تھی، کہ نہیں؟''

''جی سرکار۔ اور میں نے انھیں بتا دیا تھا...''

''تو پھر وہ دروازہ آپ نے خود ہی تیغا کر لیا ہے...'' نواب نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''اب معاملۂ زیر غور میں سامنے کی بات یہ ہے کہ اختیار آپ کو ہے، مگر میں یہ ضرور کہہ سکوں ہوں کہ نواب شمس الدین احمد ہمارے دوست ہیں، ہم لوگ انھیں معتبر سمجھتے ہیں۔''

''لیکن ریزیڈنٹ بہادر...''

''چھوڑیے ریزیڈنٹ بہادر کو۔ ان کا کیا ہے، آج یہاں ہیں کل بدل کر کہیں اور بھیج دیے جائیں گے۔ نہیں تو ولایت کو پلٹ جائیں گے۔ یہ لوگ چندروزہ ہیں، نواب اور ان کی رعایا تو مستقر ہیں۔ یہیں کے ہیں یہیں رہیں گے۔''

''بجا ارشاد ہوا۔''

''تو پھر اگر شمس الدین احمد کی شرطیں آپ کے مناسب حال ہوں اور ان کا سبھاؤ آپ کی طبع کے موافق ہو تو بسم اللہ، ہامی بھر دیجئے۔''

''اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔ بندی کے دل پر سے بہت بڑا بوجھ آپ نے ہٹوا لیا۔'' وزیر نے نواب کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ منجھلی بیگم بھی متبسم ہو کر بولیں:

''ہم کنیزیں آپ پہ صدقے، اللہ آپ نے بڑی اچھی رائے دی۔ ماشاء اللہ خدا نے آپ کے دل کو جام جہاں نما کی طرح روشن بنایا ہے۔ سچی بات اس میں فوراً جھلک جاتی ہے۔''

منجھلی بیگم کے کھلتے ہوئے صندلی رنگ اور سڈول گردن پر ان کا روشن متبسم چہرہ بالکل سورج مکھی کا پھول لگ رہا تھا۔ صرف نواب ہی ان کے حسن سے آنکھ نہیں سینک رہے تھے، چھوٹی کا تو یہ عالم تھا کہ اس کا جی کرتا تھا بہن سے لپٹ جائے اور چٹاخ چٹاخ پیار کر ڈالے۔ آج بہت دن بعد اسے اپنا بدن اپنا بدن لگ رہا تھا، اپنا جی اپنے قابو میں لگ رہا تھا۔ آج پہلی بار اس نے اپنی زندگی کے فیصلوں کے بارے میں خود کو تنہا، واماندۂ حال نہ دیکھا تھا۔

نواب یوسف علی خان کے یہاں سے رخصت لے کر وہ سیدھی اپنے سرکی والوں کے مکان میں آئی۔ سارا راستہ پالکی میں، اور اب سارا دن گھر میں گھوم گھوم کر بس اپنے کو دیکھتی رہی اور جب اس مشغلے سے فرصت ہوتی تو نواب یوسف علی خان کی باتوں پر غور کرتی۔ نواب نے ''شرائط'' کی بات کی تھی کہ اگر وہ شرطیں مجھے اپنے حال کے مناسب لگیں۔ لیکن اس کا مطلب کیا تھا؟ ظاہر ہے نواب صاحب نے یہ نہیں کہا تھا کہ شمس الدین احمد خان اگر نکاح کی شرط رکھیں تو منظور کر لیجو۔ یہ معاملہ خود اس کے اوپر تھا کہ نکاح کی شرط اگر چاہے تو رکھے۔ یا اگر وہاں سے کوئی اشارہ نہ ہو تو اپنا عندیہ خود ظاہر کر دے کہ میں بشرط نکاح خدمت کو حاضر ہوں۔ یا اگر وہ چاہے کہ نکاح کی بات ابھی نہ ہو تو وہی سہی۔ پابند ہو کر ساتھ رہنے کی بات بھی ہو سکتی تھی۔ اور یہ بھی کہ رہوں گی اپنی ہی طرح اپنے ہی جھونپڑے میں لیکن نواب کی ہو کر رہوں گی۔ مگر گذارہ کیا ہوگا۔ ریاست کبھی جانا ملے گا کہ نہیں۔ بھلا کیا کبھی دو بول بھی پڑھوائے جائیں

گے کہ نہیں۔ اور وہ موا انگریز منحوس کھوسٹ انگریز فریزر صاحب خدا جانے کتنی بی بیوں کتنے لونڈوں کو اپنی بڑبھس میں نتھی کیے ہوئے ہے۔ انگریزوں میں نکاح تو ایک سے کرتے ہیں لیکن عارضی یا استمراری تعلق جتنے چاہیں رکھیں۔ اس حرام زادے کو تو میں چینی میں پیشاب کر کے اپنی صورت بھی نہ دیکھنے دوں۔ لیکن ...حاکم تو وہی ہے۔ ماٹن بلاک صاحب جیسے تو اس کے کتنے ماتحت ہوں گے۔ سنا ہے کلکتے کے بڑے لاٹ کے دربار میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہے۔ پر نواب یوسف علی خان ٹھیک تو کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی دوستی کیا اور کس کام کی۔ آج نہیں تو کل بھاگیں گے یا بھگائے جائیں گے۔ مرزا نوشہ لاکھ انھیں اپنا دوست مانیں وہ تو دہلی والے بھی نہیں ہیں انھیں یہاں کے بادشاہ کا درد کیوں ہوتا۔ خود کو غیر قومے نصرانی کے دامن دولت سے باندھنا چاہتے ہوں تو چاہیں۔ ہم ہندیوں کے لئے اس میں کیا دلکشی ہو سکتی تھی۔ پر یہ تو ہے کہ شاعر اہیں ان کے ساتھ جو رہے گا اس کا بھی نام ہوتا رہے گا۔ مگر نہیں کیا ضرور ہے کہ ایسا ہو۔ خواجہ حافظ اور امیر خسرو کی گھر والیوں کو یا ان کی کسی معشوق کو کسی نے پوچھا کہ ان کا نام کیا تھا کہاں سے آئی تھیں کس طرح مریں کس طرح جئیں۔ اس دنیا میں مرد ہی مرد ہیں انھیں کا راج ہے انھیں کا کاج۔ ہم لوگوں کو تو یہی بس ہے کہ انھیں جہاں تک ہو سکے اپنی مٹھی میں کیے رہیں۔ نواب اور ان کی رعایا اور ان کی ریاست تو ہر وقت کی ہے۔ انگریزوں کی طرح یہ شاعر بھی ہیں کہ یہ مصری کی مکھی ہیں، شہد کی مکھی نہیں۔ نہیں تو پھر دودھ کی مکھی کہ بادیے میں گریں تو ڈوب ہی کے رہ جائیں نہ اس گھاٹ تریں نہ اس گھاٹ اتریں۔ لیکن میرے ساتھ میں اور بھی تو کئی باتیں تھیں جن کا انفصال ضروری تھا۔ اور پھر میرے بچوں، میرے جگر بند امیر میرزا اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک بادشاہ بیگم کا کیا ہوگا؟ ٹھیک ہے وہ دونوں تھے تو اے بی میم کے پاس، لیکن ان کا خرچ تو اسے ہی اٹھانا تھا اور وہ انھیں کوئی اپنے سے تو جدا تو نہیں کر آئی تھی۔ ملنا جلنا آنا جانا کبھی کبھی کا سہی لیکن سو تو ہو گا ہی... کاش امیر مرزا جلدی سے لکھنا سیکھ لیتا کہ فارسی میں نہ سہی ہندی میں خط تو لکھتا ہائے وہ امیر خسرو صاحب کے کیا بول تھے نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں۔ معشوق ہی تھوڑی سب کچھ ہے۔ عورت تو اولاد کا منھ دیکھ دیکھ کر جیوے ہے۔ مرد اس کے ماتھے کا سیندور اور اس کے سر کا تاج ہو گا لیکن جوان بیٹے سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ جوان بیٹا تو موت کو شکار کر لائے گا۔ گھر کا اصل مالک تو اسی کو ٹھہرانا چاہیئے۔ ان مرد لوگوں کا کیا ہے، عمریں زیادہ، عقل کم، تھوڑے دن بعد بدن بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں مزے بھی جاتے رہتے ہیں۔ ہائے میرا امیر میرزا کیسا گبھرو جوان نکلے گا ماٹن بلاک صاحب سے بھی ایک دو انگل نکلتا ہوا... لیکن میں انھیں کہاں سے دیکھوں گی کیسے ان کی بڑھوار دیکھ کر نہال ہوں گی خود ہی

بے خانماں ہوں گی تو ان کے استقبال کے لئے چوکھٹ اور آستاں کہاں بناؤں گی۔ میں تو در در کی ٹھوکریں کھالوں لیکن میرے جگر گوشوں کو تو اللہ رکھے عالی شان گڑھی اور حویلی نہیں تو اچھا بھلا شریفوں کا گھر تو چاہیئے۔ نواب شمس الدین احمد خان صاحب جیسا گھر کہاں ملے گا۔ میں ان سے شرطیں ٹھہراؤں... یا انھیں ہی شرطیں بھیجنے دوں، ان کے دل کو لگی ہے، آپی آپ کہلاویں گے۔ میر محمد تقی صاحب کا مصرع بھی کیا مصرع ہے۔ ان شاعروں کا کیا ہے نہ جانے کہاں کہاں سے سوچ کر کس پانی کی گہرائی میں ڈھونڈ لاتے ہیں سر کو کاٹ کے ہاتھ پہ رکھے آپھی ملنے جاؤں گا اور ہائے وہ شعر کیا رنگ و سنگ میں شاہوار ہے کاش میں اسی کے حسب حال ہو جاتی

جھک کے سلام کسو کو کرنا سجدہ ہی ہو جاتا ہے
سر جاوے گو اس میں میرا سر نہ فرو میں لاؤں گا

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں یہ بھی تو میر صاحب نے کہا تھا۔ ہائے میرے استاد میاں شاہ نصیر کو موا نظام الملک لالچ دے کر دور دکن دیس لے گیا نہیں تو میں کچھ شعر ہی موزوں کر کے نواب کی خدمت میں بھیجتی۔ کچھ تو ان کے دل کا حال کھلتا، کچھ میں اپنے دل کا حال ان سے کہتی۔ اس کمبخت اے بی میم صاحب نے کئی دن سے میرے بچوں کی خبر بھی نہ بھیجی۔ میں یہاں کس قدر تنہا ہوں۔ اور جے پور جانا اب میری قسمت میں کہاں۔ اب تو یہی تمنا ہے کہ دلی کی خاک سے اٹھی تھی اب اسی کی خاک میں کہیں زمین کا پیوند ہو جاؤں...

...بھلا کوئی اپنے منھ سے اپنا سراپا بیان کر سکتا ہے؟ غیر مرد سے اپنی باتیں میں کس طرح کہہ سکوں ہوں۔ لیکن مارٹن بلاک صاحب بھی تو غیر مرد تھے، اور جو سچ پوچھو تو غیروں کے غیر تھے، نصرانی الگ، نہ مذہب میں ایکا نہ ملت میں ایکا۔ مگر ان کی بات میں کیا بیان کروں اللہ نے خدا جانے کس مٹی سے ان کا خمیر گوندھا تھا۔ ان کے بدن میں کیا تاب وتب تھی اور یہ ہمارے نواب شمس الدین احمد...

وہ اپنے خیالوں میں ٹھٹک گئی، جیسے اچانک کوئی کنواں یا کسی پہاڑی کا آخری سرا سامنے آگیا ہو۔ ہمارے نواب صاحب؟ یہ میں کس حق سے یا کس مجبوری سے انھیں کہہ رہی ہوں؟ کیا میرا دل انھوں نے اٹھوا منگوایا ہے یا میں خود ہی انھیں نذر کرنے لگی ہوں؟ اسے نواب کی بات یاد آئی جو انھوں نے وقت رخصت کہی تھی۔ میرا دل مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ اگر واپس آکر دروازے پر دستک دے تو دروازہ مت کھولنا، کہہ دینا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اور اس نے بھی تو جواب میں کچھ کہا تھا۔ تو پھر کیا کوئی بات

دونوں کے درمیان منعقد ہوئی کہ نہیں؟ اب اور کسے پہل کہتے ہیں؟

کیا اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ بھیجوں، یا ان کی طرف سے کچھ اور نامہ و پیام ہو؟ لیکن اب نامہ و پیغام کس عنوان سے ہو... دیوان حافظ سے فال نکلواؤں کیا کروں؟ مگر فال کیا میں خود نکالوں؟ سنتے ہیں کہ جس کی غرض ہو اسے خود فال نہ لینا چاہیئے، برخلاف استخارہ، کہ استخارہ تو بہتر ہے کہ صاحب معاملہ خود استخارہ کرے۔ تو پھر کس سے کہوں؟ کیا اصیل کو بھیجوں کہ پتہ لگائے آیا یہاں آس پاس کوئی شانہ بین رہتے ہیں اور کیا وہ یہاں آسکیں گے؟ سوچتے سوچتے وہ تھک کر ہلکان ہوگئی۔ اسی ادھیڑ بن میں رات ہوگئی تھی لیکن کچھ راہ سوجھتی نہ تھی۔

تھوڑا بہت کھانا کھا کر وہ منھ دھو کر کلیاں کر کے پلنگ پر جانے ہی والی تھی کہ اسے پنڈت نند کشور کا خیال آیا۔ پنڈت نند کشور اگلے وقتوں کے لوگ تھے، بڑے مانے ہوئے منجم، رمال اور شانہ بین۔ ایک زمانہ انھیں استاد مانتا تھا۔ چھوٹی بیگم کی نانی کے یہاں کبھی کبھی بڑے اصرار کے بعد چلے آتے تھے۔ اب تو اور بھی بوڑھے ہوگئے ہوں گے... کیا پتہ مرکھپ گئے ہوں۔ خیر، ایک بات تو خاطر میں آئی۔ نیت شب حرام، صبح تو ہو، اس وقت اس پر مزید تامل کروں گی۔ ضروری ہوا تو نانی جان کے یہاں خود چلی جاؤں گی۔

پنڈت نند کشور

یہ اس کی خوش نصیبی ہی تھی کہ پنڈت نند کشور اسے مل گئے، ورنہ وہ کئی برس بیتے دلی چھوڑ کر اپنے بیٹے کے پاس ہانسی حصار جارہے تھے۔ بیوی کی موت کے بعد ضعیفی اور کمر کے درد نے انھیں بڑی حد تک معذور کر دیا تھا۔ تنہائی سے بالآخر تنگ آ کر انھوں نے خانم کے بازار والا اپنا مکان اپنی بیٹی داماد کو ہبہ کر دیا اور خود کو ہانسی حصار میں بیٹے بہو کے گھر میں آباد کر لیا۔ وسائل کی تنگی انھیں کچھ نہ تھی اور بیٹا بھی بفضلہ اچھے خرچ سے رہتا تھا لیکن انھیں کسی پر شمہ برابر بھی بوجھ بننا گوارا نہ تھا۔ بیٹے کے ہزار اصرار و التجا کے باوجود کہ پرمیشور کی لیلا سے ہمیں کچھ کمی نہیں، اور بابو جی کا خرچ ہی کتنا ہوگا جو ہمارے اوپر کچھ وزن بڑھے، پنڈت نند کشور کا چولہا الگ جلتا تھا اور جس حد تک کہ وہ نقل و حرکت پر قادر تھے، آزادانہ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ گھر کی اوپری منزل کی کوٹھری اور برساتی انھوں نے اپنا لی تھی، اس کا کرایہ لینے پر وہ بیٹے کو مجبور نہ کر سکے تھے لیکن اپنی آمد و رفت کی سہولت کے لئے انھوں نے زینے اپنے خرچ پر بنوا لئے تھے جو باہر کی طرف کھلتے تھے۔ اندرونی زینہ تو پہلے سے تھا ہی، لہٰذا جب بیٹے پوتے بہو کو دیکھنے کے لئے ان کا جی کرتا تو اندر ہی اندر ان سے مل بھی سکتے تھے۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ جب اکبری بائی کا رونا پنڈت نند کشور کی تلاش میں ان کے خانم کے بازار والے گھر پر پہنچا ہے تو پنڈت جی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اگلے دن صبح وزیر خانم کے یہاں آنے کے لئے خوشی خوشی منظوری دے دی اور یہ بھی کہا کہ کسی سواری یا راہبر کی ضرورت نہیں ہے، میں آپ ہی آپ آجاؤں گا۔

وزیر نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ پھر پنڈت جی کے شایان شان کمرہ درست کرانے اور گھر کی ضروری صفائی میں لگ گئی۔ جس کمرے کے لئے اس نے اپنے دل میں ٹھہرایا تھا کہ یہاں پنڈت جی کی

آؤ بھگت اور خاطر داری کروں گی اور پھر وہیں تفاول بھی ہو جائے گا، وہ کمرہ مکان کی ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف پڑتا تھا۔ اس میں بخیال خود یہ خوبی اس نے دیکھی تھی کہ سب سے الگ تھلگ تھا لیکن نوکر چاکر مستعد تھے اور پکارنے پر فوراً مہیا تھے۔ یہاں تنہائی بھی تھی اور پنڈت جی کو گھر کے اندر آنے کی زحمت سے بھی عافیت تھی۔ لیکن اب اچانک وہ کمرہ اسے نامناسب معلوم ہونے لگا۔ اس نے خیال کیا، پنڈت جی کہیں دل میں یہ نہ سوچیں کہ مجھے گھر کے باہر ہی ٹرکا دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جس کمرے میں نواب شمس الدین احمد خان کی تواضع ہوئی تھی وہی کمرہ ٹھیک رہے گا۔

خوب جھاڑ پونچھ کے بعد کمرے میں کس کے جاروب کشی ہوئی، پھر فرش گلاب کے پانی سے دھویا گیا۔ اسے پنکھوں کی ہوا سے جلد جلد خشک کر کر دریاں بچھائی گئیں، پھر دھلی ہوئی سفید چاندنی لگا کر کمرے کو بخور دے کر بند کر دیا گیا۔ علی الصبح پنڈت جی کے نہضت افزا ہونے کے پہلے پہلے کمرے میں قالین گاؤ تکیے لگ گئے، خاصدان پیچوان کا انتظام ہو گیا۔ گلاب پاش سے گلاب چھڑک کر کمرہ پھر بند کر دیا گیا۔

صبح کی روشنی نے کوچہ و برزن میں عنبر بیزیاں شروع کیں۔ شاہی جاروب کشوں کے اڑائے ہوئے غبار میں حلوائیوں کی دکانوں سے اٹھنے والے میٹھے دھوئیں کے امتزاج اور صبح صادق کی نئی نئی لہریوں میں چھنتی ہوئی جلیبیوں کی مہک نے فجر کی نماز پڑھ کر مسجدوں سے نکلنے والوں کے گلے اور آنکھوں میں خشک خوشبو کے دوستانہ پیغام اتار دیے۔ وزیر خانم کے گھر والی گلی میں بالائی فروش، نمش فروش، گوالے، انڈا مرغی بیچنے والے اپنی اپنی صدائیں بلند کرنے لگے۔ جہان آباد مینو سواد پر ایک نیا دن شروع ہوا۔ پرانے رنج جلد از جلد بھلا دینے والے اس شہر نے اندھیرے کی دھند سے سر نکال کر کہیں قطب صاحب کی لاٹھ کی نازک اور طمانیت قلب سے چھلکتی ہوئی گردن افرازی تو کہیں تغلق آباد میں محمد تغلق کے مقبرے کے جلال، تو کہیں بابا نظام الدین کے مزار پر انوار کے پہلو سے لگے جماعت خانے کی قدیمی مسجد میں تہلیلہ اور ترتیل قرآن کی سریلی آوازوں، اور کہیں شاہجہانی مسجد جامع کے دو رنگے گنبدوں اور مناروں پر بسیرا لینے والے، پھر مسجد کے حوض میں منقاروں کو تر کر کے اپنے دلوں کو ٹٹولنے اور کسی خودرو گل تر کی یاد میں ہوں ہاں کرنے والے بھورے نیلے کبوتروں کی ٹکڑیوں کے روپ میں، کہیں حویلی کے اندر ساون بھادوں کے فواروں کے اچانک چونک کر رواں ہونے اور کہیں سازوں کی مرتعش آوازوں اور طبلے پر پڑتی ہوئی تھاپ کی گونجیلی آوازوں کے روپ میں اپنے امٹ جمال و برنائی کا اعلان کیا۔ ایسے میں وزیر خانم کے دروازے کی کنڈی آہستہ سے کھڑکی۔ پنڈت نند کشور تشریف لے آئے تھے۔ ماما اصیل نے

جھپٹ کر دروازہ کھولا اور جھک کر تسلیمیں کرتی ہوئی انھیں گلاب سے گمکتے ہوئے کمرے میں لے آئی اور ادب کے ساتھ گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا کر خاصدان پیش کیا۔ پیچوان بھی پہلے ہی سے تیار رکھا گیا تھا اور اس کے فیض آبادی خمیرے سے سارا گھر پڑا مہک رہا تھا۔ پیچوان کی نقرئی مہنال پنڈت نند کشور کے ہاتھ میں دے کر اصیل نے دوبارہ جھک کر سلام کیا اور بولی:

''حضور ذری کی ذری پیچوان سے شوق فرمائیں۔ بندی ابھی خبر کرتی ہے، بی بی صاحب آپ ہی کی راہ دیکھ رہی تھیں، بس پل مارتے حاضر ہو جاں گی۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔'' پنڈت نند کشور نے کہا۔''اطمینان سے رہیں اور اطمینان سے آئیں، میں کہیں بھاگا تھوڑی جاتا ہوں۔'' ان کا لہجہ پست اور آواز بھاری لیکن مردانہ طرز کی خوشگوار تھی۔ آواز میں اتار چڑھاؤ بہت کم تھا، گویا بولنے والا پورے ذہنی اعتماد اور قلبی طمانیت کے عالم میں ہے، جہاں کوئی چیز اسے متحیر کر سکتی ہے نہ خوف زدہ کر سکتی ہے۔ پنڈت نند کشور کا قد کشیدہ، ڈیل دبلا اور رنگ گورا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں لمبی اور مخروطی تھیں، جیسی کہ مصوروں اور سنگتراشوں کی ہوتی ہیں۔ بائیں ہاتھ کی انگشت انگشتری کے سوا لمبی لمبی سفید انگلیوں میں کوئی انگوٹھی چھلا نہ تھا، ہاں بائیں ہاتھ کی مذکورہ انگلی میں گوریا کے انڈے کے برابر سبز بھورا لہسنیا چاندی کی کشتی نما انگوٹھی میں یوں نمایاں تھا گویا فلک زہرہ پر سورج طلوع ہو رہا ہو۔ لہسنیا کی ڈھائی لکیریں نیزۂ خطی کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ لہسنیا میں عموماً ایک، یا حد سے حد ڈیڑھ لکیر ہوتی ہے۔ دو لکیروں کا لہسنیا نادر اور ڈھائی لکیروں کا لہسنیا ایک پوری بادشاہی کے خراج سے بڑھ کر گردانا جاتا ہے۔ پنڈت جی کی انگوٹھی پر بڑے بڑے رؤسا کی للچائی ہوئی نظریں پڑ چکی تھیں لیکن کسی کو یہ بھی پوچھنے کا یارا نہ تھا کہ صاحب آپ کو یہ نگ کہاں سے ملا، چہ جائے کہ کوئی اسے ان سے خرید لینے کی بات کرتا۔

پنڈت نند کشور از سرتا پا سفید لباس میں تھے، حتیٰ کہ ان کا برہمنی طرز کا عمامہ بھی سفید تھا، ورنہ پروہت اور منجم عام طور پر گیروا عمامہ باندھتے تھے۔ پرانے طرز کی گھیردار قبا البتہ رنگ سے عاری نہ تھی، کہ قبا تو رنگین ہی ہوتی تھی، لیکن پنڈت جی کی قبا اتنے ہلکے زرد رنگ کی ململ کی بنی ہوئی تھی کہ اس کے نیچے پاجامے کی سفیدی نے قبا کی زردی کو ڈھک لیا تھا۔ دہلوی انداز کا پاجامہ، سفید سنگی (۱) کا، مہریاں نہایت فراخ کہ چلتے میں گھیتلی جوتی پائچوں کے نیچے آ جاتی تھی۔ وہ عموماً لنکلاٹ [انگریزی میں Long Cloth، جسے

(۱) ریشم ملا ہوا سوتی دھاری دار کپڑا۔

بعد میں عورتیں ٹینکلاٹ کہنے لگیں] یا گزی کا پاجامہ پہنتے تھے لیکن آج وزیر خانم کے یہاں جانے کے خیال سے سنگی کا پاجامہ پہن کر آئے تھے۔ ان کی داڑھی لمبی، گھنی اور سفید تھی۔ اگر چہ ان کے بشرے پر ضعیفی کے کچھ نشان نمایاں نہ تھے لیکن ان کی بھویں بھی سفید ہو گئی تھیں۔ بائیں ہاتھ میں آبنوسی بیراگی، دائیں میں صندل کی ہزار دانہ تسبیح، گلے میں سفید گلو بند جس کے نیچے سے رودراکش کے بہت بڑے بڑے کنٹھی دانوں کا مالا نظر آتا تھا۔ ان کی وجود کا سارا تاثر سفید اور نازک کپاس کے پھول جیسا تھا۔

ابھی انھوں نے پیچوان ملاحظہ کرنا شروع ہی کیا تھا کہ پردہ ہٹا کر وزیر خانم اندر داخل ہوئیں۔ پنڈت جی کے خیال سے انھوں نے لباس کا کچھ خاص اہتمام نہ کیا تھا، لیکن پھر بھی گاچ کی سنہری جالی کے ڈوپٹے پر لال دھاریوں والی ریشمی محرمات کا پاجامہ عجب بہار دکھا رہا تھا۔ ناک کان کلائیاں زیور سے عاری تھیں، صرف گلے میں نیلم کی جڑاؤ دھکدھکی گردن کے سڈول پن اور روادی گردن کی دلکشیوں کی طرف کچھ اشارہ کر رہی تھی۔ وزیر نے پنڈت جی کو جھک کر سلام کیا اور بولیں:

''اللہ پنڈت جی مجھ ناچیز بندی پر آپ کا کس قدر احسان و کرم ہے...''

لیکن پنڈت نند کشور نے ہاتھ اٹھا کر انھیں کچھ مزید کہنے سے روکتے ہوئے فرمایا:

''بیٹا، اس میں احسان کیسا اور کرم کس پر۔ تم تو اپنے بچے ہو۔ تمھیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ تم نے اس گوشہ نشین کو کیونکر یاد کیا؟ تمھاری نانی جان بتا رہی تھیں کہ تم خود قدم رنجہ کرنے کو تیار ہو۔ میں نے کہا، نہ بھائی اتنا بڑا گناہ ہم سے نہ ہوگا۔ ہم آپ ہی چل کر جائیں گے اور اپنی بچی سے ملیں گے۔''

''اللہ آپ نے تو میری زبان ہی بند کر دی۔ اب شکریہ ادا کروں تو آپ خفا ہوں اور کچھ نہ کہوں تو اپنی نگاہوں میں چور ٹھہروں۔'' وزیر نے آنکھیں جھکا کر ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

''تو لو، شکریہ تمھارا ہم نے قبول کیا۔ اب کہو میری یاد اچانک کیونکے آگئی؟... یا میں ہی بتا دوں؟''

وزیر کے کانوں میں پنڈت نند کشور کی بھاری، ٹھہری ہوئی، صلابت سے بھرپور لیکن دلکش آواز یوں تھی گویا کوئی فرشتۂ رحمت کمزور اور گناہ گار لوگوں کو صلاح اور سلامتی کی طرف بلا رہا ہو۔ نند کشور کے سامنے وہ خود کو بالکل ننھی بچی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دو زانو بیٹھ کر اور سر جھکا کر دھیمی آواز میں کہا:

''حضور پر سب کچھ روشن ہے۔ میں کہوں گی بھی تو وہی کہوں گی جو حضور پر پہلے ہی سے آئینہ ہے۔''

پنڈت جی مسکرائے۔ ''اچھا کسی پھول کا نام لیجئے۔'' انھوں نے کہا۔

''جوہی،'' اس کے منھ سے بے اختیار نکلا۔

پنڈت نند کشور نے آنکھیں بند کرلیں، تسبیح کے کچھ دانے شمار کیے، پھر ایک پل بعد بولے۔

''دلی کے شمال مغرب میں، یہاں سے بہت دور بھی نہیں، نوابی ریاست ہے، والی ریاست کا نام...'' انھوں نے چند لمحے توقف کیا، ''...شمس الدین احمد خان ہے۔''

وزیر کا چہرہ شرم سے گلابی ہوگیا۔ وہ سر جھکائے جھکائے بولی:

''سرکار کے لئے عیاں راچہ بیاں، لیکن میرا جی بہت ڈرتا ہے کہ...''

''ڈر کی کچھ بات نہیں۔ لیکن تم اور کیا جاننا چاہتی ہو؟ انجام کے بارے میں متفکر ہو؟''

''ج...جی...جی نہیں، انجام جاننے سے ڈرتی ہوں۔ میں تو راہ بھٹکی ہوئی ادھر ادھر پریشان پھرتی ہوں۔ راستہ چاہتی ہوں۔ اگر حضور کی رہنمائی ہو جائے...''

''...کہ اس وقت کیا کیا جائے؟ کیوں، ایسا ہی ہے نہ؟ نواب کی طرف سے سلسلہ جنبانی کی منتظر ہو؟''

''جی، وہ تو ہو چکی۔ لیکن اس کے بعد اب میں کیا کروں؟ مزید انتظار کروں یا ان کے قدم پر قدم بڑھاؤں، میری تو عقل کام نہیں کر رہی۔'' یہ کہتے کہتے وزیر کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

''تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے بی بی۔ بات تو سامنے کی ہے لیکن چلو تمھارے اطمینان کے لئے خواجہ صاحب سے پوچھ لیتے ہیں۔''

وزیر کا چہرہ کھل اٹھا۔ نہ جانے پنڈت جی کو کیسے خبر ہوئی کہ میں یہی چاہتی تھی، اس نے دل میں کہا۔

''جی، بہت مبارک، جیسی آپ کی مرضی ہو۔ میں دیوان لے آؤں؟'' اس نے پر شوق لہجے میں پوچھا۔

''ہاں لاؤ، لیکن دیکھو، پاک صاف ہاتھوں سے اٹھانا، اور رحل پر رکھ کر لانا، اور پاک کاغذ کا ایک تاؤ اور پاک روشنائی کی دوات اور نئے نرکل کا نیا نیزہ بھی لیتی آنا۔''

''پاک صاف ہاتھوں'' کا مطلب وزیر پر خوب عیاں تھا۔ وہ بولی، ''جی، میں نہائی ہوئی اور باوضو ہوں۔ دیوان ابھی لائی۔'' فال نکالنے کی غرض سے مطلوبہ کاغذ اور روشنائی، نیزہ، سب پہلے ہی سے مہیا تھے، لہٰذا وزیر کو کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ وہ کمرے کے باہر گئی اور چند لمحوں بعد وہ اخروٹ کی لکڑی کے منقش رحل پر دیوان حافظ کا ایک مذہب نسخہ رکھے ہوئے واپس آئی۔ پیچھے پیچھے ماما اصیل کے ہاتھوں میں

قلمدان اور کاغذ تھا۔ دیوان مع رحل اس نے پنڈت نند کشور کے سامنے رکھ دیا لیکن دیون کو کھولا نہیں۔قلمدان اور کاغذ بھی رحل کے پاس رکھ دیئے گئے۔ اب پنڈت جی قبلہ رخ ہوکر دو پہلو بیٹھ گئے اور زیرلب کچھ پڑھنے کے بعد انھوں نے فرمایا۔

''ذرا گلاب پاشی پھر کرادو اور لوبان، اگر، اور عود کا بخور بھی کراؤ۔صبح تو یہ حجرہ پاک کیا جا چکا ہے، خوشبو بھی ہو چکی ہے، لیکن اس وقت بھی ضروری ہے، سمجھیں؟''

گلاب پاشی اور بخور کے دوران پنڈت نند کشور آنکھیں بند کئے چپ بیٹھے رہے، پھر انھوں نے ہاتھ اٹھا کر کچھ دعا مانگی، آمین کہی اور وزیر سے کہا کہ تم بھی آمین کہو اور پھر سب دروازے بند کرادو۔ دروازے بند ہونے کے بعد پنڈت جی نے وزیر سے کہا:

''اب تم میرے سامنے بیٹھ جاؤ، یوں کہ دیوان حافظ درمیان میں ہو، ایک طرف میں بیٹھوں، اس طرح کہ کتاب میں دائیں ہاتھ سے کھول سکوں، اور دوسری طرف تم بیٹھو اور خواجہ صاحب کا تصور کرو کہ ان کی روح مبارک یہاں موجود ہے، سمجھیں؟''

''جی، ل...لیکن ت...تصور کس طرح کیا جاتا ہے میں نہ جانوں ہوں۔'' وزیر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کچھ نہیں، بس سمجھ لو کہ یہاں میں بیٹھا ہوں، دیوان حافظ پڑھ رہا ہوں اتنے میں لسان الغیب کہیں سے گھومتے پھرتے آنکلے ہیں۔''

''لیکن... لیکن ان کا تو صدیاں ہوئیں وصال ہو چکا۔'' وزیر نے کچھ گھبراتے ہوئے کہا۔

''ہاں، وصال ہو چکا۔لیکن وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، وہ اپنے کلام میں موجود ہیں۔ جب ان کا کلام یہ سوچ کر پڑھو کہ یہ الفاظ انھوں نے ابھی ابھی کہے ہیں، اور صرف تمھارے لئے کہے ہیں ،تو بس ان کا تصور خود بخود قائم ہو جائے گا۔شاعر کبھی مرتا نہیں، وہ اپنے الفاظ کے روپ بہروپ میں شاخ وشاخسار، باغ ومرغزار، کاخ وکو میں، قصور وخیام میں، ہر جگہ بولتا رہتا ہے۔چلو اب تعجیل کرو، ورنہ وقت نکل جائے گا۔''

وزیر نے ڈرڈر کر پنڈت جی کے سامنے اپنی جگہ لی اور آنکھیں بند کر کے دھیان کو دیوان حافظ کے پہلے شعر پر مرتکز کر دیا۔ پنڈت جی کی آواز اسے کچھ گونجتی ہوئی سی، کچھ دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

''دیکھو نور چشم، لسان الغیب کے کلام سے تفاول کے کئی طریقے ہیں۔لیکن باوضو اور پاک ہوکر

پاک جگہ پر بیٹھنے کے بعد پہلی بات یہ متعین کرنا ہے کہ اس وقت دن یا رات کا پہر کون سا ہے۔ تم دیکھ ہی رہی ہو کہ اس وقت دن کا دوسرا پہر لگنے والا ہے۔ یہ پہر لگ جائے تو ہم اپنا کام شروع کریں گے۔ لیکن اس کے پہلے یہ بھی معلوم کریں گے کہ اس وقت زہرہ، یعنی لولی فلک، جو تمام شعرا کی مربی ہے، کس برج میں ہے اور وہاں کب تک رہے گی۔ تو یہ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ زہرہ اس وقت برج عطارد میں ہے، جو دبیر فلک ہے۔ لہٰذا یہ وقت تفاول کے لئے اور بھی مناسب ہے، سمجھیں؟"

وزیر نے کچھ جواب نہ دیا، لیکن اچانک اسے ایسا لگا کہ ایک بڑا وجیہ وممتاز شخص سر پر علما جیسا عمامہ باندھے، بہت بلند و بالا، اس کی آنکھیں روشن لیکن سوچ میں ڈوبی ہوئی، چال میں تمکنت، کہیں اسی کمرے میں کسی دیوار سے ہو کر اندر آ گیا ہے اور اس کے سامنے سے گذر گیا ہے، کہاں، یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ دیوار سے ہو کر؟ کیا دیوار شق ہو گئی ہے، یا کوئی سایہ...؟ ایک لمحے کے لئے اس کا بدن لرز اٹھا، اسے سردی سی لگی، لیکن پنڈت جی کی آواز میں قوت نامیہ کی گرمی اور نوائے سروش کی طہارت دونوں کے لہریئے ریشمی لچھے کا روپ دھار کر سارے کمرے، بلکہ سارے گھر میں بہ رہے تھے۔

"لو بھئی اب دوسرا پہر لگ گیا۔ شاعروں کے مردہ حروف میں جان پھونکنے والی ابھی بھی منشی فلک سے ساز باز میں مصروف ہے۔ ہمارے لئے وقت کافی و وافر ہے۔ اب میرے سامنے دن کے دوسرے پہر کی جدول ہے۔ میں جھک کر زہرہ کو پرنام کرتا ہوں اور دیوان حافظ کھولتا ہوں۔ مقصد میرا یہ ہے کہ بی وزیر خانم بنت محمد یوسف سادہ کار کے بارے میں خواجہ سے پوچھوں کہ نواب شمس الدین احمد کے باب میں ان کا کیا حکم ہے۔ میں جدول کے ایک خانے میں یوں ہی انگلی رکھتا ہوں، یہ حرف دال مہملہ ہے..."

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پنڈت نند کشور نے کہا، "بی بی، آنکھیں کھول دو۔ قلم کاغذ لو اور حرف دال لکھو۔"

وزیر خانم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جوں توں کر کے دال کا حرف لکھا اور بڑی بڑی شربتی آنکھوں سے پنڈت جی کی طرف دیکھنے لگی۔ پنڈت نند کشور نے کچھ اعداد شمار کیے، کچھ تامل کیا، اور بولے:

"اب حرف رائے مہملہ لکھو۔ گویا یہ لفظ ہاتھ آیا: "در"، سمجھیں؟"

"جی سرکار، سمجھی۔"

پنڈت جی نے پھر کچھ گنتیاں شمار کیں، کچھ دیر تک مزید تامل کیا، پھر بولے:

"اب حرف لکھو، یہ بھی رائے مہملہ ہے۔"

''جی لکھ دیا۔'' قلم میرے ہاتھ میں یوں ہے گویا میں اپنی تقدیر خود ہی لکھ رہی ہوں، اس نے دل میں کہا۔ اس اثنا میں پنڈت جی نے کہا، ''اب لکھو، الف۔ لکھا؟''

''جی۔ لکھا۔''

ایک پل بعد پنڈت جی نے کہا، ''اب ہاے ہوز لکھو، گویا لفظ ہاتھ آیا: ''راہ''، اور فقرہ بنا، ''درراہ۔'' سمجھیں؟''

اب وزیر خانم کے ہاتھ میں اس قدر لرزش تھی کہ اسے خلجان ہونے لگا کہ کہیں روشنائی کی بوند ٹپک کر کاغذ کو گندہ نہ کر دے، یا حرف بگڑ نہ جائیں۔ پنڈت نند کشور نے اس کی گھبراہٹ کو سمجھ لیا اور ہمت افزائی کے لہجے میں بولے:

''لکھو، لکھو، جو میں بولوں لکھتی جاؤ، حرف کے بننے بگڑنے کا خیال مت کرو۔ اب لکھو، ع۔ سمجھیں، حرف ع لکھو۔''

''جی لکھ دیا۔'' خدا جانے کیوں وزیر پر کچھ گریہ سا طاری ہونے لگا تھا۔ وہ رک رک کر بولی: ''حضور، میں پانی پی آؤں؟''

''پانی، پانی یہیں منگا لو۔ صراحی بھروا کر رکھ لو۔ کچھ باک نہ کرو۔''

وزیر نے تالی بجائی، سامنے کا دروازہ آدھا کھلا اور اصیل نے جھانکا کہ کیا حکم ہے۔ وزیر کے اشارے پر وہ جست کی صراحی اور دو کٹورے لے آئی۔ وزیر خانم پورا کٹورا دو سانس میں پی گئیں۔

''اب کچھ جی ٹھہرا؟ ڈرتی کیوں ہو بیٹی؟ اچھا تو لکھو حرف ش۔''

''جی لکھ لیا۔''

ایک ذرا سے توقف کے بعد پنڈت جی بولے، ''اب لکھ دو ق۔ سنا، حرف ق لکھو۔'' ان کی آواز میں خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ ''تو اب پورا فقرہ بنتا ہے: درراہ عشق۔ سمجھیں؟''

''جی سرکار، سمجھی۔''

اس طرح ایک ایک حرف جوڑ کر کوئی ایک گھڑی کی مدت میں پنڈت نند کشور نے مصرع بنایا ع

درراہ عشق فرق غنی و فقیر نیست

''واللہ کیا خوب مصرع نکلا ہے، بی بی مبارک ہو۔'' انھوں نے کہا۔

''لیکن اس کا مطلب میں سمجھی نہیں۔'' وزیر کی پیشانی پسینے سے بھیگ چلی تھی۔ ''حضور اس میں

میرے لئے ہدایت کیا ہے...''

''تو بھی کیا بھولی بٹی ہے، یہ تو ایک ہی مصرع ہے، مصرع اولیٰ۔ حضرت لسان الغیب دوسرا تو ارشاد کریں۔ تب جا کے کچھ روشنی ملے گی۔ ابھی تو آب چشمۂ حیواں درون تاریکیست۔ بس یہ کہ یہ مصرع کچھ حسب حال سا ہے۔ چلو، اب دوسرا مصرع ڈھونڈتے ہیں۔ کاغذ قلم سنبھالئے اور جیسے جیسے ہم بولتے ہیں، لکھتی جائیے۔''

کوئی گھڑی سوا گھڑی کی مدت میں دوسرا مصرع حسب ذیل ہاتھ آیا ؏

اے پادشاہ حسن سخن با گدا بگو

وزیر کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کا جی چاہا، پنڈت جی کے قدموں میں سر رکھ دے۔ وہ اٹھ ہی رہی تھی کہ پنڈت نند کشور نے کہا:

''سبحان اللہ، سارے سوالوں کا جواب مل گیا۔ لیکن ذرا دیکھیں تو سہی یہ کلام لسان الغیب کا ہے بھی کہ نہیں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے دیوان کو کھولا، ردیف واؤ تلاش کی اور ہنس کر بولے:

''بہت خوب، بہت خوب، غزل دیوان میں موجود ہے، خواجہ نے مطلع یوں ارشاد فرمایا ہے ؎

اے پیک راستاں خبر سرو ما بگو

احوال گل بہ بلبل دستاں سرا بگو''

انھوں نے عالم لطف میں زانو پر ہاتھ مارا اور فرمایا، ''خواجۂ شیراز نے تمھیں پادشاہ اور انھیں گدا قرار دیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ تم ان سے سخن کرو، بلکہ یوں سخن کرو جس طرح پادشاہان جہاں اپنی چوکھٹ کے دریوزہ گروں سے سخن کرتے ہیں۔ تم طالب نہیں مطلوب ہو۔ اللہ مبارک کرے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے دعا کو ہاتھ اٹھائے، دعا پڑھ کر وزیر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور طالب رخصت ہوئے۔ وزیر خانم نے جلدی سے ایک تھیلی روپیوں کی، ایک بڑا ریشمی رومال، موگرے کے جونپوری عطر کی ایک شیشی اور عمامے کے لئے بلبل چشم کا ایک تھان پیش کیا کہ یہ حقیر نذرانہ کنیز کی طرف سے قبول ہو۔ لیکن پنڈت نند کشور نے کچھ بھی لینے سے انکار کیا۔

''اللہ تعالیٰ جب کامگار و کامران کریں گے تو اس وقت دعائے خیر سے یاد کر لینا۔ میں اپنے بیٹے بیٹیوں سے کچھ لینا حرام سمجھتا ہوں، سمجھیں۔''

''اللہ تو میں خدا نہ کرے کچھ معاوضہ تھوڑی پیش کر رہی تھی۔ ایسی بے ادبی مجھ سے عالم جنون میں

بھی سرزد نہ ہوتی۔ میں تو محض معمولی سا تحفہ حضور کے قدموں پر نچھاور کر رہی تھی۔ مگر شاید ایسا میرا نصیبہ کہاں۔'' وہ کچھ روہانسی ہوکر بولی۔

''اے لو تم تو برا مان گئیں۔ بیٹے، یوں ذرا سی بات پر دل تھوڑا نہیں کرتے۔ اچھا، تم کہتی ہو تو یہ عطر کی شیشی لئے لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے کشتی میں سے عطر اٹھایا، اس کی ڈاٹ کھول کر سونگھا، اور ذرا متبسم ہوکر ایک بوند سے کچھ کم عطر دو انگلیوں پر لے کر گلوبند پر مل لیا۔

''لے اب تو خوش ہو۔'' انھوں نے کہا، پانچ شاہ عالمی روپے نوکروں کے انعام کے طور ڈیوڑھی کے طاق میں رکھے، اور ''وقت آنے پر ہمیں بھولنا مت'' کہتے ہوئے دم زدن میں گھر سے باہر ہو گئے۔ وزیر کو ایسا معلوم ہوا جیسے گھر میں اچانک سناٹا چھا گیا ہے، گویا گھر سے کوئی بڑا بھاری سامان نکل گیا ہو اور اس کی خالی جگہ آنکھوں اور دل پر شاق گذر رہی ہو۔

نامہ و پیام

پنڈت نند کشور کے جانے کے بعد بڑی دیر تک تو وزیر پنڈت جی کی باتوں، ان کی محبت بھری مہربانیوں اور ان کی نورانی صورت کو دوبارہ اپنے ذہن میں زندہ کرنے میں محو رہی۔ اس پر لذت اور ابتہاج کی ایک کیفیت طاری تھی جو اس کے بدن کو گرم اور روح کو شاداب کر رہی تھی۔ بہت دیر بعد جب طبیعت اعتدال پر آئی اور ماما اصیل نے امور خانہ داری کی طرف اسے متوجہ کرنا چاہا تو اسے اچانک خیال آیا کہ پنڈت جی نے یہ تو بتا دیا کہ نامہ لکھنے میں پہل تو ہی کر، لیکن میں نے ان سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ لکھوں کیا اور کس طور لکھوں۔ اسے خود پر بے حد غصہ آیا کہ ایسی بھی میں کیا الھڑ ہوں کہ اتنی سی بات پوچھنا بھول گئی یا اب اگر بھول ہی گئی تو کیا آپی آپ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ نواب کو خط لکھنا بھلا کیا مشکل ہے، ابھی لکھے دیتی ہوں۔

لیکن وہ سارا دن گذر گیا اور اس کی سمجھ میں نہ القاب و آداب کا کچھ ڈھب آیا، نہ نفس مضمون کا۔ کیا لکھوں، ان سے کہوں کہ آپ بہت یاد آتے ہیں؟ توبہ کتنی خفیف بات ہے۔ میں بھلا یوں لکھ سکتی ہوں؟ اور بارے لکھ بھی دوں تو وہ کیا خیال کریں گے؟ سو پھر، یہ لکھوں کہ اب کب ملاقات ہوگی؟ ہاں، مگر کن الفاظ میں لکھوں؟ ایسا تو نہ لگے کہ یہ بیگما بالکل اتاولی ہوئی جاتی ہیں۔ وہ کیا فقرہ تھا جو نانی جان ایسے موقعوں پر بولتی تھیں... ہاں، توبہ ہے یہ لونڈیا تو ہتھیلی پر لئے پھرتی ہے... اس خیال سے ہی اس کے رخسار گلابی ہو گئے، بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں اور نواب شمس الدین احمد... اور میں بے پردہ اور میری آنکھوں میں کوئی بلاوا، کوئی دعوت... اللہ میری توبہ، میں شریف زادی ہوں کہ شیطان کی اولاد۔ ہتھیلی پر لئے پھرنا... یہ تو اشارے سے بلانے اور منھ سے بولنے سے بدتر ہے۔

دبلا پتلا ہرنی جیسا چھریرا بدن، متوسط سے کچھ بالا قامت، مور جیسی مغرور گردن، سینہ اور کولھے بھاری، کمر پتلی، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں، چہرے پر نمک ہی نمک برستا ہوا، ہر ادا بیگماتی، ہر ادا میں غربیلہ،

ہر بات میں ڈومنی پن... یہ کس کا سراپا ہے؟ نواب شمس الدین احمد نے سوچا۔ انھیں نیند نہیں آ رہی تھی، حالانکہ آج وہ بہت جلد ہی بستر پر چلے گئے تھے۔ چپی والیاں، سر کو سہلانے تھپتھپانے والیاں تھکنے لگی تھیں لیکن نواب کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔

وزیر خانم ہڑ بڑا کر بیدار ہو گئی۔ یہ میں نے ابھی کیا دیکھا، یا کیا کہا؟ میں کہاں ہوں؟ میں کہاں تھی؟ مجھے کیا پتہ اور مجھ سے کیا مطلب کہ نواب شمس الدین احمد میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور میرا سراپا ان کے ذہن میں کیسا ہے؟ لیکن یہ کون لوگ ہیں جو جام اتحاد سے مست ہیں اور کس نے کہا تھا کہ جیسے پیٹھ دکھاتے ہیں ویسے ہی منھ بھی دکھایئے گا؟ سارا گریبان اور ڈوپٹہ پسینے میں بھیگا ہوا، سانسیں تلپٹ، سارے بدن میں چل سی پڑی ہوئی، جیسے چیونٹیوں نے کاٹ کھایا ہو۔ یہ میں کیا کرتی پھر رہی ہوں؟ کوئی دم میں مجھے جنون ہووے گا...نہیں تو مراق ضرور ہی ہو جائے گا۔ سنا ہے جن لوگوں کو مراق ہو جاتا ہے وہ کسی ایک ہی بات کو پکڑ لیتے ہیں اور اسی کی رٹ لگاوتے رہتے ہیں۔ آخر نواب شمس الدین کو کیا پڑی تھی جو مجھ دکھیا پر ان کی نظر ٹھہری، کیوں وہ میرے یہاں آئے، میری تنہائی میں خلل ڈالا...

اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی، اسے لگا جیسے شام کا مطلع دیر سے ابر آلود رہا ہو اور اچانک کہیں سے تیز روشنی کی شعاع آ کر مٹ میلے افق کے آر پار ہو جائے، ہر طرف روشنی سی پھیل جائے، درختوں کی سرنگوں پتیوں کے نیچے سے کرنیں پھوٹیں، شام کی آمد سے خوف زدہ دام و دد اور طیور پھر سے پھرتیلے اور مستعد ہو جائیں۔ اسے ایسا لگا گویا شمس الدین احمد نے کہیں سے آ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا ہے اور وہ ان کے سینے سے لگی ہوئی شکایت اور سرگوشی کے لہجے میں کہہ رہی ہے۔

آ کے مجھ پاس دو گھڑی تو نیں ذوق تنہائی میں خلل ڈالا

ہائے کیا میر حسن مرحوم نے یہ شعر میرے ہی لئے کہا تھا یا اوروں پر بھی ایسی ہی بیتتی ہے؟ مگر کس موقعے سے اور کس موقعے پر یہ شعر یاد آیا۔ اب مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، یہی شعر لکھ کر بھیج دوں گی۔ نرا یہی شعر بھیجوں یا کچھ لکھوں بھی؟ لیکن لکھنا کیا ہے، ساری بات تو شعر میں کہہ دی گئی ہے اب میرے لئے بچا ہی کیا ہے۔ مگر کہیں وہ یہ نہ سوچیں کہ نامہ کیا لکھا پتھر کھینچ مارا نہ آداب نہ القاب نہ سلام نہ بندگی، نہ کچھ تفصیل کہ مراسلہ کاہے کو لکھا جا رہا ہے۔

نہیں میں اور نہیں لکھنے کی، وہ سمجھیں یا میرا خدا سمجھے۔ اچھا اس پر اپنے مصرعے لگا کر تضمین کر دوں؟ اچھا بھلا مخمس کا بند تیار ہو جائے گا۔ یہ بات اس کے دل میں آئی ہی تھی کہ گویا یہ مصرع بھی اسے

القا ہو گیا ع

نقشہ گھر کا مرے بدل ڈالا

... نہیں گھر کا نقشہ بدل ڈالنا اس جگہ بے معنی سی بات ہے، یوں کہوں ع

نقشہ دل کا مرے بدل ڈالا

... نہیں یہ مصرع بھی ست ہے، یوں کہنا چاہئے ع

دل کا احوال ہی بدل ڈالا

... واہ اب یہ مصرع برجستہ ہو گیا، اس نے دل میں کہا۔ پھر بات کی بات میں دو پیش مصرعے اور بن گئے اور بڑا بامعنی اور مربوط مخمس تیار ہو گیا۔

دامن صبر کو مسل ڈالا — جادۂ ضبط بھی کچل ڈالا

دل کا احوال ہی بدل ڈالا — ذوق تنہائی میں خلل ڈالا

آ کے مجھ پاس دو گھڑی تو نیں

چلو بارے مخمس تو مہیا ہو گیا، اب اسے خود لکھوں یا خوش نویس سے لکھواؤں، گویا وصلی کا تحفہ بھیج رہی ہوں۔ نہیں دوسرے سے لکھوانے کا کچھ محل نہیں۔ میں کوئی رسمی سوغات تھوڑی ارسال کر رہی، میں تو دل کی بات زبان قلم پر لا رہی ہوں۔ اچھا لکھوں یا خراب، لیکن خود ہی لکھوں گی۔

یہ فیصلہ کرتے ہی اس نے جامع مسجد کے مشرقی دروازے کے مینا بازار سے نئے نیزے منگوائے، انھیں قلم تراش سے چھیل کر سڈول بنایا، پھر قلم بنائے، خفی، متوسط اور جلی۔ قلم تیار ہو گئے تو انھیں محلے کے مولوی صاحب کے پاس دو روپے نذرانہ لے کر اس التماس کے ساتھ بھیجا کہ ان کی نوک درست کر دیں، شگاف لگا دیں اور پھر ان پر قط لگا دیں۔ مولوی صاحب نے از راہ لطف اسی وقت تینوں قلموں کو شگاف اور قط لگائے اور انھیں کاغذ پر جانچ کر کر اپنا اطمینان کر لیا کہ ٹھیک بنے ہیں۔ پھر اپنی دعاؤں کے ساتھ تیار شدہ قلم واپس کئے کہ اب شوق سے لکھیں اور مطمئن رہیں، ان کا قط دیر تک قائم رہے گا بگڑے گا نہیں۔

یہ سب تیاریاں کرتے سہ پہر ہو گئی۔ وزیر کا بھی جی کچھ ماندہ ہو رہا تھا، اس نے دل میں کہا کہ اب رات کو مشق بناؤں گی اور صبح کو بھجواؤں گی۔ کاغذ افشانی اور سنہرا ریشمی خریطہ بھی تیار کرا لیا گیا تھا، بس لکھنے اور بھیجنے کی دیر تھی۔ رات میں اس نے کئی بار کی مشق اور کئی تختے کاغذ کے مسترد کرنے کے بعد اپنا مخمس اپنی حد تک بہترین انداز و اسلوب میں خط نستعلیق میں متوسط قلم سے لکھا۔ اوپر خط رقاع میں "ہو الودود"، اور

نیچے خفی قلم سے خط نستعلیق میں لکھا: ''رقیمۂ نیاز و منتظر جواب وزیر خانم عفاء اللہ عنہا۔'' پھر خط کو لپیٹ کر موم جامے میں مہر بند کیا، خریطے کو ہلکا سا معطر کیا اور مہر بند نامے کو خریطے میں ڈال کر خریطے کو بھی مہر بند کر دیا۔ یہ سب کام گئی رات تک مکمل ہوئے لیکن اس نے رات کی محنت اس لئے منظور کی کہ پھر رات سے صبح تک سوچنے اور فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لئے الغاروں وقت پڑا ہے، ابھی تو باتیں ہی باتیں ہیں، لیکن نامہ ایک بار گھر سے چلا گیا تو جیسے کمان کا چھوٹا ہوا تیر ہو گیا۔ اس لئے رات اور صبح تک اور سوچ لوں گی کہ یہ نامہ بھجواؤں بھی یا نہ بھجواؤں۔

صبح ہونے کے پہلے ہی مرغان سحر کے غل نے اسے بیدار کر دیا۔ بیدار ہوتے ہی اس کے ذہن میں خیال گونجا کہ نامہ تو بھیجنا ہی چاہیئے، ساتھ کچھ چھوٹا موٹا تحفہ بھی چاہیئے ہے۔ لیکن تحفہ کیا بھجواؤں؟ نواب سے کچھ بے تکلفی تو ہے نہیں جو ایسی چیز بھیج سکوں مثلاً عطر یا رومال جس سے اپنا پن ظاہر ہو۔ قیمتی اشیا ان کے یہاں ایک سے ایک ہوں گی اور پٹی پڑی ہوں گی۔ دنیا میں کون سی شے ایسی ہو گی جو نواب کے پاس نہ ہو اور میں انھیں مہیا کر سکوں، ہاں کوئی ایسی چیز ہو جو یہاں کمیاب ہو، چاہے بہت قیمتی نہ ہو۔

اسے خیال آیا کہ چند دن ہوئے علاقۂ گڑھوال کا ایک بیوپاری شہد بیچتا ہوا آیا تھا۔ اس کے پاس لیچی کا شہد تھا، بایں معنی کہ مکھیوں کا چھتہ جس سے وہ شہد نکالا گیا تھا، وہ لیچی کے پیڑ پر لگا ہوا تھا اور اس میں جمع شدہ شہد زیادہ تر لیچی کے پھولوں سے نکلا ہو گا۔ اس میں لیچی کی خوشبو بھی تھی۔ یہ البتہ نادر شے ہو گی، اس نے سوچا۔ وہی شیشہ شہد کا بھیج دوں، امید ہے وہاں پسند کیا جاوے۔ یہ خیال آتے ہی وزیر خانم نے مودی خانے سے شہد کا شیشہ نکلوایا، اسے جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ ڈاٹ کھولی تو شہد میں لیچی کی خوشبو ویسی ہی باقی تھی، رنگ بھی نہ بدلا تھا۔ بہت ہلکا، تقریباً سفید رنگ، گائے کے گھی جیسا، اور اس میں روے بھی گھی ہی جیسے تھے۔ شیشہ بھی مہر بند کیا گیا، پھر اسے موم جامے کی تھیلی میں رکھ کر تھیلی بھی مہر بند ہوئی۔

اتنا کام کر لینے کے بعد وزیر کے دل میں ارادہ مصمم ہو گیا اب یہ سب سامان بھجوا کر ہی دم لوں گی۔ فوراً محلے کے چوکیدار کے یہاں سے ہرکارہ بلوایا گیا۔ وزیر خانم نے خود اسے ہدایت کی: ''دھیان رہے کہ یہ چیزیں خود نواب صاحب کی خدمت پیش ہونی ہیں۔ تو نے سنا ہو گا، ان کی دو کوٹھیاں ہیں۔ ایک تو یہیں پاس میں بلی ماروں میں، اور دوسری دریا گنج میں۔ پہلے معلوم کر لیجو کہ نواب اپنی کس حویلی میں تشریف رکھتے ہیں، وہیں جائیو اور نواب صاحب کی خدمت میں باریابی حاصل کر کے پورے ادب اور لحاظ سے کورنش بجا لائیو اور یہ خریطہ اور یہ تھیلی ان کے قدموں میں رکھ دیجو۔''

''سمجھتا ہوں بی بی صاحب، خوب سمجھتا ہوں۔ آپ کا کہا پوری طرح بجالاؤں گا۔ اور... کیا جواب کے لئے ٹھہرا رہوں گا؟'' ہرکارے نے سلام کر کے کہا۔

''نہیں، بس یہ بتادیجو کہ وزیر خانم بیگم صاحب نے سلام عرض کیا ہے اور یہ چیزیں ارسال کی ہیں۔ جواب کی حاجت نہیں۔''

''جی بہت خوب، بہت مبارک۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔''

''تو جا، جلد پھر آئیو۔ میں تیری راہ دیکھوں گی۔ اگر کام ٹھیک ہوگیا تو انعام اوپر سے دوں گی۔''

ہرکارہ دوبارہ سلام کر کے رخصت ہوا۔ اوپر اوپر تمکین وسکون کے باوجود وزیر خانم کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھیں، قلب پر ضعف ساطاری تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ اس اقدام کے نتیجے میں اس کی زندگی کا فیصلہ مضمر ہے۔ اگر جواب باصواب نہ ملا تو پھر اسے اپنی بساط حیات پھر سے مرتب کرنا ہوگی۔ یہ معاملہ دل کا بھی تھا اور آئندہ زندگی کے شب وروز کا بھی۔ خبر نہیں میں نے یہ ٹھیک کیا یا غلط کیا۔ لیکن میرے پاس چارہ ہی کیا تھا۔ انتظار کرنا میرا منصب نہیں، لیکن کیا خود سے لب کشائی میرے لئے روا تھی؟ لیکن لب کشائی تو نواب صاحب خود ہی کر چکے تھے... میں تو اپنا جواب ان کی خدمت میں پیش کر رہی تھی۔ اس میں عیب ہی کیا ہے؟... اور اگر عیب ہو بھی تو خواجہ صاحب کا کنایہ، پنڈت صاحب کی ہمت افزائی، نواب یوسف علی خان صاحب کا مشورہ، یہ سب بھی تو کچھ معنی رکھتے تھے؟ اسے مارسٹن بلیک بری طرح یاد آیا۔ کاش بلاک صاحب یوں چلے نہ گئے ہوتے... اور ان کے ساتھ میں کس طرح ہنسی خوشی چلی گئی تھی۔ نہ اماں باوا کا ڈر نہ شریعت کا لحاظ نہ پڑوسیوں اور ہم چشموں کا خیال... لیکن تب تو میں ناسمجھ تھی، بلند ارادے تھے اور جمنا جی کے سیلاب کی طرح اپنی راہ خود بنانے کا جوش تھا۔ نہ بچے نہ کوئی اور ذمہ داریاں، ہر طرف میں ہی میں تھی۔ اب تو دو جیوڑے اور بھی ہیں جن کے لئے مجھے بندوبست کرنا ہی کرنا ہے۔ سوچتے سوچتے اس کا دل گھبرانے لگا۔ یہ موا اکیلا گھر تو اور بھی کاٹے دوڑتا ہے۔ اس نے پالکی منگوائی اور سوار ہو کر منجھلی بیگم کے یہاں چلی گئی۔ بہن کے یہاں پہنچ کر اس نے پورا حال کہہ سنایا اور کہا کہ اب جب تک نواب صاحب کی طرف سے کچھ جواب نہیں آ تا میں یہیں رہوں گی۔

نواب شمس الدین احمد خان اس وقت اپنی دریا گنج والی کوٹھی پر تھے۔ اطلاع ملنے پر کہ سرکی والاں سے وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم صاحب کا فرستادہ باریابی کا مستدعی ہے، انھوں نے اسے اپنی سہ پہر کی

نشست گاہ میں ہی بلوالیا۔ اگر چہ وہ نشست گاہ صرف مخصوصین کے لئے تھی لیکن نواب کے دل میں بھی چھوٹی بیگم کی چونپ ایسی تھی کہ ہرکارے کی آمد کا سن کر بےچین ہو گئے۔ ان کے چوبدار کے پیچھے پیچھے ہرکارے نے دروازے پر پہنچ کر جوتیاں اتاریں، چوکھٹ پار کر کے سات سلام کئے اور وہیں منتظر رہا کہ اذن استقبال ہو تو آگے بڑھوں۔ چوبدار نے جھک کر سلام کیا اور کہا:

''وزیر خانم صاحب کا فرستادہ سرکار والا تبار کی خدمت میں حاضر ہے۔''

نواب نے اشارہ کیا کہ ہرکارے کو آگے آنے دیا جائے۔ قریب پہنچ کر ہرکارے نے ایک سلام اور کیا اور بولا:

''حضور کا اقبال بلند ہو، وزیر خانم صاحب نے بندگان عالی کے لئے کچھ نذر بھجوائی ہے۔ امر ہو تو پیش کروں۔''

نواب شمس الدین احمد کے چہرے پر مسکراہٹ آنے ہی والی تھی لیکن انھوں نے خود کو بروقت روکا اور پہلے کی ہی طرح متین چہرہ بنائے ہوئے انھوں نے کہا:

''بہت خوب۔ بیگم صاحب کا مزاج کیسا ہے؟''

''جی سرکار، بہت اچھی طرح ہیں۔''

نواب کا اشارہ پا کے چوبدار آگے آیا، نواب کے پاس ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چھوٹی منقش میز رکھی تھی، اس پر سے کچھ سامان ہٹا کر چوبدار نے ہرکارے کو اشارہ کیا کہ جو کچھ لائے ہو اس میز پر رکھ دو۔ ہرکارے نے کمر سے ہمیانی کھول کر خریطہ اور شیشے کی تھیلی نکالی، آگے بڑھ کر دونوں چیزیں میز پر رکھ دیں اور سلام کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ نواب کا دوسرا اشارہ پا کر چوبدار باہر گیا اور دوسرے ہی لمحے کوٹھی کے داروغہ کو ساتھ لئے واپس آیا۔ داروغہ نے نواب کا عندیہ سمجھ کر ہرکارے کو پانچ روپے بطور انعام دیئے۔ اب نواب شمس الدین احمد نے ہرکارے سے کہا:

''اچھا۔ بھئی واللہ ہم بہت خوش ہوئے۔ بیگم صاحب کو ہماری تسلیم کہو۔''

''سرکار کا اقبال بلند ہو، ستارہ سدا عروج پر رہے۔'' کہہ کر ہرکارے نے سات سلام کئے اور الٹے پاؤں چلتا ہوا نواب کی جناب سے باہر آ گیا۔ چوبدار اور داروغہ بھی یہ دیکھ کر کہ ہمارے لئے ٹھہرنے کا اشارہ نہیں ہے، نشست گاہ سے باہر آ گئے۔ نواب کو مشکل ہی سے صبر آ رہا تھا، وہ منتظر تھے کہ تخلیہ ہو تو خریطہ کھولوں، یہ تو وہ سمجھ ہی گئے تھے کہ خریطے میں کچھ کتابت ہے۔ تھیلی میں کچھ تحفہ ہوگا، اس کی انھیں

چنداں شتابی نہ تھی، وہ تو مشتاق مکتوب تھے۔ چلتے وقت داروغہ نے کنکھیوں سے دیکھا کہ نواب خریطے کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھا رہے تھے۔

کیا موتیوں جیسی لکھائی ہے، اور کیا نازک، برمحل، بامعنی شعر ہے۔ شمس الدین احمد نے فوراً پہچان لیا کہ میر حسن کا شعر ہے اور اس پر یہ لاجواب تضمین غالباً بلکہ یقیناً چھوٹی بیگم ہی کی ہے۔ کاش وہ میرے سامنے ہوتیں تو میں ان کے ہاتھ چوم لیتا... ہاتھ ہی نہیں اور بھی بہت کچھ چومتا، ہر ہر حرف کی داد نئے طرز سے دیتا۔ اور یہ شہد بھی کیا عمدہ شہد ہے، اس میں تو لیچیوں کی خوشبو آرہی ہے۔ ہماری طرف تو لیچی ہی نہیں پیدا ہوتی، اس کے پھول کہاں ملیں گے اور ان پھولوں کا شہد کہاں سے بنے گا۔ بھئی واللہ داد دینا پڑتی ہے اس حسن انتخاب اور اس خوش سلیقگی کی۔ اب میں ان چیزوں کا جواب کہاں سے لاؤں۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کی امید کے مطابق چھوٹی بیگم نے اگلا قدم ازخود اٹھایا تھا، یعنی ان کے بھی دل میں کچھ لگاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ یہ معاملہ دولت اور شان وشوکت، عیش وآرام اور جاہ وجلال کی ہوس کا نہ تھا، یا اگر تھا تو بہت کم تھا۔ اگر انھیں دنیاوی فائدہ ہی مقصود ہوتا تو وہ کچھ دوسرے طور اختیار کرتیں۔ اس وقت تو انھیں کا حال کچھ دگرگوں معلوم ہوتا ہے...

...لیکن میں جواب میں کیا لکھوں؟ کچھ نہ لکھوں صرف کہہ دوں کہ آکر گلے لگ جایئے؟ توبہ یہ کوئی شریفانہ بات ہوئی۔ خود چلا جاؤں اور کہوں کہ آیئے ہم آپ کو اپنی آغوش میں بھر کر لے چلیں۔ لاحول ولا قوۃ ایسی باتیں تو لوگ خانگیوں سے بھی نہیں کہتے۔ یہاں تو چھوٹی بیگم کا دل جیتنے کا معاملہ تھا اور یہ بھی اشد ضروری تھا کہ میں اپنا اشتیاق بحسن ادا بیان کروں اور ان کی مشتاقی کا بھی اشارہ کر دوں...تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں۔ انھیں یاد آیا کہ کل ہی پرسوں کوئی شخص میر اثر کی غزل گاتا ہوا بازار سے گذرا تھا۔ جب میری کھڑکی کے نیچے آیا تو یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

میرے احوال پر نظر ہی نہیں
اس طرف کو کبھو گذر ہی نہیں

مجھے لگا جیسے میرے ہی دل کی بات تھی۔ یہ شعر یاد آتے ہی شمس الدین احمد نے اپنے کتب خانے سے دیوان اثر نکلوایا اور غزل ڈھونڈ کر نکالی۔

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں
پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں

میرے احوال پر نظر ہی نہیں
اس طرف کو کبھو گذر ہی نہیں
دل نہ دیویں جگر نہ چاک کریں
یہ تو اپنا دل و جگر ہی نہیں
درد دل چھوڑ جایئے سو کہاں
اپنا باہر تو یاں گذر ہی نہیں
کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

سبحان اللہ کیا پاکیزہ کلام ہے۔ بس یہ پوری غزل ہی بھیج دوں۔ اس زبان معجز بیان سے بہتر زبان کیا ہوگی اور ان سے بڑھ کر لطیف معنی کہاں ہوں گے جو میرا حال کہہ بھی دیں اور تمکین کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ شمس الدین احمد نے فوراً کتب خانے کی یکسوئی میں بیٹھ کر افشانی کاغذ پر روشن سیاہ حرفوں میں ساری غزل لکھ ڈالی۔ کوئی القاب نہ رکھا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ نامہ شروع کرنے کا کوئی ڈھب تو ہو۔ بہت سوچ کر انھوں نے لکھا:

غزل حضرت خواجہ میر اثر اعلیٰ اللہ مقامہ منجانب دیدار بیقرار محمد شمس الدین احمد۔

یہاں تک تو ٹھیک ہو گیا، دل کا حال تو ہم نے لکھ دیا لیکن اب آگے؟ کیا بدن کا بھی کچھ حال لکھیں؟ اور لکھیں تو کس طرح لکھیں؟ کیونکر بتائیں کہ ہماری آنکھیں تمھیں دیکھنے کو تڑپ رہی ہیں، ہمارے بازو تمھیں تھامنے کو بے قرار ہیں، ہمارا منھ تمھارے منھ کو چھونے کے لئے ترس رہا ہے۔ پانی بھر آیا منھ میں دیکھے جنھوں کے ہائے وے کس مزے کے ہوں گے... اور ہمارا شبستان تمھاری شمع رخ سے روشن نہ ہونے کے غم میں سیاہ پوش ہے۔ مگر بھلا یہ سب کیسے لکھوں؟ اور اس طرح کی بہت سی باتیں تو اس دن ان سے کہہ ہی آیا ہوں۔ یہ باتیں بار بار کہنے کی نہیں ہوتیں۔ یہ کوئی نٹ کا کھیل تھوڑا ہی ہے کہ بار بار کلا بازیاں کھاتے پھریئے۔ کیا اچھا ہوتا اگر اظہار تمنا کی نوبت ہی نہ آتی۔ یا تو وہ سب کچھ بے کہے سمجھ لیتیں یا پھر میں ہی چپ چاپ جلتا رہتا۔ من عشق فعفّ و کتم فمات فھو شھیداً بزرگوں ہی نے تو کہا ہے۔ اور سچ ہے۔

پروانہ نیک رفت کہ در پیش شمع سوخت
آگہ نہ شد کہ سوختن غائبانہ چیست

یہ سب تو ٹھیک رہا لیکن ہم بت پرستوں کو عالم تشبیہ کے بغیر کچھ دکھائی کہاں دے۔ میر خسرو کیا خوب کہہ گئے ہیں۔

آیۂ رحمت ار حرم ہست برائے حاجیاں
خسرو بت پرست را جز خد و خال کے رسد

دیکھے بغیر اور چھوئے بغیر اور خد و خال کی پرستش کیے بغیر ہم جیسوں کو چین کہاں۔ چلو چند شعر اور لکھ دیتا ہوں، اس کے ساتھ یہ بھی التجا کردوں گا کہ کفش خانے کو اپنے آفتاب حسن کی شعاعوں سے منور فرمائیں تو کرم ہو۔ پھر سوچ سوچ کر شمس الدین احمد نے ایک اور تختۂ کاغذ پر قاسم بیگ حالتی کی رباعی لکھی جو انھیں بچپن سے بہت پسند تھی۔

بیمارم و میلت بہ عیادت نہ شود
یک بارہ وفا مترس عادت نہ شود
پرسیدن ما کم نہ کند خوبی تو
واز دوری من حسن زیادت نہ شود

رباعی لکھنے کو تو لکھ لی، لیکن اب ملاقات کی درخواست کس ڈھب سے لکھوں کہ کچھ ابرام بھی نہ محسوس ہو اور یہ معلوم ہو جائے کہ جسم و روح دونوں ہی اشتیاق کی گرمی سے پھنکے جاتے ہیں۔ ارے بھئی اس سب تکلفات کی کیا احتیاج ہے واللہ صاف صاف لکھ دوں کہ اب انتظار نہ کرائیں آ کر کلیجے سے لگ جائیں بس بہت ہو چکا۔ تو کیا سچ یہی لکھ دوں، سچ تو بے گمان یہی ہے۔ مگر کچھ بہانہ تو مقرر کروں، اور بہانہ ایسا ہو کہ اس سے میرے معنی کی بالکل بے شک و ریب ترسیل ہو۔

اب کاغذ کا ایک نیا اور نسبۃً چھوٹا تاؤ لے کر شمس الدین احمد نے محبت نامہ، نہیں محبت نامہ تو کیا، عریضہ اس مضمون کا لکھا کہ کل شام کفش خانے پر ماحضر تناول فرمائیں۔ اور کسی کو دعوت نہیں دی ہے، لیکن اگر مزاج مبارک میں آئے تو فرمائیں، جسے چاہیں بلوا لیا جائے۔ اگر حکم ہو سواری کسوا کر در دولت پر حاضر کر دی جائے۔ اس نامے کے ساتھ تحفے کے طور پر حسب ذیل سامان بھی تھا۔ کشمیری دوشالوں کا جوڑا، مہوبہ کے سفید پانوں کی دو ڈھولیاں، نجیب آباد کے جنگلوں کا سوا پاؤ کتھا، تقریباً سفید رنگ، جس کے

بارے میں مشہور تھا کہ پانی میں بارہ یا سولہ گھنٹے بھیگا رہنے دیں تو پانی میں ہلکے ہلکے سرور کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے، اور تانبے کا مرشد آبادی جہازی پاندان، جس کی کلھیوں میں مناسب لوازمات پان خوردنی مزید ڈال دیئے گئے تھے۔ چوبدار کو حکم ہوا کہ ایک سونٹا بردار اور ایک برچھیت ساتھ لے کر جا اور یہ سب چیزیں چھوٹی بیگم کی نذر کر۔ پاسخ مکتوب کے لئے کچھ کہیو مت، لیکن اگر کچھ جواب عطا کریں تو بصد عزت واکرام لے آئیو۔

چھوٹی بیگم اپنی منجھلی بہن کے یہاں دن کا کھانا کھا کر آرام کرنے جا رہی تھی کہ اس کی اصیل بی وفادار ہانپتی ہوئی پہنچیں اور خبر لائیں کہ لوہارو والی سرکار سے نامہ آیا ہے اور بہت کچھ تحفہ تحائف بھی ہے۔

''لو بی بی خدا مبارک کرے۔'' عمدہ خانم نے وزیر کی بلائیں لے کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ ہے ہے، ذرا دیکھو کس آسانی سے اتنے زبردست کو زیر کر لیا۔''

''چلو منجھلی باجی خدا خدا کرو۔ کس کا تیر اور کیسا نشانہ۔ میں تو دو وقت کی روٹی چاہتی ہوں مگر عزت سے۔ کسی کی رکھیل دہیل بن کر نہیں۔ اللہ کی مہربانی اور تم لوگوں کی دعائیں رہیں، بس یہی بہت ہے۔''

''میں نالکی لگوائے دیتی ہوں، لے اب اللہ کا نام لے کر سوار ہو۔ مولا چاہے گا تو اب رانی بن کر راج کرو گی۔''

عمدہ خانم نے وزیر کو گلے لگا کر پیار کیا اور اپنے ہاتھوں سے نالکی پر سوار کیا۔ تراہا بیرم خاں سے سرکی والاں کا فصل ہی کتنا تھا، بات کی بات میں وزیر اپنے گھر پہنچ گئی۔ بی وفادار نے پہلے اتر کر دروازہ کھلوایا۔ ڈیوڑھی میں نواب شمس الدین کا چوبدار مونڈھے پر بیٹھا گڑگڑی سے شغل کر رہا تھا۔ شربت کا پیالہ سامنے تپائی پر دھرا ہوا۔ برچھیت اور سونٹا بردار سامنے کھڑے تھے، شربت کے پیالے ان کے ہاتھوں میں تھے۔ معمولی چادر کے پردے کے پیچھے سے تینوں کا سلام لیتی ہوئی وزیر گھر میں داخل ہو گئی۔ نواب کے تحفے پہلے ہی اندر پہنچا دیئے گئے تھے، اب نامہ بھی اکرام کے ساتھ اندر بھجوایا گیا، اس انداز سے کہ چاندی کی کشتی پر سر بمہر خریطہ تھا جسے وفادار اپنے سر پر رکھ کر لائی تھی۔

وزیر نہال ہو گئی۔ کیا عمدہ چیزیں تھیں اور کیسا اچھا خط۔ کیسی پیاری پیاری باتیں لکھی تھیں۔ اسے اپنا دل پوری طرح نرم ہوتا محسوس ہوا۔ مگر یہ شام کی دعوت، اس میں یہ اشارہ کہ کسی اور کی دعوت نہیں کر رہا ہوں، مگر یہ کہ آپ چاہیں۔ یہ تو بڑے جوکھم کی بات ہوئی۔ ہاں کہوں تو، اور ناں کہوں تو، دونوں میں اپنے

اپنے رمز ہیں۔

جانا تو مجھے بہر حال ہے۔ وزیر نے تھوڑے سے تامل کے بعد فیصلہ کیا، اور فیصلہ کرتے ہی کاغذ قلم لے، جواب لکھ، مہر بند کر، چوبدار کے حوالے کیا۔ پانچ روپے چوبدار کو اور دو دو روپے سونٹا بردار اور برچھیت کو انعام کے طور پر الگ عطا کیے گئے۔

نواب کے نوکر انعام لے کر رخصت ہوئے۔ وزیر نے سوچا کہ اگلے دن کے خیالات میں ڈوب جانے اور تیاریوں کی فکر میں ہلکان ہونے سے پہلے منجھلی باجی کو حالات سے مطلع کر دوں۔ لہٰذا وہ اسی وقت دوسرا خط اپنی بہن کے نام لکھنے بیٹھ گئی۔ اسے خبر نہ تھی کہ نواب یوسف علی خان کا پرچہ نویس غروب آفتاب کے پرچۂ اخبار کے ساتھ نواب کی خدمت میں وزیر خانم کی اطلاع بھی پہنچا دے گا۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ فریزر صاحب کا پرچہ نویس پل پل کی خبر الگ سے انھیں پہنچا رہا ہے اور فریزر صاحب کی خدمت میں پیش کیے جانے والے آج اور کل کے پرچۂ اخبار کا انجام کہیں بہت دور جا کر کئی دردناک باتوں کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ چھوٹی بیگم کا مستقبل اس قدر محفوظ نہ تھا جس قدر وہ گمان کر رہی تھی۔

گردشِ خامۂ نقاش

وزیر خانم کو اس رات جو دیکھتا وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر دیوانہ ہو جاتا یا پھر سر کو زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے اس کے دروازے پر پڑ رہتا۔ لیکن دیدار کا یہ گوہر شمس الدین احمد خان کے کنز خوش بخت کی زینت بنتا تھا اور انھوں نے اس کے لیے بڑی حد تک خود کو تیار کر رکھا تھا۔ لیکن وہ منظر تو ان کی توقع، بلکہ ان کے خوابوں سے بڑھ کر تھا۔ یہ خبر سنتے ہی کہ وزیر خانم کی سواری کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گئی ہے، ان کے دل نے بے اختیار چاہا کہ دوڑ کر باہر آئیے اور سواری کے ساتھ چلتے ہوئے انھیں صدر دروازے تک لائیے، پھر اپنے ہاتھوں سے انھیں اتاریے اور دیوان خانے تک لے چلیے۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن تھا لیکن دیوان خانے کے باہر برآمدے میں آکر وزیر کا استقبال تو بہر حال مناسب تھا۔ دریا گنج میں نواب شمس الدین احمد کی کوٹھی انگریزی وضع کی تھی۔ چہار دیواری میں صرف ایک پھاٹک، اس کے بعد کھلی زمین جس میں چمن بندی تھی۔ بیچ میں سرخ بجریوں سے کٹی ہوئی سڑک، اتنی چوڑی کہ ہاتھی، یا رتھ، یا بڑی گھوڑا گاڑی بھی بآسانی گذر سکے۔ سڑک جہاں ختم ہوئی تھی وہاں لمبی سیڑھیاں تھیں جو برآمدے پر منتہی ہوتی تھیں۔ برآمدہ کوٹھی کے چاروں طرف یوں بنا ہوا تھا جیسے پرانے گڑھی قلعوں کے چاروں طرف خندق ہوتی تھی۔ برآمدے میں سامنے کی طرف صدر دروازہ، اور دونوں جانب دو اور دروازے تھے جو غالباً کچہری کے کام آتے تھے۔ صدر دروازہ دیوان خانے پر کھلتا تھا۔ مجموعی حیثیت سے کوٹھی کا انداز کچھ ولیم فریزر کی کوٹھی جیسا تھا۔ لیکن وسعت اور بلندی اور شان میں ولیم فریزر کی کوٹھی آگے نکلتی ہوئی تھی۔ نوکروں کی گہما گہمی بھی یہاں کم تھی، اور ظاہر ہے کہ اور کوئی مہمان بھی نہ تھا، ایک طرح کا سناٹا سا چھایا ہوا تھا گویا خود کوٹھی بھی سانس روکے منتظر ہو کہ اب کیا ظہور میں آتا ہے۔

دیوان خانے میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا تھا کہ ہم انگریزی طرز تعمیر، وضع قطع، طریقۂ بود و

باش، سب کچھ باہر ہی چھوڑ آئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ صدر دروازہ، جو خود محراب نما تھا، ایک اور محرابی دروازے پر کھلتا تھا۔ گنبدی محراب کے انداز پر بنا ہوا یہ دروازہ ہر معنی میں تاجدار دروازہ کہے جانے کا مستحق تھا۔ اس دروازے کے شاگردے (۱) سنگ پائے زر (۲) کے تھے۔ اس کی دیوار اور خود اس دروازے کے دونوں پٹ مغل طرز کے کام سے پٹے ہوئے تھے۔ دونوں کواڑ ایک ہی تختہ تراش کر بنائے گئے تھے، ان میں بینی یا پشتی دان (۳) کچھ نہ تھا۔ سب کچھ منقش تھا، اور نقش و نگار میں ہرے، زبرجدی، سنہرے، اور سفید رنگ کی اس قدر کثرت تھی کہ معلوم ہوتا تھا دروازہ اور دیوار نہیں بلکہ ایک ڈال کا نگینہ ہے جس میں کسی حیرت انگیز قدرتی معجزے کے باعث یہ سارے رنگ سما گئے ہیں۔ دروازہ کہنے کو تو صندل اور شیشم کی لکڑی کا تھا، لیکن اس پر ہاتھی دانت کے ہلکے چوکور ٹکڑوں کو کھپرے کی طرح یا آج کی زبان میں Tile کی طرح بنا کر دروازے کے پلوں پر چپکایا گیا تھا اور ہاتھی دانت کی ان کھپریلوں کو بھی اسی طرح کے نقش و نگار سے بھر دیا گیا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ کھپریل بندی کے کاری گروں کی تعریف کی جائے کہ انھوں نے اس صفائی سے ہاتھی دانت کے ٹکڑے چپکائے تھے کہ کہیں کوئی جھری، کوئی سانس نہ تھی۔ لگتا تھا کھپریلوں کو منبت کاری کے ذریعہ دروازے کے پلوں میں جڑ دیا گیا ہے۔ سارا کام اس صفائی سے ہوا تھا کہ بند دروازے پر دیوار ہی کا گمان ہوتا تھا۔ یا پھر ان نقاشوں کی تعریف کی جائے جنھوں نے ہاتھی دانت پر نقش اس طرح، اور ان رنگوں سے ابھارے تھے کہ معلوم ہوتا تھا یہ چینی کی کھپریلیں ہیں۔

دروازہ بہت اونچا اور کئی ہاتھ چوڑا تھا لیکن اس کی دیوار اور محراب اس سے بھی بہت اونچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رنگوں اور پھول پتیوں کے اس وفور کے باوجود کچھ بھی ذہنی بھاری پن یا آنکھوں پر بار ہونے کا تاثر نہ پیدا ہوتا تھا۔ اس دروازے کے پیچھے فرش کوئی ہاتھ بھر نیچا تھا، اس طرح کہ دروازہ صحیح معنی میں آستانہ بن گیا تھا۔ اب یہ داخل ہونے والے پر منحصر تھا کہ وہ کتنا چار بانک اور پھرتیلا ہے کہ فرش کے نشیب کو دیکھ لے اور اس کے قدم نہ لڑکھڑائیں۔ دروازے کے سامنے مخملی چادر کے اوپر مونج کی موٹی چٹائی پا انداز کے طور پر تھی۔

کمرے میں داخل ہوں تو سب سے پہلی چیز جو توجہ کو منعطف کرتی تھی وہ روشنی کا احساس تھا۔

---

(۱) نوکر کے بیٹھنے کی جگہ۔

(۲) فیروزی رنگ کا سنگ مرمر کی قسم کا پتھر۔

(۳) دروازے کی مضبوطی کے لئے لکڑی کی پتی یا پھٹی جو اوپر سے لگائی جاتی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ فرشی اور چھت گیر قندیلیں اور فانوس بکثرت روشن تھے، بلکہ یہ بھی کہ داخل ہونے والے کے دائیں اور بائیں طرف دو اونچی کھڑکیاں تھیں جن پر باریک ململ کے پردے پڑے ہوئے تھے، ایسے کہ ہلکی سی ہوا بھی انھیں مرتعش کر دیتی تھی۔ کھڑکیوں پر کوئی جالی یا سلاخیں نہ تھیں، ان کے کواڑ البتہ اسی منقش طرز میں تھے جیسے کہ دروازے کے کواڑ تھے۔ پھر، آنے والے کے ٹھیک سامنے بھی ایک دروازہ تھا جو تین محرابوں کو کھول کر بنایا گیا تھا، اس طرح کہ وہاں دیوار نہ تھی، صرف جالی دار محرابیں تھیں۔ تینوں محرابیں الگ الگ طرز کی تھیں۔ وسطی اور سب سے چوڑی محراب شاہجہانی طرز کی تھی۔ دائیں جانب کی ڈاٹ سہ مرغولہ تھی اور بائیں طرف کی ڈاٹ گھڑنال وضع کی، لیکن عام اسلوب سے ذرا مختلف، ہندوانہ یا بدھ طرز پر تھی۔ جالیاں احمد آباد کی سیدی سعید مسجد (۱) کے انداز پر بنی تھیں، یعنی تھیں تو وہ پتھر کی لیکن اس قدر نازک کہ ان پر لکڑی کا گمان ہوتا تھا۔ جالیوں کی وضع اور تراش میں مختلف نمونے اس کثرت سے تھے کہ ہر جالی یکتا تھی۔ بدروم، لوزاتی، زنبوری، ماہی پشت، دیکھت بھول، ہر نمونے کو پوری صفائی اور چابک دستی سے استعمال کیا گیا تھا۔ جالیوں کے پیچھے باغ، یا یوں کہیں کہ اندر کے چمن کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ اس وقت رات ہو چکی تھی لیکن چمن میں روشنی تھی اس لئے چمن کے حسن و زینت کا کچھ اندازہ ہو سکتا تھا، بلکہ جالیاں اس کے حسن کو دوبالا کر رہی تھیں اور خود جالیوں میں رنگین شیشے (۲) کا سارنگ جھلک اٹھا تھا۔

جالی دار وسطی محراب کے سامنے، لیکن کمرے کے اندر، محراب کی ہی لمبائی کا بیضاوی فوارہ تھا۔ گلابی سنگ مرمر کا یہ فوارہ سنگ تراشی اور منبت کاری کے اعتبار سے اکبر آباد کے لال قلعے میں دیوان خاص (۳) میں لگے ہوئے فوارے کی یاد دلاتا تھا۔ لال قلعے کے فوارے کی طرح اس کی بھی گہرائی بہت کم تھی، لیکن لال قلعے کے فوارے کے برعکس چونکہ یہ فوارہ کمرے کے اندر تھا لہٰذا فوارے کی پھوار بہت اونچی نہ رکھی گئی تھی اور پانی کی ایک چھینٹ بھی باہر نہ پڑ سکتی تھی۔ پتھر کی تراش ابھرواں اور دبواں دونوں طرح کی تھی لیکن کہیں بھی کائی کا شائبہ نہ تھا۔

کمرے کا فرش کاشانی، ترکی، اور کشمیری قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فرش کے شمالی مغربی کونے

---

(۱) عرف عام میں جالی مسجد۔

(۲) Stained Glass.

(۳) اصل نام، دیوان خاص و عام۔

والے حصے کو ایک ہاتھ مرتفع بنایا تھا، گویا اس کی سطح دروازے کی چوکھٹ کے برابر تھی۔ مرتفع حصے پر پھر قالین تھے جن کے نیچے گدے تھے۔ یہاں گاؤ تکیے بھی دیوار سے لگا کر رکھے ہوئے تھے۔ ساری دیواریں اسی طرح منقش اور رنگین تھیں جس طرح صدر دروازہ اور اس کی دیوار تھی۔ مرتفع حصے کے علاوہ بھی جگہ جگہ گدے تھے لیکن ان پر اونی قالین نہیں بلکہ اکبرآباد یا مرزاپور کے سبک، ریشمی چادر نما قالین بچھے ہوئے تھے۔ یہاں گاؤ تکیے نہ تھے۔ کمرے کی چھت غالباً لکڑی کی تھی، کیونکہ اس پر جو نقاشی تھی وہ اس قدر نازک تھی کہ پتھر شاید اس کا تحمل نہ کر سکتا ہوگا۔

رنگوں کے تنوع کے اعتبار سے دیوار اور چھت میں کوئی فرق نہ تھا، لیکن اونچی چھت کی یکسانی کو توڑنے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں اختیار کی گئی تھیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ چھت سے کوئی چار ہاتھ پہلے سفید اور سرخ پتھر کی منقش لگر بنائی تھی۔ اصطلاح میں اسے ''کنگنی'' کہتے تھے۔ اس کے کچھ اور نیچے ایک پٹی بالکل مختلف رنگ کی اس طرح بنائی گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا لکڑی کی منقش پٹیاں باہر سے لا کر جڑ دی گئی ہیں۔ پھر معاً چھت کے نیچے نقش و نگار کا انداز اور رنگ بالکل بدل گئے تھے۔ اب پھول پتیوں، خاص کر سرو، جام و مینا، لالہ، وغیرہ کی جگہ کنول کی کلیوں اور پھولوں کو نئے نئے انداز سے انھیں رنگوں میں پیش کیا گیا تھا جو گل نیلوفر کے ساتھ خاص ہیں۔ چاروں دیواروں پر چھت اور کنگنی کے بیچ میں غیر معمولی چیز یہ تھی کہ پان پھول وغیرہ کی طرزوں پر داسہ بنایا گیا تھا اور اس پر بھی نقش و نگار تھے۔

دیواروں کی نقاشی میں یکسانی کو توڑنے کے لئے بھی کئی صورتیں اختیار کی گئی تھیں۔ مثلاً دیواروں کو چوکور یا مستطیل ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ہر ٹکڑے میں الگ انداز اور رنگ کی نقاشی کی گئی تھی۔ پھر ہر ٹکڑے کی بنیادی نقاشی یہ تھی کہ اسے محراب کی شکل دے دی گئی تھی، اور ہر محراب مختلف تھی۔ پھر ہر ٹکڑے یا ہر محراب کو الگ کرنے کے لئے کسی اور طرح کی، اور عموماً دیواری کاغذ کے نمونے کی، نقاشی بنا کر اقلیدسی پٹیوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ بعض چوکوروں کو اس طرح رنگا اور منقش کیا گیا تھا کہ گمان ہوتا تھا یہاں دیوار نہیں ہے، بلکہ کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ چھت کی نقاشی میں بھی یکسانی کو مزید ختم کرنے کے لئے ایسی ہی تراکیب استعمال کی گئی تھیں۔ ساری چھت ریختہ کی تھی اور نہایت پست بادامی ڈاٹ پر قائم تھی، اس میں کوئی ستون یا اڑواڑ نہ تھی۔ ایسی چھت کو اصطلاح میں ''لداؤ کی چھت'' کہتے تھے۔

رنگوں، تصویروں، اور اقلیدسی نمونوں کی اس قدر فراوانی کے باوجود کمرے میں بوجھل پن بالکل نہ تھا۔ لیکن اگر ہوتا بھی تو کمرے کے وسط میں، ذرا دائیں طرف کو فرش کا ایک ٹکڑا حقیقی سبزے کا تھا، یعنی

وہاں گھاس اگائی گئی تھی، متوسط قامت کا ایک انار کا پیڑ وہاں اگا ہوا تھا اور اس کے نیچے دو کالے ہرن پاؤں موڑ کر زمین سے پیٹ لگائے آرام سے بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ انار کے درخت کی مخالف سمت میں یشب کا بنا ہوا سبزی مائل چینی طرز کا فرشی فانوس تھا جس میں چوبیس شمعیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ یشب کی سبزی میں کچھ سفیدی کچھ سرخی کی سی آمیزش معلوم ہوتی تھی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ جو بھی اس ایوان میں پہلی بار داخل ہوتا، ایک لمحے کے لئے چکرا جاتا کہ اس کے عجائب دیکھیں یا بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کریں۔ عام حالات میں نواب شمس الدین احمد خان (یا ان کے پہلے نواب احمد بخش خان) شمال مشرق کی مرتفع سطح پر سرو قد کھڑے ہو کر مہمان کا استقبال کرتے تھے، خاص خاص مہمانوں کے لئے وہ اونچی جگہ سے اتر کر دو چار دس قدم مہمان کی پذیرائی کے لئے آگے بھی آتے تھے۔ اس سے زیادہ اعزاز فرنگی حاکمان حتیٰ کہ نواب ریزیڈنٹ بہادر کو بھی نہ ملتا تھا۔ لیکن آج تو نواب شمس الدین خان نے تاج دار دروازے کو اپنا مستقر بنالیا تھا اور ان کا دل بے قرار تھا کہ اس سے بھی آگے نکل جائیں۔

وزیر خانم نے اس دن ترکی وضع کے کپڑے پہنے تھے۔ پاؤں میں آسمان رنگ کاشانی مخمل اور پوست آہو کی نکے دار شیرازی (۱) جوتیاں، بہت پتلی ایڑی اور لمبی دوڑ، دیوار بالکل نہ تھی، اور نہ اڈی (۲)۔ ایڑیاں کھلی ہوئی تھیں۔ جوتیوں کی نوکیں بھی شکر خورے کی چونچ کی طرح بہت لمبی اور اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور ان کے سرے پر جنگلی مرغے کے سرخ بیر بہوٹی جیسے پر کے طرے تھے۔ جوتیوں کے حاشیوں پر باریک بیل تھی جس میں سفید اور سنہرے پکھراج ٹکے ہوئے تھے۔ آدمی جوتیوں کی چھب دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے لیکن اس کے آگے کا منظر دیکھنے کے لئے شیر کا کلیجا اور تیندوے کی بے حیائی درکار تھی۔ ڈھاکے کی ململ کا پائجامہ، اس قدر باریک کہ کولھوں کے دائرے اور رانوں کے خطوط صاف نمایاں تھے۔ دیکھنے والے کو موقع ملتا یا ہمت بہم پہنچا کر وہ کچھ دیر ٹھہرا رہتا تو شمسین سیاہ کے درمیان کے جوف کی بھی جھلک کبھی کبھی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن نہیں، اگر یہ پائجامہ اس قدر کاشف البدن تھا تو پھر سامنے والے کو پیڑو کا ابھار اور تختۂ صندل بروے چاہ شیریں، یعنی کوہ زہرہ کا ارتفاع اور نازک ڈھلان بھی جھلک مارتی نظر آسکتی تھی۔ لیکن سامنے کا منظر تو بالکل مسطح نظر آتا تھا، صرف شکم، جسے چرخ اطلس یا برج حمل کہیں، ذرا ایک ہلکے

---

(۱) یہ دہلی میں بنتی تھیں لیکن شیرازی کہلاتی تھیں۔

(۲) جوتی کا پچھلا حصہ جو ایڑی کو ڈھکتا ہے۔

سے اشارہ کی طرح کوند جاتا۔ یہ تو نو دس برس کی لڑکی کے لئے ہی ممکن تھا کہ آگا او نچ نیچ سے اس قدر عاری ہو۔ حقیقت یہ تھی کہ پاجامے کے نیچے ایک اور زیر جامہ تھا، بالکل بدن کے رنگ کا اور اس قدر چست کہ بدن سے چسپاں ہو کر رہ گیا تھا لیکن وہ اس قدر کشاف اسرار بدن نہ تھا کہ سب کچھ نہ سہی، سامنے کے کچھ راز تو کھل جانے کے لئے مچلتے نظر آتے۔ اوپری پائجامہ ذرا اونچا اور تنگ تھا، اس معنی میں کہ پیر اور ٹخنے بالکل کھلے ہوئے تھے، اور ٹخنوں کے اوپر اس کی مہریاں پٹیوں جیسی تنگ اور زیر جامے کے رنگ کی مخمل کی تھیں۔ ان پر خوشنما بیل کاڑھ کر انھیں پٹی کی شکل بھی دے دی گئی تھی۔ یہ پائجامہ پنڈلیوں، گھٹنوں اور ران کی شاخ ارغوانی تک اس قدر ڈھیلا اور کلی دار تھا کہ لطیف گنبد یا منقش غبارے کا سماں پیدا کرتا تھا۔ وسط ران، یا زانو پر پھر ایک پٹی لگا کر مہری کو کس دیا گیا تھا۔ یہ پٹی اس پٹی ہی کے نمونے پر تھی جس سے ٹخنوں کو چست کیا گیا تھا، لیکن اس پٹی میں مخمل کی جگہ زربفت استعمال کیا گیا تھا اور اس کے اوپر اور نیچے کا کلابتو اس قدر بھاری تھا کہ گنڈے کی جگہ کنگن کا لطف دے رہا تھا۔ وسط زانو کے اوپر پائجامہ چست تھا لیکن آہستہ آہستہ ڈھیلا ہوتے ہوتے کولھوں کے شاداب نسرینی خرمنوں تک پہنچتے پہنچتے انھیں دو گوے ساحری جیسا جادو اثر بنا رہا تھا۔ لیکن دیداری نمائی و پرہیزی کی کیفیت اب بھی موجود تھی، کہ پائجامہ اوپر آتے آتے کمر کو خط پیمانہ صہبا کی طرح نمایاں کر رہا تھا۔ پائجامہ کہاں ختم ہوتا تھا اس کی کسی کو خبر نہ تھی کہ شلوکا اور پائجامہ تقریباً ہم رنگ تھے۔ پائجامہ ہلکے ارغوانی نارنجی رنگ کا تھا اور شلوکا ہلکے زرد نارنجی رنگ ذرا بھاری ململ کا تھا۔ اور رشتہ بر گلدستہ کی مانند شلوار بند اور شلوکے کا دامن اخضری رنگ کی چست مخملی صدری کے نیچے مخفی رکھ دیا گیا تھا۔ صدری کے نیچے شاما کچھ نہ تھا، اور اس کا گلا اس طرح تراشا گیا تھا کہ آگے سے تو بہت اونچا اور بند تھا، لیکن پشت پر وہ اس قدر نیچا تھا کہ گردن سے لے کر پشت کے تختۂ پکھراج سرمئی تک ایک راہ بن گئی تھی۔

گردن کی سڈول بلندی کو نمایاں کرنے کے لئے اسے ہر قسم کے زیور سے آزاد رکھا گیا تھا۔ صدری دراصل شلوکے ہی کا حصہ تھی، بایں معنی کہ شلوکا اس کے ساتھ ہی دیا گیا تھا اور صدری کے لئے آستر کا حکم رکھتا تھا۔ اس طرح اوپری بدن تو چھوٹے کپڑے کے بغیر ڈھک لیا گیا تھا، لیکن آگے شلوکے کی آستینیں اس طرح کاٹی گئی تھیں کہ وہ شانوں کے جوڑ سے آگے نہ جاتی تھیں لہٰذا گردن اور پشت اور روادی شانہ کا نظارہ خوب نمایاں تھا۔ دونوں آستینیں چست اور لمبی تھیں، اتنی کہ کلائیاں پوری طرح مخفی کر دی گئی تھیں۔ دائیں آستین پر ٹخنوں اور وسط ران کے طرز کی پٹیاں تھیں، لیکن اور بھی مخملی، منقش، اور نمایاں، لیکن

انھیں جان بوجھ کر غیر متوازن رکھا گیا تھا۔ منقش کلابتو کی پٹیوں کا ایک سلسلہ تو کلائی سے شروع ہو کر کہنی کے ذرا نیچے ختم ہوتا تھا۔ اس کے وسط میں تامڑے یا گومید کے چوکور ٹکڑوں سے جڑا ہوا آرسی نما کنگن تھا۔ اس کے اوپر بازو کا کچھ حصہ خالی تھا، لیکن شانے کے جوڑ سے ذرا پہلے تین مخملی پٹیاں نارنجی سرخ رنگ کی تھیں۔ باقی آستین پر پائجامے کے رنگ کی چھوٹی بوٹیاں اور زرد رنگ کی بڑی بوٹیاں تھیں جنھیں سرخ دائروں میں گھیر دیا گیا تھا۔ ان بوٹیوں کے اندر بھی پائجامے کے رنگ کی تین تین بوٹیاں تھیں، اس طرح کہ انسان کے چہرے کا ہلکا سا شائبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے برخلاف دائیں آستین کہنی کے نیچے تک پٹیوں سے عاری تھی۔ اس پر صرف وہی پاجامے کے رنگ کی چھوٹی بوٹیاں اور زرد رنگ بوٹیاں تھیں جن کا بیان ابھی کیا گیا۔ لیکن کہنی سے نیچے آ کر کلائی اور بازو ایک نئی قماش کی پٹیوں سے مزین تھے جسے ٹخنے کی پٹی اور بائیں آستین کی پٹی کو ملا کر ترتیب دیا گیا۔ کہنی کے نیچے جہاں یہ پٹی شروع ہوتی تھی، تین لڑوں کی بہت ڈھیلی مالائے مرجان، جس کے نگ بالکل زرد دار غوانی رنگ کے تھے، اس طرح تعبیہ کی گئی تھی کہ اس کا سرا کلائی سے بندھ گیا تھا۔ گردن ہی کی طرح کلائیاں بھی اور کسی قسم کے زیور سے عاری تھیں۔ ہاں دائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں مٹر کے دانے کے برابر پیازی رنگ کے رنگونی یاقوت انجم کی ایک انگوٹھی اور اسی ہاتھ کی کلمہ ٔ انگشت میں زمرد کی دو انگوٹھیاں تھیں۔ ان انگوٹھیوں کے نگوں کو مستطیل کاٹ کر ان کے فص خوب نمایاں کر دیئے تھے۔ ناک زیور کی آرائش سے مستغنی رکھی گئی تھی لیکن کانوں میں گوشوارے یا جھالر کی شکل کے دو بھاری آویزے زر خالص کے تھے۔ جھالر میں یہ فن ملحوظ رکھا گیا تھا کہ اس کی لڑیاں برابر نہ تھیں، کوئی لمبی، کوئی چھوٹی، کوئی متوسط، اور ان کی تنظیم میں کوئی منصوبہ بندی نہ تھی، لگتا تھا کہ کسی نے کمال بے پروائی لیکن پرکاری سے سب لڑوں کو یکجا کر دیا ہے۔

وزیر نے اپنے لمبے لمبے بالوں کو زلفوں کی شکل میں سمیٹ کر جوڑا سا بنا لیا تھا، لیکن یہ جوڑا نمایاں نہ تھا۔ اس پر آسمانی رنگ مخمل کی دستار تھی جسے بظاہر ذرا بے ترتیبی سے باندھ کر کچھ آگے کی طرف یوں جھکا دیا تھا کہ نقاب کا سا ڈھنگ جھلکنے لگا تھا۔ دستار کو اپنی جگہ پر رکھنے کے لئے چوڑی بیل جیسی ریشمی پٹی سر پر باندھ لی تھی، بیل کا نمونہ اس پٹی کے نمونے سے کچھ مشابہ تھا جو آستینوں پر لگی تھی۔ زلفوں کی درازی کا اشارہ دینے کے لئے سر کا پچھلا حصہ دستار سے نہ ڈھانکا گیا بلکہ دستار کے اوپر ایک موباف نما رومال پٹی کے ساتھ کس لیا گیا تھا اور پھر اس کے اوپر بھی سیاہ سرخ رنگ کا ایک طرہ باندھ کر صاحب دستار کے متوسط سے نکلتے ہوئے قد کو ذرا اور قیامت زا بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ ٹوپی اور رومال کی بنا پر ڈوپٹے کی

کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن خانہ پری کرنے کے لئے ملائی کے رنگ کا، اور بہت کم عرض کا کشمیری وضع شالی رومال بے پروائی سے ایک شانے پر یوں ڈال لیا گیا تھا کہ رومال کا سرا گویا لہراتا ہوا دوسرے شانے کو چھو رہا تھا۔

سامنے کا بدن، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پوری طرح نہیں تو بہت بڑی حد تک پردہ پوش تھا۔ لیکن ایک نازک سی برق وش کٹار البتہ میان سے عاری، بالکل برہنہ، اس کی کمر سے لٹک رہی تھی، اس طرح گویا ناف کی طرف اشارہ کر رہی ہو۔ لیکن اس کے رمز کو سمجھنے والے لوگ شمس الدین احمد کے بھی طبقے میں نیلے آسمان میں بجلی کی چمک کی طرح شاذ شاذ ہی تھے۔

حدکمال نصاب حسن

وزیر اس دن نواب یوسف علی خان کی بگھی میں بیٹھ کر آئی تھی۔ ارادوی کے ساگوان کی بگھی تھی، اس میں دو سفید گھوڑے جتے ہوئے تھے اور اس کے ہلکے نیلے رنگ کے دروازے اونچے اور پوری طرح بند تھے۔ اونچائی کے اعتبار سے بگھی عام طور پر بہلی، بیل گاڑی، اور رتھ سے کوئی چھ انگل زیادہ اونچی ہوتی تھی۔ بے پردگی کے امکان کو بالکل ختم کرنے کی غرض سے دروازوں کے پیچھے اندر کی طرف بھاری کمخواب کے پردے بھی لٹکائے گئے تھے۔ بگھی کی چھت اور پہیے ملائی کے رنگ کے تھے۔ گھوڑوں کی کلغیاں شتر مرغ اور مونال (پہاڑی چکور) کے پروں کی تھیں۔ ان کے بدن پر ریشمی پوزیاں اور سنہری جھالر کی دمچیاں، سفید ہرن کی کھال کی اندھیریاں یا چشم بند، اور گینڈے کی کھال کی زنجیریں تھیں جنھیں گونتھ کر عنانوں کی شکل دے دی گئی تھی۔ باہر کی نشست پر بہل بان کے ساتھ وزیر نے کرائے کا ایک سونٹا بردار بٹھا لیا تھا۔ بگھی نواب شمس الدین کی سیڑھیوں سے لگ کر ٹھہری تو معاً سونٹا بردار اپنی نشست سے کود کر نیچے آیا۔ اس نے بگھی کے دروازے پر مودبانہ دستک دی۔ دروازہ اندر سے کھلا، پردہ ہٹا۔ سونٹا بردار نے ایک چھوٹی سیڑھی بگھی کی چوکھٹ سے اٹکا دی۔ سیڑھی لگتے ہی اس کی سواری کا دایاں پاؤں باہر نکلا اور سونٹا بردار کی آنکھیں چکا چوندھ ہو گئیں۔ اس نے بے اختیار چاہا کہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اترنے کے لئے سہارا دے، لیکن دوسرے ہی پل وزیر نے دوسرا پاؤں باہر نکالا، سونٹا بردار نے بجلی کی سی کوند محسوس کر کے گھبرا کر قدم پیچھے ہٹا لئے۔ وزیر ایک انداز بے اعتنائی سے اتری اور حویلی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی، نگاہیں جھکائے ہوئے، گویا سیڑھیوں پر اپنے پاؤں مضبوط جمانا چاہتی ہو۔ اس نے دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ نواب کے دربان نے مودب، محتاط، لیکن بلند آواز میں ٹھہر ٹھہر کر اعلان کیا:

''حضور وزیر خانم صاحب تشریف لاتی ہیں۔''

اب تک وزیر آخری سیڑھی چڑھ کر برآمدے پر داخل ہو چکی تھی۔ نواب شمس الدین احمد بے تابانہ تاجدار دروازہ چھوڑ کر باہری دروازے پر آئے، اس کے دونوں کواڑ پاٹوں پاٹ کھول کر آغوش اشتیاق کو بھی وا کر لیا۔ وزیر کی آنکھیں کچھ اٹھیں، اس کے چہرے پر ذرا سا تبسم آیا۔ اس نے وہیں سے جھک کر تسلیم کی اور نواب سے نظریں ملا کر، لیکن حیا سے بھرپور لہجے میں کہا:

"اللہ نواب صاحب کو سلامت رکھے۔ اس ناچیز کے لئے سرکار نے اس قدر زحمت کی۔ میں عرق عرق ہوئی جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے نگاہیں جھکا لیں لیکن نواب کی طرف بڑھتی رہی۔ نگاہ ملا کر بات کرنا اس نے مارسٹن بلیک سے سیکھا تھا۔ کئی بار کی غلط فہمی اور جھنجھلاہٹوں کے بعد اس پر یہ بات منکشف ہوئی تھی کہ فرنگی لوگ نگاہیں پھیر کر یا جھکا کر بات کرنے والوں کو دغاباز یا بے ایمان سمجھتے ہیں، حالانکہ ہندی تہذیب میں تھا کہ بڑوں سے، اجنبیوں سے، قریبی عزیزوں سے آنکھ ملا کر بات نہ کرنی چاہیئے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو نہ سہی، نگاہ روبرو رکھنا تو دربار شاہانہ کے بھی آداب میں شامل ہے، پھر یہاں بھی کیا مضائقہ ہے کہ اہم باتیں کہتے وقت مدمقابل کے چہرے پر نگاہ پڑتی رہے۔ ہر چند کہ نواب نے اس بات کو محسوس کیا کہ وزیر نے نگاہیں نہ جھکا کر ایک طرح اپنی برابری یا آزادی کا استعارہ فراہم کیا ہے، لیکن انھیں یہ خودسری یا گردن افرازی اچھی بھی لگی۔ وزیر کے مزاج میں انھوں نے ایک طرح کا پر اعتماد تفاخر اور ایک طرح کی پرتمکنت بے نیازی بھی دیکھی تھی جو محض غرور حسن یا احساس معشوقی کی بنا پر نہ تھی، بلکہ دنیا کے بارے میں اس کے کچھ درویشانہ سے رویے کی بنا پر تھی۔ انھیں لگتا تھا کہ وزیر کو چاہت سے کوئی عار نہ تھی، اور اگر وہ کسی کو چاہتی تو اس پر اپنے حسن کی دولت ارزانی کرنے میں کچھ بخل نہ کرتی۔ لیکن اگر وہ، جسے وہ چاہتی، اسے نہ چاہتا (حالانکہ یہ تقریباً ناممکن تھا) تو وزیر اس کے پیچھے پیچھے دیوانہ وار نہ پھرتی، نہ بلا گرداں ہو کر توجہ کی زکوٰۃ طلب کرتی۔

بارہ چودہ ہاتھ کا برآمدہ طے کرنے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا، اور اس بار فینی پارکس کی طرح نواب نے بھی محسوس کیا کہ وزیر کی چال کچھ ایسی ہلکی، لطافت سے بھرپور، لیکن شہزادیوں والی تھی کہ لگتا تھا زمین اس کے آگے بچھی جا رہی ہو۔ شمس الدین احمد اب دروازے سے پوری طرح باہر آ گئے، انھوں بھی جھک کر تسلیم کی اور ہمت کر کے وزیر کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے صدر دروازے کی طرف لے چلے۔

"اللہ تعالیٰ نے کوئی فرشتہ بھیجا ہوگا کہ آپ کو چلنا سکھائے۔ ایسی چال ہم جیسے معمولی انسانوں کی تو

ہو نہیں سکتی۔ نعمت خان عالی کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

رنگ گلشن بہ زمیں طرز نگاہش ریزد
نقش پا برگ گل تازہ بہ راہش ریزد''

''نواب حضور مجھے کانٹوں میں اینچتے ہیں۔ مجھے اپنی کنیز ہی شمار کریں۔ یہاں آ کر تو یوں ہی میرا دم پھولا جاتا ہے۔ اللہ یہ دیوان عالی شان اور میں... میں بھلا یہاں کیونکر کھپ سکوں ہوں، یہی سوچ کر ہلاکان ہوئی جاتی ہوں۔''

اب تک وہ تاجدار دروازہ پار کر کے دیوان خانے میں پہنچ چکے تھے اور ہر نئے آنے والے کی طرح وزیر بھی اس کی کیفیت وکمیت دیکھ کر دنگ ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ قدم کہاں رکھے۔ ایسی صورت میں نواب کا پر اشتیاق نظروں سے اسے دیکھتے جانا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر دیوان خانے میں اپنی نشست گاہ تک لئے آنا اسے بہت خوش آیا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر اور نواب کا شکریہ ادا کیا۔ نواب نے وزیر کو صدر میں بٹھایا اور خود دائیں طرف کو ذرا ہٹ کر اس کے سامنے بالکل اس طرح بیٹھے جیسے وزیر اپنے گھر میں بیٹھی تھی۔ استقبال اور پذیرائی کے اس انداز میں جو نکتہ تھا وہ وزیر پر مخفی نہ رہ سکتا تھا۔ وہ آنکھ اٹھا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نواب نے اپنا دایاں ہاتھ ذرا سا بلند کر کے کہنا شروع کیا:

''بھئی واللہ وزیر خانم ہم اسے اپنی بے نہایت خوش نصیبی جانتے ہیں کہ آپ نے یہاں قدم رنجہ کیا۔ اس زحمت کے لئے ہماری طرف سے جو بھی خدمت مطلوب ہو، سچ جانیے ہم اس سے دریغ نہ کریں گے۔''

''حضور فیض گنجور سے خدمت درکار نہیں اور وہ ہمارا منصب بھی نہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ لطف و مدارا کی چند منزلوں کا سفر طے کرنے کے ارمان ضرور ہیں۔'' وزیر نے نواب کی طرف خوشگوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اگر میں ساربان یا قافلہ سالار رہوں تو میری اجرت کون ادا کرے گا؟''

''مانگئے، کیا مانگتے ہیں؟'' وزیر نے کچھ جی کڑا کر کے کہا، لیکن اسے اعتماد تھا کہ نواب کوئی خفیف بات نہ کہیں گے۔

شمس الدین احمد کو میرزا نوشہ کا شعر یاد آیا۔ ہر چند کہ انھیں میرزا نوشہ اور ان کے شعروں سے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا لیکن شعر اس قدر برمحل تھا کہ اسے پڑھتے ہی بنی۔ انھوں نے ایک ادائے خاص سے ہاتھ

پھیلا کر شعر پڑھا۔

زکواۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

تہیۂ ہزار تمکین کے باوجود وزیر کے چہرے پر گلابی تبسم کی لکیر سی دوڑ ہی گئی، اور پھر اس پر حیا کی سرخی کا رنگ غالب آ گیا۔ لیکن یہ موقعہ حیا کرنے کا نہ تھا، ورنہ بات اس کے قابو سے نکل جاتی۔ اس نے نواب کو کچھ لگاوٹ کی نگاہ سے دیکھا اور ذرا ہنس کر کہا:

''وہ کہاوت تو سمع مبارک تک پہنچی ہوگی، داتا کے تین گن، دے، نہ دے، دے کر چھین لے۔''

''لیکن یہ گدائے بے نوا جو مانگتا ہے اسے دے کر کوئی واپس نہیں لے سکتا۔''

وزیر ایک لمحے کے لئے لاجواب ہو گئی۔ اس نے بات کا رخ بدلنے کے خیال سے کہا:

''سرکار کو میرزا نوشہ کا کلام بہت مرغوب ہے۔''

''نہیں، بھئی واللہ، ہم تو میر تقی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کے دلدادہ ہیں...'' نواب نے فوراً جواب دیا۔ ''ہر چند کہ حسینوں کے کان نہیں ہوتے، پر آپ کے بھی گوش مبارک تک ان کا کلام پہنچا ہوگا۔

کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی''

''جی، مگر سرکار، گدا کی گدائی تو خدا کی خدائی جیسی ہے، کہ اس کا اور ہے نہ چھور۔ میر صاحب کی بات پر اعتبار کریں تو گدا کے ابرام کا جواب استغنا کے سوا کچھ نہیں۔''

''لیکن زکواۃ نکالنا تو فرض ہے۔''

''بجا ارشاد،'' وزیر نے ہنس کر کہا۔ اب اس کی ہمت ذرا کھل رہی تھی۔ ''لیکن تماشا کو آپ کیا گردانتے ہیں۔ بندگان عالی نے سنا تو ہوگا میرزا جلال اسیر کیا فرما گئے ہیں۔

اگر باج گیرم ز خورشید شاید
ز رویت زکواۃ تماشا گرفتم''

''بھئی وزیر خانم ہمیں ان باتوں پر نہ ٹالئے۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ دولت سارے میں لہریں لے رہی ہو اور سائل کو چند ٹکوں پر ٹالے بالے دیئے جائیں۔ بھئی واللہ ہم تو بلبل شیراز کی ہم زبانی کرتے ہیں۔

نصاب حسن در حد کمال است

زکواتم دہ کہ مسکین وفقیرم''

''جی سرکار، لیکن میں تو کچھ اور ہی سبق پڑھی ہوں۔

زکواۃ نیکوئی ضبط نگاہ است

بیاداز من نگہ داراین سخن را''

''بھئی واللہ خدا جانے کس خسیس ولئیم کی شاگرد تھیں۔ آپ نے سنا نہیں بہترین خصلت لئیم ترک عمل او و بدترین خصلت کریم ترک عمل او۔''

وزیر تنک کر لیکن ایک انداز دلربائی سے بولی:

''واہ صاحب جس سے کچھ توقع ہو اس کی ہجو کرنا کوئی آپ سے سیکھے۔''

''بھئی واللہ ہم تو آپ کو راغب کر رہے ہیں کہ اپنا فریضہ ادا کریں، ورنہ ہمارا کیا ہے، مواخذہ تو آپ سے ہوگا۔ محروموں کے تو گناہ یوں ہی معاف ہو جاتے ہیں۔''

''جی درست فرمایا۔ تو پھر محروم ہی رہئے۔'' وزیر کھلکھلا کر ہنسی۔

''مگر ہم اتنے گنہ گار بھی نہیں۔''

''ہمارے تو مجرم ہیں۔''

''مجرم سہی، ہم تو دائمی قید کے لئے تیار ہیں۔''

وزیر ایک لمحے کو ٹھٹکی... دائمی قید؟ یا یہ بھی وہی بلاک صاحب کا قصہ تھا؟ کئی جواب اس کے منھ پر آ کے رہ گئے۔ لیکن یہ موقع شاید ایسی باتوں کا نہ تھا۔ اس نے خود کو سنبھال کر بات کا رخ پھر مطائبات شعر کی طرف موڑنا چاہا... مگر کیوں؟ اس کے دل میں یہ خیال بھی گونجا؟ کیا مجھ میں ابھی قوت فیصلہ کی کمی ہے جو میں بات کے دھارے کو حسب دلخواہ مڑتے دیکھ کر گھبرا گئی ہوں... یا پھر میں نواب سے وہ ربط رکھنا ہی نہیں چاہتی جو ان کا مقصود ہے؟... لیکن نواب کا مقصود کیا ہے، یہی تو مجھ پر نہیں کھل رہا ہے۔ اللہ میں کیا کروں۔ دل ہی دل میں غوث پاک سے مدد مانگ کر اس نے اپنے چہرے پر تبسم کی ہلکی سی لکیر پیدا کی، پھر آنکھیں جھکا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ نواب نے بھی شاید اس کے تذبذب کو بھانپ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود ہی کہا:

''چھوٹی بیگم، کوئی سودا ایسا نہیں جو از اول تا آخر پختہ اور میٹھا رہے۔'' پھر وہ خود ایک پل کے لئے

رکے۔ ''سخت نرم بھیگا سوکھا میٹھا کڑوا سب ہی راہ میں آتا ہے۔ لوگ تو من حیث المجموع حکم لگاتے ہیں۔ اسی لئے ہم تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں بھی کچھ مدت آزما کر دیکھئے۔ ہم آپ کے محکوم نہ سہی لیکن آپ کی مرضی کے باہر جانے کا مجاز خود کو نہیں پاتے۔''

چھوٹی بیگم کے جی میں پھر لہر سی اٹھی۔ اس کے دل میں آئی، پوچھے، ''لیکن کتنی مدت تک، اور اس مدت کے بعد میرا کیا ہوگا؟'' لیکن اس کے بحر خیالات کا پانی بہت جلد تلاطم کی حالت سے بدل کر ٹھہراؤ، یا اگر ٹھہراؤ نہیں تو صرف اعماق میں خروش اور سطح پر شگفتہ اٹھکیلیاں کھیلتی ہوئی زنجیروں جیسا ہوگیا۔ یہ امر اس پر مخفی نہ تھا کہ نواب آج کی محفل میں معاملات کو کسی نہ کسی روسے استحکام اور استقرار چاہتے ہیں۔ وزیر کے خواہاں شاید اور بھی تھے اور شاید نواب کو خدشہ تھا کہ اگر انھوں نے وزیر کو بہ تعجیل تمام اپنی حریم میں نہ پہنچایا تو آگے کی راہ پیچیدہ اور غیر یقینی ہو سکتی ہے اور وزیر کے دروازے شاید بجبر، یا شاید برغبت، کسی اور پر کھل سکتے ہیں۔ لیکن وزیر کو بھی اپنی راہ صاف نظر نہ آرہی تھی۔ اب وہ چھ سال پہلے کی عاقبت نا اندیش، لیکن جذبۂ شوق و ہوس دل آرائی سے سرشار چودہ پندرہ برس کی حسینہ نہ تھی، اور نہ نواب شمس الدین احمد ہی، اپنی تمام دل کشی اور اداہائے دلآرامی کے باوصف وہ اجنبی، جدید، اور پر اسرار بحر محبت نہ تھے جس کی لہریں مارسٹن بلیک کی اشاروں کنایوں کے روپ میں وزیر خانم کو روز اول ہی سے شور بور کرتی رہی تھیں۔ زندگی، اور تاہل، اور تزویج کے بہت سے نشیب و فراز اب وزیر کے اوپر سے گذر چکے تھے۔ اب وہ آنکھیں بند کر کے، یا آنکھیں کھول کر ہی سہی، یم عشق و عاشقی میں کود پڑنے کے لئے خود کو تیار نہ دیکھتی تھی، خواہ وہ کتنا ہی پایاب نظر آتا ہو...

...لیکن سب سے بڑا سوال تو وہی تھا جو وزیر کے دل نے سب سے پہلے پوچھنا چاہا تھا: دائمی قید کے معنی نواب شمس الدین احمد کی نظروں میں کیا تھے؟

شمس الدین احمد اس کی طرف منتظر مگر صابر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ گذشتہ ایک دو گھڑی کے دوران کبھی کبھی پردوں کو ہلکی سی جنبش بھی ہوئی تھی، شاید خدام یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ خاصہ چنے جانے کا حکم کتنی دیر میں صادر ہونے کا امکان ہے۔ لیکن یہاں تو یہ دونوں اپنی ہی اپنی دنیا میں قید تھے، کسی کو باہر کی سوجھ نہ تھی۔ وزیر بی جان کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے، وزیر کے دل میں کسی نے سرگوشی کی لیکن سرگوشی کچھ اتنی اونچی تھی کہ ایک لمحے کے لئے وزیر کا چہرہ زرد پڑ گیا کہ کہیں نواب نے سن نہ لیا ہو۔

دفعۃً فیصلہ کر کے وزیر خانم سرو قد اٹھ کھڑی ہوئی۔ نواب نے ایک لمحے کے لئے تقریباً سراسیمگی

کے عالم میں سوچا، یہ کیا ہوا؟ اور پھر برہمی کی بھی ایک تیز، چبھتی ہوئی، گرم لہر ان کے سراپے میں دوڑ گئی۔ چھوٹی بیگم کی یہ جرأت کہ اس طرح بے اجازت، اور حرف وسخن کی تکمیل کے بغیر کھڑی ہو جائیں! وہ پہلو بدل کر اٹھنے، یا کچھ کہنے ہی والے تھے کہ وزیر نے لکھنو والوں کی طرح عاجزانہ ہاتھ جوڑے اور بولی:

''میں نے تو آپ کو اپنا والی، اپنا آقا، اپنا صاحب، بہت پہلے ہی مان لیا تھا۔ لیکن آپ غنی اور میں فقیر۔ آپ کا کرم بے پایاں اور آپ کا التفات بے نہایت کہ مجھ سے مجھی کو طلب کرتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ مجھے تو انگر اور خود کو کاسہ بدست قرار دیتے ہیں اور منعم ہوتے ہوئے سائل کا روپ بھرنے کا الفت بھرا کھیل کھیلتے ہیں۔ بندی آپ کے ہاتھوں بن داموں بکی ہوئی ہے اور آپ کے نام کی مالا جپتی ہوئی اپنی ساری نامراد زندگی جی سکتی ہے، لیکن...''

نواب شمس الدین احمد اب نیم قد اٹھے اور انھوں نے ہاتھ بڑھا کر وزیر خانم کا دامن پکڑ کر کہا:

''لیکن، لیکن کیا؟ آپ ہم سے اور کیا طلب کرتی ہیں وزیر خانم؟ یا آپ کے دل میں کہیں کوئی رکاوٹ ہے؟ ہمارے بارے میں کوئی شک ہے؟ نہیں تو زندگی بھر ہمارا نام لے کر جینے کے دعوے کو ہم کیا سمجھیں؟... پھر یہ بھی تو غور فرمائیں کہ کوئی کتنے روز جی سکا ہے اور عمر چند روزہ کی کتنی مدت ہے؟'' یہ کہتے کہتے نواب بھی اٹھے اور ایک قدم بڑھ کر وزیر کے بالکل قریب آ گئے۔ انھوں نے آہستگی سے وزیر کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اتنی ہی آہستگی سے اسے اپنی طرف کھینچا اور چاہتے تھے کہ منھ چوم لیں لیکن وزیر نے ایک قدم پیچھے ہو کر ہاتھ باندھ لئے اور بولی:

''سرکار میرا سب کچھ آپ کا ہے، سب کچھ آپ پر قربان بھی کرنا پڑے تو میں ہنستی کھیلتی اس گھاٹ سے بھی اتر جاؤں گی... میں آپ سے دور بھی آپ کی ہو کر رہ سکتی ہوں لیکن اگر سرکار مجھے اپنی سنہری چھاؤں میں ہی لینا چاہتے ہیں تو زہے نصیب، لیکن حضور ایک بات پر غور فرما لیتے تو بندی پر احسان عظیم ہوتا۔''

اس وقت نواب نے وزیر کے چہرے پر کچھ ایسی تمکنت، کچھ ایسی شان، اور ساتھ ہی ساتھ کچھ ایسی روشنی جھلکتی ہوئی دیکھی جسے وہ روحانی نہیں تو قلبی روشنی ضرور کہنے پر مجبور تھے۔ انھوں نے وزیر کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے اس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھنے کی تاب خود میں نہ دیکھی۔ نظریں جھکائے جھکائے وہ بولے:

''اب تو شاید کوئی بات غور کے لائق رہی نہیں چھوٹی بیگم، لیکن فرمائیے۔ میں ہمہ تن توجہ ہوں۔''

"میرا احوال سرکار سے پوشیدہ نہیں۔ میں کیا تھی... لیکن تقدیر نے، یا شاید دل نے، مجھے کچھ اور بنا دیا، کسی اور ہی جگہ پہنچا دیا۔ میں اپنے خیال میں تھوڑی بہت، اور بہت سوں کے خیال میں بہت کچھ تھی۔ لیکن پھر جلاد فلک نے میرے صاحب کا سر کاٹ کر راجپوتانے کے مرگ زار میں پھینک دیا، میرے بچوں کو مجھ سے چھین لیا۔ اس میں نہ میرا دوش نہ آپ کا، لیکن اب قسمت میرے درماندہ کارواں کو آپ کے باب عالی پر لائی ہے تو اسے ٹھہرنے اور رکنے کی جگہ بھی چاہیئے۔"

نواب کے چہرے پر ہلکا سا تبسم آیا، ان کی آنکھوں میں کچھ محبت کی سی روشنی جھمکی۔ انھوں نے پھر چاہا کہ آگے بڑھیں اور اس بار تو وزیر کو آغوش میں لے ہی لیں۔ لیکن وزیر اپنی جگہ پر کچھ اس طرح جمی کھڑی رہی کہ نواب پھر ٹھٹھک گئے۔ پھر بھی، انھوں نے ہاتھ بڑھا کر وزیر کا دامن چھوا اور بولے:

"بی بی، تم نے مجھے غنی اور خود کو فقیر کہا۔ تم نے سنا نہیں۔

خواجہ می نازد بہ سیم و زر گدا طبع بلاست

خواجہ آں باشد کہ در مہر و وفا درویش نیست

انشاء اللہ تم مجھے مہر و وفا میں درویش نہ پاؤ گی۔ زندگی موت کا کچھ بھروسا نہیں یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ... بھئی واللہ تم نے میر صاحب قبلہ کا تو شعر سنا ہوگا۔"

نواب شمس الدین احمد ایک لحظہ رکے، گویا جواب کی توقع کر رہے ہوں۔ وزیر اسی طرح نظریں جھکائے ہوئے اور ہاتھ باندھے کھڑی تھی، لیکن نواب نے جب اس کا دامن چھوا تھا تو وہ کچھ غیر محسوس طور پر ان کے قریب آگئی تھی۔ اب وہ دونوں بالکل پاس پاس کھڑے تھے۔ وزیر نے جواب دیا:

"سرکار کس شعر کو پوچھتے ہیں؟ میں نے پہلے سنا بھی ہو تو سرکار کی زبان مبارک سے شعر سننے کا لطف ہی اور ہے۔ ارشاد فرمائیں۔"

اس بار نواب نے ہاتھ باندھ کر کھرکھراتی ہوئی آواز میں، جس میں گنگری کی گمک تھی، شعر پڑھا۔

میر جہاں ہے مقامر خانہ پیدایاں کا ناپیدا ہے

آؤ یہاں تو داو نختیں اپنے تئیں ہی کھو جاؤ

نواب پھر ایک لمحہ رکے، گویا کسی سوچ میں ہوں۔

"خانم، آپ نے ایک داو لگایا۔ شروع میں تو آپ کے مہرے خوب چلے، لیکن بعد میں ششدر ہو گئے... تو کیا ہوا؟ چلئے ایک بار اور مقامر خانۂ آفاق میں اپنی گوٹ پھینکئے۔ ضرب بہ بستان و بزن زانکہ تمامی

ندب است۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔"(۱)

وزیر کے دل میں خفگی کی ایک لہر اٹھی، اسے اپنا گلا رندھتا ہوا سا محسوس ہوا...تو نواب کو منا کحت درکار نہ تھی۔ وہ پیڑ کے نہیں، صرف پھل کے خریدار تھے...لیکن اس بات پر مایوسی کیسی اور خفگی کیوں؟ آس بے آس تو لگی ہی رہتی ہے، نواب بھی یہی بات تو اپنے فارسی عربی لفظوں میں کہہ رہے تھے۔ یہ معاملے سپردگی اور انضمام کے نہیں، بیع و شریٰ کے تھے۔

اس کی خاموشی دیکھ کر شمس الدین احمد نے سمجھا کہ اب اور کوئی بات وزیر کے دل میں نہیں ہے۔ میں نے اپنا منشا ظاہر کر دیا ہے، اور وزیر خانم کو بھی اس سلسلے میں کچھ اور کہنا نہیں ہے۔ وزیر کو میرا سخن قبول ہے کہ نہیں، یہ امر مجھ پر ابھی عیاں نہیں ہوا ہے، لیکن توقع ہے کہ جلد ہی کھل جائے گا...خیر، اس بابت ابھی کیا سوچنا ہے، اور کیوں سوچنا ہے۔ انھوں نے وزیر کی طرف دیکھا اور بولے:

"کیوں صاحب، خاصہ چنوایا جائے؟ خاصہ آپ کس وقت تناول کرنا پسند کرتی ہیں؟"

وزیر کو اپنے اور نواب کے درمیاں ایک پردہ سا گرتا محسوس ہوا، لیکن اس پر اسے حیرت نہیں ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ معمولی صاحب سلامت سے لے کر جسم و جان کی وحدت کے درمیان اجنبیت کے کئی مدارج اور کئی منازل ہیں۔ اس پر رنج تو ٹھیک تھا، کہ رنج تو لازمۂ حیات ہے۔ لیکن حیرت کا کوئی مقام یہاں نہ تھا، اور خاص کر اس جیسیوں کے لئے جنھیں اپنے فیصلے خود کرنے ہوتے تھے۔

"سرکار جب کھلوادیں۔" اس نے مسکرا کر کہا، لیکن پھر خفیف سے طنز کے لہجے میں بولی، "ہم تو دروازے پر سوالی ہیں۔"

نواب کی پیشانی پر انقباض کی ہلکی سی لہر آ گئی لیکن فوراً ہی غائب ہوگئی۔ انھوں نے باآواز بلند تالی بجائی اور جب چوبدار نے اندر آ کر سلام کیا تو اسے حکم دیا کہ طعام خانے میں کھانے کا اہتمام کیا جائے۔

(۱) "تمامی ندب" نرد کے کھیل میں اس موقعے کو کہتے ہیں جب گوٹ گیارہویں گھر میں پہنچ جاتی ہے۔

بہ نگہ می تواں چشید ترا

اس رات کے کھانے کی تفصیلات نہ شمس الدین احمد کو یاد رہیں اور نہ وزیر خانم کو۔ مارسٹن بلیک کے ساتھ کھانے کی تربیت کے سبب وہ کھانے کے درمیان کلمہ کلام، یا چہل، یا بے تکلف گفتگو کے فن سے واقف ہوگئی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ہندوستانی آداب کے لحاظ سے کھانے کے دوران زیادہ تر خاموش رہنا اور کبھی کبھی کسی چیز کی تعریف کرنا واجب تھا۔ شمس الدین احمد اسے پرشوق نگاہوں سے دیکھتے اور تحفہ تحفہ چیزیں کھلانے پر اصرار کرتے رہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ باتوں کے مراحل طے ہوگئے ہیں اور کھانے کے بعد بفور نہ سہی لیکن تعجیلاً معاملات شب کی باری آئے گی۔ ایک بار جب نواب نے مزعفر کی قاب سے چمچہ چمچہ بھر خود نکال کر وزیر کی رکابی میں ڈالنا شروع کیا تو وزیر نے بے اختیار کہا:

''بس بس، سرکار کیا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ میں بھلا اس قدر کس طور کھا سکوں ہوں!''

''بھئی واللہ، سارا کھانا یوں ہی رکھا ہے۔ میں تو جانوں کھانا آپ کو پسند نہیں آیا۔ آپ تو چڑیوں کے رنگ چگ رہی ہیں۔ مانا کہ آپ دھان پان سی ہیں لیکن جسم و جان کا رشتہ تو آپ کو بھی پیارا ہوگا؟''

''بندی کو ہر وہ رشتہ پیارا ہے جو آپ سے منسوب ہو، میری جان ہی سہی۔ لیکن یہ کیا کہ آپ تو خود بھوکے اٹھے جاتے ہیں اور مجھ پر زبردستی کر رہے ہیں کہ اور کھایئے۔''

''نہیں صاحب۔ زبردستی ہم بھلا کیونکے کر سکتے تھے۔ ہم تو خوش دلی سے دعوت ہی دے سکیں ہیں۔''

نواب کے اس فقرے کی معنویت وزیر پر پوشیدہ نہ تھی، لیکن اس نے سنی ان سنی سی کر دینے کے انداز میں جواب دیا:

''جی، ہم جانتے ہیں کہ مزدور خوشدل کند کار بیش۔''

شمس الدین احمد نے بھی اس نکتے کے معنی کو بظاہر نظر انداز کر کے اپنی بات کو گذشتہ سے پیوستہ کر کے کہا:

''صاحب، ہم نے تو آپ کی طرح حجاب کچھ نہ کیا۔ بلکہ آنکھوں سے آپ کی صورت ہی چکھ چکھ کر سیر ہوئے جا رہے ہیں۔ ہر چند کہ شاعر کہہ گیا ہے...'' پھر انھوں نے داراب بیگ جویا کا شعر بڑے لطف کے ساتھ پڑھا۔

پاے تا سر مزہ است اندامت
بہ نگہ می تواں چشید ترا

وزیر کچھ شرما گئی لیکن نواب نے کچھ توقف نہ کیا اور کچھ محجوب، کچھ شوخ سی ہنسی ہنس کر بولے:

''ہر چند کہ ہم نے صرف ہاتھ پاؤں منھ کی جھلک ہی دیکھی ہے اور ہم جیسے بھوکوں کی سیری کے لئے اور بھی کچھ درکار تھا۔ لیکن بھئی واللہ... جتنا چکھا ہے اس سے پیٹ تو بھر ہی گیا لیکن جی نہیں بھرا۔''

وزیر کو ایک انگریزی فقرہ یاد آ گیا جو اے بی میم صاحب اس کے بچوں سے اس وقت کہتی تھی جب وہ کوئی کھانے کی چیز اپنے حصے سے زیادہ مانگتے تھے۔ اس نے اپنے طور پر فقرے کا ترجمہ ہندی میں کیا اور مسکرا کر بولی:

''سرکار کی چشمان مبارک سرکار کے شکم مبارک سے زیادہ ظرف رکھتی ہیں۔''

شمس الدین احمد کو یہ فقرہ سمجھنے میں ایک پل کی دیر لگی۔ لیکن جب بات ان تک پہنچ گئی تو وہ کھلکھلا کر ہنسے۔ ''بھئی واللہ کیا خوب فقرہ تراشا ہے۔ جی چاہتا ہے منھ چوم لیجئے۔''

وزیر کے دل سے شام کی تلخی اب بڑی حد تک زائل ہو چکی تھی۔ کھانے کے دوران اس نے سوچ سوچ کر اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ اس بارگاہ سے اس گھڑی جو مل رہا ہے اسی کو قبول کر لے۔ نواب کے لگاؤ کی سنہری لیکن عارضی چھاؤں بہر حال تنہا عمر رسیدگی اور بے یاری کی لمبی پرچھائیوں سے بہتر ہے۔ یہ سوچ کر اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا کہ مہرہ ساں خانہ بہ خانہ بھٹکنے سے بہتر ہے کہ نردیں کچی پڑی ہوں لیکن گھر بہت دور نہ ہو۔ تمامی ندب نہ سہی ہفت سہی، لیکن یازدہ اور ہفدہ کا امکان تو تھا۔ ایسا تو نہ تھا کہ ہفت سے ہژدہ میں جا گریں گے اور بازی ہی ختم ہو جائے گی۔ نواب کا جملہ سن کر اس نے انھیں ایک ادائے ناز سے دیکھا اور بولی:

''سرکار۔ منہ دھو رکھئے۔''

شمس الدین احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔ ''اجی آپ ہمیں مل جائیں تو ہم سمجھیں گے گنگا نہا لئے۔ ابھی تو ہمارے سر پر آب تمنا کا بھرا ہوا طشت ہے اور اس میں سے بوندیں چھلک چھلک کر ہمارا منہ دھو رہی ہیں اور ہماری آنکھوں کو نم کر رہی ہیں۔''

''سرکار تو اسم با مسمّٰی ہیں۔ آپ کے گھر میں نمی کہاں، چشمۂ خورشید میں کیدھر ہے آب۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ نہ ہوں تو بارشیں بھی نہ ہوں۔ خشک و تر دونوں آپ کے ہیں۔''

''بھئی واللہ یہ فقرے بازیاں بہت دلخوش کن لیکن ابتہاج انگیز بھی ہیں۔ کیا ہم سوکھے منہ صرف ہنستے ہی بولتے رہیں گے؟''

اس کے پہلے کہ وزیر کچھ جواب دیتی، خدمت گار نے آکر نواب سے پوچھا کہ سرکار اور خانم صاحب کے لئے فواکہ اور بھنڈے اور تنبول کا بندوبست ایوان ملاقات میں کیا جائے یا حضور یہیں شغل فرمانا پسند کریں گے۔ وزیر کو بات ٹالنے کا موقع مل گیا، بولی:

''بندگان عالی کی رکابی تو خالی ہی رہ گئی۔ اب کچھ شیرینی اور میوہ جات نوش فرما لیتے تو خوب تھا۔''

شمس الدین احمد نے کہا، ''ہمارا چنبل بھر جائے تو ہم آپ کو دعائیں دیں گے۔ رہا بھنڈے اور شیرینی وغیرہ کا قصہ، تو چلئے اب اٹھیں۔ بڑے ایوان میں بیٹھتے ہیں، پردے اٹھوا دیئے جائیں گے تو اور بھی لطف رہے گا۔''

دونوں بڑے ایوان میں واپس آبیٹھے۔ فواکہ اور میوہ جات کی کشتیاں اور خشک حلوے کے طباق حاضر کئے گئے۔ ایک بھنڈے بردار نے نواب کو بھنڈا پیش کیا، دوسرے نے سونے کے ورق لگے ہوئے سفید بنارسی پان چاندی کی کشتی میں رکھ کر دونوں کے سامنے دھرے۔ نواب نے کچھ کھانے سے انکار کر کے بڑے کھلے ہوئے ذوق کے ساتھ بھنڈے سے شوق شروع کر دیا۔ وزیر کو بھنڈا پیش کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اس کا ذوق نہیں، اس نے ایک پان البتہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ شروع صبا میں اسے تنباکوے نوشیدنی سے کچھ طوع نہ تھا تو کچھ کراہیت بھی نہ تھی۔ لیکن جب مارسٹن بلیک سے اسے معلوم ہوا کہ صاحبان عالی شان کے یہاں عورات کی تنباکو نوشی معیوب گردانی جاتی ہے تو اس نے بھنڈے کو منہ لگانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ شمس الدین احمد بھنڈا ملاحظہ کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے لئے

دونوں کے درمیان مطمئن سی خاموشی رہی، گویا دونوں میں پرانی دوستی ہو جہاں یگانگت کا ثبوت دینے کے لئے بے تکلف چھیڑ چھاڑ یا کسی مقررہ مضمون پر مکالمت یا مخاطبت ضروری نہ ہو۔

رات بھیگنے لگی تھی۔ وزیر گومگو میں تھی کہ جانے کی اجازت خود مانگوں یا اذن رخصت کا انتظار کروں، یا کچھ یوں ظاہر کروں کہ گویا میں رات رک سکتی ہوں۔ خاموشی کچھ طول پکڑنے والی تھی جب نواب نے مہر سکوت توڑی، لیکن یوں کہ انھوں نے کسی نوکر کو بلانے کے لئے تالی بجائی۔ ایک چوبدار فوراً ہی داخل ہوا، اور ایسا لگتا تھا کہ اسے اپنی طلبی کا سبب معلوم تھا۔ چنانچہ وہ شمس الدین احمد کے قریب آیا اور مودب طریقے سے جھک کر اس نے نواب کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ نواب نے ہاتھ کے خفیف اشارے سے اسے رخصت دی اور وزیر خانم کی طرف دیکھ کر ذرا سنجیدہ لہجے میں بولے:

''آپ کے ملازمان طعام سے فارغ ہو چکے ہیں۔'' پھر ان کے چہرے پر وہ خاص مسکراہٹ آئی جو اپنی دلکشی کے لئے مشہور تھی۔ ''اب آپ تشریف لے جانا چاہیں تو ہماری طرف سے اجازت ہے، لیکن دل سے نہیں۔ دل تو یہی کہتا ہے کہ رات بہت ہو گئی ہے۔ اور ہر چند کہ آپ کا ڈیرہ یہاں سے بہت دور نہیں، اور میرے عصا بردار بھی آپ کے ہم رکاب ہوں گے لیکن خواہ مخواہ رات کو باہر نکلنے کا جوکھم کیوں مول لیں؟''

وزیر اس دعوت کے لئے تیار تھی بھی اور نہیں بھی تھی۔ اس کے دل پر سے انقباض اور مایوسی کے بادل بھی چھٹ چکے تھے اور وہ جانتی بھی تھی کہ کچھ اس قسم کی ترغیب کا سامنا اسے جلد یا بدیر، اور گمان غالب تھا کہ بہت جلد، کرنا ہوگا۔ لیکن وہ نواب کی محل سرا میں پاؤں دھرنے سے گریزاں تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زنانہ حویلی میں کس طرح کا انتظام ہے۔ اور اگر منکوحہ بن کر نہیں رہنا تھا تو وہ محل سرا سے دور رہنا ہی احسن جانتی تھی۔ نواب نے شاید اس کے حیص بیص کو سمجھ لیا اور بولے:

''ہمارا مہمان خانہ بالکل الگ ہے، محل سرا سے کوئی مطلب نہیں۔ ہر طرح محفوظ و مصئون بھی ہے۔ آپ وہاں بے خطر استراحت فرمائیں۔ وہاں ساری آسائشیں مہیا ہیں اور آپ کا عملہ بھی وہیں قریب ہی میں پڑ رہے گا۔''

وزیر نے کچھ جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار ہویدا ہوئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پان کا ایک اور بیڑا منھ میں رکھا اور بولی، ''بہتر ہے، جو مزاج عالی میں آئے۔ بسم اللہ۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

نواب نے ایک لحظہ دل میں غور کیا کہ ''جو مزاج عالی میں آئے'' کا اور کچھ مفہوم تو نہیں ہے۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دوسرا مفہوم بھی ممکن تھا۔ لیکن انھوں نے یہ بات ظاہر نہ ہونے دی، بلکہ تالی بجا کر چوبدار اور مشعل بردار کو بلایا اور ہدایت کی کہ خانم صاحب کو بحفاظت واحترام مہمان خانے میں پہنچا دیا جائے۔ وزیر نے جھک کر تین تسلیمیں ادا کیں لیکن اگلی ملاقات کے وقت، یا وقت نہ سہی امکان کا بھی کچھ اشارہ نہ دیا، بلکہ صرف یہ کہا:

''بندی کا نصیبہ آج بلندی پر تھا کہ سرکار کی ضیافت میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ایسی ضیافتیں اور ایسی صحبتیں اللہ لاکھ بار نصیب کرے۔''

شمس الدین احمد نے متانت سے دل پر دایاں ہاتھ رکھا اور سر کو بہت ذرا سا خم کر کے بولے، ''جی تو ہمارا خوش ہوا۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔ انشاء اللہ ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔''

آخری جملے میں ہلکے سے استفسار کی جھلک تھی۔ وزیر نے بھی انتہائی متانت سے دوبارہ سلام کیا اور بولی، ''سرکار کی قدر افزائی۔ سب آپ کی مرضی پر ہے، میں آپ سے باہر نہیں ہو سکتی۔''

اس قول کے بعد کسی توضیح یا تفصیل کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ وزیر خانم دو قدم الٹے پاؤں ہٹی، پھر اپنے خاص انداز میں چلتی ہوئی، گویا ہر قدم ناپ تول کر رکھ رہی ہو لیکن اتنے سہج انداز میں کہ لگتا تھا پانی پر چل رہی ہے، تاجدار دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ نواب شمس الدین احمد اب بھی اپنی جگہ پر کھڑے اسے کچھ محویت سے دیکھ رہے تھے۔ وزیر کو مڑتے دیکھا تو انھوں نے داہنا ہاتھ پھر سینے پر رکھا اور اپنی جگہ پر کھڑے ہی کھڑے کہا:

''اللہ کی امان میں سونپا۔''

حبیب النسا

وزیر مہمان خانے پر اس شان سے پہنچی کہ اس کے دائیں بائیں دو مشعل بردار دستیاں روشن کئے ہوئے تھے، اس کے ذرا آگے ایک عصا بردار تھا اور ذرا پیچھے لیکن بائیں طرف کو ایک اور عصا بردار تھا۔ مہماں سرا کے دروازے پر مشعل بردار اور عصا بردار سلام کر کے رخصت ہوئے۔ مہماں سرا کیا تھی، اچھی خاصی محل سرا تھی، قدیم وضع کی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے گرد کوئی چاردیواری نہ تھی اور نہ ہی سامنے کوئی چمن تھا۔ صرف ایک روشن فوارہ رواں تھا جس کے چاروں طرف مغل طرز پر بنی ہوئی سنگ سرخ کی ستارہ صورت کیاریوں میں پھول پودے اگ رہے تھے۔ اندر روشنی ہو رہی تھی لیکن دروازہ بند تھا۔ وزیر تھوڑا ٹھٹکی تھی کہ اب کسے آواز دوں، کدھر جاؤں، کہ دروازہ بے آواز کھلا اور اندر کے ایوان کی بہت ساری روشنی باہر تک چھلک آئی۔ روشن دروازے میں ایک مغلانی کھڑی تھیں۔ روشنی ان کے پیچھے ہونے کی وجہ سے وزیر کو ان کے خط و خال نظر نہ آئے لیکن ان کا لباس خاصا شریفانہ اور نفیس معلوم ہو رہا تھا اور عمر کے لحاظ سے وہ جوانی اور ادھیڑپن کے بیچ کی کسی منزل میں لگتی تھیں۔ مغلانی نے ایک قدم آگے بڑھایا، جھک کر تین تسلیمات کیں اور بولیں:

''خانم صاحب۔ اہلاً و سہلاً۔ تشریف لائیں، بندی خدمت کو حاضر ہے۔''

وزیر کی سمجھ میں ٹھیک سے نہ آیا کہ اس وقت کیا خدمت ہو سکتی تھی، اور کیوں۔ لیکن پھر اس کے خیال میں آیا کہ یہ نواب کی خوش تدبیری اور فہمیدگی تھی کہ انھوں نے ایک معتبر اور معاملہ فہم گرہستنی قسم کی خاتون کی تعیناتی کر دی تھی کہ نئی جگہ وزیر کا دل نہ گھبرائے اور اگر کسی چیز کو اس کا دل چاہے یا سونے سے قبل کے اس کے کچھ معمولات ہوں تو وہ مغلانی کو بے تکلف بتا سکے۔ وزیر نے مسکرا کر مغلانی کا سلام قبول کیا اور اندر آ گئی۔ کمرے میں روشنی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ نمائشی معلوم ہو۔ مغلانی بی نے سرخ گلبدن کا

تنگ پائجامہ اور زرد رنگ کا لمبا کرتا پہن رکھا تھا۔ باریک سبز جالی کا ڈوپٹہ، گلے میں سونے کی زنجیر لیکن نگوں سے عاری، کان میں سونے کی بالیاں اور پتے، لیکن وہ بھی سادہ، نہ جڑاؤ نہ مینا کار۔ ہتھیلیوں اور ننگے پاؤں کے تلوؤں میں خوبصورت نگار، دونوں پاؤں کی دو دو انگلیوں میں چاندی کے بچھوے جن کی وجہ سے پیروں پر عجب بہار۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا، دانتوں پر مجلس حیران، خاصی قبول صورت اور جامہ زیب شخصیت تھی۔ چہرے بشرے پر شرافت اور نرمی کے آثار ظاہر تھے۔ ان کی عمر یہی چالیس کی رہی ہوگی، لیکن انیس سالہ وزیر کو وہ خاصی عمر رسیدہ لگ رہی تھیں۔

''بندی کو حبیب النسا کہتے ہیں۔'' مغلانی نے بتایا۔ ''بیگمات مجھے حبیبہ بلاتی ہیں۔ آپ چاہیں حبیبہ بلائیں یا پورے نام سے پکاریں، یا کوئی اور اچھا سا نام دے دیں، میں ہر طرح راضی ہوں۔'' ان کی آواز بہت صاف، شائستہ اور کچھ میواڑ کا رنگ لئے ہوئے تھی جس میں برج کی ہلکی سی مٹھاس تھی۔

''نہیں، حبیبہ بہت اچھا نام ہے۔ یہی میں بھی پکاروں گی۔''

حبیبہ نے ایک بڑی آرام صندلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''جی چاہے تو ذرا کی ذرا یہاں تشریف رکھیں۔ میں آپ کی جوتیاں اتار دوں اور تلوؤں ہتھیلیوں کی چمپی کر دوں۔''

وزیر ایک لمحے کو ہچکچائی۔ چمپی والیاں جے پور میں بھی تھیں لیکن مقرری ملازم نہ تھیں اور مغلانی بی کی طرح کا خیال اور لحاظ تو کوئی بھی نہ جانتی تھی۔ وزیر کو اچانک تکان اور اپنے جسم میں ڈھیلے پن کا احساس ہوا۔ اسے خیال آیا کہ نواب کے ساتھ ساری شام بظاہر چاہے جتنی خوشگوار گذری ہو، لیکن اندر اندر، یعنی کم از کم اس کے دل و جان کے اندر، تناؤ بہت تھے۔ اب وہ صحبت ختم ہوئی تو بہت ساری تھکن اور ایک طرح کی بےلطفی کی دیوار سی اس پر آ گری تھی۔

اس نے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی۔ متوسط سے کچھ زیادہ لمبائی چوڑائی کا کمرہ تھا۔ ایک سرے پر بھاری آبنوسی پلنگ جس کے بڑے بڑے موٹے پائے شیشم کے تھے اور ان پر چاندی اور پیتل کا ہلکا کام تھا۔ چھپر کھٹ کے طور پر استعمال کرنے کی سہولت کے لئے اس کے چاروں کونوں پر آبنوسی ڈنڈے اور پٹیاں لگی تھیں۔ پٹیوں پر سبز پوت کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ پلنگ کی اونچائی عام دہلوی طرز کے پلنگوں سے زیادہ اور راجپوتانہ کے نوابی یا مہاراجے پلنگوں کی طرز پر تھی۔ پلنگ پر پاؤں رکھنے کے لئے نیچی چوڑی سی گدے دار قدم گاہ تھی جس کے گدے پر اطلس مڑھا ہوا تھا۔ ''قدم گاہ'' کا لفظ اس کے ذہن

میں یوں ہی، یا شاید میر کے ایک مصرعے کی مناسبت سے گونج اٹھا تھا (گلستاں کسو کی قدم گاہ ہے) ورنہ راجپوتانے میں اسے ''پاؤ دان'' اور دلی میں ''پایے دان'' کہتے تھے۔ وزیر کے بالکل سامنے دیوار سے لگی ہوئی ایک بڑی سی آرام چوکی، یا صندلی تھی، کچھ انگریزی اور کچھ ہندوستانی وضع کی، جس پر مخمل کے گدے پڑے ہوئے تھے۔ بھاری پائے، لیکن نقش و نگار سے خالی، دونوں طرف چوڑے چوڑے بازو، اتنے چوڑے کہ ان پر پیالہ یا تھالی رکھی جا سکتی تھی۔ پورے کمرے میں نیلے سبز قالینوں کا فرش تھا۔ آرام چوکی کے قریب اگالدان اور سیلاپچی نیچی تپائیوں پر رکھے ہوئے تھے۔

کمرے میں جگہ جگہ فرشی اور چھت گیر فانوس روشن تھے، لیکن سب کے کنول سبز تھے اس لئے روشنی نہایت ٹھنڈی اور آنکھوں کے لئے سکون بخش تھی۔ شمامۃ العنبر کی لطیف خوشبو اس احساس برودت و طمانیت کو اور بھی افزوں کر رہی تھی۔ ستمبر کے اوائل تھے، اس لئے موسم کچھ ٹھنڈا ہو چلا تھا، لیکن پنکھے کی ضرورت پھر بھی تھی۔ چھت کی پوری چوڑائی کے برابر دو مخملی پنکھے بھاری ڈنڈوں کے سہارے لٹکائے ہوئے تھے۔ دونوں کے کھینچنے کی ڈوری، بلکہ نہایت مضبوط رسا، مشترک تھا اور چھت کے ایک سرے پر ایک چرخی نصب تھی جس کے سہارے پنکھوں کو باہر سے کھینچا جاتا تھا۔ پلنگ کے پاس پرلی طرف ایک لمبی سی نیچی میز، جس پر کچھ کتابیں، کچھ مشروبات، پانوں کا خاصدان، اور چاندی کا شمعدان تھا، جس کی شمعیں ابھی روشن نہ تھیں لیکن دیاسلائی پاس میں رکھی تھی۔ آرام چوکی اور پلنگ کے درمیان ورلی طرف ایک میز پر چاندی کے الایچی دان، ایک اور خاصدان، اور ایک سنہری طشتری جس میں سنہری گلوریاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک لمبی بڑی تھالی میں موسم کے پھل سجے ہوئے، ان کے بیچ میں کابل کا سردہ نمایاں تھا۔ اس کشتی کے سامنے چاندی کی چھوٹی غوریاں اور انگریزی پھل کا ایک فاکہہ تراش تھا جس کی بینٹ پر سونے کی نازک نقاشی کی ہوئی تھی۔ کمرے میں ان چیزوں کے علاوہ ایک دو سادہ مگر خوش نما صندلیوں کے سوا اور کوئی شے اسباب و لوازمات میں سے نہ تھی۔

آرام چوکی پر بیٹھتے ہی وزیر کی پیٹھ خود بخود کرسی کی پشت سے لگ گئی۔ اس نے بالکل بے ارادہ طور پر اپنے پاؤں پھیلا دیئے اور ہاتھوں کو دونوں چوڑے ہتھوں پر ڈال دیا۔ بڑی صندلی میں وہ چھوٹی سی گڑیا لگ رہی تھی اور اس کے چہرے پر اس وقت گڑیوں ہی جیسی نرمی اور نزاکت تھی۔ اس نے حبیبہ کو اب ذرا غور سے دیکھا۔ کچھ ہلکی گرم خوشگوار لہریں سی اس کے بدن سے پھوٹ رہی تھیں۔ ان لہروں میں وزیر کے لئے تعظیم، تواضع، مان سمان کے علاوہ کچھ محبت اور کچھ جذبۂ ملکیت کی بھی خوشبو تھی، گویا حبیب النسا کی

نظر میں وزیر خانم کوئی اجنبی، ایک رات کی یا چند شب و روز کی مہمان نہ تھی بلکہ اس کی بیٹی یا پالی پوسی لڑکی تھی اور اس کے یہ رتبے اسے بہت مسرور کر رہے ہوں۔ حبیب النسا اس وقت وزیر کو ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جن کے ذرے ذرے میں اپنائیت، گھمنڈ اور محبت کے جگنو روشن تھے۔

ایسا کیوں ہے؟ وزیر نے سوچا۔ حبیبہ کو تو میں نے آج ہی دیکھا ہے، اب تک تو میں اس کے وجود سے بھی واقف نہ تھی۔ اور خود حبیبہ نے میرا نام سنا ہو تو سنا ہو لیکن مجھے دیکھا تو کبھی نہ تھا... اور اگر نواب میرے ساتھ دو چار دس دن کا خانگی معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو ایسی مغلانی کو میری خدمت پر کیوں بھیجا ہے جو مجھے اس قدر لگاؤ سے دیکھ رہی ہے گویا میں اس کی کوئی لگتی ہوں۔ وزیر کا جی اچانک گھبرانے لگا۔ آخر یہ کیا اسرار ہے۔ میں یہاں کہاں آ گئی ہوں...

وزیر کے چہرے پر تکدر کے آثار اگرچہ خفیف تھے لیکن حبیبہ نے انھیں پڑھ لیا۔ وہ ہلکی سہ ہنس کر آگے بڑھی، وزیر کے ماتھے کا پسینہ اس نے اپنے آنچل سے خشک کیا اور اس کی بلائیں لے کر بولی:

"واری جاؤں۔ میری بیگم کو کاہے کا تردد ہے۔ میں تو جانوں بہت تھک گئی ہیں اور کوئی بات نہیں۔ ایک عنبری بیڑا کھا لیجیے، طبیعت ٹھہر جائے گی اور طاقت بھی آ جائے گی۔"

حبیبہ نے خاصدان سے ایک گلوری نکالی اور ضد کر کے حبیبہ کے منھ میں ڈال دی۔ ٹھنڈا بیڑا چباتے ہی وزیر کو محسوس ہوا کہ اس کے سارے بدن میں خوشبو دوڑ گئی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ حبیبہ نے بڑھ کر اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا:

"دیکھا نہ، فوراً پیارے پیارے مکھڑے پر تبسم کی بہار آ گئی! ہائے کیا اچھی صورت ہے۔ چاند میں میل ہے اس میں میل نہیں۔"

وزیر کی آواز تو یوں ہی ذرا پست اور پھنسی پھنسی تھی، اب وہ تقریباً سرگوشی کے لہجے میں بولی:

"ہٹو بی حبیبہ۔ تم ہمیں بناتی ہو۔ میں کالی بھجنگ، نہ ناک نہ چوٹی۔ تمھیں جیسی میرا بکھان کر سکتی ہیں۔ مثل مشہور ہے، کانی کو کون سراہے کانی کا میاں۔"

حبیبہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا، "اللہ کی سوں میں تیسوں کلام درمیان میں رکھ کر کہتی ہوں ایسی موہنی صورت جو میں نے کبھی دیکھی ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ وزیر کے پیچھے آ کر اس کی پیشانی اور پپوٹوں پر انگلیاں دوڑانے لگی، جیسے تتلیاں پھڑ پھڑا رہی ہوں، جیسے پھول سنگھی اپنے پروبال لرزا لرزا کر پھولوں کا عرق پی رہی ہو۔ وزیر کو غیر

معمولی راحت کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں آپ سے آپ بند ہوتی چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے وہی تتلیاں اپنے شانہ و گردن پر پھڑ پھڑاتی محسوس ہوئیں۔ اسے نیندسی آگئی اور اسے یہ نہ معلوم ہوا کہ حبیبہ کے ہاتھ کب اس کی کمر، پھر رانوں، پھر پاؤں کے تلوؤں سے ہو کر اس کے بازوؤں اور ہتھیلیوں اور انگلیوں تک پہنچے۔ کچھ دیر بعد انگلیاں چٹخانے کی ہلکی ہلکی آواز اور نرم جھٹکوں سے اس کی آنکھ کھلی۔ اب اسے وہ کمرہ اپنے گھر جیسا مانوس لگنے لگا۔ حبیب النسا کا نرم چہرہ اسے دائی کی طرح شفیق اور مشاطہ کی طرح لحاظ آگیں اور ماہرانہ معلوم ہو رہا تھا۔ حبیب النسا کی مسکراہٹ اس قدر رازدارانہ، گھریلو اور دلآویز تھی کہ وزیر کا جی چاہا، ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالے۔ لیکن حبیبہ نے جیسے ہی دیکھا کہ وزیر جاگ پڑی ہے تو وہ ایک پردے کے پیچھے کہیں غائب ہوگئی۔ تب وزیر کو خیال آیا کہ کمرے کے ساتھ آبدار خانہ، غسل خانہ، صحت خانہ بھی تو ہوں گے، حبیبہ شاید آبدار خانے میں گئی ہے۔

دو چار پل بعد حبیبہ واپس آئی تو وزیر نے دیکھا کہ اس کا گمان صحیح تھا۔ حبیبہ کے ہاتھ میں دو بھیگے ہوئے رومال تھے جن سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ حبیبہ نے نہایت چابک دستی سے اور سبک ہاتھوں سے، لیکن اس طرح کہ پسینے اور غبار کا کوئی شائبہ، یا ان کے باعث کوئی کسل ہو، تو وہ صاف ہو جائے، وزیر کے منھ اور گردن اور شانوں اور دست و پا پر وہ نیم گرم دستمال پھیرے۔ ان میں اگر کے عطر کی مہک تھی جو ایک بار تو کچھ بھاری اور تمبا کو آلودہ معلوم ہوئی لیکن فوراً بہت ہی ہلکی اور مفرح محسوس ہونے لگی۔ تازگی کا احساس وزیر کے بدن میں پھر عود کر آیا۔

''اس دروازے کے پیچھے آبدار خانہ ہے،'' حبیبہ نے اشارہ کر کے کہا۔ ''اور اسی سے متصل ...وہ...وہ... صحت خانہ بھی ہے۔ آپ غسل فرمانا، یا... چوکی پر جانا چاہیں تو ارشاد فرمائیں۔ بندی خدمت کو حاضر ہے۔ حاجت ہو تو ہلکے ہلکے پیٹھ مل دوں گی۔'' وہ مسکرائی۔ ''اتنی نازک تو پشت ہے۔''

مارسٹن بلیک کے ساتھ رہتے رہتے وزیر نے کچھ باتیں سیکھ یا سمجھ لی تھیں۔ مثلاً یہ کہ کبھی کبھی وزیر کے غسل کرتے میں مارسٹن بلیک اس کے آبدار خانے میں آجاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کی پشت یا دست و پا کی مالش بھی کر دیتا اور اس کے ساتھ وہ وزیر کے عمومی حسن و جمال یا کسی عضو بدن کی خوب ستائشیں کرتا تھا۔ وزیر جانتی تھی کہ فرنگی مرد عورت بعض اوقات اکٹھا غسل بھی کر لیتے ہیں لیکن عموماً یہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستانی بیگمات کو تو ان کی خواص یا مشاطہ غسل کراتی تھی، لیکن اس معاملے میں وزیر نے بیگماتی طور نہ اختیار کیے تھے، وہ ہمیشہ تنہا نہاتی تھی اور عموماً اوپر اور نیچے دو ہلکے کپڑے مثلاً ململ کی چھوٹی کرتی اور ڈھیلا

پاجامہ یا کبھی کبھی راجپوتانی لہنگا پہنے رہتی تھی۔ چوکی پر کسی سے لوٹا رکھوانا یا ہاتھ دھلوانے میں کسی سے مدد لینا اسے بالکل گوارا نہ تھا۔ چوکی پر بیٹھے ہوئے کسی سے پیٹھ ملوانا... توبہ ہے، ایسا تو میں نے انگریزوں میں بھی نہیں دیکھا... ان رئیسوں کے طور نرالے ہیں۔ چوکی پر جانے کی وزیر کو یوں بھی اس وقت کچھ حاجت نہ تھی کہ شرفا کی لڑکیوں کی طرح اسے بھی خود کو بہت دیر تک روکے رہنا یا روکے رکھنا سکھایا گیا تھا۔

''نہیں نہیں۔ میں خود ہی منھ دھولوں گی حبیبہ، تم کچھ تردد نہ کرو۔'' اس نے انکار تو ضرور ذرا سختی سے کیا لیکن اپنی اسی دلبرانہ مسکراہٹ کے ساتھ جو ولیم فریزر، میرزا غالب اور فینی پارکس کے دل کو یکساں موم کر لیتی تھی۔ حبیب النسا تو اس تبسم پر دل ہی دل میں قربان ہوگئی۔

''اچھا تو تشریف لے چلئے، میں آفتابہ تھامے رہوں گی۔ آپ جی کھول کر دونوں ہاتھوں سے منھ پر چھپاکے مار لیجئے گا۔''

''اے بی حبیب النسا تم آفتابہ تھامتے تھامتے کہیں آفتابہ نہ کھا بیٹھو، ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔''

''بی بی صاحب کو ضلع بولنے میں خاص ملکہ ہے۔ کیوں نہ ہو، دلوں کی بھی تو ملکہ ہیں۔''

''مَلکہ وہ جس کا کوئی مُلک ہو، جس کا کوئی مِلک ہو۔ یہاں تو بس ایک دو تنگ کوٹھڑیاں اور کپڑوں کے چار شکستہ جوڑے اپنی مِلک ہیں۔''

''اللہ آپ کا سکہ ملکوں ملکوں چلے۔ زبان کا خزانہ ہے کہ خرچ ہی ہونے میں نہیں آتا۔''

وزیر ہنستی ہوئی اٹھی، اس نے حبیبہ کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی، گویا اس کا گال تھپتھپا دیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں حبیب النسا اتنی عمر رسیدہ نہ لگ رہی تھی جتنی نگاہ اولیں میں لگی تھی۔ اس وقت تو وہ اسے بڑی کی ہمجولی معلوم ہو رہی تھی، اور اس کے چہرے پر روشنی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ حبیبہ نے وزیر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگایا، پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کلوں پر ہلکی ہلکی چپتیں مار کر بولی، ''ہائے اللہ میری اتنی ہمت کہ آپ کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا سکوں۔''

''زیادہ باتیں بناؤ گی تو ایک دو چپتیں اور کھاؤ گی حبیبہ۔ اچھا میں منھ دھونے اور دانت مانجھنے چلی، ابھی آتی ہوں۔'' رات کو سونے سے پہلے دانت مانجھنے کی عادت اسے مارسٹن بلیک کی صحبت میں پڑی تھی۔

وزیر ابھی آبدار خانے کے دروازے کی طرف مڑی ہی تھی کہ کسی نے اس کا ڈوپٹہ پکڑ کر آہستگی

سے کھینچا۔ اس نے گردن ذرا موڑ کر دیکھا، حبیبہ اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' وزیر ذرا تیز لہجے میں بولی۔ اسے شبہ ہو رہا تھا کہ حبیبہ بھی چاہتی ہے کہ وہ بھی آبدار خانے میں اس کے ساتھ چلے، اور یہ وزیر کو ہرگز گوارا نہ تھا۔

''خانم صاحب۔ میں آپ کا لباس بدلوا دوں؟'' حبیبہ نے سر جھکا کر کہا۔

لباس بدلوا دوں؟ وزیر ایک لمحے کے لئے گڑبڑائی۔ مارسٹن بلیک کے ساتھ رہ کر اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ فرنگی عورتوں کا لباس شب خوابی الگ ہوتا ہے جسے وہ نیٹ گون (Night Gown) کہتی ہیں۔ یہ لمبا سا کرتا تھا، موسم کے لحاظ سے سوتی یا ریشمی یا اونی، اس میں تکمے ہوتے بھی تھے اور نہیں بھی۔ سامنے سے سارا کھلا رہتا، اسے تکموں سے بند کر لیتے یا پٹی سے باندھ لیتے تھے۔ نیٹ گون کے نیچے عورتیں کچھ نہ پہنتیں۔ یہ اسے بڑی بے حیائی معلوم ہوتی لیکن مارسٹن بلیک کے اصرار پر وہ اس کی بھی خوگر ہو گئی تھی۔ مرد عام طور پر ایک لمبی سی عبا نما چیز پہن کر سوتے تھے، اس فرق کے ساتھ کہ اس میں پائینچے بھی ہوتے تھے، گویا ایک ڈھیلے ڈھالے کرتے کو ایک ڈھیلے ڈھالے پائجامے کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ یہ بھی سامنے سے کھلا رہتا تھا، اس میں گھنڈی یا تکمہ شاذ ہی ہوتا تھا۔ مارسٹن بلیک اسے نیٹ شٹ (Night shirt) اور کبھی کبھی نیٹ گون ہی کہتا تھا۔

ہندوستان کے عام شرفا کی عورتیں دن ہی کے کپڑے رات کو بھی پہنے رہتی تھیں، الا ایسے دنوں میں جب شادی بیاہ یا ایسی ہی کسی رسم کا موقع ہوتا۔ اس وقت بھاری کپڑے پہنے جاتے، اور ایسی صورت میں شب خوابی کے وقت دن کے بھاری کپڑے اتار کر روزمرہ کے کپڑے پہن لئے جاتے تھے۔ عام جوڑا دو تین دن پہن کر دھوبی کو دے دیا جاتا یا گھر میں دھلوا لیا جاتا۔ طبقۂ امرا کی بیگمات دن رات ایک ہی کپڑا پہنتیں، بھاری ہلکے جوڑے کی تخصیص نہ تھی۔ ان کے کپڑے دھوبی کے یہاں نہیں جاتے تھے۔ بیگمات ہمیشہ نئے کپڑے پہنتیں اور چار یا پانچ یا حد سے حد سات دن بعد وہ کپڑے اتار کر دائی، ماما، چھوچھو وغیرہ میں تقسیم کر دیئے جاتے۔ بیگم پھر نیا جوڑا پہن لیتیں اور دن رات اسے پہنے رہتیں، تا آنکہ اس کے اتارنے کا دن نہ آ جاتا۔

وزیر خانم نے مارسٹن بلیک کے اصرار پر شب خوابی کے کپڑے پہننے شروع تو کر دیئے تھے لیکن وہ نیٹ گون نہ پہنتی تھی، ہندوستانی طرز کا کرتا پاجامہ ڈوپٹہ، موسم کے مناسب کپڑے کا پہن لیتی۔ سوتے میں ڈوپٹہ اتار دیا جاتا لیکن رات کو کبھی اٹھنا ہوتا تو وہ ڈوپٹہ پھر اوڑھ لیتی تھی۔ آج نواب

شمس الدین احمد کی دعوت میں جو بہت خاص کپڑے وہ پہن کر آئی تھی ان میں سو رہنا تو غیر ممکن تھا کہ کپڑے پھٹ جاتے یا ستیاناس ہو جاتے، پھر ایسی حالت میں گھر کو واپسی محال تھی۔ لیکن دن کے معمولی کپڑے یہاں اپنے ساتھ لانے کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ بے حیائی کے علاوہ اس میں ایک طرح کی منصوبہ بازی بھی نظر آتی تھی جو اسے نواب کی نظروں میں سبک کر سکتی تھی۔ جب آج رات یہاں ٹھہرنا طے ہو گیا تو اس کے دل میں خدشے تھے کہ اکیلے سونا ہے یا نواب بھی شریک خواب ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں کپڑوں کی کئی طرح کی خرابی متصور تھی، اور اغلب یہی تھا کہ اسے نواب کی شریک شبستاں ہونا پڑے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اوپری کپڑے اتار کر زیر جاموں میں سو رہوں گی۔ اب جب حبیب النسا نے لباس بدلوانے کی بات کہی تو وہ ٹھٹکی۔ شاید حبیب النسا اپنے کپڑے اسے پہناوے گی؟ تو کیا اسے معلوم تھا کہ میں رات رہنے کے لئے آرہی ہوں؟ نہ سہی، لیکن یہ اس کی پیش بینی تھی کہ اس نے شب خوابی کے کپڑوں کے لئے بھی کچھ سینتاؤ کر لیا تھا۔

''لباس بدلوانے کا کچھ اہتمام ہے کیا؟'' وزیر بالآخر بولی۔

''جی۔ خانم اگر آبدار خانے کے اندر تشریف لے چلیں تو میں کپڑے دکھا دوں۔''

''ٹھیک ہے۔ پر میں آپی آپ بدل لوں گی۔''

''بہت بہتر۔ جیسا آپ فرمائیں۔'' حبیبہ کچھ مسکرائی۔ وہ جانتی تھی کہ جیسے پیچیدہ کپڑے وزیر خانم نے زیب تن کر رکھے ہیں ان کو اتارنے اور تہ کرنے اور سینت کر رکھنے کے لئے تو ایک خادمہ درکار ہی ہوگی۔ لیکن اس وقت اس نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی اور وزیر کے پیچھے چپ چاپ اندر چلی گئی۔

آبدار خانے میں اچھی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک طرف نہانے کی چوکی، گھڑونچیوں پر مٹی کے نئے گھڑے اور چما چم کرتی ہوئی پیتل کی گگریاں اور بھرت کے گڑوے، نہانے کی گڑوی (دلی کی زبان میں ڈونگیا) چاندی کی، اور منقش، نیچے فرش پر بھرت کا بڑا طشت، شاید گرم پانی کے لئے یا نیچے بیٹھ کر نہانے والوں کے لئے تھا۔ پاس میں ایک چھوٹی چوکی پر صندل اور بیسن کی ٹکیاں، مختلف طرح کے مسالے، سر دھونے کے لوازم، دو چار انگریزی صابونوں کی بھی ٹکیاں اپنی اپنی طشتریوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دو موئے انگریزی پوڈروں کے ڈبے بھی تھے۔ کئی طرح کے تیل اور خوشبوؤں کی کپیاں، شیشے اور چو پہل شیشیاں اور ان کے علاوہ دو چار گلدستے بھی طاقوں میں سج رہے تھے۔ نہانے کی چوکی سے کچھ الگ پتھر کی نیچی چوکی پر وضو کا بھاری لوٹا اور ایک طشتری میں بیسن کی ٹکیہ رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کے دوسرے سرے پر،

پردے کے پیچھے، شاید بول گاہ تھی۔ لیکن آبدار خانے میں کسی تعفن، کسی کھرانڈ کا پتہ نہ تھا۔ کچھ کیوڑے کے عطر کا سا، لیکن ہلکا کمکیلا پن سارے میں پھیلا ہوا تھا۔

آبدار خانہ اتنی وسعت رکھتا تھا کہ نہانے، وضو کرنے، اور استنجا کرنے کی جگہوں کے باوجود اتنی جگہ تھی کہ اس میں پینے کے پانی کے گھڑے گھڑونچیوں پر، شربت کے شیشے، چاندی کے کٹورے اور گلاس اور طشتریاں، دیوار سے لگی ہوئی ایک اونچی میز پر بخوبی جگہ پا سکتے تھے، اور پھر بھی اتنی جگہ خالی تھی کہ لکڑی کا ایک جہازی صندوق بھی وہیں رکھا ہوا تھا۔ صندوق کو پتھر کی منقش لیکن بہت نیچی چوکی پر رکھا گیا تھا کہ وہ سیلن سے محفوظ رہے اور اسے کھولنے والے کو کوئی مشکل بھی نہ ہو۔ صندوق کے سامنے راجپوتانی طرز کی دو اونچی، سیدھی پشت کی اور ذرا تنگ کرسیاں تھیں تا کہ بیٹھ کر تبدیل لباس کرنے والے کو آسانی ہو۔ کرسیوں کی مخالف دیوار پر ایک بدن نما آئینۂ تصویر تھا۔ اس کی تصویریں زیادہ تر پھول پتیوں اور حسین لڑکوں لڑکیوں کی تھیں۔ آئینہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں کمرے کا بڑا حصہ بخوبی منعکس تھا اور اس کا شیشہ بے حد سچا تھا، یعنی وہ اپنے دیکھنے والے کے عکس کو بگاڑتا بالکل نہ تھا۔

وزیر جس طرح کے کپڑے پہنے ہوئے تھی انھیں پہنے پہنے منھ دھونا اسی وقت ممکن تھا کہ کپڑوں کے بھیگنے کی پروا ہرگز نہ کی جائے۔ بہتر تو یہی تھا کہ کپڑے اتار دیے جائیں اور صرف زیر جامے پہنے پہنے پانی کو ہاتھ لگایا جائے۔ حبیب النسا نے آگے بڑھ کر صندوق کھولا۔ پہلا کپڑا جو اس نے نکالا وہ زرد رنگ کی ریشمی ململ کا چھ گز اڈوپٹہ تھا۔ اس کے بعد اس نے اودے رنگ کی بھاگل پوری ریشم کا ایک بہت ڈھیلا ڈھالا پاجامہ نکالا، بالکل سادہ۔ کپڑا اس قدر ہلکا تھا کہ وزیر نے اسے ہاتھ میں لیا تو اسے لگا کہ پاجامے کا وزن ڈوپٹے کے وزن سے زیادہ نہیں ہے۔ مقصود یہی تھا کہ شب خوابی کا لباس ہلکا ہونا چاہیئے۔ غالباً اسی لئے اس پر گوٹا ٹھپا کناری تو کیا، ہلکی پیمک بھی نہ تھی۔ سب سے آخیر میں حبیبہ نے ڈوپٹے ہی کے رنگ کی پھولام کا ایک ڈھیلا کرتا نکالا۔ پورے کرتے پر چمپئی رنگ کے پھول تھے لیکن بہت گھنے نہیں۔ گریبان اونچا تھا، لیکن گلے میں تکمہ نہ تھا اور گلا سامنے سے کھلا ہوا تھا۔

وزیر کا دل ان کپڑوں کو دیکھ کر للچایا کہ ایسے لباس میں سونے کے لئے کس کا دل نہ چاہے گا۔ وہ بار بار کرتے اور ڈوپٹے کو اٹھا کر اپنے بدن پر لگاتی اور ان کی پھبن دیکھتی۔

''نیچے پہننے کے لئے چھوٹے کپڑے بھی حاضر کروں؟'' حبیبہ نے پوچھا۔ جب وزیر نے جواب دیا کہ چھوٹے کپڑوں کی کچھ حاجت نہیں تو حبیبہ نے اس کی طرف کچھ معنی خیز نگاہوں سے دیکھا،

گویا پوچھ رہی ہو کہ کپڑے اتارنے میں کچھ مدد کر سکتی ہوں کہ نہیں۔ یا پھر یہ کہہ رہی ہو کہ پردے کے پیچھے تشریف لے جانا ہو تو کپڑے اتارنے ہی پڑیں گے۔ وزیر کا تذبذب اس کے چہرے سے عیاں تھا، لیکن چونکہ اس میں قوت فیصلہ بہت تھی، اس لئے یہ صورت حال دیر تک نہ رہی۔ وہ فوراً ہی کرسی پر بیٹھ کر بولی:

''چلئے، کہاں سے شروع کریں؟''

فیصلہ تو وزیر نے کر لیا تھا، لیکن اس کا چہرہ تکدر اور تبسم کے ملے جلے تاثرات کا پتہ دے رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ یہ بات پسند نہ کرتی تھی کہ کپڑے بدلنے، نہانے دھونے، یا جائے ضرور کی کسی مصروفیت میں کوئی اس کا معاون یا شریک ہو، خواہ وہ حبیبہ جیسی من چاہی کیوں نہ ہو۔

آہستہ آہستہ کر کے حبیبہ نے وزیر کے سارے اوپری کپڑے اتارے۔ دو ایک کو تو وہ بدقت یا بآسانی تہ کر کے صندوق میں رکھ سکی، لیکن باقی ایسے تھے کہ انھیں تہ کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا، یا شاید وہ تہ کیے جانے والے کپڑے تھے بھی نہیں۔ ایسے سب کپڑے حبیبہ نے نہایت احتیاط سے، گویا پھونک پھونک کر اٹھائے اور وہیں آبدار خانے کی برنجی کھونٹیوں پر لٹکا دیئے۔ پھر اس نے وزیر کا منھ، ہاتھ پاؤں دھلائے، پھر انھیں نرم اور ہلکے سے معطر دستمال سے خشک کیا۔ وزیر کی پتلی کمر، بھاری کولھے اور نمایاں گات اب اور بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کولھوں کا وزن گات کو سنبھالے ہوئے ہے ورنہ یہ کامنی جیسی بیبیا چلتیں تو پاؤں رکھتیں کہیں اور پڑتا کہیں اور۔ حبیب النسا کے دل میں شوق کا سا ایک ولولہ دم بھر گونجا لیکن اس نے ضبط سے کام لے کر چہرے پر کوئی رنگ نہ آنے دیا اور نہ ہی اپنے ہاتھوں کی خفیف لرزش کو وزیر پر ظاہر ہونے دیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب اگر وہ ٹھہرے گی تو یہ وزیر کی خفگی کا باعث ہوگا۔ وہ سلام کر کے بولی:

''میں باہر ٹھہرتی ہوں، سرکار جب چاہیں آواز دے لیں۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی وزیر کی پیشانی پر ہلکی سی چین شکن آئی۔ حبیب النسا کا اب کیا کام ہوگا جو وہ اپنے واپس بلائے جانے کا اشارہ کر رہی ہے؟ وزیر بھی بہر حال اپنے تاثرات قلب کو مستور رکھنے میں مہارت رکھتی تھی، بلکہ وہ اس فن میں حبیبہ سے بھی کچھ زیادہ ماہر تھی۔ حبیب النسا نے نوکری کے باعث چاکری کے آداب سیکھے اور ان پر عمل کیا تو وزیر نے محبت سے لے کر اِبا، اور کراہیت تک کے سب مدارج اور ماحول جھیلے تھے۔ لہٰذا وزیر نے اس خفیف سی کراہت کو، جو اس کے دل میں کہیں پیدا ہو رہی تھی، پرے جھٹک کر کہا، ''بہت خوب''، اور اپنے کپڑوں اور آبدار خانے کے سامان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

حبیب النسا کے جاتے ہی وزیر نے اپنے زیر جامے سب اتارے اور وہ اٹھ کر پردے کے پیچھے جانا چاہتی تھی کہ اس کی نظر آئینۂ بدن نما پر پڑی جس میں وہ پوری کی پوری دکھائی دے رہی تھی، جیسی کہ وہ تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چونکی، پھر ٹھٹک گئی، کہ اس کے بدن کے سارے نشیب و فراز، حتیٰ کہ کوہ زہرہ کا ارتفاع اور اس پر اگتا ہوا خفیف سا سبزہ بھی، ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی، گویا اس کے بدن سے روشنی پھوٹ رہی ہو اور وہ روشنی آئینے کی صفا اور ایضاح کو دو ایک درجہ اور بلند کر رہی ہو۔ اس کے بدن سے کہیں بھی گمان نہ گذرتا تھا کہ وہ دو بچوں کی ماں بن چکی ہے۔ اس کے پیٹ پر کھنچاؤ کے وہ نشان بھی نہ تھے جو اکثر عورتوں کے یہاں زچگی کے بعد پیدا ہو جاتے ہیں۔ رانیں گویا کمھار کے چاک سے اتار کر دھوپ میں سکھائی گئی ہوں، ایڑیوں اور تلووؤں کا گلابی پن پاؤں کے پنجوں اور ٹخنوں کے ہلکے گلابی جامنی سانولے پن کی رونق بڑھا رہا تھا۔ پیٹ بالکل مسطح، گردن بالکل سیدھی اور سڈول، شربتی آنکھوں میں شمعوں کی جگمگاہٹ یوں تھی جیسے نازک بلوری قمقموں میں ارغوانی شراب بھر کر ان کے پیچھے قندیل روشن کر دی گئی ہو۔

اچانک اس کا دل بھر آیا۔ بلاک صاحب کے سوا کسی نے اسے نہ دیکھا تھا اور جس طرح وہ آئینہ اسے دیکھ رہا تھا اس طرح تو بلاک صاحب بھی نہ دیکھتے ہوں گے۔ اور آج... آج اسے کوئی اور دیکھے گا۔ وہ ہزار راحت جاں سہی لیکن وہ پہلا نہ تھا... اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اس کو لگا کہ اس کے بدن کی ساری قوت جو حبیب النسا کی پرداخت و صیانت نے پیدا کی تھی کسی کنویں میں اتر گئی ہے۔ کرسی پر بے ارادہ گر کر اس نے زانو پر زانو رکھ لیا، اس طرح، کہ اس کا وسطی بدن بالکل پوشیدہ ہو گیا تھا۔ رانوں کے بیچ کوہ زہرہ پر تختۂ صندل بالکل چھپ گیا تھا اور رانوں کے اتصال نے پیٹ اور پیڑو کے درمیان ایک نئی اور ذرا گہری تکون سی بنا دی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اب وہ آئینے میں نہیں، اپنے دل میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس ناتجربہ کار لیکن اپنی من مانی کرنے پر مستحکم لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس کے بدن کے سارے اسرار اور روح کے بہت سے اسرار ایک کرسٹان فرنگی بدیسی نے اس پر اس انداز سے افشا کئے تھے گویا وہ اس پرائے مرد ہی پر نازل ہوئے ہوں اور پھر سب کچھ اس کے لئے حق الیقین بن گیا تھا۔ وہ مارسٹن بلیک کے لئے روئی کہ آج اس پر یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی تھی کہ کوئی تا قیامت نہیں جیتا اور مرنے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ روتی رہی اور اس کے آنسو چھاتیوں کی ڈھلان سے ہو کر اس تکونے سبو چے میں جمع ہوتے رہے جو ٹانگ پر ٹانگ رکھ

لینے کے باعث اس کے پیٹ اور پیڑو کے درمیان بن گیا تھا۔

حبیب النسا آبدار خانے کے دروازے سے لگی کھڑی تھی اور وزیر کی برآمدگی میں تاخیر کے سبب وہ بہت مشوش بھی تھی، لیکن اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ آواز دے کر دریافت حال کرے یا اندر چلی ہی جائے۔ استنجا خانے کی پرلی دیوار کا دروازہ صحت خانے میں کھلتا تھا۔ ممکن ہے چوکی پر چلی گئی ہوں۔ پتہ نہیں وہاں شمع روشن ہے کہ نہیں... نہ سہی، خود ہی روشن کر لیں گی۔ اس وقت کچھ بولنا ٹھیک نہیں۔ کیسی من موہنی سی ہیں، لیکن دماغ بھی ان کے بہت ہیں۔ کوئی بات ناگوار گذرے گی تو پٹ سے ڈانٹ ہی تو دیں گی۔ نہیں، ڈانٹیں گی نہیں، لیکن تیوری پر بل تو آئے گا، وہی کافی ہے۔

ذرا سے کھٹکے کے ساتھ آبدار خانے کا دروازہ کھلا۔ وزیر باہر آئی۔ اس کے چہرے پر تکان تھی اور تھوڑی سی اداسی کے رنگ تھے۔ حبیب النسا نے فوراً محسوس کیا کہ کچھ بات ہوگئی ہے لیکن پوچھنے کی ہمت اسے نہ ہوئی۔ وزیر نے صندوق سے نکالا ہوا اودا ریشمی پاجامہ اور وہی زرد پھولام کا کرتا اور ریشمی ململ کا زرد دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ مہماں سرا کی سبزی مائل روشنی میں یہ لباس اس پر ایسا پھب رہا تھا جیسے سونے کے شمع دان پر زرد نارنجی فانوس کنول کی طرح کھل اٹھتا ہے۔ محزوں حسن کے بارے میں حبیب النسا نے داستان گویوں سے بہت سنا تھا لیکن اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کسی حسین کے اداس چہرے پر اس قدر کشش، اس قدر تمکنت، گلاب کی پتیوں کی سیاہی مائل سبزی اور گڑہل کے بڑے نارنجی پھول جیسی شفقی روشنی کا امتزاج ممکن ہے۔

حبیب النسا نے آگے بڑھ کا وزیر کا شانہ ہلکے سے چھوا اور بولی:

"آپ تھک گئی ہوں گی۔ پلنگ پر استراحت فرمائیں تو چپی کر دوں۔"

وزیر کے دل میں شکر گذاری کے جذبے نے کروٹ لی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے کچھ چڑ، کچھ جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ کون ہے جو بات بات پر بچھی جاتی ہے۔ مغلانی ہو، مشاطہ ہو، ہے تو خادمہ ہی۔ اور کیا اسے اتنی سمجھ نہیں کہ میرا جی ماندہ ہو رہا ہے؟... نہیں ماندہ تو نہیں ہو رہا ہے لیکن اللہ جانے کیوں یہ ایوان اب پہلے کی طرح خوشگوار نہیں لگ رہا ہے... وہ تھکے تھکے قدموں سے پلنگ کے پاس آئی اور ناپ تول کر پائے دان پر پاؤں رکھ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ حبیبہ نے دوڑ کر اس کی جوتیاں اتاریں اور کچھ سبھاؤ سے اس کے پاؤں اٹھا کر پلنگ پر رکھ دیئے۔

''آپ ذری کی ذری کمر ٹیک لیں، میں بالوں میں تیل دے کر کنگھی کردوں گی۔ چپی بعد میں ہوتی رہے گی۔''

پلنگ کے اونچے سرہانے کی طرف کمخواب کے کئی بڑے تکیے اور مخمل کے کچھ گل تکیے بھی تھے۔ ہر چیز سے موتیا کے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ وزیر نے پلنگ پر اوپر کھسک کر تکیوں سے سر لگا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''کون سا تیل پسند کریں گی؟ جونپوری گل روغن، کابلی روغن بادام، بنگالے کا دریائی نارجیل جس میں تھوڑی سی کافور اور زنجبیل کی آمیزش ہے۔یا...''

''اے ہے بی حبیبہ، اب بس بھی کرو۔ تم تو پورا طبلۂ عطار ہی لئے پھرتی ہو۔ چلو، کچھ بھی لگا دو، گل روغن سہی۔''

حبیبہ لپک جھپک آبدار خانے سے تیل کی کپی اٹھا لائی۔ تیل کی چند بوندیں ہاتھ پر لے کر اس نے دونوں ہتھیلیوں کو آہستہ سے ملا اور وزیر کے سر پر انگلیاں رکھ دیں۔ تیل لگانے یا مالش کرنے کے بجائے وہ وزیر کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ وزیر کی آنکھیں فرط راحت سے بند ہونے لگیں۔ ابھی چوتھائی گھڑی بھی نہ گذری تھی کہ اس کے اندر کا تناؤ یوں زائل ہونے لگا جیسے بٹے ہوئے ریشم کے بل کھلتے ہیں۔ اس نے لطف اور آسائش سے بھری ہوئی ہلکی سی سسکی لی اور دونوں پاؤں جو اس نے اب تک زانوؤں تک موڑ رکھے تھے، پلنگ پر پھیلا دیئے اور قریب تھا کہ وہ سو جائے، لیکن اچانک وہ اندر ہی اندر چونک پڑی... میں یہاں کہاں ہوں؟... یہ تو لوہارو والوں کی حویلی ہے۔ میرا اس طرح سو جانا غیر مناسب ہے۔ اس نے ننداسی آنکھیں کھولیں اور حبیبہ کی طرف دیکھا۔ اس کا جی چاہا، حبیبہ سے پوچھوں تم یہاں کب سے ہو، کہاں سے آئی تھیں۔ نواب کی کسی بیگم کی مغلانی تو ہو نہیں سکتیں۔ شاید ان کی والدہ کے ساتھ رہی ہو اور اب ان کے مرنے کے بعد نواب کے یہاں کسی حیثیت سے نوکر ہو۔ انھوں نے تمھیں یہاں بھیجا تو وہ تم سے بہت اتحاد رکھتے ہوں گے اور دل سے اعتماد کرتے ہوں گے۔ لیکن پھر اس نے سوچا، پہلی ملاقات میں بے تکلف سوالات پوچھنا ٹھیک نہیں۔ اگر یہاں تعلق قائم رہا تو سب باتیں معلوم ہو جائیں گی، ورنہ پھر مجھے ان کے بارے میں آگاہی ہو، یا نہ ہو، سب ایک ہے۔

حبیب النسا نے دیکھا کہ اب وزیر خانم کے چہرے پر سکون، بلکہ بشاشت کے آثار ہیں۔ اس نے کہا، ''خانم اگر آرام کر جانا چاہیں تو بسم اللہ۔ آپ کو تکان بھی ہے۔ میں اب اجازت چاہتی

ہوں۔" پھر وہ اک لحظہ رک کر بولی، "نواب صاحب کے لئے کیا وقت مناسب ہوگا؟ انھیں خبر کردوں؟"

یہ سوال سنتے ہی وزیر کے دل میں ایک سنسنی سی اٹھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کا اسے انتظار یا امید تو نہ کہیں گے، توقع ضرور تھی۔ اور اگر چہ وہ آج شام کی دعوت میں برضا و رغبت آئی تھی، اور اسے شمس الدین احمد سے کچھ امیدیں بھی تھیں اور اس کے دل کا میلان بھی کچھ نواب کی طرف تھا لیکن آج کی شام وہ نہ جانے کیوں انتخاب کے اس مرحلے سے بار بار آنکھ بچا جاتی تھی۔ اب آنکھ بچانے کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ دو چار لحظے کے سکوت کے بعد وہ مسکرائی اور حبیبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی:

"ان کے لئے سبھی وقت مناسب ہیں۔ حکومت ان کی ہے۔ میں تو مہمان ہوں... اور اب تو پتھر کے نیچے ہاتھ آ گیا ہے۔"

حبیب النسا نے ان فقروں میں دو پہلو دیکھے لیکن فیصلہ نہ کر سکی کہ وزیر خانم سنجیدگی سے یہ باتیں کہہ رہی ہیں یا طنز و ظرافت کے عالم میں ہیں۔ اس نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد سنبھل سنبھل کر کہا:

"آپ مہمان نہیں۔ ہم تو آپ ہی کی حکومت ہر طرف دیکھیں ہیں۔ نواب اپنے دل کی دولت آپ کے تو زر خرید ہوئے جارہے ہیں۔"

"حبیب النساتم نے پھر چہلیں شروع کردیں۔" وزیر نے کچھ مصنوعی برہمی سے کہا۔ "چلو وہ میرے زر خرید ہی سہی، میں تو اس وقت قید فرنگ میں ہوں۔"

"خدا خدا کیجئے بی بی،" حبیبہ نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "یہ کوئی ملک انگریز تھوڑی ہے۔"

"نہ سہی، لیکن میری جان ان دنوں عجب ضیق میں ہے حبیبہ۔"

وزیر اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی، لیکن لگتا تھا وہ کچھ اور کہنا چاہتی ہے لیکن مصلحت یا تمکین مانع ہے۔ حبیب النسا کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی، لیکن اس بار بھی اس نے بہت سنبھل سنبھل کر جواب دیا:

"اللہ بڑا بادشاہ ہے خانم صاحب۔ اللہ پر بھروسا رکھئے۔" پھر اس نے آگے آ کر چٹ چٹ وزیر کی بلائیں لیں اور بولی: "بندی کو اب اجازت مرحمت ہو۔ میں نواب صاحب کو خبر کردوں گی، خدا حافظ۔"

حبیبہ نے وزیر کے سر میں ایک دو بار انگلیاں پھیریں، اس مشاقی سے کہ چوٹی کھل گئی اور گیسو

بکھر کر شانوں اور پشت پر پھیل گئے۔ چوٹی کھلی تو روغن گل کی خوشبو وزیر کی ناک میں آئی اور اس کے دل کو فرحت پہنچا گئی۔ پھر حبیبہ نے جھک کر دو سلام کیے اور ایک قدم پیچھے ہٹی۔ وزیر کا دل چاہا، انگریزوں کی طرز وروش کے اتباع میں حبیبہ کا شکریہ ادا کرے۔ اسے معلوم تھا کہ انگریز اپنے نوکروں کا شکریہ کبھی نہیں ادا کرتے تھے اور بالخصوص ہندوستانی نوکر تو ان کے لئے انسانی وجود سے کم و بیش عاری تھے۔ وہ آپس میں شکریے کی رسم کا البتہ نہایت پابندی سے التزام رکھتے تھے۔ ہندوستانیوں میں پرانے نوکروں کا شکریہ، بلکہ ان کے پورے احترام کی رسم تھی۔ پرانے نوکروں کو بابا، چاچا، وغیرہ کہہ کر پکارنا اور انھیں ''آپ'' کہنا عام تھا۔ لیکن وزیر کے لئے حبیبہ نہ تو پوری طرح پرانے نوکروں کی صف میں تھی اور نہ قرابت دار کہی جا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں وزیر کو شک تھا کہ ابھی، پہلی ہی جان پہچان میں حبیبہ سے شکریے کے کلمات کہنا بجا ہوگا کہ نہیں۔ لیکن وزیر نے یہ سب اصول وطرق بالائے طاق رکھ کر کہا:

''خدا حافظ حبیبہ۔ ہم تمھارے بہت مشکور ہیں۔''

حبیبہ یا تو تیز تیز قدم بڑھاتی آبدار خانے کے دروازے کی طرف جا رہی تھی یا رک کر وہیں کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر حیرت کا رنگ تھا۔

''ہماری مشکور ہوں اور آپ! خدا رکھے، آپ ایسا نہ کہیں۔ ہم تو نمک خوار ہیں، اپنی جان بھی آپ پر فدا کر دیں تو آپ کا حق ادا نہ ہو۔''

''اچھا اب تو میں کہہ ہی بیٹھی ہوں،'' وزیر نے ہنس کر کہا لیکن اس کا گلا کچھ بھرایا ہوا سا تھا۔ ''تم یہ بات بھول جانا۔ میں نہ بھولوں گی۔''

یہ کہہ کر وزیر خانم نے گھٹنے موڑ کر پاؤں اندر کی طرف کر لئے، اس طرح کہ اس کی کمر اور رانوں کی کششیں کچھ مخفی ہو گئیں لیکن جب اس نے پلنگ کے سرہانے سے پیٹھ لگائی تو سینہ و گردن کی افرازی نمایاں ہوگئی۔ ماتھے پر ایک دو لٹیں چھٹکی ہوئی، ایک طرف شانے پر شکن تاب گیسوؤں کی سیاہیاں لہراتی ہوئی، لمبی لمبی پلکوں کے نیچے شربتی آنکھیں جھکی ہوئی، لیکن شمعوں کی روشنی پلکوں سے چھن کر آنکھوں میں انکھیلیاں کرتی ہوئی، ایک ہاتھ گود میں رکھا ہوا اور ایک پلنگ کے پاس کی میز پر رکھی ہوئی کتاب کی طرف بڑھا ہوا، گلا اور کلائیاں اب بھی زیوروں سے عاری، لیکن دونوں انگوٹھیوں کے یاقوت اور دوسری انگوٹھیوں کے زمرد ڈوپٹے کے زرد رنگ اور کرتے کے چمپئی پھولوں کے پس منظر میں دمکتے ہوئے۔ رنگوں کی ایسی دھیمی پھوار اس ایوان کی سقف نے بھلا کاہے کو دیکھی ہوگی، پھر حبیب النسا کی بات ہی کیا تھی۔

حبیبہ نے اسے کئی لمحے پلک جھپکائے بغیر دیکھا، گویا یقین نہ کرسکتی ہو کہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی لڑکی گوشت پوست کی بنی ہوئی ہے۔ وزیر نے ایک بار پھر کہا، ”خدا حافظ“، اور کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ حبیبہ نے بھی دوبارہ جھک کر سلام کیا اور الٹے پاؤں چلتی ہوئی آبدار خانے کے دروازے میں داخل ہوگئی۔ وہاں پرلی طرف کا دروازہ ایک تنگ راہداری پر کھلتا تھا۔ راہ داری میں داخل ہوں تو سامنے ذرا بائیں جانب کو صحت خانے کا دروازہ تھا دائیں جانب راہ داری ایک بڑے دالان پر ختم ہوتی تھی جہاں سے اور کئی جانب کی راہیں نکلتی تھیں۔ سامنے آنگن تھا، جس میں متفرق پھلوں اور پھولوں کے پیڑ پودے تھے: نیم، کھجور، مولسری، گلاب، چمپا، رائے بیل، وغیرہ ان میں نمایاں تھے۔ آنگن اور دالان دونوں طرف سے خاص محل سرا کے شاگرد پیشہ تک بھی پہنچنے کا راستہ تھا۔

وزیر ان تفصیلات سے بے خبر تھی، اور نہ ہی اسے یہ سب جاننے کی ضرورت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ نواب آئیں گے تو صدر دروازے ہی سے داخل ہوں گے۔ شاید ساتھ میں کوئی چوبدار اعلان چی کے طور پر ہو، یا شاید نہ ہو۔ بہر حال، اب وہ مطمئن تھی کہ بقیہ رات کا نقشہ اب اس کے ذہن میں کم وبیش مرتب ہو چکا تھا۔ جس کتاب کو اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا تھا وہ حافظ کا دیوان نکلی۔ چمڑے کی خوبصورت زرکار جلد، کچھ پرانی سی۔ لیکن لگتا تھا کہ کتاب یوں ہی رکھے رکھے پرانی نہیں ہوگئی ہے بلکہ اسے پڑھا جاتا رہا ہے۔ اکثر ورقوں کے کونے تھوڑے مڑے ہوئے اور کچھ بوسیدہ تھے۔ ممکن ہے نواب نے کتب خانے سے منگوا کر آج اسے میری خاطر یہاں رکھوایا ہو، اس نے دل میں خیال کیا۔ پھر اس نے کتاب کسی خاص غزل یا ردیف کو دیکھنے کے لئے نہیں، بلکہ یوں ہی کھولی۔ دائیں طرف کے ورق پر پہلا ہی شعر تھا۔

ہر یک شکن ز زلفت پنجاہ شست دارد
چوں ایں دل شکستہ با ایں شکن بر آید

”خوب،“ اس نے دل میں کہا اور بے اختیار مسکرا دی۔ شاید اس شعر میں بھی کوئی فال پوشیدہ تھی، اس نے ماتھے پر کی لٹوں کو پیچھے اور برابر کرتے ہوئے سوچا۔ ابھی وہ کوئی اور ورق کھولنے والی تھی کہ باہر کچھ تیز سی روشنی جھمکی اور کچھ فاصلے پر عصا بردار کے عصا کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وزیر نے کتاب پلٹ کر جلدی سے میز پر رکھ دی اور ڈوپٹہ سر سے اوڑھ لیا۔

دروازہ آہستہ کھلا۔ نواب شمس الدین احمد اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ کوئی خدمتگار یا مغلانی نہ تھی۔ عصا بردار کی کھٹ کھٹ اسی لئے تھی کہ اندر والوں کو معلوم ہو جائے، اور دور سے اس لئے تھی

کہ مخل ہونے کا ذرا سا بھی شائبہ نہ ہو۔ وزیر نے خود کو تھوڑا اور سمٹا لیا اور نگاہیں اپنے گھٹنوں پر رکھیں۔ نواب کا تشخص بے تکلفی کے ماحول میں اور بھی وجیہ لگ رہا تھا۔ اس وقت وہ درون خانہ کا معمولی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ریشمی سفید ململ کا ڈھیلا کرتا جس پر سنہری آسمانی بیل ٹکی ہوئی تھی، اسی کپڑے کا پائجامہ دہلوی طرز، یعنی چوڑے پائینچوں کا۔ پائجامے کی ململ میں ہلکی سبز پٹریاں تھیں اور کرتا بالکل سادہ تھا۔ سر پر سبز رنگ کی پگڑی، کچھ راجپوتانی طرز کی، لیکن اس سے اونچی۔ پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی زردوزی جوتی جس پر انگوری بیل بنی ہوئی تھی۔ گلے میں موتیوں کے پنچ لڑے ہار اور داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت میں یاقوت کی مہر نگیں کے سوا نوابی کی کوئی علامت ان کے بدن پر نہ تھی۔

شمس الدین احمد اندر آ کر دھیرے سے کھنکھارے، اور بولے:

''شب بخیر، وزیر خانم (۱)۔''

اب وزیر نے آنکھ اٹھا کر نواب کو دیکھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جس کی تاب اب تک کوئی لا نہ سکا تھا۔ شمس الدین احمد کو اپنے گھٹنے کمزور ہوتے محسوس ہوئے۔ بدن چرائے ہوئے پر بھی وزیر کے انگ انگ سے کام کیلی کی دعوت چھوٹتی معلوم ہوتی تھی۔ نواب کا جی تو کچھ اور چاہا تھا لیکن انھوں نے ضبط سے کام لیا۔ جیسے ہی وزیر ان کو سلام کرنے کے لیے اٹھی، انھوں نے اس کا رخسار پیار سے تھپتھپا کر اس کی پیشانی، آنکھوں، اور پھر منھ پر بوسہ دیا۔ پھر کمر میں ہاتھ دے کر شمس الدین احمد اسے واپس پلنگ پر بٹھا کر خود اس کے پاس بیٹھ گئے، یوں کہ وزیر حسب سابق پلنگ کے سرہانے سے پشت لگائے ہوئے تھی لیکن اس بار اس نے گھٹنے موڑ کر زانوؤں سے ملا نہیں دیئے تھے، بلکہ کولہوں کے بل بیٹھے ہوئے اس نے پاؤں اور پہلو اپنی طرف یوں کھینچ لئے گویا گھٹنوں پر سر نہوڑا کر وہ کسی سوچ میں غرق ہونے والی ہو۔ لیکن اس نے گھٹنوں پر سر نہ رکھا بلکہ دونوں بازو گھٹنوں میں حمائل کر دیئے، اس طرح کہ پہلو سمٹ کر چھاتیوں سے لگ گئے۔ گویا اس کی وضع اکڑوں بیٹھنے کی تھی بھی اور نہیں بھی۔ وہ کچھ عجب آسن سے بیٹھی تھی کہ اس میں بے تکلفی بھی تھی اور بدن کے بڑے حصے کا تحفظ بھی تھا۔

اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں نواب کو دیکھ رہی تھیں اور نواب اس کے بالکل پاس سرک کر یوں بیٹھ گئے کہ ان کا ایک ہاتھ وزیر کے گھٹنے پر اور دوسرا اس کے شانے پر تھا۔ اس نقل و حرکت میں ڈوپٹہ وزیر

---

(۱) پرانے زمانے میں شام یا رات کو ملاقات کے وقت ''شب بخیر'' کہتے تھے، گویا یہ انگریزی Good Evening کا مرادف تھا۔ آج یہ فقرہ اس وقت بولتے ہیں جب رات کے لئے رخصت ہو رہے ہوں، یعنی اب یہ فقرہ Good Night کا مرادف ہو گیا ہے۔

کے سر سے پھسل کر کہیں رہ گیا اور فراز گردن کی نزاکت پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ نواب نے وزیر کے گیسوؤں میں انگلیاں پھیریں اور چاہا کہ اس کے پائینچے اوپر کھسکا کر پنڈلیوں اور ممکن ہو تو اس کے بھی آگے کی سیر کریں۔ وزیر کے بھی دل میں اب پھول کھلنے لگے تھے لیکن وہ خود کو آساں ربودہ نہ ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ جیسے ہی نواب نے پائینچے سرکائے اور آئینۂ زانو کو پیار کیا اور چاہا کہ ہاتھ اور آگے لے جائیں کہ وزیر نے جلدی سے پاؤں پھیلا دیے اور پائینچے برابر کرتی ہوئی بولی:

''انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑنا تو سنا تھا، لیکن ساق و زانو کی بلندی سے پستی کا سفر کرنے کی ہمت کرنے والے آج ہی دیکھے۔ سرکار نے یہ نٹوں کا تماشا کہاں سے سیکھا؟'' وہ کھلکھلا کر ہنسی، اور اس بات کو متیقن کرنے کے لئے کہ اسے نواب کی آزردگی ہرگز منظور نہ تھی، اس نے نواب کا ہاتھ کھینچ کر اپنے سینے پر رکھا اور کہنے لگی، ''اب دیکھئے نہ آپ کی تاخت و تاراج نے میرے دل کا کیا حال کر دیا۔ دھڑکن تیز ہو گئی۔ کہیں غشی نہ چھا جائے۔''

نواب نے وزیر کا پورا بدن اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''ہم تو آپ پر پہلے ہی سے غش ہیں۔ آپ غش کریں گی تو ہم سنبھال لیں گے۔ آخر اللہ نے آغوشیں کس لئے بنائی ہیں؟''

اس بار وزیر نے خود کو نواب کے بازوؤں میں آنے دیا اور ان کے شانے پر سر رکھ کر بولی: ''اللہ آپ کی خوشبو ایسی ہے کہ اگلا یوں ہی نشے میں لغزش کھا کر چاروں ہاتھ پاؤں سے گرے۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔''

''آپ کی کوئی لغزش ایسی نہیں جس پر سہارا دینے سنبھالنے اٹھانے کو ہم نہ موجود ہوں۔ آپ واللہ کوئی لغزش تو کھائیں، ہم کب سے بے چین ہو رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر نواب نے وزیر کا ڈوپٹہ الگ کر دیا اور اس کے کرتے کے تکمے کھولنے کے لئے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ وزیر کے بدن پر بس دو کپڑے تھے، کوئی زیر جامہ نہ تھا۔ وزیر نے تڑپ کر خود کو الگ کیا اور بولی: ''ہائے آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ تمام روشنیاں جل رہی ہیں۔''

''شمعیں جل رہی ہیں تو کچھ باک نہیں۔ انھیں جلنے ہی دیجئے۔''

''توبہ۔ کہاں میں کہاں شمع خوش آب۔ میں تو کہہ رہی تھی کہ روشنی میں...''

جی ہاں۔ روشنی ہی میں۔ آپ کی شمع بدن کے آگے یہ ساری شمعیں خود ہی جھلملا اٹھیں گی... اب اور نہ ترسائیے۔ رات بھی میرے آنسوؤں سے بھیگ کر اب ٹھنڈی ہونے کو ہے۔''

''اچھا...'' وزیر نے ڈوپٹہ پھر اوڑھ کر اس کا بکل سا لگاتے ہوئے کہا۔'' ذرا پرے ہٹ کے تو بیٹھیے...'' اور پھر اس نے نواب کے منھ پر ہاتھ کر ان کا منھ دوسری طرف پھیر دیا۔'' ادھر دیکھیے گا نہیں۔ آنکھیں بند رہیں تو اور بھی اچھا۔''

اس کے پہلے کہ شمس الدین احمد کو کچھ جواب سوجھتا، وزیر نے دونوں کپڑے اتار پھینکے، ڈھیلا ڈھالے تو تھے ہی... پھر اس نے ڈوپٹے کو چادر کی طرح اوڑھا۔'' لیجیے صاحب، اب ادھر منھ کر لیجیے۔ اب کچھ دیکھنے کو نہیں ہے۔''

وزیر کا بدن ڈوپٹے میں سے جھلک رہا تھا لیکن اس نے ڈوپٹے کی چادر اس مہارت سے بنائی تھی کہ وہ اب بھی عریاں نہ لگ رہی تھی۔ اس کی کچھ شرماتی کچھ ہنستی ہوئی روشن آنکھیں البتہ شوق کے دروازے پر دستکیں دے رہی تھیں۔

نواب نے بات تو سمجھ لی تھی لیکن پھر بھی انھیں اس کی توقع نہ تھی کہ وزیر اپنا لباس خود ہی الگ کرے گی۔ ان کے دل میں ایک لمحے کے لئے تکدر کا بگولا سا اٹھا۔ انگریز کی صحبت نے اسے بے حیا بنا دیا ہے۔ یہ خود سے کپڑے اتارنے کی بات وہیں سیکھی ہوگی... لیکن اسی لمحے وہ شرمندہ بھی ہوئے۔ انھیں میر کا مصرع یاد آیا؎

کپڑے اتارے ان نے سر کھینچے ہم کفن میں

تو جو بات میر صاحب کے زمانے میں سو سال پہلے صحیح تھی وہ آج بھی صحیح رہے گی۔ نواب نے وزیر کا ڈوپٹہ آہستگی سے کھینچا۔ وہ پھر بدن چرائے ہوئے بیٹھی تھی لیکن اس بار عریانی نے پردہ پوشیوں کو ہر محاذ پر شکست دے دی تھی۔ ان کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ادھر ان کی آنکھوں میں شوق کی قندیلیں روشن ہو رہی تھیں کہ ادھر میر کے اسی شعر کا مصرع اولیٰ ان کے حافظے کی گہرائیوں سے نکل کر ذہن کو جگمگا گیا؎

مر مر گئے نظر کر اس کے برہنہ تن میں

اس وقت میری یہی حالت ہے، یا شاید اس سے بدتر۔ انھیں اپنا بدن بے قابو ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ ذہن کے دانت پر دانت جما کر تمکین کے سارے سبق انھوں نے اپنی روح اور اپنے دل کو پڑھا ڈالے۔ اپنی مختصر مگر مصروف زندگی میں شمس الدین احمد نے بہت سے بدن دیکھے تھے۔ بازاری، خانگی، ہوس یا شوق یا احساس فرض کی ماری بیگمیں، لیکن یہاں تو عالم ہی دیگر تھا۔ وزیر کا قد اوسط سے ذرا نکلتا ہوا

تھا لیکن وہ ایسی بدن چور تھی کہ کپڑے پہن کر بالکل دھان پان لگتی تھی۔ کپڑوں کے بغیر بھی وہ دبلی پتلی لیکن کامنی اور ولاسی معلوم ہوتی تھی۔ از پیشانی تا چشم و بینی و شفتین، از زنخ تا گردن، از طوق تا ساعد و بازو، از کف دست تا انامل، از شانہ تا ثدی، از شکم تا ناف، از زیر ناف تا کفل، از سرین تا ران و ساق، از کعب تا کف پا و انگشت پا، از زلف و گیسو تا سبزۂ تختۂ صندل، کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو متوازن، سڈول، اور اپنے موقعے کے اعتبار سے بھاری، باریک، یا تنگ نہ ہو۔ اور نزاکت میں کہیں بھی تقصیر نہ تھی۔

شمس الدین احمد کو لگا کہ اس کی سانس رک جائے گی، یا شاید اس کی دنیا اس زور سے چکر کھا رہی تھی کہ اس کا بند بند کھنچتا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وزیر کا بدن سرمئی بلور کی گڑیا کا سا بدن تھا جسے کسی ماہر بت تراش نے بنا کر رکھ دیا تھا کہ شاید انفاس قدرت اس میں جان ڈال دے۔ اور پھر شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ شمس الدین احمد اسے ہاتھ لگاتے ڈرتا تھا اور اس کو ہر جگہ چھونے کے لئے بے قرار بھی تھا۔

وزیر نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر شمس الدین احمد کے بھی کرتے کے تکمے ڈھیلے کرے۔ لیکن نواب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اس کے دونوں سبک اور نگار آلود ہاتھ اپنے ایک ہاتھ میں لے لئے اور ایک ایک کر کے دسوں انگلیوں کو بوسہ دیا۔ پھر اس نے وزیر کے زانوؤں پر منھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

راحت افزا

وزیر کی آنکھ بار بار کھلتی اور بار بار پھر اسے غنودگی آجاتی۔ ہر بار آنکھ کھلنے پر وہ شمس الدین احمد کو اپنے پہلو میں دیکھتی یا انھیں ہاتھ سے چھوتی اور ہر بار اس کے دل میں اطمینان و امتنان کی ہلکی سی لہر اٹھتی اور اس کے آپے کو سیراب کر جاتی۔ نواب اس کے وفادار ثابت ہوں گے، اس میں اسے کوئی شک نہ تھا۔ اسے اپنے بارے میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ نواب سے اس کا لگاؤ خود غرضانہ منصوبہ بندی کا عمل نہ تھا بلکہ شمس الدین احمد کا شخص (۱) اور شخصیت (۲) دونوں ہی اسے بہت بھلے لگتے تھے۔ ولیم فریزر جیسے زبردست اور ذی اقتدار انگریز کے ساتھ لوہا بجانے کو ہمہ وقت تیار رہنا معمولی بات نہ تھی۔ اور آداب بستر میں بھی شمس الدین احمد کی صفات مارسٹن بلیک سے کچھ کم نہ تھیں۔ بلاک صاحب کی طرح وہ بھی زور یا زبردستی کیا، اصرار و ابرام کے بھی قائل نہ تھے۔ رضامند کرنا اور رغبت دلانا اور جانبین کو یکساں تلذذ فراہم کرنا، دونوں ہی ان ہنروں کے یکساں اور مشاق پیراک تھے۔

یہ سب تو تھا، لیکن وزیر کو ٹھیک سے نیند نہ آرہی تھی۔ کچھ تو یہ تھا کہ مرد سے بات کر لینے کے بعد عورتیں اگر تھک بھی جاتیں تو انھیں نیند نہ آتی تھی، اور فوراً تو ہرگز نہیں۔ لیکن مرد عموماً فوراً ہی، یا ایک آدھ گھڑی میں، باتیں کرتے کرتے یا عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے کھیلتے اور اس کو پیار کرتے کرتے اچانک ڈبکی لگا جاتے۔ بلاک صاحب اور نواب صاحب دونوں کا یہی معاملہ تھا۔ لیکن چھوٹی بیگم کو نیند نہ آنے کی اور بھی وجہیں تھیں۔ ہر چند کہ اس کا دل نواب کے لئے جذبۂ تشکر سے لہلہا رہا تھا لیکن اسے یہ فکر پھر بھی تھی کہ زمانہ آئندہ میں یہ بیل کون سے منڈھے چڑھے گی اور چڑھے گی بھی یا چند دنوں

---

(۱) بمعنی بدن۔

(۲) بمعنی شرافت، بلندی کردار، علو ہمتی۔

میں مرجھا کر رہ جائے گی۔

بہت دیر بعد اسے ٹھیک سے نیند آئی۔ اس وقت تین یا چار کا عمل رہا ہوگا۔ اس دوران نواب کی آنکھ ایک دو بار کھلی تھی اور انھوں نے مسکرا کر وزیر کی طرف دیکھا تھا، گویا اشارہ کر رہے ہوں یا اندازہ لگا رہے ہوں کہ آیا رات کی بات جہاں ختم ہوئی تھی وہیں سے پھر شروع کی جائے۔ لیکن ان پر نیند اور وزیر پر تھکن غالب تھی۔ صبح ہونے کے پہلے دونوں کی آنکھ بیک وقت کھل گئی اور اس وقت تبسم ہائے نوشیں اور کلمہ ہائے شیریں کے ساتھ انھوں نے وظیفۂ حیات دوبارہ ادا کیا۔ اس کے بعد بالکل غیر متوقع طور پر وزیر کو جھپکی آ گئی جو فوراً ہی گراں خوابی میں بدل گئی۔ وہ ساری تھکن اور تناؤ اور بے یقینی اور امید و بیم اور ارتکاز ذہنی اور پراگندہ خیالی جو کل شام اس وقت شروع ہوئی تھی جب اس کی سواری نواب کے دروازے پر ٹھہری تھی، اب آخر کار دھوئیں جیسی سرمئی دھند کے پردے سے سر نکالتی ہوئی صبح کی ٹھنڈی سلونی خوشبوؤں میں گھلنے اور گھل گھل کر ہوا جیسی لطیف اور فرحت بخش نیند میں تحلیل ہونے لگی۔

جب زینت النسا بیگم کی مسجد سے صبح کی اذان بلند ہوئی اور مسجد کے پیچھے نواب احمد بخش خاں کے باغ میں بلبلیں چہکنے لگیں تو وزیر خانم خواب میں دیکھ رہی تھی کہ میں جے پور میں ہوں، بچے میرے ساتھ ہیں اور ہم بلاک صاحب سے ملنے جا رہے ہیں جو کہیں دور لیکن راجپوتانے ہی کے کسی شہر میں رہنے لگے ہیں۔ میری خواب گاہ میں ایک مرقع ہے جس میں شاہانہ انداز کی تصویریں ہیں۔ ہر تصویر جگمگا رہی ہے، گویا ابھی ابھی تیار ہوئی ہو۔ کئی کئی رنگ کے نیلے رنگ، آسمانی، لاجوردی، زبرجدی، آبی، سبزی مائل، اور کئی طرح کے سبز رنگ، دھانی، پستئی، ماشی، مونگیا، انگوری۔ صورتیں پیاری پیاری، نازک ہاتھ پاؤں، لیکن کوئی تصویر نمایاں طور پر دکھائی دیتی نہیں ہے۔ خدا جانے کہاں سے ہوا چلی آ رہی ہے کہ مرقعے کے سب اوراق پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ اک ذرا دیر کو ہوا ٹھہری تو اس کی نگاہ بھی ٹھہری... یہ تو بنی ٹھنی کی تصویر تھی...

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس بار ساری نیند کافور ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ ابھی اٹھنے کی جلدی کیا تھی۔ اور یہ خواب بھی کیسا تھا۔ اس کی تعبیر کیا ہو سکتی تھی؟ نہ جانے کوئی تعبیر تھی بھی یا نہیں۔ سنا ہے صبح کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ لیکن بلاک صاحب تو اس دنیا میں ہیں نہیں، پھر میں اپنے بچوں کو لے کر ان سے ملنے کہاں جا رہی ہوں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تینوں بہت جلد عالم بالا میں ان سے جا ملیں گے؟ کیا اللہ نے ہماری تقدیر میں دوبارہ یکجائی لکھی ہے؟ یا پھر اشارہ یہ ہے کہ نواب شمس الدین احمد اب تمھارے لئے وہی ہیں جو بلاک صاحب تھے۔ تمھارا مرکزِ حیات، تمھارا ملجا و ماوا اب یہیں

ہے۔ تو کیا میرے پیارے بچے بھی مجھے مل جائیں گے؟... اور یہ بنی ٹھنی کی تصویر کیا معنی رکھتی ہے؟ بنی ٹھنی کو تو کسی نے دیکھا نہیں، وہ تو اک خیالی مورت ہیں۔ ایک دیوی جو انسان فرض کی جاتی ہیں لوگ انھیں ڈھونڈتے ہیں، چتیرے ان کی صورت گری کرتے ہیں لیکن وہ خود کہیں نہیں۔

وزیر اپنی آنکھیں بند کیے انھیں خیالوں میں گم تھی۔ شہزادی زینت النسا کے مزار کا مجاور بڑی خوش الحانی سے اذان دیتا تھا، بہت کھلی ہوئی متوازن آواز، بناوٹ یا زور یا دباؤ کی ایک رمق بھی نہیں۔ ابھی وہاں کی اذان ختم نہ ہوئی تھی کہ روشن الدولہ کی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی، ذرا مدھم لیکن گونجتی ہوئی، کھرج کے سر شاہی فرمان کی طرح ہواؤں کے صبا رفتار قاصدوں کے دوش پر رواں دواں تھے۔ پھر دوسری چھوٹی بڑی مسجدوں سے اذانیں رات کی گھٹتی ہوئی تاریکی میں روشن دھاروں کی طرح پھیلنے لگیں۔ وزیر نے آنکھیں بند کیے کیے کروٹ لی اور ہاتھ پھیلا کر نواب کو چھونا چاہا، جیسے وہ اپنی تسلی کرنا چاہتی ہو کہ نواب اس کے پاس ہی ہیں۔ لیکن اس کے ہاتھ میں ہوا کے سوا کچھ نہ آیا۔ اس کا جی دھک سے ہو گیا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی، پھر اس نے گھبرا کر ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ نواب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ آبدار خانے میں ہوں گے شاید۔ مگر میں آبدار خانے میں کیسے جھانک سکوں ہوں... تو کیا ان کو پکاروں؟ توبہ، یہ کیا احمقانہ بیان ہے۔ اری نیک بخت وہ اندر ہوں گے تو خود ہی نکل آئیں گے۔ کوئی دو چار پہر وہاں تھوڑی رہیں گے۔ یا شاید نماز پڑھنے چلے گئے ہوں۔ چھوٹی بیگم خود تو نماز کی کچھ پابند نہ تھی، ہاں بزرگوں کے مزاروں پر حاضری ممکن ہوتی تو وہ اس میں کوتاہی نہ کرتی۔ لیکن نواب کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ فجر کی نماز شاید ہی قضا کرتے ہوں۔ تو آج کی رات بھی... کیوں نہیں، جسے نماز پڑھنی ہے وہ تو پڑھے گا ہی، سردی کیا اور گرمی کیا اور نیا بستر کیا اور پرانا کیا۔ بڑے لوگوں کی باتیں بڑی۔ اس کا جی گھبرانے لگا۔ آخر سویرا کب ہوگا، میرے آدمی کب تیار ہوں گے، میں کب یہاں سے رخصت ہوں گی۔ نواب تو شاید دن میں ادھر آئیں گے نہیں۔ لیکن نواب تو ہیں ہی نہیں جو معلوم ہو سکے کہ آئندہ کے کیا طور رہیں گے۔

آبدار خانے کے دروازے پر ذرا سا کھٹکا ہوا۔ وزیر خانم چونک پڑی۔ اللہ نواب آ گئے۔ مجھے اس طرح بے لباسی کے عالم میں جاگتا ہوا دیکھ کر نپٹ بے حیا نہ سمجھ لیں۔ تو کیا کروں؟ رضائی لپیٹ کر سوتی بن جاؤں؟ مگر وہ ایک قیافہ شناس ہیں بھانپ لیں گے۔ بھانپ لیں گے تو میں کیا کروں، بھانپ لیں۔ میں اپنی سی کوشش تو کر ڈالوں۔ جے پور کی بنی ہوئی ریشمی رضائی تھی، نہایت ہلکی اور طول و عرض

دونوں میں عام سے دوگنی، کہ دو شخص بآسانی یکجا اوڑھ سکیں۔ اسے اٹھا کر ٹھیک سے لپیٹنا بھی طول امل تھا۔ وزیر نے رضائی کو تھوڑا بہت اپنے اوپر ڈال اور لپیٹ کر چپکی پڑ رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس نے آدھی کروٹ لے کر اپنا سر دائیں بازو اور کہنی کے خم میں یوں چھپا لیا کہ اس کی چوٹی، جو پہلے ہی سے کھلی ہوئی تھی، اور بھی کھل گئی اور اس کی گردن اور شانے کی بلندیوں پر پھیل گئی۔

اسے اپنی پیٹھ پر لیکن رضائی کے اوپر سے ایک ننھا سا نرم ہاتھ محسوس ہوا۔ ابھی وہ سمجھ نہ سکی تھی کہ اس ہاتھ کے بارے میں کیا رائے قائم کروں کہ اس کے پاؤں کے تلوؤں کو کسی نے رضائی سے آزاد کرا لیا اور ان پر ہلکی ہلکی گدگدی شروع کر دی۔ ہاتھ کی نرمی، خفیف سی گرمی، اور چھوٹے پن کا احساس کر کے اسے یقین ہو گیا کہ یہ نواب نہیں ہو سکتے۔ اس نے منھ پھیر کر آدھا سر رضائی سے باہر نکالا اور ابھی اس نے آنکھیں پوری طرح کھولی بھی نہ تھیں کہ آنکھیں خود بخود بڑی بڑی کھل گئیں۔ چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی اس کے پائینتی بیٹھی اس کے تلوؤں پر اپنی انگلیاں پھیر رہی تھی اور زیر لب مسکرا رہی تھی، جیسے اسے اس کام میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔ وزیر کی آنکھیں کھلتے اور اس کی توجہ اپنی طرف منعطف محسوس کر کے وہ کچھ بل کھاتی ہوئی لیکن بالکل بے تصنع اور بے عجلت پلنگ سے اتر کر الگ کھڑی ہو گئی۔ اب اس کی مسکراہٹ اور بھی شگفتہ ہو گئی تھی۔ اس نے جھک کر وزیر کو سلام کیا اور بولی:

''صباحکم خیر (۱)۔ تسلیمات عرض کرتی ہوں خانم صاحب۔'' اس کی آواز میں بلبل کی سی گنگری اور پپیہے جیسا سریلا پن اور دور تک پہنچنے کی صلاحیت تھی۔ وزیر، جس کی آواز شیریں مگر پست، کچھ پھنسی پھنسی سی، سرگوشی مائل، اور بلندی یا کرختگی کی صلاحیت بالکل نہ رکھتی تھی، اپنے سے مختلف اور پھر بھی اس قدر دلکش آواز سن کر دل میں لوٹ ہو گئی۔ اسے اپنی برہنگی کا خیال نہ ہوتا تو اٹھ کر بیٹھ جاتی اور اس لڑکی کو بھی اپنے پاس بٹھا لیتی۔

''میں آپ کو بیدار کرنے آئی تھی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''لیکن آپ تو خود ہی جاگی ہوئی ہیں۔ بندی مخل تو نہیں ہوئی؟ خانم کو نیند تو ٹھیک آئی؟''

---

(۱) یہ فقرہ، جو Good Morning کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے، صبح کے سلام کے طور پر بہت رسمی حالات میں بولا جاتا تھا۔ اس کی ایک شکل ''صباح الخیر'' بھی تھی۔ جواب میں ''روز باعیش'' کہا جاتا تھا۔ اور یہ فقرہ، ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کا تراشا ہوا ہوگا۔ لیکن وزیر کی طرف سے بہر حال کسی جواب کا سوال نہ تھا، کیونکہ یہ فقرے صرف صاحب مرتبہ لوگوں کے لئے مخصوص تھے۔ چونکہ ''روز باعیش'' کا مرادف انگریزی یا فرانسیسی میں کوئی نہیں ہے، اور اس کے بارے میں شک نہیں کہ یہ ہندوستانی فقرہ ہے، اس لئے ممکن ہے ''صباحکم الخیر/ صباح الخیر'' بھی ترجمہ نہ ہوں بلکہ ہندوستانیوں کی ایجاد ہوں۔

وزیر خانم نے رضائی کو تھوڑا اور سمیٹا اور پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنی جگانے والی کو ذرا غور سے دیکھا۔ چودہ یا پندرہ کا سن، نہ بہت لمبی نہ ٹھگنی، کچھ گداز سا بدن، جیسا کہ بعض نوعمر بچیوں کا ہوتا ہے۔ بہت کھلتا ہوا میدہ شہاب رنگ، ناک ذرا دبی ہوئی لیکن بدنما نہیں، تنگ دہانہ، نازک نازک ہونٹھ پان یا کسی اور طرح کی سرخی سے عاری، لیکن فطری گلابی پن لئے ہوئے اور کچھ پھڑکتے ہوئے سے، جیسے خوش مزاجی اور شگفتگی اس کی عادت ہو اور وہ بس ابھی ابھی ہنس پڑے گی۔ سیاہ سوسنی آنکھیں بڑے بڑے باداموں کی سی بناوٹ لئے ہوئے، انداز میں متبسم اور قالب میں متوسط، سیاہ چمکیلے گھنے بال جنھیں مینڈھیاں بنا کر ایک چوٹی شانے پر اور ایک پشت پر ڈال دی گئی تھی۔ ہلکی نیلی محمودی کا کرتا اور ہلکے گلابی کمخواب کا بہت ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے، بدن میں اودی مخملی صدری، کانوں میں جڑاؤ انتیاں، لیکن ناک اور گردن زیور سے معرا، کلائیوں میں متوسط وزن کے حیدرآبادی جوڑے، ململ کا لہریا رنگا ہوا اور چنا ہوا ڈھائی گز اڈوپٹہ، پاؤں میں گھیتلی جوتیاں، مجموعی تاثر نہایت دلچسپ، سادہ پرکار، عام شریفانہ دلفریبی اور گھریلو پن کا تھا۔ وزیر کو اس کی آواز نے تو پہلے ہی موہ لیا تھا، اب اس کی صورت اور لباس اور طریق و روش نے اور بھی گرویدہ کر لیا۔ وہ اپنی موہنی مسکراہٹ مسکرا کر بولی:

''نہیں، آپ بالکل مخل نہیں ہوئیں۔ لیکن کچھ اپنا اتا پتا تو دیجئے، آپ ہیں کون اور کدھر سے یہاں صبح صبح بھول پڑیں۔''

''جی میں آپ کو بیدار کرنے پر مامور کی گئی تھی۔'' وہ کچھ شرماتی ہوئی بولی۔ ''میں یہیں محل سرا میں رہتی ہوں، راحت افزا میرا نام ہے۔''

''سبحان اللہ کیسا پیارا نام ہے۔'' وزیر نے کہا اور دل میں سوچا یہ نواب کی کوئی قرابت دار تو ہو نہیں سکتی، لیکن خادماؤں میں سے بھی نہیں لگتی۔ اس کے باپ ماں کا پوچھوں تو کہیں کوئی غلط بات نہ ہو جائے۔ لیکن پوری بات معلوم کرنا بھی ضروری تھا کہ نواب کہاں گئے ہیں اور مجھے یہاں سے کب رخصت ملے گی۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر بولی:

''تو نواب خود تو کہیں چل دیئے اور تمھیں میری خبر گیری کے لئے چھوڑ گئے، کیوں؟''

''جی نہیں، ایسا تو نہیں۔'' راحت افزا پھر پلنگ کے پاس آ گئی اور وزیر کے پاؤں دباتے ہوئے بولی۔ ''بات یہ ہے...''، لفظ ''بات'' کو اس نے ذرا کھینچ کر ادا کیا، ''...کہ نواب صاحب تو فجر کی نماز کے بعد پرگنہ پہاسو تشریف لے گئے ملاحظے کے لئے۔ اور ہم ماں بیٹی کو کچھ حکم احکام دے گئے، سو ہم انھیں

انجام دے رہے ہیں۔"

وزیر کے دل پر چوٹ سی لگی جو بہت جلد برہمی میں بدل گئی۔ میرے جاگنے کا انتظار نہ کرنا تھا تو مجھے جگا دیتے۔ یہ کیا کہ بے ملے ہی چلے گئے، کچھ کہا نہ سنا۔ گویا میری کوئی حیثیت ہی نہیں، مجھ سے سلام دعا کی کچھ اہمیت ہی نہیں۔ لیکن یہ باتیں اس پیاری سی نوعمر لڑکی کے روبرو کرنے کی نہیں تھیں۔ اسے اپنی برہمی پھر فوراً ہی گہرے غم میں بدلتی نظر آئی۔ کیا میرے سفینۂ عمر کو ناخدا کی اور لنگر کی تلاش ہی رہے گی... لیکن راحت افزا کچھ اور بھی کہہ رہی تھی۔

"میری اماں حبیب النسا سے آپ مل چکی ہیں۔ ہم دونوں آپ کی خدمت پر مامور ہیں۔ اماں جی فجر کے بعد وظیفے بہت لمبے لمبے پڑھتی ہیں، کلام شریف الگ۔ اور پھر یہ بھی کہ انھوں نے کہا، خانم صبح پو پھٹتے ہی میری بڈھی صورت کیا دیکھیں، راحت افزا تو چلی جائیو..."

راحت افزا کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ بے اختیار وزیر کے منھ سے نکلا:

"تو نواب صاحب اس طرح چلے کیوں گئے...؟"

راحت افزا بیچ ہی میں کچھ بولنا چاہتی تھی، لیکن ایک لمحے کو چپکی رہی۔ شاید اس اچانک استفسار کے پیچھے اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وزیر کے دل میں نواب کی غیر حاضری کے بارے میں کچھ زیادہ ہی خلفشار ہے۔ وہ حسب سابق وزیر کا پاؤں دباتی رہی اور ایک لمحے کے سکوت کے بعد بولی:

"جی وہ بات یہ ہے کہ صبح کی اذانیں ہونے سے پہلے نواب صاحب بیدار ہوئے تھے۔ باہر تشریف لائے تو پرگنہ پہاسو کا ایک سانڈنی سوار پرچۂ اخبار لے کر حاضر ہوا کہ کل آدھی رات کے بعد وہاں ڈاکہ پڑا تھا اور جب نواب کے سپاہیوں نے ڈاکوؤں کو دوڑا لیا تو انھوں نے قصبے کے باہر جو جنگل ہے اس میں ایک پرانی گڑھی میں پناہ لے لی..."

"ہے ہے، یہ تو بہت برا ہوا۔ کیا کسی کی جان گئی؟"

"جی نہیں، جہاں تک میں جانوں ہوں جان کے نقصان کی تو خبر نہیں لیکن مال انھوں نے بہت سا لوٹا اور مال برآمد کرانے کے لئے کئی ساہوکاروں مہاجنوں کو گرم چمٹوں سے داغا بھی اور... اور... ایک دو لڑکیاں بھی اٹھا لے گئے۔" راحت افزا کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور اس کے چہرے کا رنگ اڑنے لگا تھا۔ "ان میں قصبے کے قاضی جی کی بیٹی بھی تھی۔ اس کا ایک پاؤں تھوڑا سا رہ گیا ہے لیکن ہے چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ بچاری ٹھیک سے بھاگ بھی نہ سکتی تھی۔ ایک شقی نے

کمند ڈال کر اسے باندھ لیا۔"

راحت افزا کے سارے بدن میں لرزش تھی اور اس کی آواز گھٹ کر سسکی میں بدل گئی، منھ فق تھا اور رنگ زرد پڑنے لگا تھا۔ وزیر کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ راحت افزا کی تسلی اور دل کی ڈھارس کے لئے کیا کرے۔ اپنی پریشانی کو ایک لمحے کے لئے دل سے نکال کر وہ بولی:

"ہائے ہائے وہ نیک بخت کیونکر بچی ہوگی۔ ظالموں نے معذور بچی کو بھی نہ چھوڑا۔ پر بی بی، تم دل تھوڑا نہ کرو۔ مولا اپنا فضل کرے گا۔ نواب تو دھاوے کی صورت گئے ہیں اس دکھاری کو ضرور چھڑا لائیں گے۔"

وزیر نے تھوڑا اٹھ کر راحت افزا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چمکارتے ہوئے کہا۔ "جاؤ کچھ پانی وانی پی لو۔ جی ٹھہر جائے گا۔ ایسے موقعے پر روتے نہیں، ہمت رکھتے اور دعا کرتے ہیں۔"

راحت افزا نے ڈوپٹے سے آنسو پونچھے اور بولی۔ "پانی نہیں... میں آپ کے لئے صبح کا شربت لائی تھی اور نواب صاحب آپ کے لئے کچھ چیز چھوڑ گئے ہیں اور حکم کر گئے ہیں کہ جب آپ منھ دھولیں تو حاضر کی جائے۔"

وزیر کا دل بلیوں اچھلا۔ نواب اس کے لئے کچھ پیغام یا تحفہ چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن اتاولی ہو کر اسے دیکھنے کے لئے مصر ہونا بھی ٹھیک نہ تھا۔ وہ ایک انداز استغنا سے بولی:

"اچھا، تو ٹھیک ہے راحت افزا تم جا کر کچھ پانی پی لو۔ خاطر کو جمع اور دل کو توانا رکھو۔ اللہ کی مرضی ہوگی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بھی اب اٹھتی ہوں۔ منھ دھوؤں گی تیار ہوں گی، تب تم پھر آجائیو، سمجھیں۔"

"میں آپ کے لئے شہد اور بادام کا شربت لائی تھی کہ ان موسموں میں نہار منھ پینا بہت فائدہ کرتا ہے۔"

"اچھا بابا کہاں ہے شربت۔ میں صبح کو شربت دودھ چھاچھ کچھ نہیں پیتی لیکن تم کہتی ہو تو یہ بھی سہی۔ لیکن دیکھو۔ ہمارے آدمیوں کو ناشتے کے ساتھ دودھ ضرور پلوا دینا اور بس۔ لاؤ شربت پی لوں۔"

راحت افزا جلدی سے آبدار خانے کے اندر گئی اور فوراً ہی چاندی کی کشتی میں رکھے ہوئے ایک لمبے سے منقش سنہرے گلاس میں شربت لئے ہوئے پھری۔ گلاس پر سرپوش پڑا ہوا تھا اس لئے شربت کی کیفیت معلوم نہ ہوتی تھی۔ وزیر کو شربت پیش کرتے ہوئے راحت افزا نے کہا:

''لے اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پی جائیں خانم صاحب۔ انشاء اللہ دماغ روشن ہو جائے گا۔ یہ شربت حکیم احسن اللہ خان صاحب کے نسخے کا ہے جب وہ جنت مکانی بڑے نواب صاحب کے معالج تھے۔''

وزیر کو واقعی صبح کے وقت نہار منھ کسی شربت یا معجون کی عادت نہ تھی۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے سرپوش ہٹایا۔ ارغوانی رنگ کا شربت تھا، مشک اور زعفران کا ایک اشارہ سا اس کی ناک میں آیا، بے حد لطیف۔ وزیر نے ایک گھونٹ پیا تو بہت سرد نہ تھا لیکن کئی طرح کے خوشگوار ذائقے اور شاید ایک دو مسالے بھی اس ایک گھونٹ میں اس طرح حل ہو گئے تھے کہ حلق سے اتارتے ہی اسے فرحت کا احساس ہوا، گویا بدن میں گلابی سی روشنی پھیل گئی ہو۔

''بھئی بڑا مزے دار نکلا یہ شربت۔ تم نے خود گھولا تھا کیا؟''

''جی وہ تو بنا بنایا شیشے میں رکھا تھا۔ میں نے بس نکال کر تھوڑے سے پانی میں حل کر کے پیش کر دیا۔ آپ کو اچھا لگ گیا تو زہے قسمت۔''

''تو پانی میں حل کرنے کا ہی کچھ کمال رہا ہوگا،'' وزیر مسکرا کر بولی۔ ''اچھا، اب تو جا۔ تھوڑی دیر بعد اپنی امی کو بھیج دیجو۔''

''ابھی نہ بھیج دوں؟'' راحت افزا کچھ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ''امی آپ کا منھ دھلوا دیں گی لباس بدلوا دیں گی۔''

اف پھر وہی مصیبت، وزیر نے دل میں کہا۔ لیکن اب اس چھوکری سے کیا بحث کرنا۔ اس کی ماں کو بھی کس مشکل سے ٹالا بتایا تھا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ جب چاہیں آ جائیں۔''

ادھر راحت افزا کا پاؤں آبدار خانے کے دروازے میں پڑا۔ ادھر وزیر نے جھٹ پٹ رات والے کپڑے پہن لئے، بستر کی شکنیں تھوڑی بہت برابر کر دیں اور کتاب لے کر یوں بیٹھ گئی گویا رات بھر کتب بینی ہی کرتی رہی ہو۔ اذانوں کے ساتھ جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو کمرے کی سب روشنیاں گل تھیں، صرف آبدار خانے کے دروازے کے پاس ایک فرشی شمع اور دیوار کے طاق میں ایک انگریزی وضع کا فانوس روشن تھا۔ انگریز اسے لمپ (Lamp) کہتے تھے۔ اس میں سرسوں کا تیل یا تلوں کا تیل جلتا تھا۔ دھوئیں کی چراہند کم کرنے کے لئے ہندوستانی لوگ تیل میں دسواں حصہ گل روغن ملاتے تھے۔ یہ تیل اس گل روغن سے کچھ مختلف تھا جو بیگمات کے یہاں سر پر لگانے کے لئے بہت مقبول تھا۔ راحت افزا جاتے

جاتے دو تین شمعیں اور روشن کر گئی تھی، اس طرح مہماں سرا میں خاصا اجالا تھا اور اوپر کے روشن دان سے چھنتی ہوئی تھوڑی روشنی سے پتہ چلتا تھا کہ باہر بھی اب دن بڑھتے بڑھتے سر کاخ وبام آ گیا ہے۔

اس نے ابھی کتاب کھولی ہی تھی کہ آبدار خانے کے دروازے پر پھر کھٹکا ہوا اور حبیبہ نے اندر آ کر سلام کیا۔

''صباح الخیر خانم صاحب۔ رات نیند اچھی آ گئی تھی؟''

''ہاں رات تو بارے اچھی گذری لیکن اب نواب کے لئے تردد ہے۔''

''خانم صاحب، تردد کا ہے کا۔ اللہ چاہے گا تو وہ مغرب کے پہلے پہلے مراجعت فرمالیں گے۔ تب تک وہاں سب امی جمی ہو جائے گی۔ موئے ڈاکوؤں کو سولی دے دی جائے گی۔''

''اور... اور وہ بچی جسے وہ اٹھالے گئے تھے؟''

''اے ہے بی بی کی بات۔ واری جاؤں وہ راضی خوشی اپنی ماں کے آنچل تلے اور اپنے باپ بھائی کے سائے میں ہوگی۔ بی بی فتح تو داد الٰہی ہے پر ہمارے نواب نے آج تک ایسی مہمات میں زک نہیں کھائی۔ اللہ رکھے ہمارے نواب کے برقنداز گڑھی کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان کلموہوں کو نکلنے نہ دیا ہو گا۔''

ہوگا، ضرور ایسا ہوگا۔ وزیر نے افسردہ دلی سے سوچا۔ ولیکن لڑکی ذات پر ظلم توڑنے کے لئے گھڑی دو گھڑی بھی قیامت کے برابر ہے۔ جب تک نواب کے سوار وہاں پہنچیں پہنچیں سارا کام ہی تمام ہو سکتا تھا... پھر اس نے کچھ پہلوے سخن بدلنے کے لئے اور کچھ واقعی احوال جوئی کی خاطر پوچھا:

''کل رات تم نے بتایا نہیں حبیبہ کہ تمھارے اتنی پیاری سی بچی بھی ہے۔''

''اللہ آپ کو خوش رکھے، غریب کیا اور اس کی بیٹی کیا۔ پر سچ تو یہ ہے کہ کل ایسے ذکر مذکور کا موقع نہ تھا... تشریف لائیے منھ دھلوا کر تبدیل لباس کرا لیجئے۔ پھر نواب کا تحفہ حاضر کیا جائے گا۔''

وزیر کا جی چاہا، کہہ دے، آخر منھ دھلوانے کی شرط کیوں؟ پہلے ہی کیوں نہ پیش ہو؟ یا کم سے کم بتا تو دیں کہ کیا ہے۔ باتوں پر باتیں بن رہی ہیں اور اصل معاملہ نہیں کھل رہا ہے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ان معاملوں میں حزم و ضبط بڑی چیز ہے۔ سو وہ اپنا من مار رہی۔ منھ دھونے اور صبح کی ضروری آرائش اور تبدیل لباس کے دوران حبیب النسا کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا مرد غلام نبی نامی، علاقۂ میرٹھ کا رہنے والا اور نواب احمد بخش خان مغفور و مبرور کی ڈیوڑھی پر بصیغۂ سپہ گری نوکر تھا۔ جس طرح کی مہم پر نواب

شمس الدین احمد آج گئے ہوئے تھے، ایسی ہی ایک مہم میں غلام نبی کھیت رہا تھا۔ حبیب النسا اس وقت پورے دن سے تھی۔ نواب خلد آشیانی نے دائی جنائی کو تعینات کر کے اس کے وضع حمل کا پورا انتظام کیا اور جب وہ چلہ نہا چکی تو اپنی بیگم یعنی شمس الدین احمد کی ماں بہو خانم کی خواصی پر مقرر کر دیا۔ تب سے ماں بیٹی یہیں کی ہو کر رہ گئی تھیں اور نواب بیگم کے خلد مکانی ہونے کے بعد بھی وہ شمس الدین احمد کی محل سرا میں مغلانی اور خادمہ کی طرح قائم تھیں۔

محل سرا کے مردوں میں حبیبہ کی اچھی صورت پر ریجھنے والے کئی تھے اور بعض تو زبردستی پر بھی اتر آنے میں عار نہ دیکھتے، اور اب تو راحت افزا بھی بڑی ہو گئی تھی۔ لیکن نواب خلد آشیانی، اور اب نواب شمس الدین احمد کا دبدبہ اس قدر تھا کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرتا تھا۔ عرش آشیانی اپنے وفاداروں اور جاں نثاروں کا کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور اللہ رکھے ہمارے نواب صاحب بھی غربا پروری میں کچھ کم نہیں۔ مثل مشہور ہے باپ پر پوت پتا پر گھوڑا کچھ نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ اب تو ان ماں بیٹی کی یہی تمنا تھی کہ خانم صاحب کی خدمت پر متعین کر دی جائیں۔ انھیں الگ سے کچھ درماہہ بھی مطلوب نہ تھا۔ حبیب النسا کے مرحوم میاں کی وجہ مقرری اسے اب تک ملے جاتی تھی۔ تیج تیوہار پر جوڑے اور انعام اکرام الگ تھے۔

انھیں باتوں میں مشاطگی کے تمام حوائج ولوازم پورے ہو گئے۔ وزیر پوری طرح سج بن کر مہمان خانے میں اسی آرام چوکی پر آ براجی جس پر وہ گذشتہ شب پہلے پہل بیٹھی تھی۔ اسی وقت راحت افزا ایک چھوٹا سا صندوقچہ ہاتھ میں لئے ہوئے اندر آئی۔

"مبارک سلامت خانم صاحب،" راحت افزا نے صندوقچہ آرام چوکی کے چوڑے ہتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے نواب صاحب قبلہ کی طرف سے یہ تحفہ مبارک ہو..."

"اور اللہ کرے ایسے ہی، بلکہ اس سے بھی اچھے تحفے تحائف ہر وقت آپ کو نواب کی طرف سے ملتے رہیں۔" حبیبہ نے کہا، اور وزیر کو کچھ جھجکتا ہوا دیکھ کر بولی، "اے لیجئے۔ اب تکلف کا ہے کا۔ اسے کھول بھی لیجئے نہ۔" وہ چاہتی تھی یہ بھی کہے کہ ہم لوگ بھی دیکھ لیں کیا تحفہ ہے، لیکن بروقت اس نے زبان روک لی۔ ابھی سے اس قدر تکلف برطرف کر کر بول چال ٹھیک نہ تھی۔ پہلے وزیر خانم اس سے کھلیں تب اسے سوہتا تھا کہ وہ بھی خادمانہ ریت رسم میں تھوڑی بہت ڈھیل برت سکے۔

کوئی ایک وجب لمبا، چھ انگل چوڑا اور اتنا ہی اونچا کشمیری اخروٹ کا بھاری سا صندوقچہ تھا

جس پر چینیوں کی طرز کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ اندر چاروں طرف سرخ مخمل کا آستر تھا اور وسط میں ایک چاندی کا ڈبہ پیپل کے پتے کی شکل کا۔ سارا ڈبہ باریک چاندی کی تارکشی کا اتنی صفائی سے بنا ہوا تھا کہ ایک نظر میں اس پر پیپل کے خشک پتے ہی کا گمان ہوتا تھا۔ چاندی کچی اور ذرا قدیم تھی کہ اس کی چمک کچھ ماند پڑ گئی تھی، اس لئے پتے کا گمان اور مستحکم ہو جاتا تھا۔ کٹک کے چاندی کی تارکشی کے کام سے وہ ناواقف نہ تھی لیکن اتنا نازک اور اتنا صاف کام اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ پیپل کے پتے کا ہر ریشہ اور ریشوں کا سارا جال ایسا بنا ہوا تھا بس دیکھتے رہیئے، ہاتھ نہ لگایئے۔ جالیوں کے پیچھے ایک پرچہ کاغذ تہ کیا ہوا، اور ایک انگوٹھی صاف نظر آ رہی تھی۔ وزیر کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ڈبے کا ڈھکن کسی کھٹکے سے بند نہ تھا کہ جسے ڈھونڈنے اور صحیح طریقے سے دبانے میں کچھ وقت اور زور لگانا پڑے اور اگلے کو اس پر پھوہڑ پن یا بلیلے پن کا شک ہو۔ اس نے انگلیوں کا ذرا سا دباؤ ڈالا اور ڈھکن کھل گیا۔

پرچہ کاغذ کو دیکھتے ہی حبیب النسا اور راحت افزا دونوں وزیر کے سامنے سے یوں ٹل گئیں جیسے انھیں کئی کام یاد آ گئے ہوں۔ راحت افزا دوسری طرف جا کر بستر کی شکنیں برابر کرنے لگی اور حبیب النسا شمع دانوں اور فانوسوں کی لگن میں جمی ہوئی موم کو پیتل کے چاقو سے کھرچ کر ایک لکڑی کے پیالے میں جمع کرنے لگی۔ پرچہ کچھ عجب طرح سے کاٹا گیا تھا کہ اوپر سے چوپرت لگتا تھا لیکن وزیر نے پرتیں کھولیں تو ایک پھول سا بن گیا۔ حنا کے عطر کا ہلکا بھپکا اس کی ناک میں آیا، نہایت نرم و گرم خوشبو تھی۔ وزیر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ باہر سے آئی ہو اور اس کے ٹھنڈے رخسار کو نواب نے اپنی انگلیوں سے چھو لیا ہو۔ بہت ہلکا نیلا کاغذ، تقریباً آبی رنگ کا، اس پر سنہری زعفرانی روشنائی میں صرف ایک شعر لکھا تھا۔

شب کہ عریاں بہ برآں شوخ قدح نوشم بود
یک بغل نور چو فانوس در آغوشم بود

وزیر کو اپنے کان کی لویں، پھر رخسار اور پھر پیشانی گرم اور سرخ ہوتی محسوس ہوئیں۔ پر ہائے کیا خوبصورت اور برمحل شعر تھا۔ اس نے جلدی سے پرچہ کاغذ کو مٹھی میں توڑ موڑ کر گریبان میں رکھ لیا... لیکن زیر جامے کے نیچے بھی کاغذ کے دکھائی دینے یا ٹپک جانے کے امکانات تھے۔ اس نے پرچے کو ذرا اور نیچے وادی شانہ کی گہرائی میں پھنسا دیا اور دل میں دعا کی کہ یا اللہ یہ اٹھتے بیٹھتے میں گر نہ جائے، بگھی میں بیٹھوں گی تو صحیح کر لوں گی۔

''اللہ خانم صاحب آپ انگشتری کو دیکھ بھی چکیئے۔'' راحت افزا نے ذرا ہمت سے کام لے کر

کچھ دلربایانہ انداز میں کہا۔ ''ہم بھی تو دیکھنے کو بے چین ہو رہے ہیں۔''

وزیر نے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھی نکالی اور چکا چوندھ سی ہو کر دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ زر جعفری کی انگوٹھی، سات ساڑھے سات ماشے کی، نگینوں میں پہلے تو نہایت گہرا زمرد تھا جسے انگور کی پتی کی شکل میں تراشا گیا تھا۔ اس کے اوپر گہرے گلابی رنگ کا چنے کی دال کے برابر یاقوت جسے خوشۂ انگور کے ڈھنگ پر تراشا گیا تھا۔ دونوں نگینوں کا تناسب اس قدر متوازن تھا کہ نہ یاقوت بھاری لگ رہا تھا اور نہ زمرد بے ڈول معلوم ہوتا تھا۔ انگور کے خوشے پر بھی ایک پتی اس نزاکت سے ابھاری گئی تھی کہ لگتا تھا یہ سارا پتھر اسی شکل میں کسی کان لعل سے نکلا ہوگا۔ زمرد کی گہری سبز چھوٹ یاقوت کے گلابی پن پر تھی اور یاقوت کا گلابی رنگ زمرد کی سبزی کو کچھ دبا رہا تھا۔ زمرد کے نیچے انگوٹھی ذرا چوڑی اور مسطح تھی۔ دونوں طرف دو سفید ہیرے سرسوں کے دانوں کے برابر اوپر تلے جڑے ہوئے تھے۔ ہیروں کو کچھ اس طرح تراشا گیا تھا کہ ہر فص کسی نہ کسی شمع کی لو کو منعکس کر رہی تھی۔ لہٰذا معلوم ہوتا تھا کہ انگوٹھی سے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ زمرد بہت چمکیلا پتھر ہے اور نہ یاقوت، اور زمرد چاہے جتنا بھی قیمتی کیوں نہ ہو، اس کے اندر داغ، یا جھائیاں ضرور ہوں گی۔ ان پتھروں کا زیادہ کمال ان کے رنگ اور ڈھنگ میں ہوتا ہے۔ لیکن چمک کی کمی کو انگوٹھی کے خالص پیلے دمکتے ہوئے سونے اور سونے پر سہاگے کے طور پر چاروں ہیروں نے اس خوبی سے پورا کیا تھا کہ پوری انگوٹھی نور کا بکا بن گئی تھی۔

''ہائے اللہ!'' راحت افزا کے منھ سے سسکاری نکلی۔ ''کم سے کم دو...'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ ''کم سے کم دو ڈھائی ہزار کی ہوگی'' لیکن حبیب النسا نے اسے بروقت گھور کر چپ کرا دیا۔ تحفے تحائف کی قیمتیں نہیں آنکی جاتیں اور وہ بھی مالکوں کے درمیان۔ راحت افزا نے گڑبڑا کر جملہ پورا کیا، ''کم سے کم دو تین کاری گروں نے اس پر کام کیا ہوگا تب جا کر کئی دن میں یہ بنی ہوگی۔''

''بے شک،'' حبیبہ نے کہا۔ ''یہ انگوٹھی زیوروں میں ایسی ہی ہے جیسی کہ حسینوں میں ہماری خانم اور رئیسوں میں ہمارے نواب۔'' اس بار اس نے ''نواب'' کا واؤ مشدد ادا کیا تھا۔

''اے ہے حبیبہ تم نے نواب کے ساتھ مجھے بھی سان دیا۔ کہاں نواب کہاں میں۔'' وزیر ہنستی ہوئی بولی۔ ''لیکن سچی کہیں تو یہ انگوٹھی نواب زادیوں ہی کو سہاوتی ہے۔''

ابھی حبیب النسا کچھ جواب نہ دے سکی تھی کہ صدر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ راحت افزا نے لپک کر دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔ فوارے کے چلنے کی سکون افزا آواز کے ساتھ تھوڑی

سی تازہ روشنی بھی مہمان خانے میں پھسلتی ہوئی آگئی۔ راحت افزا نے دروازے پر کھڑے ہوئے کسی شخص سے دبے لہجے میں کچھ بات سنی اور کچھ جواب دیا۔ شاید کوئی خدمت گار تھا جو نواب شمس الدین احمد کی مہم سے کچھ خبر لایا تھا۔ دروازہ آہستہ سے بند کر کے راحت افزا جب مڑی تو دونوں عورتوں نے اس کی طرف توقع بھری نگاہوں سے دیکھا۔ راحت افزا کو بھی خیال تھا کہ یہ لوگ نواب کی طرف سے کچھ اطلاع کی آمد گمان کر رہی ہیں۔ لہٰذا کسی کے کچھ کہنے کے پہلے ہی وہ بولی:

''خانم صاحب، آپ کے نوکروں سے پوچھا گیا تھا کہ ان کے لئے ناشتہ نواب صاحب کے دسترخوان سے بھجوایا جائے یا مودی خانے سے سیدھا لگوا دیا جائے۔ سامنے باورچی خانہ موجود ہی ہے، چاہیں تو سیدھا لے کر خود کھا پکا لیں۔''

وہ ایک لمحے کو سانس برابر کرنے کے لئے ٹھہری تو وزیر نے کہا:

''خوب، تو پھر انھوں نے کیا پسند کیا؟''

''جی۔ انھوں نے کہا کہ باورچی خانے میں برتن باسن سوختہ سب موجود ہے تو ہم اپنی اپنی وضع کا ناشتہ تیار کر لیں گے۔ ہمیں راتب دے دیا جائے۔ تو انھیں یہاں کے قاعدے کے موافق...'' ذرا رک کر اس نے دل میں غور کیا کہ کیا کیا سامان دیا گیا ہے، پھر وہ اس طرح بولی گویا فرد میں سے پڑھ کر سنا رہی ہو۔ ''...آرد گندم یک سیر، دال نخود یا، ہرے چنے کے بونٹ چھلکا اتارے ہوئے یک پاؤ، سوجی نصف پاؤ، روغن زرد یک چھٹانک، روغن تلخ یک چھٹانک، قند سفید پنج تولہ، قند سیاہ یک پاؤ، اور دو شاہی پیسے نقد... یہی پیٹیا اس ڈیوڑھی پر سب کو ملتا ہے۔''

''خوب، بہت خوب،'' وزیر نے پھر کہا۔ ''تو کیا وہ لوگ کھا پکا کر فارغ ہو چکے؟''

''جی خانم صاحب... پر ایک چیز تو میں بھول ہی گئی تھی۔ خانم علیا کے حکم کی تعمیل میں ہر نفر کو ایک بڑا پیالہ دودھ بھینس کا اور اس کے ساتھ دو چمچہ بھر بورا بھی دیا گیا۔''

''ماشاء اللہ حبیبہ۔ یہ تمھاری بیٹی تو بڑی سگھڑ ہے، سارے کام کس خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے۔'' وزیر نے راحت افزا کی طرف شاباشی بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ راحت افزا کا چہرہ کچھ شرم اور کچھ مسرت سے گلابی ہو گیا۔

''بٹی، بارے یہ تو کہہ کہ ناشتہ ہوا بھی کہ نہیں،'' حبیب النسا بولی۔ ''اور ہماری خانم علیا کو کچھ کھلوائے گی بھی یا بھوکھی ہی رکھے گی؟''

"خانم صاحب کے سب شاگرد پیشہ ناشتہ ختم کر چکے ہوں گے۔ اور خانم صاحب کے ناشتے کی ساری آراستگی اماں جی کر ہی آئی ہیں۔ میں تو حکم کی منتظر ہوں۔"

وزیر کو اچانک شرمندگی سی محسوس ہونے لگی کہ یہ دونوں ماں بیٹی کل رات سے پھرکی کی طرح میرے کاموں کے لئے ناچتی پھر رہی ہیں۔ اب انھیں مزید زحمت سے بچائے رکھوں تو خوب ہے۔ اسے یہ بھی فکر ہو رہی تھی کہ شام کو نواب کہیں میری طرف آنے کا قصد نہ کر لیں اور میں یہاں ہی ننانوے کے پھیر میں رہ جاؤں۔ ناشتہ اگر کچھ بھی رات کے کھانے کی طرح ہوا تو بارہ ہی تو بجیں گے۔ لہٰذا اس نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا:

"اچھی حبیبہ اب مجھے جانے دو تو میں تمھاری بڑی احسان مند ہوں گی۔ ناشتے کا کسالا نہ کھینچو تو بہتر ہے۔ وہاں میرا گھر بھی اکیلا پڑا ہے۔"

"آپ درست فرماتی ہیں، پر نواب تو میری چمڑی ہی ادھیڑ ڈالیں گے اگر انھوں نے سنا کہ خانم صاحب کو میں نے ناشتا ہی بھجوا دیا۔ میری مانیں تو دو ایک لقمے کھا لیں، میری ناک چوٹی رہ جائے گی۔"

یہ استدلال شاید پوری طرح مبنی بر حقیقت نہ تھا، لیکن ایسی سپارش اور گذارش کے بعد وزیر کو پائے انکار نہ ہو سکتا تھا۔ بولی، "اچھا منگوا لیجئے ولیکن آپ کو بڑی روٹی کی قسم جو پورا دستر خوان سجوایا ہو۔"

وزیر خانم کے منع کرتے کرتے بھی ناشتے سے عہدہ برآ ہوتے ہوتے دن اتنا چڑھ آیا کہ دوپہری کا سماں پیدا ہو گیا۔ حبیبہ اور راحت افزا نے آنسو بھری آنکھوں سے وزیر کو رخصت کیا۔ دریا گنج سے سرکی والوں کا فاصلہ ہی کتنا تھا، اور بگھی کے گھوڑے، گاڑی بان، سب تازہ دم تھے، گھڑی سوا گھڑی میں پہنچ گئے، ہر چند کہ چاندنی چوک میں دوکانداروں اور خریداروں کی بھیڑ بھاڑ دم بدم روز افزوں تھی۔ وزیر نے نواب کی حویلی کے صدر دروازے (جہاں وہ کل رات اتری تھی) کے بجائے مہمان خانے ہی سے سوار ہونا پسند کیا تھا کہ اس طرح وہ عوام کی نگاہوں سے محفوظ رہتی۔ اور چاندنی چوک میں تو ایک سے ایک زرق برق بہل، بگھی، رتھ، ہوادار، نالکی، چوڈول، تام جھام، ادھر سے ادھر شہاب ثاقب کی طرح اڑا پھرتا تھا۔ ایسے میں نواب یوسف علی خان کی بگھی کو کون پہچانتا اور کون تاکتا کہ اس میں سوار کون ہے۔ اپنے خیال میں وہ ٹوہ لینے والی آنکھوں سے بچ بچا کر خوش و خرم اپنے گھر پہنچ گئی۔

اسے خبر نہ تھی کہ ولیم فریزر کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ نواب شمس الدین احمد کی بھی حویلی

کے نوکروں میں کم سے کم دو ایسے تھے جو ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر اپنے اپنے طور پر صاحب کلاں کو خبریں پہنچایا کرتے تھے۔ دو الگ الگ مخبروں کا ایک فائدہ یہ تھا کہ ایک کے بیانات اور پرچوں کو دوسرے کے اخبار سے مقابلہ کر کے جھوٹ سچ، یا مبالغے، یا دانستہ یا نادانستہ فروگذاشتوں کا پتہ لگانا آسان تھا۔ دوسری بات یہ کہ دونوں اپنی اپنی جگہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہم ہی اس حویلی میں نواب ریزیڈنٹ بہادر کے جاسوس ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی وقعت بنائے رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے تا کہ سچے وفاداروں میں ان کا نام اور کام نمودار طور پر لکھا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ شام ہوتے ہوتے، جب تک شمس الدین احمد پہاسو سے واپس آئیں، گذشتہ شب اور آج صبح کا سارا کچا چٹھا ولیم فریزر تک پہنچ چکا تھا۔ ادھر نواب یوسف علی خان کے نوکروں نے انھیں بھی وزیر خانم کے کوائف سے آگاہ کر دیا تھا۔ یوسف علی خان تو مطمئن تھے کہ بات صحیح راہ باٹ پر جا رہی ہے لیکن فریزر نے بہت پیچ تاب کھایا۔ ایک دود غلیظ تھا کہ کانون سینہ سے اٹھا اور مجمر دماغ کے پار ہو گیا۔ شمس الدین احمد کو اور اگر ممکن ہو تو چھوٹی بیگم کو بھی قرار واقعی سرچنگ دینا اس کے نزدیک اب بہت ضروری ہو گیا تھا۔

حکیم احسن اللہ خان

وزیر خانم اور شمس الدین احمد کے سنجوگ کی خبر ملنے کے تیسرے دن تک فریزر نے اپنی تیاریاں کر لی تھیں۔ سب سے پہلے تو اس نے نواب گورنر جنرل بہادر کو کلکتہ ایک کیفیت پرگنہ پہاسو میں ڈاکہ پڑنے کی بھیجی۔ لیکن شمس الدین احمد نے جس پھرتی اور مستعدی سے ڈکیتوں کا قلع قمع کیا تھا اور ان کے دو سرداروں کو سرعام سولی چڑھوا دیا تھا اور تقریباً سارا لوٹا ہوا مال اور قاضی کی دختر کو بھی برآمد کرا لیا تھا، اس کا برائے نام ذکر کیا، اور وہ بھی اس انداز میں گویا یہ خبریں مصدقہ نہ تھیں اور اگر تھیں بھی تو ڈاکوؤں کے کیفر کردار کو پہنچنے میں شمس الدین احمد کی جرأت مندیوں، حکمت عملی اور قیادت کا کوئی دخل نہ تھا۔ ڈکیتی کے واقعے کو اس نے اس بات کی دلیل میں پیش کیا کہ شمس الدین احمد کا انتظام کمزور اور اپنے علاقہ جات پر ان کی گرفت ڈھیلی تھی۔ فریزر نے بار دگر اپنی پرانی رائے کا اعادہ کیا کہ مسٹر فرانسس ہاکنس ریزیڈنٹ سابق نے تمام مقبوضات نواب احمد بخش خان متوفی پر شمس الدین احمد کا حق تسلیم کر کے غلطی کی تھی:

> لہٰذا نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل (Governor General in Council) کی خدمت میں اس سفارش کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ سر چارلس مٹکاف کے روبرو جو بٹوارہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان نے ریاست اپنی کا کیا تھا اسے دوبارہ رائج کر دیا جائے تاکہ دلاور الملک کے یتیم بچے مسمی امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد اپنے اپنے حق کو حاصل کر سکیں اور اس طرح اپنی بہنوں اور والدہ کی بھی پرورش کر سکیں۔

گورنر جنرل باجلاس کونسل والی بات لکھ کر فریزر نے چالاکی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر چند نواب گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک (Lord William Bentinck) بہادر سے یہ اندیشہ نہ تھا

کہ وہ کوئی سفارش یا قیمتی تحفہ قبول کر کے شمس الدین احمد خان کے حق میں فیصلہ کر دیں گے، اور نہ یہ معاملہ اتنا وسیع الذیل تھا کہ اسے کونسل میں پیش کیا جائے، لیکن کونسل کی پابندی کا اشارہ کرنے سے یہ فائدہ تھا کہ اس اشارے کی بنا پر معاملہ اگر کونسل میں گیا تو نتیجہ اچھا ہی ہوگا، کیونکہ صاحب گورنر جنرل وہاں کوئی من مانی نہ کر سکتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان دنوں ممبران کونسل کا عام رجحان دیسی رئیسوں کے بر خلاف اور عہدہ داران کمپنی کی موافقت میں تھا، لہٰذا اغلب تھا کہ کونسل اسی کاغذ کی توثیق پر اصرار کرتی جس پر سر چارلس مٹکاف اور جنرل آکٹرلونی کے دستخط تھے۔

فریزر نے ایک دن مزید غور کیا، پھر حکم دیا کہ حکیم احسن اللہ خان کو ریزیڈنٹی میں طلب کیا جائے۔

حکیم احسن اللہ خان مولداً کشمیری اور نسلاً شیخ صدیقی تھے۔ انھیں معز الدنیا والدین ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار گوہر بار سے عمدۃ الملک حاذق الزماں کے خطابات ملے تھے اور عہدۂ معالج خاص شاہی تفویض تھا، اور ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی کی بارگاہ فلک اشتباہ سے خان سامانی و وزارت اور شاہی معالج خاص کے عہدے اور احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک ثابت جنگ کے خطابات ابھی ملنے تھے، لیکن سارے شہر میں ان کے اکتسابات علمی اور کمالات طبی کی دھوم تھی۔ ایک عالم انھیں رازی ثانی اور جانشین بوعلی کہتا تھا اور یہ قول بھی عام تھا کہ طبابت اور آداب جہاں بانی کے علاوہ بھی دنیا کے اکثر علوم پر ان سے گہری نظر اس زمانے میں کسی کی نہ تھی۔ شعر و شاعری سے بھی خاص ربط رکھتے تھے۔ مومن تو ان کے ماموں زاد بھائی ہی تھے، میرزا اسد اللہ خان غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ، علامہ فضل حق خیر آبادی، مولوی امام بخش صہبائی وغیرہم سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چتلی قبر پر ان کی حویلی کا دیوان خانہ مریضوں کے علاوہ علما اور شعرا اور ہر طرح کے ماہرین فن کی آماجگاہ تھا۔ چتلی قبر سے دہلی دروازے تک بے اندازہ خلق خدا کے مکانات تھے، بڑی بڑی حویلیاں ان پر مستزاد۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ اور حویلی بھی اسی نواح میں تھی۔ پھر وہاں سے کوچہ چیلاں تک جفت فروشوں، سوزن گروں، وغیرہ کے گھر اور کارگاہیں تھیں۔ ایک طرف دبیر الدولہ خواجہ سید فرید خان (۱) اور حکیم ثناء اللہ خان کی حویلیاں تھیں۔

یوں تو حکیم صاحب شہر میں کئی حویلیوں کے مالک تھے لیکن صبح کا عام مطب وہ ہمیشہ چتلی قبر

(۱) سرسید کے نانا۔

والی حویلی پر رکھتے تھے۔اس کی وجہ یہی تھی کہ یہاں خلق اللہ کا مجمع زیادہ تھااور شرفا وصلحا اور علما کا بھی پڑوس حاصل تھا۔ان کا معمول تھا کہ صبح اشراق کی نماز کے بعد مطب میں آجاتے تھے اور ظہر کی نماز کے ذرا پہلے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔اس معمول میں سردی، گرمی، بارش، طوفان، بھونچال، کوئی چیز حائل نہ ہوسکتی تھی۔ سرکی والوں میں بدل بیگ کی وسیع اور عالی شان حویلی ابھی انھوں نے نہ خریدی تھی۔اسے خریدنے کے بعد اپنے حسن انتظام اور مہارت فن ہندسہ کی بدولت انھوں نے اس حویلی میں کچھ ایسی نئی چیزوں کے اضافے کئے تھے کہ لوگ اس حویلی کو دیکھنے دور دور سے آتے تھے۔لیکن ابھی تو وہ بات مستقبل میں تھی، اس وقت وہ چتلی قبر والی حویلی ہی میں زیادہ تر قیام کرتے تھے۔

حکیم احسن اللہ ابھی کم عمر تھے کہ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان رستم جنگ نے انھیں اپنا ذاتی معالج مقرر کرلیا تھا اور بلی ماراں میں اپنی حویلی کا ایک حصہ ان کے لئے خالی کر دیا تھا۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، نواب موصوف کے انتقال (اکتوبر ۱۸۲۷) کے وقت شمس الدین احمد (پیدائش ۱۸۰۹) بالغ ہو چکے تھے اور دوسری محل سے نواب احمد بخش خان کے دو بیٹے امین الدین احمد (پیدائش ۱۸۱۴) اور ضیاء الدین احمد (پیدائش ۱۸۲۱) سن وقوف کو نہ پہنچے تھے۔ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ شمس الدین احمد نے باپ کی تقسیم کو مسترد اور منسوخ کرتے ہوئے تمام ریاست پر اپنا قبضہ قائم کرلیا تھا۔انھوں نے حکیم احسن اللہ کو بھی عہدۂ سابق پر برقرار رہنے کی پیشکش کی، لیکن غالباً حکیم صاحب کی نگاہ فراست مآب نے بھانپ لیا تھا کہ باپ کی وصیت اور تقسیم کو نہ قبول کر کے شمس الدین احمد نے اپنے گھرانے میں جھگڑے کا زہر بودیا ہے اور یہ شاخ زہر آگے چل کر شراروں کے پھول لاسکتی ہے۔لہٰذا انھوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ شمس الدین احمد کی پیشکش قبول نہ کی جائے۔چنانچہ انھوں نے کسی خوبصورت عذر کا سہارا لے کر شمس الدین احمد کے معالج خاص کا عہدہ نہ اختیار کیا اور فوراً ہی بلی ماروں کی حویلی سے بھی اٹھ آئے۔

چند ہی دنوں بعد نواب فیض محمد خان والی جھجھر نے حکیم احسن اللہ کو اپنا معالج مقرر کرلیا۔دہلی کی گلی کلاں محل جو کالا محل کے نام سے معروف تھی، ساری کی ساری نواب فیض محمد خان کی ملکیت تھی۔اسی گلی میں رنگ محل نامی عمارت نواب فیض محمد خان کی طرف سے حکیم صاحب کو قیام اور مطب کے لئے ملی ہوئی تھی۔اس زمانے میں ظل سبحانی اکبر شاہ ثانی کے معالج ہونے کا شرف حکیم امام الدین کو حاصل تھا کہ اپنے وقت کے اطباے حاذق اور اہل اللہ میں ان کا اعتداد تھا۔اتفاق ایسا ہوا کہ بادشاہ کو کچھ ایسا مرض

لاحق ہوا کہ حکیم امام الدین اس کی نوعیت ٹھیک دریافت نہ کر سکے اور عارضے کی کنہ کو نہ پہنچ سکے۔ اس وقت کسی کے مشورے پر حکیم احسن اللہ کو طلب کیا گیا اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ان کے علاج سے بادشاہ سلامت کو بہت جلد صحت ہوگئی۔ انعام وجلدو کے علاوہ بادشاہ نے حکیم احسن اللہ کو خطابات خانی وملکی وزمانی سے سرفراز کیا۔ اب وہ عمدۃ الملک، حاذق الزماں، حکیم احسن اللہ خان کہلائے۔ چند دن بعد بادشاہ نے حکیم امام الدین صاحب کو اذن رخصت دے کر عمدۃ الملک کو اپنا اور قلعۂ معلیٰ کا طبیب خاص مقرر کیا۔

اپنے حسن اخلاق، انکسار مزاج، اور تشخیص وتجویز دونوں میں یکساں مہارت کے باعث حکیم احسن اللہ خان دلی والوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ عمائد وعوام، وضیع وشریف، کیا ہندو کیا مسلمان، سب ان کا دم بھرتے تھے۔ طویل القامت، دوہرا بدن لیکن بھاری نہیں، چھوٹی چھوٹی روشن آنکھیں، سانولے چہرے پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ، علما وحکما کے طرز کی گول بھری ہوئی خوش نما داڑھی بہت سیاہ، لیکن بہت لمبی نہیں، از سرتاپا سفید لباس میں ملبوس حکیم صاحب اپنے دیوان خانے میں مطب کر رہے تھے۔ بہت لمبا اور کچھ کم چوڑا کمرہ، مشرقی دیوار سے لگا ہوا ایک وسیع چوبی تخت پوش جس پر گدے بچھے ہوئے، گدوں کے اوپر سفید چاندنی، چاندنی کے اوپر بیچوں بیچ میں سبز وسفید ولاجوردر یشمی قالین جس پر حکیم صاحب دوزانو بیٹھے تھے، اس طرح کہ مریض آسانی سے انھیں نبض دکھا سکے۔

حکیم صاحب کے دونوں جانب نسخہ نویس حکیم بیٹھے ہوئے تھے، اور تخت پوش کے سامنے مریض دو رویہ لمبی لمبی چوکیوں یا کرسیوں پر تھے۔ حکیم صاحب باری باری نہایت خندہ پیشانی سے دائیں اور بائیں جانب کے ایک ایک مریض کی نبض دیکھتے۔ مریض کو خود اپنا حال بیان کرنے کی حاجت بہت کم پیدا ہوتی تھی، مرض کی نوعیت سمجھنے کے لئے نبض دیکھنا ہی حکیم صاحب کے لئے کافی تھا۔ عموماً دائیں ہاتھ کی نبض دیکھی جاتی۔ لیکن کبھی کبھی دونوں کلائیوں کی نبض کا ملاحظہ ہوتا، مگر یہ اسی وقت جب مریض کوئی ایسی بات کہتا یا ایسی شکایت کا ذکر کرتا جو حکیم صاحب کے لئے غیر متوقع ہوتی۔ حکیم صاحب شاذ ونادر ہی ایک دو سوال خود بھی کر لیتے تھے اور وہ زیادہ تر اپنی تشخیص کی تصدیق کے لئے ہوتا تھا۔ مثلاً ''آپ کی شادی خاصی عمر گذار کر ہوئی۔'' یا، ''بچپن میں آپ نے سرسوں کا تیل بہت استعمال کیا ہے۔'' یا، ''آپ کے دائیں گردے پر ورم ہے، پہلی بار درد ہوا اور بخار آیا تو آپ نے کسی طبیب سے رجوع نہیں کیا؟'' وغیرہ۔ تشخیص بہت جلد ہوتی اور پھر بے تاخیر، مگر نہایت پست آواز میں بلکہ زیر لب، نسخہ نویس صاحب کو نسخہ لکھوا دیا جاتا۔ کسی مریض کو کچھ پوچھنا ہوتا تو جھک کر پوچھ لیتا۔ سوال کا جواب حکیم

صاحب اسی طرح دو تین لفظوں میں اور اسی ہلکی آواز میں بتا دیتے تھے یا نسخہ نویس کی طرف سر سے اشارہ کر دیتے کہ ان سے پوچھ لیجیے۔ پورے ماحول پر متانت اور رعب کی فضا تھی۔

حکیم صاحب کے یہاں نبض دکھانے کی کوئی فیس نہ تھی، ہاں مطب سے ملحق عطار کی دوکان سے دوا لی جاتی تو اس کی قیمت ضرور لگتی تھی۔ لیکن حکیم صاحب خدا جانے کون سا اشارہ کر دیتے تھے جسے بھانپ کر نسخہ نویس کسی کسی مریض کے نام کے ساتھ کوئی علامت بظاہر مبہم سی بنا دیتا جس کا مدعا ہوتا کہ اس مریض سے دوا کی قیمت نہ لی جائے، یا نصف لی جائے۔ اور اگر مطب کے عطار سے دوا نہ لی جاتی تو بھی کچھ ہرج نہ تھا۔

ولیم فریزر کے فرستادہ ایک برچھیت اور ایک چوبدار حکیم احسن اللہ خان کے مطب میں اس وقت داخل ہوئے جب دوپہر شروع ہو رہی تھی، کوئی بارہ پونے بارہ کا عمل رہا ہوگا۔ نو واردوں کو اشارہ کیا گیا کہ منتظرین میں اپنی مناسب جگہ لے لیں۔ لیکن وہ درانہ آگے بڑھتے ہوئے حکیم صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ چوبدار سلام کر کے بولا:

''حضور کو صاحب کلاں بہادر نے یاد فرمایا ہے۔''

حاضرین میں سے بعض کی تیوری پر بل آیا۔ کچھ کی برہمی کا باعث یہ تھا کہ ریزیڈنٹ کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ بادشاہ کی رعایا، علی الخصوص بادشاہ کے معالج کو اپنے یہاں طلب کرے۔ کچھ کو اس وجہ سے تردد ہوا کہ حکیم صاحب اب اٹھ جائیں گے اور ہم لوگ آج انھیں نبض نہ دکھا سکیں گے۔ لیکن حکیم صاحب نے اپنے معمولہ لہجے میں پوچھا۔

''کیوں، کیا معاملہ ہے؟ کچھ طبیعت ناساز ہے کیا؟''

''ہم لوگوں کو خبر نہیں سرکار۔ ہمیں بس یہی حکم ہوا کہ حکیم جی صاحب کو ہمارا سلام پہنچاؤ اور ابھی ساتھ لے کر پھرو۔''

''ابھی تو میں مریضوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ظہر کے ذرا پہلے اٹھوں گا، پھر نماز پڑھ کر تمھارے ساتھ چل سکوں گا، سمجھے؟''

''مگر صاحب نے تو...'' چوبدار نے کہنا شروع کیا۔

''ٹھیک ہے، صاحب نے کہا ہے۔'' حکیم صاحب نے قطع کلام کیا لیکن لہجے میں کوئی درشتی یا ناخوشگواری نہ تھی۔ ''لیکن میں تو اتنے لوگوں کو ادھر میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تم چاہو تو جا کر نواب ریزیڈنٹ

بہادر کو مطلع کردو۔"

ظاہر ہے کہ اس کے آگے چوبدار کو کیا چارہ تھا۔ دونوں خدام چپ چاپ ایک طرف بیٹھ کر حکیم صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ حکیم صاحب اپنے وقت سے اٹھے، نماز ادا کر کے بر آمد ہوئے اور اپنے ہوادار میں سوار ہو گئے۔ دونوں نفر ہوادار کے ساتھ تیز تیز چلے۔

جب حکیم احسن اللہ خان بہادر کا ہوادار ولیم فریزر کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچا تو چار بج رہے تھے۔ نوبت خانے کے محافظ نے بتایا کہ صاحب کلاں بہادر تو اب اٹھ گئے ہوں گے، آپ بہر حال تشریف لے جائیں۔ شاید ملاقات ہو جائے۔

حکیم صاحب اور فریزر کی گفتگو بڑے ملاقاتی کمرے میں نہیں بلکہ اس سے ملحق دربار کمرے میں ہوئی۔ چاروں طرف دیواروں پر انگریزی، فارسی، لاطینی اور یونانی کتابیں بجی ہوئی، سامنے بڑی سی میز جس کے ایک سرے پر فریزر انگریزی لباس میں مقطع مسجع بیٹھا ہوا خاصا پر رعب لگ رہا تھا۔ ایک عصا بردار اور ایک مگس ران پشت پر، ایک چوبدار اس کے دائیں ہاتھ کی طرف کاغذوں کا بستہ لیے ہوئے، کچھ کاغذ سامنے میز پر پھیلے ہوئے، فریزر کی توجہ کاغذوں پر تھی جب باہری چوبدار نے آواز لگائی:

"عمدۃ الملک حکیم احسن اللہ خان بہادر۔"

فریزر نے آنکھ اٹھا کر حکیم صاحب کو دیکھا۔ اس کے پہلے کہ وہ انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرے، حکیم صاحب اسے ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے خود ہی پاس والی صندلی پر متمکن ہو گئے۔ فریزر نے اشارے سے تمام نوکروں کو رخصت کیا، نیم قد کھڑے ہو کر حکیم صاحب کی تعظیم کی اور کہا:

"عمدۃ الملک، آپ تشریف لائے، میں بہت ممنون ہوں۔"

حکیم صاحب نے کچھ جواب نہ دیا، صرف سر کو خفیف سا خم کیا، گویا کہہ رہے ہوں کہ ٹھیک ہے، میں آپ کے بلاوے پر آ گیا۔ لیکن یہ تکلفات نہ کیجیے، بر سر مطلب آئیے۔ فریزر نے ایک لمحہ انتظار کیا، لیکن جب دیکھا کہ حکیم صاحب کو رسمی گفتگو میں دلچسپی نہیں، تو اس نے مزید کہا:

"عمدۃ الملک، آپ کی مدبرانہ لیاقت اور سوجھ بوجھ کے سب قائل ہیں۔"

اب حکیم صاحب کو کچھ جواب دیے ہی بنی۔ انھوں نے آداب بجالا کر کہا، "نواب ریزیڈنٹ بہادر کی کرم گستری اور قدر افزائی ہے۔"

فریزر نے مسکرا کر کہا، "آپ کو آج زحمت دہی کا سبب یہی ہے۔"

''میرے لائق جو خدمت ہوگی میں اس سے دریغ نہ کروں گا۔'' حکیم صاحب کا لہجہ متین لیکن خشک اور محتاط تھا۔

''حکیم صاحب، من حیث المجموع مجھے دہلی اور اہل دہلی سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ معاملات ریاست کے نظم ونسق میں نواب شمس الدین احمد بے حد ڈھیل دے رہے ہیں۔ ان کی بعض حرکات سے مجھے خود تکلیف پہنچی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ انھیں تنبیہ کریں کہ مجھے حسب سابق اپنا بزرگ اور بہی خواہ گردانیں، ایسا کچھ نہ کریں جو میرے لئے موجب ملال اور ان کے لئے باعث پریشانی ہو۔''

پھر ایک لحہ خاموش رہ کر، گویا غور کر رہا ہو کہ یہ بات ظاہر کرے یا نہ، وہ بولا۔ ''نواب گورنر جنرل بہادر کے بھی دل میں ان کی طرف سے میل آسکتا ہے۔''

حکیم احسن اللہ خان ایک دو لحظہ چپ رہے۔ فریزر کی ساری باتیں خلاف قاعدہ اور مدبرانہ حکمتوں سے خالی تھیں۔ اسے اگر نواب شمس الدین احمد سے کوئی پرخاش تھی تو یہ قضیہ اس کا تھا اور اس کا حل بھی اسے ہی نکالنا چاہیئے تھا۔

''صاحب کلاں بہادر کی طبع وقاد پر یہ امر تو روشن ہوگا کہ نواب شمس الدین احمد، بلکہ نواب احمد بخش خان مرحوم کے سارے ہی اخلاف پر، میرا کوئی زور نہیں۔''

''لیکن آپ نواب احمد بخش خان کے ذاتی معالج تھے۔ شمس الدین احمد بچپن میں آپ کی گودوں میں کھیلا ہے۔''

''جی ہاں۔ تھا۔ اب نہ نواب ہیں نہ میری معالجی باقی ہے۔'' حکیم صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔

فریزر کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہوئے۔ یہ ہندوستانی مسلمان ہوتے ہی بڑے بد دماغ ہیں لیکن یہ شخص تو اپنے بھلے برے کے خیال سے بھی عاری معلوم ہوتا تھا۔ فریزر نے اب ذرا بلند آواز سے کہا:

''حکیم صاحب۔ ہم ہر چیز کی خبر رکھتے ہیں۔ دلی میں کیا ہے جو ہم پر آئینہ نہیں۔ ہم نے جس کام کے لئے آپ کو پسند کیا ہے اس کے لئے آپ موزوں ترین شخص ہیں۔''

''بہتر ہے، میں مقدور بھر کوشش کروں گا، کوتاہی ہرگز نہ کروں گا۔''

''آپ شمس الدین احمد کو آگاہ کر دیں کہ چھوٹی بیگم کسی اور کی نظر چڑھ چکی ہے، پس وہ اس کا خیال چھوڑ دیں۔ آپ انھیں صاف صاف بتا دیں کہ یہ میرا پیغام ہے اور آپ کو بے واسطۂ غیر مجھ سے ملا ہے۔''

''اس اعتماد کے لئے میں صاحب کلاں بہادر کا ممنون ہوں لیکن نہ تو میرا شمس الدین احمد پر کوئی داب یا اثر ہے اور نہ یہ میرا منصب ہے کہ میں ان کے پاس آپ کا پیغام لے جاؤں۔''

''کیوں، منصب کیوں نہیں؟'' فریزر نے سرکہ جبیں ہو کر کہا۔ ''کیا آپ سرکار کمپنی بہادر کے وفادار نہیں ہیں؟''

''خطا معاف، لیکن میں نہیں گمان کرتا کہ اس معاملے کا کوئی ربط وفاداری سرکار کمپنی سے ہے۔'' حکیم صاحب نے بھی تیوری پر بل لا کر جواب دیا۔ ''اور بالفرض اگر ہو بھی تو میں نمک خوار بادشاہ کا ہوں، نمک خوار کمپنی نہیں۔''

''اور تمھارا بادشاہ کمپنی بہادر کا نمک خوار ہے عمدۃ الملک حکیم احسن اللہ خان۔''

''اپنا اپنا خیال ہے نواب ریزیڈنٹ بہادر،'' حکیم صاحب کا لہجہ اور بھی خشک ہو گیا تھا۔ ''ظل الٰہی اور ان کے اسلاف کو تخت دہلی پر حکمرانی کرتے دو سو سے زیادہ برس ہو گئے...''

''ہم نے آپ کو یہاں تاریخ کا درس دینے کے لئے نہیں طلب کیا ہے حکیم صاحب۔''

''جی ہاں، اور نہ نسخۂ عرق گاؤزبان کے لئے۔ اور یہی دو کام میں جانتا ہوں۔ مجھے رنج ہے کہ میں آپ کے لئے ناکارہ ثابت ہوا۔''

حکیم احسن اللہ خان نے صندلی سے اٹھ کر بڑے وقار اور رواداری سے آداب کیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ اذن رخصت کے بغیر دربار کمرے سے باہر نکل جانا فریزر کی سخت توہین تھی۔ اس وقت تو وہ سب کچھ برداشت کر گیا کہ اسے اپنی بھی عزت کا خیال تھا لیکن اس دن سے کمپنی بہادر اور حکیم احسن اللہ خان کے درمیان خاموش جنگ چھڑ گئی۔ ایک فریزر ہی پر موقوف نہ تھا، فریزر کے بعد بھی ہر ریزیڈنٹ کے دل میں حکیم احسن اللہ کے خلاف از خود گرہ پڑ جاتی۔ یا شاید دفتری یادداشتوں میں یہ مضمون درج تھا کہ حکیم کے ساتھ مہربانی کا سلوک نہ کیا جائے بلکہ ہمیشہ پہلوتہی کی جائے، کہ جس کی بنا پر حکیم صاحب کے تئیں ہر ریزیڈنٹ کا برتاؤ معاندت کا نہیں تو بے رخی کا ضرور رہتا۔ ایک بار بہادر شاہ کی بادشاہی کے زمانے (۱۸۴۶) میں حکیم احسن اللہ خان نے صلح صفائی کی بھی کوشش کی کہ نواب ریزیڈنٹ بہادر کے دل میں کوئی

غبار ہو تو نکل جائے، لیکن بادشاہ کی سفارش کے باوجود حکیم احسن اللہ خان کا وجود انگریزوں کے لئے نا پسندیدہ ہی رہا۔

ولیم فریزر کی کوٹھی سے حویلی مبارک خاصے فاصلے پر تھی اور حکیم صاحب کو اندیشہ تھا کہ وہاں پہنچتے پہنچتے عصر کا وقت نکل جائے گا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ عصر کی نماز فتح پوری کی جامع مسجد پر ادا کروں گا اور پھر لاہوری دروازے پر حاضر ہو کر شاہ جمجاہ کے حضور باریابی کا طالب ہوؤں گا۔ ولیم فریزر کی گفتگو کا پورا احوال بادشاہ کے گوش گذار کرنا ضروری تھا، نہ صرف اس لئے کہ نواب شمس الدین احمد یا کسی بھی ہندوستانی منصب دار یا عمدہ کے بارے میں کوئی اطلاع ان تک پہنچتی جو ملکی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہو سکتی تھی، تو ایسی اطلاع کو بادشاہ تک پہنچانا ان فرائض منصبی میں تھا، بلکہ اس لئے بھی کہ حکیم احسن اللہ خان کو اپنے یہاں طلب کر کے فریزر نے آداب سلطنت کو ملحوظ نہ رکھا تھا۔ حکیم احسن اللہ خان کو طلب کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا اور اگر بلوانا ہی تھا تو بادشاہ کے توسط سے بلوانا تھا۔ لہٰذا حکیم صاحب کے لئے یہ ضروری تھا کہ فریزر نے آداب سلطنت کی جو خلاف ورزی کی تھی اس کی اطلاع وہ ظل سبحانی تک پہنچا دیتے۔

شام کا دربار برخاست ہو چکا تھا اور ظل سبحانی خاصہ تناول فرمانے کے لئے اٹھ رہے تھے لیکن حکیم احسن اللہ خان کو باریابی کی اجازت مل گئی۔ بادشاہ نے خاموشی سے احسن اللہ خان کا اظہار سنا۔ انھیں برا تو بہت لگا کہ فریزر کی ہمتیں اتنی کھل گئی ہیں لیکن حکیم صاحب کے سامنے کچھ ظاہر نہ کرنا ہی بہتر تھا، کیونکہ بادشاہوں کی خفگی بے نتیجہ نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کے پاس اس وقت کوئی طاقت نہ تھی جس کے بوتے پر وہ فریزر کے بارے میں کوئی موثر اقدام کر سکتے۔ بل تو اپنا ہی بل نہیں تو جاوے جل، لہٰذا اپنی خفگی، یا کسی بھی تاثر کو ظاہر کرنا بادشاہ کی صوابدید کے برعکس تھا۔ گورنر جنرل کے پاس شکایت بھیجنا ضرور ممکن تھا، لیکن وہ کام بھی موقع محل دیکھ کر ہی کیا جا سکتا تھا اور اس کا بھی نتیجہ معلوم تھا۔ ہر چند کہ عرش آرام گاہ حضرت اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک بادشاہ اور گورنر جنرل میں براہ راست مراسلت ہوتی تھی (بعد میں یہ مراعات بھی باقی نہ رہی)، لیکن ایسی مراسلت کی خبر اور اس کے محتویات پر اطلاع ریزیڈنٹ کو بہر حال ہو جاتی یا کر دی جاتی تھی۔ اکثر و بیشتر گورنر جنرل کے یہاں سے بھی بادشاہ کا شقہ ریزیڈنٹ ہی کے پاس اظہار اور کیفیت کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔

بادشاہ کیواں بارگاہ سے اذن رخصت حاصل کر کے حکیم احسن اللہ خان دیوان خاص سے باہر

آئے تو موتی مسجد میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ مسجد میں باجماعت نماز ادا کر کے انھوں نے اپنے معمولہ طویل نوافل پڑھنا ملتوی رکھا اور باہر آ کر ہوادار کے کہاروں کو حکم دیا کہ دریا گنج میں نواب شمس الدین احمد کی حویلی پر چلو۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب تشریف فرما نہیں ہیں۔ مردھے کو ہدایت کر کے کہ نواب صاحب جب آئیں تو انھیں بتا دینا کہ احسن اللہ آیا تھا اور نواب مناسب جانیں تو کل صبح چتلی قبر میں بوقت مطب مجھے مل لیں، حکیم صاحب واپس اپنی حویلی پر آئے۔ فریزر سے ملاقات اور اس کے بے ہنگام و بے ضابطہ مطالبات نے ان کا دل منغض کر دیا تھا، لیکن ان کے اضطراب کا اصل سبب یہ نہ تھا۔ فریزر کی رعونت اور اس کا یہ اعتماد کہ وہ خود کو ملک ہند کے رؤسا اور زعما کے گھریلو معاملات اور نجی کردار و اطوار میں مداخل ہونے کا استحقاق رکھتا تھا، یہ باتیں ملک ہند اور اہل ہند کے لئے کسی خوش آئند مستقبل کی خبر نہ دیتی تھیں۔ مانا کہ وہ شمس الدین احمد پر ایک طرح کا حق رکھتا تھا کہ وہ نواب احمد بخش خان کا دوست رہ چکا تھا اور عام حالات میں شمس الدین احمد اسے ''چچا جان'' پکارتے تھے، لیکن گھر کی بات اور تھی۔ بلکہ اس صورت میں تو یہ اور بھی ضروری تھا کہ فریزر ان معاملات میں درگذر کرے اور چشم پوشی سے کام لے جن کا کوئی تعلق انتظام و انصرام ملک سے نہ ہو۔ یہ رعونت اور جابرانہ گھمنڈ فرنگی مزاج کا خاصہ تھا۔ حکیم احسن اللہ خان کو اندیشہ تھا کہ اقتدار میں افزائش کے ساتھ صاحبان انگریز کے عجب و تکبر اور اہل ہند کے تئیں ان کے استخفافانہ برتاوے میں اور بھی اضافہ ہو گا۔ امرا کی امارت، شرفا کی شرافت، اور غربا کی غیرت، سب کی فصلیں ایک ہی درانتی سے کٹیں گی۔ اور اگر یہ لوگ حاکم بن بیٹھے تو فرعون و نمرود کے بھی کان کاٹیں گے۔

اگلی صبح کو شمس الدین احمد نے حکیم احسن اللہ خان کے مطب پر ان سے ملاقات کی۔ حکیم صاحب نے انھیں تخلیے میں لے جا کر تمام باتیں بتا دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ میں نے ساری روداد اعلیٰ حضرت کے سمع میمون تک بھی پہنچا دی ہے۔ لیکن حکیم صاحب نے چھوٹی بیگم کے بارے میں کچھ بھی تجسس نہ جتایا، اور نہ شمس الدین احمد کو اس ضمن میں کوئی نصیحت کی یا مشورہ دیا۔ شمس الدین احمد چپ چاپ سنتے رہے لیکن جب حکیم احسن اللہ پوری بات کہہ کر خاموش ہوئے تو شاہی حزم و تمکین کے برعکس نواب کی طرف سے برہمی اور بیزاری اور فریزر کے خلاف دھمکیوں کے اعلان و اظہار میں کچھ تکلف نہ ہوا۔ نواب جب گرج برس کر چلے گئے تو حکیم صاحب نے پھر اپنا مطب سنبھالا۔ آج بھیڑ معمول سے کچھ زیادہ تھی۔

حکیم صاحب جب تک مطب سے اٹھیں اٹھیں، نواب شمس الدین احمد نے بلی ماراں میں اپنی

حویلی میں واپس آکر دو مستعد سانڈنی سواروں کو لوہارو بھیج دیا کہ آٹھ چنیدہ لٹھیتوں کو لے کر فوراً واپس آئیں۔ اگر قلعے پر آٹھ نفر بفور نہ مل سکیں تو قصبے سے بھرتی کی جائے۔ ہر صورت میں تیسرے دن کی صبح تک وہ دہلی میں آموجود ہوں۔ پھر انھوں نے اپنے داروغہ کو بلا کر حکم دیا کہ لوہارو سے آنے والے چار لٹھیت دن میں اور چار شب میں، وزیر خانم کے دروازے پر تعینات کئے جائیں۔ انھیں وہاں سے کہیں ہٹنے کی اجازت نہ ہوگی اور جس کسی نے محافظت میں ذرا کوتاہی کی اس کے ہاتھ پاؤں تڑا کر گاؤں واپس بھیج دیا جائے گا۔ اور جب تک لوہارو کی نفری نہ آئے، اتنی ہی تعداد میں مقامی لیکن معتبر اور جیوٹ عصا بردار خانم صاحب کے وہاں بغرض حفاظت آٹھوں پہر موجود رہیں۔

وسواس

منجھلی بیگم کا دل چھوٹی میں اٹکا ہوا تھا۔ نواب شمس الدین احمد کے ساتھ کیا بنی، اس کی تفصیل جاننے کے لئے اسے تجسس بھی تھا اور تردد بھی۔ چھوٹی کو جے پور سے آئے ہوئے چھ مہینے سے اوپر ہو چلے تھے۔ ضروری تھا کہ اب جلد از جلد اس کا کوئی وارث، کوئی خبر گیر، کوئی محافظ اس کے حسب دلخواہ مہیا ہو جائے۔ نکاح نہیں نہ سہی، لیکن کوئی شریف اور خوش حال مرد اس کا ہاتھ تھام کر گھر میں بٹھا لیتا تو بھی بہت تھا۔ پھر ممکن ہے بعد میں نکاح بھی ہو جاتا۔ اور بہت سے تعلقات محض آشنائی اور من بہلاؤ سے آگے بڑھ کر کبھی کبھی اتنی استواری بھی حاصل کر لیتے کہ نکاح میں اس سے زیادہ استواری کیا ہوتی۔ اور یوں بھی، نکاح میں اور گھر میں بٹھا لینے میں کون سا بڑا فرق تھا۔ ان دنوں مرد لوگ بے کھٹکے طلاقیں دیتے اور بے تکلف کئی کئی آشناؤں سے ایک ساتھ راگ سہاگ رکھتے تھے اور بعض بعض تو آشنائیوں کو نکاح سے زیادہ نبھاتے۔ سب اپنی اپنی تقدیر کا معاملہ تھا۔ تخت و بخت اگر لکھا ہو تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ چھوٹی کی عمر ابھی کچھ نہ تھی لیکن یہ زمانہ ایسا خراب تھا کہ کتنی ہی لڑکیوں کی جوانی اور بڑھاپا ساتھ ہی ساتھ یا ایک دو برس کے وقفے سے آتے تھے۔ بظاہر تو نواب شمس الدین احمد کا دل چھوٹی پر آیا ہوا تھا، اگر یہ سنجوگ لکھا ہو گا تو چھوٹی کے بھاگ کھل جائیں گے۔ چاؤ چوز میں کمی نہ ہو، کپڑے لتے، نوکر چاکر کی تنگی تکلیف نہ ہو تو انسان شکرانے کی نماز پڑھے اور زندگی گذار لے۔ سب سے بڑی چیز عزت تھی، وہ جو بزرگوں نے کہا ہے، رکھ پت رکھا پت۔ اور باعزت رہنے، بے وقر اور بے پت نہ ہونے کے لئے کسی رئیس کی وفاداری کا سایہ ضروری تھا۔ نواب شمس الدین احمد اگر چھوٹی کی بانہہ پکڑ لیں اور اسے عافیت کا کوئی گوشہ دے دیں تو اور کیا چاہئے تھا۔ مگر وزیر تو دیوانی تھی، وہ محبت اور دلداری اور چاہا چاہی کی بات کرتی تھی۔ یہ اس کا بھول پن ہی تو تھا کہ اس تیرہ صدی میں وہ چاہ چیت ڈھونڈتی تھی، حالانکہ بڑی چیز تو عزت اور عافیت تھی۔ چاہت کا کیا

ہے، موسم بہار کی تتلی ہے کہ بے حد خوش رنگ ہے لیکن چند روزہ۔ خیر، بارے کچھ دروازہ تو کھلا ہے چھوٹی کے لئے، نہیں تو بلاک صاحب کے چل بسنے کے بعد وہ بچاری کہیں کی نہ رہ گئی تھی...

عمدہ خانم کو جیسے ہی اطلاع ملی کہ وزیر خانم بخیر وخوبی واپس آ گئی ہیں، اس نے اپنی بہل کسوائی اور گھڑی بھر کے اندر ہی سر کی والان پہنچ گئی۔ وزیر کا دمکتا ہوا، بلکہ تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کا دل ٹھنڈا ہوا۔ دونوں بہنیں دیر تک گلے ملتی رہیں۔ پھر عمدہ کے کچھ پوچھنے کے پہلے ہی وزیر نے اسے نواب کی دی ہوئی انگوٹھی دکھائی اور گذشتہ رات کے احوال کہہ سنائے۔

''بی بی اللہ مبارک کرے، تمھیں اپنے صبر کا پھل مل گیا۔ اب راج رجوگی۔ نواب صاحب کے پاس دولت ہے، شکل اور عمر میں تمھارے جوڑ کے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم پر دم دیتے ہیں۔ اب تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

عمدہ خانم کے دل میں فریزر کا کچھ خیال نہ تھا، اور نہ ہی فریزر نے کبھی نواب یوسف علی خان پر اشارتاً بھی ظاہر کیا تھا کہ اسے وزیر سے کوئی غرض ہے یا وہ وزیر سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس دن کی دعوت ضرور تھی، لیکن اس کا مقصد عمدہ خانم اور نواب یوسف علی خان کے گمان میں یہی تھا کہ وزیر کو رونق محفل بنایا جائے۔ اصل حالات سے عمدہ خانم اور نواب یوسف علی خان دونوں بے خبر تھے کہ وزیر تو فریزر کی نظر چڑھ چکی تھی۔ بجا کہ فریزر نے اسے دوبارہ بلوانے یا اس کے یہاں خود جانے کا کوئی ڈول اب تک نہ ڈالا تھا، لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ شمس الدین احمد نے اسے موقع ہی نہ دیا تھا۔

جب فریزر کے پرچہ نویسوں نے اسے خبر دی کہ نواب شمس الدین احمد دوسرے ہی دن وزیر کے یہاں پہنچ گئے تو وہ جز بز ضرور ہوا، لیکن اس نے خیال کیا کہ نواب کا چند روزہ چونچلا ہے، کچھ دن بعد بخار اتر جائے گا اور سب جوش ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ پھر جب اسے پرچہ لگا کہ نواب اور وزیر کے مابین پیغامات اور تحفہ جات کا ردو بدل ہو رہا ہے تو اسے شک ہوا کہ بات دور تک جانے والی ہے، یا شاید چلی ہی گئی ہے۔ اس کے پہلے کہ وہ وزیر کو بلوانے یا اس سے ملنے کی کوئی مناسب سبیل سوچتا، مخبروں نے نواب کے یہاں وزیر کی شب باشی کی اطلاع دی تو اسے بے انتہا طیش آیا۔ لیکن عمدہ خانم اور نواب یوسف علی خان کو ابھی کچھ خبر نہ تھی، بلکہ شبہ بھی نہ تھا۔ لہٰذا عمدہ خانم سمجھ رہی تھیں کہ اب وزیر اور شمس الدین احمد کی راہ میں کوئی رکاوٹ یا تامل نہیں ہے۔ وزیر کو بھی اب فریزر کی طرف سے کوئی خدشہ نہ تھا۔ اس نے جواب دیا:

''باجی تمھاری دعا اور نواب کی بلند اقبالی نے میرے کام صحیح راستے پر ڈال دیئے۔ لیکن... مجھے

اب بھی ایک الجھن ہے۔‘‘

’’الجھن، اب الجھن کا ہے کی؟ کیا نواب نے کوئی ایسی بات کہی یا کیا کوئی ایسا اشارہ کیا جس سے تمھیں کچھ شک پڑ گیا ہے؟‘‘

’’ن... نہیں۔‘‘ وزیر نے ’’نہیں‘‘ کو ذرا کھینچ کر ادا کیا۔ وہ ایک ذرا دیر چپ رہی، پھر دوپٹے کے ایک کونے کو انگلیوں سے بل دیتی ہوئی وہ سر جھکائے جھکائے بولی:

’’نہیں۔ میرے جی میں کوئی وسواس نہیں۔ لیکن نواب صاحب نے ابھی بات صاف بھی تو نہیں کی ہے...‘‘

’’اے لو۔ اب انھیں بات صاف ہونے کی پڑ گئی۔ بھلا کوئی اتنی قیمتی انگوٹھی یوں ہی دے دیوے ہے اور یوں ہی کسی کے اتنے ناز اٹھاوے ہے؟‘‘

’’سو تو سب ٹھیک ہے باجی۔ لیکن ابھی انھوں نے اشارے ہی کنائے میں بات کی ہے۔ اصل بات کو مگھم رکھا ہے۔ میرے ساتھ کیا معاملہ کریں گے اس پر کچھ کھلتے ہی نہیں ہیں۔‘‘

منجھلی کے جی میں آیا، پوچھے، اور اس مونڈی کاٹے مارٹن بلاک فرنگی نے تیرے ساتھ کون سے عہد و پیمان کیے تھے۔ لے گیا تھا تو نکاح بھی کر لیتا۔ نہ سہی نکاح دیوانی عدالت کے سامنے قول و اقرار تو ہو جاتا۔ موت و حیات پر کس کا زور چلے ہے پر اس نصرانی نے تو جیتے یا مرتے چھوٹی کے لئے کوئی بھی سامان نہ کیا تھا... اچانک اسے خیال آیا کہ چھوٹی کے دل میں جو حیص بیص ہے وہ اس وجہ سے بھی ہے کہ بلاک صاحب کچی گرہستی چھوڑ کر چل بسے تھے۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیوے ہے، چھوٹی کا ڈرنا برجا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی منجھلی کا دل چھوٹی کے لئے محبت اور رقت سے بھر گیا اور اپنی حالت کی بھی سچی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک جھلک مار گئی۔ ہر چند کہ نواب یوسف علی خان اسے بے حد آسائش اور آرام سے رکھتے تھے اور سارے آثار اس بات کے تھے کہ وہ اسے کبھی خود سے جدا نہ کریں گے، لیکن نکاح کا بھی لفظ کبھی ان کے درمیان نہ آیا تھا۔ دنیا کی نظروں میں کچھ سہی، لیکن خدا کے سامنے اور نواب کے گھرانے میں منجھلی کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ منجھلی کی آنکھ میں آنسو چھلک آئے۔

’’ایک طور سے دیکھیں تو تیری بات ٹھیک ہے،‘‘ اس نے آنسوؤں کو ضبط کر کے کہا۔ ’’مگر ہم لوگوں کے پاس چارہ ہی کیا ہے۔ جو کچھ نصیب سے مل گیا ہے اسے ہی بہتر سے بہتر نبھانے کی دھن میں لگے رہیں، یہی ہم عورتوں کا دھرم ہے۔‘‘

وزیر کی بھی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اس نے ڈوپٹے سے آنسو پونچھے اور پھر ہمت کر کے کہا، ''لیکن باجی تم نے نواب صاحب کے دامن سے خود کو باندھنے میں کیا سوچا تھا؟''

منجھلی ایک لمحے کے لئے ساکت رہ گئی۔ اسے نواب یوسف علی خان کے ساتھ اب پانچ چھ برس ہو چلے تھے۔ ان سے پہلے اس نے کسی مرد پر کوئی معنی خیز نگاہ بھی نہ ڈالی تھی، مرد کے بارے میں سوچنا تو بڑی بات تھی۔ اور نواب کے ساتھ وہ محض رسماً پابند ہو کر نہ رہی تھی، بلکہ عفت اور حجاب کے سارے رسوم وطرق کا وہ پورا پورا لحاظ رکھتی تھی۔ تو کیا وہ نواب صاحب کو پہلے ہی سے دل دیئے ہوئے بیٹھی تھی اور تبھی اس نے ان کا اشارہ قبول کر کے باپ ماں کا گھر چھوڑ نواب کی حویلی کو اپنی جان کا ملجا و ماوا بنانا منظور کیا تھا؟ وہ بہت سوچ کر بولی:

''اب تو اتنے دن ہو گئے۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ اس گھڑی میرے جی میں کیا کیا خیال تھے... شاید مجھے ان سے کچھ لاگ ہی تھی... جو لگن میں بدل گئی، اللہ جانے۔ لیکن خدا شاہد ہے نواب صاحب نے میرے ساتھ کوئی چھل نہیں کیا۔ مجھے کوئی سبز باغ نہیں دکھائے۔''

''اللہ تم لوگوں کے جیوڑے سلامت رکھے۔'' چھوٹی نے کہا۔ ''اب تک تو پچھتاوے کی کوئی بات نہیں۔''

''نہیں ہے، اور ہے بھی۔'' منجھلی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''لیکن یہ جامہ میں نے خود پہنا اور تقدیر کے درزی نے میرے لئے کوئی اور جامہ سیا ہی نہیں۔ اب یہی میرا کفن بنے تو میں سمجھوں کہ خداوند عالم نے میرا پردہ رکھ لیا۔''

''مگر یہ اللہ ہی ہے جو میری مشکل آسان کرے...'' وزیر کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ عمدہ خانم نے بات کاٹ کر کہا:

''اللہ اللہ کرو چھوٹی۔ تمھاری کون سی مشکل ہے اور تمھیں کون سا سنکٹ ہے؟ اپنا تو دل ٹٹولو۔ تمھارا دل نواب شمس الدین سے اٹکا ہے کہ نہیں؟''

''میں نہیں جانتی...'' وزیر کی آنکھیں پھر تر ہونے لگیں۔ ''اپنے حسابوں سمجھتی تو یہی ہوں پر...''

''پر کیا؟ تم اگر یہ سمجھتی ہو اور نواب بھی تم پر مائل ہیں تو پھر زندگی کے کاروبار کو نئے سرے سے شروع کرو، اب تک جو ہوا اسے سبھ شگون مانو۔''

''لیکن،'' وہ کچھ رک کر بولی۔ ''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر باجی، میرے بچے...''

''اے لو بی بی کی بات سنو۔ ابھی سے بچوں کی فکر۔ تو ہر بات میں کھڑ پنچ ضرور نکالے گی۔''

وزیر کے جی میں آئی، کہہ دے، باجی تمھارے تو بچے ہیں نہیں۔ تم اولاد کے چھٹنے کا درد کیا جانو۔ لیکن ایسی بات کہنے کی کب تھی، سوچنے کی بھی نہ تھی۔ اسے یہ بھی کچھ شک تھا کہ باجی نے جان بوجھ کر بچے نہیں پیدا کیے، یا شاید نواب نے منع کر دیا ہو۔

''نہیں میں کسی کی کھڑ پنچ میں نہیں ہوں باجی۔ لیکن بلاک صاحب کے بہن بھائی نے مجھ پر ستم کیا کہ نہیں؟''

''اچھا، اور تو یہ بھی دیکھ کہ غیر خون کی اولاد کو تو تنہا کس طرح پالتی جلاتی؟ نصرانی ذات کے دل میں مسلمان کے لیے بھلا کون سی محبت بھری ہوئی ہے؟ اور تیرے پاس ان کی پرورش پرداخت کے لیے کوئی قارون کا خزانہ تو ہے نہیں۔ اب نواب شمس الدین کا کچھ سہارا ہو رہا ہے تو پھر دیکھیں گے۔ ابھی تو بیج بکھیرا ہے اور تو ابھی سے فصل کٹنے کے خواب دیکھنے لگی۔''

وزیر کے منھ پر مسکراہٹ کی تھوڑی سی دمک آئی۔ ''باجی تم تو جانتی ہی ہو میں سدا کی جلد باز رہی ہوں۔''

''اور تو یہ بھی جانتی ہے کہ جلدی کے کام شیطان کے ہوتے ہیں۔ دیکھ ترے کام میں کیسا پیچ پڑ گیا تھا۔ آخر کھولن ہار نے اسے اپنے وقت پر اور بالکل صحیح وقت پر کھولا کہ نہیں؟ ورنہ انتظار تو بچوں کو بوڑھا کر دے ہے۔''

یہ کہہ کر منجھلی بیگم اپنی جگہ سے اٹھی، اس نے چٹ چٹ چھوٹی کی بلائیں لیں اور پھر اسے گلے سے لگا کر بولی۔ ''اچھا اب میں چلی۔ آئندہ جو بھی واقعہ وقوع ہو مجھے فوراً خبر کیجو۔''

''باجی کھانا تو کھا لیتیں۔''

''نہیں، شام کے وقت نواب صاحب اکثر مجھے ڈھونڈتے ہیں۔ کبھی کبھی کھانا کھانے اندر بھی آجاتے ہیں۔ تو دل مضبوط رکھیو، میں نواب صاحب سے بھی سارا حال کہہ دوں گی، انشاءاللہ سب اچھا ہو گا۔ لے اب میں چلی، تجھے اللہ کی امان میں سونپا۔''

عمدہ خانم کو اٹھتا دیکھ کر اس کی اصیل اس کے اوڑھنے کی ریشمی چادر لے آئی، چادر اسے اس طرح اڑھا کر کہ سارا بدن اور منھ کا بڑا حصہ پوشیدہ ہو گیا، اس نے باہر جا کر بہل بان سے کہا کہ گاڑی دروازے پر لگا دے۔ وفادار اور دوسری اصیل مبارک قدم ایک بڑی چادر تان کر یوں کھڑی ہو گئیں کہ گلی

کی طرف سے بالکل پردہ ہوگیا۔ منجھلی چلتے چلتے پھر چھوٹی کی بلا گردان ہوئی اور چھوٹی نے سر جھکا کر بار بار اپنا بایاں ہاتھ سینے پر لے جا کر "باجی تسلیم"، "باجی اللہ معکم"، "اللہ آپ کو سلامت رکھے" کہا۔

فریزر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ چھوٹی بیگم کے بارے میں کیا کروں کہ کام بھی بن جائے اور انگشت نمائیاں بھی نہ ہوں۔ ورنہ یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ چھوٹی بیگم کو گھر سے اٹھوالیا جاتا، یا پچھلی بار کی طرح اپنے یہاں دعوت میں بلوا کر پھر وہیں روک لیا جاتا۔ (گویا اسے اعتماد تھا کہ اگر دعوت کے بہانے بلاؤں گا تو چھوٹی بیگم کو انکار کی جرأت نہ ہوگی۔) اسے معلوم تھا کہ بہت سے عیاش طبع اور ستم راں نواب اور راجا بے تکلف اس طرح کے کام کرتے تھے اور ان کی عمل داریوں میں عورتوں، خصوصاً کمزور طبقے کی عورتوں کا ناموس ہمیشہ غیر محفوظ تھا۔ ریزیڈنسی میں ایسے نوکر بھی موجود تھے جو جرائم پیشہ قبائل سے تعلق رکھتے تھے یا جن کی رسائی جرائم پیشہ لوگوں تک تھی۔ خود فریزر کے بارے میں افواہیں تھیں کہ وہ لڑکیوں بلکہ لڑکوں تک کو اسی طرح اٹھوا منگواتا ہے۔ یہ بات درست نہ تھی، مگر پیشہ ور معشوقوں کو بجبر بلوا لینا یا گھریلو عورتوں کی بھی مردم وزدی کرا لینا بہر حال کوئی ان ہونی بات نہ تھی۔ لیکن حکیم احسن اللہ والی ترکیب پٹ پڑنے کے بعد فریزر کو خدشہ تھا کہ نواب شمس الدین احمد تک یہ خبر ضرور پہنچے گی کہ چھوٹی بیگم پر صاحب ریزیڈنٹ بہادر نظر رکھتے ہیں، لہٰذا یہ قطعاً متوقع تھا کہ شمس الدین احمد حفاظتی تدابیر عمل میں لائیں اور چھوٹی بیگم کے گھر پر پہرہ بٹھا دیں۔ دوسری طرف، یہ بھی بعید از قیاس نہ تھا کہ بادشاہ کی طرف سے اس معاملے میں صراحتاً نہ سہی لیکن کنایتاً کچھ ناراضی کا اظہار ہوتا۔

ان سب باتوں کے پیش نظر جبری تدابیر اختیار کرنا فریزر کے لئے مناسب نہ تھا۔ چھوٹی بیگم کے یہاں خود بدولت بغرض ملاقات پہنچ جانا بے شک ممکن تھا، خاص کر ابھی جب شمس الدین احمد نے چھوٹی بیگم کے دروازے پر محافظ تعینات نہ کئے ہوں گے۔ اور اگر پہرے دار لگا بھی دیئے ہوں تو کس کی مجال تھی کہ صاحب ریزیڈنٹ بہادر کی راہ روک دیتا۔ فریزر کو یہ فیصلہ کرنے میں کچھ دیر لگی ہو تو لگی ہو، لیکن اس پر عمل درآمد کرنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ شام ہو رہی تھی، اس کی ہوا خوری کا وقت تھا ہی، لہٰذا اس نے اپنے خاص ہاتھی صورت سندر پر سوار ہو، دو ہاتھیوں پر برقنداز اور چار گھوڑوں پر چار قرابین بردار سپاہی بٹھا، شہر کی راہ لی۔

شام کو شہر میں سیر کی رسم جنرل اختر لونی نے شروع کی تھی، اور پہلے پہل اسی نے یہ ہمت بھی

کی تھی کہ شکوہ شاہی کی خاص علامت، یعنی سواری فیل کو شہر کے اندر استعمال میں لائے۔ سوار کے لئے زرکار ہودہ اور ہاتھی کے لئے مرصع جھول اس پر مستزاد تھے۔ بادشاہ کے سوا کسی کو چتر لگانے کی اجازت نہ تھی، اور یہ ایسی سخت ممانعت تھی کہ مادھوراؤ سندھیا اور غلام قادر روہیلہ بھی اس کا احترام کرتے تھے۔ لیکن یہاں بھی اختر لونی نے یہ بدعت کی تھی کہ شاہی انداز کا چتر تو نہیں، لیکن انگریزی وضع کی چھتری ایک خادم کے ہاتھ میں دے کر اسے اپنے پیچھے ہودے میں کھڑا رکھتا تھا۔ اختر لونی کی بدعتیں ریزیڈنٹی کے نانوشتہ رسوم کا حصہ شمار ہونے لگی تھیں اور ہاتھی، ہودہ، چھتری، اور احتشام نوابی کے ساتھ شام کو شہر کی سیر ایک طرح سے ریزیڈنٹی کا جھروکہ درشن بن گئی تھی۔

فریزر کو معلوم تھا کہ محی الدین اورنگ زیب عالم گیر نے اپنی طویل مدت حکومت کا دوسرا حصہ، جو کوئی چوبیس پچیس سال کو محیط تھا، دکن کی مہمات میں گذارا تھا اور اس مدت میں سے بھی آخری پانچ چھ برس تو براہ راست محاذ جنگ یا اردو میں گذرے تھے۔ ایسی صورت میں جھروکہ درشن کا اہتمام غیر ممکن تھا۔ لیکن اورنگ زیب نے اس کا بدل یہ نکالا تھا کہ ہر صبح ساعت مقررہ پر وہ موسم کے اعتبار سے نالکی یا ہوادار پر سوار ہو کر لشکر کی گشت کو نکلتا۔ چونکہ اردوے شاہی کئی فرسخ پر پھیلا ہوا ہوتا تھا، اس لئے گشت کی تکمیل میں ایک دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔ اورنگ زیب کے ہاتھ میں کتاب ہوتی اور وہ سارا وقت اپنی آنکھ کتاب پر لگائے رکھتا۔ ورق الٹنے میں انگلیوں یا ہاتھ کی تھوڑی سی حرکت کے سوا اس کے بدن کو اصلاً جنبش نہ ہوتی۔ اس کی سواری جہاں جہاں سے گذرتی، کیا مہاجن، تاجر، جوہری، کیا غلہ فروش، کیا توپچی، کیا طلائے کے سوار، کیا بندوقچی، کیا سپاہی، کیا نفر، کیا احدی سوار، کیا چوبدار، کیا خدمتگار، کیا کمیدان، کیا راجگان و نوابان، جو جس کام میں مصروف ہوتا، دور ہی سے کام چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا اور جب سواری میمونہ سامنے آجاتی تو جھک جھک کر تین سلام کرتا۔ لیکن عالم گیر کی آنکھ کتاب ہی پر رہتی۔ دائیں یا بائیں گردن گھما کر کچھ دیکھنا تو دور رہا، اس کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر بھی نہ ہویدا ہوتا۔ وہی بارعب متانت، وہی شاہانہ جلال کا ارتکاز، گویا وہ کھلی سواری میں لشکر کا معائنہ نہ کر رہا ہو بلکہ دربار میں کسی غیر ملک کے ایلچی سے ملاقات کر رہا ہو۔ اور یہ بھی تھا کہ اس کی بظاہر بے توجہی میں یہ اعتماد بھی پنہاں تھا کہ وہ اپنی آنکھ سے دیکھے یا نہ دیکھے لیکن لشکر کے سارے کام چوکسی، سلیقے اور خوش انتظامی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ پچاسی چھیاسی برس کا دبلا پتلا، کشیدہ قامت، عقابی آنکھ اور لمبی خمیدہ ناک، جیغہ اور سرپیچ کے نیچے بلند پیشانی، سفید براق داڑھی، سادہ لیکن شاندار لباس میں ملبوس اورنگ زیب اس وقت صحیح معنوں میں عالم

گیر لگتا تھا۔

ولیم فریزر کو اورنگ زیب کی یہ ادا بہت خوش آئی تھی اور وہ خود کو اقتدار اور جاہ و جلال میں نہیں تو علم اور تمکنت میں اورنگ زیب کے برابر ہی گردانتا تھا۔ اور کمپنی بہادر کا عینی وجود اس کی نظر میں آج نہیں تو بس کوئی دن جاتا تھا کہ اسی مرتبے پر فائز ہونے والا تھا جس پر اورنگ زیب عالم گیر نصف صدی تک متمکن رہا تھا۔ جس طرح اورنگ زیب نے سارے ملک ہند، سارے بنگالہ و کامروپ، اور سارے ملک دکن کو اپنے زیر نگیں کر لیا تھا، فریزر کے خوابوں میں اب یہی کام کمپنی بہادر انجام دے رہی تھی، یا انجام دینے والی تھی۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ اورنگ زیب اور اس کے محکوم اورنگ زیب کو ظل الٰہی اور آیۂ رحمانی سمجھتے تھے تو فریزر کے لئے علیا حضرت کمپنی بہادر کا وجود ظل شاہ انگلشیہ تھا، اور شاہ انگلشیہ پر تثلیث مقدس کے موجودات عینیہ کا ظل ممدود اس شان سے پرتو افگن اور نور بار تھا کہ چین و آسٹریلیا سے لے کر افریقہ و امریکہ تک سارا روے زمین جگر جگر کر رہا تھا۔ ساری دنیا کی دولت کھنچ کر مملکت برطانیہ میں چلی آ رہی تھی اور علم و حکمت، فلسفہ و منطق و ریاضی، طب و ہیئت کے لازوال سرچشمے سرزمین برطانیہ سے ابل ابل کر اور بہ بہ کر اطراف عالم میں پھیل رہے تھے اور سارے عالم کو منور اور سیراب کر رہے تھے۔

لہٰذا فریزر کے اپنے حسابوں یہ بالکل برجا تھا کہ وہ بھی شہر دہلی کی گشت کو اسی شان اور کرو فر سے نکلے جس طرح محی الدین اورنگ زیب عالم گیر میدان مصاف یا اردوے معلیٰ میں گشت کر کے لوگوں کو اپنی موجودگی، صحت، اور اہلیت سلطنت رانی و جہاں بانی کا ثبوت فراہم کرتا تھا۔ سواری فیل پر گشت کے دوران فریزر بھی اپنے ہاتھ میں کتاب رکھتا تھا لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنے جسم کو مکمل طور پر ساکن رہنے اور اپنی آنکھ کو ورق کتاب پر مرکوز رہنے کی تربیت نہ دے پایا تھا۔ اور پھر وہ گشت بھی کس کام کی جب انسان اپنے گرد و پیش کا معائنہ نہ کرتا چلے۔ اس کو سلام کرنے والے اتنے نہ صحیح جتنے عالم گیر کے ہوتے ہوں گے، لیکن پھر بھی بہت ہوتے تھے۔ وہ حسب مراتب کسی کے سلام کا جواب مسکرا کر دیتا تو کسی کو ''تسلیمات''، یا ''کورنش بجا لاتا ہوں'' کہتا۔ انگریزوں اور بعض مخصوص ہندوستانیوں کو وہ Good Evening, Sir کہتا۔ ٹوپی البتہ وہ کسی ہندوستانی کے لئے نہ اتارتا۔ ٹوپی اتار کر تعظیم دینا صرف اعلیٰ مرتبت فرنگیوں کے لئے مخصوص تھا۔

اس شام جب فریزر کا جلوس سرکی والان کے پھاٹک پر پہنچا تو فریزر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گلی کا بڑا پھاٹک بند تھا اور صرف بغلی دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں سے لوگ پیدل گذر سکتے تھے۔ سواریاں

پہلے دستک دیتیں، پھر پھاٹک تھوڑا سا کھلتا اور ایک لٹھیت باہر جھانک کر آنے والوں کی کیفیت معلوم کرتا اور پھر اپنا اطمینان کر لینے کے بعد انھیں داخلے کی اجازت دیتا۔ جب فریزر پھاٹک کے قریب پہنچا ہے تو لٹھیت ایک پالکی سوار کو اندر بلا لینے کے بعد پھاٹک بند کر رہا تھا۔ فریزر کی سواری آتے دیکھ کر اس نے پھاٹک ویسا ہی آدھا کھلا چھوڑ دیا، گویا یہ ظاہر کر دیا کہ پھاٹک کے اندر آنے کی مراعات از خود حاصل نہیں ہو سکتی۔ فریزر کا ہاتھی مجبوراً پھاٹک پر رک گیا اور اس کے پیچھے آنے والے فیل نشین اور اسپ سوار بھی ٹھہر گئے۔ ابھی وہ لوگ معاملے کو سمجھ نہ سکے تھے، لیکن یہ چند لمحوں کا وقفہ بے فکروں کا مجمع اکٹھا ہونے کے لئے کافی تھا۔ دلی والوں کو تو تماشا چاہیئے، خواہ وہ قتل عام ہی کیوں نہ ہو۔ حکیم مومن خان نے اسی مناسبت سے کیا خوب کہا تھا ؎

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

اور یہاں تو تماشا طرفہ بھی تھا اور تھوڑا سا سہا دینے والا بھی۔ نواب ریزیڈنٹ بہادر کا ہاتھی، ان کا جلوس سواری، اور سرکی والان کی اس گلی کا پھاٹک جس میں چھوٹی بیگم کا گھر تھا، اور اس گھر پر لوہارو والوں کے لٹھیت پہرے پر تعینات، وہ خدا جانے کس کی راہ روکنے پر مقرر کئے گئے تھے۔ سب کے دلوں میں تھوڑا بہت ڈر اور بہت ساری سنسنی تھی۔ تماشبینوں کے دلوں میں تجسس، خوف، اور سنسنی کا امتزاج خود ہی بہت لذت بخش تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ تماشے کے افراد میں اس وقت کا سب سے بڑا فرنگی عہدے دار بھی تھا جس کے بارے میں سنا گیا تھا کہ دہلی والوں کی زبان بھی بخوبی بولتا اور سمجھتا تھا۔ کرخندار، دوکاندار، ان کے بچے، حتیٰ کہ کوٹھوں پر چلمن یا چق سے جھانکتی ہوئی بعض زنانہ آنکھیں بھی چشم زدن میں آمادۂ تماشا ہو گئیں۔ بہت سے دیکھنے والوں نے تو ریزیڈنٹ بہادر کو پہلی بار دیکھا تھا اور اس کی وضع قطع یوں ہی ان کے لئے کسی اعجوبے سے کم نہ تھی۔ اس کا ہندوستانی لباس، فرنگی صورت، اس کی خواصی میں بیٹھا ہوا چوبدار جو اس کے پیچوان کے پیچ اور فرشی کو سنبھالے ہوئے تھا، ہر چیز آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بار بار دیکھنے کا تقاضا کرتی تھی۔

فریزر نے اوسان بجا رکھے اور خود کچھ نہ کہا، لیکن اس کا اشارہ سمجھ کر ایک شہسوار گھوڑا ڈپٹا کر قرابین تانے ہوئے آگے آیا اور کڑک کر لٹھیت سے بولا:

''ابے ماں کے خصم کھڑا دیکھتا کیا ہے؟ ہاتھ پاؤں رہ گئے ہیں کیا؟ صاحب کلاں بہادر کے

ہاتھی کو راستہ کیوں نہیں دے رہا؟''

لٹھیت خالص میواتی قبائلی تھا۔ سفید زین کا تنگ پاجامہ، اس کے اوپر پوری آستین کا شلوکہ نما کرتا اسی کپڑے کا، کمر میں سرخ ڈوپٹہ اور اس میں ایک پیش قبض تعبیہ کیا ہوا، سر پر سیاہ رنگ کا پھینٹا، کلائیوں میں لوہے کے کڑے، ہاتھ میں نو سیر کا قد آدم لٹھ جسے کئی برساتوں تک بارش میں رکھ کر اور پھر کئی مہینے تک سرسوں کا تیل پلا پلا کر سیاہی مائل لوہے کے میل سے زیادہ سخت اور لچیلا بنا دیا گیا تھا۔ لٹھ کے ایک سرے پر پیتل کی موٹھ اور دوسرے سرے پر لوہے کی نوک دار شام چڑھی ہوئی تھی۔ لٹھیت نے نیم وا پھاٹک میں سے لٹھ کو لمبا کیا اور اسے شہسوار کے گھوڑے کی گردن پر پھیپھڑے کے پاس ہلکے سے رکھ کر بولا:

''ذری زبان کو لگام دو تلنگے صاحب (۱) اور اپنے گھوڑے کو بھی لگام دو نہیں تو ایک قدم اگے ڈگو اور یہ لٹھ تمھارے ملے پچ (۲) کے جگر کے پار ہو جاؤ۔''

''ابے تلنگا کس کو کہتا ہے؟ ہم بارڑوزئی پٹھان ہیں۔ ابھی اتر کر زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔''

بات بڑھنے کا خدشہ دیکھ کر باقی تینوں لٹھیت بھی آگے آ گئے لیکن خاموش کھڑے رہے۔ فریزر نے محسوس کیا کہ اس وقت بات کا بڑھ جانا اور مکالمے کا محاربے میں بدل جانا مجمعے کے لئے موجب تضحیک اور میرے لئے مورد خجالت ہوگا۔ لہٰذا اس نے اپنے پیچھے والے فیل سوار سے انگریزی میں کچھ کہا۔ فیل سوار نے معاً اپنا ہاتھی آگے بڑھوا کر افغان گھڑ سوار کو پیچھے کیا اور متین لہجے میں بولا:

''صاحب کلاں بہادر کو راستہ نہ دینا کچھ اچھی بات نہیں میاں لٹھ باز خاں۔''

اب لٹھیت بھی کچھ نرم پڑا۔ ''راستہ کیوں نہیں دیاں گے۔ پر صاب جاں گے کہاں یہ تو پتہ چلے۔ اگے تو رستہ بند ہے۔''

فیل سوار نے فریزر کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھا تو فریزر نے کچھ اشارہ ایسا کیا جس سے فیل سوار نے سمجھ لیا کہ وزیر خانم کے یہاں جانا ہے۔

''سرکار دولت مدار ریزیڈنٹ بہادر فرماتے ہیں کہ ہم خانم صاحب کو شرف ملاقات عطا کرنے جا رہے ہیں۔''

---

(۱) اس لفظ کے ایک معنی ''گھڑ سوار'' بھی تھے۔ مرہٹوں کی فوج کے تلنگوں نے دلی میں بہت ستم ڈھائے تھے اور اگرچہ بادشاہ جمجاہ کی بھی فوج میں تلنگوں کی ایک پلٹن تھی، لیکن عام دلی والوں کی زبان پر یہ لفظ گالی سے کچھ ہی کم تھا۔

(۲) دس سے چودہ پندرہ سال کی عمر کا گھوڑا، یعنی عمر رسیدہ اور سال خوردہ گھوڑا۔ ظاہر ہے کہ لٹھیت نے یہ لفظ تحقیراً استعمال کیا تھا۔

چاروں لٹھیت سوچ میں پڑ گئے۔ انھیں وزیر خانم کے دروازے پر پہرے کے لئے لگایا گیا تھا ظاہر ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ کسی ناجنس کو نہ آنے دیں، اور ناملائم کی ملاقات سے خانم صاحب کو محفوظ رکھیں۔ خانم صاحب کو بظاہر کوئی خطرہ تو تھا نہیں، لیکن اگر کوئی دشمن ان پر چڑھائی کرتا تو خانم صاحب کو ہر طرح بچائے رکھنا بھی ان کا فریضہ تھا۔ مگر صاحب کلاں بہادر؟ انھیں یہ تو نہ معلوم تھا کہ صاحب کلاں بہادر ہی سے کچھ خطرہ محسوس کر کے نواب صاحب نے انھیں یہاں متمکن کیا تھا لیکن جب نواب صاحب خود بدولت خانم صاحب کے خواہاں تھے تو پھر صاحب کلاں بہادر کا گذر وہاں کیونکے ممکن تھا۔ لیکن اگر وہ ریزیڈنٹ بہادر کو روک دیتا تو بڑی خرابی کا بھی امکان تھا۔ اس تذبذب کے عالم میں ایک لٹھیت جو چاروں میں عمر رسیدہ اور تجربہ کار نظر آتا تھا آگے آیا اور بولا:

''جی بہت معقول۔ لیکن میں خانم صاحب سے پوچھ آؤں کہ وہ اس وقت ملاقات کو راضی ہوں گی کہ نہیں۔''

اس کا لہجہ دلی والوں جیسا اور آواز میں شائستگی تھی۔ لیکن یہ بھی بڑی بات تھی کہ ریزیڈنٹ کسی شخص سے ملنے خود اس کے گھر پر آئے اور وہ شخص، چہ جائے کہ چھوٹی بیگم جیسی ناوابستہ تنہا عورت، آنے والے سے بصد شوق ملنے کے بجائے ملنے کے اوقات اور موقع کی مناسبت کی بات کرے۔ لہٰذا لٹھیت کا یہ جواب فریزر کے لئے مشکل کھڑی کر گیا۔ وزیر خانم ملنے سے انکار کر دے تو؟ میری بڑی ہنسی اڑے گی اور اس سے زیادہ یہ کہ کمپنی بہادر کے رعب اور دبدبے میں حرف آئے گا۔ لیکن لٹھیت کا جواب سن کر چپ چاپ چلے جانا بھی اتنا ہی غیر مناسب تھا جتنا زبردستی کر کے وزیر خانم کے گھر میں داخل ہو جانا۔ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا جب اس سے ایسی حماقت سرزد ہوئی تھی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ چھوٹی بیگم کو ریزیڈنسی میں بلوا بھیجتا۔ کاروبار سلطانی دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔ پھر وہاں عالی و سافل، بالا و پست کے اعتبار سے حفظ مراتب بھی ہو جاتا۔ لیکن اب تو اسی برے سودے کو نبھا کر بہتری کی صورت نکالنی تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے ہاں کہی تو فیل سوار نے لٹھیت سے کہا:

''ٹھیک ہے۔ سرکار یہیں توقف فرمائیں گے۔ تم فوراً اطلاع کرو۔''

وزیر کو مقدم ولیم فریزر کی خبر سن کر حیرت تو ہوئی لیکن کوئی اندیشہ یا تردد نہ محسوس ہوا۔ بے اطلاع آ جانا ایک طرح کی ہتک ضرور تھا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ فریزر کی نظر میں چھوٹی بیگم بھی زنان بازاری کی طرح تھی اور کسی بھی وقت عند الطلب مہیا ہو سکتی تھی۔ وزیر نے یہ نکتہ نظر انداز نہ کیا تھا، لیکن اس

نے اسے انگریزوں کی معمولہ خود پسندی، بلکہ تبختر اور فرعونیت پر محمول کیا۔ لیکن ملنے سے انکار کرنے کی کوئی وجہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ ہر چند کہ وہ خود کو دل ہی دل میں نواب شمس الدین احمد سے وابستہ قرار دے چکی تھی، لیکن ابھی وہ خود کو اس قدر پابند بھی نہ سمجھتی تھی کہ گھر آئے ہوئے صاحب ریزیڈنٹ بہادر کو ٹکا سا جواب دے دیتی۔ اور چونکہ وہ اس بات پر مطلع نہ تھی کہ ولیم فریزر کو بگمان خود شمس الدین احمد سے یک گونہ رقابت ہے، لہٰذا وہ سمجھ رہی تھی کہ مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ولیم فریزر کے خلاف مزاج کوئی بات نہ کرے، کیونکہ ریاست کے بہتیرے کاموں میں نواب شمس الدین احمد کو ریزیڈنٹ کی مرضی کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ صاحب کلاں بہادر کو پوری عزت و اکرام کے ساتھ لے آؤ۔'' اس نے بزرگ لٹھیت سے کہا اور خود منھ دھونے اور کنگھی کرنے آبدار خانے میں چلی گئی۔ جانے کے پہلے اس نے وفادار سے کمرہ کھلوانے اور اس میں ہلکی سی خوشبو چھڑکنے کو کہا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں شمس الدین احمد اور بعد میں پنڈت نند کشور بٹھائے گئے تھے۔ دوسری اصیل مبارک قدم کو اس نے باورچی خانے بھیجا کہ پانوں کا خاصدان اور مٹھائیوں کی کشتی تیار رکھے اور چائے بنائے۔ آبدار خانے میں وزیر نے منھ پر دو چار چھینٹے ٹھنڈے پانی کے مارے لیکن لباس اور زیور سب وہی رکھا جو وہ صبح سے پہنے ہوئے تھی۔ صرف ڈوپٹہ اس نے بدل کر آسمانی جالی کا چھ گزا ڈوپٹہ اوڑھ لیا جس میں سنہرے تارے ٹکے ہوئے تھے۔

جب وہ آبدار خانے سے باہر آئی تو مبارک قدم خاصدان لئے ہوئے تیار تھی۔ وفادار نے صدر دروازے پر فریزر کا استقبال کر کے اسے کمرے میں بٹھا دیا تھا اور خود مگس رانی کر رہی تھی۔ کمرے کی آرائش اور ساز و سامان، شیشہ آلات اور فرش فروش کی سلیقہ مندی، خوش ذوقی اور سادگی دیکھ کر فریزر کچھ متعجب ہو رہا تھا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہندوستانی عورتیں اپنا گھر ٹھیک سے نہیں رکھتیں۔ یہ مارسٹن بلیک کی صحبت کا اثر ہوگا، اس نے دل میں کہا۔ اسے یہ بھی تعجب ہوا کہ وزیر اس کے خیال میں فی الحقیقت ایک ''ناچ گرل'' (Nautch Girl) ہی تھی، لیکن اب تک اس کے گھر میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تھی جسے عموماً ناچ گرل کے ساتھ منسوب کیا جاتا تھا۔ وہاں نہ سازندے تھے، نہ سپر دائی نہ سپردے، نہ تانپورہ اور ستار، نہ سارنگی نہ طاؤس، نہ پکھاوج نہ طبلہ، نہ کوئی اور لڑکی یا عورت جسے معاملات رقص و غنا سے منسلک سمجھ سکتے ہوں، نہ بھونڈے شوخ رنگوں میں سجائے ہوئے حجرے تھے جن کی سجاوٹوں میں شہوانی اشارے جھلکتے ہوں۔ ہزار فراست کے باوجود فریزر یہاں بھی مات کھا گیا اور اس بات کی تہ کو نہ پہنچا کہ وزیر کوئی ناچ

گرل نہیں ہے، بلکہ وہ خود کو عزت دار اگر چہ آزادہ منش بیگم سمجھتی ہے۔

وزیر نے مبارک قدم کو خاص دان لے کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے میں اس وقت داخل ہوئی جب مبارک قدم نے خاصدان کو ایک چھوٹی سی تپائی پر فریزر کے سامنے رکھ دیا اور سلام کر کے پیچھے ہٹ گئی۔ وزیر نے اندر آ کر ایک فرشی سلام کیا اور چہرے پر مسرت کا مصنوعی انداز لا کر بولی:

''کنیز تسلیمات عرض کرتی ہے۔ زہے نصیب کہ میرے غریب خانے کی چوکھٹ نے صاحب کلاں بہادر کے قدم چومے۔''

وزیر کے لہجے میں تھوڑا تملق ضرور تھا لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کی مرعوبیت کا نشان نہ تھا۔ فریزر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ایک لمحے کے لئے گڑبڑا ہی تو گیا، کہ اس کے تخیل میں جو صورت اور جو پھبن چھوٹی بیگم کی تھی وہ اس وقت اس سے بھی کچھ فزوں نظر آ رہی تھی۔ ڈوپٹے سے اس کا بدن ڈھکا ہوا تھا لیکن پھر بھی لگتا تھا کہ نسائی نزاکت اور کشش چراغ کی لو کے مانند اس کے اندر ضوفگن ہے۔

''چھوٹی بیگم۔ ہم خود تم سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ اس دن ہمارے یہاں تم نے بڑا اچھا اثر چھوڑا تھا۔'' فریزر کا ہندی لہجہ عام طور پر خاصا شستہ تھا۔ لیکن اس وقت شاید رعب حسن سے، یا مربیانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش میں انگریزیت زدہ ہو گیا تھا۔

وزیر کمرے کے اندر آ کر فریزر کے سامنے لیکن کچھ دور پر دوزانو ہو کر بیٹھنا چاہتی تھی کہ فریزر نے نیم قد اٹھ کر ہاتھ بڑھایا اور چاہتا تھا کہ وزیر کا بازو پکڑ کر اسے اپنی بغل میں بٹھا لے، لیکن وزیر بظاہر کسی کوشش کے بغیر مگر دراصل پھرتی سے پیچھے ہٹ کر مناسب دوری پر بیٹھ گئی۔ فریزر کی حرکت اسے بری تو بہت لگی لیکن اس وقت اس نے پھر مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس طرف بالکل متوجہ نہ ہو۔ اس اثنا میں چائے اور مٹھائیوں کی کشتیاں آ گئیں۔ اہل ہند میں چائے ابھی بہت مقبول نہ ہوئی تھی لیکن نامانوس بھی نہ تھی۔ فرنگی مزاج رکھنے والے ہندوستانیوں، خاص کر وہ جو کرسٹان ہو گئے تھے یا وہ جن کے والدین میں کوئی ایک ہندی نژاد تھا، ان کے یہاں چائے کا چلن بڑھتا جاتا تھا۔ ہندوستانی عموماً چائے میں بہت ساری بالائی اور شکر ملاتے تھے، اور بعض تو زعفران بھی تھوڑی سی گھس کر ملا دیتے تھے، لیکن انگریزوں کے یہاں چائے بغیر دودھ شکر پیالیوں میں ڈال کر لائی جاتی تھی۔ کوئی کوئی انگریز چائے کے ساتھ صرف دودھ یا صرف شکر استعمال کر لیتا، ورنہ انگریزی چائے بالکل سادہ ہوتی تھی۔ فریزر کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چھوٹی بیگم کے یہاں چائے بطرز انگریزی تھی۔

وزیر کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ فریزر سے کیا بات کرے، اور نہ ہی فریزر کے آنے کی علت غائی اس کی سمجھ میں آسکی تھی۔ اتنا تو وہ بھی دیکھ رہی تھی کہ فریزر اس کے یہاں اس غلط فہمی کی بنا پر آیا ہے کہ چھوٹی بیگم ایک طرح کی ناچ گرل ہی ہے، چاہے عام سطح سے کچھ نکلتی ہوئی کیوں نہ ہو۔ یہ بات واضح تھی کہ یہاں آکر فریزر کو مایوسی اور شاید دل میں کچھ شرمندگی بھی حاصل ہوگی۔ ظاہر ہے کہ وزیر کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ فریزر کے دل میں رقابت، اور اس سے بھی زیادہ مجروح انانیت کی لو دھواں دیتی ہوئی اور بھڑکتی ہوئی اس کے پورے تشخص کو سیاہ فام کر چکی ہے۔

''چھوٹی بیگم، چائے کا انتظام تو آپ نے خوب ہی کیا۔'' وزیر کی خاموشی دیکھ کر مجبوراً فریزر نے مہرِ سکوت توڑی۔

''سرکار کی قدر افزائی ہے،'' وزیر نے خفیف سے تبسم کے ساتھ کہا۔ ''لیکن...''

وہ کہنا چاہتی تھی کہ لیکن آپ یہاں چائے کا لطف اٹھانے تو تشریف لائے نہیں ہیں، لیکن اس نے زبان کو بر وقت تھام لیا۔ براہِ راست کسی موضوع پر آجانا، یا کوئی سوال ایسا پوچھ لینا جس میں یہ مضمون پنہاں ہو کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے، انگریزی تہذیب میں معیوب نہ تھا لیکن ہندیوں کے یہاں بہت معیوب بلکہ مہمان کی سخت توہین تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہ تو وزیر پر بھی عیاں تھا کہ جس مقصد کو نظر میں رکھ کر صاحب کلاں بہادر اس کے یہاں آئے ہیں اسے وہ خود ہی بیان کریں گے کیونکہ میل جول کا ضابطہ یہ تھا کہ پہل مرد کی طرف سے ہو۔ لیکن اسے تشویش یہ تھی کہ اگر صاحب بہادر نے سوال کر لیا تو میرا جواب کیا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ سلسلۂ گفتگو میرے ہاتھ میں رہے گا تو میں شاید اسے کم ضرر رساں سمتوں میں موڑ سکوں گی۔

لیکن فریزر کے لئے لفظ ''لیکن'' کے بعد وزیر کا ٹھہر جانا بہت تھا۔ وہ فوراً بولا:

''لیکن کیا؟ میرا آنا آپ کو اچھا نہیں لگا کیا؟ مجھے تو آپ سے ملنے بات کرنے، اور آپ کی مقاربت کا بہت اشتیاق تھا اور ہے۔''

ممکن تھا کہ فریزر نے لفظ ''مقاربت'' کو اس کے اصل عربی مفہوم میں استعمال کیا ہو (''آپ سے مقاربت'' نہ کہہ کر ''آپ کی مقاربت'' کہنے سے تو یہی متبادر ہوتا تھا،) اور وہ اس کے اردو معنی سے واقف نہ رہا ہو، لیکن پھر بھی وزیر اتنی سادہ نہ تھی جو ''بات کرنا'' اور ''مقاربت'' جیسے الفاظ کو خالی از علت قرار دیتی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ یہ اشارے کدھر لے جانے والے ہیں۔ اس کے دل میں اچانک

غصے اور جھلاہٹ کا ایک شعلۂ جوالہ سا جوش مارنے لگا۔ اس غصے میں اپنی بے چارگی پر رنج بھی شاید شامل تھا۔ کون ہوتا ہے یہ مرنے جوگا منحوس صورت انگریز مجھ سے ایسی توقعات رکھنے والا، کیا اس نے مجھے قرض خواہ یا دبیل ٹھہرایا ہے؟ اور یہ کون سی شرافت ہے کہ کوئی بھی نتھو خیرو کسی عورت پر کچھ بھی دعویٰ رکھ دے اور عورت کو چوں کرنے کی اجازت نہ ہو۔ کیا عورتیں کوئی بھیڑ بکری ہیں کہ جہاں چاہا ہانک کر لے گئے؟

اس نے کہاں تو سر جھکا رکھا تھا اور کہاں سر اٹھا کر فریزر سے آنکھیں چار کیں، دوزانو ہی رہی لیکن تن کر بیٹھی اور سرد اور مضبوط لیجے لیکن متوسط آواز میں بولی:

''نواب ریزیڈنٹ بہادر، وہ راگ نہ چھیڑیں جن کے ساز آپ کے پاس نہ ہوں۔''

وزیر کی بات کا رمز فریزر پر فوراً آشکار نہ ہو سکا۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وزیر کے معنی اس پر یوں منکشف ہوئے جیسے کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لئے ہونٹ بھینچ لئے، پھر بولا:

''یہ بلند خیالیاں خوب سہی لیکن ہمیں پر کترنے اور بال و بازو باندھنے کے ہنر بھی آتے ہیں۔''

''ہم مرغان رشتہ بپا کو اڑنے سے کوئی غرض نہیں نواب ریزیڈنٹ بہادر، لیکن ہم ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد کے قائل ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو چپ رہی۔ ''آپ شاید اپنی قدر شناسی سے منکر و منحرف ہونے کے دعوے دار ہیں؟''

یہ بیان بھی فریزر کے لئے ذرا حل طلب نکلا۔ مجبوراً اسے پھر کچھ سوچ کر جواب دینا پڑا، اور اس توقف نے بھی اسے شرمندگی اور خفگی کے احساس سے دوچار کیا۔ لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ اس وقت برہمی کا عریاں اظہار اس کی ساکھ کو اور بھی کم کر دے گا۔ اسے بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت تھی۔

''ہم تمھاری تو قدر کرتے ہیں چھوٹی بیگم۔ لیکن شاید تم گوہر شناس نہیں۔''

''ہم کہاں کے جوہری اور کہاں کے شاہ، نواب ریزیڈنٹ صاحب کی توقعات ہم غریب غربا سے پوری نہ ہوں گی۔''

''میں توقع نہیں رکھتا۔'' فریزر نے میڑھی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں ارادے اور نتیجے کی وحدت کا قائل ہوں۔''

وزیر تھوڑا سا پیچھے کھسکی، گویا اٹھنا چاہتی تھی لیکن فوراً ہی ارادہ بدل دیا ہو، اور بولی:

''جی، تو آپ وحدت کے اس قدر قائل ہیں تو آئینے میں منھ بھی نہ دیکھتے ہوں گے۔ دیکھ لیتے تو بہتر تھا۔''

فریزر نے اپنے خیال میں بڑی گہری اور باوزن بات کہی تھی۔ لیکن اسے وزیر جیسی لڑکی سے سابقہ کب پڑا تھا اور نہ اس نے کوئی ہندوستانی لڑکی ایسی دیکھی تھی جو اس قدر نازک طبع ہو اور جس کا مزاج کسی انگریز کے روبرو بھی پل بھر میں برہم ہو سکتا ہو۔ وزیر کا جواب سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ہندوستانی تہذیب اور نفاست اور کنایاتی بیان کا ملمع ایک دم میں یوں اڑ گیا گویا اس پر تیزاب پڑ گیا ہو۔ اس نے خاصدان کی تپائی پر ہاتھ مار کر خاصدان اور تپائی دونوں الٹ دیے اور اکڑ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے سپاہیوں کی پریڈ دیکھ رہا ہو۔

''چھوٹی بیگم یہ سودا تمھیں مہنگا پڑے گا۔''

''میرا آپ کا کوئی سودا نہیں۔ اور میں وارے کا سودا بھی نہیں ڈھونڈتی۔ میں تو عیار طبع خریدار دیکھتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وزیر بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی:

''دروازہ ادھر کی جانب ہے صاحب کلاں بہادر۔''

پھر اس نے فریزر کو جھک کر سلام کیا اور ایک انداز نخوت و حقارت سے مسکرائی۔ فریزر کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ وہ خاموش رہا لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ اس نے غصے میں دانت بھینچ لیے تھے اور اس کے رخسار کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ ادھر مبارک قدم نے یہ دیکھ کر کہ رنگ محفل دگرگوں ہے، باہر جا کر اشارہ کر کے بزرگ لٹھیت اور اس کے ایک نوجوان ساتھی کو آگے بلوا لیا تھا اور اس وقت وہ دونوں وزیر کی ڈیوڑھی کے اندر آکر مستعد کھڑے تھے کہ بلاوا ہو یا ضرورت پڑے تو فوراً اندر پہنچ جائیں۔ فریزر کے عملے کو دوسرے دو محافظوں نے باتوں میں لگا کر پھاٹک ہی پر روک لیا تھا۔ وزیر نے انتہائی توہین کے انداز میں فریزر کو راستہ بتایا تھا اور فریزر کا بس نہ چلتا تھا کہ اپنی بوٹیاں نوچ لے یا خود وزیر کے گھر میں کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے۔ گذشتہ چند لمحوں کے دوران گھر کے اندر مدارات و تواضع کا درجۂ حرارت گھٹ کر نقطۂ انجماد تک پہنچ گیا تھا۔ وفادار نے بادزنی بند کر دی تھی اور وزیر کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے کسی حکم کی متوقع ہو۔ فریزر کے تہدیدی جملے اور اس کے جواب میں وزیر کے سخت تحقیری جواب نے ماحول کو بوجھل کر دیا تھا۔ فریزر دو قدم آگے بڑھ کر لب فرش ٹھہر گیا۔ اتنا سب کچھ

ہوتے ہوئے بھی اسے امید تھی کہ کوئی اصیل دوڑ کر اسے جوتیاں پہنائے گی۔ لیکن کسی کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ مبارک قدم نے الٹے ہوئے خاصدان اور تپائی اور چائے وغیرہ کی کشتیاں وہیں چھوڑ کر ڈیوڑھی کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول دیا تھا۔ دو لٹھیت مستعد عمل کھڑے صاف نظر آرہے تھے اور مبارک قدم کا رخ ان کی طرف تھا، گویا اسے اس بات کی خبر ہی نہ ہو کہ ولیم فریزر بہادر اب رخصت ہوا چاہتے ہیں۔

بدرجۂ مجبوری فریزر نے جوتیاں خود پہنیں۔ کمرے میں کوئی کرسی یا چوکی تو تھی نہیں، اس لئے وہ یا تو فرش پر اکڑو بیٹھ کر جوتیاں پہنتا اور ہمیشہ کے لئے تضحیک کا مورد بنتا، یا پھر کسی نہ کسی طرح جوتوں میں پاؤں اڑا کر تقریباً لنگڑاتا ہوا باہر نکلتا۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ اس نے چمکیلے سیاہ چمڑے کے بے تسمہ والے ہلکے جوتے پہن رکھے تھے جنھیں اصطلاح میں Pump کہا جاتا تھا۔ ذرا سی کوشش سے اس کے پاؤں جوتوں میں آگئے اور وہ دل ہی دل میں بھنتا جلتا ہوا، لیکن خدا کا شکر بھی ادا کرتا ہوا وزیر کے گھر سے بخیر و خوبی نکل آیا۔

فریزر کا جلوس ابھی گلی سے باہر نکلا ہی نکلا تھا کہ وزیر نے بزرگ لٹھیت کو، جس کا نام امیر غلام خاں تھا، بلوا کر اسے حکم کہلایا کہ ابھی اسی وقت تیز قدم جا کر نواب صاحب سے التماس کرو کہ بے توقف یہاں آجائیں یا پھر ہمارے لئے سواری بھیجیں اور اذن باریابی دیں کہ ہم حاضر ہو سکیں۔ نواب کے پہرے دار آج ہی صبح تعینات ہوئے تھے، اس لئے وزیر کو ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ کس بنا پر یہاں بھیجے گئے ہیں۔ لیکن فریزر کی غیر متوقع آمد اور اس کے غیر دوستانہ بلکہ غیر شریفانہ برتاؤ کے بارے میں نواب کو جلد از جلد بتانا بھی اشد ضروری تھا۔ وہ بڑی بیتابی سے نواب شمس الدین احمد کے جواب کا انتظار کرتی رہی اور دعا کرتی رہی کہ وہ خود تشریف لے آویں اور اس کے دل کو ڈھارس بندھاویں۔ اسے فریزر کی طرف سے کوئی خطرہ یا بے اطمینانی تو اب بھی نہ تھی، لیکن تھوڑی بہت الجھن اور دل ہی دل میں، اگرچہ بالکل بے وجہ، شرمندگی بھی اسے تھی کہ فریزر نے اسے بازاری یا خانگی قسم کی عورت ٹھہرایا تھا۔ فریزر کی اس غلط اندیشی اور جرأت کا ماجرا نواب سے بیان کرنا ضروری تو تھا ہی، لیکن اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس واقعے کی بنا پر شمس الدین احمد کہیں میرے بارے میں ناموافق رائے نہ قائم کریں، اور اس سے زیادہ گھبراہٹ اس بات کی تھی کہ شمس الدین احمد خفا ہو کر میرے خلاف گرم کیں نہ ہو جائیں اور پھر مجھ سے کنارہ ہی نہ کر لیں۔

امیر غلام لٹھیت کے جانے کے بعد بھی وزیر بے حد خلفشار میں رہی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ آتا بھی نہ تھا کہ میں مزید کیا کروں، کس سے بات کر کے اپنا دل ہلکا کروں۔ فریزر کا یہاں آنا موجب

رسوائی ہوسکتا تھا، مگر کیوں؟ میں نے تو اپنی کسی بت سے ذرا بھی اشارہ کسی کو بھی نہ دیا تھا کہ میں کوئی ایسی ویسی عورت ہوں۔ لیکن لوگوں کا کیا ہے۔ انھیں رائی کا پربت بنانے اور اچھے کو برا ثابت کرنے میں کچھ شرم نہیں آتی۔ اس کا جی چاہا، منجھلی کو بھی بلوا بھیجئے، یا اس کے یہاں چلی جایئے۔ لیکن بلوا بھیجنے میں قباحت تھی کہ ایک اصیل، یا ایک پہرے دار اور کم کرنا پڑتا اور اس وقت اسے یہ گوارا نہ تھا۔ کچھ خوف نہ سہی، لیکن ایک طرح کی بے اطمینانی اور ہراس ضرور اسے تھا۔ اور اس کا جی تو چاہتا تھا کہ صدر دروازے کو مضبوط تیغا کرادے اور خود اندر جا کر سب سے کونے والے حجرے میں خود کو بند کر لے۔ ایسی صورت حال میں اسے یہ پسند تھا کہ مانوس، یا اگر مانوس نہیں تو معتبر چہرے اس کے چاروں طرف فوری طور پر موجود رہیں۔ اور منجھلی کے یہاں خود چلے جانے میں قباحت یہ تھی اس درمیان نواب شمس الدین احمد آگئے تو آشفتہ ہوں گے اور دل میں کہیں گے کہ وزیر نے مجھے ناحق ہی اتنی جلدی کر کے بلایا۔ والدہ یا بڑی بہن سے مشورہ کرنے کا تو خیر کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ ان سب باتوں کو سوچ کر اس نے دل میں کہا کہ نواب شمس الدین احمد سے بات ہو جانے کے بعد میں منجھلی باجی کے وہاں جانے کے بارے میں کچھ خیال کروں گی۔

شام تو ہو ہی چکی تھی، تھوڑی دیر میں اندھیرا اچھی طرح پھیل گیا۔ آنگن میں وزیر کی پالتو چڑیاں غروب آفتاب کے وقت کا گانا بند کر چکی تھیں۔ آنگن میں پیلی چنبیلی کی دونوں جھاڑیوں اور انار کے پیڑ پر پودنے، پدڑیاں، اور گوریاں اپنا سیر و سفر اور گانا ختم کر کے بسیرا لینے کو آگئی تھیں۔ سرکی والان کی گلی میں اور اس کے باہر چتلی قبر کے بازار میں روشنیوں کی چمک، راہگیروں، دوکانوں پر خرید و فروخت کرنے والوں، کٹورا بجانے والے سقوں، شام کے خوانچہ فروشوں کی قطاروں، کوچہ چیلاں اور بازار سیتارام کے کرخنداروں اور بے فکروں کے ہجوم نے تیوہار کی طرح کا سماں پیدا کر دیا تھا لیکن وزیر کا دل ہر گذرتے ہوئے پل کے ساتھ بھاری ہوتا چلا جاتا تھا۔ وقت درحقیقت بہت نہ گذرا تھا لیکن الانتظار اشد من الموت والی بات تھی۔

آخر کار امیر غلام لٹھیت واپس لوٹا۔ لیکن اس کی خبر بہت دلخوش کن نہ تھی۔ نواب صاحب بلی ماراں کی حویلی میں رونق افروز تھے نہ دریا گنج میں۔ وہ ظہر بعد قطب صاحب کی درگاہ پر برائے زیارت تشریف لے گئے تھے اور خواجہ صاحب ہی میں شب باشی کا ارادہ رکھتے تھے۔ امیر غلام خان نے دونوں حویلیوں کے مردھوں کو خوب اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا کہ نواب جیسے ہی خواجہ صاحب سے پھریں، انھیں خانم صاحب کے حالات اور پیغام کی خبر کر دی جائے۔ وزیر کی الجھن اور بڑھی لیکن اس وقت صبر کے سوا

چارہ نہ تھا۔ منجھلی کے وہاں جانے کا بھی وقت اب نہ رہ گیا تھا۔ اس نے امیر غلام کو ہدایت کی کہ آپ چاروں پہرے دار پوری رات جاگیں اور کسی بھی مشکوک آدمی کو گلی کے پھاٹک میں دھنسنے نہ دیں۔

وزیر نے وہ رات کسی دشت میں راہ گم کردہ مسافر کی طرح بڑھتے ہوئے تفکر اور تردد کے باعث تقریباً نیم مردنی کے عالم میں گذاری لیکن اگلے دن کا سورج اس کے لئے کئی مبارک و مسعود باتیں لے کر طلوع ہوا۔ ابھی مسجدوں میں چاشت کی نماز ادا کرنے والوں نے سلام بھی نہ پھیرا تھا کہ نواب شمس الدین احمد گھوڑا اکڑ کڑاتے ہوئے سرکی والان کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ سب سے آگے چار زنگی قلماقنیاں تھیں، بالا قد کسرتی جسموں والی سیاہ فام، سیاہ دیوہیکل عربی گھوڑوں پر سوار، نیزہ ہاتھ میں سونتے ہوئے، کمر میں دونوں جانب طمنچے آویزاں، سر پر راجستھانی چنری کی دستار جس پر سرپیچ اور جنگلی مرغ کے سرخ وسیاہ پروں کا طرہ، سامنے کمر میں مرصع ڈاب جس میں تیغ ہندی کا طلائی آہنی قبضہ جھمک رہا تھا۔ تنے ہوئے بلند سینے، کمر تنگ اور کولھے بھاری لیکن سڈول اور چست، اونچی گردن اور جامنی چہرے سے خون کی گلابی جھلک، جیسے بادل کو چیرتی ہوئی سورج کی کرنیں، چہروں پر شجاعت کا رعب و داب، لگتا تھا ایک ایک قلماقنی سو نہیں تو پچاس تلنگوں یا بکسریوں پر ضرور بھاری ہوگی۔ ان کے پیچھے دو مرد شہسوار، قرابینیں تانے ہوئے دلکی چال چلتے ہوئے، لیکن اس طرح کہ نواب کے گھوڑے سے ذرا ہی آگے رہیں، کہ نواب کی سواری کو یمین و یسار دونوں طرف سے تحفظ ملتا رہے۔ نواب کے پیچھے ایک ہاتھی جس پر دو برقنداز جن کی بندوقوں کے دہانے دائیں اور بائیں تنے ہوئے تھے۔ ہاتھی کے پیچھے ایک مرصع پالکی تھی، اس کے ساتھ دو عصا بردار لوگوں کے درمیان ہٹو بچو، صاحب! ہٹو بڑھو، صاحب! شور بلند کرتے ہوئے تیز تیز چل رہے تھے۔

سرکی والان کی گلی میں کوکبۂ نوابی کیا داخل ہوا، سارا راستہ قرق ہو گیا۔ ہر چند کہ اہل محلّہ کو نواب کی سواری سے کوئی خطرہ نہ تھا، اور انھیں یہ بھی خوب معلوم تھا کہ نواب کی اس وقت آمد کس باعث ہے، لیکن جلوس سواری کا رعب اس قدر تھا کہ راہ چلتے رک کر دوکانوں کے تختوں کے پیچھے دبک جانے اور صبح کے حمال اور مزدور کونے کھدرے میں گوشہ گیری ہی میں عافیت جانتے تھے۔ بازار کھلنا شروع ہو گیا تھا، لیکن ابھی پھیری والے اور صبح کی اشیا مثلاً مکھن، پنیر، ملائی، دودھ، نمشک، ناشتے کے پراٹھے اور کباب، بیچنے والے زیادہ تعداد میں تھے۔ یہ سب آواز لگانا بھول کر اپنی اپنی جگہ چپ ٹھہر گئے۔ مستقل دوکانداروں نے اپنی دوکانوں پر کام کرنے والے لونڈوں کو ہدایت اور سرزنش بند کر دی اور جھاڑ پونچھ اور

آراستگی دوکان کے بغیر ہی اپنے ٹھڑوں پر جم گئے۔ نواب کا جلوس گویا چشم زدن میں گذر کر اپنی اپنی جگہ متمکن ہوگیا اور شمس الدین احمد گھوڑے سے اترے اور بلا توقف وزیر کی دہلیز کے پار ہو گئے۔ دروازہ اندر سے بند کرلیا گیا۔

وزیر کہاں تو دل وجان سے نواب کی منتظر تھی، کہاں اب ان کے اندر آجانے کی خبر پا کر از سرتا پا لرزش کا شکار ہوگئی۔ کس طرح ان کے سامنے جاؤں، کیا کہوں؟ کہیں انھیں کل کے واقعات پر مجھ سے کچھ آزردگی نہ ہو۔ قصور میرا نہ سہی، لیکن یہ کیا کم تھا کہ ایک غیر مرد اور وہ بھی مردار انگریز میری ڈیوڑھی کے اندر آگیا۔ عورت ذات ہی کو سب برا کہتے ہیں، اور یہاں تو میں اپنے تئیں خود ہی مجرم مقرر کیے بیٹھی ہوں۔ اے ہے توبہ میں کوئی کوتوال تھوڑی ہوں کہ کسی کے آنے جانے پر روک لگادوں۔ لیکن انصاف دنیا میں کہاں ہے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ سچ کی قدر کون کرتا ہے۔ خدا لگتی کوئی نہیں کہتا منھ دیکھی سب کہتے ہیں۔ دبے پر تو چیونٹی بھی کاٹ کھاتی ہے پر نہ عورت ذات میں ہمت نہ اس کی کوئی عزت...

نواب شمس الدین اسی حجرے میں فروکش ہوئے جس میں گذشتہ بار وزیر سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ مبارک قدم پیچھے کھڑی پنکھا جھل رہی تھی۔ وفادار نے جلد جلد پان لگا کر پیش کیے اور یہ کہہ کر دروازے سے لگ کر کھڑی ہوگئی کہ خانم صاحب بس تشریف لاویں ہی لاویں ہیں۔ وہ تو کل رات ہی سے سرکار عالی کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

شمس الدین احمد کے دل کو الجھن ہو رہی تھی، آخر وزیر خانم سامنے کیوں نہیں آرہیں؟ کیا ہم سے کچھ آزردہ ہیں یا طبیعت کچھ ماندی ہے۔ لیکن لونڈی باندیوں نے ان کی طبیعت کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں۔ جب وفادار نے کہہ ہی دیا ہے کہ ابھی تشریف لاتی ہیں تو مزید کچھ پوچھنا بے لحاظی ہوگی۔ لیکن یہ فاصلے کیوں ہیں؟ شمس الدین احمد کو یقین سا ہوگیا کہ کل شام کے واقعات نے وزیر خانم کا مزاج کچھ برہم کر دیا ہے۔ مجھے چل کر انھیں منانا چاہیے۔ خواہی یہ بات مناسب ہو خواہی مناسب نہ ہو، لیکن یہاں تنہا بیٹھے رہنے کا کچھ مطلب نہیں۔

''بھئی واللہ خانم اگر تشریف نہیں لا رہی ہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم سے روٹھ گئی ہیں تو ہم چل کر منائے لیتے ہیں۔'' شمس الدین احمد یہ کہتے ہوئے اٹھے، مبارک قدم نے دوڑ کر جوتیاں پہنائیں اور ''تشریف لائیں سرکار''، کہہ کر ان کے آگے ہوئی اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ادھر سے قدم رنجہ فرمائیں۔ وفادار بھاگ کر خانم کے حجرے میں گئی اور بولی، ''خانم جی وہ...وہ...نواب صاحب ادھر آپ

کے حجرے میں...''

وزیر جو تکیے میں منھ دیے پڑی تھی، ہڑ بڑا کر اٹھی۔ ہائے اللہ غضب ہوگیا۔ اس نے دل میں کہا۔ مجھے اس حال میں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟ میں یوں ہی منھ تھتھائے سر بکھیرے پڑی ہوں، نہ کنگھی کی ہے نہ منھ دھویا ہے نہ دانت مانجھے ہیں۔ اس نے جلدی سے پاندان کھول کر دو الائچیاں منھ میں ڈالیں اور انھیں خوب زور سے چبالیا کہ منھ صاف ہو جائے۔ پھر اس نے عطردان سے ذرا سا عطر گلاب لے کر ہنسلی پر مل لیا اور تھوڑا سا اپنے ڈوپٹے پر لگا ہی رہی تھی کہ وفادار کی آواز آئی:

''حضور سرکار عالی جاہ تشریف لاتے ہیں۔''

وزیر پلنگ سے اتر کر جوتیاں پہنے بغیر دروازے پر آ گئی۔ اتنی دیر میں نواب بھی آنگن پار کر کے دالان میں پاؤں دھر چکے تھے۔ وزیر ڈوپٹہ سنبھالتی باہر آئی لیکن اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ کچھ گھبراہٹ، کچھ شرمندگی، کچھ خوف، اور ان سب کے اوپر خوشی کی ایک موج تھی کہ اس کے بدن کا توازن متلاطم کیے دیتی تھی۔ دالان کے وسط میں دونوں کا سامنا ہوا۔ شمس الدین احمد ایک متین سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھے تھے کہ وزیر نے لرزتے قدم بڑھا کر ان کا دامن تھام لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی:

''بندی تسلیمات عرض کرتی ہے... سرکار آپ نے بڑی...'' اتنا کہتے کہتے اس کی سسکی چھوٹ گئی۔ شمس الدین احمد سمجھے کہ وزیر کو میرے دیر سے آنے پر شکوہ ہے اور وہ ''آپ نے بڑی دیر کر دی'' کہنا چاہتی تھی۔ شمس الدین نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا اور اسے آہستہ سے اپنی طرف کھینچ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بے حد ملاطفت سے کہا:

''نہیں۔ دیر تو ایسی نہیں ہوئی۔ میں تو سنتے ہی بھاگا بھاگا آیا ہوں۔'' ان کے لہجے میں دلی کی کھڑی بولی پر راجستھانی برج کا لوچ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔

وزیر کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''سرکار پرواری جاؤں۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ نے دیر کی۔''

دونوں چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہوئے وزیر کے حجرے میں داخل ہو گئے۔ شمس الدین احمد نے پردہ برابر کرتے کرتے وزیر کے منھ اور آنکھوں پر کئی بوسے دیے اور کہا۔

''اچھا اب شکوہ شکایت برطرف۔ یہ بتائیے آپ ہم سے ملنے کیوں نہیں آ رہی تھیں۔'' وہ ہلکی

سی ہنسی ہنسے۔ ''کیا ہمیں یہاں بلوانا منظور تھا؟''

وزیر کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں جھکا کر اس نے نواب کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''مجھے سرکار سے شرمندگی ہے۔''

''شرمندگی؟ شرمندگی کاہے کی بھئی واللہ۔ افسوس کی بات ضرور ہے اور افسوس کا محل ہمارے لئے ہے کہ ہم یہاں نہ تھے اور آپ کو اتنی تصدیع اٹھانی پڑی۔''

''ایک بے حیا لچا غیر مرَد میرے گھر میں یوں آجائے اور میں اسے جوتیاں مار کر نکال نہ سکوں... میں تو عرق عرق ہو رہی تھی کہ سرکار میرے بارے میں کیا خیال فرمائیں گے۔ کہیں مجھے بھی ان حرافہ مال زادیوں میں نہ سمجھ لیں۔''

وزیر یوں تو کچھ ذرا سی متبسم تھی لیکن اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور بالکل قریب تھا کہ وہ زار و قطار رونا شروع کر دے۔

''اجی وزیر خانم، بھئی واللہ جہاں تک ہمیں بتایا گیا آپ نے اس ولد الزنا کے جوتیاں تو نہ لگائیں لیکن سلوک اس سے کچھ بدتر ہی کیا۔ اب اسے معلوم ہو گیا ہو گا کہ پرائی بی بیوں پر یوں دیدہ درائی نہیں کرتے اور نہ ان کے گھر پر دکنی کسبی سپاہیوں کی طرح چڑھے آتے ہیں۔''

شمس الدین احمد نے کلمے کی انگلی سے وزیر کی ٹھوڑی اٹھا کر مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر اسی انگلی سے اس کے دائیں رخسار پر ہلکے سے چٹکنا دیا۔

''لے اب تو راضی ہو جئے، ہنسئے، بولئے۔ آپ کو ڈر کاہے کا۔ فریزر کو میں چچا کہتا تھا۔ آج سے سب رشتے کالعدم۔ ایک دن اسے بھی ان رشتوں کی طرح زمین میں گاڑ دوں گا۔''

''نہیں ایسا نہ کہیئے۔ آپ کے والد حضور اسے دوست گنتے تھے۔ آپ طرح دے جایئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ مجھے ڈر تھا تو یہی کہ آپ مجھ بندی پر بے دماغ نہ ہوں۔''

''بھئی واللہ۔ اس بندی نے کون سی خطا کی جس کے لئے وہ آپ کو سرچنگ کی سزاوار سمجھے۔ رہے فریزر صاحب، تو ان سے رشتہ تھا، قرابت داری تو نہ تھی۔ وہ نبھاتے تو رشتہ نبھایا جاتا۔''

وزیر چپ رہی تو نواب نے اس کے شانے پر شفقت اور محبت سے ہاتھ رکھا اور بولے:

''خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ لگتا ہے آپ رات بھر سوئی نہیں ہیں۔ چلئے، ہنسی خوشی اٹھئے،

لباس تبدیل کرنا ہو لباس تبدیل کیجئے ورنہ یوں ہی باہر آ کر پاس ہمارے بیٹھئے۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کہنی ہیں۔'' نواب یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وزیر کے چہرے پر اس وقت وہ بہار تھی اور بے خوابی اور اشک افشانی کے باعث اس کی آنکھوں میں ایسے پیارے پیارے گلابی ڈورے تھے کہ دل سے بے ساختہ آہ اور پھر دعا نکلتی تھی، اگرچہ یہ دعا غلط بات کے لئے ہوتی، کہ یا اللہ ہمیشہ یہ آنکھیں یوں ہی بھری گلابیوں کی طرح رہیں۔ جی تو نواب کا چاہتا تھا کہ وزیر کو آغوش میں بھر کر دروازہ بند کر لوں، لیکن ایسی خلاف تہذیب بات ان سے سرزد ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا اگر وزیر کے دل میں ان کی عزت کم ہو جاتی۔

'' اللہ نواب صاحب آپ مجھے کہیں کی خیلا گردانتے ہوں گے کہ اس طرح سر جھاڑ منہ پہاڑ آپ کا سامنا کر بیٹھی۔'' وزیر نے ڈوپٹہ برابر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

'' نہیں نہیں۔ یہ جلوہ گری تو مانی و بہزاد کو بھی فریفتہ کر لیتی۔'' نواب نے وزیر کے ڈھلکے ہوئے آنچل اور کرتۂ شب خوابی کے ڈھیلے گریبان پر لگاوٹ سے بھری ہوئی، لیکن غلط انداز سی نگاہ ڈالی۔'' معلوم ہوتا ہے آپ کو آئینہ دیکھنے سے کوئی رغبت نہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے،

از فیض تنت جیب قبا آئینہ دار است

پیراہن از اندام تو لبریز بہار است''

وزیر نے شرما کر پلنگ سے دلائی کھینچ کر بدن پر جوں توں لپیٹ لی اور منہ پھیر کر بولی،'' بس رہنے دیجئے یہ شعر و شاعری کی باتیں۔''

'' بی بی۔ بجز تمھیں دیکھنے کے انسان تو انسان، پیڑ پودے کنکر پتھر بھی شاعر ہو جاویں،

ہر چہ می بینم از تو خالی نیست

سبزہ شوخ است و گل صفا دارد''

'' بارے اب میں آپ سی زبان اور آپ سی یادداشت کہاں سے لاؤں۔ اور اگر لاؤں بھی تو خجالت مجھے تاب لب کشائی بھلا کب دیوے۔''

وزیر کا جی چاہتا تھا کہ ایسی ہی چہلیں اور مزے مزے کی باتیں تا دیر ہوتی رہیں۔ لیکن اس کو یہ الجھن بھی تھی کہ نواب ہٹیں تو میں کنگھی چوٹی کر، ہاتھ منہ دھو، آدمی کی صورت بنا ان کے سامنے اطمینان سے بیٹھوں۔ نواب دروازے کے بازو کا سہارا لئے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے مبارک قدم چاندی

کی کشتی میں شربت اور حلوے کی قاب لئے ہوئے باورچی خانے سے نکلی اور وزیر کی نگاہ اس پر پڑی تو بات ختم کرنے کا بہانہ اسے ہاتھ آیا۔ اس نے مبارک قدم کی طرف دیکھ کر کہا:

''سرکار نے ابھی ناشتہ نہ کیا ہوگا۔ مبارک قدم آپ کی خدمت میں شربت اور حلوہ حاضر کرنے کو مضطرب ہے۔ اور جو کچھ جی چاہے بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔ چائے، قہوہ، کباب پراٹھے سب مہیا ہیں۔''

نواب نے ہنس کر کہا، ''بھئی واللہ یہاں آ کر اپنے تو بھاگ کھل گئے۔ لیکن بھوک بالکل بھاگ گئی۔ آپ اطمینان سے تیار ہو جئے۔ اتنے ہم شربت چکھیں گے، گلوریوں کا لطف اٹھائیں گے اور دیوان حافظ سے دل بہلائیں گے۔''

''بہت مناسب۔ بندی پل مارتے حاضر ہوتی ہے۔''

نواب نے دروازہ چھوڑ کر باہری حجروں کا رخ کیا اور مبارک قدم ان کے پیچھے پیچھے چلی تو ایک اور اصیل نے لپک کر باہری کمرے کا پردہ اٹھایا اور جب نواب اندر آئے تو پنکھا لے کر ان کی پشت پر کھڑی ہو گئی۔ وفادار نے وزیر کے حجرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور صندوق سے کپڑے نکال کر وزیر کی پسند معلوم کرنے لگی کہ آج کون سے لباس اور کون سے رنگ پہنے جائیں گے۔

وزیر نے منھ دھونے کپڑے بدلنے اور کنگھی چوٹی سے درست ہونے میں بمشکل آدھی پون گھڑی صرف کی لیکن جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو کچھ عجب نہیں کہ اسے دیکھ کر آنگن میں چہکتے ہوئے لالوں اور کوکو کرتی ہوئی قمریوں کے بھی دل سے صل علیٰ نکل گئی ہو۔ رات کی تکان اور ذہنی خلش کا اثر اس کے منھ پر اب بھی تھا اور اب بھی وہ ہلکی سی پژمردگی اس کے حسن کی نزاکت میں اضافہ کر رہی تھی۔ آنکھ سرمے سے اور ہونٹ سرخی سے عاری، گلے میں صرف ایک زیور، یعنی سونے کی زنجیر جس میں زبرجد کا بڑا سا آویزہ، کلائیوں میں سونے کے بتانے لیکن سادہ، ناک میں چنے کی دال کے برابر ہیرے کی کیل، کانوں میں ہلکے لیکن جڑاؤ گوشوارے، ہر چیز سے سادگی برس رہی تھی۔ یہی حال اس کے لباس کا تھا۔ سارا تاثر ایک گھریلو نوعمر لڑکی کا تھا جو اچانک بھرپور عورت بن گئی ہو اور جسے خود اس بات کا احساس ابھی پوری طرح نہ ہوا ہو۔ چھریرے بدن میں کہیں سے بھی وہ بھرت اور بھاری پن نہ تھا جو پورے شباب پر آئی ہوئی ایسی عورت کے ہر عضو سے ٹپکتا ہے جو ایک یا دو بچوں کی ماں بن چکی ہو۔ سڈول بدن کے سب خطوط اور قوسیں اپنی جگہ پر ٹھیک ٹھاک کھنچی ہوئی تھیں، لیکن نہ کولھے بہت نمایاں نہ سینہ سر اٹھا کر نظارگی کی دعوت دیتا

ہوا، لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کا جسم ان چیزوں کے ہونے پر دلالت نہ کر رہا ہو۔

وزیر کو دیکھ کر شمس الدین احمد حسب معمول ایک لمحے کے لئے سکتے میں آگیا۔ یہاں میرے آنے کا سبب کیا ہوا ہے اور مجھے وزیر خانم سے کیا کہنا ہے، یہ سب بھول کر وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وزیر نے اندر آکر جھک کر ایک سلام کیا اور حسب سابق نواب کے سامنے ذرا ہٹ کر دائیں طرف دوزانو بیٹھ گئی۔ شمس الدین احمد کا تنفس تھوڑا سا تیز ہونے لگا، اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر وزیر کو اپنی طرف کھینچ لے اور کنیزوں کو اشارہ کرے کہ دروازہ بند کر دیں۔ لیکن وہی وزیر جو دریا گنج کی حویلی کے مہمان خانے میں دھیرے دھیرے کھلی تھی، اور پھر اس نے اس طرح آغوش ہوس وا کی تھی کہ شمس الدین احمد کو اس کا بحر حسن سراسر اوج و موج و تلاطم لگتا تھا اور اس کا شوق جہاں تک جاتا تھا وہاں تک موجہ ہائے بوس و کنار لہراتی اور بل کھاتی تھیں، وہی وزیر عام حالات میں اس قدر شرمیلی اور پر تمکین لگتی تھی کہ شمس الدین احمد کے منھ میں آئے ہوئے لفظ خشک ہو جاتے تھے۔

''سرکار کیا سوچ رہے ہیں؟'' وزیر نے ایک لطیف و ملیح نگاہ نواب پر ڈالی اور سر کو جھکا لیا۔

''یہی سوچ رہا ہوں،'' شمس الدین احمد نے کچھ توقف کے بعد کہا، ''کہ اصل وزیر کہاں ہے۔ آپ میں اس قدر شرم کہاں سے اور کیوں ودیعت ہوئی، اور وہ شرم کبھی کبھی پر لگا کر کہاں اور کس طرح اڑ جاتی ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ آپ میں اس قدر شرم اور اس قدر اور ایسی بے باکی نہ ہوتی تو آپ کیسی ہوتیں؟ کیا آپ وہی وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم ہوتیں جو اس وقت ہیں؟... بھئی واللہ اس وقت میرزا رفیع واعظ کا کیا خوب شعر یاد آگیا ہے۔

زناز و غمزہ و رفتار و شوخی و تمکیں
شود گر انجمنے میر انجمن شرم است''

''یہ سرکار کی چشم کرم اور محبت ہے کہ مجھ میں شرم و آزرم دیکھتے ہیں۔ مجھے تو اپنے اندر کوئی خوبی نظر آتی نہیں۔ شاید یہ شرم ہی ایسی خوبی ہو جس کے باعث سرکار کو بندی کا منھ اچھا لگتا ہے۔ میں تو اپنے بخت کی بلندی کا گھمنڈ کرتی ہوں۔''

''بلندی بخت کی بھی ایک ہی کہی۔ لیکن آپ کی اس بات میں وزن ہے کہ آپ کا آپا، آپ کا سراپا، اس قدر محبوب صفت ہے تو اس میں اس امر کو بھی دخل ہے کہ آپ شرم کو صحیح طرح برتتی ہیں۔ میں پچھلی بار آیا تھا تو اس وقت میں نے ایک بات کہی تھی اور آج پھر کہتا ہوں... لیجئے میرزا رفیع واعظ کا مقطع بھی سن

لیجئے، لگتا ہے آپ ہی کی زبان سے کہا گیا ہے۔

ترا نظر بہ قد و عارض است و مو و اعظ

جمال پیش تو ایں ہاست پیش من شرم است

اور سچی بات تو یہ ہے بھئی واللہ کہ ہم بتا ہی نہیں سکتے کہ آپ کی کن کن اداؤں کے قتیل ہیں۔''

وزیر کے دل میں کانٹا سا کھٹکا۔ یہی باتیں ہی باتیں رہیں گی یا اس سے کچھ گھٹ بڑھ کر بھی عمل میں آئے گا۔ اپنا سب کچھ میں تو وار چکی ہوں۔

وزیر کو خاموش دیکھ کر شمس الدین احمد نے کہا، ''چپ کیوں ہوگئیں۔ ہماری باتیں اچھی نہیں لگیں کیا؟''

وزیر نے سر اٹھایا، مسکرائی، لیکن ذرا اداس لہجے میں بولی:

سرکار کے منھ سے تو پھول جھڑتے ہیں۔ میں تو لاجواب سنتی ہوں، لیکن... یہ بھی سوچتی ہوں کہ پھول جھڑے، ہی پھل لگتا ہے۔''

نواب نے وزیر کا کنایہ فوراً بھانپ لیا۔ وہ بولے: ''پھول کی ڈال نیچے جھکتی ہے۔ آپ ہاتھ بڑھائیں تو پھل بھی آپ کے، پھول بھی آپ کے۔''

''ہم مفلسوں کے لئے آپ کے میٹھے بول سب سے بڑی دولت ہیں۔ ہم تو کہیں ہیں کہ پھول نہیں تو پنکھڑی سہی، ہم دامن پسارے آپ کے چمن کی روش پر بیٹھے ہیں۔'' وزیر نے ہنس کر کہا۔

''تو لیجئے، دامن بھر کر اٹھائیے۔ دامن کشاں نہ ہوجئے۔''

''میں سرکار کا مطلب نہ سمجھی۔''

نواب شمس الدین احمد ذرا گمبھیر لہجے اور متین آواز میں بولے۔ ان کا چلبلا پن اچانک رخصت ہوگیا تھا:

''چاندنی چوک خانم کے بازار میں سہ منزلہ مکان۔ اوپر کی دو منزلیں آپ کی اقامت کے لئے اور نچلی منزل کی دو کانوں کا کرایہ آپ کی تحویل اور صرف میں۔ کہیئے کیا کہتی ہیں؟''

وزیر کے چہرے پر سرخی سی آئی، شربتی آنکھوں میں ہلکی لہریں تفکر کی ابھریں۔ وہ سوالیہ نظروں سے نواب کی طرف دیکھ رہی تھی کہ نواب نے مزید کہا:

''آپ کے نام مکان کے قبالے آج شام تک تیار ہو سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ابھی ورنہ کل صبح

اس گھر کو اپنے مقدم سے میمون کریں۔ یہاں کا سارا سامان فوراً اٹھوانا اور جلد از جلد وہاں آراستہ کرانا ہمارا ذمہ۔ مکان تاحیات آپ کا اور پھر آپ کے اخلاف کا۔'' نواب نے ہلکی ہنسی ہنس کر بات پوری کی، ''بس یہ ہے کہ مجھے وہاں آنے جانے کی کھلی چھٹی ہو اور میرے سوا کوئی نہ آئے۔''

''سرکار اپنی کنیز کو شرمندہ کرتے ہیں۔ جب میرے دل میں کوئی اور نہیں تو میرے گھر میں کوئی اور کہاں سے آسکے گا۔ اور اگر وہ گھر میرا ہے تو آپ کا بھی ہے کیونکہ میں آپ کی ہوں۔ آپ کے لئے دروازہ ہر وقت کھلا رہے گا۔''

''اور آپ؟'' نواب کو شوخی سوجھی لیکن وزیر نے اس بات کو صاف اڑا دیا:

''سرکار میرا کیا ہے، پی کے پاٹن سر دھرو، دھر و چرن پرسیس کے سوا مجھے کوئی فن نہیں آتا۔ مجھے تو آپ پا انداز ہی ٹھہرا لیں تو میں خوش ہوں۔''

''چھی ایسی بات نہیں کہتے بھئی واللہ۔ میں آپ کے کنے یوں آؤں گا جیوں سینے میں راز آوے۔ آپ کے دل و جان و تن پر بار بن کر رہنا نہیں ہے۔ ہاں آپ مجھے گلے کا ہار بنا لیں تو آپ کے دامن و گریبان کو ہی مامن و ماویٰ مان لوں گا۔''

''یہ خدمت مجھے منظور ہے۔ ہر خدمت مجھے منظور ہے۔''

''آپ کے گھر اور ملازمان کے سارے خرچ کی کفالت ہمارے ذمہ ہوگی۔ پاندان اور داد و دہش کے لئے پان سو روپے ماہانہ آپ کی خدمت میں اوپر سے پیش کئے جائیں گے۔ ایک سال کی پیشگی کے طور پر ہزار ہزار کے چھ توڑے باہر پالکی میں آپ کی قبولیت کے منتظر ہیں۔''

وزیر سناٹے میں آگئی۔ اتنا سب کچھ اور اس قدر فراخ دلی سے بھلا اور کون تھا جو اسے یا کسی کو دے سکتا تھا۔ اور اس سب کے عوض مجھ سے مطالبہ کچھ نہیں... بس ان کے گھر میں رہوں اور ان کی ہو کر رہوں تو اس سے آسان خدمت کیا ہوگی... لیکن وہ ایک بات تو رہی جاتی ہے... پر اب چپ رہوں تو برائی ہے اور کچھ کہوں تو کیا کہوں...

''اعلیٰ حضرت مجھے میری توقع اور امید اور حق سے بڑھ کر نواز رہے ہیں۔ ایسی فیاضی تو قصے کہانیوں کے بادشاہوں میں بھی نہ تھی۔ میں ایک ذرۂ بے مقدار آپ کے مہر محبت کی ایک توجہ سے چراغ خانہ اور شمع شبستاں بنا دی گئی ہوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اور داد اس سخاوت کی دینے میں تو اچھے اچھے استادوں کی زبان خشک ہو جاتی۔''

''بس، تو یہ سب سخاوت ہی ہے؟'' نواب نے مسکرا کر کہا۔

''میں تو اسے سخاوت ہی پر محمول کروں ہوں سرکار کہ آپ مجھ بے حسن میں حسن دیکھیں ہیں اور مجھ بے ہنر کو ہنر مند گردانیں ہیں۔ اللہ آپ کو تا قیامت سلامت رکھے۔ یہ مزاج کی سخاوت ہی ہے کہ جہاں اچھائی نہیں ہے وہاں اچھائی نظر آوے اور جہاں عیب ہووے وہاں حسن دکھائی دے۔''

''اگلے لوگ تو اسے سخاوت نہیں محبت کہتے تھے۔'' نواب پھر مسکرائے۔ ''خیر جانے دیجیے، کچھ سخاوت آپ بھی روا رکھیں تو ہمارا بدلہ ہو جائے۔''

''میں تو سب کچھ وار چکی۔ میری حریم جسم و جاں ہے اور آپ ہیں۔'' وزیر نے جواب دیا، لیکن اس کے لہجے میں کچھ واماندگی سی تھی جو نواب سے مخفی نہ رہی۔ انھوں نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا:

''آپ کی دولت سرا کا انتظام و انصرام کرنے کے لئے آپ کے موجودہ نوکران سے سوا مغلانی حبیب النسا اور آپ کا جی بہلانے کے لئے راحت افزا ہجولی آپ کی خدمت میں ہمہ وقت حاضر رہیں گی۔ میں سمجھتا ہوں تکمیل آرزوے راحت کے لئے یہ انتظامات کافی ہوں گے؟''

''میرے سرکار، تکمیل آرزوے راحت کی خاطر تو آپ کے قدموں میں پڑ رہنا ہی بہت کافی ہے۔'' وزیر کچھ عجب انداز سے مسکرائی۔ اس کے بھی صحیح معنی شمس الدین احمد پر آشکارا تھے لیکن انھوں نے بار دگر بھی طرح دے جانا ہی مناسب خیال کیا۔ نواب کو تھوڑا تاسف ضرور ہوا کہ عام عورتوں کی طرح وزیر کے بھی دل میں نکاح (اور شاید نکاح کے ذریعہ حاصل ہونے والی حکومت) کے ارمان تھے۔ انھوں نے دل میں کہا اس سے اچھی تو میری ماں تھیں کہ نوشت و خواند کی صلاحیت سے محروم تھیں، ظاہر ہے کہ تہذیب اور بیگماتی رکھ رکھاؤ نہ جانتی تھیں لیکن انھیں میرے والد خلد آشیانی کی خوشنودی کے سوا کچھ درکار نہ تھا۔ بعد میں وہ منکوحہ، نواب بیگم، مالکہ، سب کچھ بنیں لیکن بس اپنے شوہر اور بچوں کے لئے جیتی تھیں۔ سامان ثروت و جاہ و حکومت سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا۔

نواب کو ذرا رکتا ہوا دیکھ کر وزیر خانم سمجھ گئی کہ میری بات سرکار تک پہنچ گئی ہے اور کچھ گراں بھی گذری ہے۔ لیکن اس نے تلافی مافات کی کوئی شعوری سبیل نہ کی، اور نہ اسے یہ خیال تھا کہ نواب اسے نکاح کی طالب اس لئے سمجھتے ہیں کہ نکاح دہلیز ہے حکومت اور اقتدار کی اور وزیر بھی اقتدار و دولت کی خواہاں ہے۔ بہر حال، اگر وزیر کو علم ہو بھی جاتا کہ نواب نے اس کے اشاروں کا مطلب کچھ زیادہ ہی نکالا ہے تو بھی وہ اس باب میں خاموش ہی رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ خلوص اور وفا اور ولا کی باتیں زبانی طے نہیں

ہوتیں۔

خاموشی ایک دو پل سے بڑھ کر کچھ تکلیف دہ یا پریشان کن صورت اختیار کرنے والی تھی کہ وزیر نے مزید کہا:

''میں تو آپ کے قدموں ہی میں بھلی ہوں اور بھلی رہوں گی۔ تلے پڑی کا مول کیا۔ میں بھلا آپ کی عزت افزائیوں پر پھولی نہ سماؤں تو بد بخت ٹھہروں۔''

نواب کے چہرے پر راحت اور آنکھوں میں مسکراہٹ کی جھلک آئی۔ ''اچھا اب ہم کچھ اوامر ضروریہ کو نپٹانے جاتے ہیں۔'' شمس الدین احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے اثاث البیت کو بندھوانے، اٹھوانے، اور چاندنی چوک کے مکان پر پہنچانے کے لئے پان سات روز مزورے تھوڑی دیر میں یہاں بھجوا دیئے جائیں گے۔ یا جب آپ چاہیں۔''

''میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی اڑ کر اپنے گھر میں پہنچ جاؤں لیکن آسانی سب کی اسی میں ہے کہ کل صبح کو یہاں سے رخت بار کیا جائے۔'' وزیر نے اظہار رضامندی و مسرت کے لہجے میں کہا۔ ''لیکن سرکار ابھی کہاں تشریف لئے جاتے ہیں۔ دوپہر کا خاصہ تو تناول فرما لیتے۔ آپ کے بھاویں تو نہ ہوگا لیکن آج دعوت شیراز ہی سہی۔''

اس میٹھے بول نے شمس الدین احمد کا دل خوش تو کیا لیکن انھیں واقعی ایک کار ضروری لاحق تھا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر وزیر کا گال تھپتھپایا اور اس کی پیشانی چومی اور بولے، ''نہیں آج نہیں۔ انشاءاللہ کل پرسوں تک آپ چاندنی چوک والا گھر ٹھیک کر لیں گی تو ہم بھی آپ کے ساتھ نئے گھر میں دعوتیں کھاویں گے۔ اور ہاں۔ یہ محافظ جو ہم نے یہاں مقرر کئے ہیں وہ ابھی تو موجود رہیں گے ہی۔ لیکن چاندنی چوک میں بھی، ہر چند کہ وہ جگہ سب طرح مصئون ہے، یہ نفری آپ کے دروازے پر حاضر رہے گی۔''

نواب کے لب فرش تک پہنچنے کے پہلے وزیر خانم نے آگے بڑھ کر نواب کی جوتیاں اٹھا لیں اور نواب کے کہنے کے باوجود کہ ''ارے صاحب۔ آپ یہ کیا ظلم کرتی ہیں،'' وزیر نے جھک کر جوتیاں انھیں پہنا دیں۔ لیکن نواب کا دھیان جوتیوں کو ٹھیک سے پہننے کی طرف ہونے کے بجائے وزیر خانم کی لمبی چوٹی پر تھا کہ پھسل کر اس کے شانے پر آ گئی تھی اور اس کی گردن اور پیٹھ کے خم کی شان لمبی لٹکتی ہوئی چوٹی نے دوبالا کر دی تھی۔

نواب مرزا

اکتوبر ۱۸۳۰، یہ وہ زمانے تھے جب گھروں بلکہ گھرانوں کو بنتے دیر لگتی تھی اور نہ بگڑنے میں کچھ تاخیر ہوتی تھی۔ بطور خاص، دلی شہر نے تو سر بفلک حویلیاں چند مہینوں میں قائم ہوتے اور آباد ہوتے دیکھی تھیں۔ چاندنی چوک کا سہ منزلہ مکان، پہلی منزل میں دکانیں، بعد کی ہر منزل میں آنگن، تین دالان، تین بڑے حجرے، توشہ خانہ، آبدار خانہ، غسل خانہ، وغیرہ صاف ستھرے مہیا تھے۔ باورچی خانہ، مودی خانہ، کبوتر خانہ، وغیرہ نچلی منزل پر تھے۔ مغلانی حبیب النسا کے لئے ایک حجرہ اوپر اور ایک نیچے بھی تھا۔ اوپر والے حجرے کی الماریوں اور صندوقوں میں کتابیں تھیں، کچھ تو وزیر کی اور زیادہ تر نواب کی پسندیدہ اور مطالعے میں اکثر رہنے والی، مثلاً دیوان حافظ، فورٹ ولیم کالج کا مطبوعہ کلیات میر، انشاے مادھورام، تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری، وغیرہ۔ پندرہ بیس انگریزی کتابیں بھی تھیں لیکن انھیں پڑھنے کا اتفاق کم ہوتا تھا۔ دونوں منزلوں کے آنگنوں میں ایک طرف چمن اور حوض اور چھوٹا سا فوارہ سنگ مرمر کا تھا۔ اوپری منزل میں آنگن کے دوسرے سرے پر پالتو چڑیوں کے لئے جال اور کبوتروں کے لئے ٹھاٹھر بھی نصب کیا گیا تھا۔ سارے گھر کو سجنے بننے اور اشیاے ضروریہ کے مہیا ہونے میں تین دن بھی تو نہ لگے۔

نیچے بازار کی چہل پہل دیر رات تک جاری رہتی تھی۔ خرید و فروخت کرنے والوں، سیر تماشا دیکھنے والوں کے علاوہ بہتیرے ایسے تھے جو نہر سعادت خان کے دورویہ درختوں اور پھولوں کی بہار اور روشنیوں کے تلے دوستوں ہمجولیوں سے ملاقات اور معشوقوں سے چشمکیں کرنے کے لئے وہاں جمع رہتے تھے۔ ایسے میں کسی بدمعاش بے غیرت کی ہمت نہ پڑ سکتی تھی کہ وزیر خانم کے مکان کی سمت مخالفانہ چڑھ دوڑنے کا خیال بھی کر سکتا۔ اس کے باوجود نواب نے حفاظت کے لئے کئی انتظام کر رکھے تھے۔ ایک دو سپاہی بازار کے پورے اوقات میں، یعنی چار گھڑی کے قریب دن چڑھے سے لے کر آدھی رات کی نوبت

بجنے تک نیچے کی دو کانوں پر چوکس اور خفیہ نظر رکھتے تھے۔

دو کانوں سے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں نہایت ہوشیاری سے بغلی گلی میں بنائی گئی تھیں کہ انجان شخص یا دوکان پر خرید و فروخت کرنے والوں کو پتہ ہی نہ لگے کہ اوپر کی منزلوں کے لئے راستہ کہاں سے ہے۔ دروازے کے اندر ہی چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی جس میں ایک قوی ہیکل عصا بردار دن رات متعین رہتا تھا۔ اس سے نپٹ کر اوپری منزل پر پہنچیں تو ایک فراخ چوکا ملتا تھا، تین طرف سے بند، اور آنے والے کے رخ پر سال کی لکڑی کا اونچا بھاری بھر کم منقش دروازہ نظر آتا تھا جس کی موٹی زنجیر پیتل کی بنی ہوئی تھی اور سونے کی طرح چمکتی تھی۔ حلقۂ زنجیر بھی اسی طرح پیتل کا، بھاری اور چمکتا ہوا تھا۔ چوکے میں ایک طرف چھوٹا سا قالین تھا اور دوسری طرف ایک چوکی بچھی ہوئی تھی جس پر دو تین آدمی بیٹھ سکتے تھے۔

زنجیر ہلائیں تو ایک قد آور، مردانہ لباس میں مسلح اور مکمل اردا بیگنی برآمد ہوتی اور آنے والے یا والی کی مفصل کیفیت اور غرض ملاقات پوچھتی۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ تک اجنبی یا باہری ملنے والوں کے پہنچ جانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ نواب کی غیر موجودگی میں زیادہ تر آنے جانے والے صورت آشنا بیوپاری یا کاروباری لوگ تھے۔ ملاقاتیوں عزیزوں میں عمدہ خانم کا آنا اکثر ہوتا اور پھر اکا دکا بیاں اور آ جاتیں، خصوصاً تیوہار یا میلے، محرم کے جلوس وغیرہ کے دنوں میں معمول سے زیادہ چہل پہل ہو جاتی۔ وزیر خانم بہت کم نکلتی تھی، اور اگر نکلتی بھی تو شام ڈھلے سوار ہو کر عمدہ خانم کے وہاں جاتی، یا مہینے دو مہینے پر نواب شمس الدین احمد کے ساتھ پردہ بند گاڑی میں بیٹھ کر سلطان جی یا خواجہ صاحب زیارتوں کی غرض سے چلی جاتی تھی۔ نواب جب چاندنی چوک میں قیام پذیر رہتے تو ریاست کے کارکنوں اور عمال کی آمد بالخصوص صبح کے وقت ضرور ہوتی رہتی۔ اردا بیگنیاں ان میں سے اکثر کی صورت شناس تھیں لیکن پھر بھی ضروری پوچھ گچھ کے بعد ہی انھیں اندر آنے دیتی تھیں۔

اردا بیگی یا قلماقی کی خدمت پر جو عورتیں نوکر رکھی جاتی تھیں وہ عموماً علاقۂ سندھ یا کاٹھیاواڑ کی زنگن ہوتی تھیں۔ نہایت گٹھے ہوئے بدن کی، بنوٹ اور طمنچہ بازی اور چاقو زنی میں طاق یہ عورتیں بالا دوی میں بھی ماہر ہوتی تھیں اور نقش قدم اور دوسرے نشانات راہ کی مدد سے مفرور مجرم یا چور کا پتہ لگانے میں بھی بے حد مشاق تھیں۔ بعض بعض حویلیوں میں ترکنیں بھی رکھی جاتی تھیں اگرچہ ان کی تعداد اب کم ہو گئی تھی۔ اردا بیگنیوں کے برخلاف، جو مردانہ لباس پسند کرتی تھیں، ترکنیں ہمیشہ اپنے ملک کا زنانہ لباس ہی پہنتی تھیں۔ لمبی تڑنگی، نہایت گوری گلابی رنگت اور بڑی بڑی بادامی آنکھوں، بے حد سیاہ یا سنہرے چمکیلے بالوں

والی مسکراتی ہوئی یہ سورما عورتیں جس قدر دلکش تھیں اسی قدر جرأت اور جفاکشی اور سفاکی میں بھی مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ ایک ترکن دس مردوں پر بھی بآسانی قابو پا سکتی تھی اور میدان جنگ میں غنیم پر پنجہ قابض ہو جانے پر اسے قیدی بنانے کے بجائے وہیں اس کی تکا بوٹی کر ڈالتی تھی۔ نواب شمس الدین احمد کے دادا عارف جان جب ترکستان [آج کے زمانے میں ازبکستان] سے ہندوستان آئے تھے تو قزاقستانی جنگ آزما قبائلی عورتوں کی بھی ایک ٹکڑی اپنی محافظت کے لئے ساتھ لائے تھے۔ یہ عورتیں ازبک اور قزاق قوم ہی کے مردوں سے رشتۂ مناکحت قائم کرتی تھیں اس لئے تین نسلیں گذرنے پر بھی ان میں تمام نسلی اور لسانی خصوصیات پہلے کی طرح برقرار تھیں۔ شمس الدین احمد نے وزیر کے یہاں دو اردابیگنیاں بھیجی تھیں۔ ان میں ایک زنگن تھی اور دوسری نواب عارف جان کی ترکنوں میں سے ایک کی اولاد تھی۔

محافظت کا انتظام دراصل فریزر یا اس کے فرستادوں کی ہمت شکنی کے لئے تھا، اور بظاہر شاید اسی باعث فریزر نے بھی چھوٹی بیگم کے تئیں اپنے ارادے ترک کر دیئے تھے۔ فریزر کا جوش کچھ اس لئے بھی سرد پڑ گیا تھا کہ اس کے مخبروں نے اواخر اکتوبر ۱۸۳۰ میں وزیر خانم کے یہاں دائیوں کی بکثرت آمد و رفت دیکھ کر سن گن لی تو پتہ لگا کہ وزیر خانم امید سے ہیں۔ یہ خبر سن کر فریزر کی امیدوں پر ڈھیر سارا پانی پھر گیا، کیونکہ اب اس کا امکان بہت کم نظر آتا تھا کہ شمس الدین احمد اور چھوٹی بیگم میں مقاطعہ ہو سکے اور چھوٹی بیگم کے لئے فریزر کی ریشہ دوانیاں پھر سے شروع ہو سکیں۔ دوسری بات یہ کہ حاملہ عورت سے پینگیں بڑھنایوں بھی نہ کچھ فائدہ رکھتا تھا اور نہ قرین قیاس تھا۔ فریزر کو اتنا صبر کہاں تھا کہ وزیر کے وضع حمل اور پھر زچہ خانے سے برآمد ہونے کا انتظار کرتا۔

چاندنی چوک میں نواب کا آنا جانا بھی اب اس کثرت سے ہونے لگا تھا کہ دلی میں ان کی دونوں حویلیاں گویا سنسان ہو کر رہ گئی تھیں۔ اکثر تو علاقے سے مراجعت پر شمس الدین احمد سیدھے چاندنی چوک پہنچ کر وزیر کے یہاں ہی اترتے۔ وزیر اور نواب کے مابین ملاطفت اور موانست و مجانست روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ نواب کی منکوحہ نہ بن سکنے کے دکھ کے باوجود، یا اس دکھ کو بالکل بھلا کر، وزیر نے اب شمس الدین کی محبت اور خوشنودی کو اپنی زندگی کا مرکز بنا لیا تھا۔ ادھر شمس الدین احمد کا یہ عالم تھا کہ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ کون سی تحفہ چیز یا قیمتی زیور یا لباس وزیر کے اوپر سے نچھاور کر دیں یا محبت کا کون سا بول انھیں سوجھے جسے وہ وزیر کے کانوں میں رس کی طرح گھول دیں۔ حبیب النسا کہتی تھی کہ وہ بات جو کہانیوں

میں یا بڑی بوڑھیوں کی زبانی سنا کرتے تھے وہ نواب اور وزیر کی جوڑی نے سچ کر کے دکھا دی کہ ایک کو دوسرے کے بغیر ایک پل چین نہیں اور ایک کا جی ماندہ ہو تو دوسرے کو خود بخود خبر ہو جاتی ہے۔

ایک بار شمس الدین احمد پندرہ دن متواتر نہ آئے۔ فیروز پور جھرکہ سے دلی آنے جانے میں چھ دن لگتے تھے۔ اس طرح، نواب اگر چار دن بھی وہاں قیام کرتے تو دس دن کی غیر حاضری ہو جاتی۔ لوہارو بھی ڈھائی دن کی مسافت پر تھا۔ اس طرح وہاں بھی جانے آنے میں پانچ چھ دن لگ ہی جاتے تھے۔ لہٰذا ریاست کے کسی بھی سفر کا مطلب دس دن سے کم کی غیر حاضری نہ ہوتا تھا۔ وزیر نے خود کو دس دن کے ہجر کا اس قدر معتاد بنا لیا تھا کہ دس سے گیارہواں دن نہ ہونے پاتا تھا کہ اس کا دم الٹنے لگتا تھا۔ اس بار نواب جو پندرہ دن نہ آئے اور نہ کوئی خبر بھیجی تو وزیر خانم کی بے قراری ایسی تھی کہ حبیبہ اور راحت افزا سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ راحت افزا اور وزیر میں اس درجہ یگانگت اور الفت ہو گئی تھی کہ نواب کی غیر حاضری میں وہ وزیر ہی کے حجرے میں سوتی تھی اور نواب کی موجودگی میں بھی نواب کے فوراً بعد بلکہ اکثر ان سے بھی پہلے، وہ راحت افزا کی ہی صورت دیکھتی۔ نواب بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے اور اکثر وہ وزیر کو سوتا چھوڑ کر منھ اندھیرے تیار ہو کر نچلی منزل کے دیوان خانے میں ریاست کے کاغذات دیکھنے یا امور ضروریہ کا تصفیہ کرنے کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں چھوٹا موٹا دربار آراستہ ہو جاتا اور ناشتے کی خبر ملتے ملتے نواب شمس الدین احمد زیادہ تر معاملات کا انفصال کر چکے ہوتے تھے۔ اس دوران وزیر کے جاگنے کا وقت ہو جاتا تو راحت افزا کشتی میں شربت اور چھوٹی سی چنگیر میں موسم بے موسم کے پھول لے کر دبے پاؤں اندر آتی اور دریا گنج کی حویلی میں پہلی صبح کی طرح وزیر کے تلوؤں میں دھیرے دھیرے گدگدی کرتی اور وزیر کی آنکھ کھلنے پر اسی پہلی صبح کی طرح مسکرا کر "صباحکم بخیر خانم صاحب" کہتی۔ وزیر کے بیدار ہونے سے تبدیل لباس تک سارے کام راحت افزا ہی کی خدمت گذاری سے انجام پاتے۔

اس خلا ملا کے باوجود اس وقت شمس الدین احمد کی دو ہفتے کی غیر حاضری میں وزیر خانم کے اضطراب و اضطرار کو کم کرنے اور وزیر کا دل بہلانے کے لئے راحت افزا کی ہر سعی رائیگاں گئی۔ وزیر کو بار بار وہم آتا کہ فریزر نے کچھ شرارت نہ کی ہو، کہیں تنہا پا کر ان پر حملہ نہ کروا دیا ہو۔ راحت افزا لاکھ سمجھاتی کہ ایسا غیر ممکن ہے، لیکن وزیر کے دل کو تسکین نہ ہوتی۔

بالآخر سولہویں دن سانجھ پھولنے کے بھی بہت بعد شمس الدین احمد وزیر کے گھر پہنچے تو اس نے

اضطراراً دوڑ کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور منھ دھونے یا پانی شربت کو بھی پوچھے بغیر بے ساختہ کہنا شروع کر دیا:

''اللہ نواب صاحب آپ کہاں رہ گئے تھے۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ دو گھڑی بھی نہ دیکھوں تو جان گھٹنے لگتی ہے۔ اتنی دیر دیر میں یہاں آیئے گا تو میں تو کھپ ہی جاؤں گی۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ وزیر نے اتنے کھلے ہوئے اور جوش سے ابلتے ہوئے الفاظ میں نواب کے تئیں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا، اور وہ بھی اوروں کی موجودگی میں۔ ان کی تہذیب میں بات کو، خاص کر محبت کی بات کو مبالغہ اور تاکید کے ساتھ کہنے کی رسم عام تھی۔ لیکن طرفین یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ کون سے الفاظ رسم نبھانے کے لئے ہیں، اگر چہ حقیقت سے بالکل عاری نہیں، اور کون سے الفاظ دلی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ وزیر نے اس وقت جو بات کہی اس میں اور اس کے لہجے میں سچائی اس قدر گرم اور روشن تھی کہ لگتا تھا وزیر کا کلیجہ خون ہو کر اس کے لفظوں میں بھڑک اٹھا ہے۔ شمس الدین احمد ایک لمحے کو سکتے میں آ گیا، پھر وزیر کے ہاتھوں کو اپنے لبوں سے لگا کر دھیمی آواز میں بولا:

''ہم بھی تمھیں دیکھ دیکھ جیتے ہیں بہو خانم۔ تمھیں کچھ دیر نہ دیکھیں تو دم رکنے لگتا ہے لیکن کبھی کبھی... دنیا ہے آخر۔ نہیں آئے جو میر کچھ کام ہو گا۔''

میر کا ڈیڑھ مصرع پڑھ کر شمس الدین احمد نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو اپنے منھ پر آنے دیا، گویا شرمندگی کا اظہار کر رہے ہوں۔ وزیر اپنے ہاتھوں کو چھڑا کر دوپٹے سے آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نواب نے اسے بہو خانم کہا تھا۔ یہی خطاب تو نواب احمد بخش خان خلد مکان نے شمس الدین احمد کی ماں کو نکاح میں لانے کے بعد دیا تھا۔ وزیر کے آنسوؤں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نواب نے اسے بہو خانم کہا تھا، اور وہ بھی سب کے سامنے۔ شاید اس میں بھی کوئی اشارہ پوشیدہ رہا ہو، یا شاید نہ رہا ہو، لیکن اس دن سے کسی کے دل میں یہ شک نہ رہا کہ نواب اور وزیر کی جوڑی کبھی بچھڑ بھی سکتی ہے۔

ہر چند کہ یہ وزیر کا تیسرا حمل تھا، اور اس کی عام تندرستی بہت اچھی تھی اور تمام دائیوں کا متفقہ قول تھا کہ بچہ اپنے وقت پر نہایت تندرست اور نہایت آسانی سے پیدا ہو گا، لیکن وزیر کے دل میں طرح طرح کے خوف تھے۔ موسم کے ٹھنڈا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے بھی دل میں خوف کی لہر سرد سے سرد تر ہوتی گئی۔ اسے خلش تھی کہ کہیں لڑکی نہ ہو، اور کہیں نواب کو لڑکی کی پیدائش خوش نہ آئے... یا کہیں بچہ جاتا رہے تو پھر کیا ہو گا؟ وزیر کو کچھ دھندلا سا گمان تھا کہ نواب کو لڑکے کی بہت تمنا ہے۔ اور اس نے اڑتی اڑتی

یہ خبر بھی سن رکھی تھی کہ نواب کی دوسری منکوحہ بیگم (۱) کسی طبی معذوری کے باعث بچہ جننے سے قاصر ہیں۔ اور پہلی (۲) سے دو بیٹیاں ہو چکیں۔ اب وہاں بھی اولاد نرینہ کی کوئی امید نہیں (۳)۔ ایسے میں اگر میرا بچہ ضائع ہو گیا، یا لڑکی پیدا ہوئی، یا لڑکا تو ہوا لیکن کچھ عیب دار نکلا تو کیا ہوگا؟ مانا کہ میں ہاتھ پیر سے بالکل ٹھیک ہوں اور نواب کی تو خیر مردانہ حسانت کی لوگ مثال دیتے ہیں، مگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ان معاملات کو کون جانتا سمجھتا ہے۔ کیا اچھے ماں باپ کے بچے عیبی نہیں پیدا ہوتے؟ اور کمی کسی میں ہو لوگ تو ماں ہی کو نام دھریں گے۔

ہر چند کہ دائیوں اور خود حکیم صاحب نے بار بار کہا تھا کہ وزیر کو مقوی دوا یا کسی معجون کی ضرورت نہیں، عام غذائیں اور احتیاطیں کافی ہیں۔ نبض اور تمام نشانیاں یہی بتاتی ہیں کہ بچہ صحیح و سالم اور تندرست پیدا ہوگا۔ لیکن وزیر نے ان کے چوری چھپے حبیبہ کے توسط سے کئی تعویذ، کئی دعائیں، اور کئی دوائیں استعمال کر ڈالیں اور دہلی کے بائیسوں خواجگان کی چوکھٹ پر جا جا کر منتیں مانیں کہ بیٹا ہو اور ہر طرح نک سکھ سے درست ہو۔ اسے ٹھنڈا پانی پینا اور ٹھنڈے پانی سے نہانا بہت پسند تھا، لیکن گلابی جاڑوں کے شروع ہوتے ہی اس نے سمویا ہوا پانی پینا اور اچھے خاصے گرم پانی سے نہانا شروع کر دیا کہ کہیں مجھے زکام نہ ہو جائے اور زکام کی ٹھنڈک بچے کو لگ جائے۔ لیکن وہ گرم خشک خاصیت کی چیزیں بھی کھانے سے ڈرتی تھی کہ کہیں بچے کے دماغ میں خشکی نہ پیدا ہو جائے۔ ڈھونڈ کر اس کے لئے گرم تر اشیا لائی جاتیں، اگرچہ بڑھتے جاڑوں میں گرم تر خاصیت کی اشیائے خوردنی بہت کم دستیاب ہوتی تھیں۔ ہرن کے علاوہ ہر طرح کا گوشت کھانا اس نے بالکل چھوڑ دیا تھا اور ہرن بھی اگرچہ گرم خشک تھا، لیکن بوجہ لطافت وہ ہرن کے گوشت کا قلیہ کبھی کبھی کھا لیتی تھی۔ آبی چڑیوں مثلاً بطخ سے اسے کوئی ذوق نہ تھا لیکن گرم تر خاصیت کے باعث وہ نئے نرالے ڈھنگوں سے بطخ پکوا کر تھوڑی بہت کھا لیتی تھی۔ مچھلیوں میں زیادہ تر

---

(۱) حسینی بیگم بنت ولی محمد خان، ان کا نکاح شمس الدین احمد سے ۱۸۲۹ میں ہوا تھا۔ انھیں بعد میں امیر بہو خطاب ملا۔

(۲) افضل النسا بیگم عرف جانی بیگم بنت میرزا مغل بیگ خان۔ ان کا نکاح شمس الدین احمد سے ۱۸۲۸ میں ہوا تھا۔

(۳) وزیر کو اس کی خبر نہ تھی، لیکن نواب کی ایک مدخولہ چمپا نامی بھی تھی۔ اس سے بھی بیٹی ہی پیدا ہوئی تھی، رحمت النسا اس کا نام رکھا گیا تھا۔ افضل النسا بیگم سے متولد لڑکیوں کے نام احمد النسا بیگم اور شمس النسا بیگم تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نسل و نام کی برقراری، اور اس کے لئے ان کے یہاں اولاد نرینہ کا پیدا ہونا اس وقت نواب شمس الدین کی اہم ترین اور اولین ضرورت تھی۔ انھیں اپنے خاندان کا نام باقی رہنے کا کس قدر ارمان تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی بڑی بیٹی کا نام اپنے باپ کے نام پر اور چھوٹی کا نام اپنے نام پر رکھا تھا۔

سرد تر، لہٰذا متروک تھیں، الا یہ کہ جھینگوں کا سالن کبھی کبھی پک جاتا تھا کہ جھینگا گرم تر ہے۔ چاول کے بارے میں دو قول ہونے کے سبب کہ سرد خشک یا گرم خشک ہے، اس نے چاول چھوڑ دیئے تھے۔ اسے ہر طرح کے ساگ پسند تھے لیکن پالک اور خرفہ سرد تر تھے اور چولائی سرد خشک، لہٰذا ان کو بھی ترک کیا گیا۔ گاجر اور کھرنی کہ گرم خشک ہیں، اسے قبول تھے لیکن یہ ہر موسم میں ملتے نہ تھے۔ ان کی تلاش جاری رہتی تھی۔ بادام، انگور اور شکر قند اسے بہت مطلوب رہتے تھے کہ یہ سب گرم تر تھے۔ کھانے میں ہلدی، فلفل سیاہ، الائچی خورد و کلاں، پودینہ، اور زیرے کی مقدار کم کر دی گئی تھی کہ یہ سب گرم خشک ہیں۔ اسی اعتبار سے اڑد کی دال اسے بہت مرغوب ہو گئی تھی کہ گرم تر، حالانکہ قابض تھی۔ صبح کا شربت موقوف کر کے وہ کبھی کبھی چائے یا قہوہ پی لیا کرتی تھی۔ لیکن ان دونوں ہی چیزوں کو وہ دوا کے طور پر کرہاً اور کم مقدار میں استعمال کرتی تھی۔ چائے تو اس لئے گوارا تھی کہ ہاضم طعام کہی جاتی تھی اور قہوہ تاثیر میں بے حد گرم تر سمجھا جاتا تھا۔

ان وحشتوں اور الجھنوں کے دنوں میں وزیر کے لئے راحت افزا واقعی راحت افزا ثابت ہوئی۔ راحت افزا کو شاعری سے شغف تھا اور اگرچہ اس نے علم موسیقی حاصل نہ کیا تھا، لیکن اس کا گلا بہت اچھا تھا اور مختلف شادی بیاہ کی محفلوں، میلاد شریفوں، اور محرم کی سوز خوانیوں اور نوحہ خوانیوں میں بچپن سے موجود رہنے اور دس گیارہ سال کی عمر سے ایسی مجالس میں خود حصہ لینے کے باعث گانے کی مشق اسے بہت ہو گئی تھی۔ وہ کبھی گا کر، کبھی گنگنا کر، کبھی تانپورے کے ساتھ لے اٹھا کر وزیر کے من بہلاؤ کا سامان کرتی رہتی۔ فیضی کی ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای
دردیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ ای

وہ راحت افزا سے بار بار سنتی اور شمس الدین احمد کے ترک نژاد ہونے کے باعث "ترک غمزہ زن" کی ترکیب اور یہ شعر، بلکہ پوری غزل اسے اکثر اشک بار کر دیتی تھی۔

من خوں گرفتہ نیستم امروز ورنہ تو
خنجر بدست و تیغ حمائل نشستہ ای
خوباں شکستہ رنگ و خجل ایستادہ اند
ہر جا تو آفتاب شمائل نشستہ ای

اس غزل کے ہر شعر میں اسے اپنی محبت اور وارفتگی کی سچی تصویر کے ساتھ شمس الدین احمد کے جسم و جان کا پرتو نظر آتا تھا۔ اور فیضی کی حسب ذیل غزل راحت افزا کی الھڑ، غیر تربیت یافتہ، لیکن میٹھے سر وں کے گن سے بھری ہوئی آواز میں عشق کی حوصلہ مندیوں کے افسانے کو حقیقت بنا کر سناتی تھی ؎

صبح دم خیز و صراحی ز سر طاق بگیر
خندہ بر چرخ زن و خردہ بر آفاق بگیر

یک دو نقش ہوس از مہرۂ امید بہ باز
یک دو جام طرب از قسمت میثاق بگیر

گاہ نقد طربے در کف محتاج بنہ
گہ ترنج ہوسے از کف مشتاق بگیر

زہد خشک ار خردت گرد بر آرد آخر
ہمدم عشق شو و مشرب عشاق بگیر

لیکن جو شعر کہ اس کے دل و جان، دین ایمان اور ہوش و وارفتگی کو اپنی وسعتوں میں چھپا کر انھیں ہر دم نئی زندگی دیتے تھے وہ جامی کی شہرۂ آفاق نعت کے شعر تھے ؎

و صلی اللہ علیٰ نورٍ کہ زو شد نورہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

دو چشم نرگسینش را کہ مازاغ البصر خوانند
دو زلف عنبرینش را کہ واللیل اذا یغشیٰ

ز سر سینہ اش جامی الم نشرح لک برخواں
ز معراجش چہ می پرسی کہ سبحان الذی اسریٰ

شیخ جامی کی یہ نعت جو حضرت امام ابو حنیفہ کی ایک عربی نعت پر مبنی تھی، اسے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان محبوبی کا جوہر معلوم ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ سارا عالم، اس کی تکوین و تخلیق کے سارے اسرار و عوامل، سب چاند ستارے کہکشاں، جنگل پہاڑ دریا، انسان اور جن، میرے آقا و مولیٰ کے عاشق زار ہیں اور جو بھی انھیں چاہے گا اس میں بھی وہی شان محبوبی پیدا ہو جائے گی۔ سارے افلاک اور

سارے عوالم عاشق رسولؐ ہیں اور ان میں جو کچھ دلکشی ہے وہ اسی عشق کے پھول ہیں جنھیں گلزار حقیقت نے عالم امکان میں روشن کیا ہے۔ وہ بار بار ان اشعار کو سنتی، اور خود بھی انھیں پڑھتی اور ہر بار اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں، دل بھر آتا اور وہ دعا کرتی کہ کاش دونوں جہان کے والیؐ کی خاک نعلین کے صدقے ان بابرکت الفاظ کے نور سے میرے بیٹے (اس نے خود کو یقین دلا لیا تھا کہ اسے بیٹا ہی ہو گا) کی بھی تقدیر کچھ چمک جائے اور اگر وہ علوے ہمت، جواں مردی، اور مرزایانہ شان سے کچھ بہرہ مند ہو تو اسے مقبولیت اور محبوبیت بھی نصیب ہو۔

راحت افزا کے برخلاف، کہ وہ گانے کا فن نہ جانتی تھی، وزیر نے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ایام طفلی ہی میں موسیقی میں کچھ درک حاصل کر لیا تھا اور آواز بھی اس کی بہت اچھی تھی۔ لیکن اسے گانے کا شوق نہ تھا، بلکہ وہ ان چیزوں کو دون مرتبہ جانتی تھی۔ لیکن راحت افزا کی سنگت اور نواب شمس الدین کی محبت نے اس کے دل و جان میں جو ابتہاج اور تواجد پیدا کر دیا تھا، اس کے باعث اب وزیر بھی گانے میں دل لگانے لگی تھی۔ شیخ جامی کی نعت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ وزیر کو میرا بائی اور سورداس کے بہت سے بھجن بھی بچپن میں یاد ہو گئے تھے۔ اب حافظے کے کونے کھدروں میں ڈھونڈ کر وہ انھیں جھاڑ پونچھ کر اپنی فوری یادداشت میں لے آئی تھی اور وقتاً فوقتاً اکیلے یا راحت افزا کے ساتھ مل کر انھیں گایا کرتی تھی۔ میراثنوں کو بلوا کر وہ امیر خسرو کے گیت یا قوالیاں بھی سننے لگی تھی اور کچھ قوالیاں اس نے سیکھ بھی لی تھیں۔ امیر خسرو کی یہ قوالی اس نے بسنت کے موسم میں سنی تھی اور تب سے یہ اس کی حرز جاں بن گئی تھی:

موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ دے رنگیلے
تو تو صاحب مورا محبوب الٰہی
ہمری چنریا پیا کی پگریا
دونوں بسنتی رنگ دے تو تو صاحب مورا محبوب الٰہی
نجام الدین اولیا ہیں پیر میرو
پریم پیت کا سنگ دے رنگیلے
تو تو صاحب مورا محبوب الٰہی

چوک سعد اللہ خان کے آخری بازار کے آگے چاندنی چوک شروع ہوتا تھا۔ چوک کے مغرب کی جانب خاص بازار، جنوب میں کشمیری کٹڑہ، اس کے مشرق کی سمت پر محلۂ کشتی بانان، اور اسد علی

ہزاری کی حویلی تھی۔ شمال کی سمت سے چوک میں داخل ہوتے بائیں ہاتھ کو پہلی بڑی عمارت جین مندر تھی جسے شاہ جہاں کے وقتوں میں جہان آباد کی تعمیر سے پہلے بنایا گیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس مندر کے لئے کچھ زمینیں وقف کی تھیں جو اس وقت بھی مندر کے نام وقف چلی آ رہی تھیں۔ جین مندر، جسے اس زمانے میں لال مندر بھی کہتے تھے، اس سے آگے اندر کو آئیں تو چاندنی چوک باقاعدہ شروع ہوتا تھا۔ یہاں پہلی قابل ذکر عمارت گوری شنکر کا مندر تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی تعمیر میں خلد مکان حضرت اورنگ زیب عالم گیر کا عطیہ بھی شامل تھا۔ گوری شنکر کے مندر سے کچھ آگے اسی طرف، یعنی چوک سعد اللہ خان سے آنے والے شخص کے بائیں ہاتھ کو گوردوارہ سیس گنج کی بلند عمارت تھی۔ یہ تینوں عبادت خانے اب بھی موجود ہیں اور ان میں پوجا پاٹ کرنے والوں، زیارت کرنے والوں، اور خدمت کرنے والوں کا ہجوم آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن وزیر خانم کے زمانے میں ان عبادت گاہوں میں صبح صادق سے لے کر رات کے دوسرے پہر تک بھجن، کیرتن، اور گرنتھ صاحب کا جاپ اور پاٹھ ہوتے رہتے تھے۔ پجاریوں اور عقیدت مندوں کے گانے کی آوازیں چاندنی چوک کی زندگی اور تہیج میں اضافہ کرتی تھیں اور دور دور تک تقدس اور عبودیت کا سماں باندھتی رہتی تھیں۔

گوردوارے سے آگے بڑھیں تو دائیں جانب کو وہ جگہ ملتی تھی جسے آج فوارہ کہتے ہیں۔ وزیر خانم کے زمانے میں یہاں فوارہ یا حوض کچھ نہ تھا، چاندنی چوک کے عام انداز پر دوکانیں اور اوپر اقامتی قطعات تھے۔ ان کے مقابل وہ مشہور مسجد تھی جسے سنہری مسجد کہتے ہیں۔ اسی مسجد کے صحن میں دوپہر کے وقت نادر شاہ تلوار کھینچ کر بیٹھ گیا تھا اور یہ دلی کے قتل عام کا اشارہ تھا جس میں ایک محتاط اندازے کے مطابق چند ساعتوں میں تیس ہزار جانیں گئی تھیں۔

وزیر کا گھر اس جگہ پر واقع تھا جہاں سے لال حویلی کا شمالی دروازہ نظر آ سکتا تھا اگر درمیان میں خانم کا بازار اور صدہا قطعات مکانات کے نہ ہوتے۔ خانم کے بازار کی چہل پہل غیر محسوس طور پر چاندنی چوک کی پر جوش اور پر رنگ اور پر لطف فضاؤں میں ڈھلتی رہتی تھی، جس طرح الہاباس کے پریاگ راج میں گنگا ندی کی ہلکے رنگ اور وسعتیں اور سست خرامیاں جمنا ندی کی گہرائیوں اور تیز رفتاریوں اور شوخ سبز رنگ سے گلے ملتی رہتی ہیں۔ وزیر کے گھر کے ٹھیک سامنے ایک مسجد تھی اور یہ مسجد بھی سنہری مسجد کے نام سے جانی جاتی تھی۔ وزیر کے گھر کی دوسری منزل سے مسجد کا چھجا اور اندرونی محرابیں اور آتے جاتے ہوئے نمازی دکھائی دیتے تھے۔ یہ مسجد جاوید خان خواجہ سرا المخاطب بہ نواب بہادر خان نے ۱۷۴۷ میں

بنوائی تھی۔ یہ مسجد دلی کی تمام مساجد میں ممتاز اس لئے تھی کہ اس کی تعمیر سنگ باسی سے ہوئی تھی۔ ہلکی سیاہی لئے ہوئے سرخ رنگ کا یہ پتھر عموماً بڑی تعمیروں کے لئے مستعمل نہ تھا لیکن اس مسجد میں یہ نہایت کامیابی اور حسن کے ساتھ استعمال ہوا تھا۔ نواب احمد بخش خان نے جب وہ عمارت خریدی (اغلباً ۱۸۱۶ میں) جس میں اب وزیر کا قیام تھا، تو انھوں نے اس مسجد کی دیکھ بھال، صفائی، روشنی، مرمت وغیرہ کا کام اپنے ذمہ کر لیا تھا اور اب یہی خدمت نواب شمس الدین احمد خان انجام دیتے تھے۔

ایک بار احمد بخش خان اور امین الدین احمد خان، جو اس وقت بہت کم عمر تھے، بگھی میں سوار سنہری مسجد کے سامنے سے گذر رہے تھے کہ اچانک ایک بے حد قوی ہیکل مست ہاتھی بغل کے کوچے سے نکل کر ان پر حملہ آور ہو گیا۔ ایک گھوڑا اور گاڑی بان تو وہیں جاں بحق تسلیم ہو گئے اور بگھی چور چور ہو گئی۔ نواب اور امین الدین احمد گاڑی سے گرے تو سنہری مسجد کی سیڑھیاں سامنے تھیں۔ حاضر دماغی کو کام میں لاتے ہوئے نواب نے امین الدین احمد کو گود میں اٹھایا اور مسجد کی سیڑھیاں تیز تیز چڑھ کر اوپر محفوظ جگہ پہنچ گئے۔ اس وقت اکثر لوگوں نے کہا کہ مسجد کی بے لوث خدمت کے صلے میں اللہ نے نواب اور ان کے بیٹے کی جانیں بچا لیں۔

اس سال کا رمضان فروری ۱۸۴۳ میں پڑا۔ نہایت خوشگوار موسم، مطلع بادلوں اور گرد و غبار سے بالکل خالی، شفاف ہوا میں آوازیں دور تک جاتی تھیں۔ وزیر اگر ذرا دھیان سے سنتی تو سنہری مسجد کے قاری صاحب کی خوش الحان تراویح سن سکتی تھی۔ وزیر اس بات کا خاص اہتمام رکھتی تھی کہ تراویح کے وقت گھر میں حتیٰ الامکان کوئی اور کام نہ کیا جائے اور سب لوگ سنہری مسجد کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور لوگ نہ سہی، لیکن وزیر بہر حال میاں جعفر حسین کی قرأت پر کان لگائے رکھتی تھی۔ قاری صاحب ٹھہر ٹھہر کر نہایت میٹھی آواز میں پوری تجوید کے ساتھ لیکن بنوٹ سے بالکل عاری لہجے میں سوا ڈیڑھ پارے سناتے تھے اور ان کی آواز وزیر کے کلیجے میں اترتی جاتی تھی۔ روزہ رکھنے والے گھر میں کئی لوگ تھے، اور جو نہیں بھی روزہ دار تھے وہ بہر حال روزے کا احترام اور افطاری کا پورا اہتمام رکھتے تھے۔

رمضان کا سارا مہینہ مقدس جشن کی طرح گذرا۔ عید آئی تو وزیر کے لئے، اس کے ہونے والے بچے کے لئے، تحفے تحائف، عیدیاں، سویاں اور جوڑے آئے۔ عمدہ خانم کے علاوہ نواب یوسف علی خان نے بھی تحفہ تحائف بھیجے۔ اور نواب یوسف علی خان نے تو وزیر کا اتنا خیال کیا کہ عمدہ خانم کو ساتھ لئے لئے عید ملنے آئے۔ اس سے زیادہ لطف کی بات یہ ہوئی کہ اگرچہ شمس الدین احمد کی بیگمات میں سے، یا ان کی طرف سے کوئی نہ آیا لیکن ان کی دونوں بہنیں نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم عید کے چند روز بعد ملنے آ گئیں

اور بہت دیر تک ٹھہریں۔ اپنے بھائی کی طرح یہ دونوں لڑکیاں بھی بے حد خوبصورت اور بڑے رکھ رکھاؤ والی تھیں۔ شرافت اور امارت کی شان ان کی رگ رگ سے ٹپکتی تھی۔ دونوں کا قد اوسط سے نکلتا ہوا، بدن چھریرے، دست و پا نازک، کچھ ذرا سی بادامی شکل لئے ہوئے بڑی بڑی سبزی مائل آنکھیں، رنگ گلابی اور بال سنہرے تھے۔ نواب بیگم کے لئے کئی رشتے آچکے تھے لیکن بات ابھی کہیں ٹھہری نہ تھی۔ تینوں حسینوں میں بہناپا فوراً قائم ہو گیا۔

ذی الحجہ کی بارہ تاریخ، چہار شنبہ کا دن، دو بجے دن کا وقت اور ۱۲۴۶ کا سال تھا (مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱) جب وزیر خانم کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ مراشنوں، اصیلوں، اور حبیبہ اور راحت افزا نے مبارک بادیاں گا گا کر گھر بھر دیا۔ نواب شمس الدین احمد نے ۱۰ ذی الحجہ حسب معمول فیروز پور جھرکہ میں منائی تھی۔ گیارہویں ذی الحجہ کو دن چڑھے اونٹ گاڑیوں پر سواران کا قافلہ لوہارو کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ فیروز پور جھرکہ سے تجارہ کا فاصلہ نصف منزل کا تھا لیکن صرف پگڈنڈیاں اور اوسر زمین تھی۔ کہیں کہیں کیکر اور جھڑ بیری کے جنگل تھے۔ اونٹوں کے لئے یہ راستہ کچھ مشکل نہ تھا۔ تجارہ سے لوہارو تک اچھی چلتی ہوئی سڑک تھی جو آگے جا کر دو حصوں میں منقسم ہو جاتی تھی۔ ایک شاخ ریواڑی کو نکل جاتی تھی اور دوسری فرید آباد، سوہنا ہو کر دہلی کو جاتی تھی۔

شام سے پہلے پہلے نواب شمس الدین احمد لوہارو کے قلعے میں داخل ہو گئے۔ ان کے پہنچتے ہی قربانیاں ہوئیں، گوشت، انعام و اکرام اور لنگر تقسیم ہوا۔ اس دن شمس الدین احمد کے جی میں خدا جانے کیا آئی کہ اپنی سوتیلی ماں بیگم جان صاحب کے بھی سلام کو حاضر ہوئے۔ انھوں نے دونوں چھوٹے بھائیوں امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد کو ہزار ہزار روپے عیدی میں دیئے، اپنی پانچوں بہنوں کو جوڑے پہنائے اور سوا سوا سو روپے عیدی کے ہر ایک کے ہاتھ پر رکھے۔ بیگم اماں صاحب کی خدمت میں انھوں نے پنچ لڑا مالائے مروارید پیش کیا۔ سویاں چکھ کر وہ قلعے کے اندر ہی مردانہ حویلی میں آئے۔ رعایا کے نذرانوں اور سلام کی وصولی اور انعامات کی تقسیم کی مصروفیت کے باوجود ان کا دل نہ لگ رہا تھا کیونکہ وہ دہلی سے ولادت کی خبر کے لئے بے چینی سے منتظر تھے۔

جب ۱۲ ذی الحجہ کی شام تک کوئی خبر نہ آئی تو اگلے دن صبح وہ دہلی کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور تین دن کی مسافت دو دن میں طے کر کے ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۴۶ مطابق ۲۸ مئی ۱۸۳۱ کو وہ دہلی پہنچے۔ یہاں خوش خبری ان کی منتظر تھی۔ حبیبہ کا بھیجا ہوا ہرکارہ ۲۶ مئی کو دہلی سے روانہ ہوا تھا لیکن راستے میں کہیں

ان کا سنگم نہ ہو سکا تھا۔

وزیر خانم نے بچے کو پہلی بار دیکھا تو ایک لمحے کے لئے دھک سے ہو کر رہ گئی۔ نو مولود بہت تندرست، اچھے ہاتھ پاؤں کا، ناک نقشے سے درست، لیکن سیاہ فام تھا۔ ہر چند کہ خود چھوٹی بیگم کا رنگ بہت دبتا ہوا تھا اور وہ اچھی خاصی سانولی رنگت کی تھی، لیکن یہ بیٹا تو بالکل ہی حبشی معلوم ہوتا تھا، خاص کر اس وجہ سے کہ وہ خود تو سیاہ فام تھا ہی، اس کے ساتھ ساتھ اس کے بال بھی گھنے بھاری اور گھونگر یالے تھے، وزیر کے بالوں کی طرح باریک اور چمکیلے نہ تھے۔ لیکن تھوڑی دیر تک غور سے دیکھنے اور بچے کو اٹھانے لٹانے کے دوران حقیقت کچھ مختلف معلوم ہوئی۔ اول تو یہ کہ حبشیوں کے بالکل برعکس بچے کی ناک بالکل سیدھی اور اونچی تھی، اتنی کہ بچپن کے پھولے پھولے گالوں کے باوجود دبتی ہوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی پیشانی بھی بلند تھی اور آنکھیں سیاہ بہت بڑی بڑی جن پر لمبی پلکیں جھکی ہوئی رہتی تھیں۔ آنکھوں اور ناک کے بعد اس کی چوڑی کلائیاں اور بہت لمبی لمبی مخروطی انگلیاں توجہ کو منعطف کرتی تھیں۔ پاؤں کی انگلیاں بھی معمول سے زیادہ لمبی اور سڈول تھیں۔

اس کے چہرے پر ہوشمندی اور شعور کے آثار تھے جو نو زائیدوں میں بالعموم مفقود ہوتے ہیں۔ پیدائش کے چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ بڑی بڑی آنکھیں کھول کر ہر اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کرتا جو اس کے جاگنے کے عالم میں اسے گود میں اٹھا لیتا۔ ایسے میں اس کا سیاہ رنگ اور بھی بھلا معلوم ہونے لگتا۔ مجموعی طور پر بچے کے چہرے پر غیر معمولی دلکشی اور زندگی کا چونچال پن تھا۔ حبیب النسا جو ایک طرح وزیر کی عاشق زار تھی، بچے کو پیار کرتے اور چمکارتے نہ تھکتی اور کہتی تھی کہ خانم صاحب یہ آپ پر پڑا ہے اور دیکھئے گا بڑا ہو کر آپ ہی جیسا حسین نکلے گا۔

وزیر کی بہت تمنا تھی کہ اس کے باپ اور بڑی بیگم زچگی کے پہلے آکر مجھے دیکھ جائیں اور کچھ دعا تعویذ جھاڑ پھونک بھی کر دیں۔ لیکن بار بار کہلانے پر بھی ان میں سے کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ ولادت کی بھی خبر اس نے باپ اور بڑی بیگم کو بھجوائی لیکن اس بار بھی دونوں کے یہاں سے صدائے برنخاست کا رنگ تھا۔ وزیر کو رنج تو بہت ہوا لیکن ان کی سرد مہری کے اسباب اس پر مخفی نہ تھے۔ عمدہ خانم ہی کیا کم تھیں کہ چھوٹی نے اپنی حرکتوں سے سارے خاندان کو بدنام کر دیا تھا۔

ولادت کے کچھ ہی دیر بعد ایک حافظ جی کو بلوا کر بچے کے کان میں اذان دلوا دی گئی تھی۔ لیکن نام رکھنے کے لئے نواب کا انتظار تھا۔ فی الحال تو سب لوگ اسے ''بچے میاں'' کہتے تھے۔ ''بچے میاں کو

بھوک لگی ہے''۔ ''بچے میاں جاگ اٹھے ہیں'' وغیرہ۔ بچے میاں صاحب جب سوتے نہ ہوتے تو ہر وقت کسی نہ کسی کی گود میں سوار ٹکر ٹکر سب کو دیکھتے ہوتے۔ بالآخر ۲۸ مئی مطابق ۱۵ ذی الحجہ کی شام کو نواب دلی پہنچے اور سیدھے چاندنی چوک آ کر اترے۔ وزیر کو خوف تھا کہ گورے ترکستانی رنگ والے خاندان میں سیاہ فام بچے کی پیدائش پر نواب کہیں چیں بجبیں نہ ہوں۔ لیکن وہ بھول گئی تھی کہ نہ خود اس کا رنگ گورا تھا اور نہ ہی شمس الدین احمد کی ماں مدی المخاطب بہ بہو خانم کا رنگ گورا رہا ہوگا۔ اور بالفرض ان کا رنگ اگر کھلتا ہوا گندمی بھی رہا ہو تو ترک بیگمات کے رنگ کا مقابلہ کہاں ممکن تھا۔ خود وزیر کو انگریزوں کا پھیکا شلغمی رنگ یا سفیدی مائل سرخ رنگ بالکل بے جان لگتا تھا۔ اکا دکا انگریز بی بیوں کو چھوڑ کر، کہ وہ واقعی خوبصورت تھیں، گوری کھال کی عورتیں وزیر کو بالکل بے نمک لگتی تھیں۔ اے بی میم صاحب جیسی غیر دلچسپ اور چمک دمک سے عاری فرنگنوں سے بہتر تو وہ رتھمبھور کی قبائلی عورتوں کو سمجھتی تھی، کہ ان کے بدن اس قدر سڈول اور چہرے زندگی کی ضو سے اس قدر چمکتے ہوئے ہوتے تھے کہ بس۔ اے بی جیسی فرنگنوں کو دیکھ کر وزیر اپنے دل میں شیخ ناسخ کا شعر ضرور پڑھ دیتی تھی۔

حسن کو چاہیئے انداز و ادا ناز و نمک
لطف کیا گر ہوئی گوروں کی طرح کھال سفید

بچے میاں کی پیدائش کے دو ہی چار پہر بعد وہ دل ہی دل میں اسے دنیا کا حسین ترین بچہ سمجھنے لگی تھی۔ دائی پلائی کے فراہم ہوتے ہوئے بھی وہ چوری چھپے بچے میاں کو تھوڑا بہت اپنا دودھ پلا دیا کرتی اور ہر طرح اس کی اللہ آمین میں لگی رہتی تھی۔

نواب شمس الدین نے بچے کو دیکھا تو پھولے نہ سمائے۔ وزیر کے اوہام کے علی الرغم انھوں نے بچے میاں کے رنگ کے بارے میں ایک حرف بھی نہ کہا بلکہ یہ کہہ کر تعریف کی کہ بہو خانم یہ بالکل آپ پر گیا ہے۔ انھوں نے فوراً زچہ پر سے اکیس سو روپئے نچھاور کر کے غربا کو بانٹے۔ پھر سب دائیوں، نوکروں، اور متوسلین کو مٹھی بھر بھر کے روپئے بانٹے۔ انھوں نے بچے میاں کے کان میں دوبارہ اذان دی اور کہا کہ ہم ان کا نام اپنے مرحوم چھوٹے بھائی کے نام پر محمد ابراہیم علی خان رکھتے ہیں۔ لیکن پکارنے کے لئے ہم انھیں ''نواب مرزا'' پکاریں گے، کیونکہ ہمیں ان میں نوابی اور مرزائی دونوں کی شانیں نظر آتی ہیں۔ یہ نام ''نواب مرزا'' اس قدر مقبول ہوا کہ بہت جلد ہی سب لوگ محمد ابراہیم علی خان کو بھول گئے اور ''نواب مرزا'' سب کی زبانوں پر رواں ہو گیا۔

نواب بیگم

دوسال گذر گئے۔ اور یہ دوسال شمس الدین احمد خان کی زندگی کے سب سے عمدہ سال تھے۔ ریاست پر ان کا تسلط پہلے سے بہتر تھا۔ فصلیں اچھی ہوئیں، بیوپاری ان کے علاقے میں خوب آئے۔ اپنے حسن انتظام سے انھوں نے اپنی عمل داری کی راہیں ٹھگوں، ڈاکوؤں، بٹ ماروں سے بالکل صاف کردیں۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش خان کے زمانے میں علاقہ جات کے محاصل تین سے پانچ لاکھ روپے سالانہ تھے۔ اب محاصل بڑھتے بڑھتے سات سے دس لاکھ سالانہ ہو گئے تھے۔ وزیر خانم سے ان کی محبت روز افزوں تھی۔ نواب مرزا کی ذہانت اور تیزی طبع، شوخیوں، اور معصوم محبوبیت نے باپ ماں، بلکہ سب ہی دیکھنے والوں کے دل موہ رکھے تھے۔ گیارہ مہینے کی عمر میں نواب مرزا اچھی طرح بولنے اور بات سمجھنے لگ گئے تھے۔ دوسال کی عمر آتے آتے انھیں کثرت سے اشعار حفظ ہو گئے تھے اور ان کی طبیعت میں لے اور تان کا احساس اس قدر شدید تھا کہ ڈھائی سال کی عمر میں انھیں اشعار اور چھوٹے موٹے گیت لہک لہک کر گانے میں درک حاصل ہونے لگا تھا۔ فارسی وہ ابھی روانی سے نہ بول سکتے تھے، لیکن فارسی گفتگو وہ کم وبیش ٹھیک سے سمجھ لیتے تھے کیونکہ نواب شمس الدین احمد ان سے بات چیت زیادہ تر فارسی میں کرتے تھے۔ ہر مہینے ان کی خوبصورتی افزوں تھی، اپنی عمر کے بچوں میں وہ اپنی معصوم شوخی اور کھلنڈرے پن کے علاوہ ڈیل ڈول کے اعتبار سے ممتاز لگتے تھے۔ سب لوگوں کو یقین ہو چلا تھا کہ جلد ہی اب نواب شمس الدین احمد اپنی چہیتی بہو خانم سے نکاح کر لیں گے اور ریاست کی ولی عہدی کے لئے نواب مرزا کا نام انگریزی کمپنی اور مہاراجہ الور کے درباروں سے منظور کرا لیا جائے گا۔

اسی اثنا میں نواب شمس الدین احمد نے اپنی بہن نواب بیگم کی شادی بہت دھوم دھام سے کی۔ اگرچہ شادی کی رسمیں سب قلعۂ فیروز پور میں ادا ہوئی تھیں لیکن دلی شہر میں بھی ایک ہفتے تک محتاجوں کو لنگر

تقسیم ہوا اور تین وقت کے تورے خاص خاص احبا اور اقربا کے گھر بھجوائے گئے۔ دولہا نواب زین العابدین خان عارف انیس بیس برس کا خوبصورت اور عالی خاندان لیکن ذرا زرد روسا نوجوان تھا۔ (بعد میں اسے تپ دق تشخیص ہوئی۔) دولہا کے والد شرف الدولہ نواب غلام حسین خان مسرور ابن شرف الدولہ نواب فیض اللہ خان بہادر سہراب جنگ اور نواب شمس الدین احمد خان میں قرابت قریبہ تھی۔ یعنی دولہا کی والدہ بنیادی بیگم صاحب کے والد نواب الٰہی بخش خان معروف تھے جو نواب احمد بخش خان کے سگے چھوٹے بھائی تھے۔ لہٰذا بنیادی بیگم، جو نواب الٰہی بخش خان کی بڑی بیٹی تھیں، نواب شمس الدین احمد کی سگی عم زاد بہن ہوئیں اور بنیادی بیگم کا بیٹا زین العابدین خان عم زاد بھانجا نواب شمس الدین کا ہوا۔ لیکن یہ رشتہ داری اسی پر ختم نہ تھی۔ زین العابدین خان کے پردادا نواب قاسم جان تھے جن کے نام پر دلی میں گلی قاسم جان اب بھی ہے۔ شرف الدولہ کا خطاب انھیں شاہزادہ عالی گوہر نے علاقۂ بہار کے ایک معرکے میں نمایاں خدمات کے صلے میں دیا تھا۔ شاہزادہ عالی گوہر عرف میرزا بلاقی عرف لال میاں جب ابو المظفر جلال الدین عالی گوہر محمد شاہ عالم ثانی کے نام سے تخت نشین ہوئے (۱۷۵۹) تو انھوں نے فرمان جاری کیا کہ شرف الدولہ کا خطاب قاسم جان اور ان کی جانشین اولاد کے لئے دائمی مقرر کیا جاتا ہے۔

قاسم جان تین بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی عارف جان تھے جو احمد بخش خان کے باپ لہٰذا شمس الدین احمد خان کے دادا تھے۔ یہاں یہ بات بھی بے محل نہ ہوگی کہ بنیادی بیگم کی چھوٹی بہن امراؤ بیگم کا نکاح میرزا اسد اللہ خان غالب سے ہوا تھا اور زین العابدین خان عارف کی موت کے بعد غالب اور امراؤ بیگم نے عارف کی دوسری بیگم کے دونوں بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔

ساری نجابت خاندانی، عالی نسبی، اور پشتینی امیر زادگی کے باوجود زین العابدین خان عارف کی مالی حالت کچھ بہت مستحکم نہ تھی۔ انھیں نواب احمد بخش خان کے زمانے سے ڈھائی سو روپے مہینہ نواب کے خزانے سے ملتا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ نواب شمس الدین احمد خان نے بھی برقرار رکھا تھا اور وہی ان کا خاص وسیلۂ آمدنی تھا۔ ولیمے کی دعوت بھی کہنے کو شرف الدولہ کی طرف سے تھی لیکن وہ صرف نام کرنے کو کھڑے کھڑے دعوت گاہ میں ہو لئے تھے۔ سارا انتظام اور صرفہ شمس الدین احمد خان نے کیا تھا۔ دعوت میں ولیم فریزر کو بلایا گیا تھا لیکن وہ شریک نہ ہوا۔ وزیر خانم کی بھی شرکت کہیں نہ ہوئی لیکن شادی کے بعد دولہا دلہن اس سے ملنے اور دعائیں لینے چاندنی چوک کے گھر پر حاضر ہوئے تھے۔

میاں سے نہ بننے کی وجہ سے بنیادی بیگم نے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ شرف الدولہ غلام حسین خان نے کچھ املاک ان کے نام کر کے زین العابدین خان کی پرورش و پرداخت بھی انھیں سونپ دی تھی۔ ایسی صورت میں زین العابدین خان کی تعلیم اور (چونکہ وہ دائم المرض تھے) ان کا علاج معالجہ دونوں ہی ناقص رہے۔ لیکن زین العابدین خان نے وہبی صلاحیت کی بنا پر فارسی میں بہت اچھی، اور عربی، تاریخ و ہیئت وفلسفہ وغیرہ میں معمولی استعداد حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے اپنا تخلص عارف اپنی ماں کے دادا نواب عارف جان کے نام پر اختیار کیا تھا اور امراؤ بیگم کے توسط سے فن شعر میں میرزا اسد اللہ خان کے شاگرد بہت نوعمری ہی میں ہو گئے تھے۔

حالانکہ زین العابدین خان سے شمس الدین احمد کی بہن کا رشتہ زیادہ تر ان کی آپسی اور قدیمی قرابت داریوں کی بنا پر تھا، داماد کی دنیاوی جاہ وثروت کی بنا پر نہیں، لیکن یہ توقع ضرور تھی کہ زین العابدین خان کو فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے علاقہ جات سے کچھ نہ کچھ املاک مل ہی جاویں گی اور زین العابدین خان عارف کو ماہانہ وظیفۂ قدیم کے اوپر دیگر مالی تمتع بھی بہم رہے گا کہ اب تو بھرنے کے لئے ایک سے دو پیٹ تھے اور اللہ نے چاہا تو اولادیں بھی ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر نئی گرہستی کے خرچ، اور وہ بھی امیرانہ خرچ کے لئے روپیہ درکار تھا۔

ایک بہن کو بیاہ کر شمس الدین احمد خان ایک بڑے فرض سے عہدہ برآ ہو گئے تھے اور انھیں امید تھی کہ دوسری کے بھی سر سہرا باندھنے کا افتخار وسعادت انھیں بہت جلد نصیب ہوگا۔ شمس الدین احمد کو یہ توقع تو نہ تھی کہ ولیم فریزر ان سے کینہ توزی نہ کرے گا اور پرانی باتیں بھول جائے گا۔ ریاست کے انتظامی امور میں چھوٹی موٹی رخنہ اندازیاں کمپنی بہادر کی طرف سے ہوتی رہتی تھیں۔ ولیم فریزر چونکہ گورنر جنرل بہادر کا ایجنٹ دربار دہلی ہونے کے ساتھ ساتھ دہلی کا کمشنر بھی تھا اور کمشنری کے ناطے اس کے اختیارات دیوانی وفوجداری اور ممالک زیر نگرانی بہت وسیع تھے، اس لئے اسے شمس الدین احمد کو زک پہنچانے، خفیف کرنے، اور ان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کے مواقع بکثرت ملتے رہتے تھے۔ دوستوں کی محفلوں میں اب ان کی ملاقات نہ ہوتی تھی کیونکہ شمس الدین احمد کسی ایسی جگہ نہ جاتے تھے جہاں ولیم فریزر کی موجودگی کا امکان ہو۔ فرنگیوں کے بڑے دن پر شمس الدین احمد البتہ فریزر کے یہاں جانے اور اس کی ملاقات اور ڈالی پیش کرنے پر مجبور تھے۔ عام طریقے کے خلاف فریزر کی طرف سے جوابی ڈالی بہت معمولی ہوتی تھی لیکن شمس الدین احمد اسے قبول کرنے پر مجبور تھے۔

نواب مرزا تین سال کے ہو گئے (مئی ۱۸۳۴) اور ان کی سالگرہ بڑے چاؤ اور ارمان سے منائی گئی۔ اس کے ساتھ ہی نواب شمس الدین احمد، اور پھر وزیر خانم کی زندگیوں میں طرح طرح کے اختلال، تلاطم، اور آشوب پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اول اول تو لگتا تھا کہ یہ معمولی باتیں ہیں۔ کسی بات کا اثر دیر پا، یا کچھ زیادہ نقصان دہ نہ ہوگا۔ لیکن ایک کے بعد ایک شدائد پہلے سے بھی سخت تر ہوتے گئے۔ سب سے پہلے تو شمس الدین احمد خان کی نو بیاہتا بہن نواب بیگم یعنی زین العابدین خان عارف کی بیوی بیمار رہنے لگیں۔ کئی ہفتے بعد تشخیص ہوئی کہ انھیں پیڑو کی تپ دق ہے۔ شادی کے دوسرے ہی مہینے انھیں استقرار حمل ہو گیا تھا اور اب زچہ کی جسمانی کمزوری کے سبب بچے کی جان کو ڈر تھا۔ یا اس سے بدتر امکان تھا کہ دق کا اثر جنین پر بھی ہو جائے اور وہ معذور یا عیب دار پیدا ہو۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ نواب بیگم کی ہڈیاں، بالخصوص پیڑو کی ہڈیاں شکست پذیر اور بھربھری ہو رہی تھیں۔ خوف تھا کہ بچے کی ولادت دونوں کے لئے موت کا سامان لے کر آئے گی۔ اور یہی ہوا۔ ابھی نواب بیگم کو ساتواں مہینہ تھا کہ انھیں درد لگے اور جریان خون شروع ہوا۔ چوبیس گھنٹے کی خون افشانی اور دردزہ میں نہ بچہ سلامت رہا اور نہ ماں کی جان بچ سکی۔ اس وقت نواب بیگم کی عمر بمشکل اٹھارہ سال کی تھی۔

جہانگیرہ بیگم

ایک بہن کے غم کے ساتھ شمس الدین احمد کو دوسری بہن جہانگیرہ بیگم کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ پیغام تو بہت سے آ رہے تھے لیکن کوئی بھی شمس الدین احمد کی نظر نہ چڑھتا تھا۔ ابھی وہ ہر طرف مشاطائیں دوڑا رہے تھے اور خدا کی بارگاہ میں دست بہ دعا تھے کہ جلد یہ بیل منڈھے چڑھے۔ اچانک انھیں پرچہ لگا کہ فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کی وراثت کے بارے میں لاٹ گورنر جنرل بہادر کے دربار سے کوئی فیصلہ تا حال حاصل نہ ہوسکنے اور صاحب کلاں بہادر کے اظہارات اور یادداشتوں پر وہاں کوئی خاطر خواہ عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے نواب ریزیڈنٹ نے بے صبر ہو کر نواب مستطاب سر چارلس مٹکاف صاحب قائم مقام گورنر جنرل بہادر کی خدمت اقدس میں ایک سرکاری لیکن ذاتی مراسلہ بھیجا ہے جس میں اس بات کی دوبارہ اور مزید زور دے کر سفارش کی گئی ہے کہ شمس الدین احمد کو لوہارو سے بے دخل کیا جائے اور فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان رستم جنگ نے جو تصفیہ وراثت ریاست ہٰذا کا کیا تھا اور جس پر خود چارلس مٹکاف صاحب بہادر کے بھی دستخط تھے، اسے بفور جاری کیا جائے۔

دوسری خبر یہ تھی کہ اس مراسلے کی فرستادگی پر بس نہ کر کے صاحب کلاں بہادر نے فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان مرحوم کے دوسرے بیٹے نواب امین الدین احمد خان کو (کہ اب سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے) تمام کواغذ کی نقول اور تفصیلی اظہار کے ساتھ کلکتہ بھیجا ہے کہ اپنے معاملے کی پیروی خود کریں اور مقدمے کا انفصال اپنے حق میں جلد تر کرانے میں ساعی ہوں۔

کچھ دن بعد یہ خبر بھی شمس الدین احمد کو ملی کہ ان کے عم زاد بہنوئی میرزا اسد اللہ خان صاحب غالب نے کلکتے میں اپنے دوستوں اور شناساؤں کو امین الدین احمد خان کے بارے میں تعارفی اور سفارشی مکتوب بھیجے ہیں کہ وہ وراثت کے مقدمے کا فیصلہ امین الدین احمد خان کے حق میں کرانے کے لئے

کوشاں ہوں۔ شمس الدین احمد کو یہ بات بہت بری لگی کہ میرزا نوشہ بھائی صاحب نے ہماری قرابت داری کا بھی خیال نہ کیا اور آپسی اختلافات کو دشمنی کا رنگ دے کر دنیا کے سامنے بیچ بازار میں لا کھڑا کیا۔ ان کے وظیفے کا فیصلہ تو خلد آشیانی والد صاحب مبرور و مغفور خود فرما گئے تھے۔ اور وہ اگر میرے باپ تھے تو امین الدین احمد و ضیاء الدین احمد کے بھی باپ تھے۔ لہٰذا محل شکایت کا اگر تھا تو صرف مجھ سے نہ تھا۔ اور امین الدین احمد نے قولاً یا عملاً یہ اشارہ بھی کبھی نہ دیا تھا کہ اگر لوہارو انھیں مل گیا تو وہ میرزا نوشہ کا وظیفہ بڑھوا دیں گے۔ میرزا صاحب تو اپنے مقدمے میں کلکتے تشریف لے جا چکے اور وہاں سے بے نیل مرام اور یک بنی و دو گوش محض کے ساتھ مراجعت بھی فرما چکے تھے۔ اب انھیں امین الدین احمد کی جنبہ داری اور میری مخالفت سے کیا نفع متصور تھا، یہ وہی جانیں۔ لیکن میرزا نوشہ بھائی صاحب سے اس امر میں شکوہ کرنے کا کچھ حاصل تھا نہیں، بلکہ اپنی ہیٹی ہی تھی۔ اور تیر بہر حال اب از کماں جستہ تھا۔

اس بات کا امکان ہے کہ ریزیڈنٹی سے جو خطوط وراثت کے مقدمے میں تازہ تازہ جاری ہوئے تھے ان کی کیفیت آشکار ہونے اور صاحب کلاں بہادر کی ترغیب و تدریب سے امین الدین احمد کے کلکتہ بھیجے جانے کی خبر کے بھی افشا ہونے میں ولیم فریزر کا اشارہ رہا ہو اور اس افشائے راز کا مقصد شمس الدین احمد کو ذلیل اور شرمندہ کرنا ہو۔ توثیق اس امکان کی اس امر سے ملتی تھی کہ اسی زمانے میں شہر میں یہ افواہ گشت کرنے لگی تھی کہ صاحب کلاں بہادر نے نواب شمس الدین احمد کی بہن جہانگیرہ بیگم کے لئے پیغام دیا ہے کہ ہمارا نکاح ان بیگم سے ہو جائے تو کمپنی بہادر مقدمۂ وراثت میں نواب شمس الدین احمد کے دعوے پر ہمدردی سے غور کر سکتی ہے۔

ان افواہوں کے نتیجے میں شمس الدین احمد کو بے نہایت خجالت نصیب ہو رہی تھی۔ یہ باتیں اس کے دل و جان میں بچھو کے کانٹے کی طرح کھٹک پہنچا رہی تھیں۔ فریزر پر اس کا بس چل نہ سکتا تھا اور نہ ہی یہ بات ثابت ہو سکتی تھی کہ ان افواہوں اور حرکتوں میں اس کا ہاتھ ہے۔ دلی چھوڑ کر فیروز پور جا رہنے میں سبکی بھی تھی اور مسائل کا کوئی حل بھی نہ تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ شمس الدین احمد کسی موقعے پر مجمع عام میں ولیم فریزر کو ذلیل کریں اور اس کے لئے دشنام اور سب و شتم کی قسم کے الفاظ بے تکان استعمال کریں۔ اس میں ایک طرح کی اخلاقی فتح مندی تو انھیں حاصل ہوتی اور دل بھی ان کا کچھ ٹھنڈا ہوتا۔ لیکن یہ کوئی طویل المدت حل نہ تھا، بلکہ قلیل المیعاد بھی حل نہ تھا۔ بس چار دن کی سنسنی ہوتی۔ ہاں دلی کے بے فکروں کو قہوہ خانوں اور قمار بازی کی پھڑوں اور بٹیر بازی یا مرغ بازی کی پالیوں جیسی عامیانہ جگہوں پر گپ اور مزید افواہیں اڑانے کا

موقع ضرور ہاتھ آجاتا۔ لیکن یہ بھی امکان تھا کہ نواب کے جارحانہ اور توہین آمیز برتاؤ پر فریزر کے محافظ حرکت میں آجاتے اور شمس الدین احمد پر تلوار یا گولی چلا دیتے۔ لہٰذا ولیم فریزر کو سرِ عام گالیاں دینے یا دلوانے میں نواب کے دل کی کھولن ضرور تھوڑی دیر کے لئے کم ہو جاتی لیکن اور کوئی فائدہ اس میں نہ تھا۔ نقصان کی گنجائش بہر حال تھی۔

اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے نواب شمس الدین احمد خان کی آنکھوں کے آگے خونیں غبار کا ایک پردہ کھینچ دیا اور قریب تھا کہ وہ تلوار کھینچ کر فریزر پر حملہ کر دے۔ یہ جولائی ۱۸۳۴ کے اواسط تھے۔ اس سال برسات خوب ہوئی تھی۔ ساری دہلی پر طرح طرح کے ہرے رنگوں کے غبارے اور جھنڈیاں سی اڑتی نظر آتی تھیں۔ گلی کوچوں میں بھی لوگوں کے لگائے ہوئے پودے خوب بہار دے رہے تھے، بقول میرزا نوشہ ؎

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موج ہستی کو کرے موج ہوا موج شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل
موجۂ سبزۂ نو خیز سے تا موج شراب

ایک شام ولیم فریزر کا جلوس ہوا خوری بلی ماراں اور پھر گلی قاسم جان کی طرف جا نکلا۔ (ممکن ہے کہ ''جا نکلا'' درست نہ ہو اور ولیم فریزر نے جان بوجھ کر فیل بان سے کہہ کر اپنے ہاتھی کا رخ اس خطۂ شہر کی طرف موڑا ہو اور اس کے دل میں نواب شمس الدین احمد کے خلاف کوئی مذموم ارادہ پہلے سے رہا ہو۔ پرچہ نویسوں نے اسے خبر دے رکھی تھی کہ شمس الدین احمد دلی ہی میں ہیں اور اس وقت اپنی حویلی واقع بلی ماران میں قیام پذیر ہیں۔) جس وقت فریزر کا ہاتھی گلی قاسم جان میں حویلی حسام الدین حیدر کے پھاٹک پر پہنچا ہے اسی وقت نواب شمس الدین احمد اپنے دوست مظفر الدولہ ناصر الملک میرزا سیف الدین حیدر خان بہادر سیف جنگ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حویلی کے پھاٹک سے برآمد ہو رہے تھے۔ فریزر کا ہاتھی ساڑھے تین گز اونچا، اس پر ڈیڑھ ہاتھ بلند عماری، فریزر گویا آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ شمس الدین احمد کشیدہ قامت تھے اور میرزا سیف الدین حیدر کی قامت ان سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوہ پیکر ہاتھی کے سامنے دونوں پستہ قد بلکہ بونے لگ رہے تھے۔ اور یوں بھی، بیٹھے ہوئے کے آگے کھڑے ہوئے کو اپنے اندر نقص اور کوتاہی کا احساس ہوتا ہے۔

فریزر نے ہاتھی رکوایا اور مصنوعی شگفتگی کے لہجے میں بولا:

’’مظفر الدولہ۔ دلاور الملک۔ تسلیمات گذارش کرتا ہوں۔‘‘

نواب شمس الدین احمد کے پہلے سیف الدین حیدر کا نام لینے میں شمس الدین احمد کی توہین کا اشارہ تھا۔ سیف الدین حیدر اگرچہ نجابت اور قدامت نسبی کے لحاظ سے بزرگ تر تھے، لیکن شمس الدین احمد بھی بہرحال باپ کی طرف سے سید تھے اور ایک بہت بڑی خودمختار ریاست کے مالک تھے درحالے کہ سیف الدین حیدر کی رئیسی کی بنیاد اب محض چند مکانات و دکاکین اور چند قطعہ دیہات تھے۔ شمس الدین احمد نے خون کا گھونٹ پی کر ایک سلام کیا اور جواباً کہا:

’’نواب ریزیڈنٹ بہادر سلمکم اللہ تعالیٰ۔ خوب ملاقات ہوئی۔ بندگی عرض کرتا ہوں۔‘‘

فریزر کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ اسی طرح برقرار تھی۔ لیکن اب اس کا لہجہ پہلے کی طرح صاف نہ تھا بلکہ فرنگی انداز لئے ہوئے تھا:

’’اور دلاور الملک، جہانگیرہ بیگم اب کیسی ہیں؟ سنا تھا نصیب دشمناں ان کا مزاج ناساز ہے۔ جی چاہے تو نور باغ میں جھولے ڈلوا دیئے جائیں، وہاں تشریف لے آئیں، دل بہل جائے گا۔‘‘

ایک عالم اس گفتگو کو سانس روکے ہوئے سن رہا تھا۔ اور نواب شمس الدین احمد کا تو یہ حال تھا کہ آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے لیکن کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ دلی سے کچھ باہر آزاد پور میں واقع نور باغ ایک وقت میں فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان رستم جنگ، یعنی نواب شمس الدین احمد کے باپ کی ملکیت تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الور کی مسند نشینی کے لئے بلونت سنگھ اور ونے سنگھ کے دھڑوں میں کشاکش تھی اور نواب احمد بخش خان کا رجحان بلونت سنگھ کی طرف تھا۔ نواب احمد بخش خان کے رسوخ سے گھبرا کر ونے سنگھ نے چند میواتیوں کو احمد بخش خان کے قتل پر مامور کیا کہ نواب نہ رہیں گے تو بلونت سنگھ کا ہاتھ کمزور پڑ جائے گا۔ حملہ آور جب مستعد قتل ہوئے تو اس وقت نواب احمد بخش خان آزاد پور میں تھے اور نور باغ کی بارہ دری میں آرام کر رہے تھے۔ ایک قاتل دیوار پھاند کر اندر پہنچا اور اس نے نواب پر تلوار چلا دی۔ بارے وار اوچھا پڑا اور نواب کی صرف ایک چھنگلیا کٹ گئی۔ اسی وقت احمد بخش خان کے محافظوں نے قاتل کو آلیا اور اس طرح قتل کی سازش ناکام ہوگئی۔

اس واقعے کے نتیجے میں نواب احمد بخش خان کا دل نور باغ سے اس قدر برگشتہ ہوا کہ انھوں نے اسے جنرل اختر لونی کے ہاتھ اونے پونے بیچ دیا۔ اختر لونی کی موت کے بعد اس کی مسلمان بیوی

مبارک النسا بیگم نے یہ باغ ولیم فریزر کے رشتے کے بھائی سائمن فریزر (Simon Fraser) کے ہاتھ اور بھی کم داموں میں بیچ دیا۔ سائمن فریزر ان دنوں دلی میں سٹی مجسٹریٹ اور ولیم فریزر کا نائب خاص تھا۔

جہانگیرہ بیگم کا نام یوں لینا، اور وہ بھی بھرے بازار میں غیروں کے سامنے، ایسی توہین تھی کہ جس پر تلواریں نکل آتیں تو غیر مناسب نہ تھا۔ مخدرات شرفا کا نام غیر مردوں کی زبان پر آئے، اسے خاندان کی انتہائی ذلت سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کے معنی یا مضمرات یہی تھے کہ اس بی بی اور نام لینے والے میں آشنائی ہے۔ یا آشنائی وغیرہ کچھ نہ سہی، یہ پردہ نشینی کی شان کے خلاف تھا کہ کسی شریف زادی کا نام غیر مرد کی زبان پر آئے۔ اور نام لینے والا انگریز ہو، اور وہ بھی ولیم فریزر جیسا بدنام زمانہ عیاش انگریز، پھر تو سب کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ فریزر، یا کوئی بھی غیر، جہانگیرہ بیگم کا نام بھی نہ لیتا، صرف یہ پوچھ دیتا کہ آپ کی ہمشیرہ صاحب کیسی ہیں، تو یہ بھی بے انتہا موجب خفگی تھا۔

سیر باغ کی دعوت یوں ہی توہین آمیز تھی، چہ جائے کہ یہ دعوت جو اس طرح دی گئی تھی گویا شمس الدین احمد کی بہنوں کے لئے نور باغ کی سیر روز کا نہیں تو ہفتے عشرے کا معمول ضرور رہی ہو۔ نور باغ کے مذکور میں بھی کئی کنائے تھے۔ کنائے کیا، زہر میں بجھے ہوئے کانٹے تھے جو شمس الدین احمد کے کانوں میں چبھوئے گئے تھے۔ نور باغ تمھارے باپ کی ملکیت رہا ہوگا، لیکن اب ہماری ملکیت ہے۔ جس جگہ جہانگیرہ بیگم کے باپ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا وہاں اب جہانگیرہ خوش فعلیاں اور اٹکھیلیاں کرنے آتی تھی، یا آسکتی تھی۔ ایک کنایہ یہ بھی تھا کہ تم جیسوں کے گھرانے کی عورات کے لئے شہر یا قلعے کے اندر کوئی باغ نہیں، شہر سے دور انگریز کے باغ میں منھ چھپا کر آؤ تو آؤ۔

شمس الدین احمد خان کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا تھا۔ انھوں نے ایک قدم آگے بڑھا کر تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ سیف الدین حیدر خان نے ان کی کہنی مضبوطی سے پکڑی اور منھ ہی منھ میں کہا، ''رک جاؤ۔ کیا کرتے ہو۔'' نواب شمس الدین احمد خان نے ایک گہری سانس لی، پھر آہستہ آہستہ ایک ذرا سی سسکی کے ساتھ سانس کو باہر نکالا، پھر پورے اطمینان سے پیٹھ موڑ کر حویلی حسام الدین حیدر کے پھاٹک کی اونچی دہلیز چڑھنے لگے، گویا فریزر اور اس کا جلوس اور جہانگیرہ کے باب میں اس کا استفسار، یہ باتیں وجود ہی نہ رکھتی ہوں۔ اس میں فریزر کی توہین تھی، لیکن شمس الدین احمد کی جو ہتک اس نے کی تھی اس کے آگے اس کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ فریزر ایک ہلکی سی زہریلی مسکراہٹ مسکرایا:

''مظفر الدولہ بہت باتدبیر اور دور اندیش شخص ہیں، ماشاء اللہ۔ بندگی عرض کرتا ہوں۔'' بہت

صاف لہجے میں یہ فقرے کہہ کر اس نے اپنا ہاتھی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر میں جلوس آگے نکل گیا اور اس کے جاتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے در و دیوار، بام و کاخ، حاضرین، سب نے اطمینان کی سانس کھینچی ہو۔ نواب شمس الدین احمد نے اپنی حویلی واقع بلی ماران سے سواری منگوائی اور اس میں بیٹھ کر عازم چاندنی چوک ہوئے۔

وزیر خانم نے نواب کے تمتمائے ہوئے چہرے اور بدن میں ہلکی سی لرزش سے سمجھ لیا کہ کوئی ناشدنی ہوئی ہے اور یہ اس کی مزید فراست تھی کہ اس نے خیال کیا کہ فریزر صاحب کا کچھ معاملہ ہے۔

''کیوں خیر تو ہے۔ کیا ریزیڈنٹ سے کوئی بات ہو گئی؟'' اس نے نواب کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔ ''اللہ آپ کے تو ہاتھ بالکل برف ہو رہے ہیں۔ ایسا بھی اپنا جی کیا ہلکان کرنا۔ چھوڑیے۔ جو ہوا اسے درگذر کیجیے۔''

''کیسے درگذر کر دوں۔ میرے تو دروئے میں دوں سی دہک رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی جا کر حرامزادے کی گردن اڑا دوں۔''

اب تو وزیر گھبرا گئی۔ ''اے ہے بھلا کیا ہوا۔ بارے کچھ کہیے تو سہی۔ یوں غصہ نہیں کرتے۔ ذرا ٹھنڈے ہو جیے۔ نواب مرزا کو کھلائی باہر لے گئی ہے۔ انھیں بلوائے دیتی ہوں آپ کا جی بہل جائے گا۔''

''ان بہلاؤوں سے کچھ نہ ہوگا چھوٹی بیگم۔ اب میں یہ قصہ قطع کر کے ہی رہوں گا۔''

''اچھی کچھ معلوم تو ہو کس بات نے آپ کو اس قدر بے دماغ کر دیا۔ لیجیے شربت ملاحظہ کیجیے۔'' اس نے راحت افزا کو آواز دے کر شربت انار منگوایا۔ ''میں پنکھا جھلاتی ہوں آپ آرام چوکی پر پاؤں پھیلا کر دراز ہو جیے۔ میں آپ کی جوتیاں اتارے دیتی ہوں قبا کے بند ڈھیلے کیے دیتی ہوں۔''

یہ کہتے کہتے وزیر نے سر اٹھایا تو وہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی کہ نواب کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ ایک لمحے کو وہ سکتے میں آ گئی کہ اب کیا کہوں کیسے انھیں تسلی دوں۔ نواب شمس الدین احمد کرسی کی پشت سے پیٹھ لگا کر پاؤں پھیلا کر نیم دراز ہو گئے تو وزیر نے جلدی سے اپنے آنچل سے ان کا منھ پونچھا یعنی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ ان کے آنسو خشک کر رہی ہے۔ بڑے اصرار سے اس نے شربت کے دو گھونٹ نواب کو پلائے، پھر بولی:

''اب بتا تو دیجیے کہ بات کیا ہوئی۔''

''بات کیا ہوتی۔'' شمس الدین احمد نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''ہمارے طالع اب

گردش میں ہیں۔ لگتا ہے صحیح راستہ ہی بھول گئے ہیں۔ آج بھرے بازار میں قرم ساق ولد الحرام نے میری پگڑی اچھال دی۔''

''خدا خیر کرے۔ ایسا کہاں ہو سکتا ہے۔ اس کی یہ ہمت تو نہ تھی۔''

''بس ہو ہی گیا۔ کہہ دیا نہ کہ ستارے ناموافق ہوں تو اچھی بات بھی خراب اثر دیتی ہے۔ میں آج شام سیف الدین حیدر کے یہاں ان کی بیمار پرسی کو گیا تھا۔ بارے ان کی طبیعت اب ٹھیک نکلی۔ وہ ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں دے کر اپنی حویلی کے دروازے تک مجھے پہنچانے آئے تھے کہ یہ سانحہ ہو گیا۔''

پھر نواب نے پورے واقعے کی تفصیل بتائی اور کہا:

''میں نے ایک بار آپ سے کہا تھا نہ کہ جس طرح چچا بھتیجے کے رشتے کو دفن کر رہا ہوں اسی طرح ایک دن فریزر کو بھی زمین میں گاڑ دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے وہ دن آگیا ہے۔ آج میں اس کی جان لئے بغیر نہ رہوں گا۔''

''سرکار آپ کو خدا رسول کا واسطہ یوں نہ کہئے۔ اور نہ سوچئے۔ بھلا سب سے اول یہ تو غور فرمائیے کہ آج کے واقعے کی جڑ بنیاد کیا ہے؟''

''کیا مطلب؟ فریزر کے کمینہ پن کے سوا اور جڑ بنیاد کیا ہو سکتی ہے؟''

''سو تو ٹھیک فرماتے ہیں سرکار۔ لیکن بندی کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلی بات اس وقت جہانگیرہ بی بی کی ہے۔ ان کی عزت اور حفاظت سب پر اولیٰ ہے۔''

''تو پھر؟ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' شمس الدین احمد نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔

''میں عرض کرتی ہوں کہ کوئی مناسب بر دیکھ کر جہانگیرہ بیگم کے ہاتھ پیلے کر دیجئے۔ جلد از جلد۔ ہو سکے تو ایک آدھ مہینے میں یہ مبارک کام ہو جانا چاہئے۔ آخر ساری بات یہیں سے تو نکلی ہے۔ آج جہانگیرہ بیگم اپنے گھر کی ہوتیں تو وہ خنزیر خوار مرنے جوگا مسٹنڈا ایسی بات کیونکر کہہ سکتا تھا؟ اور اول تو ساری دنیا جانتی ہے کہ ہماری جہانگیرہ بی بی کی عصمت وعفت کی فرشتے قسم کھاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی شادی ہو جاوے گی تو وہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توپ دی جاوے گی۔''

نواب نے پر تفکر لہجے میں جواب دیا، ''بات تو آپ کی کچھ ٹھیک لگتی ہے لیکن کوئی رشتہ بھی تو ہو۔''

''او ہی آپ جیسے کو جہانگیرہ بیگم جیسی چندے آفتاب چندے ماہتاب بہن کے لئے رشتوں کا کیا کال۔ بس ذرا دھیان سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔''

"ٹھیک ہے۔ بات سمجھ میں آتی ہے۔ میں بہت جلد جہانگیرہ کا انتظام کر دوں گا۔ لیکن اس نابکار کو سر چنگ پہلے دوں گا۔ میں ابھی ریزیڈنٹی کو جاتا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے نواب اٹھ کھڑے ہوئے، خود ہی جوتیاں پہنیں، قبا کے بند درست کئے اور سیڑھیوں سے کھٹ کھٹ اترتے چلے گئے۔ وزیر "آپ کو خدا رسول کی قسم، آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ، سنئے تو سہی۔ وہاں نہ جایئے" کہتی ہی رہ گئی۔

مارا میان بادیہ باراں گرفتہ است

شمس الدین احمد نے گھوڑا گاڑی میں قدم رکھتے ہی گاڑی بان سے کہا:

''ریزیڈنٹی چلو۔ ابھی اسی وقت۔''

گاڑی بان تذبذب میں پڑ گیا۔

''عالی جاہ۔ کچھ عصا بردار کچھ برچھیت ساتھ لے لیں؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یہیں بلی ماروں کی حویلی سے مل جائیں گے۔''

شمس الدین احمد کے جی میں آئی کہ گاڑی بان کو چابک رسید کر کے کہیں، ''تیرا کام مشورہ دینا نہیں، تعمیل کرنا ہے۔'' لیکن اس وقت ان کی عقل ان کے دل پر حاوی آ گئی۔ وہ ایک لمحہ چپ رہ کر بولے، ''ٹھیک ہے۔ مگر عجلت کرو، وقت کم ہے۔''

شمس الدین احمد پر ہر طرف سے نحوست کی بارش ہونے لگی تھی اور وہ بے چھتری سائبان تھے۔ وہ اس وقت اذا حاق القضاء ضاق الفضاء کے مصداق تھے کہ جب قضا قریب آ جاتی ہے تو فراخ جگہ بھی تنگ ہو جاتی ہے۔ ان کے اوپر دلی کی سرزمین کے تنگ ہو جانے کا وقت آ گیا تھا۔ اگر وہ اس وقت ریزیڈنٹی نہ جاتے تو بھی انجام شاید وہی ہوتا۔ لیکن وہاں جا کر انھوں نے اپنے انجام نافرجام کی جانب ایک اور قدم اٹھا لیا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھڑی میں شمس الدین احمد، ان کے جلو میں دو سوار، اور دائیں بائیں چار برچھا بردار ریزیڈنٹی کے پھاٹک پر پہنچے تو انھوں نے پھاٹک کو بند پایا۔ شمس الدین احمد خان اپنے پرانے خیالوں میں تھے کہ میں کھلے ہوئے پھاٹک سے درانہ اندر گھستا چلا جاؤں گا۔ یا اگر پھاٹک بند بھی پایا گیا تو ڈانٹ ڈپٹ سے کھلوا لوں گا۔ لیکن فریزر تو ایک کائیاں تھا اور وہ شمس الدین احمد کے بارے میں ان کے زمانہ

طفولیت سے واقف تھا کہ شمس الدین احمد جتنا مغرور المزاج، ضدی اور جلد باز ہے اتنا ہی شجاعت ذاتی، جرأت عملی، اور ہمت جنگی سے بہرہ ور ہے۔ لہٰذا کچھ عجب نہ تھا کہ شام کے واقعے کے بعد وہ ریذیڈنٹی میں کسی وقت بھی آدھمکتا اور فریزر سے کسی نہ کسی نہج پر برسرپیکار ہوتا۔ لہٰذا اس نے حفظ ماتقدم کرلیا تھا اور ایسا انتظام کیا تھا جس میں حفاظت خود اختیاری کے علاوہ شمس الدین احمد کی تذلیل کا بھی سامان ہو سکے۔

بند پھاٹک کے پیچھے محافظ خانے کے دو پہرے دار حسب معمول دو گاڑے کاندھوں پر لئے کھڑے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ پھاٹک کھلا نہ تھا اور وہ پھاٹک کے دونوں سروں پر نہ تھے بلکہ بند پھاٹک کے پیچھے اور بیچ میں تھے۔ ان کے ساتھ چار بکسریئے مسلح و مکمل، کاندھے پر فرانسیسی قرابین رکھے کھڑے ہوئے تھے، اس طرح کہ ان چھ نے پھاٹک کی پوری وسعت پر قبضہ کرلیا تھا اور اگر پھاٹک بزور یا کسی ترکیب سے کھول بھی لیا جاتا تو ان سنتریوں کو راستے سے ہٹا کر ہی آگے بڑھنا ممکن تھا۔

''کیا بات ہے پھاٹک کیوں نہیں کھولتے؟ دیکھتے نہیں سرکار ملاقات کو تشریف لائے ہیں۔'' شمس الدین احمد کے ایک سوار نے آگے بڑھ کر ملائمت لیکن مضبوطی کے لہجے میں کہا۔

وہاں تو سب سدھے ہوئے تھے، ایک سنتری نے چالاک مسکراہٹ مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہماری کیا مجال جو پھاٹک نہ کھولیں لیکن صاحب کلاں بہادر سکھ کر گئے ہیں۔ ان کے حکم بغیر ہم کسی کو اندر نہ آنے دیں گے۔''

''سکھ کر گئے ہیں'' کا فقرہ شمس الدین احمد کے کانوں میں تیزاب بن کر ٹپکا۔ ''سو جانے'' کے لئے یہ محاورہ صرف بادشاہ ذی جاہ کے لئے بولا جاتا تھا۔ دوسروں کے لئے مناہی نہ تھی، لیکن ایک رسم سی بن گئی تھی اور قلعے کے باہر یہ محاورہ رائج بھی نہ تھا۔ اس دو ٹکے کے مجہول النسب فرنگی کی یہ مجال کہ ہمارے بادشاہ دیں پناہ کے لئے جو فقرہ استعمال ہوتا ہے اسے یہ ہتھیا لے! ملک تو یہ لوگ لئے ہی جا رہے ہیں۔ اب ہمارے خاص روزمرے اور محاورے بھی اپنے اوپر صرف کرنے لگے۔ لیکن شمس الدین احمد نے اس وقت جھگڑا نہ بڑھانے ہی میں بہتری جانی اور بولے:

''شہباز خان۔ اس سے کہو کہ اندر جا کر خبر کرے۔''

''جی جناب،'' کہہ کر شہباز خان نے یہی بات سنتری سے ان لفظوں میں کہی کہ ولی نعمت فرماتے ہیں اندر جا کر اطلاع کی جائے اور پھاٹک کے کھلوانے کا بندوبست کیا جائے۔

بکسریا کچھ اس انداز سے مسکرایا گویا وہ اندر کی کوئی بات جانتا ہو جو کسی اور کو، اور خاص کر

نوواردان کو، بالکل معلوم نہ تھی۔ ''جی بہت اچھا'' کہہ کر وہ اطمینان سے چلتا ہوا کوٹھی کی طرف بڑھا حتیٰ کہ موڑ پر سے اوجھل ہو گیا۔ اور پھر ایک ہی دو ثانیوں میں واپس آ کر اس نے کہا:

''کھان صاحب۔ بڑے صاحب کا حکم ہے کہ نواب صاحب پا پیادہ ہو جائیں تو اکیلے ہی اندر آ سکتے ہیں۔''

شہباز خان نے یہ بات دبے دبے لہجے میں شمس الدین احمد سے کہی تو انھوں نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا: ''نواب ریزیڈنٹ کو مطلع کر دیا جائے کہ ہم پا پیادہ ہو جائیں گے لیکن دو برچھیت ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہم اپنے محافظوں کے بغیر کہیں نہیں جاتے۔''

نواب شمس الدین احمد کی بات بکسریئے نے خود سن لی کیونکہ اس بار نواب کی آواز خاصی بلند تھی۔ بکسریا اسی طرح واپس گیا اور اسی طرح جلد لوٹ آیا۔ اس نے کہا: ''نواب صاحب اپنے برچھیتوں کے ساتھ آ سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے محافظ خانے کے پہرے دار کو اشارہ کیا کہ پھاٹک کھول دیا جائے۔ پھاٹک کھلا، نواب گاڑی سے اترے اور دائیں بائیں برچھیتوں کو لئے اندر بڑھتے چلے گئے۔ پہرے داروں اور سپاہیوں نے جھک کر سلام کرتے ہوئے راستہ دے دیا۔ ایک برچھیت نے دستی روشن کر لی تھی لیکن دوسرے ہاتھ میں ننگا برچھا بدستور رہنے دیا تھا۔ دوسرے کے دونوں ہاتھوں میں برچھا تھا۔

اس بات کا تو اندیشہ نہ تھا کہ اندھیری ابر آلود اترتی ہوئی رات اور اندرونی سڑک کے دو رویہ گھنے درختوں، جھاڑی جھنڈیوں اور عام طور پر ہریالی کے سبزی مائل اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر پا پیادہ چلتے ہوئے نواب کو بے خبری میں مار لیا جائے گا لیکن دونوں برچھیت ہر طرح سے چوکنے تھے اور نواب کے بالکل نزدیک، تقریباً ان کے بدن سے بدن ملائے ہوئے ان کے آگے پیچھے چل رہے تھے، ایک ذرا دائیں جانب تھا اور دوسرا کچھ بائیں جانب۔ دستی بردار بائیں جانب تھا اور وہ نواب کے کچھ آگے یوں چل رہا تھا کہ روشنی راستے پر تو پڑے لیکن نواب کا جسم نسبتہً اندھیرے میں رہے۔ خود نواب گردن سیدھی کئے نپے تلے قدم رکھ رہے تھے۔ ان کو پا پیادہ ہونے پر مجبور کر کے فریزر نے پہلی چال تو جیت لی تھی لیکن ان کے خیال میں ابھی کئی اور مہرے بساط پر تھے۔ وہ اسی خیال میں گم چلے جا رہے تھے کہ فریزر کا سامنا ہونے پر مجھے کیا کرنا چاہئے۔

کوٹھی کا باہری برآمدہ اور اس کی صدر سیڑھیاں سامنے آ گئیں۔ لیکن وہاں نہ کچھ روشنی تھی، اور نہ کوئی نوکر جس سے خبر کرائی جاتی۔ کسی خانساماں یا خود فریزر کا برائے استقبال کھڑے ہوئے ملنے کا تو خیر

مذکور کیا تھا۔ جس برچھیت کے ہاتھ میں دستی تھی وہ نواب کے ساتھ آگے آگے سیڑھیاں چڑھا کہ صدر دروازے پر لگے ہوئے حلقۂ درکو ہلائے۔ اب ایک برچھیت برآمدے کے نیچے کھلی جگہ پر تاروں سے خالی آسمان تلے اندھیرے میں اکیلا تھا۔ دفعۃً پیچھے سے دو تنومند میواتیوں نے آکر اس کے ہفتے گانٹھ لئے۔ اس نے لنگر قائم کرنا چاہا، لیکن حریف زبردست تھا، لنگر کب قائم ہونے دیتا۔ کچھ زور کر کے دونوں نے برچھیت کا لنگر اکھاڑا، اور اس کو زمین سے ذرا اوپر اٹھا کر کہا:

''خان صاحب بس چپ چاپ پھاٹک پر واپس چلے چلو نہیں تو جان کی خیر نہیں۔''

نواب اور دستی بردار نے چونک کر دیکھا۔ اچانک ایک اور میواتی نے اندھیرے سے نکل کر بنوٹ کا ایسا داؤ کیا کہ برچھیت کی دونوں کہنیوں پر ضرب شدید پڑی، درد اتنا سخت تھا گویا کہنیاں ٹوٹ ہی جائیں گی۔ ایک جھٹکے کے ساتھ برچھیت کے بازو سیدھے ہوئے، مٹھیاں کھلیں، اور دونوں برچھے کھڑکھڑاتے ہوئے زمین پر آرہے۔ برچھیت کے منھ سے زور کی سسکار نکلی اور اس نے کہنی کی مضروب ہڈیوں کو سہلانا چاہا لیکن انگلیوں میں جان نہ پائی۔ اسی وقت دربار کمرے کا دروازہ کھلا اور دو تلنگوں نے نواب کے ساتھ والے برچھیت کو نہتا کر کے اس کے بھی ہفتے گانٹھ لئے۔ دستی زمین پر گری، اس کا فانوس ٹوٹ گیا۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اور زمین پر گرنے کی دھمک نے دستی کی شمع کو بجھا دیا۔ اب برآمدہ تقریباً بالکل اندھیرا تھا اور نواب شمس الدین احمد گویا ارض غنیم میں تنہا کھڑا تھا۔ دونوں برچھیتوں کو ان کے حملہ آور تیز تیز دھکیلتے، بلکہ تقریباً دوڑاتے ہوئے، پھاٹک کی طرف لے جا رہے تھے۔ ہفتے گانٹھ لئے جانے اور لنگر اکھڑ جانے کے بعد آزاد ہونے کی سعی بے سود تھی، ان کے پاؤں زمین پر اس طرح ٹکے ہوئے تھے جس طرح کسی بھاری جانور کی گردن کمر اور پٹھے باندھ کر اسے زمین پر گھسیٹے لئے پھرتے ہیں۔ دونوں برچھیت شرمندگی کے باعث آنکھیں بند کئے ہوئے تھے اور نواب کی طرف رخ کرنے کی بھی کوشش نہ کر رہے تھے۔

شمس الدین احمد نے یہ بات فوراً سمجھ لی تھی کہ ہمیں پا پیادہ کرنے اور صرف دو برچھیت اندر لانے پر اصرار دراصل سازش تھی کہ ہمیں بآسانی تنہا اور نہتا کر لیا جائے۔ اب اس کے بعد جو بھی سلوک ہو۔ ممکن ہے مجھے گولی ماردیں اور پھر بہانہ کریں کہ ہم سمجھے تھے کوئی چور اندر گھس آیا ہے۔ ان کے برچھیت جو اس ذلت کے ساتھ باہر کو دوڑائے جا رہے تھے، انھوں نے ''بچاؤ! بچاؤ!'' کی آواز ایک دو بار اس امید میں اٹھائی کہ ہماری آواز شاید نواب کے دوسرے سپاہیوں تک پہنچے اور وہ دوڑ کر اندر آجائیں

اور نواب کی محافظت کرلیں۔ لیکن اول تو ان کی آواز باہر نہیں پہنچ رہی تھی، لیکن اگر پہنچ بھی جاتی تو عبث تھا کیونکہ نواب کے اندر آتے ہی پھاٹک فوراً بند کر دیا گیا تھا اور چھ محافظ وہاں حسب سابق تعینات تھے۔

نواب نے تلوار نکال لی اور برآمدے کے ایک بڑے کھمبے سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہو گئے۔ جب نواب کے برچھیوں کے گھسٹتے ہوئے قدموں کی آواز معدوم ہوگئی تو کمرے میں روشنی ہوئی، اس کا دروازہ پھر کھلا اور ولیم فریزر شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے نمودار ہوا۔

''بھتیجے، یہ تم ہو! اس طرح تلوار سونتے ہوئے اندھیرے میں... میں اگر تمھیں چور یا قاتل سمجھ کر گولی مار دوں تو...؟ نہیں میں تو گولی نہ چلاتا لیکن یہ سنتری حرام زادے پرلے سرے کے احمق ہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''لیکن تم یہاں اس وقت کیا کرنے آئے؟''

شمس الدین احمد نے زہر خند کے ساتھ کہا، ''ولیم فریزر چچا جان سے ملاقات کرنے کے لئے کسی وقت یا موقعے کا تعین ضروری تو نہ تھا۔''

''کیوں، کیا شام کی ملاقات کافی نہ تھی؟''

''اسی کا تو حساب بے باق کرنے آیا ہوں۔'' شمس الدین نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ان کی تلوار اٹھی ہوئی تھی۔

فریزر نے تالی بجائی۔ چھ مسلح سپاہی نمودار ہوئے، گویا اشارے کے منتظر رہے ہوں۔ دو نے جھپٹ کر شمس الدین احمد کا دایاں اور بایاں بازو تھاما۔ دو آگے پیچھے اس طرح کھڑے ہوگئے کہ شمس الدین احمد کو جائے حرکت نہ رہی۔ پیچھے والے ایک تلنگے نے ہاتھ بڑھا کر کہا:

''نواب صاحب، یہ تلوار غلام کو دے دیں۔''

شمس الدین احمد تھوڑا سا بائیں گھومے، گویا پینترا بدل رہے ہوں۔ پھر انھوں نے تلوار والا ہاتھ نیچے کر کے اچانک اسے بلند کیا اور پھر تلوار یوں گھمائی کہ تلنگے کا شانہ نشانہ ہوگیا۔ اگر انتہائی مشاقی اور مہارت کا اظہار کرتے ہوئے نواب نے بالکل آخری وقت پر اپنا ہاتھ ہلکا نہ کرلیا ہوتا تو تلوار کم سے کم چار انگل شانے میں اتر جاتی۔ اس وقت تو بس یہ ہوا کہ کہ تلوار کی دھار تتلی کی سی آہستگی سے تلنگے کے شانے پر بیٹھی اور مونڈھے کے کپڑے کو کاٹتی ہوئی شانے پر خون کی باریک سی ایک لکیر چھوڑ گئی۔

''آئندہ ایسی گستاخی کی تو تیری زبان کے ٹکڑے کر کے تیرے حلق میں ٹھونس دوں گا۔'' شمس الدین احمد نے سرد لہجے میں کہا۔ تلنگا جو پہلے ہی سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا، ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر

بولا، ''سرکار مالک ہیں۔''

''صاحب زادے، بہت خوب۔'' فریزر نے قہقہہ لگا کر کہا۔'' آخر ہونہ دلاور الملک رستم جنگ کے بیٹے!'' وہ دفعۃً خشک اور سنجیدہ ہو گیا۔ ''لیکن اب یہ کھیل غیر دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یہاں کے پہرے دار تمھاری گردن میں ہاتھ دے کر تمھیں کوٹھی سے باہر کر دیتے۔ لیکن میں صلح پسند اور مروت کیش ہوں۔ لہٰذا سپاہی تمھیں حلقے میں لے کر پھاٹک تک پہنچائیں گے۔ وہاں کے پہرے دار تمھارا بازو تھام کر تمھیں سوار کرا دیں گے۔ چلو۔ بس اب میں زیادہ کا روادار نہیں۔''

یہ کہہ کر فریزر نے پیٹھ موڑی۔ سپاہیوں نے نواب کے گرد حلقہ اور تنگ کر لیا۔ لیکن شمس الدین احمد نے گرج کر کہا، ''ٹھہرو۔''

فریزر نے ایک انداز بے اعتنائی سے گھوم کر نواب کی طرف دیکھا۔'' اچھا، اب تمھیں اور کیا لینا ہے؟'' اس نے بیزاری سے ہاتھ ہلا کر کہا۔

''ولیم فریزر تم نے آج دو بار میری ہتک کی ہے۔ آج تو میں یہ تلوار میان میں رکھے لیتا ہوں لیکن جلد ہی تمھارا بدن اس کی نیام ہوگا اور تمھارا خون اس کے لئے لباس عروسی ہوگا۔''

فریزر نے قہقہہ مارا۔'' لباس عروسی کے لئے تو جہانگیرہ بیگم زیادہ...''

شمس الدین احمد نے تلوار لہرا کر اپنے سامنے والے بکسریوں کو تتر بتر کر دیا اور قریب تھا کہ ان کا اگلا وار فریزر پر پڑتا، لیکن فریزر شاید اس کا بھی منتظر تھا۔ اس نے تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور وہیں سے بآواز بلند چیخا:

''یہ شخص مجھے جان سے مارنے کے درپے ہے! دیکھتے کیا ہو۔ اسے دھکے دے کر باہر نکال دو!''

فریزر کی آواز سن کر کئی لٹھیت اور برقنداز، جو شاید آواز کے منتظر تھے، ہر طرف سے دوڑتے ہوئے نکلے اور سب کے سب مل کر شہد کی مکھیوں کی طرح شمس الدین احمد کو لپٹ گئے۔ نواب نے پیچھے ہٹنا چاہا کہ تلوار چلانے کو کچھ جگہ کھلے، لیکن بے سود۔ ایک حملہ آور کو شمس الدین احمد نے زخمی کیا لیکن پھر ایک لٹھیت نے دور سے لٹھ چلا کر نواب کی دائیں کلائی کو نشانہ کیا۔ تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر پاؤں کے سامنے گری۔ پھر یہ موقع کہاں تھا کہ جھک کر تلوار دوبارہ ہتھوا لی جائے۔ شمس الدین احمد کو نہتا اور پا بدست دگرے دست بدست دگرے کر دیا گیا۔ اس کھینچا تانی میں نواب کی آستین ایک جگہ سے چاک ہو گئی اور ایک پاؤں کی جوتی نکل گئی۔ اسی حالت میں افتاں و خیزاں نواب شمس الدین احمد کو پھاٹک کے باہر پہنچا دیا گیا۔

طالب عیش اند اما جانب غم می روند

شمس الدین احمد کو مطلق خبر نہ ہوئی کہ کب راستہ کٹا اور کب اسے وزیر خانم کے گھر پہنچایا گیا۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ چاندنی چوک پہنچائے جانے کا حکم اس نے خود دیا تھا یا اس کے محافظوں نے یہ فیصلہ کیا۔ شمس الدین احمد کا بدن تختے کی طرح اکڑا ہوا تھا، آنکھیں پتھرائی ہوئی، گویا اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو، اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ وزیر نے اس کی حالت دیکھی تو سر پیٹ لیا کہ ہائے اب کیا کروں کس طرح انھیں ہوش میں لاؤں۔ کسی حکیم کو، حتیٰ کہ حکیم احسن اللہ خان کو بھی بلوانا خلاف مصلحت تھا کہ بات کے پھیل جانے کا امکان تھا۔ اور یہ بات تو صاف تھی کہ نواب کے بدن پر کہیں زخم نہ تھا، اور نہ ہی ان کی نبض ڈوب رہی تھی۔ ریزیڈنٹی میں خلاف مزاج کوئی بات ہوئی ہوگی، پھر بات بڑھ گئی ہوگی اور نواب کو شاق گذری ہوگی۔ ضرورت ان کے دل پر سے صدمہ اور طبیعت پر سے شاق کے اثر کو ہٹانے کی تھی۔

کسی نہ کسی طرح پلنگ پر لے جا کر وزیر اور حبیبہ نے وفادار کی مدد سے نواب کی قبا اور پگڑی اتاری، پاؤں کے گرد و غبار کو صاف کیا، ہلکے گرم پانی میں تر کیا ہوا دستمال ان کے منھ پر پھیرا کہ کچھ تازگی پیدا ہو۔ وفادار اور مبارک قدم نے نواب کے پاؤں کے تلوؤں پر نرم کپڑے سے ہلکے جھانویں کرنے شروع کئے اور وزیر نے بدقت ان کا بھنچا ہوا منھ تھوڑا سا کھول کر عرق بید مشک کے چند قطرے ٹپکائے۔ جب شمس الدین احمد کے بدن کا تناؤ کچھ کم ہوا اور آنکھیں سیدھی ہوئیں تو لیٹے ہی لیٹے ان کے پاؤں پلنگ کے نیچے لا کر انھیں دیر تک سموئے ہوئے پانی سے پاشویہ کیا گیا۔ پاشویہ ختم کرتے ہی دونوں پاؤں کو ململ کے ڈوپٹے سے خشک کر کے پلنگ پر سیدھا سیدھا پھیلا کر ہلکے دوہر سے ڈھانک دیا گیا تا کہ پاشویہ کی لطیف گرمی برقرار رہے اور گرمی بھی زیادہ نہ لگے۔

دھیرے دھیرے شمس الدین احمد کو غشی آمیز سی نیند آ گئی۔ سارے گھر میں سناٹا تھا گویا کوئی بلا نازل ہونے والی ہو اور گھر کے سب لوگ دم سادھے ہوئے دل ہی دل میں بلا کو ٹالنے کے لئے دعا کر رہے ہوں۔ دعائیں تو بہر حال پڑھی جا رہی تھیں۔ نواب کو نیند آ جانے کے بعد حبیبہ نے مصلی سنبھال لیا تھا اور مسلسل تسبیحیں اور وظائف پڑھ رہی تھی۔ راحت افزا درود شریف پڑھ پڑھ کر نواب کے سر و سینہ پر دم کر رہی تھی۔ وفادار اور مبارک قدم جو تھوڑی بہت حرف شناس تھیں ڈوپٹے کو سر اور منھ پر لپیٹے ہوئے دالان میں چاندنی پر بیٹھی ہوئی رحل پر کلام مجید کھولے ہوئے ٹٹول ٹٹول کر سورۂ رحمٰن پڑھ رہی تھیں۔ دوسری اصیل کنور رانی جو ہندو تھی، وہ ماش کے دانے اور لال مرچ نواب پر سے وار کے چولھے میں ڈال کر اٹھتے ہوئے دھوئیں کو غور سے تک رہی تھی گویا اس میں کوئی شکل نظر آ جائے گی۔ ایک اور اصیل جو اپنے گورے چمپئی رنگ، بادام کی سی آنکھوں اور چپٹی ناک کی وجہ سے کچھ کچھ مغل ترکن سی لگتی تھی، ہر چند کہ اس کا قد چھوٹا اور جسم گداز تھا، اور جو اپنی خوش مزاجی اور بھولے بھالے لہجے کے باعث سب کو بھلی لگتی تھی، ایک کونے میں سکڑی بیٹھی اپنے جنگلوں کے دیوتا اور ندیوں کی روحوں کو یاد کر کے دعا کر رہی تھی کہ نواب اچھے ہو جائیں۔ اس کا نام ونیسی تھا۔ اسے علاقۂ کامروپ کے پہاڑوں سے کوئی اٹھا لایا تھا اور یہاں دہلی کے بازار میں بیچ گیا تھا۔ نواب مرزا کی پیدائش پر جب موٹے کاموں کے لئے کسی نو عمر اور قبول صورت دائی کی ضرورت ہوئی تو نواب کا خانساماں اسے بہت تلاش کے بعد خرید لایا تھا۔

وزیر چپ چاپ نواب کے پاس پلنگ پر بیٹھی ہوئی اپنے دل کی دہشت دور کرنے کے لئے ناد علی پڑھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ نواب چنگے ہو جائیں گے لیکن یہ ہول بھی اس کے دل میں یقین کی طرح جا گزیں تھا کہ ہم دونوں ہی کی زندگی میں اب کئی انقلاب آنے والے ہیں۔ اسے نواب کی وفا پر کوئی شک نہ تھا اور نہ ہی اسے فریزر کا کچھ خوف تھا۔ لیکن کہیں کچھ بات ہو گئی تھی جو نواب اور وزیر دونوں کی دیوار حیات کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹنے لگی تھی اور یہ سارا راج پاٹ، ساری خوبصورتی اور عشق و عاشقی، ساری امیدیں اور امنگیں چند دن میں رخصت ہونے والی تھیں۔

اسے مارسٹن بلیک یاد آیا۔ وہ بھی کچھ اسی طرح اس سے رخصت ہوا تھا اور اعتماد سے بھرپور تھا کہ بس ابھی واپس آؤں گا اور بہر حال تم لوگوں کے تحفظ کا پورا انتظام کر کے جاتا ہوں۔ اور اس بار تو میرے دل میں کچھ خطرات بھی نہ تھے کچھ شکوک اور اوہام بھی نہ تھے۔ پھر بلاک صاحب مجھ سے چھٹے اور کس بے دردی سے چھٹے اور پھر میرے بچے...؟ اب اللہ رکھے نواب مرزا میرے ساتھ ہیں، دو بچوں کو تو

ایک طرح میں رو ہی چکی ہوں۔ ان کی خبر تو کبھی کبھی آتی رہتی تھی لیکن یہ بات صاف تھی کہ نہ ان کے دل میں ماں کے لئے کوئی جگہ خالی تھی اور نہ ان کے اتالیق اور موجودہ والی وارث ٹنڈل بھائی بہن ہی چاہتے تھے کہ کبھی کبھی ہی سہی، لیکن وہ اپنی ماں سے ملیں۔ با قاعدہ ہر مہینے چھٹے چھماہے ملنے کا بھلا کیا سوال تھا۔ اور میں...؟ خود میرے دل میں اب کیا ان کے لئے وہی ہوک اور بے قراری ہے جو اللہ رکھے نواب مرزا کے لئے ہے... کیا اس لئے کہ وہ غیر خون ہیں، فرنگی ہیں، کرستان ہیں؟ لیکن بلاک صاحب تو اب بھی مجھے یاد ہیں۔ اس زخم کی طرح جو بھر گیا ہو لیکن جس کا نشان باقی ہو اور جو اس زخم کی درد انگیز یادگار بھی ہو اور دل کو موہ لینے والی نشانی بھی ہو...

...نہ مجھے کوئی دعائیں آتی ہیں نہ عمل اور وظیفے جانتی ہوں جن کا سہارا لے کر ہونی کو ان ہونی کرنے کی کوشش کروں۔ پنڈت نند کشور... ہاں پنڈت نند کشور کو کل بلوا بھیجوں گی اگر یہ رات خیریت سے کٹی اور اگر وہ شہر میں ہوئے... اس حرام زادے فرنگی کی دشمنی لے کر میرے نواب صاحب نے برا کیا۔ لیکن وہ کرتے بھی تو کیا کرتے۔ معاملہ صرف ایک میرا نہیں ان کے ناموس کا بھی ہے۔ میں تو ایک حقیر ناچیز بے اوقات بے قیمت چونٹی ہوں اور یہ لوگ طاقت کے نشے میں چور آندھیاں ہیں جو اپنے آگے کسی کو نہیں ٹکنے دینا چاہتیں۔ کیا معلوم خلد آشیاں نواب احمد بخش خان صاحب کی بڑی بیگم یا ان کے لوگ میرے نواب صاحب کے خلاف کچھ دعائیں پڑھوا رہے ہوں کچھ عمل اذکار کرا رہے ہوں کہ ان کا زوال ہو تو ان کا عروج ہو۔ لوہارو والے خود کو اصل اور میرے نواب کو کم اصل سمجھتے ہیں اور بڑے نواب صاحب نے بھی حصہ الگ کر دیا تھا۔ اگر میرے نواب صاحب نے ان کی وصیت پر عمل کیا ہوتا...

...کیا تقدیر کا لکھا مٹ سکتا ہے، یا بدل سکتا ہے؟ یہ بات نہ ہوتی تو کوئی اور بات پیدا ہو جاتی۔ اگر میرا گھر بار اجڑنا ہی ہے اگر میرے وارث کو مجھ سے چھوٹنا ہی ہے اگر میری لاش کو تنہا ہی تا گور جانا ہے تو یہ نہ سہی کوئی اور شکایت پیدا ہو جاتی۔ لوہارو والے کیا ہیں اور فریزر کیا ہے۔ لیکن اگر میری صورت ایسی نہ ہوتی... اور یہ صورت بھی کے دن کی ہے اور صورت کا اچھا ہونا بھی اچھا لگنے پر موقوف ہے۔ اصل بات تو یہی ہے۔ مردوں کو تو کھیلنے کے لئے توڑنے پھوڑنے کے لئے چھوڑنے بھلانے کے لئے کھلونے بھی درکار ہیں اور گھر کے اندر ماما ئیں اصیلیں اور خادمائیں بھی مطلوب ہیں۔ لیکن میں تو کہیں کی نہیں ہوں۔ سچ پوچھو تو میرا کوئی گھر بھی نہیں ہے...

...لیکن میں بھی کیا بھولی ہوں کہ ایک ذرا سے وہم کو لے کر اتنی لمبی لمبی باتیں سوچ بیٹھی

ہوں۔ ابھی تو یہی نہیں معلوم کہ کیا بات ہوئی ہے میرے نواب صاحب پر کیا گذری ہے۔ کیا ضرور ہے کہ فریزر صاحب ہی سے کچھ بگڑی ہو۔ پہلے یہ ٹھیک تو ہو جائیں۔ پھر باقی باتیں سمجھی جاویں گی۔

وہ رک رک کر نادِ علی پڑھتی تو کبھی معوذتین کی تلاوت کر کے نواب کے جسم پر دم کرتی۔ کبھی کبھی اسے گھبراہٹ چڑھتی کہ کہیں فریزر اپنے سپاہیوں کو لے کر چڑھتا نہ چلا آ رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ خوف بالکل بے بنیاد تھا اور یوں بھی اس کا گھر بہت محفوظ تھا۔ وہ برچھیت اور سونٹا بردار جو نواب کے ساتھ گئے تھے اب واپس جا چکے تھے اور شاید بلی ماراں والی حویلی میں ہوں۔ انھوں نے نواب کی حالت کے تئیں ایک لفظ بھی نہ کہا تھا لیکن ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دو برچھیت نہتے لگتے تھے۔ اگر فریزر کے یہاں کوئی بری بات ہوئی ہو گی تو وہ لوگ خود سے تو کچھ کہیں گے ہی نہیں، اور اگر ان کو مار مار کر الٹا لٹکا دیا جاتا تو بھی وہ راز کو افشا نہ کرتے۔ لیکن بری بات بھی کیا ہو سکتی تھی؟ نواب تو بظاہر کہیں سے گھائل نہ تھے اور نہ ان کے بدن کے لعل و جواہر کچھ کم ہوئے تھے۔ اس لئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ ڈاکوؤں نے یا فریزر کے سپاہیوں نے حملہ کر کے انھیں لوٹ لیا ہو۔ لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ نواب نے فریزر کو جہانگیرہ کے بارے میں کوئی سخت بات کہہ دی ہو۔ اسی غرض سے تو وہ فریزر کے یہاں گئے ہی تھے، اور فریزر نے اپنے نوکروں سے انھیں زد و کوب کرایا ہو... ہاں یہ تو ہو سکتا ہے لیکن پھر اس کا سوال نہیں کہ فریزر کے سپاہی یا کمپنی کے کمیدان میرے گھر پر چڑھ آئیں۔ اور فرض کر دم آئے بھی تو کیا ہم لوگ آسانی سے نواب کو یا آپ کو ان کے ہتھے چڑھنے دیں گے۔ مجھے جان لینا نہیں آتا، جان دینا تو آتا ہے اور میری اردا بیگنیاں خنجر تلوار پستول ہی نہیں ہاتھوں اور پاؤں حتیٰ کہ سر کو بھی ہتھیار بنا لیتی ہیں۔

...لیکن نواب مرزا؟ کیا یہ دانشمندی نہ ہو گی کہ نواب مرزا کو یہاں سے ہٹوا دوں؟ لیکن کہاں بھیجوں۔ منجھلی باجی کے یہاں بھیج سکتی ہوں۔ لیکن لے کون جائے گا اور کیا جانے اس وقت باہر کے راستے جوکھم سے خالی ہوں کہ نہ ہوں... پھر اگر میں ایک اصیل اور ایک محافظ کے ساتھ انھیں بھیج بھی دوں تو یہاں میرے نواب کے لئے محافظ کم پڑ سکتے ہیں۔ توبہ یہ کہاں کی دانائی ہے کہ اچھے خاصے بے خطر گھر سے اپنے بچے کو نکال کر اسے غیروں کے حوالے کر دوں کہ وہ اسے بازار گلی کوچوں میں لئے پھریں۔ اور اگر نواب کسی وقت ہوش میں آ کر نواب مرزا کو پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گی؟ اللہ میرے وارث کو اچھا کر دے اور اچھا رکھے اور ہر آفت سے بچائے رکھے۔ وہ ہیں تو سب کچھ ہو جائے گا۔ جو نہیں ہے وہ بھی ہو جائے گا۔ دل ہی دل میں اس کے اندر شرم کی لہر دوڑی اور اس نے محبت بھری نگاہ سے شمس الدین احمد کو

دیکھا۔ وہ اب بائیں کروٹ ہو کر سو رہے تھے، ایک ہاتھ تکیے کے اوپر آگے پھیلا ہوا تھا گویا کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ وزیر نے پھیلے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی پر دوبارہ ہلکے ہلکے چھانواں کرنا شروع کیا اور اپنے خیالات کو جھٹک کر پھر نادعلی پڑھنے لگی۔

رات نہ معلوم کتنی دیر میں گذری۔ شاید وزیر کی بھی آنکھ جھپک گئی تھی۔ راحت افزا تو بے شک وہیں پٹی سے لگی لگی سو گئی تھی اور حبیبہ اور دوسری قرآن خواں عورتیں اپنے اپنے مصلوں پر جھکی ہوئی منڈ کری مار کر سو رہی تھیں۔ کنور رانی اور ونیسی اور اردابیگنیاں البتہ اب تک جاگ رہی تھیں۔ وزیر اس وقت چونکی جب سنہری مسجد میں اذان ہوئی اور پھر دوسری مسجدوں سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ جین مندر اور گوری شنکر کے مندر اور گوردوارہ سیس گنج میں ناقوس اور زنگولہ اور جلاجل کا شور تھا۔ گھر کے اندر اجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ آنگن میں لال اور پدڑیوں نے ہلکی ہلکی سیٹی اور قمریوں نے کوکو شروع کی۔ ان کی آواز سن کر گوریوں اور کبوتروں اور ہدہدوں اور میناؤں کو بھی معلوم ہو گیا کہ گھر میں لوگ جاگ اٹھے ہیں یا جاگنے والے ہیں اور آنگن میں ہمارے لئے دانہ پانی مہیا کیا جا رہا ہوگا۔ اپنی اپنی بولیاں بولتے ہوئے یا چپ چاپ سب کی ٹکڑیاں دونوں آنگنوں میں اترنے لگیں۔ کچھ دیر بعد کوؤں نے بھی ادھر ادھر سے تاک لگانا شروع کر دیا۔ رات کے چراغ اور فانوس جو بجھائے نہیں گئے تھے اب پھیکے پڑ گئے تھے لیکن ان کے پھیکے پن میں اداسی کا رنگ نہ تھا۔ اچانک ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ گذشتہ رات کی منحوس بلا دفع ہو گئی ہے۔ خود گھر بھی تازہ دم اور شگفتہ معلوم ہونے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں نیچے بازار میں بہشتیوں، خوانچے والوں، اور گھر گھر گھوم کر مکھن ملائی کچوریاں کباب بیچنے والوں کی صداؤں سے سارا شہر جاگ اٹھا۔ سعادت خان کی نہر پر ہوا انکھیلیاں بھر رہی تھی اور خوشبودار پھولوں کی جھاڑیوں کا سایہ دھیرے دھیرے پانی پر لہرا رہا تھا۔ اس وقت شہر کی ہوا میں وہ طمانیت، وہ طاقت، اور وہ توانائی و تازگی تھی کہ لگتا تھا یہ دلی اب بھی عالمگیر کے زیر نگیں ہے۔ محی السنت والدین اورنگ زیب شاہنشاہ ہندوستان و دکن کی سواری ابھی ابھی اورنگ آباد دکن سے پہنچی ہے اور دلی دروازے سے ہو کر حویلی مبارک میں جلوہ افروز ہو رہی ہے۔ اور یہ سب روشنی، یہ سب لہر بہر، یہ سکون و اعتماد، اسی وجہ سے ہے کہ مہابلی کا سایہ سب پر روشن ہے۔ فرنگی مرہٹہ ابدالی درانی کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں۔ دلی اب بھی ہندوستان کا دل اور دنیا کی جان ہے۔

گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست۔ گفت جانست و ایں جہانش تن۔

شمس الدین احمد کی آنکھ کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ وزیر خانم مجھ پر جھکی ہوئی نرم رومال سے

میری پیشانی اور چہرہ پونچھ رہی ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں گلاب کا شیشہ ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں میں تردد کی ہلکی سی گھٹا ہے لیکن چہرے پر ذہنی تکان کے آثار کے باوجود مسرت کی ہلکی سی روشنی بھی ہے۔

''تسلیمات عرض کرتی ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے سرکار نے آنکھ تو کھولی۔''

نواب نے ہلکی سی انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھے۔ راحت افزا نے جلدی سے ان کی پیٹھ کے پیچھے دو نرم تکیے لگا دیے اور سلام کر کے ہٹ گئی۔

''کیوں کیا کوئی پریشانی کی بات تھی؟'' نواب نے پوچھا۔

وزیر خانم ایک لمحے کے لئے تذبذب میں پڑ گئی۔ پھر اس کے خیال میں آیا کہ نواب یا تو کل کی بات بھول گئے ہیں یا ایسا ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔

''جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں... بس یہ ہے کہ کل آپ تھکے تھکے سے تھے، آتے ہی سو گئے۔ کچھ خاصہ بھی نہیں نوش فرمایا۔''

''ہاں... آں...'' شمس الدین احمد نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ''کل میں کچھ زیادہ ہی واماندہ حال ہو گیا تھا۔'' وہ اپنی دل آویز مسکراہٹ مسکرائے۔ ''اسی لئے تو میں سیدھا یہاں چلا آیا، کہ میرا آرام جاں یہیں تو ہے۔''

''ہٹیے آپ تو ہر وقت باتیں ہی بناتے ہیں۔ اللہ آپ نے میرا تو کلیجہ ہی دہلا دیا۔ آتے ہی ایسی گہری نیند سوئے... نہ کچھ بولنا نہ چالنا۔ حبیبہ کھانے کو پوچھتی رہ گئی۔''

''اچھا کوئی بات نہیں۔ ابھی جم کر ناشتہ کر لیں گے۔ آپ کے سب گلے دور ہو جائیں گے۔ اور بھلا ہمارے نواب مرزا کہاں ہیں۔ ابھی تو سو رہے ہوں گے؟''

''جی ابھی جگائے دیتی ہوں۔ آپ کو دیکھ کر نہال نہال ہو جاں گے۔''

''نہیں ابھی انھیں سونے دیجئے۔ اپنے وقت سے اٹھائیے گا۔'' نواب نے وزیر کے چہرے کو لگاوٹ بھری نگاہ سے دیکھا۔ ''آئیے آپ بھی سو رہیے۔ ابھی تو بہت سویرا ہے۔ کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی ہیں۔ ہمارا تو جاگنے کا وقت ہو گیا ہے نہیں تو ہم بھی...''

وزیر نے جلدی سے بات کاٹی۔ ''میں تو اب جاگ ہی گئی ہوں اب نیند کہاں آئے گی۔ آپ ذری کی ذری پاؤں اور کمر دبوالیں پھر غسل کریں۔ میں ناشتے کا انتظام کرتی ہوں۔''

شمس الدین احمد نے اس کا دامن پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''ابی ذرا سنئے تو سہی...''

لیکن وزیر ہلکی سی شرمائی ہوئی مسکراہٹ آنکھوں اور ہونٹوں پر سجائے ہوئے بعجلت کمرے سے باہر ہوگئی۔

پاؤں دبوانے اور بدن پر چپی کے لطف سے سرور میں آکر شمس الدین احمد پھر سو گئے۔ اور اس بار جب وہ بیدار ہوئے تو دن خوب چڑھ چکا تھا۔ نیچے بازار میں زندگی کا معمول پوری ہماہمی اور ہمہمہ انگیزی کے ساتھ رواں تھا۔ شمس الدین احمد کو اپنی طبیعت بڑی حد تک بحال محسوس ہوئی۔ رات کی گرہیں زیادہ تر کھل چکی تھیں اور دل میں ٹھہراؤ اور اطمینان آ گیا تھا۔ غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ دیر تک نواب مرزا سے کھیلتے اور اس کی توتلی لیکن رواں باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ وزیر نے کئی بار چاہا کہ پوچھے، جہانگیرہ کے بارے میں آپ کچھ سوچتے ہیں کہ نہیں۔ لیکن نواب نے سارا وقت چہلوں اور قہقہوں میں اڑا دیا اور کبھی اتنی تنہائی بھی نہ ہونے دی کہ وزیر ان کے پاس گھڑی آدھ گھڑی اطمینان سے بیٹھ سکے۔ نواب مرزا کو میاں مصحفی کی ایک غزل کے دو تین شعر وزیر نے حال ہی میں یاد کرائے تھے۔ شمس الدین احمد اس کی زبان سے وہ اشعار بار بار سنتے اور ہر بار اسے انعام دیتے اور کبھی مٹھائی یا پھل منگوا کر سارے گھر میں تقسیم کرتے۔ اشعار کی خفیف سی شوخی اور طباعی کے ساتھ کچھ محزونی اور واماندگی پر نواب مرزا کا بھولا بھالا لہجہ اور مسکراتا ہوا چہرہ عجب لطف دے رہا تھا۔

یوں رو رو اس گلی میں دن رات کاٹتے ہیں
رستے میں جوں مسافر برسات کاٹتے ہیں
ہے زیر تیغ اپنی جوں شمع زندگانی
سو بار سر کٹے ہے تب رات کاٹتے ہیں

سب الفاظ بالکل درست، سب وقفے اپنی جگہ پر، ہر مصرع بالکل موزوں، کھلی ہوئی اگرچہ بچوں کی سی کچھ رکتی ہوئی سی آواز، تین ساڑھے تین برس کی جان کا یہ مقدور دیکھ کر شمس الدین احمد اور وزیر خانم گل چاندنی کی مانند کھلے پڑتے تھے۔ حبیب النسا بار بار بلیاں لیتی اور دوسری مامائیں کئی بار چشم زخم سے بچانے کے لئے کبھی تیل ماش وارتیں، کبھی دامن پھیلا کر دعا کرتیں کہ یا اللہ ہمارے میاں کو نظر نہ لگے، ان کی عمر دراز ہو۔ دوپہر تک یہی معاملے رہے۔ دن کے کھانے کے بعد بھی نواب نے نہ خود آرام کیا اور نہ وزیر یا نواب مرزا کو اپنے آگے سے ہٹنے دیا۔ نواب مرزا جب تھک کر اپنی کھلائی کی گود میں سو گیا اور گھر کے سب نوکر کھانے سے فارغ ہوئے تو عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ تب کہیں جا کر شمس الدین احمد نے تخلیہ کیا اور وزیر کو بھی اپنے ساتھ حجرۂ خواب میں لے جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وزیر چیں بجبیں ہوتی رہی کہ دن

دہاڑے کا یہ کون سا چونچلا ہے لیکن نواب نے ایک نہ سنی۔ اور سچ پوچھئے تو وزیر کو بھی بس بہانہ مطلوب تھا۔ شمس الدین احمد نے اسے آغوش میں کھینچ کر اس کے منھ اور آنکھوں اور سینے پر بوسوں کی بارش کر دی تو اس کا سارا وجود اس بارش میں حل ہو کر شمس الدین احمد کی رگ رگ میں پیوست ہو گیا۔

بہت دیر بعد، جب شام کے سائے دروازے اور کھڑکیوں کی جھری سے اندر جھانکنے لگے اور ان کا کمرۂ خواب کم و بیش بالکل تاریک ہو گیا تو شمس الدین احمد کی آنکھ کھلی۔ وزیر خانم کا سر ان کے سینے پر تھا اور اس کا ایک بازو شمس الدین احمد کے پہلو تلے تھا۔ لیکن نواب کے سارے دوران خواب میں وہ نہ سوئی تھی نہ کسمسائی تھی۔ اس کی آنکھیں شمس الدین احمد کے شانہ و سینہ و گردن کی سڈول صباحت کو پی رہی تھیں اور وہ پورے ہوش و حواس میں ہونے کے باوجود کچھ بے خواری کے سے عالم میں تھی۔ شمس الدین احمد جاگے تو انھوں نے اپنا ہاتھ اس کے رخسار پر رکھا اور حیرت سے کہا، ''ارے آپ جاگتی ہی رہ گئیں۔'' انھوں نے جلدی سے پہلو بدلا اور اٹھ بیٹھے۔

''ہائے افسوس۔ آپ کا بازو دبا رہ گیا۔ بھئی واللہ آپ کو کتنا درد ہوا ہوگا۔ آپ نے کچھ کہا کیوں نہیں؟''

''کہتی کیا۔ میں تو بڑے آرام سے تھی۔''

''بھئی واللہ۔ آپ بھی خوب شے ہیں۔ مجھے تو کچھ سدھ نہ رہی تھی لیکن آپ تو ذرا ٹھیل ٹھال کر مجھے الگ کر دیتیں۔''

وزیر نے شمس الدین احمد کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنا منھ ذرا سا پھیر لیا اور کچھ شرمائی ہوئی سی لیکن مضبوط آواز میں بولی:

''کیوں، آپ نے سنا نہیں کیا؟ خوش آں شبے کہ در آغوش گیرمت تا روز۔ بزیر پہلوے تو دست من بخواب رود۔''

شمس الدین احمد نے تڑپ کر زانو پر ہاتھ مارا اور بولے۔ ''ہائے ظالم یہ شعر تو میرے پڑھنے کا تھا اور یہ بات تو میرے کہنے کی تھی۔ بھئی واللہ جی چاہتا ہے منھ چوم لیجئے۔''

''تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔'' وزیر نے اسی طرح منھ پھیرے پھیرے جواب دیا لیکن اس کے لہجے میں شرم بہت کم تھی، گویا کوئی فیصلہ دے رہی ہو۔

''آپ اپنا رتبہ کم کر رہی ہیں۔ طالب تو میں ہوں۔ آپ تو مطلوب ہیں۔''

''طالب اور مطلوب کا رتبہ ایک کیوں نہ ہو؟ یا میں طالب کیوں نہ ٹھہرائی جاؤں۔ کبھی کبھی تو مطلوب بھی طالب قرار پاتا ہے۔'' وزیر نے اب نواب کی طرف رخ پھیرا اور اپنے کپڑے برابر کرتی ہوئی بولی۔

''سو بھلا کیسے؟''

وزیر پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ہاتھ باندھ کر سر جھکایا اور شعر پڑھا۔

خوش آں زماں کہ نکویاں کنند غارت شہر
مرا تو گیری و گوئی کہ ایں اسیر من است

شعر ختم کرتے کرتے وزیر کی آواز کچھ بھرا گئی۔ اس نے کلمے اور بیچ کی انگلی سے آنکھوں کے کونے پونچھے، بہت ہلکے سے، گویا پسینے کی نمی پونچھ رہی ہو۔ شمس الدین نے بے اختیار کچھ کہنا چاہا لیکن وزیر نے آواز پر کچھ قابو پا کر کہا:

''اب دیکھئے نہ، جو مطلوب ہے وہی طالب ہے۔ خود گرفتار بھی اور خود ہی گرفتار کنندہ بھی۔'' اس نے ہلکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ لیکن اس ہنسی میں آنسوؤں کی کچھ رقت چھلک رہی تھی۔

شمس الدین احمد کو جھرجھری سی آ گئی۔ وہ شہیدی قمی کے اس شعر سے واقف تھے لیکن انھوں نے کبھی اس نقطۂ نظر سے دیکھا تھا نہ سوچا تھا۔

''وزیر خانم۔ میں تو آپ کے ہاتھوں میں ہمیشہ لاچار تھا۔ لیکن میں گمان کرتا تھا کہ یہ میری مجبوری ہے، کیونکہ تلاش تو میری تھی۔''

''سرکار کی مجبوری کسی کی قوت پر مبنی رہی ہوگی۔ لیکن میں بھی تو شاید مجبور تھی۔''

''اب شاید ایسا ہے کہ نہ آپ مجھے رہا کر سکتی ہیں اور نہ میں آپ کو رہا کر سکتا ہوں...'' شمس الدین احمد کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ان کی بات پوری ہونے کے پہلے وزیر خانم نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا:

''اور آپ کو رہا کرنا بھی اب آپ کے بس سے باہر ہے۔ نہ میں ہی اپنے بند سے خود کو آزاد کر سکتی ہوں اور نہ شاید سرکار ہی...''

''شاید کی بات نہیں۔ بالکل بے شک و ریب۔ بہو خانم اب اگر میں چاہوں بھی تو خود کو تم سے آزاد نہیں کرا سکتا۔''

وزیر نے منھ پر ہاتھ پھیرا جیسے دعا کر کے اٹھی ہو۔ نواب کے پاس جا کر اس نے ان کی بلائیں

لیں اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا، ''اندھیرا بہت ہوگیا ہے۔ میں شمعیں جلوانے کو کہتی ہوں۔''

''ابھی رہنے دیجیے۔ اس تاریکی میں آپ کے چہرے کی روشنی بہت بھلی لگ رہی ہے۔''

''اللہ آپ کی بھی باتیں۔ میں تو آپ کا روے روشن نہ دیکھ سکوں اور آپ کو میرے شام رنگ میں بھی نور کا تڑکا نظر آوے۔''

''جو بھی ہو۔ آیئے میرے پاس بیٹھیے۔'' نواب کا چہرہ اچانک پر تفکر ہوگیا تھا۔ وزیر کا دل دھڑکا لیکن اس نے شگفتہ روئی سے کہا:

''بندی تابع فرمان ہے۔ ارشاد ہو۔''

وہ دروازے کی طرف سے پلٹ کر شمس الدین احمد کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شمس الدین احمد کا چہرہ کچھ تاریک ہو رہا تھا۔ شاید یہ آج اس وقت کی اترتی ہوئی رات کے سائے تھے یا ایسا تو نہیں کہ کل کی رات اب تک نہ گئی ہو اور اس کے قدوم شوم اب تک میرے دروازے ہوں، وزیر کے دل میں خطرہ گذرا مگر وہ کچھ بولی نہیں، نواب کی طرف پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ شمس الدین احمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے پاس کھینچ لیا، اتنا کہ دونوں ہم بغل اور قریب قریب ہم آغوش ہوگئے۔

''بہو خانم۔''

''جی، حکم فرمایئے۔''

''ہم نے کچھ فیصلے کیے ہیں اور انھیں آپ کے بھی گوش گذار کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی بہت بہتر۔ میرے لائق جو خدمت ہو میں حاضر ہوں۔''

''آپ کی خدمت...'' نواب کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ''آپ اس وقت بس میرے معروضات سماعت فرمائیں اور آئندہ دنوں میں نواب مرزا صاحب کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔''

وزیر ایک لمحے کو سن سے ہو کر رہ گئی۔ ''سرکار کیا فرما رہے ہیں!''

''کچھ نہیں۔ بس آپ سنتی جائیں۔ ہم آج رات بلی ماروں والی حویلی میں گذاریں گے۔ کل بہت سویرے ہم فیروز پور چلے جائیں گے۔ جہانگیرہ کے باب میں آپ کی بات سو بسوے پکی ہے۔ ایک رشتہ خیال میں آیا ہے، اس کی مزید چھان بین کروں گا اور بن پڑی تو برساتیں گذرتے ہی ان کے نکاح اور رخصتی کے فریضے فیروز پور سے حسب دستور سر انجام دے دیے جائیں گے۔''

''سرکار کی بات بہت انسب ہے۔ اللہ آپ کے ارادوں میں برکت دے اور آپ کے سب

کام بحسن وخوبی تکمیل کو پہنچیں۔"

"جی، انشاء اللہ۔ اور اس کے بعد... اللہ جو دکھائے گا دیکھیں گے۔"

وزیر کے خیالوں پر الجھن پھر طاری ہوگئی۔ "اللہ میں آپ کا مطلب نہ سمجھی۔ نکاح رخصتی کے بعد تو سرکار دہلی واپس آویں گے؟ میں بھلا پھر کب آپ کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کروں گی؟"

شمس الدین احمد کئی پل چپ رہے۔ وزیر کی ہمت نہ پڑی کہ خاموشی کو توڑے یا پوچھے کہ میرے سوال کا جواب کب ملے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر نواب کی طرف دیکھا۔ حجرہ اب کم و بیش پوری طرح تاریک تھا، کھڑکیوں اور دروازے کی جھریوں سے جو تھوڑی تھوڑی روشنی چھن کر آرہی تھی اس کے سبز سرمئی دھندلکے میں شمس الدین احمد کا چہرہ شگفتگی اور صحت سے محروم معلوم ہوتا تھا۔ رخسار کچھ دھنسے ہوئے سے اور آنکھوں کے نیچے رخساروں کی ہڈیاں کچھ نمایاں لگ رہی تھیں۔ ان کی سیدھی ستواں ناک اس وقت کچھ پتلی اور خشک سی لگتی تھی۔ مغرور اور بلند گردن اب بھی سیدھی تھی لیکن وہ بھی کچھ ذرا ایسی لگ رہی تھی کہ ایک دو نسیں کچھ نمایاں ہوگئی تھیں۔ وزیر نے دھیرے دھیرے نواب کے پورے سراپا پر نظر دوڑائی۔ انھوں نے دولائی کے نیچے ٹانگیں تو پھیلا رکھی تھیں لیکن گود میں رکھے ہوئے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

وزیر کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کیسی چلی ہوا یہ کہ جی سنسنا گیا۔ کہیں وہی کل والی رات تو نہیں ہونے والی...؟ اس کا جی چاہا نواب کا شانہ ہلکے سے جھنجھوڑے، لیکن ہمت نہ پڑی۔ اٹھوں، کسی کو بلاؤں... یہ تو اور بھی نامناسب ہوگا۔ اس نے بے ارادہ نواب کے اور قریب ہو کر ان کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنا سر وسینہ ان کے شانے سے لگا دیا۔ اس کے بدن کی گرمی نواب تک پہنچی تو ان کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھلیں۔ انھوں نے وزیر کی ٹھوڑی کو اٹھا کر اسے مسکرا کر دیکھا اور بولے:

"میں بڑی دیر چپ رہا... خیر اب بات صاف کیے دیتا ہوں۔ جہانگیرہ کا فرض ادا کر کے میں فریزر کا حساب بے باق کر دوں گا۔"

وزیر نے چونک کر قطع کلام کرنا چاہا۔ لیکن شمس الدین احمد نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "شش، بس سنتی جایئے۔ کچھ بولیے مت۔ یہ حساب کیوں کر چکتا ہوگا میں ابھی کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اس کے حد سے بڑھے ہوئے غرور کی سزا اسے ملنی ہی چاہیئے۔"

"لیکن... لیکن سرکار کیا سزا دیں گے اسے۔ اور کیا ایک سرکار ہی ہیں جن کے ذمہ یہ فرض

ہے... آخر اور بھی تو امیر و رئیس ہیں۔ خود بادشاہ سلامت ہیں...''

''ہونھ۔ ہم نے سب کا ہی حال دیکھا ہے۔ سب کو اپنے آرام، اپنے چھپر کھٹ، اپنے شرب وطعام، اپنے شوق وہوس سے غرض ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہر کوئی اپنی زندگی کو، اپنے مایۂ حیات کو، اپنی ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہمیں اوروں سے کیا غرض۔''

''تو پھر میں آپ کو کب دیکھوں گی؟'' وزیر نے نالہ کناں لہجے میں کہا۔ اس کے آنسو دونوں رخساروں پر ٹپ ٹپ گر گر نیچے پھسل رہے تھے۔ اسے صاف دکھائی نہ دے رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اپنے آنسوؤں سے بے خبر تھی۔

''پتہ نہیں۔ جب اللہ ملائے گا۔ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی بھی کہ نہیں۔ کچھ صبر سے کام لیجیے۔ دنیا ہماری مرضی پر نہیں چلتی لیکن ہم تو اپنی مرضی پر چل سکتے ہیں۔''

شمس الدین احمد نے اٹھ کر اپنے کپڑے درست کیے، دروازہ تھوڑا سا کھولا اور تالی بجائی۔ حبیبہ کے اندر آنے پر انھوں نے کمرے میں روشنی کا حکم دیا۔ باہر سارے گھر میں روشنی ہو ہی چکی تھی، رات کے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ شمس الدین احمد نے نواب مرزا کو بلوایا اور تھوڑی دیر نواب مرزا اور وزیر کے ساتھ چہلیں کیں۔ اب عشا کی نماز اور نواب مرزا کے سونے کا وقت ہو رہا تھا۔ شمس الدین احمد نے نواب مرزا کو گود میں لے کر خوب پیار کیا، وزیر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فی امان اللہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئے۔ ان کی کمر سیدھی، گردن تنی ہوئی اور قدم نپے تلے پڑ رہے تھے۔ ادھر نواب نے پیٹھ پھیری ادھر وزیر نے مصلی بچھا کر آنچل پھیلا دیا۔ اشک آلود آنکھوں، بھرائے ہوئے گلے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ وہ دیر تک خدا جانے کیا کیا دعائیں مانگتی رہی۔ نوکروں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ کہے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

فیروز پور جھرکہ

فیروز پور جھرکہ تک تین دن کا سفر بخیر و خوبی طے ہوا۔ برسات نے راستوں کو کیچڑ اور تمام سوکھے ندی نالوں کو پانی سے بھر دیا تھا، لیکن نواب کے ہاتھی اور اونٹ خوب سدھے ہوئے تھے۔ ایک خیمہ و خرگاہ ان کے آگے آگے چلتا تھا، ایک ان کے ساتھ رہتا تھا۔ لہٰذا اگر کہیں مجبوراً بھی قیام کرنا پڑتا تو اچھی جگہ دیکھ کر خیمے نصب کر لئے جاتے اور راستے کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر لیا جاتا۔ آگے جانے والے خیمہ و خرگاہ کے ساتھ مسلح برقندازوں کے علاوہ دو اونٹوں پر دو دو زنبورکیں بھی ہوتی تھیں۔ ان کا گولہ بارود مضبوط ترپال سے ڈھکا رہتا تھا اور زنبورکیں دائیں بائیں اونٹ کے کجاوے میں اس طرح نصب کی جاتی تھیں کہ ایک ہی زنبورچی دونوں توپیں بیک وقت سر کر سکتا تھا۔ چھوٹے میدان جنگ میں دفاع کے لئے ان سے بہتر اسلحہ کوئی نہ تھا۔ زنبورچی عموماً علاقۂ دکن کے ہوتے تھے اور مخالفانہ گولیوں کی بوچھار کے سامنے مقاومت کے لئے بہت نامدار تھے۔

دلاور الملک نواب احمد بخش خان کے پہلے فیروز پور جھرکہ میں کوئی قلعہ نہ تھا، صرف ایک گڑھی تھی جس میں نواب نجیب الدولہ کے زمانے تک شاہی فوجدار رہتا تھا۔ نجیب الدولہ کے انتقال (۱۷۷۰) کے بعد اس علاقے پر دہلی کا اقتدار کمزور پڑتا گیا، حتیٰ کہ جب لارڈ لیک کو شاہ عالم بہادر شاہ ثانی نے وکیل مطلق مقرر کیا (۱۸۰۳) تو ہانسی حصار تک کا سارا خطۂ ملک عملاً فرنگی نظام میں آ گیا۔ اب فیروز پور جھرکہ کی سیاسی اور فوجی اہمیت گھٹ گئی کیونکہ ہانسی میں انگریز منتظم بیٹھنے لگا تھا اور خود ریزیڈنٹ کو کمشنر علاقۂ دہلی ہونے کی وجہ سے ہانسی تک کے تمام ملک میں تفوق اور اقتدار حاصل تھا۔ لیکن نواب احمد بخش خان نے یہاں کی آزاد ولایت حاصل کرنے کے بعد گڑھی کی مرمت اور توسیع کی جانب فوراً توجہ کی اور سال بھر کے اندر اندر اسے اپنے قیام کے لائق قلعے میں تبدیل کر لیا۔ مرمت اور توسیع شدہ پرانی گڑھی انھوں نے

اپنے اور دفتر و دیوان کے لئے رکھی۔ اس سے متصل دو حویلیاں حرم سرا کے طور پر تعمیر کرائیں۔ پرانی گڑھی اور نئی حرم سرائیں ایک ہی چہار دیواری میں تھیں لیکن ان کے درمیان طویل وعریض خانہ باغ تھا جس میں موسم کے اعتبار سے استعمال میں آنے والی بارہ دریاں، مہتابیاں اور بنگلے تھے۔ بیچ میں ایک نہر تھی جس میں جگہ جگہ فوارے چھوٹتے تھے اور جس کا پانی اندرون گڑھی اور حویلیوں کے بھی فواروں کو تازہ رکھتا تھا۔

نواب احمد بخش خان کے زیر اقتدار آتے ہی فیروز پور جھرکہ کی خوشحالی اور آبادی میں اضافہ ہونے لگا تھا اور اب وہ قصبہ نہیں بلکہ چھوٹا سا شہر تھا جس میں شہری زندگی کے تمام لوازم موجود تھے۔ دو شفا خانے، متعدد سرائیں، باغات، مستقل بازار، گنج، اہل حرفہ کے الگ الگ محلے، کئی مدرسے، ایک جامع مسجد، کئی ذیلی مساجد، ایک کربلا، ایک رام لیلا میدان، کئی مندر، ایک گوردوارہ، حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا گرجا گھر بھی تھا جسے انگریزوں نے شاہ عالم بہادر شاہ ثانی فردوس منزل کے آخری سال میں بادشاہ کی اجازت سے بنوالیا تھا۔ بازاروں میں طرح طرح کے سامان اور خریداروں کی ریل پیل تھی۔ گنج سب کے سب غلے اور گڑ، شکر، گھی، تیل، تلہن، ہر قسم کی اشیائے خوردنی سے بھرے ہوئے تھے۔ دور دور کے بیوپاریوں نے اپنی کوٹھیاں وہاں کھڑی کر لی تھیں۔ گرد و نواح کی منڈیوں سے غلہ، مویشیاں اور دیگر سامان کی مسلسل آمد و رفت تھی۔ شمس الدین احمد نے اپنے باپ کے قائم کردہ امن و امان اور خوشحالی کو اور بھی ترقی دے دی تھی اور اب تو بعض حریص انگریز صاحبان عالی شان کو افسوس ہونے لگا تھا کہ ایسا متمول اور بھرا پرا علاقہ کسی دیسی رئیس کے زیر نگیں کیوں ہو۔

فیروز پور جھرکہ پہنچ کر شمس الدین احمد نے چند ہی دنوں میں جہانگیرہ کے لئے تمام امکانات پر ازسرنو غور کیا۔ مرزایان اکبر آباد میں سے ایک گھرانے کی طرف سے ایک رشتہ پہلے آیا تھا جو انھیں مناسب لگا تھا لیکن وہ مناسب نہیں بلکہ انسب کی تلاش میں تھے، اس لئے انھوں نے اکبر آبادی رشتے کو محض زیر غور رکھا تھا اور اس کے بارے میں عملاً کوئی قدم نہ اٹھایا تھا۔ اب انھوں نے اکبر آباد میں اپنے مختار کار کے ذریعہ چھان بین کرائی تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ سنی المذہب، سید النسب ایرانی خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا اور میرزا اسد اللہ خان کے دادا قوقان بیگ ایک ہی وقت میں اپنے اپنے اصل مستقر و زادبوم سے نقل مکان کر کے ہندوستان آئے تھے، میرزا قوقان بیگ ماوراء النہر سے اور آغا میرزا محمد احسن علی شیراز سے۔ احسن علی کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک کی شادی رام پور کے ایک شیعہ گھرانے میں ہوئی اور اس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ اب اس شاخ کے سب مرد عورت شیعہ تھے اور اس گھرانے کے آغا مرزا تراب

علی ایک جوان لائق وفائق، ظریف وخلیق، نواب رامپور کی سرکار میں داروغۂ فیل خانہ وخرگاہ تھے۔

اس خاندان کی اکبر آبادی شاخ حسب سابق سنی المذہب رہی تھی۔ آغا محمد احسن علی کے ایک بیٹے آغا میرزا امجد علی نے شاہ عالم بہادر شاہ ثانی فردوس منزل کے زمانے میں قلعۂ اکبر آباد میں کتاب دار کا منصب حاصل کیا اور خطابات ملکی وخانی سے مخاطب ہو کر اعتبار الملک آغا میرزا محمد امجد علی خان کہلائے۔ قلعے پر انگریزوں کا تسلط ہوا تو کتاب دار کا عہدہ تخفیف میں آگیا اور اعتبار الملک نے بادشاہ کی نوکری کے بعد کسی اور کی نوکری کو دون مرتبہ جان کر اپنی حویلی واقع میوہ کٹرہ میں قیام کیا اور اپنی زمینات وباغات کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ خالی وقت میں وہ خاص خاص رؤسا کے لڑکوں کو منطق وفلسفہ کا درس بھی دیتے تھے۔ اعتبار الملک اور راجہ بلوان سنگھ اور میرزا قوقان بیگ کی حویلیاں پاس ہی پاس تھیں، لہٰذا رفتہ رفتہ ان کی اولادوں میں اتنا میل جول ہو گیا کہ سب ایک ہی گھر کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ ان اولادوں میں میرزا قوقان بیگ کے پوتے میرزا اسد اللہ خان غالب اور اعتبار الملک کے بیٹے میرزا محمد معظم علی خان بھی تھے۔ انھیں معظم علی خان کے چھوٹے بھائی محمد اعظم علی خان سے جہانگیرہ بیگم کے رشتے کی بات میرزا غالب کے خسر اور شمس الدین احمد خان کے سگے چچا نواب مرزا الٰہی بخش معروف کے توسط سے آئی تھی۔

مختار کار کی اطلاع کے بموجب میرزا اعظم علی خان سترہ اٹھارہ برس کے خوبصورت نوجوان اور علم وفضل کی دولت سے مالا مال تھے۔ یہ لوگ راسخ العقیدہ سنی المذہب، حنفی المشرب تھے اور ایران سے ان کے روابط روحانی اب بھی اتنے استوار تھے کہ ان کے گھر میں فارسی بولی جاتی تھی، درحالے کہ میرزا اسد اللہ خان کے والد کے زمانے سے میرزا قوقان بیگ کے اندرون حویلی ہندی ہی کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ مختار کار نے اس گھرانے کی کیفیت میں یہ بھی بیان کیا کہ اگرچہ یہ خانوادہ دنیاوی ثروت کے اعتبار سے بہت بلند رتبہ نہ تھا لیکن اس کے مردوں کی شرافت ونجابت اور علم وزہد اور اس کی عورتوں کے حسن، عصمت وعفت اور سگھڑاپے کی قسم کھائی جاتی تھی۔ ان کے دنیاوی وسائل بہت وسیع نہ سہی لیکن اتنے تنگ بھی نہ تھے کہ سارا گھرانہ فکر معاش سے آزاد مرفہ الحال زندگی نہ بسر کرتا ہو۔ آغا میرزا محمد اعظم علی خان اب چند دنوں سے صاحب لفٹین گورنر بہادر صوبۂ آگرہ کے دفتر نظارت میں نائب میر منشی مقرر ہو گئے تھے۔

نواب شمس الدین احمد خان نے بہت سوچ کر رشتے کی منظوری دے دی۔ ۱۲ ستمبر ۱۸۳۴ کو بعد نماز جمعہ جہانگیرہ بیگم کا نکاح آغا میرزا محمد اعظم علی خان سے منعقد ہوا۔ بارات آگرے سے فیروز پور جھرکہ آئی تھی۔ آمد بارات کے تیسرے دن نکاح ہوا اور ساتویں دن رخصتی عمل میں آئی۔ ایک لاکھ

روپے سکۂ شاہی مہر بندھا، ایک ربع جس کا معجّل تھا اور فوراً ادا کر دیا گیا تھا۔ بقیہ تین ربع موجل رہا۔ بارات کی آمد و رفت اور گھوڑے جوڑے کا سارا خرچ نواب شمس الدین احمد خان نے اٹھایا، لیکن لڑکے والوں کی طرف سے بھی چڑھاوے کے زیوروں، اقمشہ اور دیگر قیمتی اشیا میں غیر معمولی فراخ دلی اور افراط برتی گئی۔ بارات کے دوران قیام ساتوں دن سارے شہر فیروز پور جھرکہ میں دونوں وقت کے کھانے کا انتظام نواب کی طرف سے تھا۔

سسرال میں جہانگیرہ بیگم ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔ ان کے حسن و جمال اور نوابی شائستگی، نفاست اور تمکین نے سب کے دل موہ لئے۔ انھیں جہانگیر دلہن کا خطاب ملا اور جلد ہی وہ اپنے نئے گھر میں گھل مل کر ہنسی خوشی رہنے لگیں۔ شمس الدین احمد خان کو بہن کے سکھ اور سارے اکبر آباد میں چھوٹے بہنوئی کے تئیں محبت اور احترام، اور زن و شو میں الفت و انس کے معاملات کی خبریں ملیں تو انھوں نے سجدۂ شکر ادا کیا اور دل میں خیال کیا کہ میری شومی طالع کے دن اب گذر چکے ہیں یا جلد گذر جانے والے ہیں اور ایک گرہ ولیم فریزر کی جو ابھی محتاج کشائش ہے، وہ بھی انشاء اللہ جلد وا ہو جائے گی۔ لیکن قدرت کو تو کچھ اور منظور تھا۔

تا ناخن از پلنگ نہ گیرد بہ عاریت
ایام از دلم گرہے وا نمی کند

چہارم اکتوبر ۱۸۳۴، سنیچر کا دن، موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ شمال کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی تھی اور راجپوتانے کی سرکش مغربی ہوائیں سست پڑ گئی تھیں۔ قلعے کے گنجان باغوں میں تیتر بولنے لگے تھے۔ شام کے وقت شاما بھی اکثر بولتی اور طرح طرح کے طوطوں کے جھنڈ تو ہمہ وقت باغوں اور آسمان میں شور کرتے رہتے تھے۔ شمس الدین احمد کی طبیعت آج بہت بحال تھی کیونکہ جہانگیرہ کے سسرال والوں کی طرف سے جمنا کنارے کی ترکاریوں کی ڈالی کے ساتھ جہانگیرہ کا خط بھی آیا تھا۔ نواب کا معمول تھا کہ سنیچر کو دن کا کھانا زنانہ حویلی میں تناول کرتے تھے۔ صبح کا دربار برخاست کر کے انھوں نے جہانگیرہ کا خط دوبارہ بہت خوش ہو کر پڑھا، اکبر آباد سے آئے ہوئے کارندوں کے قیام و طعام کے بارے میں ہدایات دیں اور قلعے سے برآمد ہو کر اس تنگ کوچۂ سلامت کی طرف مڑنے ہی والے تھے جو پھولدار درختوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا اور زنانہ حویلی پر ختم ہوتا تھا۔ نواب کے برآمد ہوتے ہی دور قلعے کے صدر دروازے پر کچھ ہلکا سا شور ہوا۔ کوئی سانڈنی سوار اندر آنے کی اجازت کا طالب تھا۔ محافظ خانے سے دو

سونٹا بردار دوڑتے ہوئے نواب کے سامنے حاضر ہوئے اور سلام کر کے بولے کہ دہلی سے حضور کے لئے کوئی کاغذ لے کر سانڈنی سوار آیا ہے لیکن ہم نے اسے روک دیا ہے کہ عالی جاہ اب دربار برخاست فرما چکے ہیں۔ شمس الدین احمد نے حکم دیا، ''کچھ مضائقہ نہیں۔ آنے دو۔''

سانڈنی سوار، جس کا نام انیا میواتی تھا، نواب کے یہاں ہرکارے کے طور پر نوکر تھا۔ تیز رفتاری، جفاکشی اور صعوبات سفر کی برداشت کے لئے اس کے شہرے دور دور تک تھے۔ وہ اپنا ناقہ صدر دروازے پر چھوڑ کر دوڑتا ہوا نواب کے سامنے آیا اور جھک کر سات تسلیمیں کرنے کے بعد عرض گذار ہوا:

''عالی جاہ کے مختار کار بہادر نے عریضہ بھیجا ہے۔''

شمس الدین احمد کے دل میں خطرہ گذرا کہ کچھ غیر معمولی بات ہے، حالانکہ ایسی بات کے بظاہر کہیں سے کوئی آثار نہ تھے۔

''بہت بھاگم بھاگ چلے آرہے ہو۔ لاؤ دیکھیں تو سہی کیا لائے ہو۔'' نواب نے انیا کو نزدیک آنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''یہ تو عالی جاہ ہی بہتر جان سکتے ہیں۔ مجھے کل رات دیوان صاحب نے بلوا کر حکم دیا کہ آج صبح پو پھٹے ہی یہاں سے کوچ کر جائیو۔ یہ عرضی ہمارے حضور کی خدمت میں کل ظہر کے پہلے پہلے پیش ہو جاوے۔''

''بہت خوب۔ تم نے چالیس بیالیس کوس بڑی عجلت سے طے کیے۔'' یہ کہتے ہوئے نواب شمس الدین احمد نے اشارہ کیا کہ خط حاضر کیا جائے۔ انیا نے اپنی پگڑی کھولی، ایک مہر بند ریشمی تھیلی اس میں سے نکال کر دونوں ہاتھوں پر رکھی اور ایک قدم آگے بڑھ کر سر جھکائے ہوئے اپنے ہاتھ نواب کی طرف بڑھا دیئے۔ نواب کے دائیں جانب کھڑے ہوئے برقنداز نے بڑھ کر تھیلی اپنے ہاتھ میں لے لی اور مالک کا اشارہ پا کر مہر توڑی اور تھیلی کے اندر سے گول لپیٹا ہوا ایک موٹا کاغذ نکالا اور یوں ہی لپیٹا ہوا کاغذ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر نواب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ خط کو ہاتھ میں لیتے ہی شمس الدین احمد کو محسوس ہوا کہ یہ کاغذ کسی بہت بری خبر سے بوجھل ہے۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ اسے پڑھے بغیر آگ یا دریا میں ڈلوا دیتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا کرنا نہ تو ممکن تھا اور نہ کچھ معنی ہی رکھتا تھا، کہ جو اطلاع اس خط میں مذکور تھی وہ بہر حال آشکارا ہو کر رہنی تھی۔ کاغذ کے بل آہستہ آہستہ سیدھے کر کے نواب نے ورق کو سیدھا کیا اور اس پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ محسوس ہوا، کسی نے چارہ کاٹنے کا بھاری گنڈاسہ ان کے پاؤں پر کھینچ مارا ہے

اور دونوں ٹانگیں ٹخنے کے اوپر سے کٹ کر پیروں سے الگ ہوگئی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے لہرا کر انھوں نے چاہا کہ پاس کھڑے ہوئے برقنداز کے کندھے کا سہارا لیں، لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال کر انھوں نے خط کو بغور پڑھا۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' نواب کے منھ سے نکلا اور وہ کچھ مزید کہے بغیر الٹے پاؤں قلعے کے اندر واپس چلے گئے۔ اندر اپنی مخصوص آرام کرسی پر دراز ہو کر انھوں نے اشارے سے پانی مانگا اور پانی پیتے پیتے خط کو تیسری بار پڑھا:

اعلیٰ حضرت ولی نعمت سلامت بعد تسلیمات معروض می شود خبر رسیدہ است کہ از آستانۂ عالیۂ نواب گورنر جنرل بہادر فیصلہ درباب مقدمۂ حضور صادر شدہ است ونقل آں فیصلہ امروز بوقت صبحگاہی در ریزیڈنٹی موصول شدہ است توقع و اندیشہ ہا این است کہ در دو سہ روز نواب ریزیڈنٹ بہادر احکامات برائے عمل درآمد آں فیصلہ جاری خواہند فرمود بندہ درتحریر ایں عریضہ بسیار قلق و رنج دارد کہ فیصلہ بحسب منشائے آں بندہ پرور سلامت نمی باشد حکم نواب گورنر جنرل بہادر این است کہ علاقۂ لوہارو و پرگنہ جات تحت آں سرکار از تحویل اعلیٰ حضرت گرفتہ می شوند وولایت آں ملک تمامی سپرد امین الدین احمد خان بہادر می باید کرد مزید حکم صادر شدہ است کہ عمل در آمد ایں فیصلہ بفوری کنند دیوان وکارکنان سرکار لوہارو را باید کہ تعجیلا درخدمت سرکار اعلیٰ حضرت حاضر شوند اور جملہ تمسکات و کواغذ را در تحویل خود بحق امین الدین احمد خان بہادر بگیرند و از حویلیان در شہر دہلی حویلی واقع محلہ بلی ماران گلی قاسم جان زیر تصرف امین الدین احمد خان بہادر و حویلی دیگر واقع دریا گنج در قبضۂ اعلیٰ حضرت خواہد شد و فیروز پور جھرکہ وسائر پرگنہ جات ومحالات تحت آں سرکار در تسلط حضور پر نور حسب سابق می مانند عرض کردن واجب پنداشتم ایں عریضہ فرستم حررۂ نیاز دیوان عبداللہ خان مرقوم شد بتاریخ بست و ہفتم جمادی الاول ۱۲۵۰ بروز جمعہ مطابق سی ام ستمبر ۱۸۳۴ بوقت مغرب در شہر شاہجہاں آباد ۱۲

(ترجمہ)

اعلیٰ حضرت ولی نعمت سلامت۔ بعد تسلیمات کے معروض ہے۔

خبر ملی ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر کے آستانۂ عالی سے درباب مقدمۂ حضور فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور نقل اس فیصلے کی آج صبح ریزیڈنٹی پہنچ گئی ہے۔ توقع اور اندیشہ ہے کہ اندر دو تین روزوں کے ریزیڈنٹ بہادر برائے عمل درآمد فیصلہ مزید احکامات جاری فرماویں گے۔ یہ تحریر کرتے ہوئے بندے کو نہایت قلق ہے کہ فیصلہ بندہ پرور سلامت کی حسب منشا نہیں ہے۔ حکم نواب گورنر جنرل بہادر ہے کہ علاقہ لوہارو کا اور اس کے ماتحت پرگنہ جات تحویل سے اعلیٰ حضرت کی لے لئے جاویں اور ولایت اس خطۂ ملک کی امین الدین احمد خان بہادر کو سپرد کر دی جاوے۔

مزید حکم ہوا ہے کہ عمل درآمد اس فیصلے پر بفور ہو اور دیوان و کارکنان علاقۂ لوہارو شتابی سامنے حضور فیض گنجور اعلیٰ حضرت کے حاضر ہوویں اور جملہ تمسکات و کواغذ کو تحویل اپنی میں لے لیں۔ شہر دہلی کی دو حویلیوں میں سے حویلی واقع محلہ بلی ماران گلی قاسم جان پر قبضہ صاحب زادگان لوہارو کا اور حویلی واقع دریا گنج پر تصرف اعلیٰ حضرت کا ہوگا۔ فیروز پور جھرکہ اور سائر پرگنہ جات و محالات جو تحت فیروز پور جھرکہ ہیں، حسب سابق تسلط میں حضور پرنور کے رہیں گے۔

عرض کرنا واجب جانا، یہ عریضہ بھیجتا ہوں۔ حررہٗ نیاز دیوان عبداللہ خان۔

مرقوم ہوا بتاریخ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۵۰ بروز جمعہ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۳۴

بوقت مغرب در شہر شاہ جہاں آباد، حد۔

ظاہر ہے کہ خط کا مضمون بالکل واضح تھا اور شمس الدین احمد اگر اسے بار بار پڑھ رہا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ مضمون میں کوئی اشکال تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ کچھ فیصلہ کرنے سے خود کو قاصر پاتا تھا۔ اور اس وجہ سے بھی کہ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا اور ہر بار پڑھ لینے کے بعد اسے بےچینی ہوتی کہ خط کو دوبارہ پڑھیے، شاید اس میں کوئی بات موافق ہو جو گذشتہ پڑھنے میں مجھ سے چھوٹ گئی ہو۔ لیکن خط کی عبارت اس قدر سادہ تھی کہ کہیں سے کسی غلط فہمی یا ابہام کا امکان نہ تھا۔

شمس الدین احمد نے اگلی نصف ساعت میں دیوان عبداللہ خان کے مراسلے کو کئی بار پڑھا اور ہر بار مضمون کے واضح سے واضح تر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کی برہمی اور دلی رنج و غضب میں اضافہ ہوتا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا احساس بےچارگی بھی فزوں ہوتا گیا کہ اب میں کروں تو کیا کروں۔

نواب گورنر جنرل کے فیصلے کے سامنے وہ بے بس تھا۔ نہ مہاراجہ الور ہی کچھ کر سکتے تھے، نہ حضرت ظل سبحانی اس معاملے میں اثر انداز ہو سکتے تھے۔ فریزر نے یہ آگ لگائی تھی اور فریزر کو جان سے مروا دینے پر شمس الدین احمد کی آتش انتقام کچھ سرد ہو سکتی تھی اور اس رسوائی کا بھی کچھ تاوان ممکن تھا جو جہانگیرہ بیگم کے باب میں اس ملعون خنزیر صفت نصرانی نے شمس الدین احمد کے سر پر انڈیل دی تھی... لیکن اس سے ریاست تو واپس مل نہ سکتی تھی۔ نہ میرے پاس اتنی قوت اور دولت ہے کہ فرنگی سے عدالت میں لڑ کر اپنا حق لے لوں اور نہ یہ ممکن ہے کہ میں کوئی جنگ کر سکوں۔ گورنر جنرل بہادر تو کلکتے میں ہیں اور وہاں فوج کشی نا ممکن ہے۔ حکومت تو چھن ہی گئی ہے جان بھی جائے گی... لیکن میں جان دینے کو تیار ہوں اگر وہ ممکن ہو سکے۔ افسوس کہ وہ بھی ممکن نہیں، کہاں فیروز پور کہاں کلکتہ۔ لیکن اس نابکار گھمنڈی عیاش فریزر کو تو ضرور ہی سزا ملنی چاہیئے۔ کوئی اور سزا دے نہ دے میں تو اس کی کینہ توزیوں کا جلاد بن کے دکھا دوں گا۔ میں اسے اس کی گستاخیوں کا مزہ چکھا کر ہی رہوں گا۔ اس فرنگی قوم کی رعونتیں چڑھتے دریا امنڈتی آندھی کی طرح ہیں کہ گیلا سوکھا سبھی اجاڑے دیتی ہیں۔ اگر ہمارے ظل سبحانی اس قدر بے طاقت نہ ہوتے... نہ سہی، میں اپنی سی تو کر گذروں گا۔

ہر گذرتے ثانیے کے ساتھ شمس الدین احمد خان کا حرارہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چڑھی ہوئی تھیں، گویا دیر کا جاگا ہوا ہو۔ سارے بدن پر ہلکا سا لرزہ تھا، مٹھیاں بھنچی ہوئیں، پیشانی پر شکن، تنفس تیز، بدن کچھ اینٹھا ہوا سا، گویا بخار کا تشنج ہو۔ اس کا یہ عالم دیکھ کر کسی کو یارائے سخن نہ تھا۔ انیا میواتی، برقنداز، دیوان خانے کے چوبدار، سب بت بنے کھڑے تھے۔

نواب کو اندر آنے میں دیر ہوئی تو افضل النسا بیگم کی خادمہ صبح دولت، جو نواب اور بیگم دونوں کے بہت منہ لگی ہوئی تھی، اسے افضل النسا بیگم نے ہدایت کی کہ جا دیکھ آ، باہر نواب صاحب کو کیا درنگ ہے۔ وہ پائیں باغ سے ہو کر قلعے کے عقبی دروازے اور راہ داری سے ہوتی ہوئی دیوان خانے کے اس دروازے پر آئی جو اندر کی طرف کھلتا تھا۔ لیکن یہاں ہر طرف سکتے کا عالم اور نواب کی تشنج آمیز خاموشی دیکھ کر وہ سہم گئی اور الٹے پاؤں واپس جا کر اس نے بیگم سے عرض کیا کہ سرکار والا کو خدانخواستہ کوئی صدمہ پہنچا ہے یا دور پار کوئی خراب بات ریاست میں ہو گئی ہے کہ سرکار دیوان خانے میں بالکل گم سم تشریف فرما ہیں۔ چہرے پر غصے کے مارے سرخی اور سیاہی دوڑ رہی ہے۔ بدن بالکل ٹھس اور بے حرکت ہے۔ ایک

مرتبہ افضل النسا کے جی میں آئی کہ خود باہر آ کر مردانہ قلعے میں پہنچ جائیں اور اپنی آنکھ سے دیکھیں کہ بات کیا ہوگئی ہے اور ہو سکے تو نواب کے حال کا تدارک کریں یا اس کی کچھ تدبیر کریں۔ لیکن انھوں نے زندگی میں ایک بار بھی قلعے کی مردانہ حویلی میں قدم نہ رکھا تھا۔ ان کی تربیت اس ڈھنگ سے ہوئی تھی کہ اپنے گھر، اپنی حویلی، اپنے خانہ باغ میں سب آزادیاں تھیں لیکن غیر مرد نہ ان کی آواز سن سکتا تھا اور نہ قدم کی آہٹ لے سکتا تھا۔ کسی ایسی جگہ پر، خواہ وہ قلعے کے اندر ہی کیوں نہ ہو، ان کا جانا غیر ممکن تھا جہاں مرد کی پرچھائیں بھی پڑ سکتی ہو۔ انھوں نے مجبوراً کھانا بڑھوا دیا اور صبح دولت سے کہا کہ تو سن گن لیتی رہ کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ آخر کون سی بات ہوگئی ہے جس نے سرکار کو اس طرح حال سے بے حال کر دیا۔ اور آیا کسی حکیم وید یا سیانے کو بلایا گیا ہے کہ نہیں۔

افضل النسا بیگم یہ حکم احکام دے کر تسبیح لے کر مصلے پر بیٹھ گئیں۔ دونوں بچیوں کو دائی کھلائیاں اپنے اپنے حجروں میں لے جا کر بہلانے کھانا کھلانے اور پھر سلانے کی کوشش کرنے لگیں۔ بچیوں کو بے حد مایوسی تھی اور شکوہ تھا کہ ان کے ابا جان نہیں آئے اور وہ انھیں دیکھنے اور ان کے پاس بیٹھنے سے محروم رہ گئیں۔ نواب شمس الدین احمد خان تقریباً ہر روز پورا دن اور اکثر راتیں قلعے کی مردانہ حویلی میں گذارتے تھے۔ مقررہ دن کے وقت ان کا اندر آنا اور بیگم اور بچوں کے ساتھ کھانا کھانا بچیوں کے لئے ایسا واقعہ تھا جس کا ذکر وہ اگلے کئی دنوں تک کرتی رہتی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں نواب کے صدمے اور غم کی کیفیت امیر بہو اور چمپا بی تک بھی پہنچ گئی۔ ساری زنانہ حویلی میں سناٹا سا چھا گیا۔ صرف چمپا کی بیٹی رحمت النسا جو ڈھائی سال یا اس سے کچھ کم کی تھی، اپنی ماں کے حجرے میں کبھی تنک کر اور کبھی رو کر شکایت کرتی رہی کہ آج میرے ناب شاب کیوں نہیں آئے۔ باپ کو وہ ماں کی نقل میں ''نواب صاحب'' کہنا چاہتی تھی، لیکن توتلے منھ سے ''ناب شاب'' نکلتا تھا اور شمس الدین احمد خان کو یہ نام یا لقب ننھی بچی کے منھ سے اس قدر بھلا لگتا تھا کہ ہر ملاقات پر اس سے بار بار ''ناب شاب'' کا فقرہ ادا کراتے اور ہر بار اسے انعام دیتے تھے۔

بھر مارو

باہر قلعے کی مردانہ حویلی کے صدر پھاٹک پر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ آنے والے نے گھوڑے سے اتر کر اس کی باگ محافظ خانے کے ایک سونٹا بردار کے ہاتھ میں دی، کمر میں بندھے ہوئے طمنچے کو سیدھا کیا، گھوڑے کے قربوس پر سے ایک ململی دستمال لے کر اپنا منھ پونچھا، پھر جوتیوں کو جھاڑا، محافظوں کی طرف مسکرا کر دیکھا، اور کہا:

''میاں صاحب لوگ، ہمارے گھوڑے پر نگاہ رکھنا۔''

''ذرا سوچ سمجھ کر اندر جایئے گا بھر مارو جی۔'' ایک سونٹا بردار نے کہا۔

''کیوں، کیا بات ہو گئی؟'' اس نے مڑ کر محافظوں کو غور سے دیکھا۔ سب کے چہرے کچھ رنگ باختہ لگ رہے تھے۔

''سرکار کا مجاز برہم ہے۔''

''مگر کیوں؟ کیا خاصہ پسند نہیں آیا تھا؟''

''خان جی، ابھی منھ میں ایک نوالہ بھی گیا ہو تو قسم سمجھو۔ سرکار اندر تشریف ہی نہیں لے گئے۔ دیوان خانے میں چپ چاپ مگر مچھ سر کیے پڑے ہیں۔''

نو وارد کی پیشانی پر تفکر کی شکنیں ابھریں۔ ''اچھا، ہم جا کر دیکھیں تو سہی،'' کہہ کر وہ قلعے کے اندرونی پھاٹک کی طرف بڑھا۔ لیکن اب اس کی چال میں پہلے جیسی پھرتی نہ تھی۔ انتہائی قد آور اور تنومند، سرخ و سفید رنگ، چہرے پر راجپوتوں جیسی پگڑی، لیکن لمبے پٹے دار چمکیلے بال پگڑی کے پیچھے کاکلوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ چوڑا سینہ، سیاہ روشن آنکھیں، راجپوتانے کے جاٹوں جیسی مونچھیں اور بہت چھوٹی داڑھی اس کے گورے صحت مند رنگ پر بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ اس نے انگریزی وضع کا شہسواری

لباس اور بوٹ پہن رکھے تھے۔ بائیس چوبیس سال کی عمر، سیدھی کمر، شانے اور پیٹ اور رانوں پر فالتو گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ تھی، چربی کا بھلا کیا سوال تھا۔ یہ کریم خان تھا، نواب شمس الدین احمد خان کا میر شکار، اور اپنی چال ڈھال، وجیہ مردانہ پن، ہلکے لیکن مضبوط قدموں اور پر اعتماد آنکھوں کی وجہ سے وہ خود بھی جوانی اور قوت سے بھرپور، کسی گھنے اور شاداب جنگل میں پر نخوت چال چلتا کوئی گلدار معلوم ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پندرہ پندرہ کوس پا پیادہ شکار کا تعاقب کر سکتا تھا اور تھکتا نہ تھا۔ جنگلوں کی مہارت اسے اس قدر تھی کہ جانوروں کے قدموں کے دھندلے نشان، ان کے گذار کے باعث تڑی مڑی جھاڑیوں کی پتیاں یا گھاس، جنگلی چڑیوں، اور لال بندروں، چکاروں، کانکروں، لنگوروں کی بولیاں اس کے لئے مادری زبان کی طرح تھیں۔ وہ اپنے وقت کا بے مثال تفنگچی اور برقنداز تھا۔ جو لوگ گھوڑے یا ہاتھی، یا کسی سواری پر سے بندوق چلاتے تھے انھیں تفنگچی، اور جو لوگ پا پیادہ رہ کر بندوق چلاتے تھے، انھیں برقنداز کہا جاتا تھا۔ دونوں فن الگ الگ طرح کی تربیت اور مزاج کے متقاضی تھے۔ لیکن کریم خان کا نشانہ کبھی چوکتا نہ تھا، چاہے نشانہ لینے کے لئے وقت کتنا ہی کم ہو اور روشنی کتنی ہی دھندلی ہو، اور اس کا گھوڑا، یا خود شکار کتنا ہی تیز دوڑ رہا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ تمامی اہل فیروز پور، اور لوہارو کی بھی تمام رعایا اسے ''بھرمارو'' کہتی تھی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ''بھرمار'' ایسی بندوق کو کہتے تھے جس میں بارود اور گولی نالی کی راہ سے بھری جاتی ہے۔ ایسی بندوقیں ''توڑے دار'' اور ''ٹوپی دار'' بھی کہلاتی تھیں۔ جدید توڑے دار اور قدیم توڑے دار بندوق میں فرق یہ تھا کہ قدیم توڑے دار بندوق کی بٹنی (Nipple) کو رنجک دینے کے لئے شتابہ استعمال کرتے تھے جو ایک طرح کا فلیتہ ہوتا تھا۔ بٹنی کو گھمائیں تو تھوڑی سی جگہ نظر آتی تھی، اس میں نہایت باریک بارود (جسے رنجک کہتے تھے) کی ایک چٹکی رکھ لیتے تھے اور فیر کرتے وقت بٹنی کو شتابہ دکھاتے تھے۔ باریک بارود گرمی پا کر روشن ہو جاتی تھی اور اس کا شرارہ کوٹھی کی راہ سے بندوق کے منھ پر پہنچ کر نالی میں بھری ہوئی بارود اور گولی کو سر کر دیتا تھا۔ جدید توڑے دار بندوق میں شتابہ غیر ضروری تھا۔ اس کی جگہ بندوق کا گھوڑا بٹنی کے ڈھکن (یعنی ٹوپی) پر طاقت کے ساتھ ضرب کرتا تھا۔ ٹوپی پٹاخے کا کام کرتی تھی، جس کی دھمک سے رنجک روشن ہوتی تھی اور بندوق کا فیر ہو جاتا۔ ایسی بندوق کو ٹوپی دار بھی کہتے تھے۔ اس بندوق کے جدید ترین طرز کو ''پتھر کلہ'' کہتے تھے، کہ اس میں رنجک کی جگہ چقماق پتھر سے کام لیتے تھے۔ ان سب بندوقوں میں گولی بارود براہ نال بھری جاتی تھی۔ انگریزی میں انھیں ML یعنی Muzzle Loading کہتے تھے۔ ہندوستان میں یہ عموماً ایک نال کی ہوتی تھیں لیکن انگریزوں نے دونالی

بھرمار بھی رائج کر دی تھیں۔ انھیں DBML یعنی Double Barrelled Muzzle Loading کہا جاتا تھا۔

بھرمارو کی تمام اقسام پر کامل مہارت کے علاوہ کریم خان کو قرابین اور بے دھرمی کی بھی نہایت عمدہ مشق تھی۔ قرابین فرانسیسی ایجاد کی بندوق تھی، اسے انگریزی اور فرانسیسی میں Carbine کہتے تھے۔ اس کی نال بھرمارو سے چھوٹی اور طمنچے سے لمبی ہوتی تھی۔ اس لئے گھڑسوار اسے اکثر بندوقوں پر ترجیح دیتے تھے۔ قرابین کا منھ آگے سے ذرا چوڑا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ دونالی بھی بنتی تھی، لیکن عام طور پر ایک نالی کی قرابین رائج تھی۔ اس میں گولی بھرنے کے لئے اس کے کندے اور نال کے بیچ میں ایک خانہ ہوتا تھا جسے توس دان کہتے تھے۔ دوبدو جنگ اور مدافعت وتحفظ کے لئے قرابین بہت مقبول تھی کیوں کہ اگرچہ اس کا ٹپا یعنی اس کا توڑ بہت نہ تھا، لیکن کم وزن اور نسبۃً چھوٹی نال کے باعث اسے گھوڑے یا اونٹ پر سے بآسانی سر کیا جا سکتا تھا۔ قرابین کی گولی بھی نسبۃً بھاری ہوتی تھی اور اس کو سر کرنے میں شتابہ یا بتّی کی ضرورت نہ تھی، لہٰذا فیر جلد جلد ہو سکتے تھے۔

قرابین میں ایک سے زیادہ گولیاں سر کرنے کی صلاحیت ہوتو اسے چندضربی کہتے تھے، ورنہ عام بندوقوں کی طرح قرابین بھی یک ضربی ہوتی تھی۔ قرابین اور بے دھرمی میں گھوڑا نہیں ہوتا تھا، اس کے بجاے نال کے تخت کے اندر ایک نوکدار کمانی ہوتی تھی جو لبلبی دبانے پر کارتوس یا گولی کے پیندے پر ضرب لگاتی تھی اور اسلحہ سر ہو جایا کرتا تھا۔ ایسی تمام بندوقوں کو انگریز BL یا Breech Loading کہتے تھے۔ ان میں گولی بارود نال سے نہیں بلکہ کندے کی طرف سے ڈالتے تھے۔ ایسی بندوقوں کی پاکھی میں (نال اور کندے کے درمیان) ایک کیل لگی ہوتی تھی جسے مغز کیل کہتے تھے۔ مغز کیل کو اپنی جگہ سے کھسکائیں تو کندہ الگ ہو جاتا تھا اور نال میں حسب ضرورت گولی چڑھا دی جاتی تھی۔ ایسی دو نالی بندوقیں انگریزی میں DBBL یا Double Barrelled Breech Loading کہلاتی تھیں۔ ہندی میں انھیں دونالی قرابین، بے دھرمی یا رفل، یا دوگاڑا کہتے تھے۔ استعمال اور سر کرنے میں آسانی کے باوجود ہندوستانی فوجیوں میں Breech Loading بندوقیں اس وقت بہت مقبول نہ تھیں۔

بے دھرمی بندوق دراصل انگریزوں کی ایجاد کردہ اور رائج کردہ یک نالی رائفل تھی جس کا توڑ بہت دور تک ہوتا تھا۔ انگریزوں کی آوردہ ہونے کی وجہ سے اسے عام ہندوستانی ''بے دھرمی'' کہتے تھے، لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت لفظ ''رفل'' اس کے لئے رائج ہو رہا تھا اور ''بے دھرمی''

کی اصطلاح ترک ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ آتش کے دیوان اول میں شعر ہے۔

اپنی شکارگاہ جہاں میں ہے آرزو
ہم سامنے ہوں اور تمھاری رفل چلے

کریم خان میر شکار اگرچہ بے دھرمی بندوق کا بے حد مشاق اور ماہر تھا، اور نواب کے اسلحہ خانے میں اور اس کی اپنی ملکیت میں کئی وضع کی بے دھرمیاں بھی تھیں، لیکن وہ شکار کے لئے بے دھرمی کبھی نہ استعمال کرتا تھا۔ کریم خان کا قول تھا کہ ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے سے چھپ کر یا ہاتھی کی اونچائی سے شکار مار لینا آئین جواں مردی نہیں ہے۔ بھرمار اور پتھر کلہ ہی شکاری کو جانور پر ایک طرح کا تفوق اور برتری دلا دیتی ہیں، چہ جائے کہ انگریزی رفل، جو محض بزدلی کا ہتھیار ہے۔ اس کا یہ بھی قول تھا کہ سب سے بہتر شکاری وہ ہے جو پا پیادہ صرف تلوار یا برچھے کے بل بوتے پر شیر یا ہاتھی سے نبرد آزمائی کرے اور فتح مند ہو۔

کریم خان کی پیدائش اور تربیت فیروز پور کے قلعے ہی میں ہوئی تھی۔ شمس الدین احمد سے دو تین سال چھوٹا ہونے کی وجہ اوائل ریعان ہی سے وہ ان کے ساتھ پلا بڑھا تھا اور شمس الدین احمد کے ساتھ اس نے فنون سپہ گری، مسلح اور نہتی جنگ و دفاع کے گر بھی سیکھے تھے۔ اور عربی فارسی میں شروع کے چند برس وہ اور شمس الدین احمد ایک ہی آخوند جی کے شاگرد رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں کا اچھا اور بات چیت میں ظریف الطبع اور شائستہ ہونے کی وجہ سے کریم خان ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ دلی کے من چلے اسے ''گل سرخ'' کہتے تھے۔ کئی اچھی جگہوں سے اشارے آنے کے باوجود کریم خان نے شادی نہ کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ جنگل کی جھاڑیاں میری رانیاں ہیں اور جنگل کے چھتنار درخت میرے براتی ہیں۔ پھر مجھے کسی اور سے شادی کی کیا پڑی ہے۔

مردانہ حویلی کے صدر دراوزے پر تعینات برقندازوں کو دیکھ کر کریم خان نے ابرو کے اشارے سے اندر کا حال پوچھا۔ برقندازوں نے اسے اندر جانے کا اشارہ دے تو دیا، لیکن ان کے انداز میں سنکوچ اور احتیاط نمایاں تھی، گویا کہہ رہے ہوں کہ اگر بات بگڑ گئی تو ہمیں نہ کہنا۔ صدر دروازہ پار کر کے کریم خان نے دیوان خانے کے سامنے صحن میں قدم رکھا۔ ہر طرف پھول اور پھلدار درختوں کی جھاڑیاں، گھاس کی روشیں، بیچ میں نہر، اور نہر کی پرلی طرف مہتابی تھی۔ صحن کے بقیہ حصے میں سنگ مرمر کا فرش تھا اور اس کے سامنے اور بائیں طرف چوڑے دالان تھے۔ سامنے والے دالان کے پیچھے دیوان خانہ تھا۔ کریم خان نے دیوان خانے کا رخ کیا ہی تھا کہ بائیں دالان کے پیچھے ایک دروازے کا پردہ ہلا، کوئی

اسے اشارہ کر رہا تھا۔ کریم خان نے آنکھ اٹھائی تو وہ صبح دولت تھی جو دوبارہ نواب کا حال معلوم کرنے آئی تھی اور نواب کا سامنا کرنے کی ہمت اب بھی نہ کر سکنے کی وجہ سے شاگرد پیشہ کی طرف جا رہی تھی کہ کسی معمر نوکر سے مدد لے۔

صبح دولت اور کریم خان ایک دوسرے سے خوب واقف تھے اور صبح دولت کبھی کبھی اسے ایک ادائے خاص سے دیکھ بھی لیتی تھی، لیکن کریم خان نے اس پر کچھ دھیان نہ دیا تھا۔ اس بار بھی اسے گمان ہوا کہ شاید تنہائی کا موقع پا کر یہ خیلا مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔

''کیوں، کیا بات ہے؟ تو ادھر مردانہ حویلی میں کہاں ملکتی پھر رہی ہے؟'' کریم خان نے ماتھے پر شکن لا کر تند لیکن سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''اللہ کریم خان جی۔ آپ نے سنا نہیں کیا؟ سرکار عالی پر کچھ دورہ سا پڑا ہے۔ اندر سب بیگماتیں گھبرا گھبرا کر باولی ہوئی جا رہی ہیں۔ کسی کی عقل کام نہیں کر رہی۔''

''یہ تو بڑے سانسے کی بات ہے... کیا بے ہوش ہیں؟... پر تو یہاں کیوں ہے؟''

''بڑی بیگم صاحب بار بار پچھوا رہی ہیں حکیم صاحب آئے کہ نہیں۔ اندر کوئی خبر ہی نہیں بھجواتا کہ کیا ہو رہا ہے سرکار کیسے ہیں۔''

''اچھا تو میں جا ہی رہا ہوں سرکار کی خدمت میں۔ تو یہاں سے چل۔ میں ابھی سب حال معلوم کر کے کوئی صورت بہتری کی نکالوں گا۔ پھر اندر بھی حال کہلا دوں گا۔'' یہ کہہ کر کریم خاں تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔ صبح دولت ایک لمحہ اس امید میں وہیں کھڑی رہی کہ شاید کریم خان مڑ کر دیکھے۔

دیوان خانے میں نواب کی حالت آہستہ آہستہ اعتدال پر آ رہی تھی۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھے لیکن بدن میں تشنج نہ تھا اور چہرے کی سیاہی تحلیل ہو گئی تھی۔ انھیں پسینہ البتہ آ رہا تھا اگرچہ موسم خنک تھا۔ ایک خادم نرم دستمال سے ان کا پسینہ ہلکے ہلکے خشک کر رہا تھا۔ دو نوکر کچھ دور ہٹ کر بڑے پنکھے ہلا رہے تھے۔ ایک چوبدار تھالی جوڑ گلاس میں شربت لئے ہوئے کھڑا تھا لیکن نواب اس کی طرف متوجہ نہ ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اب بھی خالی خالی تھیں اور چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ چپی والی ایک اصیل پاؤں کے تلوؤں میں ململ کے دوپٹے سے جھانواں کر رہی تھی۔ کریم خان آہستہ سے اندر داخل ہوا۔ شربت والے چوبدار سے اس نے اشاروں میں پوچھا کہ حکیم صاحب یا وید جی کوئی آئے نہیں۔ نفی میں جواب پا کر وہ نواب کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بہت ہلکے اور شیریں لہجے میں بولا:

"کیا ہو گیا میرے بادشاہ کو؟ کس نے آزردہ کیا ہے؟ کس نے ایسی گستاخی کی؟"

نواب نے چھت کی طرف سے آنکھیں ہٹا کر اسی طرح خالی خالی نظروں سے کریم خان کی طرف دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ کریم خان کو دیکھ کر وہ ہمیشہ خوش ہو جاتے تھے لیکن آج ان کا چہرہ تاثر سے بالکل عاری تھا۔

"کچھ منھ سے بولئے تو سہی میرے سرکار۔" کریم خان نے اس بار نواب کا گھٹنا پکڑ کر ہلکے سے ہلایا، جیسے نیند سے جگا رہا ہو۔ "آپ حکم تو فرمائیے۔ سب جاں نثار حاضر ہیں آپ کی مرضی فوراً پوری ہوگی۔"

نواب نے اس بار کریم خان کو اس طرح دیکھا گویا اب اس کے آنے پر مطلع ہوئے ہوں۔

"کریم خان۔" نواب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اب کچھ نہیں۔ اب مرنے مارنے کا وقت ہے۔"

کریم خان نے نیم قہقہہ لگایا۔ "سرکار فرما تو دیں کس کے مرنے کا وقت ہے۔ مارنے کو ہم تیار ہیں۔"

"لوہارو ہم سے چھن گیا۔ یہ سب اسی قرم ساق کی کارستانی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ہم نے اسی روز اسے مار دیا ہوتا۔"

"سرکار تو پہیلیاں بجھا رہے ہیں۔" کریم خان نے پرانے دوستوں کے سے انداز میں کہا۔

نواب نے زمین پر پڑے ہوئے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے اٹھا کر پڑھ کیوں نہیں لیتے۔ سب تو اسی میں لکھا ہوا ہے۔"

کریم خان نے کاغذ اٹھا کر پڑھا تو چند ہی ثانیوں میں ساری حقیقت عیاں ہو گئی۔ اس کے چہرے پر افسوس کے بادل آئے لیکن فوراً ہی گزر گئے۔ افسوس کی جگہ متانت اور عزم صمیم کی صلابت نے لے لی۔

"میں سرکار کے حکم کا منتظر ہوں۔ دلی جاؤں یا کلکتہ چلا جاؤں؟ کیا فرنگی بادشاہ کے یہاں مرافعہ ہوگا؟"

"مرافعہ کیسا اور التجا کیسی؟" نواب نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "جو ہو چکا اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اب اللہ ہی ان سے انتقام لے گا۔ وہ عزیز اور ذوانتقام ہے۔"

''انتقام تو ہم بھی لے سکتے ہیں سرکار۔''

''نواب شمس الدین احمد خان نے آرام چوکی کے ہتھے پر زور سے مکا مار کر بلند آواز میں کہا۔'' کیا کوئی ایسا نہیں جو اس کا فرنا ہنجار فریزر کو ٹھکانے لگا دیتا کہ میرے جی کو کچھ تسکین ملتی۔''

ہر طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد کریم خان نے کہا:

میں نے سنا ہے سرکار نے خاصہ بھی نہیں تناول فرمایا۔ اندرون حویلی کے لوگوں میں بڑی بچینی اور خلفشار ہے۔ بارے آپ انھیں اور ننھے بچوں کو کب تک انتظار میں رکھیں گے۔''

نواب نے کریم خان کی طرف کچھ حیرت سے نظر کی۔ موضوع گفتگو کے اچانک بدل جانے کی کچھ علت ہوگی، لیکن کیا علت ہو سکتی ہے؟ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ کریم خان نے مزید کہا:

''میں تو ولی نعمت دولت مدار سے اجازت لینے آیا تھا۔'' وہ ایک لحظے کو رکا، گویا کوئی عام سی بات کہہ رہا ہو، کہیں کچھ جلدی یا گھبراہٹ نہ ہو۔ ''ایک ضروری کام آ پڑا ہے۔ میں ابھی ابھی دلی کے لئے کوچ کیا چاہتا ہوں۔ اعلیٰ حضرت خاصہ نوش فرمائیں۔ آپ کا جی ماندہ ہو رہا ہے۔ چندے آرام فرمائیں۔ پھر غلام کچھ تدابیر عرض کرے گا۔'' یہ کہہ کر کریم خان نے نواب کے گھٹنوں کو پھر ہاتھ لگایا اور اٹھ کر سات بار جھک جھک کر سلام کیا۔

''جاؤ۔ تمھیں خدا کو سونپا۔'' نواب نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

کریم خان الٹے قدموں دیوان خانے سے باہر نکل آیا۔ اس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ چوبدار نے شربت کی کشتی دوبارہ پیش کی لیکن نواب نے اشارے سے انکار کر دیا۔ دوبارہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نواب ذرا چست و چاق ہو کر بیٹھے، پھر حکم دیا کہ آبدار خانے سے سیلابچی اور آفتابہ منگوائیں کہ ہاتھ منھ دھلوایا جائے۔ ہلکے گلاب اور کیوڑا آمیز پانی کے چھینٹوں سے چہرے پر کچھ شگفتگی آئی تو شمس الدین احمد نے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ نوکروں کا مجمع گویا سانس روکے ہوئے میری حالت کے بہتر ہونے کا منتظر ہے۔ صبح دولت، جو کریم خان کو باہر جاتے دیکھ کر دیوان خانے کے دروازے پر آ گئی تھی کریم خان کا اشارہ پا کر اب ہمت کر کے اندر آئی اور سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ نواب نے اس کی طرف نظر کی اور پوچھا، ''اری صبح دولت، تو اس وقت باہر کیونکے نظر آ رہی ہے؟ سب خیر تو ہے؟''

صبح دولت نے دوبارہ سلام کیا اور بولی:

''سرکار والا جاہ کا جی کیسا ہے۔ بیگم صاحب کلاں نے پچھوایا ہے کہ کیا حکیم صاحب کو بلوانے کی رائے نہیں ہوئی؟ سرکار اب کیسے ہیں؟''

شمس الدین احمد خان نے ٹھنڈی سانس لی اور کچھ زیر لب، کچھ سب کو مخاطب کر کے صیدی طہرانی کا شعر پڑھا:

بغیر سوختنم مطلبے زمانہ نہ دارد
چو شمع خوشۂ ما غیر اشک دانہ نہ دارد

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نواب نے صبح دولت سے فرمایا۔ ''حکیم صاحب کی حاجت نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم اندر جاؤ۔ خاصہ چنوایا جائے۔''

صبح دولت تین سلام کر کے دیوان خانے سے نکلی تو نواب نے چوبدار کو حکم دیا کہ ہوادار منگوایا جائے۔ ہم قلعے کے باغ میں کچھ دیر ہواخوری کے بعد خاصہ کھانے زنانہ حویلی میں جائیں گے۔

ہفتم اکتوبر ۱۸۳۴ بروز سہ شنبہ کریم خان اور انیا میواتی نے گوڑگاؤں کی ایک سرائے میں رات گذاری اور اگلے دن دوپہر کے پہلے پہلے دہلی پہنچ کر انھوں نے نواب کی دریا گنج والی حویلی میں قیام کیا۔ چونکہ ان کا دہلی آنا جانا اکثر رہتا تھا لہٰذا کسی کو ان کے آنے اور حویلی میں قیام کرنے پر حیرت نہ ہوئی اور نہ کسی نے پوچھا کہ تم لوگ کس غرض سے آئے ہو اور نواب کہاں ہیں۔ یوں بھی اس موسم میں نواب اپنے علاقوں کا دورہ کرتے تھے لہٰذا کسی کو ان کا انتظار نہ تھا۔

کریم خان کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ولیم فریزر بھی ان دنوں دلی میں نہیں ہے کہ وہ بھی زمستانی ملاحظوں کی غرض سے اطراف ملک میں گھومتا پھر رہا تھا۔ کچھ تو دہلی کمشنری کا علاقہ خود ہی وسیع تھا، اور کچھ یہ کہ صاحبان فرنگ کی آنکھیں ان دنوں پنجاب پر تھیں لہٰذا ان ممالک کے تمام حاکمان افرنگ کے دوروں میں پنجاب کی سرحدوں کے پاس واقع شہر اور قصبے ضرور شامل ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ولیم فریزر کا دہلی آنا بہت کم ہوتا تھا، اور اگر ہوتا بھی تھا تو بہت کم مدت کے لئے۔ اور یہ مختصر وقت بھی اس کا زیادہ تر ریزیڈنٹی ہی میں گذرتا۔ شام کی سیر بھی اس نے موقوف کر دی تھی۔ پھر خبر لگی کہ ان اطراف میں کچھ شورش کے باعث صاحب کلاں بہادر نے بالفعل خود کو کرنال میں متمکن کر لیا ہے اور دہلی کی طرف ان کا رخ اب اور بھی کم ہو گا۔

کریم خان کو دہلی میں پڑے پڑے اب تین مہینے ہو رہے تھے اور اس دوران فریزر پر اس کا پنجہ قابض ہونے کا موقع تو دور رہا، اس نے فریزر کی جھلک بھی ایک ہی دو بار دیکھی تھی۔ اس نے فریزر کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لئے چند بہت معتمد جاسوس رکھ چھوڑے تھے جو اس ساری مدت میں کم و بیش مفت ہی کی تنخواہ کاٹتے رہے تھے، یہاں تک کہ وسط دسمبر ۱۸۳۴ آ گیا اور صاحبان عالیشان کے خیام و قصور میں بڑے دن کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ کریم خان کو خبر لگی کہ ولیم فریزر بسلسلۂ بڑا دن و نوروز افرنگی امروز و فردا میں دہلی آیا چاہتا ہے۔ اب اسے توقع ہوگئی کہ ہفتے عشرے میں فریزر کا سینہ اس کی گولی کا نشانہ ہو سکے گا۔ اس نے جاسوس کو تاکید کی کہ فریزر صاحب کی مراجعت دہلی کے بعد سے ان کی نقل و حرکت، قیام و سفر کے بارے میں پل پل کی خبر مجھے پہنچتی رہے۔ لیکن فریزر ابھی دہلی پہنچا بھی نہ تھا کہ کریم خان کو حسب ذیل رقعہ ملا :

خان عزیز القدر شجاعت نشان میر شکار محمد کریم خان بھر مارو بسلامت باشند۔ باعث تحریر آنکہ۔ شما مقیم دار الخلافۂ فرخندہ بنیاد می باشید از مدت سہ ماہ کم و بیش ولاکن شما امر ضروری بابت خریداری سگان شکاری تا ہنوز انجام نہ دادہ باشید و ہم ہیچ پرچۂ اطلاع و اخبار دریں بابت نہ فرستادہ اید تا حال۔ پس ایں خطر در خاطر ما می گذرد کہ شما برائے سرانجامیدن مہمات امور مثلاً خریداری سگان شکاری ہیچ اہلیت نہ دارید۔ فلہٰذا مجرد دیدن ایں روبکار بفور مراجعت سوئے قلعہ بکنید۔ تعویق اصلا مناسب نیست۔ مرقومہ پانزدہم شعبان سال حال بروز یوم الاثنین بوقت چاشت ۱۲

(ترجمہ)

خان عزیز القدر شجاعت نشان میر شکار محمد کریم خان بھر مارو بسلامت رہیں۔

باعث تحریر آنکہ۔ تم کو دار الخلافۂ فرخندہ بنیاد میں عرصہ تین مہینے کا ہونے آ رہا ہے اور تم نے خریداری سگاں کے امر ضروری کو سرانجام نہیں دیا ہے اور نہ ہی کوئی اطلاع بھیجی ہے۔ پس یہ خیال ہماری خاطر میں آیا ہے کہ تم خریداری سگاں جیسے اہم امور کو انجام دینے کی اہلیت کچھ نہیں رکھتے ہو۔ لہٰذا اس روبکار (۱) کو دیکھتے

(۱) جس نوابی رقعے میں کوئی حکم مرقوم کیا جاتا اسے "روبکار" کہتے تھے۔

ہی سوئے قلعہ مراجعت کرو۔ دیر ہرگز مناسب نہیں۔

مرقومہ ۱۵ شعبان سال حال بروز دوشنبہ بوقت چاشت، حد۔

رقعہ نواب شمس الدین احمد خان کے نہایت خوبصورت شکستہ خط میں لکھا ہوا تھا لیکن اس پر ان کے دستخط نہ تھے، نہ مہر تھی۔ کاغذ بھی وہ نہ تھا جو دیوان ریاست میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن کریم خان کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ روبکار خود نواب کی تحریر کردہ تھی۔ لہٰذا کریم خان نے اگلے دن علی الصبح فیروز پور جھرکہ کے لئے رخت سفر باندھ لیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے خیال کیا کہ رقعے کو حویلی میں چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ اسے اپنے پاس رکھنا بھی خلاف مصلحت تھا، بلکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ رقعے کو نذر آتش کر دیا جائے یا پرزے پرزے کر دیا جائے۔ لیکن نواب کی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر کو جلانا یا چاک کرنا کریم خان کو گوارا نہ ہوا۔ بہت سوچ سمجھ کر اس نے وہ رقعہ دریا گنج کی حویلی کے سامنے والے کنویں میں ڈال دیا۔

دو منزلوں کو ایک منزل کرتا ہوا کریم خان دوسرے دن عصر کے وقت قلعۂ فیروز پور کے دروازے پر حاضر ہو گیا۔ بعد مغرب جب اس کی باریابی ہوئی تو نواب شمس الدین احمد کچھ خاص مصاحبوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ چکے تھے۔ کریم خان کو بھی شریک ہونے کا اشارہ ہوا۔ کھانے کے دوران رسمی دعا سلام کے علاوہ کوئی بات نہ ہوئی لیکن نواب کے چہرے پر وہ شگفتگی نہ تھی جو عموماً نظر آتی تھی اور جس کی بنا پر ان کا تشخص اور بھی دلچسپ و دلکش ہو جاتا تھا۔ کھانا ختم ہونے پر جب حقے اور گلوریوں کا دور چلا تو کریم خان نے ایک مصاحب کی کسی بات پر کہا کہ ہمارے آقا و ملجا و ماوا کو کسی دشمن سے آزار پہنچے تو کم از کم میں تو خاموش نہ بیٹھوں گا۔ میں تو دشمن کو ٹھکانے لگا کر ہی دم لوں گا۔

''بے شک۔ شکم پرست لوگ یوں ہی باتیں بناتے ہیں۔'' شمس الدین احمد نے خفیف سے تبسم کے ساتھ کہا لیکن ان کی پیشانی پر اب بھی ہلکا سا بل تھا۔

کریم خان کو وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔ نواب کا اشارہ صاف صاف اسی کی طرف تھا، لیکن نواب کی بات برجا تھی ہر چند کہ دل آزار تھی۔ بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ شمس الدین احمد اور کریم خان ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے، نواب کا جملہ کریم خان کے کلیجے میں سوئی کی طرح چبھا، مگر اس وقت خاموش رہنے میں ہر طرح کی مصلحت تھی۔ جلد از جلد مناسب موقع دیکھ کر اس نے نواب سے اجازت رخصت لی اور محفل سے اٹھ آیا۔ گھر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ ریزیڈنٹی کے کچھ متصدی، ریاست کا خزانچی اور لوہارو کے

دیوان صاحب گذشتہ دو مہینے سے فیروز پور میں مقیم تھے اور ریاست سے لوہارو کی علیحدگی کے کاغذات تیار کر رہے تھے۔ گذشتہ دو مہینوں سے لوہارو کی کوئی محاصل فیروز پور جھر کہ نہ آئی تھی، سب وہیں کے خزانے میں داخل کی جا رہی تھی۔ کئی سال پہلے جب وراثت کا مناقشہ اٹھا تھا، انگریز نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ لوہارو کی ریاست امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان کی مشترکہ ملکیت رہے گی۔ اسوقت کے محاصل پچیس ہزار ماہانہ تھے جس میں سے انگریزوں نے پندرہ ہزار ماہانہ امور انتظامی اور اخراجات ریاست کے طور پر وضع کر کے دس ہزار دونوں بھائیوں میں برابر برابر تقسیم کئے تھے، اس حکم کے ساتھ کہ ضیاء الدین احمد خان چونکہ نابالغ ہیں لہٰذا ان کی کفالت امین الدین احمد خان کریں گے اور ضیاء الدین احمد خان کے حصے کی رقم ماہ بماہ خزانے میں جمع ہوتی رہے گی۔ لہٰذا اس زمانے میں تو لوہارو کا خزانہ الگ تھا اور ضیاء الدین احمد خان کی رقم ضلع حصار کے انگریزی خزانے میں جمع ہوتی تھی۔ لیکن جب سے یہ فیصلہ کالعدم ہوا تھا، لوہارو کے محاصل بھی فیروز پور میں جمع ہوتے تھے اور امین الدین احمد خان کی رقم انھیں یہاں سے ادا ہوتی تھی۔

اب پھر نئے نظم کے تحت فیروز پور کا خزانہ لوہارو کی آمدنی سے محروم ہو گیا تھا۔ متصدیان سرکاری پیسے پیسے کا حساب لینے میں مصروف تھے کہ گذشتہ رقومات صحیح طور پر صرفے میں لائی گئیں کہ نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اب امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمارے باپ کے ترکے میں نقدی، رقوم جواہر، اور قیمتی فرش فروش، شیشہ آلات، جو شمس الدین احمد کو ملے تھے، ان میں سے ہمیں بھی حصہ ملنا چاہیئے۔ لہٰذا لوہارو اور فیروز پور کے قلعہ جات میں قیمتی سامان کی فہرست بن رہی تھی تا کہ چھوٹے بھائیوں سے دستخط لے کر ان کا سامان ان کی تحویل میں دائماً دے دیا جائے۔

کریم خان کے لئے لوہارو بھی اسی طرح اس کا گھر تھا جس طرح فیروز پور جھر کہ اس کی زاد بوم تھی اور دونوں شہروں کے قلعے اس کی یادوں سے رنگین تھے۔ اسے اب تک لوہارو کے جدا ہو جانے کی طبیعی حقیقت کا احساس نہ ہوا تھا۔ اب اسے تقسیم اور انفکاک کے یہ اقدامات ایسے لگے گویا اس کا اپنا گھر نہ صرف یہ کہ تقسیم ہو رہا ہے بلکہ اجڑنے والا ہے۔ اس کے دل میں انتقام کا ارادہ اور بھی مستحکم اور اپنی اب تک کی ناکامی پر خجالت کا احساس اور بھی عرق آور ہو گیا۔ اس کے جی میں آئی کہ ابھی ابھی نواب کی خدمت میں واپس جا کر عذر معذرت کرے اور گڑگڑا کر کہے کہ میں اپنا فرض ضرور، بالضرور پورا کروں گا۔ لیکن کسی ایسی جگہ پر بات کرنا جہاں بات سن لئے جانے کا خفیف سا بھی امکان ہو، عقلمندی کے منافی تھا۔ وہ موقعے کے انتظار میں رہا اور تیسرے دن جب وہ نواب کے ساتھ شکار پر گیا تو ایک موقعے پر تخلیہ دیکھ کر اس نے کہا:

''میں عالی جاہ سے شرمندہ ہوں۔''

''میں خود اپنے سامنے شرمندہ ہوں، کریم خان۔''

''لیکن میں شکم پرست نہیں، آقا پرست ہوں۔''

''ہم بھی قابو پرست نہیں۔ لیکن ہم کوشش، اور کوشش کے اچھے نتیجے کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔''

''کوشش میں کمی ہرگز نہ آنے پائے گی اور نہ آنے پائی ہے۔ سرکار کا نمک خوار ہوں اور نمک خوار ہی رہوں گا۔ میں روہیلہ ہوں۔ میں کلال کلوار نہیں ہوں۔ قول مرداں جان دارد۔''

''لیکن مردوں کو روبہ مزاج بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔''

کریم خان نے شکاری چاقو نکال کر اپنی گردن پر رکھ لیا۔ ''یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں!''

نواب نے ہاتھ بڑھا کر چاقو کریم خان کے ہاتھ سے بہ آہستگی لے کر اس کی نوک اپنی گردن اور سینے کے بیچ میں رکھ لی اور بولے: ''ہم سے زیادہ تمھاری قدر کون جان سکتا ہے۔ لیکن تم میرے بچپن کے یار ہو۔ تم بھی مجھے خوب جانتے ہو گے۔''

''مجھے اچھی طرح علم ہے کہ آپ کی خاطر میں کیا ہے اور جب تک آپ کی مرضی نہ پوری ہو گی میں چین کی نیند نہیں سونے کا۔ اس دن سے مجھے ایک ہی دھن ہے۔''

نواب نے ذرا آگے بڑھ کر کریم خان کا شانہ تھپتھپایا۔ ''مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔''

کچھ دیر دونوں چپ رہے۔ پھر نواب نے کہا۔ ''مارچ کے مہینے میں شاید حالات زیادہ سازگار ہوں۔''

''جی بہت مناسب۔ میں اوائل مارچ ہی میں دہلی چلا جاؤں گا۔''

پھر اس مضمون پر دونوں میں کوئی بات اس وقت نہ ہوئی، بلکہ کبھی نہ ہوئی۔ ان دنوں کالے ہرنوں کی ایک بہت بڑی ڈار مضافات فیروز پور میں آ گئی تھی اور کھیتوں کو بہت نقصان پہنچا رہی تھی۔ دونوں اسی ڈار کو ڈھونڈنے اور دو چار کا شکار کر کے باقیوں کو خوف زدہ کر کے بھگانے نکلے تھے۔ لیکن اس وقت کئی کوس کا چکر لگانے کے باوجود کالے ہرن دکھائی نہ دیے۔ شاید وہ علاقہ ہی چھوڑ گئے ہوں، یا شاید شکاریوں کی آمد سے باخبر ہو گئے ہوں۔ خود شکاریوں کا بھی دل شکار میں کچھ بہت نہ لگ رہا تھا۔ اصل گفتگو ہو ہی چکی تھی، لہٰذا شکار ختم کر کے دونوں واپس آ گئے۔

پاے اجل

جنوری اور فروری کے مہینے پلک جھپکتے گذر گئے۔ دوشنبہ کا دن تھا اور ۳ مارچ کی تاریخ جب کریم خان اور انیا دوبارہ دہلی پہنچے اور پہنچتے ہی انھوں نے یہ دل خوش کن خبر سنی کہ فریزر صاحب دلی میں موجود ہیں۔ کریم خان نے اپنے پرانے جاسوسوں کو فوراً کام پر لگا دیا لیکن انھیں پر تکیہ نہ کر کے اس نے انیا کی مدد سے فریزر کی کوٹھی واقع پہاڑی اور علی پور میں لڈلو کاسل (Ludlow Castle) میں کمشنری عدالت و دفاتر پر صبح و مسا نگاہ رکھنی شروع کر دی۔ جلد ہی اسے فریزر کے معمولات کا پتہ لگ گیا۔ لیکن یہ معلومات کچھ خاص امید افزا نہ تھی، کیونکہ دن کے وقت فریزر کبھی تنہا باہر نہ نکلتا تھا اور نہ ہی اس کی عام راہوں میں ایسے خطے تھے جہاں لوگوں اور سواریوں کی آمد و رفت کم ہو اور راستہ نصف گھڑی یا اس سے بھی کم وقت کے لئے سنسان ہو۔ فریزر کا آنا جانا زیادہ تر ٹامس منکاف کے یہاں اور کبھی کبھی اپنے دور کے رشتے سے بھائی سائمن فریزر، یا اپنے پرانے دوست جیمس اسکنر (سکندر صاحب) کے یہاں تھا۔ منکاف کی کوٹھی، جو اس وقت بھی منکاف ہاؤس کہلاتی تھی، علی پور کے بالکل آخری سرے پر تھی۔ سائمن فریزر اور اسکنر کے مکانات سول لائن میں کشمیری دروازے کے پاس تھے۔ صرف منکاف ہاؤس ذرا فاصلے پر تھا ورنہ بقیہ دونوں زیادہ سے زیادہ کوس سوا کوس کے فاصلے پر تھے۔ رات کو فریزر ہمیشہ غروب آفتاب کے ایک دو گھنٹہ بعد تک گھر واپس آ جاتا تھا اور اس وقت تک اس کی کوٹھی کا راستہ خاصا چلتا ہوا ہوتا تھا۔ کوٹھی کے اندر داخلے کے لئے عام سڑک چھوڑ کر پہاڑی کی چڑھائی چڑھنی ہوتی تھی اور وہ چونکہ شارع عام نہ تھی اس لئے عموماً سنسان رہتی تھی لیکن وہاں چھپ رہنے اور گھات لگانے کا موقع بالکل نہ تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فریزر کو جگہ پر تنہا دیکھ کر مار لیا جائے۔

عام طور پر کہا گیا ہے کہ فریزر کی کوٹھی باڑہ ہندو راؤ میں تھی۔ یہ بات صحیح ہے بھی اور نہیں

بھی۔ صحیح اس معنی میں کہ کوٹھی اسی علاقے میں تھی جسے آج باڑہ ہندوراؤ کہتے ہیں۔ اور غلط اس معنی میں کہ اس وقت باڑہ ہندوراؤ کا وجود نہ تھا۔ کشن گنج اور پہاڑی کے بیچ میں کچھ مکانات اور دو کانیں تھیں، باقی کھلا میدان جنگل جلیبی، مالتی، چھیول اور ببول وغیرہ کی جھاڑیوں اور پستہ قد درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میدان کہیں کہیں کنکریلا اور پتھریلا تھا۔ ایک سڑک محلہ کشن گنج کو ان مکانات اور دو کانوں سے ملاتی تھی جو کشن گنج اور پہاڑی کے بیچ میں واقع تھیں۔ اس سڑک کے ختم ہونے پر چڑھائی شروع ہوتی تھی اور وہاں سے فریزر کی نجی سڑک تھی جو نسبۃً تنگ تھی لیکن اس پر سرخ بجری اور کنکر کٹے ہوئے تھے۔ فریزر نے اپنی سڑک کے دورویہ جنگل صاف کرا کے پھولدار جھاڑیوں اور پھلدار درختوں کی قطاریں لگوادی تھیں۔ کچھ آگے چل کر فریزر کی کوٹھی کا پہلا پھاٹک ملتا تھا۔ اس کے بعد بھی اسی طرح خم کھاتی ہوئی سڑک دورویہ درختوں اور جھاڑیوں کی بدولت ہری بھری لگتی تھی۔ جھاڑیوں اور درختوں کے گھنے پن کے باعث پوری پہاڑی اور اس کے پہلے کا میدان زیادہ ترنیم تاریک اور سایہ دار تھے اور پراسرار لگتے تھے۔

اس سارے علاقے کا کوئی نام نہ تھا۔ پہاڑی کو صرف پہاڑی اور کوٹھی کو فریزر صاحب کی کوٹھی کہا جاتا تھا۔ فریزر کی موت کے بعد جب اس کی املاک اور سروسامان فروخت ہونے لگے تو ہندوراؤ نامی ایک رئیس نے وہ کوٹھی اور وہ سارا میدان خرید لیا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یہ سارا خطۂ زمین "باڑہ ہندوراؤ" کہلایا اور اب بھی اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ فریزر کی کوٹھی کا زیادہ تر حصہ امتدادِ ایام سے کھنڈر ہو گیا یا ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں شاہی فوجوں کا ایک اہم مورچہ ہونے کے سبب سے انگریزوں کی شدید گولہ باری کے نتیجے میں مسمار ہو گیا۔ اب صرف ایک حصہ باقی ہے جو باڑہ ہندوراؤ ہسپتال کا مرکزی جزو بن گیا ہے۔

مارچ ۱۸۳۵ کی ۲۲ تاریخ اور رات کا وقت تھا۔ فریزر کی بند بگھی جب کشن گنج سے چلی تو اس وقت کوئی گیارہ کا عمل تھا۔ ایک مدت کے بعد ایسا اتفاق ہوا تھا کہ فریزر اتنی رات کو گھر سے باہر اور وہ بھی نسبۃً کھلی جگہ پر تھا۔ اس شام وہ کشن گڈھ کے راجا کلیان سنگھ (۱) کے یہاں کھانے پر مدعو تھا۔ کھانے کے بعد رقص و شراب کی محفل دیر تک کھنچ گئی تھی اور فریزر نے معمول سے بہت زیادہ پی لی تھی۔ جب وہ تقریباً بے ہوش ہو گیا تو کلیان سنگھ کے ملازموں اور اس کے محافظوں نے اسے کسی طرح اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا تھا اور جلد جلد واپس لے چلے تھے۔ کسی خطرے کا گمان بھی نہ تھا، اس لئے جلو میں صرف ایک سوار

(۱) یہ کشن گڈھ ہریانہ میں ہے اور اس کا راجپوتانے کی مشہور ریاست کشن گڈھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

لینٹرن (لفظ ''لالٹین'' ابھی رائج نہ ہوا تھا) لئے ہوئے تھا اور چار کچھ فاصلے پر پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ پانچوں سواروں نے بھی خوب پی رکھی اور دعوت خوب اڑائی تھی، اس لئے ان کے ذہن اور بدن دونوں ہی سست پڑ گئے تھے۔

اس سال دہلی میں سردی بہت پڑی تھی اور موسم دیر تک معمول سے بہت زیادہ سرد رہا تھا۔ جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے میدان اور پہاڑی پر رطوبت کی وجہ سے ٹھنڈی دھند چھائی ہوئی تھی اور اندھیرا الگ تھا۔ دس قدم کے آگے بمشکل ہی کچھ دکھائی دے سکتا تھا۔ جو کچھ روشنی تھی وہ فریزر کی بگھی کے دھندلے چراغوں کی تھی جو انگریزی وضع کے تھے اور کوچ لیمپ (Coach Lamp) کہلاتے تھے۔ ان کے شیشے عموماً ہلکے سبز یا نیلے ہوتے تھے، اس لئے بگھی کے فوری محاذ کے علاوہ ان کی روشنی بہت کم فاصلے تک پھیلتی تھی۔ فریزر کے آگے والے گھڑسوار کے قربوس سے لینٹرن ضرور آویزاں تھی۔ لیکن وہ کچھ آگے نکل گیا تھا، یا اس کی لینٹرن بجھ گئی تھی، کیونکہ سوار جو آگے آگے چل رہا تھا اس کی سواری پر کوئی روشنی نہ تھی اور وہ خود سر سے پاؤں تک سیاہ پوش لگتا تھا۔ مشکی رنگ کا نہایت طاقتور اور بلند قامت گھوڑا جو خود بھی اندھیرے میں ضم سا ہو گیا تھا، اور اس کا سوار دونوں نہایت اعتماد سے قدم رکھ رہے تھے اور ہرگز ان راہوں کے لئے اجنبی نہ لگتے تھے۔

فریزر کے بدن پر پورا درباری لباس تھا۔ بہت تنگ برجس نما اونی پتلون، اعلیٰ درجے کی ململ کی سفید قمیص جس کی آستینوں اور گریبان پر پھول اور پھندنے لگے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر زری کے کام کی سیاہ واسکٹ، طلائی گھڑی کی زنجیر اس میں آویزاں، اس کے اوپر چھوٹا کوٹ، کمر پر سے بہت تنگ اور آستینیں بھی بہت تنگ، لیکن کلائی پر سے چھوٹی، تاکہ قمیص کے کف کی سجاوٹ اور جھالر دکھائی دے۔ گلے میں پھولدار ریشمی گلوبند (Cravat) اور سب کے اوپر بھاری لمبا کوٹ جسے ٹاپ کوٹ (Top coat) کہتے تھے۔ سر پر سیاہ مخملیں اونچی سخت ٹوپی جو ٹاپ ہیٹ (Top hat) کہلاتی تھی اور جس کا رواج کچھ ہی برس پہلے شروع ہوا تھا۔ فریزر نیم بے ہوش تھا، آنکھیں بند، اور گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اس کے خراٹے بلند ہوتے اور کبھی کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتا۔ بگھی کی چھت جو چمڑے اور ترپال کی بنی ہوئی تھی، کمانیوں پر تنی ہوئی تھی۔ دونوں طرف نیم دروازے تھے جنھیں باہر اور اندر سے بند کیا جا سکتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ صرف آدھی اونچائی کے تھے اس لئے فریزر جو گاڑی کے پچھلے گدے پر ڈھیر تھا، بآسانی نظر آ سکتا تھا۔

فریزر کی کوٹھی کا موڑ آ گیا۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ذرا سی بھی لاپروائی ہوتی تو موڑ پیچھے چھوٹ کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ مشکی سوار نے بے جھجک اپنا گھوڑا فریزر کی کوٹھی کو جانے والی تنگ سڑک پر موڑ لیا۔ بگھی اس کے چند لمحے بعد موڑ میں داخل ہوئی۔ جلوسوار کا کہیں پتہ نہ تھا اور کوچبان شاید مشکی خنگ سوار ہی کو جلوسوار سمجھ رہا تھا۔ موڑ مڑنے کے بعد چاروں محافظ پیچھے اوٹ میں پڑ گئے اور کئی لمحوں کے لئے فریزر کی بگھی ان کی نظر سے باہر ہو گئی۔ دفعۃً مشکی سوار کی رفتار دھیمی پڑی۔ سوار اور بگھی کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا۔ مشکی خنگ سوار کی رفتار اور بھی کم ہوئی، لیکن کوچبان جس کا نشہ ٹھنڈی ہوا لگ کر اور بھی گہرا ہو گیا تھا، کچھ خبر نہ ہوا۔ مشکی خنگ سوار اور فریزر کی بگھی بالکل برابر آ گئے۔ سوار نے قربوس پر رکھی ہوئی بندوق اٹھائی۔ فریزر کا داہنا پہلو ٹھیک سامنے تھا۔ پیاپے تین فیر ہوئے۔ ایک گولی فریزر کے پہلو کو توڑتی ہوئی اندر پھیپھڑے کو چیر کر جگر کو چھوتی ہوئی دو پسلیاں شکستہ کر کے باہر نکل گئی۔ دوسری گولی نے دل میں سوراخ کر دیا اور بائیں طرف کی پسلیوں میں پھنس کر رہ گئی۔ تیسری گولی پیٹ کے اگلے حصے پر پڑی اور معدے کو پھاڑتی ہوئی تلی میں پیوست ہو گئی۔ فریزر کی موت کو ایک لمحہ بھی نہ لگا۔ پہلی ہی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

کوچبان کی تو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ مشکی سوار نے گھوڑا اکڑ کایا اور بگھی سے آگے نکل کر گھوڑے کا رخ کشن گنج کی طرف کر دیا۔ فریزر کے چاروں محافظ جو پیچھے پیچھے ست قدم آ رہے تھے، اب گولی کی آواز سن کر اپنے اپنے گھوڑے سرپٹ بھگانے لگے۔ انھوں نے کسی سوار کو یا کسی پیادے کو نہ دیکھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ مشکی خنگ سوار نے فوراً ہی سڑک چھوڑ کر جنگل کی راہ لے لی تھی، اگرچہ اس میں گھوڑے کے ٹھوکر کھانے اور نتیجۃً سوار کے گرنے اور اپنی گردن توڑ لینے یا کم از کم شدید زخم کھانے کا امکان بہت تھا۔

گولیوں کی آواز اور پھر مشکی سوار کے غائب ہونے پر کوچبان کی عقل کچھ ٹھکانے آئی اور اس نے واویلا شروع کیا۔ اتنی دیر میں فریزر کے محافظ اسوار بھی پہنچ چکے تھے۔ ایک نے تیز تیز آگے بڑھ کر جلوسوار کو آلیا اور دونوں اندھا دھند بھاگتے ہوئے کوٹھی پر گئے کہ روشنی اور مزید نفری کا انتظام کریں۔ تھوڑی دیر میں روشنیاں اور سپاہیوں کے اسلحہ ہر طرف چمکنے لگے لیکن فریزر سارے ہنگامے سے بے خبر موت کی نیند سو رہا تھا اس کا چہرہ ڈھیلا اور منھ کھلا ہوا تھا اور پیلے دانت مشعلوں کی زرد روشنی میں بدنما معلوم ہو رہے

تھے۔ ٹامس مٹکاف نائب ریزیڈنٹ اور سائمن فریزر شہر مجسٹریٹ خبر ملتے ہی شب خوابی کے لباس میں لیکن مسلح سپاہیوں کے ساتھ موقعے پر پہنچے اور پانچوں سواروں اور کوچبان کو ہتھکڑی بیڑی ڈلوا کر علی پور کے جہل خانے بھجوانے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر ولیم میکناٹن (William McNaughton) اور ان کے نائب ڈاکٹر چمن لعل پہلے آ چکے تھے، ان کی نگرانی میں لاش کو بحفاظت واحترام کوٹھی پر پہنچا دیا گیا۔ اسی وقت غسل اور تکفین کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ قتل کی خبر سارے شہر میں آندھی طوفان کی طرح پھیل گئی اور صبح تک افواہیں بھی گرم ہو گئیں۔

اگلے دن دس بجے تک لاش کو تیار کر کے دیوان ملاقات میں رکھ دیا گیا اور اعلان کیا گیا:

> ملک ظل الٰہی کا، حکم کمپنی انگریز بہادر کا، ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آج بوقت ساڑھے تین بجے دن علی پور کے گورا قبرستان میں، جو متصل لڈلو کاسل وعدالت و دارالانشا نواب ریزیڈنٹ بہادر واقع ہے، تدفین نواب عالی جناب امارت وایالت مرتبت معظم الدولہ امین الملک ولیم فریزر صاحب کلاں بہادر شہید مرحوم ومغفور کی عمل میں آوے گی۔ رعایاے شہر جو زیارت وتعزیت کو آنا چاہتے ہیں بارہ بجے کے اندر اندر معظم الدولہ امین الملک صاحب کلاں بہادر شہید کی کوٹھی پر حاضر ہو جاویں۔

لیکن اس اعلان کے بہت پہلے ہی لوگوں نے فریزر کی کوٹھی اور موقع واردات پر جمگھٹ لگانا شروع کر دیا تھا۔ ان میں تعزیہ دار بھی تھے اور بے فکرے تماش بین بھی تھے۔ تعزیت اور زیارت کو آنے والوں میں اولین دو شخص میرزا اسد اللہ خان غالب اور نواب شمس الدین احمد کے ایک رشتے کے بھائی فتح اللہ بیگ خان تھے۔

شہر میں اس وقت دو افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ ایک، جو زیادہ نہیں پھیل رہی تھی، یہ تھی کہ نواب شمس الدین احمد نے لوہارو کے چھن جانے کا ذمہ دار فریزر کو ٹھیراتے ہوئے، اور جہانگیرہ بیگم کے بارے میں اس نے جو نازیبا بات کی تھی، اس کے بدلے میں، فریزر کو مروا دیا۔ دوسری افواہ، جو زیادہ مقبول تھی، یہ تھی کہ قتل کے پیچھے کسی عورت یا مرد کا معاملہ تھا۔ سنا جا رہا تھا کہ کسی عورت کو فریزر صاحب لے اڑے تھے، اور اس کے پچھلے عاشق نے فریزر کو انتقاماً مروا دیا تھا۔ کابلی دروازے کے آگے باغ شالامار تک متعدد باغوں، مثلاً روشن آرا باغ، باغ محلدار خان، باغ پٹنی مل وغیرہ کے بے فکرے، جن میں زیادہ تر

امرد پرست تھے، متفقہ طور پر اس خیال کے تھے کہ معاملہ کسی امرد کا ہے اور عین ممکن ہے کہ خود امرد ہی نے کسی بات پر غیرت میں آ کر صاحب کلاں بہادر کا رشتۂ حیات منقطع کر دیا ہو۔ انگریزوں کو ان افواہوں کی مکمل خبر تھی کیونکہ ان کے جاسوس سارے شہر میں قاتل کے بارے میں ٹوہ لیتے پھر رہے تھے۔

ایک خفیف سا امکان انگریزوں کی نظر میں یہ بھی تھا کہ یہ قتل کسی سازش کا نتیجہ ہو یا اس کی پشت میں کوئی امر انتظامی یا ملکی ہو۔ بریلی کے ان واقعات کو دس ہی بارہ سال کا عرصہ گزرا تھا جب حافظ رحمت خان کے نبیرہ نواب مصطفیٰ خان اور مفتی شہر مولوی محمد عیوض کی قیادت میں اہل شہر نے سنگین اور مسلح خروج انگریزوں کے خلاف کیا تھا۔ اس قیام خونیں کو کوئی انگریز فراموش نہ کر سکا تھا۔ مانا کہ بریلی کے کمشنر ایڈورڈ کولبروک (Edward Colebrooke) اور کلکٹر فرانسس لو (Francis Lowe) نے مغادرین کی سرکوبی انتہائی سختی اور بے حد تعدی کے ساتھ کی تھی، لیکن دو ہفتوں کے لئے تو اقتدار کمپنی پورے روہیل کھنڈ میں ہل کر رہ گیا تھا۔ دہلی میں ایسا کوئی امر دن بھر کے لئے بھی واقع ہو جاتا تو اس کے اثرات دوررس ہو سکتے تھے۔ اس امکان کے خیال سے بوکھلا کر سائمن فریزر اور ٹامس مٹکاف نے فیصلہ کیا تھا کہ فریزر کو فی الحال پورے پہرے کی حفاظت میں ریزیڈنسی کے قریب ترین گورا قبرستان میں جلد از جلد دفن کر دیا جائے۔ بعد میں جب تفتیش کے بعد پورا معاملہ کھلے گا اور قاتل پکڑا جائے گا تو مناسب مدفن و مزار بھی انتظام کر لیا جائے گا۔ اس وقت تو زیادہ دھوم دھام کے بغیر ہی جنازے کو سپرد خاک کر دینا بہتر ہے۔

میرزا فتح اللہ بیگ خان اور نواب شمس الدین احمد آپس میں بھائی بھائی تھے، کیونکہ شمس الدین احمد خان کے دادا نواب عارف جان اور فتح اللہ بیگ خان کے دادا نواب قاسم جان سگے بھائی تھے۔ فتح اللہ بیگ خان کا مکان بلی ماران ہی میں کٹڑہ و مسجد آدینہ بیگ خان کے سامنے بالا خانے پر تھا۔ شمس الدین احمد اور فتح اللہ بیگ میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ لیکن بعد کو ایک گھوڑے کے متعلق ہنسی مذاق کی باتوں میں کچھ بگاڑ پیدا ہوا جو تکرار و حجت اور جھانجھی میں بدل گیا اور فی مابین اتنی تلخی پیدا ہو گئی کہ دونوں ایک دوسرے کا منھ دیکھنے کے روادار نہ رہ گئے تھے۔ اس صبح کو جب میرزا اسد اللہ خان غالب اور میرزا فتح اللہ بیگ خان زیارت نعش اور تعزیہ دینے کے لئے ولیم فریزر کی کوٹھی پر پہنچے تو پہاڑی کی چڑھائی سے لے کر کوٹھی کے صدر دروازے تک سواریوں کا ہجوم تھا۔ دیوان زیارت میں انتظام یہ تھا کہ لوگ ایک دروازے سے داخل ہوتے تھے۔ فریزر کا لاشہ پورے درباری لباس اور تمغوں اور اسلحہ سے مزین سنگی تابوت میں رکھ

کر ایک بڑی چوکی پر لٹا دیا گیا تھا۔ درباری لباس اور اسلحہ سے مکمل چار سپاہی گورا فوج کے اور ان کا فرنگی کمیدان لاشے کے سرہانے بالکل تنے ہوئے کھڑے تھے۔ تعزیت و زیارت کرنے والے اندر آتے اور چوکی کے پاس سے گذرتے ہوئے دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے۔ لہٰذا دیوان زیارت ہمہ وقت لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ جب میرزا غالب اور میرزا فتح اللہ بیگ خان دیوان میں داخل ہوئے تو فتح اللہ بیگ خان نے نعرہ مارا اور جھپٹ کر لاشے پر گرے اور بظاہر بے اختیارانہ پکار اٹھے:

''ہائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا۔''

ایک انگریز نے فتح اللہ بیگ خان کا شانہ مضبوط پکڑ کر انھیں اٹھایا اور کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میرزا غالب اپنی جگہ شرمندہ ہوتے رہے کہ یہ مفت کا تماشا کھڑا ہو گیا، لیکن فتح اللہ بیگ خان کے عمل اور ان کے ماتمی جملے کی طرف محض میرزا غالب یا اہل ہند میں سے دیگر حاضرین ہی کی توجہ منعطف نہ ہوئی تھی، کئی انگریز حکام نے، جن میں سائمن فریزر بھی شامل تھا اس پورے واقعے کو بہت اہمیت دی۔ پانی پت کا مجسٹریٹ اور فریزر کا خاص دوست جان لارنس (John Lawrence) قتل کی خبر سن کر دھاوے کی صورت دلی پہنچ کر سیدھا فریزر کی کوٹھی پر ابھی پہنچا ہی تھا کہ اسے فتح اللہ بیگ خان کے واقعے کی خبر دی گئی۔ اس نے ٹامس مٹکاف سے مشورہ کیا تو مٹکاف کو اس معاملے کی تفتیش کے بارے میں کچھ بہت گرم نہ پایا۔ مٹکاف کا خیال تھا کہ فتح اللہ بیگ خان نے موقع غنیمت جان کر شمس الدین احمد سے اپنی پرانی دشمنی نکالی ہے۔ لیکن لارنس اور سائمن فریزر کی رائے میں یہ بات مزید دریافت و جستجو کی متقاضی تھی۔

پہلے تو فریزر نے فتح اللہ بیگ کو اگلے دن کچہری میں بلوا کر دیر تک ان سے جرح کی۔ ظاہر ہے کہ فتح اللہ خان کو کچھ معلوم تو تھا نہیں، اور ٹھنڈے سبھاؤ سے سوچنے پر انھیں اپنی حماقت اور سفاہت کا احساس بھی ہوا لیکن اب پچھتائے کیا ہوتا تھا۔ سائمن فریزر اور جان لارنس کی سخت ترین جرح کے جواب میں وہ یہی کہتے رہے کہ صاحب میں کچھ جانتا نہیں۔ میں نے صرف ایک مشہور بات کہہ دی تھی کہ صاحب کلاں بہادر سے شمس الدین احمد کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

ہر چند کہ حاکمان انگریز کو فتح اللہ بیگ خان سے کچھ بھی کام کی بات نہ معلوم ہو سکی، لیکن انھوں نے نہ صرف فتح اللہ بیگ خان بلکہ شمس الدین احمد کے بڑے خسر میرزا مغل بیگ خان کو بھی حراست میں لے لیا، صرف اس بنا پر کہ وہ شمس الدین احمد کے خسر تھے اور ان دنوں شادل خان کی حویلی میں فتح اللہ بیگ

خان کے بالا خانے والے مکان کے بالکل پاس رہتے تھے۔ انگریز حلقوں میں میرزا مغل بیگ نہایت شاطر اور اندر سے ''غیر وفادار'' مشہور تھے، بلکہ اس زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف ٹامس بیکن (Thomas Bacon) نے تو صاف شک ظاہر کیا ہے کہ میرزا مغل بیگ اس معاملے میں پوری طرح ملوث تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ میرزا مغل بیگ کو تو کچھ بھی اس بات کی ہوا نہ لگی تھی کہ شمس الدین احمد کے ساتھ جولائی کے مہینے میں فریزر کی کوٹھی پر کیا معاملہ گذرا تھا۔ اور لوہارو کا علاقہ شمس الدین احمد سے چھن جانے کی خبر جب آئی تھی اس کے بہت پہلے سے میرزا مغل بیگ اور شمس الدین احمد کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا میرزا مغل بیگ خان کو حراست میں لینا اتنا ہی بے سود اور بے نتیجہ رہا جتنا فتح اللہ بیگ کو حراست میں لینا۔ لیکن ان اقدامات سے شمس الدین احمد کو نقصان پھر بھی پہنچا کیونکہ ان کی بنا پر شہر میں افواہیں اور بھی بھڑک اٹھیں کہ فریزر کے قتل میں شمس الدین احمد خان کا ہاتھ ہے۔

میرزا غالب سے بھی پوچھ گچھ ہوئی، لیکن زیادہ نہیں۔ اس بنا پر یہ افواہ بھی پھیلی کہ مرزا نوشہ تو ساری مخبری پہلے ہی دن کر چکے تھے، اس لئے ان سے کسی مزید جرح و تفتیش کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تو واقعہ ہے کہ ان دنوں مرزا غالب کا آنا جانا ایک انگریز حاکم تھیوڈور پریسکاٹ (Theodore Prescott) کے یہاں بہت تھا۔ اور یہ بھی واقعہ، بلکہ عجیب واقعہ ہے کہ اپنے تمام صلح کل اور میانہ روی کے باوجود غالب کی زبان یا قلم سے ایک بھی کلمۂ خیر شمس الدین احمد کے حق میں کبھی نہ ٹپکا تھا، بلکہ وہ موقع بے موقع شمس الدین احمد کی برائی ہی کرتے رہتے تھے۔ جب فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان کے انتقال پر شمس الدین احمد خان نے پوری ریاست اپنے ہاتھ میں لے لی تو غالب نے ایک فارسی خط میں لکھا کہ اب تو ناکسوں کا بازار گرم ہوگا اور فرومایگان کی گرمی ہنگامہ رہے گی۔ شمس الدین احمد خان سے میرزا غالب کی ناخوشی اس حد تک مشہور تھی کہ شہر کے بازاروں میں لوگ مرزا نوشہ کو، نہ کہ فتح اللہ بیگ کو مخبر ٹھہراتے تھے۔ یہ بات اس قدر پھیلی کہ میرزا غالب نے کئی خطوط میں اپنی برأت کا اظہار کیا اور دعویٰ کیا کہ مخبری تو ساری فتح اللہ بیگ خان نے کی تھی، میں تو صرف پریسکاٹ سے میل جول رکھنے کا گنہگار ہوں۔ لیکن شمس الدین احمد خان سے غالب کا عناد دلی اس زمانے کی ان کی تحریروں سے بھی صاف عیاں ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے نام ایک خط میں غالب نے شمس الدین احمد کو ''کافر نعمت داور کش'' لکھا اور ایک اور خط میں فریزر کے قاتل کو بد دعا دی کہ ''وہ ستم گر نا خدا ترس عذاب ابدی میں'' گرفتار ہو۔ اور اسی

زمانے میں انھوں نے ایک غزل کا مقطع لکھا۔

غالب ستم نگر کہ چو ولیم فریزرے
زیں ساں ز چیرہ دستی اعدا شود ہلاک

ان باتوں سے مخبری نہیں ثابت ہوتی، کیونکہ فریزر کی تاریخ تو گھنشیام لال عاصی نے بھی کہی تھی، رثائی شعر نہ سہی۔

گفت ہاتف ز روے درد والم
آ ہ خو ن فر یز ر و لیم

گھنشیام لال عاصی نے تو ایک تاریخ اور بھی قتل فریزر کی کہی تھی جس میں طرح طرح کے ہنر دکھائے گئے تھے۔لیکن میرزا غالب نے شمس الدین احمد خان کے خلاف عملاً کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو (اغلب یہی ہے کہ کچھ نہیں کیا، بجز اس کے کہ قدم قدم پر شمس الدین احمد سے اپنی نفرت کا اظہار کیا) لیکن اہل دہلی کی نظر میں دہلی کے سب سے بڑے شاعر اور سر برآوردہ رئیس زادے کے دامن پر کچھ مشکوک چھینٹیں ضرور پڑی رہ گئیں۔اور اس میں بھی بہت کم کلام ہے کہ شمس الدین احمد کی طرف شک کی انگلی پھرنے میں اس بات کو بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا کہ غالب، جو اس وقت کی دلی میں احمد بخش خان کے گھرانے کے ممتاز ترین افراد میں تھے، نسبی نہ سہی، سببی سہی، انھیں شمس الدین احمد سے پوری توقع تھی کہ وہ ایسے جرم کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور اس توقع کا جا بجا اظہار کرنے میں انھوں نے شاید کوئی تکلف نہ کیا تھا۔

اگر فتح اللہ بیگ خان کے واقعے اور میرزا اسد اللہ بیگ خان غالب کے مبینہ اشاروں سے قطع نظر کر لیں تو شمس الدین احمد خان کے خلاف کوئی شہادت نہیں مل رہی تھی۔ موقع واردات پر اجنبی شہسوار کے جو نشان سم ملے تھے وہ بے حد الجھن میں ڈالنے والے تھے کیونکہ نشان ہر طرف تھے اور کوئی بھی سمت متعین نہ ہو سکتی تھی کہ سیاہ پوش مشکی سوار کس طرف سے آیا اور پس از قتل جنگل میں اترنے کے بعد کدھر گیا۔لیکن سائمن فریزر اور شاید اس سے بھی زیادہ جان لارنس کے دل میں انتقام کی آگ جہنم کے شعلے سے بھی بڑھ کر گرم تھی۔ سائمن فریزر کو شمس الدین احمد خان کے خلاف بدگمانی تو تھی ہی، خاص کر حویلی حسام الدین حیدر کے پھاٹک پر جو آمنا سامنا فریزر اور شمس الدین احمد خان کا ہوا تھا، اور اس کے بعد فریزر کی کوٹھی پر جو حادثۂ فاجعہ ہوا تھا، اس کی بھی پوری اطلاع سائمن فریزر کو تھی۔ اور اس کا یہ بھی خیال تھا کہ دہلی شہر میں جو افواہ پھیلتی ہے وہ بے اصل نہیں ہوتی۔ قدرتی طور پر، اس نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی

کہ مرزا مغل بیگ اور فتح اللہ بیگ کو حراست میں لے کر خود انگریزوں نے اس افواہ کو آسمان تک پھیلا دیا تھا۔ بہر حال، تین چار دن کے بحث و مباحثہ کے بعد فریزر اور لارنس نے منکاف کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اگلے دن چار بجے صبح کے وقت شمس الدین احمد خان کی حویلی واقع دریا گنج پر چھاپا مار کر اس کے دروازے اندر سے بند کرا دیے جائیں اور حویلی کے کونے کونے کی تلاشی لی جائے۔ اور اگر دریا گنج والی حویلی کی تلاشی بے نیل ثابت ہو تو پھر بلی ماران کی حویلی پر چھاپا ڈالا جائے۔ آخر الذکر حویلی پر بے اطلاع چڑھ دوڑنے میں قباحت ضرور تھی کہ وہاں نواب کے گھر کی عورتیں بھی قیام پذیر تھیں، لیکن اس باب میں یہی فیصلہ ہوا کہ بر وقت دیکھ لیں گے، تلاشی تو لینی ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فیصلے تمام ہندوستانی عملہ فعلہ سے پوشیدہ رکھے گئے تھے۔

...دست روزگار

موے جبیں گرفتہ بخوں می کشد مرا

قتل کی خبر ملتے ہی سائمن فریزر نے شہر کے تمام دروازے بند کرا دیئے تھے۔ اور اسے جب یہ اطلاع ملی تھی کہ ایک سیاہ پوش سوار کشمیری دروازے کی طرف سے دریا گنج کی طرف بھاگتا ہوا دیکھا گیا ہے تو اس نے یہ بھی حکم دے دیا کہ کوئی اکا دکا سوار جہاں نظر آئے اسے فوراً روک کر اس کی تلاشی اور اظہار لیا جائے کہ اس وقت وہ کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ کمپنی کے نفری، احدی، اور پلس کے پہرے دار ہر طرف پھیل گئے اور آنے جانے والوں کو تنگ کرنے لگے۔ لیکن انیا تو پاے شاطری مارنے والا مشاق دوندہ تھا، وہ پلس داروں اور چوکیوں کی گرفت میں کب آنے والا تھا۔ نہایت تیزی سے اس نے پہاڑ گنج کی عیدگاہ کے پیچھے تنگ گلیوں میں خود کو گم کر لیا اور نسبۃً کم آباد اور زیادہ تاریک گلی کوچوں سے ہوتا ہوا وہ بلبلی خانے کے پاس آنکلا۔ وہاں سے ترکمان دروازے کی دہلیز لانگھنا کچھ مشکل نہ تھا۔ ترکمان دروازے سے ذرا فاصلے پر مہندیوں کے قبرستان میں کچھ روشنی تھی، باقی ہر طرف اندھیرا تھا۔ مہندیوں کا چکر کاٹ کر فیروز شاہ کی لاٹھ اور عمارات کو ٹول کر راستہ پہچانتا ہوا وہ مسجد عبد النبی اور مسجد خیر المنازل کی روشنیوں کے سہارے بی بی فاطمہ سام کی درگاہ تک پہنچ گیا۔ حسن اتفاق سے وہاں کئی زائرین دالانوں میں اور کھلے آسمان تلے سو رہے تھے۔ انیا نے خود کو انھیں میں پوشیدہ کر لیا اور صبح تڑکے گجر دم اس نے فیروز پور کی راہ لی اور ۲۴ مارچ ۱۸۳۵ کی صبح کو بہت سویرے وہ قلعۂ فیروز پور کے صدر دروازے پر تھا۔

نواب شمس الدین احمد اس وقت خواب گاہ سے برآمد نہ ہوئے تھے، لیکن ان کے اس حکم کے بموجب کہ کریم خان یا انیا میواتی جس وقت بھی باریاب ہونا چاہیں، ہمیں خبر کی جائے، پیشی کے چوبدار نے فوراً یہ اطلاع اندر پہنچوا دی کہ انیا میواتی سلام کو حاضر ہوا ہے۔ نواب نے خواب گاہ سے باہر آ کر صحن

چمن میں انیا سے ملاقات کی۔ انیا نے انھیں دیکھتے ہی دور سے نعرہ بلند کیا:

''عالی جاہ کا اقبال بلند رہے!'' اور پھر دوڑ کر اس نے نواب کے قدم لئے۔ شمس الدین احمد نے یہ بات سمجھ ہی لی تھی کہ انیا اس بار کوئی خوش خبری لایا ہے۔ لہٰذا انھوں نے بلا تاخیر پوچھا:

''کہو، کیسے آئے، سب اچھا تو ہے؟''

''سرکار کے اقبال سے کام ہو گیا۔'' انیا نے جھک کر سلام کیا۔ ''دشمن راستے سے ہٹا دیا گیا۔''

''اچھا۔ بہت خوب، تو تم نے خود دیکھا؟''

''جی نہیں سرکار۔ مگر میں نے اپنے کان سے سنا کہ تین بار قرابین چلی۔ پھر ہر طرف کہرام ہو گیا۔ سارے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی کہ صاحب کلاں بہادر نہیں رہے۔''

''اور کریم خان؟''

''مجھے ان کی خبر نہیں عالی جاہ۔ کریم خان صاحب دشمن کے پیچھے پیچھے نکلے ہوئے تھے۔ میں تو گولی کی آواز سن کر سرپٹ بھاگا کہ اپنے سرکار کو سب سے پہلے خوش خبری پہنچانے والا میں ہوں۔ خان صاحب کا نشانہ کبھی چوکتا تو ہئی نہیں، سرکار جانتے ہیں۔ اس لئے شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔''

شمس الدین احمد خان کے رگ و پے میں نئے خون کی لہر سی دوڑ گئی۔ لیکن انھوں نے اپنے دل کی حالت پر قابو رکھا اور نہ اپنے قول یا فعل سے کچھ اہتزاز و ابتہاج ظاہر ہونے دیا۔ انھوں نے تالی بجائی اور چوبدار کے حاضر ہونے پر حکم دیا کہ انیا کو دس اشرفیاں دلوائی جائیں۔ یہ حکم دے کر انھوں نے کہا:

''انیا، تم فیروز پور ہی میں ٹھہرو۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور ابھی تمھارے نصیبے میں بہت کچھ ہے۔''

نواب کا یہ کہنا ایک طرح کا وعدہ تھا کہ انیا کو ابھی بہت کچھ انعام اور ملے گا، لیکن فوراً کوئی خاص اور نمایاں برتاؤ اس کے ساتھ نہ کیا جائے کہ ایسا کرنا خلاف مصلحت ہوگا۔ انیا اس بات کی رمز کو کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا، لیکن وہ سات سلام کر کے نواب کے حضور سے ہٹ آیا۔ لیکن شمس الدین احمد نے شاید انیا کی آنکھوں میں اعتماد کی کچھ کمی کی جھلک دیکھ لی تھی، کیونکہ انیا کے ہٹتے ہی انھوں نے فیروز پور کے کوتوال کو بلوا کر حکم دیا کہ انیا پر نگاہ رکھی جائے اور اسے شہر سے باہر نہ جانے دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ انیا اپنے وقت کا مانا ہوا دوندہ تھا، لہٰذا اسے اس بات کا خوب سلیقہ تھا کہ لوگوں کا تعاقب کیونکر کیا جاتا ہے اور خفیہ طور سے لوگوں پر نگاہ کیونکر رکھی جاتی ہے۔ اور کوتوال فیروز پور کے جاسوس

بھی شاید کچھ نااہل تھے، بہر حال انیا کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کوتوالی کے آدمی مجھ پر نگاہ رکھ رہے ہیں۔ اس کے دل میں خطرہ گونجا کہ ایسا تو نہیں کہ نواب کا اتنا بڑا راز میرے پاس ہے تو نواب مجھے مروا دینا چاہتے ہوں کہ یہ راز میرے ہی ساتھ دفن ہو جائے۔

اگلے دن تک انیا کا یہ شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہ صبح کو قضائے حاجت کے لئے جنگل جا رہا تھا کہ جس ٹیلے کے پیچھے اسے بیٹھنا منظور تھا، اس پر سے ایک بھاری پتھر لڑھکتا ہوا آ کر اس کے پاؤں کے آگے گرا۔ انیا نے فوراً یہ سمجھ لیا کہ یہ پتھر تو میرے لئے تھا اور اوپر سے اسے لڑھکانے والے کی ذرا سی چوک نے میری جان بچالی۔ وہ بھاگتا ہوا ٹیلے پر چڑھا کہ نشانات قدم یا دیگر قرائن سے اپنے حملہ آور کے بارے میں معلوم کرے، مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن اس بات سے اس کا شبہ اور بھی مستحکم ہو گیا کہ نہایت چالاک دشمن سے سامنا ہے۔ اگر میں یہاں رہ گیا تو یقیناً مارا جاؤں گا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انیا جب نواب کے حضور سے باہر آیا تو اس نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نواب کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ انیا جیسے فرومایہ شخص کو، جو اتنے بڑے راز سے آگاہ ہے، موت کے گھاٹ اتروا دینا بہتر ہوگا۔ اس کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ میرا خفیہ تعاقب ہو رہا ہے تو پھر اسے پورا یقین ہو گیا کہ اب میرے دن گنتی کے باقی ہیں۔

جنگل سے واپس پہنچ کر انیا نے اپنے بڑے بھائی کو پوری بات بتا دی اور اسے بھی یقین دلا دیا کہ یہاں میری جان بچنی محال ہے، میں روپوشی اختیار کر لوں گا اور آج رات بھیس بدل کر یہاں سے نکل لوں گا۔ انگریزی عملداری میں چونکہ امن وصیانت کی توقع زیادہ تھی، لہٰذا رات کے اندھیرے میں انیا نے آگرے کی راہ لی۔ بالا دوی میں مہارت کی وجہ سے رات کا سفر اس کے لئے کچھ ڈراؤنا نہ تھا۔ انیا کے غائب ہونے کی اطلاع کوتوال نے نواب کو اس خوف سے نہ بھیجی کہ نواب سخت سرزنش کریں گے کہ انیا کو کیوں ہاتھ سے یوں نکل جانے دیا گیا۔ دوسری بات یہ کہ کوتوال کو معاملے کی سنگینی کا کچھ پتہ بھی نہ تھا، لہٰذا اس نے خاموش رہنے میں کچھ خاص برائی نہ سمجھی۔

انیا کے غائب ہونے کے چوتھے دن سارے فیروز پور میں یہ خبر عام ہو گئی کہ فریزر صاحب بہادر کا قتل ہو گیا اور صاحبان فرنگیان نے جان توڑ کوشش کے بعد راز حل کر لیا اور ہمارے نواب کے میر شکار کریم خان بھر مارو کو اس جرم میں گرفتار کر کے جیل خانے بھیج دیا ہے۔ اب ان پر عدالت انگریزی میں مقدمہ چلے گا۔ فیروز پور کی رعایا چپ تھی اور حیرت میں تھی کہ ان حالات میں ہم کیا کریں۔ کیا نواب

صاحب کو مبارک باد دیں کہ ان کا دشمن مارا گیا، یا ان سے اظہار افسوس کریں کہ ان کا ملازم خاص اس جرم میں گرفتار ہوا ہے۔ خود نواب شمس الدین احمد خان پر بظاہر اس خبر کا کوئی اثر نہ تھا، اور نہ انھیں اپنے لئے کسی خطرے کا احساس پیدا ہوا۔ وہ حسب معمول اپنے منصبی کاموں میں مصروف رہے۔

مارچ ۱۸۳۵ کی اٹھائیس تاریخ کو صبح کا گجر بجنے سے بہت پہلے دریا گنج کی سڑک اور گلیاں گھڑ سواروں کی ٹاپوں اور حدیوں اور نفریوں کے قدموں کی آوازوں سے گونجنے لگیں۔ مشعلوں لینٹرنوں اور فانوسوں کی کثرت پر بارات کا گمان گذرتا تھا۔ سائمن فریزر اور جان لارنس کی قیادت میں کمپنی بہادر کی ایک بڑی جمعیت نے دریا گنج میں نواب شمس الدین احمد خان کی حویلی کو گھیر لیا۔ فریزر، لارنس، اور چند انگریز فوجیوں نے اندر داخل ہوتے ہی حویلی کا صدر دروازہ بند کر لیا تھا۔ چھاپہ مارنے والوں کو اندر کسی سے خطرہ تھا نہیں، اس لئے وہ مختصر سی گورا ٹکڑی کافی تھی۔ فریزر تو اندر دیوان خانے میں چلا گیا، جان لارنس نے باہر حصے میں اسلحہ خانہ، فیل خانہ، اصطبل وغیرہ کی تلاشی شروع کر دی اور جلد ہی اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔

خاصا بڑا اصطبل تھا، اس کے ایک کونے میں تیلیاں رنگ کا ایک تومند راہوار سر جھکائے الگ کھڑا تھا۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ گھوڑا کئی دن سے بیمار ہے اور باہر نہیں نکلتا۔ لیکن لارنس نے قریب جا کر گھوڑے کے دانے کا توبڑا اس کے منھ سے لگایا تو وہ مزے مزے سے دانہ کھانے لگا۔ ابھی لارنس اس بات پر غور کر رہا تھا کہ گھوڑے کے بارے میں اس بظاہر بے وجہ غلط بیان کی وجہ کیا ہے، کہیں یہ گھوڑا کچھ اور اہمیت تو نہیں رکھتا، کہ اچانک اس کی نظر اس بلند و بالا سیاہی مائل سرنگ کے سموں پر پڑی۔ اسے محسوس ہوا کہ یہاں کچھ عجیب بات ہے، کچھ بدلا ہوا ہے۔ سئیس نے لارنس کے حکم پر بادل ناخواستہ گھوڑے کا دایاں پاؤں اٹھا کر دکھایا تو لارنس کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گھوڑے کی نعل تو الٹی ٹھکی ہوئی تھی۔ اس نے چاروں پاؤں اٹھوا کر دیکھے تو سب میں یہی حال تھا۔ وہ مارا! اس نے دل میں کہا۔ جائے واردات پر مشکی سوار کے نشان کسی کی سمجھ میں آتے تو کیوں کر آتے جب گھوڑے کی سب نعلیں الٹی ٹھکی ہوئی تھیں! معا اس کے دل میں خیال گذرا کہ گذشتہ صدی میں اس کے ملک کا ایک مشہور ڈاکو ڈک ٹرپن (Dick Turpin) بھی تو یہی کرتا تھا کہ واردات کے بعد اپنا تعاقب یا تفتیش کرنے والوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لئے وہ اپنی سواری کے گھوڑے کی نعلیں الٹی ٹھکوایا کرتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ ڈک ٹرپن کا تعاقب

شمالی خطوں تک کیا گیا تھا اور بالآخر اسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ولیم فریزر کے قتل کا معما اب اس گھوڑے کی دریافت سے حل ہو گیا ہے اور فریزر کا قاتل بھی بالآخر اپنے کیفر کردار کو پہنچ کر پھانسی کے تختے پر لٹکے گا۔

اندرون حویلی کی تلاشی میں کچھ نہ ملا، حالانکہ جوش تحقیق سے مغلوب ہو کر فریزر نے کچھ جگہوں پر کھدائی بھی کرا ڈالی جہاں اسے خفیہ دستاویزات کے صندوق مدفون ہونے کا شبہ تھا۔ لیکن مشکوک گھوڑے کے سموں کا ناپ اور نقشہ جائے واردات کے پر اسرار نشان سم سے ملایا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی اصطبل کے داروغہ، اور تمام سیسوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ اب ایسا لگنے لگا کہ کریم خان کی بدنصیبی قدم قدم پر ساتھ چل رہی تھی، بلکہ آگے آگے تھی۔ جب تک قتل کی خبر لے کر انیا فیروز پور جھرکہ پہنچے پہنچے، نواب نے انتظار اور جذبۂ تجسس سے تنگ آ کر کریم خان کے بہنوئی واصل خان کو دریافت کوائف مفصلہ کے لئے دہلی بھیج دیا تھا۔ چنانچہ واصل خان حویلی دریا گنج پر چھاپے اور تلاشی کی صبح والی رات کو حویلی میں آ کر اترا تھا۔ نوکران حویلی سے معمولہ پوچھ گچھ کے دوران واصل خان سے بھی جرح کی گئی۔ اس نے اقبال کر لیا کہ میں کریم خان کا نسبتی بھائی ہوں لیکن وہ اس موقعے پر اپنی دہلی میں آمد کی کوئی معقول وجہ نہ بتا سکا، بجز اس کے کہ میں اپنی بیوی کے بھائی سے ملنے آیا تھا۔ بہر حال اسے بھی فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ واصل خان کا حشر کیا ہوا، اس کے بارے میں کوئی مصدقہ روایت نہیں۔ ایک انگریز مصنف کو خیال گذرا ہے کہ واصل خان (جس کا نام اس نے وسائل خان لکھا ہے) ہی اصل قاتل تھا۔ بہر حال اس کا امکان ہے کہ واصل خان کو بھی لمبی مدت تک قید سہنی پڑی اور وہ شاید قید ہی میں واصل بحق ہوا۔

ادھر جاسوسوں نے خبر دی کہ نواب کا میر شکار کریم خان کئی بار اسی مشکوک تیلیاں گھوڑے کی سواری کرتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ آتشیں اسلحہ کی مہارت میں کریم خان کی تمام زمانے میں شہرت کے پیش نظر اس کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ شہر کے ایک مشہور انگریز تاجر ولیم میکفرسن صاحب (William Macpherson) کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ سائمن فریزر فوراً میکفرسن کی کوٹھی پر کئی پلس داروں کے ساتھ پہنچا تو اس وقت کریم خان اور میکفرسن اسی گھوڑے کی خریداری اور قیمت کے تعین کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جس کی نعلوں کے بارے میں شک گذر چکا تھا۔ سائمن فریزر نے اپنے دل میں اس بات کو کریم خان کے جرم کا مزید ثبوت قرار دیا اور اسے بلا توقف گرفتار کر لیا۔

گرفتاری کے بعد کریم خان کو لڈلو کاسل (Ludlow Castle) میں بند کر کے سخت ترین تفتیش اور جرح سے گذارا گیا۔ لیکن نواب شمس الدین احمد تو در کنار، کریم خان کو بھی ماخوذ کرنے کی غرض سے جرح کے سوالات قائم کرنے کے لئے کوئی سراغ یا اطلاع انگریزوں کے پاس تھی نہیں، لے دے کے وہی افواہیں اور مشکوک گھوڑے کی نعلیں تھیں۔ کریم خان مسلسل یہی کہے گیا کہ اس گھوڑے پر کبھی کبھی سواری میں نے ضرور کی ہے لیکن گھوڑا جب جب میری سواری میں آیا اس کی نعلیں بالکل ٹھیک تھیں۔

''تو پھر یہ الٹی نعلیں کس نے اور کب لگوائیں اور کیوں؟''

''عالی جاہ۔ یہ تو گھوڑے کا مالک ہی بتا سکے ہے۔ میں بچارہ اس کے بارے میں کیا کہہ سکوں ہوں۔''

''کیوں نہیں؟ تم تو نواب کے میر شکار ہو۔''

''سرکار میں داروغۂ اصطبل تو نہیں ہوں۔'' کریم خان مسکرایا۔

''تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ تہذیب سے بات کرو نہیں تو صاحب بھی جوتے سے بات کرے گا۔'' فریزر نے جان لارنس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''حضور مالک ہیں۔ لارن صاحب اور سیمن صاحب آپ دونوں مجھے پہچانتے ہیں۔ میں کوئی غلط کام صاحبان عالی شان کے خلاف بھلا کیونکر...''

''یہ چکنی چکنی باتیں اپنی عورتوں کو سنانا۔ تم ہندوستانی لوگ ڈنڈے کی زبان سمجھتے ہو اور کچھ نہیں۔ ابھی اتنے چابک پڑیں گے کہ ماں یاد آجائے گی۔''

سائمن فریزر نے سرگوشی کے لہجے میں انگریزی میں کہا:

''لارنس، ذرا احتیاط سے کام لینا۔ تم جانتے ہو کمپنی کا حکم ہے کہ دیسی لوگوں کو مار تو ماری جا سکتی ہے، لیکن احتیاط سے۔ ان کی ہڈیاں نرم اور جسم کمزور ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قیدی مر ہی جائے۔ بدنامی بھی ہوگی اور شہادت بھی ہاتھ سے جائے گی۔ اس کو مارو لیکن ہڈیاں نہ توڑنا۔''

جان لارنس مسکرایا۔ ''میں اس حبشی خبیث کی ہڈیاں نہیں اس کی قوت مقاومت کو توڑوں گا۔'' اس نے انگریزی میں جواب دیا۔

(Don't worry. I'll break this evil negro's spirits, not his bones.)

''بہتر ہے کہ اسے اندھیری کوٹھری میں کچھ دن بھوکا پیاسا رکھیں۔'' سائمن فریزر نے کہا۔

جان لارنس نے کچھ دیر تامل کیا، پھر وہ بولا: ''ہاں تم نے اچھی ترکیب بجھائی ہے فریزر۔''

جس کوٹھڑی میں کریم خان کو قید کیا جانا تھا، اس میں بان کی ایک چارپائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ چارپائی ہٹا دی گئی اور کوٹھڑی کی کھڑکی اور دروازہ بند کر کے ان پر سیاہ پردے ڈال دیئے گئے۔ چار دیسی سپاہیوں نے کریم خان کو بے قابو کر کے اس کے کپڑے اتار لئے اور اسے ٹھوکر مار مار کر کوٹھڑی کے ایک کونے میں کر دیا اور بولے:

''خبردار۔ یہاں سے ہلنا مت۔ ذرا بھی ہلے ڈلے تو سونٹا کھاؤ گے۔''

کئی گھنٹے کی قید کے بعد دروازہ تھوڑا سا کھلا، لیکن چونکہ شام تھی، اس لئے کوئی روشنی اندر نہ آئی۔ جان لارنس اندر داخل ہوا۔ کریم خان اس وقت اپنے پیشاب میں لت پت کونے میں پڑا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ لارنس نے کریم خان کی پنڈلیوں اور پاؤں کے تلوؤں پر کئی بیت مارے، اس قوت سے کہ کریم خان ہر ضرب پر اچھل اچھل پڑتا تھا، لیکن اس کے منھ سے سسکی تک نہ نکلی۔

''قتل کے وقت تم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟'' لارنس نے بالآخر پوچھا۔

''سرکار میں کیا بتاؤں؟ قتل کس وقت ہوا مجھے نہیں معلوم۔''

لارنس کے اشارے پر ایک جمعدار نے کریم خان کے سر، گردن اور پیٹھ پر کئی سونٹے بہت تول تول کر ایک ایک دو دو ثانیہ کے وقفے سے لگائے۔ کریم خان کا سارا اوپری دھڑ لہو سے بھر گیا۔ پھر لارنس نے کہا:

''حرامی کتے۔ گستاخی مت کرو نہیں تو اس سے بھی برا حال ہوگا۔ بائیس مارچ کی شام سے صبح تک تم کہاں تھے؟''

''اپنے حجرے میں پڑا سو رہا تھا سرکار۔''

''وہاں کسی نے تم کو دیکھا؟ کوئی گواہی ہے؟''

''حضور مجھے بہت تیز تپ چڑھ آئی تھی۔ میں رات بھر منھ لپیٹ کر پڑا رہا۔ روٹی بھی نہیں کھائی۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم اس رات کو صاحب کلاں بہادر کی کوٹھی کے پاس دیکھے گئے تھے۔''

''ممکن ہی نہیں جناب۔''

ایک سپاہی نے کئی سونٹے پھر کریم خان کو لگائے اور جمعدار نے کریم خان کو ماں کی گالی دی اور کڑک کر بولا:

''تو کیا ہمارے صاحب بہادر جھوٹ بول رہے ہیں؟ ابے تو سچ سچ بات بتا کیوں نہیں دیتا؟''

''جو آپ کہیں جمعدار جی، میں تو وہی کہوں گا...''

جان لارنس نے بات نہ پوری ہونے دی اور بڑھ کر دوبارہ کئی بیت کریم خان کے پیٹ اور کفِ پا پر لگائے۔ پھر اس نے پوچھا:

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم اس مشکی گھوڑے پر آخری بار کب چڑھے تھے؟''

کریم خان چند ثانیے چپ رہا، گویا سوچ رہا ہو۔ پھر بولا، ''مجھے یاد نہیں سرکار۔'' اچانک وہ مسکرایا۔ ''میں کوئی روزنامچہ تو بھرتا نہیں سرکار۔'' اس کی مسکراہٹ میں تمسخر تھا، یا شاید نہیں تھا۔ لیکن جان لارنس کو یہی لگا کہ یہ ٹکے کا دیسی ملازم میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ کئی سونٹے کریم خان پر پھر پڑے۔ پھر لارنس نے پوچھا:

''کیا یہ شک کی بات نہیں کہ جس گھوڑے پر فریزر صاحب کا قاتل سوار تھا تم اسی گھوڑے کو بیچنے جا رہے تھے؟''

''جی ہاں حضور شک کی بات تو ہے۔ لیکن کیا قاتل نے قبول دیا ہے...؟''

لارنس نے آگے بڑھ کر کریم خان کو جھنجھوڑا اور اس کی مونچھوں کے کئی بال اکھاڑ دیئے، پھر اس نے اپنے بھاری فوجی بوٹ سے کریم خان کو ٹھوکر ماری اور چیخا: ''تم خود قاتل ہو۔''

کریم خان نے منھ پر ہاتھ پھیرا، پھر ہاتھ جھٹک کر بولا:

''سرکار مالک ہیں۔'' اس کے لہجے میں عاجزی نام کو نہ تھی، بلکہ لگتا تھا کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔

''تم اس گھوڑے کو بیچنے کیوں گئے، اور وہ بھی اس وقت؟''

''میں اپنے حاکم کا حکم پورا کر رہا تھا حضور۔ نواب صاحب کا فرمان تھا کہ یہ گھوڑا بہت ضدی ہے، اسے الگ کر دو۔''

''کیا ثبوت؟'' لارنس دہاڑا۔

''سرکار داروغۂ اصطبل سے پوچھ لیں۔''

''وہ تو ہم پوچھیں گے ہی۔ لیکن ابھی تو تم یہاں ہو حرام زادے شیطان کی اولاد، تم بتاؤ کہ تم

جب آخری بار اس گھوڑے پر سوار ہوئے تو اس کی نعلیں ٹھیک نہیں تھیں۔ کیوں؟''

''بالکل ٹھیک تھیں۔ میں حلفیہ کہتا ہوں عالی جاہ۔''

''تم اگر بیمار تھے تو حکیم کے پاس کیوں نہ گئے؟''

''جناب ہم کہاں اور حکیم صاحب کہاں۔ ہم تو یوں ہی...'' کریم خان عجب انداز سے مسکرایا، ''...لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔''

لارنس کے تن بدن کو گویا آگ لگ گئی۔ اس نے اچھل کر ایک بیت کریم خان کے منھ پر مارا، کریم کے ماتھے سے لے کر ٹھوڑی تک خون کی لکیر ابھر آئی۔ انگریزی میں گالی دے کر اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ دو سپاہیوں نے کریم خان پر سونٹے برسانا شروع کیے۔ کریم خان کے منھ سے آواز بھی نہ نکلی لیکن اس نے اپنا سر نہوڑا کر گھٹنوں اور پیٹ کے بیچ میں کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد لارنس نے کریم خان کی پسلیوں پر بوٹ کی ٹھوکر ماری اور چیخا: ''سر اٹھا کر بات کرو!''

کریم خان نے سر اٹھایا۔ اس کی ایک آنکھ تامڑے کی طرح سیاہی مائل سرخ تھی اور ایک آنکھ سوج کر بند ہو گئی تھی۔

''تو پھر اس کے پاؤں میں وہ نعلیں تم نے کب لگوائیں؟''

''میں نے اس گھوڑے کی نعلیں کبھی نہیں ٹھکوائیں۔ آپ یقین کریں سرکار میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

''مکار حرامزادے۔ تم اس گھوڑے کو بیچنے کے لئے اب کیوں گئے؟''

''میکفرسن صاحب شہر میں موجود نہ تھے حضور۔ پرسوں ہی آئے ہیں۔''

جان لارنس تلملا کر رہ گیا کہ بات صحیح تھی۔

''وہ نعلیں کس نے لگوائیں؟ تمھیں تو اس گھوڑے پر سوار تھے۔''

''حضور... میں داروغۂ اصطبل نہیں۔'' کریم خان نے کھنکھار کر خون آلود بلغم اس طرح تھوکا کہ اس کا رخ کم و بیش لارنس کی طرف تھا۔ ''ہاں ایک آدھ بار اس گھوڑے پر سواری کا قصور مجھ سے ضرور ہوا۔ لیکن میرے حاکم کو اس کا علم ہے۔ انھوں نے مجھے کوئی سزا نہیں دی۔''

''نمک حرام۔ قتل کے وقت تم کہاں تھے؟''

''قتل کس وقت ہوا معلوم نہیں عالی جاہ۔''

''جھوٹے غدار۔ تم قتل کی رات کوٹھی کے پاس دیکھے گئے تھے۔ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔''

کریم خاں نے بدن اکڑایا، گویا انگڑائی لے رہا ہو۔ ''میں وہاں تھا نہیں سرکار۔ پر اگر تھا بھی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قاتل بھی میں ہوں۔''

جان لارنس کے جی میں آئی کہ اس گستاخ دیسی کتے کا سر بوٹ کے تلے رگڑ کر کچل دوں، لیکن اسے فریزر کی نصیحت یاد آ گئی۔ اس نے کچھ ٹھہر کر بہت ٹھنڈے لہجے میں پوچھا:

''تم نے صاحب کلاں بہادر کو آخری بار کب دیکھا؟''

کریم خان نے پھر چند ثانیوں کے سکوت کے بعد کہا، ''اب یاد نہیں آتا حضور، بہت دن ہو گئے... ہم دیسیان صاحبان فرنگیان سے دور ہی رہتے ہیں...'' یہ کہتے کہتے کریم خان نے پیشاب کر دیا، لیکن ایک انداز بے پروائی سے، گویا کسی اوٹ کی جگہ اطمینان سے فراغت کر رہا ہو۔ پیشاب کی دھار گرنے کی آواز لارنس اور سب سپاہیوں نے سنی۔ لیکن لارنس کہتا بھی تو کیا کہتا۔ قیدی کو اسی کے حکم سے کوٹھڑی میں ننگا اور تنہا رکھا گیا تھا۔ خجالت مٹانے کے لئے اس نے کریم خان کو دو چار سونٹے اور لگوائے، پھر پوچھا:

''قتل کی رات تم کہاں تھے؟''

''دریا گنج والی حویلی میں سرکار۔''

لارنس دانت پیس کر رہ گیا۔ سوالوں اور سونٹے یا بیت کی مار کا سلسلہ رات بھر چلا۔ لارنس گھوم گھوم کر وہی سوالات بار بار پوچھتا۔ اچانک کسی سوال کے جواب کے دوران کریم خان کی بات کاٹ کر وہ کوئی غیر متعلق بات پوچھ دیتا یا کسی پوچھے ہوئے سوال کو پھر پوچھتا۔ اس کی کوشش تھی کہ کریم خان کے کسی جواب یا بیان میں کوئی تضاد پکڑ لے یا کریم خان کو حواس باختہ کر کے اس سے کوئی بات اگلوا لے۔ پانی یا اور کسی بھی قسم کی راحت کے بغیر کریم خان کا گلا خشک ہو گیا، آواز بھراتے بھراتے تقریباً معدوم ہو گئی، تکان اور زخمداری اور حرارت غریزی میں کمی کے باعث اس پر غشی سی چھانے لگی اور خود جان لارنس کا گلا بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی ساری جرح و تفتیش کا نتیجہ محض صفر رہا۔

صبح ہوتے ہوتے لارنس نے تھک کر جرح بند کر دی۔ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ قیدی پر دو تین گھڑے ٹھنڈا پانی ڈالو تا کہ وہ صاف ہو جائے۔ پھر اسے کرتا پاجامہ پہنا کر دوسری کوٹھری میں لے جا

کر کچھ کھانے کو دو۔ لیکن اسے سونے مت دینا۔ میں دن ڈھلے پھر آؤں گا۔

لارنس کو واپسی میں شام کے بجائے رات ہو گئی۔ لیکن اس تاخیر میں کریم خان یا اس کے آقا کے لئے کوئی اچھائی پوشیدہ نہ تھی۔ اس دن ایک شہادت ایسی مل گئی تھی کہ سارے فرنگیان اعلیٰ و حکام بالا بغلیں بجا رہے تھے کہ اب کریم خان ہی نہیں شمس الدین احمد پر بھی ہمارا قابو چل جائے گا۔ ہوا یوں کہ جس دن دریا گنج کی حویلی میں چھاپا پڑا اور گرفتاریاں ہوئیں، اسی دن ایک شخص کا ڈول حویلی کے سامنے والے کنویں میں گر پڑا۔ ڈول کی بازیافت کے لئے مرجیا کنویں میں اتارا گیا۔ جب وہ تھوڑی دیر بعد اوپر آیا تو اس کے ہاتھ میں گم شدہ ڈول کے علاوہ ایک پتھر کلہ بندوق بھی تھی جس کی نال کاٹ کر چھوٹی کر دی گئی تھی۔ غوطہ خور نے یہ بھی بتایا کہ ڈول ایک کونے میں کیچڑ میں پھنسا ہوا تھا، اسے زور کر کے نکالا تو اس کے پیندے میں چپکا ہوا ایک کاغذ بھی چلا آیا جو کچھ خط وغیرہ سا معلوم ہوتا تھا۔ پولس دار نے فوراً مٹکاف صاحب بہادر کو اس دریافت کی خبر دی اور بندوق مع کاغذ بحق سرکار کمپنی بہادر ضبط کر لی۔ مٹکاف نے کاغذ فوراً سائمن فریزر کو بھیج دیا کہ اس کا معائنہ ہو، عبارت کی رمز شناسی کی جاوے اور ضروری سمجھا جاوے تو کاتب کے بارے میں تحقیق ہو۔ بندوق اس نے جان لارنس کے پاس بھیج دی کہ اس کے مالک کا پتہ لگایا جائے۔

کاغذ ہر چند کہ بہت کچھ گل چکا تھا اور عبارت جگہ جگہ سے مٹ گئی تھی، لیکن اس پر کچھ کیمیائی عمل کیا گیا تو زیادہ تر حروف روشن ہو گئے اور یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی خط ہے جو نواب شمس الدین احمد خان نے کریم خان کو بسلسلۂ خریداری سگان شکاری لکھا تھا۔ خط پر دستخط نہ تھے اور نہ مہر تھی لیکن شمس احمد خان کا سوادِ خط کئی لوگوں نے پہچان کر گواہی دی کہ یہ کتابت انھیں کی لکھی ہوئی ہے۔ کاغذ پر تاریخ صاف نہ تھی، اور سال بالکل نہ تھا، لیکن اس میں مذکور تھا کہ کریم خان تین مہینے سے دہلی میں ہے اور اب اسے واپس آ جانا چاہیئے کیونکہ وہ خریداری سگان صید افگن کے لئے نااہل ثابت ہوا ہے۔ کریم خان کے قیام دہلی کے بارے میں تھوڑی بہت تفتیش سے یہ بات کھل گئی کہ یہ کتابت ۱۸۳۴ اور ۱۸۳۵ ہی کے زمانے کی ہے۔ ''خریداری سگان شکاری'' کے معنی یہ نکالے گئے کہ یہ رمز ہے، اور اس کے معنی قتل ولیم فریزر ہیں۔

حکام انگریزی کو اس بات کے ثابت کرنے میں ناکامی ہوئی کہ اکتوبر ۱۸۳۴ سے کریم خان کے قیام دہلی کی اصل غایت فریزر کا قتل تھا۔ کریم خان نے فریزر کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لئے جتنے جاسوس نوکر رکھے تھے وہ کریم خان اور نواب شمس الدین احمد خان کے جاں نثار تھے، لہٰذا وہ سامنے نہ آئے اور نہ ہی کوئی مخبران کے بارے میں کچھ معلومات مہیا کر سکا۔ لیکن یہ کمی بندوق کے سراغ سے پوری ہو گئی

تھی کیونکہ فریزر کے آدمیوں نے چند ہی گھنٹے کی محنت میں ایک لوہار کو ڈھونڈ نکالا جس نے بندوق کی شناخت کی اور گواہی دی کہ میں نے کریم خان کی فرمائش پر اس کی نال کاٹی تھی۔ اب تو جان لارنس اور فریزر قسم کھانے کو تیار تھے کہ کریم خان پر ہی نہیں، شمس الدین احمد خان پر بھی جرم ثابت ہو گیا ہے۔ وہ دونوں اپنے اس خیال میں اس قدر پختہ تھے کہ انھوں نے ٹامس مٹکاف کے سامنے تجویز رکھی کہ اب مرزا مغل بیگ خان اور فتح اللہ بیگ کو قید رکھنے کی ضرورت نہیں، قتل کے اصل مجرم شناخت کر لئے گئے ہیں۔ لیکن مٹکاف جہاندیدہ اور مدبر ہونے کے ساتھ حد درجہ محتاط بھی تھا۔ وہ کسی بھی قیدی کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ جب تک مرزا مغل قید رہے گا، شمس الدین احمد پر ہمارا دباؤ قائم رہے گا۔ رہا فتح اللہ بیگ، تو اس جیسے کم حقیقت شخص کا جیل میں رہنا نہ رہنا برابر ہے۔ اور اس وقت ضرورت دیسیوں پر داب و دبدبۂ سلطنت ظاہر کرنے کی ہے نہ کہ مروت اور شفقت کی۔ لہٰذا ولیم فریزر کے گھڑ سوار، کوچبان، اور نواب شمس الدین احمد کے داروغۂ اصطبل اور سئیسوں کی طرح مرزا مغل بیگ خان اور فتح اللہ بیگ خان بھی بدستور قید رکھے گئے۔

شام کو جان لارنس اور سائمن فریزر ساتھ ساتھ علی پور گئے۔ اس بار کریم خان کی کوٹھڑی میں خود جانے کے بجائے لارنس نے حکم دیا کہ کریم خان کو حسب سابق ننگا کر کے جیل کے صحن میں ایک کرسی پر بٹھا کر رسیوں سے جکڑ دیا جائے۔ اس کی آنکھوں کے آگے تیز مشعلیں روشن کر دی گئیں، اس طرح کہ اسے روشنی کے پیچھے کچھ نظر نہ آ سکتا تھا۔ سائمن فریزر نے اس کاغذ کو، جو کنوئیں سے برآمد ہوا تھا، کریم خان کے سامنے لہرا کر پوچھا:

"تم اس کاغذ کو پہچانتے ہو؟"

"عالی جاہ، مجھے اتنی دور سے کیا نظر آ سکے ہے۔ کاغذ میرے ہاتھ میں پکڑا دیں تو عرض کروں۔"

کاغذ کو کریم خان کے ہاتھ میں دینے کا سوال تو تھا نہیں، لیکن اس خط کو اٹک اٹک کر، جہاں تک وہ پڑھنے میں آ سکتا تھا، فریزر نے پڑھ کر سنایا اور پھر ایک اچھے قد و قامت کے نفری کو حکم دیا کہ اسے کریم خان کی آنکھوں کے پاس لے جاؤ۔

"کیوں، سن لیا؟ اور دیکھ لیا؟ اب بتاؤ۔"

"میں کیا بتاؤں سرکار۔ میں نے اس خط کو کبھی دیکھا ہی نہیں، اور نہ ہی کہہ سکوں ہوں کہ اسے لکھا کس نے۔"

"کمینے۔ کیا تم اپنے نواب کی لکھائی نہیں پہچانتے؟"

"پہچانتا تو ہوں میرے سرکار۔ لیکن اس پر میرے مالک کے نہ دستخط ہیں نہ مہر ہے۔"

"لیکن لکھائی تو انھیں کی ہے، ہے کہ نہیں؟ صاف جواب کیوں نہیں دیتا کہ کس نے لکھا ہے؟"

"عالی جاہ مجھے کیا معلوم کہ کس نے لکھا ہے۔ کسی نے جال یا دند پھند کیا ہوگا تو میں کیا جانوں۔"

"میں کہتا ہوں کہ یہ خط شمس الدین نے تم کو لکھا تھا اور شکاری کتوں کی خرید سے مراد ولیم فریزر صاحب کلاں بہادر کا قتل تھا اور تم نے یہ کام شمس الدین کے حکم پر انجام دیا۔"

"جناب حاکمان ہیں۔ کچھ بھی کہہ سکیں ہیں لیکن یہ خط مجھے ملا ہی نہیں اور نہ میں یہ مان سکتا ہوں کہ نواب شمس الدین احمد خان بہادر..."

فریزر نے جملہ پورا نہ ہونے دیا اور اس کے پہلے ہی جھپٹ کر کریم خان کے پیٹ پر بوٹ سے ٹھوکر مارتا ہوا بولا، "خونی قاتل بدمعاش کو نواب اور خان بہادر کہتا ہے! تو اور تیرا نمک حرام نواب دونوں ہماری ٹھوکر میں ہیں۔"

"...ایسا کوئی خط لکھ سکتے تھے۔" کریم خان نے جملہ پورا کیا، گویا اس کے لئے فریزر کی ٹھوکر اور گالی بھرے جملے کا وجود ہی نہ ہو۔

"صاحب کلاں بہادر سے تیرے ڈکیت نواب کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔"

"عالی جاہ۔" کریم خان پھر وہی مسکراہٹ مسکرایا جو صاحبان عالیشان کو نہایت خبیث لگتی تھی۔ "بڑوں کی باتیں بڑے ہی جانیں۔ میں تو حقیر خدمت گار ہوں، آپ کے لئے کیڑے سے بدتر ہوں۔"

فریزر نے بڑی مشکل سے خود کو ضبط کیا۔ "تم شمس الدین احمد کے ساتھ پلے بڑھے نہیں ہو؟"

"پلا بڑھا تو آپ کا کتا بھی آپ کے بابا لوگوں کے ساتھ ہے سرکار۔" کریم خان نے بظاہر مسکین لہجے میں کہا لیکن اس بار پھر اسے صلے میں کئی سونٹے کھانے پڑے۔

"ہم تمھیں کتے سے بدتر موت ماریں گے۔" اس بار سائمن فریزر مسکرایا۔ "ہم تمھیں سور کی کھال میں سلوا کر جمنا میں پھکوا دیں گے۔"

"یہ بند کھلوا کر میرے ہاتھ میں ایک تلوار دے دیجئے سرکار۔"

"ہم تجھے اس طرح ماریں گے کہ تو اپنی تلوار اپنی ہی چھاتی میں بھونک لے گا۔" فریزر دہاڑا۔ "سچ کہتا کیوں نہیں کہ یہ خط تجھے کب ملا اور اس کا مطلب کیا ہے؟"

''حضورِ عالی، وہ کاغذ تو بالکل آب زدہ ہے۔ کیا کہیں پانی میں پڑا ملا تھا؟''

''سوال ہم پوچھ رہے ہیں۔ زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرو، جواب دو۔''

''حضور، اگر یہ خط میرے صاحب کا ہے اور اگر یہ مجھے ملا ہوتا تو میں کیا اسے پانی میں پھینک دیتا؟'' کریم خان نے صاحبانِ فرنگی کی طرف کچھ ایسی نگاہ سے دیکھا گویا ان کی عقل پر رحم کھا رہا ہو۔

بار بار انھیں سوالوں کو دہرانے اور طرح طرح سے کریم خان پر تشدد کرنے اور اسے ذلیل کرنے میں آدھی رات گذر گئی۔ لیکن کریم خان وہی باتیں کہتا رہا جو وہ شروع سے کہتا رہا تھا۔ بالآخر سائمن فریزر نے جان لارنس سے کہا کہ اب تم جرح شروع کرو۔ لارنس نے اشارہ کیا تو اس کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک برقنداز نے اس کے ہاتھ میں ایک بندوق دے دی جس کی نال کٹی ہوئی تھی۔ مشعلوں کی روشنی میں بندوق صاف دکھائی دیتی تھی اور اسے دیکھ کر کریم خان ایک لمحے کے لئے سناٹے میں آ گیا۔

''کریم خان۔ تم اس بندوق کو پہچانتے ہو؟''

''سرکار اتنی دور سے میں کیا پہچانوں۔ بس یہ ہے کہ بندوق ہے۔''

''یہ تمھاری بندوق ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم عالی جاہ۔'' پھر کچھ توقف کے بعد کریم خان نے کہا۔ ''کیا اس پر میرا نام لکھا ہوا ہے؟''

''پھر وہی حرام زادگی۔ اے مادر بخطا سوال ہم پوچھ رہے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں یہ بندوق تیری ہے؟''

''سرکار بہتر جانتے ہیں۔''

''بکواس مت کرو۔'' پیچھے کھڑے ہوئے سونٹا بردار نے کریم خان کے منہ پر ایک سونٹا مارا۔ کریم خان کے چہرے پر کرب کی ایک لہر آئی لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

''اقبال کر لو ورنہ مارے جاؤ گے۔''

''کریم خان نے ایک مصنوعی ٹھنڈی آہ بھری۔ ''اب مارے جانے میں کیا کسر ہے عالی جاہ۔'' جملہ ختم ہوتے ہی اس کے سر و گردن پر پھر ایک سونٹا پڑا۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ کریم خان کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ تھوڑی سی خاموشی کے بعد لارنس نے بہت آہستہ سے پوچھا:

''کریم خان۔ تم جمعہ دین لوہار کو جانتے ہو؟''

کریم خان کے ستے ہوئے چہرے پر تفکر کی شکن ابھری۔ بالآخر اس نے کہا:

''وہی جمعہ دین لوہار جس کی دوکان کوچہ بلاقی بیگم میں لالہ پورن مل کی حویلی کے پیچھے ہے؟''

''وہی سمجھ لو،'' لارنس نے جواب دیا۔

''تو پھر تو میں اسے جانتا ہوں سرکار۔''

لارنس اور فریزر دونوں فتح مندانہ مسکراہٹ مسکرائے۔ لارنس نے کہا:

''جمعہ دین کا حلفیہ بیان ہے کہ یہ بندوق تمھاری ہے اور اس نے تمھارے کہنے سے اس کی نال کاٹی تھی۔''

کریم خان پھر تھوڑی سی سوچ میں پڑ گیا۔ ''جمعہ دین کہتا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا کہ یہ میری ہی بندوق ہے اور میں ہی نے اس کی نال کٹوائی ہوگی۔''

لارنس بڑے جوش سے کچھ کہنے والا تھا کہ کریم خان نے مزید کہا۔ ''لیکن اگر یہ وہی بندوق ہے تو یہ بہت دن سے میرے پاس نہیں ہے۔ کھو گئی تھی۔''

''تم پھر جھوٹ بول رہے ہو جذامی اونٹ کی اولاد۔ لیکن تم نے بندوق کی نال کٹوائی کیوں تھی؟''

''سور مارنے کے لئے حضور۔'' لفظ ''سور'' اس نے کچھ اس طرح ادا کیا جیسے کوئی ظریفانہ بات کہہ رہا ہو۔ پاس کھڑے ہوئے ایک مسلمان احدی نے بہن کی گالی دے کر کریم خان کو ایک سونٹا مارا اور کہا:

''مسلمان ہو کر سور کا شکار کرتا ہے۔''

''شکار نہیں کرتا حوالدار جی، بس مار ڈالتا ہوں۔''

''پہلیلیاں کیوں بجھا رہا ہے؟'' اس بار فرنگی کے منھ سے ماں کی گالی نکل گئی۔ ''صاف بتا تا کیوں نہیں ہے؟''

''عالی جاہ کو بندوق کے بارے میں معلوم ہی ہے۔'' کریم خان نے اس طرح کہنا شروع کیا گویا جماعت میں لڑکے پڑھا رہا ہو۔ ''نال چھوٹی کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ بندوق کا توڑ کم ہو جاتا ہے لیکن چھرے دور تک نہیں پھیلتے۔ سب قریب قریب یکجا ہی گرتے ہیں۔ لہٰذا نال کٹی ہوئی بندوق کم فاصلے کی مار کا ہتھیار ہے۔ اگر فاصلے سے چند قدم کے کسی پر ایسی بندوق سر کی جاوے تو...''

کریم خان وہی مسکراہٹ مسکرایا جو صاحبان فرنگیان کو زہر لگتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چٹخائیں اور انھیں الگ کر دیا۔ ''...بس اسی طرح چٹ پٹ دو ٹکڑے ہو جاوے گا۔'' اس نے فریزر

کی طرف پرمعنی نظروں سے دیکھا۔فریزر کو جھرجھری سی آگئی۔اس کو خاموش دیکھ کر لارنس نے کہا۔

''تو پھر؟''

''تو پھر یہی ... کہ سرکار جانتے ہیں خواجہ صاحب کے راستے میں عرب سرائے کے آگے بنڈ یلے بہت ہیں۔ایک بار انھوں نے صاحب میرے کی پالکی پر حملہ کر دیا۔وہ تو کہیے کہ برچھیت لوگ ہوشیار تھے نہیں تو غضب ہو جاتا۔پھر آئندہ ایسے موقعوں کے لئے میں نے یہ بندوق تیار کرائی کہ آسانی سے پالکی میں رکھی جاسکتی تھی اور میرے صاحب بھی جھٹ پٹ فیر کر سکتے تھے۔''

''تو تم قبولتے ہو کہ یہ بندوق تمھارے مالک کے اور تمھارے استعمال میں تھی۔''

''بے شک حضور۔لیکن مدت ہوئی یہ بندوق کھوگئی۔ایک بار میں نے شکار میں کاندھے سے اتار کر ایک پتھر پر چشمے کے کنارے رکھ دیا تھا۔پھر وہاں سے اٹھا تو اٹھانا اسے بھول گیا۔''

''تم نے شمس الدین احمد کو یہ بات بتائی؟''

''نواب صاحب بہادر تو وہیں موجود ہی تھے حضور۔مجھ پر بہت گرم ہوئے۔''

''کب کا واقعہ ہے یہ؟''

کریم خان انگلیوں پر حساب لگا کر بولا۔''اب کے چاند کو نو مہینے ہو جائیں گے جناب۔''

''لیکن تم اسے جنگل میں بھول آئے تھے تو پھر یہ دریا گنج کی حویلی کے سامنے کنویں میں کیسے پہنچی؟''

''سرکار ایک بات پوچھوں؟'

''سوال ہم پوچھ رہے ہیں۔تمھارا کام جواب دینا ہے۔''

''عالی جاہ۔جمعہ دین نے اپنے اظہار میں بتایا تو ہو گا کہ میں نے بندوق کی نال کب...''

''سوال کا جواب دو۔کتوں کی طرح بھونکنے کی ضرورت نہیں۔''

کریم خان نے سمجھانے والی سی ہلکی آواز میں کہا:

''حاکمان عالی جاہ کی رائے روشن پر ظاہر ہو گا کہ چھپ کر دور سے مار کرنے کے لئے چھرے والی بندوق بالکل بیکار ہوتی ہے کیونکہ چھرے دور دور پھیل جاتے ہیں اور بمشکل ایک ہی دو چھرا نشانے پر لگتا ہے اور اگر بندوق کی نال کٹی ہوئی ہو تو اس کا توڑ بھی کم ہو جاتا ہے...''

''تم پھر پاگل کتے کی طرح بھونک رہے ہو۔''لارنس نے تیزی سے کہا۔''موقعے پر جو گولیاں برآمد ہوئی ہیں وہ اسی بندوق سے چلی تھیں۔یہ بندوق تمھیں پھانسی پر چڑھوائے گی۔''

حقیقت یہ تھی کہ کریم خان کے خلاف جو مقدمہ تیار کیا جا رہا تھا اس میں دو بڑے سقم تھے۔ ایک تو یہ کہ جمعہ دین کسی بھی طرح یہ کہنے کو تیار نہ تھا کہ بندوق کی نال کٹوانے کا واقعہ حال میں پیش آیا تھا۔ بار بار کی شدید جرح کے باوجود وہ اپنی گواہی پر قائم تھا کہ واقعہ پرانا تھا لیکن صحیح تاریخ یا مہینے کا تعین وہ نہ کر سکتا تھا۔ دوسری کمزوری یہ تھی کہ ہر چند کہ قاتلانہ فیر بہت نزدیک سے ہوا تھا لیکن عام تجربے اور عقل کا تقاضا تھا کہ وہ ایسی بندوق سے ہوا ہو، مثلاً ٹوپی دار یا رائفل، جو دور تک مار کر سکتی ہو۔ دو گولیاں یا گراب جو مقتول کے بدن سے برآمد ہوئے تھے انھیں اب غور سے معائنہ کیا جا رہا تھا اور کنویں سے برآمد شدہ پتھر کلہ بندوق سے چند فیر کر کر خارج شدہ گراب سے مقابلہ کر کے یہ متعین کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ آیا مقتول کے بدن سے نکالے ہوئے گراب اسی بندوق سے سر کیے گئے تھے۔ لیکن چونکہ توڑے دار بندوقوں کی نال میں اندرونی سطح پر خار (grooves) نہ ہوتے تھے، لہٰذا ان سے فیر کی ہوئی گولیوں پر چکر دار نشان (جنھیں rifling کہتے ہیں) بھی نہ ہوتے تھے، اس لیے حتمی فیصلہ ناممکن تھا، صرف ایک عمومی رائے دی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ فریزر اور لارنس اپنے مقدمے کی کمزوری کو خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن انھیں یہ بھی منظور نہ تھا کہ کریم خان کوئی ایسا اظہار دے یا کسی سوال کا ایسا جواب دے جس سے ان کا مقدمہ کمزور پڑ جانے کا امکان ہو۔

ساری رات یوں ہی گذر گئی۔ صبح کاذب کی دھندلی سفیدی میں کریم خان کا چہرہ سیاہی مائل اور پچکا ہوا سا معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کے بدن پر جگہ جگہ انگریزوں کے تھوک اور اس کے اپنے کف دہن کے ملگجے نشان تھے۔ اس کی نیم وا آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور رات بھر کی جسمانی اذیت اور شبنم اور سیت نے اس کا جسم اکڑا دیا تھا۔ پہاڑی کی جھاڑی جھنڈیوں میں سوئے ہوئے جانور جاگے۔ مسجدوں اور مندروں میں عبادت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اواخر مارچ کی سرد ہوا شمال مغرب سے بہنے لگی۔ جیل کے صحن میں جلتی ہوئی مشعلوں اور فانوسوں کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تو صاحبان فرنگیان نے، کہ خود بھی بہت افسردہ و واماندہ ہو چکے تھے، ایک آخری کوشش کی۔ فریزر نے بلند آواز میں کہا:

''سنو! کریم خان۔'' کریم خان جب متوجہ نہ ہوا تو ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ جھنجھوڑا اور اس کا سر ہلا کر کہا، ''ابے سنتا نہیں ہے ماں کا یار۔ صاحب بہادر کچھ فرما رہے ہیں۔''

کریم خان نے گردن سیدھی کی، ادھر ادھر دیکھا، اور ایک مصنوعی سی جمائی لے کر بولا:

''جی سرکار۔حاضر ہوں۔''

''کریم خان۔'' فریزر نے کہا، ''جرم تم پر ثابت ہے۔تم تو بے شک پھانسی پر لٹکو گے...لیکن اگر تم سچی بات بتادو کہ تم نے شمس الدین احمد کے کہنے پر یہ کام کیا تھا تو ہم تم کو وعدہ معاف گواہ بنالیں گے۔ پھر تمھاری جان بچ جائے گی...اور نواب کو اپنے کئے کی سزا ملے گی۔''

کریم خان نے سر اٹھایا اور کھوکھلی سی آواز میں کہا، گویا اس کے سینے میں طاقت نہ ہو۔

''سرکار۔جھوٹ بولنے سے تو مر جانا ہی اچھا۔''

فریزر اور لارنس ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔بالآخر فریزر نے انگریزی میں کہا:

''اب اس شخص پر مزید سختی بیکار ہے۔اس کا خیال رہے کہ مقدمہ کھلی عدالت میں چلایا جائے گا لیکن پھانسی تو اس ولدالزنا کو ہو گی ہی۔ہمیں شمس الدین احمد کے خلاف مزید شہادت فراہم کرنی ہوگی۔''

لارنس نے پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا:

''فریزر،تم مطمئن رہو۔اس دوغلے کتے نواب کو پھانسی کے تختے تک لانا میرا ذمہ ہے۔''

(Be assured, Fraser. It'll be my task to bring that half-caste dog of a nabob to the gallows.)

جب نواب شمس الدین احمد خان کو کریم خان کی گرفتاری اور وفاداری کی خبریں ملیں اور اس بات کا امکان بھی ظاہر کیا گیا کہ خود انھیں بھی اس جرم میں گرفتار کیا جا سکتا ہے، تو انھوں نے گورنر جنرل کو دو عریضے ۱۱ اپریل ۱۸۳۵ اور ۱۲ اپریل ۱۸۳۵ کو بھیجے جن کا لب لباب یہ تھا کہ میرے نوکر کریم خان کو میکفرسن صاحب کی کوٹھی سے بلا جرم گرفتار کیا گیا ہے۔یہ ساری شرارت فتح اللہ بیگ خان کی ہے جس نے میری دشمنی میں اور مجھے رسوا کرنے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے کریم خان کو متہم کیا اور میرے خلاف بھی مخبری کی۔مجھے معلوم ہوا ہے کہ فتح اللہ بیگ کہتا پھر رہا ہے کہ میں نے تو سولہ ہزار روپے کی رقم بطور انعام ان لوگوں کے لئے مختص کر رکھی ہے جو نواب شمس الدین احمد خان اور کریم خان کے خلاف گواہی دیں گے۔لیکن جہاں تک میرا معاملہ ہے، تو نواب گورنر جنرل بہادر کو معلوم ہو کہ میں نے اپنے پیارے عم مکرم ولیم فریزر صاحب بہادر کے قاتل کا پتہ لگانے والے کے لئے دو ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا ہے۔صاحب کلاں بہادر مرحوم میرے کرم فرما اور میرے باپ فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان رستم جنگ مغفور کے خاص دوستوں میں تھے۔اس

بات کا سوال ہی نہیں اٹھتا کہ میں انھیں ضرر پہنچانے کے لئے کوئی بھی اقدام کروں۔ چونکہ میری جان، ریاست، اور عزت سب حکومت انگلشیہ کی مرہون احسان ہیں، لہٰذا یہ عریضہ بھیج رہا ہوں کہ حضرت شفقت مآب نواب مستطاب گورنر جنرل بہادر پر میرا سب حال آئینہ ہو جاوے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ان مکتوبات کو گورنر جنرل کے ملاحظے میں آنے کا شرف حاصل ہوا کہ نہیں، لیکن یہ کاغذات، اور اس معاملے میں شمس الدین احمد کی طرف سے گذرانے گئے آئندہ کاغذات بھی دربار کلکتہ کے لاڈپارٹمنٹ (Law Department) میں نہیں بلکہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ (Political Department) میں داخل دفتر کئے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کمپنی نے شروع ہی سے اس معاملے کو قانون و عدالت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔

کریم خان پر قتل فریزر کا مقدمہ چلانے کی تیاریاں تیزی سے ہونے لگیں۔ پنجشنبہ ۳۰ اپریل ۱۸۳۵ کو دہلی کے کوتوال نے سائمن فریزر کی عدالت میں، کہ وہ دہلی کا سٹی مجسٹریٹ تھا، شمس الدین احمد اور کریم خان کے خلاف فرد جرم داخل کر دی۔ شمس الدین احمد خان کے خلاف ابھی ثبوت تو کیا، شہادت بھی ایک نہ تھی، لیکن جان لارنس نے مٹکاف کے سامنے یہ استدلال رکھا کہ کریم خان اور نواب کے درمیان نوکر اور آقا (Master and Servant) کا رشتہ تھا اور قانون انگریزی کے مطابق نوکر کے ہر کام کا ذمہ دار اس کا آقا قرار دیا جاتا ہے۔ لارنس کی دوسری دلیل یہ تھی کہ جب یہ خبر پھیلے گی کہ نواب کے خلاف فرد جرم عائد کی گئی ہے تو کچھ گواہیاں یا نئے سراغ بھی مہیا ہو سکتے ہیں۔ نواب پر برا وقت پڑتے دیکھ کر بہت سے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اور یہ بات ایک حد تک صحیح بھی نکلی۔ مقدمہ قائم ہونے کی خبر پھیلتے ہی ایک آدھ لوگ یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ کریم خان اکیلا تھوڑا ہی مجرم ہے۔ اس کا ساتھی اور نواب کا خاص ہرکارہ انیا بھی تو اس کام میں شریک تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انیا کا نام اس معاملے میں لیا گیا تھا اور جاسوسوں نے یہ خبر حکام فرنگی تک فوراً پہنچا دی۔ لیکن شمس الدین احمد خان کے قریبی لوگوں، یا ان کے طبقے کے افراد، حتیٰ کہ امین الدین احمد خان بہادر کی طرف سے بھی کوئی اشارہ اس امر کا نہ ہوا کہ ہم شمس الدین احمد خان کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہیں۔ لے دے کے ایک میرزا غالب صاحب تھے، لیکن شمس الدین احمد سے ان کی معاندت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ ٹامس بیکن (Thomas Bacon) نے لکھا ہے کہ شہر کے اشرافیہ میں شمس الدین احمد خان کے دوست اور بہی خواہ بہت تھے۔

جان لارنس نے انیا کی تفتیش شروع کی تو پہلی بات اسے یہ معلوم ہوئی کہ گذشتہ دو بار سے ایسا

ہوا تھا کہ کریم خان اور انیا دونوں ساتھ ہی ساتھ دہلی آئے تھے، اور قتل کی رات کے بعد سے انیا کو کسی نے دیکھا نہ تھا۔ کریم خان سے پھر جرح ہوئی کہ وہ اور انیا ساتھ ہی ساتھ دوبار دہلی کیوں آئے تھے۔ لیکن کریم خان نے حسب معمول ایسے جوابات دیئے کہ لارنس کی تشفی نہ ہوئی لیکن جانچ کے آگے بڑھنے کا راستہ بھی نہ مل سکا۔ لارنس اپنی بوٹیاں نوچتا رہ جاتا لیکن کریم خان کی تقدیر اس کے دشمنوں کے آگے آگے چل کر انھیں راستہ دکھا رہی تھی۔ انیا کے بارے میں لارنس کی تفتیش سرسبز ہوتی چلی گئی۔ اس نے ایک جاسوس فیروز پور جھرکہ بھیجا جس نے واپس آ کر خبر دی کہ قتل کے دوسرے دن انیا وہاں آیا تھا لیکن دو ہی دن بعد روپوش ہو گیا اور سنا جاتا ہے کہ اس وقت وہ بریلی میں ہے۔

ادھر مقدمے کی کارروائی اور فرد جرم کی از روے ضابطۂ فوجداری تصدیق و توثیق کے بعد معاملہ اس لائق قرار دیا گیا کہ ملزمان مسمیان کریم خان اور شمس الدین احمد پر قتل عمد کا مقدمہ جج صاحب بہادر سرکٹ کورٹ (Circuit Court) کے روبرو پیش کیا جائے۔ اس زمانے میں سشن عدالت کو سرکٹ کورٹ کہتے تھے۔ بعد میں جب ضلعی انتظام کمپنی بہادر نے اور پھر حکومت ملکۂ عالیۂ برطانیہ نے پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیا تو سرکٹ کورٹ کو سشنز کورٹ (Sessions Court) اور بعد میں ڈسٹرکٹ اینڈ سشنز کورٹ (District and Sessions Court) کہنے لگے۔ سائمن فریزر نے اپنی کارروائی بند کر دی کیونکہ اس سے زیادہ کا وہ بحیثیت مجسٹریٹ مجاز نہ تھا۔ چند دنوں کے اندر اندر ٹامس مٹکاف نے ایک بہت تجربہ کار انگریز مسٹر جان الکزنڈر کالون (John Alexander Colvin) کو اسپیشل جج اور کمشنر مقرر کیا کہ وہ اس مقدمے کی سماعت اور فیصلہ کریں گے۔ یہ مئی ۱۸۳۵ کا پہلا ہفتہ تھا۔

کہا گیا ہے کہ جب مقدمے اور اس کے ممکن انجام کی خبر پھیلی (اور یہ خبر خیر خواہان کمپنی نے شد و مد سے پھیلائی تھی) تو انیا نے اپنے بھائی دھنے خان کو ایک شخص کے ساتھ کر کے جان لارنس کے پاس بھیجا کہ اگر انیا کو وعدہ معاف گواہ بنا دیا جائے تو وہ ساری بات طشت از بام کر دے گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ جان لارنس نے اپنی سعی سے بریلی میں انیا کا پتہ چلایا اور اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کا لالچ ورنہ پھانسی کا خوف دلا کر دہلی بلوا لیا اور لڈلو کاسل کے جیل خانے بھجوا دیا۔ انیا کا اظہار کئی دن تک لکھا گیا اور طرح طرح سے اس سے سوال جواب کیے گئے۔ لیکن اس کے پاس براہ راست اور اوّلی شہادت تو کوئی تھی نہیں۔ نواب اور کریم خان کے مابین دونوں ہی گفتگوؤں میں سے کسی ایک کے بھی وقت وہ موجود نہ تھا۔ اور خود وہ جب فریزر کے قتل کی خبر لے کر فیروز پور جھرکہ میں نواب کے حضور باریاب ہوا تو دونوں میں

کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے نواب کا اس معاملے میں براہ راست ملوث ہونا ثابت ہوسکتا۔ کنویں سے برآمد شدہ خط کے بارے میں اس نے ضرور کہا کہ ہاں یہ روبکار نواب شمس الدین احمد صاحب کی ہے۔ لیکن اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ میں حرف شناس نہیں ہوں، بس یہ ہے کہ میں نواب صاحب کی مہر پہچان سکتا ہوں۔ لیکن اس کاغذ پر کوئی مہر تو تھی نہیں، بندوق کے بارے میں اس کی گواہی اور بھی بیکار تھی کیونکہ وہ یہ نہ بتا سکا کہ قتل کی رات کو کریم خان کے ہاتھ میں کون سی بندوق تھی۔

کریم خان کے خلاف انیا کی یہ شہادت بہر حال وزنی تھی کہ مشکی گھوڑے کے پاؤں میں الٹی نعلیں کریم خان نے اس کے سامنے خود ٹھونکیں تھیں اور پھر وہ دونوں قتل کی مہم پر بیک وقت اور ساتھ ساتھ نکلے تھے۔ اگر چہ اس نے براہ راست کریم خان کو فیر کرتے ہوئے دیکھا نہیں لیکن دونوں میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ قتل کی خبر لے کر انیا فوراً سے پیشتر نواب شمس الدین احمد کے پاس بھاگ کر چلا جائے گا۔ لہٰذا اس نے جب فیر کی آواز سنی اور بعد میں مشکی سوار کو بھاگتے دیکھا تو سمجھ لیا کہ کام ہو گیا ہے۔ مشکی سوار کے بارے میں وہ حلفیہ کہہ رہا تھا کہ وہ کریم خان ہی تھا، اگر چہ اس نے سوار کو دور ہی سے دیکھا تھا اور اس وقت اندھیری رات اور جنگل کی گھنیری کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ مشکی سوار سر سے پاؤں تک سیہ پوش تھا۔

انیا کے انکشافات کی بدولت کریم خان کے خلاف تو مقدمہ مضبوط ہو گیا لیکن اس کے آقا کے خلاف اب بھی کوئی ٹھوس شہادت نہ تھی۔ مٹکاف کی صدارت میں پریسکاٹ، فریزر اور لارنس نے ایک غیر رسمی مشاورت منعقد کی اور فیصلہ کیا کہ مقدمہ اپنی جگہ مکمل سمجھا جائے۔ اب نواب کے خلاف عدالت کو مطمئن کرنا کمپنی بہادر کی طرف سے حاکمان استغاثہ اور وکیل مدعی کا کام ہے۔ لہٰذا نواب کو فوراً حراست میں لے کر اس سے پوری پوچھ گچھ کی جائے۔ ممکن یہ بھی ہے کہ دوران سوالات شمس الدین احمد اپنی معمولہ حماقت یا جہالت کی بنا پر ایسی کوئی بات اگل ہی دے جس سے اس پر جرم مزید ثابت ہو سکتا ہو۔ مشاورت کی متفقہ رائے تھی کہ نواب کو گرفتار کرنے اور اس پر مقدمہ چلانے میں درنگ اب کمپنی کے مفادات کو ضرر رسید کرے گا اور اہل ہند میں غلط فہمیاں پیدا ہوں گی کہ کمپنی بہادر اپنے اتنے بڑے اہل کار کے قاتل کے بر خلاف بالکل بے دست و پا ہے۔

چونکہ ملزم شمس الدین احمد ابھی فیروز پور ہی میں تھا اور وہاں کمپنی کے پولس داروں کا حکم نہ چلتا تھا، اور یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر کمپنی کی جمعیت وکمیدان برائے گرفتاری شمس الدین احمد بھیجے گئے تو مقامی رعیت اور مزارعین باغی ہو کر از روے بلوہ ملازمان کمپنی ہی کو مار دیں یا محبوس کر لیں۔ لہٰذا ۳ مئی ۱۸۳۵ کو ایجنٹ

نواب گورنر جنرل بہادر و کمشنر دہلی کی جانب سے حسب ذیل رقعہ شمس الدین احمد خان کو بھیجا گیا۔

وقیع المراتب و یار خاص گورمنٹ کمپنی انگلشیہ بہادر و دلبند نواب مستطاب سر چارلس متکف گورنر جنرل بہادر دلاور الملک نواب شمس الدین احمد خان بہادر رئیس فیروز پور جھرکہ بعد دعاے عافیت ملاحظہ فرمایند ہرگاہ کہ یک نوکر آں والا جاہ مسمی کریم خان بجرم قتل صاحب کلاں ولیم فریزر صاحب بہادر مرحوم و مغفور و مبرور ماخوذ است و یک نوکر دیگر آں عالی قدر مسمیٰ انیا میواتی ہم در آں معاملہ در معرض شک می باشد و از اظہارات ہر دو نام بردگان عیاں می شود کہ چند امور ضروریہ متعلق بہ آں سانحۂ فاجعہ امکاناً در علم والا مرتبت مشارٌ الیہ می باشند فلہٰذا مودبانہ التماس می کنیم کہ براے امداد و معاونت تفتیش کنندگان و استغاثہ داران معاملۂ ہٰذا بمجرد رسیدن ایں عریضہ مراجعت بہ دہلی بفرمایند فقط والسلام الملتمس اختصاص یار خان طامس تیافلس متکف فیروز جنگ صاحب قائم مقام ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر و مختار امور سرکار دولت مدار کمپنی بہادر و قائم مقام صاحب کمشنر بہادر علاقۂ دار الخلافۂ شاہجہان آباد و دہلی المرقوم در شہر دہلی چہار شنبہ سیوم مئی ۱۸۳۵ عیسوی مطابق پنجم محرم ۱۲۵۱ ہجری ۱۲

(ترجمہ)

وقیع المراتب اور یار خاص گورمنٹ کمپنی انگلشیہ بہادر، و دلبند نواب مستطاب سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل بہادر، دلاور الملک نواب شمس الدین احمد خان بہادر رئیس فیروز پور جھرکہ، بعد دعاے عافیت ملاحظہ فرمائیں۔

ہرگاہ کہ آپ والا جاہ کا ایک نوکر مسمی کریم خان، صاحب کلاں ولیم فریزر مرحوم و مغفور و مبرور کے جرم قتل میں ماخوذ ہے اور آپ عالی قدر کا ایک اور نوکر مسمی انیا میواتی بھی اس معاملے میں معرض شک میں آیا ہے، اور ان دونوں نام بردگان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ امکان ہے کہ اس سانحۂ فاجعہ کے متعلق کچھ ضروری امور آپ والا مرتبت مشارٌ الیہ کے علم میں ہوں۔

لہٰذا مودبانہ التماس ہے کہ یہ خط دیکھتے ہی اس معاملے کے تفتیش کنندگان اور استغاثہ داران کی امداد و معاونت کے لئے دہلی تشریف لے آئیں۔ فقط

والسلام۔

الملتمس، اختصاص یار خان ٹامس تھیافلس مٹکاف، صاحب قائم مقام ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر ومختار امور سرکار دولتمد ار کمپنی بہادر، وصاحب قائم مقام صاحب کمشنر بہادر علاقۂ دارالخلافہ شاجہاں آباد دہلی۔

المرقوم در شہر دہلی، چہار شنبہ سیوم مئی ۱۸۳۵ عیسوی، مطابق پنجم محرم ۱۲۵۱ ہجری، حد۔

کمپنی کے دو معتبر ہرکاروں نے، جو جاسوسی بھی کرتے تھے، یہ مراسلہ ۵ مئی ۱۸۳۵ کو نواب شمس الدین احمد خان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

شش جہت سے اس میں ظالم بوئے خوں کی راہ ہے

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ ہمارے نواب کو بسلسلۂ قتل فریزر دہلی طلب کیا گیا ہے۔ شام تک یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ کمپنی بہادر نے دھمکی دی ہے کہ اگر نواب صاحب جلد از جلد دہلی کی ریزیڈنسی میں حاضر نہ ہوئے تو کمپنی اپنی فوج بھیج کر چڑھائی کر دے گی۔ اس پر کئی من چلوں نے اسلحہ بندی اور شہر کے تحفظ کے اقدامات شروع کر دیئے اور آس پاس کے مزارعین نے شہر میں آ آ کر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ کمپنی کی فوج اگر ہمارے شہر میں آئی تو ہم اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالیں گے۔ پہلے ہماری جان جائے گی پیچھے کمپنی کی فوج ہمارے نواب کو لے جائے گی۔ صبح ہوتے ہوتے اہل کاران ریاست کے علاوہ اطراف کے زمینداروں نے ایک ایک دو دو کر کے قلعۂ فیروز پور میں حاضر ہو کر کمپنی کے خلاف اپنی مقاومت اور جد و جہد کا نواب کو یقین دلایا۔ دیوان ریاست راجہ ملکھان سنگھ نے بار بار عرض کی کہ ہمیں تو اس مراسلے میں کچھ فریب معلوم ہوتا ہے۔ حضور دہلی نہ تشریف لے جائیں، یہیں رہیں۔ ہم کمپنی کی فوج کا منھ پھیر دیں گے۔ کتنی ہی بڑی طاقت کیوں نہ ہو لیکن رعیت سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں۔ ایک جوتشی بھی پیش ہوا جس نے حکم لگایا تھا کہ بہتری اسی میں ہے کہ نواب صاحب دو مہینے تک شہر نہ چھوڑیں۔ ابھی چندرما کو برچھک سے نکلنے میں دو مہینے باقی ہیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن شمس الدین احمد خان نے ایک نہ سنی۔

کمپنی کا مراسلہ پہنچنے پر شمس الدین احمد خان کا پہلا خیال یہی تھا کہ میں ہرگز نہ جاؤں گا، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اپنا خیال بدل دیا۔ چنانچہ حکم جاری ہو گیا کہ ہم ابھی دلی جائیں گے، ہمارا اسباب سفر درست کیا جائے۔ اپنی رعیت و روسا سے بھی نواب نے کہا کہ خطرے یا تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میں جب چاہوں گا واپس آ جاؤں گا انگریز مجھے روک تھوڑا ہی سکتے

ہیں۔ جوتشی کو حکم ہوا کہ حساب لگا کر بتائے کہ اسبھ ساعتوں میں سب سے کم اسبھ کون سی ہے، تا کہ اسی کے مطابق سفر شروع کیا جائے۔ ہر طرح کے غور و فکر اور ظن و تخمین کے بعد جوتشی نے حکم لگایا کہ پرسوں بروز اتوار گیارہ بجے دن کو راہو کالم گذرنے کے بعد ستاروں کی چال ذرا کم مخالفانہ ہوگی۔ لہٰذا نواب اگر جانا ہی چاہیں تو اتوار کو گیارہ اور بارہ بجے دن کے درمیان شہر سے کوچ کر جائیں۔

اگلے دن ۶ مئی کی دوپہر کو ایک عمر رسیدہ سکھ قلعے پر آکر باریابی کا طالب ہوا۔ اس نے اپنا نام اجاگر سنگھ بتایا اور نواب سے ملتمس ہوا کہ میں آپ کے والد ماجد بڑے نواب صاحب کے زمانے میں ان کا خاص ہرکارہ تھا۔ ان کے سرگباش ہونے کے کچھ دن پہلے میں نواب کی ملازمت سے وظیفۂ حسن خدمت لے کر وطن واپس چلا گیا تھا اور آج صبح خبر سن کر گاؤں سے دوڑا چلا آیا ہوں۔

''سرکار کا اقبال بلند رہے۔ میری سانڈنی سوکوس سے ادھر دم لینے والی نہیں۔'' اس نے عرض کی۔ ''عالی جاہ چند مدت کے لئے لباس میرا پہن لیں اور سانڈنی میری پر سوار ہو کر آج ہی رات سکھوں کے ملک کے لئے نکل چلیں۔ میں واہے گورو کی قسم کھا کر کہتا ہوں سرحد پر میری قوم کے لوگ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور پورے عزت آبرو سے آپ کو لاہور کے قلعے میں پہنچا دیں گے۔''

نواب شمس الدین احمد نے اجاگر سنگھ کا شکریہ ادا کیا، اسے دس اشرفیاں انعام دلوائیں اور یہ کہہ کر پورے اعزاز کے ساتھ رخصت کر دیا کہ ہم بھگوڑے بن کر مہاراج دھیراج کے سامنے اور اپنے ہم چشموں، اور اپنی رعایا کی نگاہ میں خفیف ہونا نہیں چاہتے۔ اجاگر نے ہزار کہا کہ مہاراج شیر پنجاب آپ کو بھائی کی طرح رکھیں گے، انگریز کا بیری ان کا دلی دوست ہے۔ لیکن نواب شمس الدین احمد خان نے ایک نہ مانی۔

اگلے دن سنیچر کی دوپہر کا وقت تھا، نواب دار الانشا میں میر منشی کو کچھ ہدایات اور احکام املا کرا رہے تھے کہ چوبدار نے آکر عرض کیا، ''عالی جاہ۔ صبح دولت باریاب ہونا چاہتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے وہ کس لئے آئی ہے۔'' نواب نے کہا۔ ''کہلا دیا جائے کہ ہم ایک دو گھڑی میں یہاں کا کام ختم کر کے اندر آئیں گے اور خاصہ وہیں کھائیں گے۔''

افضل النسا بیگم صاحب کے قطعۂ حویلی میں دسترخوان بچھا ہوا تھا اور کچھ کھانے بھی چنے ہوئے تھے، خادمائیں ادھر ادھر مصروفیت سے آجا رہی تھیں۔ لیکن کھانا کھلائے جانے یا کھانے پر بیٹھنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ افضل النسا بیگم کے وسیع ایوان میں از دیوار تا دیوار کشمیر، ترکی، اور بھدوہی کے قالین

تھے۔ کمرہ نیم تاریک تھا اور اس غرض سے کہ گرمی کا احساس زیادہ نہ ہو، روشنی صرف چار کونوں میں تھی جہاں سفید شیشے کے دو دو مردنگ روشن تھے۔ ان کی دودھیا روشنی اور پائیں باغ کی طرف سے خس کی ٹٹیوں سے چھن کر آنے والی ہلکی سبز روشنی نے کمرے میں انتہائی پرسکون خواب آور ماحول پیدا کر دیا تھا۔ لیکن کمرے میں موجود تینوں عورتوں کے چہرے پر تناؤ اور گھبراہٹ کے سے آثار تھے۔ ایک تخت پر افضل النسا اور ان کی دونوں بچیاں احمد النسا اور شمس النسا چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک بڑی کرسی تھی جس پر حسینی بیگم اور نیچے ان کے پاس قالین پر لیکن نمایاں انداز میں چمپا بی بیٹھی ہوئی تھیں۔ چمپا کی ننھی بچی رحمت النسا اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن بار بار اٹھ کر احمد النسا اور شمس النسا سے کھیلنے اور انھیں چھیڑنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایوان کے دروازوں پر بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔ پیچھے کا دروازہ اور اونچی کھڑکیاں سب پائیں باغ پر کھلتی تھیں ان پر خس کی ٹٹیاں تھیں جن پر باہر سے چھڑکاؤ ہو رہا تھا اور اندر بڑے بڑے پنکھے ہلائے جا رہے تھے۔ دونوں بیگمات بھنڈے سے شوق فرما رہی تھیں۔ نواب کے لئے بھی بھنڈا تازہ کر کے لایا گیا تھا۔

اندرون ایوان میں صبح دولت کے سوا کوئی اصیل حاضری میں نہ تھی۔ نواب کے اندر آنے پر سب نے اٹھ کر تسلیم کی۔ صبح دولت نے سات تسلیمیں کیں۔ بیگمات نے تین تسلیمیں کیں، چمپا نے پانچ، اور بچیوں نے جس طرح بن پڑا ایک ایک دو دو تسلیمیں کیں۔ نواب نے سب کا جواب ایک تسلیم سے اور پھر دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر دیا۔ تسلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ذرا سا جھک کر دایاں ہاتھ زمین پر اس طرح رکھتے تھے کہ ہتھیلی اوپر کی طرف رہتی تھی۔ پھر کمر کو سیدھا کرتے ہوئے ہاتھ کو اٹھا کر سر پر رکھتے تھے۔ منھ سے کچھ بولنا ممنوع تھا۔ تسلیم کے برعکس، کہ اس کا رواج عام تھا، کورنش صرف بادشاہ کے لئے مخصوص تھی، یعنی کوئی اور کورنش کا حقدار نہ سمجھا جاتا تھا۔ کورنش ہمارے آج کل کے سلام سے مشابہ تھی، یعنی دائیں ہتھیلی کو پیشانی پر رکھتے تھے، پھر سر کو جھکا لیتے تھے۔

نواب نے سر جھکائے ہوئے آگے قدم بڑھایا اور افضل النسا بیگم کے سامنے بڑی چوکی پر بیٹھ گئے، اس طرح کہ ان کا رخ حسینی بیگم اور چمپا کی بھی طرف تھا۔ رحمت النسا نواب کو دیکھتے ہی ہمک کر ان کے پاس آگئی۔ شمس النسا بھی تسلیمیں کرتی ہوئی آ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ نواب نے دونوں کو پیار کیا اور ان کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اور ان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر بولے:

”صاحب یہ عدالت عالیہ کیوں منعقد کی گئی ہے؟ بھئی واللہ کیا ہم آپ سب کے مجرم ہیں؟

اور یہ بی احمد النسا کیوں الگ تھلگ بیٹھی ہیں۔ کیا اپنے بلاول پاس نہ آویں گی؟"

عام بیگمات کے بالکل برخلاف افضل النسا بیگم اپنے شوہر کو نواب صاحب یا میرزا صاحب وغیرہ کے برعکس دلاور الملک کہتی تھیں۔ بیٹی احمد النسا نے بھی اپنی ماں کی دیکھا دیکھی شمس الدین احمد کو دلاور الملک کہنا شروع کر دیا لیکن اس کی توتلی زبان سے "بلاول" ہی نکلتا تھا اور وہ اپنے باپ کو مستقلاً اسی نام سے پکارنے لگی تھی۔ اس وقت اس کی عمر ٹھیک پانچ سال کی تھی، شمس النسا اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی تھی اور رحمت النسا کوئی ڈھائی سال کی تھی۔ افضل النسا بیگم نے احمد النسا کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر اس کی اوڑھنی ٹھیک کرتے ہوئے کہا:

"ارے اب تو جاوتی کیوں نیں بلاول پاس۔ ابھی تک تو ٹھنک رہی تھی کہ بلاول آئے کیوں نہیں کہاں رہ گئے۔"

احمد النسا شرمائی شرمائی سی اٹھی اور نواب کو دوبارہ تسلیم کرتی ہوئی ان کی صندلی کے دوسرے پائے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ نواب نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ اٹھایا تو یہ دیکھ کر ان کے دل پر گھونسہ سا لگا کہ اس کی بڑی بڑی کریلیوں جیسی روشن سبز آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ انھوں نے جھک کر اس کی آنکھیں چوم لیں اور اسے زمین سے اٹھا کر گلے سے لگاتے ہوئے بولے:

"ہاں وہاں بھئی واللہ جانی بیگم۔ ایں چہ اسرار است۔ چشمان قرۃ عینی نم دیدہ اند۔ خدانہ کردہ رنجوری باشد۔ آیا شما حکیم را طلب کردید؟"

(ارے ارے بھئی واللہ جانی بیگم، یہ کیا اسرار ہے؟ میری قرۃ العین کی آنکھیں نم ہیں۔ خدانہ خواستہ بیمار تو نہیں؟ کیا آپ نے حکیم کو طلب کیا؟)

"دلاور الملک، صاحب زادی شما ہرگز رنجور نیست۔" (دلاور الملک، آپ کی صاحب زادی بالکل بیمار نہیں ہیں۔) نواب سے وہ زیادہ تر فارسی میں گفتگو کرتی تھیں۔ نواب ہندی میں جواب دیتے، لیکن کبھی کبھی ذہنی یا اعصابی کشاکش یا دباؤ کے باعث خود ہی فارسی میں گفتگو کا آغاز کرتے۔ "صاحب زادی غمین است کہ شما دریں زمان نا مساعد اورا پس گذاشتہ و مجبور ساختہ رہگرائے دہلی می شوید۔" (صاحب زادی رنجیدہ ہیں کہ آپ ان نا مساعد حالات میں انھیں پیچھے چھوڑ کر اور انھیں مجبور کر کے دہلی کی راہ لے رہے ہیں۔"

شمس الدین احمد ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئے۔ انھیں حالات کی سنگینی کا احساس تھا، لیکن نہ

اس قدر۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ شمس الدین احمد بڑی بیٹی کو کاندھے سے لگائے ہوئے اس کی پیٹھ ہلکے ہلکے تھپتھپاتے رہے۔ تینوں عورتوں کی آنکھیں ان پر لگی ہوئی تھیں اور شمس النسا اور رحمت النسا بھی بالکل چپ تھیں، گویا انھیں بھی ماحول کے تناؤ کا احساس ہو گیا تھا۔

"جانی بیگم۔ غور سے سنئے۔ اور امیر بہو، آپ بھی توجہ فرمائیں... چھپا بی تم بھی موجود ہو تو بہت خوب، تم بھی سنتی رہو۔ کام کی بات ہے۔" شمس الدین احمد نے اپنے شانے برابر کئے، احمد النسا کو کاندھے سے ہٹا کر گود میں بٹھایا اور بولے۔

"میں سپاہی ہوں۔ سپاہی کا قدم آگے نہ بڑھے تو واجب القطع ہے... میں اپنی مرضی سے جا رہا ہوں اپنی مرضی سے آؤں گا۔ لیکن اگر نہ آسکوں تو خدا سب کا مالک ہے۔"

چھپا سر جھکائے سنتی رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا پوچھے، سپاہی اپنی عزت کا نگہبان ہے لیکن سپاہی کے ناموس کا نگہبان کون ہوگا؟ لیکن وہ جانتی تھی کہ میرا منصب صرف سننا اور عمل کرنا ہے، سمجھنا بھی ضروری نہیں۔

"جی سرکار۔" اس نے سر جھکائے جھکائے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ لیکن شمس الدین احمد اپنی بیگموں سے کچھ زیادہ کی توقع رکھتے تھے۔ انھوں نے دونوں کو بیک نگاہ دیکھا اور کہا:

"بھئی واللہ آپ لوگ فہم و ذکا زیادہ رکھتی ہیں۔ کچھ اپنی زبان معجز بیان سے ارشاد کریں۔"

امیر بہو کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت برہم ہیں اور انھیں یہ بات اچھی نہیں لگی ہے کہ نواب نے فیصلہ کر بھی لیا اور اب ہماری زبان سے وہی فیصلہ سننا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ایک دو ثانیہ اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن جب بولیں تو آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"سپاہی کی دنیا اس کی تلوار کی نوک تک ہے۔ ہم پردے والیوں کی دنیا ہے ہی نہیں۔ صرف راہیں ہیں۔ اور پردہ رکھنے والا نہ ہو تو ہر راہ بند ہو کر گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ آپ ہمیں گھٹ گھٹ کر مرنے کے لئے چھوڑے جا رہے ہیں۔"

امیر بہو بوٹا سے قد، چھریرے بدن اور چمپئی رنگت کی بی بی تھیں۔ ان کے چہرے پر دلکشی اس قدر تھی کہ بالکل ہرن کا بچہ معلوم ہوتی تھیں کہ بس ہاتھ سے چھو لو اور دیکھے جاؤ۔ ان کا سینہ اور کولھے اتنے بھرے بھرے تھے اور سارا بدن اس قدر متناسب تھا کہ گرمی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں بھی بدن کی بوٹی

بوٹی سے جوانی اگلی پڑتی تھی۔ لیکن مزاج کی وہ بہت تیز تھیں، شاید غرور حسن کی وجہ سے ہو۔ بہر حال انھوں نے جو بات کہی وہ دوسرے امرا کی بیگمات بھی کبھی محسوس تو کرتی ہوں گی لیکن اسے ادا کرنے کے لئے معمولی سے کچھ زیادہ جرأت درکار تھی۔ نواب شمس الدین احمد خان کے چہرے پر ناخوشی کے بادل آئے لیکن انھوں نے ایک لحہ توقف کر کے ملائم لیکن سرد آواز میں کہا:

''ہم سب اسی آسمانی شطرنج کے مہرے ہیں۔ کوئی فیل بنتا ہے، کوئی اسپ، کوئی پیادہ۔ اور شطرنجی کا کچھ پتہ نہیں کہ اس کے جی میں کیا ہے۔ جب وقت آتا ہے تو سب کو انجام اپنا قبول کرنا پڑتا ہے۔''

کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔ احمد النسا نے باپ کی طرف دیکھا، چاہا کچھ پوچھے، لیکن اس کا ہیاؤ نہ کھلا۔ شمس الدین احمد نے محسوس کیا کہ بچہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

''احمدی بیگم آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔'' انھوں نے کہا۔

باپ کی توجہ اپنی طرف دیکھ کر احمد النسا اور بھی شرما گئی اور ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر بولی:

''جی... کچھ نہیں میں تو کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھی... لیکن...''

''ہاں کہیئے کہیئے، لیکن کیا؟''

''جی وہ... وہ تو کچھ نہیں... لیکن آپ تو کہتے ہیں شطرنج بری چیز ہے؟''

''جی ہاں۔ جسے شطرنج کی لت پڑ جائے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔''

''تو پھر ہم آپ کسی شطرنج کے مہرے کیوں ہیں بلاول؟''

شمس الدین احمد کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ آئی۔ انھوں نے ہنسنے کی کوشش کی، لیکن خود انھیں ہی اپنی کوشش کھوکھلی معلوم ہوئی۔

''جوگی کا بچہ سانپ سے کھیلتا ہے۔ ہم سپاہی بچے ہیں موت سے کھیلتے ہیں۔ آپ ہمارے بچے ہیں۔ شاہ و شہریار کے بچوں کی کشتی حیات دم بدم طوفانی رہتی ہے۔''

احمد النسا کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ ابھی وہ کچھ اور کہنے کی کوشش میں تھی کہ افضل النسا بیگم بول پڑیں:

''کشتی اے کہ ناخداش سپاہی بچگان چوں شما ہستند بے شک لطمۂ تلاطم ہاے طوفاں می خواہد خورد۔''

(جس کشتی کے ناخدا آپ سے سپاہی بچے ہوں وہ طوفان کے ہچکولوں کے طمانچے تو کھائے گی ہی۔)

شمس الدین احمد کے چہرے پر خفگی کے آثار صاف نمایاں ہوئے۔ لیکن انھوں نے پست آواز میں کہا:

''آپ نے شاید معاملے کو ٹھیک سے خاطر نشیں نہیں کیا۔ میں کہیں اور چلا جاؤں تو بھی آپ رحم و کرم پر فرنگی کے رہیں گی۔ سارے ہندوستان جنت نشان پر شیطان کا سایہ ہے۔ میں جہاں جاؤں گا یہ سایہ مجھ پر مسلط رہے گا۔ اگر میں یہیں رہا تو لٹیرے فرنگیان آج نہیں تو کل چڑھ دوڑیں گے۔ لوہارو تو وہ لے ہی چکے ہیں۔ فیروز پور مقابلہ ان کا کرے گا... مگر تا بہ کے؟ ایک دن سپر ڈالنی ہوگی۔ اس دن میں نہ ہوں گا۔ پھر وہ سلوک بھی آپ لوگوں کے ساتھ نہ ہوگا جو ٹیپو شہید کے گھر والوں کے ساتھ ہوا۔''

افضل النسا بیگم سے کچھ جواب بن نہ پڑتا تھا، لیکن امیر بہو نے کچھ الزامی لہجے میں کہا:

''وہاں جانے پر انجام آپ کا کیا ہوگا۔ یہ بھی آپ نے کچھ خیال فرمایا؟''

''مجھے توقع ہے کہ میرا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ لوگوں کے لئے مناسب انتظام کیے جاتا ہوں۔''

''خدانخواستہ خدانخواستہ آپ نہ ہوئے تو انتظام ہمارے کس کام کا؟''

ابھی شمس الدین احمد نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ چمپا نے جھک کر افضل النسا بیگم سے کچھ اشارے اور کچھ سرگوشی میں کوئی بات کہی۔ افضل النسا نے بات سن کر ذرا ملتجیانہ لہجے میں کہا:

''سرکار۔ آں مہاراجہ رنجیت سنگھ...''

''یہ خیال دل سے نکال دیں جانی بیگم۔'' شمس الدین احمد نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کسی کا احسان قبول کروں اور آپ لوگوں کو یہاں چھوڑ جاؤں، بھلا یہ غیر ممکن نہیں تو کیا ہے۔ اور ہم راجپوت یا پٹھان تو ہیں نہیں کہ زن بچہ کو تہ تیغ کر کے سر سے کفن باندھ لیں۔ اور آپ یہ بھی تو خیال کریں کہ رنجیت سنگھ ہی کا راج کے روز کا ہے۔ سکھوں کے بھی خون سے فرنگی کے پنجے اور دانت رنگین ہو کر رہیں گے۔''

افضل النسا بیگم کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ بہے۔ ننھی شمس النسا نے دوڑ کر اپنی اوڑھنی سے ان کے آنسو خشک کیے اور انھیں یوں چمکارنے لگی گویا وہ اس کی ماں نہیں پیاری گڑیا ہوں۔

بوجھل سے ایک وقفے کے بعد شمس الدین احمد نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولے:

''اور امیر بہو سب اپنی زندگی جیتے ہیں اور اپنی موت مرتے ہیں۔ کوئی کسی اور کے لئے مرتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی فرمان ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ نہیں اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجھ کسی دوسرے کا۔ آپ امید اچھی اور خیال اچھا رکھئے۔ خاطر مضبوط اور دل توانا رکھئے... کل کا انتظام نہ ہوگا تو کچھ نہ ہو سکے گا۔''

شمس الدین احمد نے تالی بجائی۔ چوبدار اندر آیا تو انھوں نے کہا:

''خزانچی جی سے تھیلیاں لے آؤ۔''

چشم زدن میں کئی بدرے ایک بڑی سینی پر رکھے ہوئے لائے گئے۔ شمس الدین احمد نے کہا:

''امیر بہو۔ آپ کا مہر مبلغ ڈھائی سو اشرفی بندھا تھا۔ ایک تہائی اس کا معجّل تھا جو میں نے فوراً ادا کر دیا تھا۔ کہیئے ٹھیک ہے؟''

امیر بہو کی ساری تیزی رخصت ہو چکی تھی۔ انھوں نے رندھے ہوئے گلے اور پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا، ''جی بالکل ٹھیک ہے۔''

''میں معجّل کی رقم دوبارہ ملا کر یہ ڈھائی سو اشرفیاں آپ کا پورا مہر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔'' نواب نے کہا۔

اب امیر بہو کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جنھیں خشک کرنے کی بھی ان میں تاب نہ تھی۔

''سرکار میں نے معاف کیا۔ پورا مہر معاف کیا۔''

''آپ کے معاف کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ معاف کر بھی نہیں سکتیں۔ آیئے قبول کیجئے۔''

یہ کہہ کر شمس الدین احمد سرو قد کھڑے ہو گئے۔ سینی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر انھوں نے ہاتھ آگے بڑھائے، گویا نذر پیش کر رہے ہوں۔ امیر بہو نے دوپٹہ سر پر رکھا، پھر سر جھکائے ہوئے آگے آئیں اور شوہر کو تسلیم کر کے سینی قبول کر لی۔ شمس الدین احمد نے دایاں ہاتھ امیر بہو کے سر پر رکھا اور انھیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ بدن سمٹائے ہوئے بیٹھ گئیں لیکن اب وہ آہستہ آہستہ سسکیاں بھی لے رہی تھیں۔

''امیر بہو خدا پر بھروسا رکھئے۔ دل چھوٹا نہ کیجئے۔ ابھی کچھ نہیں گیا۔ میں جو بھی کر رہا ہوں

صرف مومنانہ احتیاط کے پیش نظر کر رہا ہوں۔ میں نے کچھ مکانات آپ کے نام کر دیے ہیں۔ قبالے ان کے آپ کو آج کل میں مل جائیں گے۔"

امیر بہو نے اب زار زار رونا شروع کر دیا تھا۔ لیکن شمس الدین احمد نے ان سے مزید کچھ کہنا غیر مناسب جانا اور افضل النسا بیگم کی طرف رخ کر کے بولے:

"جانی بیگم آپ کا مہر ڈھائی لاکھ روپے شاہ عالمی تھا۔ وہ میں نے تا ہنوز ادا نہیں کیا۔ لیکن خلد آشیانی نے ڈھائی لاکھ روپے جو کمپنی فرنگی کو استمراراً پانچ فی صدی پر قرض دیے تھے، بوقت نکاح قرار پایا تھا کہ وہ تمسک مہری آپ کی خدمت میں بعوض دین مہر پیش کر دیا جائے گا۔ تا حال وہ آپ کے ہاتھ میں دیا نہ گیا تھا لیکن وہ میرے قبضے میں بھی نہیں ہے، خزانہ ریاست میں آپ کے نام سے مخزون و محفوظ ہے۔"

افضل النسا بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن نواب نے ہاتھ اٹھا کر انھیں روک دیا اور کہا:

"خطا معاف، لیکن بات میری ابھی پوری نہیں ہوئی، وہ آپ پہلے سن لیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ تمسک قرضۂ کمپنی جو خزانے میں آپ کے نام سے موجود ہے، اس پر میں نے گواہان و مختار عدالت کی موجودگی میں دوبارہ مہر کر کے آپ کے نام سے استمراراً منتقل کر دیا ہے۔"

نواب نے تالی بجائی۔ چوبدار حاضر ہوا تو انھوں نے حکم دیا کہ خزانچی جی سے عرض کرو کہ قرضۂ کمپنی کا تمسک مہری لے کر بیگم صاحب کلاں کی خدمت میں پیش ہوں۔ پل مارنے کی دیر تھی کہ لالہ پراگ نرائن خزانچی بستہ سنبھالے ہوئے حاضر ہوئے۔ شمس الدین احمد نے سربہ مہر تھیلی ان کے ہاتھ سے لے کر مہر توڑی اور کاغذ نکال کر اٹھے، پھر آگے بڑھ کر انھوں نے افضل النسا بیگم کے قدموں میں وہ کاغذ رکھ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے:

"افضل النسا بیگم، یہ دین مہر قبول فرما کر مجھے سرخ رو کریں۔" اچانک ان کی آواز میں ہلکی سی سسکی کا شائبہ ابھر آیا۔ "حیف صد حیف کہ میں اس سے زیادہ کا اہل نہ ہو سکا۔"

افضل النسا بیگم نے اپنی آنکھیں خشک کیں، جھک کر کاغذ اٹھایا اور پھر نواب کا ہاتھ پکڑ کر بولیں:

"للہ نواب صاحب ایں کنیز بے چارہ را مزید شرمسار نکنید۔"

عام حالات میں یہ ناممکن تھا کہ افضل النسا بیگم سب کے سامنے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیتیں۔ لیکن آج کے دن کسی کو اپنے الفاظ و جذبات پر قابو نہ تھا۔ پھوٹ پڑنے سے یہی بہتر تھا کہ الفاظ اور

آنسوؤں کے بجائے حرکات وسکنات پر اعتماد کیا جائے۔ نواب ایک لحظے کے لئے تو سناٹے میں آ گئے کہ بیگم نے یوں ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، لیکن انھیں پھر اس بات میں پنہاں رمز کا احساس ہو گیا۔ پھر انھوں نے بہت محبت اور شفقت سے، گویا وہ شوہر نہیں کوئی خدا رسیدہ بزرگ ہوں، افضل النسا بیگم کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے:

''اللہ سب کا حامی و ناصر ہے۔ اللہ کی پناہ سے بڑھ کر کوئی پناہ نہیں۔''

اس فقرے میں اشارہ یہ تھا کہ آپ میری پناہ میں نہ رہیں گی تو کچھ باک نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ آپ کو حاصل ہے اور حاصل رہے گی۔

''دونوں بیٹیوں کے لئے بھی سارا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ خزانچی جی آپ کو سمجھا دیں گے۔'' نواب نے گذشتہ بات کا سلسلہ پھر آغاز کیا۔ ''اور اگر حویلی تصرف میں چھوٹے بھائیوں کے آ گئی تو یقین ہے کہ آپ دونوں یہاں جمعیت خاطر سے رہ سکیں گی۔'' انھوں نے امیر بہو اور افضل النسا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اور کچھ نہیں تو کرایہ ادا کر کے آپ یہاں رہ سکیں گی۔'' ان کی چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ دونوں بیگمیں دوپٹے سے سروں کو ڈھانکے نظر جھکائے چپ کھڑی تھیں۔ چھپا کا جی چاہتا تھا چیخ کر روئے لیکن بیگمات کے ہوتے اسے رونے کا بھی حق نہ تھا۔ وہ حسرت بھری ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے نواب کو تک رہی تھی۔

''اور چھپا بی۔'' شمس الدین احمد نے کہا۔ چھپا یوں چونک پڑی گویا کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔

''جی سرکار۔''

''تمھارا انتظام ہم نے دلی چاندنی چوک والے گھر میں کہلا دیا ہے۔ تم جب تک چاہو وہاں رہ سکتی ہو۔ چاہو تو اپنا چوکا برتن الگ کر لینا۔ بندوبست اس کا بھی ہم نے کر دیا ہے... اری رحمت النسا آج تو اپنے ناب شاب سے کچھ انعام نہیں لے گی کیا؟'' شمس الدین احمد نے مڑ کر رحمت النسا کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا لیا۔ ''اچھا تو کچھ بھی نہ کہے گی تو بھی ہم انعام دیئے دیتے ہیں۔ پر یہ تیری اماں کو ملے گا، تیرے نام سے۔''

یہ کہہ کر انھوں نے چھپا کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا۔ چھپا آگے آئی لیکن اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ آنسو اور سسکیاں پینے کی کوشش سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جوں توں کر کے وہ نواب کے پاس آئی اور دوبارہ جھک کر تسلیم بجا لا کر اس نے رحمت النسا کو نواب کی آغوش سے لے لینا چاہا۔ وہ بولی:

''سرکار کے قدموں پر واری جائے چھوکری مجھے دے دیں۔ سرکار تھک گئے ہوں گے۔'' وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب اس کے آنسو تھم نہ سکے۔ اس نے دوپٹے سے سر پوری طرح ڈھانک کر سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ شمس الدین احمد نے رحمت النسا کو گود سے نہ اتارا اور مصنوعی طور چمپا کو ڈانٹنے کے لہجے میں کہا: ''بس کرو... یہ رونا دھونا۔ ہم کوئی مرے تھوڑی جاتے ہیں۔'' پھر انھوں نے مڑ کر لالہ پراگ نرائن کو حکم دیا۔

''خزانچی جی۔ چمپا بی کی تھیلی ان کی خدمت میں پیش کر دی جائے۔''

خزانچی نے پردہ ہٹا کر خزانے کے چوبدار کو جھانکا اور اسے اشارہ کیا کہ اندر آجا۔ چوبدار مضبوط لال کپڑے کی بنی ہوئی دس تھیلیاں اٹھائے اندر آیا اور نواب کو سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ خزانچی نے پانچ پانچ تھیلیاں کر کے دو بار میں پورے روپئے چمپا کو دے دیئے۔ چمپا نے آنچل پھیلا کر تھیلیوں کو لینا چاہا تھا لیکن نواب نے کہا، ''نہیں، یوں نہیں۔ کوئی ماما بلائی جائے۔ وہ ان تھیلیوں کو چمپا بی کے حجرے میں پہنچائے گی۔''

چمپا نے کچھ کہنا چاہا، لیکن شمس الدین احمد نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے سب سے مخاطب ہو کر کہا:

''آپ سب کو اللہ کی امان میں دیتا ہوں۔ میرے لئے دعا کرتی رہیئے گا۔ یہ نہ بھولئے گا کہ ہم کوئی سانپ بچھو نہیں ہیں کہ بلوں میں چھپتے رہیں اور موقع پا کے ڈس لیں۔ ہم امت اس نبی کی ہیں خوف جان کے وقت بھی پائے استقلال کو اس کے لرزش نہ ہوئی۔ ہم اگر ڈر کر بیدین فرنگیوں سے چھپ گئے تو آخرت اپنے آقا کو کیا منھ دکھائیں گے... اور آپ دیکھ لیجئے گا میرا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ آخر میں والی فیروز پور جھر کہ ہوں۔''

پھر نواب نے سب بچوں کو باری باری سے پیار کیا، گلے سے لگایا، دونوں بیگمات اور چمپا کو الگ الگ تسلیم کہی۔ افضل النسا اور پھر امیر بہو نے جلد جلد امام ضامن نواب کے بازو پر باندھے۔ پھر افضل النسا نے نواب کے سر سے پانی کا کٹورا وار کے پانی کا گھونٹ پیا اور سسک سسک کر ہندی میں بولیں:

''جیسے پیٹھ دکھاتے ہیں ویسے ہی منھ بھی دکھایئے گا۔ آپ کو امام ضامن کی پناہ میں دیا۔''

پھر انھوں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''ہزار جان گرامی فدائے ہر قدمت۔ دعا می کنیم از خدا کہ اقبال شما بہر قدم افزوں تر می شود۔

آمین یارب العلمین بجاہ سید المرسلین۔''

حاضرین نے بہ آواز بلند آمین کہی اور بڑھ بڑھ کر جو دعا بن پڑی، پڑھ پڑھ کر نواب پر دم کی۔ پھر ادھر نواب کی پیٹھ پھری اور ادھر افضل النسا بیگم غش کھا کر گریں۔ امیر بہو نے ہچکیاں لے لے کر دعائیں مانگنی شروع کیں۔ پھر بچوں کے رونے کی آوازیں بلند ہوئیں اور بالآخر چمپا کے رونے کی آواز بھی ان دعاؤں میں شامل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد چھٹویں کی مجلسوں، نوحہ خوانوں اور روضہ خوانوں کی بھی آوازیں حویلی کے امام باڑے اور شہر کے کوچہ و برزن سے اٹھیں اور شام کے دھندلے جنگل میں کھوئے ہوئے مسافروں کی پکار کی طرح دھیرے دھیرے پھیلتی ہوئی آسمانوں میں تحلیل ہوگئیں۔

حیف حلق تشنۂ جو تھا نبی کا بوسہ گاہ
تس گلے اوپر چلایا شمر خنجر یا امام
ہے دوست...
در حضور تو گئے مارے ز جور کوفیاں
دو پسر تیرے علی اکبر و اصغر یا امام
ہے دوست...
ز آتش غم جل کے خاکستر ہوا ہے آسماں
کوکب و انجم ہوئے مانند اخگر یا امام

اگلی صبح کی لو پھوٹتے ہی قاسم بن حسین کی مہندی اور ان کی بیوہ کے نوحوں نے گرم طلوع ہوتے ہوئے سورج کے منھ پر طمانچے مارے اور مغرب سے اٹھتی ہوئی ہواؤں کی سرسراہٹ سسکیوں میں بدل گئی۔ نوحہ خواں پردہ دارنیاں جن کے گھروں کی کھڑکیاں ملی ہوئی تھیں، ایک ایک دو دو کر کے ایک بیوہ بزرگ سیدانی کے گھر جمع ہوئیں اور تھوڑی دیر میں اس گھر کا آنگن اور آسمان درد بھری آوازوں کی بجھی بجھی گونج سے بھر گیا۔

رن سے چلے آؤ منھ مجھ کو دکھاؤ
صاحب مرے بچپن کے رنڈاپے کو نبھاؤ
میکے کی ہے اب آس نہ سسرال کا گھر پاس
کس جائے رہوں میرا ٹھکانا تو بتاؤ

شام ڈھلے فیروز پور کے امام باڑے میں مردانہ مجلس کے بعد نوحہ خوانیاں ہوئیں ۔

آں دم عروس ہے ہے رورو کہے زناں سوں
جاتے ہیں واہ ویلا تنہا ستم گراں سوں
ملنا جو پھر کہاں ہے واحسرتا جہاں سوں
کر کے چلے اندھارا دن کو چو شام قاسم
ہے دوست...
تجھ درد تجھ الم سوں رووّیں تمام عالم
ہم طائر و بہائم ہم جنیان دائم
گفتہ سعید کوئی خالی نہیں ز ماتم
واحسرتا دریغا ہے ہے مدام قاسم
ہے دوست ... ہے دوست ...
حسین حسین واحسینا...واحسینا...

مجلس تمام ہونے کے بعد لڑکوں، نوجوانوں، اور متعدد بوڑھوں نے جلوس کی شکل بنالی اور نوحہ پڑھتے ہوئے بازاروں کے لمبے راستوں سے ہو کر شہر کے باہر کی کربلا تک گئے۔ کچھ دیر وہاں نوحہ خوانی کے بعد جلوس ایک مختلف راستہ اختیار کر کے شہر کی جامع مسجد تک گیا اور جامع مسجد کے سامنے میدان میں تا دیر نوحہ خوانی کے بعد آہستہ آہستہ منتشر ہوا۔

قاسم کی شادی اس دن رچائی
جس دن کہ شہ کو کچھ بن نہ آئی

شام تک سارے فیروز پور جھرکہ کے بازار قرق ہو گئے، ایسا لگتا تھا ساری آبادی نے بن باس لے لیا ہے۔

قدم شریف

سہ شنبہ ۵ مئی ۱۸۳۵ مطابق ہفتم ماہ محرم ۱۲۵۱ ہجری نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صبح گیارہ بجے دن کو نواب شمس الدین احمد خان نے دہلی کے لئے کوچ کیا۔ شہر کے باہر بھی دور دور تک جو گاؤں اثنائے راہ میں تھے ان کے نواح سے مہندی کے بین بلند و پست سنائی دیتے رہے۔ دس مسلح سوار اور چھ برچھیت ان کے ساتھ تھے۔ وہ خود پالکی پر تھے اور پالکی کے بارہ کہاروں کے سوا کوئی اور نوکران کے ساتھ نہ تھا۔ ان کی سواری جس بڑی آبادی سے گذرتی وہاں کے عمائد و روٗسا اور وضیع و شریف ان کے استقبال کو آبادی سے باہر مجتمع ہو کر شربت اور پان کی تواضع کے بعد سلام و دعا کے ساتھ انھیں رخصت کرتے۔ انھوں نے اپنا سفر نہ بہت عجلت میں طے کیا اور نہ ہی کسی تعویق یا کسالت کو راہ میں مداخل ہونے دیا۔ ۷ مئی ۱۸۳۵ کو ظہر کے بعد وہ پالم گاؤں پہنچے اور گاؤں کے پرانے قلعے میں اترے جہاں ان کے استقبال اور آرام کا انتظام پہلے سے موجود تھا۔ دو سواروں کو انھوں نے دہلی بھیجا کہ جا کر ٹامس مٹکاف صاحب بہادر کو نواب کی آمد سے مطلع کردیں۔ لڈلو کاسل میں سواروں کی باریابی مغرب کے بعد ہوئی۔ ان سے کہا گیا کہ دریا گنج والی حویلی میں ٹھہریں اور احکام کے منتظر رہیں۔

نواب کے منزل بہ منزل سفر کی اطلاع تو انگریزوں کو مل ہی رہی تھی۔ ان کے استقبال اور ہندوستان میں ان کی مقبولیت پر مٹکاف اور فریزر دانت پیس کر رہ جاتے تھے، لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔ ویسے انھیں کرنا ہی کیا تھا، ان کا شکار خود ہی اور اپنی مرضی سے جال میں پھنسنے کے لئے چلا آرہا تھا۔ شمس الدین احمد کو مزید مطمئن رکھنے کی غرض سے میرزا مغل بیگ خان کو بھی رہا کر دیا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی کہ شمس الدین احمد اب پالم پہنچ گیا ہے، مٹکاف نے فریزر اور لارنس کو لڈلو کاسل بلوا کر مشورہ شروع کیا۔ سب سے پہلی بات لارنس نے کہی اور وہ یہ کہ لفٹنٹ کرنل جیمس اسکنر (مقبول نام سکندر صاحب) کو بھی مشاورت

میں شریک کر لیا جائے۔ اسکنر اگرچہ خالص خون کا نہ تھا لیکن اس میں کئی اوصاف تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ آدھا ہندوستانی ہونے اور ہندیوں میں گھلے ملے ہونے کی وجہ سے وہ ہندیوں، خاص کر ہندی مسلمانوں کے مزاج سے خوب واقف تھا۔

دوسری بات یہ کہ نواب احمد بخش خان کا دوست قدیم ہونے کی وجہ سے وہ شمس الدین احمد سے بھی نہایت اچھی معرفی رکھتا تھا۔ اسکنر اپنی ذاتی فوج Skinner's Horse (ہندیوں کی زبان میں 'سکندر صاحب کے سوار') کے اچھے انتظام اور بہادری اور انگریزوں سے وفاداری کے باعث حکام کمپنی میں رسوخ رکھتا تھا لیکن اتنا نہیں کہ سماجی اور جنگی طور پر وہ فرنگیوں کے برابر قرار دیا جائے۔ اپنی فوج میں اس نے لفٹننٹ کرنل کا عہدہ اختیار کر رکھا تھا لیکن انگریزی فوج میں اسے بمشکل کارگذار کپتان (Acting Captain) کا درجہ حاصل تھا اور وہ بھی اس نے بہت تگ و دو کے بعد حاصل کیا تھا۔ اسکنر کے خیال میں وہ بھی بڑی چیز تھی کیونکہ اس زمانے میں کسی غیر خالص نسل والے فرنگی، چہ جائے کہ ہندی کو کمپنی کی فوج میں کوئی بھی عہدہ نہ ملتا تھا۔ کمپنی کی فوج میں کٹنے مرنے والے سب ہندی تھے۔ بہر حال، اس وقت یہ فیصلہ بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ ایک دوغلے افسر کو صاحبان فرنگیان کو دہلی کی سب سے بڑی اور خفیہ مشاورت میں شریک کیا جائے۔ وقت نے ثابت کیا کہ یہ فیصلہ انگریزوں کے لئے بہت سازگار اور نتیجہ خیز نکلا۔

اسکنر کی وسیع و عریض کوٹھی ریزیڈنسی کے بالکل قریب تھی لہٰذا وہ ایک گھڑی سے بھی کم عرصے میں مٹکاف کے دفتر خانے پر پہنچ گیا جہاں مجلس مشاورت منعقد تھی۔ اسکنر کی عمر اس وقت ساٹھ سے متجاوز تھی لیکن وہ کشیدہ قامت، کسرتی بدن کا اور پھرتیلا شخص تھا اور اپنی عمر سے کم لگتا تھا۔ رنگ اس کا سیاہ تھا، بال گھنے گھونگھر والے جو اب کھچڑی ہو چکے تھے اور آنکھیں کرنجی تھیں۔ سیاہ رنگ کے علاوہ اس کی چال ڈھال، انداز نشست و برخاست سب بالکل انگریزوں جیسے تھے۔ ایوان مجلس میں داخل ہوتے ہی اسے مٹکاف نے بڑی آؤ بھگت کے ساتھ اپنے قریب ہی بٹھایا۔ اس وقت گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ شمس الدین احمد کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جائے یا اسے شہر دہلی میں کہیں کسی محفوظ حویلی میں خانہ قید رکھا جائے۔ مٹکاف کا خیال تھا کہ نواب کی گرفتاری سے دہلی کی رعایا میں شورش اور بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اسے خانہ قید ہی رکھنا چاہیے اور مقدمے کی کارروائی جلد مکمل کرا کے مجرموں کو فوراً پھانسی دے دی جائے۔ اور پھانسی بھی بیرون شہر بلکہ دہلی سے کچھ دور دی جائے۔ مثلاً پانی پت کی راہ میں مغل سرائے نام کا پرانا قصبہ ہے، اس میں جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے زمانے کی ایک سرائے مدتوں سے ویران پڑی ہے۔ اسی سرائے کے

احاطے میں دار یں استاد کی جائیں اور پھانسی کے بعد تدفین بھی وہیں جلد از جلد کر دی جائے۔ جان لارنس چونکہ پانی پت کی مجسٹریٹی پر تھا، لہٰذا وہ یہاں کے چپے چپے سے خوب واقف تھا۔ اس نے تجویز کی تائید کی اور کہا کہ سارا کام وہاں پر امن طریقے سے چپ چپاتے ہو جائے گا۔

سائمن فریزر کے سینے میں آتش انتقام تو برافروختہ تو تھی ہی، یہ موقع اس کو بہت خوب مل گیا تھا کہ اپنے عم زاد کے خون ناحق کا بدلہ بھی لے اور بادشاہ کے بشمول تمام دیسیوں کو سخت سبق اور ہدایت بھی پہنچادی جائے کہ فرنگی حکام کی جان سے کھیلنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ ملک ہند میں ہمارا وجود و قیام استبداد اور خوف کے بل بوتے پر ہے۔ اگر طاقت میں کہیں کوئی تخفیف ہوئی یا تخویف میں کچھ نقص آیا تو یہ لوگ ہمیں چشم زدن میں اس طرح نوچ کر کھا جائیں گے جیسے ہمالیہ کے بھالو شہد کی مکھیوں کا چھتہ نوچ کر سارا شہد پی لیتے ہیں اور موم کو پارہ پارہ کر کے نیچے پھینک دیتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں غصے میں بھنبھناتی ناچتی بار بار حملہ کرتی ہیں ریچھ کو لپٹ لپٹ جاتی ہیں لیکن اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ اگر ہندیوں کو ذرا موقع مل جائے تو یہ ہماری مٹھی بھر فوجی چھاؤنیاں، ہماری کچہریاں اور گودام، دو ہی تین گھنٹوں میں لٹ پٹ کر ننگے ہو جائیں گے۔ ہماری عورتیں سیاہ فام وحشیوں کے لئے کسبیاں اور بدصورت بھونڈے موٹے عیاش بنیوں اور زمینداروں کی داشتائیں بنیں گی۔ ملک ہند، اور ملک دکن میں بھی، اس وقت اکثر علاقے تو ایسے تھے کہ سینکڑوں مربع میل کے علاقے میں بس ایک انگریز گھر تھا اور اس سارے خطۂ زمین پر اس کے گھر والے کی حکومت، حکمت عملی، داو پیچ، اقبال، اور داب سلطنت کی بنیاد پر آسمان سے باتیں کرتی تھی۔

فریزر نے جان لارنس کو مقدمۂ قتل ولیم فریزر کی تفتیش نہایت مستعدی اور جانفشانی سے کرتے ہوئے خیال کیا تھا کہ لارنس کو سرکار کمپنی بہادر کا دبدبہ قائم رکھنے میں اتنی ہی گرمی اور تعصب ہوگا لیکن آج اس کا مشورہ سن کر فریزر کو سخت تعجب اور ناگواری ہوئی۔ تاہم، ناگواری کا برملا اظہار اس وقت موافق مصلحت نہ تھا، کہ اس کے ہم چشم، اور ان سے بڑھ کر یہ نیم ہندوستانی کپتان اسکنر یہ خیال کر سکتا تھا کہ میں اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کو معاملات ملکی اور امور انتظامی پر مقدم کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس نے بہت متوازن لہجے میں ہر لفظ بہت تول تول کر کہا:

''میرا خیال ہے کہ ملزم کی گرفتاری اور مجرموں کی پھانسی یہیں دلی میں ہونی چاہیئے۔ ہم نے ذرا بھی رو رعایت کی تو دیسیان اسے ہماری کمزوری گمان کریں گے۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں میرا

تجربہ ہے کہ حکام کے خلاف افواہیں بے سبب بھی بہت پھیلاتے ہیں اور موقع ملتے ہی شیر ہو جاتے ہیں اور اگر دباؤ میں رکھا جائے تو کیچڑ میں آلودہ کتے کی طرح گربۂ مسکین بنے رہتے ہیں۔''

''تو پھر تمھاری رائے کیا ہے مسٹر فریزر؟'' مٹکاف نے پوچھا۔

''مجھے جو اطلاعات ملی ہیں ان کی رو سے مقامی رعایا کی ہمدردیاں شمس الدین احمد اور کریم خان کے ساتھ ہیں۔لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ دو... ہندی...'' وہ ایک لمحے کے لئے ٹھہرا اور پھر کھنکھار کر بولا،'' ...جیالوں نے فرنگی صاحب کا منھ جھلس دیا ہے... Have taken the torch to the Firanghee's face...ایسی صورت میں ہمارے لئے اور بھی ضروری ہے کہ ہم سخت ترین تعزیری اقدامات کریں اور کھلے بندوں کریں۔''

''تو آپ کے خیال میں رعایا کی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہ ہوگی؟ بریلی کا معاملہ...''

''بریلی والا معاملہ اور تھا، اسے بھول جایئے۔ دلی کے عیش پسند میرزا لوگ اور جوابی کارروائی؟'' سائمن فریزر ہنسا۔''ہم اگر قوت اور استقلال کا مظاہرہ مناسب موقعوں اور مناسب جگہوں پر کریں گے تو جوابی کارروائی کی کسی کو سدھ بھی نہ ہوگی۔دلی کے امیراب لونڈوں اور طوائفوں پر مرتے ہیں،عزت پر نہیں۔'' فریزر پھر ہنسا،اس بار اس کی ہنسی میں حقارت کے کھٹے نشے کی مہک اور بھی نمایاں تھی۔

''مگر بادشاہ کو تو ہموار کرنا ہی ہوگا، اور بعض خاص خاص ملاؤں کو بھی۔ ملا لوگ خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔'' مٹکاف نے کہا۔اس نے لفظ''ملا'' کو بفتح اول بروزن''پلّہ'' ادا کیا تھا۔

''ملاؤں کی نہ پوچھئے،'' فریزر نے جواب دیا۔''عبدالعزیز کے بعد اب ان میں کوئی ایسا نہیں جو چوں بھی کرے۔اور بادشاہ کے اشارے بغیر ملا لوگ یوں بھی کچھ نہ کریں گے۔اور بادشاہ کو ہمارا ایک اشارہ کافی ہوگا۔''

اسکنر نے اب تک بحث میں حصہ نہ لیا تھا۔اب وہ بولا:

''میں مسٹر فریزر کے خیال سے متفق ہوں۔ بڑی بات یہ ہے کہ ہم شمس الدین کی گرفتاری کسی سیاسی بنیاد پر نہیں بلکہ ارتکاب قتل عمد کے الزام میں کر رہے ہیں۔دیسی رعایا اس بات کو تعجب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ ہم کوئی کام قانون کی پشت پناہی کے بغیر نہیں کرتے۔''

''کپتان اسکنر۔تو آپ کی رائے میں شمس الدین کو شہر میں داخل ہونے کے ساتھ ہی گرفتار

کر کے جیل بھیج دیا جائے؟'' لارنس نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اسکنر نے ایک لمحے کے توقف کے بعد جواب دیا۔ ''ہمیں تھوڑی سی حکمت عملی سے کام لینا چاہیئے۔ میں ان لوگوں سے خوب واقف ہوں۔ یہ لوگ وضع داری اور اوپری دکھاوے اور پرانی رسوم پر جان دیتے ہیں۔''

''تو پھر؟'' مٹکاف نے کچھ تیز لہجے میں بے صبری سے کہا۔

''میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس پر غور کر لیں۔''

لارنس کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مٹکاف نے اسے اشارے سے روک دیا۔ جیمس اسکنر نے مٹکاف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا:

''شمس الدین احمد کو شہر کے باہر گرفتار کیا جائے۔ اور وہ اس طرح کہ پہلے میں اس سے ملاقات کروں اور اس کے ہتھیار رکھوا لوں، اس کے بعد کمپنی کی مسلح نفری کا ایک دستہ مجسٹریٹ فریزر کی قیادت میں پہنچ کر اسے گرفتار کر لے۔ اسے ہتھکڑی بیڑی وغیرہ نہ ڈالی جائے، بس ہمارے آدمی اس کی پالکی کو گھیرے میں لے کر یہاں ریزیڈنٹی میں لے آویں۔ شمس الدین کو مجھ پر اعتبار ہے۔ وہ مجھ سے ملاقات کرنے اور میرے کہنے پر اپنے ہتھیار الگ کرنے کو راضی ہو جاوے گا۔ دیسی رعایا کو شکایت کا موقع نہ ہوگا، کیونکہ گرفتاری شہر کے باہر ہوگی اور غیر مسلح ہو کر شمس الدین نے گویا خود کو ہمارے حوالے کر دیا ہوگا۔ پالکی میں بدستور سفر کرنے کی بنا پر اس کی کوئی توہین بھی بظاہر نہ ہوگی۔''

اسکنر کی طویل تقریر سب نے پوری توجہ سے سنی، لیکن چند ثانیوں کے لئے کوئی کچھ بولا نہیں۔ پھر مٹکاف نے اپنے سامنے کی میز پر مکا مارا اور خوش ہو کر کہا:

That's indeed a fine set of suggestions, Captain Skinner.

Quite like eating one's cake and having it too!

(کپتان اسکنر، آپ کی تجاویز تو واقعی نہایت عمدہ ہیں۔ گویا آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔)

گو کہ مٹکاف نے اسکنر کی بات پر صاد کیا، لیکن بعد میں خود انگریزوں کا خیال تھا کہ شمس الدین احمد کو اس طرح فریب سے گرفتار کرنا صاحبان عالیشان فرنگیان کے شایان شان نہ تھا۔

اسکنر نے حاضرین محفل کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ پھر سب تفصیلات چشم زدن میں طے کر

لی گئیں اور تھوڑی ہی دیر میں اسکنر گھوڑے پر تنہا سب کے آگے اور اس سے کوئی سو قدم پیچھے فریزر اور پچاس مسلح سوار پالم کے لئے روانہ ہو گئے۔ پالم قلعے پر پہنچ کر فریزر اور سپاہی فصیل کے اندر لیکن صدر دروازے کے باہر ٹھہرے رہے۔ اسکنر نے تنہا اندر جا کر اطلاع کرائی تو اس کی توقع کے بموجب شمس الدین احمد خود اس کے استقبال کو باہر آ گیا اور بڑی گرم دلی سے بولا:

''بھئی واللہ سکندر صاحب۔ اے آمدنت باعث دلشادی ما۔ جناب کا مزاج کیسا ہے؟'' یہ کہتا ہوا شمس الدین احمد اسے اپنے ساتھ قلعے کے اندر لے گیا جہاں دیوان عام کی طرح کے ایک ہال میں نواب کا قیام تھا۔ شمس الدین احمد کو خیال آیا کہ شاید سکندر صاحب انگریزوں کی طرف سے کوئی پیغام لائے ہوں اور پیغام بیان کرنے یا مزید بات چیت کے لئے تخلیہ پسند کریں۔

''تشریف رکھیں۔ بھنڈا ابھی حاضر کیا جاتا ہے، اتنے آپ شربت سے شوق فرمائیں۔''

یہ کہہ کر نواب نے اسکنر کو اپنے برابر دائیں جانب بٹھایا اور توقع بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''دلاور الملک میں آپ سے جھوٹ نہ بولوں گا۔ آپ بڑی مشکل میں ہیں۔'' اسکنر نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

''جی میں سمجھتا ہوں۔ لیکن صاحبان عالیشان کو میرے بارے میں کچھ غلط فہمی ہے۔ میرے خلاف کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں۔ میں قسمیہ کہتا ہوں۔ اس خطا پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا کی بات اور ہے۔''

''دلاور الملک، آپ ابھی نوجوان اور ناتجربہ کار ہیں۔ معاملات ملکی میں طرح طرح کے پیچ ہوتے ہیں، رنگ رنگ کی باریکیاں ہوتی ہیں... کس موقعے پر کون ملزم سے مجرم بن جائے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

شمس الدین احمد کا منہ سوکھ سا گیا۔ ''میں عندیہ جناب کا سمجھنے سے قاصر رہا۔''

''میری رائے یہ ہے کہ آپ خود کو مٹکاف صاحب کی امان میں دے دیں۔ اپنی تلوار اور دیگر اسلحہ میرے حوالے کر دیں۔ میں آپ کے ہم رکاب چلوں گا۔''

اسکنر کے چہرے پر مکمل متانت اور سنجیدگی تھی، گویا اسے خود پورا یقین تھا کہ دلاور الملک کا مستقبل میرے ہاتھوں میں بالکل محفوظ ہے۔ اس نے ''ٹامس مٹکاف'' کے بجائے صرف ''مٹکاف'' جان بوجھ کر کہا تھا کہ وقت ضرورت اس سے چارلس مٹکاف، یا ٹامس مٹکاف، یا دونوں ہی مراد لئے جا سکیں۔

شمس الدین احمد کو اپنا بچپن یاد آیا جب ولیم فریزر اور جیمس اسکنر دونوں کا اس کے باپ کے

یہاں برابر آنا جانا تھا اور اسکنر سے تو احمد بخش خان کو اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے بلی ماراں میں نئی حویلی بنوائی تو اس پر اپنا نام لکھوانے کے بجائے ''حویلی جیمس اسکنر صاحب بہادر'' کندہ کرایا۔ اور سنگ مرمر کی وہ لوح حویلی کے صدر دروازے کی محراب پر اب بھی اسی طرح موجود تھی۔ شمس الدین احمد نے دل میں خیال کیا کہ میں انگریزوں کے نرغے میں تو ہوں ہی، ذلت سے گرفتار ہونے سے بہتر ہے کہ غیر مسلح ہو کر سکندر صاحب کے ساتھ چلا چلوں۔ آگے جو ہوگا دیکھ لیں گے۔ ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم ہی پر عمل پیرا ہونے میں صلاح ہے۔

یہ سوچ کر شمس الدین احمد نے سونے سے منقش اپنی اصفہانی تلوار، مرصع بیدری خنجر، اور فرانسیسی جڑاؤ طمنچہ اسکنر کے حوالے کر دیئے اور بولا:

''لیجیے ان امانتوں کو سنبھالئے۔ میں آپ کا بندہ ہوں۔''

اسکنر نے تینوں ہتھیار اپنے قبضے میں کیے اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں انھیں کسی معتبر سردار کے پاس محفوظ رکھواتا ہوں، اتنے آپ کوچ کا انتظام کریں'' کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔ فریزر اور اس کے سپاہیوں نے اسکنر کو تنہا ہتھیاروں کا بوجھ اٹھائے باہر آتے دیکھا اور بے توقف اندر داخل ہو گئے۔ شمس الدین احمد ابھی سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ یہ لوگ کیوں اس طرح اندر آ گئے ہیں کہ فریزر نے طمنچہ ہاتھ میں لیا اور بڑھ کر بولا:

''نواب شمس الدین احمد۔ آپ پر مسٹر ولیم فریزر کے قتل کا الزام ہے۔ آپ کو سرکار کمپنی بہادر کی حراست میں لیا جاتا ہے۔''

شمس الدین احمد ہکا بکا رہ گیا۔ ''سکندر صاحب!'' بے ساختہ اس کے منھ سے نکلا، گویا وہ اسکنر کو استمداد کے لئے پکار رہا ہو۔ لیکن پل مارتے میں فریزر کے سپاہیوں نے نواب کو حصار میں لے لیا۔ اسکنر تو ظاہر ہے باہر نکلتے ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دلی کی طرف سرپٹ نکل گیا تھا، اور اگر وہ ہوتا بھی تو اس کی طرف سے کسی استجاب کا سوال نہ تھا۔ لیکن شمس الدین احمد کی آواز سن کر اس کے کئی سوار اور برچھیت اندر آ گئے اور انھوں نے چاہا کہ مقاومت کریں اور مزاحمت کر کے شمس الدین کو آزاد کرا لیں۔ لیکن شمس الدین احمد نے انھیں اشارے سے منع کیا اور جب وہ لوگ ٹھہر گئے تو اس نے کہا:

''گوروندر سنگھ، اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ پالکی کا انتظام کیا جائے۔ ہم فوراً دلی جائیں گے۔''

گوروندر سنگھ ''جو حکم،'' کہہ کر باہر جانے لگا تو فریزر نے اسے روک کر سختی سے کہا:

''تم یہیں ٹھہرو۔ پالکی ابھی لگوا دی جائے گی۔ ہم نے حکم دے دیا ہے۔''

یہ جملہ سن کر شمس الدین احمد کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''سیمن صاحب، آپ میں جھلک آپ کے مرحوم بھائی کی خوب نظر آتی ہے۔ حق مغفرت کرے میرے کرم فرمائے خاص الخاص تھے۔''

سائمن فریزر کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ آیا یہ واقعی تعزیت ہے، یا اس میں کسی قسم کا طنز یا کچھ اور رمز پنہاں ہے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کیا جواب دوں، کہ نواب نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر کچھ مربیانہ انداز میں ہاتھ رکھا اور کہا:

''پالکی کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا گیا تھا تو اب چلیں، پھر دیر کا ہے کی؟''

شمس الدین احمد کا چہرہ اس وقت اتنا پر سکون اور پر وقار تھا اور ان کے پورے تن بدن سے اس قدر اعتماد ترشح کر رہا تھا کہ فریزر از خود ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر خود کو سنبھال کر وہ بولا:

''اب دیر کچھ نہیں۔ انجام نزدیک ہے نواب صاحب۔''

''ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا۔'' شمس الدین احمد نے قہقہہ مارا۔ ''تو آئیں، اب چلتے ہیں۔ ہم نے تو آئینۂ زانو میں اپنا انجام دیکھ لیا ہے۔''

فریزر گڑبڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ نواب نے درحقیقت کیا کہا ہے۔ ''آئینۂ زانو'' سے وہ واقف نہ تھا، اور نہ اس نے میر کا مصرع کبھی سنا تھا۔ وہ دانت پیس کر لیکن بظاہر ٹھنڈے لہجے میں بولا:

''آپ ہر جگہ میرے سپاہیوں کے گھیرے میں رہیں گے۔ چلئے، یہاں سے اٹھئے۔''

نواب شمس الدین احمد کی پالکی کے پردے چھٹے ہوئے تھے۔ کسی نے اسے شہر میں داخل ہوتے نہ دیکھا۔ میرزا مغل بیگ کے آدمیوں نے دن ڈھلنے کے بہت بعد انھیں خبر دی کہ آپ کے داماد نواب شمس الدین احمد خان صاحب کو لڈلو کاسل کے ایک گوشے میں قید رکھا گیا ہے۔ میرزا مغل بیگ، جو پہلے ہی اپنے حراست میں لئے جانے کے بعد پستی ہمت کا شکار ہو چکے تھے، بہت حیص بیص میں پڑے کہ اب کیا کیا جائے۔ بالآخر انھوں نے مرزا اسفندیار بیگ کو بلوایا کہ وہ ریاست ہائے فیروز پور جھرکہ و لوہارو کے معاملات میں صاحبان انگریز کے دفتر خانوں اور عدالتوں میں پیروی کرتے تھے۔ میرزا مغل بیگ نے میرزا اسفندیار بیگ کو ریزیڈنٹی بھیجا کہ معلوم کریں نواب کی صورت حال کیا ہے اور ملاقات ان سے کب ہو سکتی ہے۔ کوئی تین گھنٹے بعد اسفندیار بیگ صرف یہ خبر لے کر واپس ہوئے کہ نواب کو عزت و احترام سے انھیں کے آدمیوں کی نگرانی میں رکھا گیا ہے لیکن قانونی طور پر ان کی حیثیت ملزم، بلکہ مجرم کی ہے۔ جہاں تک سوال ملاقات کا ہے، تو سر رشتہ داری اس وقت بند ہے۔ کل صبح دس اور گیارہ کے درمیان باضابطہ

ملاقات کی درخواست گذاری جائے تو اس پر غور کیا جاسکے گا۔ میرزا مغل بیگ نے اسفندیار بیگ کو مختار نامہ دستخط کر کے دیا اور ہدایت کی کہ اگلے روز اول وقت میں نواب شمس الدین احمد سے ملاقات کی درخواست سررشتہ داری میں لگا دیں اور پوری کوشش کریں کہ نواب اور میرزا مغل بیگ کی ملاقات کل شام سے پہلے پہلے ممکن ہو سکے اور اسفندیار بیگ بھی بطور وکیل وہاں موجود ہوں۔

اگلا دن ۸ مئی ۱۸۳۵، یوم الجمعہ، یوم عاشورہ تھا لیکن اسفندیار بیگ نے وہ سارا دن ریزیڈنٹی اور انگریزی دفتر (English Office) اور سررشتہ داری کے درمیان سعی وتگ ودو میں گذار دیا۔ ملزم سے ملاقات کے لئے درخواست اور فرد جرم کی نقل کے مطالبے کے علاوہ انھوں نے صدر دیوانی عدالت الہ آباد کی خدمت میں ایک درخواست تیز رفتار ہرکارے کے ذریعہ بھجوائی۔ اس درخواست میں نواب کے سانحۂ اسیری کے مختصر تذکرے کے بعد لکھا تھا کہ فدوی اس مقدمے کی مزید پیروی کے لئے جلد از جلد عازم کلکتہ ہو رہا ہے، لیکن نواب شمس الدین احمد کا مفصل اظہار لینے ایک صدر امین الہ آباد سے دہلی فوراً بسبیل ڈاک روانہ کیا جائے تا کہ مقدمے کے مکمل کوائف اور احوال پوشیدہ سب پر ظاہر و باہر ہو سکیں۔

میرزا مغل بیگ اور شمس الدین احمد کی ملاقات تو ۸ مئی مطابق ۱۰ محرم کو ہی ممکن ہو گئی، لیکن صدر دیوانی عدالت الہ آباد نے ''محرم کی چھٹیوں'' کے سبب اسفندیار بیگ کی درخواست پر کارروائی کی ضرورت نہ سمجھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ شمس الدین احمد کے مقدمے کی بابت جتنی بھی عرضیاں اسفندیار بیگ نے کلکتہ بھیجیں، ان میں سے بھی کسی پر غور نہ ہوا۔ صاحب گورنر جنرل بہادر کے دفتر میں سارے کاغذات محکمۂ قانون و انصاف میں نہیں بلکہ سیاسی محکمے (Political Department) میں داخل کئے گئے اور کسی پر بھی کوئی ایسی علامت نہیں کہ اسے کسی بڑے عہدہ دار کمپنی چہ جائے کہ نواب گورنر جنرل بہادر کی نظر مسیحا اثر سے گذارا گیا تھا۔

میرزا اسفندیار بیگ نے درخواست ملاقات حسب ہدایت کچہری میں پیش کی لیکن اس پر کوئی حکم صادر نہ ہوا۔ صرف یہ کہا گیا کہ آج بارہ بجے سیمن فریزر صاحب بہادر مجسٹریٹ شہر دہلی کی عدالت میں ملزم کو پیش کیا جائے گا۔ آپ وہاں اس سے مل سکتے ہیں۔

شمس الدین احمد کو بارہ بجے کے کچھ بعد عدالت میں پیش کیا گیا تو وہ اپنے معمولہ لباس میں تھے لیکن ان کے چہرے پر تھکن اور بے خوابی کے آثار تھے۔ اسفندیار بیگ اور میرزا مغل سے انھوں نے صرف اتنا کہا کہ میری طرف سے معاملے کی وکالت اور پیروی تا کلکتہ کیجئے۔ فیروز پور میں سب کو مطلع کر

دیجیے کہ مشوش نہ ہوں۔ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے اور میں بہت جلد بری ہو جاؤں گا۔

انگریزوں کی طرف سے استغاثہ دائر کرنے والے کی حیثیت سے جان لارنس نے عدالت کے سامنے فردِ جرم پیش کرتے ہوئے پرزور تقریر کی کہ ملزم اور اس کے نوکر مسمی کریم خان پر جرم پوری طرح ثابت ہے۔ مزید برآں، کریم خان پر کمشنر خصوصی عالی جناب مسٹر جان الکزنڈر کالون (John Alexander Colvin) کی عدالت میں مقدمہ چل ہی رہا ہے، اسی مقدمے میں ملزم شمس الدین احمد کو بھی شریک کر لیا جائے۔ شمس الدین احمد نے کوئی بیان نہیں دیا اور نہ ان سے کوئی استفسار ہوا، بجز اس کے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم اقبال جرم کرتے ہو، تو انھوں نے صاف اور کھلی ہوئی آواز میں کہا:

''ہرگز نہیں۔ الزام بالکل جھوٹا اور سازش پر مبنی ہے۔''

دو گھنٹے کی رسمی کارروائی کے بعد فریزر نے جان لارنس کی مرضی کے مطابق حکم صادر کر دیا۔ ملزم کو دوبارہ لڈلو کاسل میں محبوس کر دیا گیا۔ اسفندیار بیگ کے سوا کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی، لیکن اسفندیار بیگ نے اسی دن (۸ مئی ۱۸۳۵) تین پہر دن ڈھلے براہ کشتی فرخ آباد کا رخت سفر باندھ لیا۔ فرخ آباد میں کشتیاں چھوڑ کر تیز رفتار گھوڑوں اور بہلی کے ذریعہ الہ آباد اور پھر کلکتہ کی راہ اختیار کی گئی۔ ساری رات اور نصف دن کے رحلۂ بے قیام کے بعد الہ آباد میں اسفندیار بیگ کے قافلے کا صرف دو گھنٹے کا قیام صدر دیوانی عدالت میں ایک اور عرضی پیش کرنے کی غرض سے ہوا۔ ۱۰ مئی ۱۸۳۵ کو جلد از جلد عازم کلکتہ ہو کر اسفندیار بیگ منزلوں پر منزلیں مارتا ۱۱ مئی کی نیم شب کے قریب وہ کلکتے میں اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا، لیکن ابھی اسے کمر کھولنے کی مہلت نہ تھی۔ نواب شمس الدین احمد نے کلکتہ میں ایک انگریز وکیل سینفورڈ تھیکری (Sanford Thackeray) کو اپنا مختار کار مقرر کر رکھا تھا۔ لہٰذا کلکتہ پہنچ کر پہلا کام انگریز وکیل کو پورے حالات سے آگاہ کرنا اور ضروری عرضیاں تیار کرنا تھا۔ چنانچہ دونوں نے ساری رات کام کر کے ایک مفصل عرضی نواب گورنر جنرل بہادر کے نام بزبان فارسی تیار کی اور تھیکری نے اسے اگلے دن گیارہ ہی مئی کی تاریخ ڈال کر گورنر جنرل کے سکریٹری کے یہاں جمع کرا دیا۔

ادھر دہلی میں دوسرے ہی دن سے انگریز حکام کی گرفت بیجا شمس الدین احمد کے اوپر اور بھی سخت ہونا شروع ہو گئی۔ فوری طور پر تو نواب کے زندان خانے پر انھیں کے آدمی پہرے دار مقرر کیے گئے تھے، لیکن گیارہ کی رات کو وہ سب پہرے دار صرف اس جرم پر ہٹا لیے گئے کہ شمس الدین احمد نے ایک

محافظ سے یہ پوچھ لیا تھا کہ کیا آدھی رات ہوگئی، یا شاید یہ پوچھ دیا کہ ابھی آدھی رات ہونے میں کتنی دیر ہے؟ شاید انگریزوں کا ذہن اس امکان سے پریشان تھا کہ اپنے محافظوں سے اس بظاہر معصوم تبادلۂ خیالات واطلاع کے پردے میں شمس الدین احمد کوئی سازش نہ چھیڑ رہا ہو۔ بہر حال، نہ صرف یہ کہ شمس الدین احمد کو اپنے خدام اور محافظین سے محروم کر دیا گیا، انگریزوں نے یہ حکم بھی راتوں رات گشت کرادیا کہ نواب شمس الدین احمد کا کوئی بھی ملازم یا قرابت دار اگر شہر میں گھومتا ہوا پایا جائے گا، خواہ وہ کسی بھی ضرورت یا مجبوری سے باہر نکلا ہو، تو اسے بے درنگ قید خانے بھیج دیا جائے گا۔ لہٰذا گھڑی بھر میں شہر دہلی ایسا ہو گیا گویا وہاں شمس الدین احمد کا کوئی حامی و ناصر کبھی تھا ہی نہیں۔

جان الکزنڈر کالون (John Alexander Colvin) کی عدالت میں نواب کے خلاف مقدمے کا سارا دارومدار انیا کی گواہی پر تھا اور جان لارنس نے اسے ہر ممکن تفصیل کے ساتھ ڈرامائی انداز میں استعمال کیا۔ انیا کی شہادت کی ہر دھجی اور ہر دھاگے کو الجھانے، سلجھانے، اور الگ الگ کر کے پیش کرنے اور پھر سب کو آپس میں مربوط کرنے کی پوری کوشش کے باوجود استغاثہ یہ ثابت کرنے میں ناکام رہا کہ انیا نے کبھی براہ راست نواب کے منھ سے قتل کا حکم سنا تھا، یا یہ کہ نواب نے کریم خان کو، یا کسی شخص کو، انیا کی موجودگی میں کوئی ایسی ہدایت دی تھی جس سے مترشح ہوتا ہو کہ نواب کی مرضی ہے کہ ولیم فریزر صاحب بہادر کو شہید کر دیا جائے۔ فریزر کے قتل کے بعد انیا کی نقل و حرکت کو خوب پھیلا کر دکھایا گیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ انیا نے نواب کے حکم کی تعمیل تین دن کا سفر ایک دن میں طے کر کے فیروز پور جا کر نواب کو اس قتل کی اطلاع دی تھی۔ لیکن انیا صرف یہ کہہ سکا کہ کریم خان نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ اور گولی کی آواز سنتے ہی فیروز پور کے لئے روانہ ہو جاؤ اور وہاں پہنچتے ہی نواب کو خبر کرو کہ فریزر صاحب مار دیئے گئے۔ شمس الدین احمد کے وکلا کی دلیل تھی کہ فریزر کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہ تھا اور شمس الدین احمد کے لئے مقتول کی اہمیت کے پیش نظر یہ نامناسب نہ تھا کہ قتل کی خبر سنتے ہی ان کا ملازم بھاگتا ہوا فیروز پور جائے اور نواب کو یہ خبر پہنچائے۔

شمس الدین احمد سے بھی عدالت میں جرح کی گئی، لیکن وہاں پوچھنے اور ثابت کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ شمس الدین احمد موقع واردات پر تو کیا، بوقت ارتکاب جرم شہر دہلی ہی میں موجود نہ تھا۔ بندوق کے بارے میں یہ ثابت نہ ہو سکا کہ وہ نواب کی ملکیت تھی۔ گھوڑے کی الٹی نعلوں کی گواہی بے شک بہت اہم تھی لیکن یہ ثابت نہ تھا کہ یہ وہی گھوڑا ہے جو قاتل کی سواری میں تھا جب اس نے قتل کیا۔ اس بات کی

بھی کوئی شہادت نہ مل سکی کہ کریم خان نے کہا تھا کہ فریزر کا قتل میں کروں گا اور نواب کے حکم سے کروں گا۔

مختصراً، استغاثہ کا سارا مقدمہ بس اتنا تھا کہ انیا کی گواہی اور کریم خان کے بیانات سے خود کریم خان پر جرم ثابت ہے۔ کریم خان با قبال خود نواب شمس الدین احمد کا نوکر ہے۔ اور انگریزی قانون کی رو سے مالک کو نوکر کے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ اسے ''نظریۂ مالک ونوکر'' (Master and Servant Theory) کہتے تھے۔ لہٰذا جب کریم خان پر جرم ثابت ہو گیا اور ضمنی شہادتیں اس بات کا کافی ووافی ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ ملزم شمس الدین احمد کو مقتول فریزر سے دشمنی تھی، دشمنی کا بنیادی ثبوت فتح اللہ بیگ خان کا وہ نعرہ تھا جو فریزر کی لاش دیکھ کر ان سے سرزد ہوا تھا کہ ''ہائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا'' تو کریم خان کے مالک ملزم شمس الدین احمد پر بھی جرم قتل عمد پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے اور دونوں کو پھانسی کی سزا ملنی چاہئے۔

میرزا اسفندیار بیگ اور دوسرے ہندوستانی ماہرین قانون کے پاس نظریۂ مالک ونوکر کا کوئی توڑ نہ تھا، بجز اس کے کہ یہ نظریہ نہ اسلامی شرع میں تھا اور نہ مغل قانون میں۔ نہ ہی اہل ہنود کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر تھا۔ لہٰذا ایسے کسی نظریے کو تعزیر کی بنیاد بنانا انصاف اور انسانیت سے بعید تر تھا۔ لیکن یہ دلیل کالون صاحب کے یہاں مقبول نہ ہوئی۔ ملزم شمس الدین احمد کے خلاف آخری شہادت یہ تھی کہ اس نے کریم خان کو خط میں سرزنش کی تھی کہ فریزر صاحب کا قتل اب تک انجام کیوں نہیں دیا گیا۔ لیکن اس مکتوب پر نواب کے دستخط نہ تھے اور نہ فریزر کا کوئی ذکر تھا، صرف شکاری کتوں کی خریداری کی بات کہی گئی تھی، ہر چند کہ لہجہ ذرا خشن تھا۔ مزید برآں کہ خط پر تاریخ تھی لیکن سال درج نہ تھا لہٰذا یہ بات پوری طرح ثابت نہ ہو سکی کہ خط ۱۸۳۵ ہی میں لکھا گیا تھا۔ بس ایک شبہہ تھا، اور استغاثہ نے اس شبہے کو بہت زور دے کر پیش کیا۔ لیکن کریم خان نے ہر طرح کی سخت ونرم ترغیب کے باوجود یہ اقبال کر کے نہ دیا تھا کہ اس مکتوب کا کاتب ملزم شمس الدین احمد تھا اور سگان شکاری کی خریداری سے مراد قتل فریزر تھا۔

استغاثہ نے کئی گواہ ایسے گذارے جن کا دعویٰ تھا وہ ملزم شمس الدین احمد کے سواد خط سے واقف ہیں اور اسے بآسانی پہچان سکتے ہیں۔ ان گواہان نے بھی یہی کہا کہ مذکورہ مراسلے کا کاتب ملزم شمس الدین احمد ہی معلوم ہوتا ہے اور کوئی قرینہ اس سے مختلف رائے قائم کرنے کا نہیں ہے۔ شمس الدین احمد نے بہر حال عدالت کے سامنے کوئی عبارت لکھنے اور اس طرح اپنی لکھائی کا مصدقہ نمونہ فراہم کرنے سے انکار کیا۔ ملزم کا دعویٰ تھا کہ یہ ساری عدالتی کارروائی اس کی نظر میں قانون شریعت اسلامیہ اور قانون مغلیۂ ہند دونوں کے خلاف، اس لئے غیر قانونی تھی۔ لہٰذا ملزم کی طرف سے کوئی ثبوت پیش کرنے یا استغاثہ کی

کسی دلیل کو رد کرنے کا سوال ہی معنی سے عاری تھا۔ اس کے جواب میں استغاثہ نے کھاری باولی کے مدرسے کے ایک مولوی کو پیش کیا جن کا بیان تھا کہ قانون شریعت اسلامیہ اور قانون مغلیۂ اورنگ زیب عالمگیر بذکور در فتاواے عالمگیری کی رو سے ولیم فریزر ذمی کا درجہ رکھتا تھا، اور ذمی کے قاتل پر بھی قصاص لازم ہے۔ لہٰذا شمس الدین احمد اور اس کے نوکر کریم خان کو خون فریزر کے لئے ماخوذ کیا جا سکتا ہے۔

اس پر عدالت میں قہقہہ تو نہ پڑا، کہ جان سبھی کو پیاری ہے، لیکن ہلکی سی کھی کھی جگہ جگہ سے سنائی دی۔ کالون نے برہم ہو کر اپنی میز کو بیت سے بزور کھٹکھٹایا ہی تھا کہ شمس الدین احمد کے وکیل نے گواہ کی جرح کے لئے اجازت مانگی اور اجازت ملنے پر اس نے پوچھا:

''ملاں جی، مقتول ولیم فریزر نے آخری بار جزیہ کب ادا کیا تھا؟''

ملاں جی اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے تو دوسرا سوال یہ پوچھا گیا:

''مولانا، اگر مقتول جزیہ ادا کر کے سلطنت مغلیہ میں ذمی کی حیثیت حاصل کر چکا تھا تو اس کے قتل کا قصاص قائم اور منعقد کرنے کے لئے کون سی عدالت مامور من اللہ ومجاز من السلطان ٹھہرے گی؟''

سوالوں کے جواب نہ ملنے کے باعث گواہ کو عدالت نے اجازت رخصت دے کر مزید کارروائی کا حکم دیا۔

مقدمہ سات دن چلا اور ہر دن عدالت نے معمول سے زیادہ دیر تک اجلاس کیا۔ ایوان عدالت کے قریب پھٹکنے کی اجازت کسی کو نہ تھی، ہر طرف سخت پہرہ تھا۔ ملزمان کی طرف سے میرزا اسفندیار بیگ (جب وہ دہلی میں موجود ہوتے، کہ وہ اکثر کلکتے کے صدر دفاتر میں عرضیاں لگانے اور ان پر شنوائی کی سعی میں ہوتے)، ان کے نائب مرزا بچھو، اور شمس الدین احمد خان کے مختار کار دیوان عبداللہ خان کو عدالت میں حاضر ہونے کی سہولت تھی۔ لیکن مرزا بچھو اور عبداللہ خان کسی گواہ سے جرح نہ کر سکتے تھے۔ ان کو صرف یہ اختیار تھا کہ گواہ کی شہادت پر تنقیحات قائم کر کے اس پر کچھ وضاحت طلب کر سکیں اور ضروری سمجھیں تو اس وضاحت پر اپنا وکیلانہ بیان دیں۔

نواب شمس الدین احمد خان کے برخلاف، کریم خان نے پوری رضامندی کے ساتھ اپنا بیان دیا اور وکلاے استغاثہ کی جرح بھی قبول کی۔ لیکن اس کارروائی سے ملزمان کو کچھ منفعت نہ ہوئی کیونکہ ملزم کو یہ اختیار نہ تھا کہ فرد جرم کی تردید یا گواہان کے اظہارات کی تغلیط میں اپنی طرف سے کوئی بیان دے یا الگ سے کچھ کہہ سکے۔ اس کا اختیار صرف اتنا تھا کہ اپنے بیان حلفی میں، اور دوران جرح، وہ اپنی کہانی اپنے طور

پر کہے۔ مقدمے کی پوری مدت میں کریم خان کے منھ سے ایک لفظ بھی ملزم شمس الدین احمد کے خلاف نہ نکلا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ میں بے گناہ ہوں میرے اوپر جرم ثابت ہی نہیں ہے۔ اور صاحب کلاں بہادر مرحوم کو قتل کرنے کے لئے دلاور الملک نواب شمس الدین احمد خان بہادر دام اقبالہٗ نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا۔ عدالت کی طرف سے جب یہ پوچھا گیا کہ بالفرض اگر نواب ایسا کوئی حکم تمھیں دیتا تو کیا تم اس کی تعمیل کرتا، تو کریم خان نے جواب دیا:

''توبہ توبہ۔ اللہ اللہ کرو صاحب، بھلا کسی بے گناہ کی جان لینا... یہ میرے دین میں سخت گناہ ہے۔''

استغاثے کا مقدمہ، ظاہر ہے کہ وعدہ معاف گواہ انیا کی شہادت کے بغیر صورت پذیر ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اسے بڑی محنت سے اور ہر امکان کی رو سے ٹھونک بجا کر پختہ کر لیا گیا کہ وہ کہیں بھی منحرف نہ ہو سکے۔ لیکن انیا کی شہادت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے ملزمان کا جرم براہ راست ثابت ہو سکتا۔ اور وہی سب سے مضبوط شہادت تھی۔ لیکن اب مقدمے کی نوعیت نفاذ قانون اور ارتکاب جرم اور مکافات عمل کا کھیل نہ رہ گئی تھی۔ اب یہ معاملہ خود فرنگیوں کے قابو سے باہر ہو کر آئین جہانبانی اور اصول حکمرانی کے حدود میں لوہے کی لاٹھ کی طرح نصب ہو گیا تھا اور اس کی نوک کو قلم رو ہند کے قلب میں پیوست ہونا تھا۔ مقدمے کے آٹھویں دن دوپہر کے بعد جان الکزنڈر کالون نے پچاس صفحات پر مشتمل اپنا فیصلہ کھلی عدالت میں پڑھ کر سنایا۔ ملزمان کریم خان اور شمس الدین احمد ارتکاب قتل عمد کے مجرم قرار دیے گئے اور قانون تعزیرات دولت انگلشیہ کی رو سے دونوں ہی پھانسی کی سزا کے مستوجب ٹھہرائے گئے۔ عدالت نے مزید حکم دیا کہ مجرمان کو جلد از جلد مجمع عام میں سولی دی جائے تا کہ اوروں کو عبرت ہو۔ یہ واقعہ سہ شنبہ ۱۸ اگست ۱۸۳۵ کا ہے۔

فیصلے کی اطلاع ملتے ہی مٹکاف نے پھر اپنے مشیروں کو اس بات پر غور کرنے کے لئے طلب کیا کہ ملزمان کو گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں سزا کے خلاف مرافعے کی اجازت دی جائے کہ نہیں، اور پھانسیاں کہاں اور کس دن دی جاویں۔ مشاورت میں پہلی بات تو یہ کہی گئی کہ از روئے قانون کمپنی کوئی دفعہ ایسی نہیں جس کے تحت گورنر جنرل بہادر کے یہاں مرافعہ داخل اور قائم ہو سکے۔ جان کالون کو اس مقدمے کی سماعت کی غرض سے اسپیشل جج اور کمشنر مقرر کیا گیا تھا اور مقدمۂ ہٰذا کی حد تک اس کے اوپر کوئی عدالت نہ تھی جس کے روبرو مرافعہ پیش ہو سکے۔ کلکتہ میں کمپنی کی سپریم کورٹ ضرور تھی لیکن حکومت صوبۂ

آگرہ، اور کمشنری دہلی کے معاملات کی سماعت اس کے اختیار میں نہ تھی۔ الٰہ آباد کی صدر دیوانی عدالت کا صدر الصدور بے شک اصولی طور پر مسٹر کالون سے بلند عہدہ تھا، لیکن قتل، ڈکیتی وغیرہ کے معاملات کی سماعت کا بھی اسے اختیار نہ تھا، مرافعے یا نظر ثانی کی بات ہی کیا ہے۔ اور یہ عدالت بھی اپنے کمترین حق کو استعمال کرنے، یعنی ملزم کا آزاد اظہار سننے سے بھی بوجوہ قاصر رہی تھی۔ ۱۷ صفر ۱۲۵۱ مطابق ۱۴ جون ۱۸۳۵ کو بالآخر جب صدر دیوانی عدالت الٰہ آباد کا ایک صدر امین نواب شمس الدین احمد کا اظہار لینے دہلی پہنچا تو اس سے کہا گیا کہ عدالت مقررہ نے ملزمان کے خلاف فرد جرم قائم کر دی ہے لہٰذا اب صدر امین کے سامنے اظہار کی ضرورت نہیں۔

مشاورت کی مجلس میں متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ مجرمان کو مرافعے کی اجازت نہ دی جاوے۔ الحال تو کوئی عرضی بھی مشتمل بر مضمون مرافعہ ان کی طرف سے موصول نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اگر آئندہ ہو بھی تو صاحب اسپیشل جج و کمشنر اسے فوری طور پر مسترد کر دیں گے۔ اس موقعے پر مٹکاف یا شاید پریسکاٹ نے سوال اٹھایا کہ مجرم شمس الدین احمد خان سرکار کمپنی کا خطاب یافتہ سردار اور والی ریاست ہے، لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس کی پھانسی کی تجویز پر گورنر جنرل بہادر کی توثیق حاصل کر لی جائے؟ سائمن فریزر اور جان لارنس دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ جب بحث زیادہ تلخ ہونے لگی تو مٹکاف نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کر دیا کہ کیا آپ کے خیال میں گورنر جنرل کے یہاں سے اس سزا کی توثیق نہ ہوگی؟

''ہوگی، یقیناً ہوگی، خدا کی قسم ہو کر رہے گی۔'' فریزر گرم ہو کر بولا۔

''مسٹر سائمن فریزر، قسم کھانے کا یہ کون سا موقع تھا؟'' مٹکاف نے تنبیہ کے لہجے میں کہا۔ ''آداب مجلس کو ہر وقت ملحوظ رکھنا ہر سفید فام عہدہ دار کا فرض ہے۔''

فریزر نے اپنی غلطی محسوس کی اور اس کا چہرہ شرمندگی سے اور بھی سرخ ہو گیا، جسے انگریز لوگ ''چقندری رنگ'' (beetroot colour) کہتے ہیں۔ فریزر نے رومال سے منھ خشک کیا اور تھوک نگل کر بولا:

"Sorry I got carried away. Shan't happen again, I am sure."

''مسٹر فریزر کو شاید خیال ہے کہ کلکتے سے جواب آنے میں دیر ہوگی۔'' پریسکاٹ نے مصالحت کے انداز میں کہا۔ ''لیکن اول تو دیر کا امکان نہیں، دوئم، مجرم شمس الدین ابھی جوان اور تندرست ہے، چار چھ ہفتوں میں مر تھوڑا ہی جائے گا۔''

''لیکن پہرے کے سپاہیوں کا بیان ہے کہ سزائے موت کی خبر سن کر شمس الدین نے اپنا سر بار بار دیواروں سے دے مارا، گویا خودکشی کرنا چاہتا ہو۔'' جان لارنس نے کہا۔

مٹکاف کے چہرے پر شکن سی نمودار ہوئی۔ ''لیکن مسٹر لارنس، آپ کو معلوم ہے کہ پہرے والوں نے فوراً اس کا تدارک کیا اور اب تو کئی دن سے اس کا کھانا بھی کمپنی کے ایک انگریز سپاہی کی نگرانی میں تیار ہوتا ہے تاکہ شمس الدین زہر نہ کھا سکے۔''

''گویا وہ اسی وقت مرے گا جب ہم اسے ماریں گے۔'' پریسکاٹ نے مسکرا کر کہا۔

اس پر سب کے چہروں کا کھنچاؤ کچھ کم ہوا اور ماحول میں خوشگواری واپس آ گئی۔ اتفاق رائے سے طے کیا گیا کہ مقدمے کا سارا حال اور کالون کے فیصلے کی نقل، شمس الدین احمد کی پھانسی کی تجویز بغرض توثیق واستناد نواب مستطاب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں ہرکارۂ خاص کے ذریعہ فوراً بھجوا دی جائے ۔لیکن کریم خان کو پھانسی چڑھانے کے انتظامات فوراً شروع کئے جائیں۔ یہ فیصلہ بھی اتفاق رائے سے ہوا کہ کریم خان کو پھانسی چاندنی چوک میں جامع مسجد فتح پوری کے سامنے کھلے میدان اور مجمع عام میں ۲۶ اگست ۱۸۳۵ کو دوپہر کے وقت دی جائے گی۔

کریم خان کی پھانسی کے وقت چار سو مسلح تلنگے چاندنی چوک، جامع مسجد فتح پوری، اور اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ انگریز عہدہ داران میں ڈاکٹر کے سوا کوئی نہ تھا۔ کریم خان کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے کہا:

''میری کوئی خواہش نہیں۔ بس التجا ہے کہ اہل ہند میرے حق میں دعائے خیر کریں۔''

گل سرخ کا گل حیات شاخ دار پر چشم زدن میں مرجھا گیا۔ لیکن ظہر اور عصر کی نمازوں کے بعد دہلی کی تمام مسجدوں میں اس کے لئے دعائے مغفرت کی گئی اور شام کو کالکا جی کے مندر، جوگ مایا کے مندر، جینیوں کے لال مندر، اور گوردوارہ سیس گنج میں اس کے لئے بھجن کیرتن گائے گئے۔ کریم خان کی لاش اس کے بہنوئی واصل خان کے سپرد کر دی گئی لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ میت کو چپ چپاتے دفن کرا دیا جائے، کوئی ہوحق، کوئی ہلڑ نہ ہو، کوئی جلوس جنازہ نہ اٹھے۔ آج اس کی قبر کا نشان نہیں ملتا، بلکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی قبر تھی کہاں؟ لیکن اس کی خاموش تدفین نے اس زمانے میں اس کے بہی خواہوں اور ماتم داروں کو اس کے مزار کو زیارت گاہ بنانے سے باز نہ رکھا۔ لوگ مدتوں اس کی قبر پر پھول چڑھاتے او رچراغاں کرتے رہے۔ اس کا عرس پابندی سے کیا جاتا اور اس میں عام قوالیوں کے علاوہ خود اس کے محامد پر

مبنی قوالیاں بھی گائی جاتیں۔

مجرم شمس الدین احمد کو اس بات کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی کہ تیرے مقدمے کی مسل کلکتے بغرض توثیق گورنر جنرل بہادر بھیجی گئی ہے یا بھیجی جائے گی۔ شمس الدین احمد کے پیروکاروں کو بھی کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ فیصلے پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ درایں اثنا دلی کے خبرتراشوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ فرنگیوں کے بادشاہ نے شہر لندن میں کونسل کر کے فیصلہ کیا ہے کہ نواب شمس الدین احمد خان کو معافی دے دی جاوے۔ کچھ ہوا باندھنے والوں نے یہ ہوائی اڑا دی کہ خود جناب امیر حیدر کرار غیر فرار نے بادشاہ انگریز کے خواب میں آکر اسے حکم دیا تھا کہ شمس الدین احمد باپ کی طرف سے میری اولاد ہے، اسے کچھ گزند پہنچا تو تیری ہڈیاں سرمہ ہو جاویں گی۔ بادشاہ نے خوف سے تھرا کر فوراً نواب شمس الدین احمد خان کے حق میں حکم رہائی جاری کر دیا۔ ریزیڈنسی کے مخبروں نے سائمن فریزر کے یہاں پرچہ لگایا کہ شہر میں عام خوشی کے آثار ہویدا ہیں کہ نواب شمس الدین احمد اب جلد ہی اپنی ریاست کو واپس چلے جاویں گے۔

ان افواہوں کے پیش نظر حکام فرنگیان کے تئیں یہ ضروری قرار پایا کہ سرکاری طور پر اعلان کر دیا جاوے کہ مجرم شمس الدین احمد کا معاملہ نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت عالیہ میں بغرض توثیق سپرد کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ۴ ستمبر ۱۸۳۵ کو ایک گزٹ جاری کیا گیا جس میں شمس الدین احمد کی تجویز پھانسی کی خبر اور یہ خبر برائے اطلاع عام شائع کی گئی کہ اب معاملہ کلکتے میں زیر غور ہے۔

ادھر کلکتے میں میرزا اسفندیار بیگ نے یہ خبر پڑھی تو انھوں نے مجرم شمس الدین احمد کی طرف سے ایک عریضہ گورنر جنرل کے نام تیار کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے گزٹ کے ذریعہ اطلاع ملی ہے کہ میرے کاغذ مقدمہ اعلیٰ حضرت نواب گورنر جنرل بہادر کے ملاحظے اور تجویز حتمی کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ میں میرزا اسفندیار بیگ کو اپنا وکیل مقرر کر کے آپ کی خدمت اقدس میں بھیجتا ہوں۔ ان کے اظہارات و شواہد سے آپ کی رائے روشن پر یہ حقیقت آئینہ ہو جاوے گی کہ دہلی کی عدالت نے میرے اعتراضات و بیانات و شواہد پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے سازش کی بنا پر بے گناہ ماخوذ و معتوب کیا گیا ہے۔ میری استدعا ہے کہ جناب والا میرے وکیل میرزا اسفندیار بیگ کے معروضات کو توجہ اور ہمدردی سے سن لیں اور ان کی جانب سے داخل شدہ کاغذ و دستاویزات کو انہماک سے ملاحظہ فرمائیں۔ مجھے آپ کی ذات والا صفات کے سوا اس دنیا میں کسی سے بھی کچھ امید نہیں اور نہ ہی کسی سے کچھ غرض ہے۔

یہ عرضداشت میرزا اسفندیار بیگ نے ۱۰ ستمبر ۱۸۳۵ کو کلکتہ دیوان گورنر جنرل میں تھیکری (Thackeray) کی معرفت داخل کر دی۔ اسی مضمون کی ایک اور عرضی ۲۸ ستمبر کو بھیجی گئی۔ کلکتہ میں ہزار تگ ودو کے بعد اس کی ملاقات گورنر جنرل کے سکریٹری سے ہو سکی لیکن بے نتیجہ۔ پھانسی کے حکم کی توثیق گورنر جنرل باجلاس کونسل کے یہاں سے جاری ہوگئی۔ ۷ اکتوبر ۱۸۳۵ کو توثیق نامہ دہلی پہنچا۔ وہاں حکام انگلشیہ کو پہلے ہی یقین تھا کہ شمس الدین کی پھانسی بحال رہے گی، لہٰذا سب تیاریاں کلکتہ رپورٹ بھیجتے ہی شروع کر دی گئی تھیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ پھانسی اگلے دن ۸ اکتوبر کو نو بجے صبح کشمیری دروازے کے باہر مجمع عام میں دی جائے۔ تاریخ ۷ اکتوبر کی رات کو دار استاد کی گئی۔ چاروں طرف ساگوان کی اونچی بلیاں گاڑ کر محاذ دار کو الگ اور محفوظ کر لیا گیا تھا۔ میرٹھ اور کول سے فوج پہلے ہی طلب کی جا چکی تھی اور بارہ سو سپاہی جن میں سو گورے اور باقی دیسی تھے، اعلیٰ افسروں کے زیر کمان منتظر تھے کہ وقت مقررہ پر پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیں تاکہ رعیت کو کچھ فساد و ہنگامہ کرنے کی جرأت نہ ہو۔

میرزا اسفندیار بیگ اپنی ناکامی پر اس قدر شرمندہ و محزوں ہوا کہ اس نے دستار باندھنی چھوڑ دی اور تاعمر محض ایک مختصر دوپٹہ سر پر باندھتا رہا اور عوام میں ''میرزا بھینٹے باز'' کہلایا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث مقدمہ شمس الدین احمد میں ناکامی اس کی ترقی و عروج میں مخل نہ ہوئی۔ چند برس وہ الور میں نائب دیوان اور پھر دیوان ہو گیا۔ اس نے ۱۸۶۲ میں وفات پائی۔

شام کے وقت سائمن فریزر کو مخبروں سے کچھ اطلاع ملی کہ اس بات کا خطرہ ہے کہ شمس الدین احمد کو چھڑانے کی کوششیں ہوں، لہٰذا ۷ اکتوبر کی رات کو مٹکاف نے فیصلہ کیا کہ مجرم کو راتی رات لڈلو کاسل سے کشمیری دروازے کی گورا بارک میں پہنچا دیا جائے۔ یہ اس خیال سے کیا گیا کہ لڈلو کاسل سے کشمیری دروازے تک کا فاصلہ بہت ہے، نواب کی پالکی کو کشمیری دروازے پہنچنے میں وقت لگے گا اور راستے میں جگہ جگہ بازار اور آبادیاں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ دیسی رعایا مشتعل ہو جائے اور موقع دیکھ کر نواب کی رہائی کے لئے بلوہ کر دے۔ شمس الدین احمد رات کا کھانا باطمینان کھا کر سو چکا تھا جب پہرے داروں کے سربراہ انگریز بریگیڈیر نے اسے جگایا اور کہا کہ فوراً سوار ہو جئے آپ کو کشمیری دروازے کی بارک جانا ہے۔ شمس الدین احمد نے احتجاج کیا کہ میں تو خیال کرتا تھا کہ اس آخری رات مجھے چین سے سونے دیا جائے گا۔ لیکن مٹکاف کے حکم کے آگے قیدی کی ایک نہ چلی۔

انگریز افسر لفٹنٹ ٹامس بیکن اس رات کشمیری دروازے کی بارک کے ایک بڑے کمرے

میں دو اور افسروں کے ساتھ سویا ہوا تھا۔ یہ تینوں رات ہی کو یہاں آ گئے تھے کہ صبح انھیں اچھی جگہ مل سکے اور پھانسی کے منظر کا نظارہ وہ ٹھیک سے کر سکیں۔ بیکن نے لکھا ہے کہ شمس الدین احمد کی اچانک آمد پر ہم لوگوں نے کمرہ خالی کرنے کی پیشکش کی، لیکن نواب نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں، میں یہیں اپنا بستر لگوا لوں گا۔ تھوڑی دیر میں نواب کے ملازم اس کا پلنگ اور بستر لے کر آ گئے۔ شمس الدین احمد نے بیکن سے پوچھا کہ کیا مجھے سبز نوابی لباس پہننے کی اجازت مل سکتی ہے؟ یہ سفید ململ تو بس شب خوابی کے لئے ٹھیک ہے۔ بیکن نے جواب میں کہا کہ مٹکاف صاحب ہی اس باب میں کچھ کہہ سکتے ہیں۔ شمس الدین احمد نے پلنگ پر دراز ہو کر انگریزوں کی طرف پیٹھ کر لی۔ دو چپی والوں نے اس کے بدن کو آہستہ آہستہ دبانا شروع کیا اور شمس الدین احمد، جسے اگلی صبح فراز دار پر ابدی نیند سونی تھی، چند ثانیوں میں بے خبر سو گیا۔ ٹامس بیکن کو البتہ رات بھر نیند نہ آئی۔

شمس الدین احمد نے بہت سویرے بیدار ہو کر فجر کی نماز پڑھی۔ پھر ایک مولوی صاحب تشریف لائے جنھوں نے اسے سورۂ یاسین شریف پڑھوائی اور خود بھی سورۂ یٰسین پڑھ کر شمس الدین احمد پر دم کی۔ (ٹامس بیکن نے ان مولوی صاحب کو ''پادری'' لکھا ہے اور کہا ہے کہ پادری جی نے کچھ دعائیں پڑھیں اور شمس الدین احمد کو پڑھوائیں۔) اتنی دیر میں شمس الدین احمد کا نائی اصلاح بنانے کے لئے حاضر ہو گیا۔ شمس الدین احمد اصلاح بنوانے کے دوران بار بار آئینہ دیکھتا اور ٹامس بیکن سے وہی بات پوچھتا کہ کیا مجھے سبز لباس پہننے کی اجازت مل سکتی ہے؟ لیکن بیکن کے پاس سکوت کے سوا کچھ نہ تھا۔

جب ٹامس مٹکاف دو افسروں اور بیس سپاہیوں کے ساتھ مجرم کو رن گاہ تک لے جانے کے لئے پہنچا تو اس نے شمس الدین احمد خان کو ہر طرح تیار و مستعد و مہیا پایا۔ اکتوبر کی ہلکی سردی، صبح کا وقت، اور نواب کا وجیہ و بالا قد، کچھ زرد ایا ہوا سا چمکتا ہوا چہرہ، اس پر سفید لباس خوب سج رہا تھا۔ اصلاح بنانے والے نے بھی بہت جی لگا کر موتراشی کی تھی۔ داڑھی اور مونچھوں کا ایک ایک بال اپنی جگہ پر ترشے ہوئے نگینے سا جڑا ہوا تھا۔ سبز پوت کی پگڑی، جس پر گہری سبز چھوٹی چھوٹی بوٹیاں گلاب کی کلیوں کے موافق کڑھی ہوئی تھیں۔ اسی کپڑے کی قبا، سبز ململ کا انگرکھا اور سبز مشروع کا پاجامہ، جوتیاں بھی شیرازی اور سبز کیمخت کی سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ شمس الدین احمد نے مٹکاف سے ہندی میں کہا:

''صاحب کلاں بہادر۔ مجھے اس معمولی سفید لباس میں مرنا منظور نہیں۔ کیا آپ مجھے سبز لباس پہننے دیں گے؟''

مٹکاف انھیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے دل میں کہا کہ اس وقت اور اس موقعے پر سراسر سبز لباس پہننے کی کیا لم ہو سکتی ہے؟ اسے خبر مل گئی تھی کہ مجرم رات ہی سے سبز لباس پہننے کا تقاضا کر رہا ہے۔ اچانک اس کے خیال میں آیا کہ سبز رنگ مسلمانوں کا رنگ ہے... اور شاید اس میں کچھ مذہبی رمزیت بھی ہے۔ اب اسے خوف ہوا کہ نواب کو اس لباس میں پھانسی دیے جانے پر دلی کے مسلمان کہیں برانگیختہ نہ ہو بیٹھیں، اور کچھ فساد یا فساد نہیں تو خلفشار نہ کھڑا ہو جائے۔ اس نے نواب سے فارسی میں کہا:

''شمس الدین احمد خان، بطور ایسے مجرم کے جسے سزائے موت دی جانی ہو، یہ لباس آپ کو زیب نہیں دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کسی اور رنگ کا لباس پہن لیتے تو ٹھیک تھا۔''

ایک مرتبہ شمس الدین احمد کے جی میں آئی کہ انکار کر دیجیے۔ موت تو آنی ہی ہے، یہ مسخرا ہمارا کیا کر لے گا۔ لیکن ایک لحظے کے تامل نے نواب کو ایک بہتر تجویز بجھا دی۔

''ہم نے تو سنا تھا کہ مرنے والے کی آخری خواہش ضرور پوری کی جاتی ہے،'' نواب نے مسکرا کر لیکن سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن اگر کمپنی بہادر کو میرے شجرِ حیات کو سرسبز نہ ہونے دینے پر نشاطِ خاطری نہیں ہے اور اسے میرے حلۂ فقیری کی بھی سبزی گوارا نہیں تو یہ بھی نہ سہی۔ ہم سفید ملبوس کو کفن جان کر پہن لیں گے لیکن پگڑی سبز ہی رہنے دیں گے۔''

مٹکاف کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا، لیکن قرینے سے اتنا تو سمجھ ہی گیا کہ نواب نے سفید لباس پہننا منظور کر لیا ہے۔ نواب نے تمام سبز کپڑے اور جو کپڑے وہ پہنے ہوئے تھے ان میں سے پگڑی اور پٹکا وہیں خیرات میں دلوا دیے اور پالکی میں بیٹھ کر اس شان سے کشمیری بارک سے کشمیری دروازے کو چلے کہ دونوں طرف مدراس پلٹن کے چار چار سوار تھے اور مٹکاف مع چار افسران انگریز کے گھوڑے پر ساتھ ساتھ تھا۔ ایک گورا افسر پالکی کے اندر بھی شمس الدین احمد کے ساتھ تھا۔ اثنائے راہ میں ایک جگہ کسیرو بکتے ہوئے نظر آئے تو نواب نے پالکی رکوا کر کسیرو خریدے اور انھیں قلم تراش سے خود چھیل چھیل کر کھانا شروع کر دیا۔ چھلکوں کو وہ پالکی کے دونوں طرف ایک شگفتہ انداز بے پروائی سے پھینکتے جاتے تھے گویا راہگیروں کو چھیڑ رہے ہوں۔ گورے سے انھوں نے ایک دو بار ہنس کر کہا کہ لو صاحب آپ بھی کسیرو کھاؤ لیکن اس نے ہر بار شرمندگی سے انکار کر دیا۔

کشمیری دروازے تک کا راستہ چشم زدن میں طے ہو گیا لیکن ایک آدھ بار کہاروں کا پاؤں ڈگمگایا تو نواب نے مصنوعی برہمی سے ان کی سرزنش کی کہ اجی یہ کیا مستانی چال چل رہے ہو۔ ذرا شاہ گام

چلو۔ بتاریخ ۸ ا کتوبر ۱۸۳۵، بروز پنجشنبہ، بوقت آٹھ بجے دن، نواب شمس الدین احمد خان کو دار پر کھینچا گیا۔ جیسا کہ بیان ہوا، کشمیری دروازے کے باہر کھلی جگہ دار استاد کی گئی تھی تا کہ کثرت سے لوگ تماشا دیکھ سکیں۔ انگریزوں کے اپنے ملک میں پھانسی کا نظارہ کرنے کے لئے ایک جم غفیر ہمیشہ مجتمع ہو جاتا تھا۔ اکثر حکام کو توقع تھی کہ دہلی میں بھی یوں ہی ہوگا۔ دیسی اور گورا پلٹنوں کی کثیر تعداد کے باوجود فساد کا پھر بھی اندیشہ تھا، یا اس کا اب بھی امکان تھا کہ خلقت غم اور غصے سے بے قابو ہو کر نواب کو بچا لینے اور رہا کرانے کی کوشش نہ کرے۔ ایسی کوشش کامیاب تو نہ ہوتی لیکن خون کی ندیاں ضرور بہ جاتیں۔ تماش بین بہر حال بہت کم تعداد میں تھے، زیادہ تر مجمع سرکاری عملہ فعلہ اور دیسی اور گورا سپاہیوں کا تھا۔ دلی والوں میں سے چند ہی عمائدین تھے۔ البتہ باہر سے آنے والوں میں راجہ ہندوراؤ، مہاراجہ گوالیار، مہاراجہ الور، مہاراجہ نابھ، مہاراجہ پٹیالہ اور دوسرے چھوٹے بڑے ہندو مسلمان رؤسا موجود تھے۔

تختۂ دار پر پہنچ کر مٹکاف نے ہندی میں بآواز بلند کہا:

''مجرم شمس الدین احمد، تم پر ولیم فریزر صاحب کلاں بہادر کے قتل کا جرم ثابت ہے۔ کیا تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو؟''

''میں بے قصور ہوں۔'' شمس الدین احمد نے گردن اٹھا کر کہا۔

مٹکاف کے اشارے پر دو جلاد آگے آئے۔ تختۂ دار پر چڑھنے کے پہلے شمس الدین احمد خان نے کلمۂ توحید اور پھر کلمۂ شہادت پڑھا۔ دار پر پہلا قدم رکھتے وقت ایک ذرا رنجیدہ تبسم ان کے منہ پر آیا۔ انھوں نے جلادوں سے ان کی سرگوشی کے لہجے میں ان کی ذات اور مذہب کے بارے میں کچھ پوچھا۔ جواب سن کر، جو اسی طرح زیر لب دیا گیا تھا، نواب شمس الدین احمد نے آہستہ خود کلامی کے لہجے میں، لیکن اس طرح کہ جلاد اور ڈاکٹر اور بہت پاس کے لوگ سن سکیں، کہا:

''اللہ جانے میرے ڈھیر کو بھی مسلمان کے ہاتھ کی مٹی نصیب ہوگی کہ نہیں۔ اس لئے میں خود ہی اپنی مٹی کی دعا پڑھ لوں۔''

یہ کہہ کر انھوں نے سر جھکایا اور بلند آواز میں پڑھا، بسم اللہِ و باللہِ و علیٰ ملتِ رسولِ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ و سلم۔ پھر دوبارہ درود پڑھ کر دلاور الملک نواب شمس الدین احمد خان بہادر والی فیروز پور جھرکہ ولوہارو نے جلادوں سے کہا، ''چلئے صاحب، ہم تیار ہیں۔'' اوپر پہنچ کر ایک جلاد نے شمس الدین احمد کے گلے میں پھندا لگانا چاہا لیکن مجرم نے ہاتھ بڑھا کر پھندا خود ہی گلے میں ڈال لیا۔

پھر پھانسی کی ٹوپی، جو کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر سیاہ کے بجائے سرخ رنگ کی تھی، وہ ٹوپی بھی دوسرے جلاد سے لے کر شمس الدین احمد نے خود پہن لی۔ اس وقت ان کی عمر چھبیس سال اور کچھ مہینے تھی۔

پھانسی کا جھٹکا لگتے ہی اجل رسیدہ کی گردن ٹوٹ گئی، بدن ایک ثانیے کو بھی نہ پھڑکا۔ منھ خود بخود قبلہ رخ ہو گیا، اتنا تشنج بھی نہ ہوا کہ پاؤں سے جوتی نکل جاتی۔

منصور تجھے عشق کا ٹک مانیو احساں
پستی سے بلندی کے تئیں دار نے کھینچا

موت، اور وہ بھی پھانسی کی موت کے روبرو شمس الدین احمد خان کی تمکین اور تمکنت، بلکہ لا پروائی اور غیر جذباتی تحمل و ضبط کو دیکھ کر بعض انگریز پھڑک اٹھے، اور ٹامس بیکن کے قریب کھڑے ہوئے ایک فرنگی افسر نے بے ساختہ کہا، ''واللہ ایسا لگتا ہے گویا ہر صبح کو پھانسی پر چڑھنا اس بدمعاش کی تفریح رہی ہو!'' لاش ایک گھنٹے تک لٹکتی رہی اور اسی وقت فراز دار سے اتاری گئی جب فرنگی ڈاکٹر کو پورا یقین ہو گیا کہ اب طائر جان نے قفس خاکی کو خیر باد کہہ دیا ہے۔

نعش کی قبلہ رخی نے متشککین کو بھی یقین دلا دیا کہ نواب کی موت شہادت کی موت تھی۔ ہر طرف ایک ماتم کی سی گونج اٹھی جو ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح تیزی سے سارے شہر میں پھیل گئی۔ لاش کو سیاہ کپڑے میں لپیٹ کر نواب شمس الدین احمد خان کے بڑے خسر میرزا مغل بیگ خان کے سپرد کیا گیا اور سائمن فریزر نے یہ اشارہ بھی کر دیا کہ تجہیز و تکفین میں دیر نہ ہو۔ اسے اب بھی خوف تھا کہ لاش اگر دیر تک رونمائی کے لئے رکھی رہی تو نقض امن پیدا ہو سکتا ہے۔

یہاں تاخیر کا سوال یوں بھی نہ تھا۔ مٹی کو لوگ اسی سیاہ کپڑے میں لپیٹے ہوئے اور گہوارے میں ڈال کر کاندھوں پر رکھ کر نواب شمس الدین احمد کی بلی ماران والی حویلی میں لائے، کہ میرزا مغل بیگ خان کی حویلی بھی اس کے قریب تھی اور عورتیں سب وہیں جمع تھیں۔ نواب کو ان کے اپنے حجرۂ خاص میں غسل دیا گیا۔ تکفین اور دعاؤں کے بعد قرأت سورۂ یٰسین شریف کی چھاؤں میں جنازہ اٹھا اور قدم شریف لے جایا گیا۔ نماز جنازہ آٹھ ہزار کے مجمعے میں مولانا شاہ محمد اسحٰق نبیرۂ حضرت شاہ عبدالعزیز نے پڑھائی۔

قدم شریف کی تاریخی حقیقت تو کچھ نہ تھی، لیکن عقیدۂ عوام میں یہ بالکل اصلی سچی متبرک یادگار رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اسے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت پانچ سو برس آگے مدینۂ منورہ سے لائے تھے۔ مشہور تھا کہ جب حضرت مخدوم نے روضۂ پاک کے اندر حاضر ہونا چاہا

تو وہاں کے پاسبانوں نے کہا کہ مزار مبارک کا دروازہ صرف آل رسولؐ کے لئے کھل سکتا ہے۔ تمھارے پاس کوئی ثبوت ہو کہ تم آل رسول سے ہو، تو لاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں جتنے علما و صلحا و اتقیا تشریف رکھتے ہیں پاس آجائیں تو میں ان کے سامنے دروازہ کھلنے کی درخواست کروں۔ جب سب جمع ہو گئے تو ہر ایک نے اپنی اپنی باری پر کہا، الصلواۃ و السلام علیک یا رسول اللہ۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ جب حضرت مخدوم کی باری آئی تو آپ نے وضو تازہ کیا، دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا، الصلواۃ و السلام علیک یا رسول اللہ۔ فوراً جواب آیا، الصلواۃ و السلام علیک یا احسن ولدی اور دروازۂ متبرک کا قفل آپ سے آپ کھل کر گر گیا۔ آپ کا یہ درجہ دیکھ کر سب ششدر رہ گئے۔ وہاں کے خلیفہ نے آپ کو آنحضورؐ کے قدم مبارک کی زیارت کرائی اور آپ نے حسب الحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے خلیفہ سے حاصل کر لیا اور اس رطل گراں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے دہلی شریف لے آئے۔ یہاں فیروز شاہ خلجی کے حکم سے قدم شریف کو فیروز آباد میں رکھا گیا اور سلطان نے وصیت کی کہ میری وفات کے بعد قدم مبارک کو میرے سینے پر رکھ کر مجھے دفن کیا جائے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سلطان فیروز شاہ کے بجائے یہ دولت اس کے پیارے اور یتیم پوتے فتح خان کے نصیب میں آئی۔ فتح خان کی وفات پر سلطان نے قدم شریف اس کے سینے پر رکھوا دیا اور کچھ اور بھی تبرکات اس کے مرقد میں رکھ دیئے گئے۔ فیروز تغلق نے ایک مسجد، ایک مدرسہ، اور ایک کنواں وہاں بنوایا، آب زمزم جتنا اس کے خزانے میں تھا، سب اس کنویں میں ڈلوا دیا گیا اور اس کے پانی سے دس من مصری کا شربت لنگر کے ساتھ زائرین میں روزانہ تقسیم ہوتا۔ فیروز تغلق نے کچھ آراضی ''ضرتح خاص'' نام دے کر قدم شریف اور اس کی عمارت کے لئے وقف کر دی۔

قدم شریف، چاہ زمزم، اور کچھ دوسرے بزرگوں کی قبروں کے علاوہ اس کی عمارت کے نواح میں ایک مزار تھا جس پر ایک املی کا پیڑ سایہ کئے ہوئے تھا۔ اس مزار پر عورتیں منت مانتی تھیں اور علامت کے طور اپنے پہننے کی کانچ کی چوڑیاں درخت کی شاخوں پر لٹکا دیتی تھیں۔ مراد پوری ہونے پر چاولوں سے تیار کیا ہوا کھانا اور چوڑیوں کا جوڑا نذر کے طور پر چڑھایا جاتا۔ قدم شریف کے صحن میں بشکل حوض، سنگ مرمر کا ایک کٹہرا تھا۔ یہ حوض شکر، دودھ، گلاب کی پنکھڑیوں اور پانی سے ہمہ وقت بھرا رہتا۔ لوگ یہ پانی تبرک کے طور پر پیتے تھے۔

تاریخی حقیقت کچھ بھی سہی، لیکن خلق اللہ کے دلوں میں قدم شریف کی عمارت اور اس کے نواح کی بے حد تقدیس و تکریم تھی۔ بڑے بڑے لوگ یہاں دفن ہونے کی آرزو رکھتے تھے اور اس کے لئے پہلے

سے اہتمام کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا جب نواب شمس الدین احمد خان کے بارے میں دہلی کی خلقت کی متفقہ رائے ہوئی کہ وہ شہید ہوئے اور انھیں قدم شریف میں مدفون کیا جائے تو انگریزوں کو بہت برا لگا اور انھیں تشویش بھی ہوئی کہ نواب کا مزار کہیں ہمارے خلاف فتنہ وفساد کا محور نہ بن جائے۔ لیکن لوگوں کے تیور اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ ٹامس مٹکاف اور سائمن فریزر کو چپ سادھے رہنے ہی میں عافیت محسوس ہوئی (۱)۔

ایملی بیلی کی نظر میں قدم شریف کی وقعت وہاں شمس الدین احمد کی تدفین نے بھلے ہی کم کر دی ہو، لیکن نواب شمس الدین احمد کا مزار بہت دن تک خلق خدا کا مرجوعہ رہا۔ ہر سال وہاں عرس ہوتا اور عرس کے موسم کے سوا بھی قدم شریف کے تمام زوار، کیا سنی کیا شیعہ، کیا نانک پنتھی کیا غیر مذہب، نواب شمس الدین احمد کے مزار پر چڑھاوا چڑھانا، یا نیاز دلوانا، یا فاتحہ پڑھنا اپنا فرض جانتے تھے۔

---

(۱) اس واقعے کے دس سال بعد ٹامس مٹکاف کی بیٹی ایملی بیلی (Emily Bayley) نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ قدم شریف کی تقدیس اب بہت گھٹ گئی ہے اور نواب شمس الدین احمد جیسے خونی اور نابکار مجرم بھی وہاں دفن ہونے لگے ہیں۔

آیا تھا اک سیلاب سا

عرس کے موسم میں تو وزیر خانم گھر سے نکلتی ہی نہ تھی، لیکن عام دنوں میں وہ روزانہ چراغ جلے حبیبہ یا راحت افزا کو، یا دونوں کو ساتھ لے کر مزار پر جاروب کشی اور چراغ جلانے کے لئے جاتی، پھر وہیں دیر تک مراقب رہتی۔ بیچہ مہ ستی کا یہ شعر اکثر اس کے ورد زبان رہتا۔

کوکب بختم کہ بود از وے منور آسماں
بنگرا ے مہ کز فراقت در زمین است ایں زماں

لیکن شمس الدین احمد خان کے نام کی مناسبت سے دوسرا مصرع وہ یوں پڑھتی ع

بنگرا ے خور کز فراقت در زمین است ایں زماں

ان دنوں حافظ کی ایک غزل کے شعر بھی اکثر اس کی زبان پر رواں ہوتے۔ کبھی وہ انھیں زیر لب گنگناتی، کبھی صبحدم اٹھ کر مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھتی، پھر دو رکعت نفلی نماز پڑھ کر نواب کی روح کو ایصال ثواب کرتی، اور دعا ختم ہوتے ہوتے اس کی زبان پر اشعار رواں ہو جاتے۔ لیکن بہت جلد پھر اس کی آواز سسکیوں میں ڈوبنے لگتی۔ جب سسکیاں رکتیں تو وہ پھر سے درود پڑھ کر اور دعا مانگ کر نواب کی روح کو ایصال ثواب کرتی اور دل ہی دل میں، اور کبھی کبھی سرگوشی کے لہجے میں شعر پڑھتی۔

شربتے از لب لعلش نہ چشیدیم و برفت
روے مہ پیکر او سیر نہ دیدیم و برفت
گوئی از صحبت ما نیک بتنگ آمدہ بود
بار بر بست و بہ گردش نہ رسیدیم و برفت
عشوہ دادند کہ بر ما گذرے خواہی کرد

دیدی آخر کہ چنیں عشوہ خریدیم و برفت
شد چماں در چمن حسن و لطافت لیکن
در گلستان وصالش نہ چمیدیم و برفت
ہم چو حافظ ہمہ شب نالہ و زاری کردیم
کاے دریغا بہ وصالش نہ رسیدیم و برفت

اپنے نواب کے مزار پر جانے کے علاوہ وزیر خانم نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا، حتیٰ کہ وہ منجھلی بیگم کے یہاں بھی نہ جاتی۔ بڑی نے، اور پھر باپ نے اس کے گھر آ کر رسمی طور پر تعزیت کے کلمے کہہ دیے تھے۔ ان فقروں کی یاد اسے اتنی ہی عزیز تھی جتنی شمس الدین احمد کی یادیں اسے عزیز تھیں۔ اسے اس بات سے بھی کچھ تسلی ہوئی کہ اس کے باپ اور بڑی بہن دونوں کا دل نواب مرزا کی طفلانہ اداؤں اور دلچسپ شوخیوں نے موہ لیا تھا۔ آمد و رفت تو انھوں نے شروع نہ کی، لیکن محمد یوسف سادہ کار اکثر نواب مرزا کے لئے کچھ نہ کچھ بھجواتا رہتا اور کبھی کبھی اسے خود بھی بلوا کر اپنے پاس سارا سارا دن رکھتا اور شام کو با دل ناخواستہ ماں کے یہاں واپس اس پیغام کے ساتھ بھجوا دیتا کہ بہت جلد پھر بلواؤں گا۔

بڑی بیگم نے رخصت کے وقت آنکھوں میں آنسو بھر کر وزیر کو گلے سے لگا کر کہا تھا کہ تیری جوانی کو اس طرح اجڑتے دیکھ کر کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ کاش میں تیرے کچھ کام آ سکتی۔ لیکن وزیر سے کچھ مناسب جواب نہ ملنے کی وجہ سے بڑی بیگم نے پرانی بے تعلقی کے انداز دوبارہ اختیار کر لئے تھے۔ منجھلی نے جانا آنا حسب سابق برقرار ہی نہ رکھا بلکہ اور بھی بڑھا دیا۔ نواب مرزا کی محبت اسے بھی بہت تھی۔ خود بے اولاد ہونے کی وجہ سے نواب مرزا اسے اور بھی پیارا لگتا تھا۔

مالی حیثیت سے وزیر خانم پہلے کی طرح مستحکم نہ رہی تھی، لیکن بدحال بھی نہ تھی۔ انگریزوں نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست اور قلعے کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس باعث افضل النسا بیگم اور حسینی بیگم کو اپنی عدت پوری کئے بغیر ہی وہاں سے نکلنا پڑا۔ ادھر شمس الدین احمد خان کے خلاف کئی لاکھ کا بقایا ثابت کر کے دریا گنج کی حویلی اور اس کے تمام بیش بہا شیشہ آلات، فرش فروش اور سامان کو اونے پونے نیلام کرانے کے بعد صاحبان والاشان نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ابھی شمس الدین احمد کے بقایاجات کا پورا بھگتان نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایک طرف تو افضل النسا بیگم کے مہر کی رقم بحق سرکار کمپنی بہادر ضبط کرنے کی کارروائی شروع کر دی تو دوسری طرف چاندنی چوک میں وزیر خانم کے مکان کو قبضے میں لینے اور وزیر کو

وہاں سے بے دخل کرنے کی بھی کوشش کی۔ وزیر کے پاس چونکہ مکان کے لئے قبضۂ مالکانہ کے تمام کاغذات درست اور مہیا تھے اس لئے بے دخلی کے احکام و اقدام غیر موثر رہے۔ البتہ افضل النسا بیگم کو سرکار کمپنی کے خزانۂ ضلع ہانسی حصار سے اپنی رقم واگذار کرانے میں کئی برس لگے۔ اس دوران وہ اپنی بچیوں کے ساتھ اپنے باپ کی حویلی واقع بلی ماران میں رہیں۔

چمپا اور رحمت النسا کو وزیر خانم نے حسب وصیت نواب شمس الدین احمد خان اپنے پاس بلوا کر رکھا اور ہر طرح ان کی کفیل بھی رہی۔ حسینی بیگم عرف امیر بہو کو جہانگیرہ بیگم نے اپنے پاس اکبرآباد بلوالیا۔ بیوگی کے چند سال موٹا جھوٹا پہن کھا کر گذارنے کے بعد بھی ان کے حسن و جمال میں کچھ فرق نہ آیا اور بالآخر امیر بہو نے نکاح ثانی کر لیا اور زندگی کے بقیہ دن چپ چاپ باعزت گمنامی میں کاٹ لے گئیں۔ چمپا کا بھی نکاح نواب جھجھر کے ایک بوڑھے پشتینی خدمت گذار کے ادھیڑ دوہاجو بیٹے محمد علی سے ہو گیا اور وہ بھی اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے گھر کی ہو رہی۔ افضل النسا بیگم نے دعویٰ دائر کیا کہ نواب شمس الدین احمد نے اپنے کیے کی سزا پائی لیکن ان کی ریاست فیروز پور جھرکہ ان کے پس ماندگان، یعنی ان کی دو قانونی اور جائز اولادوں احمد النسا بیگم اور شمس النسا بیگم کو مل جانی چاہیئے کہ وہ بے گناہ اور معصوم ہیں۔ یہ دعویٰ ریزیڈنٹ و صاحب کمشنر ٹامس مٹکاف صاحب بہادر نے پہلی ہی سماعت میں خارج کر دیا۔

درایں اثنا یہ خبر اڑی کہ کمپنی بہادر کے عہدہ داران بالا و حاکمان اعلیٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ شمس الدین احمد کے اعقاب میں کوئی ایسا باقی نہ رکھا جائے جو آئندہ ان کی ریاست کا دعوے دار ہو سکے یا ان کی موت کے لئے کچھ تاوان طلب کرے۔ افواہیں گرم ہونے لگیں کہ نواب مرزا اگرچہ اولاد شمس الدین احمد کی زن منکوحہ سے نہیں ہیں اور اسلامی قانون کی رو سے حق ان کا کوئی باپ کے ترکے پر نہیں ہے، لیکن قانون انگریزی کے اعتبار سے وہ پورے پورے حقدار ہیں، اور اسی لئے قانون فرنگ میں ایسی اولاد کو ''فطری بیٹا'' (Natural son) اور ایسی اولاد کی ماں کو اپنے مرد کی ''زوجہ از روے قانون عامہ'' (Common Law Wife) کہتے ہیں۔ لہٰذا کمپنی بہادر کی خفیہ رائے ہے کہ نواب مرزا کو کسی طور زہر دلوا دیجئے، یا کسی پیشہ ور بچہ دزد کے ہاتھوں اسے اٹھوا کر کہیں دور دراز کسی راجا یا نواب کے یہاں چپ چپاتے رکھوا دیجئے کہ وہاں وہ کنج خمول میں پرورش پائے اور اس کا نشان نہیں تو نام ضرور مٹ جائے۔

ظاہر ہے کہ ان خبروں اور افواہوں کی کچھ اصل نہ تھی لیکن وزیر کی تو جان ہی سوکھ گئی کہ اب

میرے بچے کا والی وارث کون بنے گا اور میں اسے لے کر کہاں چھپ جاؤں کہ اس پر فرنگی کی نظر نہ پڑے۔ انھیں دنوں وزیر کو ٹنڈل بھائی بہن کا ایک فارسی میں لکھا ہوا مراسلہ ملا جس میں درج تھا کہ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کا نام ایک سزا یافتہ خونی کی داشتہ کے طور پر مشہور ہو چکا ہے اس لئے ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ مارسٹن بلیک صاحب جیسے عالی مرتبت انگریز کی صلبی اولادیں چھوٹی بیگم جیسی گری ہوئی عورت سے منسوب کی جائیں۔ لہٰذا آج کی تاریخ سے مارٹن بلیک اور سوفیہ بلیک کو مذہب عیسوی میں داخل کر لیا گیا ہے اور اب انھیں اپنی ماں سے ملنے کی اجازت نہ ہوگی۔ جب مارٹن بلیک اور سوفیہ بلیک کو بحساب قانون انگریزی سن بلوغ حاصل ہو جائے گا تو اس وقت انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا۔ فی الوقت انھیں مذہب نصرانی و طریق فرنگی پر چلایا جائے گا۔ اپنی شادیاں وہ اپنی مرضی سے، لیکن ہم سے اجازت لے کر کریں گے۔ اب انھیں اس بات کا پورا اذعان ہے کہ بمقابلۂ ہندیان صاحبان انگلستان بدر جہا بہتر ہیں۔ آخر میں یہ بھی درج تھا کہ اب چونکہ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم کا سارا ربط و تعلق ماسٹر مارٹن بلیک اور مس سوفیہ بلیک سے منفک و منقطع ہو گیا ہے، لہٰذا چھوٹی بیگم کو اب سے ان دونوں بچوں کی کفالت یا تعلیم کے لئے انفاق زر کی ضرورت نہیں۔

وزیر سناٹے میں آ گئی۔ وہ بڑی دیر تک رنج اور غصے اور روحانی احتجاج کے عالم میں چپ بیٹھی رہی۔ جب زیادہ بے چین ہو جاتی تو سسکیاں بھر کر رونے لگتی کہ یا اللہ کیا سارے ستم میرے ہی لئے لکھ دیئے گئے ہیں۔ حبیبہ اور راحت افزا کی دلجوئیوں اور موانست اور غم گساریوں کے بعد جب اس کا دل کچھ ٹھہرا تو اس کا جی چاہا کہ ابھی کسی صورت سے جے پور چلی جائے اور ٹنڈل بھائی بہن کے خلاف دعویٰ داخل کر دے اور پھر ان کے گھر جا کر ان سے خود بحث و مباحثہ کرے، لڑے جھگڑے، اور اپنے بچے ان سے واپس لے لے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن العمل تھی، اور جب ماٹن بلاک صاحب کے گذرنے پر... اللہ اس سانحے کو لگتا ہے ایک عمر گذر گئی... میرا اور ٹنڈل بھائی بہن کا مجادلہ بچوں کے بارے میں ہوا تھا اس وقت بھی ان لوگوں نے کہہ دیا تھا کہ ہماری قانونی حیثیت مستحکم ہے اور اگر تم ہم پر دعویٰ لاؤ گی بھی تو ہمارا کچھ نہ ہوگا... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ راج ان کا، فوج اور پولس دار، چوکی سپاہی، سب ان کے، اور میں اکیلی عورت، یہ دنیا مرد کی غلام اور عورت کی دشمن ہے۔ میں اس بھنور کی گرہ نہیں کھول سکتی...

اگلے دن جب وزیر کے اوسان کچھ بجا ہوئے تو اس نے میرزا اسفندیار بیگ کو بلوا کر ان سے مشورہ کیا۔ اسفندیار بیگ کا دل یوں ہی شکستہ تھا کہ نواب شمس الدین احمد کی وکالت میں وہ ناکام رہے

تھے۔ کلکتہ جا کر انھوں نے انگریزوں کے داب وجلال جہانبانی اور ان کے نظام سیاست میں مروت کی کمی اور انسانیت اور دردمندی کی جگہ بے مہری اور کینہ وری کا وفور دیکھ کر یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ قوم اپنے بنائے ہوئے قوانین اور اپنے آداب حکمرانی سے تجاوز کرنا نہیں جانتی اور اس کے قوانین و آداب اصلاً و اصولاً اس کے لئے ہی سودمند ہیں۔ بدیں وجوہ اسفندیار بیگ نے گول مول الفاظ میں وزیر کو یہی مشورہ دیا کہ اس وقت حالات آپ کے نامساعد ہیں، انتظار اس وقت کا کیجئے جب تقدیر کوئی اچھی کروٹ لے۔

نواب مرزا کے بارے میں انگریزوں کے منصوبوں کی افواہیں (ہر چند کہ وہ بالکل بے اصل تھیں) سن سن کر وزیر یوں ہی بے حد متوحش ہو رہی تھی، اب پہلوٹھی کے بچوں کی طرف سے مایوسی نے وزیر کے دل میں نواب مرزا کی حفاظت اور اسے ہر ممکن گزند سے بچانے کا خیال اور بھی شدید کر دیا۔ کئی دن کے غور و فکر کے بعد، لیکن نہایت ناراضامندی اور دلی رنج کے ساتھ وزیر نے فیصلہ کیا کہ نواب مرزا کی سلامتی اور مناسب پرداخت کے لئے ضروری ہے کہ اسے منجھلی باجی اور نواب یوسف علی خان کی پناہ میں دے دیا جائے۔ منجھلی بیگم کے توسط سے وزیر نے نواب صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی تو وہ اس قدر خوش ہوئے گویا اس بات کے منتظر رہے ہوں۔

بات چیت کے بعد طے یہ ہوا کہ حبیب النسا کو نواب مرزا کے ساتھ کر دیا جائے گا اور نواب مرزا کی تعلیم، تربیت اور پرداخت نواب یوسف علی خان کے زیر انصرام اسی طرح عمل میں آئے گی جس طرح دیگر رؤسا اور شرفا کے بچے پلتے ہیں۔ نواب مرزا کی حیثیت عمدہ خانم کے حقیقی بھانجے کی ہوگی۔ اسے نواب یوسف علی خان یا عمدہ خانم کا متبنیٰ یا منھ بولا بیٹا نہ بنایا جائے گا اور اسے نواب شمس الدین احمد خان شہید اور وزیر خانم کی اولاد ہی کہا جائے گا۔ نواب کی واحد اولاد نرینہ ہونے کے باعث نواب مرزا ہی سے نواب شمس الدین احمد کی نسل کے قائم رہنے کا امکان تھا۔ وزیر کا آنا جانا نواب یوسف علی خان کے یہاں اور نواب مرزا کا آنا جانا وزیر خانم کے یہاں حسب سابق بے روک ٹوک ہوگا۔

یہ بات اوائل ۱۸۳۶ کی ہے، وزیر نے آنسو پی پی کر نواب مرزا کی سلامتی کے لئے دعائیں کیں، اس کے بازو پر کئی کئی امام ضامن بندھوائے اور کئی کئی بار سینے سے لپٹا کر بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور نواب یوسف علی خان کے بھجوائے ہوئے رتھ میں اس کے سارے کپڑوں لتوں، کھلونوں، الف بے کی تختی، گنتی گننے کی تسبیح وغیرہ سارے ساز و سامان کے ساتھ بالوں میں تیل، آنکھوں میں کاجل اور ماتھے پر نظر کا ٹیکہ دے کر رخصت کیا۔ نواب مرزا کی عمر اس وقت کوئی پانچ سال کی تھی۔ اس کے باپ کی موت کو

ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا، لیکن باپ سے جدائی کو بہت مدت گذر چکی تھی۔ اس پورے زمانے میں بچے نے باپ کو یاد نہ کیا تھا، اس معنی میں کہ جس طرح مثلاً جی برا ہونے، یا چوٹ لگ جانے، یا دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں جھڑپ ہو جانے پر بچہ اپنے باپ یا باپ ماں دونوں کو پکارتا ہے، یا روتا ہے کہ ہمارے ابا کہاں ہیں، ایسی کوئی بات کبھی نواب مرزا کے ساتھ نہ ہوئی تھی۔

شروع شروع میں تو اسے یہ کہہ کر بہلا وا دیا جاتا تھا کہ آپ کے ابا جان علاقے پر ہیں اور وہاں کے انتظام میں لگے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی حبیبہ کہتی کہ کل رات تو وہ آئے تھے پر آپ سو گئے تھے، ہم لوگوں نے جگایا نہیں کہ سوتے سے بے وقت اٹھا دینے سے جی آپ کا ماندہ نہ ہو جائے۔ پھر وہ کچھ مٹھائی یا کپڑے یا کوئی تحفہ چیز، کبھی کوئی خوبصورت چڑیا، یہ کہہ کر اسے دیتی کہ لیجئے بچے میاں صاحب، آپ کے ابا جان یہ آپ کے لئے لائے تھے۔

لیکن یہ حیلے کب تک چل سکتے تھے۔ تیرا باپ ایک بڑے حکیم کے زیر علاج ہے اور وہیں وہ آرام کی نیند سوتا رہتا ہے، یہ ایک نئی بات نواب مرزا کو اس وقت بتائی گئی تھی جب ایک بار نواب مرزا نے بہت ضد کی تھی کہ مجھے ابا جان کنے جانا ہے، مجھے تحفے نہیں چاہئیں۔ میں ان کے ساتھ بجار کی سیر کو جاں گا۔ اسے یہ کہہ کر تسلی دی گئی کہ بیٹا تمھارے ابا جان کو لڑائی میں چوٹ لگ گئی ہے۔ شہر سے بہت پرے ایک حکیم جی رہتے ہیں، وہ انھیں حکیم جی کے پاس ہیں۔

''تو پھر وہ واپس آتے کیوں نہیں؟ چھوتے کب ہوں گے بھلا؟'' وہ راحت افزا سے پوچھتا۔

راحت افزا منھ موڑ کر دوپٹے سے آنسوؤں کو چپکے چپکے خشک کرتی ہوئی کہتی:

''بچے میاں، تمھارے ابا جان کو کہیں کسی شے کی کمی تو ہے نہیں۔ وہاں بھی وہ بڑے آرام سے ہیں تم کچھ بھی فکر نہ کرو۔ نہیں تو اپنی اماں جان یا خالہ جی سے پوچھ لو۔''

اب کوئی باہر والا بے سمجھ شخص کبھی پوچھ دیتا کہ نواب مرزا جی، آپ کے ابا جان کہاں ہیں، تو وہ بہت متین اور کچھ امید بھرے لہجے میں جواب دیتا:

''وہ قم شریف میں چھولے ہیں۔ حکیم جی انھیں وہاں دوا پلاتے ہیں۔''

اس کے کئی مہینے بعد جب شمس الدین احمد کا شجر زیست خزانی ہو چکا اور اس کا جسد خاکی قدم

شریف کے آنگن میں ایک مولسری کے درخت کے نیچے ابدی نیند کے لئے لٹا دیا گیا اور جولائی ۱۸۳۴ کی اس اسرار عشق وحیات سے بھری ہوئی رات کے بعد وزیر خانم کا آرام جاں پہلی بار اس کے پہلو میں تھا، اگر چہ زیر خاک تھا اور وزیر خانم اس کے بچے کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی تو وزیر کے کچھ کہے بغیر نواب مرزا نے آپی آپ کہا کہ ’’اماں جان، میلے ابا جان کے حکیم صاحب کہاں ہیں؟‘‘

وزیر خانم ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گئی کہ حکیم کا یہاں کیا مذکور ہے؟ معاً اسے خیال آیا کہ بچہ کسی بنا پر وہم میں ہے کہ قدم شریف ہی وہ جگہ ہے جہاں اس کا باپ حکیم صاحب کے زیر علاج ہے۔ وہ اپنی سسکی دبا کر بولی، ’’بیٹا وہ دونوں اسی مزار کے نیچے ایک حجرے میں ہیں۔‘‘

’’اماں جان میں بھی وہاں جاں گا۔‘‘ نواب مرزا نے کچھ مچل کر کہا۔

’’نہیں، نہیں،‘‘ وزیر نے گھبرا کر کہا۔ ’’ایسی بات نہیں کہتے۔ اللہ میاں کو برا لگے گا۔ جب تمھارے ابا جان اچھے ہو جائیں گے تو حکیم صاحب انھیں خود ہی واپس بھیج دیں گے۔‘‘

معلوم نہیں نواب مرزا نے اس بات پر کس حد تک یقین کیا اور کس حد تک اس کی قوت تخیل نے اس کے دل کے اندر اور آنکھوں کے سامنے ایسی تصویر کھینچ دی جو اس کے لئے حقیقت تھی، لیکن نواب مرزا نے اس کے بعد سے مدتوں یہی کہا کہ ہمارے ابا جان حکیم صاحب کے پاس قدم شریف میں ہیں۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد اس نے اپنے دل کے طاق میں شمس الدین احمد خاں کے بجائے میرزا فتح الملک بہادر کی شبیہہ رکھ دی، لیکن زندگی کے اکثر کٹھن موقعوں پر وہ خواب میں ایک خوبصورت، متین، متدین، بارعب شخص کو دیکھتا جس کے بارے میں اسے یقین ہوتا کہ یہ قدم شریف کے حکیم صاحب ہیں اور وہ مجھے میرے باپ کے بارے میں بتانے آئے ہیں۔

اب ۱۸۳۶ میں فروری کی کسی تاریخ میں صبح کا وقت تھا جب بیٹا خوشی خوشی ماں سے جدا ہوا۔ شام ہوتے ہوتے وزیر کو سخت تپ چڑھ آئی۔ وہ کئی دن صاحب فراش رہی اور بخار کے اشتداد میں وہ کبھی نواب مرزا کو بلوانے کے لئے واویلا کرتی کبھی امیر مرزا اور بادشاہ بیگم کو پکارتی۔ لیکن مارسٹن بلیک یا شمس الدین احمد کا نام اس کی زبان پر کبھی نہ آیا۔ اس کی ساری خدمتیں راحت افزا اور ونیسی نے انجام دیں۔ منجھلی کبھی تنہا کبھی نواب مرزا کے ساتھ دوسرے تیسرے دن چھوٹی بہن کو دیکھنے اور دلجوئی کرنے آجاتی تھی۔ تیرہویں دن وزیر کے پیٹ اور سینے پر موتی جھرے کے دانے نمودار ہوئے۔ تپ تو کچھ کم ہوئی لیکن کمزوری اور بھی بڑھ گئی، اور اس زمانے کے اطبا (بلکہ موجودہ زمانے میں کچھ مدت پہلے تک ڈاکٹر

بھی) موتی جھرے کے مریض کو خالی پیٹ ہی رکھنا پسند کرتے تھے۔ کئی دن تک صرف عرق بادیان، عرق زنجبیل اور شربت انار شیریں پر وزیر کی قوت کا دار و مدار تھا۔ خدا خدا کر کے اکیسویں دن دانے مرجھانے لگے اور بائیسویں دن تپ اتری لیکن نقاہت نے مزید کئی ہفتے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ بچے کی جدائی اور طویل بیماری نے اسے اپنی تبدیل حال پر اور بھی دل شکستہ اور محزون بنا دیا لیکن اسے اپنے مستقبل کے لئے کوئی راہ نظر نہ آتی تھی۔

دسمبر ۱۸۳۵ آتے آتے انگریزوں کو اطمینان ہو گیا کہ نواب شمس الدین احمد خان کو سولی دینے کے نتیجے میں کسی فتنہ و فساد کے برپا ہونے کا امکان اب نہیں رہا۔ جاسوسوں کی اطلاع تھی کہ عوام الناس میں شمس الدین احمد کی جوانا مرگی پر جذبۂ رنج تو تھا، لیکن مرضی مولا اور کارستانی تقدیر پر جذبۂ صبر و تحمل بھی تھا۔

عام خیال یہی تھا کہ نواب شمس الدین احمد کا ہاتھ قتل فریزر کے پیچھے رہا ہو یا نہ رہا ہو، لیکن یہ محض شومی قسمت تھی کہ کئی سراغ ایسے مل گئے جو ان کے خلاف پڑتے تھے اور اس سے بھی سوا یہ کہ انیا نے اپنے مالک کے ساتھ دغا کر کے نمک حرامی کی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ گولی تو شمس الدین احمد کے ہاتھ سے چلی نہ تھی، پھر انھیں بھلا کس طرح سزا کا مستوجب قرار دیا جا سکتا تھا؟ فینی پارکس نے الہ آباد میں اپنی ڈائری میں لکھا کہ لوگ یہاں عام طور پر کہہ رہے ہیں کہ کریم خان کو پھانسی دینا ٹھیک مان بھی لیا جائے تو بھی نواب کو سولی دینے کا کچھ جواز نہ تھا کہ نوکر کے کئے کی سزا مالک کو دینا بعید از انصاف ہے۔

بدامنی کا کوئی خطرہ نہ دیکھ کر انگریزوں کے ایوان مشاورت میں سکندر صاحب کے مشورے پر یہ متعین کیا گیا کہ قتل کے فوراً بعد تو ولیم فریزر کو ریزیڈنٹی کے قبرستان میں چپ چپاتے دفن کر دینا باصواب تھا۔ لیکن اب ان کی شان کے مطابق مقبرہ بننا چاہیئے اور ان کا جنازہ بھی اسی کر و فر اور شکوہ و صولت و دبدبہ سے اٹھنا چاہیئے جس طرح وہ زندگی کرتے تھے۔ سکندر صاحب نے کشمیری دروازے پر واقع اپنے گرجا گھر موسوم بہ (Saint James') میں مناسب زمین کی پیش کش کی اور یہ بھی کہا کہ مقبرے کی تعمیر کا صرفہ اٹھانے کو وہ تیار ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین و صرفہ و تعمیر کے قضایا حل ہو جانے کے باقی کچھ نہ رہتا تھا۔ تجویز خوشی سے منظور کر لی گئی۔

جیمس اسکنر نے روپیہ بے دریغ خرچ کیا اور بہت جلد سفید سنگ مرمر کی ایک ہشت پہلو عمارت تیار کرا دی جو اپنے اسلوب کے اعتبار سے فرنگیانہ تھی لیکن سنگ مرمر کی پچی کاری میں مغل طرز کی

تھوڑی بہت نقل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔عمارت قدیم یونانی طرز کے آٹھ کھمبوں پر کھڑی کی گئی تھی لیکن اس کا چبوترہ جو دوسری کرسی کا بھی کام دیتا تھا، سنگ سرخ کا بھی تھا اور اس پر سادہ لیکن مغل انداز کی نقاشی تھی۔چبوترے کی کرسی بھی سنگ سرخ کی اور بالکل سادہ تھی۔عمارت کی چھت کو سنبھالنے کے لئے وہی آٹھ کھمبے اوپر جا کر یونانی طرز میں چوڑے کر دیے گئے تھے اور چاروں طرف سادہ کارنس سی بنا دی گئی تھی جس کے نیچے سنگ مرمر کی چوڑی پٹی پر سنگ سیاہ کی پچی کاری تھی۔عمارت کا سب سے نمایاں حصہ اس کا بھاری اور اونچا کلس تھا جسے بہت ہی نیچے گنبد پر اٹھایا گیا تھا۔گنبد اور کلس دونوں ہی سنگ مرمر کے تھے اور انھیں کچھ ہندوانہ کچھ فرنگیانہ طرز میں کنول نما تراشا گیا تھا۔پوری عمارت سے یہ تاثر پیدا ہوتا گویا ایک بھاری بھرکم تاج رکھا ہوا ہو۔

لوح مزار پر اسکنر نے حسب ذیل عبارت کندہ کرائی :

THE REMAINS

INTERRED BENEATH THIS MONUMENT

WERE ONCE ANIMATED

BY AS BRAVE AND SINCERE

A SOUL

AS WAS EVER VOUCHSAFED TO MAN

BY HIS

CREATOR.

A BROTHER IN FRIENDSHIP

HAS CAUSED IT TO BE ERECTED

THAT WHEN HIS OWN FRAME IS DUST

IT MAY REMAIN

AS A

MEMORIAL

FOR THOSE WHO CAN PARTICIPATE IN LAMENTING

THE SUDDEN AND MELANCHOLY LOSS

OF ONE

DEAR TO HIM AS LIFE

WILLIAM FRASER

DIED 22ND MARCH 1835

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتبۂ مزار کے الفاظ نہایت موثر، باوقار، اور مناسب حد تک درد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس بات میں کچھ کسر نہ چھوڑی گئی تھی کہ فریزر کو ایک مثالی اعلیٰ کردار، ہردل عزیز انسان کی حیثیت سے یاد کیا جائے لیکن اس کے قتل کا کچھ ذکر نہ کیا جائے۔ اسکنر نے اپنا نام تو نہ لیا لیکن خود کو دوستی کے اعتبار سے متوفی کا بھائی قرار دیا اور اشارہ اس بات کا رکھا کہ میں تو تاحیات ولیم فریزر کا ماتم کروں گا ہی، میرے بعد اور بھی ماتم دار ہوں گے اور یہ یادگار دراصل مستقبل کے لئے قائم کی جا رہی ہے۔ پوری عبارت میں غم، اور غم سے زیادہ فرنگی نسلی مباہات، اور اس سے بھی زیادہ فرنگی شان کے تا قیامت قائم رہنے کے اشارے تھے۔ لیکن یہاں تاریخ نے اپنے رموز و اشارات کو تادیر مخفی نہ رکھا۔ پچیس سال بھی نہ گئے تھے کہ کشمیری دروازے کے علاقے کی ہر ہر اینٹ کے لئے حریت کے متوالوں نے اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔ اس کوچہ کوچہ جنگ کی ایک جھڑپ میں فریزر کا مزار بھی زد میں آ گیا۔ گرجا گھر اور قبر فریزر و لوح مزار تو محفوظ رہے لیکن وہ علامتی تاج نما قبہ جو مزار پر تھا اسے برابر خاک کر دیا گیا۔

رام پور

وزیر کا غم بہت آہستہ آہستہ کم ہوا اور درگاہ قدم شریف میں اس کی حاضری بھی کم ہونے لگی۔ آخر کار اب وہ صرف عرس کے ایک دن پہلے وہاں جاتی، شمس الدین احمد خان کے مزار پر آنسو بہاتی اور نواب کے نام پر کچھ خیر خیرات کر کے واپس آجاتی۔ نواب مرزا کی پرورش کا بوجھ اب بہت کم ہو جانے کے باعث اس کے اخراجات کم ہو گئے تھے لیکن اتنے نہیں کہ اپنے محدود وسائل کے اندر وہ آرام سے رہ سکتی۔ شرفا جیسی زندگی گذارنے کے لئے قیمتی زیور، بھاری کپڑے، سواری کے وسائل، اور متعدد نوکر درکار تھے۔ خرچ کو کم سے کم کرنے کے باوجود اس کی مستقل آمدنی ان ضرورتوں کا کفالہ نہ کر سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے منجھلی سے چھپا کر اپنے کچھ قیمتی جواہرات اور بھاری جوڑے چپکے چپکے فروخت کرنے شروع کر دیے۔ اب وہ گھر سے اس قدر کم نکلتی تھی کہ منجھلی بیگم کے یہاں بھی دو چار مہینے میں تیج تیوہار کے دن چار گھڑی کے لئے ہو آتی اور بس۔ اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ میری کتاب زیست کا شیرازہ بس شمس الدین احمد کا غم ہے۔ میں اس غم کو اپنے دل میں مجتمع کر لوں تو اپنے بقیہ دن سکون قلب سے نہ سہی لیکن دل سوزی اور صبر سے گذار لوں گی۔ اب مجھے آنا جانا کہیں نہیں ہے۔ اکثر وہ صیدی طہرانی کا یہ شعر پڑھتی اور تکیے میں سر دے کر گھنٹوں چپ چاپ پڑی رہتی۔

بے محبت پارۂ دلہا ز ہم پاشیدہ شود
مہر او اوراق ایں غم نامہ را شیرازہ شد

لیکن قضا و قدر نے وزیر کی تقدیر کا نقشہ شاید قلم سرمہ سے کھینچا تھا کہ اس میں رد و بدل کی، مٹانے اور از سر نو بنانے کی بڑی گنجائش تھی۔

اگست ۱۸۴۰ میں نواب محمد سعید خان کو ڈپٹی کلکٹری سے بلا کر والی رامپور مقرر کر دیا گیا اور ان

کے صاحب زادۂ بلند اقبال نواب محمد یوسف علی خان ان کے ولی عہد ہوئے۔ یہ نواب یوسف علی خان کے عروج کا آغاز لیکن ان کی بے فکری کے اختتام کا بھی آغاز تھا۔ اب انھیں دہلی کا قیام ترک کر کے رام پور (جس کا نام محمد علی خان نے بدل کر مصطفیٰ آباد رکھ دیا تھا) میں مستقل اقامت اختیار کرنی پڑی۔ عمدہ خانم اور نواب مرزا بھی نواب کے ساتھ مصطفیٰ آباد منتقل ہو گئے۔ وزیر خانم بالکل تنہا رہ گئیں۔ منجھلی بیگم نے وعدہ کیا تھا کہ کبھی کبھی نواب مرزا کو لے کر تم سے ملنے ملانے شاہجہاں آباد آجایا کروں گی۔ لیکن رام پور کے چھوٹے لیکن نئے ماحول اور پورے نوابی رنگ نے بہت سی نئی ذمہ داریاں ان پر ڈال دیں اور انھیں فرصت کم سے کم ملنے لگی۔ ادھر نواب مرزا بھی نواب یوسف علی خان کے بیٹے نواب کلب علی خان کے ہم سبق بنا کر رام پور کے فاضل اجل و عالم متبحر ملا غیاث الدین عزت رامپوری کے سامنے بٹھا دیے گئے تھے۔ اب نواب مرزا کی بھی زندگی میں لڑکپن کی بے فکری کے بجائے علم کی محنت طلبی اور شعر و سخن کی مضمون تراشی کا بول بالا ہونے والا تھا۔ اس طرح عمدہ خانم اندرون حویلی کی ذمہ داریوں، اور نواب مرزا تعلیم کے بندھنوں کے سبب مصطفیٰ آباد میں مقید ہو کر رہ گئے۔

نواب مرزا کے رامپور چلے جانے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وزیر خانم اور محمد یوسف سادہ کار کے درمیان وہ نیا تعلق جو نواب مرزا کے سبب قائم ہوا تھا، اب منقطع ہو گیا۔ محمد یوسف کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اسے حدت جگر اور ضعف معدہ کی پرانی شکایت تھی جو روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد وہ کھانے کے اہتمام سے بالکل بے پروا ہو گیا تھا اور حکیموں کی ہدایت کے برخلاف کھٹی، تلی ہوئی، مسالے دار چیزیں بے تکلف کھا لیا کرتا تھا۔ گوشت سے بھی اسے کوئی پرہیز نہ تھا۔ شاہ عالم کے فرمان کے بعد سے دلی میں گائے کا ذبیحہ اب خال خال ہی ہوتا تھا، لیکن بھیڑ اور دوسرے چھوٹے جانوروں کا گوشت بکثرت ملتا تھا۔ بکری کا گوشت عام طور پر مریضوں یا نفاست پسند امیروں کے لیے مختص تھا۔ عوام اور متوسط طبقے کے لوگ بھیڑ کا گوشت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ اسی زمانے میں علاء الدین احمد خان علائی اور میرزا غالب کے درمیان محبت بھرے بے تکلف قطعات کا ردو بدل ہوا اور ان کے اشعار سے اس زمانے کے کھانوں اور امرا کے ذوق کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ پہلا قطعہ غالب کا ہے، اور دوسرا علائی کا۔

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں

سرِ آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوب جاں
نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشے دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

علائی نے جواب میں لکھا۔

سرِ آغاز موسم میں کیا خوب ہے
کہ دلی سے حضرت لوہارو کو آئیں
سرولی کے وہ ڈاک پر سبز آم
وہ دلی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں
وہ لیں باغ سے جا کے املی کے پھول
وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحم طری
کہ کیا کیا اسے کھا کے ہم حظ اٹھائیں

بھیڑ کا ریشے دار گوشت دیر ہضم بھی تھا اور نفخ شکم بھی پیدا کرتا تھا۔ لیکن محمد یوسف کو اپنی صحت کا اب کچھ خیال نہ رہ گیا تھا، اور اسے چٹپٹی چیزیں کھانے کا شوق بھی تھا۔ بد پرہیزی اور عدم پابندی اوقات کے باعث اس کا جگر خراب ہوتا گیا۔ جگر کی خرابی کے باعث اسے بھوک بھی کم لگتی تھی اور انفاخ شکم اور

کثرت امتلا کی علت مزید اسے لاحق ہوگئی تھی۔ اس کا وزن گھٹتے گھٹتے بمشکل من سوا من رہ گیا تھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ نواب مرزا کی بدولت اسے چھوٹی بیگم کی نگہداشت اور کھانے پینے کے لئے پرہیزی چیزیں اور صحت کے سلسلے میں عام احتیاط پھر نصیب ہونے لگی تھی۔ وہ ساری احتیاط اور نگہداشت اب ختم ہوگئی اور محمد یوسف کا وہ حال ہونے لگا جو بیوی کے سانحۂ ارتحال کے بعد ہوا تھا۔

نومبر ۱۸۴۰ مطابق شوال ۱۲۵۶ کا آخری دن تھا جب اچانک محمد یوسف سادہ کار کو استفراغ دموی ہوا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب میری آخری گھڑیاں ہیں۔ جیسے تیسے غسل کر کے اس نے دو رکعت نفل پڑھی اور قرآن پاک لے کر بیٹھ گیا۔ محلے کے ایک لونڈے کو اس نے بڑی بیگم کے یہاں دوڑا دیا تھا کہ آ جا اور میری آخری رسوم کا انتظام کر دے۔ بڑی کے دل میں محبت خواہری نے جوش مارا تو وہ چھوٹی کو بھی خبر کراتی ہوئی پالکی میں بیٹھ کر جوں توں باپ کے یہاں پہنچی۔ محمد یوسف کو مصلے پر بیٹھے ہی بیٹھے ایک خونی قے اور ہوئی تھی اور وہ نیم غشی کے عالم میں سر نہوڑائے ہوئے مصلے پر بیٹھا ہوا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قرآن پاک کے اوراق کو خون کی کلیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حکیم غلام نجف خان صاحب بھی اسی وقت آ گئے تھے، انھوں نے نبض دیکھی تو بالکل دودی تھی، گویا تھی ہی نہیں۔ انھوں نے دھیمی آواز میں کہا:

"اب کچھ نہیں رہا۔ انھیں پلنگ پر لٹا کر قبلہ رخ کر دیں اور سورۂ یٰسین پڑھیں۔ غسال اور کفن کا بندوبست شروع کریں۔" یہ کہہ کر وہ گھر کے باہر نکل رہے تھے کہ چھوٹی بیگم انھیں دروازے پر ملی اور اس نے روتے ہوئے پوچھا، "حکیم صاحب میرے ابا جی کیسے ہیں؟ انھیں بچا لیجیے للہ۔"

"اب سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے بی بی۔ ہم لوگ یہاں بے بس ہیں۔"

چھوٹی بیگم دوڑتی، لڑکھڑاتی، آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی باپ کے پلنگ تک آئی۔ محمد یوسف کا ایک ہاتھ بڑی بیگم کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ سامنے قرآن کریم کا وہی نسخہ تھا جس کی تلاوت کے وقت محمد یوسف کو غشی آ گئی تھی۔ بڑی بیگم کا میاں سورۂ یٰسین پڑھ رہا تھا۔ محمد یوسف کی آنکھیں پتھرانے لگی تھیں، لیکن چھوٹی کو گمان ہوا کہ اسے دیکھ کر باپ کی آنکھوں میں پھر سے کچھ روشنی آ گئی ہے۔ اس نے دوڑ کر محمد یوسف کے قدموں میں سر رکھ دیا اور کہا، "ابا جی بس ایک بار میری طرف دیکھ لیں، میری خطائیں معاف کر دیں۔"

محمد یوسف کے دوسرے ہاتھ کو ذرا سی حرکت ہوئی۔ چھوٹی بیٹی نے بے اختیار ہو کر باپ کا ہاتھ

تھام لیا۔ ’’کلمۂ شہادت پڑھو چھوٹی۔ کلمۂ شہادت پڑھو۔ روؤمت۔‘‘ بڑی یہ الفاظ ادا ہی کر رہی تھی کہ محمد یوسف کو بڑی سی ہچکی کے ساتھ پھر خونی قے ہوئی۔ بیٹیوں نے ہاتھ بڑھا کر خون کی بوچھار کو روک لینا چاہا۔ لیکن محمد یوسف کے کاروان حیات کو روکنا اب ممکن نہ تھا۔

باپ کا واقعہ سنتے ہی منجھلی بھی روتی پیٹتی رامپور سے آئی۔ اسے آخری دیدار نصیب نہ ہوا، لیکن باپ کی موت نے بہنوں کو ایک بار پھر رشتۂ محبت میں باندھ لیا۔ تینوں کا آپس میں پہلے کی طرح ملنا جلنا ہونے لگا، پرانے تحفظات اور شکایتیں بھلا دی گئیں۔ بڑی نے ایک تجویز یہ رکھی کہ دونوں بڑی بہنیں اپنے حصے سے دست بردار ہو جائیں اور اباجی کا مکان اور اثاث البیت اور نقدی وغیرہ اگر کچھ ہو تو وہ سب چھوٹی کو دے دی جائے۔ منجھلی نے فوراً اس پر صاد کیا، لیکن چھوٹی راضی نہ ہوئی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ اس تجویز کے پیچھے میری محبت ہے، لیکن اس میں کہیں میرے بے سہارا ہونے کے احساس کا بھی شائبہ ہے۔ اس نے کہا کہ مکان اور ترکے سے جو کچھ حاصل ہو، اسے فتح پوری کے مدرسے اور جامع مسجد کو دے دیا جائے تاکہ والدین کی طرف سے صدقۂ جاریہ قائم ہو سکے۔ سب نے اس تجویز کی تحسین کی، اور اس پر عمل کیا گیا۔ چہلم کے بعد منجھلی واپس رامپور چلی گئی۔ چھوٹی نے چاندنی چوک خانم کے بازار میں اور بڑی نے اپنی سسرال واقع پھاٹک حبش خان میں زندگی حسب سابق گذارنی شروع کر دی۔

پورا ایک سال یوں ہی گذرا۔ نواب مرزا نے دہلی ہی میں فارسی کی اچھی استعداد بہم پہنچالی تھی اور عربی میں بھی میزان منشعب سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ دوسرے علوم خصوصاً ریاضی، منطق، عروض، بیان وغیرہ میں بھی ان کی مشق اچھی اور ذوق صحیح تھا۔ وہ ماں کو یاد تو کرتے لیکن پڑھنے پڑھانے اور اپنے ہم چشموں کے ساتھ وقت گذارنے اور بڑوں جیسی باتیں کرنے میں انھیں بہت لطف آنے لگا تھا۔ دوسری بات یہ کہ انھیں احساس تھا کہ جب بھی اور جیسے بھی دہلی جانا ممکن ہوا، خالہ خود ہی مجھے لے کر دلی چلیں گی۔ اب میں کچھ از خود اصرار کرتا ہوں تو ان پر ایک دباؤ سا ہوگا اور انھیں مفت کی کشاکش اور شاید درماندگی بھی محسوس ہو، لہٰذا انھوں نے خاموش رہنے میں بہتری سمجھی۔

قمری تقویم کے لحاظ سے نواب مرزا سوا گیارہ برس کے ہو گئے (مئی ۱۸۴۲)۔ ان کی مسیں بھیگنے لگی تھیں اور عمدہ خانم نے مسوں کا کونڈہ کرنے کی بڑی لمبی چوڑی تجویز بنائی جسے وزیر نے بخوف چشم زخم ابنائے زمانہ وعداوت انگریز بختی سے مسترد کر دیا۔ لیکن عمدہ خانم نے بہت ضد کی اور بار بار لکھا کہ

باقاعدہ مہمانوں، میراثنوں، ملانوں وغیرہ کو بلا کر دھوم دھامی نہ سہی، لیکن کونڈوں کی رسم تو ہونی ہی چاہیئے۔ کئی مراسلات کے ردوبدل کے بعد جولائی ۱۸۴۲ کے آخری ہفتے میں وزیر رام پور پہنچی اور نواب یوسف علی خان کی حویلی کے پاس ایک مکان میں اتاری گئی۔ عمدہ خانم نے یہ مکان اور اس کے لوازم فرش فروش شیشہ آلات سب پہلے ہی سے درست کرار کھے تھے اور چھوٹی کی آسائش کا ہر انتظام وہاں موجود تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی آمد کے ایک ہی دو گھڑی کے اندر نواب مرزا بھی وہیں آگئے۔ وزیر نے بیٹے کو کلیجے سے لگا کر بار بار اوپر سے نیچے تک دیکھا اور چٹاچٹ بلائیں لیں اور آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے ہنس کر بولی:

''اللہ نواب مرزا آپ نے تو خدا رکھے بالکل جوانوں کے سے ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔''

ابھی نواب مرزا نے کچھ جواب نہ دیا تھا کہ راحت افزا بول پڑی: ''جی ہاں اور دور پار بالکل بڑے نواب صاحب پر گئے ہیں۔ بس رنگ ذرا کم ہے نہیں تو عین مین وہی نقشہ ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے وزیر خانم کی طرف دیکھا تو سناٹے میں آگئی۔ کاش میری زبان کٹ جاتی، اس نے دل میں کہا۔ وزیر خانم کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ وہ منھ کو سختی سے بند کئے ہوئے سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے بس اب پھوٹ بہے گی لیکن ابھی اس کی ساری طاقت خود کو ضبط میں رکھنے میں لگی ہوئی ہے۔ عام حالات ہوتے تو نواب مرزا اپنی ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر جھول جاتا، اس کے سینہ و بغل میں خرگوش یا بلی کی طرح کھسر پسر کرتا ہوا گدگدی سی کرتا اور لمحے بھر میں ماں کی ناراضگی یا رنجیدگی دور کر دیتا۔ لیکن اب اسے کچھ عجیب سا تکلف، بلکہ اجنبیت کا سا احساس ہو رہا تھا۔ اب ان کے درمیان کوئی ڈیڑھ دو سال کے فاصلے کی ہی اجنبیت نہ تھی، نواب مرزا اچھے ہاتھ پاؤں نکال کر لمبائی اور تن و توش میں اپنی ماں سے بہت بڑھ گیا تھا۔ خیر، تن و توش میں ماں تو ہمیشہ کی دھان پان تھی اور اب پانچ چھ سال تک مرد کی صحبت سے پرہیز نے اس کے بدن میں کچھ اور بھی نزاکت پیدا کر دی تھی اور اس کے چہرے پر تقدس کی ہلکی سی چھوٹ بھی پڑنے لگی تھی۔ اس وقت اس کی عمر تیس یا اکتیس سال کی تھی، لیکن اس کی چال ڈھال، نشست و برخاست، ڈوپٹہ اور دامن اور پائینچے سنبھالنے کے انداز میں کوار پتے کی خوشبو بکھرتی ہوئی سی، اور سب سے بڑھ کر اس کی آواز میں الھڑ جوانی کی جھانجھن بجتی ہوئی سی لگتی تھی۔

نواب مرزا کا جی چاہتا تھا کہ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے چمکارے اور ہنسائے، جیسا کہ وہ پہلے کیا کرتا تھا۔ لیکن اب... اب کئی باتیں اور کئی طرح کے

خیالات مزاحم تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ صورت حال ہی بالکل نئی تھی۔ نواب مرزا نے وزیر کو شمس الدین احمد خان کا ماتم آنسوؤں سے کرتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ نواب مرزا کے دل میں شمس الدین احمد خان کی تصویر غم آلود لیکن دم بدم دھند لکے میں گم ہوتی ہوئی تصویر تھی جس کی خوشبو اور گرمی تو ضرور اس کے وجود میں تازہ تھی لیکن بچپن کے کسی خواب کی طرح، جو بھولتا نہیں لیکن پوری طرح یاد بھی نہیں آتا۔ خود اپنے وجود کی تشکیل، اس کی طرح کشی، اس میں رنگ آمیزی، نطق و منطق کی صلاحیت، طبیعت کی موزونی، نفاست، حسن اور خوش نما چیزوں کے لئے دل میں کشش، یہ سب اسے وزیر خانم کا ورثہ لگتا تھا۔ صورت شکل مزاج بات چیت، ہر چیز میں وہ خود کو وزیر خانم کی چھنگلیا سے بھی کمتر سہی، لیکن اس کا جزو بدن نہیں تو ایک حصہ ضرور سمجھتا تھا۔

باپ کے گھر والوں میں خود باپ کے علاوہ کسی کو اس نے دیکھا نہ تھا اور سچ پوچھئے تو باپ کی طرف سے اس کا تھا ہی کون جسے وہ دیکھتا اور جس کے مقابلے میں رکھ کر باپ کے تشخص، مزاج، اور اپنے ہم چشموں اور محکوموں میں اس کی محبوبیت اور مقبولیت کا کچھ اندازہ کرتا۔ سگا چچا کوئی تھا نہیں، سوتیلے چچاؤں پھوپیوں سے اس کے میل جول کا سوال ہی نہیں تھا۔ سگی پھوپیوں میں ایک، یعنی نواب بیگم کو اس نے دیکھا ہی نہ تھا اور دوسری، یعنی جہانگیرہ بیگم ایک دو بار اس کے گھر ملنے ملانے والیوں کی طرح آئی تھی۔ اس کے لئے جہانگیرہ بیگم کا چہرہ خوشگوار لیکن اس کے مرکز حیات سے دور ہٹے ہوئے کئی غیر متعلق چہروں میں سے ایک چہرہ تھا اور کچھ نہیں۔ دس سال کی عمر کو پہنچ کر اسے اپنے ساتھی سنگاتیوں سے، اور از خود بھی، بہت سی باتیں اولاد و تولید کے بارے میں اور عورت مرد کے فرق کے بارے میں معلوم ہو گئی تھیں۔ اور اب تو وہ اپنے جسم اور اخلاط مزاج، اور تصورات و تخیلات کے بدلتے ہوئے رنگوں کو کچھ زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگا تھا، ورنہ سات آٹھ سال کی عمر تک تو وہ خود کو بے باپ ہی کا نہیں بلکہ باپ کی کسی شراکت کے بغیر براہ راست وزیر خانم کی اولاد سمجھتا رہا تھا۔ آج جب اس نے اپنی اور شمس الدین احمد خان کی چہرے مہرے اور چال ڈھال کے اعتبار سے مشابہت کا ذکر سنا اور اس ذکر پر اپنی ماں کو اس درجہ غمگین پایا تو وہ کچھ دیر تک تو وہ بے بس کھڑا ہاتھ ملتا رہا کہ اب میں کیا کروں کہ اماں جان کا غم غلط ہو۔

گیارہ سوا گیارہ برس کا نواب مرزا اس وقت چودہ پندرہ برس کا جوان لگتا تھا۔ کشیدہ قامت، ماں سے کچھ ہی دبتا ہوا قد، سیاہ فام، لیکن چہرے پر غضب کی نرماہٹ اور ملاحت جس پر سبزہ آغازی کچھ طرفہ بہار دکھا رہی تھی۔ بھرے بھرے ڈنڈ، چوڑی کلائیاں، بڑی بڑی شربتی آنکھیں جو عین مین ماں پر گئی

تھیں، لیکن ترکانہ ناک اور اونچی پیشانی باپ کا ورثہ تھیں۔ نہایت باریک آسمانی ململ کا کرتا، جس پر پھولام کی قبا، اس پر آسمانی رنگ کی دھاری دار سنگی کا انگرکھا جس کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی تھیں، دلی والوں کی طرز کا گلابی مشروع کا دوبرکا پاجامہ، سر پر رام پوری اونچی مخملی کلاہ کی جگہ دلی کے ہی طرز کی کلابتو کے کام کی پنج گوشیہ سیاہ ٹوپی، نہایت چمک دار گھنے بال جو اس وقت کے رواج کے موافق کاندھوں سے ذرا اوپر تک لے آئے گئے تھے اور ٹوپی سر پر ذرا کج رکھی گئی تھی۔ اس وقت نواب مرزا کے چہرے پر جوانی کی متانت اور نوعمر سلونا پن گلے ملتے ہوئے کچھ اس طرح دکھائی دیتے تھے کہ انسان کا دل خواہ مخواہ کھنچتا تھا۔ ماں، خالہ، اور اصیلیں تو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی ہی تھیں، لیکن اس وقت موقعے کی نزاکت اس بات کی متقاضی تھی کہ ماں کا رنج بھی ہلکا ہو اور بیٹا اپنی محبت کا برملا اظہار بھی کر سکے۔ یہ نواب مرزا کی ذکاوت اور دلجوئی کی جبلت کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ اس نے بالکل صحیح قدم اٹھایا۔

نواب مرزا نے ذرا آگے بڑھ کر اور ماں کے قدموں میں بیٹھ کر جوتیوں سمیت اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھے، اور کہا:

''اماں جان۔ میں تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چھوڑیے ان چھوکریوں کی باتوں کو...'' وہ ذرا سا مسکرایا۔ ''راحت افزا مجھے چھوکرا سمجھتی ہیں تو خود بھی تو چھوکری ہوئیں... میں آپ کا بچہ ہوں، اور کچھ نہیں۔''

''چھوکری کیا، چھکریا کہیں تو روا ہے۔'' عمدہ خانم نے راحت افزا کے گال پر ہلکی سی چپت مار کر کہا۔ ''بنو کی زبان کیا ہے، کترنی ہے۔ مگر اللہ نواب مرزا آپ تو بھوئیں سے اٹھیے۔ کیا بھوئیوں (۱) کی طرح فرش ہی پر ہاتھ پیر مارتے رہیں گے؟''

یہ کہہ کر عمدہ خانم اپنی مخصوص ہنسی ہنسیں۔ اس ہنسی میں ہلکی سی دوستانہ چاشنی تھی، گویا وہ نواب مرزا کو برابری کا درجہ دے رہی ہوں اور ماں کو بھی اشارہ دے رہی ہوں کہ بیٹا اب نام خدا جوان ہونے لگا ہے، اب باپ کو بھولو اور بیٹے کو گلے سے لگاؤ۔

''خالہ جان آپ فرماتی ہیں تو میں بھچپا کے جھاڑ کی طرح ابھی اسی وقت اٹھ کھڑا ہوتا ہوں، لیکن اماں جان تو مجھ سے بولتی بھی نہیں ہیں۔'' نواب مرزا نے ماں کے جھکے ہوئے سر کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھی اماں جان، ذرا دیکھئے تو سہی، سنئے تو سہی۔ مجھے لفظ بھچپا پر یاد آیا۔ میاں نظیر

(۱) بھاؤ بتانے والے، یعنی رقاص۔

مرحوم کا کیا عمدہ شعر ابھی کچھ دن ہوئے نظر سے گذرا تھا۔ لیجئے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

یوں تو ہم کچھ نہ تھے پر مثل انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا

اور یہ خالہ جان ہمیں تماشا اور تماشا گر دونوں ہی بنائے دیتی ہیں۔"

وزیر خانم نے آنسو پی کر سر اٹھایا اور بیٹے کی بلائیں لے کر بولیں:

"ہائے نواب مرزا آپ نیچے میرے قدموں میں! الٰہی توبہ، یہ کیا بدشگونی ہے۔ آپ کو تو ہم سر آنکھوں پر لیں، کلیجے میں رکھیں تو کم ہے۔ اچھی اب تو اٹھئے۔ دیکھئے اب تو ہم ہنس بھی رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وزیر خانم نے اپنے پاؤں پرے کھینچ کر نواب مرزا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو نواب مرزا نے کہا:

"جی نہیں اماں جان۔ یوں آپ کی گلو خلاصی نہ ہوگی..."

"بچے میاں صاحب اب مجھے اور شرمندہ نہ کریں،" وزیر نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔

"جی نہیں، اس میں شرمندگی کا ہے کی۔ آپ نے بے وجہ سب کو رلایا اور تس پر یہ کہ میں نے آپ کو میاں نظیر صاحب کا اتنا عمدہ شعر سنایا تماشا کے مضمون پر اور آپ نے داد بھی نہ دی۔ لہٰذا پہلا تاوان تو یہ کہ آپ وعدہ کریں اس دنیا میں میرے ہوتے ہوئے آپ روئیں گی نہیں..."

"اے لو نواب مرزا آپ تو بڑا ظلم کرتے ہیں۔ بھلا آنسوؤں سے رونے یا پھر دل سے رونے پر کسی کا حکم چلا ہے؟"

"نہ سہی۔ لیکن میری اتنی سی بات تو آپ مانیں گی کہ رہ جانے والوں کا حق چلے جانے والوں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔"

وزیر کو سکتہ سا آ گیا۔ نواب مرزا کے لہجے میں عجب طرح کا پیار بھرا تحکم تھا، اور ایک طرح کی دنیا شناسی بھی تھی۔ اور یہ پہلی بار ہوا تھا کہ نواب مرزا نے اپنے باپ کی موت کی حقیقت کو سب کے سامنے قبول کیا تھا، اور وہ بھی ایسے انداز میں، کہ ماں کا وجود باپ کے عدم سے بڑھ کر اہم معلوم ہوتا تھا۔ وزیر نے کچھ لمحہ چپ رہ کر اپنے اوسان جمع کئے اور پھر بولی۔

"بھلا اسے کون نہ مانے گا۔ منصفی تو وہی ہے جو آپ کہو ہو۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میرا حق آپ پر یہ ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ اور اب رہی دوسری

بات...''

''اے لیجیے اب کون سی دوسری بات رہی جاتی ہے۔ زمین سے قد بالا کو اوپر لائیے، پھر سنیں گے آپ کے بتنگڑے۔''

''اچھا ہم اٹھے جاتے ہیں۔ لیکن میاں نظیر کی داد نہ دینے کا تاوان پھر بھی عطا ہو۔ تماشا کے مضمون پر اچھا سا شعر ایک سنائیے تو ہم جانیں۔''

اس بار وزیر نے کچھ زیادہ زور دے کر نواب مرزا کے ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچا۔ دونوں ہی نے ہلکے بدن کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی اور نواب مرزا اپنی ماں کے گلے میں دایاں ہاتھ حمائل کر کے کھڑا ہو گیا۔

سبحان اللہ۔ مدرسے میں تو نواب مرزا پڑھیں اور امتحان مجھ بندی کا ہو۔'' وزیر کچھ شگفتہ روئی سے بولی لیکن اس کے لہجے میں خفیف سی گھبراہٹ بھی تھی۔ ''یہ بیت بحثیاں آپ ملاں جی غیاث الدین صاحب کے سامنے کھیلیں تو خوب ہو۔''

''سہی۔ لیکن شعر آپ سے تو ہم ضروری سنیں گے۔ ڈھیر سارے شعر مجھے زبردستی یاد کراتی تھیں، آج کچھ تو کسر نکلے۔ چلئے فارسی شعر سنا دیجئے، ہندی نہ سہی۔''

''میں بوڑھی باولی اب مجھے شعر کہاں سے یاد آویں جو میں اپنے بچے میاں کی دل تسلی کروں۔'' وزیر نے کچھ مصنوعی خفگی اور الجھن کے لہجے میں کہا۔ ''اچھا لیجیے مولانا نادم لاہیجانی کا ایک ٹوٹا پھوٹا سا شعر سن لیجیے۔''

''جی بہت خوب۔ ارشاد۔''

وزیر نے نہایت سادہ لیکن دلنشین انداز میں شعر پڑھا۔

بسیار دریں کہنہ سرا معرکہ دیدم
بازیچۂ اطفال تماشائے دگر داشت

''سبحان اللہ اماں جان کیا شعر ارشاد ہوا۔ واللہ طبیعت میں سرور آ گیا۔'' نواب مرزا نے ہنس کر کہا۔ لیکن اس نے مضمون شعر میں ایک کنایہ بھی محسوس کیا کہ اماں کا اشارہ ہے کہ تجھ میں ابھی بچپنا بہت ہے۔ نواب مرزا تو اب خود کو اچھا خاصا مرد سمجھنے لگا تھا۔ اپنی ماں کا بھولپن دیکھ کر اس کے دل میں محبت کی ایک نئی لہر سی دوڑ گئی کہ بچاری اماں کتنی سادہ ہیں۔ اس نے فوراً جواب دیا:

"مگر بازیچۂ اطفال کی نہیں صحیح اماں جان۔ سنئے، میرزا بیدل کیا فرماتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بیدل کا شعر بڑے لحن سے پڑھا۔

نو بہار است و جہاں سیر چمنہا دارد
وضع دیوانۂ ما نیز تماشا دارد

"اے کیا خوب شعر پڑھا۔" عمدہ خانم اور وزیر خانم تقریباً ایک ساتھ بول پڑیں۔ "ہے ہے کیا بات کہی کہ وضع دیوانۂ ما نیز تماشا دارد۔"

نواب مرزا نے جھک کر سلام کیا، گویا شعر انھیں کا ہو اور ساری داد انھیں کا حصہ ہو۔

"میں مان گئی کہ آپ اب بازیچۂ اطفال میں نہیں رہ گئے۔ مبارک ہو۔" وزیر نے نواب مرزا کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "کیا آپ بھی شعر موزوں کریں گے؟ فارسی کہیں گے یا ریختہ؟"

"جی تو میرا بھی بہت چاہتا ہے۔" نواب مرزا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن کہوں گا تو ریختہ ہی کہوں گا۔ ابھی تو استاد ہے نہ کوئی تخلص۔"

"آپ ارادہ تو باندھ لیں۔ پھر تخلص اور استاد سب مہیا ہو جائیں گے۔" وزیر نے کہا۔

"جی۔ مگر ملا جی تو شاید بے دماغ ہوں۔ کہتے ہیں کہ شعر گوئی کار بیکاراں است۔" نواب مرزا نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد ان کی مسکراہٹ اور بھی من موہنی ہو گئی جب انھوں نے کچھ شرماتے ہوئے کہا:

"اماں جان آپ ہی مجھے شاگرد کر لیجیے نہ، اور کوئی اچھا سا تخلص بھی تجویز کر دیجیے۔ پھر تو میں مکتب کے ہم چشموں میں بہت ممتاز ہو جاؤں گا۔"

"اے ہے بیٹا۔ مجھے ایک مصرع بھی موزوں کیے مدتیں بیت گئیں۔ اللہ بخشے میاں شاہ صاحب ہوتے تو ان کے قدموں میں آپ کو بٹھا دیتی۔ خود بھی کچھ سیکھتی۔ ہائے ایسے شفیق استاد اب کہاں ملیں گے۔ لیکن ان کو تو موئے دکن کی پڑی تھی۔ پھر وہ جگہ سوکن کی طرح انھیں اپنی آغوش میں چھپا ہی لے گئی۔"

وزیر کا چہرہ کچھ رنجیدہ ہوتے دیکھ کر نواب مرزا نے مچل کر کہا:

"اچھی ان باتوں کی نہیں صحیح... آخر کب تک آپ گذرے ہوئے زمانوں میں خود کو مینار بند

کئے رہیں گی۔ دنیا بدل گئی دنیا والے بدل گئے۔''

عمدہ خانم نے نواب مرزا کو کچھ معنی خیز نگاہوں سے دیکھا، گویا لڑکے نے وہ بات کہہ دی ہو جو وہ خود کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی ہو۔ راحت افزا نے البتہ کچھ مصنوعی اور کچھ اصلی غصے سے کہا:

''اے ہے نواب مرزا آپ کی زبان بہت چل نکلی ہے۔ کہیں رہ نہ جائے۔'' ذرا آگے آ کر اس نے وزیر کے گلے میں ہاتھ ڈالا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رام جیائی اصیل کو پکار کر اس نے حکم دیا کہ وزیر خانم صاحب کے لئے شربت انار لے آ۔

لیکن نواب مرزا اب کل کا بچہ نہ تھا۔ عمدہ خانم کی نگاہ کے معنی اس پر مخفی نہ تھے۔ اور اگر وہ اپنی عمر میں افزونی اور بلوغ کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سے ذرا متوحش ہو کر پہلے کی طرح ماں کی آغوش میں سر رکھنے، اسے گدگدانے، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے اپنے سر و سینہ پر رکھنے سے باز رہنے لگا تھا تو دوسری طرف اسی افزائش عمر کے احساس نے اس کی زبان کو پہلے سے زیادہ آزادی بھی بخش دی تھی۔ راحت افزا کی طرف منہ کر کے وہ ہنس کر بولا:

''بی راحت افزا، اپنی خیر مناؤ۔ تاڑ کی طرح آسمان میں تھگلی لگاتی نظر آتی ہو۔ میری اماں جان ہی کیوں کل کے اندھیاروں میں پڑی جھینکتی رہیں... اچھا اماں جان، کوئی تخلص تو میرے لئے تجویز کر دیجئے، استاد بعد میں ڈھونڈ لیں گے۔''

''اچھا بھئی تمھاری ہی سہی۔ منجھلی باجی دیوان حافظ ہو تو منگواؤ۔'' وزیر خانم نے کچھ زچ ہو کر لیکن خوش مزاجی سے کہا۔ ''لسان الغیب سے تخلص مانگتے ہیں۔ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور کرتا ہے۔''

''چھوٹی اس وقت دیوان حافظ تو ہے نہیں۔ ہاں دیوان درد کا اچھا سا نسخہ کل کوئی نواب صاحب کو نذر کر گیا تھا، میں اسے دیکھتے ہی دیکھتے یہاں لے آئی تھی۔ کہو تو اس ہی کو منگوایئے۔''

''دیوان درد میں تو فال کوئی دیکھتا نہیں۔ لیکن کیا مضائقہ، وہ شیخ شیراز تھے یہ شیخ جہان آباد۔ ان سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔'' وزیر نے جواب دیا۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی فقیر نے باہر کی ڈیوڑھی سے ذرا دور سہ تار پر نسبتی تھانیسری کی غزل چھیڑ دی۔

یک دل و خیل آرزو دل بہ چہ مدعا نہم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

نہایت کھلی ہوئی اور پر سوز آواز اور اس پر سہ تار کا محزوں یک آہنگ ترانہ، لگتا تھا تینوں تاروں نے مل کر لفظ کی صورت اختیار کر لی ہے۔

''بھئی بچے میاں صاحب، تن ہمہ داغ داغ شد کیا اچھا فقرہ ہے۔'' منجھلی بیگم نے کہا۔

اتنے میں دیوان درد بھی آ گیا۔ چھوٹی کو وہ دن اور وہ زمانے یاد آ گئے جب اس نے دیوان حافظ سے فال لینے کے لئے پنڈت نند کشور کو بلوایا تھا۔ معاً وہ ساری گذری ہوئی تصویر اس کے سامنے لہرا سی گئی۔ اس کا ہاتھ کانپ گیا اور قریب تھا کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے، لیکن اس نے خود کو سنبھال کر ایک گھونٹ شربت پیا اور کہا:

''بھائی ہم لوگوں کو فال دیکھنی تو آتی نہیں۔ یہ کام تو پنڈت اور مولانا ہی کر سکیں ہیں۔ میں تو بس سیدھے سادے طور پر بسم اللہ شریف پڑھ کر دیوان کے ورق لوٹوں گی۔ جہاں نگاہ رک جائے وہی فال ہے۔ کہو منظور ہے؟''

''جی بہت بہتر۔'' نواب مرزا نے کہا۔

دیوان کو آنکھوں سے لگا کر بسم اللہ کر کے ایک جگہ ورق کھولا تو یہ مطلع سامنے تھا۔

اپنی قسمت کے ہاتھوں داغ ہوں میں
نفس عیسوی چراغ ہوں میں

''بھئی کیا عمدہ شعر نکلا!'' منجھلی نے بے ساختہ کہا۔ ''گو حسب حال نہیں، لیکن نامناسب بھی نہیں۔ کہ شاعر کا کام ہی دلسوزی و داغ داری ہے۔ ہمارے نواب کہتے ہیں کہ جب تک انسان دردمند نہ ہو شعر کہاں سے نکالے گا۔ درد و داغ ہی تو شعر میں ڈھل کر نکلتے ہیں۔ یہ میر درد صاحب کی دردمندی ہی تو ہے جس کی دولت سے آج بھی ان کا کلام سب کی زبانوں پر ہے۔''

''ہاں، اور درد و داغ میں مناسبت بھی ہے۔'' وزیر نے کہا۔ ''اور ابھی ابھی میاں تسبتی کا بھی کیا اچھا مطلع داغ کے مضمون پر گویا فال گوش ہو ہی چکا ہے۔''

''اماں جان، چراغ اور نفس عیسوی کے مضمون کو ہمارے طوطی ہند اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی بھی تائید حاصل ہے۔ فرماتے ہیں۔

گر دد ز نفس چراغ مردہ
گر خود نفس مسیح باشد'

''تو بس اللہ رکھے آج سے آپ حضرت نواب مرزا دہلوی ثم رامپوری ہو گئے۔ شاگردی کا بھی ایک دو دن میں قضیہ طے کر دیں گے۔ دلی میں استاد ذوق کے بڑے چرچے ہیں۔ لکھنؤ میں شیخ ناسخ نہیں رہے لیکن کئی ان کے بڑے نامی گرامی شاگرد ہیں۔ پھر نواب سید محمد خان صاحب رند ہیں۔''

''بہت مبارک، لیکن اماں جان میں دہلوی ثم رامپوری نہ کہاؤں گا۔ میں تو سیدھا سچا دہلوی ہوں۔ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ رام پوری کہانے میں وہ بات کہاں۔'' نواب مرزا نے ہنس کر کہا۔

منجھلی بیگم ایک لمحے کو تو گھبرا گئیں کہ کہیں نواب یوسف علی خان تک یہ فقرہ نہ پہنچے۔ نوابوں کے آنکھ نہیں ہوتی، صرف کان ہوتے ہیں۔ لیکن پھر سوچیں کہ لڑکوں کی بات کا کس نے برا مانا ہے۔ انھوں نے شگفتہ جبینی سے کہا، ''چلیے صاحب آپ دلی کے روڑے، ہم جمنا کے پرلے کنارے کی کنکریلی ریتی۔ دلی کی استادی آپ کو مبارک ہو۔''

''تابع فرمان ہوں۔ اماں جان آیئے دو چار شعر موزوں کریں۔ آخر تخلص کے گنہگار تو ہم ہو ہی چکے ہیں۔ چلیے کوئی مصرع دیجیے، پھر دیکھیے گا ہماری مضمون آفرینیاں۔''

''اچھا، تماشے کی بات ہو رہی تھی تو لیجیے میر تقی صاحب کا ایک مصرع ہے۔ مطلعے کا مصرع تھا، آپ بھی اسے مطلع کیجیے۔''

''بہت خوب، بہت مبارک۔''

وزیر نے اپنے خوبصورت انداز اور نہایت میٹھی آواز میں مصرع پڑھا ؏

دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

''اے لیجیے، اماں جان آپ بھی غضب کرتی ہیں بھئی واللہ۔'' نواب مرزا نے کچھ ٹھنک کر کہا۔ ایک تو استاد کے مصرعے پر امتحان لیتی ہیں اور پھر مصرع ایسا بھرپور کہ ہاتھ ملتے رہ جایئے۔ اس پر مطلع کس کے نصیب میں ہوگا۔''

''چلیے باتیں نہ بنایئے صاحب زادے۔'' منجھلی بیگم نے ہنس کر کہا۔ ''بلکہ ایسی ہی باتیں بناتے بناتے مصرع بنا ڈالیے۔''

''مگر مطلع بنانا شرط ہے بچے میاں۔''

''جی بہت خوب۔'' نواب مرزا نے آہستہ سے کہا اور برجستہ مطلع گذرانا۔

کرتے ہیں بے ادب کا یاں باادب تماشا

دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

''ماشاءاللہ''، ''سبحان اللہ''، کی آوازیں گونجیں۔ وزیر نے بیٹے کی پیشانی چومی، سر پر ہاتھ پھیرا اور آنچل پھیلا کر دعا مانگی، ''اللہ میرے بچے کا نام روشن ہو۔ دنیا اسے جہاں استاد کہے۔''

سب نے آمین کہی۔ منجھلی بیگم نے فوراً گیارہ روپے کی شیرینی منگا کر ہر طرف تقسیم کرائی کہ میاں داغ سلمہ' آج اپنی والدہ ماجدہ کی شاگردی فن شعر میں داخل ہوئے ہیں۔ درایں اثنا وزیر خانم نے کہا:

''بچے میاں، مطلع تو خوب کہا آپ نے۔ لیجیے اس پر بھی پھڑکتا ہوا سا مصرع لگ جائے تو میں آپ کو فارغ الاصلاح شاگرد مان لوں۔'' یہ کہہ کر وزیر نے مسکراتے ہوئے اپنا مصرع پڑھا ع

محفل میں کہکشاں کی اک آدمی نہیں ہے

وزیر کا مصرع پڑھنا تھا کہ نواب مرزا نے بے ساختہ کہا ع

پھیلا دیا فلک نے کیا بے سبب تماشا

ہر طرف سے داد کے ڈونگرے پھر برسے۔ نواب مرزا نے خوش ہو ہو کر سب کو تسلیم کی، لیکن پھر کہا، ''ہم فارغ الاصلاح شاگرد نہ بنیں گے۔ ہم اپنی محنت سے شعر کہیں گے۔ کبھی کبھی اماں جان کی نظر کیمیا اثر سے گذار بھی دیں گے۔ لیکن ابھی تو ہمیں تحصیل علم کرنی ہے۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اماں جان کی دعائیں قبول ہوں گی۔''

اس پر سب نے آمین کہی۔ اب کھانے کا وقت ہونے لگا تھا۔ آج کا کھانا منجھلی بیگم کے یہاں سے کئی توروں میں آیا تھا۔

متاعِ جمع کن شاید کہ غارت گر شود پیدا

کھانے کے بعد اپنی حویلی کو جاتے ہوئے منجھلی نے نواب مرزا کو دوبارہ کچھ معنی خیز نگاہوں سے دیکھا، اور بولی:

''نواب مرزا، مدرسے کے پاس ہی تو ہماری نئی حویلی ہے۔ شام کو ادھر سے ہوتے جائیے تو کیا خوب ہو۔''

نواب مرزا کی سمجھ میں کچھ ٹھیک سے نہ آیا، لیکن یہ بات صاف تھی کہ منجھلی خالہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ نواب مرزا کا دل کچھ الجھن اور تجسس سے بھر گیا، لیکن وہ بظاہر اطمینان اور خاطر جمعی سے بولا:

''کیوں نہیں، منجھلی خالہ۔ میں کل ہی شام قدم بوس ہوں گا۔''

''بہت خوب۔ تب تک کے لئے آپ سب کو اللہ کی امان میں دیا۔''

یہ کہہ کر منجھلی سوار ہوئی۔ نواب مرزا اور وزیر خانم اپنے اپنے حجروں میں استراحت کے لئے چلے گئے۔ دوسری شام کو نواب مرزا جب منجھلی بیگم کی حویلی پر پہنچا تو دروازے پر ایک سجی سجائی بہل اور ڈیوڑھی کے محافظ خانے میں کچھ نئے چہروں کی آمد و رفت دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ بوجہ نوعمری، اور اس وجہ سے بھی کہ یہ اس کی سگی خالہ کا گھر تھا، وہ اطلاع بھجوائے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی پار کرتے ہی اسے عمدہ خانم کی اصیل ملی جس نے سلام کیا اور کہا کہ بی بی جی آپ کو دیوان خانے میں بلوا رہی ہیں۔

دیوان خانے میں عمدہ خانم کے پاس ایک نئی سی صورت دیکھ کر نواب مرزا لحظہ بھر کو ٹھٹکا تو عمدہ خانم وہیں سے بولیں:

''آیئے آیئے، چشم ما روشن دل ما شاد۔ کیا آپ نے انھیں پہچانا؟''

نواب مرزا نے اب جو ذرا نظر بھر کر دیکھا تو صورت کچھ جانی پہچانی لگی، لیکن نام نہ یاد آیا۔

کشیدہ قامت، بھرا بھرا بدن، میدہ شہاب رنگ، سیدھی ناک، روشن سیاہ آنکھیں جن کے گوشے بادام کی طرح نوکدار تھے، نازک گلابی ہونٹ، دونوں ہاتھوں کی تین تین انگلیوں پر الماس، یاقوت اور جانیا کی انگوٹھیاں، سادہ لیکن قیمتی لباس، پورے سراپے سے حسن، صحت، اور جوانی کا اعتماد ٹپکتا ہوا۔ نواب مرزا کو دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی نیم قد اٹھ کر بولیں:

''آیئے نواب مرزا، آپ نے ہمیں نہ پہچانا ہو لیکن ہم نے تو ایک ہی نظر میں آپ کے انداز قد سے پہچان لیا...''

''اے سبحان اللہ، جہانگیرہ پھوپھی، تسلیمات... اب میں نے پہچانا، آپ بالکل بدلیں نہیں!'' نواب مرزا نے ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

نواب مرزا کی آواز، اس کی چال، ہر چیز میں نواب شمس الدین احمد کی جھلک اس قدر نمایاں ہو چلی تھی کہ جہانگیرہ کا دل بھر آیا۔ اس کے جی میں آئی شہید بھائی کی اس یادگار کو کلیجے سے لگا لے۔ لیکن نواب مرزا کے اندر ہلکی سی جھجک محسوس کر کے وہ باز رہی۔ نواب مرزا نے دونوں کو پھر تسلیم کی اور ان کے قدموں کے پاس گدے پر بیٹھ گیا۔

''ارے ارے، وہاں نہیں، یہاں میرے پاس بیٹھئے بچے میاں۔'' عمدہ خانم نے کہا اور نواب مرزا کا بازو پکڑ کر اسے اپنے پاس صندلی پر بٹھا لیا۔

''کہیے آپ کے سبق کیسے چل رہے ہیں؟ کیا پڑھ رہے ہیں آج کل؟'' جہانگیرہ نے پوچھا۔

نواب مرزا نے اپنے دل میں کچھ بے چینی سی محسوس کی۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ یہ چھوٹی موٹی ادھر ادھر کی باتیں اس ملاقات کا اصل مقصد نہیں، اور جہانگیرہ پھوپھی کا اس وقت یہاں ہونا خالی از علت نہیں۔ پھوپھی یہاں کیوں ہیں اور مجھ سے کیا بات کہنے والی ہیں، یہ معما جلد از جلد حل ہو جائے تو اچھا ہے، اس نے سوچا۔

''جی سب ٹھیک ہے۔ ملا غیاث صاحب آج کل ہمیں شرح میبذی اور ہدایہ پڑھا رہے ہیں۔ ہیئت و ریاضی کے سبق الگ ہیں۔ ریاضی میں شرح چغمنی اب ختم ہونے والی ہے... آپ اکبر آباد سے کب تشریف لائیں؟ سب خیریت تو ہے؟ پھوپھا جان کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہے، مولا کا کرم ہے۔ آپ کی اماں جان کیسی ہیں؟ مجھے ان سے بھی ملنا ہے۔ جب انھیں فرصت ہو مجھے بلوا بھیجیں۔ میں فوراً آ جاؤں گی۔''

"جی بہت بہتر۔ جب آپ فرمائیں۔ کل ہی ملاقات ہوسکتی ہے۔ ابھی چندے آپ کا قیام رامپور میں رہے گا؟"

"ہاں، ابھی کچھ دن تو ٹھہرنا ہوگا۔ میرے جیٹھ جی کو آپ جانتے ہوں گے؟ ان کا ایک کام آن پڑا ہے۔"

"جی وہ آغا مرزا تراب علی صاحب؟ میں ان کے نام نامی سے تو آشنا ہوں، بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہے۔"

"خاندانی شخص ہیں، خالص ایرانی گھرانہ ہے۔ وہ لوگ اب بھی آپس میں فارسی میں بات چیت کرتے ہیں۔" عمدہ خانم نے کہا۔

نواب مرزا کی سمجھ میں بالکل نہ آرہا تھا کہ یہ تفصیلات کیوں بیان ہورہی ہیں۔ اسے کچھ الجھن اور اکتاہٹ ہونے لگی لیکن پاس ادب کے مارے وہ کچھ کہہ نہ سکا، سر جھکائے ہوئے "جی بہت خوب" کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"نواب صاحب قبلہ وکعبہ کے داروغۂ فیل خانہ وخرگاہ ہیں۔ ماشاء اللہ اچھی حیثیت ہے اور بہت اچھی یافت بھی ہے۔ نواب صاحب ان کا بہت لحاظ کرتے ہیں۔"

اس بار نواب مرزا بالکل چپ رہا۔ عمدہ خانم اور جہانگیرہ بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا۔ نواب مرزا نے دل میں سوچا، آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا ان آغا صاحب کی کوئی لڑکی وغیرہ ہے جسے مجھ سے منسوب کرنے کی تجویزیں ہیں، ورنہ مجھے ان باتوں سے کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

ایک لمحے کی مزید خاموشی کے بعد جہانگیرہ بولیں:

"آپ کی اماں جان تو اب بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں گی کہ اب آپ بھی دلی چھوڑ کر رامپور آگئے ہیں۔ دلی میں بھی سنا ہے کہیں آتی جاتی نہیں ہیں۔"

"جی ہاں، تنہا تو بہت ہوگئیں ہیں، میرا دل بہت کڑھتا ہے ان کے لئے لیکن..."

"میرا تو جی چاہتا ہے کہ چھوٹی بیگم یہیں آجاتیں، لیکن وہ میرے پاس رہنا چاہتی ہیں نہیں۔" عمدہ خانم نے کہا۔

"میں تو کہتا ہوں کہ زمانۂ ماضی کوئی رہنے کی جگہ تھوڑی ہے..." نواب مرزا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے سوچا، یہ میں کیا کہنے لگا تھا... پھوپھی بیگم کہیں برا نہ مان جائیں... ابا جان مرحوم ومغفور کی سگی

بہن ہیں۔۔۔انھیں وہ بھی تو ہمہ وقت یاد ہی کرتی ہوں گی۔

''ہاں کتنا اچھا ہوتا۔۔۔'' جہانگیرہ بیگم کچھ رکتی ہوئی بولی، گویا کچھ سوچ رہی ہو۔ ''سنئے۔ایک صورت نکلی تو ہے۔اس میں سبھی کا فائدہ شاید اللہ نے مخفی رکھ دیا ہو۔'' اب جہانگیرہ نے عمدہ خانم کی جانب دیکھا، گویا ملتجی ہو کہ اگلی بات آپ کہیں تو خوب ہو۔

عمدہ خانم نے ہلکے سے گلا صاف کیا، ڈوپٹے کو ٹھیک سے سر پر جمایا، پھر بہت ٹھہر ٹھہر کر انھوں نے کہا، ''نواب مرزا، میری بڑی تمنا ہے کہ میری بہن کے لئے زندگی کا کچھ مناسب ڈھب نکل آتا اور اور۔۔۔میں اس کا گھر دوبارہ رستا بستا دیکھ لیتی۔اس کی تنہائی دور ہو، اس کا غم کچھ غلط ہو۔۔۔''

عمدہ خانم نے یہ کہتے کہتے سر اٹھا کر نواب مرزا کو غور سے دیکھا، گویا اندازہ لگانا چاہ رہی ہوں کہ لڑکے پر ان کی بات کا برا اثر تو نہیں پڑ رہا ہے۔لیکن نواب مرزا، جس کے دل کی الجھن اب کچھ ہلکی ہونے لگی تھی، سر جھکائے ہوئے خاموش سن رہا تھا۔ ''۔۔۔میں نے جہانگیرہ بیگم سے یہ بات کہی تو انھیں بھی اپنا ہم خیال پایا۔۔۔سن رہے ہیں آپ؟''

''جی ہاں، منجھلی خالہ۔آپ فرمائیں۔''

''تو۔۔۔تو ایسا ہے کہ تمھاری پھوپھی بیگم کے جیٹھ جی کی طرف سے۔۔۔تمھاری اماں جان کے لئے پیغام آیا ہے۔۔۔''

''جی کیا فرمایا آپ نے؟''

''ہاں میں یہی کہہ رہی ہوں۔آغا مرزا تراب علی تمھاری ماں کے خواہاں ہیں۔''

''تو کیا اب تک وہ غیر شادی شدہ ہیں؟''

''نہیں۔'' جہانگیرہ نے کہا۔ ''لیکن ان کی بیوی کچھ دن ہوئے اللہ کو پیاری ہوئیں۔اولاد کوئی ہے نہیں۔اتنی بڑی حویلی بھائیں بھائیں کرتی لگے ہے۔۔۔انھوں نے۔۔۔انھوں نے وزیر خانم کی بہت تعریفیں سنیں اور حالات معلوم کیے تو خاص طور پر مجھے بلوایا کہ میں بات کروں۔''

''تو۔۔۔تو۔۔۔اس سلسلے میں آپ مجھ سے کیوں بات کر رہی ہیں؟'' نواب مرزا کے لہجے میں الجھن اور ساتھ ہی ساتھ شاید تھوڑی برہمی بھی تھی۔اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ماں کی زندگی میں کسی مرد کے داخلے پر کیا سوچے۔اور اسے اس معاملے میں کچھ سوچنے یا کوئی رائے رکھنے کا حق ہے بھی کہ نہیں۔باپ کی موت، جسے وہ شہادت سے تعبیر کرتا تھا، اس کے حافظے میں براہ راست نہ تھی، لیکن اس

سانحے کی ایک ایک تفصیل گھر اور باہر کی گفتگوؤں اور تذکروں کے سہارے اس نے اپنے شعور اور تحت شعور میں بسالی تھی اور امتدادِ وقت کے ساتھ وہ تفصیلات اس کے باطن میں اس طرح جاگزیں ہوگئی تھیں کہ وہ اب اس کے حافظے کا نہیں بلکہ تجربے کا حصہ بن گئی تھیں۔ کئی بار وہ راتوں کو چونک کر اپنا بستر ٹٹولتا کہ اس نے خواب میں خود کو اپنے باپ کی آغوش میں جاگتے دیکھا تھا۔ ماں کے نکاح ثانی، یا اپنے اوپر کسی سر پرست کے سائے کی ضرورت کے بارے میں اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ روحانی سطح پر باپ کی کمی قدم قدم پر محسوس ہونا اور بات تھی، اور گھر کے اندر، ماں کے بستر پر، عام زندگی میں، کسی نئے باپ کی آمد کا تصور اور بات تھی۔ سچ پوچھئے تو نواب مرزا اپنے تئیں اس قدر مکمل اور اپنی ذہنی زندگی کو کسی کفیل یا وکیل کی ضرورت سے اس قدر بے نیاز سمجھتا تھا کہ اسے کبھی خیال ہی نہ آیا تھا کہ زندگی کا موجودہ طرز و نظام کسی تبدیلی کا بھی متحمل ہوسکتا ہے۔ اگرچہ سن بلوغ کی آمد نے اپنی ہلکی ہلکی آہٹوں سے اسے خبردار کر دیا تھا کہ خود اس کی جسمانی اور روحانی زندگی میں کچھ بڑی تبدیلیاں رونما ہونے کا وقت آگیا ہے، لیکن ان تبدیلیوں کے ساتھ معاملہ کرنے، یا ان تبدیلیوں کے لائے ہوئے تقاضوں کی تکمیل فوری طور پر عمل میں لانے کے لئے گھر میں بیوی یا دل میں معشوق کی بھی کوئی جگہ ہوسکتی ہے، اس کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔ ابھی تو اسے اپنے ہم جنسوں، ہم سبقوں، اور ہمجولیوں میں کھیل کود کرنے، اشعار سننے سنانے، حافظے کی قوت کا مقابلہ کرنے، اور کبھی کبھی کسی دلکش دلچسپ چہرے والے ساتھی کو چھیڑنے میں جو لطف آتا تھا اسے ہی وہ اپنی خارجی زندگی کا حاصل سمجھتا تھا... اور داخلی زندگی؟ اس میں تو جاگتے سوتے اس کی ماں اور باپ کی حکمرانی تھی۔ باپ کی صورت اسے یاد نہ تھی، اس کی جگہ اس کی قوت متخیلہ کبھی اپنی ماں کو، کبھی قدم شریف میں باپ کے مزار کو، اور کبھی عبا و قبا پہنے ہوئے بلند و بالا قد والے صحت مند حکیم صاحب کو متمکن کر دیتی تھی۔ ایسے میں کسی اور کے گذر کا امکان کہاں تھا... لیکن اماں جان کی تنہائی اور... اور بے چارگی؟ بچے عام طور پر اپنے والدین کو ان کے عالم جوانی میں بھی سن رسیدہ یا بالکل بوڑھا سمجھتے ہیں۔ خاص کر جب بچے خود بڑے ہونے لگیں تو انھیں اپنے والدین بہت ہی قدیم اور فرسودہ معلوم ہوتے ہیں، چاہے فرسودگی کے اس احساس میں نکتہ چینی یا ازکاررفتگی کا کچھ دخل نہ بھی ہو۔ لیکن نواب مرزا کے ذہن میں باپ کی شبیہ کے ساتھ اپنی ماں کی شبیہ بھی وقت اور امتداد سے بے نیاز ہوگئی تھی۔ اپنی ماں اسے اب بھی بہت کم عمر اور تقریباً نا کتخدا معلوم ہوتی تھیں۔ ماں کا خیال آنے پر اس کا دل اکثر ایسی محبت کے احساس سے بھر جاتا تھا جس میں زمانہ اور اہل زمانہ کی چیرہ دستیوں کے خلاف اپنی ماں کے تحفظ اور ہمہ وقت ماں کے دفاع کا جذبہ دیگر

تمام تاثرات پر حاوی ہوتا تھا۔ اسے یہ خیال کبھی نہ آتا تھا کہ کبھی جب میں بڑا ہوں گا تو میری بھی شادی ہوگی، کوئی گھر ہوگا، اولادیں ہوں گی، پھر ایسے نظم حیات میں میری ماں کی جگہ کیا اور کہاں ہوگی۔ وہ کسی ایسے مستقبل کا تصور نہ کر سکتا تھا جس میں وہ اپنی ماں سے الگ زندگی گذارے، خصوصاً ایسی حالت میں کہ اس کی ماں دنیا میں موجود ہو۔ لیکن ماں کی تنہائی...؟ یہ خیال اسے بار بار آتا تو تھا، لیکن اس کے معنی اور مضمرات پر اس نے کبھی غور نہ کیا تھا۔ شاید اس کے دل میں یہ بات کہیں چھپی ہوئی تھی کہ اماں جان مجھے اپنی روحانی اور ذہنی زندگی کا محور بنالیں، ابا جان کی جگہ روحانی طور پر مجھے دے دیں، اور ہماری زندگی یوں ہی سبک قدموں گذر جائے۔ یہ بات اس کے خیال میں نہ آئی تھی کہ زندگی اس طرح نہیں گذرا کرتی۔ خود اسے بھی کسی نہ کسی دن بال بچوں والا گھر بنانا ہوگا اور اگر اسے ماں کا گھر چھوڑنا نہ بھی پڑے تو بھی ماں کو اس کی زندگی کا مرکز اس وقت تو خالی ہی کرنا ہوگا جب وہ خود بال بچوں والا ہو جائے گا۔

اب جو جہانگیرہ بیگم اور عمدہ خانم نے تجویز رکھی کہ اس کی اماں جان ایک بار پھر گھر گرہستی کے ساتھ ساتھ کتخدائی کے بھی بوجھ کو اٹھالیں تو اسے یک گونہ بے چینی کا احساس ہوا۔ ہر چند کہ وہ خود کہہ چکا تھا کہ اماں جان کے لئے اچھا نہیں ہے کہ وہ ماضی میں رہیں، لیکن اب جب اماں جان کو ماضی سے کھینچ کر حال میں لائے جانے کی بات ہو رہی تھی تو اسے رنجیدگی، گھبراہٹ، اور کسی بے نام سی برہمی کا احساس ہو رہا تھا۔ کیوں، آخران جھگڑوں جھمیلوں کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اماں جان کی تنہائی...

''آپ سے اس لئے بات کر رہے ہیں...،'' جہانگیرہ بیگم نے نواب مرزا کے خیالات کی لہروں کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''...اس لئے کہ ہم آپ کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔''

''میری مرضی؟ میں کیا اور میری مرضی کیا؟ اماں جان راضی نہ ہوئیں تو؟'' نواب مرزا کے لہجے میں تو نہیں لیکن اس کے دل میں امید کا ہلکا سا تبسم در آیا۔

''چھوٹی سے میں بات کروں گی۔'' عمدہ خانم نے کہا۔ ''یہ تو ہے ہی کہ چھوٹی نہ چاہے تو کچھ نہیں ہو سکتا... لیکن... لیکن زندگی اونچ نیچ کی جگہ ہے، عورت کے لئے مرد بڑا سہارا اور بڑی طاقت ہوتا ہے۔ عمر کا سورج ڈھلنے کے ساتھ زندگی کی دھوپ میں شدت آنے لگتی ہے، اس وقت عورت کے سر پر کوئی چھاؤں نہ ہو تو سب جھلس جائے، کچھ باقی نہ رہے۔''

''منجھلی خالہ،'' نواب مرزا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''وہ سب تو اپنی جگہ پر، لیکن میں اس معاملے میں اماں جان سے بات نہیں کر سکتا۔''

''اللہ میری توبہ۔'' عمدہ خانم نے کہا۔'' آپ سے کون کہہ رہا ہے کہ چھوٹی سے بات کریں۔ ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ اگر آپ کو یہ بات پسند ہو تو ہی ہمارا قدم اٹھے گا، ورنہ کوئی بات نہیں۔''

''پسند...؟'' نواب مرزا ایک دم گڑبڑا گیا۔'' اس میں پسند کی کیا بات، اور وہ بھی میری پسند! میں تو کہہ چکا کہ فیصلہ اماں جان کا ہے، میرا نہیں۔''

عمدہ خانم کچھ اور کہنا چاہتی تھی، لیکن جہانگیرہ نے محسوس کر لیا تھا کہ نواب مرزا پر اس وقت ذہنی اور جذباتی بوجھ بہت زیادہ ہے۔ یہ بات تو واضح تھی کہ وہ ماں کے لئے اس رشتے، یا کسی بھی مناسب رشتے کا پرزور مخالف نہیں ہے۔ لیکن اس کے آگے اس سے کچھ کہلانا اس وقت شاید ممکن نہ تھا۔ لہٰذا جہانگیرہ نے عمدہ خانم کو آنکھ کے اشارے سے منع کیا اور کوئی اور بات چھیڑ دی۔

اپنے خیالات میں جلتا بھنتا بازاروں میں بے مدعا پھرتا نواب مرزا دیر سے گھر واپس آیا۔ لیکن نواب مرزا کے اٹھتے ہی عمدہ خانم پالکی پر سوار ہو کر وزیر کے عارضی مستقر پر آئی اور پھر اس نے زیادہ تمہید کے بغیر جہانگیرہ بیگم کے توسط، اور آغا مرزا تراب علی کے پیغام کی بات وزیر کو بتا دی۔

''دیکھو بی بی، یہ رنجیدہ ہونے یا آزردہ ہونے کی بات نہیں، ساری زندگی کا سودا ہے۔ سوچ سمجھ کر جواب دو، اگر تمھیں نہیں پسند تو کوئی بات نہیں، ہم...''

وزیر خانم کے منھ پر بہت تلخ اور بہت رنجیدہ تبسم آیا۔'' ساری زندگی، بلکہ اپنی جان کا سودا میں نے کتنی ہی بار کیا اور اب کتنی بار کروں گی منجھلی باجی۔''

''کاتب تقدیر کے ایک ہاتھ میں قلم ہوتا ہے اور ایک ہاتھ میں تلوار۔ قلم جو لکھتا ہے تلوار اسے کاٹ بھی دیتی ہے۔ ہم میں سے بعض کی تقدیریں بار بار لکھی اور کاٹی جاتی ہیں۔ ہماری بازیاں بار بار کھیلی اور جیتی جاتی ہیں...''

''ایسی جیت سے کیا فائدہ جب بازی بار ہا کھیلنی پڑے؟''

''تم نہ کھیلنا چاہو تو کوئی اور تمھاری طرف سے بازی کھیل دے گا۔ زندہ پانسوں اور مردہ پانسوں میں یہی فرق ہے۔''

''کیوں؟ کیوں کھیل دے گا؟ اور کون کھیلے گا؟'' وزیر کی آواز میں نہ جانے کیسے غصہ، رنج، احتجاج، سب یکجا ہو گئے تھے۔'' کیا ہماری زندگی اور کیا ہماری بازیاں، اور کیا ہماری ہار جیت، یہ سب کچھ کسی شرارتی بوڑھے کے رچے ہوئے سوانگ ہیں؟ منجھلی باجی تمھیں یہ سب کہنے کا کوئی حق نہیں۔''

''میں تو کچھ نہیں کہہ رہی۔ کچھ بھی نہیں کہہ رہی۔ لیکن تو ہی بتا انسان دنیا میں اکیلا کیوں رہے جب اس کی طرف کسی کا ہاتھ محبت سے بڑھا ہو؟''

''محبت سے یا اپنے مطلب سے؟'' وزیر جل کر بولی۔

''محبت بھی ایک طرح کا مطلب ہی ہے۔ شاید سب سے زیادہ جابر اور قاہر۔ چھوٹی ذرا ہوش کے ناخن لو۔ جہانگیرہ اور میں تمھارے دشمن نہیں ہیں۔''

وزیر خانم دیر تک خاموش رہی، پھر تھکی ہوئی سی آواز میں بولی، ''اچھا۔ میں سوچوں گی۔'' اس نے یہ کہا اور عمدہ خانم کی طرف دیکھے بغیر بارہ دری سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ عمدہ خانم نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید نواب مرزا اس طرف آتے ہوں، یا شاید وزیر ہی باہر آئے، لیکن جب دونوں میں سے کوئی بات رونما ہوتے نظر نہ آئی تو وہ بھی اپنی حویلی کو واپس چلی گئی۔

وزیر خانم کو رات بھر نیند نہ آئی۔ لیکن وہ اپنے دل کا حال کس سے کہتی؟ ایک منجھلی تھی لیکن وہ تو خود ہی اس کے سررشتۂ حیات کو باریک سوت کے لچھے کی طرح الجھانے اور کاٹ کاٹ کر اسے نئی شکلیں دینے پر آمادہ تھی۔ نواب مرزا میرا بیٹا ہے، اس کے سامنے ایسی باتیں کیونکر ممکن ہو سکے ہیں۔ پھر وہ تو خود ابھی بچہ ہے... اور کوئی اس سے کچھ کہے بھی تو وہ کیا سوچے گا؟ کہ اماں جان کو بڑھاپے میں یہ کیا چونچلے سوجھے ہیں... اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کہیں اس کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اپنے باپ کی یاد پر جان چھڑکتا ہے... اور میں؟ میرے لئے بھی ان کی یادیں... کوئی میرا دل چیر کر دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ میں تو ایک ویران مزار ہوں جس پر نواب شمس الدین احمد خان کی یاد چراغ لوح کی طرح روشن ہے۔ وہ چراغ نہ ہو تو مزار ہمیشہ کے لئے اندھیرے میں ڈوب جائے... اور بلاک صاحب اور میرے بچے... بلاک صاحب کو مجھ سے چھینا گیا تو میرے بچے بھی جبراً مجھ سے لے لئے گئے۔ لیکن اللہ میں ان بچوں کو کس طرح پالتی پوستی۔ کیوں نہ پالتی پوستی، جس طرح نواب مرزا کے شجر حیات کو گل بکاولی کے پودے کی طرح اپنے آنسوؤں سے سینچتی آئی ہوں۔ لیکن اگر امیر مرزا اور بادشاہ بیگم میرے ساتھ ہوتے تو کیا نواب صاحب مجھ پر اسی طرح مائل ہوتے؟ پرائے بچوں کو سبھی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتے ہیں... اپنا بچہ اور پرائی عورت ہی سب کو بھاتی ہے۔

اور یہ آغا صاحب کون ہیں، مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ سنا ہے شیعہ ہیں۔ تو کیا متعہ کریں گے، یا

نکاح میں لیں گے؟ میرے بیٹے اور میرے بچھڑے ہوئے بچوں کا کیا ہوگا؟ امید تو نہیں کہ امیر مرزا یا باد شاہ بیگم اب میرے پاس لوٹ کر آئیں، لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ دنیا تو عالم امکان ہے۔ اور اگر انھوں نے لوٹ کر آنا چاہا تو کیا یہ آغا صاحب راضی ہوں گے؟

دو دن اسی ادھیڑ بن میں گذر گئے۔ جہانگیرہ کو اب واپس اکبر آباد جانے کی جلدی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ بیل میرے سامنے ہی منڈھے چڑھ جائے۔ لیکن اسے وزیر کے مزاج کا بھی خوب اندازہ تھا کہ وہ کسی کے کہنے میں نہیں ہے۔ ہوش سنبھالنے کی عمر کے آتے ہی وزیر کو اپنے حسن کی ساحرانہ کشش اور اپنی روح میں انگڑائیاں لیتی ہوئی موہنی کا احساس ہو گیا تھا۔ خود پر اعتماد، اور پھر مدتوں کی معشوقی نے اس میں ایک دلفریب مگر آسانی سے تسخیر نہ ہو سکنے والا انداز تبختر پیدا کر دیا تھا۔ تجربۂ زیست نے اسے بھلے برے کی تمیز، اور عام چاہنے والوں کے تئیں عام طور پر رعونت کا برتاؤ بھی سکھا دیا تھا۔ اسے اپنی تکمیل کے لئے مرد کی ضرورت نہ تھی۔ مرد کے ذریعہ وہ اپنی شخصیت اور وجود کا اثبات چاہتی تھی۔ اس کا گمان تھا کہ اگر دنیا میں محبت کہیں ہے تو وہ عورت کے لئے ہے۔ یعنی عورت چاہے، اور اپنی مرضی کے علاوہ کسی کی پابند نہ ہو۔ وہ کہتی تھی کہ مرد چاہتے نہیں ہیں، وہ چاہے جانے کے احساس کے دلدادہ ہیں۔ اگر ان کو چاہے جانے میں لطف آنے لگے تو یہ گویا ان کا چاہنا ہے۔ اصل چاہ تو عورت کی ہوتی ہے۔ لیکن عورت اگر سوچ سمجھ کر نہ چاہے، فریب میں مبتلا ہو جائے، تو اسے اپنی بھول کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑ سکتی ہے۔ مگر یہ قیمت بھی گوارا ہے اگر وہ مرد میں چاہے جانے کا احساس پیدا کر سکے اور اس طرح مرد کی شبیہ میں اپنی شبیہ دیکھ سکے۔

محبت کی تلاش میں سرگرداں پھرنا ہی شاید ہمارا مقدر ہے، وزیر نے ایک رات چونک کر ادھوری نیند اور خواب کے درمیان کسی کیفیت سے باہر آ کر خود سے کہا، لیکن اس کا بآواز بلند یہ کہنا خود کلامی نہ تھا، فیصلہ تھا۔ صبح کو اس نے پالکی منگوا کر عمدہ خانم کی حویلی کا رخ کیا اور جہانگیرہ کو کہلا بھیجا کہ زحمت قدم نہ فرمائیں۔ منجھلی کا سامنا ہوتے ہی وزیر نے کسی تمہید یا مزاج پرسی کے بغیر کہا:

"منجھلی باجی، تم اس نسبت میں میرا کیا فائدہ دیکھتی ہو؟"

"لڑکی تو باولی ہو گئی ہے کیا؟" عمدہ خانم نے ہنس کر پیار سے کہا۔ "اب تجھے یہ بھی سمجھانا پڑے گا کہ عورت کے لئے مرد اس کے بدن کی چادر ہے، اس کے سر کے اوپر کی چھت ہے، اس کی جوانی کی پناہ، اس کے بڑھاپے کا سہارا ہے۔"

''واہ منجھلی باجی، تمھیں تو کسی مسجد کا واعظ یا امام ہونا چاہیئے تھا۔''

''چھوٹی بیگم۔ ان باتوں کو اس طرح ہنسی میں نہ اڑا۔ یہ تیرے لئے غور وفکر کا مقام ہے۔''

''اب تک مجھے مردوں سے کون سا سہارا ملا ہے کہ اب مل جائے گا؟'' وزیر نے تنک کر کہا۔

''ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ۔ نواب مرزا اب نام خدا جوان ہونے کو ہے۔ وہ اپنا گھر بسائے گا، اپنی گرہستی بنائے گا۔ خدا معلوم دہلی میں رہے کہ رام پور میں کہ کہیں اور چل دے۔ اس زمانے کے لڑکے گھر سے آزاد رہنا پسند کرتے ہیں، خاص کر جب باپ کا پاؤں درمیان نہ ہو۔''

''میرا نواب مرزا ایسا نہیں، وہ مجھے کبھی نہ چھوڑے گا۔''

منجھلی کے جی میں آئی، پوچھے کہ امیر مرزا اور بادشاہ بیگم کی طرح؟ لیکن بہن کی دل آزاری اسے منظور نہ تھی۔ وہ تہ دل اس بات کی تمنا کرتی تھی کہ چھوٹی کی ناؤ کہیں ٹھیک سے پار گھاٹ لگ جائے۔

''نہ سہی۔ لیکن آخر تم کھاؤ گی کیا اور نواب مرزا کو کھلاؤ گی کیا؟ تم نے زندگی کا بڑا حصہ سکھ سے گذارا ہے، نوکر چاکر، دربان محافظ، پالکی نالکی، سب کچھ مہیا تھا۔ نواب مرزا کو بھی تم نے بڑے ناز سے پالا۔ لیکن آخر کب تک؟ کیا میں دیکھتی نہیں ہوں کہ تمھاری حالت اب سقیم ہوتی جا رہی ہے؟''

وزیر کہاں تو عمدہ خانم سے بحث پر آمادہ تھی، اور کہاں ایک دم چپ ہوگئی۔ اس کے چہرے پر زردی کی لہر سی آئی، ہونٹ خشک ہونے لگے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کوئی لفظ زبان تک نہ آسکا۔ منجھلی نے چھوٹی کی یہ حالت دیکھی تو اس نے گھبرا کر اپنی خاص اصیل چاندنی کو آواز دی کہ وزیر خانم کے لئے عرق بید مشک برف ڈال کر جلد لا۔ ان کا جی کچھ ماندہ ہو رہا ہے۔ پھر اس نے بہن سے کہا:

''دیکھو بنو۔ میں کوئی زبردستی نہیں کرتی۔ فیصلہ تمھارا ہی ہے، تمھارے ہی ہاتھ میں ہے۔ اور میں یہ بھی نہیں کہتی کہ تم میری ہی پسند کو قبول کرو۔ تم سوچ سمجھ لو، چاہو تو دیکھ بھال بھی لو۔ اگر نسبت پسند آئے تو منظور کرو ورنہ خوش اسلوبی سے انکار کر دو۔ دیکھو ایک فائدہ اس رشتے میں یہ بھی ہے کہ تم رامپور میں رہو گی، نواب مرزا تمھارے ساتھ رہیں گے۔''

''یہ کون صاحب ہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔ کہاں انھوں نے میرے بارے میں سنا، یا مجھے دیکھا۔ میں انھیں کیوں پسند آ گئی؟'' وزیر نے کچھ پریشانی کے لہجے میں کہا۔

عمدہ خانم، جو بچپن ہی سے وزیر پر جان چھڑکنے والوں کا ہجوم اپنے اور وزیر کے اطراف میں دیکھتی رہی تھی، اپنی مخصوص دل آویز ہنسی ہنس کر بولی:

''اے سبحان اللہ۔ گویا اب آپ کو یہ بھی سمجھانا پڑے گا کہ آپ کے ذکر اذکار سارے رامپور میں ہیں۔ واری جاؤں، ابھی تو تم بالکل کنواری لگتی ہو۔''

''منجھلی باجی ہمیں بناؤ نہیں۔ سچ سچ پورا حال کہو تو میں کچھ سوچوں بھی۔''

''پورا حال کچھ بھی نہیں۔ جہانگیرہ کے جیٹھ ہیں، انھوں نے جہانگیرہ سے تمھارا ذکر سنا... اور ...اور... سچ تو یہ ہے کہ نواب شہید کے سانحے کے بعد کون ہے جس نے تمھارا ذکر یوں بھی نہ سنا ہو۔ اب جو تم رامپور آئیں اور یہاں کی بی بیوں نے تم کو دیکھا تو بیان اور توقع سے سوا پایا۔ آغا صاحب کی بیوی کو گذرے کوئی ایک سال ہو رہا ہے، انھوں نے جہانگیرہ سے تمھارے بارے میں پوچھا...''

''تو کیا نکاح کے طالب ہیں؟''

''لو اور کیا؟ آخر جہانگیرہ بیچ میں ہیں۔''

''نہیں، میں سمجھی، شاید متعہ چاہتے ہوں۔''

''توبہ توبہ۔ رامپور میں امامیہ مذہب کے نواب کا راج ہے تو کیا ہوا۔ یہ لوگ اصلاً تو اہل سنت ہی تھے۔ یہاں ایسی چیزوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔''

''اور اگر کوئی اولاد ہوئی تو کیا اسے شیعہ بنائیں گے؟''

''اے بی بی، تمھیں اتنی دور تک سوچنے کی کیا پڑی ہے؟ جب اولاد ہوگی تب دیکھیں گے۔''

''نہیں۔ یہ بات صاف ہونی چاہیے۔ اولاد اگر ہوئی تو وہ ہمارے مسلک پر چلے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں جہانگیرہ سے کہوں گی۔ اور کچھ؟''

وزیر خانم پھر کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر بولی:

''میں نے ان آغا صاحب کو دیکھا تک نہیں ہے۔ کس قماش کے مرد ہیں، کیا مزاج ہے، کڑوے سبھاؤ کے تو نہیں ہیں۔ نواب مرزا کے لاڈ پیار میں کمی تو نہ کریں گے؟''

''اگر ان کے سبھاؤ یا ذات پات یا شرافت میں کوئی کمی ہوتی تو نہ جہانگیرہ بیگم یہ بات اٹھاتیں اور نہ میں۔ لیکن کیا تم ان کے سامنے ہونا چاہتی ہو؟''

''نہ... نہیں، یہ بات نہیں۔ لیکن میں نے ایسی پیونگی کبھی کی نہیں۔ بن دیکھے کا سودا کرتے مجھے الجھن بھی ہوتی ہے اور تھوڑی سی دہشت بھی۔''

اب عمدہ خانم کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ ''آغا صاحب پرانے طور طریقوں کے آدمی ہیں۔ اللہ

جانے وہ کیا خیال کریں۔''

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ یہ تو شرعاً بھی حکم ہے۔''

''اے بی بی ان معاملوں میں رواج اور رسم زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ خیر، تو آج رات کی رات یہیں ٹھہر جا۔ میں بعد نماز عصر جہانگیرہ کے وہاں چلی جاؤں گی، سب باتیں صاف کرلوں گی، کہ اگر اگلا قدم اٹھانا ہے تو وہ کل یہیں سے اٹھے۔ میں اپنے نواب صاحب سے بھی مشورہ کرلوں گی۔''

''مگر ایک بات اور ہے،'' وزیر نے کہا۔ ''میں نواب مرزا کو کسی حال میں رنجیدہ نہیں دیکھ سکتی۔''

عمدہ خانم نے بہن کا عندیہ سمجھ لیا۔ ''نواب مرزا سے ہم بات کرلیں گے۔ ان کی مرضی اگر خلاف ہوئی تو بس معاملہ یہیں ختم سمجھو۔''

آغا مرزا تراب علی کے شاید دل کو لگی ہوئی تھی۔ اس شام عمدہ خانم اور جہانگیرہ بیگم کی بات چیت کو بہت وقت نہ گذرا تھا اور عمدہ خانم ابھی اپنی حویلی پر آئی ہی آئی تھی کہ ڈیوڑھی پر ایک سونٹا بردار خادم اور دو مزدور حاضر ہوئے۔ انھوں نے اندر اطلاع بھجوائی کہ ہم آغا صاحب کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ آغا صاحب نے کچھ سوغات بھیجی ہے۔ مرادآبادی پیتل کے چار گھڑوں میں خشک میوے تھے اور سہارنپور کے نازک کام کا، شیشم کی لکڑی کا ایک چھوٹا مقفل صندوقچہ تھا جس کی کنجیاں سربہ مہر تھیلی میں الگ سے رکھی ہوئی تھیں۔ سونٹا بردار اور مزدوروں کو انعام دے کر رخصت کرانے کے بعد عمدہ خانم نے صندوقچہ وزیر کے ہاتھ میں دیا کہ لو بھئی اسے تم ہی کھولو۔ یہ میوے کے گھڑے میں ابھی مودی خانے میں رکھوائے دیتی ہوں۔ وزیر کے چہرے پر شرم کی لالی دوڑ گئی۔ خدا جانے اس صندوقچے میں کیا ہے؟ کہیں کوئی قیمتی شے نہ ہو۔ مجھے ایسی کوئی تحفہ چیز ان سے لینا ہرگز منظور نہیں۔ لیکن صندوقچہ کھولے اور اس کے اندر کیا ہے یہ دیکھے بغیر کوئی فیصلہ بھی کیونکر ہو سکے ہے۔

انھیں خیالوں میں گم صندوقچہ لئے لئے وہ اندر کے ایک حجرے میں چلی گئی۔ گھبراہٹ میں کنجی اس کے ہاتھ سے پھسل پھسل جاتی تھی، بارے صندوقچہ کھلا تو اس میں دو کاغذ عمودی شکل میں لپیٹے ہوئے اور کلابتو سے بندھے ہوئے تھے۔ اللہ تیرا شکر ہے، کوئی ہیرے جواہر کی چیز نہیں ہے، اس نے سوچا اور ایک کاغذ اٹھا کر کھولا تو اس پر سعدی کے اشعار نہایت خوشنما خط شفیعا میں لکھے ہوئے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ لکھنے والے نے کوئی اہتمام نہیں کیا ہے لیکن اس کا سواد خط اس قدر پاکیزہ اور متوازن ہے

کہ اسے اہتمام کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ اشعار حسب ذیل تھے۔

حدیث عشق بہ طومار در نمی گنجد
بیان شوق بگفتار در نمی گنجد
سماع انس کہ دیوانگاں ازو مستند
بسمع مردم ہشیار در نمی گنجد
ترا چنانکہ توئی من صفت نہ خواہم کرد
کہ عرض جامہ بہ بازار در نمی گنجد
دگر بہ صورت ہیچ آفریدہ دل نہ دہم
کہ با تو صورت دیوار در نمی گنجد
بچشم دل نظرت می کنم کہ دیدۂ سر
ز برق شعلۂ دیدار در نمی گنجد

وزیر اشعار پڑھ کر دنگ رہ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاعر نے یہ شعر خاص کر کے اسی کے لئے اور اسی موقعے کے لئے کہے تھے۔ ہر شعر میں معنی کی تہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ وزیر تمھارے ہر سوال کا جواب یہاں موجود ہے۔ جب وزیر کی حیرت اور بہجت کچھ کم ہوئی تو اچانک اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کبھی نواب شمس الدین احمد شہید سے بھی اسی طرح اشعار کا ردو بدل ہوا کرتا تھا۔ ہائے وہ دن اور وہ راتیں اب میں کہاں سے لاؤں۔ لیکن اب تو دنیا ان دنوں اور راتوں کو پاؤں تلے روند کر کے اور پاتال میں دفن کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ دنیا تو پیچھے مڑ کر دیکھتی بھی نہیں، گردش ایام کے پیچھے کی طرف دوڑنے یا چند لمحوں کے لئے رک ہی جانے کا سوال کہاں ہے۔ نواب شمس الدین احمد شہید کی صورت ابھی اس کی آنکھوں میں دھندلی تو نہ ہوئی تھی لیکن اب اس شبیہ خیالی میں امیر مرزا، نواب مرزا، اور شاید اس کے اپنے باپ کی بھی کچھ جھلک ہویدا ہونے لگی تھی۔ اسے اس بات کا تو احساس ہو گیا تھا کہ کوئی کتنا ہی حریت پسند کیوں نہ ہو، کتنا ہی اپنی مرضی اور اپنے انتخاب پر اصرار کیوں نہ کرے، لیکن کوئی چیز پوری طرح تنہا، پوری طرح قائم بالوجود نہیں ہوتی۔ نواب مرزا کی ہستی نے شمس الدین احمد خان شہید کی ہستی میں کچھ تغیر برپا کر دیا تھا اور امیر مرزا اور بادشاہ بیگم اس سے علحدہ ہو چکے تھے لیکن تو بھی مارسٹن بلیک ایک حد تک انھیں کے توسط سے اس کے لوہو میں زندہ تھا... اور اب... یہ نئی لہر میری زندگی کے ساحل کو سیراب (یا برباد) کرنا چاہتی ہے، تو

اس کے بھی نشانات دور دور تک اور کئی لوگوں کی زندگیوں پر مترتب ہوں گے۔ کیا میں اس کے لئے تیار ہوں؟

اس نے اپنے سراپا پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی۔ اندر کہیں وہ شکستہ ہو چلی تھی، لیکن اوپر اوپر تو اس کا تشخص ابھی کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا نواب شہید چھوڑ کر گئے تھے۔ کیا وہ خراشیں جو میری روح پر ہیں جلد یا بدیر میرے بدن پر بھی تسلط جمالیں گی اور کیا یہ سارا بے بناؤ کا بناؤ، بے سنگار کا سنگار سکڑ کر اور تڑ مڑ کر جھریوں اور سلوٹوں کا لقمہ بن جائے گا...

اسے منجھلی کی بات یاد آئی کہ کوئی دن جاتا ہے جب نواب مرزا اپنی گرہستی الگ بنائے گا اور تجھے بالکل تنہا رہنا ہوگا۔ پھر بڑھاپا ہوگا اور تو ہوگی... لیکن... اس نسبت میں تو یہ فائدہ ہے کہ میں رامپور میں ہوں گی۔ نواب مرزا میرے ساتھ رہے گا، مجھے دہلی خراب آباد کے غل مچاتے سناٹوں سے بھی نجات ملے گی اور بیٹے کی اٹھان دیکھ دیکھ کر میرا ابھی جی بڑھے گا۔ کیا میری تقدیر میں اولاد پیدا کرنا اسی لئے لکھا ہے کہ مجھے اپنے جگر گوشوں سے بزور جدا کر دیا جائے، میرا پہلو چیر کر دل و جگر اس میں سے نوچ کر مجھے ویران کر دیا جائے؟

...ارے میں نے دوسرا کاغذ تو ابھی کھولا ہی نہیں، اسے خیال آیا۔ اس نے سنہرے دھاگے کے بند کھول کر کاغذ کو سیدھا کیا۔ رنگ اور روشنی کے جھماکے اس کی آنکھوں کے آگے کوند گئے۔ بے حد وجیہ لیکن ذرا سن رسیدہ مرد کی دو چشمی تصویر تھی۔ کوئی چالیس پینتالیس کا سن، گورا رنگ، زندہ دمکتی ہوئی آنکھیں، بلند پیشانی پر لٹ پٹی دستار کا تھوڑا سا سایہ، دستار اموے رنگ کی ریشمی، جس میں باریک زرد دھاریاں جھلک مار رہی تھیں، ایرانی طرز کی نوک دار داڑھی بہت ہلکی، تھوڑی سی نمایاں مونچھیں، بدن میں ہلکی سبز پھولدار ململ کا نہایت باریک کرتا، جس پر مغل وضع کا نیمہ۔ تصویر کے ہر خط اور ہر نقطے سے خوش مزاجی اور خوش ذوقی ترشح کر رہی تھی۔ وزیر کی نگاہیں جمی کی جمی رہ گئیں۔ اچانک اس نے جھرجھری لی، گویا نیند سے اٹھی ہو یا بیہوشی سے ہوش میں آئی ہو۔ تصویر کو کھڑکی کے قریب خود سے پرے رکھ کر اس نے دوبارہ دیکھا، رنگوں اور صاحب شبیہ کی شگفتگی کا وہی عالم تھا۔

اچانک اس پر جھلاہٹ سی طاری ہونے لگی، ایسی جھلاہٹ جس میں بے بسی کا عنصر زیادہ تھا۔ میں تو چاہتی تھی کہ اپنی مرضی سب پر جاری کروں۔ لیکن اب تو کچھ اور ہوا چاہتا ہے۔ منجھلی باجی، جہانگیرہ، یہ آغا صاحب، یہ لوگ کیوں مجھ پر اپنی مرضی اور اپنا ارادہ تھوپنے پر لگے ہیں۔ کون ہوتے ہیں یہ لوگ کسی کی زندگی کے طرح کش ہونے والے؟ انسان اپنی چاہت سے جی نہیں سکتا پر مر تو سکتا ہے۔

شاید اب بھی جو ہوگا میری مرضی ہی سے ہوگا۔ نہیں، منجھلی اور جہانگیرہ کی منصوبہ بندی نہ سہی، لیکن نواب مرزا کی تو مرضی اس میں شامل ہوگی۔ اب میں آزاد نہیں رہ گئی۔

حجرے سے باہر نکل کر اس کی نگاہوں نے منجھلی کو ڈھونڈا۔ وہ تو وہیں دالان میں تخت پر بیٹھی ہوئی باریک نفیس چھالیا کتر رہی تھی گویا اسے کوئی اور کام ہی نہ ہو۔

''منجھلی باجی۔ نواب مرزا سے تم نے بات کی؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''تم مطمئن رہو بی بی۔ میں نے اور جہانگیرہ نے ان سے دیر تک بات کی ہے۔''

''تو پھر؟ کیا کہا انھوں نے؟ برا تو نہیں مان گئے؟''

''اے ہے برا کاہے کو مانتے۔ انھوں نے کہا کہ فیصلہ تو اماں جان کا ہوگا۔ مجھے تو یہی لگا کہ وہ خود تمھاری تنہائی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔''

''اچھا'' وزیر نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ ''تو میں قسمت ٹھونکے لیتی ہوں۔ ہر چہ بادا باد...'' یہ جملہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس نے منھ پھیر کر آنسوؤں کو چھپایا اور اندر جا کر قلم دان سے قلم لے کر سعدی کی غزل کے نیچے صائب کا شعر لکھا۔

گنج رازیں پیش درویرانہ می کردم نہاں
ایں زماں در گنج پنہاں می کنم ویرانہ را

اگلے چاند کی پہلی جمعرات (۴ شعبان المعظم ۱۲۵۸ مطابق ۱۱ اگست ۱۸۴۲) کو وزیر خانم اور آغا مرزا مولوی تراب علی کا نکاح بطریق اہل سنت اور پھر بطریق مذہب اثنا عشریہ باندھا گیا۔ ڈھائی سو اشرفیاں مہر مقرر ہوا، نصف اس کا معجل تھا جو فوراً ادا کر دیا گیا۔ وزیر خانم دہلی واپس نہیں گئی، اس کی رخصتی منجھلی کی حویلی سے عمل میں آئی۔ دہلی سے بڑی بیگم اور اس کا میاں بہت کچھ سامان لے کر خوش خوش آئے اور پوری دل جمعی سے شادی کی رسوم میں شریک ہوئے۔ ان کا دل ٹھنڈا ہوا کہ چھوٹی آخر راہ مستقیم اور راہ نجات پر آگئی ہے۔ نواب یوسف علی خان نے شادی کی دعوت، گھوڑے جوڑے اور رخصتی کا اہتمام بڑی شان اور دھوم دھام سے کیا اور سارے خرچ کی کفالت اپنے ذمہ کر لی۔ دوسرے دن ولیمے میں نواب یوسف علی خان اور دوسرے عمائدین شہر موجود تھے۔ نواب محمد سعید خان بہادر کی طرف سے نوشاہ اور دلہن دونوں کے لئے شیرینی، جوڑے اور انگشتریاں آئیں۔

وزیر نے دہلی کا گھر اپنے قبضے ہی میں رکھا، لیکن اسے بند کرا کے کنجیاں بڑی کے حوالے کر دیں کہ کبھی کبھی کھلوا کر صفائی اور مرمت وغیرہ حسب ضرورت کراتی رہے۔ چوتھی کی معمولی رسموں کے بعد وزیر اور نواب مرزا نئے گھر میں منتقل ہو گئے۔ آغا مرزا تراب علی نے ان کی خاطر داریوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ وزیر خانم کو مدتوں بعد محسوس ہوا کہ امن و امان اور سلامتی کے چاند اس کے گرد ہالہ کئے ہوئے ہیں اور خارجی دنیا کی کریہہ ظلمت اب اسے اور اس کے بیٹے کو کبھی نہ چھو سکے گی۔

آغا مرزا تراب علی کہنے کو تو مولوی بھی کہلاتے تھے لیکن ان میں مولویوں جیسا تقشف اور ملایان مکتبی جیسی یبوست نام کو نہ تھی۔ نہ ہی انھیں اپنی خاندانی وجاہت کا کچھ ایسا مبالغہ آمیز وہم تھا کہ وہ چھوٹی بیگم کو اپنے سے کمتر سمجھتے۔ ان کا مزاج صحیح معنی میں شاعرانہ اور عاشقانہ تھا۔ اور وزیر کا وہ اس قدر لحاظ کرتے تھے کہ ایک طرف تو وہ اسے ”چھوٹی بیگم“ کبھی نہ کہتے اور نہ وزیر خانم، بلکہ ہمیشہ ”وزیر بیگم“ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اپنے گھر والوں سے وہ فارسی بولتے تھے، لیکن وزیر سے ان کی بات چیت با محاورہ ریختۂ اردو ہی میں ہوتی تھی۔ اور یہ بھی اسی لحاظ و پاس کا ایک حصہ تھا، کہ فارسی بولیں گے تو کہیں وزیر کو یہ گمان نہ گذرے کہ اپنا ولایتی ہونا جتا رہے ہیں۔ اسی طرح، انھوں نے وزیر کی بھولی بسری شعر گوئی کے نقوش دوبارہ اجالنے کی کوشش کی۔ عمدہ خانم کو وہ زور دے کر اور اصرار سے کہتے کہ وزیر خانم المتخلص بہ زہرہ دہلوی کے اشعار سوچ سوچ کر حافظے سے برآمد کریں۔ اگر کوئی بیاض ہو تو اسے ڈھونڈ نکالیں، ہم اگر وزیر بیگم کے کمال صورت اور جمال سیرت کے دلدادہ ہیں تو ان کے شاعری کے بھی گرویدہ ہیں۔ ہم تو رامپور کے اساتذہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے دلی سے ایک مونال تیتر ہی نہیں بلکہ ایک شاما بھی حاصل کی ہے۔

”اے چلئے آغا صاحب،“ وزیر کبھی کبھی تنک کر جواب دیتی۔ ”ہمیں اپنی کھال میں مست رہنے دیجیے۔ کہیں آپ کا وہی حال نہ ہو کہ لوگ کہیں ابتر کے گھر میں تیتر باہر رکھوں کہ بھیتر۔“

آغا تراب علی نے قہقہہ مارا اور بولے، ”آپ کو معلوم ہے وزیر بیگم، انگریزی شطرنج میں فرزی کو ”ملکہ“، یا ”بیگم“ کہتے ہیں، اور ہماری شطرنج میں فرزی کو ”وزیر“ کہا جاتا ہے۔ تو آپ کے تو دونوں طرف سے پو بارہ ہیں، کھال میں مست رہنے کا بھلا مذکور ہے۔“

”توبہ ہے۔ گھر گرہستی ہو یا شاعری، کوئی شطرنج یا چوسر کا کھیل تھوڑا ہی ہے۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ آپ کے خمیرے کی مہک سے دم الٹا آتا ہے، سانس برابر ہی ہونے میں نہیں آتا اور آپ کو شاعری کی

نوا اور مغنی کے نفس کی سوجھی ہے۔‘‘

آغا تراب علی پھر ہنس کر بولے،’’یونانی حکما تو گردش سیارگاں کی آواز کو ہر نغمے بلکہ ہر وجود کی بنیاد قرار دیتے تھے۔‘‘

’’چھوڑیے ان فیلسوفوں کو،‘‘ وزیر ایک ادائے دلبری سے کہتی۔’’یہ نہیں کہ رٹول یا گنگوہ سے ہری تازہ کیریاں منگوا دیتے۔‘‘

’’ارے، ہم تو آپ کو بتانا بالکل بھول ہی گئے تھے۔ ہم نے دو گھڑ سوار کل بھیجے ہیں، ایک مظفر نگر اور رٹول گیا ہے ور دوسرا گنگوہ اور سہارن پور۔ دیکھیے گا کل شام پھولتے پھولتے دونوں اتنی کیریاں لے آئیں گے کہ شفق شام کی سرخی کو ان کی ہریالی پر غبطہ ہوگا۔‘‘

وزیر کو نکاح کے چند ہی دنوں بعد حمل ٹھہر گیا تھا۔ اطبا کے معالجے، حبیب النسا کی زبردست نگہداشت، اور پھر تجربہ کار دائی جنائیوں کی براہ راست نگرانی کا ثمر جون ۱۸۴۳ میں وزیر کے تیسرے بیٹے کی شکل میں رونما ہوا۔ بالکل باپ کی شکل اور اچھے ہاتھ پاؤں والے بیٹے کا نام آغا مرزا تراب علی نے وزیر کے کہنے پر شاہ محمد آغا مرزا رکھا۔ بڑا ہو کر یہ بیٹا بھی شاعر بنا۔ فارسی میں شائق اور ہندی میں شاغل تخلص اختیار کر کے آئندہ زمانوں میں نومولود نے استادی کا درجہ حاصل کیا اور بہت نام کمایا۔

چھٹی اور زچگی سے فراغت ہوتے ہوتے برسات کے دن آ گئے۔ آغا مرزا تراب علی کی حویلی کے آنگن اور چمن میں وہ گل رنگینیں جن کے بارے میں موسم تابستاں میں لگتا تھا کہ روز آفرینش سے یہاں سبزے کی پرچھائیں بھی نہیں گذری، اب اچانک انگڑائی لے کر لہلہانے لگیں۔ کوچہ و برزن میں جنگلی پھول پودے، گھروں میں کاشتکاری کی ترکاریاں، باغوں میں آموں سے لدے ہوئے درخت، بارش اور ہریالی کا اس قدر جوش کہ دونوں ایک دوسرے سے ہر وقت باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کوسی ندی میں بہیا کا سا سماں پیدا ہو گیا، اس کی لہروں کو دیکھ کر میر تقی صاحب کے شکارناموں کی ابیات یاد آتی تھیں کہ کہاں تو پہلے یہ حال تھا۔

کناروں میں اس کے کہیں کوئی کھیت
وگر نہ یہی سنگ بے رتبہ ریت
نہ سبزہ کہیں تھا نہ آب رواں
نہ دامن میں اس کے چکارا دواں

نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار
نہ ظاہر میں اس کے کہیں لالہ زار
یہی سینک یا کانس پانی کی گھانس
زمین و ہوا آب و آتش اداس
کہیں دوں لگی ہے تمامی ہے دود
کہیں دو شجر ہیں تو کیا بد نمود
نہ پتہ نہ شاخیں نہ کچھ ان کو بار
سراپا ہے خشک و زبوں زرد و زار

اور کہاں برسات کی جھڑی لگتے ہی وہ حال ہوا جیسا کہ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

عجب لطف کا تھا وہ کوہ گراں
کہ صد چشمہ کا اس میں پانی رواں
شجر سبز و پتھر بہت صاف تھے
سبھی جیسے الماس شفاف تھے
ہوا ایک ابر اس جبل سے بلند
ہوا پر بچھے اس کے یزدی پرند(۱)
پہردن سے بارش لگی ہونے زور
رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
نکلتا ہوا کھینچ کر یہ عذاب
بلا بیش تر ایک تہ دار آب
رواں تھا کسو کی طرف تند وتیز
ہوا اس کے چلنے کی تھی پیش خیز
وہ پانی جو چلتا نہ تھا ڈھنگ سے
کہ تھا رگرا سر زناں سنگ سے

(۱) یزدی = یزد (ایک شہر کا نام) کے بنے ہوئے؛ پرند = دوشالہ، چادر۔

صفا اور خوبی میں کچھ بڑھ گیا
کئی ہاتھ مقدار سے چڑھ گیا
کہیں سبزۂ تر سے جی جا لگے
کہیں سرسوں پھولے دلوں کو ٹھگے
وہ پانی چلا واں سے دریا ہوا
رواں گرم تر سوے صحرا ہوا
بہا دامن کوہ میں سنگ پر
کیا سنگ ریزوں کو بھی رنگ پر
کہ لوگ ان کو ہاتھوں میں رکھنے لگے
جواہر کے رنگوں پرکھنے لگے
بہا سنگ ریزوں پہ اس رنگ آب
کہ قدر ان کی جوں قدر یاقوت ناب
بحیرہ نہ دریاے اعظم سے کم
اٹھا کرتے تھے لجے لطمے بہم
کنارے پہ تھی اس کے اک گل زمیں
سراسر ہری جوں زمرد نگیں

ایسے ہی گلستاں رنگ قطعہ ہاے زمیں میں اور باغوں میں جھولے پڑ گئے، پکوانوں کی مہک سے سارا ماحول شاہی باورچی خانہ بن گیا۔ موروں کی جھنکار، کوئلوں کی کوک اور ٹیٹری کی پکار نے زمیں آسمان ایک کر رکھا تھا۔ رام پور صحیح معنی میں دارالسرور ہو گیا۔ مدتوں بعد وزیر کے آنگن میں ہر طرح کی بہار تھی۔ گود میں بیٹا، چاہنے والا مرد، خوف سے وارستگی، ملکۂ شعر و شاعری اور علمیت ولیاقت میں نواب مرزا کی پیہم ترقی، اس کی سعادت مندی روز افزوں، اب بھلا اور کیا درکار ہوتا۔ وزیر خانم کے لئے دن عید اور رات شب برات سے کم نہ تھی۔ ایسی صورت میں اگر وزیر کے دل میں شعر و شاعری کی لہریں بھی موجزن ہونے لگیں تو تعجب کی کوئی بات نہ تھی، بالخصوص جب مولوی تراب علی اس کو شعر گوئی کی طرف مائل کرنے کے جتن بھی کرتے رہتے تھے۔ خود شہر رامپور میں بھی شعر و سخن کی محفلیں جگہ جگہ آراستہ ہونے لگی

تھیں۔ رامپور کی سرزمین سخن میں نئے نئے شگوفے پھوٹنے اور نئے نئے گل کھلنے کا موسم آگیا تھا۔

نواب محمد سعید خان کے ورود سعادت نمود کے بعد سے رامپور، جو اس وقت تک علم و تعلم کا بڑا مرکز بن چکا تھا، بساط شعر پر بھی نئے نقشے جمانے لگا تھا۔ نواب یوسف علی خان تو باضابطہ شاعر تھے۔ دہلی میں وہ حکیم مومن خان صاحب کے شاگرد تھے اور یوسف تخلص کرتے تھے۔ جب وہ ۱۸۵۵ میں مسند نوابی پر متمکن ہوئے اس وقت حکیم مومن خان صاحب رہ گرائے عالم بالا ہو چکے تھے، لہٰذا نواب یوسف علی خان نے میرزا غالب کی شاگردی اختیار کی۔ نئے استاد نے نیا تخلص ناظم تجویز کیا اور اسی تخلص نے شہرت پائی۔ ان کی دیکھا دیکھی ان کے کئی برادران عم زاد بھی حکیم صاحب کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ان میں عباس علی خان بیتاب، عنایت علی خان عنایت، ہدایت علی خان غربت، اور عبدالوہاب خان سروش خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سب بھائی اب رامپور میں بس رہے تھے۔ نواب یوسف علی خان نے ۱۸۴۰ میں رامپور آ کر یہاں ماہانہ مشاعرہ قائم کیا۔ دہلی سے بعض اور شعرا مثلاً موجد رامپوری، میر تسکین دہلوی اور ان کے بیٹے میر غمگین بھی نواب کے عندالطلب یہاں آگئے۔ علی بخش بیمار کے شاگرد میر احمد علی رسا بھی ان دنوں ایجاد مضامین کی نئی راہیں نکال رہے تھے۔ ان شعرا میں سے کسی نے، یا شاید خود نواب یوسف علی خان نے اپنے طور پر شاہ سراج اورنگ آبادی کا کلام دریافت کیا اور پھر ہر طرف شاہ سراج کے چرچے ہونے لگے۔ سراج کی غزلوں پر غزلیں کہی گئیں اور نواب یوسف علی خان نے ایک مشاعرے میں سراج کے حسب ذیل مصرعے کو طرح قرار دیا ؏

ہے زلف یار حلقۂ زنجیر ہو بہو

ایسا بولتا ہوا مصرع تھا کہ سب شعرا، بلکہ غیر شعرا کے بھی جی للچائے کہ اس پر ایسا ہی سڈول اور شگفتہ مصرع لگائیے۔ آغا تراب علی جب شام کو حویلی واپس آئے تو انھوں نے وزیر سے اصرار کیا کہ اس مصرعے پر گرہ تو لگنی ہی چاہیئے اور پوری غزل بھی ہونی چاہئے۔ نواب کے کتاب خانے میں وہ دیوان سراج سے پوری غزل بھی نقل کرالائے تھے ۔

ہے زلف یار حلقۂ زنجیر ہو بہو
ابرو ہے جیوں کمان پلک تیر ہو بہو
دل کے ورق پہ زخم جدائی سیں یار کے
شنگرف سی لہو کی ہے تحریر ہو بہو

کہتے ہیں اتفاق سیں سب بلبلان ہند
تیری گلی ہے گلشن کشمیر ہو بہو
رخسار یار دیکھ کے معلوم یوں ہوا
مصحف لکھا ہے کاتب تقدیر ہو بہو
گل لینے اشک گرم کا پتلی کی شمع سیں
ہیں دو پلک سراج کی گلگیر ہو بہو

آغا تراب علی غزل پڑھتے جاتے تھے اور وزیر ہر ہر مصرعے کی چست بندش، مشکل ردیف کے ساتھ قافیے کے بٹھاؤ اور نبھاؤ کو دیکھ دیکھ کر دنگ تھی۔ غزل ختم ہوتے ہی اس کے منھ سے نکلا، ''سبحان اللہ، یہ شاعری نہیں اعجاز ہے۔''

''اب آپ کو اس غزل پر غزل کہے ہی بنے وزیر بیگم۔ ہم نے آپ کو محظوظ کیا، آپ ہمیں محظوظ کریں۔''

''یہ آپ کی اچھی زبردستی ہے صاحب۔ ایسے شعروں کے سامنے اس زمین میں کیا کوئی ہاتھ پاؤں ہلائے گا۔''

آغا تراب علی کا اصرار جس قدر بڑھتا، اسی قدر وزیر کا انکار شدید ہوتا جاتا۔ اسی لفظی پھیر بدل میں اچانک وزیر بول اٹھی، ''ابرو کمان ہیں تو نظر تیر ہو بہو۔''

آغا تراب علی کے منھ سے کلمۂ تحسین نکلنے ہی والا تھا کہ وزیر کچھ ٹھٹکی، پھر بولی:

''نہیں نہیں، یہ تو بادنیٰ تغیر استاد ہی کا مصرع ہو گیا۔ آپ کے احباب کہیں گے سرقہ ہے۔ میں اور کوشش کرتی ہوں۔''

پھر ایک ہی دو ثانیے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی بولی:

''لیجیے اب صحیح مصرع بن ہی گیا:

رکھتی ہے آنکھ سحر سی تاثیر ہو بہو''

''بہت خوب، بہت درست۔ اور 'تاثیر' قافیہ بھی آپ نے کیا عمدہ ڈھونڈا۔''

''رہنے دیجیے، آپ تو بناتے ہیں۔ میرا مصرع استاد کے مصرعے کا ہم رتبہ تو نہیں، لیکن گرہ کی حد تک ٹھیک ہے۔''

"جی نہیں، معنی کے اعتبار سے آپ کے یہاں نازک خیالیاں ہیں۔ پہلے آنکھ مسحور کر کے فریفتہ و دیوانہ کرے گی، پھر زلف کی زنجیر سے دیوانے کو بستہ و پابند کیا جائے گا۔"

"بہر طور اتنا تو ہے کہ آپ نے مجھ سے مطلع کہلالیا، دلی کی لاج رہ گئی۔"

"جی نہیں، اتنی آسانی سے دلی والیوں کی گلوخلاصی نہ ہوگی۔ آپ لوگوں نے تو شیخ مصحفی تک کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ہم تو آپ سے پوری غزل لیں گے۔"

"اچھا صاحب، پہلے طبیعت تو رواں ہو، آپ کا یہ حکم بھی پورا ہوگا۔"

دوسرے دن شام کو جب آغا مرزا تراب علی رات کا کھانا کھانے کے لئے اندرون حویلی آئے تو وزیر نے کچھ شرمائے شرمائے سے انداز میں انھیں ایک کاغذ تھما دیا اور خود بچے کو دیکھنے کے بہانے ادھر ادھر ہو گئی۔ آغا صاحب نے کاغذ کھولا تو دیکھا کہ وزیر کے خوبصورت، لیکن ذرا بچکانہ خط میں یہ پوری غزل لکھی ہوئی ہے۔ انھوں نے بڑے اشتیاق، اور پھر استعجاب کے ساتھ غزل کو پڑھا۔

ہے زلف یار حلقۂ زنجیر ہو بہو
رکھتی ہے آنکھ سحر سی تاثیر ہو بہو
اس کے بیاض رخ پہ وہ نور سحر کی چھوٹ
چھلکا پڑے ہے رنگ طباشیر ہو بہو
اس کوچے میں دل اپنا جہاں چھوڑ آئے ہم
جنت سی ایک ہے وہیں تعمیر ہو بہو
بالیں پہ میری شمع رخ یار وقت نزع
جیسا تھا خواب ویسی ہے تعبیر ہو بہو
گم گشتہ دشت شب میں وہ ننھی سی آب جو
ہے میرے بخت خفتہ کی تصویر ہو بہو
تاب نظارہ کس کو ہے گلشن میں صبح کے
اس کا جمال مہر کی تنویر ہو بہو
اس پائے مرمریں پہ نہیں برگ گل کا داغ
منشور شہ پہ زر کی ہے تحریر ہو بہو

آغا تراب علی غزل پڑھ کر اس درجہ محظوظ و متاثر ہوئے کہ ہر چند یہ بات تہذیب کے خلاف تھی، لیکن انھوں نے وہیں دالان میں بیٹھے ہی بیٹھے پکارا، ''ارے بھئی وزیر بیگم آپ کہاں ہیں؟ ادھر تو آیئے۔''

وزیر نے بچے کو دائی پلائی کے حوالے کیا اور ڈوپٹہ سنبھالتی ہوئی میاں کے پاس آئی۔

''جی فرمایئے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا ہوا۔ ہولا دیا مجھے تو آپ نے۔ کیا غزل پسند خاطر نہیں آئی؟''

''اے سبحان اللہ وزیر بیگم۔ پسند خاطر کے کیا معنی۔ لاجواب غزل کہی ہے آپ نے۔ واللہ کیا مضموں یابیاں ہیں، ان اشعار کی داد تو شاہ نصیر مرحوم یا شیخ ناسخ مبرور ہی دے سکتے تھے۔''

وزیر کا چہرہ شرم اور مسرت سے گلابی ہو گیا۔ ''اللہ آپ نے کیسی بات کہی۔ وہ لوگ خسروان ملک سخن، میں ان کی ناچیز باندی سے زیادہ نہیں۔''

''وہ لوگ خسروان مملکت شعر ہیں تو کیا ہوا۔ آپ بھی تو اپنے نام کی وزیر ہیں۔''

''جی۔ برعکس نہند نام زنگی کافور والا قصہ ہے۔ لیکن آپ نے غزل پسند کی یہی میرے لئے بہت بڑی بات ہے۔''

اس بات کا تو سوال نہ تھا کہ نواب یوسف علی خان کے مشاعرے میں وزیر اپنی غزل خود پڑھے، یا کسی سے پڑھوا ہی دے، لیکن جب آغا تراب علی نے نواب یوسف علی خان کو وزیر کی غزل پڑھوائی تو وہ بھی داد و تحسین میں مرزا تراب علی سے ہیٹے نہ رہے۔ پھر انھوں نے ''بخت خفتہ'' والا شعر پڑھا اور بولے:

''لوگ کہتے ہیں کہ طبقۂ ذکور و اناث میں شعر گوئی کی حد تک کچھ امتیاز نہیں۔ دونوں ایک ہی طرح کے مضمون باندھتے ہیں اور اناث بھی صیغۂ واحد حاضر مذکر ہی لکھتی ہیں، لیکن یہ غزل، اور خاص کر ''ننھی سی آبجو'' کا مضمون کوئی بیگم ہی لکھ سکتی تھی۔ سبحان اللہ۔''

ایک تو غزل خود ہی بے حد بلند رتبہ، اس پر نواب یوسف علی خان کی تحسین، اور ان کی اس نکتہ رسی کے باعث، کہ ایسی غزل کسی مخدرہ ہی سے ممکن تھی، وزیر کی غزل سارے رامپور میں اہل ذوق کی زبانوں پر آ گئی۔ نواب مرزا نے جب یہ غزل اور اس کے بارے میں نواب یوسف علی خان کا جملہ سنا تو اس نے یہ بات بھی محسوس کی کہ ساری غزل میں کوئی مصرع ایسا نہ تھا جس میں صیغۂ واحد حاضر مذکر استعمال کیا گیا ہو۔ اپنی ماں کے لئے اس کے دل میں محبت، اور احترام دونوں بیش از بیش افزوں ہو گئے۔

شاہ محمد آغا مرزا بھی اپنے بڑے اگرچہ سوتیلے بھائی نواب مرزا کی طرح چونچال نکل رہا تھا۔ پانچ ہی چھ مہینے کی عمر سے اس کی قلقاریوں اور غوں غاں کے چہچہوں سے گھر بھرا رہتا تھا۔ آغا مرزا تراب علی پہلے تو دن میں صرف ایک بار، عموماً رات کے کھانے کے وقت یعنی بعد مغرب زنان خانے میں آتے تھے۔ اب انھوں نے کئی کئی بار اندرون حویلی آنا اور بیٹے کے ساتھ کھیلنا کھلانا شروع کر دیا۔ محمد آغا مرزا بھی باپ سے خوب ہل گیا تھا اور جب تراب علی گھر میں ہوتے تو بیٹا بمشکل ہی ان کی گود سے اترتا تھا۔

سون پور

نومبر ۱۸۴۳ کا آغاز تھا جب آغا مرزا تراب علی نے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی خرید کے لئے سون پور بہار جانے کا قصد کیا۔ مویشیوں، گھوڑوں، ہاتھیوں، اور دیگر جانوروں کا ملک ہند میں یہ سب سے بڑا میلہ وہاں ہر سال پوس کی تیسری تاریخ سے لے کر وسط ماگھ یعنی مکر شنکرانتی کے دن (۱۴ جنوری) تک دریائے گنڈک کے کنارے ایک وسیع میدان میں لگتا تھا۔ چاروں جانب سے بیوپاری اور خریدار جمع ہوتے تھے اور کھیل کود، دنگل، جانوروں کی دوڑ، رقص وسرود کی محفلوں، نٹوں کے تماشوں وغیرہ کے سبب اس ساری مدت تک وہاں جشن کا سماں رہتا تھا۔

نواب کی ایما اور اجازت سے آغا مرزا تراب علی نے ۱۱۵ گہن مطابق ۹ دسمبر ۱۸۴۳ کو سون پور کے لئے کوچ کیا۔ چلنے کے پہلے انھوں نے شاہ محمد آغا کو خوب خوب پیار کیا، نواب مرزا کو گلے سے لگایا، اور خلوت میں وزیر خانم کے آنسو پونچھ کر اس کے ساتھ دل کھول کر بوس وکنار کیا۔ حبیبہ، راحت افزا، منجھلی بیگم اور وزیر خانم نے آغا مرزا تراب علی کو الگ الگ امام ضامن باندھے، ان کے اوپر سے وار کے پانی کا گھونٹ پیا، ان پر صدقے ہوئیں اور سب نے یک زبان ہو کر کہا، "جایئے جس طرح پیٹھ دکھاتے ہیں اسی طرح منھ بھی دکھایئے گا۔" آغا صاحب نے سب کو مولا کی امان میں دیا، بیٹوں پر دعا پڑھ کر پھونکی اور اول وقت شہر کے پھاٹک سے نکل کر براہ مراد آباد عازم بریلی ہوئے۔ ان کے ساتھ چار ذاتی ملازم، بارہ برچھیت، چار سئیس اور دو فیلبان تھے۔ کچھ خشکی اور کچھ پانی کا سفر بیس دن تک رہا۔ ۲۹ دسمبر کو دن چڑھے ان کا قافلہ بخیر وعافیت سون پور پہنچ گیا۔

آغا مرزا تراب علی نے سون پور کے میلے میں اعلیٰ درجے کے جانوروں کی ریل پیل دیکھ کر اندازہ لگالیا کہ یہاں ایک ہفتے سے زیادہ قیام کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مکر شنکرانتی کے

کئی دن پہلے یہاں سے نکل چلنا بہتر ہوگا، کیونکہ دور سے آئے ہوئے بیوپاری اور خریدار عموماً مکر شنکرانتی کا نہان نہا کر فوراً سون پور چھوڑ دیتے تھے۔ نتیجۃً تمام راہیں اور سرائیں مسافروں سے بھر جاتی تھیں۔ راہوں کا بھر جانا تو اچھا تھا، لیکن سراؤں میں کثرت مسافران وزائرین کے باعث اچھی جگہ ملنا غیر ممکن ہو جاتا تھا۔ مکر شنکرانتی کے پہلے چل نکلنے میں سنسان راہوں کا جوکھم تو تھا، لیکن ٹھہرنے کی اچھی جگہوں کا آسانی سے مہیا رہنا بہت بڑا فائدہ بھی تھا۔

پانچ دن کے اندر اندر ہمارے رامپوری مسافروں کا کام قریب قریب اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ نیپال کی ترائی سے کچھ ہاتھیوں کے بیوپاری اگلے دن پہنچنے والے تھے، ان کا مال دیکھ کر خریداری فیلاں کا فیصلہ ہو جانا تھا۔ چنانچہ ۱۱ جنوری کو جب مرزا تراب علی نے جائزہ لیا تو ان کی خریداری چھ ہاتھیوں اور آٹھ گھوڑوں پر مشتمل تھی اور ان کی پوری قیمت مع اجرت سئیسان وفیل بانان زائد مبلغ ۵۲۵۰۰ (باون ہزار پانچ سو) روپے تھی۔ زائد سئیس اور مہاوت واپسی کے سفر کے لئے تھے، لیکن امکان تھا کہ رامپور پہنچ کر انھیں نواب کے عتبۂ عالی میں بصیغۂ ملازمان رکھ لیا جائے۔ رقم کی ادائگی کچھ مشکل نہ تھی، کیونکہ آغا تراب علی کے پاس نواب کے مختار کار مہاجن کی درشنی ہنڈی مبلغ ایک لاکھ روپے کی موجود تھی۔ سب کا حساب بیباق کر کے اگلے دن ۱۲ جنوری ۱۸۴۴ کو وہ عازم رامپور ہوئے۔

الٰہ آباد تک کا سفر زیادہ تر خشکی سے، اور کہیں کہیں جہاں جنگلات اور درندگان کا خوف زیادہ تھا، دریائے گنگا سے ہوا۔ یہاں پہنچ کر مرزا تراب علی نے حکم دیا کہ اب فتح گڈھ تک کا سفر دریائے گنگ ہی سے ہو، تا کہ نوخرید ہاتھیوں اور گھوڑوں پر مسلسل سفر زیادہ نہ ہو۔ ندی کا سفر اگر چہ سست رفتار تھا لیکن آندھی یا اتھلے پانی میں کشتیوں کے کسی ٹاپو سے ٹکرانے یا ریتے میں پھنس جانے کے خوف کو چھوڑ کر بہت آرام دہ تھا۔ کھانے پینے کی کسی تنگی کا سوال نہ تھا، پھر بھی ایک بڑی کشتی میں جانوروں کا چارہ اور ایک بڑی کشتی میں انسانوں کے لئے اشیائے خورد ونوش بار کر لی گئیں۔ ۲۰ جنوری کی صبح کو آبی قافلے نے پھاپھامئو کے مقام سے الٰہ آباد کو چھوڑا اور آغا تراب علی چار گھوڑوں، دو سئیسوں، دو برچھیتوں اور خچروں پر سوار چار ذاتی خادموں کے ہمراہ وہیں سے عازم کڑا مانک پور ہوئے۔ وہاں سے انھیں کڑا مانک پور، فتح پور ہوتے ہوئے کانپور نکل جانا تھا۔ کشتی کی راہ بھی کڑا مانک پور ہوتی ہوئی کانپور براہ بند کی پہنچتی تھی۔ ہر چند کہ خشکی کا راستہ ایک اور بھی تھا، لیکن کڑا مانک پور والی سڑک کو زیادہ چلتی ہوئی اور زیادہ محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ ایک بوڑھے تجربہ کار سئیس نے دبی زبان سے آغا مرزا تراب علی کو ٹھگوں کے خطرے کی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن مرزا تراب

علی نے اس کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔

"کمپنی بہادر نے ٹھگوں کی کمر توڑ دی ہے۔ انھیں جہل خانوں میں سڑا دیا ہے یا پھانسی پر کھینچ دیا ہے۔ اب کیسے ٹھگ اور کہاں کے ٹھگ، منیر خان تم سٹھیا تو نہیں گئے۔"

"حضور زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ پر ہم لوگ تو سنتے ہیں کہ ٹھگ زہریلے سانپ کی طرح ہیں۔ جب تک سانپ کا سر کاٹ کر دھڑ سے الگ نہ کر دیا جائے، اس کے ڈسنے کا خطرہ باقی رہتا ہے۔"

زخمی سانپ

آغا مرزا تراب علی کے مزاج میں ہٹ عام سے کچھ زیادہ تھی، اور رامپور کے پٹھانوں میں رہتے رہتے ان کی جہالت میں کچھ اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ خشکی کے سفر براہ کڑا مانک پور، فتح پور اور کانپور کی انھیں ضد آ گئی تھی اور ہر چند کہ ان کا لہجہ شگفتہ تھا، لیکن اس بات کو سب سمجھتے تھے کہ آغا صاحب اپنے فیصلے سے ٹلنے والے نہیں ہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ہندوستان کے ٹھگ اگہن کا سارا مہینہ بندھیاچل کی دیوی کے مندر میں عبادت اور پوجا پاٹ اور درشن میں گذارتے ہیں۔ اگہن ختم ہوتا ہے تو وہ دور دور پھیل جاتے ہیں اور مکر شنکرانتی لگتے ہی ٹھگی کا خاص موسم شروع ہو جاتا ہے۔ اور افسران و خیر خواہان کمپنی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ایسا نہیں تھا کہ ٹھگوں کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہو۔ انھوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ بجبر دا نگریز کے دباؤ کے، بہت سے ٹھگوں نے انگریزی عملداری چھوڑ کر اودھ میں پناہ لے رکھی تھی۔ اور وہ علاقے جہاں ملک انگریز اور ملک اودھ کی سرحدیں ملتی تھیں، بطور خاص مخدوش سمجھے جاتے تھے۔ کانپور کے آس پاس کئی جگہیں ایسی تھیں جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں ٹھگوں نے اپنی بیل بنا رکھی ہے۔ مع یائے مجہول، ''بیل'' اس خطۂ زمین یا جگہ کو کہتے تھے جسے ٹھگ اپنے شکار کو مارنے اور گاڑنے کے لئے پہلے سے تجویز کر رکھتے تھے۔ ایسی جگہیں چونکہ محفوظ اور خفیہ ہوتی تھیں، اس لئے انھیں بار بار کام میں لایا جاتا تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر لکھ رہے ہیں، ان ایام میں کانپور اور فتح پور کے درمیان چکٹیا نام کی ایک جگہ، اور کانپور کے علاقے میں چپر گھٹا نامی ایک جگہ کی بیلیں مشہور تھیں۔

یہ سب تھا، لیکن آغا تراب علی کی رگ گردن نے ٹیڑھی ہونے کے بعد نرم ہونا جانا ہی کہاں تھا۔ ان کی آنکھوں میں برہمی کا کھنچاؤ دیکھ کر سب ملازمین نے دم سادھ لیا۔ کڑا مانک پور اور پھر فتح پور تک کا سفر شیر شاہی سڑک پر بہت آرام سے اور اچھی رفتار سے ہوا۔ سڑک فراخ اور مضبوط، ٹھہرنے کی جگہیں

صاف ستھری، پانی وافر، ہر مقام پر ان کی خاطریں ہوئیں۔ ایک بار تو انھوں نے حکام انگریز ان کے ڈاک بنگلے میں رات گذار لی اور وہاں کے انتظام و انصرام نے ان کے دلوں کو موہ لیا۔ بندکی پہنچتے پہنچتے منظر بیشتر اجاڑ اور سنسان نظر آیا اور سڑک کے دونوں طرف مٹی کے دھسوں اور ٹیلوں سے بھر گیا۔ کہیں کہیں بیہڑ اور کہیں کہیں جھڑ بیری اور جنگل جلیبی کی گھنی باڑیں بلکہ چھوٹے موٹے بن بھی دکھائی دیے۔ مرزا تراب علی کا سدھا ہوا قافلہ اور ان کے گھوڑے اور خچر ان دشوار راستوں سے بآسانی گذرے، لیکن وہ دنیا ایسی تھی کہ اس سے گذرتے وقت ڈاکوؤں، بٹ ماروں، ٹھگوں، اور جوگی سادھوؤں کی شبیہ خواہ مخواہ آنکھوں میں پھرنے لگتی تھی۔

بندکی کے کئی کوس آگے جب کانپور بمشکل تین کوس رہا ہوگا، انھیں اپنے ذرا آگے ہندوؤں کا ایک قافلہ دکھائی دیا جو بہت آہستہ چل رہا تھا، گویا بہت تھک گیا ہو۔ نزدیک پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کوئی پندرہ بیس مرد ہیں، عورتیں اور بچے ایک بھی نہیں۔ بظاہر متوسط طبقے اور مخلوط ذاتوں کے یہ ہندو عموماً ادھیڑ عمر کے، یا بوڑھے تھے۔ ان کے کپڑے معمولی، کچھ ملگجے، لیکن پیوند سے عاری تھے اور نہ کہیں سے پھٹے یا مرمت شدہ تھے۔ بغور دیکھنے سے مرزا تراب علی کو اندازہ ہوا کہ ان میں ایک آدھ اچھی ذات کے بھی ہیں، بقیہ شکل وصورت کے اعتبار سے کسان، اہیر، لوہار، اور چرواہے وغیرہ اور چال ڈھال، سبھاؤ، جسمانی حرکات وسکنات کے اعتبار سے نہایت نیک، قاعدے قانون اور رواج سماج کا احترام کرنے والے، مشقت کی روٹی کھانے والے لگتے تھے۔

قافلے کے بزرگ نے مرزا تراب علی اور ان کے سواروں کو آتے دیکھ کر اپنے لوگوں کو اشارہ کیا کہ ہٹ جاؤ، راہ دے دو۔ لیکن جب مرزا تراب علی کا گھوڑا نزدیک آیا تو اس نے بیچ راہ میں گھٹنے ٹیک کر آغا مرزا تراب کو سلام کیا۔

''سلام مائی باپ۔ سرکار کا اقبال بلند رہے۔''

اس کا لہجہ نہایت شائستہ، انکسار اور لجاجت سے بھرپور تھا، گویا اسے حاکمان و رؤسا سے اکثر سابقہ پڑتا رہا ہو۔ آغا مرزا تراب کا دل کچھ پسیجا، لیکن انھوں نے درشت اور متفاخر لہجے کو موقعے کی ضرورت جانتے ہوئے سلام کا جواب دیے بغیر ڈپٹ کر کہا:

''کون ہو تم لوگ۔ اور کیوں ہمارا راستہ روکے کھڑے ہو؟''

''آپ کا راستہ روکیں یہ ہماری مزال نہیں سرکار۔ ہم جاتری ہیں، بندکی سے قنوج دیوی

درشن کو جا رہے ہیں۔''

''تو جاؤ۔'' آغا مرزا تراب علی نے کڑک کر کہا۔''ہٹو ہماری راہ نہ کاٹو۔''

اب بوڑھا اور بھی ملتجیانہ اور نرم لہجے میں بولا: ''حضور ہم اکیلے ہیں، کوئی نفری احدی ساتھ نہیں، کوئی بٹ مار دبوچ لے تو بچانے والا کوئی نہیں۔''

اتنی دیر میں ایک دوسرا بوڑھا سامنے آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے بھی کچھ بڑھ کر میٹھی بولی میں کہا۔''جی ہاں عالی جاہ، ہم میں کچھ برام اور مجبور بھی ہیں۔ سرکار عالی کی چھتر چھایا مل جاتی تو ہماری جاترا بے کھٹکے پوری ہو جاتی۔''

آغا مرزا تراب علی نے دونوں بوڑھوں کو غور سے دیکھا۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی اور ان کے بدن سمٹے سکڑے ہوئے فدویانہ بیچارگی کی تصویر تھے۔ لیکن مرزا تراب کو یہ بھی محسوس ہوا کہ پیدل قافلے والے کسی آہستہ، غیر محسوس طریقے سے کچھ اس قدر آگے آ گئے تھے کہ ان کے قافلے کے گرد ڈھیلا ڈالا سا حلقہ بن گیا تھا۔ ان کے بدن میں ہلکی سی سنسنی دوڑ گئی۔ ''یہ لوگ ٹھگ تو نہیں؟'' ان کے دل میں یہ سوال تیزاب کی بوند کی طرح جلتا جلتا اتر گیا۔ ''نہیں، ٹھگ بھلا کیا ہوں گے، بالکل بے ضرر معلوم ہوتے ہیں۔'' لیکن شاید وہ حلقہ اب کچھ اور بھی قریب آ گیا تھا۔ انھوں نے منیر خان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بےچینی کے ساتھ بے یقینی بھی تھی۔ منیر خان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ممکن ہے یہ میرا وہم ہو، آغا تراب علی نے اپنے دل میں کہا۔ اچانک ان کی بائیں آنکھ کے گوشے کی بصارت کے انتہائی حدود پر انھیں ایک نوجوان شخص کی جھلک دکھائی دے گئی۔ دوسرے راہگیروں کے بر خلاف وہ اپنا بدن چرائے ہوئے نہ تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی جو سفاک ہونے کے ساتھ ساتھ توقع سے بھرپور تھی، جیسے کسی اژدہے نے اونگھتا ہوا خرگوش دیکھ لیا ہو۔ انھیں اچانک کچھ ڈر محسوس ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ پیڑوں کے پچھلے جھنڈ سے ایک کوا کاؤں کاؤں کرتا ہوا گذرا۔ آغا تراب علی نے دیکھا، بلکہ محسوس کیا، کہ اہل قافلہ کی آنکھیں گو کہ زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں، لیکن در حقیقت سب اس کوے کو دیکھنے کے لئے تجسس میں ہیں کہ کوا کسی شاخ پر اترتا ہے یا اڑ جاتا ہے۔ منیر خان ہلکے سے کھنکھارا، شاید اس نے لب کشائی کی جرأت کر لی تھی۔ لیکن ابھی اس نے کچھ کہا نہ تھا کہ کوا بآواز بلند پکارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کوے کے گذرتے ہی اہل قافلہ کے چہرے بشرے سے کچھ مایوسی مترشح ہوئی، گویا انھوں

نے سمجھ لیا ہو کہ ان نواب صاحب کا تحفظ ہمیں نصیب نہ ہوگا، ہمیں اپنی راہ لگنا چاہیئے۔ لیکن یہ مایوسی کسی اور بات کی غماز تو نہیں؟ آغا تراب علی نے دل میں سوچا۔ ایسا تو نہیں کہ یہ واقعی ٹھگ ہوں اور میرے سخت طرز گفتگو سے وہ سمجھ گئے ہوں کہ میں چھنک گیا ہوں اور اب ان مردار خواروں کا شکار نہ بن سکوں گا؟ پیدل قافلے والوں کا حلقہ ان کے گرداگرد کچھ غیر محسوس طور پر ڈھیلا ہو گیا تھا لیکن کوئی اپنی جگہ سے ہٹنے یا ہلنے کی طرف مائل نہ لگتا تھا۔

''سرکار۔'' منیر خان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''سرکار، نکل چلیں۔''

منیر خان کی آواز نے آغا تراب علی کے دل پر گویا بانگ درا کا اثر کیا۔ وہ چونکے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے: ''ایں، ہاں ٹھیک ہے۔'' پھر انھوں نے گلا صاف کر کے سامنے والے بوڑھوں سے کڑک کر کہا، ''چلو، ہٹو تم سامنے سے۔'' دونوں بوڑھوں کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر تھا جسے وہ صاف سمجھ نہ سکے، لیکن یہ ضرور تھا کہ راستہ دینے کے لئے ان بظاہر مسکین بوڑھوں کی طرف سے کچھ خاص عجلت بھی نہ دکھائی دیتی تھی۔ آغا تراب علی نے اپنا گھوڑا ایک قدم پیچھے ہٹا کر چابک ہوا میں لہرایا اور گھوڑے کی پسلیوں کو رانوں میں مضبوط داب کر کہا، ''اڑ چل بیٹے!'' گھوڑے نے گردن اٹھائی، دانت عریاں کیے، سیاہ گھنی ایال ہوا میں پرچموں کی طرح لہرائی، اگلے دونوں پاؤں سمیٹ کر اس نے کمر کی پوری قوت کے ساتھ اپنا بدن آگے کو ہیل دیا۔ اگلے پاؤں سمٹ کر پیٹ سے تقریباً لگے ہوئے، پچھلے پاؤں سکڑ کر زیر کمر، بوڑھے ابھی سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ کیا بچاؤ کریں، اور گھوڑے نے اپنے سوار کو لئے ہوئے برف کے گالے کی سی خاموشی کے ساتھ کئی گز آگے اتار دیا۔ گھوڑے کے گذرنے کی سنسناہٹ اور پھر اس کے زمین پر اترنے کی تکان سے خوف کھا کر بوڑھے زمیں بوس تھے اور ان کے اہل قافلہ کا حلقہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آغا مرزا تراب علی اور ان کے ساتھی غبار اور پھر طوالت فاصلہ کے سبب نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

کئی کوس کی دوڑ کے بعد سانسیں برابر کرنے اور گھوڑوں کو پانی پلانے کے لئے وہ ایک کنویں پر رکے تو منیر خان نے آہستہ سے کہا:

''وہ لوگ ٹھگ تھے۔ سرکار... یہاں زیادہ نہ ٹھہرتے تو اچھا تھا۔''

''کیوں؟'' تراب علی کی ضد پھر عود کر آئی۔ ''یہاں ٹھہرنے میں کیا قباحت ہے؟ اب ٹھگ یہاں کہاں؟''

''جناب، یہ لوگ شکار کو تاک کر اس پر اپنا پنجہ قابض کرنے کے لئے آگے پیچھے دو تین ٹکڑیوں میں بٹ کر واردات کرتے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ ان کی ایک ٹکڑی یہیں کہیں آگے گھات میں ہو۔''

''یہ کیا فضول بیان ہے۔ تم لوگ پٹھان ہو یا چرواہے اور گھسیارے ہو۔ بے وجہ ڈرے جاتے ہو اور بے موت کے مرے جاتے ہو۔''

''جناب۔'' ایک بوڑھے برچھیت نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں ان راہوں سے پہلے بھی گذرا ہوں۔ وہ سامنے پانڈو ندی ہے۔ میں نے اکثر سنا کہ ٹھگان نابکار اسی ندی کے گھاٹ میں چھپ کر گھات لگاتے ہیں اور واردات کر کے قریبی گاؤں میں چھپ جاتے ہیں۔ گاؤں یہاں سے آدھا کوس بھی نہیں ہے۔''

''خیر میرا ابھی ارادہ یہاں کوئی رات گذارنے کا نہیں تھا۔ چلو آگے بڑھو۔''

شام ہوتے ہوتے وہ کانپور پہنچے، لیکن مرزا تراب علی کے قافلے کو وہاں ان کی حیثیت کے موافق کوئی سرائے نہ ملی، اس لئے وہ تیز دھاوے کے طور پر چلتے ہوئے بٹھور اور پھر بلہور پہنچے جہاں انھوں نے رات کا پڑاؤ کیا اور بحفاظت طباشیر صبح سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ سردیوں کا موسم، دریائے گنگا بالکل پاس، لہٰذا ٹھنڈک اور کہرا دونوں غضب کے تھے۔ لیکن مرزا تراب علی نے جلد از جلد وہاں سے کوچ کیا۔ دن ڈھلنے کے کچھ پہلے قنوج کوئی ڈھائی کوس رہ گیا تھا۔ ایک مناسب سرائے میں رات گذار کر اگلی صبح کو انھوں نے قنوج کے لئے کوچ کیا۔ وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انھیں کوئی بیس بائیس مسلمانوں پر مشتمل ایک پیدل قافلہ ملا۔ ان میں بھی کوئی عورت یا بچہ نہ تھا، لیکن وہ لوگ شکل سے انتہائی نیک طبع اور عابد و زاہد معلوم ہوتے تھے۔ اکثروں کی داڑھیاں لمبی، لبیں کتری ہوئی، پاجامے اونچے، اور سروں پر گول یا چوگوشیہ ٹوپیاں تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ شخص نے گذشتہ دن کے قافلے والے بوڑھے کی طرح بیچ سڑک میں ٹھہر کر مرزا تراب علی کو شرعی سلام کیا :

''السلام علیکم سرکار، جناب کس طرف تشریف لے جاتے ہیں۔''

مرزا تراب علی کو اس شخص کے سبھاؤ، صاف ستھرے اگر چہ موٹے جھوٹے کپڑوں، اور پیشانی پر سجدے کے نشان نے از حد متاثر کیا۔ انھوں نے یہ بھی نہ غور کیا کہ باقی اہل قافلہ کسی خاص ترتیب سے سڑک کے درمیان ٹھہر گئے ہیں۔ لیکن ان کی مرزائیت نے پسند نہ کیا کہ سر راہ رک کر کسی معمولی اہل حرفہ قسم کے نفر سے بات کریں۔

"شرفا راستے میں رک کر بات نہیں کرتے۔ چلو بڑھو، چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"عالی جاہ، ہم غریب کاریگر مسلمان، ہمارے پاس کوئی دولت نہیں کوئی طاقت نہیں اور یہ راستہ بڑے جوکھم کا ہے۔ ہم کب سے امید لگائے ہوئے ہیں کہ اللہ آپ جیسا کوئی جری رئیس زادہ بھیج دے تو اس کے دامن سے لگ کر ہم بھی پار گھاٹ لگ جائیں۔"

مرزا تراب علی نے محسوس کیا کہ منیر خان اور ان کے دوسرے نوکروں کے دل و ذہن میں کچھ شدید تناؤ ہے اور یہ تناؤ ان کے بدن کی حرکات و سکنات سے بھی ظاہر ہے۔ وہ دل ہی دل میں کچھ جزبز ہوئے کہ یہ کمبخت بے وجہ مرے جاتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ بھی احساس تھا کہ گذشتہ دن کے پیدل راہگیروں اور ان لوگوں میں کچھ پراسراری مماثلت ہے۔ انھوں نے اپنی کمر میں بندھے ہوئے طمنچے پر ہاتھ ڈالا اور کہا:

"تو کیا تم نے ہمیں اپنا محافظ مقرر کیا ہے؟ تمھارے اپنے میٹ اور چودھری کہاں ہیں؟"

ادھیڑ عمر کے مسافر نے طمنچے پر ہاتھ جاتا دیکھ کر زمین کو چھو کر سلام کیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا:

"سرکار بہادر ہم کمپو میں جان کمپنی کے ملازم ہیں۔ تھوڑی رخصت ملی ہے تو قنوج اپنے گھر جا رہے ہیں۔ ہم کاریگر ہیں چوٹے چوہڑے نہیں ہیں۔"

اس شخص کے لہجے میں اس قدر مسکنت تھی کہ مرزا تراب علی کو اپنا دل پسیجتا ہوا معلوم ہوا۔ لیکن انھیں بوڑھے برچھیت منے خان کی بات یاد آ گئی کہ ٹھگ لوگ کئی ٹکڑیوں میں آگے پیچھے بٹ کر مسافروں کا شکار کرتے ہیں۔ اتنی دور تک بھلا ان کا دورہ کیا ہوگا، لیکن احتیاط شرط ہے۔ انھوں نے دل میں کہا۔

"ٹھیک ہے، لیکن ہمارا تمھارا ساتھ نہیں۔ چلو ہٹو نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

نہایت مایوسی کے لہجے میں اور پست، ہاری ہوئی سی آواز میں "جو مرضی مالک کی" کہہ کر ادھیڑ عمر کے آدمی نے راستہ چھوڑ دیا اور اپنے قافلے والوں میں مل گیا۔

مرزا تراب علی کے اہل قافلہ نے آگے بڑھتے ہی یک زبان ہو کر کہا، "سرکار کی عقل و فراست کے قربان جایئے۔ سرکار نے فوراً پہچان لیا کہ وہ لوگ ٹھگ ہیں۔"

"ہونہہ، ٹھگ بھلا کیا ہوں گے۔" آغا تراب علی نے کہا۔ "اچھے بھلے نیک مسلمانوں کو تم لوگ ٹھگ بنائے دے رہے ہو۔"

پلٹ کر جواب دینے کی ہمت تو کسی میں نہ تھی، لیکن سب نے دل میں کہا، جان بچی لاکھوں پائے، خواہ وہ کسی بہانے سے بچی ہو، جان بچ تو گئی۔ آغا تراب علی کے بھی دل میں اس دفعہ کچھ گھبراہٹ اور خوف کا ملا جلا ملگجا سا غبار اڑ رہا تھا۔ خوبی کی بات یہ تھی کہ دھوپ چمکی ہوئی تھی، موسم خوشگوار تھا اور راہ بہت ہموار۔ آسانی سے تیز تیز چلتے ہوئے انھوں نے قنوج کے دو منزل آگے قیام کیا۔ یہاں سے فتح گڈھ کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ سرائے کی چہل پہل، اونٹ گاڑیوں کا ہجوم، بچوں کی چیخ پکار اور کلکاریاں، پاس کے مندروں اور مساجد سے عبادت اور اذان کی آوازوں کے غلغلے میں میرزا تراب علی کی طبیعت کچھ ہلکی ہوئی۔ انھوں نے حکم دیا کہ سب اہل قافلہ آرام سے پاؤں پھیلا کر دیر تک سوئیں، صبح گرم پانی سے نہا دھو، تازہ دم ہو کر دن چڑھے روانہ ہوں گے۔

اگلی صبح کو آغا تراب علی کپڑے پہن کر ناشتے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ منیر خان نے آکر سلام کیا اور کچھ جھجکتے ہوئے، کچھ شرماتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولا، ''سرکار کچھ عرض کرنا ہے۔''

''کہو۔ کہو۔'' مرزا تراب علی نے محسوس کیا کہ اس وقت منیر خان کے چہرے پر وہی منفعلانہ لجاجت تھی جیسی کل اور پرسوں کے پا پیادہ قافلے والوں کا سامنا کرتے وقت نظر آئی تھی۔ لیکن جب منیر خان نے بات کہی تو وہ کچھ اور ہی تھی۔

''سرکار، یہ میرے گھر کے ہیں، میرے ماموں کے بیٹے،'' وہ بولا۔ پھر اسے شاید خیال آیا کہ بات ابھی واضح نہیں ہوئی۔ ''جی، یہ میرا ماموں زاد بھائی ہے۔ صادق خان اس کا نام ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پیچھے مڑ کر کسی شخص کو اشارہ کیا کہ آگے آجاؤ۔ تیس پینتیس سال کی عمر، پستہ قد، گٹھا ہوا بدن، سر پر رنگین پھینٹا، بر میں رنگین گزی کا کرتا اور اسی رنگ اور کپڑے کا پاجامہ ایک بر کا، دونوں کپڑے بالکل صاف دھلے ہوئے اور پیوند یا چاک سے عاری، جیسے کسی معمولی لیکن شریف گھرانے کا غریب آدمی ہو۔

''تسلیمات عرض کرتا ہوں سرکار،'' اس نے جھک کر دو تسلیمیں کیں اور ایک طرف سکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی نگاہیں اپنے پاؤں پر مضبوطی سے جما رکھی تھیں۔

''کیا نام ہے تمھارا؟ کہاں سے آرہے ہو؟''

نو وارد نے اپنی آنکھیں زمین پر قائم رکھیں۔ ''غلام کو صادق خان کہتے ہیں۔ ہم کمپو سے آرہے ہیں۔''

''تو کیا تم تنہا نہیں ہو؟''

''ج...جی نہیں عالی جاہ۔''

آغا تراب علی کے دل میں کچھ سنسناہٹ سی ہوئی۔ ''کل کتنے نفر ہو تم؟''

''پ... پندرہ... بیس ہیں سرکار۔''

''عورتیں اور بچے؟''

''کوئی بھی نہیں جناب۔ ہم لوگ اپنی نوکری سے گھر واپس جا رہے ہیں۔ ہمارے گھر والے وہیں پر ہیں۔''

مرزا تراب علی کچھ دیر چپ رہے۔ پھر انھوں نے کہا، ''منیر خان؟''

''جی سرکار۔''

''یہ تمھارے سگے ماموں کا بیٹا ہے؟''

''ج...جی...نہیں سرکار۔ رشتے کا بھائی ہے۔''

''تم اسے پہلے سے جانتے ہو؟''

یہ سوال سن کر نو وارد کچھ اور بھی سکڑ گیا، لیکن پھر بھی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مرزا تراب علی نے ڈانٹ کر کہا۔

''منیر خان، میں نے تم سے پوچھا ہے۔''

اب منیر خان اور نو وارد دونوں کے چہروں پر سراسیمگی کے سے آثار نمایاں ہوئے۔ نو وارد نے منیر خان کو کچھ آنکھ کا اشارہ کرنا چاہا لیکن مرزا تراب علی نے اسے جھڑک دیا، ''تم چپ رہو جی۔ منیر خان، تم نمک حرامی پر تو آمادہ نہیں ہو گئے؟'' یہ کہتے کہتے آغا تراب علی نے طمنچہ اٹھا لیا۔

نو وارد نے تیزی سے قدم پیچھے اٹھایا اور دروازے سے ٹکراتا ہوا ہڑبڑا کر نکل گیا۔ مرزا تراب علی نے چاہا کہ اس کا تعاقب کریں، لیکن پھر رک کر انھوں نے منیر خان کے سینے پر طمنچہ رکھا اور گرج کر کہا:

''حرام زادے، تو مجھے ٹھگوں سے خبردار کرتا تھا اور اب تو نے انھیں کے ہاتھ اپنا ایمان بیچ دیا!'' مرزا تراب علی کے بدن پر کچھ خشم ناکی اور کچھ گھبراہٹ کے سبب لرزش تھی۔ ''تو نے میرے شیر خوار بچے کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔''

منیر خان نے سینہ تان کر اور گردن سیدھی کر کے کہا، ''مجھے بے شک گولی مار دیں۔ حضور مالک ہیں، میں بندہ نمک خوار۔ میرا ایمان تو آپ کے ہاتھوں پہلے ہی دن سے گروی ہے۔ میں آپ کا دکھی

ہوں۔ مجھ سے آدمی پہچاننے میں غلطی ہوئی۔"

"نطفۂ شیطان، باتیں مت بنا۔ میں تیرے دونوں ہاتھ پاؤں توڑ کر تجھے ہمیشہ کے لئے اپاہج کردوں گا۔"

"عالی جاہ۔ میں مرنے کے لئے تیار ہوں۔ میری بھول کی یہی سزا ہے۔ لیکن میں غدار نہیں ہوں۔ میں اللہ کا کلام سر پہ رکھ کر کہہ سکتا ہوں..."

"یہ بھول تھی؟ دنیا تو اسے دغابازی ہی کا نام دے گی۔ ایک انجان آدمی کو تو نے اپنا ماموں زاد بتایا اور اسے میرے قتل کے لئے میرے ہی سامنے لا کھڑا کر دیا۔"

"بتایا نہیں سرکار، دھوکے میں آ کر مان لیا۔"

"حرام زادے، کچھ تو تحقیق کی ہوتی۔"

"عالی جاہ انھوں نے جیسے میرے سر پہ الو کی ہڈی پھیر دی تھی... میں کچھ بھی سمجھ نہ پایا کہ کیسا برا فریب کھا رہا ہوں۔" اب منیر خان کی گردن جھکنے اور اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔ مرزا تراب علی کے بھی ہاتھ کا تناؤ اب کم ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ وہ طمنچہ نیچے کر لیں۔ لیکن انھوں نے دانت بھینچ کر ہاتھ کو وہیں مضبوط رکھا۔ انھیں کچھ تجسس بھی تھا کہ آخر ایک نپٹ اجنبی نے منیر خان جیسے چلت پھرت کے شخص کو کس طرح یقین دلا دیا کہ وہ اس کا ماموں زاد بھائی، یا ماموں زاد بھائی نہ سہی، دور کا قرابت دار ہے۔ منیر خان نے جیسے مرزا تراب علی کے دل کی بات جان لی۔ وہ یوں ہی سر جھکائے جھکائے بولا:

"سرکار۔ اس نے اور اس کے ایک دو ساتھیوں نے مجھ سے ایسی ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ کیا عرض کروں۔ نہ جانے کہاں کہاں کے رشتے ناتے جوڑ کر انھوں نے مجھے یقین دلا دیا... میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں۔ آپ کی گولی میرے سینے میں اتر جائے تو میں دین دنیا میں پھل ہو جاؤں۔"

"اور میں تمھارے قتل کا مجرم ٹھہروں... تمھارے گھر والوں کو کیا جواب دوں گا... اور تمھاری بد نامی انھیں زندہ در گور نہ کر دے گی؟ اب تم اسی وقت میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ جاؤ میں نے تمھاری تقصیر بخش دی۔ میں نے یہ معاملہ یہیں پر ختم کیا۔ باقی دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔"

موت کے جوکھم سے اس قدر نزدیک آ جانے کی ذہنی تکان، اور منیر خان جیسے قدیمی اور معتبر

خدمت گذار کو نوکری سے نکالنے، اور وہ بھی ان نامبارک حالات میں نکالنے کا افسوس اور رنج، ان باتوں نے آغا تراب علی کا دل افسردہ کر دیا تھا۔ انھوں نے کچھ کھائے پیئے بغیر بوجھل قدموں سے اگلے پڑاؤ کے لئے سفر شروع کیا۔ منیر خان کی برطرفی کے بعد ان کے ملازموں کی تعداد سات رہ گئی تھی۔ لیکن تجربے اور فراست کے اعتبار سے منیر خان ان ساتوں سے بڑھ کر تھا۔ اور جب منیر خان جیسا جہاندیدہ شخص ٹھگوں کا فریب کھا سکتا تھا تو پھر اوروں کا کیا ٹھکانا تھا...

انھیں خیالوں میں گم، ہر طرف چوکنی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، اپنے نوکروں میں سے کچھ کو ذرا آگے ہراول کے طور پر، کچھ کو اپنے دائیں بائیں، اور دو کو اپنے پیچھے رکھتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے بڑھتے گئے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ آج دن ڈوبتے ڈوبتے قائم گنج ہوتے ہوئے لکھرالا پہنچ جائیں۔ وہاں سے بداؤں، آنولہ، اور شاہ آباد ہوتے ہوئے رامپور کوئی بہتر کوس یا ساڑھے چار دن کی راہ تھا۔ لیکن احتیاط، بلکہ تقریباً پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی وجہ سے ان کی رفتار بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ کشتی والے قافلے کو فتح گڈھ پر دریائی راستہ چھوڑ کر خشکی کی راہ سے دس کوس قائم گنج اور پھر لکھرالا پہنچنا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ اگر میرزا تراب علی کے قافلے نے اپنی رفتار ہلکی رکھی اور دو چار دن کہیں راہ میں قیام بھی کر لیا، تو دونوں قافلے بداؤں اور آنولہ کے درمیان مل بھی سکتے تھے۔ بڑی جمعیت کا اپنے ساتھ مل جانا بہت دلکش اور امید افزا ضرور تھا، لیکن آغا تراب علی اب کہیں ٹھہرنے کو تیار نہ تھے۔ اس وقت ان کی رفتار یوں ہی مدھم ہو رہی تھی جو ان کی مرضی کے خلاف تھا۔ لیکن سنبھل سنبھل کر چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اس ادھیڑ بن میں راستہ طے کرتے ہوئے وہ کچھ دور نکل آئے۔ جب میرزا تراب علی نے چونک کر آسمان پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ دن بہت چڑھ چکا ہے۔ وہ مشرق سے مغرب کی طرف جا رہے تھے، اس لئے سورج ابھی ان کے پیچھے تھا اور گھڑ سواروں، خچر سواروں، اور پیادہ سپاہیوں کے لمبے سائے سڑک پر پھیل رہے تھے۔ بظاہر ابھی قائم گنج بہت دور تھا۔ چاروں طرف دور تک بنجر میدان دھوپ میں ست پھیلا ہوا تھا، اس کی انتہا ہی نہ ملتی تھی۔ لمبے سایوں کو اجاڑ اور سنسان راستے پر رینگتے دیکھ کر مرزا تراب علی کا جی چاہا کہ کوئی اور قافلہ، یا کچھ سوار، نہیں تو دو چار پیادہ مسافر ہی مل جاتے تو کچھ من بھاونا ہو جاتی... کتنا سونا رستہ ہے بھیڑیا ہی مل جائے۔ یا شاید راستہ اتنا ہول انگیز نہ تھا، یہ آغا تراب علی کے دل میں بیٹھی ہوئی دہشت تھی جو کسی چھل پائی کی طرح ان کے آگے آگے بھی چل رہی تھی اور کبھی کبھی مڑ کر اپنا بھیانک چہرہ اور بگاڑ کر گویا ان کا منھ چڑاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مرزا تراب علی نے سڑک پر دور تک نگاہ

کی لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ آگے جا کر سڑک ایک تیز خم کھا کر شمال کی طرف مڑتی تھی، خم اتنا تیز تھا کہ اس کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مرزا تراب کو وہم ہونے لگا کہ کہیں اس موڑ کے پرلی طرف ٹھگوں کا کوئی جرگہ ان کی تاک میں بیٹھا ہوا ہو تو ہم لوگ ان شیطانوں سے کس طرح نپٹیں گے۔ انھوں نے سن رکھا تھا کہ گھڑ سواروں پر قابو پانے کے لئے دو کے بجائے تین ٹھگ حملہ کرتے ہیں۔ ایک گھوڑے کی راس کو پکڑ لیتا ہے، اس قدر مضبوط اور سخت پکڑ کے ساتھ کہ گھوڑا ایک قدم حرکت نہیں کر سکتا۔ دوسرا ٹھگ سوار کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے نیچے کھینچ لاتا ہے اور تیسرا ٹھگ سوار کے گرتے گرتے اپنے آلۂ قتل، یعنی سفید اور زرد پٹیوں والے موٹے کپڑے کے انگوچھے (ٹھگوں کی اصطلاح میں ''رومال'') سے چشم زدن میں اس کا گلا گھونٹ دیتا ہے، شکار کو تڑپنے کی بھی مہلت ٹھیک سے نہیں ملتی... مرزا تراب علی کو دور سڑک پر کچھ سایہ نما سیاہی دکھائی دی، جیسے درختوں کا کوئی جھنڈ ہو۔ اگر اس جھنڈ میں دشمن...

''لاحول ولاقوۃ۔ یہ کیا عورتوں والے اوہام ہیں۔'' مرزا تراب علی نے برے خیالات کو دل سے جھٹکتے ہوئے خود سے کہا۔ لیکن ان کا دل پھر بھی بار بار انھیں بھیانک پیکروں میں الجھ جاتا۔ انھوں نے نادعلی کا ورد شروع کیا اور دل ہی دل میں منت مانی کہ گھر پہنچ جاؤں بحفاظت تو پہلی فرصت میں مزار مبارک پر حافظ شاہ جمال اللہ صاحب کے چادر چڑھاؤں گا اور لنگر منعقد کروں گا۔ اور کار ہائے سرکار سے مہلت ملتے ہی امروہہ جا کر درگاہ حضرت مخدوم شاہ ولایت پر حاضری دوں گا۔ مرزا تراب کو اب محسوس ہوا کہ موڑ سے ذرا پہلے جو سواد سا نظر آتا تھا اور جسے وہ درختوں کا کوئی جھنڈ سمجھے تھے کہ سڑک کے وسط تک سایہ کئے ہوئے ہے، دراصل چند مسافروں کا گروہ تھا۔ کوئی آٹھ دس آدمی رہے ہوں گے۔ ان میں سے ایک آدمی چادر لپیٹے ہوئے پڑا سو رہا تھا۔ شاید بیمار ہو یا زخمی ہو۔ تین چار آدمی لیٹے ہوئے شخص کے سرہانے اور پائینتی بیٹھے ہوئے کچھ باتیں کر رہے تھے، یا شاید کچھ دعا وغیرہ پڑھ رہے ہوں۔ باقی تین چار شخص کندھے جھکائے ہوئے مایوسی کی تصویر بنے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے آغا تراب علی کے قافلے کو امید اور خوف بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

گنتی

آغا مرزا تراب علی کے ہراولی سواروں نے انھیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور خود اجنبیوں کے پاس جا کر انھیں بغور دیکھا۔ سات آٹھ آدمی تھے، وہ سپاہیوں کے لباس میں تھے لیکن نہتے اور مسکین لگ رہے تھے۔ وہ تین چار آدمی جو لیٹے ہوئے شخص کے سرہانے اور پائینتی بیٹھے ہوئے تھے، ان کے چہرے پر انتہائی غم زدگی برس رہی تھی۔ وہ تو اپنی جگہ سے نہ اٹھے اور جو کچھ پڑھ رہے تھے وہ اسے ہی پہلے کی طرح پست آواز میں پڑھتے رہے... ہراول سواروں سے صاف نہ سنا گیا، لیکن وہ عربی میں کچھ مسلمانوں والی دعا یا قرآن کی آیتیں معلوم ہوتی تھیں۔ چار آدمی سڑک کے کنارے کھڑے تھے، ان کے بھی چہروں پر رنج اور افسوس کی مٹیالی رنگت دوڑی ہوئی تھی۔ ان کے بدن ڈھیلے اور جھکے ہوئے تھے، گویا عاجزی، مسکنت اور واماندگی کی آخری منزل طے کر چکے ہوں۔ ان کا رنگ سیاہی مائل اور خال و خط اودھ والوں جیسے تھے۔ ان کے بھی ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہ تھا، لیکن ان کے پیچھے چار چھ بڑی بڑی گٹھریوں میں کچھ سامان بندھا ہوا تھا اور گٹھریوں کی لمبائی چوڑائی سے گمان گذرتا تھا کہ ان میں اسلحہ بھی ہوں گے۔ انھوں نے توقع سے بھری ہوئی مسکین نگاہوں سے سوار کو دیکھا اور ان میں ایک نے جھک کر تسلیم کی اور مردہ سی آواز میں بولا:

''زہے نصیب کمیدان صاحب کہ آپ کا گذار ادھر سے ہوا۔ ہماری تو آس ٹوٹ چکی تھی...''

سواروں میں سے ایک نے بات کاٹ کر خشمگیں لہجے میں کہا: ''کیا بات ہے، کون لوگ ہو تم؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

مسکین شخص نے، جو کھچڑی بالوں، کڑ بڑی داڑھی اور جھریوں والی گردن والا ادھیڑ عمر معلوم ہوتا تھا، کچھ آگے آنے کی کوشش کی لیکن سوار نے اسے گھڑک دیا۔ ''وہیں رہو۔ جو کہنا ہے وہیں سے کہو۔''

''کمیدان جی، کریم الدین میرا نام ہے۔ ہم سپاہی نواب صاحب چاند پور کے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ لکرالا چھٹی پر گئے تھے۔ وہاں سے اپنی نوکری پر لوٹ رہے ہیں...''

سوار کے منع کرنے کے باوجود آغا تراب علی اب راہگیروں کے اس قدر نزدیک آ گئے تھے کہ وہ ان کی گفتگو بخوبی سن سکتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ راہگیر واقعی سپاہی ہیں اور مسلمان ہیں۔ انھوں نے معمولی سپاہیوں کی طرح گزی کے تنگ اور اونچے پاجامے پہن رکھے تھے۔ بدن پر نیلی سوسی یا محمودی کا تنگ شلوکا، اس کے اوپر پھولدار چھالٹی کی قبا جس کا دامن مسلمانوں کے طرز پر بائیں سے دائیں اوپر کو آتا تھا، سر پر مسلمانوں سے مخصوص طرز کی صافہ نما پگڑی، کمر میں مضبوط پٹکے جیسا ڈوپٹہ، لیکن خنجر یا طمنچے سے عاری، پاؤں میں نیچی ایڑی کی نکے دار جوتیاں جن کی اڈیاں اونچی تھیں تاکہ تیز چلنے میں آسانی ہو۔ وہ از سرتاپا تھکے ہوئے، بلکہ ہارے ہوئے سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اسلحہ نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی۔

آغا تراب علی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کڑ بڑی داڑھی والے مسکین سپاہی کریم الدین نے زور کا نعرہ بلند کیا، ''اللہ تیرا شکر! نواب صاحب تشریف لے آئے! رحمت کا فرشتہ اتر آیا!'' یہ کہتے کہتے وہ زمیں بوس ہو گیا۔ سڑک پر کھڑے باقی تین راہگیروں نے بھی جھک جھک کر تسلیمیں کیں اور پکارے، ''اللہ سرکار کو سلامت رکھے۔ اب ہمارے مردے کو زندگی مل جائے گی۔''

''شور مت مچاؤ۔'' مرزا تراب علی نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔ ''کیا معاملہ ہے؟ یہ مردے کی زندگی کا قصہ کیا ہے؟''

جو چار راہگیر لیٹے ہوئے شخص کے پائین اور سرہانے تھے، اب ان کی آوازیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ نیم خواندوں کے لہجے میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ رہے تھے۔ کریم الدین نے زمین سے سر اٹھایا اور روہانسے گلے سے بولا:

''سرکار والا۔ وہ جو زمین پر پڑا ہوا ہے وہ ہمارا بھائی ہے۔ آج صبح قضائے حاجت کے لئے جا رہا تھا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا۔ چٹ پٹ مر گیا، ہائے کیا جوان موت آئی۔'' یہ کہتے کہتے اس نے زمین پر پڑے ہوئے شخص کے سر سے چادر سرکائی۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ رہا تھا اور منھ پر سبزی مائل جھاگ تھا۔ ''ہم تب سے یہاں پڑے ہیں کہ کوئی مولوی عالم شریف انسان نماز جنازہ اس کی پڑھ دے تو ہم اسے مسلمان کی طرح دفن کر دیں۔ ہم بے لکھے پڑھے، فرض نماز تھوڑی بہت جانتے ہیں، جنازے کی نماز کیسے

پڑھائیں...‘‘

’’ہوں۔تو تم لوگ یہاں کس طرح پہنچے؟‘‘

پاس کھڑے دوسرے سپاہی نے پھر جھک کر تسلیم کی اور بولا، ’’سرکار، ہم ٹکرالا سے چاند پور جا رہے ہیں۔احدی نواب صاحب کے ہیں۔چھٹی پر ٹکرالا اپنے وطن گئے تھے۔‘‘

مرزا تراب علی کو معلوم تھا کہ چاند پور نامی ایک چھوٹی سی ریاست بلہور اور قنوج کے درمیان ہے۔اس کے نواب سے ان کی معرفی نہ تھی لیکن اس کا نام انھوں نے سنا تھا۔’’کیا نام ہے تمھارے نواب کا؟‘‘

’’عظیم الدولہ نواب مستقیم الدین خان صاحب بہادر، سرکار۔‘‘

راہگیر سپاہیوں کے منھ سے نواب کا صحیح نام سن کر مرزا تراب علی کو کچھ اطمینان ہوا۔’’اچھا، تو ہم تیز تیز جاتے ہیں اور اگلے گاؤں سے تمھارے لئے کوئی مولوی بھجوانے کا بندوبست کرتے ہیں۔‘‘

’’عالی جاہ،‘‘ دوسرے سپاہی نے کہا۔’’یہاں سے کئی کوس تک کوئی گاؤں نہیں۔دو کوس پر ایک نگلہ ہے، وہاں صرف ڈوم اور چمار رہتے ہیں، اونچی ذات کا ہندو بھی نہیں۔‘‘ وہ کچھ ہچکچایا۔’’سرکار، دیر ہونے میں لاش کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔اگر آپ ہی...‘‘

’’جی سرکار بہادر۔‘‘اب وہ شخص بولا جو لاش کے سرہانے آیتیں پڑھ رہا تھا۔’’ہم غریب پردیسیوں پر اتنی مہربانی کر دیتے کہ نماز جنازہ پڑھا دیتے تو ہم سرکار کی سات پشتوں کو دعائیں دیں گے۔اللہ کے یہاں آپ کو ثواب ملے گا۔‘‘

’’تم لوگ سنی ہو؟‘‘ مرزا تراب علی نے گومگو کے عالم میں پوچھا۔

’’سرکار ہم سارے ہی سنی ہیں۔‘‘

’’مگر میں تو شیعہ ہوں۔کیا نماز تمھاری ہو جاوے گی؟‘‘

وہ سب کچھ سوچ میں پڑ گئے۔پھر پہلا سپاہی آہستہ سے بولا:

’’سرکار بہادر کا اقبال بلند رہے۔آپ کی نماز بھی تو اللہ ہی میاں کی نماز ہے۔ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اسے کفاروں کی طرح نہ تو پنا پڑے۔‘‘

آغا مرزا تراب علی نے مڑ کر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ان کے چہرے تذبذب اور کچھ ناراضگی کا آئینہ تھے۔بظاہر وہ یہاں مزید رکنے کے حق میں نہ تھے۔نماز جنازہ وغیرہ تو بہت دور کی باتیں

تھیں۔ مرزا تراب علی نے ان کی خفگی بھانپ لی، لیکن اس سے ان کی ضدی طبیعت کو اور بھی اشتعال ملا۔ نماز جنازہ تو میں پڑھا کر رہوں گا، انھوں نے اپنے دل میں کہا۔ بچارے کو اس طرح بے گور و کفن چھوڑ دینا کہاں کی آدمیت ہے۔

''صابر بخش،'' انھوں نے کہا۔ ''وضو کے لئے پانی لاؤ۔ اور تم لوگ بھی وضو کر لو۔ پانی کم ہو تو مٹی پر ہاتھ مار لینا۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنے اسلحہ الگ کرنے شروع کیے۔ ''تم لوگ بھی اسلحہ اپنے الگ کر لو۔'' انھوں نے حکم دیا۔ ''اور جلدی کرو۔ دیکھتے نہیں ہو ہمیں دور جانا ہے۔''

تیوری پر بل لئے ہوئے صابر بخش اور دوسرے نوکروں نے جیسے تیسے اپنے ہتھیار اتارے، وضو کیا، اور صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ راہگیر سپاہیوں میں سے ایک کے سوا باقی نے اپنی صف پہلے ہی بنالی تھی۔ حفاظت کے خیال سے مرزا تراب علی کے آدمیوں نے اپنی صف راہگیر سپاہیوں کی صف کے آگے رکھ لی۔ ایک جو صف کے باہر تھا، اس کی طرف اشارہ کر کے کریم الدین نے کہا:

''سرکار نواب صاحب اور ملازمان کے ہتھیار حفاظت سے رہیں گے۔ ہمارے بھی ہتھیار ان گٹھریوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ سر بلند خان رکھوالی ان کی کرے گا۔ نواب صاحب حضور، نماز پڑھا دیں۔''

سر بلند خان کا نام کریم الدین کی زبان سے ادا ہوتے ہی آغا مرزا تراب علی کو کچھ ایسا لگا جیسے سپاہیوں میں کچھ بجلی سی چمک گئی ہو۔ ان کے ڈھیلے بدن چست اور مستعد اور ڈھلی ہوئی گردنیں سخت اور بلند معلوم ہونے لگیں۔ آغا تراب علی کے سینے میں اچانک زور سے دھڑکن ہوئی، جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا ہو۔ کچھ نہیں، شاید دھوپ کا اثر ہے، انھوں نے دل میں کہا۔ جاڑوں کی دھوپ بڑی فریب کار ہوتی ہے۔ وہ نماز کے لئے آگے بڑھے جہاں ایک سپاہی کا چوڑا رومال جانماز کے طور پر بچھا دیا گیا تھا۔

مرزا تراب علی نے تکبیر کہہ کر نیت باندھ لی۔ دونوں صفوں نے بھی ہاتھ باندھ لئے۔

چند ہی ثانیے گذرے تھے کہ اچانک کسی نے گفتگو کے لہجے میں آہستہ سے کہا:

''تما کھو کھا لو۔''

یہ آواز ہوتے ہی مردہ سپاہی، جس کی نماز جنازہ پڑھائی جا رہی تھی، تیندوے کی طرح اچھل کر آغا تراب علی پر ٹوٹ پڑا، اس نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ادھر کریم الدین نے چشم زدن سے بھی کم مدت میں اپنے گریبان سے زرد اور سفید پٹیوں والا موٹے کپڑے کا کوئی پون گز کا رومال نکالا جس کے

ایک سرے پر گرہ دی ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ گوش یا نیولے کی سی سرعت سے آگے بڑھ کر رومال یوں گھمایا جیسے سانپ نے پھن کاڑھ کر حملہ کیا ہو۔ رومال کا حلقہ مرزا تراب علی کی گردن میں پچی ہو گیا۔ ان کے منھ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ رومال کا دوسرا سرا کریم الدین نے اس زور سے کھینچا کہ آغا تراب علی کے نرخرے کی ہڈی جگہ جگہ سے شکستہ ہو کر ان کے حلق کی پشت میں دھنس گئی۔ انھوں نے سانس لینے کے لئے منھ کھولنا چاہا لیکن منھ ان سے کھولا نہ گیا۔ پھر ان کے سینے اور گلے میں شدید درد اٹھا اور انھیں نہ معلوم ہوا کہ کب وہ زمین پر آرہے، کب تک ان کی حرکت مذبوحی جاری رہی اور کب ان کی روح نے عالم بالا کا رخ کیا۔ مکمل سکوت کے عالم میں سات تندرست اور تنومند مردوں کو رومال کے ذریعہ ٹھکانے لگانے میں چوتھائی گھڑی (۱) بھی نہ صرف ہوئی۔

ابھی تمام مقتولوں کے بدن کی اینٹھن اور ایڑیوں کی رگڑ اور ہاتھوں کا تشنج زائل بھی نہ ہوا تھا کہ ساتوں لاشوں کے اوپری کپڑے، جوتیاں، اور بدن کے زیور، انگوٹھیاں وغیرہ اتار لئے گئے اور انھیں اسلحہ کے ساتھ گٹھریوں میں لپیٹ کر گولا لاٹھی کی شکل دے دی گئی۔ اتنی ہی دیر میں دور آسمان پر کرگسوں کے بھورے کتھئی سائے لہراتے نظر آنے لگے تھے۔ کریم الدین نے کہا :

"کسّی نکالو۔"

یہ ہدایت سن کر ایک شخص نے اپنی گٹھری کھول کر سفید کپڑے میں لپیٹی ہوئی ایک کدالی نہایت احتیاط اور احترام سے نکالی۔ باری باری تمام ٹھگوں نے جائے واردات سے کچھ نشیب میں ایک قبر نما گڈھے کو وسیع کرنا شروع کیا۔ گڈھا چونکہ پہلے ہی کھود لیا گیا تھا، اس لئے بمشکل نصف گھڑی میں قبر یا گڈھا اتنا وسیع اور گہرا تیار ہو گیا کہ ساتوں لاشیں اس میں ایک کے اوپر ایک ٹھونس دی گئیں، اس طرح کہ ایک کے پاؤں پر دوسری کا سر رکھا گیا۔ ساتوں کو در گور کرنے کے بعد پہلے ہی جیسی پھرتی سے زمین برابر کر کے اس پر گھانس، چھوٹے پتھر، روڑے، سوکھی ہوئی کانٹے دار شاخیں اس طرح پھیلا دی گئیں کہ دیکھنے والے کو گمان بھی نہ ہو کہ یہاں کوئی مدفن ہے، اور کانٹے دار جھاڑیوں کے ڈر سے سیار اور بھیڑیے بھی وہاں زمین کھودنے کی ہمت نہ کریں۔ کسّی کو دھو کر سفید کپڑے میں دوبارہ نہایت احترام سے لپیٹا گیا۔ پھر سب نے مغرب کی طرف رخ کر کے بآواز بلند کہا، "جے دیوی ماں کی" اور کسّی کو بوسہ دے کر گٹھری میں واپس رکھ لیا۔

---

(۱) ایک گھڑی = چوبیس منٹ۔

قافلے کے گھوڑوں اور خچروں کے ساز اتار کر انھیں وہیں کوتل چھوڑ دیا گیا کہ جہاں چاہیں نکل جائیں یا بھیڑیوں اور گلداروں اور تیندوؤں کی غذا بنیں۔ ''مردہ'' راہگیر کو ملا کر وہ نو ٹھگ تھے۔ لوٹ کا سامان اور اپنا سامان بآسانی اٹھا کر وہ بظاہر آہستہ لیکن درحقیقت تیز قدم چلتے ہوئے بہت جلد غائب ہو گئے۔

مہا کالی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب دیوی دیوتا، جن و پری، دیو اور دیونیاں، عفریت اور شیاطین، اسور اور راکشس، غول اور پریت، ارض انسانی پر آزاد گھومتے تھے اور کبھی کبھی عام انسانوں کو نظر بھی آتے تھے۔

انھیں دیویوں میں ایک دیوی بھوانی بھی تھیں۔ اہل ارض پر ایک کٹھن وقت ایسا آیا جب ایک عظیم الجثہ عفریت کہیں سے پیدا ہو کر تمام ذی حیات اہل دنیا پر حاوی ہو گیا۔ انسانوں کے پیدا ہوتے ہی وہ انھیں کھا جاتا۔ کچھ ہی زمانہ گذرا تھا کہ دنیا میں انسانوں کی گنتی کم ہونے لگی اور جانور بڑھنے لگے۔ جانوروں کی افزائش سے دوسرا خطرہ پیدا ہوا کہ انسانوں کو عفریت الگ کھائے گا اور درندے ان کا خون الگ بہائیں گے۔ چند ہی مدت میں سنسان جگہیں، پھر دیہات، پھر بڑی بستیاں، اور پھر شہر، حتیٰ کہ راجاؤں کے محل بھی شیروں، ببر شیروں، گلداروں، چیتوں، بھیڑیوں، سیاہ گوشوں، لکڑ بگھوں اور شغالوں سے بھر جائیں گے۔ لوگوں نے فوجوں اور گروہوں کی صورت میں عفریت کے قتل کو نکلنا شروع کیا۔ کئی جگہ تو ہاتھیوں، گینڈوں، اور ارنے بھینسوں کے غول اس کام کے لئے مہیا کئے گئے۔ لیکن عفریت کو مارنے کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں۔ وہ قد میں اتنا بلند تھا کہ عمیق ترین سمندر بھی اس کی کمر تک نہ پہنچتا تھا۔ انسان ہو یا حیوان سبھی اس کے سامنے آتے ہی خوف سے بیہوش ہو جاتے تھے اور پھر وہ عفریت انھیں بآسانی دبوچ کر اپنے منھ میں ڈال لیتا تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ وہ عفریت نہ تھا، راکشس تھا، اور اس کا نام رَکت بیج (۱) تھا۔

جب سارے عالم میں تراہ تراہ مچ گئی تو دیوی بھوانی کو، جنھیں کالی ماں اور درگا ماتا بھی کہتے

---

(۱) اول دوم مفتوح، مع یائے مجہول۔

ہیں، اہل ارض پر رحم آ ہی گیا۔ انھوں نے اپنی ہیرے جڑی ہوئی طلائی تلوار سے عفریت راکشس کا سر قلم کر دیا۔ لیکن سر قلم ہونے پر خون کا فوارہ چھوٹا اور اس کی بوندیں زمین پر گریں تو ہر قطرے سے ایک اور عفریت پیدا ہوا جو ہو بہو اصل عفریت کی طرح تھا۔ اب تو بھوانی کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے تلوار کو دونوں ہاتھوں میں لے کر عفریتوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ لیکن مرنے والے ہر عفریت کے خون کے ہر قطرے سے ایک نیا عفریت فوراً پیدا ہو جاتا۔ سارا میدان عفریتوں کے جتھے اور ان کی چنگھاڑ سے بھر گیا۔ مارتے مارتے اور کاٹتے کاٹتے بھوانی ماں کے ہاتھ شل ہو گئے اور وہ پسینے پسینے ہو گئیں۔

تب انھوں نے اپنے بازو پونچھے اور دونوں بازوؤں سے ایک ایک قطرہ پسینہ ارض مصاف پر ٹپکایا۔ پسینے کی بوندوں کا مٹی پر ٹپکنا تھا کہ گندھی ہوئی مٹی سے دو سورما پیدا ہوئے۔ بھوانی ماں نے اپنے زرد سفید دامن کا کنارہ پھاڑ کر دو لمبی دھجیاں نکالیں اور دونوں سورماؤں کو ایک ایک دھجی دے کر کہا:

''ایک ایک کر کے ان نابکار عفریتوں کا گلا گھونٹ دو۔ خون ہرگز نہ بہے۔''

جیالے سورماؤں نے تھوڑی ہی مدت میں سارے عفریتوں کا قلع قمع کر دیا۔ بھوانی نے خوش ہو کر ایک دھجی انھیں بخش دی اور کہا:

''آج سے تمھارا دھرم یہی ہے۔ اس دھجی سے انسانوں کا خون کرو۔ لیکن خون نہ بہے۔ تمھارے مارے ہوؤں کو میں کھا جایا کروں گی۔ لیکن مارنے کے بعد پلٹ کر نہ دیکھنا۔ تمھارا مارا ہوا کیونکہ میرے فرمان سے مرے گا اس لئے مرنے کے بعد نہ وہ بھوت بنے گا اور نہ اس پر کوئی جانچ پڑتال ہوگی۔ اس کا دوبارہ جنم نہ ہوگا اور وہ سیدھا بیکنٹھ جائے گا۔ نرک کا منھ کبھو نہ دیکھے گا۔''

ایک روایت یہ ہے کہ رکت بیج کو ماں نے خود اپنے انگوچھے سے گلا گھونٹ کر مارا تھا اور پھر وہی انگوچھا کا چنی قوم کے ایک ٹکڑ گدا کو بخش کر یہ بردان دیا تھا کہ لے، اس سے مسافروں کو مار کر اپنی روزی پیدا کر۔ لاشوں کو گاڑنا اور تیری اور تیرے قبیلے کی رکچھا کرنا ہمارا کام ہے۔

بھوانی نے کچھ شرائط اور کچھ مستثنیات بھی مقرر کیں، مثلاً یہ کہ عورت کو نہ مارنا، اپنے اعزا میں سے کسی کو نہ مارنا، مالی منفعت کی توقع نہ ہو تو ہرگز مت مارنا، ساتے کا دھیان رکھنا، وغیرہ۔ لیکن اصل حکم یہی دیا کہ اس دھجی (یا انگوچھے) یا اس کی طرح کے رومال سے گلا گھونٹ کر مارنا اور بعد مارنے کے پلٹ کر نہ دیکھنا۔ بھوانی کے یہ عقیدت مند سارے جہان میں پھیل گئے اور بے فکری سے بنی نوع انسان کو شکار کرنے لگے۔ بھوانی ان کے مقتولوں کی لاشیں فوراً ہڑپ کر جاتی اور کسی کو پتہ نہ چلتا کہ آخر وہ شخص گیا کہاں اور اسے

کیا ہو گیا تھا۔

ہزاروں سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔لیکن انسان بچہ بلا وجہ احمق نہیں کہلاتا۔ایک بار ایک من چلے نے سوچا، ذرا پلٹ کر دیکھ تو لوں کہ ماں میرے شکار کو کیسے کھاتی ہے۔پس اس نے راہ میں ایک راہگیر کو مارا اور بھاگ نکلا۔لیکن بھاگتے بھاگتے اس نے پلٹ کر دیکھا...دیوی ماں نہایت ذوق و شوق سے اور نہایت تیزی سے لاش کو نگلتی جا رہی ہیں...

ایک روایت یہ ہے کہ من چلے ٹھگ نے جب اپنا منھ پھیرا تو کیا دیکھا کہ دیوی ننگے بدن اپنی اصل صورت میں موجود ہیں اور لاش کو اٹھا کر اپنی رتھ پر لاد رہی ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ دیکھنے والے نے دیکھا کہ کرامات کی راہ سے دیوی اس لاش کو اپنے ناخن پا سے نگل رہی تھیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ دیوی نے لاش کو اتنی آسانی سے اٹھا لیا تھا جیسے وہ خشک پتہ ہو، اور انھوں نے لاش کو آسمان کی طرف اچھال کر اسے غائب کر دیا تھا۔

دیوی کی نظر اس دیکھنے والے گستاخ پر پڑی تو وہ غصے سے بھر گئیں اور بولیں: "اب مجھ کو لاش برداری سے، کہ میرا ذمہ تھا، کچھ کام نہیں۔اب سے تم جانو اور لاشیں جانیں۔" یہ کہہ کر دیوی رتھ سمیت غائب ہو گئیں۔تب سے لاچاری کے سبب کدال یعنی کسّی بنوانا، اس سے مدفن کھودنا، اور لاشوں کو گاڑنا ضرور پڑا۔

ایک روایت یہ ہے کہ گستاخ ٹھگ کی نالہ وزاری اور عفو خواہی کے سبب بھوانی کو رحم آ گیا۔لہٰذا انھوں نے آئندہ لاشوں کو ٹھکانے لگانے سے اگرچہ انکار کیا، لیکن اپنا ایک دانت توڑ کر انھوں نے زمین پر پھینک دیا اور کہا کہ اسے لے جاؤ اور اس کی کدالی بنا لے۔اسے کسّی کہہ کر پکاریو۔جب تک تو کسّی کی توقیر اور پرستش کرے گا یہ تیرا ساتھ دے گی، تجھے راہ سجھائے گی، غلطیوں سے بچائے گی، گور گڑھا اس کے ذریعہ بہت جلد بن جایا کرے گا۔اور کام ہو جانے کے بعد کسّی کو کنویں میں پھینک دیا کیجو۔پھر تو جب بھی کام اپنا کرنے کو، جسے جِتائی پر جانا کہیں گے، اور گلا گھونٹنے کو بھُوتی کہیں گے، گھر سے نکلے تو اسی کنویں پر جائیو اور میرا نام لے کر کسّی کو بلائیو۔کسّی اپنے آپ اوپر آ جاوے گی۔

میجر جنرل ولیم ہنری سلیمن (Major-General William Henry Sleeman) جسے کمپنی کی دو بڑی خدمات (انسداد ٹھگی اور اودھ کی شاہی کے خلاف رپورٹ) کے صلے

میں زندگی کے بالکل آخری وقتوں میں سر کا خطاب اور Knight Commander of the Bath کا تمغہ دیا گیا، اپنے وقائع میں لکھتا ہے کہ کئی ٹھگوں نے اس سے حلفیہ بیان کیا کہ انھوں نے اپنی آنکھ سے یہ منظر دیکھا ہے کہ ٹھگوں کے جمعدار نے کنویں پر جا کر اپنی کسّی کو پکارا ہے اور وہ فوراً اپنے آپ سے اوپر آ گئی ہے۔ ایک نے تو یہاں تک بیان کیا کہ اگر کسی کنویں میں ایک سے زیادہ جمعداروں کی کسّیاں ہوں تو پکارنے پر ہر ایک کی کسّی الگ الگ بے خطا اوپر آ جاتی ہے۔

برطانوی ہندوستان میں افواج انگریزی کی تاریخ کا ایک دلچسپ اگرچہ گمنام گوشہ یہ ہے کہ انسداد ٹھگی کے سات دہائی بعد پہلی عالمی جنگ کے کچھ پہلے جب اسی جنرل سلیمن کے پوتے کرنل جیمس سلیمن نے چاہا کہ ہندوستانی فوج کے لئے زمین کنی کا کوئی عمدہ آلہ تیار کرائے، تو کئی نقشے اور مشقیں اور تجربات عمل میں لانے کے بعد کرنل جیمس سلیمن نے جو کدالی ایجاد کی وہ ٹھگوں کی کسّی کے کم و بیش ہو بہو تھی، اگرچہ کرنل جیمس سلیمن نے کوئی کسّی کبھی دیکھی نہ تھی۔

جب کوئی ٹھگوں کا جمعدار کسّی تیار کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اچھا شگون دیکھ کر لوہار سے کسّی بنواتا ہے اور اس بات کا لحاظ رکھتا ہے کہ کسّی بنانے کے دوران لوہار کوئی اور کام نہ کرے اور کوئی غیر آدمی اس کے گھر آنے نہ پاوے۔ جب کسّی تیار ہو جاتی ہے تو کوئی اچھا سا دن دیکھ کر اسے دھوپ دیتے ہیں کہ اس میں انس و برکت پیدا ہووے۔ پھر اگر حضر میں ہیں تو دروازے مکان کے بند کر کے، اور اگر سفر میں ہیں تو کسی بہت ہی محفوظ جگہ میں بیٹھ کر سوائے سنیچر اور اتوار کے، ٹھگان کی ایک مجلس جماتے ہیں۔ کسی صاف ستھری جگہ کو لیپ پوت کر چوکا دیتے ہیں یعنی خطوط مستقیم سے بڑا سا مربع بنا دیتے ہیں اور ایک ٹھگ جو دستورات ہوم سے خوب واقف ہوتا ہے، اس چوکے کے اندر بیٹھ جاتا ہے، اور دیگر ٹھگوں کو بھی اپنے پاس بٹھاتا ہے۔ پھر ایک تھالی میں کدالی کو پاک پانی سے دھو دھا کر اس پانی کو ایک گڈھے میں، کہ چوکے کے قریب پہلے ہی کھود لیا گیا ہو، ڈال دیتے ہیں۔ بعد اس کے، گڑ کے شربت سے، پھر دہی سے، پھر شراب سے اس کسّی کو دھو کر سارا رقیق اسی گڈھے میں ڈالتے جاوتے ہیں۔ پھر اس کدالی پر، کہ ہنوز گیلی ہو، سات ٹیکے سیندور کے کدالی کی نوک تک لگا کر ہوم کنندہ کدالی کی نوک کو تھالی کے کنارے پر اپنے روبرو رکھتا ہے۔ اور ایک دوسری تھالی میں ایک ناریل اور پانچ یا سات پان اور چند پھول لونگ، گوگل جَو، اندر جَو، تل سفید، اور گڑ رکھتے ہیں۔ پھر ایک کٹوری میں گھی رکھتے ہیں۔ پھر چوکے کے بھیتر کنڈوں کی آگ جلاوتے ہیں اور تھوڑی سی چوب انبہ و بیر پہلے تیمناً جلاوتے ہیں۔ جب آگ خوب روشن

ہولے تو ناریل جھٹ تھالی کی ہر شے وہ ٹھگ جو واقف دستورات قدیم ہوتا ہے، آگ میں یوں پھینکتا ہے کہ شعلہ اٹھے۔ اسی شعلے پر کدالی کو سات دفعہ پھیر کر ہوم کنندہ پوست ناریل کا دور کر کے جملہ حاضرین ٹھگ سے اجازت مانگ کر کدالی کا سر، کہ جس طرف بینٹ لگانے کے لئے چھید ہوتا ہے، جے دیوی مائی کی کہتا ہوا ناریل پر اس زور سے مارتا ہے کہ ایک ہی ضرب میں ناریل پاش پاش ہو جاوے۔ اور سب ٹھگ بھی، کیا مسلمان کیا ہندو، چلا کر بولتے ہیں، جے دیوی مائی کی۔ پھر ذرا سی ناریل کی گری اور تمام اس کا پوست و استخواں اسی آگ میں ڈال دیتے ہیں اور پھر سارے ٹھگ رو بہ مغرب سجدہ کر کے باقی ماندہ گری کو کھا جاتے ہیں۔

سوائے جمعدار کے کوئی شخص کسّی بنو نہیں سکتا۔ حالت جنابت یا نجاست میں کسّی کو ہاتھ لگانا، یا عام حالت میں بھی اس کو لانگھنا نہایت درجہ بے ادبی ہے۔ ٹھگ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جس طرف جانے کا رادہ ہووے، کسّی کی نوک ادھر رکھ کر اسے زمین میں گاڑ دینا چاہئے۔ اگر اس طرف جانے میں بہتری نہ ہووے تو کسّی ادھر سے منھ پھیر کر دوسری طرف جس طرف جانے میں بھلائی ہووے، کر لیتی ہے۔

جب شکار کو مارنے کا موقع نزدیک آتا ہے اور اپنے گروہ کو متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ تیار ہو جائیں، تو ان میں سے ایک شخص، یا جمعدار، کسی بہانے سے سر بلند خان، دلڑ خان، یا سرمست خان، نام لیتے ہیں۔ اس نام کو سن کر ٹھگ مستعد ہو کر جھرنی کا انتظار کرتا ہے۔ جھرنی وہ بظاہر بے ضرر لفظ یا الفاظ ہیں جو جمعدار اشارتاً یہ بتانے کے لئے بولتا ہے کہ اب ارتکاب قتل کر ڈالو۔ عموماً یہ الفاظ تماکھو کھا لو، سرتی کھا لو، تبک لاؤ، حقہ پی لو، پان دو، کبت پڑھ لو، آئے ہو تو گہرے چلو، وغیرہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی اشارہ (جو پہلے سے آپس میں مقرر کر لیتے ہیں) سن کر ہر بھتوت اپنا کام کر ڈالتا ہے۔

مقررہ شگونوں اور مستثنیات کے علاوہ ٹھگوں کے تمام گروہ ساتے کا بھی پورا لحاظ کرتے ہیں۔ یعنی جتائی پر نکلنے کے دن سے سات دنوں کو ساتا کہتے ہیں اور ان ایام میں تمام ٹھگ، حتیٰ کہ ان کے گھر والے بھی، بعض کاموں سے مکمل پرہیز کرتے ہیں۔ مثلاً، خیرات دینا، یہاں تلک کہ اس کی بھی احتیاط کرتے ہیں کہ کتا، بلی روٹی نہ لے جاوے۔ ان دنوں میں وہ سوائے مچھلی کے کوئی گوشت نہ کھاتے، سر نہیں منڈاتے، کپڑے دھوبی کو نہیں دیتے۔ ان سات دنوں میں ان کے گھر والے، دیگر ٹھگوں کے متعلقین کو، اگر ان کے ٹھگ الگ سے جتائی پر گئے ہوں، تو انھیں اپنے گھر آنے، بلکہ اپنا دروازہ بھی لانگھنے سے منع کرتے ہیں۔

اقوام و افراد مستثنیات میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں: اتیت، اندھا، بوچا، بھاٹ، تیلی، جٹا دھاری، جوگی، چمار، دھوبی، سنار، عورت، فقیر، قلتبان، کایتھ، کسبی، کلانوت، کنگال، کوڑھی، لنگڑا، لولا، نانک پنتھی، اور نکٹا۔

ایٹب کے ممنوعات میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

ایام مفصلۂ ذیل کو ایٹب (۱) کہتے ہیں: جب کسی ٹھگ کی جورو بچہ جنے، یا اس کی جورو، بیٹی پہلی بار کپڑوں سے ہووے، یا کسی ٹھگ کی بیٹی بیاہی جاوے، یا اس کے بیٹے کی مسلمانی ہووے تو اس دن سے لے کر بارہ دن تک سفر کو نہ نکلیں اور اگر سفر میں ہوں تو واپس چلے آویں۔ کسی ٹھگ کے یہاں کوئی غمی ہو جاوے تو یہی پابندی دس دن کی ہے۔ اگر کسی ٹھگ کی سواری کا گھوڑا یا گھوڑی مر جاوے تو بھی یہی پابندی دس دن کی ہے۔ کسی ٹھگ کی گائے یا کوئی اور چوپایہ مر جاوے تو یہی پابندی سات دن کی ہے۔ کسی ٹھگ کی عورت معمولہ طور پر حائض ہووے، یا اس کی بکری، کتیا، بلی، بچہ جنے، تو یہی پابندی تین دن کی ہے۔ اور یہ نہیں ہے کہ جس ٹھگ کے یہاں ایسا ہووے اسی کو ایٹب لگے۔ اگر کوئی ٹھگ بارہ کوس کی راہ سے بھی سن لیوے کہ فلانے ٹھگ کے یہاں ایسا ہوا ہے، تو اس کو بھی ایٹب لگ جاوے گا۔ ٹھگ لوگ ایٹب زدہ ٹھگوں کو اگر چھو بھی لیں، یا ان کا کپڑا ہی ان کو چھو جاوے تو انھیں بھی ایٹب لگ جاتا ہے۔ اور ہندوستانی ٹھگ ایٹب کو ایٹگ (۲) کہتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ قوم ٹھگان، جن کے گروہ مختلف اقالیم ہند میں مختلف نام رکھتے تھے، ٹھگی کے علاوہ عام دنوں میں اکثر نہایت سلیس و سادہ اور اپنے مذہب کے عبادات و مناسک کے پورے پابند اور بہت رحم دل اور مخیّر ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلیمن صاحب نے صرف اوپر اوپر صفائی کی، ورنہ ٹھگ جرگے یا افراد تو اب بھی خفیہ طور پر موجود ہیں اور اپنا کام کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ آج کل کے ٹھگوں کا ملک دکن میں دور دورہ زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دکن میں اورنگ آباد سے لے کر دولت آباد تک کا علاقہ ان کا خاص ملاذ و ملجا رہا ہے۔ ایک ٹھگ نے تو سلیمن صاحب کے سامنے بیان دیا کہ اور لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن ایلورا کے غاروں میں جو چھوٹی مورتیاں اور سنگی شبیہیں ہیں ان میں ٹھگی کے پورے عمل، مثلاً رومال سے گلا گھونٹنا، دو ٹھگوں کا اپنے شکار کے ہاتھ پاؤں جکڑنا، کدالی سے گور کھودنا، پھر لاش کو توپنا، ان

(۱) یائے معروف، سوم مفتوح۔

(۲) مع یائے معروف۔

سب کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ایک روایت تو یہ بھی ہے کہ ٹھگان نابکار اب امریکہ ولندن میں بھی سرگرم کار ہیں۔ اور سارے ٹھگ اب بھی اپنی مخصوص بولی استعمال کرتے ہیں جسے وہ رماسی کہتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سلیمن صاحب نے ٹھگوں کی تعدی اور تعدد دونوں ہی کو بہت بڑھا کر بیان کیا، ورنہ دراصل ٹھگی اس قدر عام نہ تھی۔ درحقیقت چند ہی بدنصیب گناہ گار چوٹے اچکے اور شکار کو مخنق کر کے مارنے والے جرائم پیشہ اقوام کے فرد تھے جنھیں بعض علاقوں میں ٹھگ کہتے تھے۔ یہ صرف جان کمپنی اور انگریزی راج کی برکتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا ایک حیلہ تھا کہ امن و امان قائم کرنے کے بہانے ہزاروں کو ٹھگی کے نام پر پکڑا دیا، سینکڑوں کو پھانسیاں دی گئیں، سینکڑوں کو عبور دریائے شور کا حکم دیا گیا۔ کچھ کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا اور بیسیوں یہیں شاہجہاں پور، اندور، ساگر، جبل پور اور لکھنو وغیرہ کے جیل خانوں میں دائم الحبس سزا دیے گئے۔ بڑی تعداد میں ٹھگوں کو ماخوذ کئے جانے کے وقت سے پہلے کے زمانے میں، یعنی جنرل سلیمن کی کارگذاریاں شروع ہونے کے پہلے کسی مجرم کو سزائے موت اسی وقت دی جا سکتی تھی جب سزائے موت کی موافقت میں قاضی شہر بھی فتوائے قتل صادر کرے۔ ٹھگوں کی کثیر ترین تعداد کو آسانی سے سزائے موت دی جا سکے، اس غرض سے جان کمپنی نے نیا قانون وضع کیا جس کی رو سے قاضی کے فتوے کی ضرورت نہ تھی، صرف انگریز عدالت کا فیصلہ کافی تھا۔ یہ سارا کھٹ راگ کمپنی کی شہرت اور نیکنامی کے لئے برپا کیا گیا۔ واللہ اعلم۔

بستر بیگانگی

اس واقعے کے ساتویں دن آغا میرزا تراب علی کے اہل کشتی کا بیڑا فرخ آباد کے گھاٹ پر اترا اور کسی غیر ضروری تاخیر کے بغیر اگلی منزل کے لئے روانہ ہو گیا۔ فتح گڈھ، اور پھر قنوج میں، اور اثنائے راہ بھی، انھوں نے آگے جانے والوں کے بارے میں پوچھا، لیکن کہیں کوئی اطمینان بخش جواب نہ مل سکا اور نہ کوئی خبر ہی ملی کہ وہ لوگ اب کہاں ہوں گے۔ انھوں نے گمان کر لیا کہ آغا صاحب مع اسپان و نوکران اب تک رام پور پہنچ چکے ہوں گے۔ لیکن قائم گنج کے بازار میں انھیں کسی رامپوری رئیس کے ایک خادم کی خبر، بلکہ افواہ، ملی کہ اس نے اپنے مالک کے ایک گھوڑے یا کسی اور سواری کو کوتل بھٹکتا ہوا پایا اور بالآخر اسے اسیر بھی کر لیا تھا۔ اب تو کشتی والوں میں کچھ سراسیمگی سی پھیلی۔ وہ کون رئیس اور کون خادم ہو سکتا تھا؟ ایسا تو نہیں کہ ہمارے آغا صاحب کا کوئی آدمی ہو؟ مگر پھر آغا صاحب کہاں تشریف لے گئے؟ گھوڑے کو بے سوار کیوں چھوڑ دیا؟

قافلۂ کشتی کے داروغہ شاہ نور خان نے بہت فکر کے بعد دل میں خیال کیا کہ شہر میں کوئی شاطر یا نشان قدم پہچاننے والا ہو تو اسے تفتیش کے لئے معین کیا جائے۔ ایسے لوگ اکثر علاقۂ کاٹھیاواڑ کے، اور حبشی النسل ہوتے تھے۔ نسل کے اعتبار سے انھیں ''سیدی'' اور کام کے اعتبار سے انھیں ''کھوجیا'' کہا جاتا تھا اور وہ نشان قدم پہچاننے، مفرور کا پتہ لگانے، اور لا پتہ اشیا کو ڈھونڈنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ مدت دراز سے سلاطین اور پھر نوابین و روسائے گجرات کے یہاں یہی خدمت انجام دیتے آئے تھے، اگر چہ وہ شروع شروع میں سواحل افریقہ سے غلاموں کے طور پر گجرات و دکن لائے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے قدر شناسوں کا حلقہ دہلی اور اودھ و روہیلکھنڈ تک پھیل گیا تھا۔ آپس میں وہ اب بھی سواحلی بولتے تھے، لیکن باہر کے لوگوں سے وہ کبھی کبھی گجراتی، لیکن زیادہ تر گجری یعنی ہندی میں بات

کرتے تھے۔ ازمنۂ پاستان سے ان کے بزرگوں نے کچھ مناجاتیں اور نعتیہ گیت تصنیف کر کے ان میں مقبول کئے تھے۔ ان منظومات کو ''ذکر'' کہا جاتا تھا، ان کی زبان سواحلی، گجراتی، اور گجری کا آمیزہ تھی اور یہ اب بھی پہلے ہی جیسے جوش عقیدت اور دردمندی کے ساتھ گائے جاتے تھے۔ مثلاً ان کا ایک ''ذکر'' حسب ذیل تھا، اسے وہ ناچتے ہوئے گاتے تھے لیکن ان کا رقص کسی گجراتی رقص سے مشابہ نہ تھا:

کون امر لایا جگ موں
کس نے امر دیکھا جگ موں
امر نام اللہ کا جگ موں
امر نام لایو نبی جگ موں

زمانۂ حال میں سیدیوں کی تعداد کم ہوتی جاتی تھی لیکن پھر بھی اکادکا ہر اہم شہر میں وہ مل جاتے تھے۔ قائم گنج نہیں تو فتح گڈھ فرخ آباد میں ان کا ملنا تقریباً یقینی تھا۔ لہٰذا شاہ نور خان نے قائم گنج میں تلاش شروع کرانے کے ساتھ ہی اپنے ایک ساتھی کو فتح گڈھ روانہ کر دیا۔ بالآخر دونوں جگہ کامیابی ہوئی اور انھیں دو نشانیے سیدی اکرام اور سیدی منعم مل گئے جنھوں نے فوراً فتح گڈھ کے کچھ اوپر یعنی بلہور سے تفتیش کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا مقصود رامپور کے مبینہ رئیس کے نوکر اور اس کے گھوڑے کا پتہ لگانا تھا۔ دوسرا، ظاہر ہے کہ آغا مرزا تراب علی اور ان کے قافلے کے بارے میں مصدقہ خبر مہیا کرنا تھا اور ممکن ہو تو ان کا موجودہ مستقر معلوم کرنا تھا۔

سیدی اکرام تو فوراً فتح گڈھ کو روانہ ہوا، ادھر قائم گنج میں دو تین دن کی سعی و تلاش میں منعم نے اس ملازم مفرور کا پتہ نشان معلوم کر لیا کہ وہ ابھی قائم گنج ہی کے اطراف میں کہیں ہے۔ جب آخر کار وہ اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو وہ ملازم ایک بازاری عورت کے گھر میں مفروروں کی طرح چھپا ہوا تھا۔ اس نے اقبال کیا کہ میرا نام منیر خان ہے اور اسے اپنے مالک کا ایک گھوڑا آوارہ بھٹکتا ہوا ملا تھا۔ مالک نے چونکہ اسے نوکری سے برطرف کر دیا تھا اس لئے گھر واپس لوٹنے میں اسے شرمندگی اور ذلت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن گھوڑے کو کوتل پھرتے دیکھ کر اس کے دل میں شک اور خوف پیدا ہوا تھا کہ میرے مالک کو کچھ ہو گیا ہے۔

''اور اب... اور اب... میرے لئے اور بھی مصیبت اور جوکھم ہے۔'' وہ تقریباً روتا ہوا بولا۔ ''میں کس منھ سے رامپور جاؤں، کس کو منھ دکھاؤں اور کس بوتے پر یہ خبر بد پہنچاؤں۔ مجبوراً میں چھپا انتظار

کر رہا ہوں یہاں کہ کوئی سبھ سندیسہ مالک کے بارے میں ملے تو مجھے راہ واپسی کی شاید سوجھے۔ نہیں تو میں خود اپنی جان لے لوں گا نہیں تو پہاڑوں میں جا کر بن باسی ہو جاؤں گا۔''

''پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب مل کر خبر گیری تمھارے مالک کی کریں۔ مار مرنے یا بن باس لینے کی بات بعد میں ہو گی۔'' سیدی منعم نے جواب دیا۔'' تم اپن ساتھ چلو۔ اس وقت تو تمھارے آقا کی خبر تم سے زیادہ کسو کو نہیں۔ داروغہ حمایت کی سرائے میں ٹھہرے سنگی ساتھیوں کا ڈیرہ ہے۔''

''میں یوں تمھارے سنگ چلنے کا نہیں۔ اگر تم کشتی والوں کی طرف سے آئے ہو تو کچھ پتہ نشانی تو تمھارے پاس ہو گی، دکھاؤ۔''

منعم نے اپنی پگڑی اتار کر اس کے نیچے سے ایک تحریر نکالی جو پہلے انگریزی کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ داروغہ شاہ نور خان نے اپنی مہر کے اوپر ہندی میں راہداری لکھی تھی کہ حامل رقعہ ہمارا آدمی ہے اور نواب صاحب رامپور مدظلہ العالی کے کام پر مامور ہے۔ ایسی ہی تحریر سیدی اکرام کو بھی دی گئی تھی۔

منیر خان بجبر و اکراہ اور بہت بجھے ہوئے دل اور ڈوبی ہوئی امید کے ساتھ منعم کے ہمراہ چلا۔ داروغہ حمایت کی سرائے پر پہنچ کر شاہ نور خان کا سامنا ہوتے ہی وہ غش کھا کر گر پڑا۔ شاہ نور خان اور اس کے ساتھیوں نے شک کیا کہ یہ سب بنوٹ ہے، لیکن جب وہ دو گھڑی کے بعد بدن میں چٹکیاں کاٹنے اور منھ پر ٹھنڈے پانی کے چھڑکاؤ کے باوجود ہوش میں نہ آیا تو بید سیانے طلب کیے گئے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ دل پر اثر ہے۔ مختلف دواؤں اور جھاڑ پھونک کے بعد منیر خان کو ہوش آیا لیکن اس کا چہرہ زرد تھا، آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور رخسار پچکے ہوئے تھے، گویا اس کے دانت ٹوٹ گئے ہوں۔

شاہ نور خان نے مناسب جانا کہ اس وقت سرزنش و سرچنگ کے بجائے پیار اور چمکار سے کام لیا جائے۔ چنانچہ اس نے دھیرے دھیرے کر کے منیر خان سے اس کی پوری کہانی معلوم کر لی۔ اس پر جو گذری اس میں سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ منیر خان کے دل میں ڈر بیٹھ گیا تھا کہ ٹھگ لوگ دوبارہ کوشش کر سکتے ہیں اور ایسے وقت میں مرزا صاحب کے ساتھ میرا نہ ہونا بڑے رنج اور شرم کی بات ہو گی۔ سامنے جانا تو فی الحال ممکن نہ تھا، لیکن اس نے یہ کوشش رکھی کہ پا پیادہ ہونے کے باوجود وہ مرزا تراب علی کی راہ پر اس طرح چلے کہ ان سے چند ہی ساعت پیچھے رہے اور اگر کہیں وہ مرزا صاحب کے لئے کوئی خطرہ یا خوف محسوس کرے، یا اسے کسی بات پر کوئی شک پیدا ہو، تو وہ جلد از جلد مرزا صاحب کے قافلے تک پہنچ جائے۔ دوسری بات یہ تھی کہ برطرفی کے باوجود منیر خان کے دل میں موہوم سی امید تھی کہ شاید اسے آئندہ

جلد ہی معافی مل جائے۔ لہٰذا اس نے بھاری قدموں کے ساتھ لیکن ممکن تیز رفتاری کے ساتھ میرزا صاحب کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ یہ تو نہ کہہ سکا کہ وہ مرزا صاحب کے کتنے پیچھے تھا، لیکن قائم گنج کا سواد اسے دکھائی دینے لگا تھا جب اس نے دل میں سخت بےچینی اور دہشت محسوس کی، گویا اس کے پیچھے کوئی چل رہا ہو۔ اس نے بار بار چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھا، راہ سنسان پڑی تھی اور سورج زوال میں تھا۔ سائے ہر طرف لمبے ہو رہے تھے۔ اس نے تیز تیز قدم مارنا شروع کیا کہ غروب آفتاب کے پہلے پہلے قائم گنج پہنچ جائے۔

قائم گنج درحقیقت بہت دور نہ تھا اور وہ سورج ڈوبنے کے کچھ بعد وہاں پہنچ گیا۔ کہیں آرام کی جگہ ڈھونڈنے کے بجائے اس نے میرزا صاحب کے قافلے اور شاہ نور خان کے قافلے کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ اس کا دل خوف اور رنج سے خون ہو گیا جب اسے میرزا صاحب کی کوئی بھی خبر، ذرا بھی سن گن نہ ملی، نہ شاہ نور خان کے بارے میں کسی نے کچھ سنا تھا کہ وہ فرخ آباد بھی پہنچے کہ نہیں۔ خیر، شاہ نور خان کے بارے میں ابھی پریشانی کا سبب نہ تھا، لیکن میرزا صاحب...؟ انھیں تو یہاں سے گذر چکنا، یا سچ پوچھو تو یہاں موجود ہی ہونا چاہیئے تھا۔

رات ایک سرائے میں گذار کر منیر خان ہمت کر کے واپس بالہور کی سڑک پر چلا اور سہ پہر کے بعد وہاں سے بےنیل مرام لوٹتے ہوئے اس نے قائم گنج سے کچھ کوس پہلے پھر کل والی دہشت اور بےچینی محسوس کی۔ پہلے تو اس نے چاہا کہ ٹھہر کر چھان بین کروں کہ یہاں کیا ہے، یا کیا ہوا ہے، لیکن اس کی ہمت پھر جواب دے گئی۔ اس نے واپسی کا سفر جاری رکھا، لیکن رفتار اس بار ذرا دھیمی رکھی، کہ شاید کوئی سراغ دکھائی پڑ جائے۔ وہ کوئی آدھ کوس گیا ہو گا کہ دور میدان میں اسے کچھ سائے سے لہراتے نظر آئے۔ گھبراہٹ کے باعث اس کے پاؤں لرزنے لگے، اب اس نے تیز بھاگنا چاہا۔ لیکن اس سے نہ بھاگا جاتا تھا اور نہ ٹھہرا جاتا تھا۔ جی کڑا کر کے اس نے فیصلہ کیا کہ جانور ہوں گے، نہیں تو بھٹکے ہوئے مسافر ہوں گے۔ بھوت پریت تو مذہب اسلام میں ہیں نہیں، لیکن کیا معلوم جنات ہوں، بدروحیں ہوں؟ اور بڑکھا بڑ سناٹے میدان میں چور ڈاکو تو ہو نہیں سکتے۔ اس نے کئی بار آیت الکرسی پڑھی اور دل ہی دل میں ''یا غوث پاک'' کہتے ہوئے وہیں ٹھہر کر ان سایوں کو کچھ اور نزدیک آنے دیا...

اللہ رحم کرے، یہ تو میرزا صاحب کے جانور ہیں، اس نے دل میں کہا۔ دو گھوڑے تھے اور ایک خچر۔ تینوں کے بدن پر جگہ جگہ خراشیں تھیں، جیسے وہ سخت کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر بمشکل نکل پائے ہوں، یا... شاید درندوں نے ان پر حملہ کیا ہو۔ منیر خان کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

تیندوا ہوسکتا تھا یا شیر... لیکن شیر تو ادھر ہوتے نہیں شاید، اور چیتے کے تو کتوں جیسے پنجے ہوتے ہیں، وہ ناخون سے حملہ نہیں کرتا۔ تیندوا تو نہایت ہی چالاک اور کمینہ خصلت جانور ہے۔ وہ تو گھنٹوں گھات لگائے چپ چاپ پڑا رہ سکتا ہے، یا کسی گھنے پیڑ کی ڈالی پر چھپا رات پوری پوری گذار سکتا ہے کہ شکار پیڑ کے نیچے سے گذرے تو میں اوپر سے کود کر اس کی کمر توڑ دوں... اللہ بچائے۔ لیکن خیر ابھی تو روشنی تھی، ابھی اتنا خطرہ نہ تھا۔ جانور ابھی کئی ہاتھ کے فاصلے پر تھے۔ نزدیک آجائیں تو میں انھیں پکڑنے کی کوشش کروں۔ پر یہ جانور یہاں اور اس طرح کیسے؟ اگر مرزا صاحب کے قافلے پر جنگلی جانوروں نے حملہ کیا ہوتا تو بھلا کتنے جانور رہے ہوں گے؟ مرزا صاحب کے ساتھ تو برچھیت بھی تھے اور دگاڑے والے بھی تھے۔ کچھ تو خون خرابا ہوتا۔ کچھ تو نشان کہیں ہوتے یا کہیں کچھ تو خبر اڑی ہوتی... یہ تو ٹھگوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ ظالموں نے بے گناہ مسافروں کو ٹھکانے لگا کر ان کا مال لوٹ لیا ہوگا اور جانور کو تل چھوڑ دیئے ہوں گے۔

جانور اب نزدیک آگئے تھے۔ منیر خان نے پہچانا کہ ایک ان میں مرزا کی خاص سواری کا گھوڑا تھا، دوسرا سونپور میں خریدا ہوا تھا۔ خچر بھی پرانا لیکن اڑیل اور مشکل سے حکم ماننے والا جانور تھا۔ منیر خان بڑھا کہ تینوں کو اکٹھا سمیٹ لے، لیکن نیا گھوڑا بدک گیا اور اس کے ساتھ بوڑھا خچر بھی بھڑک کر ایک طرف کو نکل بھاگا۔ میرزا صاحب کے گھوڑے نے البتہ منیر خان کو پہچانا اور خود اس کے پاس آکر اس کی بغل میں منھ ڈال دیا۔ منیر خان نے اسے چمکارا، اپنے تھیلے سے گڑ کی ڈلی نکال کر اسے کھلائی اور اس سے بات کرنے لگا گویا وہ انسان کی بولی سمجھتا ہو اور جواب بھی دے سکتا ہو۔ گھوڑے کی حالت کا بغور معائنہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے آوارہ پھرتے کم سے کم دو دن ہوگئے ہیں۔ اللہ جانے اصل بات کیا تھی، لیکن اگر یہ ٹھگوں کی واردات نہیں تھی تو جناتی کارخانہ معلوم ہوتا تھا۔

وہ گھوڑے کو ساتھ لئے ہوئے قائم گنج آیا، لیکن اب اس کے دل میں یہ ڈر گھر کرنے لگا کہ اگر میرزا صاحب کا قافلہ ٹھگوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو اس گھوڑے کا میرے پاس سے برآمد ہونا مجھے اور بھی مشکوک بنا دے گا۔ لہٰذا جب تک کوئی بات پکی نہیں معلوم ہو جاتی گھوڑے کو چھپا دینا اور خود کہیں اور چھپ رہنا بہتر ہے۔ یہ سوچ کر اس نے گھوڑا ایک مقامی اصطبل میں کچھ رقم ادا کر کے رکھوا دیا اور کہا یہ کہ میرے مالک کا گھوڑا ہے، اچانک بھڑک کر بھاگ گیا تھا۔ اب میں اسے پکڑ لایا ہوں۔ میرے مالک شکار پر ہیں، ایک دو دن میں آجاویں گے، تب تک آپ گھوڑے کی حفاظت اور دیکھ بھال کریں۔ خود منیر خان نے ایک طوائف کے کوٹھے پر پناہ لی۔ طوائف سے اس کی کچھ آشنائی پہلے کی تھی۔

شاہ نور خان نے یہ پورا اظہار سیدیوں کی موجودگی میں سنا تھا اور اب ان سے مشورہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ منیر خان جھوٹ نہیں بول رہا تھا، بالخصوص جب کہ اس نے گھوڑا بھی برآمد کرا دیا تھا۔

''اگر حضور صاحب کو ٹھگوں نے قتل کیا ہے، اور اسی علاقے میں گاڑا ہے، تو آپ جان لیں کہ دو تین دن میں اللہ چاہے، ہم انھیں ڈھونڈ نکالیں گے۔'' سیدی منعم اور سیدی اکرام نے کہا۔

''پر سنا ہے ٹھگان اپنے مقتول کو اس طرح ٹھکانے لگاتے ہیں کہ زمین پر کوئی پتہ نشان ہی نہیں رہتا۔'' شاہ نور خان نے کہا۔

''سو تو ہے جناب جی۔ پر ہمن بھی اپنے کام میں پکے ہیں۔ آپ دیکھئے گا پتہ کیسے نہ لگے گا۔''

شاہ نور خان نے مناسب معاوضہ طے کر کے سیدی اکرام اور سیدی منعم کو نصف اس کا اسی وقت ادا کیا اور ان کے ساتھ پیدل چلا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے دیکھا کہ سڑک، میدان، درخت، جھاڑیاں، پھلیاں اور بیج جو جانوروں یا چڑیوں نے کھا کر یا کتر کر چھوڑ دیئے تھے، حتیٰ کہ جانوروں کا گوبر اور چڑیوں کی بیٹ، وہ تمام چیزیں جو اس کے لئے کوئی خاص معنی نہ رکھتی تھیں، سیدیوں کے لئے بچوں کی کتاب کی طرح تھیں جن پر موٹے موٹے حرفوں میں الف بے پے لکھا ہوا تھا۔ پچھلے کئی دنوں کے واقعات وہ یوں بیان کر رہے تھے گویا وہ قصے ہوں جو انھوں نے پہلے سے یاد کر رکھے تھے۔ پہلی بار وہ قائم گنج سے بلہور تک تیز تیز گئے، یعنی انھوں نے گھنٹہ بھر میں کوئی ایک کوس کا فاصلہ طے کیا۔ پھر بھی، جہاں جہاں انھیں شک گذرتا کہ یہ جگہ مزید تفتیش چاہتی ہے، وہاں تھوڑی دیر رک کر وہ سرخ کپڑے کا ایک ٹکڑا رکھ کر اس پر کوئی ہاتھ بھر کی گلی مضبوط گاڑ دیتے۔ واپسی میں وہ ہر مشکوک مقام پر ٹھہرتے اور دیر تک نشانات زمین کو دیکھتے، حالانکہ شاہ نور خان کو کچھ بھی علامت وہاں قافلے کے قیام یا انجام کی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس طرح انھوں نے دو جگہیں متعین کیں جہاں میرزا تراب علی کا قافلہ تھوڑی دیر کے لئے راہ میں ٹھہرا تھا۔

''تم لوگ یہ کیونکر کہہ سکتے ہو کہ نشانات یہ ہمارے ہی مالک کے قافلے کے ہیں جو تم نے دریافت کئے ہیں؟'' شاہ نور خان نے شک سے بھرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''سوں کھا کر تو ہم بھی نہیں کہہ سکتے میاں جی،'' سیدی منعم نے جواب دیا۔ ''لیکن ہماری بدیا کہتی ہے کہ یہاں جو قافلہ رکا تھا اس میں چار گھوڑے، چار خچر، اور سات آدمی تھے۔''

''خچر گھوڑے اور آدمی میں تم بھلا فرق کیسے کرتے ہو گے؟''

’’ہر ایک کی بو الگ ہوتی ہے۔ اور نشان بھی ان کے اٹھنے بیٹھنے کے الگ ہوتے ہیں۔ دیکھئے یہاں خچروں کے نشان ہیں، مٹ گئے ہیں لیکن پہچان میں آتے ہیں۔ خچر یہاں کچھ دیر ٹھہرے تھے اور ان کے اوپر کسی اور جانور کا نشان نہیں ہے۔ یہ ہمارے بھاگ کی بات ہے کہ بھوئیں بھی یہاں کچھ نرم ہے، نشان آسانی سے لے لیتی ہے۔‘‘

شاہ نور نے غور سے دیکھا تو واقعی اسے کچھ بالکل دھندلے نشان سم دکھائی دیئے، یا نشان سم کا وہم سا دکھائی دیا۔ اسے انکار کا چارہ نہ تھا کہ کچھ نہ کچھ تو وہاں تھا ضرور۔ اب اس کے دل میں کچھ امید جاگی کہ اس کے مالک کا کچھ پتہ نشان لگ جائے گا۔ لیکن کیا پتہ لگے گا؟ اس خیال سے اس کا دل ڈوبا جاتا تھا کہ کہیں یہ پتہ گور غریباں کی صورت میں نہ ہو۔

قائم گنج کوئی تین کوس تھا جب سیدی لوگ اپنی گاڑی ہوئی آخری گلی پر پہنچے۔ یہاں انھوں نے ایک بڑے قطعۂ زمین پر خط کھینچ کر مربع سا بنایا، پھر اس مربع کو انھوں نے چھوٹے چھوٹے مربعات میں تقسیم کیا۔ ایک طرف سے ایک سیدی اور دوسری طرف سے دوسرے نے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ کر ایک ایک مربع کو غور سے دیکھنا، سونگھنا، اور آہستہ آہستہ کریدنا شروع کیا۔ اس وقت ان کے چہروں پر اس قدر شدت کا ارتکاز اور ان کے جسموں میں ایسا تناؤ اور ہلکی ہلکی لرزش تھی گویا وہ انسان سے زیادہ بودار کتے ہوں۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے تک مربعات زمین کے ہر ہر انگل کو بغور دیکھتے، کریدتے، سونگھتے سونگھتے دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کوئی آٹھ دس ہاتھ کی دوری پر رک گئے اور نعرے کے انداز میں بولے، ’’وہ مارا! جمعدار جی، یہاں کھدائی کراؤ۔‘‘

شاہ نور خان اور اس کے ساتھیوں نے دونوں طرف سے کھدائی فوراً شروع کر دی۔ کوئی دو گھڑی کے اندر اندر گور گڑھا صاف نمایاں ہو گیا، اور اس کے اندر جو جسم محبوس تھے... شاہ نور خان اور اس کے ساتھی ابکائیاں لیتے ہوئے اور ’’یا اللہ توبہ! یا اللہ توبہ!‘‘ پکارتے ہوئے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئے۔ صرف دونوں سیدی اپنی جگہ پر جمے رہے۔ اوپر تلے آٹھ قریب قریب ننگی لاشیں، باہری کپڑوں سے مبرا، سب سے نیچے مظلوم آغا مرزا تراب کی لاش تھی۔ دوران خون اور سلسلۂ تنفس بند ہو جانے کے باعث سب کے بدن پہلے تو اکڑ گئے تھے، اور پھر چوبیس گھنٹے یا اس سے زیادہ مدت گذرنے کے بعد دوبارہ نرم پڑ گئے تھے۔ لیکن اکڑن کے زمانے میں جگہ کی تنگی کے باعث سب لاشیں کچھ نہ کچھ شکستہ اور مسخ شدہ ہو گئی تھیں۔ بعض کے جبڑے ٹیڑھے ہو کر پھر سیدھے نہ ہوئے تھے، بعض کی آنکھیں کھلی رہ گئیں تھیں، بعض کی پشت،

بعض کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو کر رہ گئے تھے۔ سب کی زبانیں سیاہ باہر نکلی ہوئی، کچھ کی ناک سے، اور ایک کے ناک کان دونوں سے خون بہ کر جم گیا تھا لیکن کہیں کہیں مٹی میں ملی ہوئی کسی خراب شے کے باعث جمنے کے پہلے سڑنے لگا تھا۔ بعض کو عالم سکرات میں اپنے جسم پر قابو نہ رہا تھا اور انھوں نے اپنے کو گندہ کر لیا تھا۔ گڑھے پر سے مٹی پوری طرح ہٹنے کے پہلے ہی بدبو کے بھبکے آنے لگے تھے اور جب لاشیں پوری طرح کھل گئیں تو خون اور بدن میں مقید ریاح اور باہر کی غلاظتوں کی بدبوئیں مل کر ناقابل برداشت ہو گئی تھیں۔

شاہ نور خان نے گھبرا کر چاہا کہ لاشوں کو وہیں دوبارہ توپ دے، یا ان پر کچھ ترپال یا بھاری کپڑا وغیرہ اوڑھا دے۔ لیکن ذرا سے تامل نے اس پر ظاہر کر دیا کہ ایسا کرنا خلاف صلاح تھا۔ سیدیوں نے بھی اس کی طرف کچھ اس طرح دیکھا گویا توقع کر رہے ہوں کہ ان لاشوں کے مناسب کفن دفن کا انتظام جلد کیا جائے گا۔ اس نے سیدی منعم سے، کہ وہ دونوں میں معمر تھا، پوچھا :

"کیا انھیں یہیں دفن کر دیا جائے؟"

منعم نے سر ہلایا۔ "جمعدار جی۔ ابھی تو لاشیں خراب نہیں ہوئی ہیں، مل ہوا لگ کر فوراً ہی بگڑنے لگیں گی۔ مطلب یہاں گاڑنے کا یہ ہے کہ آپ کو بہت کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ کئی تگاڑے پانی، کئی تھان کفن، قبر کھودنے والے، جنازہ پڑھانے والا... ان چیزوں کا سینتاؤ کرتے کرتے بہت سماں نکل جائے گا، بدن بگڑ جائیں گے۔"

"تو کیا کروں، انھیں کسی طرح اٹھا لپیٹ کر رامپور لے جاؤں؟"

"نہ۔ نہ۔ میں یہ تھوڑی کہہ رہا ہوں... اس طرح تو جب آپ رامپور پہنچیں گے تو لاشیں نہیں سڑے گلے ٹکڑے ہی پہنچیں گے۔ آپ کسی کو بھیج کر فوراً قائم گنج سے کئی تھان کورا لٹھا اور چار پانچ پالکیاں منگوائیے۔ ساتھ ہی ساتھ قبرستان کوئی اور آدمی جا کر انتظام مردوں کے نہوانے اور قبروں کے کھدوانے کا کرے۔ جب تک قبریں تیار ہوتی ہیں اتنے وہی آدمی جنازے کی نواج کے لئے ملانے کا بندوبست کر لے گا۔ ادھر آپ لاشوں کو لٹھے میں اچھی طرح لپیٹ پالکیوں میں ڈال قائم گنج قبرستان لے چلیں۔"

"جی بات تو سیدی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" شاہ نور کا ایک ساتھی بولا۔ "اس طرح رات پڑتے پڑتے سب کام ہو جاویں گے ان شاء اللہ۔"

شاہ نور خان اور اس کے ساتھیوں نے اب تک اپنے اوپر قابو رکھا تھا۔ لیکن مردے جب قبر

میں اتارے جانے لگے تو اسے بے اختیار رونا آ گیا۔ ہائے کیا بے کسی کی موت تھی کہ گھر والوں میں کوئی بھی نہ تھا کہ آخری منزل تک دیکھ بھال کے پہنچا دیتا۔ وہ تو کہیئے کہ مولا کے کرم سے ایک شیعہ صاحب بھی نماز جنازہ پڑھنے والوں میں شریک ہو گئے تھے، انھوں نے آغا میرزا صاحب کے لئے جواب نامہ مہیا کر کے ان کے کفن میں رکھوا دیا اور امامیہ طریقے کی دعائیں جیسی ان سے بن پڑیں پڑھ دیں۔ بقیہ مردے اہل سنت والجماعت کے تھے۔ جب آخری دیدار کا وقت آیا تو منیر خان ڈھاڑیں مار مار کر رویا کہ میرے مالک مجھ سے خفا گئے ہیں، میں کیسے ان کو منھ دکھاؤں۔

تدفین کے دوسرے ہی دن شاہ نور خان اور ان کے ساتھی اپنے جانوروں کے ساتھ، اور منیر خان آغا میرزا صاحب مرحوم شہید کے گھوڑے کو لے کر عازم رامپور ہوئے۔ کوچ کرنے کے پہلے شاہ نور خان نے کوتوال قائم گنج کو منیر خان کا، دونوں سیدیوں کا، اور اپنا مکمل اظہار لکھوا کر التجا کی تھی کہ ہمارے مالک اور ان کے نوکران کے ظالم قاتلوں کا پتہ لگا کر انھیں سولی دی جائے۔ لوٹا ہوا سامان ہمیں درکار نہیں، جو کچھ برآمد ہو سکے وہ سب کچھ کوتوالی کے ان بہادر دوڑ والوں کو انعام میں دے دیا جائے جن کے ہاتھوں مجرمان نابنجار کی گرفتاری عمل میں آوے۔ کوتوال نے وعدے تو بہت کئے، لیکن اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی جھلک اتنی نمایاں تھی کہ کسی کو ان وعدوں پر اعتبار نہ آیا۔ بلکہ یوں کہیں کہ اگر دونوں سیدی معتبر اور معروف شخص نہ ہوتے تو کوتوال خود شاہ نور اور ان کے ساتھیوں کو مقدمہ قتل میں ماخوذ کرنے کے بارے میں غور کر سکتا تھا۔

بداؤں اور آنولہ کے کچھ حصے نام کے لئے لکھنؤ کی شاہی عملداری میں، اور کچھ برائے نام بادشاہ دہلی کی عملداری میں تھے۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ یہاں انگریزوں کا راج تھا اور کمشنر بریلی کا حکم سارے میں چلتا تھا۔ صاحبان انگریز نے جگہ جگہ پلس تھانے اور چوکیاں قائم رکھی تھیں۔ ایسی پہلی ہی چوکی پر شاہ نور خان نے مفصل اظہار اپنا لکھوایا اور یہاں بھی وہی درخواست درج کرائی کہ جان کمپنی بہادر اپنے اقبال کو کام لا کر مجرمان ظالمان کو جلد از جلد پکڑ کر سولی دلوا دے۔ جو پلسدار قاتلوں کو پکڑے گا اسے قرار واقعی بخشش نواب صاحب بہادر رامپور کی سرکار سے عطا ہوگی۔

پانچویں دن کی شام کو سوگواروں کا یہ قافلہ رامپور پہنچا۔ اس رات رامپور کے کئی گھروں سے تا دیر نالہ و شیون بلند ہوتا رہا۔ کئی گھروں میں کوئی سویا نہیں۔ وزیر کو سکتہ سا ہو گیا، وہ ساری رات دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے رہی کہ میرے آغا صاحب آتے ہی ہوں گے۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ اس کی چوڑیاں کب ٹھنڈی کی گئیں اور کب اسے سفید دوپٹہ اڑھایا گیا۔

بہار باغ تو یوں ہی رہی لیکن...

۱۸۴۴ء، شہر رامپور، نواب سید محمد سعید خان کا دور سعادت نشان و اقبال آسمان، سج دھج میں، بازاروں کی چہل پہل میں، رونق بزم و کوچہ و برزن میں، محافل ذکر و مکاتب فکر میں، حلقہ ہائے درس و تعلم میں، انجمن آرائی، شعر گوئی و داستاں سرائی میں، رامپور رشک دہلی و لکھنؤ بنا چاہتا تھا۔ بس گنجان آبادیوں کے لحاظ سے لکھنؤ اور عمارات کے حسن و وسعت کے لحاظ سے دہلی ابھی بہت آگے تھے۔ نجیب الدولہ اور نواب فیض اللہ خان اور حافظ الملک کے زمانوں میں تعمیر کی ہوئی روہیلوں کی عمارات نجیب آباد، بجنور، میران پور کٹرہ، سہسوان، بداؤں اور بریلی میں کچھ اچھے احوال میں اور کچھ شکستہ حال میں عظمت و شوکت رفتہ کے قصے زبان حال سے پڑھ رہی تھیں۔ ترقی پذیری، امن و امان، مرفہ الحالی اور چمک دمک کے اعتبار سے قرب و جوار کے تمام شہر، آنولہ، سنبھل، امروہہ، حسن پور، شاہ آباد، حتیٰ کہ مراد آباد اور بریلی بھی رامپور کے آگے ماند پڑتے نظر آتے تھے۔ نواب فیض اللہ خان عرش منزل کے وقتوں (۱۷۷۴ تا ۱۷۹۴) سے ہی پورا رامپور دارالامن و دارالعلم بن گیا تھا۔ دور دور سے مختلف قومیتوں کے لوگ یہاں آنے اور آباد ہونے لگے تھے۔ منولال مورخ رامپوری کے قول کے مطابق رامپور میں کوئی پانچ سو علما و فضلا اس وقت ایسے تھے جنھیں خزانۂ ریاست سے مشاہرۂ معقول ملتا تھا اور سرکاری خدمت کی کوئی شرط نہ تھی۔ انھیں آزادی تھی کہ سرکاری مدرسے میں پڑھائیں یا اپنی قیام گاہوں پر علم کے پیاسوں کی تشنگی بجھائیں۔ اصفیا و اتقیا میں دہلی اور بیرون ملک سے آکر یہاں رہ جانے والوں میں حافظ جمال اللہ، شاہ درگاہی، شاہ بغدادی، شاہ جمال الدین، کے سوا بھی کئی نامی ہستیوں نے رام پور کو اپنے قدوم بابرکت سے سرسبز و پر میمنت کیا۔ نواب عرش منزل کے بنا کردہ کتب خانے اور مدرسے نے بہت شہرت پائی۔ کتب خانے کو بعد میں ''رضا لائبریری'' اور مدرسے کو بعد میں ''مدرسۂ عالیہ'' کہا گیا۔ نواب فیض اللہ خان نے بحرالعلوم ملا عبد

العلی فرنگی محلی اور ملا محمد حسن فرنگی محلی کو لکھنو سے بلوا کر مدرسے میں معلم اور صدر معلم مقرر کیا۔ جلد ہی رامپور میں ممالک غیر کے بھی طلبا تحصیل علم وکمال کے لئے آنے لگے اور رامپور کو عموماً بخارائے ہند کہا جانے لگا۔ نواب عرش منزل کو شعر وسخن سے کچھ طوع نہ تھا۔ یہ کمی ان کے چھوٹے بھائی نواب محمد یار خان المتخلص بہ امیر نے ٹانڈہ میں اپنے چھوٹے سے دربار میں پوری کردی تھی۔ قائم، مصحفی، قدرت اللہ شوق، فدوی لاہور، کبیر علی کبیر سنبھلی جیسے کملائے روزگار وہاں چند مدت کے لئے جمع ہوگئے تھے۔

سقوط ٹانڈہ وآنولہ نے محمد یار خان امیر کے ارکان بزم کو اوراق خزانی کی طرح منتشر کردیا تو نواب عرش منزل نے محمد یار خان کو رامپور بلوالیا۔ ان کے ساتھ استاد قائم چاند پوری، کبیر علی کبیر سنبھلی اور فلک آنولہ کے کچھ دوسرے ستارے بھی رامپور آرہے اور یہیں کے ہو رہے۔ نواب احمد علی خان رند کا طویل دور حکومت یوں بہت قابل ذکر نہ تھا لیکن علم اور شعر وشاعری کا چرچا رامپور میں ویسا ہی رہا، بلکہ روز افزوں ہوا۔ نواب سید محمد سعید خان اگرچہ مذہباً لکھنو کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے لیکن انھوں نے رامپور کو لکھنو کا ضمیمہ بنانے کے بجائے ایک الگ رامپوری رنگ کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس رنگ میں مغل آب وتاب اور صولت وجزالت کی جھلک زیادہ تھی، لکھنو کی باریکیوں اور مذہبی تقشف کا پرتو کم از کم تھا۔

یہ سب تھا، لیکن آغا میرزا تراب علی کی بے وقت موت پر نالہ کناں ہونے والی وزیر خانم، ان کی بلبل شیدا، وہ گل گلزار محبوبی اور معنبر کن شبستان مہر وولا اور معطر کن حدیقۂ عاشقی ومعشوقی، رام پور میں نہ تھی۔ آغا تراب علی کے بعد ان کی حویلی جو انھیں نواب کی طرف سے ملی تھی، حسب قاعدۂ قدیم دربار نوابی کی ملکیت میں واپس چلی گئی تھی۔ آغا تراب علی کے قریبی متعلقین میں صرف ایک بیوہ بہن اور بوڑھی بیوہ پھوپی تھیں۔ وزیر بھی اپنا بچہ لے کر ان کے ساتھ آغائے مبرور کے پرانے گھر میں منتقل ہوگئی۔ نواب مرزا نے بہتیرا چاہا کہ ماں کے دامن سے لگے رہیں، لیکن آغا مرزا تراب علی مرحوم کے چھوٹے سے آبائی گھر کو دیکھ کر وزیر نے سخت اصرار کیا کہ آپ اپنی منجھلی خالہ کے پاس چلے جائیں اور وہیں رہیں۔ قدیم طرز کی اینٹوں اور گچ سے بنے ہوئے اس گھر میں تنگ سی ڈیوڑھی کے آگے آنگن تھا جس کے دو طرف دو دو حجرے، یا کمرے تھے اور سامنے ایک دالان اور پھر سہ دری۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف ایک ایک باورچی خانہ اور جائے ضرور، کل اتنی ہی مکانیت تھی۔ آنگن میں چمن، کنویں، نہر، یا حوض کا کوئی مذکور نہ تھا۔ پانی کے لئے دوسرے عام گھروں کی طرح بہشتی مقرر تھا جو کوسی ندی کا پانی صبح وشام لاکر بھر دیا کرتا تھا۔

زندگی نے فوراً اپنا رنگ بدل لیا تھا۔ نوکروں، ماماؤں کی وہ کثرت نہ تھی، دروازے کی بہل، رتھ، گھوڑے، پالکی، سب پرانی حویلی کے ساتھ چھٹ گئیں۔ تعزیت کے دنوں اور سوئم، چہلم کی مجلسوں کے سوا آنے جانے والوں کا تانتا ٹوٹ کر برائے نام رہ گیا۔ حبیبہ اور راحت افزا کا ساتھ نہ ہوتا تو وزیر شاید کنویں میں کود کر جان دے دیتی۔ ایک تو آغا صاحب کی موت کا غم، اور موت بھی کیسی موت، گویا مرنے والوں کا خدا ہی نہ تھا یا مارنے والوں کو موت ہی نہ آنی تھی، اور تس پر ننھے بچے کا پالنا پوسنا، جس کے لئے اب دائی کھلائی یا ماما چھوچھو جیسی کوئی نوکرانی نہ تھی، اور پھر سسرال کی بیوہ نند اور پھوپھیا ساس کی چشم نمائیاں اور اشاروں کنایوں میں بار بار یہ ظاہر کرنا کہ چھوٹی بیگم ان کی نظر میں آغا صاحب کی منکوحہ تو کیا، ممتوعہ کا بھی درجہ نہ رکھتی تھی۔ بجا کہ وہ آغا صاحب کی نکاحی بیوی تھی لیکن، پھوپھیا ساس کے بقول، ایسیوں کے نکاح کیا اور ان کے ساتھ قول و قرار کیا، اور ان بنو کا تو حال ہی دیگر تھا۔ جس کا ہاتھ انھوں نے پکڑا اسے پھر ملک الموت نے سیدھا جا پکڑا۔

وزیر کو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ یہاں اب اس کا رہنا بہت دیر تک نہ ہوگا۔ وہ یہ بھی جان رہی تھی کہ راحت افزا کی جدائی بھی اب زیادہ دیر ٹل نہیں سکتی۔ شریف گھرانوں کی بیٹیوں کے حساب سے تو اس کی شادی کی عمر نکل چکی تھی، لونڈی باندی، اصیل اور خواص کے اعتبار سے بھی اب اس کی عمر قریب قریب جا ہی چکی تھی اور کچھ مدت بعد تو اسے گھر میں ڈال لینے والا بھی کوئی نہ ملتا۔ حبیب النسا نے وزیر کی محبت سے مغلوب ہو کر اب تک بیٹی کی شادی کے لئے زور نہ دیا تھا، لیکن اب جب وزیر خانم خود بے ٹھکانے ہوئی جاتی تھی، راحت افزا کا انتظام اشد ضروری ہو گیا تھا۔ راحت افزا کی صورت شکل اور سگھڑاپے کے باعث اس کے لئے اچھا بر ملنا غیر ممکن نہ تھا، شرط صرف حبیب النسا اور وزیر خانم کی رضا مندی، اور نو بیاہتا جوڑے کے لئے رہنے سہنے کے لئے گھر اور اثاث البیت کے مناسب انتظام کی تھی۔ وزیر نے اپنی فراست سے سمجھ لیا تھا کہ حبیب النسا از خود اب بھی کچھ نہ کہے گی، لہٰذا اس نے مناسب موقع دیکھ کر حبیبہ سے کہا کہ عدت کے دن گذارتے ہی وہ راحت افزا کے لئے سامان شادی کی فکر شروع کر دے گی اور مناسب لڑکا ڈھونڈنے میں بھی اس کی مدد کرے گی۔

''میرا بس چلتا تو میں راحت افزا کو کبھی اپنے سے جدا نہ کرتی اور اس کے میاں کو گھر جوائی بنا کر رکھ لیتی۔ لیکن...''

''خانم صاحب،'' حبیبہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''راحت افزا کے لئے آپ پہلے ہی دن

سے باپ، ماں، فرشتۂ رحمت، سب کچھ تھیں۔ کاشکے آپ کی تقدیریوں ٹیڑھے قلم سے نہ لکھی گئی ہوتی۔ خیر میں تو آپ کے قدموں سے لگی ہی رہوں گی... لیکن...'' اب اس کے آنسو پھوٹ بہے، ''راحت افزا کی جدائی کیسے برداشت ہوگی؟''

''ہمت سے کام لو حبیبہ۔'' وزیر کے لہجے میں استقامت آمیز غم آلودگی تھی۔ ''اگر حالات صحیح ڈھب کے ہوتے تو راحت افزا کبھی کی بیاہ گئی ہوتی۔ اب اور دیر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہاں کا رنگ تم دیکھ ہی رہی ہو...''

''تیرہ صدی ہے خانم صاحب۔ جو نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ لیکن...''

''ابھی تو مجھ دکھاری کے خانہ قید کے ایام ہیں، پتہ نہیں ان کے گذر جانے پر یہ میرزا بیگمائیں کیا کیا فیل مچائیں۔''

''مجھے تو ان کے لچھن نہ ان کے سبھاؤ کچھ بھلے لگتے ہیں۔ اللہ جانے ہمارے آغا صاحب کو انھیں کی نظر کھا گئی...''

''توبہ کرو حبیبہ۔ توبہ کرو۔ کوئی اپنے وارث کو بری نظر سے کیوں دیکھے گا۔ ان دونوں کا تو سارے جہان میں کوئی اور ہاتھ تھامنے والا نہ تھا۔''

''سہی۔ لیکن اگر آغا صاحب سے ان کو لگاؤ تھا تو آپ سے لاگ کیوں ہو؟ آپ آغا صاحب سے الگ تو تھیں نہیں۔''

''تھی بھی، اور نہیں بھی تھی۔'' وزیر خانم نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ''ایک تو میں غیر کفو، دوسرے غیر مذہب، اور تیسرے یہ کہ بالکل باہر والی اور... اور بدنام الگ۔''

''یہ بدنامی اور نیک نامی آپ کیا لے بیٹھیں۔ نواب شمس الدین شہید کے ایک ناخن پا پر ان جیسوں کو قربان کروں، کوئی آپ کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے تو اس کی ہی پھوٹیں۔ انسان کی نیک نامی اس کی انسانیت سے ہوتی ہے۔ بڑی آئی ہیں گنوں نہ گوتھوں میں دولہے کی خالہ۔''

''چھوڑو تم یہ ایران توران کی کہانیاں۔ اول بات کی اول فکر ضروری ہے۔ راحت افزا کے لئے کوئی لڑکا تمھاری نظر میں ہے؟''

حبیب النسا سوچ میں پڑ گئی۔ بڑی دیر تک سر جھکائے رہنے کے بعد وہ دبے پاؤں اٹھی، جس حجرے میں وہ دونوں بیٹھی تھیں، اس کا دروازہ تیغا کیا، پھر واپس آ کر وزیر کے زانو سے زانو قریب ملا

کر زمین پر بیٹھ گئی۔

''کیوں کیا ہوا حبیبہ؟'' وزیر نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں،'' حبیب النسا نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے خیال سا ہوا کہ آپ کی پھوپھیا ساس جی کہیں پاس ہی میں کان لگائے بیٹھی ہیں۔''

''توبہ، تمھارے بھی وہم کیا ہیں ہندنیوں کے توہم ہیں کہ وہ ہر گھنے پیڑ پر برم راکھس کی چھایا دیکھتی ہیں۔ خیر کہو تو سہی، کوئی بات دھیان میں آئی ہے کیا؟''

''جی وہ جو شاہ نور خان ہیں نہ، ہمارے مرحوم آغا صاحب کے خریدے ہوئے جانوروں کو سونپور سے لائے تھے...''

''ہاں، تو پھر؟''

''جی وہ میرے مرحوم کے گھر کے ہیں، میرٹھ کے۔ یہاں کے نہیں ہیں۔''

''یعنی اعتبار کے لوگ ہیں۔ خوب، تو ان کے یہاں کوئی رشتہ ہے؟''

''ایک بار ان کی خالہ جی آئی تھیں، اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ گئی تھیں۔ لیکن اس وقت سماں اور تھا۔ میں نے بھی اشارے اشارے میں انکار کر دیا تھا۔''

''دوبارہ بات شروع کی جائے، یہی تمھاری مرضی ہے؟ اور راحت افزا؟''

''اللہ میری توبہ۔ راحت افزا کا کیا مذکور ہے۔ جو آپ کہیں گی، جو میں چاہوں گی وہی ہوگا۔''

''نہ، نہ، اس کی مرضی لینا ضرور ہے۔''

حبیب النسا کے چہرے پر ذرا سا انقباض دوڑا، لیکن اس نے بات ٹال کر کہا:

''ادھر چند دن ہوئے شاہ نور خان کی ایک رشتے کی بہن مجھے عمدہ خانم صاحب کے یہاں ملی تھیں، کہنے لگیں، ہماری خالہ جی ہمارے بھائی کے لئے رشتے دیکھ رہی ہیں۔ مجھے لگا کسی مطلب ہی سے انھوں نے ایسا کہا ہوگا۔''

ہاں، بات تو دل کو لگتی ہوئی ہے۔ تو تم نے کچھ پوچھ گچھ کی؟''

''نہیں، ابھی کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ آپ سے پوچھے بغیر کچھ کہتی یا کرتی، میری کیا مجال۔''

''خیر اب دیر نہ کرو۔ مگر چھان بین کر لینا۔ میں بھی منجھلی باجی سے بات کروں گی۔ صحیح پتہ لگانے میں ان سے امداد ملے گی۔''

کچھ دنوں بعد عمدہ خانم اور دوسرے ذرائع سے پورا پتہ لگ گیا کہ لڑکے والے شریف پٹھان ہیں، گھر میں باپ ماں کوئی نہیں، ایک بیوہ بوڑھی بہن ہے، سگی نہیں بلکہ رشتے کی۔ وہ اور اس کا نابینا بیٹا شاہ نور خان کی کفالت میں ہیں۔ خود شاہ نور خان ایک بیوی کو طلاق دے چکے ہیں۔ مطلقہ بیوی سے ایک لڑکی ہے جس کی عمر اب کوئی بارہ پندرہ سال ہوگی۔ وہ اپنے باپ ہی کے یہاں رہتی ہے۔ شاہ نور خان یہی کوئی چالیس کے پیٹے میں ہوں گے، حضور نواب صاحب بہادر کے فیل خانے میں بیس پچیس برس سے نوکر ہیں۔ یافت اچھی ہے، دو وقت کی روٹی آرام سے چل جاتی ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق دینے کی وجہ بیوی کی بدمزاجی اور جھگڑالو پن بتایا گیا۔ کہا گیا کہ اسے اپنی بیوہ بوڑھی نند اور اس کا بے بصارت بیٹا ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ عمومی حیثیت سے تو رشتہ ٹھیک معلوم ہوتا تھا۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ دولہے کا گھرانا کچھ لمبا چوڑا نہ تھا اور ساس سسر کے ساتھ نباہ کرنے کا کوئی معاملہ تھا ہی نہیں۔ رہی بیوہ بہن اور اس کا بیٹا، تو وہ نادار رشتہ داروں کی طرح دولہے کے یہاں مقیم تھے، ان کے ساتھ کسی قسم کی آویزش یا تنافرذات کا امکان نہ تھا۔

''لڑکے کا اصل سبھاؤ کیسا ہے، لوگ کیسے ہیں، یہ تو کچھ دن ساتھ رہنے برتنے سے ہی معلوم ہوگا۔'' عمدہ خانم نے وزیر سے کہا۔ ''آدمی جانے بسے سونا جانے کسے۔ لیکن بظاہر تو نسبت ٹھیک ہی لگتی ہے۔ باقی اللہ مالک ہے۔''

شادی کی بات عیب کی طرح ہوتی ہے، کتنا ہی چھپاؤ چھپتی نہیں، اور خاص کر ان لوگوں کو ضرور اس کا پتہ لگ جاتا ہے، یا پتہ نہیں تو سن گن ہی لگ جاتی ہے جن کی طرف سے مخالفت یا اڑچن کا اندیشہ ہو۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ شاہ نور خان کے گھر والوں تک حبیبہ کی طرف سے اشارہ پہنچتے ہی پہنچتے وزیر کی نند نور فاطمہ اور پھوپھیا ساس امیر النسا بیگم کو خبر لگ گئی۔ پھوپھیا ساس نے اسی دن وزیر کو اپنے حجرے میں بلوا بھیجا اور کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا:

''دیکھیے چھوٹی بیگم ابھی آپ کی عدت پوری نہیں ہوئی ہے، آپ کو شادی منگنی کی بات کرنا زیب نہیں دیتا۔''

وزیر کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ اس نے ذرا تیز لہجے میں کہا:

''میں سمجھی نہیں کہ کس نسبت یا بیاہ شادی کی بابت آپ کو یہ اوہام دامنگیر ہیں۔ آپ...''

''یہ راحت افزا...'' امیر النسا بیگم نے وزیر کی بات کاٹ کر کہا۔

وزیر نے بھی قطع کلام کیا اور بولی: ''آپ کو اس طرح بات کرنا سہاوتا نہیں پھوپھی جان۔ بے باپ اور بے سہارا بچی کے دو بول پڑھوا کر اسے گھر گھاٹ لگا دینا تو آپ کے یہاں بھی ثواب کا کام ہو گا۔''

''عذاب ثواب کی بات ملاں مجتہد جانیں ہوں گے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ تمھیں سوچو۔ تمھیں عدت اور رنڈاپا کس طرح گذارنا ہے؟''

''میں کیا خدا نہ خواستہ اپنے نکاح بیاہ کا سلسلہ کر رہی ہوں؟ یہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟'' فرط برہمی سے وزیر کی آواز بھرانے لگی تھی۔

''اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔ تم تو ان کوچوں میں خوب کھائی کھیلی ہو۔'' نور فاطمہ نے زہر خند کے ساتھ کہا۔ اپنے مرحوم بھائی کی اکلوتی، اور وہ بھی چھوٹی بہن ہونے کی وجہ سے اس کی زبان بہت کھلی ہوئی تھی اور روز وزیر کا گھر میں آنا اسے سب سے زیادہ شاق بھی گذرا تھا۔

وزیر نے یہ کہتے ہوئے اٹھ کر دروازے کا رخ کیا کہ ''آپ لوگوں کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے...'' لیکن ساس نے اپنی آواز کچھ بلند کر کے کہا:

''ہم گھر میں بیٹھنے والیاں تم لوگوں جیسی شائستگی کہاں سے لاویں گے، لیکن چھوٹی بیگم، اتنا سمجھ لو کہ اس دروازے پر کسی سیکس فیلوان کی بارات کبھی آئی ہے اور نہ اب ہی آوے گی۔''

''یہ دروازہ میرا نہیں ہے کیا؟'' وزیر پلٹ کر بولی۔

''اے سبحان اللہ۔ کبھی کنویں میں جھانک کر منھ تو دیکھا ہوتا۔ میرے ماں جائے کی اولاد، کھرا سید نجیب الطرفین، تم نے کوئی برکی ڈال دی ہو گی کہ چندے ہوش کھو بیٹھا۔ میرا بھتیجا لے آیا تو اب ستونتی ہو کر بیٹھی ہو ورنہ تم کہاں اور یہ چوکھٹ کہاں۔''

''جی بہت خوب۔ لیکن لائی تو میں نکاح کر کے گئی تھی، اور آپ کے لاڈلے بھتیجے کا بیٹا میرے ہی پیٹ کا پیدا ہے۔ وہ نہ ہو تو آپ کی ساری نجیب الطرفینی دھری رہ جائے۔ آپ کے باپ دادا کا نام چلے گا تو اسی سے چلے گا۔''

''اس کو ہم الگ سے سلٹ لیں گے۔ تم پہلے اپنی عدت پوری کرو چھوٹی بیگم۔ اور حبیب النسا کو تو ہم کھڑے کھڑے نکال باہر کریں گے۔ اس سے کہہ دو کہ اس خیال میں نہ رہے کہ اس کی بیٹی کا ڈولا اس گھر سے اٹھے گا۔''

''حبیب النسا اور اس کی بیٹی کے باب میں بولنے کی زحمت آپ نہ کریں امیر النسا بیگم۔ دہلی اور رامپور دونوں جگہ میرے گھر ہیں۔ آپ کے ماں جائے کا مرحوم بیٹا مجھے ہزار منتوں سے لایا تھا ورنہ میری جوتی بھی یہاں نہ آتی۔'' وزیر نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ جیسیوں سے تو میں چوکی پر لوٹا بھی نہ رکھواتی۔ غضب خدا کا جس کا آشیاں خود ہی شکستہ شاخ پر ہو وہ دوسرے کو بے گھر کرنے کی دھمکی دے۔ راحت افزا کی بارات آئے گی اور یہیں آئے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ڈوپٹہ کمر پر کس کے باندھا۔ شربتی آنکھیں گہری سیاہ، چہرے پر وہی تیج جس نے کبھی نواب شمس الدین احمد کی جرأتیں پست کر دی تھیں، وہ کمرے سے باہر چلی گئی لیکن دونوں عورتوں کو وہ حجرہ بہت دیر تک اس کی موجودگی سے لبریز محسوس ہوتا رہا۔

کمرے سے باہر آتے ہی وزیر خانم نے پرچہ بھیج کر منجھلی کو بلوایا اور اسے پوری بات بتائی۔

''ابھی تو راحت افزا کی نسبت ٹھہری نہیں ہے، لیکن اس جگہ نہیں تو اور کہیں نہ کہیں ٹھہر ہی جائے گی۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ یہ دونوں بیوائیں اپنے دل کی کڑواہٹیں اس بچاری پر انڈیلیں، اس کی تذلیل کریں اور مجھے بھی خوار کریں۔'' وزیر نے اپنے عام، ٹھنڈے، متین لہجے کے برخلاف انتہائی شدت اور جوش سے کہا۔ ''شادی تو میں یہیں سے کروں گی، آخر یہ گھر میرا بھی ہے۔ لیکن پھر میں یہاں رہوں گی نہیں۔''

''وہ تو کوئی بات نہیں۔ میرا گھر موجود ہے، عدت کے بعد تم جب چاہو اٹھ آؤ۔'' منجھلی نے کہا۔

''نہیں منجھلی باجی، میں دلی میں رہوں گی۔ میرا گھر تو وہاں ہے ہی، اجڑا بجڑا سہی۔ فقیر کو کمبل ہی دوشالہ ہے۔ لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ اول بات یہ ہے کہ مجھے تمھاری، تمھارے نواب کی، اور بندگان عالی کی پشت پناہی درکار ہے۔''

''میں اور میرے نواب صاحب تو بے شک تمھارے پشتیبان ہیں، جیسے کہ پہلے تھے۔ اعلیٰ حضرت کا ذمہ میں نہیں لے سکتی، لیکن کوشش میں کمی نہ ہوگی۔ میں آج ہی اپنے نواب صاحب سے تذکرہ کروں گی۔'' عمدہ خانم نے جواب دیا۔

کچھ دن تک کوئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی، لیکن راحت افزا کے لئے شاہ نور خان کے گھر والوں سے بات تقریباً پکی ہو گئی۔ تاریخ، مہر، براتیوں کی تعداد، اور دیگر تفصیلات طے ہونا باقی تھیں۔ امیر النسا بیگم اور نور فاطمہ نے وزیر خانم سے بالکل کنارہ کر لیا تھا، حتیٰ کہ اپنے کھانے پینے کے برتن باسن بھی

الگ کر لئے تھے۔ چھوٹا سا گھر، ایک کا دوسرے کے پاؤں تلے آنا لازمی تھا، لیکن وزیر نے اپنے برتاؤ کو ہمیشہ سبک اور شیریں رکھا، ہر چند کہ امیر النسا بیگم یہ جتانے کا کوئی موقع نہ چھوڑتی تھیں کہ وزیر کا وجود ان کے لئے مقبول نہیں، اور راحت افزا کو تو اگر سانپ ڈس لیتا یا بجلی اسے جلا کر خاک کر دیتی تو امیر النسا گھی کے چراغ جلاتیں۔ یہ بات بھی ساس نند نے واضح کر دی تھی کہ راحت افزا کی بارات عرش معلیٰ پر آ کر ٹھہرے یا بازار میں عین چوراہے پر قیام کرے، لیکن ان کے گھر پر اس کا اترنا غیر ممکن تھا۔

وزیر کی عدت کے دن ختم ہوئے، راحت افزا کی تاریخ بھی ٹھہر گئی اور سانچق مہندی بارات رخصتی کے انتظامات بھی زور پکڑنے لگے لیکن شادی کے رقعے تقسیم نہ ہو سکے تھے۔ عمدہ خانم نے یہ اطلاع تو دے دی تھی کہ نواب یوسف علی خان نے بہت زور دے کر یہ بات کہی کہ آغا مرزا تراب علی مرحوم کے گھر پر وزیر کا پورا پورا حق ہے کہ آخر وہ اس گھر کی بہو ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت حضور پر نور بندگان عالی نے اس باب میں اپنا کوئی عندیہ ظاہر کیا کہ نہیں، اس عقدے کی کشائش تک بھی نہ ہو سکی تھی۔ اس گومگو کے عالم کے باوصف وزیر کا تہیہ اسی طرح برقرار تھا کہ شادی اسی گھر سے ہوگی اور حبیب النسا کے نہیں، وزیر خانم کے شایان شان ہوگی۔ یہ ارادہ قوت سے فعل میں کس طرح آئے گا، اس بات کا نقشہ ابھی وہ اپنے ذہن میں تیار نہ کر سکی تھی، لیکن اسے کچھ عجب طرح کا اطمینان تھا کہ اس کا ارادہ پورا ہو کر رہے گا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ شادی کو ایک ہفتہ رہ جائے اور پھر بھی آستانۂ عالی سے کوئی حکم صادر نہ ہو تو میں منجھلی باجی کو لے کر نواب یوسف علی خان، اور ممکن ہوا تو خود حضور کی خدمت اقدس میں بار پانے کی سعی کروں گی۔

بارات کی آمد کو دس دن رہ گئے تھے اور اب وزیر خانم کو تشویش ہونے لگی تھی۔ ایک بار تو اس کے جی میں یہاں تک آئی کہ فیروز پور جھرکہ فرنگیوں کے ہزار زیر نگیں ہو، لیکن نواب شہید کو حرف مہر والفت کے ساتھ یاد کرنے والے وہاں اب بھی بہت ہوں گے، کیوں نہ رقعہ بھیج کر دس بیس جیالوں کو بلوا لوں کہ شادی کا انتظام کرنا ہے، آپ لوگوں کے بغیر پورا حسب مرضی نہ ہو سکے گا۔ لیکن یہ خیال اس نے فوراً ہی مسترد کر دیا کہ ناممکن العمل نہ بھی سہی، لیکن کئی پہلوؤں سے یہ کوئی اچھی تجویز نہ تھی۔ بجا کہ فیروز پور کے جوانوں کی نگرانی میں نکاح بطریق امن وامان ہو جاوے گا، لیکن اگر اعلیٰ حضرت کو پرچہ لگا، اور پرچہ انھیں ضرور بالضرور لگے گا کہ باہری لٹھیتوں کو بلوا کر شادی کا انتظام کرایا گیا تو وہ آشفتہ خاطر بھی ہو سکتے ہیں۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کوئی اچھی بات نہیں۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ ایسی شادی کس قدر بے لطف گردانی جاوے گی جس میں باہر کے لوگوں کا چوکی پہرہ درکار ہووے۔

ظہر کی نماز پڑھ کر وہ پالکی منگوا کر منجھلی باجی کے یہاں جانے کا خیال کر رہی تھی کہ باہر کچھ شور سا ہوا۔ ایک دو لحظہ بعد خبر لگی کہ آستانۂ عالی سے حضور پر نور نے پالکی بھیج کر وزیر خانم کو طلب فرمایا ہے۔ پالکی کے اغل بغل دو سونٹا بردار اور جلو میں چلنے کے لئے ایک سوار مہیا ہیں جن کی حفاظت میں وزیر خانم کو قلعۂ معلیٰ پہنچا دیا جائے گا۔

وزیر سناٹے میں آ گئی۔ اسے باب عالی سے کسی اشارے کی توقع تھی کہ امیر النسا بیگم کو کچھ مناسب ہدایت کہلا دی جاوے گی۔ یا بہت ہوا تو نکاح بارات کے وقت اعلیٰ حضرت کی طرف سے دو چار اسوار گلی میں تعینات رہیں گے کہ سب کام بخیر و خوبی انجام کو پہنچیں۔ لیکن یہ طلبی...؟ اور میں ان کا سامنا کس طرح کروں گی، پتہ نہیں حضوری کے طریقے وہاں کیا ہیں۔ تسلیمات کیونکر بجالاؤں گی... شاید مجھے کھڑی رہنے کو کہا جائے؟ اور یہ میرے بیوگی کے بے رنگ بانے... کپڑے تو آج ہی بدلے ہیں، بناؤ سنگھار کا تو سوال یوں بھی نہیں اٹھتا... دو چھپکے پانی کے منھ پر مارلوں اور بال ذرا ٹھیک کر کے ڈوپٹے کا گھونگھٹ سا بنا لوں۔ یہی بہت ہو گا۔

آج اس نے مدتوں بعد آئینہ دیکھا تھا، چہرے پر شگفتگی نہ تھی لیکن بظاہر کوئی شکن بھی نہ تھی۔ بال اور ہاتھ پاؤں روکھے، بے آب سے تھے مگر سر میں ایک سفید بال نہ تھا اور بدن پر بڑھاپے کی سکڑن نہ تھی۔ وہ بالوں میں جلد جلد کنگھی پھیر رہی تھی کہ باہر سے کسی کے پکارنے کی سی کچھ آواز آئی۔ حبیبہ نے آ کر بتایا کہ سوار نے کہلایا ہے، حضور نواب صاحب انتظار فرما رہے ہیں۔

''بسم اللہ شریف پڑھ کر تشریف لے جایئے خانم صاحب، مولا کی مہربانی سے بڑا اچھا موقع ملا ہے۔ راستے میں درود پڑھ کر یا ودودُ کی تسبیح پڑھ کر خود پر پھونکتی جایئے گا۔ روبرو ہوتے وقت یا اللہُ یا رحمٰنُ یا رحیمُ پڑھنا نہ بھولئے گا۔'' حبیبہ کے لہجے میں تاکید تھی لیکن گھبراہٹ نہ تھی۔

وزیر نے جلد جلد بال ٹھیک کیئے، کپڑوں سے حتی الامکان شکنیں دور کیں اور چادر لپیٹ کر پالکی میں سوار ہو گئی۔ اسے راستوں کی زیادہ ٹکل نہ تھی، اور بند پالکی سے باہر کا حال کچھ زیادہ دکھائی بھی نہ دیتا تھا۔ بازار کی تھوڑی بہت آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں لیکن کتنی راہ طے ہوئی اس کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ سونٹا بردار پالکی کے دونوں طرف بے تکان اور بے آواز پالکی کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے تھے۔ آگے کے سوار کے گھوڑے کی ٹاپیں کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھیں۔ ہموار سڑک اور کہاروں کے سدھے ہوئے قدموں کے آہنگ کے باعث وزیر کو جھٹکے نہ لگتے تھے اور پالکی کی رفتار میں کشتی کے بہاؤ کی سی

کیفیت تھی۔

پالکی ایک ثانیے کے لئے دھیمی ہوئی، پھر رک گئی اور کہاروں نے پالکی کو آہستہ زمین پر رکھ دیا۔ کسی نے آواز لگائی:

''پردہ لگاؤ۔''

نیم تاریک پالکی میں وزیر کو کچھ پتہ نہ چل رہا تھا کہ میں کہاں ہوں، لیکن تھوڑی دیر بعد آواز آئی کہ ''پردہ لگ گیا ہے۔ سرکار تشریف لے آویں۔'' اور وزیر نے احتیاط کے ساتھ پاؤں باہر نکالے۔ اس نے بدن پر چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ جوتیوں سے لے کر سر تک سب کچھ ڈھکا ہوا تھا، صرف آنکھیں اور پیشانی کا ایک حصہ کھلا ہوا تھا۔ پاؤں باہر نکالنے میں اس نے یہ اہتمام رکھا کہ جوتیوں کے سوا ٹخنے بھی نہ دکھائی دیں۔ چادر برابر کر کے اور ہاتھوں کو چادر میں چھپائے ہوئے جب وہ باہر آئی تو اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ قلعۂ معلیٰ کے صدر دروازے، یا دیوان دفتر کے سامنے نہیں بلکہ کوچۂ سلامت جیسی راہداری میں ہے۔ پالکی کے پیچھے پردہ کھنچا ہوا ہے، دونوں جانب دیواریں، اور سامنے اندرون حویلی کا بلند دروازہ ہے۔ چھیوں کہار، دونوں سونٹا بردار اور سوار، سب پردے کے پیچھے تھے۔

وزیر ایک لمحے کے لئے دل میں ڈری کہ میں یہاں کہاں لے آئی گئی ہوں۔ اس نے ہمت کر کے ادھر ادھر دیکھا، لیکن محافظ خانے کے دروازے پر چار قلماقنیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ ابھی اسی سوچ میں تھی کہ قلماقنیوں کو سلام کروں یا نہ کروں، کہ ایک قلماقنی نے قدم آگے بڑھا کر اسے تسلیم کی اور کہا:

''آیئے۔ بے کھٹکے تشریف لے آیئے۔ قبلۂ عالم حضور نواب صاحب آپ کے منتظر ہیں۔''

وزیر نے دل میں اطمینان کا سانس لیا اور ہاتھ کے اشارے سے چاروں قلماقنیوں کو سلام کر کے آگے بڑھی۔ دروازے کے اندر چند ہی قدم جانے پر اسے نواب یوسف علی خان بہادر کے یہاں کی ایک اصیل نظر آئی۔ وزیر کو سلام کر کے اصیل نے کہا:

''یہ چادر مجھے دے دیں خانم صاحب۔ اندر بڑے ایوان میں بڑے حضور نواب صاحب بہادر آپ سے ملاقات فرمائیں گے۔''

چادر کی اوٹ ہٹتے ہی ایسا لگا جیسے وزیر کا بدن اچانک کسی پھول کی طرح کھل اٹھا ہے۔ پالکی میں سوار ہونے کے وقت سے لے کر اترنے کے بعد تک اس کے ذہن میں خلفشار سا تھا جو اب دور ہوتا نظر آتا تھا۔ اس خلفشار کے باعث اس کے بدن میں ایک تناؤ تھا جس کی وجہ کر اسے اپنا اٹھنا بیٹھنا سب

مصنوعی محسوس ہوتا تھا۔ اب اس کے دل دماغ کی فضا کھلتی ہوئی محسوس ہوئی تو ایک خود کار اور غیر شعوری عمل کے ذریعہ اس کے بدن کی رگوں میں خون کی چہل پہل اور چہک تیز ہو گئی اور جسم ہلکا محسوس ہونے لگا۔ اس کی روح بیوگی کے سبب یوں ہی تاراج و خستہ تھی، اب راحت افزا کی شادی کی الجھن نے اسے اور بھی بوجھل بنا دیا تھا۔ اب اس خستگی اور الجھن کے نقوش وقتی طور پر مدھم پڑ گئے۔ طبیعت ہلکی ہو جانے کے باوجود وزیر نے اپنی نظریں اپنے قدموں پر جمائے رکھیں اور نواب یوسف علی خان کی اصیل کے پیچھے چلتی ہوئی ایوان میں داخل ہوئی۔

اونچی دیواریں، فرش پر ہر طرف ترکی اور کشمیری قالین، چھت جھاڑوں اور کنولوں سے پٹی ہوئی، لیکن اس وقت صرف کوئی تین سو قمقموں والا ایک وسطی جھاڑ روشن تھا۔ بیچ میں سنگ مرمر کا چھوٹا سا چلتا ہوا فوارہ جو لالے کے پھول کی ہیئت میں تھا۔ قالینوں پر جگہ جگہ چھوٹے گاؤ تکیے، ان کے سامنے چاندی کے اگالدان اور صندلی تپائی پر چاندی کی طشتری میں خشک میوے، ہوا میں ہلکی ہلکی خوشبو، پورے ماحول سے نفاست اور خوش سلیقگی برس رہی تھی۔ لیکن کمرہ اتنا بڑا تھا کہ وہ چلتی گئی اور کمرہ تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ خادمہ اس کے ساتھ دائیں جانب ذرا پیچھے چل رہی تھی لہٰذا وزیر کو اطمینان تھا کہ ابھی ٹھہرنے کی منزل نہیں آئی ہے۔ ایوان کے اگلے سرے پر زربفتی پردہ دیوار کی طرح کھنچا ہوا تھا۔ پردے کے قریب پہنچ کر خادمہ نے وزیر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ذرا سے فاصلے پر بیٹھی ہی تھی کہ پردے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی اور پردہ بیچ سے کھنچ کر ایک دو انگل بھر کھل گیا۔ اصیل نے پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کے لہجے میں وزیر سے کہا:

''حضور والا تشریف لے آئے ہیں۔ تسلیمات بجا لائیں۔''

وزیر کچھ ہڑبڑا کر اٹھی، پردے کی طرف رخ کر کے تین تسلیمیں کر کے وہ بولی:

''سرکار کا اقبال بلند رہے، ہمائے سعادت کا سایہ حضور کے فرق مبارک پر تا قیامت رہے۔''

پردے کے پیچھے سے نہایت شائستہ، متین اور پر رعب آواز آئی:

''وزیر خانم۔ آغا مرزا تراب علی ہمارے خدمتگار وفادار تھے۔ ہمیں ان کی شہادت کا رنج ہے، لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔''

''بندی ان کے ماتم میں سحر و شام سیہ پوش ہے، ان کی یادگار کو کلیجے سے لگائے جی رہی ہے۔''

''ہمیں یقین ہے کہ وہ مرتبۂ شہادت پر فائز کیے گئے ہوں گے۔''

وزیر کو لگا کہ اس جملے میں شاید یہ اشارہ پنہاں ہے کہ جانے والا تو اعلیٰ علیین میں آرام سے ہو گا، تمھیں اپنے حال و آئندہ کی فکر کرنی چاہیئے۔ وہ ابھی کوئی مناسب جواب سوچ ہی رہی تھی کہ نواب صاحب نے مزید فرمایا:

''اور آپ کی بہبود بھی ہمیں منظور ہے۔''

''دولت و اقبال حضور کا روز افزوں ہو، سرکار کی رعایا پروری تو چاروں دانگ شہرہ رکھتی ہے۔''

''آپ ہماری رعایا ہی نہیں، ہماری بہو بھی ہیں۔ ہم یہ ہرگز پسند نہ کریں گے کہ سسرال میں آپ کو گھر کا سا آرام اور لحاظ نہ ملے۔''

وزیر کے خیال میں نواب کا مطلب بالکل صاف تھا: امیر النسا کی کچھ نہ چل سکے گی۔ وزیر اپنی حسب منشا آمد بارات، شادی، رخصتی وغیرہ کا انتظام کرے، کوئی مزاحم نہ ہوگا۔ وزیر ابھی تک سر جھکائے کھڑی تھی، پردے کی جھری سے اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ صرف آبنوسی صندلی کا پایہ اور نواب صاحب کی زر نگار جوتی کی دھندلی سی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اس نے اسی جوتی پر نظر جمائے جمائے جواب دیا:

''حضور فیض مرتبت کے احسان سے یہ بندی کبھی عہدہ برآ نہ ہو سکے گی۔ اللہ آپ کی سلطانی کو تا قیامت قائم رکھے اور آپ کے ملک کو شاد و آباد رکھے۔''

وزیر نے یہ کہہ کر تین تسلیمیں کیں اور پردے کی طرف منہ کئے کئے الٹے قدموں واپس جانے کے لئے تیار ہوئی کہ اسے نواب صاحب کی آواز پھر سنائی دی:

''نواب یوسف علی خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ کو اپنا مربی سمجھیں، جب بھی کچھ عرض کرنا ہو، بے تکلف گذارش کریں۔ اب جائیں، اللہ آپ کا حافظ و ناصر ہو۔''

''مجھ بندی کا رواں رواں آپ کا دعا گو رہے گا۔ کنیز آخری سانس تک آپ کے گن گاتی رہے گی۔ جناب سیدہ اور دوازدہ معصومین کی برکات سدا آپ کے شامل حال رہیں۔''

قلعۂ میموں سے واپس آتے میں ایک پل کے لئے وزیر کے دل میں خیال آیا کہ نواب یوسف علی خان بہادر سے یہ درخواست کرنا چاہیئے کہ آغا مرزا تراب علی مرحوم کی حویلی جو بحق سرکار واپس لے لی گئی تھی، شادی تک کے لئے پھر اسے مل جاوے۔ لیکن تھوڑے سے تامل نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ اگر نواب صاحب قبلہ کی مرضی یہ ہوتی تو حویلی کی بابت حکم انھوں نے خود ہی صادر کر دیا ہوتا۔ سچ پوچھو تو جو مجھے مل گیا ہے وہ بسا غنیمت ہے، اس نے اپنے دل میں کہا۔

راحت افزا کی شادی مقررہ تاریخ اور وقت پر مناسب اہتمام اور دھوم دھام کے ساتھ وقوع پذیر ہوئی۔ بارات کے استقبال کے لئے کوکبۂ شہریاری تو موجود تھا ہی، نواب یوسف علی خان کی طرف سے دولہا دولہن کے جوڑے اور جہیز کے برتن باسن، اور اعلیٰ حضرت فرمانروائے رامپور کی طرف سے دس اشرفیاں بطور سلامی دولہا، اور اس کے تمام گھر والوں کے لئے تشریفی جوڑے بھی تھے۔ پھوپھیا ساس جی اور نند جی بھی جبراً قہراً رسومات شادی میں شریک ہوئیں۔ اگلے دن دوپہر کے بعد راحت افزا روتی پیٹتی رخصت ہوئی۔ نواب مرزا نے بھائی کی حیثیت سے اسے سہرا باندھا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ رخصتی جو انھوں نے بطور خاص لکھی تھی، اس میں بھی انھوں نے راحت افزا کو بڑی بہن کہا۔ رخصتی کے اشعار بہن کے بچھڑنے کے رنج، اور بچپن سے لے کر شعور کی عمر تک اس کی ناز برداریوں اور تلطف و مدارا کی یادوں کی ہلکی بنفشئی گلابی روشنی سے بھرے ہوئے تھے۔ حبیب النسا اور وزیر خانم صورت دیوار چپ تھیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ روئیں مگر ناچار چپ تھیں۔ گھر میں کسی تجربہ کار اور معاملہ فہم سن رسیدہ مرد کے نہ ہونے کی وجہ سے سارے کام انھیں کے ذمہ تھے۔

چوتھی اور پھر چوتھی کے بعد کی رسموں میں کئی دن بجلی کی سی تیزی سے گذر گئے۔ پھوپھیا ساس اور نند کی خفگی ویسی ہی تھی۔ وزیر سے ان کی بول چال نہ تھی، لیکن اب انھوں نے شاہ محمد آغا کو اپنی توجہ کا مرکز بیش از بیش بنانا شروع کر دیا تھا۔ محمد آغا اب سال سے کچھ اوپر کے تھے، ابھی غوں غاں کرتے تھے، لیکن بات خوب سمجھ لیتے تھے اور لوگوں کو خوب پہچاننے لگے تھے۔ نور فاطمہ انھیں طرح طرح کے بہانوں سے اپنے پاس بلواتی اور سارا سارا دن اپنے پاس رکھتی، انھیں کھلاتی پلاتی، نہلاتی دھلاتی، حتیٰ کہ سونے کے لئے بھی ماں کے پاس نہ جانے دیتی۔ وزیر کو دودھ اس بار بہت کم ہوا تھا اور وہ بچوں کو دودھ پلانے سے ممکن حد تک گریز بھی کرتی تھی۔ اب جب کہ اچھی ذات کی دائی پلائی کو نوکر رکھنا ممکن نہ تھا، وہ بدرجۂ مجبوری بچے کو اپنا ہی دودھ پلاتی تھی لیکن وہ کم پڑتا تھا۔ سال بھر کا ہوتے ہوتے وزیر نے اسے نرم غذا بھی دینی شروع کر دی کہ دودھ کی چاٹ اسے کم سے کم ہو۔ یہ باتیں امیر النسا اور نور فاطمہ سے پوشیدہ نہ تھیں۔ آغا مرزا کو اپنے پاس دیر دیر تک رکھنے میں ساس نند کی مصلحت یہ بھی تھی کہ بچے کا دودھ جلد از جلد چھڑا دیا جائے اور ماں پر اس کا انحصار اور ماں سے اس کا انس کم ہوتا جائے۔

وزیر ان باتوں کو خوب سمجھتی تھی، لیکن جہاندیدہ پھوپھیا ساس اور زبان دراز نند سے کھلا جھگڑا مول لئے بغیر اس صورت حال کا تدارک ممکن نہ تھا۔ راحت افزا کی شادی کی بات اور تھی لیکن بچے کے

معاملے میں نواب صاحب سے کچھ عرض کرنا وہ اپنے مرتبۂ وقار و تمکین سے فروتر جانتی تھی۔ وہ چپ چاپ مناسب وقت کے انتظار میں تھی۔ رام پور چھوڑ دینا اور دہلی چلا جانا بعید از امکان تو نہ تھا، لیکن محمد آغا کی کم عمری اور پھوپھی سے اس کی مانوسیت آڑے آتی تھی۔ وزیر کو خوف تھا کہ اتنا کم عمر بچہ شاید اس کے تنہا ہاتھوں ٹھیک سے پل نہ پائے گا۔ یا اس بات کا امکان تو تھا ہی کہ رام پور چھوٹ جانے کے بعد شروع میں کئی مہینے تک وہ پھوپھی اور دادی کو یاد کر کے ہڑکتا رہے اور شاید بیمار بھی پڑ جائے۔

نواب مرزا اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ اس کی ماں کے دل میں کشاکشوں اور الجھنوں کا ہجوم ہے جو بظاہر تو نظر نہیں آتا لیکن اندر ہی اندر اس کے تصورات کی دنیا میں زہریلے سانپوں اور دھواں اگلنے والے اژدہوں کی طرح لہراتا رہتا ہے۔ اس کی اماں جان کے چہرے پر وہ شگفتہ شباب اب نہ تھا جو محمد آغا کی پیدائش کے کچھ پہلے اور پھر اس کی پیدائش کے بعد، اور شعر گوئی کے مواقع دوبارہ ملنے کے سبب، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آغا صاحب مرحوم کی ناز برداریوں اور نیک خلقی اور شرافت نفسی کے باعث ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وزیر خانم جو ہمیشہ اپنی عمر سے بہت کم لگتی تھی، اب اچانک اپنی عمر سے زیادہ لگنے لگی تھی۔ ایسا تو نہ تھا کہ اس کے شبستان حسن پر صبح کی سفیدی جھلک دکھانے لگی ہو، لیکن یہ ضرور تھا کہ درونے میں پلتے ہوئے افکار نے اسے کچھ مضمحل سا کر دیا تھا۔ نواب مرزا اکثر فکر میں رہتا کہ اماں جان کے دکھوں کا مداوا کیا ہو اور کیونکر ہو۔ ایک بات تو اسے صاف نظر آتی تھی۔ رامپور میں رہ کر اس کی ماں کو سکون قلب نہ مل سکتا تھا۔ سکون قلب تو دور رہا، یک گونہ عافیت کا بھی احساس ممکن نہ تھا۔ اور یہ بات بھی صاف تھی کہ خود اس کی ماں ان قضیوں کو حل کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ بجا کہ ایک بار اماں جان نے کہا تھا کہ میں رامپور میں نہ رہوں گی۔ لیکن وہ ایک وقتی سی بات تھی، لمحاتی کیفیت میں منہ سے نکل گئی تھی۔ اس کے بعد تو اماں جان نے کبھی وہ تذکرہ نہ چھیڑا تھا۔

بہت سوچ کر نواب مرزا نے فیصلہ کیا کہ منجھلی خالہ صاحب کے سامنے بات رکھی جائے، لیکن اس طرح کہ اماں جان کو ابھی خبر نہ ہو۔ یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر نواب مرزا پہلے ماں کے گھر گیا کہ وہاں کے تازہ ترین حالات پر مطلع ہو جائے۔ وہاں پہنچ کر اس کی تشویش اور تردد میں اور بھی اشتداد پیدا ہوا کہ وہاں تو حالات بد سے بدتر ہو گئے تھے۔ اس کی ماں نے کل رات سے کھانا نہ کھایا تھا، اور نہ ہی محمد آغا گذشتہ رات سے اس کے پاس آیا تھا۔ معلوم ہوا پھوپھی جان نے اسے وہیں کھلا پلا کر اپنے پاس سلا لیا تھا اور محمد آغا نے ایک بار بھی ماں کے پاس جانے کی ضد نہ کی تھی۔ نواب مرزا کے سامنے وزیر خانم آنسوؤں

سے تو نہ روئی لیکن اس کی آنکھوں کی سرخی اور منھ کی زردی صاف پتہ دیتی تھی کہ وہ کئی بار رو چکی ہے۔

''اماں جان، وہ لوگ محمد آغا سلمہٗ کو آپ سے لے لینا چاہتے ہیں۔'' نواب مرزا نے کہا۔

وزیر کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''معلوم ہوتا ہے میرا مقدر یہی ہے کہ بچے جنوں اور پھر ان سے ہاتھ دھولوں۔''

''خدا نہ خواستہ۔ آپ ایسا کیوں کہتی ہیں۔ بھلا میں بھی تو آپ کا جایا ہوں۔ مجھے کوئی آپ سے دور نہیں کر سکتا۔''

وزیر نے آنکھیں میچ کر اشکوں کی بوندوں کو آنکھوں ہی ٹھہرانا چاہا لیکن اس کے گال آنسوؤں سے تر ہونے لگے۔ اس نے ڈوپٹے کو منھ پر لپیٹتے ہوئے سر جھکا کر کہا:

''جان مادر وہ زمانہ اور تھا۔ انگریز کے خوف سے کسی میں جرأت نہ تھی کہ تمھیں اپنا تا... مشہور تھا کہ فرنگی حاکمان دور پار تمھیں مروا دینا چاہتے ہیں۔ اور لوہارو والوں کو تو یوں بھی تمھارا وجود ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔''

''چلئے یوں ہی سہی۔ لیکن ہمیشہ ہمیش کے لئے میں آپ ہی کا ہوں۔ آپ کا بیٹا ہوں اور آپ کا سایہ میرے سر پر ہے تو میں کچھ نہ کچھ کر کے دنیا کو دکھا دوں گا کہ میری رگوں میں دوڑتا پھرتا نواب شمس الدین شہید کا خون رائگاں نہیں گیا ہے۔ اور آپ کے لئے بھی میں آفات زمانہ کے خلاف سد سکندری بن جاؤں گا۔ آپ کو کسی اور کی پروا کیوں ہو؟''

یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ نواب مرزا نے ماں سے اس قدر کھل کر اور اس قدر اعتماد کے ساتھ گفتگو کی تھی۔ وزیر کے سینے میں فخر اور امتنان کی ایک شمع سی روشن ہوئی، لیکن نواب مرزا کے آخری فقرے کے معنی اس کی روح میں شعلہ بن کر چمکے۔

''مجھے آغا صاحب شہید مرحوم کی املاک یا ان کا ترکہ نہ چاہیئے۔'' اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ''لیکن ان کی یادگار جسے میں نے جان دے کر اپنے اندر پالا اور پیٹ کے باہر گلاب کے شگوفے کی طرح سنبھال کر رکھا اسے کیوں چھوڑ دوں اور کس دل سے چھوڑ دوں؟ نواب مرزا آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟''

نواب مرزا کو محسوس ہوا کہ میں نے فیصلہ کن بات کہنے میں غیر ضروری تعجیل کی۔ ''میں کچھ نہیں چاہتا اماں جان۔'' اس نے ذرا مجحوبی کے ساتھ کہا۔ ''مجھے صرف آپ کا سکون دل منظور ہے۔ میں آپ کو

رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا۔''

وزیر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،'' مجھے تو لگتا ہے اللہ میاں نے مجھے ایسے ہی کسی لمحے میں بنایا تھا جب بدنصیب ہی بدنصیب بنائے جا رہے تھے۔''

'' ہر بات کے دو رخ ہوتے ہیں صاحب۔'' نواب مرزا نے گفتگو کو ذرا شگفتہ بنانے کی کوشش میں کہا۔'' نصیب نہ ملے عقل تو ملی، اور حسن ذاتی اس پر مستزاد۔''

'' ایسی عقل سے کودن ہونا بہتر اور ایسی صورت جائے بھاڑ میں۔ اپنے جگر گوشوں کو چھاتی سے لپٹا سکوں نہ اپنے قدرداں کے پہلو میں بیٹھ سکوں، نواب مرزا آپ مجھے بچہ سمجھتے ہیں کیا۔''

نواب مرزا سے کوئی جواب نہ پڑا۔ ایک دو ثانیہ چپ رہ کر اس نے کچھ اور بات چھیڑنے کی کوشش کی۔'' میں ابھی منجھلی خالہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا۔ وہ آپ کو بھی یاد کر رہی تھیں، آپ چاہیں تو تشریف لے چلیں۔ میں پالکی منگوائے لیتا ہوں۔''

'' وہاں جا کر کیا نئی بات ہو جاوے گی۔ محمد آغا تو یہاں ہیں۔''

'' سہی، لیکن ذرا اس گھر کی تنگ فضا سے نکلیں تو کیا قباحت ہے۔''

'' جانے والا تو مجھے اسی گھر میں چھوڑ گیا۔'' وزیر کے لہجے میں تلخی تھی، گویا آغا مرزا تراب علی نے جان بوجھ کر موت کو گلے لگایا تھا۔

'' لیکن آپ اس گھر میں بند تو نہیں ہیں۔'' نواب مرزا نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

وزیر نے کچھ جواب نہ دیا لیکن نواب مرزا کو اس نے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہی ہو، ہر بات ہر شخص کے سمجھنے کی نہیں ہوتی۔ نواب مرزا اندر ہی اندر لڑکھڑا گیا۔ اب کیا کہوں اور کیا نہ کہوں، جو بات بھی اس وقت میرے منہ سے نکلتی ہے الٹا ہی کام دکھاتی ہے۔ وہ کوئی مناسب بات سوچ ہی رہا تھا کہ وزیر نے ذرا خشک لہجے میں کہا:

'' آپ منجھلی باجی کے یہاں شوق سے تشریف لے جائیں لیکن مجھے ان کے یا اپنے خیالوں کا پابند نہ سمجھیں۔''

نواب مرزا ایک لحظے کے لئے چکرا گیا۔ کیا اماں جان نے میرے ارادے جان لئے ہیں؟ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ لیکن اب نہیں تو تب، بات ان کے سامنے کھول کر رکھنی ہی پڑتی، لہٰذا اب ہی سہی۔ مگر... خالہ صاحب سے استصواب بھی تو ضروری ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو جائے کہ اماں یہاں سے اٹھ

کر خالہ صاحب کے پاس چلی آویں... انھوں نے ایک بار پہلے کہا بھی تھا۔ لیکن اماں جان کیا برادر خورد کو یہاں چھوڑنے پر راضی ہو جاویں گی...؟ یہ سارا قضیہ تو اسی بات کا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے کو وہ لوگ رجھا کر اپنا کر لینا چاہتی ہیں۔

ابھی وہ انھیں خیالوں میں گم تھا کہ وزیر نے کچھ بیٹھے ہوئے سے گلے کے لہجے میں کہا:

''نواب مرزا صاحب، آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر، لیکن آپ یہ نہ سمجھئے کہ آپ ماں کی آتما اور بچے کے تئیں اس کے درد کو سمجھ سکتے ہیں۔''

''حاشا میں ایسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا...'' نواب مرزا نے گھبرا کر جواب دیا۔ لیکن وزیر نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں، جیسے وہ کسی اور ہی عالم میں تھی۔

''آپ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں لیکن آپ اول و آخر مرد ہیں۔ مرد ذات سمجھتی ہے کہ ساری دنیا کے اسرار اور تمام دلوں کے نہاں گوشے اس پر منکشف ہیں، یا اگر نہیں بھی ہیں تو نہ سہی، لیکن وہ سب کے لئے فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ مرد خیال کرتا ہے کہ عورتیں اسی نہج اور مزاج کی ہوتی ہیں جیسا اس نے اپنے دل میں اپنی بہتر فہم و فراست کے بل پر گمان کر رکھا ہے...'' وہ ایک پل کو چپ رہی، پھر بولی۔ ''اور اگر عورتیں اس نہج اور مزاج کی نہیں بھی ہیں تو یہ سہو مرد ذات کا نہیں، عورت ذات کا ہے، کہ وہ ویسی کیوں نہ ہوئی جیسی کہ مرد چاہتا یا سمجھتا ہے۔''

وزیر کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ ''اللہ آغا مرزا صاحب شہید کو کروٹ کروٹ جنت بخشے، لیکن انھیں گمان تھا کہ مرد کا درجہ عورت سے بلند تر ہے۔ عورت محکوم ہے اور شوہر حاکم...''

اب نواب مرزا نے ہمت کر کے قطع سخن کیا اور وہ دھیمی آواز میں بولا: ''اماں جان، مجھے خدا نے مرد بنایا اور شریعت اور رواج نے مجھے کچھ باتیں سکھائیں، لیکن سب کے علی الرغم میں نے ہمیشہ یہی کہا اور سمجھا کہ میری ماں کا قول، میری ماں کا خیال، میری ماں کا فیصلہ، سب مردوں پر مقدم ہے۔ جب منجھلی خالہ اور پھوپھی صاحب نے مجھ سے آپ... آپ کے... آپ کے بارے میں بات کی تو میں نے یہی جواب دیا کہ میری اماں جو چاہیں وہی صواب ہے۔''

''یہ آپ کی سعادت مندی ہے بچے میاں۔ لیکن رواج اور شریعت، بلکہ شریعت کے غلط مطلب نکالنا، اور پھر ان غلط معنی پر لوگوں کے بے سوچے سمجھے عمل کی مثالیں ہمارے چاروں طرف پھیلی

ہوئی ہیں۔ اور برانہ مانیں، آپ بھی اس سے عاری نہیں ہیں۔ آخر...''

''معافی چاہتا ہوں آپ کا قطع کلام ہوتا ہے،'' نواب مرزا نے بے چینی سے کہا۔

''نہیں۔ میں آپ کا قطع کلام کرتی ہوں اور پوچھتی ہوں کہ آپ نے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا کہ میری مشکل کی کشائش آپ کا فرض ہے؟''

نواب مرزا اب بالکل ہی ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن منھ کھلا کا کھلا رہ گیا، کوئی لفظ ادا نہ ہو سکا۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس نے اپنی ہتھیلیاں اور پھر پیشانی خشک کی اور رک رک کر بولا:

''جی۔ جی... وہ... ایسا ہے کہ میں آپ کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔ شاید... بیٹے اور بہن کا... یہ شاید فرض نہیں ہے کہ ماں یا بہن کی مشکل میں ان کے کام آئیں؟''

''لیکن بیٹا ماں کو، یا بھائی بہن کو معذور کیوں سمجھے؟ یہ کیوں قرار دیا جائے کہ عورت ہے اس لئے اس کی مشکل کوئی مرد ہی، یا کوئی اس کا بزرگ ہی حل کر سکتا ہے؟''

نواب مرزا بالکل ٹپٹا گیا۔ اس نے کبھی خیال ہی نہ کیا تھا کہ یہ بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ آخر بیٹا ہوتا کس لئے ہے؟ ماں کی دستگیری بیٹا نہ کرے گا تو کون کرے گا؟ وزیر نے شاید اس کے دل میں اٹھتے ہوئے خیالات، بلکہ وہ الفاظ ہی پڑھ لئے اور ذرا سمجھانے کے لہجے میں بولی:

''ذرا سوچئے، اگر آپ ماں کی جگہ باپ کو مشکل میں دیکھتے تو بھی یہ قرار دے لیتے کہ باپ کی دستگیری میرا فرض ہے؟''

نواب مرزا نے بالکل اضطراری اور غیر ارادی طور پر کہا:

''جی نہیں۔ بالکل نہیں۔ مرد تو اپنے معاملات...''

یہ کہتے کہتے اس نے اپنا منھ سختی سے بند کر لیا۔ لاحول ولاقوۃ یہ کیا بیان ہے۔ اماں جان یہی تو کہہ رہی ہیں کہ آپ مرد ہیں، آپ کو یقین ہے کہ سارا کار دنیا آپ ہی کے سہارے چلتا ہے۔

''جی، دیکھا آپ نے بچے میاں،'' وزیر نے کچھ رنجیدہ اور تلخ تبسم کے ساتھ کہا۔ ''آپ جوش محبت میں بہ کر مجھے سب پر فوقیت دے لیں تو دے لیں، لیکن آپ کی عقل آپ کو کچھ اور راہ سجھاتی ہے۔''

''لیکن... لیکن... شریعت بھی تو کہتی ہے کہ مرد کو عورت پر فوقیت ہے۔'' نواب مرزا نے کچھ گڑبڑا کر کہا۔ ''ہماری کتابیں تو یہی کہتی ہیں، ہمارے بزرگ تو یہی سکھاتے ہیں۔''

"آپ کی کتابوں کے مصنف سب مرد، آپ کے قاضی مفتی بزرگ بھی کون، سب کے سب مرد۔ میں شرعی حیثیت نہیں جانتی، لیکن مجھے بابا فرید صاحب کی بات یاد ہے کہ جب جنگل میں شیر نمودار ہوتا ہے تو کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ شیر ہے یا شیرنی۔ آخر حضرت رابعہ بصری بھی تو عورت تھیں۔"

"وہ تو ولی اللہ تھیں۔"

"جی ہاں۔ اور میں ایک بے خدا، دنیادار بندی جس کا بال بال گناہوں سے پرویا ہوا ہے۔"

"اماں جان خدا کے واسطے میری بات کو یوں توڑ موڑ کر نہ بیان کریں۔" نواب مرزا ہاتھ ملتا ہوا تقریباً روہانسا ہو کر بولا۔

وزیر کی مامتا فوراً جوش میں آ گئی۔ آنکھوں میں شرمندگی کے آنسو لئے وہ اٹھی اور اس نے چٹا چٹ نواب مرزا کی بلائیں لے ڈالیں۔ "ہائے ہائے اللہ مجھے معاف کرے، میں نے آپ کو شرمندہ کرنے کی غرض سے کچھ نہیں کہا نواب مرزا۔ میرے بچے کو مجھ سے کوئی شکایت ہو اس سے پہلے میں مر جاؤں تو میں اپنے کو بھاگوان جانوں۔ آپ ایسی باتیں نہ سوچئے للہ۔"

نواب مرزا کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ "اماں جان آپ کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی پر میں نچھاور ہو جاؤں۔ آپ کو دیکھ دیکھ کر تو میں جیتا ہوں، آپ کو ملول و محزوں کیسے دیکھ سکوں گا۔"

"آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ دو ہی چار دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب آپ اپنی خالہ صاحب کے گھر واپس جائیں۔ ان سے کہہ دیجئے گا میں کل پرسوں ملنے آؤں گی۔"

نواب مرزا حیص بیص کے عالم میں بادل ناخواستہ ماں کے پاس سے اٹھا۔ ادھر وزیر نے بیوگی کے بعد پہلی بار ٹھیک سے منھ ہاتھ دھوئے اور منھ کو دستمال سے خوب رگڑا کہ آنسوؤں کی لائی ہوئی بے رونقی جاتی رہے، اچھے اور صاف لیکن سفید کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کی، کانوں میں گوشوارے ڈالے، دو انگلیوں میں انگوٹھیاں پہنیں، پھر حبیبہ کو پھوپھیا ساس کی طرف اطلاع کرنے کے لئے بھیجا کہ خانم صاحب تشریف لاتی ہیں۔

وزیر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر امیر النسا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے ہرگز توقع نہ تھی کہ چھوٹی بیگم اس قدر جرأت مندی سے کام لے گی۔ وہ دیکھ ہی چکی تھی کہ قلعۂ معلیٰ میں وزیر کا کیا رسوخ ہے اور شروع شروع میں اسے اندیشہ تھا کہ وزیر اس رسوخ کو استعمال کر کے ہم لوگوں کے لئے مشکلیں پیدا

کرے گی، یا اور کچھ نہیں تو شاہ محمد آغا کو ہم لوگوں سے بالکل الگ کر لینے کے لئے موثر قدم اٹھائے گی۔ لیکن امیر النسا اور نور فاطمہ نے بھی ٹھان لی تھی کہ بچے کو وزیر کے قبضے میں نہ جانے دیں گی اور اس غرض سے وہ نہ صرف یہ کہ شاہ محمد آغا کو اپنی طرف رو کے رہنے اور اسے اپنے سے ہلانے اور مانوس کرنے کی پوری سعی کر رہی تھیں، بلکہ قلعۂ معلٰی میں بعض بیگمات کے ذریعہ حضور نواب صاحب بہادر تک یہ بات بھی پہنچانے کی سبیل کر رہی تھیں کہ وزیر کے پاس رہ کر بچے کی پرداخت مذہب صحیحۂ امامیہ پر نہ ہو سکے گی۔ ابھی اس معاملے میں انھیں کچھ مبہم سے موافقانہ اشارے ہی ملے تھے، لیکن توقع انھیں پوری پوری تھی کہ نتیجہ ہمارے حسب دلخواہ ہوگا۔

وزیر جب امیر النسا کے حجرے میں آئی تو نور فاطمہ بڑے پلنگ کے پاس چوکی پر کھیلتے ہوئے محمد آغا کو یوں ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی گویا وہ ابھی ابھی کھیلتے کھیلتے سو گیا ہو۔ لیکن بچہ بار بار اس کی گرفت سے نکل کر کھلونوں کی طرف ہمکتا تھا۔ وزیر نے اسے اٹھا لینے کے لئے بازو بڑھائے تو ماں کو دیکھ کر اس نے قلقاری ماری لیکن اس کی گود میں آنے کے لئے بدن کو کچھ بھی آگے نہ بڑھایا۔ اس کی توجہ کھلونوں ہی کی طرف رہی۔ نور فاطمہ نے اسے مصنوعی طور پر تھپکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"اللہ ابھی سو رہیئے شاہ صاحب۔ ابھی کچھ بہت دن نہیں چڑھا ہے۔ دیکھئے نہ آپ کی انکھیوں میں نبی بیگم بیٹھی ہوئی ہیں کہتی ہیں یہ پلکیں جھپکتیاں تو ہم بھی ذری آرام کر لیتے۔"

بچے کو ان چکنی چپڑی باتوں سے لاتعلق بار بار نور فاطمہ کے ہاتھوں سے نکل کر کھلونوں کی طرف لپکتے دیکھ کر وزیر خانم نے کہا:

"بھئی واہ بچے کو رجھانے کے خوب ہی جتن ہو رہے ہیں۔"

نور فاطمہ نے چمک کر کہا، "جی ہاں بھلا کوئی مردوں کو رجھائے کوئی ننھے معصوموں کو بہلائے۔"

"بے شک۔ اور بعض بعض بی بیاں تو کسی کو رجھانے کے ارمانوں میں زندگی گذار دیتی ہیں۔ انھیں کوئی جڑے تو سہی۔"

"جنھیں آبرو پیاری ہوتی ہے وہ مالک سے لو لگاتی ہیں اور جنھیں مال پیارا ہوتا ہے ان کا جوبن رکابی میں پھلتا پھولتا ہے۔"

"عصمت بی بی از بے چادری ہے بی نور فاطمہ۔ اس چھوٹی سی کوٹھڑیا کے باہر بھی دنیا ہے۔

وہاں یہ تریا چر تر نہیں چلیں گے۔ مگر چھوڑیئے، میرے بچے پر اپنا عمل کر چکی ہوں تو لایئے مجھے دیجئے۔ اس بچارے کو پتہ تو لگے کہ اس کی کوئی ماں بھی ہے۔"

امیر النسا نے بڑھ کر محمد آغا کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولیں:

"اے ہے بی بی کی زبان کیا ہے رانڈ کا چرخا ہے کہ چلے ہی جاتا ہے۔ کان کھول کر سن لو۔ تم اس کی ماں ہو گی لیکن ہم اس کے وارث ہیں اور وہ ہمارا وارث ہے۔"

"سبحان اللہ۔ آج تک تو سنا تھا کہ بچے کے باپ ماں اس کے وارث ہوتے ہیں اور بچہ ان کی وراثت پاتا ہے۔ اب یہ بوڑھی جروا نام ختیجہ اس کی وارث بننے آئی ہیں۔ کھانے کو روٹی نہیں اور پہننے کو لتا نہیں اور میرا پلا پلایا بچہ ہتھیانے کے فراق میں ہیں۔ سنا نہیں کیا ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔"

"سیدھے سبھاؤ بات کرو چھوٹی۔ یہ دلی نہیں ہے، رام پور ہے۔ گھڑی بھر میں سارے بل نکلوا دیے جائیں گے۔"

"میرا بل میرا اللہ ہے اور میرے نواب ہیں۔"

"تمھارے نواب کہاں سے ہو گئے بیگما۔ تم غیر ذات غیر مذہب غیر گھر کی لگائی جس نے چار پیسے دکھائے اسی کی ہو رہیں۔"

"پھوپھی صاحب۔ آپ کی گالیوں کا گالا بنا کر ہوا میں اڑا دوں گی، لام کاف بکنے سے بچہ آپ کا نہ ہو جائے گا۔"

"بچہ تمھارے ہاتھ میں دے دوں کہ تم اس کا آبائی مذہب چھڑا دو، اس کی دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہو جائیں۔ یہی تو تم چاہتی ہو، کیوں؟"

"ماں کا مذہب اس کی مامتا ہے اور کچھ نہیں۔ اور عادل بادشاہ کا مذہب رعایا کے ساتھ انصاف۔ اس دھوکے میں نہ رہیئے گا کہ نواب کا مذہب امامیہ ہے تو وہ ماں سے اس کا بچہ چھین لیں گے، صرف اس لئے کہ بچے کا باپ ان کا ہم مذہب تھا۔ راحت افزا کی بارات کے معاملے میں آپ منہ کی کھا چکی ہیں۔"

اونچی اور برہم آوازوں سے شاید گھبرا کر شاہ محمد آغا نے اب کھیلنے اور سونے دونوں سے دل ہٹا لیا تھا اور وہ چوکی سے اتر کر ماں کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اے دیکھئے شاہ صاحب کہیں گر نہ پڑیں۔" وزیر نے بے قرار ہو کر کہا اور بڑھ کر بچے کو گود میں اٹھاتی ہوئی بولی:

''مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ دونوں کیا چاہتی ہیں۔ آپ کو یہ گھر اور میرے شہید شوہر کی ساری املاک چاہیئے۔ وہ ہے ہی کتنی، لیکن آپ جیسی کنگلیوں کے لئے وہ تو پوری بادشاہت ہے۔ میرے مرحوم شوہر آپ کے کفیل تھے۔''

''تو تمھارے ہی پاس کیا ہے چھوٹی بیگم؟ تم بھی تو انھیں کے ٹکڑوں کی محتاج ہو۔'' امیر النسا نے کہا۔

''میرے پاس کچھ نہیں لیکن مجھے اپنی توقیر پیاری ہے۔ مجھے اپنی عزت کا پاس ہے۔''

''تو تم یہاں ہماری چھاتی پر مونگ دلتی رہوگی؟ یہی تمھاری توقیر ہے؟''

وزیر خانم نے نخوت سے بھرپور طنزیہ ہنسی ہنس کر کہا۔ ''تو یوں کہیے۔ ساس گئی گاؤں بھوکھی میں کیا کیا کھاؤں والا معاملہ ہے!''

نور فاطمہ نے اٹھ کر بچے کو وزیر کی گود سے لینا چاہا اور بولی، ''چپ رہیئے۔ ہماری غرض صرف اس معصوم سے ہے۔''

وزیر نے بچے کو اپنے سینے سے مضبوط لگا لیا اور اسی طرح مسکرا کر بولی:

''تم شاید سن نہیں رہی ہو نند جی۔ تمھاری پیاری پھوپھی صاحب کو صرف مجھ سے غرض ہے، اس معنی میں کہ میں اپنا گھر ان کے حوالے کر کے جنگل کی راہ لوں۔''

''چھوٹی بیگم، جیسا آپ کا نام بدنام ہے ویسا ہی آپ کا دل بھی برائی کی پوٹ ہے۔'' نور فاطمہ بھنا کر بولی۔

''نور بی بی ذرا کان کھول کر سنو اور آنکھ کھول کر دیکھو۔ ان کی قسمت سے آغا صاحب مرحوم کو اللہ نے بلا لیا تو آپ ان خیالوں میں ہیں کہ بچارہ شہید جو کچھ چھوڑ گیا اسے میں ہی ہتھیالوں، اور کسی کو کچھ نہ ملے چاہے وہ ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہو، بہن ہی کیوں نہ ہو۔''

''تم ہم دونوں کو لڑا کر اپنا کام نکالنا چاہتی ہو تو سن لو یہ کبھی نہ ہوگا۔ نور فاطمہ تمھاری ذات اور اوقات سے خوب واقف ہیں۔''

''مگر بچاری آپ کی ذات اور اوقات سے تو واقف نہیں ہے۔'' وزیر نے ہنس کر کہا۔ ''خیر چھوڑیئے۔ کام کی بات کیجئے۔ یہ بات تو کھل ہی گئی ہے کہ آپ کو شاہ محمد آغا سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔''

''ہے کیوں نہیں؟ کیا ہم اسے اپنے بزرگوں کے طریق سے محروم رکھیں اور خود بھی گناہ گار ہوں؟''

''اصل دین تو دین اسلام ہی ہے...'' وزیر بولی۔

اس کی بات کاٹنے کی کوشش کرتے ہوئے نور فاطمہ نے کہا، ''لیکن...''

''ذری غم کھاؤ نور فاطمہ، میری بات پوری ہونے دو۔'' وزیر نے متین لہجے میں کہا۔ ''میں کہتی ہوں دین تو ایک ہی ہے، بات صرف مسلک کی ہے۔ تو میں امام جعفر صادق علیہ السلام کو گواہ کر کے آپ سے عہد باندھتی ہوں کہ شاہ صاحب کو ان کے باپ کے مسلک پر ہی رکھوں گی۔''

پھوپھی بھتیجی ایک لمحے کے لئے سناٹے میں آگئیں۔ پھر امیر النسا نے بیچارگی کے استدلال سے کام لیا:

''اور جو تم اپنے قول سے پھر جاؤ؟''

''توبہ ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کو گواہ کر کے اپنے قول سے مکر جاؤں، جہنم کا کندہ بنوں؟''

''نہیں ہمیں کچھ اور مضبوطی چاہیئے۔'' امیر النسا نے کہا۔ پھر کچھ سوچتی ہوئی وہ بولی، ''اور... اور وہ جو دوسری بات ہے...؟''

''کہیئے کہیئے، صاف کہیئے۔'' وزیر نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا جانے دیجئے، کیوں آپ کو شرمندہ کروں۔ سنئے، میں یہاں نہ رہوں گی، جہان آباد اپنے گھر میں رہوں گی۔ یہ گھر اور سامان اور جائداد آپ کو مبارک رہے۔''

پھوپھیا ساس اور نند دونوں نے کچھ کہنے کے لئے بیک وقت منھ کھولا لیکن کچھ کہہ نہ سکیں، احمقوں کی طرح ایک دوسری کو تکتی رہیں۔ اس دوران وزیر اپنے بچے کو چمکارتی اور توتلی زبان میں اس سے بولتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد نور فاطمہ کو جیسے ہوش آیا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی بولی:

''اور شاہ محمد آغا...؟''

''ان کی پرورش اور تعلیم مذہب امامیہ کے مطابق ہوگی۔ میں سر خط لکھ دوں گی۔ یہاں کی جائداد آپ کی، اس شرط پر کہ بالغ ہونے پر وہ اس کے حق دار ہوں گے۔ اس کاغذ پر آپ دونوں کے بھی دستخط ہوں گے، سن لیا آپ لوگوں نے؟''

''ہاں۔ سن لیا۔'' دونوں عورتوں نے بمشکل یہ دو لفظ ادا کئے تھے کہ وزیر خانم ''اچھا، بہت خوب۔ تو میں چلی'' کہہ کر بچے کو گود میں اٹھائے باہر آ گئی۔

نواب مرزا، شاعر

دہلی ۱۸۴۴۔ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی کی دہلی میں بیرونی اور اندرونی لٹیروں کی تاخت و تاراج ایک مدت سے بند تھی۔ حسن و عشق، علم و فضل، ہیئت و ہندسہ، منطق و ریاضی، نجوم و رمل، شعر و ادب، اور زہد و تصوف کی شمعوں کی جگمگاہٹ نے دلی کے ہر کوچے کو غبطہ دہ بغداد و قرطبہ بنا دیا تھا۔ کھیل کود، موسیقی و غنا، مصوری و خوش نویسی، ہاتھ کی ہر صنعت و حرفت، مرصع سازی و سادہ کاری، طباخی و دوا سازی، ہر فن کے ماہر شاہجہان آباد مینو سواد میں پٹے پڑے تھے کہ ایک ڈھونڈو تو چار کا پتہ ملتا تھا۔ آداب و علوم مملکت و جہانبانی و کشور کشائی و فوج کشی و جہانستانی کے سوا کوئی شعبۂ حیات ایسا نہ تھا جس کے علما اور متخصصین دہلی میں نہ ہوں۔ اور ان علوم اور ان میدانوں میں بھی عمدۃ الحکما حاذق الزمان حکیم محمد احسن اللہ خان کے کمالات کا درجہ ایسا تھا کہ اگر ان کی وزارت واقعی وزارت، اور ان کا بادشاہ واقعی بادشاہ ہوتا تو جہانگیر و شاہجہاں نہ سہی، بہادر شاہ اول کے دن واپس آ سکتے تھے اور بدنصیب دلی کی تقدیر پلٹا کھا سکتی تھی۔ لیکن دلی کی قسمت میں تو لٹنا اور اجڑنا ہی نہیں، بیوہ ہونا اور در بدر ہونا بھی لکھا تھا۔

بہادر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے دن وہ روز شوم بہر حال بیس برس آگے کے سیاہ غبار میں گم تھا اور اس وقت کسی کو یہ خیال نہ تھا کہ ہم انحطاط کے دروازے میں داخل ہو چکے ہیں۔ حکومت اور اقتدار کے لئے خونریزیوں کا کھیل تو دلی بیسیوں بار کھیل چکی تھی۔ زمانہ بدلتا تھا لیکن آئین زمانہ کبھی نہ بدلتا تھا۔ اور علوم و فنون، ہنر و حرفہ کا اکتساب تو انسانی وجود کی ضرورت اور اس کی اشرافیت کی دلیل تھا۔ دلی والے علم و حرفہ میں اب بھی سب سے آگے تھے اور نئی روشنیاں بھی ان کے پرانے فانوسوں اور فرشی مردنگوں، حتیٰ کہ مٹی کے بھی چراغوں میں جھلملانے لگی تھیں۔ انگریزی کتابوں کے پڑھنے والے، فرنگی عقائد پر منہاج زیست کو استوار کرنے والے، بھاپ اور لوہے کی کلوں کو بنانے اور چلانے والے، یہ لوگ بھی اب دہلی

کے قلب میں نظر آنے لگے تھے۔ کشمیری دروازے پر سکندر صاحب کا کلیسا آس پاس کی مساجد کی برابری کرتا معلوم ہوتا تھا۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ دلی کی کٹھالی اب بھی وہی کٹھالی ہے جس میں سونا، چاندی، تانبا، سب گل کر اور گھل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ کسی کو یہ گمان نہ تھا کہ اب کی بار جو بارش سنگ و آہن ہوگی اس میں ساری کٹھالیاں ٹوٹ جائیں گی اور اب کی بار خون کی جو ہولی کھلے گی اس میں لال حویلی کے رنگوں کا بھی خون ہو جائے گا۔

بتاریخ ۲۸ شعبان المعظم ۱۱۸۹ ہجرت نبوی مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۷۷۵ کو میرزا ابلاقی شاہ عالم بہادر شاہ ثانی کے فرزند اکبر مرزا معین الدین کی ہندو بیگم لال بائی کے بطن سے متولد ہونے والے فرزند سراج الدین عرف میرزا اَبّن کی تقدیر بظاہر بہت اچھی نہ تھی۔ ہر چند کہ معین الدین سب سے بڑے تھے، لیکن دہلی سے شاہ عالم ثانی کی طویل غیر حاضری کے سبب انتظامات ملکی و مالی بادشاہ کے منجھلے بیٹے میرزا سلیمان شکوہ کے ہاتھ میں تھے اور بخوبی انجام پا رہے تھے۔ ایسی صورت میں خلوے سریر بادشاہی کے وقت بادشاہ کون بنے گا، یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ بارے شاہ عالم ثانی کی مراجعت دہلی کے بعد پہلے تو میرزا غلام نجف خان، پھر نجیب الدولہ، پھر مہاداجی سندھیا، اور سب سے آخر میں لاٹ صاحب کلاں لارڈ لیک صاحب بہادر کی حفاظت میں فردوس منزل شاہ عالم بہادر شاہ ثانی نے ۱۷۷۱ سے ۱۸۰۶ تک پایۂ تخت دہلی سے حکومت کی اور انگریز کی نگرانی میں بادشاہت بآسانی معز الدنیا والدین ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ تا ۱۸۳۷) کو منتقل ہوگئی۔ لیکن اکبر شاہ ثانی عرش آرام گاہ کو میرزا سراج الدین سے زیادہ اپنے دوسرے بیٹے میرزا جہانگیر بخت سے محبت تھی اور انھیں ولی عہد تسلیم کرانے کے لیے عرش آرام گاہ نے کوششیں کیں۔ لیکن کچھ تو میرزا جہانگیر بخت کی انگریز دشمنی اور کچھ ان کی عادت شراب نوشی، یہ باتیں ولی عہدی کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہیں، یہاں تک کہ میرزا جہانگیر بخت کو دو بار جلاوطنی پر بنارس اور الٰہ آباد جانا پڑا اور وہیں ۱۸۲۱ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ لاش دہلی لائی گئی اور سلطان الاولیا سلطان جی صاحب کی مسجد کے صحن میں مدفون کی گئی۔

انگریزوں نے اعلان کر دیا کہ اب سراج الدین ہی ولی عہد ہوں گے۔ چنانچہ اکبر شاہ ثانی بادشاہ عرش آرام گاہ نے جب جان جان آفریں کو سپرد کی تو ۲۸/ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ کی رات کو تین بجے میرزا سراج الدین نے حضرت ظل سبحانی، خلیفۃ الرحمانی، بادشاہ جمجاہ، ملائک سپاہ، شہریار ظل اللہ، پناہ دین محمدی، رونق افزاے ملت احمدی، سلالۂ خاندان گورگانی، نقاوۂ دودمان صاحب قرانی، خاقان المعظم،

شاہنشاہ الاعظم، الخاقان ابن خاقان، السلطان ابن سلطان، صاحب المفاخر والمغازی، ولی نعمت حقیقی و خداوند مجازی، ابوالمظفر سراج الدنیا والدین محمد بہادر شاہ غازی، خلد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ، افاض العالمین برہٗ واحسانہٗ کے القاب وخطابات کے ساتھ جلوہ افروز وسادۂ بادشاہی ہوئے۔ امام بخش صہبائی کہ نوتا جپوش کے زمانۂ شاہزادگی سے متوسلین میں شامل تھے، بحرِفکرِ شعر میں غوطہ زن ہوئے اور رباعی کی بحر میں تین لآلیِ آبدار پر مشتمل قطعۂ تاریخ کہہ کر انعام وخطاب کے مورد قرار پائے۔

از نشۂ دولت بہادر شاہی
شد پر زمئے طرب ایاغ دہلی
بنشست بہ تخت دولت روز افزوں
نزہت بفزود ازو بہ باغ دہلی
تاریخ جلوس آں شہ والا قدر
آمد بہ لب خرد چراغ دہلی
۱۲۵۳

بعد کے لوگوں نے اسے انگریز کے غلبے کی برکت قرار دیا، یا اسے دلی کا آخری سنبھالا نام دیا، یا ہنداسلامی تہذیب کی ابدی روشنی کا کرشمہ سمجھا، لیکن حقیقت بہرحال یہی تھی کہ بہادر شاہ ثانی کی دلی میں وہ سب کچھ تھا جو دنیا کے بڑے سے بڑے شہر میں اس وقت یکجا ملنا مشکل تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر آباد، رعایا دلشاد، امیر اپنے مال میں مست، فقیر اپنی کھال میں مست۔ دلی صحیح معنوں میں بیت المعمور تھی۔

لیکن وزیر کا دل تو رنج سے بھرا ہوا تھا۔ وہ رامپور سے شاہ محمد آغا اور نواب مرزا کو لے کر یہاں چلی تو آئی تھی لیکن دلی کا گھر اور شاہجہاں آباد کا شہر اسے کاٹے کھاتے تھے۔ باپ ماں کی پرانی یادیں اور بچپن کے دنوں کی بے فکریوں اور ہر نئے دن کے ساتھ بڑھتے ہوئے اور نئی نئی بہاریں لاتے ہوئے اپنے عشوہ وناز وادا کی یادیں، وہ چاہنے والوں کا ہجوم اور اس کے دل میں شوق ستم رانی کا جوش اور پھر مارسٹن بلاک صاحب کے گذر جانے کے بعد نواب شمس الدین احمد کی خود سپردگیاں اور اس کی اپنی بے قراریاں، اور نواب کی شہادت اور اپنی بے کسی، یہ سب یادیں اس کے پردۂ ذہن پر اوراق مصور کی طرح روشن تھیں، بیک وقت دل کو ناکامی کے لہو سے بھر دینے والی اور جو نہ ہو سکا اس کے ہونے کی تمنا کی کھٹک دل میں ڈالنے والی۔ خوشگوار یادوں کے ساتھ بھی اس قدر افسوس اور دلگیری اور کڑھن وابستہ ہو سکتی ہے اس نے

کبھی سوچا نہ تھا۔ گلاب کو بے خیالی سے توڑنا چاہیں تو کانٹا چبھ کر احتجاج کرتا ہے کہ ہمارے پھول کو اتنا سرسری کیوں پکڑا۔ لیکن یہاں تو گلاب ہی کانٹا تھا اور اس کی ہر پنکھڑی ماضی کے رنگ و خوشبو میں غرق تھی لیکن اسے چھوئیں تو وہ بچھو پودے کی طرح ڈنک مارتی تھی۔ اور کیسے نہ چھوئیں، کہ اس کی خوشبو ہر سانس کے ساتھ تھی اور اس کا رنگ ہر نگاہ کے اندر تھا۔

ایسے عالم میں وزیر کو دہلی میں رہنا گوارا نہ تھا۔ لیکن رامپور بھی رہنے کے قابل کب تھا۔ منجھلی باجی کے سر پر وہ کتنا اور کس کس کا بوجھ ڈالتی، ایک وہ خود اور تس پر دو بچے کہ دونوں ہی اپنے اپنے عالم میں بڑھتے ہوئے پودوں کی طرح تھے کہ ہر دم دیکھ ریکھ اور کھاد پانی کا تقاضا کرتے تھے۔ اور کیا رامپور کی یادیں دلی کی یادوں سے کچھ بہت ہٹ کر تھیں؟ دلی جتنی گہری اور شاخ در شاخ نہ سہی لیکن رامپور سے وابستہ یادوں کی بھی جڑیں مضبوط تھیں اور ان کے پھل پھول بھی بیک وقت کڑوے اور میٹھے تھے۔ جب وہ رام پور سے چلی تو اسے ایسا لگا جیسے کسی جیتے سانس لیتے پودے کو پانی اور سائے سے یکقلم و یکلخت محروم کر دیا گیا ہو۔ لیکن خود اس پودے کے سائے میں افعیوں کی بھی بانبیاں تھیں اور وہ افعی اسے صبح و مساڈستے بھی تھے۔

اللہ کی شان کہ ایسا باغ جو بظاہر تو کبھی خزاں آشنا ہو ہی نہ سکتا ہو، بار بار خزاں کی بھوری سیاہ آنکھیں اس پر پڑیں اور اس کی ہواؤں کو مسموم کر دیں۔ جن ہواؤں کے دوش پر نوجوان بلبلوں کے نغمے ہمکتے اٹکھیلیاں کرتے باغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اڑے پھرے ہوں، اب وہ ہوائیں خود ماتمی ہو جائیں۔ وہ گل رعنا اور گل یاسمن اور گل مشکیجہ جن کی نازک چلبلی اداؤں پر باغ کے فوارے سر پٹکتے تھے اور نہروں کے اندر موجیں بیقرار ہوتی تھیں اب سر جھکائے اپنے وجود پر رنج کناں ہوں۔ وزیر نے آئینہ دیکھنا اور بالوں میں کنگھی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بتیس تینتیس سال کی عمر میں اکثر عورتیں بوڑھی ہو جاتی تھیں، بالخصوص اگر وہ بار بار ماں بن چکی ہوں۔ لیکن وزیر کے بدن میں کھنچاوٹ اور کساوٹ ویسی ہی تھی اور اس کے منھ پر نرمی اور بھولا الھڑپن ویسا ہی تھا۔ چہرے پر ایک شکن نہ تھی، اور شاہ محمد آغا کو اب بھی تھوڑا بہت دودھ پلانے کی مجبوری کے باوجود اس کی گات میں پژمردگی کا کچھ بھی اثر نہ تھا۔ وزیر کو اپنا روپ سروپ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اب تک اسے اس روپ نے کیسے کیسے کڈھب گھاٹ دکھائے تھے جواب اس کی کشتی حیات کو مصئون کسی ساحل پر لے جائے گا۔ اسے میر تقی صاحب کے شعر یاد آئے ؎

مستوری خوبروئی ہرگز نہ جمع ہووے
خوبی کا کام کس کی اظہار تک نہ پہنچا

یوسف سے لے کے تا گل پھر گل سے لے کے تا شمع
یہ حسن کس کو لے کر بازار تک نہ پہنچا

ہونھ، بھلا میر صاحب کو بسنت کی کیا خبر تھی۔ شاعروں کا کیا ہے، بس مضمون باندھتے رہیئے۔ مجھے مستوری خود ہی منظور نہ تھی، پر مجھے بکاؤ مال تقدیر کے بازار کا بننا حاشا منظور نہ تھا۔ جاتی میری جوتی بازار میں۔ لیکن میں تو مردوں کے بازار میں جائے بغیر ہی رسوا ہو گئی۔ شاید انجام ہر صورت میں ایک ہے۔ بلاک صاحب کبھی کہتے تھے کہ ان کے کسی بہت بڑے شاعر نے لکھا ہے کہ یہ انسان کیا ہے، دیوی دیوتاؤں کے سامنے ویسا ہی ہے جیسے شوخ بچوں کے سامنے تتلیاں، کہ وہ انھیں پکڑتے ہیں اور کھیل کھیل میں بال بازو ان کے نوچ ڈالتے ہیں جان ان کی لے لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں دیوی دیوتا نہیں ہیں لیکن ہندوؤں کے یہاں تو ہیں۔ شاید تقدیر کو یہ لوگ دیوی دیوتا کہتے ہوں... میری ساری کوشش کہ اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کروں... اب بھی یہی کوشش ہے شاید؟ لیکن اس وقت تو بس ان دو بچوں کے لئے جینا ہی سب سے سیدھی اور سچی راہ لگتی ہے۔

اے لو راہ کے نام پر میر صاحب کا ایک اور شعر یاد آ گیا۔ کیا رونگٹے کھڑے کرنے والی بات کہی ہے جیسے خوبی کے کام کے اظہار تک پہنچنے والے شعر کا جواب کہا ہے ؎

پہلا قدم ہے انساں پامال مرگ ہونا
کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا

پامال مرگ ہونے کے بعد بچا ہی کیا ہوگا جو مآل کی باتیں ہوں۔ زندگی مر مر کے جئے جانے ہی کو کہتے ہیں۔ شاید پیدا ہونا موت سے بھی بدتر ہے کہ تم پیدا ہی نہیں ہوئے ہو مر گئے ہو۔ لیکن اس موت میں بھی لذتیں کیا کیا ہیں راحتیں کیا کیا...

اسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ شاید شاہ محمد آغا دوپہر کی نیند سے جاگ پڑے ہیں، وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ حجرے میں گئی تو بچے کو گہری نیند میں پایا۔ شاید کوئی اور بچہ رہا ہو... یا شاید مجھے یوں ہی وہم ہوا ہو۔ پاس کی پلنگڑی پر حبیب النسا سکڑی پڑی سو رہی تھی۔ گھر میں صرف ایک خادمہ اور تھی۔ باہر کا کام کرنے کے لئے محلے کا ایک لونڈا صبح شام آجاتا تھا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب گھر میں ہر طرف نوکر ہی نوکر تھے۔ اسے ان دنوں کی آسائش اور تعیش کے جاتے رہنے کا اتنا افسوس نہ تھا جتنا اس اہتزاز و سرمستی کے اڑ جانے کا جو نواب شمس الدین احمد کی محبت میں اسے ملی تھی، اور پھر وہ گھر کی چہل پہل، وہ ہر

روز کا نئی امیدوں کے ساتھ طلوع ہونا... لیکن وہ جلسہ کس قدر جلد درہم برہم بھی تو ہو گیا۔

کیا اسے نواب مرزا سے امیدیں تھیں کہ وہ اس کی تنہائی کا مداوا اور اس کے بڑھاپے کا سہارا بنیں گے؟ اور شاہ محمد آغا؟ ان کے تو بڑے ہوتے ہوتے میں دنیا ہی سے چل بسوں گی۔ اب تو جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوگا وہ نواب مرزا ہی کے دم سے ہے اور انھیں کے دم سے ہوگا۔ لیکن اب اور کیا ہونا ہے؟ اب اور بچا ہی کیا ہے ہونے کو؟ کیا اب بھی مجھے زندگی سے اور معاملۂ حسن وعشق سے کچھ توقعات ہیں؟ حکیم جی نے کیا خوب کیا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

لیکن نہیں، کیا وہ سارا قصہ چاہنے اور چاہے جانے کی بھول بھلیاں تھا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے اچانک خواجہ صاحب سے واپسی کی وہ آندھی بھری رات سنسناتی ہوئی آ کھڑی ہوئی جب اس نے ماٹن بلاک صاحب کو پہلی بار دیکھا تھا... اسے لگا جیسے وہ صندوقچۂ فرنگ پر جھکی ہوئی تصویریں دیکھ رہی ہو۔

ان کا ارادہ تو مجھ سے نظریں ملانے کا نہ تھا، بلکہ سچ پوچھو تو میری طرف دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ وہ تو ہوا کے جھونکے نے میری چادر اڑا کر مجھے گویا طشت از بام کر دیا۔ میں نے گھبرا کر آنکھ اٹھائی تھی کہ نگاہ کو ان کی ایک لحظے کے لئے اپنے منھ پر دیکھا، اللہ کیا ڈھیٹ آنکھیں تھیں، گویا میرا سراپا ٹٹول رہی ہوں... اس رات مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ مرد کی آنکھ کس طرح ایک نقطے پر ٹھہری رہنے کے باوجود شعلۂ جوالہ کی طرح کسی کے پورے سراپے کو گھیرے میں لے سکتی ہے۔ کس طرح وہ آنکھ تجسس اور استفہام دونوں کا مظہر بن سکتی ہے۔ تجسس کہ ابھی اور کیا کیا بے نقاب ہونا ہے اور استفہام کہ اس میں ہمارے لئے کیا اور کتنا ہے... میرا تو سارا پنڈا مجھے خود ہی کچھ گرم لگنے لگا، جیسے انھوں نے مجھے دیکھا نہ ہو، چھو لیا ہو۔ مرد کی چاہت اور مرد کے لئے چاہت ایک ساتھ پیدا ہوتے میں نے سنی تھی، دیکھی کبھی نہ تھی۔

اس وقت تک تو دل میں میرے کچھ نہ تھا، اس بابت کہ میں زندگی کس طور کروں گی۔ بڑی کو زچ کرنے کے لئے میں کچھ بھی کہہ دیتی، لیکن میں اتنا ہی جانتی تھی کہ مجھے میری مرضی کے بغیر نکاح کی ہتھکڑی بیڑی کوئی نہیں پنہا سکتا، اور مرضی میری تو شاید شادی کرنے کی تھی بھی نہیں۔ پھر کیا تھی مرضی میری، منصوبہ کیا تھا میرا؟ پتہ نہیں، وہ دل ہی دل میں اکتا کر خود سے بولی۔ کوئی ضروری ہے کہ ہر چیز اعتبار سے کسی منصوبے کے ہو۔ لیکن میں تو یہ جانتی ہوں کہ مردوں کا کھلونا بنتا ہو یا مردوں کی کنیز یا مردوں کی

رکھیل، یہ سب عزت کو بیچنے کے دھندے ہیں۔ اور میں تو عورت کی عزت ہی کی پاسدار بننے کو دنیا میں آئی تھی شاید۔ تو پھر بلاک صاحب کی ایک نگاہ نے مجھے خاک کیوں کر دیا؟ ایسا تو نہیں کہ میں سوچتی کسی اور ڈھنگ پر تھی اور کرنی میری سب کی سب انھیں بے عقل دھی لگائیوں جیسی تھی جو بستر کے مزے اور دو وقت کی غلامانہ روٹی کو دنیا کی ہر شے پر فوقیت دیتی ہیں؟ خصم کیا سکھ سہنے کو یا پیٹ سے لگ کر رہنے کو۔

نہیں۔ میں تو کچھ اور بننے والی تھی، کچھ اور تھی۔ بلاک صاحب نے یوں کہو کہ مجھے رجھالیا۔ لیکن میں تو کھلی آنکھوں ان پر ریجھی تھی۔ یا شاید یہ تو نہیں کہ اس رات ہمیں وہ مل نہ گئے تھے تو ہمارا بہت برا دہاڑا ہونا تھا۔ میری عمر کی لڑکیاں راہوں کے لٹیروں کے ہاتھ لگ جائیں تو پہلے تو ان کی عزت لگا تار لوٹی جائے، اور پھر وہ چند ٹکوں کے عوض کسی نائکہ کے ہاتھوں فروخت کر دی جائیں۔ اور سچ پوچھو تو اچھے بھاگ ان کے جو چکلوں میں بک جاویں، کہ جنھیں یہ ظالم خود ہی رکھ لیویں انھیں تو لونڈی باندی سے بدتر جانیں اور ذرا سا بدن ڈھلا، روپ ذرا سا اترا، اور بچاریاں بوڑھی گائے کی طرح ہنکا کر نکال باہر اور میاں ہیں کہ دوسری تیسری کرنے پر مستعد۔ بیسی کھیسی ساٹھا پاٹھا جیسی مثلیں مردوں ہی کی تو بنائی ہوئی ہیں۔

مگر جذبۂ تشکر اپنی جگہ، کیا میں ایسی بھولی تھی جو کسی انجانے مسٹنڈے مردوے انگریز کی جھولی میں اپنا پت، اپنا سارا دین ایمان یوں بے پروائی سے ڈال دیتی؟ مجھے بلاک صاحب کے ساتھ جانا ہی جانا تھا، کہ بڑی کو اور اباجی کو اور کس طرح میں آگاہ کرتی کہ میں کل کی گڑیا نہ تھی اپنی مرضی کی عورت تھی اور وہ مجھے اچھے بھی بہت لگتے تھے۔ اور یوں تو نہیں کہ میں پہلی مسلمان عورت تھی جس نے فرنگی مرد کیا تھا۔ فیض النسا بیگم، وہ تو اعلیٰ حضرت عالی گوہر شاہ عالم بہادر شاہ فردوس منزل کی منھ بولی بیٹی تھیں جنھوں نے پامر صاحب سے بیاہ رچایا تھا، کیا حسن و جمال تھا، کیا رعب حسن تھا، سچ میں بادشاہ کی بیٹی لگتی تھیں۔ اور پھر وہ دکن والی بیگم بھلا سا نام تھا ان کا... خیر النسا بیگم، کہ آصف جاہ نظام الملک بہادر کے دربار میں جو کمپنی فرنگی کا وکیل ریزیڈنٹ تھا، کہتے ہیں انھوں نے اس سے شادی کے پہلے ہی رشتہ گانٹھ لیا تھا، اتنا کہ ان کا آگا بھاری ہو گیا تھا پھر تو اماں نانی کو اسی موئے مسٹنڈے فرنگی کو داماد کرنا پڑا۔ اس نے رکھا تو پھول پان کے رنگ لیکن کچھ برس بعد ادھر اس نے اولادوں کو کرسٹان بنا کر ولایت بھیجا اور ادھر خود بھی پٹ سے مر گیا۔ بیٹا بیٹی کچھ دن بعد اپنی اصل جڑ اپنا دین مذہب سب بھول گئے اور خیر النسا بیگم کسی اور فرنگی سے نتھ گئیں۔ اور فردوس منزل ہی کی ایک اور بیٹی جو لکھنؤ کے نواب کے یہاں بیاہی تھیں اور اس کے مظالم سے تنگ آکر نکل گئی تھیں، پھر گاڈنر صاحب انگریز کے بیٹے سے انھوں نے دوسرا بیاہ رچایا تھا۔

غرض کہاں تک کوئی نام گنائے، میں نے وہی کیا جو مجھ سے بہتر بیگماتوں نے کیا تھا۔ نہیں، پر ایک بات اور ہے۔ ان بیگمات کی زندگی کا محور و مرکز بس یہی تو تھا، کسی اچھے سے مرد سے نکاح بیاہ اور پھر اس کی حویلی میں تاعمر خانہ قید، کہ آواز تو آواز، سایہ بھی چادر میں لپیٹا رہے۔ وزیر، تو تو اونچے خیالات اور بڑے کھیل والی بیگما تھی۔ کیا تو نے بھی آخر کار، نہیں بلکہ جلد ہی، پہلا موقع ملتے ہی، مرد کا قلادہ خوشی خوشی گردن میں پہن لیا؟ نہیں، میں قلادہ کیوں پہنتی۔ میں تو...

...مگر ان باتوں سے کیا حاصل؟ اری نیک بخت، حاصل کیوں نہیں؟ اس دنیا میں مرد کیا ہے اور عورت کیا ہے، مجھے تو اسی سوال کا جواب درکار ہے۔ کیا دونوں بس لکھے پڑھے بولتے سوچتے چوپائے ہیں اور ان کا جینا صرف کھانے اور اپنے جیسی اولادیں بنانے اور موت کو دور سے دور تر رکھنے کی کوششوں کا نام ہے یا کچھ اور؟ لیکن مجھے اس سے کیا؟ میں تو اپنی ہی کہہ سکوں ہوں۔ کوئی روئے یا گائے یا چپ شاہ کا روزہ رکھے زندگی گذار دے لیکن سب اعمال اسی کے ہیں اور اپنی زندگی کی اچھائی برائی کے باب میں فیصلہ اسے ہی کرنا ہوگا۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ مجھے اپنے عورت بنائے جانے پر سخت شکوہ ہے...لوگ کہتے ہیں ایسی دوائیں ہوتی ہیں، نہیں تو ایسے عمل ہوتے ہیں جنھیں صحیح صحیح پڑھا جائے تو ان کی قوت سے اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے۔ میرے ہی محلے میں تو ایک حافظ جی تھے کہ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کوئی عمل جانتے ہیں جس کے زور سے ان کے یہاں بیٹے ہی بیٹے پیدا ہوتے ہیں۔ میں کہتی ہوں میرے ابا جی نے کیوں نہ وہ عمل سیکھ لیا...مگر سنا حافظ جی کسی کو بتاتے نہ تھے۔ نہ سہی، اور بھی تو ترکیبیں ہوں گی۔ یا اگر مجھے لڑکی ہی بنانا منظور تھا کہ انھیں لڑکیاں بہت پیاری تھیں...ایسا ہی ہوگا نہیں تو تابڑ توڑ تین تین بیٹیاں پیدا کر کے وہ دونوں اس قدر خوش نہ ہوتے...اماں کہتی تھیں، تیری پیدائش پر تو تیرے ابا جی کھلکھلائے پڑتے تھے...

...پر مجھے یہ منظور نہیں کہ دنیا کی آدھی آبادی، اور بھی حاکم آبادی، مجھے اپنی ایڑی تلے دبانے کو اپنا استحقاق جانے۔ کھیتی رکھے باڑ کو باڑ رکھے کھیتی کو یہ بس کہنے ہی کہنے کی باتیں ہیں عمل کوئی نہیں کرتا...مگر اس طرح الجھنے اور اپنا کلیجا چبانے سے کیا حاصل...ہائے یہ بلاک صاحب کا خاص انگریزی فقرہ تھا، جب میں رنجیدہ ہوتی یا ایسی ہی کسی بات کے چلتے منھ لپیٹ کر چپ کہیں پڑ جاتی تو وہ کہتے تھے، شاید ان کی فرنگی زبان میں کوئی محاورہ تھا، اپنا کلیجہ مت چباؤ چھوٹی بیگم، کاہے کو غم کرتی ہو۔ میں تو تمھارا ہوں...پر وہ سب بھی منھ دیکھے کی باتیں تھیں، میرا اور میرے بچوں کا انتظام کرنے کو ایک عمر پڑی تھی کہ جو عمر ایک دن کو بھی

کافی نہ ہوئی۔ لیکن میرے نواب صاحب مرحوم، وہ بھی میرے لئے کیا کر گئے جو میں ان کی یاد کو کلیجے سے لگائے اپنی روح کو رنڈ سالہ پہنائے دن رات ایک کروں۔ لیکن وہ بچارے آغا صاحب بھی تو مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور کیوں نہیں، آخر میں ان کی بڑھاپے کی بیوی اور ان کے بڑھاپے کی اولاد کی ماں تھی۔ مگر میں ہی ان کی جان کو نہ سہائی۔ بچارے شہید موت مرے اور کیسی بے کسی اور غریب الوطنی کی موت مرے۔ مجھے ان سے لگاؤ تو تھا ہی، اور ان کی ناز برداریوں کے سبب یہ لگاؤ اور بھی بڑھ گیا تھا لیکن یہ ناز برداریاں میرے دل سے نواب شہید کی یاد نہ چھڑا سکیں۔ بلاک صاحب بھی مجھے یاد آتے رہے ہیں لیکن ان سے زیادہ مجھے میرے بچوں کی یاد ستاتی رہی ہے پر میرے نواب صاحب تو جانے کس دنیا سے کتنی موہنیاں میرے لئے سیکھ کر پیدا ہوئے تھے کہ ان کی ایک بات ایک یاد ناخن تلے کی پھانس کی طرح ہر وقت میرے جی میں زندہ ہے۔ وہ میری بوٹیاں کاٹ ڈالتے پھر بھی میرے بدن کا ہر ریشہ میرے لہو کی ہر بوند انھیں کا نام پکارتی۔ اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ جوان خوبصورت تھے، مظلوم تھے، صاحب ثروت تھے۔ نہیں میرے ان کے دل کا سنجوگ ہی کچھ تھا۔

مگر میں تو اپنے کو بڑی سخت گیر جانچ پڑتال والی گردان رہی تھی، کہ جو مرد مجھے پسند کرے تو میں اس کے بارے میں سوچوں کہ میں اسے پسند کرتی ہوں کہ نہیں۔ تو پھر یہ سب عشق و عاشقی والی باتیں کیا معنی رکھتی ہیں کہ نواب صاحب میری بوٹی بوٹی بھی کاٹ ڈالتے تو بھی...

خیال کی لہر کیا جانے کہاں کہاں کے ساحلوں اور ٹاپوؤں کو چھو کر بہے جا رہی تھی۔ نہ جانے کتنے دن اس طرح گذرے، یا شاید یہ سب خیال اور اپنے دل سے یہ سب باتیں ایک ہی دن اور ایک ہی وقت کی تھیں۔ وزیر کے معمول کچھ بدل گئے تھے، اسے وقت کا اندازہ بھی ٹھیک سے نہ ہوتا تھا۔ حبیبہ کے بار بار کہنے پر بھی وقت پر کھانا نہ کھاتی، کئی بار تو کھانا رکھا رکھا ٹھنڈا ہو کر آخر اٹھا دیا جاتا۔ نواب مرزا کو کھانا کھلانا کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ دن کا کھانا گھر میں کھاتا نہ تھا اور رات کے کھانے کے لئے کوئی تخصیص نہ تھی، وہ جب گھر آتا اور جب اسے بھوک لگتی، حبیبہ سے کھانا مانگ لیتا۔ ماں کی حالت اس سے پوشیدہ نہ تھی، لیکن اس حالت کو سدھارا کیونکر جائے یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں لوگ شادی شدہ اور گھر گرہستی والے بن جاتے ہیں لیکن نواب مرزا کی طرف سے کوئی خفیف سا اشارہ، یا اس کے طور طریقوں میں کوئی معمولی سی بات بھی ایسی نظر نہ آتی تھی جس سے پتہ لگتا کہ وہ شادی کی طرف کوئی میلان رکھتا ہے۔ وزیر کو رہ رہ کے خیال آتا کہ نواب مرزا کی بارات اب چڑھنی چاہیئے، لیکن کسی نامعلوم ذہنی رکاوٹ کے

باعث وہ نواب مرزا سے اس معاملے میں سرسری، ابتدائی گفتگو کرنے پر خود کو آمادہ نہ دیکھتی تھی۔ یوں تو اس عمر، اور اس زمانے میں، اور نواب مرزا جیسے بے حد خوبصورت جوان کے لئے معاشقوں کے دروازے ہر طرف کھلے ہوئے تھے، اور زنانہ یا مردانہ، دل لگانے کے امکانات بے نہایت تھے، اور نواب مرزا کی پرنانی کا گھرانہ بھی تھا جہاں کبھی کبھی وہ رسماً جا نکلتا تھا، لیکن کہیں پر دل اٹکنے کا سلسلہ ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔

نواب مرزا کی تعلیم البتہ اب رک گئی تھی، کچھ تو اس وجہ سے کہ ملا غیاث صاحب رامپوری کی عمدہ تعلیم اور انتھک محنت کی دولت سے وہ فارسی اور تاریخ و فلسفہ میں اپنے ہم عمروں سے بڑھ کر تھا، اور کچھ اس وجہ سے کہ اب اسے بطور شاعر اپنی شناخت قائم کرنے کی لگی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں بہت اچھا شاعر بن سکتا ہوں اور بہت جلد استاد کا مرتبہ حاصل کرلوں گا۔ اسے شعر کہنے میں مزہ آتا تھا اور شعر پڑھنے میں بھی اتنا ہی، بلکہ اس سے بھی کچھ سوا، مزہ آتا تھا۔ اس نے اپنی قوت حافظہ کی دولت سے اپنے ہم چشموں میں اپنا سکہ بٹھا رکھا تھا، کہ پرانے فارسی استادوں سے لے کر میرزا غالب تک، اور ہندی میں حضرت میر تقی میر سے لے کر استاد ذوق تک اساتذہ کے ہزارہا شعر اس کو یاد تھے۔ سند دینے میں تو یگانۂ روزگار تھا، کہ اس کے کسی شعر میں کسی ترکیب یا فقرے یا لفظ کے استعمال پر کسی دوست یا شریک محفل نے کچھ تردد ظاہر کیا، اور ادھر اس نے بے کھٹکے ریختہ یا فارسی کے کسی مسلم الثبوت استاد کی سند پیش کی اور معترض اپنا سا منھ لے کے رہ گیا۔ حال ہی میں نواب مرزا کا ایک شعر بہت مشہور ہوا تھا ؎

ہو نہ کیوں بام بلند دوست پر اپنی نگاہ
کب بنے ہے پستیوں میں آشیان شاہباز

شعر تو اچھا تھا ہی، لیکن اس کی مزید وجہ شہرت یوں ہوئی کہ اطراف بداؤں کے ایک سید زادے، صاحب دل اور صوفی مزاج شاعر سید دلدار علی مذاق ان دنوں دہلی آکر تازہ تازہ خاقانی ہند کے شاگرد ہوئے تھے۔ استاد کے وہ اس درجہ معتقد تھے، اگرچہ غائبانہ، کہ انھوں نے استاد کی مناسبت سے اپنا تخلص مذاق قرار دیا تھا۔ چنانچہ وہ شاگردی کی نیت سے حاضر آستانۂ استاد ہوئے تو حسب ذیل شعر بھی انھوں نے خدمت میں پیش کیا ؎

ذوق تھا یہ ترے تلمذ کا
کہ تخلص کیا مذاق اپنا

حضرت خاقانی ہند کمال مسرور ہوئے اور مذاق کو سلسلۂ ذوق میں داخل کیا۔ ''دہلی اردو

اخبار' مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۴۴ میں خبر شائع ہوئی:

ان دنوں ایک شاعر مسافر یہاں وارد ہوئے ہیں۔ ہم سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ نہایت ذہین و فطین ہیں، فن شعر میں دستگاہ لائق رکھتے ہیں۔ خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے رنگ ڈھنگ کی طبیعت اس شخص کو مبدا فیاض نے عطا کی ہے۔ اس شہر میں آکر نسبت تلمذ شیخ موصوف سے حاصل کی۔ بہت محظوظ ہوئے۔ نام ان کا مولوی دلدار صاحب اور وطن شہر بدایوں ہے جو کہ مولد حضرت سلطان جی صاحب قدس سرہٗ کا ہے۔ حقیقت میں وہاں کی خاک آدم خیز ہے اور اکثر اہل دل وہاں کے سنے گئے ہیں۔ قرابت قریبہ ظہور اللہ خاں نوا سے رکھتے ہیں جو شاعر نامی ہم عصر مرزا علیہ الرحمۃ کے صاحب دیوان ہندی و فارسی تھے۔ تین چار بار ہم سے ان سے ملاقات ہوئی۔ بعض اشعار حسب فرمائش حضار عین جلسۂ احباب میں کہے اور سنائے۔ غرض اتنا تیز طبع، صاحب ذہن سلیم کم دیکھنے میں آیا۔

اتفاق کی بات کہ ایسی ہی کسی محفل میں نواب مرزا بھی موجود تھے۔ نواب شمس الدین احمد شہید کی فرزندی اور خاندان لوہارو سے نسبت کے باعث سبھی انھیں جانتے تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ نواب مرزا داغ ہر چند کہ مملکت سخن میں نو وارد ہیں لیکن خم و پیچ سے اس کی راہوں کے خوب ماہر ہیں۔ مذاق صاحب نے جب اپنے شعر سنا لئے تو دہلی کے شعرا سے بھی درخواست کی گئی۔ سب سے آخر میں نواب مرزا نے غزل پڑھی۔ جب وہ منقولہ بالا شعر پر پہنچے تو انھوں نے ایک صاحب کو پہلو بدلتے دیکھا۔ یہ حکیم غلام مولا قلق میرٹھی تھے، ریختہ میں مومن کے شاگرد اور مومن ہی کی طرح فارسی تراکیب کے دلدادہ، فارسیت کا رنگ اس لئے اور بھی چوکھا تھا کہ فارسی میں مولانا صہبائی ان کے استاد تھے۔ جب داغ کی غزل ختم ہوئی اور محفل برخاست ہونے کو ہوئی تو نواب مرزا نے حکیم صاحب کے پاس جا کر تسلیم کی اور اپنے مخصوص شیریں لہجے میں پوچھا جس پر رامپوری پٹھانی رنگ بہت خفیف سا تھا اور بھلا معلوم ہوتا تھا:

''بندے نے قبلہ کو کچھ پہلو بدلتے دیکھا تھا۔ اگر خادم کی کسی بیت میں کچھ خامی ملاحظے میں آئی ہو تو ملتمس ہوں کہ اپنی کوتاہی پر مطلع فرمایا جاؤں۔''

حکیم غلام مولا قلق صاحب کی طبیعت میں حیا بہت تھی، اور اسی لئے انھوں نے داغ کو بر سر محفل نہ ٹوکا تھا۔ اب جو داغ نے براہ راست انھیں مخاطب کر لیا تو وہ ایک ذرا چپ رہے، پھر متانت سے

بولے:

''جی، خامی تو کچھ نہیں، ایک اشکال البتہ تھا۔''

اب تمام اہل محفل جانا ملتوی کر کے جہاں جہاں تھے وہیں متوجہ ہو گئے۔ ''جی ارشاد۔ ہمہ تن گوش ہوں۔'' نواب مرزا نے خاکساری کے لہجے میں کہا۔

حکیم صاحب کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں کچھ پچھتاوا سا ہے کہ میں نے اشکال کی بات کیوں کہی۔ کہہ دیتا نہیں کوئی بات نہیں، تو معاملہ ختم ہو جاتا۔ اب انھیں کہنا ہی پڑا:

''میاں صاحب، اشکال بس اتنا سا ہے کہ'' آشیان شاہباز'' کی ترکیب تو خوب ہے، لیکن شہباز کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ آشیاں بناتا ہی نہیں، اس لئے...'' فرط حیا سے حکیم صاحب خاموش ہو رہے۔

''حضور کی کرم ارزانی ہے کہ اس قدر توجہ فرماتے ہیں، لیکن آشیان شاہباز کی ترکیب کلیم ہمدانی نے باندھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔'' یہ کہہ کر داغ نے بڑی کھلی ہوئی شستہ آواز میں شعر پڑھا۔

از نشان خون ناحق کشتگاں اوراچہ باک

بال کنجشک است فرش آشیان شاہباز

کچھ تو کلیم ہمدانی کے شعر کی خوبی، اور کچھ برجستہ سند کی تحسین، حضار مجلس سے داد کا غلغلہ اٹھا۔ حکیم صاحب نے آگے بڑھ کر داغ کو گلے سے لگا لیا اور بولے:

''سبحان اللہ، خدا خوش رکھے۔ کیا بے تکلف سند دی اور کیا عمدہ شعر پڑھا۔ میں استاد کی بھی مجلس میں آپ کا ذکر کروں گا۔ یوں ہی شعر کہتے رہیں، آپ انشاء اللہ العزیز دلی کی آبرو ہوں گے۔''

حکیم غلام مولا قلق تو کلیم ہمدانی کا شعر زیر لب گنگناتے ہوئے رخصت ہوئے، ادھر میر دلدار علی مذاق نے نواب مرزا کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا، ''بداؤں مراجعت سے پہلے آپ سے مزید ایک ملاقات کا متمنی رہوں گا۔'' دل میں انھوں نے یہ بھی سوچا کہ میں بھی آج ہی استاد سے ان صاحب زادے کا تذکرہ کروں گا۔ ایسا نہ ہو حکیم صاحب انھیں مومن خاں صاحب کا شاگرد بنوا دیں، انھیں تو ہمارا استاد بھائی بننا چاہیئے۔

شعر و سخن کی دنیا میں طلوع ہونے والے تارے کی چمک اور گرمی سے اصحاب شعر کے دل روشن اور گرم ہونے لگے تھے۔ بزرگوں کو اشتیاق تھا کہ دیکھیں یہ کنجشک نو پر کبھی سیمرغ بنتا ہے کہ نہیں، اور

جوانوں کو اتفاق تھا کہ اس عمر میں ایسا نابغہ کم دیکھنے آیا ہے۔ داغ کو جس طرح دوسروں کے اشعار کثرت سے ازبر تھے، اسی طرح وہ زود گوئی میں بھی کمال رکھتا تھا۔ اب قہوہ خانوں میں اس کے دوست ہمجولی بارہا شرط لگا کر شطرنج کھیلتے تھے کہ ہار و گے تو فی البدیہہ غزل کہنی ہوگی۔ پھر نواب مرزا کا کھیل دیکھنے اور اس کے مدمقابل کو عمدہ عمدہ چالیں بتانے کے لئے لوگوں کا ٹھٹھ جمع ہو جاتا۔ فقرے بازیاں ہوتی رہتیں، اچھی چالیں بتانے کے شوق میں کئی کئی لوگ ایک ساتھ بول پڑتے اور نواب مرزا کی بازی جو سست ہوتی نظر آرہی تھی، اب تیز ہو جاتی۔ سارا مقصد یہ ہوتا کہ نواب مرزا کو ہرا کر انھیں کوئی ٹیڑھی زمین دے دیں گے اور کہیں گے کہ ابھی لاؤ سات شعر کی غزل۔ نواب مرزا کی شطرنج اچھی تھی، اس لئے مدمقابل کے مشورہ پردازوں کے باوجود اس کو ہرانا آسان نہ ہوتا تھا۔

''ابے یار حمید تیرا تو گھوڑا گدھا بنا بیٹھا وا ہے۔ اسے اٹھا کر فرزیں کے پیچھے لگا لو میرے بھائی۔''

''نہ۔نہ۔ ایسا نہ کیجو بھائی حمید۔ ان میاں خان کی عقل تو گھاس کھا گئی ہے۔ حمید میاں صاحب، تم تو فرزی والے پیادے کو ان کے رخ پہ بڑھائیو پھر دیکھیو، اسے کہویں ہیں کھیل۔''

''اجی واہ، کیا دوست ہیں کہ دشمن کے بھی کان کاٹیں ہیں۔ اے جی بھائی جان، پیادہ آگے جائے تو نواب مرزا کا گھوڑا آزاد ہو جاوے گا۔''

''یار تم لوگ تو خچروں سے بھی بڑھ کر گھوڑے گدھے کے پگھے سے بندھے وے ہو۔ دیکھتے نئیں کہ نواب مرزا پانچ چالوں میں مات دے رے ہیں۔ میاں میری مانو تو اپنے باشاہ کو واپس قلعے میں لے چلو ہیاں کا مورچہ مخدوش ہو رہا ہے۔''

اسی طرح باتوں باتوں میں ایک فریق مات کھا جاتا، اور مات کھانے والا نواب مرزا ہوتا تو یاران محفل میں جو شاعر ہوتے ان سے کہا جاتا کہ مصرع طرح تجویز کریں، ''لیکن ردیف ہو ذرا ٹھنکتی وی سی کہ گھوڑے کی طریوں کڑک دوڑتی ہوئی جائے، ذرا ان میاں صاحب کو پتہ تو لگے کہ رامپور سے پوئیاں پوئیاں کیونکر دلی آتے ہیں۔'' اس پر ایک قہقہہ لگتا جس میں نواب مرزا کی آواز سب سے بلند ہوتی۔ پھر نواب مرزا حاضرین میں سے کسی کو مخاطب کر کے کہتے:

''ہاں بھئی ان فیل بے زنجیر کو سنبھالنا، بلبلائے پھر رہے ہیں کہیں اپنی ہی صفوں پر نہ چڑھ دوڑیں۔''

اس پر بڑا زوردار قہقہہ اڑا، کہ اکثروں کے ذہن میں ایک فحش مثل بھی کوند گئی جو ایسے ہاتھی

کے متعلق تھی جو اپنی ہی فوج پر ہلہ بول دیتا ہے۔

چار پانچ مصرعوں اور فقروں کے ردوبدل کے بعد کہیں مصرع طرح تجویز ہوتا، مثلاً ع

آتے ہوئے اس گھر میں قضا کو نہیں دیکھا

مصرع پورا ہوتے ہی نواب مرزا نے مصرع لگایا ع

جنت ہے مگر خانۂ دشمن بھی الٰہی

اور ابھی شور تحسین کی گونج باقی تھی کہ داغ نے دو شعر اور پڑھ دیے۔

اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصح مشفق
دیکھا ہے کہ اس ماہ لقا کو نہیں دیکھا
افسوس کہ فرصت میں کبھی غور سے تم نے
افسانۂ ارباب وفا کو نہیں دیکھا

''نہیں نہیں۔ یہ ان صاحبوں کی ملی بھگت تھی۔ کوئی بھی اس کمال سرعت سے ایسے برجستہ چست بندش والے شعر نہیں کہہ سکتا۔'' ایک صاحب نے فرمایا۔ وہ فخر الشعرا میر نظام الدین ممنون کے شاگرد اور چھوٹے بھائی میر باقر علی المتخلص بہ جعفری تھے اور بھائی کے انتقال کے کئی مہینے بعد اب تک ان کے غم میں سیاہ رومال کمر سے باندھتے تھے۔ ابھی ان کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ داغ نے مقطع پڑھا۔

جب داغ کو دیکھا کسی بت خانے میں پایا
گھر میں کبھی اس مرد خدا کو نہیں دیکھا

داد کے غل سے قہوہ خانے کی چھت اڑی جا رہی تھی لیکن میر باقر علی جعفری نے کہا، ''ٹھیک ہے، مناسبتیں خوب ہیں، شعر رنگین ہے، پر مطلع تو کہا ہی نہیں۔''

ایک دو حاضرین نے گھور کر دیکھا، مگر میر محمد علی تشنہ، کہ اب ان کی مستی و برہنگی کا زمانہ آغاز تھا، لیکن نگاہ و ذہن چالاک رکھتے تھے، معنی خیز مسکراہٹ مسکرا کر بولے:

''تو حضور خود ہی ارشاد فرما دیتے، اس کم سن چھوکرے کو کہاں تک مکلّف کریں گے۔''

نواب مرزا نے فوراً سمجھ لیا کہ اشارہ میر صاحب کا کس جانب ہے، انھوں نے سرو قد کھڑے ہو کر سلام کیا اور کہا، ''اعلیٰ حضرت کو زحمت کیوں دیتے ہیں سرکار، مطلع حاضر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے مطلع پڑھا۔

گر میرے بت ہوشربا کو نہیں دیکھا
پھر دیکھنے والے نے خدا کو نہیں دیکھا

داد کے ڈونگروں کے درمیان محمد علی تشنہ چپ بیٹھے جھومتے رہے۔ جب شور تھما تو انھوں نے کہا، ''سبحان اللہ میاں صاحب زادے، ایک دن تم ہم سب تشنگان سخن کی سقائی کروگے۔ بس ایک بات تھی کہ ''پھر دیکھنے والے'' کی جگہ ''اس دیکھنے والے'' ہو جاتا تو شعر رنگ وسنگ میں گوہر شاہوار ہو جاتا۔''

نواب مرزا نے آگے بڑھ کر تشنہ کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا، ''جاے استاد خالیست۔''

''میاں ہم کہاں کے استاد اور کہاں کے نقاد۔ تمھیں تو میاں ابراہیم صاحب کے در پر دستک دینی چاہیے۔''

''جی بہت بہتر۔ انشاء اللہ وہاں حاضری کی کوئی سبیل جلد نکالوں گا۔''

ایسی ہی ایک محفل کسی دوست کے یہاں منعقد تھی۔ منشی گھنشیام لال عاصی، شاہ نصیر کے نامی شاگرد، میاں ذوق سے چڑے ہوئے، بعض لوگ انھیں درجۂ استادی ہی پر فائز قرار دیتے تھے، وہ بھی موجود تھے۔ مشکل زمینوں میں طاق، مضمون آفرینی میں شہرہ آفاق، صاحب علم وفضل، خوشنویسی، پیراکی، موسیقی، یہ سب ان کی نس نس میں بھرا ہوا تھا۔ تمام عمر دلی سے باہر نہ گئے اور خود کو بجا طور پر دہلی کی تہذیب کا امین سمجھتے رہے۔ انھیں نواب مرزا کی زود گوئی کے قصے سن سن کر اشتیاق تھا کہ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔ ذوق سے ان کی بنتی نہ تھی، اور غالباً اسی وجہ سے بادشاہ سلامت سے بھی خفا رہتے تھے کہ شاہ نصیر مرحوم کی ''تیلیاں'' والی غزلوں کے معرکے میں قدرتی طور پر عاصی نے شاہ نصیر صاحب کا ساتھ دیا تھا اور حریفوں کے ناطقے بند کر دیے تھے، لیکن حضرت ابوظفر سراج الدین نے بھی قدرتی ہی طور پر اپنے استاد ذوق کا ساتھ دیا تھا۔ بلکہ ایک روایت تو یہ بھی تھی کہ حضرت والا نے (وہ زمانہ بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کا تھا) کسی مولوی رشید الدین کو لکھا کہ ''ہندو کافر کی تعریف نہ کرنا۔'' وہ خط مشاعرے میں پیش ہوا اور سب شعرا نے اس کو تعصب قرار دے کر ایماناً کہا کہ عاصی کی غزل لاجواب ہے اور ذوق کی غزل پر فوقیت رکھتی ہے۔ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طبیعت میں صلح کل اور اپنی رعایا کے تئیں بے لوث اور بے لاگ محبت کا جو مادۂ وافر تھا، اس کو پیش نظر رکھیں تو یہ روایت بالکل وضعی معلوم ہوتی ہے۔ ولی عہد بہادر دل سے متمنی ضرور رہے ہوں گے کہ ان کے استاد کی فتح ہو، لیکن وہ اتنے احمق اور تنگ نظر بھی نہ تھے کہ کسی مجہول

سے مصاحب سے ایسی بات کہیں، اور وہ بھی لکھ کر۔ بہر حال، عاصی کے دل میں ابوظفر بہادر کے خلاف ایک گرہ پڑ ہی گئی تھی اور اسی لئے استاد ذوق سے بھی وہ صاف نہ تھے۔ انھوں نے شاید میر محمد علی تشنہ کی بات کے بارے میں سن لیا تھا کہ نواب مرزا کو تو ذوق کا شاگرد ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ غالباً ان کے اشارے پر ایک صاحب نے داغ سے کہا:

''میاں صاحب زادے، ہم ذرا مشتاق ہیں، چرچے بدیہہ گوئی کے آپ کی بہت سنے ہیں۔''

''جی، میں حاضر ہوں، فرمائیں۔''

''لیجئے، میاں جرأت کے مصرعے پر کچھ شعر سنایئے، لیکن التزام وہی ہو جو استاد نے رکھا ہے، سنئے، ان کا مطلع ہے۔

آواز کے تصدق اور گفتگو کے صدقے

اس ناز کے تصدق اور گفتگو کے صدقے

لہٰذا آپ بھی یوں ہی کہیں۔''

منشی گھنشیام لال عاصی کے چہرے پر ناگواری کے ہلکے سے آثار پیدا ہوئے، گویا امتحانی مصرع انھیں پسند نہ آیا ہو۔ لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں، نواب مرزا نے البتہ جواب دیا:

''حضت شعر تو میں اس زمین و بحر میں ابھی کہہ دوں، لیکن یہ کچھ مشکل امتحان نہ ہوا۔ یہاں تو ایک مصرع اور ایک لفظ ہی کہنا ہے، یہ تو آسان سی بات ہے، مثلاً شیخ جرأت صاحب ہی کا یہ مطلع ملاحظہ ہو۔'' یہ کہہ کر نواب مرزا نے شعر پڑھا۔

ہنستے آنا ترا قیامت ہے

مسکرانا ترا قیامت ہے

پھر ہنس کر نواب مرزا نے کہا، ''صاحب، آپ ملاحظہ کرتے ہو؟ ہر بار ایک لفظ ڈھونڈ لیجئے اور مصرع تیار، سنئے۔

دمساز کے تصدق اور گفتگو کے صدقے

ہمراز کے تصدق اور گفتگو کے صدقے

جس ساز میں ہو سوزش جس بات میں ہو شورش

اس ساز کے تصدق اور گفتگو کے صدقے''

پھر ایک لمحے سے بھی کم توقف کرکے نواب مرزا نے اور بھی ہنس کر کہا، ”لیجیے، اور سنیے۔

رات آنا ترا قیامت ہے
آ کے جانا ترا قیامت ہے
غرۂ عید سا بس اک لمحہ
ایسا آنا ترا قیامت ہے“

فرمائش کنندہ منھ پھاڑے ہوئے اس آمد آمد بہارِ سخن کو تک رہے تھے لیکن گھنشیام لال عاصی کے چہرے پر خفیف سا تبسم تھا۔ انھوں نے کہا:

”میاں نواب مرزا، بات تو آپ نے بے شک درست کہی۔ غزل میں ایسے شعر کہنا آسان ہے۔ معلوم ہوا آپ کا ذوقِ سلیم اور فنِ شعر پر طبیعت آپ کی حاوی ہے۔ لیکن رباعی، وہ چیزے دیگر است...“

”جی ہاں، کیونکہ وہاں دو نہیں بلکہ چار مصرعے مربوط کرنے ہوتے ہیں۔“

”بہت خوب، بہت درست۔“

نواب مرزا کے چہرے پر ایک ذرا چالاک سی مسکراہٹ آئی۔ حسنِ اتفاق سے اس نے کل ہی کمال اسمٰعیل کی ایسی ہی ایک رباعی کے تتبع میں ایک رباعی کہی تھی۔ ”تو حضور، ارشاد ہو تو رباعی عرض کیجیے۔“

”کیا ابھی، فی البدیہہ؟“

”حضرت جو بھی سمجھ لیں، میں ابھی پیش کر سکتا ہوں۔“ نواب مرزا نے گول مول سا جواب دیا۔

”تو کیوں نہیں،“ عاصی نے کہا۔ ”ابھی سنوا دیجیے۔ سب مشتاق ہیں۔“

”بہت بہتر، میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ عرض کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر نواب مرزا نے نہایت درجہ روانی کے ساتھ رباعی پڑھی، کسی کو محسوس بھی نہ ہوا کہ پہلے کی کہی ہوئی ہے۔

سمجھا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے
کہتا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے

گھنشیام لال عاصی اپنی جگہ پر اچھل پڑے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر پکارے، ”ہائے ظالم کیا مصرعے بہم پہنچائے۔ دیکھوں اب تیسرا مصرع کیا لگتا ہے۔ صاحب، پڑھیے۔ پڑھے جائیے۔“

نواب مرزا نے نیم قد اٹھ کر سلام کیا اور رباعی دوبارہ شروع کی۔

سمجھا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے
کہتا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے

''جی، اور تیسرا مصرع حاضر کرتا ہوں ؎

افلاک پہیلیاں بجھاتے ہی رہے''

ابھی نواب مرزا کی آواز گونج ہی رہی تھی کہ سامعین میں سے ایک صاحب نے نیم قد اٹھ کر نعرہ کیا:

''اے واللہ۔ بوجھا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے! سبحان اللہ۔ جی چاہتا ہے منھ چوم لیجیے۔ میاں داغ، اللہ آپ کو اور بھی چمکائے۔'' یہ صاحب بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے، نواب حاتم خان کے پوتے تھے، فدا تخلص اور میرزا فدا حسین نام تھا۔

داغ کے چہرے کی بے حد ملاحت اور نرماہٹ کے پیش نظر ''جی چاہتا ہے منھ چوم لیجیے'' والے فقرے نے کئی لوگوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا، لیکن داد دینے میں سب برابر کے شریک تھے۔ داغ نے پوری رباعی ''واہ واہ، سبحان اللہ، درست، نہایت درست'' کے ڈونگروں میں نہاتے ہوئے پھر پڑھی ؎

سمجھا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے
کہتا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے
افلاک پہیلیاں بجھاتے ہی رہے
بوجھا ہی نہیں کوئی کہ دنیا کیا ہے

جب داد کا شور کچھ تھما تو گھنشیام لال عاصی نے بڑھ کر نواب مرزا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

''واللہ آج اگر ہمارے شاہ صاحب اعلیٰ اللہ مقامہم تشریف فرما ہوتے تو میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا۔ یہ جوہر نایاب انھیں کے گنج شائگاں کی رونق کے شایان تھا۔''

نواب مرزا نے جھک جھک کر سلام کیے، عاصی اور اپنے میزبان سے رخصت لی اور وہاں سے اٹھ کر سیدھا ماں کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''اللہ بچے میاں آپ کا چہرہ کیوں تمتمایا ہوا ہے؟ نصیب دشمناں جی تو ماندہ نہیں؟'' وزیر گھبرا کر بولی۔

''جی نہیں اماں جان۔'' نواب مرزا نے ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں سوچتا ہوں...'' لیکن اسے فوراً ہی خیال آیا کہ ماں کی تنہائی یا بے کس وکو ہونے کے بارے میں کچھ بھی کہوں گا کہ

میں متفکر ہوں، آپ کا دکھ کیسے دور کروں، تو وہ فوراً برا مان جائیں گی۔ مربیانہ لہجے کا شائبہ بھی ہو تو وہ فوراً محسوس کر لیتی ہیں۔ لیکن نواب مرزا کو یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ تنہائی اور تنگی اوقات دونوں ہی اس کی ماں کے لئے مقدر ہو چکے تھے۔ جس فراغت، بلکہ اکثر عیش کی زندگی کی وزیر نے عادت ڈال لی تھی، اس کی راہیں اب مسدود تھیں۔ خرچ کم کرتے کرتے وزیر نے اب گھر کے کاموں میں بھی جیبہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ منجھلی کے رامپور چلے جانے کے بعد وزیر کا باہر آنا جانا تو یوں ہی نہ ہونے کے برابر تھا، اب عمدہ خانم جب دہلی آتیں بھی، اور کبھی کبھی وہ کئی مہینے قیام کے لئے آتیں، تو وہ خود ہی وزیر کے گھر چلی آتیں کہ وزیر کو پالکی سواری اور آنے جانے کے لئے اچھے کپڑوں کا انتظام نہ کرنا پڑے۔ نواب شہید کے مزار پر بھی وزیر کی حاضری اسی لئے بہت شاذ ہو گئی تھی کہ قدم شریف تک بھی پالکی کہاروں کا انتظام اور وہاں کے حاجت مندوں کو کچھ دینے دلانے کا انصرام اس پر گراں ہونے لگا تھا۔

دوسری طرف، نواب مرزا پر یہ بات بالکل کھلی ہوئی تھی کہ مجھے شعر و سخن ہی کو اپنا فن بنانا اور شعر و سخن ہی کو اپنی معیشت کا سہارا بنانا ہے۔ ماں کی خدمت اور اس کے اسباب حیات کی تقصیر کو کم کرنا بھی اسی وقت ممکن تھا جب نواب مرزا خود بطور شاعر اس لائق ہو جائے کہ کوئی رئیس اسے اپنے یہاں نوکر رکھ لے۔

لیکن تمام ہونہار پن اور اولوالعزمی کے باوجود وہ منزل ابھی نواب مرزا کے لئے دور تھی۔ اب وہ یا تو مشق شعر و شاعری کو ایک حد تک نظر انداز کر کے کسی رئیس کے یہاں کسی غیر شاعرانہ خدمت پر خود کو نوکر رکھوا لے، یا پھر اپنے ساتھ اپنی ماں کو بھی تنگی ترشی میں رکھے۔ لیکن نوکری ملنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ اس کے شہید باپ کا کوئی ایسا پس ماندہ یہاں نہ تھا جسے نواب مرزا یا وزیر سے کچھ مجانست یا قلبی ہمدردی ہو۔ افضل النسا بیگم اس کی بڑی ماں تو نواب مرزا اور وزیر خانم کے وجود ہی سے منکر ہونا بہتر سمجھتی تھیں کہ انھیں معلوم تھا کہ قانون فرنگ کی رو سے غیر منکوحہ عورت کا بیٹا بھی باپ کی املاک پر استحقاق رکھتا تھا۔ لہٰذا اگر نواب مرزا یا وزیر خانم کو کچھ بھی موقع قدم جمانے کا کہیں مل گیا تو ماں بیٹا نواب شہید کے ترکے پر کوئی دعویٰ بھی کر سکتے تھے۔ آخر ان لوگوں کا کوئی خاندان تھا نہ ذاتی امارت، نہ اسلاف سے ملی ہوئی ثروت۔ ایسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں، یہ ان کا خیال تھا۔ دوسری طرف یہ بھی بات تھی کہ یہ دہلی وہی دہلی تھی جہاں اس کی ماں کے بقول انگریز بہادر نے بزمانہ مقدمۂ قتل فریزر اس کے باپ کے اعزا ہی نہیں نوکر چاکروں تک کا بازاروں میں نکلنا بند کر دیا تھا۔ اور تب سے لے کر اب تک رعایا کے دلوں میں انگریز کی ہیبت اور بھی افزوں ہو چکی تھی۔ ایسے میں کس دہلوی رئیس کا بوتا تھا کہ وہ نواب شمس الدین احمد کے بیٹے، اور وہ بھی ناجائز

بیٹے کو اپنے یہاں نوکر رکھے۔

تو بظاہر یہی راہ بہتر تھی کہ نواب مرزا بہ سرعت تمام خود کو شاعر کی حیثیت سے قائم اور مستحکم کر لے اور پھر کسی رئیس سے متوسل ہو کر اپنی ماں کے لئے اور اپنے لئے مناسب آذوقۂ حیات کا بندوبست کر سکے۔

''کس سوچ میں ڈوب گئے نواب مرزا۔ آپ کچھ کہہ رہے تھے؟''

ماں کی پیار بھری آواز سن کر نواب مرزا اپنے خیالات پریشاں کے تنگ کوچوں سے باہر آیا، لیکن اس نے کچھ کہا نہیں، ایک لحمہ ماں کا منھ تکتا رہا۔

''اے یہ کیا ہونقوں کے مانند منھ پھاڑے تک رہے ہیں میاں صاحب۔ کچھ تو کہیئے کیا دل کو کوئی الجھن ہے؟'' وزیر نے بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا، پھر پکاری۔ ''اے بی حبیبہ بچے میاں کے لئے کھانے کا بندوبست نہیں کر رہی ہو کیا؟''

''جی ہاں خانم صاحب، کھانا ہی لگوانے جا رہی تھی۔'' حبیبہ نے پاس آ کر نواب مرزا کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جانی رام کو بازار بھیجا ہے روٹیوں کے لئے۔ بس وہ آ جائے تو جھپا جھپ کھانا لگا دوں گی۔ کیا بات ہے آج میاں صاحب کی بھوک کچھ چمکی ہوئی ہے کیا؟''

دلی کے اکثر متوسط گھرانوں کی طرح وزیر کے یہاں بھی اب روٹی باہر سے بروقت منگا لی جاتی تھی، صرف سالن گھر میں پکتا تھا۔ ''جی، تو آپ کیا چاہتی ہیں، ہم کھانا نہ کھایا کریں؟'' نواب مرزا نے ہنس کر کہا۔

''صاحب زادے، بات یہ ہے کہ نام خدا آپ ہیں شاعر، بلکہ استاد شاعر۔ اور شاعروں کو دیکھ کر بھوک بھاگ جاتی ہے۔'' حبیبہ نے شرارت اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ فقرے کے دومعنی وزیر اور نواب مرزا دونوں پر عیاں تھے۔

وزیر مسکرا کر بولی، ''اے چلو ہٹو بھی حبیبہ، شاعر لوگ کیا بھوکے رہیں ہیں؟''

لیکن شاعروں کے ذکر نے نواب مرزا کو اپنی بات کہنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا:

''اماں جان، وہ... بات وہ یہ ہے کہ مجھے شاعر ہی بننا ہے۔ شعر سے روٹی کمانی ہے، آپ کی نگہداشت کرنی ہے۔ شاعری کے سوا کار دیگر از ما نمی آید۔''

وزیر کے چہرے پر محبت بھرا تبسم آیا، لیکن تبسم اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھوں تک نہ پہنچ سکا۔

اس کی آنکھوں سے ہلکا سا تفکر، بلکہ فکرمندی جھلک رہی تھی۔ پھر بھی، اس نے ایک لحظہ توقف کے بعد کہا:

''لو بھئی سپاہی زادہ اور سخنوری کرے، خوب۔ بہت خوب۔ اب میں کیا کہہ سکوں ہوں، شمشیر سخن بھی کوئی شے ہووے ہے۔''

''میرزا نوشہ بھی تو سپاہی زادے ہیں، تو کیا وہ شاعر نہیں ہیں اماں جان؟'' نواب مرزا نے بحث کے انداز میں نہیں بلکہ گفتگو کے انداز میں کہا۔

''اے بیٹا وہ تو اپنے کو نواب زادہ بھی کہیں ہیں...''

''تو میں بھی تو نواب زادہ ہوں اماں جان۔''

وزیر کہنا چاہتی تھی، پر تیرے آسمان کا سورج تو کب کا غروب ہو چکا میرے بیٹے۔ تیرے دوسرے باپ کو بھی قزاق اجل نے پردیس میں لوٹ لیا۔ اب تو کس برتے پر تتا پانی کہتا ہے۔ لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے پر تفکر آنکھوں سے بیٹے پر دوبارہ نظر کی۔ وہ سیاہ شعلے کی طرح تپتا ہوا کتابی چہرہ، ستواں ناک اور چہرے کے نقوش بالکل باپ جیسے، لیکن رنگ ماں سے بھی زیادہ دبتا ہوا، آنکھیں ماں کے دیدوں جیسی شربتی، نہایت بڑی بڑی جن میں ہلکے گلابی ڈورے، گردن سیدھی، پیشانی اونچی اور قد افراز، انداز نشست و برخاست بھی بالکل باپ جیسا۔ چہرے پر سبزہ آغازی اس قدر بھلی لگتی تھی کہ جی چاہتا تھا سامنے بٹھلا لیجے اور دیکھتے رہیئے۔ سر پر رواج زمانہ کے موافق چمکیلے پٹے دار بال گردن سے ذرا نیچے تک، چوگوشیہ سیاہ مخملی ٹوپی جس کے گوشوں اور کناروں پر سنہری کام، بر میں سبز گلبدن کا ڈھیلا پاجامہ، جامہ زیبی ایسی کہ گل داؤدی بھی نثار ہو... ایسے شخص کو تو بادشاہ ہونا چاہیئے تھا، وزیر نے دل میں کہا۔ لیکن ہائے افسوس کہ اس وقت بادشاہی کیا، میرے لال کے لئے دو وقت کی شریفانہ روٹی اور رات کا آرام بھی نصیب نہیں، تس پر یہ شوق کہ شاعری کو تلاش معاش کا بہانہ بنائیں گے۔ لوگ دن رات سعی کرتے ہیں، کسی بڑے اور شہرت مند استاد کا دامن پکڑتے ہیں، تب کہیں جا کر مدتوں میں خود استاد کا درجہ حاصل کرتے ہیں اور وہ بھی تب، جب استاد فارغ الاصلاح قرار دے دے۔ شاعر بننا کچھ ہنسی نہیں ہے، اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کہ بس، دن بھر پیستے ہیں تو چٹکی بھر اٹھاتے ہیں۔ اور پھر بھی کامیابی مقدر کی پابند ہے...

اس نے دوبارہ سر اٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کچھ اعتماد، کچھ ضد، اور کچھ بچوں کی طرح مچل جانے کے تاثرات گھل مل گئے تھے۔ وزیر نے دل میں کہا، شاید یہ محض بال ہٹ سی کوئی بات ہے، بچہ ہی تو ہے۔ سمجھاؤں بجھاؤں یا ابھی بات کو ٹال جاؤں تو شاید ارادہ بدل لے۔ مجھے جلدی بھی

کیا ہے۔ پھر اسے معاً سوجھی کہ ارادے کی صلابت بفور معلوم کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اس نے مسکرا کر گلا صاف کیا اور اپنی نہایت خوش آئند آواز اور گفتگو کے لہجے میں مصحفی کی رباعی پڑھی ؎

ہے ہم کو تو شعر کا فقط اک سودا
ہو ہم سے نہ کار دیں نہ کار دنیا
ہوتی ہے جنھیں کہ مصحفی عقل معاش
پتھر سے بھی کرتے ہیں وہ روٹی پیدا

رباعی پڑھ کر وزیر نے نواب مرزا کو کچھ مستفسر، کچھ چھیڑنے والی نگاہ تبسم آمیز سے دیکھا، گویا پوچھ رہی ہو، لایئے، اب اس کا جواب لایئے۔ نواب مرزا کے چہرے پر کچھ بیچارگی سی آئی۔ اتنے عمدہ کلام کا جواب لانا، یا اس کے سامنے کوئی بات اس طرح کہنا کہ اپنی بھی بن جائے، بڑا مشکل لگ رہا تھا۔ پھر اچانک وہ کچھ زور سے ہنس کر بولا:

''مگر اماں جان پتھر سے پیدا کی ہوئی روٹی گلے کا پھندا بھی تو بن سکتی ہے۔''

وزیر مسکرائی۔ بیٹے کی بات کی تہ میں پنہاں رمز کو وہ پہنچ گئی تھی۔ ''مانا کہ روٹی کے پھیر میں انسان اپنے صفائے قلب کا گلا بھی گھونٹ دے سکے ہے۔'' اس نے ایک ذرا توقف کیا، ''مگر یوں بھی تو ہو سکے ہے کہ کوئی سودے کو عقل پر حاوی نہ ہونے دیوے، اور نہ چربی اور خون کو دل پر چڑھ جانے دیوے۔''

نواب مرزا کے دل میں کچھ جھلاہٹ سی آئی۔ یہ بیگم صاحب آخر چاہتی کیا ہیں، ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں ایں خیال است ومحال است وجنوں کی بات تو ہو نہیں رہی۔ اور نہ ہی میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں گریبان پھاڑ کر شعر کی وحشت کے اثر سے آوارہ گرد ہو جاؤں گا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ انسان سخنوری کے بل بوتے پر بھی دنیا میں جگہ بنا سکتا ہے روٹی بھی کھا سکتا ہے۔ اس نے اپنی جھلاہٹ کو دبا کر کچھ شرمندہ سے لہجے میں کہا:

''لیکن میاں مصحفی تو شاید یہ کہہ رہے ہیں اماں جان کہ میں اپنے سودے کو برقرار رکھوں گا اور عقل معاش کو بھی کام میں لاؤں گا۔''

''بھئی یہ معنی تو اس رباعی میں مجھے دکھائی نہیں دیتے۔ شیخ صاحب تو صاف کہہ رہے ہیں کہ جسے سودائے شعر ہے وہ نہ دنیا کا رہے ہے نہ دین کا۔''

نواب مرزا کے دل میں پھر برہمی کا ایک طرارہ سا اٹھا۔ ''ہر شخص اپنے اپنے طور پر مفہوم لیتا

ہے اماں جان۔ لیکن آپ چاہتی کیا ہیں؟''

''چاہتی کچھ نہیں،'' وزیر نے متانت سے کہا۔ ''جاننا چاہتی ہوں۔''

''کیا؟'' نواب مرزا نے مختصر لہجے میں کہا۔

''یہی... کہ شعر گوئی کی للک...'' اچانک اس نے بات بدل دی ورنہ وہ کہنے والی تھی کہ یہ للک پیٹ بھروں ہی کو زیب دیتی ہے۔ ''...آپ کو کہاں لے جائے گی؟''

''توبہ ہے اماں جان۔'' نواب مرزا نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''یہ میرے لئے ذریعۂ معاش کا راستہ کھولے گی اور میری... میری... روحانی، نہیں... قلبی و ذہنی زندگی میں رونقیں بر پا کرے گی۔''

''یہی تو مجھے خوف تھا...'' وزیر نے کہنا شروع کیا۔ زندگی میں پہلی بار نواب مرزا نے ماں کی بات کاٹی اور ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''واللہ اماں جان آپ کو مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں کہ میں شاعر بن سکتا ہوں اور میرے دل میں اس بات کی تڑپ ہے کہ آپ کی دیکھ بھال کروں آپ کو آرام سے رکھوں؟ کامیابی ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن انسان کوشش تو کر سکتا ہے۔''

وزیر کی زبان بھی زندگی میں پہلی بار بیٹے کے سامنے لڑکھڑائی۔ ''م... میں صرف یہ... صرف یہ کہہ رہی تھی کہ آپ ابھی بہت... چھوٹے ہیں۔''

نواب مرزا نے تلخ سا قہقہہ لگایا۔

''چھوٹے کی خوب کہی اماں جان۔ میری تعلیم جتنی ممکن تھی ہو چکی۔ اگر ہمارا کوئی سرپرست ہوتا تو اب تک میری شادی کر کے مجھے گھر گرہستی والا بنا چکا ہوتا۔ مجھ سے کم سن والے لوگ کاروبارِ دنیا میں جھونک دیئے جاتے ہیں اور نفع نقصان کچھ نہ کچھ حاصل ہی کر لیتے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ آپ کا چہرہ بے رونقی اور آپ کا بدن بے آسائشی کی تصویریں ہیں، جس طرح کی زندگی آپ کو استحقاقی طور پر ملنی چاہیئے وہ میرے لئے ایسا شمعدان ہے جو فلک الافلاک سے بھی کہیں زیادہ بلندی پر تعبیہ کر دیا گیا ہے۔ یہی رنگ رہے تو کوئی دن جاتا ہے کہ آپ کی زندگی داستانِ پارینہ بن جائے گی، آپ کا نخلِ حیات پوری طرح مرجھائے گا بھی نہیں کہ کاٹ ڈالا جائے گا۔ ایک میں ہوں جو گھر کے باہر نکل سکتا ہوں، کچھ کر سکتا ہوں۔ اور آپ سمجھ رہی ہیں کہ ابھی مجھے حبیبہ کی لوریوں اور آپ کی آغوش کی ضرورت ہے۔ آخر آپ مجھے کب تک بھونرے میں رکھ کر پالئے گا۔''

فرطِ جذبہ سے نواب مرزا کا گلا رکنے لگا۔ ادھر وزیر سر جھکائے، چہرہ آنسوؤں سے تر، دل میں جگہ ڈھونڈ رہی تھی کہ کہاں جا کر چھپ جاؤں، اور حبیبہ دیوار کا سہارا لئے بت بنی کھڑی تھی۔ ماں سے زیادہ اسے نواب مرزا کی الجھن اور مشکل کا احساس تھا لیکن اب تک وہ کچھ کہہ نہ سکی تھی۔ آج اس نے ہمت کی۔

''خانم صاحب،'' وہ ڈوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں بولی، ''ایمان کی پوچھیں تو حق بات وہی ہے جو بچے میاں صاحب کہتے ہیں۔ دنیا بہت بڑی ہے، ہماری جانیں بہت حقیر ہیں۔ دنیا کے سامنے جائے بغیر جائے پناہ بھی نہیں مل سکتی۔ بچے میاں اللہ رکھے گھر کے مرد ہیں۔ ان کو اگر گھر چلانے کی فکر ہے... تو ٹھیک ہی ہے۔''

''تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ وہ میرے کلیجے سے لگے بیٹھے رہیں؟'' وزیر نے تھکی ہوئی سی آواز میں کہا۔ ''کیا میں یہ باتیں سمجھتی نہیں ہوں؟ لیکن میرے گھر کا جو بھی مرد باہر گیا پھر واپس نہ آیا... میں کس دل سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو پہلو سے جدا کروں؟''

''گستاخی کی معافی ہو۔'' حبیبہ نے رکتے ہوئے کہا۔ ''سو تو ٹھیک ہے خانم صاحب۔ لیکن دنیا پھر بھی دنیا ہے۔ آج ہمارے نواب صاحب...''

''ان کا نام مت لو حبیبہ۔ میرے دل پر کٹاری سی چل جاتی ہے۔'' وزیر نے کہا۔ ''اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ انھیں کی فیاضیاں تھیں کہ ہمارے سر پر چھت ہے اور چولھے میں دو وقت آگ جل جاتی ہے۔''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی، پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی: ''...سنا فرنگیوں نے ان جیسے کئی رئیسوں کو یوں ہی بہانے بہانے سے بے دخل کر ڈالا یا ان کی جانیں لے لیں۔ یہ تیرہ صدی ہے... سچ بات تو وہی ہے جو تم کہتی ہو۔ بزرگوں نے کہا تو ہے کہ دنیا میں یوں رہیے جیسے صابون میں تار، لیکن الجھنا آسان ہے اور سلجھنا مشکل۔ جب تک جی ہے تب تک جنجال بھی ہے۔''

نواب مرزا پالتی مار کر ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''اچھا اماں جان اس وقت بات کو یہیں ختم کر دیں کہ مجھے بھی دنیا کا سامنا کرنے کا حق ہے۔ اور سخنوری ایسا پیشہ نہیں جس میں عزت نہ ہو اور یہ میرے دل کی مرضی کے موافق بھی ہے... چلئے اب غصہ اور رنج دونوں بھلا دیجئے، ہمیں بھوک لگی ہے۔''

وزیر نے سر اٹھا کر دیکھا تو دھوپ آنگن سے جا چکی تھی۔ ''ہائے میں اپنی فیل ہائیوں میں ایسی لگی کہ عصر کا وقت ہونے لگا اور نواب مرزا کو کھانا بھی نہ ملا۔ حبیبہ روٹیاں جلد از جلد دوسری منگایئے۔ وہ تو

ٹھنڈی ہو کر مٹی ہو گئی ہوں گی۔‘‘

’’اب نانبائی کے جھمیلے میں کیا پڑیں خانم صاحب، میں ہی جھپاک سے چار روٹیاں ڈال دیتی ہوں۔ گھڑی بھر سے کم ہی میں ہمارے بچے میاں اور خانم صاحب کھانا کھا لیں گی۔‘‘

یہ کہہ کر حبیبہ تو باورچی خانے کی طرف گئی اور وزیر نے منھ ہاتھ دھونے کے لئے آبدار خانے کا رخ کیا۔ لیکن نواب مرزا کے دل میں شرمندگی تھی اور شک تھا کہ منھ ہاتھ دھونا فقط بہانہ ہے، اماں جان در اصل اپنے آنسو پونچھنے اور چہرے پر سے آنسوؤں کے داغ مٹانے گئی ہیں۔ اس کے دل میں بڑی زور سے ہوک اٹھی کہ کاش وہ کسی بھی طرح، خواہ اپنے کو بیچ کر ہی اپنی ماں کے لئے اتنی دولت لا دیتا کہ وہ چار کو اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے کھلا کر ہی خود کھاتی اور اسے تا حیات میرے لئے کسی قسم کا خوف نہ لاحق ہوتا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے قدم شریف کی درگاہ اور اپنے باپ کے مزار کی شبیہ روشن ہو گئی۔ کیا اس میں میرے لئے کوئی اشارہ ہے؟ اس نے خود سے کہا۔ نہ سہی، لیکن ان کے مزار مقدس کی زیارت کئے مجھے کئی دن ہو گئے ہیں۔ کل ضرور جاؤں گا۔

نواب ضیاء الدین احمد خان

اگلے دن تو نہیں، لیکن تیسرے چوتھے دن نواب مرزا نے قدم شریف جانے کا اہتمام کیا۔ ماں سے گفتگو کا ذہنی دباؤ بیٹے پر تھا تو بیٹے سے گفتگو کا ذہنی دباؤ ماں پر بھی تھا۔ وزیر نے تو جوں توں کر کے خود کو سنبھال لیا اور بیٹے کی معمولہ خاطر داریوں میں لگی رہی لیکن نواب مرزا کو سردی لگ کر تپ چڑھ آئی۔ کچھ علاج معالجہ اور کچھ ماں کی تیمار داری اور حبیبہ کی خدمت گذاریوں کے باعث تیسرے دن اس کا جی اچھا ہوا اور چوتھے دن اس نے قدم شریف کی ٹھانی، لیکن ماں سے نہ بتایا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، قدم شریف پر وزیر کا جانا اب بہت کم ہو گیا تھا، نواب مرزا نے دل میں خیال کیا کہ اس وقت اماں جان پر نہ ظاہر کرنا ہی ٹھیک ہے۔ شاید وہ چلنا چاہیں لیکن تنگدستی کے عالم میں جانے سے انھیں رنج ہی ہو گا۔

قدم شریف پہنچ کر نواب مرزا نے درگاہ کے اندر ایک گھڑی آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا، پھر باپ کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ بقیہ تمام صاحبان مزارات کے حق میں دعاے خیر کر کے وہ نکل ہی رہا تھا کہ ہلکا سا شور بلند ہوا، کچھ ''طرقوا!''، ''ہٹ کے چلو صاحبان! بڑھا ؤ قدم کو جا بجا سے! بڑھے جاؤ صاحب!''، وغیرہ سی آوازیں سنائی دیں۔ نواب مرزا کی نگاہ صدر دروازے پر گئی تو لال بانات کی قبائیں پہنے ہوئے نوکروں، سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے ہوئے چوبداروں اور سفید پوش برچھیتوں سے گھرا ہوا ایک مرصع ہوادار نظر آیا جس میں کوئی بے حد وجیہ اور خوشرو شخص سوار تھا۔ نواب مرزا نے بادشاہ سلامت کو کبھی دیکھا نہ تھا، لیکن ان کی تاجپوشی والی شبیہ کی نقلیں جگہ جگہ ملتی تھیں اور نواب مرزا اس کے توسط سے بادشاہ ظل اللہ کا صورت آشنا کہا جا سکتا تھا۔ ہوادار کے مسافر کو دیکھ کر اسے دھوکا ہوا کہ یہ بادشاہ سلامت تو نہیں، لیکن فوراً ہی اس کا وہم دور ہو گیا۔ ظل الٰہی ہوتے تو ہاتھی پر سوار ہوتے، اور ملازموں کے علاوہ امرا اور شاہزادوں کا ہجوم بھی ہوتا۔ لیکن زیارت کو آنے والا امیر اگر بادشاہ نہیں تو کوئی شاہزادہ ضرور تھا۔ نواب مرزا نے نگاہ

نیچی کیئے کیئے حتی الامکان غور سے دیکھا۔ کوئی تیس پینتیس برس کا سن، کشیدہ قامت، دبلا لیکن طاقتور ڈیل، بیضاوی چہرہ، کلے کی ہڈیاں ابھری ہوئی، ناک پتلی اور ستواں، گردن اونچی اور سڈول، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں فراست اور فطانت کے نور سے روشن، ہلکا سانولا رنگ، سیاہ داڑھی پورے چہرے پر، لیکن بہت گھنی نہیں، مونچھیں بہت نفیس بنی ہوئی، کچھ گنجان لیکن ناک کے نیچے کتری ہوئی اور دہانے کے دونوں طرف ریشمی مورچھل کی طرح پڑی ہوئی۔ سبز کمخواب کا دوبرکا پاجامہ، اس پر ہلکی سبز ڈھاکے کی ململ کا کرتہ، کرتے کے اوپر جامہ وار کی چارقب، سر پر بھاری کارچوبی سے پٹی ہوئی چوگوشیہ سیاہ مخملی ٹوپی، پتلی کمر میں سبز بناری پوت کا ڈوپٹہ جس میں ایک طرف جڑاؤ پیش قبض اور ایک طرف چاندی کا مرصع طمنچہ تعبیہ کیا ہوا تھا۔ گلے میں سات لڑوں کی مالائے مروارید، ٹوپی میں کوئی زیور نہیں، لیکن دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیوں میں بیش قیمت الماس، یاقوت اور زمرد کی انگوٹھیاں، ہاتھ میں کوئی کتاب، یا شاید دعاؤں کا مجموعہ، چاروں طرف سے لوگ سلام کر رہے تھے اور وہ مسکرا مسکرا کر سینے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے، منھ سے بولتے کچھ نہ تھے۔ کسی نے کہا، ''مرزا فتح الملک بہادر ہیں، ماشاء اللہ کس قدر جامہ زیب اور شاہانہ ہستی ہیں، عین مین ہمارے بادشاہ سلامت کی صورت پائی ہے۔''

نواب مرزا کے قدم شہزادے کے جلوس کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اسے ایک لحظہ کو خیال گذرا کہ یہ بدتمیزی میں شمار ہوگا، لیکن کوئی کشش اسے کھینچے لئے جاتی تھی۔ پاس پہنچ کر وہ کورنش بجالایا اور آگے بڑھ کر درگاہ سے نکلنے ہی والا تھا کہ شاہزادے کے کسی اشارے پر ایک چوبدار نے اس کے شانے پر ہلکا سا ہاتھ رکھا اور کہا:

''جناب کو صاحب عالم وعالمیان یاد فرماتے ہیں۔

یاد فرماتے ہیں؟ مجھے؟ نہیں کوئی بھول ہوئی ہے۔ صاحب عالم مجھے کیا جانیں۔ نواب مرزا نے گھبرا کر دل میں کہا۔ وہ کچھ احتجاج کرنے ہی والا تھا کہ کہاروں نے فتح الملک بہادر کا ہوادار زمین پر رکھ دیا اور چوبدار نے نواب مرزا کے شانے پر ہاتھ رکھے رکھے اسے میرزا فتح الملک بہادر کے سامنے کر دیا۔ نواب مرزا نے ڈرتے سہمتے ہوئے تسلیم کی اور نگاہ جھکا کر ٹھہر گیا۔

''جیتے رہو'' بے حد شائستہ آواز آئی، نیچی لیکن بالکل واضح، اور ایسی ٹھکی ہوئی جیسے پیتل کی تھالی بج اٹھی ہو۔ ''ہمیں تمھاری مودب کورنش پسند آئی۔ کیا نام ہے تمھارا، کس کے بیٹے ہو؟''

''س... سرکار، م... میں... نواب شم... شمس الدین احمد خان کا بیٹا ہوں، نواب مرزا مجھے

کہتے ہیں۔"

"اچھا، شمس الدین احمد والی فیروز پور جھرکہ ولوہارو کے فرزند ہو؟"

"سرکار نے درست فرمایا۔"

"بھئی سبحان اللہ، رئیسانہ سبھاؤ کے شخص تھے، یہیں تو مدفون ہیں۔ اور تم لوگ اب...؟"

"عالی جاہ، خانہ زاد اب اپنی والدہ صاحب کے ساتھ چاندنی چوک خانم کے بازار میں حضور کے سائے دن گذارتا ہے۔"

"وہ... تمھاری وال..." اتنا کہہ کر شاہزادے نے توقف کیا۔ اسے شاید یہ خیال آ گیا تھا کہ مستورات کے بارے میں کچھ پوچھنا خلاف تہذیب ہے۔ "اچھا، ہمارا سلام کہنا۔" مرزا فتح الملک بہادر نے کچھ زیر لب سے انداز میں کہا اور ہوادار کو کچھ اشارہ کیا جسے نواب مرزا نہ دیکھ سکا مگر کہاروں نے اسے فوراً سمجھ کر ہوادار کو اٹھالیا اور چلنے پر آمادہ ہوئے۔

"پرورش ہے حضور کی۔" کہہ کر نواب مرزا نے تین تسلیمیں کیں اور جلوس کے مکمل گذر جانے تک یوں ہی کھڑا رہا، گویا کسی فکر میں ہو۔

واپسی کا راستہ نواب مرزا نے اسی ادھیڑ بن میں گذارا کہ صاحب عالم و عالمیان نے مجھے بطور خاص کیوں توجہ کے لئے منتخب کیا۔ لیکن گھر پہنچ کر اس نے ماں سے کچھ نہ بتایا۔ اپنے ہمجولیوں میں تحقیق کرنے پر بھی مرزا فتح الملک بہادر کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ معلوم ہو سکی جس سے کچھ حال کھلتا کہ انھوں نے اپنا ہوادار روک کر نواب مرزا سے باتیں کیوں کی تھیں۔ بس یہی معلوم ہوا کہ نہایت مذہبی، نیک دل شاہزادے ہیں، شاعر بھی ہیں، رمز تخلص کرتے ہیں، استاد ذوق کے شاگرد ہیں۔ نواب مرزا نے خیال کیا کہ ادھر ادھر لوگوں سے ملنے ملانے جاؤں گا تو شاید بات کچھ کھل سکے۔ شہر کے اساتذہ سے ملنے کا خیال اسے پہلے ہی سے تھا، اس نے شام کو اپنی ماں سے کہا:

"اماں جان میں کل کسی وقت مرزا نوشہ صاحب کے یہاں جاؤں گا۔"

وزیر الجھن میں پڑ گئی۔ "میرزا غالب کے بارے میں... آپ جانتے تو ہیں؟" اس نے کچھ رک رک کر پوچھا۔

"جی کیوں نہیں، فارسی کے بہت بڑے استاد، ریختہ میں بھی ان کا پایہ سب مانتے ہیں۔"

"مگر...مگر...آپ کے مرحوم باپ کے بارے میں...تو انھوں نے کچھ اچھے خیال نہ رکھے تھے۔"

"جی ہاں، میں نے بھی کچھ سنا تو ہے۔ لیکن وہ وقت اور تھا۔"

"اور یہ بھی سوچ لیجئے کہ آج کے لوہارو والوں سے غالب صاحب کا بہت خلا ملا ہے، اور سارے لوہارو والے آپ کے دشمن نہیں تو دوست بھی نہیں ہیں۔"

"مگر اماں جان، یہ تو شاعروں کی دنیا ہے۔ یہاں سب عالم دیگر ہیں۔"

"افوہ بھئی میرا منھ ہی کھلوایئے گا؟ میں پوچھتی ہوں اپنے باپ کے مخالف کے یہاں جانا آپ کو پھبتا ہے کیا؟" وزیر نے تیز لہجے میں کہا۔

"اماں جان۔" نواب مرزا نے بہت ٹھہرے ہوئے، متین لہجے میں کہا۔ "میں ہمیشہ سے کہتا ہوں کہ مضیٰ ما مضیٰ پر عمل کرنا اور گذشتہ زمانوں کو حافظے میں کہیں دفن کر دینا ہی مناسب ہے۔"

"اللہ اب آپ مجھے عقل سکھائیں گے! آپ کے باپ کے قاتلوں کو تو بہت اچھا معلوم ہوگا کہ صاحب زادے نے سب کچھ معاف کر دیا۔" وزیر غصے سے روہانسی ہو رہی تھی۔

نواب مرزا نے فوراً مراجعت کی۔ "اماں جان، آپ خفا نہ ہوں۔ آپ جو چاہیں گی وہی ہوگا۔ میں نے تو ایک بات کہی تھی کہ شعر و سخن والے اپنا الگ ہی عالم رکھتے ہیں۔ اور مرزا صاحب کا تو کچھ براہ راست اس معاملے میں دخل بھی نہ تھا۔ میں اگر شاعر بنا تو ان ہی لوگوں سے میرے سابقے پڑیں گے۔ کوئی میرا استاد ہوگا، کوئی رہنما ہوگا۔ کوئی ساتھی سنگی بھی بن سکتا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "استاد تو مجھے بھی ہونا ہے۔"

وزیر نے بھی فوراً رخ بدلا، بیٹے کو خفا دیکھنا اس کے لئے غیر ممکن تھا۔

"بیٹا میں تمھارے ہی بھلے کی کہتی تھی۔ اونچ نیچ دیکھ لو پھر پاؤں باہر رکھو۔ شہر میں بہتیرے استاد پڑے ہیں۔"

"جی بجا ارشاد۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔"

نواب مرزا نے مرزا نوشہ کے یہاں جانے کا خیال ترک کر دیا، لیکن ابھی وہ کہیں اور بھی نہ گیا تھا کہ اس کا نام بلا مبالغہ زبانوں پر چڑھ کر سارے شہر میں متداول ہو گیا اور بجائے اس کے کہ وہ مرزا غالب کے دروازے پر دستک دیتا، خود مرزا صاحب کو فکر ہوئی کہ اس ہونہار لڑکے کو بلوایئے اور اس کی ہمت افزائی کیجئے۔

خواجہ حیدر علی آتش مدتوں سے نابینا تھے، درویشانہ مزاج الگ، کہیں جانا تو بڑی بات تھی، کسی سے ملتے بھی شاذ ہی تھے۔ لیکن جب بھی کبھی کوئی تازہ کلام وہ تصنیف کرتے، شاگردوں اور مداحوں کے ذریعے بہت جلد سارے لکھنؤ میں پھیل جاتا اور پھر دلی تک پہنچ جاتا۔ شیخ ناسخ کے انتقال (۱۸۳۸) اب دیار شرق میں یہی خواجہ صاحب تھے جن کا نام دلی والے بھی ادب سے لیتے تھے۔ خواجہ آتش کے بارے میں بھی سنتے تھے کہ اب ان کا چل چلاؤ ہی ہے، دیدوادید جو ہو جائے غنیمت سمجھو، خدا جانے کل کو یہ ہم میں ہوں نہ ہوں۔ چنانچہ جب ان کی تازہ غزل دہلی آئی، مطلع ؎

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

تو بہت سے شعرائے دہلی نے اس پر غزل کہی۔ کئی محفلیں ترتیب دی گئیں جن میں خواجہ صاحب کے مصرع اول (مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے) کو طرح قرار دیا گیا۔ یہ سلسلہ کئی دن سے چل رہا تھا اور داغ نے بھی غزل اس زمین میں کہی تھی۔ اس کے کئی شعر فوراً زباں زد خلائق ہو کر اساتذہ کے ایوانوں تک پہنچے۔ مطلع تو خیر ذرا سست تھا ؎

مجھے اے اہل کعبہ یاد کیا بت خانہ آتا ہے
ادھر دیوانہ جاتا ہے ادھر مستانہ آتا ہے

مگر بعد کے کئی شعر تو قیامت شور انگیز تھے، خاص کر مندرجۂ ذیل شعر تو داغ کی زبان سے ادا ہوتے ہی سارے شہر میں مشہور ہو گیا تھا کہ ایسی ادابندی، ایسا نیا اور رنگین مضمون کبھی سنا نہ گیا تھا، شعر میں کیا بندھتا ؎

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

میر کے ریختوں کی طرح لوگ نواب مرزا داغ کے شعروں کو گلیوں میں گاتے پھرتے تھے ؎

جگر تک آتے آتے سو جگہ گرتا ہوا آیا
ترا تیر نظر آتا ہے یا مستانہ آتا ہے

دغا شوخی شرارت بے حیائی فتنہ پردازی
تجھے کچھ اور بھی اے نرگس مستانہ آتا ہے

نواب مرزا کے ساتھ شہر کی سیر کرنے والوں اور جگہ جگہ شعر کی محفلوں میں کلام خوانی کرنے

والوں میں ایک تو خواجہ امان کے بیٹے قمر الدین راقم تھے، کہ جن کی عمر یہی کوئی بارہ تیرہ برس کی ہوگی اور جنھوں نے راقم تخلص کے ساتھ شعر گوئی ابھی ابھی شروع کی تھی اور میرزا نوشہ سے، کہ ان سے کچھ قرابت بھی تھی، رشتۂ تلمذ استوار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ابھی شعر کیا کہتے، لیکن حویلی کے تعلق کی وجہ سے لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لئے رہتے تھے کہ وہ حضرت ظل سبحانی سے تیر اندازی سیکھتے تھے اور فرصت کے وقتوں میں شعر گوئی کی مشق کرتے تھے۔ نواب مرزا کے دوسرے دوست سید ظہیر الدین حسین المتخلص بہ ظہیر دہلوی عمر میں کچھ بڑھے ہوئے تھے، یہی کوئی اٹھارہ انیس کا سن ہوگا۔ لیکن شادی نہیں ہوئی تھی اس لئے مزاج ان کا اس وقت لڑکوں بالوں میں زیادہ ملتا تھا۔ شعر میں میرزا نوشہ کے شاگرد، خوش نویسی میں کبھی کبھی بادشاہ ذی جاہ سے اصلاح لیتے تھے، کہ ظہیر کے والد ماجد حلاج الدولہ سید جلال الدین حیدر مرصع رقم خان بہادر و یاقوت رقم ثانی نے بادشاہ کو خوشنویسی کی تعلیم دی تھی۔ یہ تین دوست، یا ہمجولی، الگ الگ عمریں، لیکن ایک طرح کا مزاج، ظہیر الدین حسین کو ان میں سید الطائفہ کی حیثیت حاصل تھی لیکن وہ باقی دونوں سے ایک حد کے اندر بے تکلف بھی تھے۔ شہر کے لوگوں کی نگاہوں میں وہ آ ہی چکے تھے کہ تین ہونہار اور صاف ستھرے سبھاؤ والے نوجوان ہیں، اور نواب میرزا داغ سے میرزا غالب کی دلچسپی اس پر مستزاد۔ نجوگ تو ہونا ہی تھا۔ ''رخ روشن ...'' والے شعر نے شہر میں دھوم مچا ہی رکھی تھی کہ انھیں دنوں میں ایک بار میرزا صاحب نے اپنے گھر کے بالا خانے والی کوٹھری کے دریچے سے تینوں کو دیکھا کہ کلائیوں میں گجرے ڈالے، پاؤں میں گھیتلی جوتیاں اور بر میں ڈھیلے پاجامے پہنے، سر پر مرصع ٹوپیاں اوڑھے، آنکھوں میں ہلکی سی سرمے کی لکیر، غرض سیلانی بے فکروں کی صورت سیر بازار کو چلے جاتے ہیں۔

میرزا صاحب نے بیتاب ہو کر وہیں سے پکارا:

''اے اولمڈو! کہاں نکلے جاتے ہو، ادھر تو آؤ، میرے پاس آؤ!''

تینوں دوستوں نے بیک وقت چونک کر اوپر نظر کی تو مرزا غالب صاحب کا چہرہ، خوبروئی میں مثال گلشن، اور ذکاوت کے نور سے مزین، سامنے تھا۔ ہڑ بڑا کر تینوں ''جی بہت اچھا'' کہتے ہوئے اوپر پہنچے اور مرزا صاحب کے حجرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر تین تین تسلیمات بجالائے۔ ظہیر اور راقم تو مرزا صاحب سے بخوبی واقف تھے، نواب مرزا کے دل میں خلجان تھا کہ دیکھیں ہمارے ساتھ کیسی گذرے۔ ماں سے جو باتیں مرزا نوشہ اور اہل لوہارو کے بارے میں ہوئی تھیں وہ سب اسے بخوبی یاد تھیں۔ ہر چہ بادا باد کہہ کر اس نے دہلیز پر قدم رکھا اور ایک بار پھر تسلیم کی:

"تسلیمات عرض کرتا ہوں حضور۔"

مرزا غالب نے نواب مرزا کے خوبصورت سراپے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ نواب مرزا کے چہرے پر ہچکچاہٹ اور شک کے سے آثار تھے، لیکن بدن کے سبھاؤ میں اعتماد تھا، کمر سیدھی تھی اور نگاہ مرزا صاحب پر۔ کشیدہ قامتی کی وجہ سے نواب مرزا کا پورا بدن کوٹھڑی کی دہلیز میں سما گیا تھا۔ مرزا صاحب نے ہاتھ پھیلایا اور خوش ہو کر بولے:

"اماں تم ہی نواب مرزا ہو، بھائی شمس الدین احمد کے بیٹے۔ آؤ آؤ میں تو تمھیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔" انھوں نے نواب مرزا کا گال تھپتھپایا اور اسے اندر آجانے کا اشارہ کرتے ہوئے قمر الدین راقم کے کان ہلکے سے پکڑ کر کہا، "اندر آجا بیٹے، آرام سے پھسکڑا مار کر بیٹھ۔" پھر انھوں نے ظہیر کا شانہ چھوا اور بولے، "آؤ میاں ظہیر اندر آجاؤ۔ دہلیز پہ کیوں کھڑے ہو۔" میرزا صاحب نے تینوں کو یوں بٹھایا کہ نواب مرزا ان کے دائیں جانب، لیکن ذرا آگے کی طرف تھا، اس طرح کہ دونوں کم و بیش آمنے سامنے تھے۔ ظہیر دہلوی سیدھے دائیں جانب اور راقم بائیں طرف کو بیٹھے۔ یہ سب اس خوش اسلوبی سے ہوا گویا اپنے آپ ہی ہو گیا ہو۔ غالب صاحب نے نواب مرزا کی طرف تحسینی آنکھ سے دیکھا اور بولے:

"اجی اس وقت تم اچھے آنکلے۔ ساری دلی میں آپ کے شہرے ہیں اور نہیں ملنا ہو رہا ہے تو مجھی سے۔" پھر انھوں نے بڑے شستہ، کھلے ہوئے، اور دلکش لہجے میں شعر پڑھا۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

"صاحب زادے، ہم تو آج تم سے وہی غزل سنیں گے۔ اے سبحان اللہ، یہ عمر اور یہ مضموں یابیاں۔ سچ ہے صاحب، خدا جس کو دے... لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم لوگ کھاؤ گے کیا۔" پھر ذرا ٹھہر کر ایک خفیف سے شرارت بھرے تبسم سے میرزا غالب صاحب بولے، "...اور پیو گے کیا؟"

نو عمر مہمان ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا جواب دیں، کس طرح بحسن و خوبی عذر کر دیں کہ ہمیں بھوک نہیں ہے کہ ایک بوڑھا لیکن تندرست نوکر، کرتے پاجامے میں ملبوس، شانے پر سوتی لیکن رنگین اور صاف رومال سموسہ کیا ہوا، گلے میں چاندی کا کنٹھا، دائیں ہاتھ کی کلمے کی انگلی میں فیروزے کی انگوٹھی، ایک بڑی تھالی میں انواع و اقسام کے خشک میوے لئے حاضر ہوا۔

"اے لو بھئی میاں کلیان خود ہی آگئے۔" غالب صاحب نے ہنس کر کہا۔ "جانتے ہیں کہ رئیسوں

کے بیٹے ہیں، مقوی ہی مال کھائیں گے۔"

میرزا صاحب نے قمر الدین راقم کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اسے تھالی پر جھکایا اور کھلکھلا کر ہنسے:

"ابے چھوکرے، دانتوں سے اٹھا اٹھا کر منھ میں رکھ۔ سب لوگ دیکھیں تو سہی کہ شیر کا بچہ ہے، یہ دو ایک دانے اٹھا کر ٹونگنا تو مرغیوں کی حرکت ہے!"

مرزا صاحب نے قمر الدین کی گردن یوں ہی جھکائے رکھی، لیکن ان کے ہر لفظ اور ہر عمل سے محبت اور خوش طبعی پھوار کی طرح ٹپک رہی تھی۔ "نواب مرزا، آپ جانتے ہو، اس لڑکے کا باپ میرا بھتیجا ہے۔ اس اعتبار سے میں اس کا دادا ہوں، اور دلدادہ بھی۔"

مرزا صاحب کی کھلی ہوئی لیکن متین ہنسی میں عجب متعدی رنگ تھا کہ سبھی ہنس پڑے۔ نواب مرزا نے دل میں کہا، میں ناحق ہی گھبرا رہا تھا۔ وہ میرزا نوشہ ہی کیا جو وقت اور حالات کی مناسبت سے صحیح اور خوشگوار بات نہ کہیں۔ نواب مرزا کو بخوبی معلوم تھا کہ اسی قمر الدین راقم کے دادا خواجہ حاجی کو مرزا صاحب نے بارہا بے ایمان بلکہ چور ظاہر کیا تھا اور کہا تھا کہ خواجہ حاجی کی ہم سے کوئی قرابت نہیں ہے، ہماری دادی صاحب مغفور کی ایک بیوہ بھانجی کا بیٹا ہے۔ ہماری دادی نے از راہ یتیم نوازی و غریب پروری اس بھانجی کی شادی اپنے کسی نوکر سے کر دی تھی۔ خواجہ حاجی اسی عقد کا ثمرہ تھا۔ لہٰذا ہماری خاندانی پنسن میں خواجہ حاجی کا کچھ بھی حصہ نہ ہونا چاہیئے، چہ جائے کہ نصفا نصف یعنی پانچ ہزار سالانہ اس کو دلوا دیئے جائیں۔ یہ اور بات کہ مرافعات اور پیرویاں غالب صاحب کی سب رائیگاں گئی تھیں، خواجہ حاجی برابر پانچ ہزار سالانہ پر قابض رہا تھا اور اب اس کے دونوں بیٹے شمس الدین عرف خواجہ جان، اور بدر الدین عرف خواجہ امان اس پنسن کے مالک تھے۔

جب ہنسی تھمی اور ماحول سنجیدہ ہوا تو میرزا صاحب نے نواب مرزا سے پہلے تو رخ روشن والی غزل سنی اور دل کھول کر داد دی، پھر انھوں نے ظہیر سے پوچھا، "کیوں میاں، کچھ کہہ کے لائے ہو؟"

"حضرت سلامت میں بہت شرمندہ ہوں، ادھر کچھ خاص فکر شعر نہ ہو سکی۔"

"بھلا کیوں؟"

"جی، وہ قلعۂ معلی میں نوکری کے کچھ قرائن ہیں..."

"قرائن چہ معنی دارد؟ تم تو وہاں مدت العمر سے صیغۂ ملازمان میں ہو؟"

"جناب بجا فرماتے ہیں۔ یہ حقیر بسن دوازدہ سالگی خدمت داروغگی قوربیگی پر سرفراز کیا گیا

تھا، آج اسے کوئی عرصہ چھ سات سال کا ہوتا ہے۔ لیکن اب... ذرا افزونی عہدہ اور تفویض کارخانہ جلوس شاہی مثل ماہی مراتب وغیرہ کی بات ہے۔ لہٰذا کئی کئی بار حضور میں بلاوا ہوتا ہے، جان سولی پر انکی رہتی ہے۔"

"خوب، تو مبارک ہو، مولا چاہیں گے تو سب کام بن جائیں گے۔"

"سرکار کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔ پر ان دنوں تو میاں داغ کی طبع وقاد خوب چمکی ہوئی ہے۔"

"اجی اس غزل کو سن کر تو مدعی بھی قائل ہو جاویں۔ میاں نواب مرزا، کبھی کبھی ملتے رہیو، اور ہاں دیکھیو، اب کے آئیو تو شیخ جرأت کی زمین میں غزل کے ساتھ۔ مطلع سنتے ہو صاحب،

نہ لوٹنا دل پر اضطراب سے چھوٹا

بلا سے جان گئی میں عذاب سے چھوٹا"

مرزا صاحب نے سامعین کی داد کے دوران جرأت کا مطلع دوبارہ سنایا اور کہا، "ہے ہے نہ لوٹنا دل پر اضطراب سے چھوٹا اور چھوٹا تو جان نکلنے کے بعد ہی، کہ عالم جاں کنی کا خود ہی تشنج کا عالم ہے، سبحان اللہ۔"

"میری بساط کیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے امتثال امر میں کچھ جگر کاوی کروں گا،" نواب مرزا نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

"بہت خوب،" مرزا صاحب بولے۔ "اور میاں ظہیر الدین، تم بھی کچھ کہہ لانا۔" ایک لحظہ توقف کے بعد انھوں نے اسی متین لیکن خوشگوار لہجے میں کہا: "حاشا میری نیت کوئی تم دونوں میں مکابرت قائم کرنے کی نہیں۔ لیکن زمین اچھی ہے اور میاں ظہیر بھی نہایت درجہ خوش فکر شاعر ہیں۔"

"مہربانی ہے حضور کی۔ میں بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں گا۔" ظہیر نے جواب دیا۔ پھر نوعمر مہمانوں نے اٹھ کر تین تین بار تسلیمیں کیں اور "اب اجازت مرحمت ہو" کہہ کر مرزا غالب صاحب کی طرف پشت کیے بغیر تینوں نے دہلیز پر آ کر جوتیاں پہنیں اور نیچے گلی میں آ گئے۔

"اچھا ہوا کہ ہم بچ نکلے۔ میرزا صاحب نے ہم سے نہیں کہا۔" قمر الدین راقم نے لمبی سانس لے کر کہا۔

"اس کا باعث آپ کی نوعمری تھوڑی ہے،" ظہیر نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ مرزا غالب صاحب یہ نہیں چاہتے کہ شہر والوں کو بدابدی کرنے کا موقع ملے۔"

"بدابدی کیا؟" راقم نے پوچھا۔

''اجی بے وقوف، سارا شہر جانتا ہے کہ میرزا صاحب قمار کا ذوق بے اندازہ رکھتے ہیں۔ اگر انھوں نے تین تین نوسکھیوں کو بیک وقت ایک ہی زمین میں طبع آزمائی کو کہا تو یاروں کو گمان ہوگا کہ یہ بھی کوئی جوئے کی شرط کا معاملہ ہے۔ پھر تو میاں سارے شاہجہاں آباد میں ہم لوگوں پر شرطیں لگنے لگیں گی۔''

''اللہ تیری پناہ!'' راقم اور داغ کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔ پھر نواب مرزا نے کہا: ''یہ شہر ہے کہ مقامر خانہ۔ یہاں والوں کو اور کچھ کام ہی نہیں۔''

''بیٹے اور کیا۔'' ظہیر نے کہا۔ ''یہ جوئے کی لت کوئی ایسی ویسی لت نہیں، پوری علت ہے۔ دلی والوں میں تو بات بات پر شرط لگتی ہے، بلکہ بے بات کی باتوں پر اور بھی زیادہ شرطیں لگتی ہیں۔''

نواب مرزا نے دو ہی دن میں غزل کہہ لی اور اسے لے کر تیسرے دن مناسب وقت پر مرزا غالب صاحب کو سنانے پہنچ گیا۔

''تو آپ نے غزل کہہ لی؟ بھئی کیا آمد ہے، لوحش اللہ۔ ذرا سنائیے تو سہی۔'' مرزا غالب نے بہت خوش ہو کر اشتیاق کے لہجے میں کہا۔ داغ کے یہاں ان دنوں آمد ہی آمد تھی، معلوم ہوتا تھا شعر صف باندھے انتظار میں کھڑے ہیں۔ جرأت کی خاصی ٹھس زمین میں نوعمر شاعر نے بائیس شعر کہے تھے۔ مطلع ؎

یہ عشق کب دل خانہ خراب سے چھوٹا
بہشت میں بھی نہ میں اس عذاب سے چھوٹا

''عذاب'' کا قافیہ میاں جرأت کے یہاں بھی مطلعے میں تھا اور حق یہ ہے کہ نوعمر داغ نے کہنہ مشق اور میر و سودا کی آنکھیں دیکھے ہوئے استاد کو اس قافیے میں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بعض دوسرے شعر جن پر مرزا صاحب نے اپنی نگاہ تحسین سے صاد کیا، حسب ذیل تھے ؎

نگاہ مست نے سرشار کر دیا مجھ کو
شراب مجھ سے چھٹی میں شراب سے چھوٹا
نہ کیوں ہو رشک مجھے ایسے ملنے والوں پر
نہ رنگ گل سے نہ نشہ شراب سے چھوٹا
بیان ان کے ہوں اوصاف داغ سے کیا کیا
کوئی نہ وصف شہ بوتراب سے چھوٹا

مقطع تو معمولی تھا، لیکن مرزا غالب صاحب کے مذاق کا مضمون تھا، اس لئے انھوں نے خوب جم کر داد دی اور اتنے خوش ہوئے کہ اپنا پیچوان بطور اولوش عنایت کیا۔ داغ نے شرمندہ سی مسکراہٹ مسکرا کر انکار کیا تو شربت گڑہل منگا کر اصرار سے پلوایا، پھر ایک گلوری عطا کی۔ ایک آدھ شعر میں مرزا صاحب کسی ترکیب یا لفظ کو بدلنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے کچھ کہا نہیں کہ کہیں یہ گمان نہ گذرے، میں اصلاح دے کر اپنا شاگرد کرنا چاہتا ہوں۔ داغ کے موجودہ، ذرا لڑکپن لئے ہوئے انداز مضمون آفرینی میں غالب کے لئے دلکشی تو بہت تھی، لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی اپنی مضمون بندیاں اور خیال آفرینیاں اور طرح کی تھیں اور نوعمر داغ کی مضمون یابی اور راہ سے تھی، اس کی طبیعت لطف زبان اور وقوعہ گوئی کی طرف زیادہ مائل تھی۔

نواب مرزا ڈرتا تھا کہ غالب صاحب کے پاس کہیں زیادہ دیر تک نہ بیٹھ جاؤں اور ان کے مزاج پر بار گذرے، لیکن غالب تھے کہ اجازت ہی نہ دیتے تھے۔ جب جب نواب مرزا اٹھنے کا ارادہ کرتا، مرزا صاحب اسے کچھ اور ثانیہ بیٹھنے کو کہتے۔ داغ نے دل میں سوچا کاش مرزا صاحب اپنے ایک دو شعر ہی سنا دیتے، اتنی دیر سے بٹھائے ہوئے ہیں۔ داغ کا بہت جی چاہتا تھا کہ میں خود ہی مرزا صاحب سے شعر کی فرمائش کروں لیکن اس کا ہیاؤ نہ کھلتا تھا۔ تیسری بار جب نواب مرزا یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ”حضور تھک گئے ہوں گے، اب بندے کو اجازت مرحمت ہو“ کہ کلیان نے اوپر آ کر کہا:

”سرکار نواب ضیاء الدین خان بہادر تشریف لاتے ہیں۔“

غالب گویا دوبارہ شگفتہ ہو گئے۔ ”بھئی سبحان اللہ، خوب آئے میاں نیر۔“ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”آؤ تمھیں تمھارے ایک قرابت دار اور ہونہار شاعر سے ملائیں۔“

اتنی دیر میں نواب ضیاء الدین احمد خان اندر آئے اور مرزا صاحب کو ایک تسلیم کر کے ان کے دائیں پہلو میں بیٹھ گئے۔ نواب مرزا نے سرو قد کھڑے ہو کر دو تسلیمیں کیں اور باہر جانے کا دوبارہ ارادہ کیا، لیکن مرزا غالب نے اشارے سے کہا، بیٹھو۔ نواب مرزا اپنی پرانی جگہ پر، یعنی مرزا غالب کے کچھ بائیں جانب، لیکن ذرا آگے کو، بیٹھ گیا۔ ضیاء الدین احمد خان کا نام سن کر اس کے دل میں پھر بے چینی اٹھنے لگی تھی کہ خدا جانے میرا ان سے کیا معاملہ ہو، اور مرزا صاحب مجھے کس طرح ان سے متعارف کریں۔ لیکن اس کے یہ وسواس بھی بے اصل نکلے، کہ مرزا صاحب نے اپنی معمولہ فراخ دلی اور مہمان نوازی اور موقع شناسی کو کام میں لاتے ہوئے دونوں سے یوں گفتگو کی گویا پرانے واقعات کا اب وجود بھی نہیں رہ گیا۔

اور یہ بات ایک حد تک صحیح بھی تھی۔

دہلی کے لوگ نواب شمس الدین احمد خان کو بھولے نہ تھے، لیکن ان کے بارے میں کھلے عام گفتگو بھی نہ کرتے تھے۔ ان کے مزار پر عرس اب کئی سال سے نہ ہوتا تھا، لیکن قدم شریف کے زوار کم و بیش ہمیشہ ہی نواب شہید کی قبر پر فاتحہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ رؤسا کے ایک طبقے میں یہ خیال بھی متداول تھا کہ چھوٹی بیگم کے سقیم حالات کے پیش نظر ریاست لوہارو سے ان کے لئے وظیفہ مقرر ہو جاتا تو نامناسب نہ تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد بہادر بھی اسی خیال کے تھے اور وہ چھوٹی بیگم سے ملاقات کے بھی خواہاں تھے۔ چھوٹی بیگم کو لوہارو سے وظیفہ ملنے کی رائے کے موافق وہ اس لئے تھے کہ ان میں اور بڑے بھائی نواب امین الدین احمد خان میں مکمل صفائی اور ہم آہنگی نہ تھی۔ ضیاء الدین احمد خان کے خیال میں امین الدین احمد کا رویہ چھوٹے بھائی کے ساتھ غیر منصفانہ تھا اور انھیں ریاست کے محاصل و مراتب سے برابر کا حصہ نہ ملتا تھا جس کے وہ بخیال خود حقدار تھے۔ دونوں بھائیوں کی عمروں میں خاصا تفاوت تھا (۱) اور چھوٹے بھائی کے بقول اس تفاوت کے نتیجے میں باپ کی سی دلجوئی اور مہرورزی کی جگہ امین الدین احمد ان کے ساتھ آمرانہ اور مستبدانہ رویہ رکھتے تھے۔ ضیاء الدین احمد خان نے کئی بار انگریز کے یہاں عرضی دی کہ ریاست دو حصوں میں منقسم کر دی جائے تاکہ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ آزاد ہو جائیں۔ لیکن یہ درخواستیں نامنظور کر دی گئی تھیں۔ اب ضیاء الدین احمد کا مطالبہ تھا کہ میرے حصے کی آمدنی مجھے براہ راست مل جایا کرے اور اس کے لئے مجھے ریاست لوہارو کا دست نگر نہ رہنا پڑے۔ یہ عرضی ابھی صاحب گورنر جنرل بہادر کے دربار کلکتہ میں زیر غور تھی۔

عام رئیس زادوں کے برعکس ضیاء الدین احمد خان نے اپنی فراغت اور فارغ البالی کو حصول علم کے لئے استعمال کیا۔ فارسی، عربی، ترکی وہ خوب جانتے تھے، ادب، انشا، تاریخ، سوانح رجال، تفسیر و حدیث، نجوم و ہیئت، ہر فن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی سے بھی بیگانہ نہ تھے۔ رفتہ رفتہ کر کے انھوں نے بڑا وسیع اور قیمتی کتب خانہ جمع کر لیا تھا۔ چھوٹی بیگم میں ان کی دلچسپی اب تک صرف غائبانہ تھی، آج شاید حسن اتفاق سے اس میں کچھ تبدیلی ہونے والی تھی۔ انھوں نے نواب مرزا پر اڑتی ہوئی سی نظر ڈالی، کئی باتوں میں انھیں نواب مرزا میں اپنے مرحوم سوتیلے بڑے بھائی کی شبیہ جھلک مارتی ہوئی محسوس ہوئی۔ امین الدین احمد اور ضیاء الدین احمد دونوں ہی کو شمس الدین احمد سے ڈرنا اور نفرت کرنا سکھایا گیا تھا

(۱) امین الدین احمد، پیدائش ۱۸۱۴؛ ضیاء الدین احمد، پیدائش ۱۸۲۱۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شمس الدین احمد نے گھریلو برتاؤ کی حد تک دونوں چھوٹے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ شفقت اور ملاطفت ہی روا رکھی تھی۔ آج ضیاء الدین احمد کو سوتیلے بھائی کا مرحوم وجود کئی طرح کے ذہنی تلاطم میں مبتلا کر گیا تھا۔ اگر بڑے بھائی اور وہ بھی سوتیلے اور قبضۂ مخالفانہ رکھنے والے بھائی کی پسماندہ عورت میری تسخیر میں آجائے... لیکن بھائی شمس الدین احمد نے ذاتی طور پر تو میرے ساتھ مہربانی ہی کا سلوک رکھا تھا... مجھے اس وقت تو ان کے مرنے کا رنج نہ ہوا تھا، میری عمر ہی کتنی تھی، مگر اب اس لڑکے کو دیکھ کر کچھ رنج ہو رہا ہے، یہی اعتماد، یہی تمکنت ان مرحوم کے بھی چہرے اور ہر بن مو سے ٹپکتی تھی... ایسی ہی اونچی اور سیدھی گردن، ان لوگوں کے اصل حالات کیا ہیں اس لڑکے کو دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا... آنکھوں میں قطعاً دھندلاہٹ نہیں، پیشانی پر حاشا کچھ بھی رنگ انفعال نہیں، بڑا صاحب اقبال نکلے گا... بیٹے پر حسن کی یہ چھب ہے تو ماں کا کیا حال ہوگا... لیکن میں کیا... بھائی صاحب مرحوم اگر آج ہوتے... خدا معلوم چھوڑ ہی چکے ہوتے، نکاح تو کیا نہیں تھا اور نکاح بھی ہوتا تو کون سی رکاوٹ ہوتا ... بھائی امین الدین احمد کا خیال نہ جانے کیا ہو لیکن ان سے مطلب ہی کیا...

نواب مرزا نے اس اثنا میں ضیاء الدین احمد خان بہادر کو سر سے پاؤں تک لیکن چپکے چپکے دیکھا۔ بائیس تیئیس کا سن، کشیدہ قامت، چھریرا بدن لیکن فراخ سینہ، بلند پیشانی، داڑھی ابھی پوری طرح گھنی نہ تھی لیکن چوکور کچھ مغل کچھ راجپوت طرز کی ترشی ہوئی، مونچھیں بہت گھنی نہیں لیکن نوابی انداز میں چڑھی ہوئی، اوپری سارا لباس سفید ڈھاکے کی ململ کا، نچلے دھڑ میں بنارسی دھاری دار ریشمی آڑے کا پاجامہ، ہر ہر انداز اور ہر ہر طور سے نوابی اور عالی دماغی مترشح تھی۔

''برخوردار نواب مرزا، داغ تخلص، تمھارے بھائی مرحوم کی یادگار ہیں۔'' مرزا غالب نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ کچھ اس طرح کہا گویا داغ، شمس الدین احمد اور ضیاء الدین احمد کے مابین کوئی گذشتہ تاریخ، کچھ تناؤ، کچھ سانحے، تھے ہی نہیں۔

''تو یہ ہیں نواب مرزا، بہت خوب۔'' ضیاء الدین احمد خان نے کچھ خشک سے تبسم کے ساتھ کہا۔ ''ابھی گھنشیام لال عاصی صاحب کسی محفل میں ان کا ذکر کر رہے تھے۔''

''ہاں میاں ان سے تو ہمیں بڑی توقعات ہو گئی ہیں کہ تم لوگوں کے بعد دلی میں کوئی شاعر ایک مدت سے نہ اٹھا تھا۔'' مرزا صاحب نے کہا۔ ''بھلا ان کا وہ شعر تو تم نے سنا ہوگا، رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں...''

''جی درست، ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے۔ کیا اچھا خیال باندھا۔''

''میں انھیں تم سے ملانا چاہتا تھا، اس وقت اچھا سنجوگ ہو گیا۔'' مرزا صاحب نے کہا۔ ''اچھا میاں داغ، یہ تخلص تمھیں کس نے دیا؟''

''جناب یہ میری والدہ صاحب کا عطا کردہ ہے۔''

''بھئی اچھا تخلص بہم پہنچایا... اجی وہ تو خود بھی شاعر ہیں؟'' مرزا صاحب نے کہا۔ ''کس کو کلام دکھاتی ہیں؟''

''شاہ نصیر صاحب مرحوم سے کبھی کبھی مشورہ تھا، لیکن اب مدت سے وہ سلسلہ منقطع ہے اور مشق سخن بھی اب چھوٹ گئی۔''

ضیاء الدین احمد خان نے اچانک پہلو بدلا اور بولے:

''لیکن ان کی ایک رامپوری غزل نے تو بڑی شہرت پائی تھی، کیا زمین تھی اس کی...'' انھوں نے ایک پل توقف کیا، ''ہاں، تصویر ہو بہو، شمشیر ہو بہو۔''

نواب مرزا کو کچھ حیرت ہوئی کہ نواب ضیاء الدین خان بہادر کو اتنی دلچسپی میری والدہ میں کیوں اور کیسے پیدا ہوئی، لیکن اس سوال کا یہ موقع نہ تھا۔

''جی ہاں، بس وہ ایک غزل ہو گئی تھی۔'' نواب مرزا کو آغا مرزا تراب علی کا ہنس مکھ چہرہ یاد آیا اور ایک لمحے کے لئے وہ چپ ہو رہا، گویا شعر یاد کر رہا ہو۔ پھر تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے مطلع پڑھا ؎

ہے زلف یار حلقۂ زنجیر ہو بہو
رکھتی ہے آنکھ سحر کی تاثیر ہو بہو

مرزا غالب اور ضیاء الدین احمد خان دونوں نے شعر کی تعریف کی۔ نواب مرزا نے جھک کر آداب کیا اور تھوڑی سی مزید لیکن رسمی بات چیت کے بعد سلام کر کے رخصت ہوا۔

واپسی میں راستے بھر نواب مرزا کو الجھن رہی۔ اسے کچھ غصہ بھی تھا اور کچھ افسوس بھی تھا کہ جمعیت خاطری اور طمانینت ذہنی کی کوئی صورت نکلتی نہیں اور نئے نئے تنازعات سامنے آ جاتے ہیں۔ پہلے میرزا فتح الملک بہادر اور اب یہ ضیاء الدین احمد خان۔ انھیں میری ماں سے واسطہ اور میری ماں کی طرف انھیں کیوں میل دل ہو...؟ میل دل، یا صرف ہوس اور بے حیائی کا بے لباس ابلیسی رقص ان لوگوں کو

حرکت مذبوحی جیسی بھونڈی ہلچل پر مجبور کر رہا ہے۔ کیا ہم لوگوں کے لئے سکون کے دو لمحے کہیں نہیں ہیں؟ ان دنوں اسے گرہ تقدیر، ناخن تدبیر، قضائے معلق، قضائے مبرم، دعا، ساعت قبولیت، تعویذ اور نقش، عمل اور وظیفہ، ان سب باتوں کے بارے میں بڑی تشویش رہنے لگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شک و ریب کے دام بے درماں سے کوئی بھی انسان نہیں بھاگ سکتا... یا شاید بزرگان دین اور اللہ والوں کے لئے زندگی شک سے مبرا ہو۔ لیکن شکوک کا اظہار کرنا، یا ان کا عقلی حل تلاش کرنا، یا زندگی کو شکوک پر مرکوز کر دینا، یہ سب باتیں خطرے سے بھری ہوئی تھیں۔ خطرے سے بھری ہوئی نہ سہی لیکن سکون دل کی دشمن یہ باتیں بھی اسی قدر تھیں جس قدر تدبیر کی ناکامیوں اور تقدیر کی ستم ظریفیوں کے شکوے اور تجربے سکون قلب کے لئے زہر تھے۔ اور یہ بھی تھا کہ ان خیالات کی سرحدیں آپ سے آپ بڑھتے بڑھتے کفر کی سرحدوں سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔ یہ ملانے اور یہ مولوی، ان سے خدا محفوظ رکھے۔ کفر کے فتوے، نکاح ٹوٹ جانے کے حکم، برادری میں حقہ پانی بند کئے جانے کے اعلانات، جو نہ کر دیں تھوڑا ہے۔

تقدیر میں جو لکھا ہے... مگر کیا لکھا ہے اور کیوں؟ نواب مرزا نے دل میں کہا، بسا اوقات خود سے نفرت ہو جاتی ہے کہ ہم انسان کیوں بنائے گئے۔ سوالوں کے حل ہمارے پاس ہیں نہ وحوش و طیور کے پاس۔ تو کہیئے پھر کون بہتر ہوا، وہ کہ ہم؟ نہ بادشاہ کا زور نہ محتسب کا شور نہ شحنہ کا پکارنا چور چور۔ نہ سوالوں کی یلغار نہ جوابوں پر تکرار۔ ہم شاعر لوگ تو پھر بھی اچھے ہیں کہ کبھی فلک، کبھی قضا و قدر، کبھی واعظ، کبھی بت، کبھی صرف ''وہ'' یا ''ان'' کہہ کر کام نکال لیتے ہیں، نہیں تو روز ہی تکفیر ہوتی اور پھر کبھی دار پر بھی کھنچ جاتے۔ مدتوں بعد بھی نواب مرزا انھیں سوالوں کے خارزار میں الجھا ہوا دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے ایک بڑا عجیب سا شعر کہا تھا ؎

ہے وہی جبر وہی قہر وہی کبر و غرور
بت خدا ہیں مگر انصاف نہ کرنے والے

یعنی خدا منصف ہے مگر جبر اور قہر اور کبر اور غرور اس کی صفات ہیں؟ مگر جس میں یہ سب ہو وہ منصف کیوں کے ہو سکے؟ یا پھر یہ کہنا مقصود تھا کہ بت اگر انصاف کرنے لگ جائیں تو انھیں خدا کہہ دیا جائے۔ یا ایسا کچھ اشارہ تو نہیں کہ دو خدا ہیں اور ایک ہی خدائی۔ ایک خدا تو وہ جو عرش معلی پر ہے اور ایک خدا یہ بتان بے مہر جو فلک ناانصافی میں اوج ثریا پر ہیں۔ تصرف دونوں کو اس دنیائے دنی پر یا کم از کم گروہ عاشقاں پر حاصل ہے۔ مگر یہ تو کفر سے بھی بڑھ کر شرک جیسی بات ہو گئی۔ ناانصافی سے پھر شاید مراد یہ تھی

کہ بتوں کا ذکر تو بہانہ ہے، دراصل خدا ہی کی خدائی میں جبر و قہر، کبر و غرور کا دور دورہ ہے۔ بھلا کوئی انصاف والا ہو اور جابر و قاہر ہو، یہ تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن اس کا رحم، اس کی رحمت، اس کی صفت رحمانی، وہ کب کارفرما ہوگی؟ اگر جاننے والے پر سب کچھ عیاں ہے تو وہ یہ بھی تو دیکھتا ہوگا کہ ہم لوگ مجبور زیادہ ہیں ماثور کم ہیں۔

ولی عہد سوئم

نواب مرزا نے اپنی ماں سے صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر کا ذکر کیا تھا، نہ اب ضیاء الدین احمد خان کا ذکر کیا۔ لیکن اسے فکر دامنگیر رہی کہ آیا ان لوگوں کے طرف میری ماں کے میلان میں فی الاصل کچھ ہے بھی کہ نہیں۔ اور اگر ہے، تو میرا اس کے بارے میں استجاب کیا ہو؟ لیکن پہلے مجھے اماں جان کو کچھ اشارہ تو کر دینا چاہیئے۔ کہیں کوئی بات اچان چک ہوگئی تو اماں جان کے قلب پر برا اثر پڑسکتا ہے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ بات کو کس نہج سے اماں کے سامنے رکھوں کہ گستاخی نہ معلوم ہو۔ ادھر یہ پریشانی بھی تھی کہ بتانے میں دیر کرنا ٹھیک نہیں۔ صاحب عالم کی طرف سے تو شاید کوئی محتاط قسم کی سلسلہ جنبانی ہوتی، لیکن ضیاء الدین احمد سے تو ایک طرح کی قرابت بھی تھی، وہ شاید تکلف کو بالائے طاق رکھ کر خود بدولت آہی جاتے۔ نواب مرزا اپنے دل میں بے حد آشفتہ تھا کہ آخر میری ماں کو ان لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے؟ لیکن اسے دنیا کے طور طریقوں سے تھوڑی بہت آگاہی تو تھی ہی کہ دنیا اہل اقتدار کے آگے خود بخود جھکتی تھی اور کمزوروں، بالخصوص عورتوں کو وہ کبھی معاف نہ کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی والدہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی اپنی تاریخ ہوتی ہے، اپنا ماضی ہوتا ہے۔ اور ایسی عورتوں کو دنیا ہمیشہ شک، خوف، اور توقع بھری نظروں سے دیکھتی آئی تھی۔ یہ کوئی نیا عقیدہ نہ تھا کہ ایسی عورت گمراہ ہے اور ہر مرد کو اس کا ہاتھ پکڑنے کا حق ہے۔

یہ سب سوچ سمجھ کر نواب مرزا نے اپنی ماں کو مختصراً دونوں ملاقاتوں کا حال بتا دیا۔ وزیر خانم چپ سنتی رہی۔ اسے مرد کی نہیں، سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس بازار میں سہارا اور مرد دونوں ایک ہی جنس تھے۔ آغا مرزا تراب علی سے اسے محبت شاید نہ تھی، لیکن وہ مرحوم اسے بھلے ضرور لگتے تھے۔ اور... اس کی شرط تو یہی تھی کہ میں پسند کروں گی... پر یہ سب آخر کب تک چل سکے گا؟

اس گفتگو کے دو ہی دن بعد ایک معمر لیکن تنومند چوبدار نے وزیر خانم کے گھر کی سیڑھیوں پر آواز دی:

"نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر تشریف لائے ہیں۔"

حبیبہ نے یہ خبر وزیر تک پہنچائی، حسن اتفاق سے نواب مرزا بھی موجود تھا، اس نے جلد نچلی منزل پر اتر کر وہاں کا دیوان خانہ درست کیا، اب تک اس کے دوست ہی اکا دکا آجاتے تو دیوان خانہ کام میں آتا تھا۔ جلدی میں جو کچھ ہو سکا، صاف ستھرا بنا کر اس نے جانی رام سے کہا کہ جا نواب صاحب کو باعزت پالکی سے اتروا لا، صدر میں ان کو بٹھا کر پان اور بھنڈا پیش کیجیو اور کہیو کہ نواب مرزا صاحب ابھی حاضر ہوتے ہیں۔

ضیاء الدین احمد خان نے حسب معمول سفید لباس زیب تن کیا تھا لیکن آج اہتمام کچھ زیادہ تھا۔ سر پر ٹوپی کے بجائے سفید ریشمی دستار تھی جس پر جنگلی مرغ کے سرخ کبود پروں کا طرہ لگا ہوا تھا۔ بازوؤں پر جڑاؤ جوشن، کمر میں زرنگار پٹکا، چاندی کا طمنچہ اس سے آویزاں، سفید ہرن کی کھال کی مغل طرز کی جوتیاں جن پر ننھے ننھے سنہرے پکھراج ٹکے ہوئے تھے۔ جوانی کے دن، چھریرا بدن، کشیدہ قامت، چہرے پر علم اور نجابت کا نور، ضیاء الدین احمد خان ایک تو خود ہی خوشرو شخص تھے، اس پر ایسے سادہ اور ایسے پرکار لباس نے سونے پر سہاگہ کر دیا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک چوبدار بڑی سی سینی میں ڈالی لئے ہوئے آیا اور اسے جانی رام کے ہاتھ میں دے کر نیچے اتر گیا۔ اسی دم نواب مرزا اندر داخل ہوا۔

نواب مرزا کو اندر آتے دیکھ کر ضیاء الدین احمد خان اپنی جگہ سے نیم قد اٹھے، دونوں کے ہاتھ تسلیم کے لئے ایک ساتھ بلند ہوئے۔

"بندگی عرض کرتا ہوں، بڑی مسرت ہے آپ تشریف لائے۔" یہ کہتا ہوا وہ ضیاء الدین احمد خان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ "بھنڈا ملاحظہ فرمائیں، حکم ہو تو شربت حاضر کیا جائے۔"

"نہ۔ نہ۔ صاحب زادے کچھ زحمت نہ کریں۔ دید وا دید ہی سب کچھ ہے۔"

چند ثانیوں کے لئے خاموشی رہی۔ نواب مرزا کے پاس کہنے کو کچھ تھا نہیں، اور ضیاء الدین احمد کو مناسب لفظ نہ مل رہے تھے۔ باب سخن کھولنے کی غرض سے بالآخر انھوں نے کہا، "آپ کے اشعار تو خوب سے خوب تر ہو رہے ہیں، ہر طرف آپ کے تذکرے ہیں۔"

"جناب کی خورد نوازی اور قدر افزائی ہے ورنہ بندہ ابھی طفل مکتب سے زیادہ نہیں۔ یہ توقع

البتہ رکھتا ہے کہ آپ جیسے کاملین کی توجہ سے کچھ بن سکے گا۔"

وہ کہنے کو تو یہ کہہ گیا، لیکن نواب مرزا کو فوراً خیال آیا کہ اس کے معنی کچھ اور بھی نکالے جا سکتے ہیں۔ اسے اپنی ناکردہ کاری اور حمق پر افسوس ہوا کہ جہاندیدہ اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ ہوتا، یا فلسفہ اور منطق کی باریک رگوں کے خم و پیچ سے باخبری حاصل کی ہوتی تو ایسی بات کبھی نہ کہتا۔ لیکن اب تو تیر از کماں جستہ تھا، خیریت اسی میں تھی کہ مزید کچھ نہ کہا جائے۔ ادھر ضیاء الدین احمد خان بھی تذبذب میں پڑے کہ نواب مرزا کے قول میں جو مضمرات ہیں وہ بر بنائے سادہ لوحی ہیں یا بالارادہ ہیں۔ احتیاط کا تقاضا اسی میں دیکھ کر کہ جب تک کوئی اور حتمی اشارہ نہ ملے اس باب میں سکوت ہی بہتر ہے، انھوں نے بات کا رخ فوراً بدل دیا:

"بے شک، استاد کامل نصیب ہو جائے تو یہ راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ آپ کس سے مشورۂ سخن کرتے ہیں؟"

"جی ابھی تک تو کسی کو کلام دکھایا نہیں ہے۔ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ میں خود کو کسی بڑے استاد کی تربیت کا اہل نہیں سمجھتا۔"

"کیوں، بھلا یہ کیا بات ہوئی۔" ضیاء الدین احمد نے مسکرا کر کہا۔ "جہاں تک فہم میری میں آتا ہے آپ کو تو کوئی بھی استاد خوشی سے قبول کر لے گا۔"

اس بار بات کہہ کر ضیاء الدین احمد خان کو دل میں تھوڑی سی ندامت ہوئی۔ کہیں نواب مرزا یہ گمان نہ کر لیں کہ میں انھیں اپنی یا مرزا غالب صاحب کی شاگردی میں لینا چاہتا ہوں۔ مرزا غالب نے ضیاء الدین احمد خان کو اپنا خلیفہ قرار دیا تھا اور اگرچہ خود ضیاء الدین احمد نے ہنوز کسی کو شاگرد نہ بنایا تھا، لیکن آئندہ تو ممکن تھا ہی۔ ضیاء الدین احمد نے دل ہی دل میں خود پر نفرین کی۔ لیکن جب اصل مطلب کی گفتگو ممکن نہ ہو رہی ہو تو انسان خاموشی کا خلا بھرنے کے لئے ادھر ادھر کی لاطائل باتیں بکنے ہی لگتا ہے۔ ضیاء الدین احمد خان نے پیچوان منھ سے لگایا، تمباکو بہت تازہ تھا لیکن حقے کی فرشی کچھ گرد آلودسی تھی۔ شاید بھنڈے کا شوق یہاں کسی کو نہیں ہے۔ وہ تمباکو کی ثنا میں ایک آدھ بات کہنے والے تھے کہ انھیں خیال آیا، یہ بھی خاموشی کو پاٹنے کی بے اثر سی کوشش ہے، اس کا انجام بھلا کیا نکلے گا۔ چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ اور یوں بھی اس وقت باری نواب مرزا کی تھی۔

"جناب کا کرم ہے کہ مجھ ناقص کو اس قابل سمجھتے ہیں۔ لیکن بلاشک مجھے کسی اچھے اور شفیق

استاد سے بہت منفعت حاصل ہو گی۔ دلی تو اس وقت شاعر نو پر کے لئے امکانات بے پایاں رکھتی ہے۔ حضرت غالب یہاں کے اساتذۂ عظام میں سرفہرست ہیں۔‘‘

’’بے شک جناب میرزا صاحب کی نظر کیمیا اثر نے جانے کتنوں کو مس خام سے کندن بنا دیا۔‘‘

ضیاء الدین احمد خان کے چہرے پر اب ایک ذرا سی پریشانی جھلک مارنے لگی تھی۔ بھلا میری گفتگو کب تک اور کس طرح ان رسمی، معنی سے تہی جملوں کے رشتوں میں الجھی رہے گی۔ نواب مرزا سے بھلا کتنی دور تک اس بے لطف سلسلے کو طویل کرنا باصواب ہوگا۔ ان کے دل میں وزیر خانم کے خلاف کچھ غصے کی تپش بھی روشن ہونے لگی تھی۔ کہاں کی انسانیت ہے یہ کہ اس طرح مجھے انتظار میں ڈال رکھا ہے۔ نواب مرزا بھی اب کچھ گھبرانے لگا تھا کہ یا تو انھیں رخصت کیجئے یا پھر ان سے پوچھئے کہ اماں جان سے ملنے کی خواہش انھیں کیوں ہے۔ لیکن اس وقت تو یہی ظاہر کرنا تھا کہ کوئی بات ہے ہی نہیں، ضیاء الدین احمد کا اچانک چلا آنا نہ تھا، روز کی برادرانہ بھائی چارے کی ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات تھا۔

’’استاد ذوق صاحب کی خدمت میں بہت جلد برائے ملازمت حاضر ہوں گا۔‘‘

نواب مرزا کا جملہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ اوپری منزل سے اترنے والے زینے کا دروازہ کھلا اور وزیر خانم نے دروازے پر سے انتہائی شیریں لیکن خیر مقدمی لہجے سے بالکل عاری آواز میں کہا:

’’آداب بجالاتی ہوں نواب صاحب۔ زہے نصیب کہ آپ کو یہاں دیکھتی ہوں۔‘‘

ضیاء الدین احمد اور نواب مرزا اضطراری طور پر کھڑے ہو گئے اور ضیاء الدین احمد نے کچھ پھنسی پھنسی آواز میں کہا:

’’نصیب تو ہمارے اعلیٰ ہیں کہ آپ کی زیارت ہو سکی.. تشریف لائیں، ادھر قدم رنجہ فرمائیں۔‘‘

وزیر اس وقت سیاہ چادر کے سوا بالکل سفید لباس میں تھی۔ چادر کو اس نے ایرانی طرز میں اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ منھ کا صرف تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا، یعنی تھوڑی سی پیشانی، پیشانی کے اوپر چمکیلے عنبریں بالوں کی ہلکی سی جھلکار، آنکھیں، ناک اور دہانہ، اس طرح کہ اگر نیم رخ دیکھیں تو صرف ناک، اور دہانے کے خطوط دکھائی دیتے، اور اگر دو چشمی دیکھیں تو آنکھیں، اور آنکھوں کا محاذ باقی ہر چیز پر حاوی ہو۔ وزیر اندر آ کر ضیاء الدین احمد سے کچھ الگ اس انداز سے بیٹھی کہ نہ تو اس کی پشت نواب کی طرف تھی

اور نہ اسے نواب کے روبرو کہہ سکتے تھے۔

نواب مرزا کسی بہانے سے اٹھ آیا۔ جاتے وقت اس نے پردہ برابر کر کے دروازہ ہلکے سے بند کر دیا تھا۔ اب وزیر اور نواب ضیاء الدین احمد اکیلے تھے۔

دروازے پر داخل ہونے سے لے کر اب تک وزیر نے کئی بار ہنکھیوں سے نواب ضیاء الدین احمد خان کی طرف دیکھا تھا۔ نواب شمس الدین احمد خان سے مشابہت جگہ جگہ نمایاں تھی۔ اس وقت چھوٹے بھائی کا سن بھی وہی تھا جو نواب شمس الدین احمد خان کا اس وقت تھا جب ان کی پہلی ملاقات وزیر سے ہوئی تھی۔ ضیاء الدین احمد خان کو دیکھ دیکھ کر وزیر کے دل میں ہوک سی اٹھتی معلوم ہوتی تھی اور عیش گذشتہ کی یاد اس کی روح میں چنگاری کی طرح چبھنے لگتی تھی۔ اسے ضیاء الدین احمد خان پر یک گونہ پیار بھی آتا اور نفرت کی بھی لہر اس کے دل پر سانپ کی طرح لوٹتی کہ انھیں زندہ رہنے کا کیا حق ہے جب میرے نواب کی جان چلی گئی اور انھیں لوگوں کی وجہ سے گئی۔ نہ یہ لوگ انگریز سے ساز باز کر کے بڑے بھائی کو بے دخل کراتے اور نہ وہ حادثۂ فاجعہ پیش آتا۔ اب بھلا یہ کیا کرنے میرے پاس آئے ہیں۔ شاید میرے حال پر ہنسنے اور خوش ہونے آئے ہوں۔ لیکن میں بھی اپنے نام کی وزیر نہیں جو انھیں خوش ہونے یا بغلیں بجانے کا موقع دوں۔

''مجھے آپ کو دیکھنے کا اشتیاق بہت تھا۔'' ضیاء الدین احمد خان کے الفاظ نے وزیر کے خیالات کی رو کو منتشر کر دیا۔ ''دیکھنے'' کے لفظ کی معنویت وزیر پر خوب واضح تھی لیکن وہ اپنی طرف سے کوئی موقع نہ دینا چاہتی تھی۔

''تقدیر اور ملک الموت نے ہمیں علٰحدہ کر دیا ورنہ ملنا اور مل جانا غیر ممکن نہ تھا۔'' وزیر نے کچھ خشک لہجے میں جواب دیا۔

ضیاء الدین احمد خان نے اس جملے میں پوشیدہ تعریض کو محسوس کیا، لیکن اس وقت ان کے لئے بھی بحث کا موقع نہ تھا۔ انھوں نے درد بھرے لہجے میں کہا:

''جی ہاں، ہم انسان اپنے خیال میں بہت سرکش اور گردن افراز ہیں لیکن کن فیکون کے نقشے پر ایک خشک پرکاہ سے زیادہ نہیں۔'' پھر ایک لحظہ خاموش رہ کر انھوں نے صائب کا شعر پڑھا اور اس طرح گویا وزیر خانم کو جواب دیا۔

ہر کہ آمد در غم آباد جہاں چوں گرد باد
روزگارے خاک خورد آخر بہ ہم پیچید و رفت

''جی ہاں،'' وزیر کے لہجے میں تھوڑی سی تلخی تھی۔ ''لیکن ہمیں غم آباد جہاں میں لایا کون تھا؟''

ضیاء الدین احمد خان ایک لمحے کے لئے لاجواب سے ہو گئے۔ انھوں نے آہستہ سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور خفیف سی مسکراہٹ مسکرا کر بولے، ''یہ سوال تو عمر خیام سے پوچھنے کا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے وزیر خانم کہ جنھیں کچھ ملتا ہے وہ مزید کے خواہاں رہتے ہیں اور جنھیں نہیں ملتا وہ پانے کے متمنی رہتے ہیں۔''

اپنے خیال میں ضیاء الدین احمد خان نے وزیر کی دونوں باتوں کا جواب دے دیا اور عرض مدعا بھی کر دی، لیکن وزیر کے مزاج کی برہمی یوں کم نہ ہو سکتی تھی۔ اس نے کچھ تیز لہجے میں کہا:

''نواب صاحب نے شاید غور نہ فرمایا کہ ایسے بھی ہو سکتے ہیں ترک تمنا ہی جنھیں سب کچھ مل جانے کے مترادف ٹھہرے۔''

''بھلا وہ کون؟'' ضیاء الدین احمد نے شاید تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

وزیر نے جواب میں کلیم ہمدانی کا شعر پڑھا۔

قطع امید کردہ نہ خواہد نعیم دہر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

''آپ خدانخواستہ شاخ بریدہ کیوں ہونے لگیں؟ ابھی تو نہال آرزو میں آپ کے برگ و بار کے اسرار بہت پوشیدہ ہیں۔'' ضیاء الدین احمد نے کہا۔

''مجھے خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی اس کوشش کا شکریہ، لیکن صاحب خانہ ہی کیف و کم خانہ کو سمجھتا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ہر نہال حیات کو باثمر کرنے کا گن ہر باغبان کو نہیں آتا۔ ہر نخلے و ہر باغبانے آپ کے سمع مبارک تک پہنچا تو ہوگا سرکار۔''

یہ جملہ کہہ کر وزیر نے بخیال خود تمام باتیں صاف کر دی تھیں: نواب ضیاء الدین کو اس باغ سے پھل کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔ لیکن ہزار فہم و فراست کے باوجود ضیاء الدین احمد اپنے وقت کے انسان تھے، ان کے حسابوں تو یہ غیر ممکن تھا کہ کوئی عورت انتخاب اور پسندیدگی کے سوالوں سے کوئی سروکار بھی رکھے۔ انتخاب تو مرد کا حق تھا اور پسند کرنا نہ کرنا بھی مرد ہی کا معاملہ تھا۔ یا شاید ایسا تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد میں حس مزاح شاید کم تھی اور وہ اس صورت حال کے ظرافتی پہلو تک نہ پہنچ سکے تھے کہ کوئی عورت انھیں باتوں میں اڑا کر لطف لے سکتی تھی اور بہر حال اس کے لئے ضیاء الدین احمد خان کا اس کے یہاں آنا کسی دلکشی کا حامل نہ تھا۔

ضیاء الدین احمد خاں نے تاریخ کا علم بہت حاصل کیا تھا، فلسفہ اور منطق بھی وہ خوب جانتے تھے اور دلی شہر میں بھی جو اس وقت باکمالوں سے بھرا ہوا تھا، ضیاء الدین احمد کا ثانی ملنا آسان نہ تھا۔ لیکن وہ چھوٹے بھائی بھی تھے، اور امین الدین احمد خاں ہی نہیں، شمس الدین احمد خاں کے بھی وہ چھوٹے بھائی تھے۔ برادر خورد کو برادر بزرگ سے کچھ نہ کچھ شکایت ہمیشہ رہتی آئی ہے اور اگر مابہ النزاع اموال و جائداد ہوں تو تلخی وہاں بھی آجاتی ہے جہاں اس کی جگہ نہ ہو۔ ضیاء الدین احمد خاں نے اوائل صبا سے شمس الدین احمد کی خوبصورتی، جامہ زیبی، محرور المزاجی اور سوتیلے بھائیوں کے تئیں ناانصافی کے چرچے مسلسل سنے تھے۔ شمس الدین احمد کا پھانسی پر کھینچا جانا ان کے خیال میں کیفر کردار کے سوا کچھ نہ تھا۔ مرزا غالب کے وہ بہت مداح تھے، اور مرزا صاحب موقع بے موقع شمس الدین احمد کی برائیاں کرتے رہتے تھے۔ سوتیلے بڑے بھائی کے خلاف ضیاء الدین احمد کی معاندت اس سبب سے اور بھی چمک گئی تھی۔ جب ضیاء الدین احمد شعور کو پہنچے تو انھوں نے چھوٹی بیگم کے جمال قیامت خیز اور شمس الدین احمد سے ان کے عشق کے قصے سنے تھے اور ایک دبا دبا سا حسد انھوں نے محسوس کیا تھا۔ لیکن وہ سب باتیں احتمال اور خیال کے عالم سے تھیں، ضیاء الدین احمد نے ان کی عملی حیثیت کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ بڑے بھائیوں کے خلاف شکایات میں بہر حال یہ بات بھی شامل تھی، دھندلے طور پر سہی، کہ شمس الدین احمد نے باپ کی وراثت پوری پوری ہتھیا لینی چاہی اور مدتوں اس پر قابض بھی رہے، اور کشور حسن میں انھوں نے وہ تسخیریں کیں جو ہم چھوٹوں کو نہ مل سکیں۔ امین الدین احمد نے لوہارو کے قلعے اور دربار پر اپنا تسلط رکھا تھا اور چھوٹے بھائی کو حکومت میں شریک نہ گردانتے تھے۔ ضیاء الدین احمد کی یہ شکایت دربار انگریز تک پہنچ چکی تھی۔

لہٰذا ضیاء الدین احمد اگر چھوٹی بیگم پر مائل ہو رہے تھے تو بخیال خود ایک قسم کی تلافی مافات کو عمل میں لا رہے تھے اور اس تلافی میں چھوٹی بیگم کا برابر سے شریک ہونا بالکل مناسب تھا۔ اب جو وزیر خانم نے اس شراکت سے صاف انکار کیا تو ان کی مردانگی سے زیادہ ان کے تصور انصاف کو ٹھیس لگی۔ وہ اس بات کو خیال میں بھی نہ لا سکتے تھے کہ وزیر خانم کو بھی زمانے، یا تقدیر، سے کچھ شکایات ہو سکتی تھیں۔ انھوں نے کچھ استعجاب سے کہا، لیکن بہت پست آواز میں، گویا خود سے ہمکلام ہوں:

"جس شجر حیات کو پے بہ پے باغبان حاصل ہوتے جائیں اسے تقدیر کا شکوہ بھلا کاہے کو ہو سکے۔"

''ہر باغبان کچھ تراشتا اور قطع برید بھی کرتا ہے۔ وہ کچھ لے بھی لیتا ہے، صرف بخشش ارزانی نہیں کرتا۔ اور جب خود باغبان کا شجرِ حیات خزانی ہو جائے تو جس شجر کی باغبانی وہ کرتا تھا اس کو بھی خزاں کی زہریلی زبان چاٹ لیتی ہے۔ آپ ابھی...''

وہ کہنا چاہتی تھی، ''آپ ابھی بچے ہیں، ان رموز کو آپ کیا سمجھیں۔'' لیکن اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ اس کے بجائے اس نے دوسری بات کہی: ''آپ ابھی اس بات پر توجہ فرمائیں نواب صاحب کہ جس طرح ناہمواری حیات کے لئے ناگزیر ہے اسی طرح انسان بھی اپنی طینت کا بندہ ہے۔ کبھی بسترِ نرم اس کو سخت اور ناگوار لگتا ہے کبھی خاکستر گرم اسے آغوشِ مادر لگتی ہے۔''

ضیاء الدین احمد کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی۔ ''ایسی نکتہ شگافیاں تو ہم بھی کر سکتے ہیں چھوٹی بیگم۔''

''یہی تو بندی بھی عرض کر رہی ہے۔ بندی کسی کے لئے چھوٹی بیگم ہے کسی کے لئے وزیر خانم۔''

اس طنز اور اس کنائے کو سمجھنا ضیاء الدین کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ اندر ہی اندر تلملا سے گئے لیکن مراجعت اتنی آسان بھی نہ تھی اور وہ بھی آخر میرزا تھے، صرف سید نہ تھے۔

''خیر، ہمیں آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ سو وہ ابھی پورا نہ ہوا۔'' ضیاء الدین احمد خان نے رک کر، کچھ کچھ تلخ سے تبسم کے ساتھ کہا۔ ''کیا ہمیں دوبارہ ناصیہ سائی کی اجازت ہے؟''

''یہ دروازہ کسی کے لئے کھلا ہوا نہیں ہے نواب صاحب۔ لیکن آپ غیر نہیں ہیں، آپ کی بات اور ہے۔'' وزیر نے گردن ذرا سی موڑی، اس طرح کہ اب اس کا تقریباً پورا منھ نواب کی طرف تھا۔ ضیاء الدین احمد نے وزیر کے چہرے کو ٹٹولا کہ اس پر شاید کہیں کچھ ہمت افزا تبسم یا لگاوٹ آمیز نرمی کی جھلک روشن ہو۔ لیکن وزیر کا چہرہ کچھ مبہم اور کچھ درشت معلوم ہو رہا تھا۔

ضیاء الدین احمد ایک انداز بے پروائی سے اٹھے اور انھوں نے جوتیوں میں پاؤں ڈالنے کے پہلے ظہوری کا شعر پڑھا۔

می تواں کرد مدعا بافی
تا نفس تار گفتگو دارد

پھر انھوں نے کورنش کے انداز میں سر جھکا کر اور سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''کیا مجھے یہ بھی کہنے کی اجازت ہے کہ مارا بہ تو صد حساب باقیست؟''

وزیر اپنی جگہ سے نہ اٹھی، اس کے بدن کا تناؤ اس کے مزاج کی برہمی کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے تالی بجائی، اور جب تک جانی رام آئے آئے، اس نے بیٹھے بیٹھے ہی نواب کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ہلکی سی ہنسی ہنس کر کہا :

''سبحان اللہ، اب یہاں کیا رکھا ہے۔ دل از دو کون شستم و کردم حساب پاک۔''

ضیاء الدین احمد نے ایسی نرم اور مترنم ہنسی پہلے کبھی کاہے کو سنی تھی، ان کے دل سے لے کر وسط کمر تک ہیجان سا اٹھا، لیکن ہنسنے والی نے ان کی تقدیر ہی پر ہنس دیا تھا۔

اس ملاقات کی بے فیضی کا اثر نواب ضیاء الدین احمد خان کے دل پر مدتوں رہا لیکن اس کے باوجود انھوں نے وزیر خانم کے یہاں اگلے دو مہینوں میں مزید دو تین بار حاضری دی۔ وہ ملاقات آخری ثابت ہوئی جب وزیر نے تنگ آ کر ان سے اشارتاً کہہ دیا کہ ہماری عمروں میں بہت تفاوت ہے، آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ اپنے برابر کے سن والوں میں کام دلی کے حصول کی سعی کریں تو بہتر ہوگا۔ نواب مرزا نے اس اثنا میں کبھی کوئی تجسس ظاہر نہ کیا تھا، ہر چند کہ ضیاء الدین احمد کے آنے جانے کا مقصد اس پر واضح تھا۔ اسے اپنی ماں سے ایسی محبت تھی جس میں فیصلے، اعتماد، استفسار، تفتیش، کسی شے کی ضرورت نہ تھی۔ نواب مرزا کے خیال میں اس کی ماں دنیا کی بہترین اور کامل و اکمل شخص تھی۔ اس کی ماں کا کوئی فیصلہ، کوئی اقدام، کوئی مواصلہ یا مقاطعہ، کسی خارجی توجیہ یا دلیل کا محتاج نہ تھا۔ اس کے باصواب ہونے کی یہی دلیل بہت تھی کہ یہ کام یا یہ فیصلہ وزیر خانم نے کیا تھا۔ نواب مرزا کی یہ پریشانی تو بدستور تھی کہ مجھے اپنی ماں کو ان کے مرتبے اور معتاد کے مطابق آرام سے رکھنا ہے اور اس کے لیے اب تک کوئی خاطر خواہ صورت نہ پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اماں جان اگر اپنی مرضی اور پسند سے کسی مرد کا ساتھ اختیار کر لیں تو یہ بات بھی اسے قابل قبول لگتی تھی۔ اگر ایسی صورت میں محمد آغا اور خود اس کی نگہداشت و پرداخت پر کوئی سوال اٹھتا تو اسے یقین تھا کہ اماں جان محمد آغا کو اپنے ساتھ ہی رکھیں گی، اور خود نواب مرزا رامپور واپس جا کر نوابی آستانے پر کوئی چھوٹی موٹی نوکری حاصل کر سکتا تھا۔ یا اگر شاہ محمد آغا کو اماں جان اپنے ساتھ نہ لے جا سکیں تو منجھلی خالہ انھیں بخوشی رامپور میں رکھ کر انھیں بالکل ماں کی طرح پال پوس سکتی تھیں۔ آخر انھوں نے نواب مرزا کو بھی تو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ وہ خود بھی چاہت والے سبھاؤ کی تھیں اور لاولد ہونے کے باعث ان کی ساری ممتا چھوٹی بہن اور اس کی اولاد پر مرکوز ہوگئی تھی۔

اپنے اور اپنے اخیافی بھائی کے سلسلے میں ایک اور امکان نواب مرزا کے ذہن میں تھا۔ دہلی کو مراجعت کے بعد اس نے انوری خانم یعنی اپنی بڑی خالہ کے یہاں بغرض سلام حاضری دی تھی۔ بڑی خالہ نے کچھ تو اس بنا پر کہ مرحوم باپ کو نواب مرزا سے بہت محبت تھی، کچھ خود نواب مرزا کے حسن صورت اور باتمیز طور طریقوں، اور کچھ چھوٹی بیگم کی مامتا کے سبب نواب مرزا کی بڑی خاطر داریاں کیں۔ چھوٹی بہن کو تو نہ بلایا، لیکن خود نواب مرزا سے کہا کہ تم اور ننھے آغا میاں جب چاہو آؤ جاؤ گھر تمھارا ہے۔ اگلی کئی ملاقاتوں میں چھوٹی کا پورا حال بھی بڑی پر کھلا تو اس نے اس بات کا اشارہ بھی دیا کہ اگر وزیر نکاح کر کے کسی شریف آدمی کے گھر بیٹھ جائے، اور حالات تقاضا کریں، تو وزیر کے دونوں بیٹوں کو وہ بخوشی اپنے پاس رکھ لے گی۔

بڑی خالہ کے گھر میں نواب مرزا کے لئے ایک اور دلکشی و دلبستگی کا سامان اس کی خالہ زاد بہن فاطمہ تھی۔ تیرہ چودہ سال کی فاطمہ صورت شکل، بات چیت، سگھڑاپے، نماز روزے، بڑوں کی خدمت گذاری، ان سب میں اپنی ماں پر گئی تھی۔ معمولی حساب اور تھوڑی بہت اسلامی تاریخ کے علاوہ وہ فارسی سے بھی آشنا تھی اور ہندی کی شاعری، خاص کر حمد، نعت، مرثیہ، منقبت، جنگ نامے وغیرہ وہ خوب پڑھتی اور زنانہ مذہبی محفلوں میں سناتی تھی۔ چھوٹی بیگم کی طرح آواز بھی اس نے بہت اچھی پائی تھی۔ نواب مرزا کا دل خود بخود فاطمہ کی طرف کھنچتا چلا گیا تھا۔ ابھی یہ بات ظاہر نہ تھی کہ فاطمہ، جسے نواب مرزا کچھ چڑانے کے لئے اور کچھ اپنے حال دل کے اظہار کے لئے ''پری بانو'' کہہ کر پکارتا تھا، اپنے گھبرو خوشرو مقبول زمانہ نوجوان شاعر اور خالہ زاد بھائی کے لئے کیسے خیالات رکھتی ہے۔ لیکن پری بانو کی محبت بہت تیزی سے نواب مرزا کے دل میں گھر کرتی چلی گئی۔

ظاہر ہے کہ حسن فروش بالا خانوں کی بدولت نواب مرزا کی عمر اور طبقے کے اکثر نوجوانوں کو آداب و مناہج ہم بستری سے بیگانگی نہ تھی۔ اس زمانے میں یہ قول عام تھا کہ جس نے امردوں کی گالیاں اور طوائفوں کی جوتیاں نہیں کھائیں وہ عاشق ہی نہیں ہوا۔ مثل مشہور تھی ع

عاشق کی آبرو ہے گالی و مار کھانا

نواب مرزا کی تو عمر ہی ایسی تھی کہ سادہ رو لڑکوں اور خوبرو لڑکیوں کے لئے دل خواہ مخواہ مچلتا تھا لیکن فاطمہ کی بات اور تھی۔ وہ اسے پری بانو یوں ہی نہ کہتا تھا۔ فاطمہ اسے سچ مچ کچھ فوق الانسان سی لگتی تھی، بلکہ اسے کبھی کبھی یہ بھی خوف لگتا کہ فاطمہ جیسی نازک دھان پان دودھ مصری کے شربت جیسی شیریں اور لطیف

معشوقوں کے ساتھ جسمانی عشق کے مراحل انجام دیئے بھی جاتے ہیں یا نہیں...

خیر، اس وقت تو نواب مرزا کے بے صبر دل کو بھی وہ بات بہت دور بلکہ نا قابل یقین وحصول لگتی تھی۔ اسے پہلی فکر اس بات کی تھی کہ بڑی خالہ مجھے ہزار چاہتی ہوں لیکن اماں جان سے تو ناخوش ہیں، بھلا میرے بارے میں کبھی غور بھی کریں گی۔ دنیا کے کاموں میں نا تجربہ کار لڑکے کو یہ نہ معلوم تھا کہ لڑکی والے ایسے حالات میں داماد کو دیکھتے ہیں، داماد کی ماں کو نہیں، اور چھوٹی بیگم بہر حال انوری خانم کی سگی بہن تھی اور نواب مرزا نرا شاعر نہ تھا، وہ بہر حال نواب شمس الدین احمد جیسے جلیل القدر والی ریاست کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ریاست اور امارت خواہ نہ رہی ہو لیکن پدری نسب تو باقی تھا اور ہمیشہ باقی رہنے والا تھا۔

داغ کی بالکل اوائلی شاعری میں جگہ جگہ معاملات اور وقوعات یوں سلک نظم میں آئے ہیں کہ ذاتی واردات کی باپردہ جھلک نظر آجاتی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ داغ کی شاعری میں جسمانی حسن کا بیان کم کم ہے اور شروع کے کلام میں تو نہیں کے برابر ہے، گویا اسے اپنی خالہ کی بہن کے ناموس اور حجاب کا لحاظ ہو۔ ذیل کے شعروں میں نوجوان عاشق کی خود پر مباہات اور بیان حسن واظہار تمنا میں احتیاط غیر معمولی لطف کے حامل ہیں۔

تمھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا
بتائیں لفظ تمنا کے تم کو معنی کیا
تمھارے کان میں اک حرف ہم نے ڈال دیا

بعد کے نکتہ دانوں نے داغ کی شاعری کو زنان رقاصۂ بازاری کی مرغوب شاعری کہا۔ ممکن ہے انھوں نے ایسا ہی دیکھا ہو، لیکن اوپر درج کردہ شعروں کی نفاست اور تمکین اور بھولی بھالی متانت سے تو ایسا کہیں سے نہیں لگتا۔ نواب مرزا کے مزاج میں کچھ شوخی اور کھلنڈرا پن ضرور تھا، لیکن اس کا اظہار موقعے موقعے سے ہی ہوتا تھا۔ اور جس زمانے کا ہم ذکر لکھ رہے ہیں، وہ زمانہ تو نواب مرزا کے لئے کئی طرح کے بحران کا زمانہ تھا اور اس وقت اس کا کھلنڈرا پن، خاص کر عشق کے معاملے میں شاذ ہی بروئے کار آتا تھا۔

پروانہ پاس شمع کے بلبل ہے گل کے پاس
اک میں کہ تیری بزم میں خلوت گزیدہ ہوں

اے آرزوے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پاے شوق و دست تمنا بریدہ ہوں

پندرہ سولہ برس کا لڑکا ایسے شعر تبھی کہہ سکتا تھا جب شاعری کی سرحدیں مضمون آفرینی سے آگے نکل جائیں۔ معشوق سے معاملہ جب گھریلو سطح پر اور مانوس ماحول میں ہو تو ہی ایسے شعر ہو سکتے ہیں۔

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

اسی غزل میں یہ شعر بھی ہے، اور کچھ عجیب بات نہیں کہ پندرہ برس کی عمر کا داغ جب زینت باڑی کے مشاعرے میں اسے پڑھے تو امام بخش صہبائی جیسا دبنگ استاد اپنی جگہ سے اٹھے اور شاعر کو گلے لگا لے۔

لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

اسی رنگ میں ایک اور بھی دلکش مضمون آفرینی کا نمونہ ملاحظہ ہو، ایسا شعر تعقل اور تصنع دونوں سے بے نیاز ہے۔

سادگی بانکپن اغماض شرارت شوخی
تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اسی مضمون کو عرفی نے اپنے بے مثال، پیچیدہ اور تعقلاتی اسلوب میں یوں بیان کیا تھا۔

ازاں بہ دردِ دگر ہر زماں گرفتارم
کہ شیوہ ہاے ترا با ہم آشنائی نیست

حق یہ ہے کہ عرفی کے مضمون کی نزاکت، اور اس سے بڑھ کر معنی کے امکانات کی وسعت ایسی ہے کہ داغ کا شعر بظاہر پھیکا اور گھریلو معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہی گھریلو پن تو اس معاملے کی جان ہے، اور "انداز" کے لفظ کا گھریلو پن "شیوہ" کے مقابلے میں اپنے حسن کو منوا رہا ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر "جی جانتا ہے" اس قدر بے تکلف اور محاوراتی زور رکھتا ہے کہ زبان ہندی کے ایجاز اور ہندی شاعر کے اعجاز پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

سہل ممتنع کا جو طرز بعد میں داغ کی شاعری کا امتیازی نشان بنا، درحقیقت شروع ہی سے ان

کے یہاں موجود تھا جس کی وجہ غالباً فاطمہ کا عشق ہی تھا کہ جوانی کے برگ و بار لاتے ہوئے قادر الکلامی کے مزے اٹھاتے ہوئے اس نوبادۂ حدیقۂ شعر و سخن کا جی چاہتا تھا کہ غیر پیچیدہ اور غیر استعاراتی، غیر رسمی زبان میں اپنے معشوق سے اپنے دل کا حال کہے۔

شب ہجراں سے موت بہتر ہے
خواب آرام سے تو آئے گا
کبھی اپنا بھی دور خوش اے داغ
دور ایام سے تو آئے گا

☆

چین دیتے نہیں وہ داغ کسی طرح مجھے
میں جو مرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ جینا ہوگا

☆

کہا ظالم نے میرا حال سن کر
وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا

☆

شمع رو آپ گو ہوئے لیکن
لطف سوز و گداز کیا جانیں

☆

اپنی تعریف سے چڑھتے ہو اگر جانے دو
چشم بد دور ہمارا ہی جمال اچھا ہے
آپ گھبرائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ مضمون کے لحاظ سے یہ اشعار معاملہ بندی کی غزل کی رسومیاتی دنیا کے باہر نہیں ہیں۔ لیکن ان کے لہجے میں کچھ ایسا فوری تقاضا، التجا کی کچھ ایسی عجلت تھی کہ ان مضامین کو مبنی بر اصلیت تسلیم کیے ہی بنتی تھی۔ فاطمہ کی خوشنودی، فاطمہ کے ایک تبسم کی تمنا میں طرح طرح کے منصوبے

بنانا، فاطمہ کی ذرا سی تغافل شعاری، اصلی اور واقعی یا محض فرضی، پر پہروں رنجیدہ رہنا اور کڑھنا، ان سب کیفیات کا نچوڑ اس وقت کے کلام داغ میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ کسی نہ کسی بہانے سے ایک دو بار فاطمہ کے یہاں کا چکر ضرور لگالینا، بازار دوکان کے کام خود کرلانے کی پیشکش کرنا، کسی بنا پر فاطمہ اس وقت گھر پر نہ ہوئی تو دل میں ہزار طرح کے شکوے دل میں اس وقت تک پالتے رہنا جب تک فاطمہ سے ملنا نہ ہو اور وہ مسکرا کر نہ پوچھ لے کہ آپ اب تک کہاں تھے، یہ نواب مرزا کے روزانہ کے معمول تھے۔

ادھر یہ بھی ہے کہ نواب مرزا کو شربت یا پان پیش کرتے ہوئے فاطمہ کے منہ پر حیا کی ہلکی سی رمق، ڈھلکے ہوئے آنچل کو جلدی سے برابر کر کے ایک ہاتھ سے سینہ ڈھانکنے اور دوسرے ہاتھ سے پان کی طشتری سنبھالنے کی کوشش، دسترخوان پر اس بات کا خاص اہتمام کہ کوئی خاص کوشش نظر نہ آئے لیکن کھانے کی ہر اچھی چیز سب سے پہلے نواب مرزا کے سامنے رکھی جائے، یہ سب کسی تعلق کے غماز نہ تھے تو اور کیا تھے؟ نواب مرزا کی دستک میں اپنائیت کا ایک انداز تھا، ایک آہنگ تھا جسے فاطمہ خوب پہچان گئی تھی۔ اگر وہ دستک کسی دن سورج چڑھنے کے بعد تک نہ سنائی دیتی تو فاطمہ کی نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھتیں۔ نواب مرزا کو اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن دستک ہوتے ہی جس مستعدی سے وہ شیریں آواز سنائی دیتی، جس ہلکی سی مسکراہٹ اور ہلکی سی حیا کے ساتھ وہ گل دوپہریا جیسی نازک اور دھوپ سے کچھ بے پروا سی، لیکن دھوپ ہی کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہوئی زندگی سے بھری ہوئی آواز اس کے کانوں تک آتی، ''آجایئے پردہ نہیں ہے''، اس سے نواب مرزا کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ بلانے والی اسے محض رسماً گھر کے اندر نہیں بلا رہی ہے، بلکہ زبان حال سے میرزا بیدل کا شعر پڑھ رہی ہے ؎

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

نواب مرزا کے دل کو اب ایک کی جگہ دو باتیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک تو اپنی ماں کے لئے مستقل آرام اور سکون کی زندگی کا سامان کرنا، اور دوسری فاطمہ کو اپنی دلہن بنانا۔ لیکن اس وقت دونوں ہی معاملوں میں کوئی پیش رفت نہ ہو رہی تھی۔ اس کی شاعری یقیناً شہرت پذیر تھی لیکن ابھی اس سے روٹی پیدا کرنے کی کوئی سبیل سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ ظہیر دہلوی سے کہہ دیکھیں، شاید قلعۂ معلیٰ میں اپنے لئے بھی کچھ نوکری کی صورت ہویدا ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اسے دیوانی وخان سامانی وغیرہ میں نوکری سے کچھ بھی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا خیال، بلکہ عقیدہ تھا کہ شاعر کے لئے شاعری ہی بہت ہے، کیا پیشہ کیا مشغولیت، کیا

مصروفیت، ہر حیثیت سے شاعری اکیلی کافی ہے۔ لیکن اس کی شاعری اس وقت تک تو مصحفی کی رباعی کے اول دو مصرعوں کی تصویر پیش کر رہی تھی کہ شاعری کے سوا کچھ کار دیں یا کار دنیا اس سے بن نہ پڑتا تھا۔ اور زندگی کی ضرورتیں اور فرض کے تقاضے اور جوان ہوتی ہوئی لطف حیات اور لذت تکمیل حیات کی امنگیں تھیں کہ اس کے ذہن اور ضمیر پر دستکیں دیئے جا رہی تھیں۔ ان دنوں میں نواب مرزا کو یقین کامل تھا کہ ساری دہلی میں مجھ سے بڑھ کر بدنصیب اور دکھارا کوئی نہیں۔

ماں کے بارے میں نواب مرزا کو اتنا ضرور معلوم تھا کہ اگر وہ چاہیں تو کہیں مناسب جگہ نکاح یا کچھ اور انتظام کر سکتی ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ اس کی اماں جان کے چہرے اور بدن ہی پر نہیں، ان کی روح میں بھی اب کچھ تھکن سی چھانے لگی تھی، جیسے اتنا بہت کچھ گنوانے کے بعد اب ان میں مزید حاصل کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ دوسری طرف، اس نے یہ بھی اڑتی اڑتی سن رکھی تھی کہ صاحب عالم مرزا فخرو بہادر کا کچھ میلان وزیر خانم کی جانب اب بھی ہے۔ ظہیر دہلوی نے ایک دن قلعے سے واپسی پر نواب مرزا کو بتایا کہ صاحب عالم و عالمیان مرزا فتح الملک بہادر نے دہلی کے مشہور مصور استاد غلام علی خان کو بلوا کر ان سے کہا ہے کہ ہمیں چھوٹی بیگم کی تصویر درکار ہے۔ میاں غلام علی خان اب بہت مسن ہو چکے تھے اور شبیہ سازی ترک کر چکے تھے، لیکن ان کی کارگاہ میں کئی ہونہار شاگرد شبیہ سازی اور نقشہ کشی کرتے تھے۔ استاد غلام علی خان پیرانہ سری کے باوجود دربار شاہی سے اب بھی وابستہ تھے اور ظل سبحانی کے یہاں ان کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ وہ مصوری کے علاوہ خوش نویسی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور علم مجلسی میں طاق اور بے حد خوش تقریر بھی تھے۔ ان کے والد استاد مظہر علی خان بھی حضرت اکبر شاہ ثانی عرش آرام گاہ کے عہد بابرکت کے بے حد نمودار مصور تھے۔ انھیں عمارتوں کی تصویر بنانے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے چھوٹے بیٹے، یعنی میاں غلام علی خان کے چھوٹے بھائی استاد فیض علی خان اب کچھ تو رسم پدر کی پاسداری میں، اور کچھ بلحاظ غلبۂ شریعت، شبیہ سازی ترک کر کے صرف عمارتوں کی تصویر بناتے تھے۔ ظہیر دہلوی نے نواب مرزا سے کہا کہ صاحب عالم نے چھوٹی بیگم کی تصویر کے واسطے استاد غلام علی خان کو منھ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔

نواب مرزا کچھ سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بات اماں جان کو بتاؤں یا ان سے فی الحال اسے پوشیدہ ہی رکھوں۔ اور ان کی تصویر میاں غلام علی کو کہاں سے مل جائے گی؟ اماں جان سے کچھ پوچھنا گویا بات ہی

کو کھول دینا تھا، لہٰذا اس گتھی کو وہ فوراً نہ حل کر سکا تھا۔ حسن اتفاق کہ ایک دن بڑی خالہ کے یہاں باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوگیا کہ اس کی ماں کی ایک تصویر عین جوانی کے دنوں میں بنی تھی اور وہ شاید اب کسی رئیس کے پاس تھی۔ بڑی خالہ نے یہ خبر کچھ بہت مسرت کے ساتھ نہیں بلکہ ناخوشی کے لہجے میں بتائی تھی اور محل اس کا یہ تھا کہ تصویر کشی کو اللہ رسول نے اس لئے بھی منع کیا ہے کہ یہ بے پردگی کا سبب بنتی ہے۔ نواب مرزا کے جی میں آئی تھی کہ کسی طرح فاطمہ کی تصویر بنوا کر اپنے کلیجے میں رکھ لے، اور شبیہ سازی کی بات اس نے اسی غرض سے شروع بھی کی تھی۔ خیر وہ مقصود تو حاصل نہ ہونا تھا اور نہ ہوا لیکن ماں کی تصویر کے بارے میں اسے ایک کام کی بات معلوم ہوگئی۔

استاد غلام علی خان اپنے وقت کے مانے ہوئے نقاش تو تھے ہی، انھیں تصویروں کے بارے میں معلومات بہت تھی کہ کس کی تصویر کس نقاش نے کب بنائی اور اب وہ تصویر کہاں ہے۔ انھوں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد پتہ لگا لیا کہ وزیر کی وہ پرانی تصویر تو کسی انگریز نے خرید لی تھی، لیکن اس کی ایک ناقص نقل پرانی اشیا کے ایک تاجر کے وہاں موجود ہے۔ میاں غلام علی خاں نے اس تصویر کو بیس روپے میں خرید کر اپنے شاگردوں کو دیا کہ صاحب شبیہ کی عمر میں کچھ اضافہ کر کے ایک جدید تصویر بنا دو لیکن وہ دو چشمی ہو۔ یہ تصویر جلد ہی تیار ہوگئی، پھر میاں غلام علی خان نے اس کی نوک پلک درست کی۔ ان کی ہدایت کے مطابق شاگردوں نے صاحب تصویر کو عام مغل رواج تصویر کشی کے خلاف کچھ اس طرح پیش کیا تھا گویا اسے اس بات کا پورا علم ہے کہ ہماری تصویر کھنچ رہی ہے۔ شبیہ جب پوری طرح بن سنور چکی تو استاد خود ہچکچک سے ہو گئے۔ انھوں نے دل ہی دل میں صل علیٰ کہا... اور ایک لحظے کے لئے ان کے ہاتھ میں ارتعاش پیدا ہو گیا کہ یہ تصویر تو زندہ آدمی سے زیادہ جاندار معلوم ہوتی تھی۔ کیا وزیر خانم کی روح کہیں سے آ کر چند لحموں کے لئے تصویر کے اندر حلول کر گئی تھی؟

میاں غلام علی خان کو جھرجھری آ گئی۔ نہیں، کسی گوشت پوست کے انسان کو یہ تصرفات کہاں نصیب ہو سکتے ہیں۔ اور ان بی بی صاحب کو تو ہوا بھی نہ لگی ہوگی اس بات کی کہ ان کی شبیہ کھینچی جا رہی ہے۔ پر یہ کیا اسرار ہے کہ صاحب شبیہ لگتا ہے بس اب تصویر سے باہر آ کر... یہ رونگاری نہیں جادو نگاری ہے اور جادو سارے کا سارا صاحب شبیہ میں ہے۔ چہرہ پرداز کو تو خبر بھی نہ ہوگی کہ اس کی متاع ہوش اور متاع فن دونوں ہی اس شبیہ نے اپنے کر لئے ہیں۔

استاد نے اپنے بوڑھے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تصویر کو ایک ریشمی بستے میں رکھا اور

صاحب عالم کے دربار کے وقت قلعۂ مبارک میں حاضر ہو گئے۔ وہاں تصویر کی ایک جھلک دیکھ کر صاحب عالم و عالمیان نے اسے اپنے پاس ذاتی صندوقچے میں رکھ لیا اور میاں غلام علی خان کو دو سو روپئے انعام میں دلوائے۔

میرزا فتح الملک بہادر کو دربار ختم کرنے کی جلدی تھی، لیکن وہ ہر کام نہایت وضعداری اور قاعدے کے مطابق کرتے تھے۔ بدلتے ہوئے دن رات کا بھی احساس انھیں دوسرے تمام شاہزادوں اور سلاطین زادوں اور شاہزادیوں سے زیادہ تھا۔ شاید بادشاہ ذی جاہ ہی ان سے زیادہ اس بات کا شعور رکھتے ہوں کہ ہماری سلطنت کا آفتاب اب دوبارہ کسی بھی افق پر بلند نہ ہوگا، اور اس کی وجہ بادشاہت کی اندرونی کمزوریاں ہی نہیں، بلکہ آئین جہانبانی اور اصول حکمرانی کی بساط پر ایک غیر وجود کی موجودگی تھی۔ انگریز نے آکر طور طریق، رسم ورواج، اصول وفروع، تاریخ وافسانہ، سب کی شکل بدل دی تھی۔ انگریز نے اہل ہند کو باور کرانا شروع کر دیا تھا کہ اہل ہند جن باتوں کے دلدادہ ہیں اور جن خیالوں کی روشنی میں وہ اپنا جادۂ حیات ڈھونڈتے ہیں وہ سب باتیں اب غلط نہیں تو از کار رفتہ ہو چکی تھیں۔ لیکن میرزا فتح الملک بہادر کا عقیدہ تھا کہ حالات کے بدلنے میں ہی یہ راز بھی مضمر ہے کہ انھیں اپنی مرضی کے موافق بدلا جا سکتا ہے، یا خود کو اس لائق بنایا جا سکتا ہے کہ تبدیلی حال سے متمتع ہوا جا سکے۔ انھوں نے ایک انگریز کو نوکر رکھ کر انگریزی پڑھنی شروع کر دی تھی اور قلعے کے تمام رسومات کے ساتھ مذہب وشرع کے بھی تمام احکامات پر وہ کاربند رہتے تھے۔ بادشاہت تو میرزا دارا بخت ولی عہد اول کو ملنی تھی، لیکن میرزا فتح الملک کو تخت شاہی سے زیادہ اپنے اجداد کی روایات اور تاریخ عزیز تھے، لہٰذا انھوں نے اپنے لئے گوشوارۂ عمل اور طریق معیشت وہی رکھا تھا ان کی شاہزادگی جس کا تقاضا کرتی تھی۔ بادشاہ کوئی بھی ہو، بادشاہی سب کچھ نہیں۔ جن کے نیاگان میں بابر و اکبر ہوں ان شہزادوں کے بھی انداز اپنے تھے۔

دربار برخاست کرتے ہی میرزا فخرو اپنے ایوان خاص میں چلے گئے۔ چوبداران کا صندوقچہ اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھا، دو چوبداران کے آگے چل رہے تھے۔ ایوان میں پہنچتے ہی میرزا فخرو نے تخلیہ کا اشارہ کیا اور صندوقچہ کھول کر تصویر نکالی...

...آنکھوں میں جنس اور شباب کا ایسا بھرپور شعور تھا کہ شاہزادہ میرزا غلام فخر الدین فتح الملک بہادر کے ہاتھ سے تصویر چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ لگتا تھا تصویر اپنی آنکھ یا ابرو سے کوئی اشارہ کرنے والی ہے۔ لیکن اس کی ادا میں کوئی رکاکت یا سوقیانہ پن نہ تھا۔ سڈول چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، ان پر لمبی

لمبی پلکیں، لیکن آنکھیں جھکی ہوئی نہیں کچھ اٹھی ہوئی۔ آنکھوں کا رنگ شربتی، اور چہرے میں ہلکی سی ٹھنڈک کی ایسی کیفیت جیسے تازہ کھلا ہوا گل مشکی۔ آہو کی سی لمبی سڈول گردن میں مالائے زمرد۔ گلے کے نیچے تک وادی شانہ میں چنے کی دال کے برابر زمرد ہی زمرد تھے جن کی سبزی آنکھوں میں ہری دوب کی طرح کھبی جاتی تھی۔ آنچل سر پر نہ تھا، اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ صاحب تصویر کو آنچل کے ڈھلک جانے کا علم ہے...

عمر یہی کوئی میری ہی عمر، یا شاید ایک آدھ برس کم یا زیادہ ہو۔ مگر یہاں عمروں کی موافقت یا تفاوت کا کیا ذکر تھا۔ اہم بات تو یہ تھی کہ یہ چہرہ اور یہ گردن، یہ ہاتھ اور یہ شانے، کسی زندگی بھری ہوئی خواہش کے سحر سے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ یہ تصویر نہ تھی صاحب تصویر کے رواں دواں لہو سے شاداب حسن کی بہتی ہوئی جدول تھی جس سے سیراب ہونے اور جس میں ڈوب جانے کا دل چاہتا تھا۔

مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ بہادر عرف مرزا غلام فخر الدین عرف میرزا فخرو کی عمر اس وقت کوئی بتیس چونتیس کی ہوگی۔ سورۂ فتح کی آیت مبارکہ انا فتحنا لک فتحاً مبیناً سے ان کی تاریخ پیدائش ۱۲۳۳ مطابق ۱۸۱۲ نکلتی ہے۔ وہ ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ کے چوتھے بیٹے تھے۔ ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ کو سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے۔ اس وقت مرزا محمد دارا بخت بہادر عرف میراں شاہ سب سے بڑے بیٹے تھے اور ٹامس مٹکاف نے انھیں پانچ اشرفیاں اسی وقت نذر کر کے ان کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تھا۔ میراں شاہ بہادر کے بعد بہادر شاہ کے دوسرے بیٹے میرزا محمد شاہ رخ بہادر تھے۔ انھیں وزیر اعظم و مختار عام کا عہدہ تفویض ہوا۔ تیسرے بیٹے میرزا کیومرث بہادر کو ولی عہد دوم کا عہدہ دیا گیا۔ ان کے بعد میرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر تھے جنھیں ولی عہد سوم مقرر کیا گیا۔ یہ بات واضح نہیں ہوئی ہے کہ میرزا محمد شاہ رخ بہادر کو ولی عہد دوم کیوں نہیں مقرر کیا گیا اور کیا وجہ تھی کہ وزیر اعظم و مختار عام جیسے جلیل القدر مناصب کے حامل ہونے کے باوجود انھیں بادشاہی کی وراثت میں کوئی درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بادشاہ کی نظر میں میرزا محمد شاہ رخ بہادر کسی نامعلوم بنا پر بہت محبوب نہ تھے۔

میرزا کیومرث بہادر کے بارے میں مشہور کیا گیا ہے کہ وہ لیاقت ذاتی کی بنا پر، یا محض ہوس کے باعث، خود کو ولی عہدی کا سب سے بہتر مستحق سمجھتے تھے۔ دولت مغلیہ میں ولی عہد نام کا کوئی منصب نہ

تھا اور حکمراں کی موت یا معزولی کی صورت میں خانہ جنگی یا خونریزی کے بعد ہی نئے حکمراں کا فیصلہ ہوتا تھا۔ لیکن انگریزوں نے یہاں بھی تصرف کر کے ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی کی ولی عہدی کے وقت سے یہ طے کر دیا تھا کہ حکمراں کا سب سے بڑا بیٹا ولی عہد، اور پھر وارث تاج و تخت ہوگا۔ لہٰذا خود ٹامس مٹکاف ہی نے میرزا دارا بخت کی ولی عہدی کا اعلان ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت کر دیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ولی عہدی اور پھر وراثت کے جھگڑے آئندہ نہ پیدا ہو سکیں گے یا شہزادگان اپنے لئے اپنے طور پر ولی عہدی یا بادشاہی کے لئے ساعی نہ ہوں گے۔

اس زمانے کے شاہزادوں کی طرح میرزا فخرو نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ کئی طرح کے خط نہایت عمدہ لکھتے تھے اور رقص و موسیقی میں کلاونت اور مہاراج کا درجہ رکھتے تھے تو شہسواری اور تیر اندازی میں بھی طاق تھے۔ انگریزی وہ اچھی خاصی سیکھ چکے تھے۔ ریختہ میں وہ استاد ذوق کے شاگرد تھے اور رمز ان کا تخلص تھا۔ فارسی میں انھوں نے مولانا صہبائی کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا تھا، اگرچہ خود فارسی نہ کہتے تھے۔ صورت شکل ان کی ہو بہو باپ جیسی تھی۔ اور شاہزادوں کے برخلاف وہ اکثر سوار ہو کر شہر میں نکلتے اور بعض ممتاز ہندیوں اور انگریزوں سے سلسلۂ ملاقات بھی رکھتے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود مرزا فخرو اپنے باپ کے بہت چہیتے نہ تھے۔ ممکن ہے ان کے مزاج کی یہی سب خصوصیات، یعنی ان کی بیدار مغزی، جدید حالات کا شعور اور ان حالات سے ساز کرنے، یا ان کے خلاف مقاومت کرنے کے لئے ان کی تیاریاں، بادشاہ کے لئے ناخوشنودی کا سامان فراہم کرتی ہوں۔ اور شاید انھیں باتوں کی وجہ سے، کہ میرزا فخرو خود کو بدلی ہوئی اور مزید بدلتی ہوئی تیرہویں صدی کا اہل بنانا چاہتے تھے، بادشاہ جم جاہ کو میرزا فخرو سے کچھ بہت لگاؤ نہ تھا اور وہ انھیں بیشتر دور ہی دور رکھتے تھے، لیکن میرزا فخرو نے اپنی راہ متعین کر لی تھی۔

میرزا فتح الملک بہادر کی ازدواجی اور جنسی زندگی عام تیموریوں کے برخلاف بہت محدود تھی۔ ان کی پہلی شادی چہیتی عم زاد فضیلت النسا بیگم سے ہوئی تھی جو شاہزادہ جہانگیر میرزا، یعنی ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے خوبصورت، حریت پسند لیکن آزادہ رو چھوٹے بھائی کی بیٹی تھیں۔ جس طرح باپ کا حسن ضرب المثل تھا اسی طرح بیٹی کے بھی جمال سے سارا قلعہ روشن کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، میرزا جہانگیر نے دوبار انگریز کے ساتھ شوریدہ سری اور تختی کا برتاؤ کیا تھا اور دو بار جلا وطن ہو کر بنارس اور پھر الہ آباد بھیج دیئے گئے تھے۔ دوسری جلا وطنی ان کی موت کا پروانہ ثابت ہوئی۔ شراب اور آب

غربت نے اکتیس ہی سال کی عمر میں ان کا کام تمام کردیا۔ یہ سال ۱۸۲۱ کا تھا۔ ان کی چہیتی بیٹی بھی بہت دن نہ جی سکیں۔ انھیں فضیلت النسا بیگم کے بطن سے میرزا ابو بکر پیدا ہوئے تھے۔ میرزا ابو بکر سنہ ۱۸۵۷ کے زمانے میں انگریز کی مخالفت میں پیش پیش اور اپنے چچا میرزا ظہیر الدین عرف میرزا مغل بہادر (بہادر شاہ ظفر کے چھٹویں بیٹے) کے ساتھ انگریز کے خلاف نبرد آرا تھے۔ انھوں نے میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان (بہادر شاہ ظفر کے آٹھویں بیٹے) کے ساتھ فتح دہلی کے بعد انگریز افسر ہاڈسن کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

میرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر نے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ہی دوسری شادی کی۔ یہ میرزا ہدایت افزا عرف میرزا الٰہی بخش کی بیٹی حاتم زمانی بیگم تھیں۔ ان سے ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ بہادر شاہ نے اسی بیٹی کی دودھ چھڑائی کے موقعے پر منعقد تقریبات رقص و سرود میں شرکت کی تھی اور شرکا کو انعامات سے سرفراز کیا تھا۔ یہ میرزا الٰہی بخش وہی ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انگریزوں کے جاسوس اور بہی خواہ اور بادشاہ کے بد خواہ تھے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے انھیں بہت نوازا اور خاندان شاہی کا سرپرست تسلیم کرلیا تھا۔ گمان غالب ہے کہ حاتم زمانی بیگم اور فتح الملک بہادر میں بنتی نہ تھی۔

مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر نے تصویر ہاتھ سے رکھ دی، لیکن اسے اپنے سامنے ہی رکھا۔ نواب مرزا کو قدم شریف کی اس ذرا سی ملاقات کے سوا بھی وہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔ ماں سے اس کی مشابہت، اور سیہ فامی کے باوجود اس کے بے مثال حسن کی وجہ اب ان پر کچھ واضح ہوگئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تصویر کو سنبھال کر صندوقچے میں رکھ دیں تا کہ کسی ناجنس کی نظر نہ پڑے۔ لیکن انھیں اندیشہ تھا کہ تصویر اٹھا لوں گا تو کلیجے ہی سے لگائے بن پڑے گی۔ میاں غلام علی خان بھی کیا کمال کے آدمی ہیں۔ لیکن وزیر خانم سے ملنے کی طرح کیا ہو؟ نکاح کا پیغام دوں یا یوں ہی اپنے پاس رہنے کے لئے کہوں؟ اور اگر انھوں نے پابند رہنے، یا پاس رہنے سے انکار کردیا؟ میرزا فخرو نے کہیں اڑتی اڑتی سنی تھی کہ نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بیٹے ضیاء الدین احمد نے بھی وزیر خانم کی طرف کچھ سلسلہ جنبانی کی تھی۔ اس کا کچھ نتیجہ برآمد ہوا کہ نہیں، اور اگر کوئی نتیجہ تھا تو وہ کیا تھا، اس پر وہ مطلع نہ تھے۔ لیکن وزیر خانم اگر واقعی اس تمکنت اور جذبہ و فکر میں اسی تعمق کی عورت تھیں جو ان کی شبیہ سے ہویدا تھا تو بلا شبہ انھوں نے ضیاء الدین احمد کو محض ایک چھوکرے کی طرح اپنے آستانے سے مسترد کردیا ہوگا۔ لیکن ہم ان سے درِ سخن کس طرح باز

کریں... بجا کہ شہر کے بعض رؤسا اور بعض انگریز ان کے ہاں ہماری کبھی کبھی کی آمد و رفت ہے، لیکن وہ ملنا ملانا جانا آنا اور ہے اور ہمارا وزیر خانم کے در پر جا کر دق باب کرنا اور ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ کامیابی نہ ہوئی تو بڑی ہی سبکی ہوگی۔ لیکن اگر کامیابی نہ ہوئی تو ہماری زندگی...

ایک چوبدار نے آہستہ سے پردہ ہٹا کر جھانکا اور ہمت کر کے بہت دھیمی آواز میں کہا:

''سرکار صاحب عالم۔ استاد تشریف لانے کی اجازت کے خواستگار ہیں۔''

میرزا غلام فخر الدین ذرا سا چونکے۔ انھوں نے جلدی سے وزیر خانم کی تصویر اپنے صندوقچے میں رکھی اور دونوں ہاتھ منھ پر پھیر کر آنکھوں کو ملا، گویا ابھی نیند سے بیدار ہوئے ہوں۔

''استاد تشریف لے آئے؟ بہت خوب۔ انھیں باریابی دی جائے۔''

''جی اعلیٰ حضرت'' کہہ کر چوبدار نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے استاد ذوق کو خفیف سا اشارہ کیا اور استاد پردہ اٹھا کر پراشتیاق لہجے میں یہ کہتے ہوئے اندر تشریف لائے:

''بندگی عرض کرتا ہوں صاحب عالم۔ سرکار کا مزاج کیسا ہے؟''

''اہلاً و سہلاً۔ آئیں حضرت، میرے قریب تشریف لائیں۔'' میرزا فتح الملک نے اپنی جگہ پر سرو قد کھڑے ہو کر کہا۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق کی عمر کوئی ساٹھ برس کی تھی۔ متوسط قد، متوسط بدن، خوبصورت، یک مشت سے کچھ زیادہ تل چاولی داڑھی، لیکن مناسب ترشی ہوئی اور ذرا نوکیلی، بہت گھنی نہیں لیکن چھدری بھی نہیں۔ مونچھیں ہلکی لیکن ایسی نہیں کہ مولویوں جیسی کتری ہوئی لبیں معلوم ہوں۔ سر پر چوگوشیہ سیاہ مخملی ٹوپی جس پر کارچوبی کی بیل، گلے میں ہلکے سبز رنگ کی ململ کا کرتا، لیکن اتنا باریک نہیں کہ بدن جھلکے، جیسا اس زمانے کا دستور تھا۔ کرتے کے اوپر سفید مشروع کا نیمہ، اس کے اوپر بہت ہلکے رنگ کی پھولام کی کفتان، بر میں دھاری دار سنگی کا ڈھیلا پاجامہ، مہریاں جس کی اتنی چوڑی تھیں کہ پاپوش ڈھک گئی تھی، یعنی پاپوش اگر ان کے پاؤں میں ہوتی تو ڈھک گئی ہوتی۔ حسب معمول ایوان میں داخل ہونے کے پہلے انھوں نے جوتیاں باہر ہی اتار دی تھیں۔ رنگ ان کا اچھا سا نولا اور چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ کثرت سے تھے لیکن ان کی صورت پر خوش مزاجی اور طباعی اس قدر برستی تھی کہ چیچک کے داغوں کا عیب محسوس نہ ہوتا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن، نگاہیں تیز، چال ڈھال سے ذہنی پھرتی اور خود اعتمادی نمایاں تھی۔

استاد آگے بڑھتے آئے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ شہزادے سے مصافحہ کیا۔ میرزا فتح الملک نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنے پہلو میں جگہ دے کر سامنے رکھی ہوئی سونے کی جالی دار ڈبیا سے چکنی ڈلی اور الایچی لے کر اپنے ہاتھوں پر رکھی اور استاد سے کہا۔ ''شوق فرمائیں حضور، اتنے بھنڈا تیار ہوتا ہے۔''

''جی بڑا کرم ہے صاحب عالم کا، لیکن بھنڈا اس وقت نہ عطا ہوتا تو عین بندہ پروری ہوتی۔'' استاد ذوق نے الایچی کے دو دانے سلام کر کے اٹھاتے ہوئے عرض کیا۔

شاہزادے کی پیش کی ہوئی تواضع کو قبول نہ کرنا عام لوگوں کے لئے بڑی گستاخی ہوتی۔ لیکن استاد ذوق چونکہ استاد شاہ تھے اس لئے وہ غیر ولی عہد شاہزادے سے اتنی بے تکلفی برت سکتے تھے، لیکن وہ بھی شاذ اور خاص حالات میں ممکن تھا۔

میرزا فخرو متبسم ہوئے۔ ''استاد، آپ کی نکتہ طرازیاں بھی خوب ہیں کہ ہماری کوئی شے آپ تک نہ پہنچے تو یہ ہماری بندہ پروری ٹھہرے۔''

شیخ ذوق کو شاہزادے کے اس جملے میں تعریض کی خفیف سی جھلک دکھائی دی۔ بھنڈے کا قبول نہ کرنا شاید صاحب عالم کو برا لگا تھا۔

''صاحب عالم کی بندہ پروری تو اظہر من الشمس ہے اور ہم سب ہی صاحب عالم کے خوان کرم کے زلہ ربا ہیں۔'' ذوق نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کے آستانے سے بھنڈا نصیب ہو یہ میری عین خوش بختی ہے۔ لیکن دو تین دن سے شدید کھانسی میں مبتلا ہوں۔ راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ عمدۃ الحکما نے حکم دیا ہے کہ دود اور دخان کی ہر شے سے پرہیز کرو۔''

اس طویل جواب دہی نے شہزادے کی خوش مزاجی بحال کر دی۔ انھوں نے کہا: ''نہیں ہم بھلا آپ کے فقدان راحت کا سبب کیونکے بن سکتے ہیں۔ آپ نہ چاہیں تو شغل نہ فرمائیں۔''

اس اثنا میں ایک چوبدار نے چاندی کی کشتی میں لگا کر خشک میووں کی دو طشتریاں حاضر کیں۔ استاد نے جھک کر شاہزادے کو تسلیم کی اور بادام کے دو دانے منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر عرض کیا: ''حضور ان باداموں پر تو کسی کی آنکھیں نثار ہوں...''

''جی ہاں،'' فتح الملک شاہ بہادر نے مسکرا کر کہا، ''لیجئے یہ تو مصرع ہی ہو گیا، ع ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر۔'' یہ کہہ کر شاہزادے نے استاد ذوق کی طرف کچھ متوقع نظروں سے دیکھا، گویا

مصرعے پر گرہ کے طالب ہوں۔ وہاں تو مضامین صف باندھے کھڑے ہی رہتے تھے، جیسے امرالقیس نے لکھا ہے کہ قافیوں کی میرے سامنے وہ کثرت ہے جیسے بچے کے آگے ٹڈی دل، کہ ایک کو پکڑتا ہے تو دو ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں۔ استاد نے ہاتھ باندھ کر عرض کی:

''مرشد زادے کے سامنے منھ کھولوں، یہ میری حقیقت کیا، لیکن از راہ امتثال امر عرض کرتا ہوں کہ مطلع ہوا ہے...''

'''خوب، استاد بہت خوب۔ ارشاد ہو۔''

ذوق نے یوں ہی ہاتھ باندھے باندھے مطلع پڑھا۔

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

''اماں استاد آپ مغتنم روزگار ہیں۔ واللہ کیا مطلع سر کیا ہے۔ جی چاہتا ہے ہاتھ چوم لیجیے۔'' میرزا فتح الملک بہادر نے فرمایا۔

استاد نے نیم قد اٹھ کر تعظیم دی اور کہا، ''یہ سب حضور ہی کے خانوادے کا فیض ہے... لیکن صاحب عالم نے بھی تو ادھر کچھ کہا ہوگا۔ کیا ہم تشنگان آب حیات سخن کو عطشاں عطشاں ہی واپس بھیج دیں گے؟''

میرزا غلام فخر الدین کے چہرے پر کچھ تکلف، کچھ خجالت کے سے آثار ہویدا ہوئے۔ ایک پل چپ رہ کر انھوں نے کہا، ''استاد، کل رات خدا جانے مجھ پہ کیا افتاد تھی کہ نہ چین پڑتا تھا نہ آنکھ لگتی تھی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گذری، اور وہ جو شیخ ناسخ کی غزل ہے نہ۔

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

بس اسی کا ورد کیے بنتی تھی۔ بار بار درود شریف کا دورہ کیا، چچی والیوں نے آیت الکرسی شریف پڑھ پڑھ کر دم کی، لیکن نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ بالآخر استاد آپ ہی کا قطعہ حسب حال نکلا کہ۔

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

ادھر زینت المساجد سے اذان فجر سنائی دی، ادھر بندے نے وضو بنا، نیت باندھ، جوں توں کر کے سنتیں اور فرض فجر ادا کیے اور تب جا کر پلنگڑی پر پڑ رہا کہ بارے کچھ غنودگی سی آگئی۔ آنکھ کھلی تو پھر وہی شیخ

صاحب کا مطلع وردِ زبان تھا کہ وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں...''

استاد ذوق نے فوراً کان کھڑے کیے۔ قلعے میں نئی نئی افواہیں روز رائج ہوتی تھیں، ایک افواہ کی عمر پوری ہوتی یا وہ غلط ثابت ہوتی تو اس کی طرح کی دو مزید افواہیں گشت کرنے لگتیں۔ ہر اچھے درباردار کی طرح استاد ذوق بھی قلعے میں دوڑتی پھرتی تمام خبروں، افواہوں، گپوں، اور ہوائیوں کی اطلاع رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سن رکھا تھا کہ صاحب عالم و عالمیان کو چھوٹی بیگم کی شبیہ کی تلاش ہے اور اس غرض سے انھوں نے میاں غلام علی نقاش کو دربار میں طلب کیا ہے۔ اب جو صاحب عالم کی زبان سے شیخ ناسخ کا مطلع اور رات کی کم خوابی کا حال انھوں نے سنا تو گمان کیا ہو نہ ہو صاحب عالم کا دل ادھر جا اٹکا ہے۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کچھ کہنے یا پوچھنے کی تاب تو تھی نہیں، وہ شہزادے کی گفتگو بتوجہ و اعتنائے تمام سنتے رہے۔ جب شاہزادے نے شیخ صاحب کا شعر پڑھا اور پھر وہ ایک لمحے کے لئے ٹھہرے تو استاد ذوق نے عرض کیا:

''لیکن مجھے یقین ہے حضرت صاحب عالم نے بھی اس زمین میں توسن طبع کو جولان کیا ہو گا۔ بھلا طبائع موزون و مشحون کو قرار کہاں؟''

شہزادے نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''جی ایک دو شعر تو ضرور ہو گئے تھے، کبھی غزل بھی ہو جائے گی۔ فی الحال یہ دو چار شعر بنظر اصلاح حاضر کرتا ہوں۔''

''اے سبحان اللہ، ارشاد فرمائیں۔''

شہزادے نے سینے پر ہاتھ باندھ کر مطلع پڑھا۔

نہیں اس کا نشاں جہاں جاؤں
میں یہ دل لے کے اب کہاں جاؤں

''سبحان اللہ صاحب عالم، کیا خوب مطلع فرمایا۔'' استاد ذوق نے بے ساختہ کہا۔ ''واللہ شیخ صاحب کی بھی روح کو تواجد بہم پہنچا ہو گا!''

''حضور تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔'' میرزا فخرو نے مسکرا کر کہا۔ ''زیب مطلع ملاحظہ فرمائیں، شاید کسی لائق ہو۔

تھام لے گر نہ مجھ کو تیرا غم
یہ جہاں چھوڑ اس جہاں جاؤں''

شعر پڑھ کر میرزا فخرو نے ذوق کی طرف دادخواہ نگاہوں سے دیکھا۔ استاد نے بھی کچھ کمی نہ کی اور دل کھول کر داد دینے کے بعد کچھ کہنا چاہا تو میرزا فخرو نے کہا، ''استاد ذرا یہ بیت بھی گوش مبارک تک پہنچ جائے۔''

''بیشک، بیشک۔ ذرا بہتر اس سے بھی مضمون نکالا ہو تو ہم بھی دیکھیں۔ ان دنوں تو روانی طبع صاحب عالم کی آب گنگ و جمن کے زمانۂ سیل کو بھی مات کر رہی ہے۔'' ذوق نے کہا، اور شہزادے نے شعر پڑھا۔

میں ہوں ظاہر وہ روح عالم غیب
میں نہیں ہوں جہاں وہاں جاؤں

استاد ذوق نے ایک عالم ابتہاج میں زانو پر ہاتھ مارا اور بولے: ''اب تو صاحب عالم نے درجۂ استادی ہی حاصل کر لیا، ایسی غزل اور کس سے ممکن تھی۔ الہم زدفزد۔''

میرزا غلام فخر الدین بہادر کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کا شائبہ جھلکا۔ انھوں نے نیم قد ہو کر استاد کو تسلیم کی اور دل میں کہا کہ عالم انسانی پر ہمارا دخل اب کچھ نہیں کے برابر ہے، عالم دل بھی ایک دنیا ہے، ایک جہنم بھی اور ایک فردوس بھی... لیکن اس پر بھی ہمارا کچھ دخل ہو سکتا تو... ان کی آنکھ کے سامنے وزیر خانم کا وہ پراسرار سا تبسم کوند گیا جس میں لگاوٹ کا شمہ برابر بھی اشارہ نہ تھا، لیکن وہ تبسم یہ بھی کہے دیتا تھا کہ اگر کوئی جوہر قابل ہو تو یہی تبسم انبساط اور ابتہاج کی ایک پوری دنیا کے در کھول سکتا ہے، لذت حیات و موت کے نئے شاخسار حدیقۂ روح کے ہر خیابان میں کھلا سکتا ہے۔ وہ بلند گردن، نخوت حسن اور اعتماد حیات سے بھرپور جسے کوئی خم نہیں کر سکتا لیکن جو اپنے چاہے جانے والے کی انگشت میں رگ گل کی پھانس کے چبھ جانے پر بار الم سے دوہری بھی ہو جانے کا وعدہ یا امکان رکھتی تھی... میں تو عالم ظاہر کی طرح غلیظ اور مرئی اور کثیف اور وہ عالم غیر ظاہر کی طرح لطیف، میں وہاں جاؤں تو کس طرح جاؤں، پہنچوں تو کس طرح پہنچوں۔

استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق اپنے بادشاہ اور قلعۂ میمونہ میں اپنے ہر مربی کی افتاد مزاج سے واقف تھے۔ انھیں پوری طرح اندازہ تھا کہ صاحب عالم کی یہ محویت، اشعار کی یہ کیفیت یہ سب کچھ معنی رکھتی ہیں۔ انھیں خیال آیا کہ چھوٹی بیگم کے لئے ایک اور دروازہ کھلتا ہوا لگتا ہے، لیکن ہمیں اس سے کیا؟ کاروبار سلطانی تو اب رہا نہیں، اب کشور دل کی جہانبانیوں ہی کو ملک گیری و کشورستائی کہنا ہے۔ خدا شاہزادے

کو مبارک کرے۔ چھوٹی بیگم ایسا ہیرا تھیں کہ وہ، جس کے جیغے میں لگا اسے پھر جیغہ ہی بننا نصیب ہوا۔

صاحب عالم و عالمیان میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین فتح الملک بہادر نے سر اٹھایا تو استاد ذوق کو یہ دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی کہ شہزادے کے چہرے پر کچھ اس طرح کی تمکنت اور جلالت تھی گویا وہ وسط تیرہویں صدی کے زوال پرورده باغ کا اجڑا ہوا بوڑھا بیجان بر گدنہ ہو بلکہ سمرقند اور خیوہ کے دور تک پھیلے ہوئے وحشی سبزہ زاروں میں غرور سے سر اٹھائے ہوئے اور فیاضی سے چھاتی پھیلائے ہوئے دور و نزدیک کے لوگوں کو اپنے سائے سے فیضیاب کرنے والا کرژم کا چھتنار درخت ہو۔ اور...

''استاد ہم آپ کے بہت متشکر ہیں۔'' میرزا فتح الملک بہادر نے کہا۔

استاد ذوق نے سمجھ لیا کہ اب باریابی کی مدت تمام ہوئی اور یہ رخصت کا اشارہ ہے۔ انھوں نے اٹھ کر تین تسلیمیں ادا کیں، شہزادے نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر بائیں طرف رکھ کر ''فی امان اللہ'' کہا اور دوبارہ سر جھکا لیا۔ انھیں خبر نہ ہوئی کہ کب چوبدار نے پردہ ہٹایا، کب استاد ذوق نے ایوان کے باہر قدم رکھا، کب چرن بردار نے انھیں جوتیاں پہنائیں۔ استاد بھی ایوان سے باہر ہوتے ہی نگاہ روبرو کیے اردابیگنی کے پیچھے پیچھے آہستہ متین چال چلتے ساون بھادوں کے باغ کی روشوں سے گذرتے ہوئے پانی کے گہرے کنویں تک پہنچے جہاں ایک قلماقنی نے انھیں اپنے ساتھ لے کر قلعے کے لاہوری دروازے کے کوچے تک پہنچا دیا۔ وہاں سے دو ڈھلیتوں نے انھیں بحفاظت تمام لاہوری دروازے کے محافظ خانے پر لا کر چھوڑ دیا اور سلام کر کے رخصت ہوئے۔ صاحب عالم نے تو استاد کی پیٹھ پھرتے ہی صندوقچہ کھول کر وزیر خانم کی تصویر نکال لی تھی۔

امام بخش صہبائی

وہ ساری رات مرزا فخرو پر بھاری گذری۔ وزیر خانم سے رسم وراہ، اور رسم وراہ ہی نہیں، زندگی بھر کا نباہ ان کے وجود کی اہم ترین ضرورت بن گیا تھا۔ وزیر اگر ان کی نظر میں کوئی خانگی یا ڈیرہ دارنی ہوتی تو کام آسان تھا۔ لیکن ان کا دل اسے صرف عورت سمجھنے، اور لین دین کے قابل عورت سمجھنے سے منکر تھا۔ ایسا نہیں کہ انھیں وزیر کے حالات وکوائف کی پوری خبر نہ تھی۔ سچ پوچھئے تو یہ خبر ساری دلی کو تھی۔ نور بائی کے بعد اگر طبقۂ مخدرات، یا شرفا کے زمرے کے باہر کی کوئی عورت، یا کوئی غیر بیگماتی عورت، (یا بازاری عورت، جو جیسا بھی سمجھتا) ایسی تھی کہ اس کا نام اور اس کے حسن و جمال اور دلبری کی صفات کے چرچے سب زبانوں پر تھے تو وہ چھوٹی بیگم تھی۔ یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ایک زمانہ اس کا نادیدہ دلدادہ تھا، لیکن یہ بھی تھا کہ ہر کوئی اس کے آستان تک رسائی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر کے ساتھ جو گذری تھی اس کی خبر، یا افواہ، یا گپ، شدہ شدہ ان سبھی دلی والوں میں عام ہو چکی تھی جو عشق و عاشقی کے کوچوں کی ہوا کھانے کو لازمۂ حیات سمجھتے تھے، یا لازمۂ حیات نہیں تو وہاں کے حالات سے باخبری ان کے لئے خوش وقتی کا ایک مشغلہ ضرور تھا۔

لیکن مرزا فتح الملک بہادر کا معاملہ اور تھا۔ اپنے باپ کے برخلاف انھیں نئی نویلی دلہنیں لانے اور کثرت سے شادیاں رچانے کا شوق نہ تھا۔ ارباب نشاط اور دل باختگی و دل فروشی کے معاملات میں ان کی دلچسپی بس اتنی ہی تھی جتنی اس زمانے کے روسا میں رائج تھی۔ وزیر خانم میں انھیں شریک بستر نہیں شریک حیات کی تلاش تھی۔ اور یہ تلاش صرف اس بنا پر نہ تھی کہ وزیر کے حسن کے شہرے جو ان تک پہنچے تھے ان کی تصدیق اس کی تصویر نے کر دی تھی۔ دل لگانے کو وہ زندگی کا اہم مقصد گردانتے تھے لیکن دل لگانا اور دل بہلانا ان کے لغت میں دو الگ باتیں تھیں۔

بہت رات گئے مرزا فخرو کو اپنے استاد اور دوست امام بخش صہبائی کا خیال آیا۔ صہبائی نے مرزا فخرو کو فارسی کے درس مدتوں دیئے تھے لیکن ان کی عمروں میں تفاوت بہت نہ ہونے کی وجہ سے دونوں میں جلد ہی استادی شاگردی یا شاہزادہ اور درباری کے بجائے رئیس اور مصاحب کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ صہبائی کی حس مزاح بہت لطیف تھی۔ شہزادہ اگر کبھی بے دماغ یا بدحظ بھی ہوتا تو وہ اپنے شگفتہ جملوں سے اسے شگفتہ کر دیتے تھے۔ صہبائی سے مشورہ کرنے میں یہ فائدہ بھی تھا کہ وزیر خانم سے جو معاملات بھی طے ہوئے ہوتے، انھیں کی معرفت طے ہو سکتے تھے، کسی اور ملاں یا میانجی گر کو بیچ میں لانے کی ضرورت نہ تھی۔

اگلی صبح کو مولوی صہبائی ابھی چاشت کی نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ صاحب عالم و عالمیان کا ایک چوبدار ایک کوزے میں ٹھنڈا دودھ اور ایک کوری ہانڈی میں گرم گلاب جامنیں اور دوسری ہانڈی میں مال پوے لے کر مولوی صاحب کے دروازے پر پہنچا کہ صاحب عالم نے ناشتہ بھجوایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ مولانا صاحب بشتاب حویلی مبارک میں صاحب عالم و عالمیان مرزا محمد سلطان غلام فخر الدین بہادر کے ایوان خاص میں تشریف لے آویں۔ چوبدار کو تو انعام دے کر رخصت کیا گیا اور صہبائی دو گھڑی بعد برآمد ہو کر قلعے کے لئے سوار ہوئے۔ صہبائی کی عمر اس وقت چالیس سے کچھ کم تھی لیکن چہرے کی نرمی اور بدن کے بہت دبلے پتلے بلکہ دھان پان ہونے کی وجہ سے تیس پینتیس سے زیادہ کے نہ لگتے تھے۔ چہرے پر خشخشی داڑھی مغل طرز کی، یعنی کلوں پر ذرا چھدری اور ٹھوڑی پر زیادہ نمایاں، سفید پاجامہ ایک برکا، سر پر سفید چوگوشیہ ٹوپی جس کے کناروں پر ہلکی نیلی اور سنہری بیل، اس زمانے کے رواج کے موافق پٹے دار گھنے چمکیلے بال، گلے میں آبی رنگ کا کرتا، اس پر نیلے رنگ کا انگرکھا لیکن بالکل سادہ، انگرکھے پر موسم کے اعتبار سے ہلکی یا بھاری عبا، غرض نہایت خوبصورت شخص تھے، اور بالخصوص اس وجہ سے اور بھی اچھے لگتے تھے کہ ان کا چہرہ ہمیشہ مسکراتا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

فارسی زبان اور ادب وانشا میں میرزا غالب اور شاید حکیم مومن خان، اور عربی میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے سوا مولانا صہبائی کا ثانی سارے ہندوستان میں کوئی نہ تھا۔ باپ کی طرف سے وہ فاروقی تھے اور ماں کا سلسلۂ نسب غوث پاک حضرت سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا تھا، لیکن وہ چونکہ کسی صاحب ثروت خاندان کے نہ تھے، اس لئے بہت متمول نہ تھے اور دلی کالج کی نوکری سے جو وجہ مقرری ملتی تھی اسی

پر ان کی زیادہ تر گذران تھی۔ ہر چند کہ ان دنوں کے حساب سے وہ تنخواہ بہت تھی، لیکن تنخواہ داری اور امیر زادگی میں فرق تو ہے ہی، اسی لئے میرزا غالب جیسے رئیس اور خاندانی لوگ انھیں اپنے برابر کا نہ سمجھتے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ مولوی صہبائی باعتبار سن ان سب کبار و کملا میں کم عمر تھے۔ یہ سب سہی، لیکن معما گوئی اور عروض و بدیع و بیان میں ان کا لوہا سب مانتے تھے۔ معما گوئی میں ان کی مہارت اور اس فن سے ان کی مناسبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ایک بیت ایسی کہی تھی جس میں کئی سو اسما بطریق معما پوشیدہ تھے اور بسا اوقات ایک مصرعے سے دس دس نام برآمد ہو سکتے تھے۔ اچھے اچھے لوگ سر مار کر تھک جاتے لیکن حل معما سے قاصر ہو کر مولوی صہبائی کے در فضیلت پر دستک دیتے اور معما کا حل معلوم کرتے۔

اردو عروض پر مولانا صہبائی کا بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے میر شمس الدین فقیر کی کتاب ''حدائق البلاغت'' کا اردو ترجمہ کیا لیکن اصل کتاب میں مندرج عربی فارسی مثالوں کی جگہ اردو مثالیں رکھ دیں۔ ان کا یہ ترجمہ اسی زمانے میں مکمل ہوا تھا جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، لیکن اس وقت اس ترجمے سے بھی زیادہ ان کے جس کام کا شہرہ تھا وہ ان کے معمے تھے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک پر بنائے تھے۔ یہ معمے اس قدر مشکل تھے کہ مصنف کی وضاحت کے باوجود بہت مشکل ہی سے سمجھ میں آتے تھے۔ اسی ضمن میں ان کا رسالہ ''گنجینۂ رموز'' فن معما گوئی پر بہت مشہور ہوا تھا اور وہ بھی اسی قدر عسیر الفہم تھا۔ ارباب ذوق کا ان دنوں ایک مشغلہ یہ بھی تھا کہ مولانا صہبائی کے معمے حل کیے جائیں اور ہو سکے تو ایسا ایک آدھ معما خود بھی کہا جائے۔ حکیم مومن صاحب کو معما گوئی میں کچھ درک تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ وہ بھی مولوی صہبائی کے اکثر معموں کو سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ میرزا فخرو کا وطیرہ تھا کہ ملاقات پر اکثر پہلے ہی پوچھتے، ''استاد، کوئی نیا معما ارشاد فرمایا؟'' اور پھر صہبائی اگر کوئی معما سناتے تو دیر تک اس کے حل میں لگے رہتے۔ اگر معما حل ہو جاتا تو مولانا انھیں ایک چونی عطا کرتے، اور اگر حل نہ ہو سکتا (اکثر ایسا ہی ہوتا) تو صاحب عالم انھیں ایک روپیہ ہدیہ کرتے۔

جس دن کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس دن بھی میرزا فخرو صاحب نے مولوی صہبائی سے پہلی بات عند الملاقات یہی پوچھی، ''استاد، کوئی نیا معما؟'' مولانا صہبائی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا:

''صاحب عالم، معمے تو میں ہزار کہہ لاؤں، ہستی ہماری خود ہی معما ہے۔ لیکن یہ معما بھی عجب بے سر پیر کی شے ہے کہ سر کی جگہ پا اور پا کی جگہ سر رکھ دیں تو اس کی بھی ہستی عام ہو جائے، پھر معما کی کیا وقعت رہی صاحب عالم؟''

مولانا صہبائی نے بلا شک یہ جملہ بطرز معما کہا تھا۔ میرزا فخرو سوچ میں پڑ گئے کہ اس کا حل نکالیں اور استاد کو معقول جواب دیں، اور وہ بھی جلد از جلد، ورنہ بڑی کرکری ہوگی۔ لیکن بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اچانک مودی خانے کی مہتمم باہر غلام گردش میں بڑبڑاتی ہوئی گذریں، ''موئے مونڈی کاٹے مولا بخش کو خصی کا گوشت لانے کو کس نے کہا تھا...'' معاً فتح الملک بہادر کے انتقال ذہنی نے انھیں ''اخص'' تک پہنچایا، بمعنی ''سب سے زیادہ خاص، خاص ترین''، پھر وہاں سے ذہن ''اعم'' کی طرف گیا، یعنی ''سب سے زیادہ عام، عام ترین...''

پھر تو معاملہ آسان تھا: ''معما'' کا سر الگ کریں تو ''عما'' بچتا ہے، اور پاؤں الگ کریں تو صرف ''عم'' رہ جاتا ہے۔ اب سر (میم) کی جگہ پاؤں (الف) رکھیں تو 'اعم' ہاتھ آتا ہے، اور اب پاؤں (الف) کی جگہ سر (میم) رکھیں تو ''اعم'' بنتا ہے جسے ''اعم'' تلفظ کرتے ہیں۔ مرزا فتح الملک مسکرائے اور بولے:

''حضرت استاد، اعمیٰ کے لئے بھی کچھ ارشاد کردیتے۔'' اس میں اشارہ تھا کہ ہم نے ''اعم'' کو حل کرلیا ہے۔ ''اعم'' اور ''اعمیٰ'' (بمعنی ''اندھا'') الگ مادوں سے ہیں لیکن شبہ اشتقاق کا لطف رکھتے ہیں، دیکھیں وہاں آپ کی جودت طبع کیا ایجاد کرتی ہے۔

''صاحب عالم کے ذہن رسا کی داد کون نہ دے گا،'' مولانا نے متانت سے کہا۔ ''لیکن معما کا سر ایک باری اور قطع کریں اور اس کے پاؤں میں جوڑ دیں تو کیا آپ چچا کو نعوذ باللہ نابینا تصور فرمائیں گے؟''

مولانا کے چہرے پر اس قدر سنجیدگی، بلکہ عالمانہ خشکی تھی کہ گمان ہی نہ گذرتا تھا کہ وہ معما گوئی کررہے ہیں۔ لیکن شہزادے پر ظاہر تھا کہ یہ معما ہے اور ہمیں اسے ابھی ہی حل کرنا ہے۔ انھوں نے دل میں کہا، معما کا سر ایک بار اور کاٹو تو ''عما'' بچتا ہے، ''اعمیٰ'' سے اس کی صوتی تجنیس ظاہر ہے۔ اب رہا ''معما'' کا پاؤں، یعنی الف، تو اسے... نہ نہ نہ ہرگز نہیں، اسے ''عما'' سے نہیں بلکہ ''اعمیٰ'' سے جوڑنا چاہیے... اب ملا ''اعمیم''، یعنی ''اعمام'' جو جمع ہے ''عم'' کی، بمعنی ''چچا''۔ اور ''اعمام'' بروزن افعال کے معنی ہیں، ''بہت سے چچاؤں والا ہونا''۔

''ہرگز نہیں حضرت،'' میرزا فخرو بولے، ''ہم تو کـلُّ عـام کی بھلائی کے قائل ہیں، کسی کا برا کیوں چاہیں، اور بالخصوص اپنے عمان مکرمان کا۔''

یہ فقرہ گرم تھا، کہ ''عام'' کے معنی ''سال، برس'' کے بھی ہیں، اور نئے سال کے لئے تہنیت کے موقعے پر کـلُّ عـام و انتم بخیر کا فقرہ بھی اس زمانے میں رائج ہورہا تھا۔ صہبائی مسکرائے کہ

شاگرد قابل اور رشید ہے۔ لیکن انھوں نے دل میں کہا، صاحب عالم نے یہاں مجھے صبح صبح معما بازی کے لئے تو یاد کیا نہ ہوگا، خدا جانے کیا مصلحت ہے۔ لیکن مجھے خود کچھ کہنا معیوب ہے، میں تو یوں ہی باتیں بنائے جاؤں، گویا مقصد معما ہی ہے، اور کچھ نہیں۔ یہ خیال کر کے وہ بولے:

''حضرت صاحب عالم کے حافظۂ مبارک میں میری وہ بیت تو ہوگی جس میں کئی صد اسما و اشیا کے معمے مخفی ہیں؟''

''جی، یاد کیا معنی، صاحب ہم تو اسے اکثر پڑھتے اور حل نکالنے کی سعی میں راتوں کو جاگتے بھی ہیں۔'' شہزادے نے کہا۔

''قدر افزائی ہے مرشد زادۂ آفاق کی، اچھا وہ بیت پھر سنائے دیتا ہوں۔ اور یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ اس کا حل ''سام'' ہے۔ یعنی جہاں اس بیت میں صدہا اور معمے ہیں، ایک معما اور بھی ہے جس کا حل ''سام'' ہے۔''

''ارشاد ہو، یک لفظی حل تو ہم ڈھونڈ ہی لیں گے۔ مولانا، آج بندے کو آپ کی چونی کا نقصان منظور ہے۔''

''بہت خوب، بیت ملاحظہ ہو ؎

چو آں مہ روے خود از پردہ بنمود
دل از ما برد و آخر کرد نابود

کہیئے، کچھ سمجھے؟''

میرزا فتح الملک بہادر سناٹے میں آگئے۔ بھلا ان الفاظ میں لفظ ''سام'' کہاں پوشیدہ ہو سکتا تھا؟ کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔

انھوں نے ہلکے سے تالی بجائی اور جب چوبدار حاضر ہوا تو اس سے فرمایا: ''ارے صاحب سنگھ، ذری کی ذری صاحب عالم میرزا قادر بخش صابر صاحب کو تو بلوا لائیو۔ کہیو مولانا صہبائی رونق افزائے بزم ہیں، شتاب یہاں آ جاویں۔''

میرزا قادر بخش صابر کو بلوانے میں کئی مصلحتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خود بھی مولانا صہبائی کے شاگرد فن شعر میں تھے، دوسری بات یہ تھی کہ افواہ تھی (حویلی والوں کی افواہوں سے اللہ بچائے) کہ میرزا قادر بخش صاحب عالم کا زیر تصنیف تذکرہ موسوم بہ ''گلستان سخن'' تمام تر مولوی صہبائی کا دیکھا ہوا، بلکہ

لکھوایا ہوا تھا، لہٰذا ممکن تھا کہ مولوی صاحب نے اس بیت کا حل صابر میرزا کو بتا دیا ہو۔ تیسری بات یہ کہ صابر میرزا اور فتح الملک بہادر میں ہمیشہ سے گاڑھی چھنتی رہی تھی۔

جب تک میرزا قادر بخش آئیں آئیں، جھنڈے اور گلوریوں کے دور چلے، میرزا فخرو نے اپنے دو ایک شعر سنائے اور استاد سے داد پائی۔ میرزا فخرو برابر سوچتے رہے کہ ''سام'' والے معمے کا حل نکل سکے لیکن انھیں کامیابی بالکل نہ ہو رہی تھی۔ اتنے میں میرزا قادر بخش تشریف لائے۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ فتح الملک بہادر سے ایک ہی دو سال بڑے تھے مگر خاندانی اور ذاتی وجاہت کی بنا پر سب ان کا ادب حد سے زیادہ کرتے تھے۔ میرزا قادر بخش کے والد میرزا اکرم بخت کے پردادا میرزا اعز الدین بڑے بیٹے معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ دہلی کے تھے۔ اس طرح ان کا سلسلۂ نسب براہ راست اعلیٰ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر شاہ شاہان خلد مکان سے ملتا تھا۔ مرزا قادر بخش کے اکرام میں فتح الملک بہادر نے سرو قد کھڑے ہو کر تعظیم دی اور مولانا صہبائی نے، باجودیکہ استاد تھے، نیم قد ہو کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ قادر میرزا نے فرمایا:

''اماں استاد آپ یہاں خوب ملے، میں آپ کو یاد ہی کر رہا تھا۔ مثنوی معنوی کل شب زیر مطالعہ تھی، ایک مقام بالکل مغشوش تھا، کچھ بات سمجھ ہی میں نہ آتی تھی۔ خیال کیا کہ استاد ملیں گے تو پوچھوں گا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ آپ یہیں تشریف فرما ہیں۔''

''مثنوی کے شعر تو پھر سمجھ لیں گے برادر، اس وقت تو استاد کا معما زیر غور ہے اور اسی کے لئے آپ کو زحمت دی گئی ہے۔ بھلا فرمایئے تو سہی اس بیت سے اسم ''سام'' کیونکے بر آمد ہوتا ہے۔'' فتح الملک بہادر نے شعر پڑھا، لیکن کنکھیوں سے میرزا قادر بخش کی جانب بھی دیکھتے گئے کہ ان پر کیا اثر مترتب ہوتا ہے۔ لیکن میرزا قادر بخش صابر کے بھی منھ پر وہی نامفہومی کی الجھن تھی۔ انھوں نے زیر لب شعر کو دہرایا۔

چو آں مہ روے خود از پردہ بنمود
دل از ما بر د و آخر کرد نابود

''مہ نے اپنے چہرے کو پردے کے اندر سے ظاہر کیا، یعنی... ''مہ'' بمعنی ''مہینہ'' کے معنی عربی میں ''شہر'' لئے جائیں تو...'' میرزا قادر بخش نے زیر لب کہا۔

''بہت خوب، صاحب عالم۔'' صہبائی نے کہا، ''ایک قدم آپ آگے بڑھے۔''

"مگر... مگر... پھر شہر گویا مہ ہے جو پردے سے باہر نکلا ہے۔ اچھا، بہت خوب..." فتح الملک بہادر نے کہا۔ "اجی پر اس کے آگو کیا ہے؟"

"اچھا شہر کے اعداد پان سے پانچ ہیں، کچھ یہ اعداد کا طلسم تو نہیں...؟ لیکن سام کے اعداد تو محض ایک سے ایک ہیں۔ کیا پان سے پانچ میں جوڑ گھٹا کر ایک سے ایک بن سکتا ہے؟" قادر میرزا نے کہا۔

"بجا، لیکن اس سے بات کیا بنتی ہے؟ ہمیں تو دھیان میں پوری بیت کو رکھنا ہے۔"

ان بحثوں کے درمیان مولانا صہبائی مزے مزے سے بھنڈے کے کش لے رہے تھے اور زیر لب مسکرا رہے تھے۔ جب دونوں شاگرد عاجز آ گئے تو میرزا فتح الملک نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، "حضور اب آپ ہی عقدہ کشائی فرمائیں۔ ہم دونوں آپ کو نذر پیش کریں گے۔"

صہبائی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے:

"تو سنئے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ "مہ" بمعنی "مہینہ" کا پردہ "شہر" ہے کہ عربی میں "مہینہ" کے لئے لفظ "شہر" ہے۔ لیکن آگے ذرا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ "خود" بفتح اول کے معنی ہیں "لام"، اور "لام" کو "را" سے بدل لیتے ہیں، جیسے "دیوار" سے "دوال"۔ لہٰذا "شہرام" حاصل ہوا۔ کیا سمجھے؟"

"جی، حضور نے "خود" کی ماہیت ہی بدل دی۔" میرزا قادر بخش نے ہلکی سی شکایت کے لہجے میں کہا۔

مولانا صہبائی ہنسے۔ "تو اور معمے کیسے بنتے ہیں صاحب من۔ آگے سنئے۔ اعداد کے اعتبار سے "ما" برابر چہل [چالیس] اور یک [ایک] ہے۔ "دل از ما برد" کی تکرار اس معنی میں ہے کہ دل کو ہم سے لے گیا اور بالآخر اسے نابود کر دیا۔ دل کو ہم [ما] سے لے گیا، یعنی "چہل" کا دل، یعنی ہائے ہوز کو لے گیا۔ پھر تکرار کے سبب "یک" کا دل، یعنی اس کا نقطہ لے گیا، کیونکہ یہاں نقطہ نہیں تو لفظ بھی نہیں۔"

"اللہ اللہ کیا پیچ ہیں کیا تاؤ ہیں۔ استاد ہم تو کان پکڑتے ہیں۔" قادر میرزا نے کہا۔

"ابھی معما حل کہاں ہوا صاحب عالم۔" مولانا صہبائی نے جواب دیا۔ "ابھی صرف یہ ہوا ہے کہ "شہرام" کا دل، یعنی ہائے ہوز، اور اس کے نقطے، حذف کیے تو "شہرام" سے "سرام" حاصل ہوا۔ اب بہ سبب تکرار، "یکے" کا دل یعنی کاف لے گیا کہ اعداد اس کے بیس ہیں، اور "یک" کا دل، یعنی اس کے نقطے، نکالے تو پھر کاف رہا، کہ اعداد جس کے بیس ہیں۔ اب بیس کے آگے نقطہ واپس لگا دیں، بطور تکرار، تو دو سو بنتے ہیں۔ اور یہ اعداد ہیں رائے مہملہ کے، اور یہی رائے مہملہ "سہرام" کا دل بھی ہے۔ جب یہ دل نکالا تو "سام" باقی رہا۔ فہو

المقصود۔"

"استاد، ان معموں پر تو میر حیدر معمائی بھی آپ کے آگے پانی بھرتا۔" فتح الملک بہادر نے کہا۔

قادر مرزا نے اٹھ کر استاد کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ "اللہ اللہ کیا طباعیاں ہیں، کیا نکتہ شگافیاں ہیں۔"

صہبائی مسکرائے، "یہ سب پیر و مرشد کا فیض ہے۔"

"پیر و مرشد" سے بادشاہ سلامت مراد تھے لہٰذا سب نے بے شک، بے شک، صل علیٰ کہی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میرزا قادر بخش صابر نے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر استاد کو ایک روپیہ نذر کیا اور اجازت رخصت کی چاہی۔

"قادر میرزا برادر، جی تو نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو اس تعجیل سے مرخص کروں،" میرزا فخرو نے کہا۔ "لیکن استاد کو بھی کچھ امر درپیش ہیں اس لئے یہ دلچسپ محفل یہیں تمام ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر مرزا فخرو نے سروقد اٹھ کر میرزا قادر بخش کو تین تسلیمیں کیں اور چوبدار کے لئے تالی بجائی۔ چوبدار اندر آیا تو فتح الملک بہادر بھائی کو ساتھ لئے لئے دروازے تک آئے اور "فی امان اللہ" کہہ کر انھیں رخصت کیا۔

مولانا صہبائی انتظار میں تھے کہ مجھے بھی کچھ اشارہ ملے تو اجازت طلب ہوں، لیکن صاحب عالم تو بالکل خاموش تھے، گویا کسی فکر میں ہوں۔ مولانا پر یہ بات بھی واضح تھی کہ خود انھیں کوئی امور درپیش نہ تھے، جیسا کہ صاحب عالم نے میرزا قادر بخش صاحب سے کہا تھا۔ امور تو یقیناً متعلق بہ صاحب عالم ہوں گے، اور یقیناً کوئی مشورہ مجھ سے درکار ہوگا، لیکن جب تک کچھ عندیہ نہ ملے مجھے چپ ہی رہنا ہے اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ مجھے کچھ کام نہیں، کہیں جانے کی عجلت نہیں۔

بالآخر میرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر نے سر اٹھایا۔

"استاد،" انھوں نے سرسری گفتگو کے لہجے میں کہا۔ "ایک بات ہے۔"

"صاحب عالم۔ ارشاد، میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"آپ چھوٹی بیگم سے واقف ہیں؟"

"جی کون، وہی چھوٹی بیگم جو نواب شمس الدین احمد سے متعلق تھیں؟ میں نے انھیں دیکھا تو نہیں، لیکن..."

"...ان کے حسن کے شہرے سنے ہیں۔" فتح الملک بہادر نے مسکرا کر کہا۔

’’جی، وہ تو ہے۔‘‘

’’ہمارے یہاں طریقہ تو یہ تھا، بلکہ ہے، کہ ظل سبحانی کسی کے لئے اشارہ کر دیتے تھے، یا علیا حضرت صاحب کوئی تجویز پیش کرتی تھیں۔‘‘ فتح الملک بہادر ایک لحظہ خاموش رہے۔ پھر بولے۔ ’’کبھی باقاعدہ پیغام بھی گیا تو آپس ہی میں گیا۔ بارات اکثر گھر کی گھر میں اترتی تھی، یا دلہن کا ڈولا سارے ساز و اہتمام کے ساتھ قلعۂ مبارک میں آجاتا تھا۔‘‘

مولانا نے چشم زدن میں بات سمجھ لی۔ ’’درست، اور بڑی بات یہ کہ فریقین کی طرف سے گفتگو ایک ہی شخص کر لیتا تھا، یا اگر دو ہوئے تو اول اجتماع فریقین ہی میں بات طے ہو جاتی تھی۔‘‘

’’لیکن یہاں معاملہ دیگر ہے۔ باہر پیغام ہم بھیجتے نہیں ہیں۔ ظل الٰہی کی رضامندی بھی تبھی ہوگی جب سب باتیں ادھر سے ہوں، لیکن اشاروں کنایوں میں مہابلی سلامت کی مرضی بھی شامل ہو۔‘‘

’’چھوٹی بیگم کی ایک بڑی بہن تو ہیں...‘‘ صہبائی نے کہا۔

’’جی ہاں، وہ تو ہے۔‘‘ میرزا فخرو نے الفاظ کو ذرا کھینچ کر ادا کیا۔

’’تو پھر مشکل کیا ہے صاحب عالم۔‘‘ صہبائی نے کہا۔ ’’احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان صاحب یہ بات مہابلی کے کان میں ڈال دیں، باقی کام ہم کر لیں گے۔‘‘

’’لیکن مہابلی کی نظر ہم پر کچھ بہت کرم فرمایانہ نہیں ہے...‘‘ میرزا فخرو نے رک رک کر کہا، جیسے بادل ناخواستہ کسی بات کا اقرار کر رہے ہوں۔

مولانا صہبائی کو قلعے کی سیاست میں اگرچہ اس درجہ درک نہ تھا جتنا استاد ذوق کو تھا، لیکن وہ نپٹ بے علم بھی نہ تھے۔ یہاں انھوں نے اپنی فراست اور شرافت دونوں کو کام میں لاتے ہوئے وہ بات کہی جسے کہنے میں ولی عہد سوئم کو تکلف ہو رہا تھا۔

’’جی، وہ ملکۂ دوراں نواب زینت محل صاحب دامت اقبالہا و ادام اللہ ایامہا کا معاملہ بے شک درمیان ہے، کہ انھیں میرزا جواں بخت صاحب کے امکانات ولی عہدی...‘‘

’’شش... دیوار ہم گوش دارد!‘‘ ولی عہد سوئم نے کہا۔ ’’بات کو استاد نے سمجھ لیا، بہت خوب۔‘‘

’’مرشد زادۂ عالم و عالمیاں۔ ایک بیٹا اللہ نے آپ کو پہلے ہی ودیعت فرما دیا ہے۔ خداوند عالم اعلیٰ حضرت میراں شاہ صاحب کو قائم و دائم رکھے، اس وقت معاملات ولی عہدی کے قیاسی بھی نہیں، ظنی ہیں۔ علیا حضرت ملکۂ دوراں کو اس امر میں کچھ خیال بھی ہو تو عبث اور بے سود ہی رہے گا۔ مجھے اذعان

کامل ہے کہ حضرت ظل اللہ دامت فیوضہم کو علیا حضرت کی بات پر اصلا توجہ نہ ہوگی۔ میری رائے ناقص میں تو یہی آتا ہے کہ احترام الدولہ کے توسط سے آپ کی بات گوش گذار ظل سبحانی کے کردی جائے۔ رہیں خانم صاحب، تو ان کی بڑی بہن کو درمیان میں لا سکتے ہیں۔"

میرزا فخرو کا چہرہ کھل اٹھا۔ "ماشاء اللہ۔ استاد آپ کی خیر خواہی اور فراست سے ہم بہت خوش ہوئے ہیں۔ ہم کل ہی احترام الدولہ کو اس باب میں زحمت دیں گے۔"

"بہت مبارک۔ انشاء اللہ اس کے فوراً ہی بعد توسط سے بڑی بیگم کے معاملات کو انجام تک پہنچانے کی سعی بلیغ ہوگی۔"

"آپ کو خدا کامیاب کرے،" فتح الملک بہادر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، "ورنہ آپ جانتے ہی ہیں کہ لیسَ بینَ الموتِ و الفراق فرق (۱)۔"

"ایسے کلمات منھ سے نہ نکالیں صاحب عالم۔ وہ خالق ہے، باری ہے، منعم ہے، بحر سخا ہے۔ آپ نے سنا نہیں کیا؟ البحرُ لا یُخافُ من السَرق (۲)۔" مولوی صہبائی ہنسے۔ "اور ہم تو مانگ رہے ہیں، چوری بھی نہیں کر رہے ہیں۔ وہ دے گا اور ضرور دے گا۔"

"جو بھی ہو، میں تو یہی جانتا ہوں کہ دلم سخت آرزومند است۔"

"صاحب عالم، ہم بھی جانتے ہیں کہ زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است لیکن عشق کی ایک جست فاصلہ ہائے دور دراز کو چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔"

مولوی صہبائی کی خوش مزاجیوں کے باوجود مرزا غلام فخر الدین بہادر کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ مولانا نے دل میں کہا کہ اب زیادہ ٹھہرنا غیر مناسب ہے، شاہزادے کو اب تخلیہ چاہیئے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اجازت طلبی کے لئے کیا الفاظ کہوں کہ ایک خواص نے حاضر ہو کر سلام کیا اور کہا:

"سرکار والا نے استاد میر ناصر احمد صاحب بین کار کو شاید طلب فرمایا تھا، وہ حضوری کے درخواست گذار ہیں۔"

"آں ہاں، اچھا یاد دلایا۔ انھیں حاضر کرو، وقت کے لحاظ سے کچھ سنوائیں تو جی بہلے۔" میرزا

---

(۱) موت اور فراق میں کوئی فرق نہیں۔

(۲) سمندر کو چوری سے خوف نہیں۔

فخرو نے کہا۔ مولانا صہبائی کو رخصت طلبی کا اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ تین تسلیمات کر کے رخصت ہوئے۔

''ہمارا کام یاد رہے۔'' مرزا فخرو نے نیم قد اٹھ کر سلام کرتے ہوئے مولانا سے کہا۔

''جناب عالی، وہ تو عقیق دل پر قلم الماسی سے منقش ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد نتائج حاصل ہوں گے۔''

''جائیے، آپ کا خدا ہمراہ۔'' شہزادے نے متین اور بھاری لہجے میں کہا۔

مولانا کے باہر جاتے ہی ایک چوبدار نے داخل ہو کر تسلیم کر کے متوسط لہجے میں آواز دی:

''صاحب عالم کا اقبال بلند ہو، استاد میر ناصر احمد صاحب باریابی کے منتظر ہیں۔''

شہزادے کا اشارہ پاتے ہی چوبدار نے آواز لگائی: ''ملاحظہ! آداب سے کریں مجرا! صاحب عالم ولی عہد سوئم بہادر سلامت!''

استاد میر ناصر احمد اپنے وقت کے مانے ہوئے بین کار تو تھے ہی، وہ حضرت سید خواجہ میر درد کے براہ راست اخلاف میں سے بھی تھے۔ اس لئے بوجہ سیادت نسبی بھی سارا شہر انھیں احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ عموماً وہ کہیں جاتے نہ تھے، لیکن میرزا فخرو کے یہاں طلبی پر ضرور حاضر ہو جاتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ استاد نظام خان دھرپدیے، مکھو پکھاوجی، اور چار دیگر سازندے لئے ہوئے، سات تسلیمیں کرتے ہوئے حاضر ہوئے۔ مرزا غلام فخر الدین فتح الملک شاہ بہادر کی مہارت و مزاولت موسیقی کے بارے میں تمام کلاونت اور سازندے خوب سن چکے تھے اس لئے ان کے دل میں خود ہی سنکھے لگے ہوئے تھے کہ بہتر سے بہتر سوز و ساز ہو، مالک عزت اپنی رکھ لے۔ اعلیٰ حضرت ظل الٰہی کا شعر ان کے دل میں گونج رہا تھا۔

مت چھیڑ کر سنا تو قانون و بین مجھ کو\
لگتا ہے تار بارش تار رباب ساقی

اگر اچھا بجایا اور اچھا گایا نہ گیا تو ظل سبحانی کا شعر الہامی ہی ثابت ہوگا۔ شہزادے کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہی میر صاحب نے بینا کے تاروں کو چھیڑنا اور سادھنا شروع کیا۔ دوسرے سازندے نے قانون پر سر ملانے شروع کئے۔ بقیہ میں سے ایک نے تانپورہ سنبھالا۔ تیسرے اور چوتھے سازندوں نے دف کی سی قسم کے دو چھوٹے نقاروں کو کسنا اور درست کرنا شروع کیا۔ مکھو پکھاوجی، کہ گلاب سنگھ پکھاوجی مرحوم کے شاگردوں میں سب سے اعلیٰ تھے، چپ چاپ وقت کے منتظر رہے۔ جب سب تیاری

ہو چکی اور تانپورے اور قانون پر سر سادھے جا چکے تو میر ناصر احمد نے بین پر راگ جونپوری میں الاپ چھیڑا۔ کوئی ایک گھڑی کے الاپ کے بعد دفالیوں نے سنگت شروع کی، پھر مکھو پکھاوجی نے پکھاوج پر چوٹ دی اور ان کی سنگت شروع ہوتے ہی نظام میاں دھرپدیئے نے نہایت کومل سر میں الاپ شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں سوز سے مکمل ہم آہنگی کے بعد ساز مدھم پڑنے لگے، یہاں تک کہ تانپورہ گویا بالکل کوئی دھیمی بہتی ہوئی جوئے شیر کا نرم ڈھال پر سے اتار بن گیا اور بین کسی برہ کی ماری جوگن کی سسکی بھری تھرتھراہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ جمال خلیل شروانی کی رباعی کے الفاظ دور سے پکارتے ہوئے پپیہے کی صدا بن کر ایوان میں اس طرح پھیلے کہ جدھر کان لگائیں لگتا تھا آواز یہاں سے آرہی ہے، یہیں اسی پردے کے پیچھے کوئی پکار رہا ہے۔

اے وائے تو مونس کسے وآں کس من
سو دائے تو مونس کسے وآں کس من
زیں خوب ترم چہ بایدا ے دوست چو شد
غم ہائے تو مونس کسے وآں کس من

میرزا فتح الملک بہادر کو پہلے تو سنسنی سی آگئی کہ یہ کیا گایا جارہا ہے؟ کیا ان لوگوں کو میرے حال کی خبر ہے؟ کیا یہ لوگ کچھ ملی بھگت کر کے آئے ہیں، یا مجھ سے انعام کچھ زیادہ اینٹھنے کے فراق میں ہیں؟ لیکن چند ہی لمحوں میں وہ موسیقی، وہ شعر، اور وہ آواز ان کے دل پر اثر کرتی چلی گئی اور وہ سب کچھ بھول کر ایک عالم محویت میں زانوؤں پر ہلکی تھاپ دینے اور بین کی لے کے اوپر جھومنے لگے۔ کئی گھڑی بعد جب درت لے اور بھی درت ہوئی، اس قدر درت، کہ لگنے لگا بین کی آواز اور انسان کی آواز میں فرق معدوم ہو جائے گا، تو فتح الملک کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ان کا رومال تر ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ زانوؤں میں سر دے کر بے ہوش سے ہو جائیں۔ یہ حال دیکھ کر سازندوں نے لے مدھم اور پھر بہت مدھم کر دی اور سوز اچانک خاموش ہو گیا۔ نظام میاں اپنے شالی رومال سے پسینہ پونچھنے لگے اب تک انھیں احساس ہی نہ تھا کہ پسینے نے ان کے چہرے، پیشانی، بغل اور سینے کو بھگو کر رکھ دیا تھا اور کبھی کبھی تو ان کی انگلیوں کی پوروں تک سے پسینہ ٹپک جایا کرتا تھا۔

میرزا فخرو کے چوبداروں اور آبدار نے صاف بنی پاک سے ان کا چہرہ، پیشانی اور گردن خشک کی، ایک بہت نازک، چھوٹے سے چینی آبگینے میں کوئی مفرح انھیں پیش کیا، ان کے کپڑے برابر

کئے، اور پھر سب کے سب دوزانو ہو کر ایوان ہی میں مختلف جگہوں پر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی میرزا فخرو کی حالت سنبھلی، سازندوں نے پھر ساز چھیڑے اور اس بار میر صاحب کا انتظار کئے بغیر نظام میاں صاحب نے راگ جے جے ونتی میں الاپ اٹھایا اور بہت جلد کمال اسمٰعیل کی رباعی کے انترے پر آکر ٹھہر گئے، گویا اوروں کا انتظار کر رہے ہوں کہ آئیں اور میرا ساتھ نبھائیں۔ رباعی کے الفاظ تھے ؎

ہم لب نہم ایں با تو بہم یا نہ منم
امشب منم ایں باتو بہم یا نہ منم
ے برلب ولب کشادہ و در بستہ
یا رب منم ایں باتو بہم یا نہ منم

شہزادہ فتح الملک بہادر بھونچکا ہو کر سنتے رہے۔ یہ راگ، یہ وقت، یہ الفاظ، گویا خدا کی طرف سے میری دلجوئی اور میرے قلب کی مضبوطی کے لئے اتارے گئے ہوں اور پھر میاں نظام کی وہ کچھ باریک، کچھ دبی دبی سی آواز جس میں ایک دل کے ہزاروں ارمان بھرے ہوئے تھے، یا شاید ہزاروں دلوں کا ایک ہی ارمان بھرا ہوا تھا اور وہ سب کچھ اس راگ کی صورت میں متشکل ہو کر جوئے حیات کی طرح گویا فتح الملک بہادر کے رگ و پے کو سیراب کر رہی ہو۔ ان کی محویت کو دیکھ کر، کہ گذشتہ رباعی کو سن کر جو تلاطم ان کے ذہن و روح میں آیا تھا، اس بار اس کی جگہ گہرا سناٹا، تحیر کی طلسماتی چپ، اور جاگتے سوتے کے خواب کی سی چلتی پھرتی حیرانی تھی، استاد ناصر صاحب نے محفل کو اور طول دینا چاہا، لیکن ایک چوبدار نے، کہ شہزادے کا مزاج شناس تھا، خاموشی کا اشارہ کیا اور موسیقاروں سے پوچھے بغیر اس نے سرگوشی کے لہجے میں شہزادے سے کہا:

"صاحب عالم، استاد میر ناصر احمد صاحب اور میاں نظام خان صاحب اور سازندگان خواستگار رخصت ہیں۔"

مرزا فخرو گویا خواب سے بیدار ہوئے۔ دو پہر گذر چکی تھی۔ گردو پیش شمعیں روشن تھیں، مشعلچیوں نے فرشی کنول اور چھت کے جھاڑ اس خاموشی سے یکے بعد دیگرے جگا دیئے تھے گویا کسی مخفی وقت مقررہ پر وہ آپ سے آپ جل اٹھے ہوں۔ "او ہو ہو، وقت اتنا گذر گیا،" انھوں نے کہا۔ "بھئی قربان جایئے ہمارے کلاونتوں کے کہ انھوں نے ہمیں تھوڑی ہی دیر میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔"

دونوں استادوں نے جھک کر سات سلام کئے اور کہا:

''سرکار ہمارے تو گلے خشک ہو رہے تھے اور سازوں پر ہاتھ کانپ رہے تھے۔ حضور کے سامنے الاپ بھی چھیڑنا بے ادبی تھی چہ جائے کہ پورا دھرپد سنانا۔ اللہ نے لاج رکھ لی۔''

میرزا فخرو نے سب اہل طائفہ کو مناسب انعام اور تین تین پارچے خلعت کے دلوا کر رخصت کرانے کے پہلے یہ کہہ کر داد دی کہ اس میں گستاخی کی کیا بات ہے، جس کے گلے میں سر، اور جس کی انامل میں راگ کا ارتعاش ہوگا وہ آپ سے آپ گرفتار تموج آہنگ و صدا ہو جائے گا۔

ہر تار زبیراہن فانوس کمندے ست
گستاخی پروانہ نہ از بال و پر اوست

احترام الدولہ

عمدۃ الحکما احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر کہنے کو تو محض خانساماں تھے، اور اپنا دفتر ہمیشہ عمارت خانسامانی ہی میں قائم رکھتے تھے، وزارت عظمیٰ یا میر بخشی کی طرف وہ کبھی نظر نہ آتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کارہائے سلطنت میں وہ جتنا دخل رکھتے تھے اتنا ولی عہد اول یا وزیر اعظم کو بھی حاصل نہ تھا۔ کچھ تو اس بنا پر کہ وہ بادشاہ کے معالج خاص تھے، اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی مدبرانہ صفات اور با وزن بات کے باعث بادشاہ کے یہاں ان کی ہر رائے قبول ہوتی تھی، حکیم احسن اللہ خان کے مرتبے بہت تھے۔ بادشاہ کے مختار کار خواجہ سرا محبوب علی خان کے برابر با اثر شخص سارے قلعے میں حکیم احسن اللہ خان ہی تھے۔ اندرون حویلی البتہ ملکۂ دوراں نواب زینت محل کے آگے کسی کی کم ہی چلتی تھی۔ فرق بہر حال یہ تھا کہ نواب زینت محل ہوں یا خواجہ سرا محبوب علی خان، رعایا میں محبوبیت اور مقبولیت حکیم احسن اللہ خان کے ہی حصے میں آئی تھی۔

مغل بادشاہوں کا دستور تھا کہ سرکاری دعوتوں کے سوا ان کے ساتھ کھانے میں اہل خاندان، اور اہل خاندان میں بھی اقربا کے سوا کوئی شریک نہ ہوتا تھا۔ اور شاہی عورتیں تو بالکل ہی تخلیے میں کھانا کھاتی تھیں۔ پردے کے اس اہتمام کے باوجود بادشاہوں کا کھانے کا موقع عجب چہل پہل، گہما گہمی، اور تھوڑی بہت ہنسی چہل اور بہت کچھ رشک، بلکہ حسد کا موقع ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد بادشاہ کبھی کبھی کسی بہت اہم معاملے پر گفتگو کرنے، یا عرضداشت سننے کے لئے کسی بہت ہی مقرب امیر یا منصب دار کو گلوری میں شریک کرتا تھا۔ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی نے با ایں ہمہ کہ اس کے وسائل محدود اور ضرورتیں بے حد وسیع تھیں، اپنے پیش روؤں کے طور طریقے باقی رکھے تھے۔ آج کے دن بھی ایسا ہوا کہ معمول کا دربار ختم کر کے بادشاہ اٹھ کھڑے ہوئے تو جسولنی نے اشارۂ ابرو سے سمجھ لیا کہ اندرون محل تسبیح

خانے کا قصد ہے۔ اس نے آواز لگائی:

''خبردار! پیرومرشد، حضورِ عالی، بادشاہ سلامت، عمر دراز۔''

ادھر بادشاہ کا قدم تخت سے اتر کر آگے آیا کہ جسولنی تیز پا آگے بڑھی اور ہر چند قدم پر کڑک دار سروں میں سب کو مطلع کرتی چلی:

''جہاں پناہ، بادشاہ سلامت۔ مہابلی، بادشاہ سلامت۔''

''خبردار، پیرومرشد، حضورِ عالی۔ بادشاہ سلامت عمر دراز۔''

''عالم پناہ، بادشاہ سلامت، مہابلی عمر دراز، ادب سے مجرا کرو۔''

اندر تمام بیگمات تعظیم کے لئے سرو قد کھڑی ہوئیں، تخت کے پیچھے خواجہ سرا مور چھل ہلا رہا ہے، بادشاہ آکر تخت پر جلوہ فرما ہوئے۔ بیگمات اور شہزادیوں نے اپنے اپنے رتبے کے مطابق دور یا نزدیک سے سلام کیا۔ زنانہ تسلیمات کے ختم ہوتے ہوتے خاصے والیوں نے سات گز لمبا، تین گز چوڑا چمڑا بچھایا۔ اس پر ایک سفید دسترخوان بچھایا، اور پھر اس دسترخوان کے بالکل بیچ میں دو گز لمبی، ڈیڑھ گز چوڑی اور چھ گرہ اونچی ایک چوکی رکھی۔ اس چوکی پر پھر ایک چمڑا اور سفید دسترخوان بچھا کر بے شمار کھانے سجائے کہ سب مہر بند خوانوں میں اور خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ کھانوں پر سونے چاندی کے ورق جگمگا کر بہار دے رہے ہیں، مشک، زعفران، عنبر، گلاب، اور کیوڑے کی بہت ہلکی پھواریں ہو رہی ہیں۔ دائیں جانب کی ایک خواص نے، کہ اس کام کے لئے مقرر تھی، بسم اللہ کہہ کر پہلا نوالہ توڑا اور بادشاہ کے منھ میں دیا۔ ادھر لقمہ اٹھا، ادھر چوبدار پکارا ''خاصہ مبارک۔'' اس آواز کے بلند ہوتے ہی باہر بھی دیگوں، لگنوں اور دیگچوں کے منھ کھل گئے اور روز کے آنے جانے والوں کے علاوہ اتفاقیہ آنے والے مسافر، حاجت مند، بھوکے، سب نے چھک کر کھایا اور موسم کے اعتبار سے پیٹ بھر کے شربت پیا۔

خاصہ ختم ہوتے ہی باہر سے دعاؤں کی آوازیں بلند ہوئیں، ''مہابلی کی عمر دراز، پیرومرشد کا سایہ سلامت، اللہ ہمارے بادشاہ جمجاہ کو ہمارے سروں پر قائم رکھے۔''

خاص بردارنی نے مہابلی کی خدمت میں گلوریوں کے خاصدان، ناگردان، رکھے۔ ہر گلوری سونے کے ورق میں لپٹی ہوئی، پان کی تہوں کو برابر رکھنے کے لئے ہر گلوری میں باریک سی چاندی کی سلائی پروئی ہوئی، جہاں پناہ جس گلوری کو دستِ مبارک سے اٹھاتے اس کی نقرئی سلائی خاص بردارنی کو بخش دیتے۔ ادھر گلوری منھ میں رکھی گئی کہ بھنڈے بردارنی نے حضور کی خدمت میں بھنڈا حاضر کیا، تازہ، معطر،

ببول کے کوئلوں کے انگاروں کی چمک سنہری روپہلی چلم پر چاندی کے چنبل پوش کے پیچھے سے یاقوت احمر کی طرح چمکتی ہوئی، سونے کی جڑاؤ مہنال، چار گز کے فتح پیچ (عام لوگوں کی زبان میں پیچوان) پر رنگین ریشم کے دھاگے، چاندی اور سونے کی تارکشی، پیچ پورے کا پورا گلاب جل میں بسا ہوا، اس کی لطیف خوشبو اور سیب کے گڑاکو کی تلخ اور بھینی خوشبو مل کر عجب بہار پیدا کر رہی تھیں۔ سونے چاندی کا گنگا جمنی منقش حقہ (عام لوگوں کی زبان میں فرشی) چاندی کے بڑے سے طشت میں مضبوط جمایا ہوا، بھنڈا کیا تھا خوشبو اور گرمی اور نقش و رنگ کا نگار خانہ تھا۔

جہاں پناہ جب تک بھنڈے کے کش لیتے رہے، مورچھل بردار اور پنکھا بردار ذرا دور دور ہٹ گئے کہ مبادا بادزن کا کوئی جھونکا چلم سے کسی اخگر نادان کو اپنی جگہ سے جست کرنے کی جرأت عطا کر دے۔ نواب زینت محل صاحب کا بھنڈا الگ ان کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ بہت ہی خاص موقعوں پر مہابلی اپنے بھنڈے کی مہنال کسی بیگم کو بطور اولوش عنایت کرتے، ورنہ کھانے کے بعد کی محفلوں میں نواب زینت محل صاحب کے سوا کسی کو جہاں پناہ کے حضور بھنڈے سے لطف اندوز ہونے کی اجازت نہ تھی۔ نواب زینت محل کے دل میں تھی کہ جہاں پناہ بھنڈے سے فارغ ہو لیں تو اس سے پہلے کہ وہ آرام کے لئے حمام میں تشریف لے جائیں، اپنے چہیتے بیٹے مرزا جواں بخت بہادر کی پانچویں سالگرہ کے بارے میں کچھ عرض کریں۔ حمام میں بیگمات شاہی کو عموماً باریابی نہ ملتی تھی۔ حویلی مبارک کا حمام کوئی نہانے دھونے کا ایوان یا غسل خانہ نہ تھا۔ وہ ایک مکمل عمارت تھی جو اپنے ہی قطعۂ زمین پر بنی ہوئی تھی۔ اسے سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کا ایوان بیچ میں تھا اور اس کے چاروں طرف دو مدور راہداریاں تھیں جن میں حسب موسم ٹھنڈی یا گرم نہریں اور فوارے رواں رہتے تھے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض جن میں موسم کے اعتبار سے خوشبودار پانی بھرا رہتا تھا۔ جھروکوں، دریچوں اور راہداریوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ کیسا ہی حبس بھرا یا بے ہوا موسم ہو، لیکن ان میں ہلکی ہلکی ہوا ہر وقت بہتی تھی اور ساری عمارت میں لطیف خوشبوؤں کی لپٹیں آتی تھیں۔ عمارت کے دو درجے تھے۔ وہ درجہ جو دریاے جمنا کے رخ پر تھا اسے سرد حمام اور دوسرا جو موتی مسجد کے رخ پر تھا اسے گرم حمام کہتے تھے۔

حمام دراصل بہت خاص شاہی ملاقاتوں کی جگہ تھا (مثلاً اورنگ زیب نے شیواجی کو حمام میں شرف باریابی بخشا تھا)، یا پھر بادشاہ اسے اپنے لئے تخلیہ اور آرام اور مراقبہ اور تفکر کی جگہ کے طور پر استعمال

کرتا تھا۔ اس دن بھنڈے کا دور غیر متوقع طور پر کچھ جلد ختم ہوا اور جہاں پناہ کسی کو لب کشائی کا کچھ موقع دیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جسولنی نے تیزی سے آگے بڑھ کر آواز لگائی:

''خبردار۔ ادب سے مجرا کرو۔ پیر و مرشد بادشاہ سلامت۔''

اتنی دیر میں جسولنی اور دیگر خواصوں نے قیاس سے سمجھ لیا کہ بادشاہ کا رخ حمام کی طرف ہے۔ کئی صدائیں بلند ہوئیں :

''حمام مبارک۔ مہابلی کو سرد و گرم آرام نصیب ہو۔''

بادشاہ نے دیوان خاص سے باہر قدم رکھا تو پیش کے خواصی نے تین تسلیمیں ادا کیں اور حکم کا منتظر ہوا۔ یہ اس لیے کہ جہاں پناہ کبھی کبھی کسی شاہزادے یا کسی بڑے منصب دار سلطنت کو بھی حمام میں طلب فرما لیتے تھے۔ بادشاہ ایک لمحے کے لیے رکے، پھر انھوں نے بہت نرم سروں میں خواصی سے فرمایا:

''احترام الدولہ باریابی کے ملتمس تھے۔ کیا وہ نشست میں موجود ہیں؟''

خان ساماں کا دفتر، جسے عوام '' خان سامانی '' کہتے تھے، دیوان عام سے بالکل متصل تھا۔ حویلی کے لوگ اسے '' نشست '' کہتے تھے۔

خواصی نے سینے پر ہاتھ رکھا اور جھک کر عرض کی:

''حضور کی طلبی پر گوش بر آواز ہیں۔''

''ولی عہد سوئم بہادر سے التماس کریں کہ حمام میں قدم رنجہ فرما کر ہم سے ہمکلام ہوں۔'' بادشاہ نے فرمایا۔'' وہ مجرائی ہولیں تو احترام الدولہ بہادر کو حمام میں تشریف آوری کی زحمت دی جائے۔''

میرزا فتح الملک بہادر اپنے تمام اوصاف حسنہ اور خصائل عالیہ کے باوجود بادشاہ کے منظور نظر نہ تھے۔ یوں تو سب سے چھوٹی اولاد ہونے، اور پھر اس پر طرہ یہ کہ نواب زینت محل کے بطن سے متولد ہونے کے سبب سے مرزا جواں بخت بہادر سب کے چہیتے تھے، لیکن جہاں پناہ کی نگاہ میں میرزا دارا بخت بہادر اور پھر ان کے بعد میرزا کیومرث بہادر زیادہ محبوب تھے۔ میرزا فتح الملک کو نئے زمانے کی باتوں اور رسوم و اطوار سے دلچسپی تھی اور یہ بات بادشاہ ذی جاہ کو بہت مرغوب طبع نہ تھی۔ لیکن میرزا فتح الملک بہادر کی اعلیٰ ذہنی لیاقت اور ان کے اکتسابات علمیہ کے معترف حضرت ظل الٰہی ضرور تھے، اور اس بات کے بھی کہ میرزا فتح الملک بہادر کی شکل و شباہت اور وضع قطع بادشاہ عالم پناہ سے بہت ملتی جلتی تھی۔ بلکہ حویلی کے حسود تو یہ بھی کہتے تھے کہ میرزا فخرو نے جان بوجھ کر ظل سبحانی جیسی وضع قطع اختیار کی ہے کہ لوگ انھیں

ہی بادشاہ کا قائم مقام سمجھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ بننے کا ارمان سبھی شاہزادوں کے دل میں تھا۔ سبھی اپنی اپنی جگہ خیال کرتے تھے کہ کسی وقت بھی پانسہ یوں پلٹ سکتا ہے کہ ہمارے ہی پو بارہ ہو جائیں۔ ہر چند کہ انگریز بہادر نے میرزا دارا بخت بہادر کو روز اول ہی سے ولی عہد تسلیم کر لیا تھا لیکن مغل بادشاہی میں ولی عہدی اور بادشاہی کسی کا استحقاق نہ تھیں۔ اور یہ بھی تھا کہ جسے ولی عہد مقرر کیا گیا وہ بادشاہ بنا ہی نہیں۔ شہزادہ محمد دارا شکوہ کی مثال سب کے سامنے تھی۔ مغل بادشاہی میں بادشاہت کے لئے کوئی رسوم، کوئی قوانین نہ تھے۔ لہٰذا میرزا دارا بخت کی ولی عہدی کے باوجود دوسرے شاہزادے بھی دل میں ارمان تو رکھتے ہی تھے کہ ہم ہی تخت کے وارث ہوں۔ اور اس گنجلک، اس الجھن سے بھرے ہوئے ذہنی وقلبی ماحول میں نواب زینت محل کے داخلے نے ایک بالکل ہی نیا عنصر داخل کر دیا تھا۔

نواب زینت محل کو بادشاہ نے ۱۸۴۰ میں اپنی ملکہ بنایا تھا۔ اس وقت بادشاہ کی عمر پینسٹھ سال اور زینت محل کی عمر انیس سال، لیکن بقول بعض سولہ سال تھی۔ گھنشیام لال عاصی نے تو (شاید اس لئے کہ وہ بادشاہ جمجاہ سے کچھ کدورت ان کے زمانۂ ولی عہدی سے رکھتے تھے، اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) بادشاہ کی عمر اور بھی زیادہ، اور بادشاہ بیگم کی عمر اور بھی کم لکھی ہے۔ شادی کے موقعے پر انھوں نے تاریخ لکھی، بلکہ تاریخ کے نام پر اعلیٰ حضرت کو تضحیک واستہزا کا ہدف بنایا۔

بے فصل گل مزادے ہرگز نہ سیر گلشن
برسائے لاکھ گوہر بے وقت ابر بہمن
شاہ و گدا تلک ہے یہ بات سب پہ روشن
جو کام ہے جواں کا آئے نہ پیر سے بن
پوچھا جو ہاتفی سے دل نے بوقت گفتن
دی یہ ندائے غیبی بارہ سو اب ہیں چھپن
اس میں جو طرز نو سے دکھلائے سامری فن
استاد تجھ کو جانے ہر شیخ اور برہمن
بکر عروس نو کا لوٹے گا کون جوبن
ہفتاد سالہ دولہا گیارہ برس کی دلہن

یہ اشعار کہہ کر عاصی نے اپنا غصہ تو شاید ٹھنڈا کر لیا ہو، لیکن شہر دہلی میں یہ نظم بالکل گرم نہ ہوئی۔ عاصی کو خیال رہا ہوگا کہ چند ہی دنوں میں یہ اشعار بچے بچے کی زبان پر ہوں گے، لیکن دہلی کے ٹھٹھولئے بات کا موقع اور محل، اور حفظ مراتب کے تقاضے خوب سمجھتے تھے۔ عاصی کے اشعار تو فوراً بھلا دیئے گئے، ادھر سال بھر کے اندر ہی اندر شاہ فریدوں فر نے نواب زینت محل کی گود ایک انتہائی خوشرو اور ماہتاب پیشانی بیٹے سے ہری کر دی۔ بد خواہ منھ دیکھتے رہ گئے۔ لیکن نئے بیٹے کی پیدائش اور نواب زینت محل کی جاہ کوشی اپنے مسائل بھی لائی۔ زینت محل نے اپنے بیٹے کی ولی عہدی کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ میرزا دارا بخت بہادر عرف میرزا شبو کے ہوتے تو کسی تبدیلی کا امکان بظاہر نہ تھا اور حضرت قدر قدرت بادشاہ سلامت بھی کسی تبدیلی کی تائید نہ فرماتے، لیکن ملکۂ دوراں نے چپکے چپکے مٹکاف صاحب کلاں بہادر کو اپنا موافق کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تحفہ تحائف بھجوانے اور صاحب کلاں بہادر کی ضیافتیں کرنے کے علاوہ وہ ان کے یہاں کی میم صاحبان سے بھی ربط ضبط پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ہر چند کہ صاحبان ذی شان کے یہاں اپنا رسوخ پیدا کرنے کی یہ مساعی تا ہنوز بارور نہ ہوئی تھیں لیکن زینت محل کے سامنے عمر کا عرصہ وسیع تھا اور وہ انتظار کا بھی ہنر جانتی تھیں۔

بادشاہ آہستہ قدم حمام کی طرف بڑھے۔ ادھر میرزا فتح الملک بہادر کو اطلاع ہوئی کہ مہابلی یاد فرماتے ہیں۔ ان کی ڈیوڑھی دیوان عام کے سامنے والے میدان کے پرلی طرف تھی، وہاں سے حمام تک کا سفر نصف گھڑی سے بھی کم تھا۔ شاہزادگان و امرائے مغلیہ کے طور کے مطابق، اور رؤسائے لکھنو کے طور کے برعکس شاہزادہ غلام فخر الدین بھی صبح برآمد ہونے کے وقت سے رات کو استراحت فرمانے تک پورے درباری لباس میں ملبوس رہتے تھے، خواہ وہ دن دربار میں ان کی حاضری کا نہ ہو۔ لہٰذا ولی عہد سوئم کو حضوری کے لئے کوئی اہتمام نہ کرنا پڑا اور وہ بہت جلد حمام کے دروازے پر پہنچ گئے۔ وہاں چوبدار شاید انھیں کا منتظر تھا اور وہ انھیں فوراً اندر لے گیا۔

باہر کی کھلی ہوا اور روشنی کے بعد حمام کے اندر کی فضا دھندلی لیکن خنک اور بے حد خوشگوار محسوس ہوئی۔ چونکہ میرزا فخرو بہادر کی طلبی اندرون حمام کئی بار ہو چکی تھی اس لئے انھیں اجنبیت، یا راہ سمجھنے میں کسی مشکل کا احساس نہ ہوا۔ ان کے دل میں اس وقت یہ کرید ضرور تھی کہ اس وقت کوئی ایسے قرائن نہ تھے کہ حضور پرنور کسی بات پر ولی عہد سوئم سے مشاور ہونا چاہتے ہیں، الہٰذا یہ طلبی ایک خفیف سی فکر مندی کا باعث ضرور تھی۔ لیکن انھیں یہ اطلاع بھی مل گئی تھی کہ حضور پرنور قدر قدرت نے احترام الدولہ کو بھی طلب کیا

ہے۔اس لئے کوئی تشویشناک بات نہ ہو سکتی تھی۔

حمام کا اوپری درجہ حسب معمول راہداریوں سے گھرا ہوا ایک متوسط ایوان تھا جس میں ہلکی سبز روشنی ہو رہی تھی۔ بیچوں بیچ نہر بہ رہی تھی جس میں ایک چھوٹا سا فوارہ لونگ اور دارچینی کے عطر کی ہلکی خوشبو بکھیر رہا تھا۔ سنگ مرمر کے سفید و سیاہ فرش پر کوئی فرش یا قالین نہ تھا۔ ایک جانب کو آبنوس کا ایک بھاری اور چاندی سے منقش پایوں والا تخت تھا جس پر ایک طرف جاے نماز اور اس کے ساتھ چاندی کے رحل پر کلام پاک کا ایک بڑا، مطلا اور مجلد نسخہ اور ایک طرف اعلیٰ حضرت کی سبز جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چو گوشیہ ٹوپی دھری تھی۔ آبنوسی چوکی سے کچھ ہٹ کر ایک مرصع چھپر کھٹ جس کے پائے چاندی کے اور پردوں کے ڈنڈے منقش اور بھاری پیتل کے تھے، مخمل دوخوابا کے بڑے بڑے تکیوں کا سہارا لئے ہوئے ظل اللہ پلنگ پر نیم دراز تھے۔ زمرد کی تسبیح ہاتھ میں، آنکھیں نیم باز، انگلیاں آہستہ حرکت کر رہی تھیں۔ میرزا فخرو کے پاؤں کی آہٹ پہچان کر انھوں نے آنکھیں کھولیں اور شفقت بھرے لہجے میں ارشاد فرمایا:

''اے آمدنت باعث دلشادی ما۔ آؤ مرزا فخرو، بیٹھو۔''

چونکہ بادشاہ کے سامنے کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی اس لئے پورے ایوان میں بیٹھنے کے لئے کوئی صندلی یا کرسی کی قسم کی شے نہ تھی۔ بیگمات اور شاہزادے اعلیٰ حضرت کا اشارہ سمجھ کر پلنگ کی پائنتی یا نماز کی چوکی پر ٹک جاتے تھے۔ اس بار حضور انور نے آنکھ کے اشارے سے فرمایا کہ میری پائنتی بیٹھو۔ مرزا فخرو نے تین تسلیمیں کیں اور حضور کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر پائنتی کی پٹی پر ٹک گئے۔ پٹی خود ہی کوئی ایک بالشت چوڑی تھی، اس پر نرم گدے کا فرش، بیٹھنے میں کوئی زحمت نہ تھی۔ مرزا فخرو بہادر نے سر جھکا کر بادشاہ کے پاؤں ہلکے ہلکے دبانے شروع کئے۔

''اماں میرزا فتح الملک،'' اچانک بادشاہ عالم آگاہ نے مہر سکوت توڑی۔ ''کہیں پیغام بھجوانے کے بارے میں رائے تمھاری کیا ہے اور کیا عمل ہے؟''

مرزا فخرو سناٹے میں آگئے۔ حضور کو کیسے خبر لگ گئی، انھوں نے گھبرا کر دل میں کہا۔ یہ باتیں تو احترام الدولہ کے سپرد تھیں۔ لیکن حضور کے استفسار میں جو اشارہ تھا اسے نظر انداز کر کے جواب دیا جائے تو... خاقان معظم خفا تو نہ ہوں گے؟ ایک لحظہ توقف کر کے میرزا فتح الملک نے فرمایا:

''ابھی تک تو ایسے تمام معاملات خاقان کامگار کے سایۂ عاطفت اور رہنمائی و بصیرت میں

طے ہوتے رہے ہیں۔'' انھوں نے ایک پل پھر توقف کیا۔'' دیگر یہ کہ دودمان تیموریہ میں شاہی گھرانے سے پیغام کبھی کسی کے وہاں جاتا نہیں ہے۔''

''درست،'' بادشاہ نے متین لہجے میں کہا۔'' ہماری لڑکیوں کے لئے درخواستیں آتی ہیں جو قبول یا نا قبول ہوتی ہیں... یا خاندان چغتا کا سربراہ جو سریر آرائے سلطنت بھی ہوتا ہے، کبھی کبھی خود کوئی مناسب شوہر تجویز کر دیتا ہے۔''

''پیر و مرشد درست فرماتے ہیں۔ یوں بھی ہوا ہے کہ ہماری بیٹیوں کے حسب مرتبہ بر نہ ملا تو ان مخدرات نے نا کتخدائی ہی کو اپنے لئے پسند کیا ہے۔''

''لڑکوں کے لئے باہر کی کسی عفیفہ پر ہماری نظر انتخاب کبھی پڑے تو ہم اسے نکاح کر کے گھر لے آتے ہیں۔'' بادشاہ نے مزید فرمایا۔

میرزا فتح الملک بہادر نے معاملے کو سمجھ لیا تھا، لیکن پاس ادب کے باعث صاف صاف بات کہنے سے گریز کر رہے تھے۔ آخر یہ احترام الدولہ کہاں رہ گئے؟ انھوں نے دل ہی دل میں خود سے الجھتے ہوئے کہا۔

''والدۂ میرزا ابو بکر بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ نے دار البقا کی راہ لے کر فدوی کو بہت تنہا کر دیا۔'' انھوں نے رکتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم جانتے ہیں کہ حاتم زمانی دل تمھارا نہیں موہ سکیں۔'' بادشاہ نے ٹھہر ٹھہر کر ہر لفظ پر تھوڑا زور دے کر کہا۔'' لیکن میرزا الٰہی بخش ہمارے معتمد ہیں۔''

''پیر و مرشد کی رائے عالی پر روشن ہے کہ میں خلاف شرع کوئی کام نہیں کرتا۔'' میرزا فتح الملک بہادر کے لہجے میں تھوڑی سی خشکی تھی۔'' اور نہ ہی میں متوسلین اپنے میں سے کسی کو خود سے منفک کرنا چاہتا ہوں۔''

بادشاہ دیں پناہ کے چہرے پر کچھ اطمینان کی سی لہر کی روشنی پھیلی۔ لیکن ابھی انھوں نے سلسلۂ کلام دوبارہ آغاز نہ کیا تھا کہ حمام کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور چوبدار کی بلند لیکن عجب طرح کی شیریں اور نرم آواز سنائی دی:

''احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر۔''

بادشاہ نے تالی بجائی۔ تالی کے بجتے ہی پردہ ہٹا اور حکیم احسن اللہ خان نے اندر داخل ہو کر

کورنش ادا کی، پھر تین تسلیمات بجالائے اور ناف پر ہاتھ باندھ کر بالکل سیدھے کھڑے ہوگئے، اس طرح کہ ان کی نگاہ روبرو لیکن بادشاہ کے پیچھے دیوار پر کسی جگہ جمی ہوئی تھی۔

''احترام الدولہ بہادر،'' بادشاہ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔'' اماں تم بہت خوب آئے۔ اور شاید جس امر کو تم گوش گذار ہمارے کرنا چاہتے تھے وہی امر ابھی ہمارے اور ولی عہد سوئم بہادر کے درمیان معرض گفتگو میں آگیا۔''

حکیم احسن اللہ خان پل بھر میں معاملے کو سمجھ گئے۔ اعلیٰ حضرت کو حویلی کے حالات کی پوری خبر رہتی ہے، انھیں شاید پرچہ ہی گذرا ہو کہ ولی عہد سوئم بہادر فلاں بیگم سے تعلق قائم کرنے کے خواستگار ہیں۔ قدرتی بات تھی کہ بادشاہ پورے حالات پر مطلع ہونا چاہیں۔ حکیم احسن اللہ خان نے نگاہیں اسی طرح روبرو رکھے ہوئے عرض کیا:

''روشن ضمیری پیر و مرشد کی ایک عالم پر ظاہر و باہر ہے۔''

''تو کیا تم پیغام بھجوانے کی اجازت طلب کرتے ہو؟'' بادشاہ نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

میرزا فتح الملک بہادر چونک کر کچھ کہنے ہی والے تھے کہ انھوں نے انتہائی فراست سے کام لیتے ہوئے اپنی زبان روک لی۔ خطاب حضور انور کا حکیم صاحب کی طرف تھا، میرا داخل ہونا بہت بد تہذیبی کی بات تھی، انھوں نے دل میں کہا اور احترام الدولہ کی طرف توقع بھری نگاہوں سے دیکھا۔

''نیاگان ظل سبحانی کی قائم کردہ رسوم سے سر مو تجاوز ہو تو ہم گردن زدنی ہوں گے۔'' حکیم احسن اللہ خان نے مودب لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔

''مگھم کیوں کہتے ہو، مفصلاً و مشرحاً بیان کرو۔'' بادشاہ کا لہجہ اب بھی ذرا تیز تھا۔

''عالم پناہ، میں تھوڑی سی گستاخی کا مرتکب ٹھہروں تو پہلے ہی سے طالب عفو ہوں۔ جن مخدرہ پر صاحب عالم و عالمیان ولی عہد سوئم بہادر کی نگاہ انتخاب پڑی ہے وہ بیوہ ہیں رامپور کے ایک صاحب حیثیت شریف سید زادے کی۔ ٹھگوں کے دست ظلم نے انھیں تا بگور پہنچا دیا اور یہ بی بی اب دوبارہ اپنے وطن مالوف دہلی واپس آگئی ہیں۔''

''ان کے حالات کا ہمیں علم ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اب وہ وفا و عفت کے حصن حصین سے قدم باہر نہ نکالیں گی۔''

یہ اشارہ تھا وزیر خانم کی اوائلی زندگی کے حالات کی طرف، اور اگرچہ بادشاہ کے خیال کے

علی الرغم میرزا فتح الملک کا خیال تھا کہ وزیر خانم ہمیشہ باوفا اور عفیفہ رہی تھیں، انھوں نے اس موقعے پر سکوت ہی بہتر سمجھا۔

''ان بی بی کی خواہر بزرگ یہاں دلی میں مولوی محمد نظیر رفاعی مجددی کو بیاہی ہیں۔ شریف اور مرفہ الحال لوگ ہیں۔ سب معاملات وہ طے کریں گی۔ مولوی صہبائی بیچ میں ہیں۔''

''اور نکاح؟''

''شہر ہی میں پڑھوا دیا جائے گا۔ یہاں سے کسی کو زحمت نہ کرنی ہوگی۔ خواہر بزرگ کی معیت میں ڈولا بحفاظت حویلی میمونہ میں آجائے گا۔''

''اچھا، میرزا فتح الملک بہادر کی یہی مرضی ہے تو سارے کام بحسن وخوبی اس حویلی کی شان کے موافق انجام پائیں۔'' بادشاہ نے ایک لحہ خاموش رہ کر کہا۔

میرزا فخرو نے باپ کی طرف تشکر بھری آنکھ سے دیکھا۔ احترام الدولہ نے کسی قرینے سے سمجھ لیا کہ اب باریابی ختم ہوئی۔ انھوں نے حسب معمول کورنش ادا کی، پھر تین تسلیمیں بجالائے اور الٹے پاؤں چلتے ہوئے حمام کے باہر ہو گئے۔

بادشاہ نے میرزا فخرو کے شانے ہلکے سے تھپتھپائے اور کہا، ''بہت خوب۔ اللہ معکم۔''

ولی عہد سوئم نے کھڑے ہو کر کورنش ادا کی اور پھر پلنگ کی پٹی پر ٹک کر باپ کے پاؤں دبانے لگے۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ کی آنکھ لگ گئی اور ولی عہد سوئم بھی حمام سے باہر چلے آئے۔

بڑی بیگم

مولوی محمد نظیر رفاعی مجددی اصلاً دلی والے نہ تھے۔ وہ قوم کے شیخ فاروقی اور مولداً بڑودہ گجرات کے تھے۔ ان کے والد شیخ دین محمد نے بڑودہ میں حضرت سید نورالدین سیف اللہ الرفاعی (وفات ۱۲۲۵ مطابق ۱۸۱۰) کے دست حق پرست پر بیعت کی اور ایک مدت انھیں کے آستانے پر مراقب ومعتکف رہے۔ رفاعی سلسلے کے بانی شیخ احمد الرفاعی (۱۱۰۶ تا ۱۱۸۲) عربی النسل تھے لیکن انھوں نے عمر کا بہت بڑا حصہ جنوبی عراق کے دلدلی علاقے کی ایک چھوٹی سی بستی بطائح میں گذارا۔ وہ خود قادری سلسلے میں بیعت تھے لیکن ان کے ماموں شیخ منصور البطائحی نے انھیں سلسلۂ رفاعیہ یا بطائحیہ کا سجادہ اور شیخ مقرر کردیا۔ بعد میں سلسلہ صرف الرفاعی کے نام سے چلا اور دور دور پھیل گیا۔ ابن خلدون نے حضرت شیخ احمد الرفاعی کا مفصل ذکر کیا ہے۔ رفاعی سلسلے کی مقبولیت مالدیپ اور سراندیپ ہوتی ہوئی ملک دکن و ہند اور جزائر لکھن دیپ تک چودھویں صدی میں پہنچی۔ ابن بطوطہ نے مالدیپ کی رفاعی خانقاہوں اور اس سلسلے کے فقرا کا ذکر کیا ہے۔ ملک ہند و دکن میں یہ سلسلہ بہت جلد دور دور تک قائم ہو گیا۔

گجرات میں رفاعی سلسلے کے بزرگوں کی آمد بظاہر سولھویں صدی میں شروع ہوئی اور چند ہی برسوں میں ان کی خانقاہیں بڑودہ، سورت، راندیر، اور دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں قائم ہو گئیں۔ حضرت شیخ سید نورالدین سیف اللہ الرفاعی اٹھارویں صدی کے گجرات میں مقبول ومحترم خلائق رفاعی بزرگ تھے۔ شیخ نورالدین سیف اللہ الرفاعی پر دل وجان سے اعتقاد اور عقیدت کے باوجود شیخ دین محمد نے حضرت شیخ کے ان مریدوں کے حلقے سے کوئی تعلق نہ رکھا تھا جنھیں راتب رفاعی سے شغف تھا۔ راتب رفاعی کے شرکا طرح طرح کے کرتبوں میں مہارت رکھتے تھے۔ رقص وغنا کے دوران خود کو تلواروں سے زخمی کرنا، اپنے سر کو لوہے یا کانسے کے گرز سے چوٹ پہنچانا ان کے خاص مشاغل تھے۔ بعض

بعض راتب دار تو اپنے بدن کے مختلف حصوں، مثلاً رخسار، ران، پیٹ، حتیٰ کہ زبان کو بھی تلوار، لوہے کی میخ یا قینچی سے اس طرح زخمی کرتے تھے کہ اوزار اس حصۂ جسم کے پار ہو جاتا جس پر وہ ضرب لگا رہے ہوتے۔ بعض لوگ اپنی سانس اندر روک کر پھر ناک، منھ، اور کان کو مکمل طور پر بند کر کے سانس کو اس زور سے باہر پھونکتے کہ ان کی آنکھ حدقۂ چشم سے باہر نکل کر ان کے رخسار پر لٹک آتی۔ ان اعمال کو "ضرب رفاعی" کہا جاتا تھا۔ عوام کی زبان میں اسے "کھیل" اور "کھیلنا" کہتے تھے۔

بعض پرانے راتب داران رفاعی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ زندہ سانپ نگل لینے اور دہکتے ہوئے انگاروں پر چلنے میں کمال رکھتے تھے۔ بڑودہ کے راتب داران عموماً نوجوان یا نو بالغ لڑکے تھے اور وہ اپنے جوش عقیدت اور اپنے مرشد کے روحانی تصرفات کا مظاہرہ عرس کے مجمعوں اور بھرے بازاروں میں کرتے تھے۔ کوئی راتب دار "کھیل" کے دوران کبھی زخمی نہ ہوتا تھا۔ زخمی ہونا تو بڑی بات تھی، زخموں سے چھدے ہوئے کسی بدن سے خون کی بوند بھی نہ ظاہر ہوتی تھی۔ "کھیل" شروع کرنے کے پہلے راتب دار لڑکے حضرت شیخ نورالدین سیف اللہ الرفاعی یا ان کے نامزد خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے دعا لیتے اور ان سے اپنے ہتھیار پر دعا دم کراتے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ چاقو یا قینچی یا موٹی سوئی کو زبان یا کسی اور عضو جسم کے آر پار لئے لئے راتب دار اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کے سامنے اس قاتل اوزار کو کھینچ کر الگ کر دیتا۔ خون کی چھینٹ بھی نہ گرتی، صرف ایک نشان سا نظر آتا اور مرشد اس پر اپنا لعاب دہن لگا دیتے تو وہ نشان بھی غائب ہو جاتا۔

راتب داران رفاعی کی سنسنی خیز حرکات اور ان سے وابستہ خوارق کی بنا پر رفاعی سلسلے کے بزرگوں کو بڑودہ میں (بلکہ تمام ملک میں جہاں جہاں وہ تھے) بیحد مقبولیت حاصل تھی۔ لیکن شیخ دین محمد کا خیال یہ تھا کہ شرع دین متین اور طرق بزرگان سلف کی پوری پابندی نہایت ضروری ہے اور ایسے کام جن میں جسم کو تکلیف پہنچانے، یا نام و نمود، یا کرتب بازی کا شائبہ بھی ہو، انھیں مناسک دین کا مرتبہ دینا یا انھیں طریقت یا شریعت کے لحاظ سے مناسب جاننا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ شیخ دین محمد اپنی اس رائے کو اپنے شیخ سے محبت کا حصہ اور دلیل جانتے تھے اور حضرت شیخ نورالدین سیف اللہ الرفاعی بھی شیخ دین محمد سے کوئی تعرض نہ کرتے تھے۔ عرس کے زمانے میں مختلف رنگوں کی جھنڈیاں نکالی جاتیں۔ ہر رنگ ان سلاسل میں سے کسی ایک کی نمائندگی کرتا تھا جن میں شیخ نورالدین اپنے مریدوں کو بیعت کرتے تھے۔ جھنڈیوں پر حضرت شیخ یا ان کا نامزد خلیفہ دعا پڑھ کر دم کرتا، پھر چھریوں، قینچیوں،

میخوں، نیزوں اور تلواروں وغیرہ پر بھی دعا دم کی جاتی اور راتب رفاعی کا جلوس نہایت شان اور جوش عقیدت کے ساتھ سارے شہر کا چکر لگاتا اور ''کھیل'' والے نوجوان اور لڑکے تماشائیوں کو اپنے خوارق سے متحیر کرتے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم نعرے لگاتا ساتھ چلتا، لوگ بڑھ بڑھ کر پرچم ہائے سلاسل طریقت کو بوسہ دیتے اور راتب بجالانے والوں کے ہاتھ اور دامن چومتے۔

اس تمام مدت میں شیخ دین محمد اپنے گھر بیٹھے رہتے اور حضرت شیخ بھی کبھی انھیں خانقاہ میں حاضری کا حکم نہ دیتے۔ کئی سال یوں ہی گذرے۔ لیکن ایک بار عرس کے کچھ دن پہلے حضرت شیخ نورالدین الرفاعی نے انھیں اپنے حجرۂ خاص میں طلب کیا اور یوں گویا ہوئے:

''دین محمد، ہم دیکھتے ہیں کہ تم منازل سلوک کے طے کرنے میں ہمہ وقت ساعی رہتے ہو۔ تمھارے قول اور عمل میں مطلق تفاوت نہیں۔ یہ بڑا فضل تم پر اللہ رب العلمین وکریم کا اور بوجہ توجہ و برکات بزرگان دین واولیاے عظام ہے۔''

شیخ دین محمد نے سر جھکا کر ہاتھ باندھ لئے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

''یہ ناکارہ کچھ نہیں۔ سرکار کے آستانۂ عالی کی خورشید نما خاک کی ایک کرن ہے جو اس ذرۂ بے قیمت کو روشن کر رہی ہے۔''

شیخ نورالدین الرفاعی نے ایک لحہ توقف کیا، پھر فرمایا:

''مگر میں ادھر ایک مدت سے مشاہدہ کرتا ہوں کہ تمھاری ترقی کچھ مسدود سی ہو گئی ہے۔''

شیخ دین محمد کی آنکھیں بھر آئیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ مرشد برحق کا یہ ارشاد تہدیدی ہے یا ہمت افزائی کی کوئی راہ نکلنے کی تمہید ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انھوں نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''رہنما بھی آپ ہیں، منزل بھی آپ ہیں۔ میں آپ کے عتبۂ عالی سے اٹھ کر کہاں جاؤں؟''

''بعض رسوم وطرق یہاں کے نظروں میں تمھاری ناپسندیدہ، بلکہ غیر شرعی ہیں۔ اور بات صحیح بھی ہے، اگر سخت متشرعانہ نگاہ سے دیکھا جائے۔''

شیخ دین محمد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا جواب دیں۔ کیا حضرت کے لئے ممکن تھا کہ وہ میری خاطر ان اعمال و مشاغل کو ترک کرا دیتے...؟ اور بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو میں حضرت شیخ اور ان کے مسترشدین کو بھلا منھ دکھانے کے لائق رہوں گا؟ اور میری مجال کیا ہے کہ میں شیخ کے کسی قول یا عمل کو ناقص اپنی عقل پر جانچوں اور تولوں؟ اگر میرا دل مطمئن نہیں ہوتا تو میں ان کا دامن چھوڑ کر کسی دوسرے

کامل کو ڈھونڈوں اور اس کے دربار سے طالب برکت ہوں۔

''بالکل یہی بات ہے۔'' شیخ نورالدین سیف اللہ الرفاعی نے فرمایا، گویا انھوں نے شیخ دین محمد کے دل کی بات سن لی ہو۔ ''اولیا اور پیران پیر کا حکم یہی ہے کہ اگر ایک مرشد کے یہاں کلی دل کی نہ کھلے تو اسے کسی اور کے در پر دستک دینی چاہیئے۔''

''تو کیا حضور مجھے راندۂ درگاہ فرما رہے ہیں؟'' شیخ دین محمد نے تھرا کر کہا۔

''نہیں۔ تم جہاں جاؤ گے ہم تمھارے ساتھ ہوں گے۔ جن باتوں پر طبیعت تمھاری ابا کرتی ہے وہ قدیم الاوقات سے ہمارے بزرگوں کے رائج کیے ہوئے ہیں۔ میں، یا کوئی بھی، تارک سنت اسلاف کا نہیں ہوسکتا کہ نتیجہ اس کا انتشار فی الامت ہوسکتا ہے۔ اور تمھارا دل بسکہ یہاں نہیں ہے، فلہٰذا تمھاری ترقیات بھی رک گئی ہیں۔''

شیخ دین محمد نے بے ساختہ ہمت کر کے شیخ کے قدم لئے اور رو کر بولے:

''سرکار مجھے یوں ہی ظلوم و جہول مر جانے دیں، خود سے جدا نہ کریں۔''

حضرت سید نورالدین سیف اللہ الرفاعی نے پتھر کو پانی کر دینے والی مسکراہٹ مسکرا کر فرمایا:

''ہم اور تم جدا نہ ہوں گے انشاء اللہ۔ لیکن تمھاری شریعت پسند طبیعت کو طریقت کی وہ راہیں زیادہ راس آئیں گی جہاں شریعت اور طریقت کی سرحدیں ایک ہو جاتی ہیں۔ اب جاؤ۔ تمھیں اللہ کو سونپا۔''

اس کے بعد شیخ نورالدین الرفائی نے اپنے کرتے سے ایک دھجی پھاڑ کر شیخ دین محمد کے گلے میں سیلی کی طرح باندھی اور وہ دعا پڑھی جو شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر نے حضرت بابا نظام الدین سلطان جی صاحب کو آخری بار رخصت کرتے وقت پڑھی تھی:

اَسعَدَکَ اللہُ فی الدارینِ و رَزَقَکَ عِلماً نافِعاً و عَمَلاً مَقبولاً (۱)

یہ واقعہ جمادی الاول ۱۲۰۴، مطابق جنوری ۱۷۹۰ کا ہے۔

شیخ دین محمد نے کئی مہینے اطراف پنجاب میں بزرگوں کے مزارات پر گذارے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے سرہند میں بھی کئی دن قیام کیا اور شیخ احمد سرہندی کے مزار مبارک پر کئی دن مراقب رہے۔ حضرت مجدد صاحب کے سلسلے میں احکام شریعت کی پابندی پر اصرار ان کی متشرع طبیعت کو بہت بھلا لگا

(۱) اللہ تعالیٰ تمھیں دین و دنیا کی سعادت نصیب کریں اور نافع علم اور مقبول عمل ارزانی فرمائیں۔

اور ان کا دل مجددی شیوخ کی طرف کھنچنے لگا۔ وہ اسی فکر میں تھے کہ کسی ہادی برحق کا پتہ مل جائے تو اس کے سامنے زانوے عقیدت تہ کریں کہ انھیں شاہ غلام علی صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سرہند میں تشریف فرما ہیں۔ شاہ غلام علی صاحب کو ایک عالم حضرت میرزا مظہر جانجاناں شہید کے اجل خلفا میں شمار کرتا تھا۔ شاہ صاحب قیام تو دہلی میں فرماتے تھے لیکن مجددی سلسلے کے ایک انتہائی نمایاں اور متبرک فرد ہونے کی وجہ سے وہ سرہند بھی اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ شیخ دین محمد نے اپنے نخچیر قلب کو حضرت شاہ صاحب کے فتراک سے باندھ لیا اور انھیں کی طرف اپنا قبلہ راست کر کے ان کے ساتھ ساتھ دہلی آ گئے۔

دہلی میں شیخ دین محمد نے شاہ صاحب کے حکم کی تعمیل میں زینت المساجد کے مدرسے میں معلمی اختیار کی اور شاہ صاحب ہی کے ارشاد کے بموجب ایک غریب بیوہ سے شادی کر کے تاہل اور معاشرے کے بکار آمد فرد کی زندگی گذارنے لگے۔ اپنے شیخ کی نسبت سے وہ خود کو رفاعی مجددی کہنے اور کہلانے لگے۔ شاہ غلام علی صاحب نے دار الفنا سے کوچ فرمایا (۱۸۲۴) تو اس وقت تک شیخ دین محمد دنیاوی اور دینی دونوں اعتبار سے محترم ہو چکے تھے۔ شیخ نور الدین سیف اللہ الرفاعی کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری اتری تھی۔ شیخ دین محمد کو شاہ غلام علی صاحب نے خلیفہ تو نامزد نہ کیا لیکن ایک دن جب مزاج میں خوب بسط تھا، انھوں نے فرمایا اور شیخ دین محمد کو نہال نہال کر دیا:

''میاں دین محمد، تم اور تمھارے پرانے شیخ ہمارے ساتھ ہیں۔''

شیخ دین محمد نے اپنے بیٹے مولوی محمد نظیر کو اچھی تعلیم دلوائی اور انھیں مجددی اور رفاعی دونوں سلاسل میں خود ہی بیعت کیا۔ باپ کی موت کے بعد مولوی محمد نظیر کا حلقۂ ملاقات اور بھی وسیع ہوا۔ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اکبری بائی فرخ آبادی اور ان کے داماد محمد یوسف سادہ کار سے بھی رسم و راہ رکھتے تھے۔ محمد نظیر اب شادی کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور مالی حیثیت ان کی بہت مستحکم تھی کیونکہ رفاعی اور مجددی دونوں سلسلوں کے عقیدت مندوں کا ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ بعض خیر خواہ بیچ میں پڑے اور محمد یوسف سادہ کار کی بڑی بیٹی انوری خانم شریفانہ دھوم دھام سے بیاہ کر مولوی محمد نظیر کے گھر آ گئیں۔ کئی سال بعد اللہ نے انھیں بیٹی عطا کی، چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ امۃ الفاطمہ نام رکھا گیا۔ بڑے نازوں میں پلی لیکن تعلیم اور امور خانہ داری سے بھی اسے پوری طرح بہرہ مند رکھا گیا۔

نواب مرزا اپنے معمولہ پھیرے پر خالہ کے گھر میں موجود تھا۔ فاطمہ سے ہلکی ہلکی معصومانہ چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ بڑی خالہ جان سے بھی وہ اپنے معمولہ سوالات کر رہا تھا:

''بڑی خالہ جان، گھر میں گھی ختم ہو گیا ہو تو لا دوں، آج میرا گذر قدم شریف کی طرف ہوا تو دیکھا کہ وہاں درجنوں میواتی عمدہ قسم کا گھی لئے ہوئے بیچنے کو آئے تھے۔ آپ حکم کریں تو لپک جھپک دو سیر خالص گھی اپنے سامنے تلوا کر کپی بھروا لاؤں۔''

''اے چل ہٹ، ہمیں ایک تو ہی ملا ہے۔ گھی سے کپڑے چیکٹ کرانے کے لئے میرے گھر میں نوکر نہیں ہیں کیا؟'' بڑی بیگم ہنس کر بولیں۔

''اچھا تو آج آزاد پور کی منڈی میں کابل کا سردہ اور گرمہ خوب گرا ہے۔ ابھی چلا جاہوں تو ایسے پھل لاؤں ہوں کہ خالو جان بھی خوش ہو جائیں گے۔''

''اللہ تجھے عقل دیوے۔'' بڑی بیگم نے ویسی ہی شگفتگی سے کہا۔ ''تیرے خالو جان سن لیویں گے کہ میں نے چھوٹی کے لاڈلے کو آزاد پور بازار کرنے کو بھیج دیا تو وہ اللہ جانے میری کیا گت کر ڈالیں گے۔''

فاطمہ نے کچھ شرماتے ہوئے بہت خفیف سے تبسم کے ساتھ کہا، ''اللہ بھائی جان آپ کیا کیا اشقلے چھوڑتے رہتے ہیں۔'' وہ ایک ادا سے ڈوپٹہ منھ پر رکھ کر ہنسی۔ ''یہاں کسی شے کی کمی تو ہے نہیں...''

''جی بہت خوب،'' نواب مرزا نے تڑ سے جواب دیا۔ ''لیکن میں تو ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں...''

فاطمہ شرمائی جا رہی تھی۔ اس فقرے کا جواب اس سے بن بھی نہ سکتا تھا اور وہ اس فکر میں بھی تھی کہ بھائی جان بات ختم کریں تو میں کسی طرح بات بنا کر بات کو ٹال دوں، کہ باہر سے آواز آئی:

''بندگی سرکار۔ پردہ کرا لیں۔ مولانا صہبائی صاحب اور ان کی بیگم تشریف لائے ہیں۔''

بڑی بیگم کچھ گھبرا کر اٹھیں۔ مولوی صہبائی صاحب کی بیگم تو بہت کم کہیں آتی جاتی تھیں، آج کوئی خاص بات ہوگی۔ انھوں نے نواب مرزا سے کہا:

''بیٹے تو جلد دیوان خانے میں مولوی صاحب کو بٹھا، ان کی خوب تعظیم کیجو۔ تیرے خالو صاحب شاہ صاحب کے یہاں گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔ اتنے تو مولوی صاحب سے باتیں کر، میں ابھی ٹھنڈا اور پان بھیجتی ہوں۔ اور چل، تو جلد یہاں سے ہٹ کہ میں پردہ کراؤں۔''

نواب مرزا تو ٹوپی کرتا درست کرتا ہوا بھاگ کر مردانے دروازے پر گیا اور مولوی صاحب کو سلام کر کے ہوادار سے اتار کر بصد تکریم دیوان خانے میں لے آیا۔ اس درمیان اندر سے آواز آ چکی تھی کہ پردہ ہے، اور بیگم صہبائی صاحب کی پالکی زنانہ دروازے پر لگا دی گئی تھی اور چادر کا پردہ چاروں طرف کھنچوا دیا گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے پردے کے پیچھے بڑی بیگم نے ان کا استقبال کیا، اہتمام کے ساتھ آنگن کے پار

اندرونی دالان میں لائیں اور انھیں صدر میں بٹھایا۔ تشریف آوری کی غایت پوچھنا خلاف تہذیب تھا۔ مہمان کو اظہار مدعا میں کتنی ہی دیر لگتی، میزبان کو انتظار کرنا پڑتا اور بظاہر وہ مہمان کی غیر متعلق باتوں پر اس قدر متوجہ رہتا گویا مہمان کی آمد صرف معمولی ملاقات اور دید وادید کی غرض سے ہے۔

صہبائی بیوی کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان تھی، لیکن ان کے بالوں میں کہیں کہیں سے چاندی کے تار چمکتے تھے، شاید مزمن زکام کا اثر رہا ہو۔ لیکن ان کے چہرے سے چونچال پن اور خوش طبعی ٹپکتی تھی۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، ذرا سا دوہرا گداز بدن، بوٹا سا قد، متوسط لیکن روشن آنکھیں، غرض بڑی دلکش اور دلچسپ لگتی تھیں۔ میاں پکے دلی والے تھے لیکن وہ پانی پت کی تھیں اور ان کے لہجے میں تھوڑا سا ہریانوی کڑک پن تھا۔

مولانا صہبائی کو توقع تھی کہ مولوی محمد نظیر موجود ہوں گے۔ یہاں انھیں ان کے بجائے نواب مرزا کو دیکھ کر یک گونہ تردد ہوا کہ نواب مرزا کی موجودگی میں حرف مطلب زبان پر لانا ٹھیک نہ ہوتا۔ یوں وہ نواب مرزا کو پہچانتے تھے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں زینت باڑی کے مشاعرے میں وہ نواب مرزا کی غزل پر خصوصی داد بھی دے چکے تھے۔ سلام دعا کے بعد مولوی صاحب نے فرمایا:

''بھئی نواب مرزا، تم آج خوب ملے۔ تمھاری شعر گوئی کے چرچے ماشاء اللہ پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ ادھر شیخ ناسخ کے ایک سہ غزلہ کے بڑے چرچے رہے۔ پہلی غزل کا پہلا مصرع تھا، کیا بحر حسن کی ہے کمر پیچ وتاب میں۔ وہ سارا ہی سہ غزلہ بہت مقبول ہوا۔''

''جی ہاں حضرت، اس کے تو بڑے شہرے ہیں۔ مطلع اول ہی کیا غضب کا تھا۔

کیا بحر حسن کی ہے کمر پیچ وتاب میں
یہ پیچ وتاب کب ہیں بھلا موج آب میں''

''سبحان اللہ۔'' مولوی صاحب بولے۔ ''میرزا نوشہ نے بھی دو غزلہ کہہ ڈالا اور میاں کیا کیا خیال آرائیاں کی ہیں۔ اجی صاحب زادے تم بھی کچھ فکر کرتے تو لوگ دیکھتے کہ معاملے کے مضمون کیونکر اس زمین میں بندھتے ہیں۔''

نواب مرزا کے چہرے پر مسکراہٹ سی آئی جس میں کچھ چالاکی بھی شامل تھی، اور کچھ یہ تاثر بھی تھا جیسے وہ کسی لطیفے پر دل ہی دل میں ہنس رہا ہو لیکن مولانا اس لطیفے پر مطلع نہیں ہیں۔ لیکن مولوی صہبائی غیر معمولی مشاہدہ اور تیزی ذہن کے آدمی تھے، فوراً سمجھ گئے کہ اس مسکراہٹ میں کوئی رمز ہوگی جو

فی الوقت مجھ پر مخفی ہے۔ لیکن اس وقت مجھے یوں ہی تجاہل برتتا ہے گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔

''جی ہاں حضرت۔ مگر شیخ صاحب مبرور نے ''جواب'' کا قافیہ شاید مبتذل جان کر ترک کیا تھا...''

''اچھا، یہ تو کسی نے خیال ہی نہیں کیا۔''

''جی، اور میرزا نوشہ صاحب نے شاید یہ فرمایا کہ شیخ مرحوم یہ قافیہ ہمارے لئے چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ میرزا صاحب نے شعر فرمایا۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں...''

''ہا! کیا مصرع بہم پہنچایا میرزا صاحب نے...'' مولوی صاحب نے زانو پر ہاتھ مار کر مصرع ثانی پڑھا ع

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

''سبحان اللہ، ایسی وقوعہ گوئی اور ایسی مضمون آفرینی۔'' مولوی صاحب نے بڑے جوش سے پورا شعر دہرایا۔ اتنی دیر میں نواب مرزا کی مسکراہٹ کچھ اور پھیل چکی تھی، لیکن اس نے ابھی کچھ کہا نہ تھا۔ اس کی خاموش مسکراہٹ کو دیکھ کر مولوی صاحب اب معاملے کی تہ کو پہنچ گئے۔

''تو نواب مرزا یہ بات ہے۔ تم نے بھی اس قافیے کو نظم کیا ہے! اچھا ذرا اپنا شعر تو سنا دو۔''

ایک پل کے توقف کے بعد نواب مرزا نے فتح مندانہ لیکن متین لہجے میں پڑھا۔

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں...

''تو تم نے مطلع کیا ہے، خوب۔ اچھا مصرع نکالا۔ پھر سے پڑھو۔'' مولوی صاحب نے کہا۔

نواب مرزا نے پورا شعر ایک عجب روانی کے ساتھ سر جھکائے جھکائے پڑھ دیا۔

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

مولوی صاحب پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئے اور ''ان کی طرف سے آپ لکھے'' بار بار زیر لب پڑھنے اور جھومنے لگے۔ نواب مرزا تو گھبرا گیا کہ یہ کیا حال ہو رہا ہے۔ اس نے دوڑ کر مولانا صاحب کے سامنے ناگر دان کھول کر رکھا، اس میں سے عطر کی شیشی نکالی اور بہت ذرا سا عطر اپنے دستمال پر لگا کر اس دستمال سے مولانا کے ہاتھوں اور کلائیوں پر ہلکی ہلکی مالش کی تا کہ ان کا دھیان بٹے۔ پھر اس نے خاص دان سے طلائی ورق لگی ہوئی گلوری نکال کر پیش کی اور بہت آہستہ سے کہا:

''حضور یہ گلوری تو نوش فرما لیتے۔''

''ایں، کیا کہا؟ گلوری۔ بہت خوب، مگر میاں اپنی طرف سے آپ لکھے... واہ واہ، وقوعہ گوئی اور یہ بے ساختگی اور ربودگی۔ اللّٰھم زد فزد۔ اچھا میاں کچھ اور شعر اسی زمین کے سناؤ، میرا تو جی چاہتا ہے کہ ایسی غزلیں حضرت عالم پناہی ظل الٰہی کی خدمت اقدس میں پیش ہوں...''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نواب مرزا کے خالو مولوی محمد نظیر صاحب رفاعی مجددی تشریف لے آئے۔ نواب مرزا انھیں دیکھ کر انھیں اور مولوی صاحب کو سلام کر کے بھاگنا چاہتا تھا لیکن مولوی صاحب نے کہا، ''صاحب زادے وہ اپنے شعر تو سناتے جاؤ۔ مولوی صاحب، ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ آپ کے بھانجے صاحب کی طبیعت میں کس قدر آمد ہے اور کیا پاکیزہ مضامین ہیں، کیا شستہ زبان ہے۔''

نواب مرزا کو خالو جان سے بہت خوف لگتا تھا، در حالے کہ وہ اس کے ساتھ ہمیشہ بہت شفقت کرتے تھے، لیکن ان کے تقدس اور متانت سے اسے خوف لگتا تھا کہ کوئی ذرا سی بھی ہلکی یا خلاف مزاج بات مجھ سے سرزد ہو گئی تو خالو جان ناراض ضرور ہوں گے۔ ان کے سامنے شعر سنانے سے وہ ہمیشہ بھاگتا تھا۔ لیکن اب اس نے کوئی چارہ نہ دیکھا تو طبیعت کو مضبوط کر کے ٹھہرے ہوئے لہجے اور کھلی ہوئی آواز میں اس نے کہا، ''مطلع عرض کرتا ہوں۔'' اور پھر پڑھا۔

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

مولانا صہبائی تو حسب سابق وجد میں آ گئے، لیکن مولوی محمد نظیر کے بھی منھ سے ''اے سبحان اللہ! پھر پڑھو'' کا فقرہ بے ساختہ ادا ہو گیا۔ نواب مرزا نے سلام کر کے مطلع دوبارہ پڑھا، پھر ہاتھ جوڑ کر کہا، ''آپ بزرگوں سے عفو کا خواستگار ہوں۔ اگلے شعر کچھ ذرا شوخ ہو گئے ہیں۔'' مولوی محمد نظیر تو چپ رہے لیکن مولانا صہبائی نے کہا، ''ہاں پڑھو، پڑھو۔ شوخی تو شعر کا نمک ہے۔''

نواب مرزا نے پڑھنا شروع کیا۔

کچھ شان مغفرت سے نہیں دور زاہدو
ڈوبیں گناہ بادہ کشوں کے شراب میں

مولانا صہبائی نے شعر پر ''ماشاء اللہ، کیا زبان ہے! کیا مضمون ہے!'' وغیرہ ارشاد کیا لیکن مولوی محمد نظیر صاحب صرف مسکراتے رہے۔ اب تو نواب مرزا کی ہمت اور کھلی، اس نے کہا، ''حضور، اسی

قافیے کو ایک اور پہلو سے نظم کیا ہے۔'' پھر اس نے شعر پڑھا۔

اے شیخ جو بتائے مئے عشق کو حرام
ایسے کو دو لگائے بھگو کر شراب میں

اس شعر پر مولوی محمد نظیر رفائی مجددی بھی اچھل پڑے۔ ''واللہ کیا جواز شرعی پیدا کیا!''

''محاورے میں تھوڑا سا تصرف کیا تو لطف مزید ہو گیا۔ خوب۔'' صہبائی نے کہا۔

نواب مرزا نے اگلا شعر پڑھا۔

پیر مغاں کی دل شکنی کا رہا خیال
داخل ہوا ہوں توبہ سے پہلے ثواب میں

''بھئی تم نے یہ شعر تو حکیم مومن خان صاحب کے رنگ میں کہہ دیا، اگرچہ خوب کہا۔ کسی کی دل شکنی نہ کرنا کار ثواب ہے۔'' مولانا صہبائی نے کہا۔

''مقطع حاضر خدمت کرتا ہوں۔'' نواب مرزا نے کہا اور شعر پڑھا۔

اے داغ کوئی مجھ سا نہ ہوگا گناہ گار
ہے معصیت سے میری جہنم عذاب میں

اس شعر پر دونوں صاحبوں نے یکساں داد دی۔ مولوی صہبائی نے اپنے دل میں کہا کہ اس لڑکے نے طبیعت کیا غضب کی پائی ہے۔ جس منصوبے کو لے کر میں یہاں آیا ہوں وہ بیل اگر منڈھے چڑھ جائے تو اسے حویلی کا اعلیٰ ماحول اور تربیت حاصل ہو جائے گی۔ پھر تو اس کے جوہر قابل اور بھی چمکیں گے... اب فیضی اور ابوالفضل اور ٹوڈرمل نہ سہی، لیکن اس دربار کو بھی اپنے نورتنوں کی قدر معلوم ہے۔ بادشاہ سلامت کا بس نہیں چلتا کہ اپنے دربار کے شعرا و حکما کو لعل و گہر سے نہال کر دیں۔

نواب مرزا نے قرینے سے سمجھ لیا کہ اب مولانا صہبائی اور خالو جان صاحب کو تخلیہ درکار ہوگا۔ لہٰذا وہ آداب و تسلیمات ادا کر کے رخصت ہوا۔ اس کے جی میں چینک تھی کہ جانے سے پہلے فاطمہ کو ایک جھلک دیکھ لیتا لیکن توبہ ہے وہاں تو پردے کا وہ اہتمام تھا کہ پرندہ پر نہ مار سکتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں لگاوٹ بھرے لہجے میں ''خدا حافظ، کل ملیں گے'' کہا اور اپنے گھر کو چل دیا۔

ادھر اندرون حویلی دونوں بیگمات نے حسب دستور شرفا پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں کیں، فاطمہ کا ذکر آیا کہ اب ماشاء اللہ اس کے ہاتھ پیلے ہونے کے دن ہیں۔ نواب مرزا کی طرف بھی اشارہ ہوا لیکن بہت احتیاط

سے، کہ کہیں بیچ کی بات کچھ اور نہ ہو۔ یہ سب قصے بیان ہو چکے تو مولوی صہبائی صاحب کی بی بی نے کہا:

''اے بوا ہم خدا جانے کتنی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمھیں اللہ رکھے سینکڑوں کام ہوں گے۔ پتہ نہیں مولوی نظیر صاحب تشریف لائے کہ نہیں، ان کی ملاقات مولانا جی سے ہو جائے تو میں تم سے رخصت لوں۔''

''نہیں نہیں آپ کو آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ آئی تھیں تو گھر میں جو روکھا سوکھا میسر ہے اسے نوش کر لیتیں۔ اور ہمارے مولوی صاحب تو گھڑیاں گذریں آچکے۔ اندر سے پان شربت بھجوایا جا چکا ہے۔ بی نصیبا نے بتایا کہ میاں نواب مرزا شعر سنا رہے ہیں، خوب خوب تعریفیں ہو رہی ہیں۔'' بڑی بیگم نے بھانجے کی شاعرانہ لیاقت کے بارے کچھ فخریہ لہجے میں بتایا۔

''اجی واہ، کیا ہونہار اور خوش اطوار لڑکا ہے۔ اللہ اسے سلامت رکھے...'' صہبائی بی بی ایک پل ٹھہریں، پھر ذرا جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولیں، ''اکبری خانم، ایک بات ہے، ذرا دھیان سے سنو۔''

''جی، کہیئے کہیئے، میں سن رہی ہوں۔''

صہبائی بی بی نے کچھ اور قریب آکر اور بھی سرگوشی کے لہجے میں کہا، ''چھوٹی کے لئے ایک رشتہ ہماری نظر میں ہے۔''

اکبری خانم سناٹے میں آگئیں۔ وہ دل سے چاہتی تھیں کہ چھوٹی کہیں پار گھاٹ لگ جائے، لیکن وہ تو پٹھے پر ہاتھ ہی نہ رکھنے دیتی تھی۔ اور اس کے لئے رشتہ کہیں باہر سے آئے گا اور مولانا صہبائی کا پاؤں درمیان ہوگا، یہ تو انھوں نے کبھی خواب میں نہ سوچا تھا۔ لیکن کیسا ہی رشتہ ہو، چھوٹی تو شاید نہ ہی کر دے گی۔ انھیں بہت تردد ہوا کہ کیا جواب دیں۔ وہ کچھ دیر چپ رہ کر مصنوعی جوش و اشتیاق سے بولیں:

''ارے واہ۔ جو میرے من میں سو بامھن کی پوتھی میں۔ اس سے بڑھ کر کیا نصیب ہوں گے چھوٹی کے کہ آپ اس کا رشتہ لے کر آئیں۔''

''یہ رشتہ میں نہیں لائی ہوں بہن۔ حویلی سے بات آئی ہے، ہم تو صرف کارندے ہیں۔''

بڑی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ''حویلی سے؟ کس کی حویلی سے پیغام ہے؟ کون لوگ ہیں وہ؟''

''اے بی بی دلی میں ایک ہی تو حویلی ہووے ہے۔ وہ لوگ پیغام نہیں دیتے ہیں، مرضی پچھواتے ہیں پھر باقی باتیں طے ہو جاتی ہیں۔''

''تو کیا... کیا... ظل الٰہی کے در دولت سے کسی سلاطین زادے یا شہزادے...؟''

''بس یوں ہی سمجھ لو۔ فرق یہ ہے کہ صاحب عالم و عالمیان میرزا فخرو بہادر ولی عہد سوئم تمھاری بہن کے خواہاں ہیں۔''

میرزا فخرو بہادر ولی عہد سوئم! بڑی بیگم کو مدتوں کی بھولی بسری بات یاد آئی۔ ہائے ایک عمر بیت گئی لیکن چھوٹی کے انداز وہی ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا تھا، شہزادہ قسمت میں ہوگا تو آئے گا ہی، میں کسی ایسے ویسے کو منھ نہیں لگاتی۔ اور آج وہ بات سچ ہوئی جاتی ہے۔

''اے بہنا یہ منھ کھولے مجھے کاہے کو تک رہی ہو۔ کچھ منھ سے بولو۔'' صہبائی بی بی کے بھی دل میں ڈر تھا کہ اگر انکار ہوگیا تو ولی عہد سوئم بہادر کو کیا منھ دکھائیں گے۔ ان کی خفگی الگ مول لینی پڑے گی۔

''مجھے تو یہ رشتہ دل و جان سے منظور ہے بہن۔ پر چھوٹی کی مرضی معلوم کیئے بغیر میں قول نہیں دے سکتی۔ آج کل چھوٹی کا دل ان باتوں میں نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں اس نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔''

''اے بہن تو اسے سمجھاؤ نہ کہ اب اس کے سکھ کے دن آگئے۔ قلعے میں ولی عہد سوئم کی بیگم بن کر راج رچے گی۔ اور زمانے کے انقلابوں کا کیا ہے۔ کیا پتہ کل کلاں میرزا فخرو بہادر ہی ولی عہد اول اور پھر اللہ رکھے بادشاہ بن جائیں۔ پھر تو تمھاری بہن ہندوستان کی ملکہ کہلائے گی۔''

''میں ہر طرح سے تیار ہوں بہن۔'' بڑی بیگم نے کہا۔ ''میں ابھی سوار ہو کر چھوٹی کے یہاں جاؤں گی۔ لیکن ذری اپنے مولوی صاحب سے بھی پوچھ لوں کہ ان کی کیا رائے ہے۔''

''ان سے بھی پوچھ لیجو،'' صہبائی بی بی نے جواب دیا۔ ''لیکن اصل بزرگ تو تم ہو اور اصل معاملہ تو ان ہنو کا ہے۔ ان سے کہو اپنا سوجھتا کریں۔ یہ دنیا ہے۔ ایسا اچھا دولہا تو شہزادیوں کو بھی نصیب نہ ہووے۔''

پردہ کرایا گیا اور مولوی محمد نظیر صاحب اندر آئے، اپنی بیوی کے حجرے میں کچھ دیر تک انھوں نے گفت و شنید کی۔ پھر وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکلے، ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی:

''تو ٹھیک ہے بیوی، میں مولانا صہبائی کو تمھارا عندیہ بتائے دیتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

''جی ہاں۔ لیکن آپ مولوی صہبائی جی سے دعا کے لئے کہیں اور خود بھی دعا کریں کہ یہ بیل منڈھے چڑھ جائے۔''

''انشاءاللہ۔ ہم سب دعا کریں گے۔ تم اطمینان رکھو۔''

مولوی محمد نظیر کے باہر جاتے ہی صہبائی بیوی اٹھ کھڑی ہوئیں اور آنچل پھیلا کر قبلہ رو

ہوئیں۔ پھر انھوں نے دعا مانگی:

"اے اللہ اپنے حبیب کے صدقے یہ بات پوری ہو جاوے۔ ہماری بات رکھ لی جاوے اور چھوٹی بیگم اس رشتے میں پھولیں پھلیں۔"

بڑی بیگم پر رقت طاری ہو گئی۔ انھوں نے ڈوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے آمین کہی اور تھوڑا سا صندل کا برادہ لے کر صہبائی بیوی کی مانگ میں افشاں کی طرح چھڑک دیا۔

"بہن اللہ آپ کو اس نیکی کا اعلیٰ سے اعلیٰ اجر دے گا۔ میں جب تک جیوں گی آپ کا احسان مانوں گی۔" ان کی آنکھیں پھر چھلک آئیں۔ "آپ لوگوں کے مبارک ہاتھ میری بہن کی ناؤ کے پتوار بن جائیں گے تو اسے کسی طوفان کا ڈر نہ رہے گا۔"

"بی بی یہ تو آدمی گری کی بات ہے جو ہم کر رہے ہیں، اس میں احسان کا ہے کا؟ بس اللہ سے دعا کرو کہ جلد از جلد یہ کام بخوبی انجام پا جاوے۔ ان دنوں حاسدوں کا زور بہت ہے۔" پھر ادھر ادھر دیکھ کر وہ جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولیں۔ "اور دیکھیو، نواب زینت محل تک بات بالکل نہ پہنچے۔"

بڑی بیگم نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "اے بہن وہ لوگ کہاں اور ہم کہاں۔ یہاں سے ان تک بھلا کون خبر لے جاوے گا..."

"شش! دیوار ہم گوش دارد... اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تمھارے مولوی جی بچارے کب تک ہمارے مولانا کی خاطرداریاں کریں گے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ پر میں آج ہی سوار ہو کر چھوٹی کے وہاں جاؤں گی۔"

"اچھا تو پھر ایک دو دن میں سب معاملہ طے تمام کر لو۔ نیک کام میں دیر کیسی۔"

"نہیں کوئی دیر نہ ہونے پاوے گی۔ بس چھوٹی کی مرضی ہونا چاہیے۔"

"اے وہ تو سب سے ضروری ہے، ہم بھی سمجھتے ہیں کہ چھوٹی کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔ لیکن بی بی یہ بات تم اسے ضرور ہی خوب سا سمجھائیو کہ اللہ میاں ان کے دن پھیرنا چاہتا ہے سو وہ کفران نعمت نہ کریں۔"

صہبائی بی بی نے بدن پر چادر لپیٹی، بڑی بیگم کے گلے لگیں اور بندگی کر کے دروازے کی طرف مڑیں۔ ادھر پردے کا پورا انتظام تھا، میاں ہوادار میں سوار ہو چکے تھے، بیوی بھی بہ سہولت پالکی میں بیٹھ کر عازم خانہ ہوئیں۔ اکبری خانم نے شام کے لئے پالکی منگوانے کی ہدایت دے کر مصلیٰ بچھایا اور کچھ وظیفہ پڑھنا شروع کیا۔

بائی جی

یہ ایک عورت تھیں با کمال، شہر شاہجہاں آباد کے باہر قریب عیدگاہ قدیم کے چھپر میں تمام عمر بسر کر دی۔ معلوم نہیں کہ اصل نام کیا تھا لیکن لوگ ''بائی جی'' کے نام سے مشہور کرتے تھے۔ اثنائے کلام میں اکثر آیات قرآنی جاری ہوتی تھیں، خصوصاً انا اعطینک الکوثر۔ دیکھا کہ جب کوئی اپنے مطلب کے واسطے ان کے پاس گیا تو ستر کوڑیاں اس مال سے جوان کے پاس لے جاتا، علٰحدہ کر کے ستر دفعہ زمین پر رکھ کر کے زمین سے اٹھاتیں اور ہر دفعہ آیت انا اعطینا کی پڑھتی جاتیں اور بعد میں جو کچھ دل میں آتا سائل کو کہہ دیتیں۔ لیکن قدرت الٰہی کا تماشا کرنا چاہیئے کہ جو اس وقت ان کی زبان سے نکلتا بعینہٖ وہی امر بے کم و کاست وقوع میں آتا۔ قریب ایک سال کے ہوا کہ جہان فانی سے رحلت کی۔

جواد الدولہ سید احمد خان بہادر، ۱۸۴۷

ماخوذ از ''مقالات سرسید''، جلد ۱۶، مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل پانی پتی

بڑی بیگم کو توقع تھی کہ مغرب کے پہلے پہلے چھوٹی کے یہاں پہنچ جاؤں گی، لیکن خانم کے بازار میں چھوٹی کے گھر سے ذرا دور اچانک اس کی پالکی کے ایک کہار کے پیٹ میں شدید درد اٹھا اور وہ پالکی چھوڑ کر سر راہ گھٹنوں کو پیٹ کی طرف موڑ کر اور سر جھکا کر بیٹھ گیا اور ابکائیاں لینے لگا۔ لیکن مزدور پیشہ شخص کو بدہضمی کہاں ہوتی ہے۔ استفراغ کی ساری کوششیں بیکار گئیں تو ایک دوکاندار نے ازراہ انسانیت کسی عطار کے یہاں سے کوئی جوارش یا معجون لا کر اسے چٹایا تو چند لمحوں کے بعد اس کی طبیعت کچھ ٹھہری۔

پھر بھی، اس نے خود میں پالکی اٹھانے کی ہمت نہ دیکھی۔ تین کہاروں سے پالکی اٹھ نہ سکتی تھی لہٰذا وہ اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ کر آہستہ قدم اپنے گھر چلا گیا کہ چیلوں کے کوچے سے ابھی ایک کہار بھیجتا ہوں۔ بڑی بیگم پالکی کے اندر بیٹھی خود سے الجھتی رہی کہ کس بری ساعت میں گھر سے نکلنا ہوا تھا۔ وہ گھبرا بھی رہی تھی کہ کہیں یہ کوئی برا شگون نہ ہو، آج مدتوں بعد وہ ایسے کام پر نکلی تھی جسے صحیح معنی میں مہم قرار دیا جا سکتا تھا اور جس میں اس کی کامیابی اس کی بدنصیب چھوٹی بہن کی تقدیر دوبارہ چمک سکتی تھی۔ سرراہے یوں پالکی میں بند بند انتظار کی گھڑیاں کاٹنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا لیکن انتظار کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ اسے یہ بھی فکر لگی ہوئی تھی کہ اگر نئے کہار کو آنے میں بہت دیر ہوئی تو مغرب کی نماز قضا ہو سکتی تھی۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ بارے نیا کہار گھڑی بھر میں دوڑتا ہوا آپہنچا اور چاروں کہاروں نے تیز قدم اپنا سفر دوبارہ آغاز کیا اور بات کی بات میں بڑی بیگم کو چھوٹی کے دروازے پر لا اتارا۔ اس وقت ہر طرف مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں اور وزیر آبدار خانے میں وضو کر رہی تھی۔ بڑی کے آنے کی خبر سن کر وہ یوں ہی باہر نکل آئی کہ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں اور کہنی سے کچھ اوپر تک کے بازوؤں کی سلونی اور سڈول گولائیاں سرمئی شعلوں جیسی لگ رہی تھیں۔ ماتھے اور ٹھوڑی پر وضو کے پانی کی بوندیں فالسے کے شربت جیسی بہار دکھا رہی تھیں۔ بڑی بڑی پلکوں پر ایک آدھ بوندیں آ کر ٹھہر گئی تھی گویا چلمن مژگاں سے گلستان رخسار میں تاک جھانک کر رہی ہو۔ اکبری خانم جب بھی وزیر کو دیکھتی تھی اسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی چھوٹی بیگم ہے جو سولہ سال کی ہوتے ہوتے ماں بن چکی تھی اور جس کے گلشن آغوش میں اللہ رکھے ایک چھوڑ چار چار گلاب کھل چکے ہیں۔ اور یہ نہ تھا کہ بڑی بیگم کو وزیر اس لئے کمسن لگتی تھی کہ دونوں میں چھوٹائی بڑائی تھی۔ سچ پوچھئے تو ان کی عمروں میں تفاوت کچھ ایسا نہ تھا لیکن اس زمانے کے اعتبار سے اتنا فرق بھی بہت تھا اور وزیر کو اس فرق کا لحاظ بھی تھا۔ لیکن وزیر کی جنت حسن ہمیشہ اس قدر یکساں کیونکے تھی، اس کا جواب بڑی کے پاس نہ تھا۔ وہ اسے قدرت خدا کا ایک کرشمہ ہی سمجھنے پر مجبور تھی۔ اور اس پر طرہ، بلکہ طرۂ شاہی، وزیر کے چہرے کی تمکنت اور تیج کہ جس کے سامنے ولیم فریزر جیسے جہاندیدہ بھی چکاچوندھ ہو گئے تھے، اکبری خانم نے اب تک کسی اور لڑکی یا عورت کے منہ پر خودداری اور حفظ توقیر اور حجاب و پاس وضع کی ایسی ٹھنڈی پھوار برستے نہ دیکھی تھی۔ لگتا تھا یہ حسینہ کسی کے رعب یا دباؤ میں آنے والی نہیں، خود اس کا احساس حسن اس درجہ تکملیت آگیں ہے کہ کسی مدافعت یا تحفظ کے تصور کو جگہ نہیں مل سکتی۔

اس شام بھی جب اکبری خانم نے چھوٹی کو دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے صل علیٰ نکل گئی۔ ادھر بڑی بہن کو، جس کی شفقتوں کی وہ ہمیشہ متمنی و مشتاق رہی تھی، غیر متوقع طور پر اپنے دروازے دیکھ کر وزیر بھی خوشی سے بے حال ہوگئی اور سارا تکلف بالائے طاق رکھ کر بڑی سے لپٹ کر بولی:

''ہائے اللہ بڑی باجی آپ ادھر کیسے بھول پڑیں! زہے قسمت۔ مگر مجھے بلوا لیا ہوتا، دونوں وقت ملتے ہیں۔ اس وقت تو آپ گھر سے نکلتی نہیں ہیں...''

''بس چپ کر، پہلے اپنے مکھڑے کو دیکھ۔'' بڑی نے وزیر کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا سونا سلونا منھ ہوگا تو اسے دیکھنے کو جی چاہے گا ہی۔ چل جلدی سے نماز پڑھ لیں، پھر باتیں ہوں گی۔''

''مگر تم اس وقت اچانک کیسے...'' وزیر نے کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا'' ...بھائی جان تو ٹھیک ہیں؟ فاطمہ کیسی ہے؟''

''اے ہے دھیا، زبان ہے کہ کترنی سی چلی جاتی ہے۔ بابا سب خیریت ہے ابھی پورا حال بتاؤں گی۔ پہلے جلدی سے وضو کرلوں، نماز پڑھ لوں...''

اتنی دیر میں حبیب النسا سلام کرتی ہوئی پانی سے بھرا آفتابہ لے آئی اور بولی:

''بڑی بیگم صاحب آپ یہیں دالان میں وضو کر لیں، چوکی بھی پاس میں بچھی ہوئی ہے۔ آپ نماز گزار لیں، اتنے میں شربت بنا کر حاضر کرتی ہوں۔''

''ہاں لاؤ وضو اور نماز تو یہیں کیے لیتی ہوں۔'' اکبری خانم نے مسکرا کر کہا۔ ''شربت کی دیکھی جائے گی۔''

وزیر سلام پھیر کر اٹھنا چاہتی تھی کہ بہن کی کچھ ضیافت کا انتظام کرے لیکن بڑی کی آنکھ کا اشارہ پا کر وہ اندر حجرے میں چلی گئی۔ بڑی بیگم بھی بعد مغرب کے وظیفے اپنے ختم کر کے اندر آ گئیں اور دروازہ انھوں نے بند کر لیا۔

''اللہ خیر تو ہے بڑی باجی تم...''

''شش! بڑی نے وزیر کو بالکل اپنے پاس کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چپ، دھیان سے سن، ابھی کچھ کہیو نہیں۔''

وزیر کی شربتی آنکھوں میں الجھن کے آثار جھلکے لیکن وہ سعادت مندانہ آ کر بڑی بہن سے پہلو ملا کر بیٹھ گئی۔ ایک لحظہ چپ رہ کر، گویا اپنی سانس برابر کر رہی ہو، اکبری خانم نے ساری بات وزیر کو

بتادی۔ اس وقت بڑی کی گفتگو میں وہ روانی اور خود اعتمادی نہ تھی جو عموماً اس کے لہجے کا حسن تھی، گویا کوئی خوش الحانی لیکن دھیمی آواز میں تلاوت کر رہا ہو۔ اس کے دل میں ڈر تھا کہ وزیر شاید نکاح کی تجویز نہ مانے، نواب شمس الدین احمد مرحوم والا معاملہ کرنا چاہے... اسے خبر نہ تھی کہ وزیر کو نواب شمس الدین ہر طرح مطلوب تھے، ورنہ نکاح کی متمنی تو وہ بہر حال تھی... دوسرا خوف اسے یہ تھا کہ وزیر شاید نکاح ہی نہیں، کسی بھی قسم کے تعلق سے انکار کر دے اور کہے کہ میرا دل اب ان باتوں سے بھر گیا مجھے اب اوڑھنی اپنی میں منھ چھپا کر کسی کونے میں پڑ رہنا ہی اچھا لگتا ہے...

وزیر کو چپ کسی خیال میں گم سا دیکھ کر بڑی کے دل کا ہول اور بھی بڑھا۔ اللہ جانے کس گھڑی میں یہ بات اٹھی تھی، اب خدا ہی ہے جو میری بات کی پچ رکھ لے۔ لیکن وزیر کا تذبذب کسی اور وجہ سے تھا۔ اسے اپنے بیٹوں کی فکر تھی، مگر وہ اس بات کا تصفیہ اپنے دل میں کرنے سے خود کو معذور پاتی تھی کہ پہلے بیٹوں کے بارے میں بات اٹھائے یا پہلے پیام نکاح کا جواب اثبات میں دے اور پھر بچوں کا سوال پیش کرے۔ یہ بات کہ اس عمر میں بھی وہ کسی کی منظور نظر ہو سکتی تھی، اور وہ بھی ولی عہد سوئم جیسے والا مرتبت شخص کی، اس کے لئے کسی خاص اطمینان یا مباہات کا باعث نہ تھی۔ اسے اپنے بارے میں نفس مطمئنہ حاصل تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس کی خوبصورتی ماہ و سال اور وقت و مقام کی پابند نہ تھی، اور یہ بھی کہ خوبصورتی صرف متناسب الاعضا ہونے یا ناک نقشے کی درستی کا نام نہیں۔

''بی بی کچھ بول تو سہی، کیا گھر پسند نہیں ہے؟'' بڑی نے ماحول میں کچھ ظرافت کی لہر دوڑانے کی کوشش کی۔

بالآخر وزیر نے مہر سکوت توڑی:

''بڑی باجی ہمارے اوپر تمھارے احسانات اتنے ہیں کہ ہم ان کا بدلہ اتار نہیں سکتے...''

بڑی بیگم گھبرائیں کہ یہ تو انکار کی تمہید معلوم ہوتی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ وزیر نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روکا اور کہا: ''ایسا پیغام کسے قبول نہ ہوگا۔ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے اور تمھاری محبت اور دلداری کہ ہمیں اس لائق سمجھتی ہو۔ پر ہمیں سوچنے کا کچھ موقع چاہیئے۔ اچانک اتنی بڑی خبر سن کے، مانا کہ وہ ایک طرح کی خوش خبری ہی ہے، میرا جی بیٹھنے لگا ہے۔''

''اے ہے بنو بی، اس میں جی بیٹھنے کی کیا بات ہے۔ ابھی تیرے آگے پوری ڈھنڈھار عمر پڑی ہے، ان بیہڑ راہوں پر چلنے کے لئے کوئی تیرا ہاتھ پکڑنا چاہے، اور وہ کون، ہندوستان کا شاہزادہ جو

کبھی تخت کا مالک بھی ہو سکتا ہے، تو غور و تامل بے شک ضروری ہے پر ڈرنے یا جی چھوڑنے کی تو کوئی بابت نہیں۔''

وزیر نے گہرا سانس لیا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی، ''ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس۔ نہ جانے آگے ہمارے جوگ بیوگ میں کیا لکھا ہے۔''

''آگے کا حال تو اللہ ہی جانے ہے پر ابھی جو باتیں نظر کے سامنے ہیں وہ تو امید سے بھری ہوئی ہیں، کہ نہیں؟''

''ہاں پر اب تک تو سارے گلابی رنگ وقت آنے پر کالک پتے ہی نکلے ہیں۔ خیر، یہ شکوے تو اللہ میاں سے ہیں اور عمر بھر کے ہیں۔ اور تم سچ ہی کہتی ہو، کیا جانے اسی خلطے میں کچھ خوبی پنہاں ہو۔ ہائے میرے اللہ میں کیا کروں۔''

اگر بڑی بیگم کو یہ توقع تھی کہ ولی عہد سوئم بہادر کی نکاحی بننے کے امکان کی صورت دیکھ کر چھوٹی پھولی نہ سمائے گی تو انھیں چھوٹی کی باتیں سن کر اور اس کا حال دیکھ کر بہت مایوسی، بلکہ کچھ جھنجھلاہٹ بھی ہوتی۔ لیکن ان کے دل میں خود ہی چور تھا کہ وزیر کی روح میں بھری ہوئی نارسائیوں اور لبِ بام پہنچ کر شکستگیِ کمند کی کڑوی بوندیں اسے کسی نئی مہم حیات کی طرف مائل نہ کریں گی۔ بہت سوچ کر وہ چھوٹی کو کچھ جواب دینا چاہتی تھی کہ وزیر پھر بولی:

''بڑی باجی۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ اپنا گھر آباد کر کے اپنے بچوں کو اجڑ جانے دوں یا ان سے پیٹھ موڑ لوں، یہ کیوں کے ہو سکے ہے؟''

''بچوں کے بارے میں سوچیں گے، ابھی ان لوگوں نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی ہے۔ لیکن اگر رکھی بھی تو کیا ہوا۔ اللہ رکھے نواب مرزا کچھ دن میں شادی بیاہ کر کے اپنا گھر الگ بسائے گا، اور شاہ محمد آغا صاحب کو میں رکھ لوں گی۔''

''نہیں۔ بچوں کو چھوڑنا میرا ہی منصب مقرر ہوا ہے کیا؟ اور تم خود ہی کہتی ہو کہ نواب مرزا کی اب شادی بیاہ کی عمر ہے۔ بھلا مجھ بوڑھی کو یہ کیونکے سوہے گا کہ جوان بیٹا گھر میں ہو اور میں بڈھی اپنا بیاہ رچاتی پھروں؟''

''بی بی۔ نہ تو بڈھی ہے نہ ہی بیاہ رچا رہی ہے۔ بڈھی ہوتی تو ولی عہد تیرا خواہاں کیوں ہوتا۔ اور بیاہ رچانا، قرآن کے سائے میں ڈولا چڑھنا، بابل گیتوں کے شور میں آنکھیں پونچھتی ہوئی بدا ہونا، یہ

سب تیرے کام نہیں۔ تیرے لئے تو اللہ کی طرف سے نئی راہ کھل رہی ہے جو تجھے سیدھے لاہوری دروازے سے ہوکر حویلی میں لے جاتی ہے۔"

"پھر بھی۔ نواب مرزا سے تو پوچھنا ہی ہوگا۔"

"ضرور پوچھو۔ کوئی ایسا کام تیرے شایان نہیں جس میں بڑے بیٹے کی مرضی نہ شامل ہو۔ اور رہی دوسری بات..." بڑی بیگم کچھ کہتے کہتے رک سی گئیں۔

"دوسری بات کون سی؟" وزیر نے بڑی بیگم کو چپ دیکھ کر اسے بولنے پر مائل کرنے کی کوشش کی۔

اکبری خانم کو نواب مرزا دل سے پسند تھا۔ فاطمہ کے بارے میں بھی انھیں اندازہ تھا کہ وہ بھی نواب مرزا کو پسند کرتی ہے۔ اور فاطمہ کے اوپر نواب مرزا کی پروانگی تو اس پر خوب عیاں تھی، چھوٹی بھی شاید نواب مرزا کے احوال دلی سے بے خبر نہ تھی۔ لڑکے والی ہونے کی حیثیت سے نسبت اور نکاح کے باب میں سلسلہ جنبانی چھوٹی کی طرف سے ہونی چاہیئے تھی۔ لڑکی والی کی طرف سے رشتے کی بات یا اشارہ ہونے کے بالمقابل تو بڑی بیگم بیٹی کا گھر بیٹھے رہنا اور اپنی جگہ پر مرجانا بہتر سمجھتی تھیں۔ لیکن اس وقت عجب مرحلہ آپڑا تھا۔ چھوٹی کو میرزا فخرو کے ساتھ نکاح پر راضی کرنا بہت ضروری تھا اور اسی ضمن میں یہ بات آپڑی تھی۔ نہ معلوم چھوٹی کے دل میں کون سا تکلف، کون سی غیریت پنہاں تھی کہ وہ ایسے موقعے پر بھی نواب مرزا کی نسبت کے بارے میں کوئی اشارہ نہ کر رہی تھی۔ بہت تامل کے بعد اکبری خانم نے کہا:

"اے دوسری بات کون سی ہوتی۔ تو ہی تو نواب مرزا کی بابت کہہ رہی تھی کہ اب ان کی بارات چڑھنے کے دن ہیں۔"

اب وزیر کے چپ ہونے کی باری تھی۔ سوچ سوچ کر اس نے کہا۔ "جی تو میرا بہت چاہتا ہے... پر یہی سوچتی ہوں کہ کہیں نوکری سے لگ جائے یا شاعری ہی کچھ ٹھکانے کا ہو چلے تب تم سے ایک بات اس کے باب میں کہتی۔"

بڑی بیگم کی جان میں جان آئی۔ بات کو حسب دلخواہ بڑھانے کے لئے ایک راستہ کھل گیا تھا۔ "بھئی ہم تو سمجھتے ہیں لڑکا ذات کا سبھاؤ اور گھر بار دیکھا جاتا ہے۔ رہا بسر اوقات کرنے کے لئے، تو اللہ کا دیا ہمارے گھر میں بہت کچھ ہے۔"

وزیر کا منھ خوشی سے تمتما گیا۔ "تو تمھیں اس بات کا کوئی خیال نہ ہوگا کہ لڑکا کماؤ نہیں؟"

''ہمیں جو مطلوب ہے اس کا ذکر ہم نے کر تو دیا ہے بی بی۔ نواب مرزا جیسے تمھارا بیٹا ہے ویسے ہمارا بھی ہے اور فاطمہ جیسے ہماری بیٹی ہے اسی طرح تمھاری بھی ہے۔ نہ گھر بدلیں گے نہ دل بدلیں گے۔ بس ہمارے مولوی جی سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ وہاں بھی سب باتیں میں ٹھیک کرا دوں گی۔'' بڑی بیگم اپنی مخصوص ہلکی سی ہنسی ہنسیں، قلقل مینا جس نے دیکھی ہو وہ بڑی کی ہنسی سے اس کا کچھ اندازہ کرسکتا تھا۔

''تمھاری طرف سے بلاوا تو آئے۔ مگر تم تو گنبد میں بسم اللہ کے گم سم بیٹھی ہوئی ہو۔''

''نہیں بڑی باجی، میں تو دل و جان سے فاطمہ کو چاہتی ہوں اور مجھے لگتا ہے نواب مرزا بھی بہت خوش ہوں گے، بس میرا ہیاؤ نہ کھلتا تھا۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے، میرے سینے سے ایک بڑا بوجھ تم نے اتار لیا۔''

اکبری خانم نے دوبارہ چھوٹی کی بلائیں لیں اور کہا۔'' میری بچی۔ اللہ تجھے خوش رکھے اور تیری ہر بات موسم بہار اور چمپا کے جھاڑ کی طرح کھلے اور پھولے پھلے۔ انشاء اللہ دونوں باتیں بہت جلد عمل میں آجائیں گی۔''

''لیکن بڑی باجی مجھے سوچنے اور نواب مرزا سے مشورہ کرنے کے لئے تھوڑی مہلت ضرور چاہیئے۔''

''بے شک، میں کب کہتی ہوں کہ تو ابھی اسی وقت نکاح بندھا لے۔ پہلے اپنے دل کو مطمئن کر لے، جس حد تک کوئی ان چیزوں میں دل کو مطمئن کرسکتا ہے۔ میں ایک دو دن میں دوبارہ پھیرا کراؤں گی۔''

''اور بڑی باجی...''

''ہاں، کیا بات ہے،'' اکبری خانم نے کہا۔'' کوئی اور شک ہو تو دور کر لے۔''

''میں شاہ محمد آغا اور نواب مرزا کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔''

''ابھی ان باتوں کا کیا مذکور ہے؟ تیری شرطیں سب وہاں پہنچا دی جائیں گی۔ پہلے تو دل تو پکا کر لے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے معلوم ہے تم میرے حق میں بہتر ہی کرو گی۔''

اکبری خانم پالکی میں سوار ہو کر رخصت ہوئیں تو وزیر نے حبیبہ کو بلا کر کہا:

''صاحب عالم میرزا فتح الملک بہادر...؟''

''جی جی۔ سب انھیں جانتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں صورت شکل بھاؤ سبھاؤ میں بالکل ہمارے ظل الٰہی پر گئے ہیں، پر ایک بات میں نہیں۔'' حبیبہ نے خفیف سی ہنسی ہنس کر کہا۔

''وہ کون سی بات ہے بھلا؟''

حبیبہ پھر ہنسی۔ ''جی، ظل سبحانی کو نکاحوں کا بہت شوق ہے پر فتح الملک بہادر کی ایک ہی بیوی تھیں، وہ گذر گئیں تو انھوں نے میرزا الٰہی بخش کی بیٹی سے شادی کی۔ سنا ہے ان بیوی سے کچھ بہت خوش نہیں ہیں پر وہ اور کسی طرف رخ نہیں کرتے۔ تھوڑا بہت شاعری کا اور بہت کچھ خیال کا ذوق ہے، اسی میں محو رہتے ہیں۔ سنا ہے خیال کی کچھ نئی بندشیں بھی انھوں نے بنائی ہیں۔''

''کچھ... لونڈوں وغیرہ کی صحبت تو در گیر نہیں؟'' وزیر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''اوہی اللہ توبہ کیجیے۔ بڑے نمازی پرہیزگار ہیں۔ تیسوں روزے رکھتے ہیں، تیس ہزاری میں محرم کی چھبیل بھی چلواتے ہیں۔''

''میں تو سنتی ہوں قلعے والوں کو بٹیر بازی کنکوے بازی چوسر پچیسی چھوڑ کچھ کام نہیں۔''

''خانم صاحب آخر ہے تو ایک ہی گھرانہ، ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی۔ جب حکومت نہیں تو انسان کیا کرے۔ پر خدا نے پانچوں انگلیاں یکساں نہیں بنائیں۔ فتح الملک بہادر کو تو سنا ہے بے فاتحہ درود کوئی کام شروع ہی نہیں کرتے۔''

''تمھیں یہ سب کہاں سے پتہ لگا حبیبہ؟''

''اے لو خانم صاحب یہ باتیں تو دلی کا بچہ بچہ جانے ہے۔ سب شاہزادوں سے زیادہ وہ شہر میں آتے جاتے ہیں، موئے فرنگیوں سے بھی رسم و راہ رکھتے ہیں، پر...'' وہ تھوڑا ہچکچائی۔ ''پر.... آپ یہ سب کیوں پوچھتی ہیں؟''

''میں... میں ایک بڑی مشکل میں ہوں حبیبہ۔''

حبیبہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ اگر کوئی مشکل آ پڑی ہے تو ولی عہد سوئم بہادر کا کیا مذکور تھا؟ خانم صاحب کے پل پل کی مجھے خبر ہے، وہ کہیں آئیں نہ گئیں۔ کسی سے بھی کوئی تعلق کیا، سرسری جان پہچان کا بھی کوئی علاقہ ان کا نہ تھا۔ تو پھر بات کیا ہو سکتی تھی؟ کہیں نواب ضیاء الدین بہادر اپنی مطلب برآری کے لئے دباؤ میرزا فتح الملک بہادر کا تو نہیں لا رہے؟ یہ دیکھ کر حبیبہ کی گھبراہٹ اور بڑھی کہ وزیر خانم نے حبیبہ

کے چہرے پر سے آنکھ ہٹالی تھی اور سر جھکا لیا تھا۔ شاید خانم صاحب کو ڈر تھا کہ میں اس معاملے میں ان کے کچھ کام نہ آسکوں گی۔ وہ بہت سوچ کر، ٹھہر ٹھہر کر بولی:

''میری جان آپ پر قربان۔ خانم صاحب آپ ڈھارس رکھیے، مولا مشکل کشا کو یاد کیجئے۔ اللہ ہر مشکل کو آسان کردے گا۔ میرے لائق جو بھی حکم ہو میں دل و جان سے پورا کروں گی۔''

وزیر کو احساس ہوا کہ اپنے انداز و الفاظ سے اس نے حبیبہ کو کچھ خوف زدہ کر دیا ہے۔ خوف زدہ وہ خود تو تھی، لیکن اس کی وجوہ آسانی سے بیان نہ ہوسکتی تھیں، اور حبیبہ کے لئے بہر حال خوف زدگی کی کوئی بات نہ تھی۔ اس نے ناحق ہی ایسا لہجہ اختیار کیا کہ حبیبہ گھبرا گئی۔

''ن... نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ مجھے صحیح جواب کی راہ نہیں مل رہی۔ میرزا فتح الملک بہادر نے... صاحب عالم میرزا فتح الملک بہادر نے مجھ سے... مجھ سے نکاح کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔''

حبیبہ کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ صاحب عالم میرزا فتح الملک بہادر ولی عہد سوئم! سوئے ہوئے بختوں کا جاگنا اسے کہتے ہیں! توقیر بڑھے، افکار و آلام سے رہائی ملے، ملک ہند کے قلب میں امن و امان کے دن رات نصیب ہوں۔ سچ ہے اللہ جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ حبیبہ کی چشم خیال کے سامنے زعفران اور سیندور سے رنگی ہوئی مستکوں، زربفت اور چاندی کی تارکشی سے بنی ہوئی سر دوالی کے پٹوں اور ٹیکوں سے چمکتی ہوئی پیشانیوں، مرصع جھالردار ریشمی کجریوں کے اوپر چاندی کی عماریوں، مرصع لباس پہنے ہوئے، چاندی یا سونے کے آنکس ہاتھوں میں لئے ہاتھیوں کو ہولتے ہوئے مہاوتوں کی قطار گذر گئی۔ آگے کے ہر ہاتھی پر زرق برق شاہزادے، بعد کے ہاتھیوں پر زرنگار اور مخملیں لباس پہنے ہوئے امرا، اور سب سے آگے، سب سے بلند ایک ہاتھی جس کے دانتوں پر سونے کے چوڑے چڑھے ہوئے اور گلے میں نقرئی گھنٹی، چاندی کے میگھ ڈمبر اور سرخ چتر کے نیچے بادشاہ فلک بارگاہ اس پر سوار، خواصی میں امام جامع مسجد علامہ محمد شاہ بخاری، پیچھے مورچھل بردار، سامنے لال بانات کی وردیوں میں ملبوس درجنوں کڑکیت ہاتھوں میں برچھے اور سونٹے لئے کڑکا کہتے ہوئے، ان کے آگے دورویہ مسلح و مکمل فوجیوں کی قطاریں۔ شاہ دیں پناہ کے ہاتھی کے ذرا پیچھے اور بائیں جانب ذرا ہٹ کر بیل کا ہاتھی جس سونے چاندی کے پھلوں سے بھری ہوئی ڈالیاں، ڈالیوں سے مٹھی بھر بھر کر چھلے نکالتے اور رعایا کو لٹاتے ہوئے چار چوبدار... بادشاہ جمجاہ کے ہاتھی کے ذرا پیچھے بائیں جانب جگمگاتی ہوئی جھلابور جھول پہنے ہوئے ہاتھی پر

مغرق اور مکلل بجواہر لباس میں شاہزادہ، پھولوں کے سہرے اور مقیش اور بادلے کے جھم جھم کرتے سہرے سے لدا ہوا... کیا یہ صاحب عالم میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین فتح الملک بہادر ولی عہد سوئم کی بارات کا جلوس ہے؟ اور یہ جلوس میری خانم صاحب کے دروازے اترے گا...!

''کیا ہوا، یوں گم سم کہاں چلی گئیں؟'' وزیر کی آواز اس کے کانوں میں یوں آئی جیسے کسی نے دور سے پکار کر جگا دیا ہو۔ ''سانسے میں تو ہم ہیں اور سانس روک کر تم بیٹھ گئیں۔'' وزیر نے ہلکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

''توبہ ہے خانم صاحب۔'' حبیبہ نے شرمائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنا آپا ہی کھو بیٹھی تھی۔ پہلے تو آپ نے ڈرا ہی دیا تھا، اور پھر ایسی نوید سنائی کہ میرے تو اوسان بجا نہیں رہے۔''

''چلو چلو،'' وزیر نے کچھ چڑچڑے لہجے میں جواب دیا۔ ''اوسان خطا ہونے کی کون سی بات ہے، الجھن میں تو میں پڑ گئی ہوں۔''

''الجھن، کاہے کی الجھن خانم صاحب؟'' حبیبہ ہمت کر کے ذرا قریب آئی اور وزیر کی بلا گرداں ہو کر بولی۔ ''یہ تو ایسا بر آپ کو مل رہا ہے کہ ساری دلی رشک کرے اور بڑی بڑی شہزادیاں زہر کھائیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اب آپ کے دن پھرنے والے ہیں اور وہ بھی اس رنگ کہ انشاء اللہ قیامت تک آپ کو کسی چیز کی حاجت ہوگی نہ کمی ہوگی۔''

''حبیب النسا بیگم،'' وزیر کے لہجے میں اب بھی چڑچڑاہٹ تھی۔ ''تم کو ہری ہری ہی سوجھتی ہے۔ ذرا اگلے کی آنکھ سے بھی دیکھتیں تو پتہ لگتا کہ کیا رنگ ہے۔''

حبیب النسا اس طرز تخاطب اور لہجے پر تھوڑا گھبرائی اور سنجیدہ منھ بنا کر بولی، ''قربان جاؤں۔ میں سمجھی نہیں۔''

''اری نیک بخت، اب میری عمر خصم کرنے کی ہے کہ نواب مرزا کے لئے چاندسی بہولانے اور شاہ محمد آغا صاحب کو پالنے پوسنے اور اللہ اللہ کرنے کی؟''

''اللہ کون سی عمر ہوئی ہے آپ کی۔ ابھی تو آپ کا سر ہر مہینے اسی طرح میلا ہوتا ہے جیسا تب تھا جب آپ ہمارے نواب صاحب کے یہاں...''

''چپ، یہ سب باتیں مجھے پسند نہیں۔ اری کچھ سوچ، دنیا کیا کہے گی؟ اور ان شہزادوں کا کیا ہے، کل کلاں کسی اور کو میرے سر پر لا بٹھاویں گے... اور میں شاہ محمد آغا کو چھوڑنے والی ہر گز نہیں ہوں،

قلعہ جائے بھاڑ میں، میری کٹیا ہی مجھے بہت ہے۔"

"بے شک اپنا گھر سب پر بھاری ہے۔ لیکن میرزا فتح الملک بہادر... سبھی جانتے ہیں کہ وہ بہت متین اور بردبار شہزادے ہیں۔ وہ آپ کو گھر لائیں گے تو بے شک نباہیں گے ہی۔"

"یہ تمھیں کیسے معلوم؟"

"اے وہ بزرگوں میں کہاوت نہیں مشہور کہ بیاہ نہیں کیا برات تو دیکھی ہے۔ ولی عہد سوئم کے احوال، ان کے نیک چلن سب پر ظاہر ہیں۔ وہ کوئی اچھال چھکوں میں کھیلنے والے رئیس تھوڑی ہیں۔"

"اور نواب مرزا اور شاہ محمد آغا؟"

"ان کا کیا ہے خانم صاحب۔ اللہ رکھے نواب مرزا بھی یہ بات سمجھتے ہیں کہ ولی عہد سوئم جیسا کوئی بڑا شخص آپ کا ہاتھ پکڑ لے تو آپ کے آنسو کچھ پچھ جائیں گے... ویسے آپ ان سے مشورہ ضرور کر لیں۔"

"لیکن قلعے والے اگر نواب مرزا اور شاہ محمد آغا کو لینے پر تیار نہ ہوئے تو؟"

حبیبہ ایک لحظہ خاموش رہی۔ "دیکھیے، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ماشاء اللہ نواب مرزا بڑے باپ کے بیٹے ہیں، ہونہار ہیں، آگے چل کر بزرگوں کا نام روشن کریں گے۔ انھیں تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ ہاں ننھے میاں صاحب کے لئے شاید شروع میں کچھ رکاوٹ ہو... تو میں تو حاضر ہی ہوں، میں انھیں بخوشی پال لوں گی۔"

"نہیں، تجھے تو میں اپنے پاس ہی رکھوں گی... ننھی سی جان ماں کو ہڑکے گا نہیں؟"

"کوئی آپ دکن یا کابل تھوڑا ہی جا رہی ہیں..."

"بڑی باجی پال لیں گی، کہہ رہی تھیں۔"

"لیجیے پھر تو کچھ پھیر ہی نہ رہا۔"

"مجھے لگتا ہے بڑی باجی قول ہار چکی ہیں، انھوں نے میرا کچھ خیال نہ کیا۔"

"قول تو وہ ہرگز نہیں ہار سکتیں۔ جو بھی آپ کو جانے ہے وہ یہ بھی جانے ہے کہ ان باتوں میں آپ کسی کے کہنے میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ تو ہے کہ وہ دل سے چاہتی ہوں گی کہ آپ بادشاہ کی بہو بنیں۔"

وزیر خانم بڑی دیر تک سر جھکائے رہی۔ اس کی پلکوں پر دو تارے جھلملائے اور ٹپک کر اس کے گریبان میں جذب ہو گئے۔ حبیبہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ سہلاتی

رہی۔ بالآخر وزیر نے سر اٹھایا، ڈوپٹے سے آنکھیں خشک کیں اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''حبیبہ، میرا دل اب ان باتوں میں نہیں ہے۔ اور میں ڈرتی بھی ہوں کہ بار بار یہی ہوتا ہے کہ چار دن کی خوشی کے بعد مدتوں رونا پڑتا ہے۔''

پھر اس نے ہلکی سسکی بھری آواز میں شعر پڑھا۔

زخم تازہ کی طرح چرخ کہن اے جرأت
ٹک ہنساتا ہے تو پھر خوب رلاتا ہے مجھے

''خانم صاحب کوئی ضروری نہیں کہ ہر بار ایسا ہو۔ کبھی کے دن بڑے تو کبھی کی رات بڑی۔''

وزیر کے چہرے پر ایک تلخ اور محزوں سا تبسم آیا۔ ''اسی لئے تو کہتے ہیں کہ روزے رکھے غریبوں نے تو دن بڑے ہوئے۔''

''اب آپ سے شعر و شاعری میں کون جیت سکے ہے، آخر شاہ نصیر صاحب آپ کے استاد تھے۔'' حبیبہ نے ہنس کہا۔ ''...لیکن ایک بات میری مانیں تو عرض کروں۔''

''کیا؟''

''بائی جی سے پوچھ لیجے۔ جو وہ کہیں وہی کیجے۔''

''بائی جی صاحب...؟'' وزیر نے ایک لمحہ رک کر جواب دیا۔ ''بائی جی سے میں کیا پوچھوں گی اور کس طرح پوچھوں گی؟''

''وہ سب مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ کل نوچندی جمعرات ہے، دن بھی اچھا ہے۔ اور پھر بعد میں وہاں سے قدم شریف بھی ہو لیجے گا۔''

''اچھا، کیا بعد فجر ٹھیک رہے گا؟''

''وہ تو سب سے اچھا وقت ہے کہ دن چڑھتے ہی وہاں بھیڑ لگ جاتی ہے۔''

''بائی جی صاحب کب بیدار ہو جاتی ہیں؟''

''اے میں نے تو سنا ہے وہ رات بھر سوتی ہی نہیں ہیں۔ شاید دوپہر کو ظہر کے پہلے جھپکی لگا لیتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ سوتی ہی نہیں ہیں۔ آنکھیں تو ان کی بالکل لال انگارہ رہتی ہیں۔''

''اچھا کوڑیوں کا انتظام کر لینا۔ سنا وہ کوڑیاں خوشی سے قبول کرتی ہیں۔''

''بہت بہتر، ابھی جانی رام کو روٹیاں لگوانے بازار بھیجوں گی تو اس سے کوڑیاں منگوا لوں

گی۔ آج کل کچھ مہنگی ہیں، روپے میں پانچ ہزار آ رہی ہیں۔"

"جتنی بھی سہی۔ دو روپے کی منگوا لینا۔"

حبیب النسا تو امور خانہ داری میں لگ گئی، لیکن قدم شریف کے ذکر نے وزیر خانم کے دل میں ایک تیر سا چبھو دیا تھا۔ اب وہ نواب شہید کے مزار پر کم جاتی تھی، لیکن جاتی پھر بھی تھی اور پورے اہتمام کے ساتھ۔ اب جو اس کی زندگی میں ایک نئے مرد کے داخلے کا امکان ہو رہا تھا تو اس کو خیال آنے لگا کہ اگر مارسٹن بلیک یا آغا مرزا تراب علی، یا دونوں کی قبریں دلی میں ہوتیں تو کیا وہ ان کے مزاروں پر بھی اسی پابندی سے جاتی؟ اس نے اپنا دل بہت ٹٹولا۔ اس نئے خیال نے اس کی روح میں نیا تلاطم پیدا کر دیا تھا۔

بلاک صاحب کو وہ چاہتی ضرور تھی، اور اب بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کی ہم آغوشیاں یاد کر کے اس کے جی کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ بلاک صاحب کی کون سی اداؤں پر وہ انھیں دل دے بیٹھی تھی... شاید ان کی وجاہت اور مردانہ حسن، مگر نواب شمس الدین احمد خان صاحب کی وجاہت اور قد و قامت کی زیبائی کے تو انگریز بھی قائل تھے... پھر بلاک صاحب کی خوش مزاجیاں، پر وہ تو کچھ ایسی دنیا اوپر نہ تھیں، ہاں ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تو طبیعت ہمیشہ بہلی رہتی تھی، کبھی جی اکتا تا نہ تھا... یا پھر آداب وصل و وصال میں ان کی مہارتیں...

وزیر کو اپنے آپ سے شرم آنے لگی، اس نے غیر شعوری طور پر بدن چرا لیا اور ڈوپٹہ سر پر مضبوط رکھ لیا۔ لیکن نہیں، بلاک صاحب سے اسے کئی طرح کا لگاؤ تو تھا، پر وہ عزت اور احترام ان کے لئے اس کے دل میں نہ تھا جو نواب شمس الدین احمد کی شرافت اور نفاست طبع کا فطری تقاضا تھا۔ یہاں بھی اسے معلوم تھا کہ فریزر صاحب کے تعصبات کی بات اور تھی، پر دوسرے سارے انگریز لوگ نواب صاحب کے انتظام و انصرام ریاست کے قائل تھے۔ اسے یاد آیا کہ جس زمانے میں قتل فریزر کی تفتیشیں ہو رہی تھیں، انگریزوں کے ہاتھ نواب شمس الدین احمد کے خلاف ایک اور ہتھیار لگ گیا تھا۔ ہوا یوں کہ نواب کے علاقے میں ایک بنیے کا قتل ہو گیا اور قاتل کا سراغ جلد نہ مل سکا تھا۔ انگریزوں نے نواب پر دباؤ ڈالنا شروع کیا، قاتل کو جلد از ماخوذ کر کے ہمارے حوالے کیا جائے۔ نواب کہتے تھے کہ قاتل ہمارا مجرم ہے، ہم اسے گرفتار کریں گے اور ہم ہی اسے سزا کو پہنچائیں گے۔ اس بات کو انگریزوں نے نواب کے انتظامیہ کی کمزوری، اور خود نواب کی بھی نا اہلی کا رنگ دے کر اس کی خوب تشہیر کی۔ لیکن آفریں ہے نواب شمس الدین احمد پر کہ وہ کسی دباؤ میں نہ آئے اور بالآخر انھوں نے بنیے کے قاتل کا سراغ لگوا کر اسے بیچ بازار

میں پھانسی لگوادی۔

مزاج کا یہ استقلال اور اپنی توقیر و تعظیم کا یہ لحاظ وزیر نے کسی اور میں نہ دیکھا، اور اس پر طرہ ہر چیز میں نواب صاحب کی خوش ذوقی، کہ شعر و شاعری سے لے کر لباس اور طرز معاشرت میں انھیں اپنے ہمچشموں میں تفوق حاصل تھا۔ گول مول لفظوں میں سہی، لیکن انگریزوں نے یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ نواب اگر بیٹے کے قاتل کو پکڑوا کر صاحبان انگریز کے سپرد کر دیں تو قتل فریزر کی تفتیش کا بھی رخ بدل سکتا ہے۔ لیکن نواب نے ان سفیہانہ للچاووں پر مطلق کان نہ دھرا۔ وزیر نے اپنے دل کو دوبارہ ٹٹولا تو اسے بالکل صاف یہ معلوم ہوا کہ بلاک صاحب کے محبت بھرے طور اور ان کا ظاہری اقبال اور دولت و اجلال ایک طرف (اور وہ بھی ان کے کچھ کام نہ آیا)، مگر نواب شمس الدین کا تو وہی رنگ تھا کہ انچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری... اور رہے آغا مرزا تراب علی، تو وہ شریف، خاندانی، ملنسار اور با مروت انسان تھے۔ وزیر نے ان کی قدر دانیوں کا جواب اپنی طرف سے حقوق شوہری کے ادا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا کر دیا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ آغا صاحب اس سے خوش تھے، اور اسے پورا یقین تھا کہ زمانے کا رنگ اور مزاج دیکھتے ہوئے وہ اس کے لئے بہت اچھے شوہر، اور اس کی زندگی کی ناؤ کے لئے قابل اعتبار و اعتماد ناخدا تھے۔

پھر... کیا ایسا بھی تھا کہ وہ ان تینوں کے ماتم میں تمام عمر روے دل کو ناخن غم سے کھروچتی رہتی اور اپنے کلیجے کو خون حیات کے بجائے زہر فراق کی کسیلی کڑواہٹوں سے سیراب رکھتی؟ وزیر کا دل ایک لمحے کو لرز اٹھا... نہیں یہ مجھ سے ممکن نہیں۔ نواب شمس الدین احمد کے لئے جوگن بن جاؤں یہ کچھ مشکل نہیں۔ ان کے مزار کے فرش کو اپنے سر کی چھت بنا لوں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کسی اور کے لئے اب میرے دل میں کتنی جگہ نکل سکتی ہے، یہ کہنا مشکل ہے۔ اور یہ صاحب عالم میرزا فتح الملک بہادر، سبھی ان کی ثنا کرتے ہیں پر میں نے تو انھیں دیکھا بھی نہیں... سچ ہے عورت خود کو کتنی ہی بھاری بھرکم کیوں نہ سمجھے، مرد کے بغیر اس کا پلہ ہلکا ہی رہتا ہے۔ مجھے خدا جانے ابھی کتنے دن اور جینا ہے۔ نواب مرزا کی دلہن گھر میں آجائے تو بڑا سہارا ہو جائے لیکن بیٹوں کا کیا ہے انھیں اپنے ہی گھر بار کے بنانے میں مزا آتا ہے۔ ماں کا گھر وہ کب تک تاکیں گے۔ شاہ محمد آغا کی تو میں ہی ماں ہوں اور باپ بھی ہوں۔ بڑی باجی...

نہ جانے کب اسے نیند آگئی۔ وہ کچھ اس قدر بے سدھ سوئی تھی کہ حبیبہ کے جگانے پر بھی نہ جاگی۔ رات کا کھانا یوں ہی رکھا رہ گیا۔ لیکن تین گھڑی رات رہے اس کی نیند کھل گئی اور بار بار کروٹیں لینے، دل کو بہلانے، درود شریف پڑھنے کے باوجود نیند اسے پھر نہ آئی۔ آخر صبح کاذب کی ملگجی لکیر آسمانوں

میں دوڑی اور چند ثانیہ بعد نماز فجر کے لئے اذانیں ہونے لگیں۔ آیۂ مبارکہ سلام ہی حتی مطلع الفجر اس کے دل میں گونج گئی۔ سلامتی اور امن کی رات ہے یہ شب، طلوع ہونے فجر تک۔ کاش وہ رات بھر اس طرح بے سدھ نہ سوئی ہوتی۔

حبیب النسا نے پالکی کا اہتمام رات ہی کو کر لیا تھا۔ جب وزیر خانم کی سواری پرانی عیدگاہ کی چڑھائی پر پہنچی تو سامنے بلند دروازے کے ذرا اندر ایک شکستہ پھونس کے چھپر کے آگے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوتا ہوا نظر آیا۔ ایک متوسط سا حجرہ، اس کے آگے لمبا سا دالان، حجرے کے اندر کا حال نظر نہ آتا تھا۔ وزیر اور حبیبہ از سرتاپا سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھیں، صرف دونوں کلائیوں کے پنجے اور آنکھوں کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ پالکی سے اتر کر دونوں ہچکچاتے ہوئے قدموں سے برآمدے تک آئیں، کوڑیوں کے دو بدرے لئے ہوئے ایک کہار پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ دالان کی کرسی بہت نیچی تھی، لیکن اوپر چڑھنے کے لئے ایک قدم کا زینہ پھر بھی بنا ہوا تھا۔ دونوں عورتوں کی بیگماتی چال ڈھال اور نسبۃً قیمتی چادروں کی نفاست کی بنا پر سب نے انھیں راستہ دے دیا۔ لیکن ایک عورت نے وزیر کا دامن تھام کر اسے ایک لمحے کے لئے روکا اور کہا:

''بی صاحب۔ ابھی حجرہ کھلا نہیں ہے۔ آپ یہیں ٹھہر جائیں... اور اگر آپ کو حاضری کا حکم ملے تو اللہ مجھے بھی بلوا بھیجئے گا۔''

وزیر ٹھہر گئی اور اس نے حبیبہ اور کہار کو وہیں دالان کے نیچے رکنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ابھی اس نے کچھ کہا نہ تھا کہ متوسط عمر کی ایک نامانوس ناک نقشے والی شریف صورت لیکن خادمہ نما عورت نے حجرے کا دروازہ اندر سے کھولا اور کچھ گفتگو کے سے لہجے میں ذرا بلند لیکن شائستہ آواز میں کہا:

''وہ خانم کے بازار والی کون ہیں؟ بائی جی سرکار یاد فرماتے ہیں۔'' اس کی آواز میں دکن کی راگ راگنیاں لہرا رہی تھیں۔

وزیر نے گھبرا کر ادھر ادھر نظر کی، لیکن کوئی عورت اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی نظر نہ دکھائی دی۔ لیکن مجھے بھلا کیسے پہچان لیا گیا ہوگا، میں تو پہلے کبھی آئی بھی نہیں۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ اٹھوں، لیکن ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے حبیبہ کی طرف مستفسرانہ دیکھا، لیکن حبیبہ کی آنکھوں سے خود ہی کچھ الجھن اور کچھ خوف ٹپک رہا تھا۔ خادمہ نما عورت نے مڑ کر حجرے کی طرف دیکھا، اندر سے بہت آہستہ سروں میں کچھ کہا گیا، اسے سن کر وہ مجمعے کی طرف منھ کر کے بولی:

''جناب میں کہتی ہوں وہ خانم کے بازار سے کون اماں تشریف لائی ہیں، سنگ باسی والی مسجد کے سامنے سے۔ دیری نہ کریں، بائی جی کو فرصت آج زیادہ نہیں۔''

اب مجبور ہو کر وزیر اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے حبیبہ کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور کوڑیوں کی تھیلیاں اپنے ہاتھوں میں لے لینا چاہیں۔ لیکن جس عورت نے کچھ دیر پہلے وزیر سے اپنے بارے میں سفارش کے لئے کہا تھا، وہ جلدی سے آگے بڑھی اور کوڑیوں کے بدرے اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی:

''اے قربان جاؤں، بندی اٹھا لے گی۔ آپ زحمت نہ کریں۔''

اس پر بائی جی کی خادمہ نے اس عورت کو ایک نگاہ بھر گھورا۔ وہ عورت سہم کر ذرا سکڑ سی گئی لیکن اپنی جگہ سے ہٹی نہیں۔ ''نکو صاحب۔ ذری کی ذری غم کھاؤ میری بنو'' اس نے کچھ طنز کچھ خوش مزاجی سے کہا۔ ''یہ تھیلیں تو ہم اٹھاویں گے۔ تم چپکی بیٹھی رہو۔''

یہ کہہ کر اس نے دونوں بدرے اس عورت سے لے کر وزیر اور حبیبہ کو اشارہ کیا کہ اندر آجایئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا گیا۔ یہ کچھ انہونی سی بات تھی، کیونکہ دروازہ ایک بار کھلنے کے بعد بند نہ ہوتا تھا۔ وزیر اور حبیبہ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتی ہوئی اندر پہنچیں۔ حجرے میں دھندلی سی روشنی ایک دو روزنوں سے جھلک رہی تھی۔ کوئی چراغ اگر تھا تو بجھا دیا گیا تھا۔ مونج کی ایک لمبی سی چٹائی وسط حجرے میں بچھی ہوئی تھی۔ اس پر کسی اور گدے یا تکیے کے سہارے کے بغیر بائی جی دو زانو بیٹھی تھیں۔ یہی چٹائی شاید ان کا بستر بھی تھی اور مصلیٰ بھی، کیونکہ پلنگ یا چوکی تخت وغیرہ کا حجرے میں پتہ نہ تھا۔ ایک کونے میں صاف گھڑونچی پر نیا گھڑا، اس پر چمچماتا ہوا کٹورا اوندھا دھرا ہوا۔ دائیں جانب طاق میں رحل، اس پر کلام پاک۔ بس یہی بساط اس حجرے کی تھی۔ غسل خانہ اور جاے ضرور کے نام پر ایک جھونپڑی شاید پیچھے رہی ہو، لیکن حجرے سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کھانے کی قسم کی کوئی چیز، نہ ہی پکانے اور کھانے کے برتن بھانڈوں کا کوئی پتہ تھا۔ بائی جی کے آگے کوڑیوں کا ایک مختصر سا ڈھیر تھا اور سامنے ایک بوسیدہ سی دری مہمانوں اور صاحبان غرض کے لئے بچھی ہوئی تھی۔

خادمہ نے تھیلیوں کا منھ کھول کر کوڑیاں پرانے ڈھیر میں ملا دیں اور ہاتھ باندھ کر پیچھے کھڑی ہو گئی۔ وزیر نے بدقت تمام آنکھ اٹھائی اور بائی جی کو نظر بھر کر دیکھنا چاہا۔ ان کا ڈیل بہت دبلا تھا لیکن انداز نشست سے کشیدہ قامتی عیاں تھی۔ کتابی چہرہ، گورا رنگ، بہت بڑی بڑی آنکھیں، لیکن بالکل جھکی ہوئی،

گویا مراقبے میں ہوں، آنکھوں کے نیچے ہلکے سرمئی حلقے جو طویل شب بیداریوں کی علامت تھے۔ چہرہ اور ہاتھوں کے سوا ان کا سارا اوپری بدن بہت لطیف زرد چمیلی رنگ پر ہلکی نیلی بوٹیوں والی ملتانی چھینٹ کی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ نچلے دھڑ میں وہ سادہ بالکل سفید ململ کا چوڑی مہریوں والا دہلوی طرز کا پاجامہ پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے چہرے اور ہاتھوں پر کہیں جھریوں یا عمر رسیدگی کے ڈھیلے پن کا نشان نہ تھا۔ ان کے بال تو چادر میں چھپے ہوئے تھے، لیکن ایک دو لٹیں جو چادر کی قید سے کچھ آزاد تھیں، بالکل سیاہ اور چمکدار نظر آتی تھیں۔ ان کی عمر کا کسی کو علم نہ تھا۔ کوئی کہتا تھا ستر کے ادھر ہیں۔ کوئی کہتا میرے دادا کہتے ہیں ہمارے بچپنے میں بھی ایسی ہی تھیں جیسی آج ہیں۔ کوئی کہتا محمد شاہ بادشاہ غازی فردوس آرام گاہ جب اللہ کو پیارے ہوئے [۱۷۴۸] تو اس وقت وہ کہیں ملک کشمیر سے دلی آئی تھیں اور یہیں کی ہو رہیں۔ اس حساب سے ان کی عمر سو سے بہت اوپر ہے۔ بہر حال ان کی اصل عمر جو بھی رہی ہو، وہ نو عمر ہرگز نہ تھیں۔ ان کے چہرے اور انداز بدن سے عمر کی پختگی بلکہ سن رسیدگی بہر حال نمایاں تھی۔

آنکھیں جھکائے ہوئے ہونے کے باوجود ان کے چہرے پر، بلکہ پورے وجود میں کچھ ایسی پاکیزگی، تمکنت، اور جلالت تابی تھی کہ وزیر کی آنکھ بار بار جھپک جاتی تھی اور اسے اس لمحے سے خوف لگ رہا تھا جب بائی جی آنکھیں کھول کر اسے دیکھیں گی۔ اس نے بدن کو اور سمیٹ کر چادر کو اور بھی مضبوطی سے لپیٹ لیا اور دری کے ایک کونے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ حبیبہ اس کے پہلو سے لگ کر لیکن ذرا پیچھے کی طرف بیٹھ گئی، اس طرح کہ اس کا ایک پہلو دری سے باہر ننگے فرش پر تھا۔ اب بائی جی نے آنکھیں کھول کر وزیر کو دیکھا۔ اللہ کیسی آنکھیں تھیں، گہری سیاہ آنکھیں جن میں سرخیوں کے لہریئے لیکن زندگی کی شگفتگی سے عاری۔ لگتا تھا ہر خواہش، ہر تمنا، ہر ضرورت، درد یا انبساط کا ہر احساس، ہر امید، ان آنکھوں سے رخصت ہو چکی ہے۔ سیاہ سمندر کی طرح گہری آنکھیں جن میں ہر منظر، ہر جذبہ، سما جائے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے۔ وزیر نے گھبرا کر سلام کیا اور آنکھیں جھکا لیں۔

بائی جی نے نہایت شیریں لہجے میں بسم اللہ شریف پڑھی، پھر سورۂ انا اعطینا کی تلاوت شروع کی۔ تین آیتوں کی تلاوت میں وقت ہی کتنا لگتا، جیسے ہی سورہ ختم ہوئی، بائی جی نے ایک مٹھی کوڑیاں اپنے سامنے کی ڈھیری سے اٹھا کر الگ رکھ لیں اور پھر بسم اللہ شریف پڑھ کر پھر سورۂ کوثر شریف کی تلاوت فرمائی۔ یہ عمل ستر بار کیا گیا۔ وزیر کے تو اوسان ہی نہ تھے، وہ صرف ترتیل کی شیرینی کو اپنی روح میں جذب کرنے کی کوشش میں تھی، لیکن حبیبہ نے بعد میں بتایا کہ بائی جی نے گنتی گننے کا کوئی اہتمام نہ کیا تھا،

بس خود بخود ہی سمجھ گئی تھیں کہ ستر بار سورۂ کوثر کی تلاوت ہوگئی۔ یا شاید پیچھے کھڑی ہوئی خادمہ نے کوئی اشارہ کردیا ہو، واللہ اعلم۔ ستر بار تلاوت کے بعد بائی جی اب پہلی بار اپنی مہمان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''کہیے، کیا چاہتی ہیں؟'' ان کی آواز میں وہی حلاوت تھی جو ان کی تلاوت میں تھی۔

''بائی جی پر سب کچھ آئینہ ہے۔'' وزیر نے بدقت اٹک اٹک کر کہا۔

''نواب شمس الدین احمد کو چھوڑنا ہوگا۔''

ہائے اللہ، بائی جی نے یہ کیا فرمادیا! وزیر کے دل میں ہڑبڑاہٹ اٹھی۔ اس کا جی چاہا کان بند کرلے، کچھ اور نہ سنے۔

''قلعے کی بیگمات کھلے عام مزاروں پر نہیں جاتی ہیں۔'' بائی جی نے سمجھانے کے انداز میں فرمایا۔ ''وہاں پردے کا بڑا اہتمام ہے۔''

''ل... لیکن م... مم... میرے بچے؟ ان کا کیا ہوگا؟''

''ہوگا، اچھا ہی ہوگا۔''

''تو بائی جی صاحب کا حکم ہے کہ میں قلعے کا پیغام قبول کرلوں؟''

''ہمارا کچھ حکم نہیں بابا۔ یہ امور ہونے والے ہیں۔''

''اور... اور... اس کے بعد میرے دکھ دور ہوجائیں گے بائی جی صاحب؟''

''دکھ سکھ تو دھوپ اور چھاؤں کی طرح ہیں۔ ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ قلعے کی بادشاہت کے بھی دن کبھی پورے ہوں گے۔''

یہ کہہ کر بائی جی نے آنکھیں بند کرلیں۔ پیچھے سے خادمہ نے وزیر کو خفیف سا اشارہ کیا کہ اب آپ کی باریابی ختم ہوگئی۔ دونوں نے اٹھ کر تین تسلیمیں کیں اور الٹے پاؤں واپس ہونا چاہتی تھیں کہ بائی جی نے آنکھیں نیم وا کیں اور کہا:

''تھیلیاں اٹھانے والی سے کہہ دیں کہ تیرا بچہ تو اب واپس آتا نہیں، پر تو صبر کر تجھے بدلے میں کچھ مل جائے گا۔''

''جی بہت خوب'' کہہ کر وزیر اور حبیبہ باہر آئیں۔ وہ عورت سامنے ہی کھڑی تھیں، ہمک کر بولی، ''اے واری جاؤں مجھے بلایا ہے کیا؟''

''نہیں، بلایا تو نہیں بی بی، پر کہا ہے کہ وہ بچہ تو شاید نہ ملے لیکن اللہ آپ کو بدلے میں کچھ دے

گا۔" وزیر نے کہا۔

"ہائے اللہ،" عورت سسکی بھر کر بولی۔ "بائی جی نے تو میری دنیا ہی اجاڑ دی۔"

اسی لمحے خادمہ نے دروازے پر آ کر سرزنش کے انداز میں کہا: "شش! گناہ کی باتاں نہ بولو۔ بائی جی سرکار خفا ہو جائیں گے۔ چلو اب یہاں سے چلو۔" پھر اس نے بلند آواز میں کہا: "سب بی بیاں اندر آ جائیں۔"

عورتوں کا ہجوم ایک اضطراب کے عالم میں لیکن آہستہ روی سے اندر آنا شروع ہوا۔ وزیر کو باہر دیکھ کر کہاروں نے پالکی دالان سے لگا دی اور اپنی سواریوں کو لے کر خانم کے بازار کو عازم ہوئے۔

شوکت محل

وزیر خانم کی پالکی جب دروازے پر واپس پہنچی تو بازار کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ نانبائیوں اور حلوائیوں کی دکانیں خاص طور سے کاریگروں، کام کاج والے لونڈوں اور گاہکوں کی ترت پھرت سے گرما گرم نظر آ رہی تھیں۔ گاہکوں کے انبوہ میں وہیں کے وہیں ناشتہ کرنے والے بھی تھے اور سوکھے یا تازے پتوں کے دونوں اور کوری ہانڈیوں یا سکوریوں میں بھروا کر مال پوے، حلوہ، پوری، جلیبیاں، ترکاریاں، ملائی، ملائی برف، شیرمال، مچھلی کے کباب، کباب دل، نہاری، وغیرہ بندھوا کر گھر لے جانے والے بھی تھے۔ سارا راستہ کھانے اور مٹھائیوں کی سوندھی اور نمکین یا میٹھی، گھی سے تر خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ صبح کو مندر جانے والیوں کے لئے گجرے اور پھولوں والوں کی بھی دو دکانیں کھل گئی تھیں...

مطلع خورشید کا رنگ شنجرفی ہوتا جاتا ہے۔ قرص ماہتاب لب بام پہنچ کرتا نبے کی تھالی کی طرح بد قلعی نظر آنے لگا ہے... نقار خانوں سے دھیمی دھیمی نوبت کی ٹکور میں شہنائیوں کی سہانی بھیرویں کی دھنیں جی کو بیکل کیے دیتی ہیں... لاہوری دروازے سے نگمبودھ کے گھاٹوں تک حسن کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ چاندنی چوک کی سڑک کہکشاں بنی ہوئی ہے۔ ہزاروں چاند کے ٹکڑے ستاروں کی طرح جگمگاتے چلے آ رہے ہیں... دریاے جمن میں نازنینان گلبدن کے جمگھٹوں سے تختۂ چمن نظر آتا ہے... ہزاروں آسمان خوبی کے ستارے مہین مہین ریشمی ساڑھیاں اوڑھے ہوئے کمر کمر پانی میں غوطے لگا رہے ہیں... کوئی پری پیکر مہ جمال جمنا کا اشنان کر کے کھڑے کھڑے بالوں کو مڑوڑی دے کر نچوڑ رہی ہے۔ کوئی خشک ساڑھی باندھ کر گیلی ساڑھی کو مڑوڑی دے رہی ہے۔

فشرد پنجۂ مرجاں ز ابر مروارید

قمر ز جیب شب اشکبار پیدا شد

[ماخوذ از "داستان غدر"، یا "طراز ظہیری"، یعنی راقم الدولہ حضرت ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت ذوق علیہ الرحمۃ کے چشم دید حالات غدر دہلی اور اپنی سوانح عمری۔]

ادھر وزیر کے گھر میں میاں نواب مرزا ابھی بستر سے اٹھ، منہ ہاتھ دھو، چاق چوبند بیٹھے تھے کہ اماں واپس آئیں تو ناشتے کا ڈول ڈالئے، یا جانی رام آ جائے تو اسی کو بازار بھیج کر کچھ منگوایئے۔ نواب مرزا کو کچھ خبر نہ تھی سوائے اس کے کہ اماں جان نے رات ہی کو پالکی کا اہتمام کر کے صبح سویرے کہیں جانے کا قصد باندھا تھا۔ اس نے خیال کیا شاید قدم شریف گئی ہوں اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ لیکن جب وزیر کی سواری دروازے پر اتری تو ماں کا منہ غیر معمولی طور پر سوچ بھرا اور سنجیدہ دیکھ کر نواب مرزا گھبرا گیا:

"اماں جان تسلیمات۔ کیوں خیر تو ہے؟ صبح صبح کہاں تشریف لے گئی تھیں؟ آپ کا منہ کیوں اترا ہوا ہے؟ طبیعت تو صحیح ہے؟ کیا حکیم صاحب..."

نواب مرزا کے سوالوں کی جھڑی ابھی قائم رہتی لیکن وزیر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر تھوڑی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا:

"اے میاں صاحب زادے ذرا چھری تلے دم تو لو۔ سب ٹھیک ہے۔ ابھی چلو جھٹ پٹ ناشتہ کرو پھر سب باتیں بتاؤں گی۔"

"اماں جان سچ کہیے گا، کوئی بات تو نہیں؟"

"اے ہے بیٹا بات کیا ہوتی۔ میں اچھی خاصی تو ہوں۔ ابھی سب کچھ بتا دوں گی، چلو تم فاقہ شکنی تو کر لو۔ صبح سے بچارے بھوکے بیٹھے ہو۔"

ناشتے اور گھر کے ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر وزیر نے نواب مرزا کو اپنے حجرے میں بلایا اور ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ بائی جی کے یہاں جو گذرا تھا وہ بھی اس نے بیان کر دیا لیکن بڑی باجی سے فاطمہ کے بارے میں جو بات ہوئی تھی اس کا ذکر اس نے اس خیال سے نہ کیا کہ نواب مرزا کہیں فاطمہ کے لالچ میں قلعے والی بات پر صاد نہ کر دے۔ اس کے برخلاف، خود وہ شکوک اور خوف جو وزیر کے دل میں تھے وہ اس نے پوری طرح ظاہر کر دیئے۔ نواب مرزا پوری توجہ سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔ جب ماں سب حال کہہ چکی تو ایک لحظہ چپ رہ کر، گویا ہنوز معاملے پر غور کر رہا ہو، نواب مرزا نے جواب دیا:

''اماں جان میرے خیال میں آپ میری اور آغا صاحب کی فکر چنداں نہ کریں۔ میں تو اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہوں اور آغا صاحب کو بڑی خالہ جان بہت اچھی طرح پال لیں گی، مجھے پورا یقین ہے۔''

کچھ کبیدگی، آزردگی، اور مایوسی کی ملی جلی سی پرچھائیں وزیر کے دل پر سے گذری۔ گویا صاحبزادے کو یقین ہے کہ میں حویلی والوں کا پیغام قبول کرلوں گی، اور گویا مجھے یہ پیغام قبول کر لینا ہی چاہیئے اور گویا میرے دل میں بچوں کی اصلا محبت نہیں کہ میں بخوشی انھیں چھوڑنے پر راضی ہو جاؤں گی۔ اور آغا صاحب تو چھوٹے ہیں شاید رو دھو کر بہل جائیں لیکن یہ تو ماشاء اللہ جوان ہیں، سمجھدار ہیں۔ کیا انھیں میری یاد نہ آئے گی؟ کیا یہ اپنے بھاویں مجھے حویلی کے سپرد نہیں بلکہ مہندیوں میں کسی گور کے سپرد کر دیویں گے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں گے؟ ان کے کوئی بہن ہوتی تو کیا وہ اسے بھی اتنی ہی آسانی سے غیر گھر میں تو پ دیتے؟ شاید ان کا خیال ہو گا کہ اماں راستے سے ہٹیں تو میں فاطمہ کو بیاہ کر اپنی راہ لوں... شاید دکن چلے جائیں اور مجھے کبھی منھ نہ دکھائیں۔ سنا ہے نظام الملک کے یہاں شاعروں کی بڑی قدر ہے۔ ہمارے شاہ صاحب بھی وہیں چلے گئے اور بالآخر وہیں کے ہو رہے۔ اور کیا دکن کا سفر کوئی یہاں سے شاہدرے کا سفر ہے کہ بہل میں بیٹھے، جمنا پار کی اور پہنچ گئے۔ آٹھ دن میں تو لوگ آگرے پہنچتے ہیں اور دکن تو آگرے سے بھی کئی سو کوس دور دست ہے۔

''کس سوچ میں ڈوب گئیں اماں جان؟'' یکا یک نواب مرزا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے چونک کر جلدی سے منھ پر ہاتھ پھیرے، گویا وضو کر کے منھ پونچھ رہی ہو۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ گڑ بڑا کر بولی۔ ''میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ میری عمر اب نکاح بیاہ کی نہیں ہے۔ میں تو چاہتی تھی کہ اب تم دونوں کے سہارے زندگی کر لیتی۔ تم کسی نوکری سے لگ جاتے تو...''

''اماں جان آپ میری نوکری کی فکر نہ کیجئے۔ وہ تو انشاء اللہ مل ہی جائے گی۔ لیکن آپ ...آپ ابھی کمسن ہیں، اور اگر ذرا بھی خود کو ٹھیک ٹھاک رکھیں تو ابھی ماشاء اللہ سے اور بھی اچھی لگیں گی۔ اور... اور بڑی بات یہ کہ اب تک تقدیر نے آپ کو... آپ کو کہیں جم کر بیٹھنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اب شاید وہ صورت پیدا ہو رہی ہے۔ کوئی آئے یا جائے لیکن قلعۂ معلیٰ تو کہیں جائے گا نہیں۔''

وزیر کی کبیدہ خاطری کچھ کم ہوئی۔ تو نواب مرزا دراصل میری محبت میں کہہ رہے تھے۔ اپنی

غرض میں باوے نہیں تھے۔ لیکن ہم لوگوں میں جدائی ہو، یہ بات انھوں نے کیسے گوارا کر لی؟

نواب مرزا نے ماں کے دل کی بات شاید سمجھ لی تھی۔ اس نے بہت مضبوط لہجے میں اور ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا:

''دیکھیے اماں جان۔ آپ کے دامن سے چھوٹ کر ہم میں سے کوئی نہیں رہ سکتا۔ اور میں تو ہرگز نہیں رہ سکتا۔ پر یہ بھی تو دیکھا چاہیئے کہ آپ ہی نہ ہوں گی تو ہم تنہا کیا جی لیں گے؟ اور اگر آپ کی زندگی میں خوش گواری اور آرام آجائے تو کیا آپ کی عمر میں اضافہ نہ ہوگا؟ اور کیا آپ ہم دونوں کے لئے بہتر سے بہتر بندوبست نہ کر سکیں گی؟''

''تم لوگوں کو چھوڑ کر میں اپنا آرام مناؤں، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔''

''چھوڑنے کی بات کس نے کہی؟ ہو سکتا ہے ہم دونوں کو، یا ہم میں سے ایک کو قلعے میں بلوا ہی لیا جائے۔ پھر دوسرے کو آپ کہیں باہر تھوڑا ہی بھیج رہی ہیں...''

وزیر نے بات کاٹ کر بے چینی سے کہا:

''اور اگر تمھاری نوکری کہیں دور دکن میں یا رامپور ہی میں لگ گئی تو؟ پھر میں تمھیں کہاں پاؤں گی؟'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''نوکری لگے گی کیسے؟ میں ملتجی ہوں گا تب تو کوئی مجھے نوکر رکھے گا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''یہ گھر آپ بیچ دیں گی کیا؟''

''نوج دور پار ایسی بات منھ سے نکالو متی۔ تمھارے باپ کی یادگار، ہم لوگوں کے سر چھپانے کے لئے گوشۂ عافیت، میں اسے کیوں بیچتی؟''

''تو پھر خاطر جمع رکھیے۔ آپ حویلی میں شاہوں کے ٹھاٹ سے رہیے گا، ہم یہاں خوشدل اپنی کھال میں مست سر چھپائے پڑے رہیں گے۔''

''چل ہٹ تجھے تو ہر گھڑی چہل ہی سوجھتی ہے۔ تو بڑی خالہ کے یہاں...'' وزیر کے منھ سے بے ساختہ نکلا، لیکن اس نے جلدی سے زبان بند کر لی۔

نواب مرزا نے وزیر خانم کا سہو کلام نظر انداز کیا، ہر چند کہ وہ اس کے معنی ایک حد تک سمجھتا اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ اسی وقت کھل کر بات ہو جائے۔ وہ چپکا رہا کہ شاید اماں جان بات کو کچھ کھولیں۔ لیکن وزیر اب بھی اسی خیال کی تھی کہ فاطمہ والی بات اگر میں صاف کہہ دوں گی تو اس کے لالچ

میں نواب مرزا مجھ پر اور بھی زور ڈالیں گے کہ آپ قلعے کا پیغام قبول کر لیں۔

نواب مرزا نے خود ہی بات بنا دی۔ ''جی اماں جان، بڑی خالہ جان تو ہیں ہی، وہ آغا صاحب کو خوب ٹھیک سے دیکھ بھال لیں گی اور میں یہاں بے فکری سے رہوں گا۔'' پھر اس نے سکھراج سبقت کا شعر بڑے لحن سے پڑھا۔

او بفکر من است و من فارغ

بندگی ہا خدا ایۓ دارد

''سچ کہیۓ گا اماں جان کیسی پر لطف بات کہی۔ آخر بیدل کے شاگرد تھے۔ کچھ اسی طرح کا آپ کا بھی حال ہو رہا ہے۔ ہماری فکر میں ہلاکان ہو رہی ہیں اور ہم موجیں مارتے پھر رہے ہیں۔''

''اچھا، اور آپ کی فکر میں ہم ہلاکان نہ ہوں گے تو کیا لوہاروو والے ہوں گے؟'' وزیر کے لہجے میں شگفتگی تھی لیکن اس کی تہ میں محزونی بھی صاف جھلکتی تھی۔ ''ذرا سوچ سمجھ کر جواب دو صاحبزادے صاحب۔ میں چلی جاؤں گی تو تمھیں غم نہ ہوگا؟''

''اے صاحب آپ خدانہ خواستہ کہاں دور چلی جا رہی ہیں۔ اور حویلی ہی تو ہے کوئی بندی خانہ تھوڑی ہے۔'' نواب مرزا نے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال دیۓ۔ ''یاد تو آپ ہر ہی وقت آویں گی۔'' اس کی آنکھیں چھلکنے کو آ گئیں۔ ''لیکن سکھ چین آرام، آپ کی زندگی میں ان چیزوں کے لۓ بھی تو کوئی جگہ ہو۔''

''جسے اولاد کا سکھ نہیں اسے پھر کاہے کا سکھ؟'' وزیر نے ذرا چڑچڑے انداز میں کہا۔

''لیجۓ آپ تو ہر بات کو بڑھا چڑھا کر کہتی ہیں۔ ہم لوگ آپ ہی کے قدموں سے تو لگے رہیں گے، تھوڑی دور ہی سہی۔''

وزیر کو بالآخر یقین آیا کہ نواب مرزا کی محبت میں کمی ہے اور نہ ہی اسے یہ بات کچھ بھی ناگوار گذری ہے کہ اس کی ماں کے لۓ قلعے سے رشتہ آۓ اور ماں اپنے بیٹوں کو چھوڑ کر ایک نئی زندگی گذارنا اختیار کرے۔ اگر نواب مرزا اس بات پر بخوشی راضی ہے کہ میں ولی عہد سوئم سے نکاح کر لوں تو یہ رضا مندی اس کی سرد مہری یا بے مروتی کی دلیل نہیں، بلکہ سراسر بر بناۓ محبت ہے۔ لیکن، وزیر نے اپنے دل سے کہا، نواب مرزا کی خوشنودی اپنی جگہ، پھر بھی مجھے تو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہے۔ یہ کوئی دگی کے معاملے تو ہیں نہیں کہ اگلا آؤ دیکھے نہ تاؤ بس بے خطر کود پڑے... جیسے میں کود پڑی تھی... مجھے اس پختہ سن و سال میں

ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہی انسب ہے۔

کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد وزیر بولی: ''ایک بات اور بھی ہے، اس کا بھی تذکرہ آپ سے کرنا اب ضروری ہو گیا ہے۔''

''جی فرمائیے،'' نواب مرزا نے ماں کی طرف کچھ اور پاس آ کر ذرا جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''وہ... بات یہ ہے... بات دراصل یہ ہے کہ اب آپ کی بھی عمر شادی کے لائق ہے۔ قلعے والی بات ہو یا نہ ہو پر اس گھر میں بہو کے قدموں سے روشنی ہو جائے، یہ میری بڑی تمنا ہے۔''

نواب مرزا بڑے زور سے چونکا۔ ''شادی، میری شادی؟ لیکن اماں جان ابھی تو میں اپنی بھی کفالت کے لئے آپ کا محتاج ہوں۔''

''سوچتی تو میں بھی یہی تھی کہ پرائی لڑکی گھر میں لاؤں...''

''پرائی لڑکی'' کا فقرہ سن کر نواب مرزا کو بےچینی سی ہوئی کہ یہ کس کی طرف اشارہ ہے۔ اس نے جلدی سے کہا، ''لیکن اماں جان...''

وزیر نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''صاحب زادے، پہلے بات تو سن لیں کہ میں کہہ کیا رہی ہوں... پرائی لڑکی کو گھر میں لاؤں تو کس بوتے پر لاؤں۔ نواب مرزا کسی قابل ہو لیں تو بات چلائی جائے۔ لیکن بڑی باجی نے کچھ اور ہی بات کہی۔''

اب نواب مرزا سے نہ رہا گیا۔ وہ اضطراراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''بڑی خالہ نے کیا کہا اماں جان؟ میرے بارے میں کچھ بات کہی کیا؟''

وزیر مسکرائی۔ وہ اپنے بیٹے کی بیتابی کا راز خوب سمجھتی تھی۔ اس نے کہا، ''انھیں انتظار تھا کہ میں تمھارے لئے فاطمہ کو ان سے مانگ لوں، پر میں کچھ کہتی نہ تھی تو ان کا بھی منھ نہ کھلتا تھا۔ اب یہ جو قلعے والی باتیں اٹھیں تو یہ ذکر بھی درمیان میں آیا۔ انھوں نے اشارے اشارے میں کہا کہ وہ تو تجھے خانہ داماد کی طرح بھی منظور کر لیں گی۔''

نواب مرزا کے چہرے کا رنگ کچھ متغیر ہوا۔ اسے فاطمہ دل و جان سے پسند تھی لیکن خانہ داماد بننے کا خیال اس کے دل سے بہت دور تھا۔

''اماں جان، یہی گھر جیسا بھی ہے میرا ہے اور فاطمہ کا بھی...'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''اے ہے بیٹا وہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب باتوں کی بات یہ ہے کہ بڑی باجی خوش ہوں گی، دل سے خوش ہوں گی اگر فاطمہ تم سے منسوب کر دی جائے۔ اور ظاہر ہے کہ میرے بھی دل کی چاہت یہی ہے۔ سو میں نے ان سے کہہ دیا جیسے فاطمہ میری بیٹی ویسے نواب مرزا تمھارا بیٹا۔ ہمیں دل سے رشتہ منظور ہے۔''

''خدا کی قسم اماں جان آپ نے میرے جسد مردہ میں جان ڈال دی۔'' نواب مرزا نے بڑھ کر اپنے بازو ماں کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ ''آپ کے ہزاروں احسان مجھ پر ہیں لیکن یہ احسان تو سب سے بڑھ کر ہے۔ میرا رواں رواں آپ کا غلام پہلے ہی تھا اب میں اور کیا آپ کی نذر کروں۔ جب تک جیوں گا آپ کو دعا دوں گا۔ اللہ آپ کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔''

نواب مرزا بار بار ماں کو گلے لگاتا، اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، اور کبھی ہنستا تو کبھی بھرائے ہوئے گلے سے ماں کی درازی عمر اور سلامتی کے لئے دعائیہ کلمات کہتا۔ وزیر کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ وہ چٹاچٹ بیٹے کی بلائیں لیتی اور کہتی، ''بچے میاں۔ میری درازی عمر کی دعا نہ کریں، میں تو دعا کرتی ہوں کہ میری عمر آپ کو لگ جائے، آپ کی آئی مجھے آجائے اور میں آپ دونوں کو ہنستا کھیلتا پھلتا پھولتا دیکھتی اس جہان سے رخصت ہوں۔''

جب دونوں کے دل کچھ ٹھہرے تو نواب مرزا نے کہا، ''اماں جان آپ یہ ہرگز خیال نہ کیجئے گا کہ میں جو آپ کو قلعے کا پیغام قبول کرنے کو کہتا ہوں تو اس وجہ سے کہ آپ کی اور بڑی خالہ کی بات فاطمہ کے باب میں ہوئی ہے یا ہونی ہے۔''

''نہیں، اب مجھے کوئی شک نہیں۔ پہلے بھی نہیں تھا، لیکن ایمان اور انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ بڑی باجی کی بات آپ سے پوشیدہ رکھوں تا کہ آپ کی جو صلاح ہو وہ کسی اور خیال کے تحت نہ ہو۔''

''جی ہاں۔ میں اس بات کو اور بھی واضح کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ وہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔ آپ قلعۂ مبارک میں داخل ہوں یا نہ ہوں، وہ الگ معاملہ ہے اور دوسرا معاملہ آپ بہنوں کے درمیان ہے۔ میں ایک کو دوسرے پر مشروط نہیں قرار دیتا۔ اصل مرضی آپ کی ہے۔''

''نواب مرزا مجھے آپ کی سعادت مندی سے یہی امید تھی۔ میں یہ سب باتیں بڑی باجی کے گوش گذار کر دوں گی۔ لیکن آپ بھی یہ سمجھ رکھیں کہ میں قلعے والوں کے یہاں شرطیں ضرور لگاؤں گی، وہ منظور ہوں یا نہ ہوں۔''

''لیکن اماں جان اپنی شرائط کی منظوری کو منظوری خطبہ کی شرط حاشا نہ ٹھہرائیے گا۔'' نواب مرزا نے گھبرا کر کہا۔ اس نے ''خطبہ'' کو بکسرِ اول بمعنی ''نکاح کا پیغام'' ادا کیا تھا۔

''بھئی واہ نواب مرزا آپ تو بالکل مولویوں والے کلام بول رہے ہیں... سچ ہے شاعروں کو ہر طرح کے قول اور فقرے آتے ہیں۔''

''اماں جان ہمیں باتوں میں نہ اڑائیے۔''

''صاحب زادے پہلے ہمیں شرطیں تو قائم کرنے دیجیے، پھر دیکھی جائے گی۔''

''بائی جی نے بھی تو کہا تھا کہ آپ کے بچوں کا سب حال ٹھیک ہوگا۔''

''انھوں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ قلعے کی بادشاہت کے بھی دن کبھی پورے ہوں گے۔''

''اماں جان۔ یہ تو عام سی بات تھی۔ اس کا کچھ اور مفہوم کیوں نکالیں؟''

''اچھا۔ دیکھی جائے گی۔'' وزیر نے ٹھنڈی سانس بھر کہا۔ ''میں کل صبح بڑی کے پاس جاؤں گی اور سب حال انھیں بتا دوں گی۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

''حبیبہ کو بھی سن گن دے دیجیے گا۔ کچھ نہ کچھ تیاریاں تو کرنی ہی ہوں گی۔ اور منجھلی خالہ صاحب کو تو ابھی سے کہلا دیجیے۔ انھیں سفر کا انتظام کرنا ہوگا، نواب صاحب سے اجازت لینی ہوگی۔''

وزیر خانم ایک لمحے کو دل میں ٹھٹکی۔ بڑی باجی کے دل میں منجھلی باجی کے لئے کچھ خاص پاس و لحاظ نہ تھا۔ نواب یوسف علی خان سے بے نکاح کیے متوسل ہونا اور اسی غیر شرعی تعلق پر قائم رہنا بڑی کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ بجا کہ نواب صاحب نے منجھلی باجی کے ساتھ متعہ کا صیغہ پڑھوا لیا تھا، لیکن ہم لوگوں کی نگاہ میں تو متعہ کچھ معنی نہ رکھتا تھا... اونہہ، ہوگا۔ چھوٹی بیگم نے دل ہی دل میں انگریزوں کی طرح کندھے اچکائے (یہ ادا اس نے مارسٹن بلیک سے سیکھی تھی، لیکن کسی کی موجودگی میں وہ کندھے ہرگز نہ اچکاتی تھی) منجھلی باجی بھی تو میری حقیقی بڑی بہن ہیں، اور انھوں نے مجھ پر لاتعداد احسان کئے ہیں۔ میں بڑی باجی کو بتا دوں گی، ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اور مجھے یقین ہے بڑی باجی کو اس بات پر خوشی ہی ہوگی کہ منجھلی باجی اس رسم میں شریک رہیں۔ رہے مولوی محمد نظیر صاحب، تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں بڑے بڑے مولانا اور متشرع لوگ بھی نکاح کے باہر ایک دو آشنائیاں کھلے بندوں رکھتے تھے۔ خود بڑے دولہا بھائی صاحب ایسے نہ ہوں، لیکن دستورِ زمانہ تو یہی ہے۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' وزیر نے توقف کے بعد کہا، اس درمیان نواب مرزا اس کا منہ تکتا رہا تھا

کہ اماں جان کو جواب دینے میں تکلف کیوں ہے۔" آج ہی تو نہیں، لیکن معاملات طے ہوتے ہی میں ڈاک ہرکارے کے ہاتھ منجھلی باجی کو نامہ بھیج دوں گی اور کہوں گی کہ جلد تشریف لے آویں۔"

اگلے پانچ سات دنوں میں سب تفصیلات معرض بحث میں لے آئی گئیں۔ بچوں کے بارے میں میرزا فخرو بہادر نے کہلایا کہ نکاح کے چند دن بعد نواب میرزا کو قلعے میں بلا لیا جائے گا اور وہ ولی عہد سوئم کے فرزند کی حیثیت سے قلعے میں تربیت پائیں گے، تعلیم حاصل کریں گے، اور ماں کے ساتھ ولی عہد سوئم کے مکان اندرون قلعہ میں قیام پذیر ہوں گے۔ ان کی تعلیم، تربیت، نگہداشت، سب ولی عہد سوم کے ذمہ ہوگی۔ شاہ محمد آغا کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں، ان کی پرورش و پرداخت اندرون حویلی مبارک کماینبغی نہ ہو سکے گی۔ ان کے لئے کچھ روزینہ مقرر ہو جائے گا لیکن ان کے پالنے پوسنے کا انتظام وزیر خانم کو بیرون حویلی خود کرنا ہوگا۔ وزیر نے دل میں سوچا کہ اصل وجہ یقیناً کچھ اور ہوگی، اور وہ یہ کہ شاہ محمد آغا ہر چند کہ شیر خوار نہ تھے، لیکن ننھے بچے تھے، اگر وہ ساتھ ہوئے تو میری بہت ساری توجہ اور بہت ساری مصروفیت انھیں کی طرف ہوگی۔ بدیں صورت میں روزاں وشباں صاحب عالم بہادر کی خدمت نہ کر سکوں گی۔ اسے غصہ تو بہت آیا لیکن ٹھنڈے دل سے سوچیں تو بات میں وزن تھا۔ نواب مرزا کو بلوا لیا جانا ایک طرح وزیر کی بڑی کامیابی تھی، لیکن یہ خود اللہ رکھے نواب مرزا کے ہونہارپن اور اہل نظر کی نگاہوں میں ان کی قدر و قیمت اور آئندہ کے لئے ان سے توقعات کا ثبوت تھا۔

مہر کے بارے میں کہلایا گیا کہ ایک لاکھ روپے مہریں شاہی (یعنی کمپنی بہادر کا روپیہ نہیں، چودہ آنے خالص چاندی کا محمد شاہی روپیہ) اور سو اشرفیاں شاہ عالمی مجوز ہیں، لیکن یہ سب موجل ہوگا، معجل کچھ نہ ہوگا۔ اس کے عوض یہ بھی تھا کہ لڑکی والوں کی طرف سے گھوڑے جوڑے، دعوت مدارات، زیور کپڑے کی قسم سے کچھ مطلوب نہ تھا۔ دلہن کے ساتھ بطور جہیز ایک یا دو خادمائیں بخوشی آسکتی ہیں، انھیں بھی قلعے میں جگہ دی جائے گی۔ دلہن کو چڑھاوے میں اور سلامی میں جو کچھ ملے گا وہ اس کا حق ہوگا۔ ایک نکاحی جوڑا بادشاہ ذی جاہ کی طرف سے اور ایک صاحب عالم و عالمیان میرزا فخرو بہادر کی طرف سے عطا ہوگا۔ نکاح نامہ لکھا جائے گا اور اس پر دستخط نکاح خواں کے ساتھ دستخط ناکح و منکوحہ کے بھی ہوں گے۔ نکاح کے بعد قلعۂ میمون سے نالکی مع دو سوار اور چار چوبدار آئے گی اور دلہن کو سوار کرا کے اندرون حویلی لے آئے گی۔

وزیر کو ترک شاہ محمد آغا کے سوا سب شرطیں منظور تھیں اور بار بار اس کے جی میں آتی تھی کہ صاف کہلا دوں، آغا صاحب نہیں تو ہم بھی نہیں۔ لیکن ایک طرف بائی جی کی بات یاد آتی تھی کہ بچوں کا حال اچھا ہی رہے گا، اور یہ سب امور تو مقرر ہیں، اور دوسری طرف اپنے اور نواب مرزا کے مستقبل کا خیال آتا تو قلعے کی زندگی سے بہتر اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ ایک بار بائی جی کے پاس چلیے اور پھر پوچھیے کہ سچ معنوں میں میرے حق میں اچھا کیا ہوگا۔ لیکن اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ یہ سراسر گستاخی تھی۔

بالآخر وزیر نے مفاہمت کی ایک صورت نکال لی: ٹھیک ہے، میں شاہ محمد آغا کا کچھ اور انتظام کر لوں گی، لیکن جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو انھیں بھی قلعے میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔ اور جب تک وہ چھوٹے ہیں، مجھے حق ہوگا کہ کبھی کبھی ان کو قلعے بلوا کر دیکھ لوں یا اگر ان کا جی ماندہ ہو ان کے معالجے اور تیمارداری کے لئے انھیں اپنے پاس بلوا لوں۔

ولی عہد سوئم بہادر نے بے تکلف یہ بات منظور کر لی۔ شاہی جوتشی کے مشورے سے مبارک دن متعین کیا گیا۔ اس سے ایک رات قبل وزیر خانم رخصتی کے لئے بڑی بیگم کے گھر منتقل ہو گئیں۔ وقت مقررہ پر مولوی امام بخش صہبائی صاحب نے وزیر سے اجازت مانگی کہ کیا میں وکیل بن کر تمھارا نکاح صاحب عالم و عالمیان میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین فتح الملک بہادر ولی عہد سوم دولت ہندوستان سے بعوض ایک لاکھ روپے مہر شاہی اور سو اشرفیاں عالم شاہی بہ گواہی مولوی محمد نظیر رفاعی مجددی و احترام الدولہ عمدۃ الحکما حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر پڑھا دوں؟ وزیر کی طرف سے صاف حرف ایجاب سن لینے کے بعد مولانا صہبائی اور مولوی محمد نظیر سوار ہو کر قلعے تشریف لے گئے جہاں مختصر سی محفل نکاح برپا کی گئی تھی۔ گواہوں اور حضار مجلس کی موجودگی میں مولانا صہبائی نے نکاح پڑھایا اور نکاح نامے پر صاحب عالم اور گواہان کے دستخط لئے۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ میرزا فتح الملک اس قدر مسرور تھے گویا ان کی نو عمری ہو اور ارمان بھرا پہلا نکاح ہو۔ تقسیم شیرینی کے بعد محفل برخاست ہوئی۔

میرزا فتح الملک بہادر نے نواب زینت محل کی خاص ناکی بادشاہ سے کہہ سن کر اپنی دلہن کے لئے مہیا کرا لی تھی۔ انھوں نے اپنی پہلی بیوی مرحومہ کے خاص نکاحی جوڑے جو موجودہ بیوی کو نہ دیئے تھے، وزیر کے لئے پہلے ہی روانہ کر دیئے تھے۔ منجھلی بیگم جنھیں نوابین اور ارباب حکومت کے طور طریقوں کا تجربہ تھا، چاہتی تھیں کہ قلعے سے جو سامان اور سواری اور سواران آئیں ان کے علاوہ لڑکی والوں کی طرف

سے کچھ نہ جائے۔ لیکن وزیر، جواب تک تو سب انتظامات خاموشی سے دیکھ رہی تھی، اس نے اس بابت صاف کہا کہ حبیبہ تو جائے گی ہی، لیکن حبیبہ کے سوا بھی بڑی باجی اور دولہا بھائی صاحب کچھ بھیجنا چاہیں وہ ضرور جائے گا، نہیں تو قلعے والے جائیں چولھے بھاڑ میں۔

''اے ہے بنو کیسے کلام منھ سے نکالتی ہے!'' عمدہ خانم نے کہا۔ ''کوئی سن سنا لے گا تو ہونٹھوں نکلی کوٹھوں چڑھی ہو جائے گی۔''

''اللہ آپ کی بات تو ٹھیک ہے منجھلی باجی۔ پر یہ کیونکہ ہو سکے ہے کہ میں سر ڈولی پاؤں کہار آئیں بیوی نو بہار کی مصداق بن کر بے حیائی سے ننگی بوچی قلعے میں دھنس پڑوں۔''

''بات تو منجھلی ٹھیک کہتی ہیں کہ قاعدے کے موافق تو یہی ہونا چاہیئے۔'' بڑی نے کہا۔ ''لیکن چھوٹی کو بطور خاص چاہا گیا ہے، وہ کوئی عام طرح کی دلہن تھوڑی ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں نواب کے زمانے کے کچھ اپنے قیمتی زیور اور لباس ضرور ساتھ لے جانے چاہئیں۔''

وہ ۱۴ محرم الحرام ۱۲۶۱ مطابق ۲۴ جنوری ۱۸۴۵ کی سرد لیکن سہانی، دھند اور ہلکے پر اسرار، میٹھے دھوئیں میں لپٹی ہوئی شام تھی جب بعد نماز مغرب عمدہ خانم، نواب مرزا، امۃ الفاطمہ، اور مولوی محمد نظیر رفاعی مجددی نے آرزوؤں اور امیدوں بھرے دل کے ساتھ چھوٹی بیگم کو قرآن کے سائے میں نالکی پر سوار کرایا۔ اکبری خانم اسی نالکی میں دلہن کے ساتھ سوار ہوئیں۔ پیچھے پیچھے دوسری پالکی پر حبیب النسا زیورات کی قطعی اور کپڑوں کے صندوق کے ساتھ تھیں۔ شاہ محمد آغا مچلے ہوئے تھے کہ ہم ساتھ جائیں گے لیکن بڑی بیگم کی مغلانی نے انھیں بہلا پھسلا کر بازار کی سیر کرنے کے لئے مولوی محمد نظیر کے ایک خادم اور ایک مرید کے ساتھ باہر بھیج دیا۔ بڑی بیگم کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ لیکن وہ خوشی کے آنسو تھے کہ آج اللہ نے یہ دن نصیب کیا کہ میں خود پوری چاہ اور ارمان کے ساتھ چھوٹی کو سجا بنا کر دلہن بنا کر اس کے دولہا کے گھر بھیجوں۔ کوئی بابل گانے والیاں نہیں ہیں تو نہ سہی، لیکن دل تو میرا غمگین بھی ہے اور خوش بھی ہے۔ آج اماں اور ابا جان ہوتے تو انھیں جو دکھ چھوٹی نے دیئے تھے ان کا معاوضہ وہ اس مبارک تقریب کی صورت میں ملتا دیکھ کر کس قدر خوش ہوتے اور مجھے اور چھوٹی کو کتنی دعائیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ یہ جوڑا سلامت رکھے اور مجھے بھی طاقت دے کہ شاہ محمد آغا کو خوب درستی کے ساتھ پالوں پوسوں۔ مدتیں ہو گئیں، جب سے فاطمہ بڑی ہوئی میں نے کسی بچے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو میری عزت رکھ لے۔

قلعۂ معلیٰ کے اندر شاہی محلات کی طرف جانے والی راہ کے دروازے پر قلماقنیوں، اردابیگنیوں، اور ترکنوں کی ایک فوج استقبال کو کھڑی تھی۔ انھوں نے نالکی کو ہر طرف سے گھیر لیا اور بعض ہمت والیوں نے کچھ چلبلا پن دکھاتے ہوئے نالکی کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر دیکھا اور ''صل علیٰ'' کہتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ ایک نے ذرا اور ہمت کی اور اپنے پاس والی سے ہنس کر کہا:

''اے سبحان اللہ، سردیوں کا چاند تو دھندلا سنا اور دیکھا تھا پر یہ تو سرد پونم کا چاند ہے کہ دیکھتے ہی جی نہال ہو جائے۔''

''ہاں بیوی، کالے گلاب سا پڑا دہک رہا ہے۔''

''اری کمبختیو جلد جسولنی کو مہابلی کے محل میں بھیجو، کہلا دو کہ چندے آفتاب چندے ماہتاب بہو بیگم تشریف لا چکی ہیں۔''

مہابلی دیر گئے سکھ کرنے تشریف لے جاتے تھے، لیکن عموماً بعد نماز مغرب کسی کو باریاب نہ کرتے تھے۔ اس بار حکم خاص تھا کہ اگر دلہن کے مقدم میں بہت دیر نہ ہوئی ہو تو ہمیں اطلاع پہنچائی جائے۔ دلہن ہم سے منھ دکھائی لے کر اپنے محل میں تشریف لے جائیں۔ حسب الحکم ایک جسولنی تیز تیز تسبیح خانے کی طرف گئی۔ نالکی بردار نالکی کو یوں ہی لئے کھڑے رہے۔ استقبال کرنے والیوں میں بعض جو زینت محل کے لئے مخبری بھی کرتی تھیں، ایک ایک بات کو غور سے ذہن نشین کر رہی تھیں کہ کن کن نے دلہن کی تعریف کی، کن نے کوئی خاص دلچسپی نہ دکھائی، اور کتنی خصوصی طور پر مستعدی دکھا رہی تھیں۔

ذرا سی دیر میں میرزا فتح الملک بہادر آگے آگے اور جسولنی پیچھے پیچھے آتے دکھائی دیے۔ جسولنی نے آ کر حکم سنایا کہ مہابلی بدولت و اقبال دلہن بیگم کو یاد فرماتے ہیں۔ اب یہ قافلہ آگے بڑھا اور دروازۂ تسبیح خانہ پر آ کر نالکی برداروں نے دلہن کی نالکی ایک سنگ مرمر کی چوکی پر رکھ دی جو دروازے کے سامنے بنی ہوئی تھی۔ میرزا فخرو نے چاہا کہ دلہن کو گود میں لے کر نالکی سے اتاریں کہ دو نہایت قوی ہیکل، عمر رسیدہ لیکن کسے ہوئے بدنوں والی حبشنوں نے آگے بڑھ کر ہنستے ہوئے غایت بے تکلفی سے کہا:

''اے ہے صاحب عالم ولی عہد بہادر، اتنے اتاولے ہوئے جاتے ہیں۔ نالکی سے اتارنا تو ہمارا کام تھا، اور ہم غریبوں کے نیگ تو ارزانی ہو جاتے نہیں تو آپ کی بیگما نالکی ہی میں اٹکی لگی رہیں گی۔''

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ لیکن میرزا فخرو اتنی آسانی سے خفیف ہونے والے نہ تھے۔ انھوں نے ہنس کر جواب دیا:

''یاقوت النساتم نہ جانے کتنی دلہنوں کو پار گھاٹ لگا چکی ہو، کبھی ہم کو بھی موقع دیتیں۔''

''سرکار آپ کے تو موقعے ہی موقعے ہیں، ہاں زر کامل ہم مفلسوں کے ہاتھ بھلا روز روز کہاں لگے ہے۔'' ان دونوں فقروں پر کئی جانب معنی خیز مسکراہٹیں بھی ہوئیں، کہ یاقوت النسا اور اس کی ساتھن زیتون آرا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دوست باز ہیں۔

''بھئی ہم تو قوم کے ترک ہیں، کسی کو اپنے مال میں ہاتھ لگانے نہیں دیتے۔''

''مرشد زادۂ آفاق کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم اٹھا کر آپ کے ہاتھ میں دیویں جب تو وہ مال آپ کا ہووے گا۔''

''بیوی یہ تو عطیۂ خداوندی ہے، کوئی پیڑ سے ٹپکا ہوا پھل تھوڑی ہے کہ آپ اٹھا کر کسی کو دے ڈالیں۔'' میرزا فخرو بہادر نے ہنس کر کہا۔

''سرکار قسم لے لیں تیسوں کلام کی میں نے نالکی میں جھانکا تو آنکھیں چوندھیا گئیں۔ پیڑ سے ٹپکے ہوئے پھل کا کیا مذکور ہے، مجھے لگا اللہ پاک نے چھینکے میں بجلی بھر کر لٹکوا دی تھی پھر قدرت خداوندی سے ہوائے وصال چلی...''

''...اور وہ چھینکا ٹوٹ کر جناب کے دامن پاک میں آ رہا۔'' زیتون آرا نے جملہ پورا کیا۔

اس پر پھر زور کا قہقہہ لگا۔ قہقہے میں فتح الملک بہادر بھی شریک تھے۔

''آپ بی بی بلائی ہونٹ چاٹا کریں۔'' جب ہنسی کچھ تھمی تو شہزادے نے کہا۔ ''چھینکا تو جہاں پہنچنا تھا پہنچ چکا۔''

اس اثنا میں میرزا فخرو بہادر کی اردابیگنی سارے مجمعے میں پانے والیوں کی حیثیت کے موافق روپے اور سونے کے چھلے بانٹ رہی تھی۔ تقسیم ابھی جاری تھی کہ تسبیح خانے کا پردہ کھنچا اور قلماقنی نے پکارا:

''اعلیٰ حضرت دولہا دولہن کو طلب فرماتے ہیں۔''

یاقوت اور زیتون نے جھٹ آگے بڑھ کر نالکی کا دروازہ پورا کھولا اور وزیر کو، جو زرق برق لیکن سمٹی ہوئی سی بیٹھی تھی، بآسانی ہاتھوں پر اٹھا کر نالکی کے باہر لے لیا۔ ''بسم اللہ، قرآن درمیان، چادر لاؤ'' کی آوازوں کے ساتھ چار عورتوں نے ایک بڑی چادر زرنگار پھیلا کر سایہ کر لیا۔ اس طرح یاقوت اور زیتون کی گود میں گٹھری سی بنی ہوئی وزیر خانم چادر کے نیچے لائی گئیں اور یہ جلوس آہستہ آہستہ تسبیح خانے کی طرف چلا۔ حبیبہ کی پالکی کو دو اردابیگنیاں اپنے ساتھ لے کر ولی عہد سوئم کی ڈیوڑھی پر چلی گئیں۔ ادھر تسبیح

خانے کی دہلیز پار کر کے یاقوت اور زیتون نے وزیر خانم کو بآہستہ گود سے اتارا اور سہارا دے کر آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ لمبے گھونگھٹ کے پیچھے سے وزیر کو کچھ نظر نہ آتا تھا، لیکن دونوں جشنیں دونوں طرف سے اس کے بازو ہلکے سے تھامے ہوئے اسے راستہ دکھاتی چلیں لہٰذا اسے کچھ مشکل نہ ہوئی۔

حفاظتی اور خیر مقدمی ترکنیں اور جشنیں باہر ٹھہر گئی تھیں۔ اب وزیر کے ساتھ یاقوت اور زیتون تھیں اور ان کے آگے میرزا فخرو بہادر نپے تلے آہستہ لیکن خود اعتمادی سے بھرپور قدم اٹھا رہے تھے۔ تسبیح خانہ روشنی سے جھکا جھک ہو رہا تھا، اس قدر کہ روشنی کی لپٹیں گھونگھٹ پار کر کے وزیر خانم کی آنکھوں تک پہنچیں۔ اللہ معلوم ہوتا ہے ساری دلی کے قمقمے اسی جگہ یکجا کر دیئے گئے ہیں، اس نے اپنے دل میں کہا۔

''خبردار ہو!''

''اللہ و رسول خبردار!''

''ادب سے کرو مجرا۔ جہاں پناہ مہابلی سلامت! پہلی آداب گاہ!''

''ملاحظہ! آداب سے کرو مجرا! دوسری آداب گاہ!''

''جہاں پناہ بادشاہ سلامت!''

''نگاہ روبرو! تیسری آداب گاہ!''

پہلی آداب گاہ تسبیح خانے کا صدر دروازہ، دوسری آداب گاہ بانات کا بھاری پردہ جسے ہر آداب کرنے والے کے لئے بطور خاص کھینچ کر کھولتے تھے۔ پردے کے اندر داخل ہوں تو سامنے بادشاہ سلامت تشریف فرما نظر آتے تھے۔ وہیں رک کر تیسری بار تسلیمات بجالا کر ہر آنے والا اپنی مقررہ جگہ پر ٹھہر جاتا تھا اور ہاتھ زیر ناف باندھ کر بالکل سیدھا دیکھتا رہتا تھا۔

''نواب دلہن صاحب کا مجرا قبول ہو!''

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اللہ رسول کی امان! دشمن پائمال، بلائیں رد! دلہن صاحب تسلیمات بجالاتی ہیں۔''

قیمتی قالینوں کا فرش، چاروں طرف بھاری اطلسی پردے، بیچوں بیچ سنگ مرمر کی نشست گاہ جس پر بادشاہ سلامت دو زانو متمکن، چہرے پر سینکڑوں برس کے شاہی خون کا تیج، بدن بالکل سیدھا، گردن فراز اور اعتماد سے بھرپور، گویا جلال الدین محمد اکبر کی روح مجسم ہوگئی ہو۔ وزیر نے جوں توں کر کے کورنش ادا کی، پھر ایک تسلیم کر کے دل میں متوحش ہوئی کہ اب کدھر جاؤں۔ لیکن بادشاہ سلامت کی آواز

سنائی دی، نہایت شائستہ، لیکن مضبوط، خوداعتمادی اور احساس اقتدار سے بھرپور، کہ سلطنت نہ سہی، لیکن ہم بادشاہ اب بھی ہیں اور وقت آنے پر میدان بھی سنبھال سکتے ہیں:

''سبحان اللہ، ہم میرزا فخرو بہادر کی نظر کے قائل ہو گئے۔ اللہ چشم زخم سے محفوظ رکھے۔''

یاقوت النسا نے وزیر کو ہلکے سے ٹھوکا دیا کہ ذرا اور آگے بڑھیے۔ وزیر نے بمشکل دو تین قدم آگے بڑھائے۔ محفل کا رعب اس قدر تھا کہ اس کے پاؤں اٹھتے نہ تھے۔ جہاں پناہ نے اشارہ کیا تو قلماقنی نے ان کے پہلو میں رکھی ہوئی قطبی کھولی اور اس کے اندر سے مالائے مروارید نکالی۔ بادشاہ کے دوسرے اشارے پر وہ مالا اس نے وزیر کے گلے میں ڈال دی۔ وزیر نے تین تسلیمیں ادا کیں اور پھر اسی پریشانی میں پڑی کہ اب کیا کروں۔ لیکن جہاں پناہ پھر گویا ہوئے:

''ہم آپ کو شوکت محل کہہ کر پکاریں گے۔ ہماری تمنائے دلی ہے کہ آپ دونوں کو ساری کامگاریاں دین و دنیا کی نصیب ہوں اور ازدواج کی تمام مسرتیں آپ کے گرد ہمیشہ حلقہ زن رہیں۔''

''آمین! اللہ رسول کی پناہ بنی رہے! بنا بنی کے دل ملے رہیں! شوکت محل صاحب کو خطاب مبارک ہو!'' کی آوازیں ہر طرف سے اٹھیں۔ پھر فوراً ہی نقیب نے پکارا:

''گوہر اکلیل سلطنت، طرۂ تاج خلافت، ولی عہد سوئم غلام فخر الدین فتح الملک مرزا محمد سلطان بہادر!''

یاقوت نے وزیر کو ہلکے سے اشارہ کیا کہ الٹے پاؤں تین قدم واپس آکر ایک جانب کھڑی ہو جائیے۔ وزیر ابھی واپس جا ہی رہی تھی کہ میرزا فخرو نے تیسری آداب گاہ سے مجرا کیا، پھر چار قدم آگے آکر مہابلی کو نذر دی۔ بادشاہ نے نذر کو ہاتھ سے چھو لیا اور نذر نثار نے پیچھے سے بڑھ کر نذر کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور ولی عہد سوئم بہادر کو تسلیم کی۔ شاہزادہ الٹے پاؤں آداب گاہ پر واپس آیا۔

اس سے پہلے کہ شہزادے کو خلعت عطا ہو، بادشاہ سلامت اچانک گویا ہوئے:

''اماں میرزا فخرو بہادر۔''

''حاضر ہوں پیر و مرشد۔''

''وہ جو ایک لمڈا ہے نہ شمس الدین احمد کی یادگار، اچھے شعر کہتا ہے۔''

''بہت درست پیر و مرشد۔''

''نظر نہیں آیا، بھلا سا نام ہے اس کا۔''

''جی عالیجاہ، نواب مرزا۔''

''آہاں، نواب مرزا خان۔ تو کیا اس کی کیفیت ہے؟''

''مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی اعلیٰ حضرت، اس کی باریابی کا حکم بندگان عالی سے نہ لیا۔''

''اسے سائے اپنے ہی میں رکھو۔ اس کے لئے وجہ مقرری کا حکم صادر ہو جاوے گا۔''

''بندہ پروری اور فیض رسانی پیر و مرشد کرامت پناہ کی ہے۔ سرکار دولت مدار کے ارشاد کی تعمیل بفور ہوگی۔''

''درست،'' عالم پناہ نے فرمایا۔

''خطاب خانی سے مخاطب و معزز کیے جانے پر برخوردار نواب مرزا خان اور اس کی والدہ کی جانب سے یہ بندہ آستانہ بارگاہ شہنشاہی پر متشکر اناصیہ سا ہے۔''

اب توشک بردار ایک چاندی کی سینی میں خلعت لئے ہوئے آگے بڑھا۔ شاہزادے نے تین تسلیمیں کر کے توشہ بردار سے خلعت لے کر پہنی، پھر آگے آ کر بادشاہ دیں پناہ کی خدمت میں دوبارہ کورنش ادا کی۔ بادشاہ سلامت نے از راہ بندہ نوازی جیغہ، سرپیچ، اور گوشوارہ اپنے ہاتھ سے شہزادے کے سر پر باندھا۔ پھر مالائے مروارید اس کے گلے میں ڈالی، سپر کو پشت سے آویزاں کیا اور تلوار گلے میں حمائل کی۔ شہزادے نے خلعت کی نذر گذرانی جسے حسب معمول بادشاہ کے ہاتھ سے مس کر کے نذر نثار نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب بادشاہ نے فاتحہ کو ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ ختم ہوتے ہی نقیب پکارے:

''دربار برخاست۔''

بادشاہ جمجاہ نے پاؤں تخت سے نیچے لٹکائے، چرن بردار نے سونے سے لپی ہوئی شاہی جوتیاں بانات سے کھول کر نکالیں اور پائے مبارک میں پہنائیں۔ بادشاہ آہستہ آہستہ اندرون محل کی طرف تشریف لے گئے۔ جب آوازیں سنائی دیں کہ بادشاہ سلامت اپنے محل میں قدم رنجہ فرما چکے ہیں تو حاضرین دربار بھی اپنی جگہ سے ہلے۔ باہر نالکی موجود تھی، وزیر کو حسب سابق سوار کرایا گیا اور نالکی برداروں نے بسم اللہ کہہ کر فتح الملک بہادر کی ڈیوڑھی کا رخ کیا۔

صاحب عالم و عالمیان

میرزا فخرو بہادر کے مستقر پر وزیر خانم کے پہنچتے ہی حبیبہ نے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ بڑی بیگم اس کی بلائیں لے کر رخصت ہوئی۔ مولوی محمد نظیر کی ہدایت تھی کہ بیوی تمھیں قلعے میں ٹھہرنا نہیں ہے، بس دلہن کا سب انتظام کر کے الٹے پاؤں واپس آ جائیو۔

''تمھیں اللہ اور اس کے حبیب کی امان میں دیا۔'' اکبری خانم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اللہ کرے تمھیں اب سکھ ہی سکھ نصیب ہوں۔''

وزیر نے بڑی بہن کے گلے سے لگ کر سرگوشی میں کہا۔ ''اللہ بڑی باجی آپ میرے لئے ہر وقت دعا کرتی رہیئے گا۔''

اکبری بیگم کے جانے کے بعد حبیبہ نے جھٹ پٹ وزیر کی ضروری آرائش کر کے اسے شبستان عروسی میں پہنچا دیا۔ وزیر کو ایک عمر پہلے کی وہ رات یاد آئی جب حبیبہ نے نواب شمس الدین احمد خان کے مہمان خانے میں اس کی خدمتیں کی تھیں۔ اس کا دل لہو سے بھر گیا۔ کیا میں اپنے نواب شہید کو کبھی نہ بھول سکوں گی؟ ایسے موقعے پر بھی نہیں جب میری کتاب زندگی از سر نو لکھی جا رہی ہے؟ وزیر کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے دیکھ کر حبیبہ سمجھ گئی کہ یہ خوشی کے آنسو نہیں، اور ایک طرح دیکھیں تو غم کے بھی نہیں، بلکہ داغہائے سینہ کے سدا بہار پھولوں پر گذشتہ یادوں کی شبنم اس رات کی گل زمین کے سینے میں پیوست ہو جانے کے لئے بیچین ہے۔ حبیبہ نے ہلکی سبز ململ کا بینی پاک لے کر بہت آہستہ آہستہ وزیر کے آنسو خشک کئے اور سرگوشی کے لہجے میں بولی:

''خانم صاحب جی کو سنبھالئے۔ شاہزادے صاحب آتے ہی ہوں گے۔ ان دنوں کی یاد تو ہمیشہ ہری رہے گی۔ لیکن اس وقت نہیں۔ للہ اس وقت کے نئے پھولوں کو کھلنے دیجے۔''

وزیر نے ایک سسکی بھر کر سر کے اشارے سے ہاں کہی اور بولی: ''جی ہے کہ بے وجہ امڈا آتا ہے۔ پر تم ٹھیک کہتی ہو حبیبہ۔ مجھے آپ کو سنبھالنا چاہیئے۔ تھوڑا سا پانی پلوا دو۔''

''لیجیے پانی حاضر ہے، لیکن اب میں رخصت ہوتی ہوں۔ دیکھئے آپ کو میری جان کی قسم یہ دکھ کے نشان چہرے سے مٹا ڈالیئے۔''

شبستان عروسی میں ہلکے سبز اور ہلکے نیلگوں رنگ کے کنول روشن تھے۔ روشنی دھیمی تھی لیکن بہت صاف اور سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ چھپر کھٹ پورا آراستہ اور اونچا تھا، اتنا کہ پلنگ پر پاؤں دھرنے کے لئے زینہ درکار تھا۔ لکڑی کا زینہ لیکن بہت بھاری اور اس پر نقش و نگار اس طرح کے بنے ہوئے تھے کہ اس پر پاؤں رکھیں تو پھسلنے کا بالکل امکان نہ تھا۔ حبیبہ نے وزیر کو دلہنوں کی طرح پلنگ پر بٹھا دیا، دونوں گھٹنے سینے کی طرف مڑے ہوئے، سر گھٹنوں پر ٹکا ہوا، گھونگھٹ سے چہرہ و سر پوری طرح ڈھکے ہوئے، دونوں ہاتھ ڈوپٹے میں چھپے ہوئے اور گود میں ہلکے رکھے ہوئے۔ لیکن وزیر کے ذہن میں تناؤ اتنا تھا کہ اس کے ہاتھ اور گھٹنوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ حبیبہ کے باہر جانے پر اس نے آنکھیں بند کر لیں، ہر چند کہ اسے اس طرح نویلی دلہن بن کر بیٹھنے پر شرم سی آ رہی تھی۔

حبیبہ باہر نکل کر صدر دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ میرزا فتح الملک بہادر تشریف لے آئے، آگے آگے دو مشالچی، پیچھے دو عصا بردار۔ قلماقنی نے پکارا، ''ولی عہد سوئم بہادر سلامت'' اور سب کا سلام لیتے ہوئے میرزا فخرو بہادر دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ان کی نگاہ حبیبہ پر پڑی۔ ڈھلتی عمر کی، لیکن ناک نقشے سے درست، شرفا جیسا لباس پہنے ہوئے اجنبی عورت کو دیکھ کر وہ ذرا چونکے تھے کہ حبیبہ نے آگے بڑھ کر تین تسلیمیں ادا کیں اور نہایت مہذب لہجے میں کہا:

''بندی مرشد زادۂ آفاق کی خدمت میں تسلیمات عرض کرتی ہے۔ مجھے حبیب النسا کہتے ہیں، میں سرکار دلہن بیگم صاحب میں مامور بہ خدمت گذاری ہوں۔''

میرزا فخرو کو حبیبہ کا سبھاؤ بہت بھایا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا، ''اے آمدنت باعث دلشادی ما، لیکن دلہن بیگم صاحب نہیں، شوکت محل کہیئے۔ آپ کی خانم کو بارگاہ خسروی سے یہی خطاب عطا ہوا ہے۔''

''سبحان اللہ کیا مناسب خطاب ہے۔ اللہ آپ دونوں کو مبارک کرے۔ تشریف لے چلیں، حجلۂ عروسی آپ کا منتظر ہے۔''

''بسم اللہ۔''

حبیب النسا در حجرہ تک ساتھ گئی، پھر آداب کر کے الٹے پاؤں وہاں سے ہٹ آئی۔ مرشد زادۂ آفاق میرزا فتح الملک بہادر نپے تلے آہستہ قدموں لیکن کچھ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر پہنچے۔ وزیر کو اس حال میں دیکھ کر ان کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے آغوش میں لے لیں، لیکن پھر خیال آیا یہ عمل بے تمیزی میں شمار ہو سکتا ہے، ورنہ غیر ضروری بے صبراپن تو ہے ہی۔ میرزا فخرو حسب سابق آہستہ قدم آگے بڑھے۔ ادھر وزیر نے آہٹ جو سنی تو سر اٹھایا اور چاہتی تھی کہ سرو قد کھڑی ہو کر استقبال کرے۔ لیکن میرزا فخرو اب پلنگ تک پہنچ چکے تھے، انھوں نے کہا:

''تسلیمات عرض کرتا ہوں۔'' پھر انھوں نے ہاتھ بڑھا کر وزیر کو روکا۔ ''واللہ آپ زحمت نہ کریں۔'' پھر وہ تھوڑی سی ہنسی ہنس کر بولے، ''ہم خود ہی آئے جاتے ہیں۔ اس مبارک موقعے پر بارگاہ الٰہی میں جتنا شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔''

پھر میرزا فتح الملک بہادر نے پلنگ کے بالکل پاس جا کر دایاں ہاتھ وزیر کے سر پر رکھا اور شعر پڑھا۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

چھپر کھٹ کا زینہ طے کر کے میرزا فخرو نے چاہا کہ چھپر کھٹ کے کنارے پر بس ٹک جائیں، لیکن وزیر نے کچھ پریشانی کے عالم میں اپنے پہلو کی جگہ خالی کر کے اٹک اٹک کر کہا:

''تشریف لائیں۔ بہت جگہ ہے۔''

''جگہ آپ کے دل میں ہو تو ایک بات بھی ہو۔ چھپر کھٹ پر آپ بیٹھیں نہ بیٹھیں ہم نے اپنے دل میں آپ کو بٹھا لیا ہے۔''

اب وزیر کی ہمت کچھ کھلی۔ ''اہلاً و سہلاً، یہ شیشہ ایک عمر سے مشتاق سنگ تھا۔''

''واللہ کیا مصرع نکال کر لائیں۔ لیکن مشتاقی تو ہم لوگوں کا وظیفہ ہے...'' میرزا فخرو نے آہ بھری۔ ''آپ کیا جانیں ہم پر آپ کے فراق میں کیا کیا گذرتی رہی رہے۔'' پھر انھوں نے خواجۂ شیراز کا مصرع پڑھا ع

اِنّی رَاَیتُ دَھراً مِن ھِجرِکَ القِیامہ

(میں نے تمھارے ہجر میں قیامت کا زمانہ دیکھا ہے۔)

وزیر عربی سے نابلد تھی، لیکن میرزا فخرو بہادر کو شاید غلط فہمی تھی کہ وہ عربی سے واقف ہے، یا وہ شاید سمجھ رہے تھے کہ حافظ کی غزل ہے، وزیر اس سے تو ضرور آشنا ہوگی۔ دربار کی شان اور گذشتہ زندگی کی یادوں کے ہجوم نے وزیر کے اوسان یونہی خطا کر رکھے تھے، ایسے میں فارسی کے شعر، وہ بھی عربی آمیز، اسے کہاں یاد رہتے۔ لیکن خدا کی مہربانی کہ اسے حافظ کی اسی غزل کا ایک برمحل شعر یاد آ گیا۔ اس نے گھونگھٹ سے کچھ آڑ سے، لیکن آنکھیں ذرا اٹھا کر شعر پڑھا ؂

دارم من از فراقت در دیدہ صد علامت

لَیسَت دُموعُ عَینی ھذا لنا العَلامَہ

(میری آنکھوں میں آپ کے فراق کی صدہا علامتیں ہیں۔ کیا میری آنکھ کے آنسو ہم عاشقوں کے لئے اس کی علامت نہیں ہیں؟)

میرزا فخرو پھڑک گئے۔ ”واللہ کیا حاضر جوابی ہے۔ سبحان اللہ کیا حافظہ ہے۔ کیا ایسی ہم امید رکھیں کہ اس حافظۂ بے مثال میں ہم بھی کہیں مقید ہو جائیں گے اور پھر نہ آزاد کئے جائیں گے؟“

وزیر کی طبیعت تو اب آمد پر آ گئی تھی، اب پوری غزل اس کے سامنے مثل کتاب کھلی ہوئی تھی۔ اس نے منھ گھونگھٹ سے نکالا اور اسی غزل کا شعر پڑھ دیا ؂

باد صبا ز حالم ناگہ نقاب برداشت

کالشّمسُ فی ضُحاھا تطلُع مِنَ الغمامَہ

(بادِ صبا نے اچانک میرے احوال پر سے نقاب اٹھا دی، جیسے کہ چاشت کے وقت کا سورج بادلوں سے نکل آئے۔)

میرزا فخرو نے وزیر کی ٹھوڑی اٹھا کر اس کی پیشانی چومی اور کہا، ”واللہ جی چاہتا ہے آپ کو یوں ہی سامنے بٹھائے رکھئے اور شعر سنتے رہیے۔ لیکن ہمیں اس سے بھی اہم اور دلچسپ کام درپیش ہیں۔“ پھر انھوں نے خواجہ حافظ کی اسی غزل کا مقطع پڑھا ؂

حافظ چو طالب آمد جامے و جان شیریں

حتّیٰ یذوقُ منہُ کاساً مِنَ الکرامہ

(اب جب حافظ طلبگار ہوا ہے تو ایک جام دے اور جان شیریں اس سے لے لے، تاکہ وہ فیاضی کے جام سے ایک گھونٹ چکھ لے۔)

وزیر نے سرگوشی کے لہجے میں کہا، "مرشدزادۂ آفاق کے گنے سب کچھ ہے، مجھ بے چارہ کی ہستی کیا ہے، جو آپ کے درخورد ہو۔"

"واللہ یہ تجاہل عارفانہ تو ہماری جان یوں ہی لے لے گا۔ آپ شاید یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہماری جان اتنی قیمتی نہیں کہ ایک جلوے یا ایک بوسے کے برابر ٹھہرے۔ بالکل درست، ولیکن کبھی کبھی پاس طبع خریدار بھی تو کیا جاتا ہے۔ تمام معشوقوں کی طرف سے تو بابا فغانی جواب دے ہی گئے ہیں..."

"جی ہاں، آپ کو اپنے مطلب کی باتیں بہت معلوم ہیں۔ پر ہمیں تو بابا صاحب کی بات تکلف ہی لگے ہے۔" یہ کہہ کر وزیر نے بابا فغانی کا شعر پڑھا۔

اے کہ می گوئی چرا جامے بہ جانے می خری
ایں سخن باساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

"لیکن صاحب عالم، ہم نے تو ابھی کچھ ارزاں نہیں کیا۔"

"ہائے ظالم یہ تو نے کیا کہہ دیا۔ ہم اس دھوکے میں تھے کہ ہمارا جذب دل آپ کو یہاں کھینچ لایا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ دگرگوں نکلا۔ صاحب آپ کچھ بھی ارزاں نہ کریں، لیکن مراعات ہم پر ارزانی فرمائیں، آخر میر خسرو کیا فرما گئے ہیں۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز"

"حضور صاحب عالم،" وزیر نے اب گھونگھٹ بالکل پلٹ کر شاہزادے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا، "آپ کو کہیں کچھ مسامحہ ہوا ہے۔ نرخ بالا وہ کرے جو کبھی ارزاں ہوا ہو۔ آپ نے سنا نہیں۔

پاسبان خود اند آگاہاں
ہم چراغ است لالہ ہم فانوس

ہمیں آپ بازار میں نہ ڈھونڈیں، بازار محبوبی میں بھی نہیں۔"

"واللہ آپ تو بجھارتیں بجھا رہی ہیں۔ پھر آپ کو کہاں پایئے وزیر خانم؟ کیا آپ ہماری

مطلوب و محبوب نہیں ہیں؟''

''ہم تو آپ کے طلبگار بن کر یہاں آئے ہیں صاحب عالم، ہم تو پہلے ہی آپ کے بندۂ بے دام ہونے کو تیار بیٹھے ہیں، پھر نرخ بالا کرنے یا ارزاں کرنے کا کچھ مذکور نہیں ہو سکتا۔ لیکن...''

''پھر لیکن کیا؟'' میرزا فخرو نے بیچین ہو کر پوچھا اور چاہا کہ بڑھ کر وزیر کے گلے میں ہاتھ ڈال دیں۔

وزیر نے میرزا فخرو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خود ہی اپنی گردن میں حمائل کر لیا اور شاہزادے کے اور بھی قریب ہو کر سرگوشی کے لہجے میں بولی:

''میں پرستش نہیں استقلال کی جویا ہوں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح لسان الغیب کی زبان سے عرض کرتی ہوں ؎

از من جدا مشو کہ توام نور دیدہ ای

مجھے اندھیرے میں نہ چھوڑ جایئے گا۔''

فتح الملک بہادر نے وزیر کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انھیں بوسہ دیا اور انتہائی نرم و شیریں لہجے میں بولے: ''صاحب من، کچھ جدائیاں ایسی ہوتی ہیں جن پر کسی کا اختیار نہیں۔ لیکن اور کوئی صورت ایسی ہو ہی نہیں سکتی کہ آپ ہم سے جدا ہوں ؎

تو خوش می باش با حافظ برو گو خصم جاں می دہ
چو گرمی از تو می بینم چہ باک از خصم دم سردم''

''میں تو اللہ سے دعا کرتی ہوں کاش کوئی ایسی صورت ہو جاتی کہ اتحاد ہی اتحاد رہ جاتا۔''

''وزیر بیگم، جو جتنا متحد ہے اتنا ہی ٹھیک ہے، جتنا اتحاد ممکن ہے اتنا ہم اللہ سے اپنے لئے مانگتے ہیں۔ دنیا اس سے بہتر ممکن ہوتی تو اللہ تعالیٰ کیا اس سے بہتر دنیا نہ بناتا؟ شاید انتشار ہی کلید حیات ہے۔ ہندو کو دیکھیے، مردے اپنے کو نذر آتش کر کے خاک میں خاک ملا دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اِنّہٗ علیٰ رَجعہ لقادر ہے، جب سب اکٹھا کئے جائیں گے۔''

''لیکن انسانوں کی سرشت میں نسیان اور خود کامی بھر دی گئی تو پھر اتحاد کے کیا معنی ہیں؟ صاحب عالم آپ مرشد زادۂ آفاق ہیں آپ ہی اس گتھی کو حل کریں۔''

''صاحب آپ انسان سے انسانیت ہی تو طلب کر سکتی ہیں؟ کوئی جواب آپ کے سوالوں

کا دے بھی دے تو اس سے حقیقت تو نہ بدلے گی؟ ہم حقیقت اپنی پر قانع رہیں تو ہی بجا ہے... لیکن یہ آپ کیسی باتیں لے بیٹھیں؟ کیا یہ شام وشب کبریٰ وصغریٰ کے لیے بنی ہیں، یا یہ بھی ہماری آتش شوق تیز تر کرنے کا ایک بہانہ ہے؟ کیا آپ کو ہمارے دل کے جوش اور خواہش کے خروش کا کچھ پاس نہیں؟''

صاحب عالم و عالمیان ایک لحظے کے لئے رکے، پھر انھوں نے بڑھ کر وزیر کے منھ کو ہلکا سا بوسہ دیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''کیا آپ نے میاں سلیم کی بیت نہیں سنی ۔

ہوس چوں شیر بر اطراف آں سیمیں بدن گردد
کہ زیر دامن او دیدہ نقش پائے آہوے؟''

یہ شعر پڑھتے پڑھتے میرزا فخرو کے چہرے پر حیا کی سرخی سی دوڑ گئی۔ اتنی کھلی ہوئی بات ابھی پہلی ملاقات میں ان سے کہہ نہ بنتی تھی، لیکن سچ یہ ہے کہ وزیر خانم کی باتوں سے اب ان کا دل الجھنے لگا تھا۔ شعر پڑھ کر میرزا فخرو نے چاہا کہ وزیر کو پوری طرح آغوش میں بھر لیں۔ ادھر اس خفیف سے بوسۂ لب اور اس شعر کے سننے کے بعد اچانک وزیر کے سارے بدن میں حیا اور خواہش کی گرمی بھر گئی تھی۔ ایسا شوخ شعر تو عورتیں بھی آپس میں نہ پڑھتی ہوں گی۔ وزیر کے دل میں اب تک میرزا فخرو کے لئے رسمی لگاؤ کے سوا، کہ وہ اس کے شوہر تھے، اور کچھ نہ تھا۔ ان کی خوش مزاجی، خوش صورتی اور بذلہ سنجی سب ٹھیک تھیں لیکن وزیر کے دل میں بسنے والے ابھی کوئی اور تھے۔ وہ صاحب عالم و عالمیان کو ایک فرض کے طور پر نبھانے کو بالکل تیار تھی، لیکن معشوق، یا عاشق، یا وہ بھی نہیں تو دوست ہی کے رتبے پر انھیں متمکن دیکھنے پر اس کا دل راضی نہ ہوتا تھا۔

لیکن میرزا فخرو کی زبان سے یہ شعر ادا ہونا تھا کہ وہ رسمی دھاگے یا جھاڑ پھونک کے بے حقیقت گنڈے کا سا رشتۂ زناشوئی جس میں وہ خود کو اور ولی عہد سوئم کو منسلک دیکھتی تھی، وزیر کے دل سے تار عنکبوت کی طرح نابود ہو گیا۔ اس کے جسم کی عروق مردہ میں نیا کس بل، نیا تناؤ آ گیا۔ اسے اپنی چھاتیاں کھنچتی اور تنتی ہوئی سی محسوس ہوئیں، جہاں مدتوں کسی گستاخ نے سر نہ اٹھایا تھا وہاں گردن افرازی کے دو سرمئی نقطے پیدا ہو گئے، گویا کسی سحر کے زور سے اس کی شربتی آنکھوں کا عکس وہاں پر توزن ہو گیا ہو۔ بسکہ پستانش بہ بالا سر کشید عکس چشم کافرش بروئے فتاد۔ اس کے جی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور گرداب آب زندگی کے نیچے چشمۂ حیواں میں نئے سرے سے آب حیات چھل بل کرنے لگا اور چشم زدن میں وہ جگہ چشمۂ پالغز زہاد میں تبدیل ہو گئی۔ اب کچھ مزے پہ آیا شاید وہ شوخ دیدہ آب اس کے پوست میں ہے

جوں میوۂ رسیدہ۔ نقش سم آہو بر سر گلبرگ روشن ہوااور زخم درون عاشق کی طرح وا ہونے لگا۔ صبح امید عاشق کے نیچے شق گشتگی قمر کے آثار در پردہ پیدا ہونے لگے۔ لام الف میں لا کی جگہ بلیٰ کا رنگ ہویدا ہونے لگا۔ دو ماہ نو جو مدتوں سے بہم یکجا تھے اب آب نمکدان پا کر اپنی پیوستگی چھوڑنے لگے۔

وزیر کو بالکل توقع نہ تھی کہ اب وہ قفل سرمہ گوں کبھی کھل سکے گا، وہ تو بقول میر انشاء اللہ خان ان سب چیزوں کو یکبار رو پیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن مرشد زادۂ آفاق کوئی تعویذ پہنے ہوئے تھے یا سلیم کے شعر میں کوئی موہنی پوشیدہ تھی یا پھر وزیر کی محبت ان کے جسم و جان کو اس طرح احاطہ کیے ہوئے تھی کہ وزیر کے بھی جسم و جان کو جائے فرار نہ رہی تھی۔ میرزا فخرو نے آہستہ آہستہ وزیر کے تلوے سہلائے، پاؤں کی انگلیوں کو بوسہ دیا، پھر چاہا کہ شاخ نسرین جیسی نازک لیکن شاخ صندل جیسی سڈول پنڈلیوں کو دریافت کریں اور ممکن ہو تو زانوؤں کے شیشہ و ساغر لبریز صہبائے حسن سے جرعہ جرعہ سیراب ہوں۔ پنڈلیوں پر میرزا فخرو کا لمس پہنچتے ہی وزیر کی بیقراری اور بڑھی، اس نے بے تکلف ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور سرگوشی کے لہجے میں لیکن کچھ شوخ تبسم کے ساتھ بولی، ''کتا بنوں شکاری...''

ایک لمحے کے لئے میرزا فتح الملک بہادر چکرا گئے کہ وزیر خانم کیا کہہ رہی ہیں۔ وزیر کی پنڈلیوں اور زانوؤں کی سیر کرتے کرتے انھوں نے حیرت سے سر اٹھایا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد وزیر کا مدعا پوچھنے ہی والے تھے کہ وزیر نے ایک پورا مصرع اسی سرگوشی کے لہجے میں پڑھا ؏

وہ آہوئے رمیدہ مل جائے تیرہ شب گر

فتح الملک بہادر کی حیرانی ایک حد تک رفع ہوئی کہ یہ وہی آہو کا تلازمہ تھا جو خود انھوں نے شروع کیا تھا۔ لیکن کتا...؟ انھوں نے دوبارہ کنکھیوں سے وزیر کو دیکھا۔ وزیر نے کچھ آگے بڑھ کر خود کو فتح الملک بہادر کے اور بھی قریب کر لیا، کہ دونوں کچھ ہم آغوش سے ہو گئے۔ پھر اس نے اپنے پائینچے اوپر کھینچے، ساق وران کی پوری خوش منظری کے سامنے میرزا فخرو کی آنکھیں چکا چوندھ ہونے لگیں۔ وزیر نے ان کے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لئے، اب اس کا تنفس کچھ تیز ہو چلا تھا۔ اس نے اشارے کی زبان میں کچھ یوں کہا کہ یہ ڈوپٹہ اور شلوکا اور انگیا میرے بدن سے بچ جائیں تو کیا اچھا ہو۔ معاً میرزا فتح الملک کے ذہن میں میاں مصحفی کا پورا شعر گونج اٹھا۔

وہ آہوئے رمیدہ مل جائے تیرہ شب گر
کتا بنوں شکاری اس کو بھنبھوڑ ڈالوں

اللہ اللہ کیا جرأتیں ہیں! کیا اچپلائیاں ہیں اور کیا ڈھٹائیاں ہیں! شاہ حاتم نے تو صرف سوچا ہو گا، ہم تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے باواز بلند شعر کو ادا کیا اور بولے:

''چھوٹی بیگم آپ آہوے رمیدہ کیوں ہوں؟ آپ ہمارے کنج محبت میں آسودۂ منزل ہو جائیں۔ ہم آپ کے رکھوالے اور آپ کے خدمت گذار رہیں گے... اور ہمارے آپ کے درمیان یہ لباسی پردے کیوں باقی رہیں۔'' یہ کہہ کر میرزا فتح الملک بہادر نے وزیر کا ڈوپٹہ کھینچ کر الگ کر دیا اور اپنی بھی قبا کے تکمے کھول دیئے۔ وزیر نے ہاتھ آگے بڑھا کر فتح الملک کے سینے کو ٹٹولا۔ تھوڑی دیر کے بعد شمعوں کی روشنی آپ سے آپ مدھم پڑنے لگی۔

وزیر کو صبح کے وقت اٹھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ آج بھی، جب قریب قریب ساری رات اسے جاگنے اور جوش و ہیجان کے اتار چڑھاؤ میں گذری تھی، اور میرزا فتح الملک کی ناز بردارانہ ہوسنا کیوں کے باعث اس کا جوڑ جوڑ ایک لطف انگیز اور نشہ آمیز درد سے رنجور تھا، اس کی آنکھ بہت سویرے کھل گئی۔ وہ بمشکل دو ایک گھڑی سوئی ہو گی، صاحب عالم و عالمیان البتہ گہری نیند میں تھے اور بظاہر آج بہت دیر سے جاگنے والے تھے۔

ابھی موتی مسجد میں فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی، باہر گہرے اندھیرے کا سا سماں محسوس ہوتا تھا، ابھی تو حبیبہ بھی سو رہی ہو گی، پر خدا جانے اس کا حجرہ کہاں ہے۔ اس نے کہا تو تھا کہ میں آپ کی چوکھٹ سے لگی لگی سو جاؤں گی، لیکن اسے کہیں دور ہی جگہ ملی ہو گی۔ وزیر نے چاہا کہ کروٹ بدل کر سو جاؤں۔ لیکن اب نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اس نے اکثر دیکھا اور سنا تھا کہ ہم خوابی اور اختلاط باطنی کے طویل یا مختصر جوش و خروش کے بعد مرد تھوڑی دیر لگاؤ کی باتیں کرتے، یا بس ادھر ادھر کی گھریلو مانوس باتیں کرتے، پھر کروٹ بدل کر گہری نیند میں چلے جاتے۔ اس کے برعکس، عورت کو اکثر نیند نہ آتی، اور آتی بھی تو بہت گہری نہیں اور بہت کم دیر کے لئے۔ اسے یہ بات ہمیشہ عجیب لگتی تھی۔ رکھوالی کا کام تو مرد کا تھا کہ عورت کے بدن میں اس کا بیج تھا، لیکن مرد اپنے مال کو اور مال بردار کو غیر محفوظ چھوڑ کر سو جاتا تھا۔ خدا جانے اس میں مزاجوں کا کون سا اختلاف کارفرما تھا۔ یا شاید مرد لوگ سمجھتے ہوں کہ عورت کو ہمارا تحفظ بہر حال حاصل ہے۔ جب تک ہم اس کے پہلو میں ہیں، محو خواب ہی سہی، اسے کوئی خطرہ نہیں۔ لیکن شاید اصل بات یہ ہے، وہ کبھی کبھی ذرا تلخ کام ہو کر خود سے

کہتی، کہ مرد کو صرف اپنی غرض سے کام ہے۔ مطلب برآری کے بعد وہ اس بات سے بے تعلق ہو جاتا تھا کہ میری شریک بستر کس حال میں ہے۔ یا پھر مرد اپنا قالب تہی کر دینے کے بعد ایک چھوٹی سی موت سے دوچار ہو جاتا تھا، جیسا کہ بعض بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں، اور اسے دوبارہ زندگی حاصل کرنے کے لئے کچھ مہلت اور کچھ راحت کی ضرورت رہتی ہے۔ راحت کی بھی اچھی رہی، وزیر اپنے دل میں کہتی، گویا جو کچھ بستر پر لوٹ مار کی وہ راحت نہ تھی، خوب۔

یا پھر اس طرح پیٹھ پھیر کر فوراً سو جانا کسی قسم کے اعتماد کی نشانی تھا، کہ ہمیں اپنی ہمخوابہ کے باب میں پورا اطمینان ہے، وہ ہماری ہم بغل ہو کر پوری طرح محفوظ ہے اور ہر طرح ہم سے وفادار بھی ہے... لیکن یہ کچھ بنوٹ کی بات لگتی تھی۔ اصل بات تو شاید یہی تھی کہ مدعا برآری کے بعد لگاوٹ کم ہو جاتی تھی۔

وزیر کو یقین ہو گیا کہ اب نیند نہ آئے گی۔ کیوں نہ گرم پانی سے نہا کر بدن کا کسل دور کر لیجے، اس نے دل میں سوچا۔ مرشد زادۂ آفاق تو ابھی لمبی تانے ہوئے ہیں، لیکن اغلب یہی ہے کہ جب اٹھیں گے تو مزید ہمخوابی کے خواہاں ہوں گے۔ ناشتے وغیرہ سے کچھ غرض آشنائی وزیر کو نہ تھی، اور اسے لگتا تھا کہ میرزا فتح الملک بہادر کو بھی فوری طور پر ناشتہ درکار نہ ہوگا۔ ایسے میں بہتر یہی ہے کہ جلد اٹھ کر نہا دھو، کپڑے بدل، تازہ دم ہو لیجیے۔

یہ سوچ کر وہ آہستہ بستر سے اٹھی، لباس سے عاری ہونے کے سبب اسے اچھی خاصی سردی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے اٹھائے، بدن پر دوشالہ لپیٹا اور آبدار خانے میں چپکے سے داخل ہوئی۔ یہاں ہر طرح کے لوازم موجود تھے، انگریزی صابن، خوشبودار بیسن، چکنی مٹی، سر دھونے کے مسالے، تیل اور عطر کی کپیاں، جسم کو رگڑنے اور صاف کرنے کے لئے طرح طرح کے جھاویں اور انگریزی اسفنج، چھوٹی قینچی اور ناخن تراش، بدن خشک کرنے کے لئے بھاری بھاری رنگین اور سادہ بھاری دستمال، نہانے کی چوکی صندل کی خوشبودار لکڑی کی، کئی قد آدم آئینے، کپڑوں صندوق کی جگہ آبنوسی الماری جس میں وزیر کے اپنے کپڑے جو ساتھ لائی تھی، اور بہت سے دوسرے کپڑے جو بظاہر اس کے لئے بطور خاص تیار کرائے گئے تھے، سلیقے سے تہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔

ایک نئی چیز جو وزیر نے دیکھی وہ چوڑے منھ کے بانس کے دونل تھے جو کہیں اوپر چھت میں سوراخ کر کے نیچے لائے گئے تھے۔ وزیر نے سنا تھا کہ قلعے کے بعض حماموں اور آبدار

خانوں میں بانس کے یا مٹی کی نریوں کے ذریعہ ٹھنڈا تازہ پانی اور گرم پانی ہمہ وقت دستیاب رہتے تھے۔ اسے یقین نہ آتا تھا، لیکن اس نے سنا تھا کہ دہلی کے بعض روسا اور بعض بڑے صاحبان انگریز کے یہاں بھی ایسا ہی انتظام تھا۔ نواب شمس الدین احمد خان کی کسی حویلی میں اندر جانے کا اسے اتفاق نہ ہوا تھا لیکن ان کے جس مہمان خانے میں اس نے رات گذاری تھی اس کے آبدار خانے میں ایسا کوئی انتظام نہ تھا۔ دونوں کے نیچے پانی جمع کرنے کے لئے بڑے بڑے طشت دھرے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کانسے کی گڑوی، جسے قلعے میں مشربہ بھی کہتے تھے، پانی نکالنے کے لئے رکھی ہوئی تھی۔ وزیر نے انکل لگا کرنل کھولے تو واقعی ایک میں ٹھنڈا پانی اور ایک میں گرم پانی آرہا تھا۔

سردی کے باوجود اس نے ٹھنڈے پانی کا چھپکا منھ پر مارا اور پھر گرم پانی کے چھینٹے اڑائے جیسے وہ کوئی بچہ ہو اور اسے پہلی بار اپنے آپ غسل کرنے اور حمام یا آبدار خانے کے مزے اٹھانے کی اجازت ملی ہو۔ پھر اس نے ایک طشت میں گرم پانی بھرا اور اس میں کچھ ٹھنڈا پانی ملایا، دوشالہ اتارا اور ایک نئے احساس لطف ولذت کے ساتھ گرم پانی گڑوی میں بھر بھر کر بدن پر لنڈھایا۔ بستر کی گرمی اور سانسوں کی تیزی اور سپردگی اور ربودگی اور تھی، اس وقت تھکن دور کرنے اور دکھتے ہوئے اعضا کو ہلکی گرمی پہنچانے اور نیند کے آخری ذروں کو آنکھوں سے بہا ڈالنے کے مزوں میں اور ہی طرح کا، لیکن کچھ اس سے ملتا جلتا بھی کیف تھا۔ مدتوں بعد اس کے جی میں آئی کہ کچھ گایئے، اور وہ حافظ کی وہی غزل آپ سے آپ گنگنانے لگی جس کے اشعار کی کچھ بیت بجثی اس کے اور صاحب عالم کے درمیان اس شب کے شروع میں ہوئی تھی ع

انی رایت دهراً من هجرک القیامه

وہ کلام لسان الغیب کی روانی اور حلاوت میں کچھ ایسی ڈوبی کہ کئی مصرعے جو اسے بطور خاص پسند تھے، انھیں بار بار دہراتی رہی۔ جب پانی ٹھنڈا ہونے لگا تو وہ حمام سے اٹھی اور اسی غزل کے اشعار گنگناتے ہوئے نہایت نرم ململی دستمال سے اپنا بدن خشک کرنے لگی۔ بے ارادہ طور پر اس کی نگاہ اپنے بدن پر پڑی جو سامنے کے قد آدم آئینے میں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ منعکس تھا۔ خواجۂ شیراز کے شیریں الفاظ اس کے ذہن سے محو ہو گئے اور ایک بے اختیار ہوک کے ساتھ اس کے دل میں اس رات کی یادیں موجزن ہو گئیں جب کچھ ایسے ہی موقعے پر حبیبہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بلائیں لے کر اسے رات کے لئے تیار کیا تھا۔ اس لمحے اس نے اپنی پہلی محبت کو اور اس کے کھو جانے کو یاد کیا تھا اور غمگین

ہوئی تھی۔ اس لمحے اسے ایک احساس بے یقینی بھی تھا کہ نہ جانے کاتب تقدیر نے نواب شمس الدین احمد خان کے ساتھ اس کا کیا مستقبل لکھا ہے اور نواب کے ساتھ اس کی مساوات زن وشوکی ہوگی یا مدخولہ کی، یا پھر آج کی شب بھر کی کہانی تھی جسے غیر متوقع طور پر رنگین قلم سے لکھا گیا تھا... اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند... اور آج اس کی روح ودل میں آسودگی منزل اور قصہ ٔ حیات کے خوشگوار انجام کا احساس تھا، لیکن پھر بھی کچھ ذوق غم سا اس کے دل میں پیچیدہ تھا...

...کیا میری تمام سرگذشت حیات کھوئے ہوؤں اور گذرے ہوؤں کی جستجو یا ان کی یادوں ہی میں تمام ہو جائے گی؟ اس کے دل میں خوف در آیا۔ اس نے سنا تھا بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شروع کرتے ہیں لیکن ختم نہیں کر سکتے... میں انھیں میں سے تو نہیں ہوں؟ لیکن ہم لوگ ختم کرنے والے کون، اور سچ پوچھو تو شروع بھی کرنے والے کون ہیں؟ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا۔ نہیں، یہ بات انصاف پر مبنی نہیں۔ تقدیر کی راہیں بھی عمل سے، تدبیر سے، کچھ نہیں تو دعا سے بدل سکتی ہیں۔ اور شاید یہ بھی ایک طرح سے تقدیر کا بدلنا ہی کہا جائے گا کہ انسان اپنی حالت پر صبر کر لے، کہ جب صبر ہے تو غم نہیں۔ لیکن پھر یہ کیوں کہا کہ رَبَّنا وَ لا تحمل علینا اِصراً کما حملتہٗ علی الّذین من قبلنا ربّنا لا تُحمّلنا ما لاطاقۃ لنا بہ... ؟(۱) شاید یہ بھی تقدیر بدلنے کی ایک صورت ہو؟ دعا سے تقدیر بدل جاتی ہوگی، تب ہی تو ایسا کہا گیا۔ لیکن پھر لوگ یہ بھی کیوں کہتے ہیں کہ تقدیر کا لکھا اٹل ہے، پتھر کی لکیر ہے، کبھی مٹ نہیں سکتا؟ پر یہ بھی تو کہا گیا کہ جو پتھر پہ پانی پڑے متصل تو گھس جائے بے شبہ پتھر کی سل... تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ہاں، جس نے لکھا ہے وہ کاٹ بھی سکتا ہے، مٹا بھی سکتا ہے، یا پھر سہارنے اور شاید خوش رہنے کی بھی قوت دے سکتا ہے۔ وہ کس کا شعر تھا کہ اگر ہم میں یہ قوت نہیں کہ کسی کو کچھ دے سکیں تو الحمد للہ یہ قوت تو ہے کہ کسی سے کچھ نہ لیں۔ قوت دادن اگر نیست مرا با کے نیست، قوت ناستدن ہست فللہ الحمد...

اسے سردی لگنے لگی تھی۔ اپنے خیالوں میں گم وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ بے لباس ہے اور گرم پانی کا لایا ہوا راحت بخش اور خوشگوار ماحول بھی ٹھنڈک میں تحلیل ہو کر آہستہ آہستہ دروازے اور کھڑکی کی جھریوں کی راہ سے باہر جا چکا تھا۔ اسے جھرجھری سی آگئی، عریاں بدن پر ہلکی کپکپی محسوس کر کے اس نے

(۱) ہمارے رب اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب ہم پر کوئی ایسا بار (دنیا یا آخرت کا) نہ ڈالیے جس کی ہم کو سہار نہ ہو۔ (القرآن، البقرۃ، آیت ۲۸۶، ترجمہ مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی۔)

سوچا کہ تھوڑا سا گرم پانی بدن پر اور ڈال لوں، پھر کپڑے پہنوں... پر خدا جانے مجھے کتنی دیر یہاں ہو چکی ہے۔ کہیں فتح الملک بہادر جاگ نہ پڑیں اور مجھے ڈھونڈنے لگیں۔ نہیں پانی سے مزید کھیلنا اب ٹھیک نہیں، جلد کپڑے پہن لینے چاہئیں، اس نے اپنے دل میں کہا۔ اس نے چاہا کہ الماری کھول کر دیکھوں کہ اس میں کیا کپڑے اور لباس ہیں، کہ آبدار خانے کے دروازے پر آہٹ سی ہوئی اور میرزا فتح الملک بہادر نے ہلکے سروں میں پکارا:

''وزیر خانم آپ وہاں ہیں؟ سب ٹھیک تو ہے، میں اندر آ سکتا ہوں؟''

ابھی وہ کچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ دروازہ کھلا اور میرزا فتح الملک بہادر ایک ڈھیلی سی عبائے شب خوابی بدن پر ڈالے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ وزیر نے گھبرا کر چاہا کہ دوشالہ اٹھا کر بدن پر لپیٹ لے، لیکن جلدی میں دوشالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا اور وہ اسے اٹھانے کے لئے جھکی۔ میرزا فتح الملک بہادر جہاں تھے وہیں ٹھٹک کر سناٹے میں آ گئے۔ سڈول، کسی ہوئی سرینیں اور زانو گویا سانچے میں کے ڈھالے ہوئے، چیتے کی سی پتلی کمر میں خم، پیٹ بالکل مسطح اور بے شکن، اس پر فالتو چربی کیا، فالتو بوٹی کا بھی نام نہ تھا، جھکی ہوئی کمر اور پیٹھ کے باعث چھاتیاں رو بہ زمین لیکن ڈھلکن یا ڈھیلے پن سے قطعاً عاری اور سر پستاں کی سختی اور سرمئی رنگ بخوبی نمایاں، لمبے گھنے گیسوؤں کا آبشار تھا کہ پیٹھ پر اور چہرے پر سے گذر کر زمین کی جانب رواں تھا۔ صراحی دار گردن اور نازک گلابے شکن، سارا بدن زیور یا آرائش کے عاری ہونے کے باوجود جگمگاتا ہوا سا لگ رہا تھا...

رات کا بڑا حصہ اس بدن کے اسرار اور اس کے امکانات کی تفتیش و تفحص میں گذارنے کے باوجود میرزا فخرو کو لگا جیسے وہ بالکل اجنبی ہوں اور یہ حدیقۂ محبوبی پہلی بار ان کے لئے اپنے در کھول رہا ہو۔ انھیں معلوم ہوا کہ انھیں اب تک اس بدن کے تناسب، اس قد کی موزونی، ان نازک دست و پا پر کنواری جوانی کی چھوٹ، پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر دگردن کی گھنی کاکلوں تک کی اس شادابی کا کچھ اندازہ ہی نہ تھا۔ کئی لمحے وہ اس لمحے کے سحر میں گرفتار رہے اور اس اثنا میں وزیر نے دوشالہ اٹھا کر بدن پر اس طرح لپیٹا کہ سینے سے زانو تک کا بدن تو چھپ گیا لیکن میرزا فخرو نے دل میں کہا کہ جو کھلا رہا وہ ڈھکے ہوئے سے بھی زیادہ دلربا اور دلچسپ لگتا ہے۔ وزیر نے چاہا کہ کچھ بولنے سے پہلے آگے بڑھ کر فتح الملک بہادر کے پاس آ جاؤں تا کہ آواز بلند نہ کرنی پڑے، لیکن پاس و حجاب نے اسے وہیں کا وہیں روکے رکھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہنا یا میرزا فخرو کو باہر جانے کا سا بہت ہلکا اور دھندلا سا اشارہ کیا، لیکن فتح

الملک بہادر تو ابھی وزیر کے جمال کو اپنے گلے کا ہار بنائے ہوئے چپ کھڑے تھے۔ وزیر نے بالآخر تقریباً سرگوشی کے لہجے میں کہا:

''اللہ میں معافی چاہتی ہوں، مجھے کیا خبر تھی کہ آپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے...''

وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یوں بے دھڑک اندر آ جائیں گے اور یوں بے حجابانہ مجھے بے حجاب دیکھ لیں گے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کہہ نہ سکتی تھی، اور نہ ہی یہ سب کہنا ضروری تھا۔ اسے تو بس کوئی بات شروع کر کے محجوبی کے اس لمحے سے باہر آنا تھا۔ اور وہی ہوا، وزیر کی آواز سنتے ہی میرزا فتح الملک بہادر اپنے طلسم حیرت سے باہر آئے۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور کہنے لگے:

''معذرت اور معافی تلافی کس بات کی، آج تو مجھ پر وہ احسان آپ نے کیا ہے کہ تا عمر بدل اس کا مجھ سے نہ ہوگا۔''

میرزا فخرو نے آگے بڑھ کر وزیر کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا، اس کا دوشالہ الگ پھینکا اور اس کے سر و سینہ و بدن پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔ وزیر بار بار کہنے کی کوشش کرتی رہی کہ اب بس بھی کیجیے، چلیے خواب گاہ میں چلیے، یہاں آپ کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔ لیکن فتح الملک بہادر اس کا جملہ پورا نہ ہونے دیتے اور اس کے منھ پر منھ یا ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیتے۔

''اللہ صاحب عالم میں آپ کے پاس سے اٹھ آئی تو سزا اس کی آپ مجھے کس قدر دیں گے؟'' وزیر نے چھوٹی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

میرزا فخرو نے دوشالہ اٹھا کر اپنے ہاتھوں پر لیا اور پھر وزیر کو بآسانی آغوش میں اٹھا لیا اور پھر اسے دوشالے میں تقریباً لپیٹ لیا، جیسے کوئی کسی بچے کو حفاظت کی خاطر خوب اڑھا لپیٹ کر کہیں لے چلے۔ ''اچھا صاحب، سزا کی سزاوار تو آپ بہت سی ہیں، لیکن چلیے، آپ کا مقدمہ خوابگاہ میں فیصل ہوگا۔''

فتح الملک بہادر نے وزیر کو لا کر چھپر کھٹ میں بٹھایا، پیچھے کئی تکیے لگا دیے اور ہلکا مخملی لحاف جس پر سنجاف کی بیل ٹکی ہوئی تھی اسے اڑھا دیا، گویا مشاطائیں ابھی دوبارہ آئیں گی اور از سر نو اسے سجانا شروع کریں گی۔ وزیر بار بار کسمسا کر فتح الملک کے بازوؤں سے نکل جانا چاہتی، کبھی اپنے گھٹنے موڑ کر ساق و پا کو چھپاتی، کبھی دونوں ہاتھوں سے سینہ و کمر کو ڈھانکنے کی کوشش کرتی۔ فتح الملک بہادر نے کہا، ''یوں نہیں چھوٹی بیگم، ذرا پاؤں پھیلا کر نیم دراز ہوں۔ یوں پاؤں موڑے موڑے تو آپ تھک جائیں گی پھر خدانخواستہ ہمیں کہاں موقع مل سکے گا کہ آپ کو تھکائیں اور پھر تر و تازہ کریں۔''

''توبہ ابھی اور بھی تھکائیں گے کیا،'' وزیر نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔ ''بندی میں تو اب کچھ رہا نہیں فتح الملک بہادر۔''

''سہی، لیکن ابھی تو آرام سے ہو جائیں،'' میرزا فخرو نے جواب دیا۔ ''آپ آپ ہماری بات مان لیں گی تو ہم آپ کو کچھ گا کر سنائیں گے۔''

وزیر نے کان کھڑے کیے۔ اس نے یہ تو سنا تھا کہ میرزا فخرو کو موسیقی میں وہ کمال حاصل ہے کہ بڑے بڑے ڈوم اور کلانوت ان کا نام سن کر کان پکڑتے ہیں، لیکن صاحب عالم خود گاتے بھی ہیں، یہ اسے خبر نہ تھی۔ اور وہ اپنی صاحب خانہ کو کچھ گا کر سنائیں، یہ تو ان سنی بات تھی۔

''زہے نصیب کہ سرکار کا لحن داؤدی میرے لئے فردوس گوش ہو۔'' وزیر نے دلی مسرت کے لہجے میں کہا۔ ''فرمایئے ہم آپ کی کیا خدمت کریں کہ اس کے انعام میں ہمیں آپ کا نغمۂ سرمدی سننے کو ملے؟''

''کچھ نہیں،'' میرزا فخرو نے مسکرا کر کہا۔ ''بس پاؤں پسارے رہیں، چراغ کف پا اور شمع ساقین اور ان کے ذرا اوپر شاخ طوبیٰ کے نظارے سے ہمیں آنکھیں ٹھنڈی کرنے دیں۔''

''اے تو کیا بالکل ننگی ہی کر چھوڑیں گے صاحب عالم۔'' وزیر نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ ''کیا کچھ بھی پردہ نہ چھوڑیں گے؟''

''ہم تو سمجھے تھے کہ اب ہمارے آپ کے بیچ کوئی پردہ نہ رہے گا۔'' میرزا فخرو نے ہنس کر کہا۔ ''خیر۔ دیکھئے کیا برمحل شعر یاد آئے ہیں، ملاحظہ ہو۔''

''بندی ہمہ تن گوش ہے۔''

میرزا فخرو نے کچھ دیر گنگنا کر راگ نٹ بھیرو کے طرز پر انتہائی سریلی اور منجھی ہوئی، لیکن ذرا دبی آواز میں گانا شروع کیا۔

گلے دارم ز رنگ و بو برہنہ
سہی سروے چو آب جو برہنہ
چو شاخ سوسنش اندام عریاں
چو ساق سنبلش بازو برہنہ
ز آب جلوہ اش تا بگذرد کبک

دو پا را کردہ تا زانو برہنہ
ز ہندو زادگاں طفلے کہ باشند
دواں چوں شعلہ بر ہر سو برہنہ
چو جوگی شعلۂ آتش نشستہ
بہ خاکستر ز عشق او برہنہ
سلیم از دل بروں کن خار حسرت
کہ آمد یار و پاے او برہنہ

وہ آواز اور وہ سماں، پھر اشعار اس قدر برمحل کہ وزیر کے سلونے پن تک کو ملحوظ رکھا تھا، گویا ڈھائی سو برس پہلے سلیم طہرانی نے وزیر کو کہیں خواب میں دیکھ لیا تھا اور یہ اشعار اس کے لئے کہہ کر چھوڑ گیا تھا۔ وزیر کی زبان سے تحسین کے الفاظ نہ نکلتے تھے۔ میرزا فخرو نے جب الاپ کے بعد انترا اٹھایا تھا تو وزیر کے منھ سے بے ساختہ "اے واہ، سبحان اللہ" کے فقرے نکل گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد تو اس کی زبان گویا زبان لال ہوگئی تھی۔ اس کا دل نغمے کی امڈتی ہوئی لہروں کے ساتھ امڈا آرہا تھا۔ ہائے وہ مردانہ لیکن کچھ سارنگی کے زوئے جیسی جھنجھناتی ہوئی آواز، ہائے وہ گلا نہ کھولتے ہوئے گانے کے باوجود لفظوں کی ادائیگی میں بانسری کے جھالوں جیسی کیفیت، مغنی کی وہ محویت اور اس کے تن بدن سے پھوٹتی ہوئی لذت عشق کی دھیمی دھیمی گرم روشنی، وزیر کے لئے کچھ کہنا ممکن نہ رہا تھا۔ نٹ بھیرو کی دھن اس کے دل میں دور تک سرایت کر رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

نواب مرزا خان داغ

پل مارتے ایک سال گذر گیا۔ شادی کا دسواں مہینہ (اکتوبر ۱۸۴۵) ختم ہوتے ہوتے وزیر نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بچہ صحیح معنی میں چاند کا ٹکڑا تھا، نہایت گورا سرخ وسفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چمکیلے سیاہ گھونگھر والے بال۔ لوگوں نے کہا کہ بال اور آنکھیں تو ماں پر ہیں، باقی چہرہ مہرہ عرش آرام گاہ حضرت اکبر شاہ ثانی پر گیا ہے۔ ظل الٰہی ابوظفر بہادر شاہ تو سانولے رنگ کے تھے، اور میرزا فتح الملک بہادر کا بھی رنگ انھیں کی طرح کا دبتا ہوا تھا۔ لیکن عرش آرام گاہ تو انتہائی خوشرو ہونے کے ساتھ ساتھ ترکوں کی طرح میدہ شہاب رنگت کے تھے۔ خورشید عالم تاریخی اور عرفی نام رکھا گیا (خورشید = ۱۱۲۰ + عالم = ۱۴۱، میزان ۱۲۶۱)، شاہی کاغذات میں میرزا خورشید عالم درج ہوا اور خورشید مرزا پیار کا نام قرار پایا۔ ولی عہد سوئم کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا، ایک سال میں دو دو بیٹے انھیں عطا ہوئے۔ خورشید مرزا تو بعد میں آئے، نواب مرزا کو حسب الحکم شاہی اور حسب دلخواہ میرزا غلام فخر الدین بہادر و چھوٹی بیگم، اسی ہفتے حویلی میں بلا لیا گیا۔ خاص و عام میں خطاب خانی کے ساتھ نواب مرزا خان مشہور ہوئے، اس حد تک کہ ''خان'' ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔ داغ تخلص پہلے ہی سے معروف تھا، اب ''نواب مرزا خان داغ'' کو دہلی والے میرزا فتح الملک بہادر کے منھ بولے بیٹے اور ہونہار شاعر کے طور پر جاننے لگے۔ آستانۂ شاہی سے نواب مرزا خان کے لئے پانچ روپے درماہہ مقرر ہو گیا جو بقدر نصف ہی صرف میں آتا تھا، نواب مرزا خان باقی رقم ماں کو دے دیتے۔ وہ اسے ان کے نام سے ایک صندوق میں رکھ چھوڑتی اور موقعے موقعے سے خیر خیرات کے لئے بھی کام میں لاتی۔ نواب مرزا خان کی تعلیم کا خرچ ولی عہد سوئم کے ذمہ تھا۔

میر غلام حسین شکیبا، شاگرد خدائے سخن میر محمد تقی میر، کے بیٹے مولوی احمد حسین کو نواب مرزا کے لئے عربی اور فارسی کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ مشہور زمانہ خوش نویس اور پنجہ کش سید محمد امیر پنجہ کش سے

نواب مرزا نے خوش نویسی، پنجہ کشی، بانک، اور بنوٹ کے درس لئے۔ سید محمد امیر سے بادشاہ سلامت نے بھی بزمانۂ شہزادگی کئی فن حاصل کئے تھے۔ سید محمد امیر یوں تو پنجہ کش کے لقب سے مشہور تھے، مگر ان کے کمالات کی فہرست بہت طویل تھی۔ انھیں خوش نویسی اور پنجہ کشی کے علاوہ کشتی، بانک، اور بنوٹ میں استاد کا درجہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں، وہ نقاشی، مصوری، لوح نویسی، جدول کشی، صحافی، سنگتراشی، اور علاقہ بندی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

قلعے میں نواب مرزا خان کی آمد کے چند ہی دن بعد میرزا فخرو نے انھیں خاقانی ہند استاد محمد ابراہیم ذوق کا شاگرد کرادیا۔ شفیق استاد نے داغ تخلص برقرار رکھا اور تھوڑے ہی دنوں بعد کہہ دیا کہ یوں ہی مشق و مطالعہ کرتے رہو۔ بہت جلد تم فارغ الاصلاح ہی نہیں، جہاں استاد بن جاؤ گے۔ داغ نے قلعے کے اندر شہزادوں اور سلاطین زادوں کی نجی محفلوں اور شہر کے خاص خاص مشاعروں میں باقاعدہ شرکت شروع کردی۔ حویلی کی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے داغ کو یہ فائدہ تھا کہ وہ میرزا فخرو سے اجازت لے کر قلعے کے باہر کہیں بھی جا سکتا تھا۔ اس مراعات نے اس کے ادبی اشتغالات کو ترقی تو دی ہی، لیکن اس سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً بڑی خالہ کے یہاں جا سکتا تھا اور فاطمہ کے دیدار اور اس کی گفتگو سے دل کو تسلی دے سکتا تھا۔ اس کا جی تو بہت چاہتا تھا کہ ماں سے پوچھے، آپ کا وعدہ کب پورا ہوگا، لیکن ہمت نہ پڑتی تھی۔ یہ بات تو اسے معلوم ہوگئی تھی کہ اماں جان نے صاحب عالم و عالمیان سے اس بات کا تذکرہ کر کے ان کی بھی منظوری حاصل کرلی ہے۔ اور یہ بات بھی وہ سمجھتا تھا کہ خورشید مرزا جب تک پیٹ میں تھے، اور پھر اب جب تک کہ وہ بہت چھوٹے اور بالکل شیر خوار ہیں شادی وغیرہ کے جھنجھٹ پالنے کا سوال نہیں اٹھتا۔ اور یوں بھی اس وقت اس کی دلبستگی اور مطالعے اور تفحص کے لئے قلعے کی دنیا بہت تھی۔

نواب مرزا خان کو ظہیر دہلوی اور قمر الدین راقم کی دوستی کے باعث قلعے کی کچھ تفصیلات معلوم تھیں، لیکن اندر یہ اتنی وسیع دنیا ہوگی، اور چہل پہل اور زندگی اور شاہانہ رسوم و روایات، اور داب و آداب شاہی سے اس قدر بھرپور ہوگی، اس کا اندازہ اسے بالکل نہ تھا۔ ظل سبحانی کے سولہ بیٹوں میں جو انتظامی امور اور معاملات دربار و سلطنت میں سرگرم تھے، ان میں میرزا محمد دارا بخت میراں شاہ بہادر ولی عہد اول، میرزا محمد شاہرخ بہادر وزیر اعظم و مختار عام، میرزا کیومرث بہادر ولی عہد دوم، اور میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین بہادر ولی عہد سوم بطور خاص قابل ذکر تھے۔ بعد کے دنوں میں میرزا ظہیر الدین بہادر عرف میرزا مغل فرزند ششم انتظام و انصرام امور میں بہت آگے ہوگئے تھے۔ ان سب شاہزادوں کے اپنے دربار

لگتے تھے جو دربار شاہی کے نمونے پر، البتہ بہت مختصر پیمانے پر منعقد ہوتے تھے۔ خود ظل الٰہی کے دربار کو اورنگ زیبی وشاہجہانی دربار کیا، فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ غازی کے دربار سے بھی کچھ نسبت نہ تھی۔ منشی فیض الدین نے جشن کے ایک دربار کا عمومی حال یوں بیان کیا ہے:

دیکھو، سب امرا نقار خانے کے دروازے پر سے اتر کر پیدل دیوان عام میں چلے آتے ہیں۔ یہ پہلی آداب گاہ ہے۔ دیوان عام میں جالی کے دروازے میں دیکھنا کیسی موٹی سی لوہے کی زنجیر اڑی پڑی ہوئی ہے کہ آدمی سیدھا نہیں جا سکتا، سب جھک جھک کر زنجیر کے نیچے سے جاتے ہیں۔ یہ دوسری آداب گاہ ہے۔ اے لو! دیوان خاص کے دروازے پر کیا بڑا سا پردہ لال بانات کا کھنچا ہوا ہے، یہ لال پردہ کہلاتا ہے۔ مردہے، پیادے، دربان، سپاہی، قلار۔ ہاتھوں میں لال لال لکڑیاں لئے کھڑے ہیں۔ جو کوئی غیر اندر جانے کا ارادہ کرے تو قلار وہی لال لکڑی انکڑے دار گردن میں ڈال کر نکال دیتے ہیں...لال پردے کے پاس کھڑے ہو کر پہلے مجرا کر کے کہ یہ تیسری آداب گاہ ہے، پھر دیوان خاص میں تخت کے سامنے آداب بجالا کر اپنی اپنی جاے پر کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔

دیوان خاص میں...بیچوں بیچ میں سنگ مرمر کے ہشت پہلو چبوترے پر تخت طاؤس لگا ہوا ہے۔ اس کے آگے دلدار پیش گیر کھنچا ہوا ہے...چاروں طرف تین تین در کیسے خوش نما محرابوں کے ہیں، گرد کٹہرا، پشت پر تکیہ، آگے تین سیڑھیاں، اوپر بنگلے نما گول چھت محراب دار، اس پر سونے کی کلسیاں۔ سامنے محراب پر دو مور آمنے سامنے موتیوں کی تسبیحیں منھ میں لئے ہوئے کھڑے ہیں...دو خواص ہما کے مورچھل لئے اہلو پہلو میں کھرے ہیں۔ پیچھے جاے نماز بچھی ہے۔

معتبر الدولہ اعتبار الملک بہادر وزیر، عمدۃ الحکما حاذق زمان احترام الدولہ بہادر، ...راجا مرزا بہادر، راجا بہادر، ...میر عدل بہادر، میر منشی دار الانشاے سلطانی، میر توزک، وغیرہ اپنے اپنے مرتبے اور قاعدے سے دونوں ہاتھ جریب پر رکھے دائیں بائیں کھڑے ہیں...

دیوان خاص کے صحن میں ایک طرف خاصے کے گھوڑے، چاندی کے

ساز لگے ہوئے، ایک طرف ہاتھی، مولا بخش، خورشید گنج، چاند مورت وغیرہ، رنگے ہوئے ماتھوں پر فولاد کی ڈھالیں سونے کے پھولوں کی، کانوں میں ریشم اور کلابتون کے گچھے اور لڑیاں، کارچوبی جھولیں پڑی ہوئیں، ایک طرف ماہی مراتب، چتر، نشان، روشن چوکی والے، جھنڈیوں والے، ڈھلیت، جمے کھڑے ہیں۔ حبشی، قلار، چاندی کے شیر دہاں سونٹے، خاص بردار بندوقیں لئے ہوئے، کٹہرے کے نیچے کھڑے ہیں۔

...بادشاہ برآمد ہوئے۔ نقیب چوبدار پکارے، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! اللہ رسول کی امان! دوست شاد دشمن پائمال، بلائیں رد!'' کہاروں نے جھٹ ہوادار کہاروں سے لے لیا۔ پہلے بادشاہ نے تخت کے پیچھے اتر کر نماز کی دو رکعتیں کھڑے ہو کر پڑھیں، دعا مانگی، پھر ہوادار میں سوار ہوئے۔ کہاروں نے ہوادار تخت طاؤس کے برابر لگا دیا۔ بادشاہ نے تخت پر جلوس فرمایا۔ جھنڈیاں ہلیں، دنادن توپیں چلنے لگیں۔ سب فوج نے سلامی اتاری۔ شادیانے بجنے لگے۔ گوہر اکلیل سلطنت، مہین پور خلافت، ولی عہد بہادر بائیں طرف تخت کے، اور شاہزادگان نامدار، والا تبار، قرۂ باصرۂ خلافت، غرۂ ناصیہ سلطنت، دائیں طرف تخت کے برابر، امیر امرا کے آگے کھڑے ہوئے۔

قلعے میں مہابلی کے براہ راست متوسلین، یعنی شاہزادوں، شاہزادیوں، سلاطین زادوں، سلاطین زادیوں کی تعداد دو ہزار سے متجاوز تھی۔ ان سب کا نان نفقہ علیٰ حسب مراتب خزانۂ شاہی سے ماہ بماہ ملتا تھا۔ وزرا، عہدہ داران، منصب یان، سپاہیان، اور موٹا کام کرنے والے اہلکاران وغیرہ کی تنخواہیں الگ تھیں۔ تیوہار اور جشن کے موقعوں پر، شادی، عقیقہ، ختنہ، پیدائش، موت، سفر کو جانے یا سفر سے مراجعت کے وقتوں پر صرفہ، صرفۂ معتاد پر مستزاد تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے، شاہجہاں کے وقت سے بادشاہ کو ''پیر و مرشد'' کہنے کی رسم شروع ہوئی، لیکن عالمگیر ثانی عرش آرام گاہ کے وقتوں سے خود بادشاہ کو پیری فقیری اور فقیر فقرا میں اٹھنے بیٹھنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، لہٰذا بادشاہ کو عموماً ''ظل الٰہی'' اور ''پیر و مرشد'' دونوں طرح خطاب کیا جانے لگا تھا اور اب حضور انور بہادر شاہ ظفر چونکہ خود صوفی مشرب تھے اور قبلہ کالے صاحب سے سند خلافت اور اجازت لوگوں کو مرید کرنے اور ان کو بیعت کرنے کی حاصل کر چکے

تھے، اس لئے آپ کے وظائف یومیہ میں ایک اہم وظیفہ مریدوں کو شرف ملاقات بخشنا، ان کو توجہ دینا، ان کے روحانی مسائل کا حل تجویز کرنا، اور نئے مرید بنانا تھا۔ پرانے مریدوں سے آپ معمولی نذر کے سوا، جو عام طور پر دو روپئے ہوتی تھی، کچھ قبول نہ کرتے تھے۔ اس کے برخلاف، ہر نئے مرید کو وہ اپنی طرف سے دو روپئے عطا فرماتے تھے۔

ان تمام مدوں میں جو رقم خرچ ہوتی تھی وہ ظل سبحانی کی ظاہری آمدنی سے یقیناً متجاوز ہوتی ہو گی۔ اس پر پہاڑ جیسے قلعے کی صفائی ستھرائی، روشنی، معمولی مرمت، قلعی چونا، یہ سب خرچے الگ تھے۔ مانا کہ قلعۂ معلیٰ کی حالت جگہ جگہ سے سقیم ہو گئی تھی، نہریں سب رواں نہ تھیں، فوارے کئی خشک ہو چکے تھے، ساون بھادوں کا چبوترا اور نہریں اور فوارے گرد سے اٹ چکے تھے۔ روہیلہ گردی، پھر جاٹ گردی اور مراٹھا گردی میں دیواروں اور چھتوں اور برجوں کا سونا چاندی بہت کچھ اتر گیا تھا، منقش در و دیوار کے قیمتی پتھر اکثر اکھاڑ لئے گئے تھے، اور ان نقصانات کی تلافی نہ پہلے ہو سکی تھی اور نہ اب ہی اس کا امکان تھا، لیکن مجموعی حیثیت سے قلعہ اب بھی قلعۂ معلیٰ کہلانے کے لائق تھا۔ باغ و خیاباں سب شاداب اور موسم کے پھولوں اور پھلوں سے تونگر تھے، دیوان عام، دیوان خاص، حمام، تسبیح خانہ، موتی مسجد، یہ سب عمارات اب بھی چمکتی دمکتی نظر آتی تھیں۔

لیکن یہ سب قائم رکھنے کے لئے روپیہ کہاں سے آتا تھا، یہ راز اب تک پوری طرح حل نہیں ہو سکا ہے۔ فردوس منزل حضرت شاہ عالم بہادر شاہ ثانی نے اپنے حسن انتظام سے بہت خزانہ جمع کر لیا تھا جو حضرت ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی عرش آرام گاہ کے زمانے میں خرچ ہو گیا۔ ان کے عہد میں، اور پھر حضرت ابوظفر کے عہد میں حویلی مبارک کے ملازمین و متوسلین کی تعداد میں معتد بہ اضافہ بھی ہوا تھا۔ نوبت بایں جا رسید کہ یہ بھی کہا جانے لگا کہ ان ستر شہزادوں شاہزادیوں کے سوا، جو حضرت عرش آرام گاہ اور اعلیٰ حضرت ظل سبحانی ابوظفر کے اخلاف براہ راست ہیں، بقیہ سب کو قلعے کے باہر کر دیا جائے اور ظل سبحانی ان کی کفالت سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہ ہو سکا تھا۔ تو حضرت ابوظفر سراج الدین بہادر کے خرچ کس طرح پورے ہوتے تھے؟ انگریز نے ان کا وظیفہ ایک لاکھ ماہانہ مقرر کیا تھا جس میں بار بار کی درخواست و گذارش کے باوجود بادشاہ سلامت کی حسب دلخواہ اضافہ نہ ہوا۔

آمدنی کی ایک صورت یہ تھی کہ عیدین، نوروز، اور بادشاہ کی سالگرہ کے مواقع پر انگریز صاحب گورنر جنرل بہادر اور صاحب کمانڈر ان چیف بہادر کی طرف سے نذریں پیش ہوتی تھیں۔ لیکن یہ

قاعدہ حضرت ابوظفر کی تخت نشینی کے تھوڑے ہی دن بعد منسوخ ہوا۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ اپنی تخت نشینی کے وقت حضرت ظل سبحانی نے اپنے لئے ایک گنگا جمنی ہشت پہلو تخت تیار کرایا تھا (اسے بعض لوگوں نے تخت طاؤس لکھا ہے لیکن دراصل اس کا نام تخت ہما تھا)۔ تاجپوشی کے وقت شاہ جمجاہ تو سریر آرائے وسادہ ہوئے لیکن صاحب گورنر جنرل بہادر کو تشریف رکھنے کے لئے کرسی نہیں پیش کی گئی۔ اس بات پر آشفتہ ہو کر انگریز بہادر نے بادشاہ کے لئے تخت ہما پر متمکن ہونا ممنوع قرار دیا۔ اور جب تخت پر جلوہ افروزی بند ہوئی تو نذریں بھی بند ہوئیں۔ اس طرح شاہی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ ہاتھ سے جاتا رہا۔

کئی سال کی تگ و دو اور کاغذی گھوڑوں کی آمد و رفت کے بعد انگریز بہادر نے دسمبر ۱۸۴۴ میں حکم جاری کیا کہ شاہ جمجاہ کے وظیفے میں مبلغ تین لاکھ سالانہ مزید کیا جاتا ہے۔ لیکن اس حکم کی بھی تعمیل ہوتے ہوتے اپریل ۱۸۴۹ ہو گیا اور اغلب یہ ہے کہ دسمبر ۱۸۴۴ تا مارچ ۱۸۴۹ تک کا اضافہ شدہ بقایا بھی بادشاہ کو نہیں دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۸۴۶ میں صرف شہر دہلی کی چنگی سے انگریز کو کم و بیش سینتالیس لاکھ کی آمدنی ہوئی تھی لیکن صاحبان عالی شان کی تنگ چشمی کہ اس رقم سے ایک دانگ بھی قلعۂ شاہی میں نہ پہنچ سکتا تھا۔ زینات و باغات خالصہ سے بادشاہ سلامت کو پچیس ہزار روپے ماہانہ کی مزید آمدنی تھی (مولوی ذکاء اللہ کا تخمینہ اس سے بھی کم کا ہے)۔ لیکن ظاہر ہے کہ سوا لاکھ ماہانہ ہو یا اس سے کچھ زیادہ، شاہی اخراجات کے لئے یہ رقم کہیں سے بھی کفایت نہ کرتی تھی۔

ظہیر دہلوی نے لکھا ہے:

> ایک چھوٹی سے چھوٹی ریاست ہندوستانی کے برابر بھی بادشاہ دہلی کو وسعت مقدرت و استطاعت نہ رہی تھی، بقول سودا ؎
>
> کہ ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
>
> رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول
>
> فقط ایک لاکھ روپیہ ماہوار تو سرکار انگریزی سے آتا تھا اور کسی قدر پرگنات و محالات و تہ بازاری و کرایۂ دکاکین و آمدنی باغات وطیول ونزول خالصہ وغیرہ کی آمدنی تھی۔ من کل الوجوہ سوا لاکھ روپیہ ماہوار تصور کر لینا چاہیئے۔ مگر عظمت جلال و شان و شوکت و تزک و احتشام و ادب و آداب دربار و انتظام جلوس سواری کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہاں کسی زمانے میں یہ خاندان عالی شان سزاوار فرماں روائی ہندوستان جنت نشان

ہوگا، جل جلالۂ۔ مگر باوجود انحطاط و کسر تمول و قلت معاش، دو امر حیرت خیز و تعجب انگیز ایسے نظر سے گذرے ہیں کہ مجھے آج تک ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ اول تو خدائے عالم نے اس لاکھ روپئے میں ایسی برکت عطا فرمائی تھی کہ وہ خیر و برکت و وسعت و استطاعت کروڑوں روپیہ کی ریاستوں میں بھی نہ دیکھی۔

شریف گر متضعف شود خیال مبند

کہ پائے گاہ بلندش ضعیف خواہد شد

چار روپیہ کا سپاہی ہے وہ بھی خوش حال ہے اور بیش قرار در ماہہ دار ہے وہ بھی مالا مال ہے۔ گردش روزگار کا کسی کو شاکی نہ پایا۔ یہ ثمرہ خوش نیتی اور نتیجہ علوئے ہمتی کا ہے۔ دوم، قرائن دربار سلطانی و سطوت جہانبانی جو دربار شاہی میں دیکھے کسی ریاست میں نہ پائے۔ خرچ اخراجات شاہی پر جو نظر غائر ڈالی جاتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ تھا، اتنی برکت خزینۂ شاہی میں کہاں سے آگئی تھی کہ ان اخراجات کو مکتفی ہوتی تھی؟

نواب مرزا خان کے تو ہوش اڑے جاتے تھے۔ جس قدر وہ شعبہ جات و کارخانہ جات شاہی کا تعقب و تفحص کرتا، اسی قدر تہ بہ تہ نئے نئے دیوان و شعبہ جات کی خبر اس کو ملتی جاتی۔ بیرون قلعہ کے ملازمان و ٹھیکہ داران کا تو مذکور الگ رہا، خود قلعۂ میمونہ کے اندر حسب ذیل شعبہ جات گرم کار تھے۔ یہ سب ''کارخانہ'' یعنی آج کی زبان میں ''دفتر'' کہے جاتے تھے:

خاصہ کلاں، خاصہ خرد، آبدار خانہ، دوا خانہ، توشے خانہ، جواہر خانہ، سلح خانہ، خانسامانی، فیل خانہ، اصطبل، بگی خانہ، توپ خانہ، شتر خانہ، رتھ خانہ، کارخانہ جلوس، ماہی مراتب (چتر و علم) بخشی خانہ فوج، کتب خانہ، کبوتر خانہ، داروغۂ نذر نثار، داروغۂ فراش خانہ، پالکی خانہ، داروغۂ کہاران، داروغۂ خاص برداران، جمعدار صبیان، نواب ناظر (افسر خواجہ سرایان)۔

اگر کسی کو گمان گذرے کہ یہ سب نام ہی نام ہیں، زیب داستان کے لئے درج کر دیئے گئے ہیں، تو ظہیر دہلوی کا بیان ہے کہ ''کارخانہ داران کے نام بنظر طوالت قلم انداز کئے گئے۔'' لیکن ہم جانتے

ہیں کہ ان میں کئی ہندو معززین بھی تھے، خصوصاً معاملات مالی وفوجی اکثر ان کے سپرد تھے۔ مثال کے طور پر، راجہ زور آور چند، رائے بہادر گیندامل، کنور دیبی سنگھ، راجہ جے سکھ رائے وغیرہ کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ ان کارخانوں کے ماتحت کیا صیغے اور دیوان تھے، ان کی ضروری تفصیل معلوم ہوتے ہوتے نواب مرزا خان کو کئی ہفتے لگ گئے۔ مثلاً افواج، کہ اب برائے نام اور برائے زینت رہ گئی تھیں اور جنھوں نے فردوس منزل حضرت شاہ عالم ثانی کے زمانے کے بعد ایک گولی بھی برہمی مصاف میں نہ چلائی تھی، ان کے صیغہ جات مندرجہ ذیل تھے:

سیاہ پلٹن، اگرئی پلٹن، پچھیرا پلٹن، خاص برداران، رسالہ برداران۔

معززین دربار معلی کی بھی ایک مقررہ فہرست تھی اور اس فہرست میں کسی کے نام کا اضافہ بڑی عزت کی بات تھی۔ اسی طرح، نااہلی یا رشوت ستانی یا غبن کے الزام میں برطرف ہونے کے بعد نام فہرست سے خارج کر دیا جاتا اور یہ امر برطرفی سے بھی زیادہ موجب تذلیل ہوتا۔ ظہیر دہلوی نے داغ کو بتایا کہ عموماً حسب ذیل زعما کے نام داخل فہرست کیے جاتے تھے:

شاہزادگان، وزرا، استادان، علما، حکما، نواب ناظر، بخشی فوج، کمیدان، کاملین فن، مہتممان کارخانہ جات، عرض بیگیان۔

تنخواہوں کی فراہمی اور تقسیم بجائے خود بہت بڑی مصروفیت تھی اور اس کے لئے کئی شعبے مقرر تھے۔ ظہیر دہلوی نے ان کی تفصیل لکھی ہے: تنخواہ محلات وشاہزادگان، صیغۂ سرکار قدیم، صیغۂ علاقۂ عسکری، صیغۂ روزینہ داران، تعلقۂ نظارت، اور ملازمان فوج۔ ہر تنخواہ، خواہ وہ دو روپے ماہوار ہی کیوں نہ ہو، تنخواہ دار کے لئے بڑے اکرام کی بات تھی۔ ان تنخواہوں کے علاوہ وہ درماہے تھے جو بیرون قلعہ رہنے والے سلاطین زادوں اور ملازمان شاہی مثلاً شاعر، منجم، پیروکار، معلم، مختلف علوم وفنون کے استاد وغیرہ کے لئے معین تھے۔

ان اخراجات کے علاوہ کئی خاص موقعوں پر (جو درحقیقت اس قدر کثیر الوقوع تھے کہ انھیں خاص نہ کہہ کر دربار کی عمومیات میں شمار کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا)، حضرت قدر قدرت اپنے شاہزادوں، متوسلین، اور باہر کے لوگوں کو خلعت ونقد سے سرفراز فرماتے تھے۔ مثلاً میرزا شاہرخ بہادر نے جب ہری دوار کے کمبھ میلے میں جانے کا ارادہ کیا تو انھیں خلعت اور سفرخرچ آستانۂ عالی سے ملا۔ اسی طرح، شادی غمی، سفرحج، سیروشکار، ان سب مواقع پر زرنقد اور خلعت یا جوڑے دربار معلی سے عطا ہوتے تھے۔

حضرت خلافت پناہی کثرت سے شادیاں کرتے تھے اور ان کی اولادیں کثیر تھیں۔ ہر محل کے لئے تنخواہ، نوکر چاکر اور ڈیوڑھی برائے قیام مقرر تھی۔ اس طرح کے کئی صرفہ جات وقتاً فوقتاً پیش آیا کرتے تھے۔ بادشاہ سلامت کو خوش نویسی، گھوڑ سواری، تیر اندازی، نشانہ بازی، اور دیگر فنون حرب وضرب میں بہت درک تھا اور ان سب فنون کے لئے استاد مقرر رہتے تھے۔ ظہیر دہلوی نے اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے داغ کو بتایا کہ بادشاہ سلامت بندوق تو ایسی لگاتے تھے کہ باید وشاید۔ بارہا دیکھنے میں آیا کہ جانور اڑتا ہوا جاتا ہے، ہوادار پر بندوق دھری ہے، اٹھائی اور بے تکلف داغ دی، بندوق چھتیانے کی بھی نوبت نہ آئی۔ جانور لوٹ پوٹ ہوا اور ہوادار میں آرہا۔ تیر اندازی میں بادشاہ جمجاہ کا استاد ایک نامی قدر انداز آپا سنگھ نام کا تھا جو قوم کا سکھ تھا۔ بادشاہ نے زمانۂ ولی عہدی میں دیوان خاص میں ایک جرثقیل لگا رکھی تھی، تین من چنے کا بورا اس سے آویختہ تھا۔ جرثقیل کے ذریعہ اسے چٹکی سے کھینچ لیتے تھے، تین ٹانک کمان کھینچنے پر قادر تھے۔ پھکیتی کے فن میں حضور کے استاد میر حامد علی صاحب تھے، اور حضور کی مشق بزمانۂ جوانی اس قدر تھی کہ تن تنہا آٹھ آدمیوں کے مقابل کسرت کرتے تھے اور آپ برابر ان آٹھوں کی چوٹ روکتے رہتے تھے۔

نواب مرزا خان کو معلوم ہوا کہ شہسواری میں بادشاہ سلامت کے کمال کا یہ عالم تھا کہ یہ بات مشہور روزگار تھی کہ ہندوستان میں محض ڈھائی سوار ہیں، ایک میرزا ابوظفر بہادر، ایک آپ کے برادر والا قدر میرزا جہانگیر بخت جنھوں نے انگریزوں سے شرط بد کر الہ آباد کے قلعے کی خندق کو فرایا تھا۔ تیسرے شہسوار کے بارے میں کہتے تھے کہ کوئی مراٹھا ہے۔ اس بات کی تصدیق فینی پارکس (Fanny Parkes) کے روزنامچے سے ہوتی ہے جہاں اس نے الہ آباد میں مقیم گوالیار کی رانی صاحب کا ذکر کیا ہے کہ ان کے متوسلین میں ایک مراٹھن شہسوار تھی جو محض مہارت شہسواری کے زور پر ایک ہزار سواروں کے بیچ سے بے گزند نکل جاتی تھی۔

یہ سب اخراجات عمومی خرچوں کے علاوہ تھے۔ ایک معمولی اندازے کے مطابق بادشاہ کی آمدنی اور خرچ میں کم سے کم دوگنے کا فصل رہا ہوگا۔ تو پھر دربار گوہربار کے اخراجات پورے کس طرح ہوتے تھے؟ نواب مرزا خان نے اس کی تحقیق کرنی چاہی لیکن کوئی جواب شافی نہ ملا۔ اعلیٰ حضرت قرض لیتے تھے، یہ بات تو سب پر عیاں تھی۔ ایام گذشتہ میں ایک آدھ بار کمپنی بہادر کو بھی کہا گیا کہ ادائے قرضہ یا

میں بادشاہ کی امداد کرے، لیکن کچھ خاص کامیابی نہ ہوئی۔ یہ بھی داغ کے سننے میں آیا کہ معززین دربار میں اکثر ایسے تھے جو اپنی دولت بادشاہ پر ظاہر نہ کرتے تھے، کچھ تو اس خیال سے کہ مواخذہ نہ ہو کہ اتنا مال آیا کہاں سے، اور کچھ اس خیال سے کہ بادشاہ کہیں قرض نہ طلب کر لیں۔ اگر یہ بات ٹھیک تھی، نواب مرزا خان نے اپنے دل میں کہا، تو پھر اعلیٰ حضرت کو قرض بھی کتنا مل جاتا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ کچھ اور ذریعہ بھی ہوگا۔

ایک دوبار عہدہ داران کے عزل ونصب کے مواقع آئے تو نواب مرزا خان کو معلوم ہوا کہ نئے تقرر کے لئے امیدوار صاحبان نذرانہ دیتے تھے اور بعض اوقات تقرر کے لئے کچھ نیلام کی صورت پیدا ہو جاتی کہ جو سب سے زیادہ نذرانہ حاضر کرے اسے عہدہ ملے۔ تو آمدنی کی ایک صورت یہ بھی ہے، نواب مرزا نے اپنے دل میں کہا۔ لیکن پھر بھی ان ذرائع سے بھلا کتنی یافت ہوتی ہوگی؟ یہی دس ہزار بیس ہزار، پر یہاں تو روپیہ ٹھیکروں کی طرح اٹھتا تھا۔

بعض لوگوں کو یقین تھا کہ بادشاہ کے قبضے میں پارس پتھر ہے اور وہ جب اور جتنا چاہتے ہیں سونا بنا لیتے ہیں۔ لیکن داغ کا خیال تھا کہ پارس پتھر ہوتا تو پھر اور بھی اجلے خرچ ہوتے، ہر چیز میں اور بھی بڑھ چڑھ کر اسراف کیوں نہ ہوتا؟ ایک خیال یہ تھا کہ حضور کے پاس دست غیب ہے، جب چاہتے ہیں، جتنا چاہتے ہیں انھیں مل جاتا ہے۔ ایک اور رائے یہ تھی کہ بادشاہ کے قبضے میں کئی زبردست موکل ہیں، وہ ہر مطلوبہ شے دم زدن میں حاضر کر دیتے ہیں۔ ان تقریروں پر بھی وہی اعتراض تھا کہ اگر ایسا ہے تو اور بھی زیادہ شان وحشمت ہونی چاہئے تھی۔ کچھ نہیں تو قلعے کے لوٹے ہوئے قیمتی پتھر، سونا چاندی کے پتر، تو دوبارہ لگوا لئے گئے ہوتے۔ یہاں تو برعکس تھا کہ برج قلعہ کا کلس مسی جس پر طلائی ملمع تھا، وہ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ نیا لگوانے کی طاقت اعلیٰ حضرت میں نہ پائی گئی۔ بات گھوم پھر کر اسی پرانی افواہ پر آجاتی کہ حضرت علیین مکان صاحب قران ثانی کے زمانے کا خزانہ قلعے کی کسی خفیہ جگہ میں مدفون ہے، وہی اب کام آرہا ہے۔ کچھ یہ بھی کہتے تھے کہ حویلی شاجہاں آباد سے اکبر آباد کے لال قلعے تک سرنگ ہے جس کا دہانہ دونوں طرف مسدود کر دیا گیا ہے، صرف بادشاہ وقت کو اس کا راز معلوم ہے۔ قلعۂ اکبر آباد میں بھی ایک خفیہ خزانہ ہے۔ مہابلی وہاں سے بھی بقدر ضرورت منگوا لیا کرتے ہیں۔

''اماں میاں صاحب یہ تو دلی ہے۔'' ظہیر دہلوی نے ایک بار نواب مرزا خان سے کہا جب وہ خفیہ سرنگ اور خزانے کی بات بہت کرید کر پوچھ رہا تھا۔ ''ہم لوگ افواہیں گھڑنے، خبریں سننے سنانے اور

کھیل تماشوں میں بے پر کی اڑانے میں مہارت قدیمی رکھتے ہیں۔ اور ہم لوگ جو بات کہتے ہیں وہ ایک گھڑی دو گھڑی میں نہیں، بس اسی وقت ندائے غیبی کی طرح چھوں دیس پھیل جاتی ہے۔"

"مگر کچھ تو اصلیت ہوگی؟" داغ نے زور دے کر کہا۔ "آخر اتنا بڑا کارخانہ حضور عالی کا کس کے بل پر چلتا ہے؟"

"صاحب زادے، الٰہی کارخانے کا سراغ کوئی جان سکا ہے؟ نہ کمیدان نہ ناظر نہ میر بخشی نہ صوبیدار، لیکن سب چیز وقت سے ہوتی ہے۔ سورج نکلے ہے، غروب ہووے ہے، گرمیوں کے بعد برساتیں آتی ہیں... تو میاں وہی پر قیاس کرلو اللہ بڑا باشاہ ہے۔" ظہیر الدین حسین نے کچھ کچھ کرختداری لہجے میں کہا۔

داغ کا اطمینان ان باتوں سے نہ ہوا، لیکن نسق و نظم شاہی کے بایں حسن و خوبی رواں رہنے کا راز بھی وہ کبھی حل نہ کر سکا۔ خیر، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اس نے اپنے دل میں کہا۔ ظل سبحانی مجھ پر مہربان ہیں، میرزا فخرو صاحب بہادر کی شفقتیں مجھ پر اتنی ہیں کہ اب پہلی بار میں نے سمجھا ہے کہ باپ کتنی بڑی نعمت اور کتنی بڑی قوت ہوتا ہے۔ اور میاں نواب مرزا خان، اس نے دل ہی دل میں کچھ اکڑ کر اور کچھ خود پر طنز ملیح کرتے ہوئے کہا، کل کس نے دیکھا ہے، آج کے لئے اللہ کا شکر ادا کرو اور بقیہ کے لئے سید خواجہ میر صاحب کی زبان سے کہہ لو۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

خدایا تو اماں جان کو، فاطمہ کو، میرزا فخرو صاحب بہادر کو، بڑی خالہ اور منجھلی خالہ کو سلامت رکھیو کہ میری دنیا انھیں کے انفاس سے روشن اور آباد ہے۔ رہا قلعہ کا بقیہ بازار زیست اور کارخانہ حیات، تو حضرت ظل سبحانی کئی بار میری سماعت میں ارشاد فرما چکے ہیں کہ میرے بعد یہ قلعہ اور یہ بادشاہت نہیں۔ پر یہ بھی خوب ہے کہ حویلی کے مکینوں میں ظاہری ایکا ہے لیکن اندر اندر افتراق ہے۔ ہر کسی کو بادشاہ بننے کے ارمان ہیں، بادشاہت کی، راج پاٹ کی ترقی کی، کسی کو فکر نہیں ہے۔

حویلی کے اندر چار چھ مہینے کے قیام نے داغ پر اندرونی سیاست کے کئی پہلو روشن کر دیئے تھے۔ میرزا دارا بخت ولی عہد بہادر اور میرزا فخرو بہادر میں انس برادرانہ بہت نہ تھا۔ ولی عہد بہادر کوشاں رہتے تھے کہ بادشاہ سلامت کے کان میرزا فخرو کے خلاف بھرے جاتے رہیں۔ اعلیٰ حضرت کو یقین آئے

نہ آئے لیکن میرزا فخرو بہادر کے عیوب و نقائص، وہ حقیقی ہوں یا فرضی، حضور ظل سبحانی کے سامنے اشارتاً ہی سہی لیکن بیان ہوتے رہیں۔ یہ کام کچھ آسان اس لئے بھی تھا کہ اعلیٰ حضرت بھی کسی نا معلوم وجہ کی بنا پر میرزا فتح الملک بہادر سے کچھ بہت خوش نہ رہتے تھے۔ ادھر میرزا کیومرث بہادر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ خود کو تیموری وراثت کا سچا حقدار گردانتے ہیں اور یہ بات وہ صاحبان عالیشان کے گوش مبارک تک کئی بار پہنچا چکے ہیں۔ میرزا شاہرخ بہادر کو سیر و شکار سے دلچسپی زیادہ تھی۔ وہ مرنجاں مرنج قسم کے نیک طینت شاہزادے تھے۔ انھیں بظاہر اس بات کی شکایت نہ تھی کہ وہ وزیر اعظم اور مختار عام تو ہیں لیکن ولی عہد دوئم کا عہدہ ان سے چھوٹے بھائی میرزا کیومرث کے پاس ہے۔ میرزا شاہرخ کی والدہ البتہ اس بات کی متمنی تھیں کہ اگر خدا نہ کردہ دارا بخت بہادر کو کچھ ہو گیا تو ولی عہدی کے لئے میرے بیٹے کا خیال رکھا جائے۔

لیکن میرزا شاہرخ کی والدہ معمولی نواب کی بیٹی تھیں، ان کا حلقۂ اثر کچھ نہ تھا۔ ان کے بر خلاف نواب زینت محل بار بار اس بات پر زور دیتی تھیں کہ وہ حضور پر نور کی صرف چہیتی ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے باپ نواب احمد قلی خان بڑے عالی خاندان تھے اور احمد شاہ ابدالی درانی کے براہ راست اخلاف میں تھے۔ مشہور تھا کہ نواب زینت محل کا دعویٰ تھا کہ کیا میرزا دارا بخت بہادر اور کیا کوئی اور، ولی عہدی اور پھر بادشاہی تو ان کے بیٹے میرزا جواں بخت ہی کو سزا ہے۔ اعلیٰ حضرت اپنے تمام تدبر و تمکین کے باوجود نواب زینت محل کی کسی بات سے اختلاف نہ کرتے تھے، یہی فرماتے کہ جب وقت آئے گا تو دیکھیں گے، ابھی نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں کچھ لکھنا بے معنی ہے۔ میرزا جواں بخت مشکل سے پانچ برس کے ہیں اور میرزا شبو نام خدا جوان العمر اور بالکل صحت مند ہیں۔ اور بادشاہی کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں۔ ان باتوں کے باوجود نواب زینت محل اپنے بیٹے کے لئے دربار انگریز میں ریشہ دوانیاں کرتی رہتی تھیں اور جب سے انھوں نے سنا تھا کہ طامس منتکف صاحب کلاں بہادر کا کوئی رجحان میرزا جواں بخت بہادر کی طرف نہیں ہے، وہ صاحب کلاں بہادر کی جانی دشمن ہو گئی تھیں اور انھیں اٹھتے بیٹھتے کوسنے دیا کرتی تھیں۔

اگر قلعے کے نسق و انصرام کے اسرار کی پوری تھاہ نواب مرزا خان کو نہ مل سکی تو بادشاہ ذی جاہ کے کرم اور مہربانیوں کی بھی، جو بادشاہ سلامت نے نواب مرزا پر ارزانی فرمائی تھیں، ان کی بھی تھاہ نواب مرزا کو نہ مل سکی۔ حضرت خلافت پناہی نے نواب مرزا خان کو شہسواری، بانک، اور تیر اندازی میں اپنا

شاگرد مقرر کیا اور پوری توجہ سے اس کے تعلم کا اہتمام کیا۔ فن شعر میں استاد ذوق کی شاگردی کے علاوہ بادشاہ بھی داغ کو کبھی کبھی بلوا کر اس سے کلام سنتے اور کبھی کبھی اصلاح یا ترمیم عنایت فرماتے جسے داغ بصد تسلیم و رضا قبول کر لیتا۔ قلعے کی شعری محفلوں، اور شہر میں بھی کبھی استاد ذوق کے آستانے پر، کبھی نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی حویلی پر شعر خوانی کی محفلوں میں داغ کی شرکت ضروری سمجھی جانے لگی تھی۔ اس کا کچھ سبب تو خود داغ کے کلام کی خوبی تھی، لیکن کچھ دخل اس میں بادشاہ سلامت کی نظر مہر و کرم کا بھی تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ پہلا باضابطہ مشاعرہ جو داغ نے پڑھا وہ قلعے میں اس کی آمد کے بعد ۱۸۴۵ کے ربع اول میں نواب مصطفےٰ خان صاحب شیفتہ کے یہاں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں داغ کا مطلع بہت مقبول ہوا تھا۔

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

مضمون تو پیش پا افتادہ تھا، لیکن زبان کی صفائی اور کلام کی روانی لائق داد تھی۔ شہرت اور پھر نو عمری کی شہرت، استاد ذوق اور میرزا فتح الملک بہادر تو خوش ہوتے ہی تھے، میرزا غالب اور حکیم مومن خان صاحب بھی تعریفیں کرتے تھے کہ گلزار شعر ہندی میں ایک نیا گلبن سر نکال کر پرانے گلابوں سے چشمکیں کر رہا ہے۔ دیکھیں اس کی ہمت عالی اسے کہاں تک لے جاتی ہے۔ ان استادوں کو اب تک جو رنج تھا کہ ہمارے بعد کوئی نظر نہیں آتا جو سرزمین ریختہ کی آبیاری کرے، اب وہ رنج دور ہونے لگا تھا۔

شہرت اور مقبولیت کے ساتھ داغ کے ہمچشموں میں اس کی عزت بھی بڑھی۔ منشی گھنشیام لال عاصی تو رنج ہی کرتے رہے کہ شاہ صاحب مبرور ہوتے تو اس بچے کو ان کا شاگرد کراتا، ورنہ اب وہ میرا ہی شاگرد ہو جاتا۔ لیکن منشی گھنشیام لال عاصی، اور مرزا نوشہ، یہ سب داغ کی طلبی قلعے میں ہو جانے کے بعد اپنی جگہ پر سمجھ چکے تھے کہ ہمہ غیست و لے نصیب دام مانیست۔ ذوق کی شاگردی اور مرزا نوشہ کی صحبتوں نے داغ کی مہارت اور لیاقت دونوں کو روشنی کی رفتار سے جلا کرنی شروع کر دی تھی۔ کبھی کبھی رشک یا حسد کے مارے داغ پر اعتراض بھی کر دیتے، لیکن ایسے مواقع پر داغ اپنے استاد کی طرح اپنا دفاع خود کر لیتا، اور استاد بھی اس کی ہمت بڑھاتے کہ خود کہتے ہو تو خود جواب بھی مہیا کرو، ورنہ بالآخر ہم تو ہیں ہی، تمھاری استمداد کو ہمہ وقت مہیا ہیں۔

ایک بار شہر کی ایک محفل میں داغ نے غزل پڑھی۔

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

زبان کا لطف، بندش کی چستی، مضمون کی شوخی، اس پر بے تکلف گفتگو کے انداز میں معاملہ بندی، اہل دہلی نے یہ ادائیں سودا اور قائم کے بعد نہ دیکھی تھیں۔ تحسین و آفریں کا شور ہر طرف سے گرم ہوا۔ بعد میں جو شعر داغ نے پڑھے وہ بھی اپنی مثال آپ تھے۔

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا
دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

داد کے ڈونگروں کے درمیان داغ نے مقطع پڑھا۔

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

جب داد کا شور کچھ تھما تو ایک بزرگ نے فرمایا، ''سبحان اللہ، یہ عمر اور یہ شعر!''
ایک اور صاحب نے ہنس کر کہا، ''صاحب زادے ابھی تو نام خدا اٹھتی جوانی ہے، ابھی سے یہ مضمون کہاں سے سوجھ گیا؟''

''جی میں عرض کروں؟'' ڈھلتی عمر کے ایک شخص نے، جو صورت سے کسی مدرسے کے مولوی لگتے تھے، ذرا بلند آواز میں کہا۔

''ضرور، مولوی صاحب، ضرور فرمائیں۔'' مجمعے سے آوازیں آئیں۔
مولوی صاحب نے کھنکھار کر کہا، ''اجی حضت یہ مضمون خدائے سخن میر محمد تقی صاحب میر اعلی اللہ مقامہ' کا ہے۔'' پھر انھوں نے حسب ذیل شعر پڑھے۔

کیا فہم کیا فراست ذوق بصر سماعت
تاب و توان و طاقت یہ کر گئے سفر سب
منزل کو مرگ کی تھا آخر مجھے پہنچنا
بھیجا ہے میں نے اپنا اسباب پیشتر سب

ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نے فرمایا، ''بھئی یہ تو درست ہے کہ میر صاحب اس مضمون کو پہلے باندھ گئے ہیں، لیکن میاں داغ کے مقطعے میں ایک برجستگی ہے جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے...''

''سرکار، قطع کلام معاف ہو،'' داغ نے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''بندے کو بالکل نہیں یاد کہ خدائے سخن کے یہ شعر کب میری نظر سے گذرے، اور گذرے بھی کہ نہیں...''

''نہ سہی سرقہ،'' مولوی صاحب نے ذرا تیزی سے کہا۔ ''توارد تو ہوا۔''

''بیشک توارد ہوا،'' داغ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بندہ تو سرقے کا الزام بھی اپنے سر لینے کو تیار ہے۔ لیکن میں دو شعر پڑھتا ہوں، ایک خدائے سخن میر تقی صاحب کا ہے اور ایک ان سے پہلے ایک شاعر گذرے ہیں امیر معزی، ان کا ہے۔ مولوی صاحب انھیں سن کر محاکمہ فرماویں کہ سرقہ یا توارد کس سے سرزد ہوا۔''

مولوی صاحب تھوڑا اگرم ہو کر بولے، ''اپنی بحث اپنے ہی شعروں تک رکھئے...''

مجمعے میں سے کچھ آوازیں آئیں۔ ''نہیں صاحب، ذرا وہ شعر بھی سن لیں۔''

داغ نے کہا، ''بہت خوب، حاضر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے پہلے معزی کا شعر پڑھا، پھر حضرت میر تقی صاحب کا۔

ہمی گوئی کہ با تو اتحادے ست
بگو ظالم کہ مارا اعتمادے ست

شعر پر واہ واہ ختم ہوئی تو داغ نے پڑھا۔

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

لوگ ایک ثانیہ چپ رہے، پھر کسی نے کہا، ''اگر معزی پہلے ہیں تو یہ سراسر سرقہ ہے میر صاحب مرحوم کا۔''

اب معاملہ شعر فارسی کی تاریخ کا تھا، اس لئے کچھ لوگوں نے نواب مصطفےٰ خان کی طرف دیکھا اور کچھ نے مولانا صہبائی کی طرف۔ مولانا نے فرمایا:

''امیر الشعرا امیر معزی سلجوقی عہد کے ہیں، سلطان سنجر نے انھیں امیر الشعرا کا خطاب دیا تھا۔

ان کا انتقال ۵۲۰ کے لگ بھگ ہوا، یعنی میر تقی صاحب کے سات سو برس پہلے، جو ۱۲۲۵ میں اللہ کو پیارے ہوئے۔''

''تو گویا میر صاحب نے سرقہ کیا۔'' ایک صاحب بولے۔

''نہیں۔ سرقہ اور توارد کے احکام بہت پیچیدہ ہیں۔ امام عبدالقاہر جرجانی تو سرقے کے وجود سے قریب قریب انکار ہی کرتے ہیں۔'' مولانا صہبائی نے کہا۔

''فدوی کا التماس یہ ہے جناب کہ سرقہ ہو یا توارد، کبھی سے سرزد ہو سکتا ہے۔ ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔'' داغ نے کہا، جواب تک حسب سابق سر محفل کھڑا ہوا تھا۔

''ممکن ہے میر صاحب نے امیر معزی کا ترجمہ کیا ہو۔ یہ بھی ایک فن ہے۔'' مولانا صہبائی نے فرمایا۔

''بیشک، لیکن الفضل للمتقدم تو ہے ہی۔'' نواب مصطفیٰ خان نے جواب دیا۔

''جی ہاں، اسی اعتبار سے بندہ بھی خدائے سخن کی افضلیت کو دل و جان سے تسلیم کرتا ہے۔'' داغ نے جھک کر دونوں بزرگوں کو سلام کرتے ہوئے عرض کیا۔

اس محفل کے چرچے دیر تک رہے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ داغ نے اگر سرقہ بھی کیا تو بڑے لطف کے ساتھ، اور اس کا الزامی جواب بھی خوب تھا۔

برکندہ از حیات بہ اندک بہانہ ایم
دندان کرم خوردۂ کام زمانہ ایم

دو سال گذر گئے۔ اس دوران کا اہم واقعہ داغ اور امۃ الفاطمہ کی شادی تھی۔ میرزا فتح الملک بہادر خود تو بارات میں نہ گئے لیکن انھوں نے پورے اہتمام سے داغ کو سوار کرایا، بارات کو رخصت کیا اور دوسرے دن دلہن کی قلعے میں آمد کے وقت استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہر چند کہ داغ کی پرورش اور پرداخت میں عمدہ خانم کا بڑا حصہ تھا، لیکن بڑی بہن کا دل رکھنے کے لئے عمدہ خانم نے خود کو دلہن کے گھر والی قرار دیا اور شادی کے ہر کام میں لڑکی والوں کی طرف سے پیش پیش رہیں۔ فاطمہ کچھ دن حویلی میں رہی، پھر سب کے اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ وہ خانم کے بازار والے گھر ہی میں رہے اور جب جی چاہے یہاں آجایا کرے، یا نواب مرزا خان وہیں چلے جایا کریں۔

وزیر خانم اور میرزا فتح الملک بہادر کی محبت دن دونی رات چوگنی ہوتی جاتی تھی۔ خورشید مرزا بھی گھٹنوں چلنے اور غوں غاں کرنے لگے تھے۔ پوری امید تھی کہ بڑے ہو کر لائق اور سعید ثابت ہوں گے۔ وزیر نے دل میں یقین کر لیا تھا کہ اب یہ اچھے دن رات یوں ہی رہیں گے۔ بہت کچھ گنوا کر اب وہ اس منزل پر پہنچی تھی کہ مثنوی شریف کی زبان میں کہہ سکتی تھی۔

جو ہر انساں بگیر د برو بحر
پیسہ گاواں بسملان روز نحر

وہ کہہ سکتی تھی کہ اب تک جو کچھ اس سے چھینا گیا وہ اس دولت کے سامنے ہیچ تھا جو اسے اب نصیب تھی، جو اس سے لے لیا گیا وہ بمنزلۂ پیسہ گاواں (۱) تھا جنھیں عید البقر میں قربان کیا جاتا ہے۔

(۱) پیسہ بروزن کیسہ، بمعنی ابلق، سیاہ و سفید۔

ایک دن اچانک شور اٹھا کہ ظلِ الٰہی کا مزاج بہت ناساز ہے۔ ہر چند کہ بادشاہوں کی بیماری ہمیشہ انتہائی راز میں رکھی جاتی ہے، لیکن بادشاہ سلامت نے کئی دن تک دربار نہ کیا اور تسبیح خانے میں بھی کسی کو باریابی نہ ملی اور حکیم احسن اللہ خان بہادر عمدۃ الحکما روزانہ کم و بیش اٹھارہ بیس گھنٹے قلعۂ معلیٰ میں گذارنے لگے تو لوگوں کے ماتھے ٹھنکے اور افواہ کی زبان تیزی سے گشت کرنے لگی۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ میرزا کیومرث بہادر ولی عہد دوئم نے بادشاہ سلامت کو زہر دلوا دیا ہے تا کہ بادشاہ کا قصہ پاک ہو اور تخت ہمیں مل جائے۔ یہ بات دل کو لگتی نہ تھی، کہ میراں شاہ میرزا دارا بخت بہادر ولی عہد اول ابھی موجود تھے اور بعد جہاں پناہ کے وصال کے بادشاہی انھیں ملتی نہ کہ میرزا کیومرث بہادر کو۔ لیکن جس طرح جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اسی طرح افواہ کے سو منھ ہوتے ہیں۔ عرش تیموری نے اپنی کتاب ''قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں'' میں یہ داستان یوں لکھی ہے:

> [بادشاہ] کے فرزند شہزادہ کیومرث بہادر ولی عہد نے بد مصاحبی کی وجہ سے لالچ میں آ کر شیر کی مونچھ کا بال پان میں رکھ کر کھلا دیا تھا، اس طمع میں کہ اگر بادشاہ کی موت ہوئی تو خود مجھ کو بادشاہت مل جائے گی... بہر حال جب آپ کی حالت غیر ہوئی تو حکماے وقت کے قے آور ادویات کے استعمال کرانے سے ڈکلے کے ڈکلے خون کے نکلے، اور اتنے کہ کئی چلمچیاں بھر جاتی تھیں۔ آخر اس خون میں بال کی کرچی بھی نکل آئی۔ تحقیقات ہوئی... آخر کار معلوم ہوا کہ یہ کام شہزادہ کیومرث بہادر کا ہے۔ جب حضور بادشاہ کو اس مرض الموت سے افاقہ ہوا تو آپ نے عین صحت یابی کی تقریب میں شہزادہ کیومرث کو طلب فرمایا اور اپنے پاس ایک پیالہ مسموم شربت کا تیار رکھا۔ منجھلا فرزند سہما ہوا سر جھکائے حاضر ہوا۔ آداب بجالایا اور بحالت منتظر کھڑا رہا کہ حکم پدر کی تعمیل کرے۔ بادشاہ نے شربت کا پیالہ ہاتھ میں لے کر بیٹے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا، ''بیٹا جس طرح تم نے مجھے شیر کا بال کھلایا اب اس کی مکافات بھرو اور لو یہ زہر کا پیالہ ابھی پیو۔''

مرزا کیومرث نے ہاتھ باندھ کر کچھ عرض کرنا چاہا تھا کہ باپ نے للکار کر کہا۔ ''او موذی کیا اب ناخلف بھی بننا چاہتا ہے؟''

مرزا کیومرث دست بستہ ادب گاہ پر آئے۔ آداب بجالائے، اور ''بہت

بہتر" کہہ کر غٹا غٹ زہر کا پیالہ چڑھا گئے۔ اور تھوڑی دیر میں باپ کے قدموں میں گر کر سرد ہو گئے۔

بیان کی ڈرامائیت قابل داد ہے، لیکن اس میں کچھ بھی سچ نہیں، سوا اس کے کہ میرزا کیومرث بہادر ۱۸۴۷ کے آس پاس اچانک راہی ملک عدم ہوئے۔ بادشاہ کو شیر کی مونچھ کا بال کھلانے یا زہر دلوانے کی روایت کسی معاصر ماخذ میں نہیں ملتی، اور نہ ہی شیر کی مونچھ کا بال کوئی سمیت رکھتا ہے کہ جو اسے کھائے اسے خون کی الٹیاں ہوں اور وہ مر جائے۔ نیز یہ واقعہ اگر ۱۸۴۷ کے پہلے کا ہے تو اس وقت میرزا شاہرخ بہادر حیات تھے اور اس طرح بادشاہت اور میرزا کیومرث کے درمیان دو ولی عہد موجود تھے۔ اور اگر یہ واقعہ ۱۸۴۷ کے بعد کا ہے تو بھی ۱۸۴۹ تک میرزا محمد دارا بخت ولی عہد زندہ سلامت تھے۔ اور اگر یہ واقعہ ۱۸۴۹ کے بعد کا ہے تو اس زمانے میں بادشاہ اور انگریزوں کے درمیان میرزا فخرو بہادر کی ولی عہدی کے لئے مراسلت چل رہی تھی، اور خود میرزا فخرو بہادر بھی اس باب میں انگریز حاکمان کی خدمت میں اور بادشاہ سلامت کی خدمت میں عرضیاں روانہ کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ غیر ممکن ہے کہ میرزا کیومرث نے کبھی ایسا احمقانہ اور غیر موثر اقدام کیا ہو۔

یہ بات صحیح ہے کہ بادشاہ سلامت کو ایک وقت میں پیٹ کا عارضہ ہوا تھا، اور یہ بہت تکلیف دہ عارضہ تھا۔ لیکن یہ بات بہت بعد کی ہے، اور اس زمانے میں تو پیٹ کا مرض عام تھا۔ صاحبان انگریز کو امراض شکم اکثر موجب مرگ ہوتے تھے۔ میرزا کیومرث کے انتقال کی صحیح تاریخ کہیں درج نہیں، لیکن اغلب ہے کہ ان کا انتقال اوائل ۱۸۴۷ میں ہوا اور اچانک ہوا۔ اچانک موتوں پر زہر خورانی کی افواہ اس زمانے میں عام طور پر اڑ جایا کرتی تھی۔ میرزا کیومرث کے گذرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد میرزا شاہرخ بہادر ولی عہد دوئم بھی اپریل ۱۸۴۷ میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

ان اموات نے نظام بادشاہی میں کچھ رخنہ پیدا نہ کیا کہ میرزا دارا بخت بہادر ولی عہد اول موجود تھے اور مقبول خاص و عام تھے۔ زینت محل کی خواہش شدید کے باوجود میرزا جواں بخت کے لئے ابھی کوئی راہ نہ نکل سکتی تھی۔ لیکن ۱۸۴۹ کے بالکل اوائل میں، یعنی ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ کو میرزا محمد دارا بخت راہی ملک بقا ہوئے۔ پہلے انھیں ہلکا سا زکام اور تپ ہوئی جسے بسبب بلغمی مزاج قرار دیا گیا اور اخراج بلغم کی دوائیں انھیں دی گئیں۔ لیکن دو ہی دن میں تپ حد سے بڑھ گئی اور پھیپھڑوں میں ورم آ گیا۔ چار دن بیمار رہ کر شاہزادے نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت اور سارے قلعے نے ان کا سوگ

کیا۔ کئی دن تک دربار نہیں ہوا اور رونے کی آوازیں قلعے کی دیواروں سے ٹکراتی رہیں۔ اشکبار بادشاہ نے تاریخ کہی۔

آں ولی عہدے کہ دارا بخت بود
کرد چوں رحلت ازیں دنیاے دوں
شد درون خلق داغ از سوز غم
گشت سال رحلتش داغ دروں
۱۲۶۵

تیسرے دن پھولوں کی تیاری ہوئی، فاتحے کے کھانے پکے۔ لوگوں نے جمع ہو کر ایک ایک سیپارہ کلام پاک پڑھا۔ الائچی دانوں پر ستر ستر ہزار مرتبہ کلمہ شریف پڑھا گیا پھر الائچی دانے سب میں تقسیم کئے گئے، مرحوم کے نام پر کھانا اور جوڑا اور دوشالہ خیرات کیا گیا۔ بعد فاتحہ بادشاہ محل میں آئے۔ مرحوم کے بیٹوں، بہوؤں، دامادوں اور بیٹیوں کو سوگ اتروانے کے دوشالے اور بیویوں کو رنڈ سالے مرحمت فرمائے۔ ہر طرف کہرام آہ و بکا برپا ہوا۔ حضور بھی آبدیدہ ہوئے اور فرمایا، ''اماں، صبر کرو۔ تقدیر الٰہی میں کسی کو دم مارنے کی جا نہیں۔'' پھر نویں دن، انیسویں دن، اور چالیسویں دن کے فاتحے ہوئے۔ قبر پر چادر از سر نو چڑھی، ختم کے الائچی دانے سب میں تقسیم کئے گئے۔

میرزا دارا بخت کا غم اگر نہ کیا تو زینت محل نے۔ تھوڑی مدت کے اندر جواں بخت کی راہ سے تین تین کانٹوں کا ہٹ جانا زینت محل کی نظر میں ان کے بیٹے کے حق میں تائید غیبی کا حکم رکھتا تھا۔ انھوں نے جواں بخت کی ولی عہدی کے لئے جان توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ بادشاہ پر تو وہ زور ڈالتی ہی رہیں، اس بار انھوں نے صاحبان انگریز، بالخصوص طامس مٹکاف صاحب کلاں بہادر اور ان کے نائب سیمن فریزر (Simon Fraser) صاحب کے یہاں تحفے تحائف اور درخواستوں کی بھرمار کر دی۔ بزرگان دین کے مزارات پر بھی بکثرت جا جا کر انھوں نے دعائیں کیں اور منتیں مانیں۔ بادشاہ کے دل میں دو خیال تھے، ایک تو یہ کہ منجموں کے قول کے مطابق میرے بعد بادشاہی نہیں، اور دوسرا یہ کہ جواں بخت اگر ولی عہد اور پھر فرض کر دم بادشاہ ہوئے بھی تو انھیں استطاعت نہ تھی کہ وہ شاہی قرض ادا کر دیں۔ ادھر میرزا فخرو نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے ولی عہد بنا دیں، میں بادشاہ ہوا تو جہاں پناہ کے تمام قرضے ادا کر دوں گا چاہے اس میں مجھے اپنے کو بیچنا ہی کیوں نہ پڑے۔

ادھر انگریز بہادر اپنی چالیں چل رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ شاہی کا نام مٹا ڈالنے اور دودمان تیموریہ کے دماغ سے دود حکومت ہمیشہ کے لئے زائل کردینے کا یہ بےنظیر موقع ہے۔ بادشاہ کو بڑی حد تک نظرانداز کر کے (زینت محل تو ابھی کسی شمار میں نہ تھیں)، انگریز صاحبان والا شان نے میرزا فتح الملک بہادر سے براہ راست گفتگو شروع کر دی۔ بلکہ اگر میرزا خورشید عالم کے قول (بروایت عرش تیموری) پر اعتبار کیا جائے تو میرزا محمد دارا بخت کے رہگرائے عالم جاودانی ہونے کے پہلے ہی سے میرزا فتح الملک بہادر اور انگریزوں کے درمیان بات چیت جاری ہو چکی تھی۔ لیکن یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ بہر حال، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ۱۸۴۹ میں میرزا فخرو نے انگریزوں سے مذاکرات شروع کئے اور سب باتیں طے ہو جانے کے بعد حضرت خلافت پناہی کی خدمت میں ایک ہی تاریخ (۳ ستمبر ۱۸۵۲) کو تین عریضے مشتمل برایں مضمون بھیجے کہ ولی عہد مقرر ہو جانے پر میں تمام زندگی شاہ آسماں جاہ کی اطاعت اور غلامی کروں گا اور حضرت ملکۂ دوراں نواب زینت محل صاحب مدظلہا کو اپنی والدہ سے زیادہ سمجھوں گا۔ دوسرے عریضے میں انھوں نے شاہی قرضے کی مکمل ادائگی کا وعدہ کیا اور تیسرے عریضے میں انھوں نے یقین دہانی کی کہ وہ نواب زینت محل کی مرضی کے خلاف کبھی نہ چلیں گے اور نواب زینت محل اور میرزا جواں بخت کی تمام مراعات برقرار رکھیں گے۔ گمان غالب ہے کہ یہ خط بادشاہ نے میرزا فخرو پر اخلاقی دباؤ ڈال کر اس وقت لکھوائے جب انھیں صاحب انگریز کے فیصلے کا پتہ چل گیا جو کلکتہ سے ان کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا کہ حکومت انگلشیہ میرزا فخرو کو ولی عہد تسلیم کرتی ہے اور نواب زینت محل نیز میرزا جواں بخت کے لئے کسی قسم کی مراعات دیا جانا غیر ممکن ہے۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز نے میرزا محمد دارا بخت کے انتقال کی خبر سنتے ہی از خود فیصلہ کر لیا تھا کہ ولی عہدی میرزا فخرو کو ملے گی اور ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کے سانحۂ ارتحال کے بعد بادشاہی ختم کر دی جائے گی۔ چنانچہ صاحب کلاں بہادر اور صاحب گورنر جنرل بہادر نے بادشاہ کی تجویز کو بنظر استحسان دیکھا لیکن شرائط ولی عہدی براہ راست میرزا فخرو بہادر سے طے کیں۔

کئی سال کی گفت و شنید کے بعد انگریز نے فتح الملک بہادر کو ولی عہد تسلیم کر لیا لیکن اس شرط پر کہ بعد وفات حضور قدر قدرت پیر و مرشد برحق بادشاہی ختم ہو جائے گی، قلعۂ معلیٰ خالی کر دیا جائے گا اور مطلق العنانی کے تمام رموز و نشانات یک قلم محو کر دیئے جائیں گے۔ نہ چتر ہو گا نہ میگ ڈمبر، نہ ماہی مراتب، نہ نوبت۔ سکۂ شاہی کا ڈھلنا تو مدتوں سے موقوف تھا، گوالیار اور الٰہ آباد کی ٹکسالوں میں شاہ عالمی

سکے ڈھلتے تھے، لوگ ان سے کام چلاتے تھے۔ کمپنی بہادر کے سکے بھی روز افزوں قوت پکڑتے جاتے تھے۔ کمپنی انگریز بہادر نے مدتوں پہلے سے آرکاٹ، سورت، اور مرشدآباد سے کئی شاہی ٹکسالوں میں سکے ڈھالنے شروع کر دیے تھے، لیکن ان پر شاہ دہلی کا نام ہوتا تھا۔ پھر ۱۸۳۵ کے سکوں پر بادشاہ دہلی کے بجائے انگریز بادشاہ ولیم چہارم کا نام اور چہرہ دیا گیا، اور ۱۸۴۰ کے سکوں پر ملکہ وکٹوریہ نمودار ہوئیں۔ اب یہی سکے ہر جگہ متداول تھے۔

ملک ہند میں بادشاہی کی علامت لے دے کر ایک جمعے کا خطبہ تھا جس میں بادشاہ کا نام لیا جاتا تھا۔ اب طے ہوا کہ جمعہ کے خطبے میں بھی بادشاہ کا نام نہ لیا جائے گا۔ میرزا فخرو خاندان تیموریہ کے سردار تسلیم کئے جائیں گے لیکن انھیں مہرولی میں مکان بنا کر قیام کرنا ہوگا اور نواب گورنر جنرل بہادر و نواب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک شمال مغرب کو عہدہ برابری سے کرسی دینی ہوگی۔ قلعۂ معلیٰ کے انخلا کے عوض میں کسی قسم کی رقم کا وعدہ نہ کیا گیا۔

میرزا فتح الملک بہادر ۳ ستمبر ۱۸۵۲ کو صاحب عالم و عالمیان، مرشدزادۂ جہانیان، میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین فتح الملک شاہ بہادر دام حشمہٗ و اقبالہٗ کے القاب و خطابات کے ساتھ ولی عہد مقرر کئے گئے لیکن اس موقعے پر کسی طرف سے کسی خاص خوشی یا جشن کا اہتمام نہ ہوا۔ فتح الملک بہادر رنجیدہ تھے کہ آل چغتا کی سلطانی کا چراغ ان کے ہاتھوں کشتہ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ شاید اپنے دل میں یہ خیال کرتے ہوں کہ بادشاہی تو اب برائے نام ہی باقی تھی، رہی نہ رہی، اس سے فرق کچھ نہیں رہتا۔ میں نے کم سے کم اپنے گھرانے کے نام کو محفوظ کر لیا۔ نواب زینت محل کی ڈیوڑھی میں تو ماتم کا سا ماحول تھا۔ ملکۂ دوراں ہاتھ اٹھا کر بلند آواز میں مٹکف صاحب کو کوس رہی تھیں اور پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ صاحب کلاں کو اس نا انصافی کا بدلہ ضرور ملے گا۔ بعض کا قول ہے کہ ملکۂ دوراں نے یہ بھی اعلانیہ کہا کہ صاحب کلاں اور اس کی میم دونوں ہی زہر کھائیں گے اور خونی قے کر کر مریں گے۔ نواب زینت محل نے جھٹ پٹ ایک عرضی سیدھے ملکۂ معظمہ ملکہ وکٹوریہ کی بھی خدمت میں بھیج دی کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ لیکن ان کی وہاں کون سنتا تھا۔ شہر اور قلعے میں بہر حال عمومی طور پر لوگ خوش تھے کہ میرزا فتح الملک بہادر جیسا خوش خلق اور نیک سیرت اور ذی علم اور صحیح معنوں میں حقدار شہزادہ ولی عہد بنایا گیا۔

میرزا فتح الملک شاہ بہادر کی ولی عہدی کو چند ہی مہینے گذرے تھے کہ ٹامس مٹکاف صاحب کلاں بہادر کو پیٹ کی تکلیف شروع ہوئی۔ تشنج شکم، امتلا، اسہال، اور ہلکی تپ نے انھیں جلد ہی بے حال

کر دیا۔ جب انگریز ڈاکٹروں کی معالجت کامیاب نہ ہوئی تو اطباے یونانی، ہندوستانی بید، اور پھر سیانے اور مولوی بھی بلائے لیکن مرض میں تخفیف کے بجاے اشتداد آتا گیا۔ مٹکاف صاحب بار بار کہتے کہ مجھے زہر دیا جا رہا ہے اور اب میں ہرگز نہ بچوں گا۔ ڈاکٹروں، مولویوں اور سیانوں، جھاڑ پھونک منتر کرنے والوں، سب نے بار بار کہا کہ سرکار کے بدن اور روح میں زہر کا کوئی اثر نہیں، لیکن مٹکاف کو یقین نہ آتا تھا۔ اور یقین کیونکہ آتا، جب اسے کسی طور افاقہ ہوتا ہی نہ تھا۔ جو کچھ بطریق غذا یا دوا وہ کھاتا، اس کا بڑا حصہ استفراغی ہو کر خارج ہو جاتا۔

دلی کے افواہ گروں کے لئے تو یہ خداداد موقع تھا۔ سارے میں مشہور ہو گیا کہ نواب زینت محل ملکۂ دوراں نے صاحب کلاں کو زہر دلوا دیا ہے، اس بات کی پاداش میں، کہ میرزا جواں بخت بہادر کو ولی عہدی سے محروم انھوں نے رکھا۔ بادشاہ کی طرف سے اس افواہ کی بار بار تردید بھی ہوئی، لیکن جب صاحب ریزیڈنٹ و کمشنر بہادر خود فرماتے تھے کہ میں مسموم ہوں تو کسی کے انکار سے کیا بنتا۔

ٹامس مٹکاف صاحب بہادر نے حکم دیا کہ میں دلی کی زہر بھری گرد آلود ہوا میں اچھا نہیں ہو سکتا۔ مجھے پہاڑوں پر لے چلو۔ دلی سے دور زہر خورانیوں کا بھی موقع نہ ہوگا۔ حسب الحکم صاحب کلاں بہادر، مٹکاف اور ریزیڈنٹی کا بہت سارا عملہ فعلہ پالکیوں، بہلیوں اور رتھوں پر لاد کر شملہ پہاڑ لے جایا گیا۔ دلی سے انبالہ تک شیر شاہی سڑک تھی اور اچھی حالت میں تھی۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی ہچکولوں اور دھچکوں سے بھرا پہاڑی رستہ تھا جس کے خم و پیچ اور سخت چڑھائیوں کے باعث سفر اور بھی تکلیف دہ تھا۔ آگے آگے دوڑنے والے ہرکاروں نے واپس آ کر خبر دی کہ پہاڑ کی اونچائیوں پر گھنے جنگلوں، برف باری اور پہاڑ کے ٹوٹ کر گرنے کے سبب راستہ اگر نا قابل عبور نہیں تو دشوار گذار بے شک ہے۔ مٹکاف کی بیوی، جو خود پیٹ کے عارضے میں مبتلا تھی، ان مخدوش حالات میں آگے سفر کرنے اور اپنے شوہر کی حالت میں مزید زبونی کا جوکھم لینے کو تیار نہ ہوئی۔ لہٰذا سارا قافلہ الٹے پاؤں دلی واپس آنے پر مجبور ہو گیا۔ اکتوبر کے اواخر میں دونوں زار و نزار دار الخلافۂ شاہجہاں آباد واپس پہنچے۔ مٹکاف یہی کہے گیا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔ اس کا وزن گھٹتا گیا اور بدن میں رطوبت کم ہوتی گئی۔

بالآخر میرزا فخرو کے حق میں اعلان ولی عہدی کے چودہ مہینے بعد ۳ نومبر ۱۸۵۳ کو فدوی خاص و فرزند ارجمند سلطانی معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خان ٹامس تھیافلس مٹکاف صاحب بہادر فیروز جنگ ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر مختار امور سرکار دولت مدار کمپنی انگریز بہادر و صاحب کمشنر بہادر

مال و دائر سائر علاقۂ دارالخلافۂ شاہجہاں آباد نے جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ اگلے دن ۴ نومبر کو سکندر صاحب کے گرجا گھر سے ملحق قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ یہ وہی قبرستان ہے جہاں اٹھارہ سال قبل ولیم فریزر صاحب کو بھی سپرد خاک کیا گیا تھا ۔

دیکھا میں قصر فریدوں کے در او پر اک شخص

حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

کچھ مدت بعد صاحب کلاں بہادر کی میم بھی بعارضۂ شکم اس دار فنا سے اٹھ گئی۔ اس بار تو صاحبان انگریز نے بھی شبہے کا اظہار کیا کہ مٹکاف میم صاحب کو زہر دیا گیا تھا۔ آستانۂ عالی سے اس بار کوئی تردید نہ آئی کہ پچھلی تردید کے باوجود نواب زینت محل کے بارے میں الزامی افواہیں اڑتی رہی تھیں۔ بعض انگریز حلقوں میں اب بھی یہی مشہور ہے کہ مٹکاف اور اس کی میم دونوں کی موت زہر خورانی سے ہوئی اور ملکۂ دوراں کا ہاتھ دونوں اموات میں تھا۔ بہر حال، نواب گورنر جنرل بہادر کے عتبۂ عالیہ سے اس بابت کوئی جانچ نہیں ہوئی اور نہ ہی کمپنی انگریز بہادر کے کواغذ میں اس معاملے پر کچھ اظہار خیال ملتا ہے۔

نیا انگریزی سال طلوع ہوا۔ اہل قلعہ، بالخصوص بادشاہ سلامت قدر قدرت، ولی عہد میرزا فتح الملک شاہ بہادر اور وزیر خانم نے امید اور دعا کی کہ اب جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ امن و امان سے گذریں۔ لیکن سال ختم ہوتے ہوتے ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ کو سلطان الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم خان ذوق استاد شہ نے دارالقرار میں قرار کیا۔ حکیم مومن خان مومن پہلے ہی حکیم علی الاطلاق کے دربار میں پہنچ چکے تھے (۱۴ مئی ۱۸۵۲)۔ اب شہر دہلی میں میرزا اسد اللہ خان غالب ہی استادوں کی نشانی اور بستان شعر فارسی و ریختہ کے بلبل ہزار دستاں اور غالب علی کل شعراء رہ گئے تھے۔ ظل سبحانی نے میرزا صاحب کو طلب کر کے اپنا استاد مقرر کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک کے خطابات عطا کئے۔

آستانۂ خلافت سے درجۂ استادی حضرت غالب کو تفویض ہونے کے بعد میرزا فتح الملک شاہ بہادر ولی عہد سلطنت المتخلص بہ رمز نے بھی ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ لیکن باوجود اس کے کہ میرزا صاحب کی نگاہ مہر وقدر داغ پر پڑتی تھی، داغ نے میرزا نوشہ کا شاگرد بن جانے کا کوئی ارادہ نہ کیا۔ شاید اسے یہ خیال رہا ہو کہ شیخ ذوق نے اسے کامل کر ہی دیا تھا، یا اس نے پرانی باتیں یاد کی ہوں اور اپنی ماں کا لحاظ کیا ہو کہ میں اگر میرزا صاحب کی شاگردی میں آؤں گا تو اماں جان کو رنج ہو سکتا ہے۔ بہر حال، یہ حقیقت ہے کہ شاگرد نہ بننے کے باوجود داغ کے مراسم میرزا نوشہ سے ہمیشہ بہت خوشگوار رہے اور دربار

رامپور سے غالب کے تعلقات استوار رکھنے اور وہاں ان کے معاملات کی شنوائی ہونے میں داغ نے کار ہائے اہم انجام دیئے۔

چند ہی مہینے گذرے تھے کہ یکم اپریل ۱۸۵۵ کو نواب سید محمد سعید خان بہادر فرمانروائے رامپور بعارضۂ سل راہی جنت الفردوس ہوئے اور ولی عہد سلطنت نواب یوسف علی خان بہادر ناظم نے مسند سلطانی پر جلوہ فرمایا۔ نواب اور عمدہ خانم کے تعلقات کے پیش نظر کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ داغ کے لئے اب رامپور کو مستقر بنانا انسب ہوگا۔ لیکن داغ نے ماں کا سایہ اور میرزا فتح الملک شاہ بہادر کا دامن چھوڑنا پسند نہ کیا۔ وزیر بھی یہی چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ خورشید مرزا کی طرح نواب مرزا اور اس کی دلہن بھی دلی کے دارالامان و دارالعزت میں رہیں اور پھلیں پھولیں۔ نواب مرزا کی اپنے سوتیلے بھائی میرزا ابوبکر بہادر سے اچھی بنتی تھی۔ ادھر میرزا خورشید عالم بھی دس برس کا ہو رہا تھا اور شاہ محمد آغا کا پندرہواں برس تھا۔ یہ چاروں اخیافی یا علاتی بھائی تھے لیکن ان میں اخلاص اور پیار سگے بھائیوں جیسا تھا۔ میرزا ابوبکر تو شعر نہ کہتے تھے لیکن شاہ محمد آغا کی طبیعت ابھی سے اہل دہلی کے فیض صحبت سے منجھنے لگی تھی۔ انھوں نے شائق تخلص اختیار کیا مگر ریختہ سے زیادہ ان کا رجحان فارسی کی طرف تھا۔ شاید یہ باپ کا اثر رہا ہو۔ میرزا خورشید عالم بھی شاعر ہونے کے شوق میں اپنا تخلص خورشید رکھ کر ایک دو مصرعے موزوں کرنے لگ گئے تھے۔ ولی عہد بہادر فرمایا کرتے کہ وزیر خانم یہ تمھارا اثر ہے جو نواب مرزا اور شاہ محمد آغا اور خورشید میرزا شاعر ہیں، ورنہ اکیلے میرے کئے سے تو کوئی اولاد شاعر نہ بن سکی۔ وزیر جواب دیتی کہ ولی عہد بہادر، اللہ آپ کو سلامت باکرامت رکھے، شاعر تو بہتیرے ہو جائیں گے۔ لیکن میرزا فتح الملک شاہ بہادر کبھی کبھی سوچتے کہ کاش میں غلام فخر الدین ہی رہتا۔

اطراف ہند سے انگریز بہادر کی چیرہ دستیوں کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ ۱۸۵۶ کا سال شروع ہوتے ہوتے سب سے بڑا سانحہ انتزاع سلطنت اودھ کا تھا۔ ۷ فروری ۱۸۵۶ کو انگریز فوجیں لکھنؤ میں داخل ہوگئیں، بادشاہ کو مسلح محافظوں کے گھیرے میں اور بڑی ایذا کے ساتھ پہلے الہ آباد، پھر کلکتہ لے جایا گیا۔ معزول بادشاہ نے اپنی مثنوی ''حزن اختر'' میں اپنا حال لکھا اور اودھ کے خلاف صاحبان فرنگی کی رپورٹ موسومہ بہ ''بلو بک'' (Blue Book) کا جواب بھی بزبان فارسی، ہندی، و انگریزی لکھوا کر شائع کرایا۔ لیکن دہلی کی ولی عہدی اور شاہی کی طرح یہاں بھی فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے، تقدیریں پہلے ہی لکھی جا چکی تھیں۔

دہلی میں اس واقعے کی گونج دیر تک سنی گئی۔ ظل اللہ کو بھی سخت تشویش تھی۔ ہر چند کہ انگریز نے دلی

کے علی الرغم اودھ کو خود مختار سلطنت تسلیم کر لیا تھا لیکن قلعے والے، بلکہ تمام دلی والے بھی یہی گمان کرتے تھے کہ اودھ کو ہم سے بجبر نہیں تو بہ سیاست الگ کیا گیا ہے۔ بادشاہ کے متعدد اقارب لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اور ان کی تنخواہیں ماہ بماہ قلعے سے جاتی تھیں۔ میرزا سلیمان شکوہ بہادر کی نسل تو اب کرنیل گارڈنر صاحب کی نسل میں ضم ہو کر محو ہو گئی تھی، لیکن میرزا جہانگیر بخت (ابن اکبر شاہ ثانی عرش آرام گاہ) کے اخلاف الہ آباد اور میرزا جہاندار شاہ (ابن شاہ عالم ثانی فردوس منزل) کے اخلاف بنارس میں موجود تھے۔ لہٰذا سیاسی اور خاندانی دونوں پہلوؤں سے سلطنت اودھ کا انگریز کے ہاتھ میں چلا جانا حضرت رعیت پناہی کے لئے صدمے کا باعث تھا۔ کہا گیا ہے کہ حضرت خلافت مآب نے یہ شعر سلطان شہید کے پردے میں بادشاہ واجد علی شاہ پر بھی فرمایا تھا ؎

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

چونکہ دکن کے علاقے کو عموماً ''ہندستان'' نہ کہتے تھے، اس لئے اس شعر میں ظل الٰہی نے لفظ ''ہندستان'' صرف کر کے ایک بسیط تر حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔ شہر دہلی میں اودھ کے سقوط کی خبر نے کیا کیفیت پیدا کی، اس کا کچھ اندازہ میرزا غالب صاحب کے ایک خط سے ہو سکتا ہے۔ قدر بلگرامی کو غالب صاحب نے ۲۳ فروری ۱۸۵۶ کو لکھا:

تباہی ریاست اودھ نے، با آنکہ بیگانہ محض ہوں، مجھ کو بھی افسردہ دل کر دیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہیں وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔

اس سال دلی میں گرمیاں بہت سخت تھیں۔ دلی میں لوئیں کبھی نہ چلتی تھیں لیکن اس سال خدا جانے کس طرح سے پچھوا ہواؤں کا تانڈو ناچ راجپوتانے کے آگے کے جنگل اور پہاڑیاں عبور کر کے شہر کے کوچہ و برزن میں آ گیا۔ علی پور سے لے کر دلی دروازے تک روز ہی ہر محلے میں کئی کئی بچے اور مزدور پیشہ یا دوسروں کے گھروں میں کام کرنے والی عورتیں لوؤں کا شکار ہو کر شدید تپ اور ہتھیلیوں اور تلوؤں کی جلن سے جھلس جھلس کر اس عالم میں موت کی آغوش میں چلی گئیں کہ پیاس سے برا حال تھا لیکن ٹھنڈا پانی یا کوئی بھی ٹھنڈائی پینے سے جسم میں دوں اور بھی بھڑک اٹھتی تھی۔ پھر جون کے وسط میں بارش آ گئی اور اس قدر کہ چند دنوں میں جمنا کا پانی سلطان جی نظام الدین صاحب کی درگاہ اور ہمایوں کے مقبرے کے سامنے لہریں مار کر گویا خشکی کا منہ چڑانے لگا۔ پھر جو کس کے دھوپ نکلی ہے تو سینکڑوں کچے اور کمزور مکان

ڈھہ گئے اور جو بچ نکلے ان میں سے بہتوں کی دیوار شق ہوئی یا چوکھٹ بیٹھ گئی یا چھت ٹپکنے لگی۔ ایسے میں بارش پھر سے جاری ہوئی اور پانی نے ملبے اور خاشاک اور لکڑی کے زمیں بوس شہتیروں کو گلا کر سڑاندھ پیدا کر دی۔ پھر ہیضہ پھیل گیا۔

کمپنی انگریز بہادر کے اہلکار حسب استطاعت شہر چھوڑ کر محفوظ مقامات کو بھاگنے لگے، غربا کے لئے دوا دارو کا بندوبست کون کرتا؟ شہر کے حکیموں بیدوں سے کچھ بن پڑا کچھ نہ بن پڑا، لیکن کوڑے کے سڑتے ہوئے ڈھیروں کو کون اٹھاتا اور جگہ جگہ رکی ہوئی نالیوں اور سنڈاسوں کو کون صاف کرتا؟ شاہجہاں آباد تو اونچائی پر تھا اور شاہی وقتوں سے وہاں پانی کے نکاس کا انتظام بہت اچھا تھا، لیکن بقیہ علاقوں کی یہ کیفیت نہ تھی۔

جولائی ۱۸۵۶ کی نو تاریخ تھی جب صاحب عالم و عالمیان، مرشد زادۂ جہانیان، میرزا فتح الملک شاہ بہادر کا مزاج صبح صبح کچھ ناساز ہوا۔ ہلکی تپ کے ساتھ امتلا کی شکایت کے ساتھ کچھ پیٹ کے خالی خالی لگنے کا احساس ہوا، گویا بہت دیر سے کچھ کھایا نہ ہو۔ حکیم محمد نقی خان معالج خاص کو طلب کیا گیا۔ وہ آئے اور انھوں نے مریض کی نقاہت اور اشتہا کے مدنظر صفراوی کیفیت تشخیص کی۔ ان کے مشورے پر مریض کو کچھ کھانا کھلایا گیا اور یخنی پلائی گئی۔ غذا پیٹ میں جاتے ہی استفراغ کی کثرت ہوئی اور مریض پر بیہوشی طاری ہونے لگی۔ شام کو حکیم محمد احسن اللہ خان بلائے گئے۔ انھوں نے حقنہ دلوایا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد مریض نے کچھ کہے سنے بغیر کروٹ لی اور بیہوش ہو گیا۔ ہوش میں لانے کی تمام تدابیر بے سود رہیں اور اگلے دن صبح کے چھ بجتے بجتے ولی عہد کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ قلعے میں کہرام مچ گیا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہو کیا گیا؟ موت کی خبر کے ساتھ ساتھ، بلکہ اس سے پہلے ہی، شہر میں افواہ دوڑ گئی کہ حکیم محمد نقی خان نے نواب زینت محل کے ساتھ ساز باز کر کے ولی عہد بہادر کو زہر دلوا دیا۔ کسی نے اڑائی کہ بادشاہ کو بھی علاج پر اطمینان نہیں ہے اور وہ انگریز ڈاکٹر بلوا رہے ہیں کہ وہ بتائے کہ ولی عہد کو بیماری کیا تھی۔ لیکن یہ خبر جھوٹ تھی، ہشتاد سالہ بادشاہ کے حواس بجا نہ تھے، اسے ان سازشوں میں الجھنے کی قوت کہاں تھی۔

یہ بات درست ہے کہ ولی عہد بہادر کے مرض کی تمام علامات عام ہیضے کے مطابق نہ تھیں۔ لیکن ہیضہ بہر حال کئی طرح اپنا کام کرتا ہے، اور شہر میں ہیضہ بیشک پھیلا ہوا تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں، اور ثبوت کیا، کوئی سرگوشی بھی نہیں کہ میرزا فتح الملک بہادر کی موت غیر فطری وجوہ سے ہوئی تھی۔ وزیر مجنونوں کی طرح ایک ایک کا منھ تکتی اور کہتی کہ نبض ذرا ٹھیک سے دیکھ لیجیے، میرے صاحب عالم بے ہوش ہیں، ان کی جان نہیں نکلی

ہے۔نواب زینت محل نے البتہ ہنس کر کہا، ''وہ مارا! اب میرے، جواں بخت کو ولی عہد بننے سے کوئی نہیں روک سکتا!''

جب بادشاہ کی طبیعت کچھ سنبھلی تو آپ نے اپنی خواص خاص بھیج کر وزیر کو تسلی کے کلمات کہلائے اور جنازے کی تجہیز و تکفین و تدفین کا حکم صادر فرمایا۔ میت کو تیار کرنے اور دفنانے کی تیاریاں جلد جلد کی گئیں کہ سخت گرمی اور اُس کے باعث نعش کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ وزیر پچھاڑیں کھا رہی تھی، میرزا ابوبکر، نواب مرزا خان، اور خورشید مرزا ماں کو تسلی دینے کی کوشش میں خود رونے لگتے۔ حاتم زمانی بیگم سوتاپے کے باوجود مو پریشاں با دیدۂ گریاں وزیر کی ڈیوڑھی میں آئیں اور شوہر کے مردے کی بلا گرداں ہوئیں لیکن اب وہاں کیا رکھا تھا۔ شہر سے اکبری خانم، مولوی محمد نظیر، اور شاہ محمد آغا با چشم تر آئے۔ مولوی صاحب اور شاہ محمد آغا میت کے سرہانے بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرنے لگے اور اکبری بیگم نے وزیر کو گلے سے لگا کر سسکیاں بھرتے ہوئے چھوٹی بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا، ''بی بی صبر کرو مرضی مولیٰ کے آگے چارہ نہیں۔'' وزیر نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا تھا، اب بڑی بہن نے گلے سے لگایا تو غش کھا کر گر پڑی۔ اسے لخلخے سنگھائے جانے اور منھ پر گلاب چھڑکے جانے کے دوران باہر شہزادے کو سفر آخرت کے لئے تیار کیا گیا۔ غسل و کفن کے بعد شاہزادے کی میت تابوت میں رکھی گئی اور تابوت کو شہزادے اٹھا کر جنازے کی نالکی تک لائے۔

> سر سے پاؤں تک تمامی نالکی پر لپٹی ہوئی ہے۔ بیٹے، بھتیجے، امیر الامرا نالکی کے ساتھ منھ پر رومال رکھے آنکھوں سے آنسو زار و قطار بہاتے، کس غم کی حالت میں ادب سے چلے جاتے ہیں۔ دیکھنے والوں کے دل پھرے جاتے ہیں، کلیجے منھ کو آتے ہیں۔ آگے آگے خاصے کے گھوڑے، سپاہیوں کے تمن الٹی بندوقیں کندھوں پر رکھے، تاشہ مرفہ الٹا کیے، پیچھے ہاتھی، ہاتھیوں پر شیر مالیں، روپے، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں اور ٹکے خیرات کے رکھے ہوئے چلے آتے ہیں۔ سارے شہر کی خلقت دیکھنے کو اُنڈی چلی آتی ہے۔ عورت و مرد بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ جامع مسجد پر جنازہ آیا۔ حوض پر جنازے کی نالکی رکھی گئی۔ ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ سب نے جنازے کی نماز پڑھی، وہاں سے شہر کے باہر جنازہ آیا۔ سب جلوس رخصت ہوا، خاص خاص لوگ جنازے کے ساتھ گئے۔ حضرت خواجہ صاحب کی درگاہ میں جنازہ دفن کیا۔ شیر مالیں، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں اور ٹکے محتاجوں کو بانٹے، خادموں کو روپئے دیئے، فاتحہ پڑھی، قبر پر دوشالہ ڈالا، ایک حافظ قرآن پڑھنے کو، ایک پہرا حفاظت کو مقرر کر کے سب رخصت ہوئے۔ بادشاہ کے یہاں سے برداشت اور حاضری کا

معمول مرحمت ہوا۔

("بزم آخر"، از منشی فیض الدین)

صاحب عالم و عالمیان مرشد زادۂ جہانیان میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین فتح الملک شاہ بہادر کو ۱۰ جولائی ۱۸۵٦ کی شام کو درگاہ خواجہ صاحب میں حضرت خلد منزل شاہ عالم بہادر شاہ اول کے پہلو بہ پہلو سپرد خاک کیا گیا۔ نواب مرزا خان داغ نے تاریخ کہی۔

غم فتح ملک سلطاں چو بلائے جان و دل شد
دہدش مقام جنت ز کرم کریم غفار
چو ز داغ سال رحلت دل دردمند پرسید
بکشید آہ حسرت دو صد و دوازدہ بار
۱۲۷۲ = ۲۱۲×٦

شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

فتح الملک بہادر کا سوئم اور سوگ ختم ہوتے ہی نواب زینت محل نے بادشاہ پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ جواں بخت کی ولی عہدی کے لئے سرکار کمپنی انگریز بہادر کو لکھیں۔ بادشاہ سلامت کچھ تو تقاضائے عمری کے سبب، کچھ بوجہ ضعف صحت و ہمت، اور کچھ بوجہ اس یقین کے، کہ میرے بعد بادشاہی نہ رہے گی، اس معاملے میں کچھ زیادہ پر جوش نہ تھے، لیکن زینت محل کی محبت انھیں مجبور کر رہی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ نواب زینت محل کو بھی حضرت قدر قدرت سے محض منھ دیکھے کی، یا غرض مندانہ محبت نہ تھی۔ سولہ سال پہلے جب انھیں بتایا گیا تھا کہ ان کا نکاح بادشاہ جمجاہ سے ہو رہا ہے تو انھیں بدن میں تھوڑی بہت تھرتھری اور جسم میں کچھ سنسنی لیکن بہت زیادہ الجھن کا بھی احساس ہوا تھا۔ محض نام کا بادشاہ، اور وہ بھی ایسا جس کی عمر ستر کے لگ بھگ ہو رہی تھی، ایسا دولہا بھلا کس طرح کا عیش دے سکتا تھا؟ لیکن زینت محل نے قلعے میں بادشاہ کا ٹھاٹ باٹ دیکھا، پھر شاہ آسماں بارگاہ کی خوش خلقی، نرم خوئی اور شائستگی دیکھی، اور سب سے بڑھ کر یہ دیکھا کہ باوجود پیرانہ سری شاہ ہمایوں مرتبت میں وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی قوت وافر تھی۔ ان سب باتوں نے آہستہ آہستہ نواب زینت محل کا دل بادشاہ کی طرف پھیر دیا اور انھیں اپنے شوہر عالی قدر سے یک گونہ محبت ہو گئی۔ اس طرح شاہ جمجاہ اور ملکۂ دوراں کے درمیاں صرف ہوس نہ تھی، محبت اور الفت بھی تھی۔ اس باعث بادشاہ کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ زینت محل کی بات کو بالکل نظر انداز کر دیں۔

بہت غور و خوض کے بعد حضور عالی جاہ نے کمپنی انگریز بہادر کو جواں بخت کی ولی عہدی کی سفارش کا شقہ لکھوا دیا۔ ان دنوں صاحب کلاں بہادر کے عہدے پر سائمن فریزر عارضی طور پر کام کر رہا تھا۔ فریزر اور بادشاہ سلامت کے مابین دوستانہ تعلقات اس وقت سے تھے جب بزمانۂ ولی عہدی انھوں نے نواب شمس الدین احمد کی گرفتاری اور پھر مقدمے اور سزائے موت کے معاملے میں

انگریزوں کی مساعی کے خلاف کوئی دخل نہ دیا تھا اور اپنے والد عرش آرام گاہ حضرت اکبر ثانی کو بھی عدم مداخلت کا مشورہ دیا تھا۔ ظل سبحانی نے فریزر کے پاس اپنے نمائندے اس درخواست کے ساتھ بھیجے کہ میرزا جواں بخت کی ولی عہدی منظور کرادیں۔

لارڈ گورنر جنرل بہادر کو جو خط بادشاہ سلامت نے میرزا جواں بخت کی ولی عہدی کی سفارش میں بھیجے ان میں میرزا جواں بخت کی عالی نسبی کا بطور خاص ذکر تھا۔ یہ بھی مذکور کیا گیا تھا کہ شاہزادہ کئی زبانیں جانتا ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم سے بہرہ ور ہے۔ ادھر نواب زینت محل نے، یا میرزا جواں بخت نے دوسرے شاہزادوں پر دباؤ ڈال کر کئی شہزادوں کے دستخط سے ایک کاغذ اس مضمون کا انگریز کو بھجوایا کہ ہم سب میرزا جواں بخت بہادر کی ولی عہدی پر متحد ہیں۔ اس کاغذ پر میرزا قویش بہادر اور میرزا ظہیر الدین بہادر عرف میرزا مغل نے دستخط نہیں کئے تھے کہ اپنی اپنی جگہ پر یہ دونوں بھی ولی عہدی پر دعویٰ رکھتے تھے۔ لیکن انگریز تو میرزا دارا بخت میراں شاہ کی وفات کے وقت ہی فیصلہ کر چکے تھے کہ اب بادشاہت کا خاتمہ کرنا بہتر ہے۔ کچھ تو میرزا فتح الملک بہادر کی ہر دلعزیزی، اور کچھ ایوان حکومت انگلشیہ میں نواب زینت محل کے بارے میں اچھی رائے نہ پائی جانے کے باعث ایک عبوری طور کا فیصلہ یہ کرلیا گیا تھا کہ میرزا فتح الملک بہادر ولی عہد تو ہو جائیں لیکن بادشاہت نہ رہے۔ پھر جب میرزا فتح الملک بھی اللہ کو پیارے ہوں گے تو دیکھا جائے گا۔

بر بنائے ایں وجوہ انگریز بہادر نے میرزا جواں بخت، یا کسی اور شہزادے کی ولی عہدی کے لئے کوئی قرار واقعی کارروائی نہ کی۔ ولی عہدی کے معاملے پر جو کاغذات و سفارشات دہلی میں صاحب کلاں بہادر کو موصول ہوئے تھے وہ ضابطے کے تحت صاحب لفٹن گورنر بہادر صوبجات شمال مغرب کی خدمت میں آگرہ بھیج دیئے گئے۔

میرزا فتح الملک شاہ بہادر جنت مکانی کے چہلم کی تاریخ مقرر ہوئی، سفید کاغذ پر رقعے لکھوا کر سارے قلعے میں تقسیم کیے گئے۔ ادھر میر عمارت نے کچی قبر کو تھوڑا سا کھلوا کر گلاب، کیوڑہ اور عطر اندر ڈالا، اوپر سے قبر پختہ کرائی، سنگ مرمر کا تعویذ بنوایا، پھر چاروں جانب سنگ مرمر کی جالیاں کھڑی کیں اور فرش لگا کر قبر مبارک تیار کر دی۔ انتالیسویں رات کو سب اقربا ولی عہد بہادر مرحوم کی ڈیوڑھی پر جمع ہوئے۔ جس جگہ مرشد زادۂ جہانیاں نے دم توڑا تھا، وہاں کھانے کا تورہ اور جوڑا، دوشالہ، جانماز، تسبیح، جوتی، کنگھی، اور مسواک، کشتیوں میں لگا کر رکھ دیئے گئے۔ تانبے اور چینی کے چھوٹے بڑے برتن، پتیلے،

تھالی، سرپوش، آفتابہ، بیسن دانی، سب مہیا کیے گئے۔ دولال سبز بہت بڑی طوغیں، سوا سوا من چربی کی، سرہانے روشن کی گئیں۔ لوبان اور اگر کے دھوئیں میں رات بھر گریہ و بکا کا شور رہا۔ صبح کو پہلے تمام مرد اعزا قبر پر تشریف لے گئے، قبر کے اوپر کمخوابی شامیانہ چاندی کے ستونوں پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اب قبر شریف کے گرد پھولوں کا چھپرکھٹ بنایا گیا، بیچ میں کمخواب کا قبر پوش، اس پر پھولوں کی چادر ڈالی گئی۔ کھانے کا تورہ اور برتن اور دیگر سامان قبر کے سرہانے رکھے گئے، پائنتی جوتی رکھی گئی۔ اب زنانہ ہوا، بیگماتوں نے سر برہنہ، مو پریشاں آکر گریہ وزاری کی۔ ادھر باہر ختم ہوا، الائچی دانے ختم کے سب میں تقسیم ہوئے۔ پھر قوالی ہوئی۔ قوالی کے بعد کھانا کھایا گیا اور غربا کو کھلایا گیا۔ تیسرے پہر کو دوسرا ختم پڑھ کر تورہ، جوڑا، برتن، تمام سامان خادموں میں تقسیم کر کے سب شہزادے اور بیگمات قلعۂ معلیٰ میں واپس آگئے۔

وزیر کی آنکھوں کے گرد روتے روتے ورم آگیا تھا۔ اس کے صاحب عالم جس دن مرے تھے اس کے بعد سے وہ بستر پر لیٹی تھی اور نہ ہی کسی دن دو وقت کا کھانا اس نے کھایا تھا۔ زمین پر سونا اور ایک وقت موٹا جھوٹا کھا کر گذر کرنا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ مرشد زادۂ آفاق کی زندگی میں وہ ان کی محبت میں اتنی گم اور اس قدر خوش رہتی تھی کہ باوجود خطاب شوکت محلی کے وہ قلعے کی سرگرمیوں میں بہت کم حصہ لیتی تھی۔ جب میرزا محمد دارا بخت ولی عہد بہادر اللہ کو پیارے ہوئے تو اس نے ان کی تجہیز و تکفین سے لے کر دوئم، سوئم، چہلم، اور پھر چھ ماہی اور برسی کی رسوم میں البتہ پورا پورا حصہ لیا۔ اسے تقدیر کی ستم ظریفی کہئے کہ ان رسوم، اور مرنے والے کے تئیں قلعہ اور بیرون قلعہ کے لوگوں کی محبت اور عقیدت کو دیکھ کر اسے ایک طرح کی طمانیت محسوس ہوئی۔ اسے ہمیشہ استقلال و استمرار کی تلاش رہی تھی اور وہ طالب سے زیادہ مطلوب بن کر رہنا چاہتی تھی۔ حویلی مبارک میں اسے دونوں چیزیں میسر ہوتی نظر آرہی تھیں۔ موتی کے تئیں اتنی مفصل اور طویل المدت رسوم کا انعقاد دیکھ کر اسے ایک طرح کی خوشی ہوئی کہ میرے صاحب عالم کا خدانہ کردہ جب وقت آیا تو ان کا وہ حال نہ ہوگا جو بلاک صاحب، نواب صاحب اور آغا صاحب کا ہوا کہ جب انھیں موت نے پکارا تو ان پر رونے والا کوئی نہ تھا۔ میں رہوں یا نہ رہوں، اس نے اپنے دل میں کہا، لیکن قلعے کی رسمیں تو باقی رہیں گی۔

چہلم کے تیسرے دن وزیر خانم کی خدمت میں ملکۂ دوراں کا پیغام آیا کہ آپ کی یاد ہو رہی ہے، جلد تشریف لے چلئے۔ وزیر کا ماتھا ٹھنکا۔ ملکۂ دوراں نے پہلے کبھی اس طرح یاد نہ فرمایا تھا۔ شاید تعزیتی کلمات

کہنا چاہتی ہوں، اس نے دل میں کہا۔ ہر چند کہ میرزا فتح الملک شاہ بہادر کی ولی عہدی کے بعد زینت محل نے وزیر اور اس کے بچوں سے خطاب و تکلم کم و بیش بند ہی کر دیا تھا، لیکن شاید اس موقعے پر ان کے دل میں کچھ درد آ گیا ہو۔ وزیر نے جلد جلد منھ پر چار چھینٹے مارے، آئینہ دیکھے بغیر انگل سے بالوں میں کنگھی کی، اور سفید لیکن صاف کپڑے پہن کر نواب زینت محل کی ڈیوڑھی پر حاضر خدمت ہوئی۔ نواب زینت محل نے معمولی طور پر اس کا استقبال کیا اور اپنے سامنے بٹھایا۔ کچھ دیر سکوت رہا، پھر ملکۂ عالیہ نے ارشاد فرمایا:

''چھوٹی بیگم، ہمیں تمھاری بیوگی پر بہت افسوس ہے۔'' وہ ایک پل رکیں۔ وزیر شکریے کے کچھ رسمی کلمات کہنے ہی والی تھی کہ ملکۂ دوراں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ ''لیکن تم تو ایسے سانحوں کی عادی ہو چکی ہو۔ اسے بھی سہ جاؤ گی۔ انو اسی کا کلیجا مضبوط ہوتا ہے، لوگ کہے ہیں۔''

ملکۂ دوراں کی بعض منھ لگی مصاحبوں نے ڈوپٹہ منھ پر رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کی، لیکن بعض دوسری خواصوں کے چہرے پر کبیدگی کے آثار نمایاں ہوئے۔

وزیر کو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی کہ ان توہین آمیز کلمات کا مقصد محض توہین نہیں۔ اصل مقصد یہ تھا کہ وزیر سے کوئی خلاف ادب یا خلاف مصلحت بات کہلا دی جائے اور بعد میں اسے وزیر کے خلاف استعمال کیا جائے۔ اس نے سر جھکا کر کہا:

''نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے ملکۂ دوراں۔ واقعہ کتنا ہی سخت ہو لیکن تاب لائے ہی بنتی ہے۔ میں تو اللہ کے حضور میں آپ اور ظل سبحانی کی درازی عمر اور صحت و دولت اور اقبال کی دعا کرتی ہوں۔ آپ دونوں کا سایہ میرے لئے بہت ہے۔''

زینت محل ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئیں۔ انھیں ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ پھر گلا صاف کر کے وہ بولیں:

''ولی عہد بہادر مرحوم تمھارے لئے کیا کیا چھوڑ گئے ہیں چھوٹی بیگم؟''

اب وزیر نے سر اٹھا کر اور کمر سیدھی کر کے جواب دیا: ''ولی عہد بہادر کا احوال مجھ سے زیادہ ملکۂ دوراں اور ظل الٰہی پر روشن ہے۔''

''تمھیں ان کی ڈیوڑھی خالی کرنی ہو گی۔''

''ملکۂ دوراں شاید بھولتی ہیں۔ میں چھوٹی بیگم ہی نہیں، شوکت محل بھی ہوں۔''

''تم شوکت محل تھیں۔ اب نہیں ہو۔'' زینت محل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''یہ فیصلہ تو وہی کرے گا جس نے مجھے یہ خطاب عطا کیا تھا۔''

''چھوٹی بیگم۔ کسی فریب میں نہ رہنا۔ تم نے ہمارے بھولے بھالے میرزا فخرو بہادر کو شیشے میں اتار کر قلعۂ شاہی میں پاؤں دھنسا لئے، اس توقع پر کہ تم بھی تیموری شاہزادیوں میں شمار ہوگی۔ پھر بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور تم ولی عہد سوئم کی بیگم کے بجاے ہندوستان کی ملکہ بننے کے امکانات میں مگن ہو گئیں۔ تم جیسیوں نے کتنے ہی اینٹ کے گھر مٹی کر دیے لیکن قدرت خداوندی بھی کوئی چیز ہے...''

وزیر سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے ملکہ کی بات کاٹنے کی گستاخی کی پروا کئے بغیر نرم لیکن مضبوط آواز میں کہا۔ ''ملکۂ عالم پر خوب عیاں ہے کہ میں کن حالات میں قلعۂ مبارک میں آئی۔ میں تو اپنے صاحب عالم و عالمیان کی خاک برابر بھی نہیں۔ انھوں نے مجھے ذرے سے آفتاب کیا ورنہ میں اپنی کال کوٹھڑی میں صبر سے رنڈاپا کاٹ رہی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔'' زینت محل نے تیز لہجے میں کہا۔ ''جس نے تمھیں ذرے سے آفتاب کیا اب وہ خود تہ خاک ہے۔ اب تم پھر وہی ذرۂ خاک ہو جو یہاں آنے کے پہلے تھیں۔''

''لیکن سرکار عالیہ،'' وزیر نے تھوڑے سے طنز سے کہا۔ ''میں پھر بھی ولی عہد ہندوستان کی بیوہ ہی کہلاؤں گی۔ آگے کوئی ولی عہد ہو، کوئی بادشاہ ہو لیکن یہ چتر میرے حقیر سر کے اوپر سے کوئی اتار نہیں سکتا۔''

''کیوں نہیں؟'' زینت محل کو جوش آ گیا۔ ''ہم اتار سکتے ہیں۔''

''ملکۂ دوراں۔ آپ اپنے قلعہ معلیٰ میں کچھ بھی ڈھنڈورا پٹوا دیں، لیکن نقارۂ خدا کی آواز بند نہیں کر سکتیں۔'' وزیر نے متانت سے کہا۔ ''لیکن آپ فرمائیں اس بندی سے آپ کیا خدمت لینا چاہتی ہیں۔ بندی ہر طرح سے تیار ہے۔''

''یہ صرف ہمارے قلعے کی بات نہیں۔ ہم اب بھی ہندوستان کی ملکہ ہیں۔ ہمارے سر پر جو مکٹ ہے وہ نور جہاں اور ارجمند بانو کے سر پر تھا۔ ہمارے پیارے فرزند میرزا فخرو بہادر کا اس دار فانی سے منہ موڑ لینا اس بات کا اشارہ رکھتا ہے کہ اللہ کو منظور نہیں کہ ان کے بعد کوئی شخص غیر یہاں تاج و تخت کا وارث بنے۔''

''تاج و تخت آپ کو اور میرزا جواں بخت بہادر کو مبارک ہو، مجھے اس سے کچھ غرض نہیں۔''

''لیکن ہمیں پرچہ لگا ہے کہ تم میرزا مغل بہادر سے مل کر ساز باز کر رہی ہو کہ میرزا مغل بہادر

بادشاہ ہوں اور خورشید مرزا کو ولی عہد قرار دیا جائے۔"

وزیر سن سے رہ گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے خلاف کوئی سازش ترتیب دی جا رہی ہے۔ یا پھر نواب زینت محل کے کان جھوٹ سے بھر دیئے گئے ہیں۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک تھا، قلعے سے وزیر خانم اور اس کی اولاد کا اخراج۔ وزیر نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی، پھر کہا:

"ملکۂ عالیہ ذرا یہ تو غور فرما لیتیں کہ میرزا مغل بہادر مجھ نکمی بیوہ کی مدد سے کیا سازش برپا کر سکتے ہیں۔ پھر میرزا ابوبکر بہادر کے ہوتے بچارہ خورشید مرزا کس شمار وقطار میں ہے؟"

"ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہی تو تم لوگوں کی چالیں ہیں۔ میرزا ابوبکر بہادر بے ماں کا تھا، اب بے باپ کا بھی ہو گیا۔ اسے کسی طور بہلا پھسلا لیا جائے گا۔"

"اللہ رکھے میرزا ابوبکر بہادر جوان ہیں، ذی علم اور ذی لیاقت ہیں..."

"ہمارے سامنے ہماری اولادوں کا بکھان نہ کرو چھوٹی بیگم۔ میرزا ابوبکر بہادر کی خوبیاں ہم پر عیاں ہیں۔ لیکن ان کا میرزا مغل بہادر سے خلاملا بھی کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔"

"سرکار مالک ہیں۔ لیکن مجھے مہابلی کی خدمت میں ایک بار پیش ہو لینے دیجئے۔ میں اپنی بے قصوری تو ان پر ظاہر کر دوں۔"

"حضور پر نور پر سب کچھ ظاہر ہے۔ یہ انھیں کا فیصلہ ہے کہ تم دو دن کے اندر اندر حویلی خالی کر دو۔ خورشید مرزا کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اور میرزا ابوبکر بہادر کو بھی، اگر وہ جانا چاہیں۔" زینت محل نے سرد لہجے میں کہا۔

وزیر ایک بار پھر سناٹے میں آ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ زینت محل اس طرح ٹکڑا سا توڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دیں گی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ بہت سے بہت یہ ہوگا کہ میرزا فخرو بہادر کی ڈیوڑھی اس سے خالی کرا لی جائے گی اور کسی کونے کھدرے میں ایک دو حجرے اسے مل جائیں گے۔ نواب مرزا کی تنخواہ موقوف ہو جائے گی اور اس کی بھی تنخواہ بہت کم کر دی جائے گی۔ خورشید مرزا کی تعلیم تربیت سب ختم کر دی جائے گی۔ لیکن قلعے سے باہر نکلنا، یہ اس نے اپنے بدترین خوابوں میں بھی خیال نہ کیا تھا۔ اب جو یہ قیامت اس کے سر پر تھی تو اس نے دل پر قابو پانے اور اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات تو اس پر بالکل عیاں تھی کہ زینت محل کے فیصلے کے خلاف جدوجہد یا احتجاج کرنا بیکار تھا بلکہ مزید خرابی بلکہ ذلت کا سبب بن سکتا تھا۔ بادشاہ کے یہاں باریابی ناممکن تھی، لیکن اگر وہ باریاب ہو بھی جاتی تو بادشاہ اب

اکیاسی برس کے ہو چکے تھے، وہ اگر پیر خرف نہیں تو ضعیف الارادہ اور بظاہر زینت محل کی مٹھی میں ضرور تھے۔ ان سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ زینت محل کے پھاڑے ہوئے کو سی سکیں گے۔ وزیر نے ممکن حد تک تمام پہلوؤں پر اس ذرا سی مدت میں غور کیا اور بولی:

''ملکۂ عالیہ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن ایک دن وہ بھی ہو گا جب کسی بادشاہ، کسی حاکم کا حکم نہ چلے گا، صرف اللہ ہو گا اور انصاف کی ترازو ہوگی۔ الامرُ یومئذٍ للہ آپ نے بھی کلام شریف میں پڑھا ہو گا۔ اللہ سب کے دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔ بندی نہیں جانتی کہ ملکۂ دوراں کے دل میں میرے خلاف زہر کے بیج کس نے بوئے۔ میں اپنا حال جانتی ہوں کہ میرے دل میں میرے مرحوم صاحب عالم، بادشاہ ظل اللہ اور ملکۂ دوراں کے لئے احترام اور محبت کے سوا کچھ نہیں۔''

''وہ سب درست، لیکن ظل سبحانی کے ارشاد کی تعمیل جلد از جلد ہو۔'' زینت محل نے ایک خشک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''بیشک۔'' وزیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے ملکہ کے سامنے سے اٹھ جانے کی اجازت بھی نہ لی اور نہ برخاستگی کے حکم کا انتظار کیا۔ ''میں نے کسی باب میں اب تک ملکہ کو مایوس نہیں کیا۔ اب بھی انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ آپ کے دامن دولت میں جگہ نہیں تو نہ سہی۔ ہم اور آبادی میں جا مقسوم اپنا پائیں گے، خلق خدا ملک خدا۔ تسلیمات۔''

وزیر نے الٹے پاؤں واپس ہونے کے بجائے زینت محل کی طرف پیٹھ کی اور ایوان سے باہر ہو گئی۔ اس وقت زینت محل کے سامنے تو اس نے یوں ظاہر کیا تھا کہ اسے قلعہ چھوڑنے کا کچھ غم ہو گا اور نہ سر چھپانے کی جگہ کی تلاش میں دربدر ہونا پڑے گا۔ لیکن اب اپنی ڈیوڑھی تک تنہا راہ طے کرتے کرتے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور قدم لڑکھڑانے لگے۔ بہزار خرابی وہ گھر پہنچی اور ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اپنے حجرے میں پلنگ پر گر پڑی۔ اتفاق سے اس وقت میرزا ابوبکر، میرزا خورشید عالم اور نواب میرزا خان تینوں ڈیوڑھی پر موجود تھے۔ انھوں نے گھبرا کر پوچھا، ''اماں جان خیر تو ہے؟ مزاج کیسا ہے؟'' لیکن وزیر کی بتیسی بیٹھ گئی تھی، اس کے چہرے پر مردنی تھی اور منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکتا تھا۔ میرزا ابوبکر نے فوراً ایک چوبدار حکیم محمد نقی خان کے لئے روانہ کیا۔ نواب مرزا خان اور خورشید مرزا نے لخلخے اور انگریزی نمکیات ماں کو سنگھائے۔ حکیم صاحب کے آتے آتے وزیر کو ہوش آ گیا تھا لیکن اس کے چہرے

پر مردنی اسی طرح باقی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور کہا کہ غم اور صدمے کے باعث جگر کا فعل سست ہو گیا ہے۔ انھوں نے نسخہ لکھا، چند بوندیں ایک مقوی مفرح کے اپنے سامنے پلوائیں اور مکمل آرام کی ہدایت دے کر رخصت ہوئے۔

وزیر سے سب حال سن کر نواب مرزا اور خورشید مرزا نے برہم ہو کر کہا کہ ہم ابھی اس جگہ کی خاک اپنے دامن اور پاپوش سے جھاڑتے ہیں۔ اماں جان جہاں دل کرے وہاں چلی چلیں۔ کچھ نہیں تو خانم کے بازار والا گھر تو موجود ہی ہے، ورنہ ہم تو ان کے ساتھ جنگل بیابان میں گھر بنانے کو تیار ہیں۔ ہم لکڑیاں کاٹیں گے، جنگلی پھلوں پر گذارہ کریں گے لیکن قلعے کا منھ نہ دیکھیں گے۔

''اماں نہیں بھئی، اتنی جلدی نہ کرو۔'' میرزا ابو بکر نے کہا۔ ''میں ابھی خان سامانی کو جاتا ہوں۔ حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر کو بیچ میں ڈالوں گا۔ ظل سبحانی مشورہ ان کا آسانی سے رد نہیں فرماتے۔''

''صاحب عالم، ذرا سوچ لیجیے۔'' وزیر نے میرزا ابو بکر کی آستین تھام کر کہا۔ ''اگر خان ساماں بہادر اس معاملے میں پڑنے کو تیار بھی ہو گئے، ہر چند کہ مجھے اس میں شک ہے، اور نواب زینت محل کو زک پہنچ بھی گئی، لیکن تا بکے یہ صورت رہے گی؟ وہ تو اپنی سی کرنے سے باز آنے سے رہیں، اور یہ جو سازش کا شیطان انھوں نے گھڑا ہے، یا لوگوں نے ان کو باور کرایا ہے، وہ پھر بھی سر اٹھاتا رہے گا۔ ہم سب کی زندگی اور بھی اجیرن ہو جائے گی۔''

''تو پھر آپ کیا چاہتی ہیں اماں جان؟ کیا نواب زینت محل کو من مانی کرنے دیا جائے؟''

''صاحب عالم اس میں من مانی کیا ہے؟ وہ جو چاہیں کر ہی سکتی ہیں، حضور انور کی چہیتی بیگم جو ٹھہریں۔ ان کے دل میں آپ کے ابا مرحوم کے خلاف کینہ اسی دن سے ہے جب اللہ بخشے وہ ولی عہد اول ہوئے تھے اور کوششیں نواب زینت محل کی ناکام ہوئی تھیں۔ اب تو زیادہ ضروری یہ ہے کہ میں اپنے بچوں کی حفاظت کروں اور ہر چیز دیگر پر اسے مقدم جانوں۔''

میرزا ابو بکر سوچ میں پڑ گئے، پھر بولے۔ ''میں میرزا مغل چچا جان بہادر سے تو مشورہ کرلوں۔''

''کاہے کو مشورہ آپ کریں صاحب عالم؟ زینت محل ان کے اور میرزا قویش کے جلاپے سے یوں ہی تپ رہی ہیں، اب میرزا مغل بہادر کو اور مکلف کرنا کیا ضرور ہے۔'' وزیر نے جواب دیا۔

''آپ کو اپنا حق تو لینا چاہیئے۔'' میرزا مغل نے فرمایا۔

''حق کیا شے ہے صاحب عالم؟'' وزیر نے زہر خند کے ساتھ کہا۔ ''ساری زندگی میں حق ہی کی جویا رہی ہوں۔ وہ پہاڑوں کی کسی کھوہ میں ملتا ہو تو ملتا ہو ورنہ اس آسمان تلے تو کہیں دیکھا نہیں گیا۔''

میرزا ابو بکر نے وزیر کے لہجے میں تلخی کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہ سوتیلی لیکن غمزدہ ماں کو کیا جواب دیں جس سے اس کی کچھ تسلی ہو، کہ نواب مرزا بولا۔

''صاحب عالم، میری مانیں تو آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ مجھے لگتا ہے یہ قلعۂ میمونہ اب زیادہ دیر تک میمون و مصئون نہ رہے گا۔'' نواب مرزا نے کچھ تردد کے لہجے میں کہا، اور یہ تردد صرف ماں کی اور اپنی حالت کے بارے میں نہ تھا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا نواب مرزا؟ میں قلعہ کیوں چھوڑوں؟'' میرزا ابو بکر نے کہا۔ دونوں کم و بیش ہم عمر تھے اس لئے ان میں بے تکلفی بہت تھی۔ ایک لحہ توقف کے بعد انھوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''ہم اور میرزا مغل چچا بہادر تو اس خیال میں ہیں کہ مناسب موقع مل جائے تو ان کرشتان فرنگیان ہی کو اپنے ملک سے نکال باہر کریں۔''

نواب مرزا کا چہرہ فکر مندی سے بھر گیا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے رہنے کے بعد بولا، ''برادر، یہ بات تو ہے کہ حاکمان نصرانیان کے خلاف رعایا کے دلوں میں، اور خاص کر سپاہیان دیسی کے دلوں میں کچھ نااطمینانی ہے۔ اور ادھر لکھنو میں کوئی خدا رسیدہ بزرگ مولوی احمد اللہ شاہ صاحب ہیں جنھیں ڈنکا پیر کہا جاتا ہے۔ وہ علی الاعلان لوگوں سے کہتے ہیں کہ انگریز ہندو کے دھرم کا اور مسلمان کے دین کا دشمن ہے۔ انگریز یہاں رہے گا تو دونوں ملتیں تباہ ہو جائیں گی۔ مگر میں سوچتا ہوں... کہ سورما چنا بھلا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے؟''

''انھیں خیالات کے سبب تو ہم بے عمل ہو گئے ہیں نواب مرزا خان۔'' میرزا ابو بکر نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

نواب مرزا نے مسکرا کر کہا۔ ''صاحب عالم۔ آپ حضرت ظہیر الدین بابر کی اولاد ہیں جنھوں نے ایک عالم کی مخالفت کے باوجود تنہا بجان واحد گھر سے نکل کر بخارا پر قبضہ کر لیا تھا اور مٹھی بھر جان نثاروں کی مدد سے کابل اور پھر ملک ہند کو دریائے شور تک لے لیا تھا۔ لیکن آپ کی طبع وقاد پر روشن ہوگا کہ امام ابو حنیفہ فرما گئے ہیں کہ ظالم بادشاہ کے خلاف خروج اسی وقت جائز ہے جب فتح کا امکان ہو۔''

میرزا ابو بکر ہنسے۔ ''خروج کی بات ابھی بہت دور ہے نواب مرزا۔ پر تم خود ہی کہتے ہو کہ رعایا

میں بہت بے اطمینانی ہے۔''

''سہی، لیکن بھائی ظہیر الدین حسین نے مجھ سے کہا کہ ان کے خسر فرمار ہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں تلوار چلے اور خونریزی عظیم ہو۔ بھائی ظہیر الدین حسین نے پوچھا، کیا روس کی فوج آنے والی ہے، توانھوں نے فرمایا کہ یہ امر اللہ کو معلوم ہے۔''

''اللہ آپ لوگ یہ تیر تلوار کی باتیں نہ کریں۔'' وزیر نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔'' خدا جانے کون سن رہا ہو اور کیا مطلب اس کا نکالے۔ میں تو صرف یہ پوچھتی ہوں کہ میرزا ابو بکر بہادر ہمارے ساتھ آسکیں تو بہت خوب ہو۔ پر وہ شاہی طور طریق کے عادی ہیں اور ہم لوگ...''

''قطع کلام معاف اماں جان۔ یہ شاہی طور طریق کی بات نہیں۔ قول اور اصول کی بات ہے۔ میرا گھر قلعہ ہے۔ یہ کوئی نواب زینت محل کی ملکیت تو نہیں۔ میں اسے کیوں چھوڑوں؟''

''صاحب عالم۔ مجھے تو یہاں آپ کے لئے خطرہ معلوم ہوتا ہے۔'' وزیر نے کہا۔'' اور یہ نواب مرزا جو راقم الدولہ صاحب سے خبر لائے ہیں وہ تو اور بھی وحشت اثر ہے۔''

''راقم الدولہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ایک مجذوب نے ان سے کہا کہ تم شہر میں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ دنیادار آدمی ہو، جاؤ رجواڑوں کی سیر کرو۔'' نواب مرزا نے کہا۔

''اماں نواب مرزا،'' میرزا ابو بکر نے زچ ہو کر کہا۔'' مجھے خبر نہ تھی کہ تم اور راقم الدولہ اس قدر اوہام پرست ہو۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ میں یہیں رہوں گا۔''

وزیر اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے خبر نہ تھی کہ میرزا ابو بکر کے لئے خطرہ تھا، لیکن قلعے کے باہر سے تھا۔ ملک الموت انھیں اپنے لئے تاک چکا تھا۔ چند مہینوں بعد انگریز کے خلاف جو قہر برپا ہونا تھا اور پھر دہلی کے دفاع کے لئے جو معرکہ گرم ہونا تھا، میرزا ابو بکر اور میرزا مغل کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا تھا اور بادشاہ کی شکست کے بعد ایک معمولی انگریز فوجی افسر کی گولی کا نشانہ بننا تھا۔ موت نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی، وہ بھلا قلعہ کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔

''ملکۂ دوراں نے اشارہ کر دیا ہے کہ میں کوئی ایسی چیز یہاں سے نہیں لے جا سکتی جو مرحوم صاحب عالم و عالمیان نے مجھے یا میرے بچوں کو عطا کی ہو۔'' وزیر نے کہا۔'' نواب مرزا اور خورشید میرزا آپ مزدوروں اور پیادوں کا انتظام کریں، کل ہم اپنا نجی سامان نواب ناظر اور خان سامان بہادر کے آدمیوں کی موجودگی میں بندھوا کر بہل پر بار کرا کر شام سے پہلے پہلے قلعہ چھوڑ دیں گے۔''

''لیکن جائیں گے کہاں؟'' خورشید میرزا نے پوچھا۔

وزیر کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ ''ابھی تو خانم کے بازار والا گھر ہے ہی... لیکن اب مجھے دلی جائے امان نہیں لگتی... بڑی باجی سے بات کر کے فیصلہ کروں گی۔''

''میں عرض کروں؟'' نواب مرزا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، کہو نہ، کیا کوئی اور تجویز ہے؟'' میرزا ابوبکر نے فرمایا۔

''جی، وہ رامپور میں منجھلی خالہ جان ہیں... وہاں ہر طرح کی حفاظت بھی رہے گی۔''

سب ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئے۔ دلی چھوڑنے کا خیال سوہان روح لگتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' وزیر نے سوچ کر کہا۔ ''لیکن منجھلی باجی سے بات تو کرنی ہو گی۔ اور خانم کے بازار والا مکان...''

''اسے آپ نہ چھوڑیں۔'' میرزا ابوبکر نے کہا۔ ''رکھوالی کا اس کی بندوبست ہو جائے گا۔''

اگلے دن مغرب کے بعد قلعۂ مبارک کے لاہوری دروازے سے ایک چھوٹا سا قافلہ باہر نکلا۔ ایک پالکی میں وزیر، ایک بہل پر اس کا اثاث البیت، اور پالکی کے دائیں بائیں گھوڑوں پر نواب مرزا خان اور خورشید میرزا۔ دونوں کی پشت سیدھی اور گردن تنی ہوئی تھی۔ محافظ خانے والوں نے روکنے کے لئے ہاتھ پھیلائے تو میرزا خورشید عالم نے ایک ایک مٹھی اٹھنیاں چونیاں دونوں طرف لٹائیں اور یوں ہی سر اٹھائے ہوئے نکل گئے۔ ان کے چہرے ہر طرح کے تاثر سے عاری تھے لیکن پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر کو جھکائے بیٹھی ہوئی وزیر خانم کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔

تمام شد

Envoi

My prime of life in wandering spent and care
Impelled, with steps unceasing to pursue
Some fleeting good that mocks me with the view.

Oliver Goldsmith, 1728-1774

The Traveller, 1764

اختتامیہ

میری جوانی کے دن در بدری میں گئے، اور فکر والم میں،
نہ تھمنے والے قدموں کے ساتھ کسی خیر گریزپا کے تعاقب پر مجبور،
جو اپنی جھلک دکھا دکھا کر میرا منھ چڑاتا رہتا ہے

''مسافر''، (The Traveller) مطبوعہ ۱۷۶۴

از آلیور گولڈ اسمتھ، ۱۷۲۸ تا ۱۷۷۴

اظہار تشکر

یہ کہنا شاید ضروری نہ ہو کہ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' جیسی کتاب کے مصنف کی گردن کرم فرماؤں، دوستوں، عزیزوں، اور دوسری کتابوں کے مصنفین کے بار احسان سے خم رہتی ہے۔ دوستوں، کرم فرماؤں، اور عزیزوں کا ذکر تو سوچ سوچ کر مکمل کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ کتابیں جن کے خزینۂ علم و معلومات سے مصنف نے استفادہ کیا ہے، ان میں سے صرف کچھ ہی کا تذکرہ ہو سکتا ہے، کہ استفادے کا عمل ایک مدت مدید کو محیط ہے اور بہتوں کے بارے میں مجھے یاد کیا، احساس بھی نہیں ہے کہ میں نے ان سے کچھ حاصل کیا ہے۔ جن کتابوں سے میں نے بالخصوص اس ناول کی تحریر کے دوران کچھ اخذ و استفادہ کیا ہے ان کے نام چونکہ دوران تحریر محفوظ کرتا گیا تھا لہٰذا وہ سب یہاں درج کرتا ہوں اور ان تمام کرم فرماؤں، دوستوں، عزیزوں، علما، شعرا، اور مورخین کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں جن کی امداد کے بغیر یہ کتاب متصور ہی نہ ہو سکتی، لکھی جانے اور پایۂ تکمیل کو پہنچنے کی بات تو بہت دور رہی۔ یہ بات واضح کر دوں کہ اگر چہ میں نے اس کتاب میں مندرج اہم تاریخی واقعات کی صحت کا حتیٰ الامکان مکمل اہتمام کیا ہے، لیکن یہ تاریخی ناول نہیں ہے۔ اسے اٹھارویں-انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب، اور انسانی اور تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہوگا۔

آصف فرخی، جنھوں نے اس ناول کی تکمیل کے لئے مجھ سے بار ہا اصرار کیا اور شہرزاد، کراچی کی طرف سے پاکستان میں اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

شاعر غرا، میرے کرم فرما دوست اور بھائی احمد مشتاق جن کا ایک مصرع میں نے مانگ کر اس ناول کا عنوان بنالیا۔ پورا شعر ہے۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمھاری زلف سیاہ تھی

(کلیات احمد مشتاق، شب خون کتاب گھر، صفحہ ۶۱)

اسلم فرخی، جنھوں نے سلیم جعفر کے بارے میں بعض معلومات مہیا کیں۔

افغان اللہ (گورکھپور یونیورسٹی)، جنھوں نے ''طراز ظہیری'' کے اول ایڈیشن کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا۔

میری چھوٹی بیٹی باراں سلمہا (نئی دہلی)، اس نے ناول کا بڑا حصہ پڑھا، اس کے بارے میں مفید مشورے دیے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرنے کی تجویز پر بخوشی صاد کیا۔ اس نے ناول کے بعض اجزا بھی اپنی بیٹی نیساں فاطمہ کو بطور سبق پڑھائے۔

بشیر عنوان (میر پور خاص، پاکستان)، جنھوں نے سلیم جعفر کے بارے میں بہت سی اہم تفصیلات بہم پہنچائیں اور اس باب میں میری غلطیوں کی اصلاح کی۔

پنگوئن گروپ، انڈیا، اور بالخصوص ان کے ایڈیٹر ان چیف اور پبلشر روی سنگھ اور مشاورتی ایڈیٹر نمیتا گوکھلے جن کی دلچسپیوں کے باعث پنگوئن بکس نے اس کتاب کو شائع کرنا منظور کیا۔ روی سنگھ اور نمیتا گوکھلے نے اس ناول کا ہندی اور انگریزی روپ بھی شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کے لئے میں ان کا مزید شکر گذار ہوں۔ پنگوئن میں میرے ایڈیٹر نوید اکبر نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بہت توجہ اور محنت صرف کی۔ میں ان کا بھی شکر گذار ہوں۔

تنویر اعجاز (احمد آباد)، جنھوں نے احمد آباد کی سیدی سعید مسجد کے بارے میں معلومات مہیا کیں۔

جمیلہ نے کتاب کا بڑا حصہ پڑھا اور کئی مشورے دیے۔ انھوں نے حضرت قاسم کی مہندی اور شادی کے بارے میں کئی پرانے نوحے میرے لئے مہیا کئے۔ محمد یحییٰ بڈگامی کے سامنے جو نوحہ پڑھا گیا ہے وہ بھی میں نے سب سے پہلے انھیں کی زبان سے سنا تھا۔ جمیلہ نے حسب معمول زندگی مجھ پر آسان رکھی اور میری بیماریوں میں بیمارداری ضرور کی لیکن کبھی یہ نہ کہا کہ تم کو یہ ناول مارے ڈال رہا ہے۔

جینت پرمار (احمد آباد)، جنھوں نے گجرات کے سیدیوں کے بارے میں اطلاع بہم پہنچائی اور ان کا ایک ''ذکر'' مجھے فراہم کیا۔

خلیق انجم، جنھوں نے ''قتل فریزر'' کی فوٹو کاپی مجھے عنایت کی۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو دراصل پرسیول اسپئیر (Percival Spear) کی کتاب (Twilight of the Mughals) کے اس باب کا ترجمہ ہے جو فریزر کے قتل سے متعلق ہے، بہت نادر ہے۔ اس کی ایک اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کے مترجم ناصرالدین خسرو میرزا خاندان لوہارو کے ایک فرد تھے۔

گھر کے لوگوں میں خلیل الرحمٰن دہلوی سلمہٗ (نئی دہلی) کی دلچسپی اور اصرار نے مجھے ہمت ہارنے سے روکے رکھا۔ مقدمہ نواب شمس الدین احمد خان کے بارے میں قومی دفتر خانے (National Archives) سے ایک اہم کاغذ کی نقل مجھے ان سے ملی۔ کئی الفاظ کے بارے میں، کہ وہ دہلی میں کن اعراب کے ساتھ اور کن معنی میں بولے جاتے ہیں، ان کی معلومات میرے لئے حسب معمول انتہائی کارآمد ثابت ہوئیں۔ انھوں نے پروف پڑھنے کی بھی پیشکش کی تھی لیکن ان کی مصروفیت کے پیش نظر میں نے انھیں یہ کسالا کھینچنے سے محفوظ رکھا۔

عزیز دوست اور نامور شاعر اور مصور ذوالفقار احمد تابش (لاہور)، جنھوں نے سرورق کے لئے بے حد نفیس تصویر بنائی۔

ریاض احمد کاتب، جنھوں نے بے حد مہارت کے ساتھ غلطیاں درست کیں اور صفحہ سازی کی۔

سید ارشاد حیدر (الٰہ آباد)، جنھوں نے بہت جانفشانی سے پروف پڑھے۔

برادر عزیز شفق سوپوری (سری نگر)، جن سے ''تعلیم'' کے بارے میں مکمل تفصیلات کے ساتھ ''تعلیم'' لکھائی کا ایک نادر نمونہ بھی ملا۔

قاضی نورالسلام فاروقی سلمہٗ (کانپور) جن کو اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ ناول بہت جلد تکمیل کو پہنچے گا اور کامیاب ہوگا۔ پہلی بات تو ان کی دلچسپی اور ہمت افزائیوں کے سبب بڑی حد تک پوری ہوئی، دوسری کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

کرن سنگھ (میرپور خاص، پاکستان)، جنھوں نے سلیم جعفر کے بارے میں مزید معلومات مہیا کیں اور اس باب میں میری غلطیوں کی اصلاح کی۔

مبین مرزا، جن سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان میں ناول کی اشاعت ان کے ادارے اکادمی بازیافت سے ہوگی، لیکن بعد میں سہواً میں نے آصف فرخی سے بھی یہی وعدہ کرلیا کہ ناول کی اشاعت ان کے ادارے شہرزاد سے ہوگی۔ مجھے شرمندگی سے بچانے کے لئے مبین مرزا نے انتہائی فراخ

دلی کے ساتھ اس بات کو منظور کرلیا کہ ناول کی اشاعت آصف فرخی کے ادارے سے ہو۔

محمود فاروقی سلمہٗ (نئی دہلی)، جنھوں نے قومی دفتر خانے (National Archives) کی فائلوں میں سے بعض اہم کاغذات کی نقل فراہم کی۔ انھوں نے ناول کے بارے میں کچھ مشورے دیے اور اس کے ترجمے کی تجویز کا خیر مقدم کیا اور اردو صلاح کار کے طور پر پنگوئن بکس کو اس کتاب سے متعارف کرایا۔

میری بیٹی مہر افشاں سلمہا (شارلٹس ویل) نے ناول کے مختلف ابواب پڑھے اور اپنی چھوٹی بہن باراں اور عم زاد بھائی محمود فاروقی کے ساتھ مل کر انگریزی میں اس کا ترجمہ کرڈالنے کی تجویز رکھی۔

نسیم احمد (بنارس ہندو یونیورسٹی)، جنھوں نے راجپوتانہ کے پرانے گزیٹیر دیکھ کر مارسٹن بلیک کے افسر اعلیٰ کرنل ایلویس (Alves) کا صحیح نام مجھے بتایا جو مجھے کہیں سے مل نہ رہا تھا۔ بعد میں بیکن کی کتاب سے اس کی مزید تصدیق بھی ہوگئی۔

نیر مسعود، اسلم محمود، اور وہ بے شمار دوست اور کرم گستر، جو ہر ملاقات، ہر ٹیلیفون بات چیت میں یہ ضرور پوچھتے تھے کہ ناول کب مکمل ہوگا؟ افسوس کہ ان میں سے ایک از حد پیارا دوست عرفان صدیقی ہم سے جدا ہو چکا ہے۔

ولیم ڈیلرمپل (William Dalrymple) جن کی کتابوں سے تو میں نے استفادہ کیا ہی، اس کے علاوہ انھوں نے دہلی اور لاہور کے دفتر خانوں میں نواب شمس الدین احمد کے مقدمے، ٹامس مٹکاف کے مرض الموت، میرزا فتح الملک بہادر کی موت کے بعد میرزا جواں بخت کی ولی عہدی کے لئے بہادر شاہ کی کوششوں کے بارے میں مجھے دوران گفتگو مطلع کیا اور ٹامس بیکن (Thomas Bacon) کی تقریباً نایاب کتاب (First Impressions) کے ان صفحات کی نقل مجھے عطا کی جن پر نواب شمس الدین احمد کو پھانسی لگائے جانے کی تفصیلات ہیں۔

کتابیات

(ا) اردو، فارسی

آزاد، محمد حسین: آب حیات

اسلم پرویز: بہادر شاہ ظفر

تنویر احمد علوی: غالب کی سوانح عمری، خطوط غالب کی روشنی میں

حالی، خواجہ الطاف حسین: حیات جاوید

حامد حسن قادری، مولانا: خطوط قادری، مرتبہ خالد حسن قادری

حسرت موہانی، مولانا: تذکرۂ شعرا، مرتبہ و مدونہ شفقت رضوی

حسن نظامی، خواجہ: بہادر شاہ کا روزنامچہ

خلیق انجم: غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ

درگاہ قلی خان، نواب: مرقع دہلی

سنگین بیگ دہلوی، مرزا: سیر المنازل

سید احمد خان بہادر، جواد الدولہ، سر: مضامین سرسید، جلد شانزدہم، مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی

سید احمد خان بہادر، جواد الدولہ، سر: آثار الصنادید، تدوین از خلیق انجم

شبیر علی خان شکیب: رامپور کا دبستان شاعری

شوق رامپوری، احمد علی خان: تذکرۂ کاملان رامپور

صفا بدایونی: تذکرۂ شمیم سخن

ظفر الرحمٰن دہلوی، مولوی: اصطلاحات پیشہ وراں
ظہیر دہلوی، راقم الدولہ ظہیر الدین حسین: طراز ظہیری
عرش تیموری: قلعۂ معلیٰ کی جھلکیاں
علی اکبر الہ آبادی: مصطلحات ٹھگی، مرتبہ ومدونہ رشید حسن خاں
غالب، میرزا اسداللہ خان: خطوط غالب، پانچ جلدیں، مرتبہ خلیق انجم
فرحت اللہ بیگ دہلوی، میرزا: دہلی کی آخری شمع
فیض الدین دہلوی، منشی: بزم آخر
کالی داس گپتا رضا، علامہ: چار توقیتیں
مالک رام: تلامذۂ غالب
مالک رام: فسانۂ غالب
مہر، مولانا غلام رسول: غالب
ناصر، سعادت خاں: خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ شمیم انہونوی
ناصر الدین خسرو میرزا: قتل فریزر
یوسف شاہ بخاری دہلوی، سید: یہ دلی ہے

(۲) انگریزی

Bacon, Nicholas : *First Impressions,* Vol. II
Bayley, Emily : *The Golden Calm (Diaries, Ed. M. M. Kaye)*
Cheema, G. S. :*The Forgotten Mughals*
Dalrymple, William : *The City of Djinns*
Dalrymple, William : *White Mughals*
Keene, H. G. : *Madhava Rao Sindhia*
Mcfie, J. M. : *Thug, or One Million Murders*
Mustas'ad Ahmad, Lt. Col. : *History of The Rajput Regiment*
Omar Khalidi : "The Rifa'i Sufi Order and the Faqirs in India" (Essay published in *Hamdard Islamicus,* Vol. 25, April-June, 2002)

Parkes, Fanny : *The Journal of Fanny Parkes (Ed. William Dalrymple)*
Patnaik, Naveen : *A Second Paradise, Indian Courtly Life, 1590-1947*
Spear, Percival : "Ghalib's Delhi" in Ralph Russell, Ed., *Ghalib the Poet, and his Age*
Woodruff, Phillip: *The Men Who Ruled India*

(۳) لغات

میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ مکالموں میں، اور اگر بیانیہ کسی قدیم کردار کی زبانی، یا کسی قدیم کردار کے نقطۂ نظر سے بیان کیا جا رہا ہے تو بیانیہ میں بھی، کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جو اس زمانے میں مستعمل نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات لغات کی مدد کے بغیر ممکن نہ تھی۔ مجھے سب سے زیادہ مدد جان شیکسپیئر (John Shakespear) کے لغت مطبوعہ ۱۸۳۴ سے ملی، پھر ڈنکن فوربس (Duncan Forbes) کے لغت مطبوعہ ۱۸۶۶ سے۔ موخر الذکر اس لئے بھی بہت کارآمد تھا کہ اس میں انگریزی سے اردو کی بھی ایک مفصل فرہنگ ہے۔ چونکہ یہ لغت اس زمانے کا ہے جب زبان اچھی طرح قائم ہو چکی تھی، اور زبان اردو پر ڈنکن فوربس کی مہارت جان گلکرسٹ (John Gilchrist) سے بہتر تھی، اس لئے، ہر چند کہ گلکرسٹ کو ڈنکن فوربس پر تقدم زمانی حاصل ہے، میرے نقطۂ نظر سے ڈنکن فوربس کی افادیت جان گلکرسٹ کے فرہنگ نما لغت سے فزوں تر نکلی۔ جدید لغات میں ترقی اردو بورڈ کراچی کے "اردو لغت، تاریخی اصول پر" نے بھی بہت سے مسائل حل کیے۔ میں ان تمام لغات کے مرتبین اور ان کے معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے حق میں دعاے خیر کرتا ہوں۔

2345

شمس الرحمن فاروقی کا یہ ناول اردو فارسی شاعری اور ہند اسلامی تہذیب کی مرقع نگاری کے انھیں سچے رنگوں سے عبارت ہے جو 'سوار' کے افسانوں میں ہر صفحے پر جھلکتے اور جھمکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے راجپوتانے سے شروع ہونے والی اور ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ بعد دلی کے لال قلعے میں ختم ہونے والی یہ داستان ہندوستانی فنکار کی روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرنے کے علاوہ ہند اسلامی تہذیب، ادبی معاشرہ، انگریزی سیاست، اور اس کی وجہ سے تہذیب اور تاریخ کے بدلتے ہوئے پیکر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ ناول ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہند اسلامی معاشرہ میں شاعر، عاشق، فنکار اور عام انسان، زندگی اور جذباتی اور روحانی تکمیل کی تلاش کس طرح اور کن اصولوں کی بنا پر کرتے تھے۔ دلی کی مٹتی ہوئی بادشاہت کے سائے میں پھلنے پھولنے والی اس تہذیب کا منظر نامہ غالب، ذوق، داغ، گھنشیام لال عاصی، امام بخش صہبائی، حکیم احسن اللہ خان وغیرہ بہت سے حقیقی کرداروں سے بھی جگمگا رہا ہے۔ اس ناول کو اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب میں قومی یک جہتی، زندگی، محبت اور فن کی تلاش کی داستان کہیں تو بجا ہوگا۔

مدتوں بعد اردو میں ایک ایسا ناول آیا ہے جس نے ہندو پاک کی ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ کیا اس کا مقابلہ اس ہلچل سے کیا جائے جو 'امراؤ جان ادا' نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی؟ اور یہ ناول ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جسے اول اول ہم نقاد اور محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے۔ اور محقق فاروقی یہاں پر ناول نگار فاروقی کو پوری پوری کمک پہنچا رہا ہے۔

انتظار حسین

اگر یہ ناول نہ ہوتا تو ہمیں کچھ بھی نہ معلوم ہو سکتا کہ ہند اسلامی دنیا اور بالخصوص دلی کی دنیا انیسویں صدی میں واقعی بھلا کس طرح کی تھی اور کیسی تھی۔

افضال احمد سید

یہ ناول مجھے اندر سے بدل کر رکھ دیتا ہے اور ان چیزوں کے لئے دل میں ایک زبردست ہوک پیدا کر دیتا ہے جنہیں ہم کھو چکے تھے اور جن کی بازیافت کی امید بھی ہمیں نہ تھی۔

مشرف فاروقی

'کئی چاند تھے سر آسماں' اکیسویں صدی ہی کی نہیں اردو فکشن کی بہترین کتاب ہے۔

اسلم فرخی

Penguin Fiction
Rs 450
www.penguinbooksindia.com

ISBN 0-14-309976-0
9780143099765